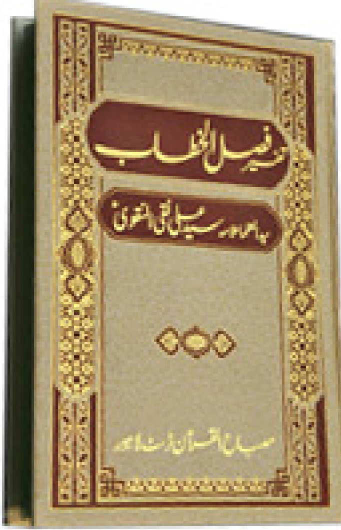
تسہیل الادب

تفسیر فصل الخطاب

جلد اوّل

مصنف

سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب-------تفسیر فصل الخطاب

جلد----------اوّل

مصنف---------سید العلما علامہ سید علی نقی النقوی ؒ لکھنوی

پروف ریڈنگ-----مولانا عابد عسکری

کمپوزنگ-----------مجاہد حسین حر (قائم گرافکس۔جامعہ علمیہ۔ڈیفنس۔کراچی)

ترتیبِ نو------قلب علی سیال

سال اشاعت------2011

ناشر-----------مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر ۲۴۔الفضل مارکیٹ۔اردو بازار۔لاہور

ابتدائیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَاٰلِهِ الطَّاهِرِيْنَ.

قارئین کرام! تفسیر فصل الخطاب کی پہلی جلد پیش خدمت ہے لیکن افسوس صد افسوس کہ سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی اب ہم میں نہیں رہے۔ میں نے ۲۹ مارچ ۱۹۸۶ کو تفسیر کے چند خصوصی نسخے لے کر سرکار ممدوح کی خدمت میں حاضری دی تو معلوم ہوا کہ آپ علیل ہیں اور کسی سے نہیں ملتے۔ بہت دکھ ہوا اور تشویش بھی بہر حال میں نے اپنا وہ نام کہلا بھجوایا جس نام سے آپ مجھے یاد فرمایا کرتے تھے۔ آدمی واپس آیا، اس نے بیٹھک کھول دی اور مجھے انتظار کرنے کو کہا، تھوڑی دیر میں مولانا برآمد ہوئے، کافی دیر گفتگو ہوئی اور پھر خورد و نوش کا سلسلہ بھی چلا۔ میں نے تفسیر کے دو نسخے پیش کیے، تیسرے پر تبرک کے طور پر ان سے دستخط کروالئے اور ساتھ لے آیا۔ مولانا نے تفسیر کو تھوڑی دیر دیکھا اور فرمایا: ''دیر آید درست آید''۔ کسے خبر تھی کہ یہ مولانا سے آخری ملاقات ہے اور پھر کبھی شرف نیاز حاصل نہ ہوگا۔

سید العلماء ۳۰، ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء رحلت فرما گئے اور عین عید الفطر کے دن مدفون ہوئے۔ خداوند عالم ان کو جوار معصومین میں جگہ عطا فرمائے۔

آہ! وہ شمع جو ۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء لکھنؤ میں روشن ہوئی تھی گل ہوگئی۔

افسوس کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں مگر وہ ہم میں روحانی طور پر موجود اور ہمارے دل و دماغ پر محیط ہیں۔ آج بھی ان کے علمی نکات ہم کو یاد آتے ہیں اور دین و دیانت اور اخلاق و شرافت سے ہماری محبت کو مستحکم کرتے ہیں۔ اب ایسی صلح کل ہستیاں کہاں ہیں جو علم و عمل کے میدان میں اسلامی تعلیمات و اقدار کی امین ہوں اور دنیا کی مشکلات میں ہمارے مژدہ فتح مبین ہوں۔

تفسیر فصل الخطاب کی پہلی جلد کی اشاعت کے تھوڑے دنوں بعد ہی ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' لاہور نے جو تفسیر نمونہ کے ناشر ہیں خواہش ظاہر کی کہ تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت کی ان کو اجازت دے دی جائے۔ مختلف مواقع پر اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی لیکن نتیجہ خیز نہ ہوسکی۔ ستمبر ۱۹۹۰ء کے آخری دنوں میں میری بیرون ملک سے واپسی پر پھر گفتگو ہوئی اور طے پایا کہ تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت مصباح القرآن ٹرسٹ کی طرف سے اور پیشکش ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کی طرف سے ہو۔ چنانچہ ادارہ ترویج علوم اسلامیہ نے دوسری جلد کا کتابت شدہ مسودہ مصباح القرآن ٹرسٹ کے حوالے کردیا تاکہ اشاعت کا کام مصباح القرآن ٹرسٹ کے اہتمام و انصرام کے تحت انجام پاسکے اور تفسیر فصل الخطاب کی جلدیں بہ سرعت شائع ہوتی رہیں۔ الحمد للہ کہ مصباح القرآن ٹرسٹ نے اب نئے سرے سے مکمل تفسیر کی کمپوزنگ کروائی ہے اور قارئین کی سہولت کیلئے اشاعتِ ھذا میں تین جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب کو مکمل شائع کر دیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ تفسیر کی پہلی جلد حاضر خدمت ہے، امید ہے کہ قارئین اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور تعاون فرمائیں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

سید علی اکبر رضوی

صدر ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کراچی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

سرکار سید العلماء علامہ علی نقوی النقوی اعلی اللہ مقامہ کے خطیبانہ و مؤلفانہ فیوض و برکات کا سلسلہ لگ بھگ پچاس سال پر محیط ہے۔ آپ کی تقریر و تحریر میں بیان و زبان کی سادگی اور مفاہیم و مطالب کی گہرائی یکساں طور پر موجود رہی ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کو برصغیر پاک و ہند کے جمہور مسلمین میں عموماً اور شیعہ مومنین میں خصوصاً مقبولیت اور ادب و احترام نصیب ہوا کہ بایدوشاید!

سید العلماء کے آثارِ علمی میں ''شہیدِ انسانیت'' سمیت دسیوں باعظمت کتابیں، آپ کے کئی ایک مجموعہ ہائے تقاریر اور مختلف دینی موضوعات پر کم وبیش پانچ سو رسالے موجود ہیں۔ تاہم آج سے ۲۵ برس قبل جب آپ کا مقدمہ تفسیر قرآن منظر عام پر آیا تو آپ کے تبحر علمی تحقیقی صلاحیت اور ذمہ دار قلم کی رعایت سے اپنے بیگانے ہر ایک کی نظریں آپ کی تفسیر قرآن کی طرف لگ گئیں۔

اس سلسلے میں خاص و عام کے ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ آپ کی تفسیر آئندہ جلد کی تلاش میں پاکستان کے لوگ ہندوستان جاتے اور وہاں کے لوگ پاکستان آتے، نیز دیگر ممالک میں مقیم مسلمان اس کے لئے ہندو پاک کے کتب خانوں سے برابر رابطہ رکھتے تھے۔ آخر کار ان ہزاروں منتظر اور متلاشی نگاہوں کی تسکین کا سامان یوں ہوا کہ سید العلماء کے ایک نہایت ہی مخلص قدرشناس غلام محمد بٹ نے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء تک کی مدت میں ثمر بگ (مقبوضہ کشمیر) سے آپ کی تفسیر قرآن ''فصل الخطاب'' کی سات جلدیں شائع کر کے اس اہم فرض کی تکمیل کا اعزاز حاصل کرلیا۔

اس اثناء میں مذکورہ تفسیر کی پاکستان میں اشاعت کی ضرورت کا احساس فرماتے ہوئے سید العلماء نے ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کراچی کے صدر سید علی اکبر رضوی کو بھی اس کی اشاعت کے حقوق مرحمت فرمادیئے۔ چنانچہ اس ادارے نے تفسیر فصل الخطاب کی جلد اول شائع کر دی لیکن بوجوہ یہ سلسلہ کچھ آگے نہ بڑھ سکا لہٰذا سید علی اکبر رضوی نے مصباح القرآن ٹرسٹ کی شاندار تفسیری و علمی خدمات کو دیکھتے ہوئے ایک معاہدے کے تحت اس تفسیر کی اشاعت کا عظیم کام اس ٹرسٹ کے حوالے کردیا۔ بنا بریں مصباح القرآن ٹرسٹ نے تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت کو خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ جلد اول جو کہ کراچی کے ادارہ ترویج علوم اسلامیہ نے شائع کی تھی، کے ختم ہونے پر مصباح القرآن ٹرسٹ نے اسے دوبارہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کی، اس کی اصلاح و تزئین میں مقدور بھر کوشش کی گئی، اس کے باوجود ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہمیں اپنی تجاویز و آراء سے مستفید فرمائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی آخر میں دردمندانہ گزارش بھی کرتے ہیں کہ تفسیر ہذا کی ترویج میں ہمارے ساتھ ہر ممکن تعاون فرما کر قرآن وعترت کی نصرت اور سید العلماء کی قدردانی کا حق ادا کرنے میں کوشاں رہیں۔

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

ضرورت تفسیر

قرآن مجید جب خود نور، ہدایت، بصیرت، آسان، واضح اور اَحسن (وبہترین) تفسیر ہے تو پھر تفسیر کی کیا ضرورت ہے؟ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات قرآن میں ہے:

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا۔(فرقان--۳۳)

اور یہ لوگ کوئی بھی مثال نہ لائیں گے مگر یہ کہ ہم اس کے جواب میں حق اور بہترین بیان (وتفسیر) لے آئیں گے

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔(دخان--۵۸)

درحقیقت ہم نے اس (قرآن) کو آپ کی زبان پر بالکل آسان قرار دیا ہے، شاید وہ نصیحت قبول کریں۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔(قمر--۱۷)

''اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنایا ہے تو ہے کوئی جو نصیحت قبول کرے''۔

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِىْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔(زمر--۲۸)

"عربی زبان کا قرآن جس میں کوئی کجی نہیں، شاید کہ وہ پرہیزگاری اختیار کریں"۔

قرآن مجید نے نہ فقط اس سوال کا جواب دیا ہے بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ مفسر قرآن کون ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔(نحل--۴۴)

"اے رسول! ہم نے قرآن کو آپ پر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے اُن تمام احکام وغیرہ کو بیان کریں (اور ان کی توضیح وتشریح کریں) جو ان کی طرف بھیجے گئے ہیں شاید وہ غور وفکر سے کام لیں"۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔(فاطر--۳۲)

"پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا انہیں جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا"۔

مذکورہ آیات میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے لئے مفسر کی ضرورت ہے اور مفسر قرآن سب سے پہلے خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے ان کے بعد وہ مفسر قرآن ہیں جو وارث قرآن، وارث علم قرآن اور وارث علم پیغمبرؐ ہیں یعنی اہل بیت وعترت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ جیسا کہ خود پیغمبرؐ نے بھی فرمایا:

"اِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ------ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِيْ اَهْلَ بَيْتِيْ-----"

میں آپ لوگوں کے پاس دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک کتاب خدا (قرآن مجید) اور دوسری اپنی عترت (یعنی اہلبیت)۔

اہل بیت وعترت پیغمبرؐ کے بعد تفسیر قرآن کی ذمہ داری اُن علماء پر ہے جو انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے حقیقی وارث اور "اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَآءِ" کے مصداق ہیں۔

انہی علماء میں سے ایک حضرت آیۃ اللہ علامہ السید علی نقی النقوی المعروف ''علامہ نقن'' ہیں۔ جنہوں نے تفسیر فصل الخطاب لکھ کر احسن طریقہ سے فریضۂ الٰہی انجام دیا۔

تفسیر فصل الخطاب سے قرآن مجید کا ترجمہ و حاشیہ مرتب کرتے وقت جس حد تک میں نے اس تفسیر کا مطالعہ کیا ہے تو تفسیر کی مختلف اقسام (مثلاً تفسیر رُوائی، تفسیر عرفانی اور تفسیر اجتہادی) میں سے فصل الخطاب کو تفسیر اجتہادی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ علامہ موصوف نے اس تفسیر میں ان تمام علوم سے استفادہ کیا ہے جو ایک جامع اور اجتہادی تفسیر کے لئے ضروری ہیں۔

یہ تفسیر اگرچہ سابقہ کتابت کے مطابق چند مرتبہ مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہو چکی ہے لیکن اب خداوند عالم نے خادمین ادارہ مصباح القرآن لاہور مخصوصاً جناب محترم شیخ محمد امین صاحب کو یہ توفیق عنایت فرمائی کہ وہ اسے کمپوز کروا کر خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ کمپوز اور اصلاح کا کام جناب محترم مجاہد حسین حر صاحب کے سپرد کیا گیا انہوں نے اپنی حد تک کوشش کی لیکن اتنے بڑے کام میں نواقص اور غلطیوں کا باقی رہنا فطری امر ہے۔ قارئین محترم سے گزارش ہے کہ نواقص کے سلسلہ میں راہنمائی فرمائیں تا کہ بعد والے ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے۔

دعا ہے کہ خداوند عالم بانیٔ ادارہ مصباح القرآن حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین مرحوم علامہ سید صفدر حسین نقوی النجفی قدس سرہ کے درجات بلند فرمائے۔ ان کے قائم کردہ تمام ادارات کو ترقی و کمال عطا کرے مصباح القرآن و دیگر ادارات کی تاسیس میں ان کے معاون خاص محترم جناب سیٹھ نوازش صاحب دام عزہ کو صحت و سلامتی اور طول عمر عطا کرے۔

علامہ مرحوم کے قائم کردہ تمام اداروں کے سرپرست اعلیٰ اور ان کے روحانی جانشین حضرت آیۃ اللہ حافظ ریاض حسین نقوی النجفی دامت برکاتہ کو صحت و سلامتی اور طول عمر بابرکت عطا فرمائے اور ان کا سایہ ہم سب کے سروں پر قائم و دائم رکھے۔

تمام معاونین و خادمین ادارہ مصباح القرآن مخصوصاً جناب محترم محمد امین صاحب کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

سید فیاض حسین نقوی

جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس۔ کراچی

ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مارچ ۲۰۱۱ء

تفسیر فصل الخطاب

چند تاثرات

ڈاکٹر محسن نقوی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ وَعَلٰی اٰلِہِ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاھِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ اَذۡھَبَ اللّٰہُ عَنۡھُمُ الرِّجۡسَ وَطَھَّرَھُمۡ تَطۡھِیۡرًا۔

ہماری خوش نصیبی ہے کہ برصغیر پاک وہند کی عظیم ترین علمی شخصیات میں سے فردِ وحید و عالم جلیل سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی (۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء۔ ۲۹ رمضان ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۷ مئی ۱۹۸۸ء) کی تفسیر فصل الخطاب کی طبع نو کے موقع پر اس کے بارے میں کچھ خیالات کے اظہار کا موقع ہمیں فراہم ہوا۔

ایک پوتے کے لئے اپنے جدّ (سیّد العلماءؒ ہمارے والد کے چچا تھے) کی کسی کتاب پر لکھنا وہ بھی ''سید العلماءؒ'' جیسی علمی شخصیت کی کتاب، اُس پر مستزاد ''تفسیر القرآن'' جیسا وسیع و دقیق موضوع اِس بے بضاعت کے لئے بہت مشکل کام تھا لیکن توفیق اِلٰہی (عزّ وجل) اور ولی العصر، صاحب الزمان علیہ الصلاۃ والسلام اور اُن کے اجدادِ کرام، صلوٰۃ اللہ علیہم کی ہدایت کے توسل سے کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں قرآن مجید کے اردو تراجم کی ابتداء سید العلماءؒ کے اجداد میں سید علی نقویؒ (۱۲۰۰ھ/ ۱۲۵۹ھ بمطابق ۱۷۸۵ء۔۔۱۸۴۳ھ) ابن سید دلدار علی غفرانمآبؒ کے حصّے میں آئی۔ آپ کا ترجمۂ قرآن شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین سے پہلے قرار پاتا ہے۔ اس ترجمے کی زبان قدیم لیکن سلیس اور بامحاورہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ پیر ابراہیم ٹرسٹ کراچی کی لائبریری، ناظم آباد میں موجود ہے۔

یوں تو علمائے شیعہ نے قرآنِ مجید کے بہت سے ترجمے اور حواشی قلم بند کئے جن میں مولانا فرمان علی (۱۸۵۳ء۔۔۱۹۱۶ء) اور مولانا مقبول احمد اعلی اللہ مقامہما (۱۸۷۰ء۔۔۱۸۸۶ء) کے تراجم و حواشی کو خاص شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح اردو تفاسیر میں مولانا عمار علی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۲۸ء۔۔۱۹۷۵ء) کی تفسیر ''عمدۃ البیان'' (۳ جلدیں) ایک متوسط حجم کی تفسیر شمار کی جاتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد مولانا امداد حسین کاظمیؒ (۱۹۰۱ء۔۔۱۹۷۵ء) کا ترجمہ و حاشیہ تفسیر متقین ہماری نظر میں فرمان علیؒ اور مقبول احمدؒ کے تراجم و حواشی پر بوجوہ فوقیت رکھتا ہے۔ اردو تفاسیر میں اس کے بعد علامہ حسین بخش جاڑا صاحب کی تفسیر 'انوار النجف' تفسیر کے شائقین کا مرکز رہی، اسی طرح علامہ ذیشان حیدر جوادیؒ کا ترجمہ و حاشیہ بھی اس بناء پر بنظر استحسان دیکھا جاتا ہے کہ ترجمہ انتہائی رواں اور حواشی عام قاری کے لئے سہل ہیں۔ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی (دام ظلہ الوارف) کی زیر نگرانی تیار ہونے والی ''تفسیر نمونہ'' کا ترجمہ انتہائی دیانت و عرق ریزی سے کیا گیا اور اس نے خاص حد تک ایک ایسی تفسیر کی کمی پوری کردی جو طلباء، کالج و یونیورسٹی کے پروفیسروں اور علماء کے لئے 'حوالے'' کا کام دے اور وہ اس کے ذریعے اپنی 'قرآن فہمی' میں

اضافہ کرسکیں۔ فجزاءہم اللہ احسن الجزاء۔ جس دوران تفسیر نمونہ کی جلدیں طبع ہوکر آرہی تھیں اُسی دوران سید العلماءؒ کی تفسیر "فصل الخطاب" پہلے سات جلدوں میں کشمیر سے چھپی، پھر ایک جلد ادارۂ ترویج علوم اسلامیہ سے اور بعد ازاں مصباح القرآن ٹرسٹ نے اس کا پورا سیٹ اچھے انداز میں طبع کیا۔

قرآن مجید کے طالب علم کی حیثیت سے عالم اسلام میں مختلف مکاتب فکر وفقہ کی تفاسیر شائع ہونے کے ساتھ زیر مطالعہ رہتی ہیں تو اپنے مکتب فکر کی اردو تفاسیر وحواشی بھی ہمیشہ زیر نظر رہتے ہیں جو اپنی قدر و قیمت میں کچھ کم نہیں جن میں سے بعض کا ذکر ماقبل ہم کر چکے۔

سید العلماءؒ کی تفسیر کی خاص بات جس نے ہمیں متاثر کیا وہ اس کا "تفسیری ترجمہ" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سید العلماءؒ کی ساری محنت وژرف نگاہی آیات کے ترجمے میں مضمر ہے اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

سید العلماءؒ کسی بھی آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے صرف عربی زبان، نحو وبلاغت، معانی وبدائع کو مدّنظر نہیں رکھتے بلکہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث اور اُن کو مدّنظر رکھ کر لکھی جانے والی تفاسیر مثلاً شیخ طوسیؒ کی التبیان، محسن فیض الکاشانی کی الصافی، تفسیر قمی علامہ طبرسیؒ کی تفسیر مجمع البیان وغیرہ میں پیش کئے گئے مطالب کو اردو ترجمے میں سمو دیتے ہیں اور تائیداً متعلقہ تفسیر کی متعلقہ عبارت کو مختصراً نقل کر دیتے ہیں۔ تفسیری مواد اس ترجمے ہی کی وضاحت ہوتی ہے۔ اسی لئے ترجمے میں لفظ پر لفظ نہیں رکھا ہے بلکہ اُسے اُردو محاورے کے مطابق ادا کیا ہے۔ نمونے کے طور پر بعض مقامات پیشِ خدمت ہیں:

(۱) سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۱۹ کے ایک جزء:

وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۚ

اس کا ترجمہ سید العلماءؒ نے یہ کیا ہے : اور جب تخلیہ ہوتا ہے تو تمہارے خلاف غیظ وغضب سے اپنی بوٹیاں کاٹتے ہیں۔

اس کے بعد حاشیے میں پہلے مولانا فرمان علیؒ کا ترجمہ دیا ہے "تم پر غصے کے مارے انگلیاں کاٹتے ہیں"۔ پھر ان ہی کا حاشیہ نقل کیا ہے: اس "الانامل" کے اصلی معنی پوروں کے ہیں مگر چونکہ اردو محاورہ میں پوروں کا کاٹنا نہیں بولتے ہیں اس وجہ سے یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

بعد ازاں سید العلماءؒ وضاحت کرتے ہیں: مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو میں تو انگلیاں کاٹنا بھی محاورہ نہیں ہے، اس لئے ہم نے ترجمہ بوٹیاں کاٹنے کے ساتھ کیا ہے" (فصل الخطاب، ج ۳ ص ۷۳)

علامہ جوادیؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: جب اکیلے ہوتے ہیں تو غصّے سے انگلیاں کاٹتے ہیں۔ تفسیر نمونہ کے اردو ترجمے میں ہے: جب وہ تنہائی میں ہوتے ہیں تو شدید غیظ وغضب سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگ جاتے ہیں۔ (ج ۳ ص ۶۴) سید العلماء کا ترجمہ عربی سے قریب اور اردو محاورے کے مطابق ہے۔

(۲) سورۂ آلِ عمران ہی کی آیت ۱۵۴ کے پہلے جزء میں فرمایا:

ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِنْكُمْ ۖ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ ...

علامہ جوادیؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: ''اس کے بعد خدا نے ایک گروہ پر پُرسکون نیند طاری کردی اور ایک کو نیند بھی نہ آئی کہ اسے صرف اپنی جان کی فکر تھی''

اس ترجمے میں ایک تو ''غم'' کا ذکر نہیں ہے، دوسرے تا کہ ''اَنۡزَلَ عَلَیۡکُمۡ'' میں جو عمومیت ہے وہ مفقود ہے۔ تیسرے قرآن مجید کے الفاظ ''وَطَآئِفَةٌ قَدۡ اَهَمَّتۡهُمۡ...'' کا ترجمہ مبہم ہے ''اور ایک کو۔۔۔'' یہاں مفرد کا گمان ہوتا ہے اگر ''گروہ'' کا اضافہ ہوتا اور ''ایک'' کی بجائے ''دوسرے'' ہوتا تو قرآنی الفاظ کی رعایت بھی ہوتی اور مطلب واضح ہوتا۔

سید العلماءؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: پھر اُس نے رنج و غم کے بعد تم پر سکون واطمینان اُتارا نیند کی صورت سے جو تم میں سے ایک گروہ پر طاری ہو رہی تھی اور ایک گروہ ایسا تھا جسے اپنی جانوں کی فکر تھی۔ (ج ۳ ص ۷۴)

اس کی تائید میں انہوں نے علامہ طبرسیؒ کی تفسیر مجمع البیان کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

(۳) سورۂ نساء کی آیت ۹۱ کا ایک جزء ہے:

كُلَّمَا رُدُّوٓا اِلَى الۡفِتۡنَةِ اُرۡكِسُوۡا فِيۡهَا.

علامہ جوادیؒ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے: یہ جب بھی فتنے کی طرف بلائے جاتے ہیں اُلٹے اس میں اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔

الفاظِ قرآن میں ''بلائے جاتے ہیں'' کسی لفظ کا ترجمہ نہیں ہے۔

شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی نے ترجمہ یوں کیا ہے: جب کبھی لوٹائے جاتے ہیں وہ فساد کی طرف تو اس کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

''اُرۡكِسُوۡا فِيۡهَا'' کے بنیادی معنی: ''يعني وقعوا فيها'' (التبیان للطوسیؒ) یعنی ''پڑ جانا'' واقع ہو جانا اس کو تائیداً نقل کر کے سید العلماءؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: اور جب فتنہ پردازی کا دوبارہ موقع ملے تو وہ اس میں بالکل جُٹ جائیں گے۔ (فصل الخطاب ج ۳ ص ۲۶۹)

''جُٹ جانا'' اُردو محاورہ ہے جس میں تن دہی سے کسی کام میں دلچسپی سے لگے رہنے کا مفہوم ہے اور یہی ''اُرۡكِسُوۡا فِيۡهَا'' کا درست ترجمہ ہے۔

ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

درج بالا سطور سے سید العلماءؒ کی تفسیر فصل الخطاب کی چند خصوصیات مستفاد ہوتی ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ الفاظِ قرآنی کی بالالتزام رعایت

۲۔ لفظی ترجمے کی بجائے محاوراتی ترجمہ اور لکھنوی اردو محاورے کی مطابقت

۳۔ ترجمے میں عقلی و منطقی اظہار اور ربط کا لحاظ

۴۔ طوالت سے گریز

۵۔ مستند تفاسیر کے طویل اقتباسات سے گریز

۶۔ تفاسیر کے مختصر اقتباسات سے استشہاد

۷۔احادیث کے طویل مندرجات کی بجائے محض متعلقہ حصّے کا اقتباس و اشارہ

۸۔تاریخی واقعات کی طرف اشارہ اور تفصیل سے اجتناب

۹۔تفسیر میں نہ اتنی طوالت کہ قاری پر بار ہو جائے اور نہ ایسا اطناب کہ وہ حاشئے میں شمار ہو۔

۱۰۔وہ مضامین جن کی ادائیگی عوام میں خلافِ ادب سمجھی جاتی ہے اُس کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال جن سے وہ دائرۂ ادب وستر سے باہر بھی نہ نکلیں اور مطلب بھی ادا ہو جائے۔مثلاً سورۂ نساء کی آیت ۶ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں: ''بلوغ کا تعلق تو عمر کے ساتھ ہے جو لڑکے میں ۱۵ برس اور لڑکی میں ۹ برس ہے یا خاص کیفیات جو علامت بلوغ کی حیثیت سے معتبر ہیں''۔(ج ۳ص:۱۴۴)

۱۱۔فقہی آیاتِ احکام کی وضاحت میں فقہی مسائل کو اپنی پوری فقہی مہارت سے بیان فرمایا ہے مگر اس کو بہت قابلِ فہم انداز میں تحریر فرمایا تاکہ مسائل سمجھ میں آسکیں۔مثلاً سورۂ نساء کی آیات اِرث۔

قابل مبارک باد ہیں مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور کے مسئولین و منتظمین جو قرآنِ مجید کی خدمت کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ علومِ اہل بیت علیہم السلام کو بھی نشر کر رہے ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ اِن سے فرمان خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں: قرآن و اہل بیتؑ جب تک ان سے تمسک رکھو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے'' پر عمل بھی کروا رہا ہے اور ثقلین کی خدمت بھی۔

ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے مساعی کو قبول فرمائے اور انہیں ''ثقلین'' کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

خادم الثقلین

ڈاکٹر محسن نقوی

۲۶ مارچ ۲۰۱۱ء کراچی

فہرست کتاب

عنوان	صفحہ نمبر
پہلا تبصرہ	21
لفظ قرآن کے لغوی تشریح	21
قرآن اور حدیث قدسی میں فرق	21
حدیث نبوی اور حدیث قدسی	24
قرآن کے اصطلاحی معنی	25
دوسرا تبصرہ	26
کلام الٰہی کے معنی اور قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا معرکہ	26
(۱) صفات ثبوتیہ	26
(۲) صفات الٰہی کے بارے میں اختلاف	26
کلام الٰہی کیا ہے؟	27
کلام نفسی کا تصور	27
شیعی نقطۂ نظر	28
نزول قرآن کے معنی	30
وحی کی صورتیں	30
خلق قرآن کا معرکہ	31
وکیع بن الجراح	34
یزید بن ہزون	34
مزنی شاگرد شافعی	34
امام بخاری	34
عبدالرحمن بن مہدی	34
تیسرا تبصرہ	37
نزول قرآن کی تاریخ	37
چوتھا تبصرہ	38
اعجاز قرآن	38
معجزہ کے معنی	38
معجزہ کی ضرورت	38
معجزہ اور اثبات حقانیت	40
معجزہ کا سحر اور غیر معمولی انسانی کمالات سے تفرقہ	42
قرآن میں معجزات انبیاءؑ کا تذکرہ	43
حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات	47
اعجاز قرآن	52
سلسلہ معجزات میں قرآن کا امتیاز	53
قرآن مجید کی حیثیتِ اعجاز	54
قرآن کے تازہ ترین معجزات	55
قرآن کے امتیازی خصوصیات بحیثیت اسنادو اعتبار	56
پہلی خصوصیت	56
دوسری خصوصیت	56
تیسری خصوصیت	57
چوتھی خصوصیت	57
پانچویں خصوصیت	57
چھٹی خصوصیت	57
ساتویں خصوصیت	57
آٹھویں خصوصیت	57
نویں خصوصیت	57

عنوان	صفحہ نمبر
پانچواں تبصرہ	58
جمع وتدوین قرآن	58
چھٹا تبصرہ	60
نفی تحریف	60
دیگر آئمہ اہلبیت کے ارشادات	64
قرآن وحدیث کی صحت کا معیار	64
قرآن کی مخالفت کفر	65
قرآن نشان ہدایت	65
قرآن جنت کا رہنما اور جہنم سے سدراہ	66
فقہ جعفری کے احکام متعلقہ قرآن	66
تفسیر اور دیگر علوم قرآن کے بارے میں	67
آئمہ اہلبیتؑ اور پھر ہر صدی کے علمائے شیعہ کی خدمات	67
نفی تحریف کے متعلق علماء شیعہ کے تصریحات	71
ساتواں تبصرہ	77
قراءسبعہ اور سبعۃ احرف	77
آٹھواں تبصرہ	79
فہم قرآن کے سلسلہ میں مختلف نظریات اور صحیح نقطہ نظر	79
قرآن مشکل ہے یا آسان	83
قرنِ اوّل کے مسلمانوں کا عمل بالقرآن	85
(۲) بلاغت کا مفہوم	88
(۳) قرآن سے ثبوت	90
(۴) قرآن کا مطالعہ	92
نواں تبصرہ	94
تفسیر واصول تفسیر	94
تفسیر بالرائے کے معنی تنزیل وتاویل میں فرق	94
محکم ومتشابہہ میں امتیاز اور تفسیر قرآن کے شرائط	94

عنوان	صفحہ نمبر
تفسیر بالرائے کی چند مثالیں	101
(۱) قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کا ذکر ہے	101
محکم اور متشابہہ	107
تاویل آیات کی مختلف اقسام	111
افادات بلاغیؒ از مقدمات تفسیر آلاء الرحمٰن فی تفسیر القران	115
تمہید	116
قرآن مجید کی معجزانہ حیثیت کا ایک خاص پہلو	117
پہلا امر	117
دوسرا امر	118
تیسرا امر	118
اعجاز قرآن کے مختلف رخ	119
تاریخی حیثیت	119
استدلالی حیثیت سے	120
تشریعی حیثیت سے	121
اخلاقی حیثیت سے	122
نفی تحریف	123
فرقہ امامیہ کا قول کہ قرآن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی	123
قرآن مجید کی قرأت	128
اصول تفسیر	132
اس سلسلہ میں چند پہلو قابل تبصرہ ہیں	132
پہلی آیت	136
دوسری آیت	136
تیسری آیت	137
افسوس ناک نتیجہ	138
تفسیر فصل الخطاب	143
سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ	144

عنوان	صفحہ نمبر
سورہ کے لفظی اور اصطلاحی معنی	144
سوروں کے نام	145
سورۂ حمد کے نام	145
سورۂ حمد کی جامعیت	145
زمانۂ نزول	146
سورۂ حمد کا اندازِ بیان	146
بسم اللہ کی خصوصیت	147
اسم کے معنی	148
اسم ذات ''اللہ''	149
رحمٰن اور رحیم کا فرق	149
حمد اور مدح کا فرق	150
حمد اور شکر میں تفرقہ	151
''رب'' (پروردگار) اور ''اب'' (باپ)	151
عالمین کی کثرت	151
رحمٰن و رحیم کے وصف کی تکرار	153
الدین جزا و سزا	153
عبادت کا مفہوم	154
تعظیم اور عبادت میں فرق	154
استعانت اور توسل	154
سلسلۂ کلام کی بلیغانہ رفعت	155
صراط مستقیم	156
دعائے ہدایت کا مطلب	157
دین حق کی معرفت میں اشخاص کی اہمیت	157
سُوۡرَۃُ الۡبَقَرَۃِ	160
سورۂ بقرہ کے مضامین	160
مقطعات قرآنیہ اور ان کی نوعیت	161

عنوان	صفحہ نمبر
تقویٰ کا مفہوم	164
ایمان بالغیب کی اہمیت	164
گزشتہ انبیاء پر ایمان کی صورت	166
آخرت پر یقین	166
دلوں پر مہر لگنا کفر کا نتیجہ	169
منافقین کا ذکر	170
خدا کو دھوکا دینے کا مطلب	171
مرض اور اس کے بڑھانے کا مطلب	172
فساد فی الارض کے معنی	173
معیار عقل و بے عقل	174
خدا کی طرف سے استہزا کا مطلب	176
منافقین کی مثال	178
عبادت کا ہمہ گیر حکم اور اس کا فلسفہ	181
قرآن کے مثل لانے کا مطالبہ اور دنیا کی عاجزی	183
ایمان اور عمل صالح	186
قرآن میں مثالوں کا مقصد	189
خلقت آسمان و زمین	192
خلافت آدم کا اعلان	193
ملائکہ کا سوال و جواب	195
تعلیم اسماء اور امتحان آدم پر ملائکہ	195
حکم سجدہ اور ابلیس کا انکار	198
جنت میں آدم کا قیام اور ترک اولیٰ	200
توبہ اور اس کی نوعیت	204
بنی اسرائیل اور ان کا کردار	206
صبر و صلوٰۃ	211
اسرائیلی عقیدۂ شفاعت اور اسلامی عقیدۂ شفاعت میں فرق	214

عنوان	صفحہ نمبر
فرعون کے مظالم اور بنی اسرائیل کی نجات	214
بداء اور اس کا مطلب	217
بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی	218
مطالبۂ دیدار اور اس کا انجام	219
من وسلویٰ	220
بابِ حِطّہ	221
بارہ (۱۲) چشمے	222
یہود کے لیے فیصلہ تقدیر	225
معیارِ نجات	225
سبت کا حکم اور اس کی مخالفت کا انجام	226
بقرہ یعنی گائے کا قصہ	228
منافقین یہود کا رویہ	233
کتب سماویہ میں تحریف	234
عہد نامہ	236
یہود کا انتظار اور بعد میں انکار	240
یہود کا گزشتہ انبیاء کے ساتھ سلوک	242
تمنائے موت کا مطالبہ اور یہود کی نفسیاتی کیفیت	243
جبرائیلؑ سے دشمنی اور اس کا جواب	245
جادو کی ابتداء اور اس کی ترقی	247
جناب سلیمانؑ کی طرف سے صفائی	248
رَاعِنَا اور اُنْظُرْنَا کا فرق	251
منکرین رسالت کی ذہنیت اور ان کا جواب	252
نسخ اور بدا	253
اہل کتاب کی حاسدانہ ذہنیت	255
یہود و نصاریٰ کے مزعومات اور ان کا جواب	257
مسیح علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کا ابطال	261
کفار کے غلط مطالبے	263
امتحان حضرت ابراہیمؑ اور اعلانِ امامت	266
دعائے ابراہیم علیہ السلام اور اس کی قبولیت با شرطِ عصمت	268
خانۂ کعبہ کی مرکزیت	269
حضرت ابراہیمؑ کی دعائیں اور ان کی استجابت	270
بنائے کعبہ اور ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی مناجات	271
دعائے ابراہیمؑ میں پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف	273
اولاد ابراہیم علیہ السلام کا دین	276
ابراہیمؑ، اسحاقؑ، اور یعقوبؑ کا دین کیا تھا؟ یہود نصاریٰ کے لئے لمحۂ فکریہ	281
تبدیلی قبلہ	283
مکّہ بزمانۂ قیام سمت قبلہ	283
سمت میں ذاتی تقدس نہیں	285
پہلا ٹکڑا اُمّت وسط	286
شہداء علی الخلق اور ان کے مراتب	287
دوسرا ٹکڑا پہلا قبلہ بھی خالق کا مقرر کردہ تھا	287
تیسرا ٹکڑا	290
مسجد حرام	292
اہل کتاب کا جان بوجھ کر انکار	294
قبلہ اور معیار فضیلت	295
صبر اور صلوٰۃ	298
حیاتِ شہداء	300
کتمان حق کرنے والے پر لعنت	305
توحید الٰہی کے معنی	307
قدرت کی نشانیاں	308
پرستارانِ باطل سے تبرا	310

عنوان	صفحہ نمبر
غذا میں جائز اور ناجائز کی تفریق	312
آباؤ اجداد کی غلط تقلید	314
مردار، خون، سوٴر کے گوشت اور غیر ذبیحہ کی حرمت	316
نجاست کفار کے مسئلہ پر ضمنی روشنی	317
معیار نجات ایمان و عمل	321
حکم قصاص	324
فلسفۂ قصاص	325
حکم وصیّت	326
روزہ کا وجوب	329
صاحبانِ اعذار کا بیان	330
ماہ رمضان کی خصوصیت	331
دُعا اور اس کی قبولیت	332
بعض سابق احکام صوم کی منسوخی	334
اعتکاف	335
ناحق مال کھانے اور رشوت ستانی کی ممانعت	336
چاند کا حساب نہ کہ سورج کا	337
گھروں میں دروازوں سے داخل ہو	337
جنگ اور اس کے حدود و قیود	338
اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو	341
حج تمتع کا حکم	343
محصور و مسدود	343
محرّمات احرام	345
عرفات اور مشعر الحرام یعنی مزدلفہ	346
دنیا داروں اور دیانتداروں کے نصب العین کا امتیاز	348
منیٰ میں قیام	349
ریا کار اور مطلب پرست آدمی کا کردار	350

عنوان	صفحہ نمبر
شب ہجرت حضرت علی علیہ السلام کا کردار	352
مسلمانوں کو انتباہ اور دعوت اتحاد و اتقیاء	352
جمہور کا انحراف کوئی عجیب بات نہیں	354
اختلاف خلق اور انبیاء کی بعثت	356
مستحقینِ خیرات	358
حکم جہاد بصورت قتال	359
خیرات کی مقدار	363
یتیموں کی بہبودی	364
غیر مسلموں سے شادی بیاہ کی ممانعت	366
ایام میں مقاربت کی ممانعت	367
بات بات پر قسم کھانے کی ممانعت	368
ایلا کے احکام	370
عدۂ طلاق	371
طلاق بائن کا حکم اور اس کا معیار	373
احکام رضاعت	379
عدۂ وفات	381
زمانۂ عدّہ کے بعض احکام	382
مہر وغیرہ جو ادا کرنا ہوگا	383
نماز وُسطیٰ	384
عدۂ وفات کا قدیم حکم جو منسوخ ہو گیا	386
وہ جماعت جو مر کر زندہ کی گئی	388
قرض حسنہ	390
قصہ طالوت و جالوت	391
اجازت دفاع کا حکیمانہ پہلو	397
پیغمبروں میں بعض کی بعض پر فضیلت	398
ہمارے پیغمبر کی متعدد وجوہ سے دیگر انبیاء کے مقابلہ میں بلندی	399

عنوان	صفحہ نمبر
توہم جبر کا دفعیہ	399
آیۃ الکرسی	403
حی وقیوم کے معنی	403
غنودگی کے بعد نیند کی نفی کا مطلب	403
ثبوت شفاعت علم غیب بمشیت الٰہی	404
دین میں جبر نہیں	405
مفہوم وحالات	406
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو نمرود سے	407
عزیر یا ارمیا کا واقعہ	409
حضرت ابراہیمؑ کی خالق سے التجا اور اس کا نتیجہ	410
راہ خدا میں خیرات کی نتیجہ خیزی اور اس کی مثال	412
خیرات کے باعث ثواب ہونے کی شرطیں	413
ریاکاری سے خیرات کے باطل ہونے کی مثال	415
قابل قبول خیرات کی مثال	415
خیرات کے دو اہم اصول	417
فضیلتِ حکمت	419
خیرات کا خفیہ دینا بہتر اعلانیہ	420
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام جبری طور پر ہدایت کرنا نہیں	422
فقراء میں ترجیح کا معیار	424
سودخواروں کی مذمت	426
سود کی حرمت	426
سودخوار کی انجام میں بربادی	427
ترتب اجر وثواب باعتبار اعمال	428
معاملات باہمی کے متعلق احکام	432
حاکمانہ اور حکیمانہ دو قسم کے احکام	432
رہن کا حکم	435

عنوان	صفحہ نمبر
شریعت اسلامی کی خصوصیت	438
سُوْرَۃُ اٰلِ عِمْرَانَ	439
آغاز سورۂ آل عمران	439
اس سورۂ کے خاص مضامین	439
فرقان کے معنی	442
آیات قرآن کی دو قسمیں محکمات اور متشابہات	444
الراسخون فی العلم اور علم تاویل قرآن	444
جنگ بدر کی مختصر روداد	449
محبت آل ومال بری چیز نہیں مگر فکر مآل مقدم	452
سحر خیزی کی تعریف	454
اوصاف الٰہی میں وحدت کے ساتھ عدل کی اہمیت	454
توحید کے ساتھ عدل اصول دین کا لازمی جزء	455
اصل دین صرف اسلام	456
حقیقت اسلام	457
نیرنگ زمانہ سے اللہ کی قدرت کا ظہور	462
حکم تقیہ	464
معیار محبتِ الٰہی اتباعِ رسول	466
آل عمران کون ہیں؟	470
جناب مریم سلام اللہ علیہا کی ولادت اور نشوونما	472
جناب زکریا علیہ السلام کی ولادت فرزند کے لئے دعا	473
ولادت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت	474
جناب مریم سلام اللہ علیہا کی فضیلت وعصمت	476
حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی رفعت	477
قرآن کا اعجازی پہلو بحیثیت بیان واقعات	479
ولادت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت	480
معجزات حضرت عیسیٰ علیہ السلام	482

عنوان	صفحہ نمبر
حوارین عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ	484
خداوند عالم کی طرف مکر کی نسبت اور اس کا مفہوم	486
غیبت جناب عیسیٰ علیہ السلام اور غیبت امام مہدی علیہ السلام	487
دائمی طور پر قوم یہود کی پستی کا اعلان	487
نصارائے نجران سے بحث کی آخری کڑی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے نہ ہونے کی	489
واقعہ مُباہلہ	490
"انفسنا" کے معنی	491
حسنینؑ کا فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونا	492
مخالفین کو روادانہ دعوت اتحاد	493
اسلام میں فقہا اور مجتہدین کو شریعت سازی کا اختیار نہیں	493
قرآنی تہذیب یا رواداری	494
حضرت ابراہیم علیہ السلام کس دین پر تھے	494
علمائے اہل کتاب کے لئے سرمایۂ انتباہات	497
پرستارانِ باطل کا ایک منصوبہ	498
جماعت اہل کتاب کی بدمعاملگی	502
امانت و دیانت کا لحاظ ہر جماعت کے ساتھ لازم	502
توریت میں تحریف کا وقوع	504
عصمت انبیاء	505
تمام پیغمبروں سے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کا عہد	506
اسلام قانونِ فطرت ہے	507
اسلام کے بغیر نجات کا تصوّر غلط	508
خیرات کے متعلق ضروری ہدایت	510
وجوب حج اور اس کی شرط لازم استطاعت، خانہ کعبہ سرزمین مکّہ اور مقام ابراہیم علیہ السلام	511
اہل کتاب کو تنبیہی تازیانے	512
مسلمانوں کے لئے سامان انتباہ	513
اتحاد اور اتفاق باہمی کی تاکید	515
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم	515
مسلمانوں کو تنبیہی تازیانے	517
انکار نص کے نتیجہ میں افتراق اور اس کا انجام	519
بہترین امت کون ہے	520
یہود کے متعلق قرآنی پیش گوئی اور حالات حاضرہ	521
غزوۂ احد کے لئے روانگی کے وقت کا تذکرہ	525
صحابہ کے واقعات پر تبصرہ کو روکنا منشائے قرآنی کے خلاف ہے	526
جنگ بدر کا حال اور مدد الٰہی	527
فرشتوں کا مدد کے لئے آنا	528
فرشتوں کے بھیجنے کی مصلحت	529
سود کھانے کی ممانعت	531
پرہیز گاروں کے اوصاف حمیدہ کا ایک سلسلہ	532
جنگ احد کی عسکری شکست پر تنبیہیں اور تسلیاں	535
آزمائش کا نتیجہ اصل جاں نثار کا تعارف	536
فرار ہونے والوں پر شدید طنز	538
مستقبل کے خطرہ پر توجہ دہانی	539
موت کا وقت مقرر ہے	540
شان نزول اور حضرت علیؑ کا کردار	540
انبیاء کے ساتھیوں کا کردار اور ساتھ ہونے کا معیار	541
حسن کردار کے ساتھ شان عبودیت کا اظہار	541
فتح، اس کے بعد شکست اور اس کے اسباب	544
صحابہ کے ایک طبقہ کی نبض قرآن دنیا طلبی	544
جنگ احد سے فرار کا عبرت ناک منظر	545
بعد کی کیفیت اور چہ میگوئیاں	546

عنوان	صفحہ نمبر
شہادت میں خسارہ نہیں	549
رسولؐ کی رواداری عام مسلمانوں کیلئے دعائے مغفرت کا حکم	550
مسلمانوں کی رسولؐ سے بدگمانی اور اس پر تنبیہ	552
صحابہ کے درمیان اچھے اور برے میں امتیاز کی ضرورت	553
احد کی شکست اپنے ہاتھوں	554
شکوہ اور جواب شکوہ	555
خیر القرون کے مسلمان اور کفر کے نزدیک	556
منافقین کا کردار اور ان کے حلئے حوالے	556
حیات شہدائے	558
غزوہ حمراء الاسد کے مجاہدین کی توصیف	560
کفار منافقین کو مہلت دیے جانے کی وجہ	564
ثبوت علم غیب بعطائے الٰہی	564
ادائے حقوق واجب نہ کرنے اور بخل سے کام لینے کی مذمت اور اس کا عذاب	566
یہودیوں کی نکتہ چینیوں پر اللہ کا غضب	567
اعتراض برائے اعتراض کا جواب نہیں دیا جاتا	568
بلاوجہ دل بخواہ معجزہ کی فرمائش پر قرآن کا جواب	569
پندار خودی کی کیفیت اور مذمت	572
غلبہ واقتدار کو دلیل حقانیت سمجھنا غلط	575
مرابطہ کا حکم اور اسکے معنی	577
سُوْرَةُ النِّسَآءِ	579
سورہ نساء کے خاص خاص مضامین	579
عالمگیر اخوت کا اعلان	580
عورت کی مرد سے تخلیق کا مطلب	580
حقوق انسانی کی اہمیت	581
یتیموں کے مال کا تحفظ	582
تعداد ازواج	582
نابالغوں کی جائداد کی کورٹ ہونے کا حکم	584
کورٹ ختم ہونے کی حد	585
لڑکیوں کو استحقاق میراث	586
مجوب الارث عزیزوں کے ساتھ سلوک اور ہمدردی	586
یتیموں کے مال میں خورد برد کرنے والوں کی سزا	588
ماں باپ اور اولاد کی میراث اور ان کے حصوں کی تیعین	589
شوہر اور زوجہ کی میراث	593
میراث ازواج میں بحث طلب مسئلہ	593
وصیت وقرض میراث سے مقدم	595
جنسی جرم کے ثبوت کے لئے چار گواہوں کی ضرورت	597
وہ جن کی توبہ قبول نہیں	598
زمانہ جاہلیت کے ایک رسم کی ممانعت	599
سوتیلی ماؤں کی حرمت	601
کن عورتوں سے شادی کرنا حرام ہے	602
حکم متعہ	604
کنیزوں کے ساتھ نکاح کا حکم	605
مال غیر کو ناحق کھانے کی ممانعت	607
گناہوں میں کبیرہ اور صغیرہ کی تفریق	608
حسد کی ممانعت	610
مردوں کی سیادت وفوقیت کے ساتھ ذمہ داری اور عورتوں کی جنسی بے راہ روی کی صورت میں تادیب کا حق	611
نزاع کی صورت میں دو ثالث مقرر کرنے کا حکم	612
خدا کی طرف سے ہر قسم کی ظلم کی نفی	614
غسل جنابت کا حکم اور تیمّم کی ترکیب	617
شرک ناقابل معافی، باقی ہر گناہ کی معافی کا امکان	621

عنوان	صفحہ نمبر
رسولؐ اور آل رسول علیہم السلام کا محسود خلق ہونا	624
آیہ اولی الامر	627
عدالت غیر شرعی میں مقدمہ لے جانے کی ممانعت	628
توسل کی اہمیت	630
قادیانی جماعت کا غلط استدلال اور اس کی وجہ	632
حکم جہاد بصورت قتال	635
تلوار اٹھانا اسلام کا بنیادی نصب العین نہ تھا	638
اطاعت رسولؐ عین اطاعت خدا ہے	643
جواب سلام کے لئے اسلامی تعلیم	646
قتل خطا کی سزائیں	652
قتل عمد کے گناہ کی اہمیت اور سزائے آخری میں شدت	653
اظہار اسلام کا اعتبار	654
صورت وجوب ہجرت	656
سفر میں نماز قصر کا حکم	658
اتباع رسولؐ راہ اہل ایمان ہے نہ کہ اجماع امت	667
دین الٰہی سے انحراف بطور انکار قابل بخشش نہیں	669
معصوم ہستیوں کی موجودگی کا ثبوت	670
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لقب خلیل کے ساتھ سرفرازی	674
اپنے اور پرائے ہر ایک کے معاملہ میں عدل وانصاف قائم رکھنے کا مطالبہ	681
ایمان لانے والوں کو دعوت ایمان	681
منافقین کے کردار کی رنگارنگی اور ان کے عذاب کی شدت	684
نفاق سے توبہ کی صورت میں انجام بخیر	686
مظلوم کے لئے ظلم کو برا کہنے کا حق	687
انکار رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مثل انکار خدا کے موجب کفر	688
حیات مسیح علیہ السلام	694

عنوان	صفحہ نمبر
رسول کے بھیجنے کا مقصد اتمام حجت	699
بہت سے پیغمبر وہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے	699
''وہ رسول'' اور ''نبی'' آپ کی آمد کا ہمہ گیر اعلان	703
غلو کی ممانعت عیسیٰؑ کا صحیح تعارف رد تثلیث اور اثبات توحید	704
کلالہ یعنی بھائی بہن کی میراث	707
سُوْرَةُ الْمَآئِدَةِ	709
سورۂ مائدہ کے خاص خاص مضامین	709
گوشت خوری کا جواز اور چوپایوں میں اصالت حلیت	711
شعائر الٰہیہ کی حرمت کے ساتھ ان انسانوں کی بھی عزت و حرمت جو رضائے الٰہی کے جادہ کے سالک ہوں	712
حیوانی قسم کی حرام غذاؤں کے بیان میں آیت اکمال دین جو یقیناً اس سے الگ خاص موقع پر اتری ہے	713
شکاری کتے کے شکار کی حلیت	714
اہل کتاب کے ساتھ غلہ کی خرید وفروخت اور ان کی عورتوں کے ساتھ عارضی طور پر تعلق ازدواجی یعنی متعہ کی اجازت ہے	716
وضو کی ترکیب اور بوقت ضرورت تیمم کا حکم	718
عدل وانصاف میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں	721
الوہیت مسیح علیہ السلام کا ابطال	727
یہود ونصاریٰ کے دعاوی باطلہ اور ان کی رد	728
سرزمین مقدس کی فتح پر ماموری، بنی اسرائیل کی عدول حکمی اور اس کا انجام	730
قصہ ہابیل وقابیل	733
ڈاکوؤں اور فسادیوں کیلئے سخت سے سخت سزاؤں کا اعلان	736
ضرورت وسیلہ	738
چوری کی حد یعنی شرعی سزا	739
توریت میں کم قصاص کا تفصیلی بیان	743

عنوان	صفحہ نمبر
آیہ ولایت	750
حکم تاکیدی اعلان ولایت جناب امیر علیہ السلام بروز غدیر	756
نصاریٰ کے مختلف فرقوں کے کافر ہونے کا صریحی حکم	758
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی صحیح حیثیت	760
بت پرستوں اور یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کی تعریف	764
قسم توڑنے کا کفارہ	768
شراب اور جوئے سے بت پرستی کی طرح ممانعت	768
کیرم وغیرہ کی حرمت	768
حالت احرام میں شکار کی ممانعت	772
دریائی جانور یعنی مچھلی کے شکار کی اجازت	773
اخبارین کے نظریہ "اصالت حرمت" کی رد	776
معجزات حضرت عیسیٰ علیہ السلام	783
مائدہ (کھانے کے خوان) کا واقعہ	787

عنوان	صفحہ نمبر

****
*****
***
*

پہلا تبصرہ

لفظ قرآن کے لغوی تشریح

"قرآن" قراءۃ کی طرح "قُرء" سے ماخوذ ہے جن کے اصلی معنی لغت عرب میں جمع کرنے کے ہیں۔

کتاب کے عام رواج سے پہلے کسی نظم یا نثر کے جمع کرنے کا اس طرح کہ وہ محفوظ ہوجائے۔ بہترین طریقہ یہی تھا کہ اُسے سینہ میں محفوظ یعنی از بر یاد کرلیا جائے۔

اس بنا پر صدر اسلام میں "قراءۃ" بمعنی حفظ مستعمل ہوتا تھا اور حافظ قرآن کو "قاری" کہتے تھے۔

چوں کہ یہی حفاظ حروف قرآن کے طریقۂ ادا اور ان کے مخارج و کیفیات سے واقف ہوتے تھے اسے لحن کے ساتھ پڑتے بھی تھے، رفتہ رفتہ قرارۃ بہ معنی علم مخارج حروف ہوگیا اور قاری یعنی مخارج کا جاننے والا چاہے حافظ نہ ہو لیکن یہ بعد کے زمانہ کا محاورہ ہے۔ صدر اسلام میں ایسا نہیں تھا جسے تفصیل کے ساتھ ہم نے اپنی کتاب "تذکرۂ حفاظ شیعہ" میں لکھا ہے۔

پھر چوں کہ جمع یعنی کسی تحریر پر حاوی ہونے کا ایک ادنیٰ درجہ یہ بھی ہے کہ انسان پوری تحریر پر نظر ڈال لے یا زبان پر اسے جاری کرے، اس لئے "قراءۃ" کے معنی مطلق پڑھنے کے بھی ہوگئے اور یہ محاورہ بھی نزول قرآن کے پہلے سے موجود تھا چنانچہ پہلی وحی جس کا آغاز اِقْرَاْ سے ہوا ہے اسی مفہوم کی حامل ہے اور بعید نہیں ہے کہ کتاب الٰہی کے لفظ "قرآن" سے موسوم ہونے کا تعلق اس اِقْرَاْ کے ساتھ بھی سمجھا جائے جس سے اس کتاب کے نزول کا آغاز ہوا ہے جس کے ماتحت نمازوں میں "قراءۃ" کے معنی اسی کتاب کے سوروں کا پڑھنا ہوا نہ کی تسبیح وغیرہ دوسری چیزوں کا پڑھنا چاہے ان کا پڑھنا واجب بھی ہو۔

جس طرح کتاب بمعنی "مکتوب" اور بیان بمعنی "مَبَیَّن" بلاتکلف استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح "قرآن" مقروٗ اور محفوظ کے مفہوم کا اعتبار کر کے خداوندی محاورہ میں نام بن گیا ہے ان الفاظ و کلمات کا جو بطور وحی جبرائیلِ امین کے توسط سے حضرت خاتم النّبیّن پر بحیثیت معجزہ اتارے گئے ہیں۔

قرآن اور حدیث قدسی میں فرق:

اسی آخری قید "بحیثیت معجزہ" سے فرق ہوگیا "قرآن" اور "حدیث قدسی" میں کیوں کہ حدیث قدسی بھی اللہ کی طرف کے ارشادات ہیں جو فرشتے کے ذریعہ رسالت مآب تک پہنچے ہیں لیکن وہ خاص آپؐ کے دعوائے نبوّت کی دلیل بنا کر معجزہ کی حیثیت سے نازل نہیں کئے گئے بلکہ وہ خاص مواقع اور حالات میں خاص خاص ارشادات ہیں جن میں سے بعض رسول کے ساتھ تخاطب کے طور پر ہیں جیسے:

لولاك لما خلقت الافلاك — اگر آپ نہ ہوتے تو میں زمین و آسمان کو بھی پیدا نہ کرتا۔

اور بعض عام بندوں سے تخاطب کی حیثیت سے ہیں جیسے:

عبدی اطعنی حتّیٰ اجعلك مثلی — میرے بندے! میری اطاعت کر، تا کہ میں تجھ کو اپنا نمونہ بنادوں۔

اور بعض میں بلا تخاطب کسی بات کا اظہار ہے، جیسے:

لایزال العبد یتقرّب اِلیّ بالنّوافل حتّیٰ اکون سمعهُ الّذی یسمعُ بهٖ وَبصرهُ الّذی یبصر به

بندہ نوافل کے ذریعہ میری بارگاہ میں قریب ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس کا سننے والا کان اور دیکھنے والی آنکھ بن جاتا ہوں۔

اسی طرح مشہور حدیث:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا الله حِصنی فمن دخل حصنی اَمِنَ مِن عذابی۔

"لَآ اِلٰهَ اِلَّا الله" میرا قلعہ ہے تو جو میرے قلعہ میں داخل ہوا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔

ان احادیث کا مجموعہ جناب شیخ حرِ عاملی رحمۃ اللہ علیہ کا جمع کردہ "الجواهر السنية فی الاحاديث القدسية" موجود ہے۔

قرآن اور ان احادیث قدسیہ میں جو فرق ابھی بتایا گیا واضح حیثیت رکھتا ہے لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ "قرآن اور حدیث قدسی" میں ایک دوسری حیثیت سے بھی فرق ہے جس کی بناء پر دونوں کی نوعیت ہی الگ الگ ہو جاتی ہے اس کی طرف مجمل طور پر ہمارے بزرگوں میں سے جناب تاج العلماء طاب ثراہ کو توجہ ہوئی چنانچہ موصوف نے پہلے تو تحریر فرمایا ہے:

من الحدیث مایسمّیٰ حدیثًا قد سیًّا وهوما یحکی کلامه تعالٰی غیر متحد بِشیءٍ مِّنه کالقراٰن المقصود بتنزیله ذالك

حدیث کی ایک قسم وہ ہے جس کا نام حدیث قدسی ہے اور یہ وہ ہے جس میں کلام الٰہی کا بیان ہوتا ہے اور اس کے کسی جزء کو اس طرح بطور معجزہ پیش نہیں کیا جاتا جیسے کہ قرآن کو معجزہ ہی کے طور پر نازل کیا گیا ہے۔ (جذہرہ عزیزہ شرح وجزہ ص ۹)

ابھی تک وہی فرق دکھایا گیا ہے جو ہم ابھی درج کر چکے ہیں اس کے بعد فرماتے ہیں:

ولا یخفی قید الحکایة مغن عن ذکر التحدی لا خراج القراٰن فانّه لیس فی مرتبة الحکایة اَللّٰهُمَّ الاانّ یرادان قراءة النّبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنفسها حکایة فلابُدّ من التقیید به لیجدی خروجه

اور واضح ہونا چاہئے کہ کلام الٰہی کے بیان کی لفظ قرآن مجید سے حدیث قدسی کا فرق ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے اس لئے کہ قرآن خود کلام الٰہی ہے نہ کہ کلام الٰہی کا بیان، وہاں کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرآن کو پڑھنا خود کلام الٰہی کا بیان ہے لہٰذا حدیث قدسی کی تعریف میں معجزہ کے طور پر نہ ہونے والی قید قرآن سے امتیاز کے لئے ضروری ہے۔ (جذہرہ عزیزہ شرح وجزہ ص ۱۰)

مگر میری نظر میں جس پہلو کی طرف تاج العلماء طاب ثراہ کا ذہن متوجہ ہوا ہے کافی وزن رکھتا ہے۔

قرآن کے سنانے اور حدیث قدسی کے بیان کرنے کی نوعیت میں فرق ہے اس کے سمجھنے کے لئے انسان کو اپنے درمیانی نامہ و پیام کی نوعیّت پر نظر ڈالنا چاہئے۔ اس وقت حقیقت حال کے ذہن نشیں ہونے میں آسانی ہوگی۔

ہم اپنے کسی عزیز دوست خاص یا معتمد ملازم کے ذریعہ سے کوئی پیغام بھیجتے ہیں کہ ہماری طرف سے یہ بات فلاں شخص تک پہنچا دو۔ یہاں سفارش کا تعلق درحقیقت ہمارے ذہنی مطلب ومقصد سے ہے۔ الفاظ اس کے اظہار کا ناگزیر ذریعہ ہیں اس لئے وہ جب یہ کہے کہ فلاں شخص

نے آپ کے پاس یہ پیغام بھیجا ہے تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ الفاظ بالکل وہی ہوں جو ہمارے لب و ذہن سے نکلے تھے بلکہ بعض اوقات اسے الفاظ کی تبدیلی ضروری ہوگی۔ جیسے اس وقت کہ جب ہماری اور ہمارے اصل مخاطب کی زبان مختلف ہو اور ہمارا پیغام رساں دونوں زبانوں سے واقف ہو تو ہم اس سے اپنا مطلب اپنی زبان میں کہیں گے لیکن اسے اصل مخاطب سے ہمارا مقصد اس کی زبان میں کہنا ہوگا۔ یہاں اس کلام کی نسبت ہماری طرف دے دی جائے گی یعنی وہ فارسی میں کہے تو یہی کہے گا کہ ''فلانی بشما گفتہ است'' اور اردو میں پہنچائے تو کہے گا کہ ''فلاں شخص نے آپ سے کہا ہے''۔

اگرچہ ہم نے اردو یا فارسی میں نہیں بلکہ اپنی بات کو مثلاً عربی میں کہا ہے مگر چوں کہ یہاں الفاظ کا سفارت کے مفاد میں دخل نہیں ہے اس لئے اس کا دوسری زبان میں اس بات کے پہنچانے پر بھی ہماری طرف یہ نسبت دینا کہ انہوں نے آپ سے یہ کہا ہے درست ہوگا۔ یہ ہوتا ہے ''پیغام''، جس میں ''نقل بالمعنیٰ''، یعنی اصل مقصود کو جدا گانہ لفظوں میں بیان کرنے کی سفیر کو گنجائش حاصل ہے۔

دوسری صورت ہوتی ہے ''نامہ'' کی۔ اس کی نوعیت مختلف ہے۔ یہاں معانی کو الفاظ سمیت نقوش کے طلسم میں محفوظ کیا جاتا ہے اور انہی الفاظ کو مکتوب الیہ تک پہنچانے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

یہاں اگر ہمارا قاصد خط کو پھاڑ ڈالے اور دوسرا خط اسی مضمون کا تحریر کردے یا اس کے مطلب کو بلا کم وکاست زبانی جا کر بیان کردے تو وہ کسی طرح اپنے فرض کو انجام دینے والا اور سفارت ادا کرنے والا نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ وہ خیانت مجرمانہ کا مرتکب اور بددیانتی کا ملزم ہوگا۔

زبانی کام میں بھی یہ صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب کہ غرض کسی نہ کسی طرح الفاظ سے متعلّق ہو جائے مثال کے طور پر یہ ہے کہ ہمارے دوست نے ہم سے ایک دعا دریافت کی تھی ہم نے کسی شخص سے جو وہاں جا رہا تھا، کہا کہ ''تم ان سے کہہ دینا کہ آپ صبح اُٹھ کر یہ دُعا پڑھ لیا کیجئے''۔

یہاں اس جملہ تک کہ آپ صبح اٹھ کر یہ دعا پڑھ لیا کیجئے۔ پہلی قسم کے پیغام کی حیثیت ہے جس میں درمیانی شخص کو الفاظ میں تغیر وتبدیل کا حق ہے لیکن جہاں سے وہ دعا شروع ہوئی ہے۔ پھر درمیانی شخص کو کسی تبدیلی کا اختیار نہیں ہے۔ اگر اس نے اس میں کوئی کمی یا زیادتی کی تو وہ ناقابل اعتبار سمجھا جائے گا۔

دوسری مثال: ہمارے کسی شاگرد نے کوئی شعر سنایا تھا اور اصلاح چاہی تھی یا ہم نے خود اس کا شعر سن کر اسے پسند نہیں کیا، ترمیم ضروری سمجھی، ایک درمیانی شخص سے جو جا رہا تھا ور شعر یاد رکھنے اور سمجھنے سمجھانے کے قابل تھا، ہم نے کہا کہ فلاں شخص سے کہہ دینا کہ آپ اپنے شعر کو اس طرح بنا لیجئے۔

یہاں اتنے الفاظ میں کہ ''آپ اپنے شعر کو اس طرح بنا لیجئے'' درمیانی شخص کو تغیر وتبدیل کا حق ہے۔ مثلاً وہ کہہ دے کہ آپ اپنے شعر میں اس طرح اصلاح کر لیجئے۔ اس طرح ترمیم کر دیجئے وغیرہ وغیرہ لیکن اصل شعر میں وہ کچھ تغیر وتبدیل کر دے، یہ جائز نہ ہوگا۔ اُس کو اُسے اُنہی الفاظ میں پہنچانا چاہئے جو ہم نے اس کے لئے بتلا دیئے ہیں۔

جب یہ دو نوعیتیں معلوم ہو گئیں تو اب ''حدیث قدسی اور قرآن'' کا فرق سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔

''حدیث قدسی'' اللہ کا پیغام ہے جو رسول تک پہنچتا تھا اور پیغمبر اس ارشاد الٰہی کو نقلِ قول کے طور پر دوسروں سے بیان فرماتے تھے اس کی نوعیت پہلی قسم کی ہے اور قرآن کی نوعیت دوسری قسم کی ہے۔ یہاں اصل الفاظ ہیں جو بحیثیت کلام الٰہی رسول پر اترے ہیں یہاں پیغمبر کا کام

ان الفاظ کو بجنسہٖ خلق تک پہنچا دینا ہے جیسے کسی نامہ نویس کا خط پڑھ کر سنایا جائے یا بلاتشبیہ کسی شعر کو محفل میں یا کسی شخصِ خاص کے سامنے پڑھا جائے اس کی حیثیت اس کی طرف سے کسی پیام کو پہنچانے کی نہیں بلکہ اس کے کلام کو پیش کر دینے کی ہوتی ہے۔

''حدیث قدسی''میں پیغمبرؐ راوی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لئے ہم نے ''مسانیدِ معصومین''میں ''احادیثِ قدسیہ''کو''مسند النبی'' کے عنوان کے ماتحت درج کیا ہے اور قرآن مجید میں پیغمبر کی حیثیت راوی کی نہیں ہے بلکہ قارئین کلام کی ہے جو پہلی وحی ''اقراء'' کا منشاء تھا۔

حدیث نبوی اور حدیث قدسی:

ہاں اب ایک چیز ابھی باقی ہے اور وہ یہ کہ خود حدیثِ رسولؐ اور احادیث قدسیہ میں کیا فرق ہے۔ جبکہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى کی بنا پر آپؐ کے تمام ہی ارشادات بربنائے وحی ہوتے تھے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اپنے احادیث میں پیغمبر راویٔ کلام الٰہی نہیں بلکہ خود متکلم ہیں لیکن بمنشائے قدرت یا حکم ربانی سے۔

اب چوں کہ تین چیزیں سامنے آگئیں:

(۱) حدیث رسولؐ　(۲) حدیث قدسی　(۳) قرآن مجید

حسب ذیل مثال سے غالباً ان تینوں کا فرق واضح ہو جائیگا۔

آپ نے کسی عالم سے جا کر اپنے دوست کی پریشانی کا تذکرہ کیا، انہوں نے کہا کہ آپ میری طرف سے اپنے دوست سے کہیے کہ وہ روز یہ دعا پڑھا کریں اور وہ دعا آپ کو لکھوا دی یا زبانی یاد کرا دی۔

اب آپ اپنے دوست کے پاس گئے ان سے کہا:''آپ کی پریشانی دور کرنے کیلئے میں آپ کے لئے بہت اچھا نسخہ لایا ہوں۔ فلاں صاحب سے میں نے آپ کا تذکرہ کیا تھا، انہوں نے ارشاد کیا کہ تم ان سے کہہ دو کہ آپ صبح اٹھ کر یہ دعا پڑھ لیا کریں، اس کے بعد آپ نے وہ دعا سنادی۔ کلام آیا ہے آپ کی زبان پر مگر اس میں تین قسم کی چیزیں ہیں۔ شروع میں خود آپ کا کلام ہے۔ اس کے بعد ان کا پیغام ہے جن میں آپ اس مضمون کو پہنچانے کے ذمہ دار ہیں۔ ان میں الفاظ کی خصوصیت نہیں ہے اس کے بعد وہ دعا جو بتانے کی ہدایت ہوئی ہے وہ تیسری قسم کی چیز ہے جس میں الفاظ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ پیغمبر خدا مجمع میں کھڑے ہوئے اور فرمایا:

قد جئتکم بخیر الدنیا والآخرۃ　میں تمہارے پاس دنیا و آخرت کی بہتری لے کر آیا ہوں۔

یہ الفاظ ''حدیثِ نبوی'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب مثلاً آپ نے فرمایا، کہ اللہ نے مجھے بڑا رُتبہ دیا ہے اور مجھ سے ارشاد فرمایا ہے کہ:

لو لاك لما خلقت الافلاك　اگر آپ نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو بھی پیدا نہ کرتا۔

ہوئی ''حدیث قدسی'' اور اب آپؐ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھ پر یہ کلام نازل فرمایا ہے اور اس کے بعد مثلاً آپؐ نے سورہ مزمل پڑھنا شروع کر دیا تو یہ ہے قرآن۔

یہ سب کچھ دنیا کے گوش زد آپؐ ہی کی زبان مبارک سے ہوتا ہے مگر نوعیت میں ان تینوں چیزوں کی فرق ہے۔

ان تمام قسموں کے الفاظ جب خود پیغمبر خدا ﷺ کی زبان پر جاری ہوتے تھے اور آپؐ سے سننے والوں کے گوش زد تو مقام حقانیت میں ان میں کوئی فرق نہیں تھا اور ہر ایک اس مضمون کے لئے جس سے متعلق ہو دلیل قطعی کی حیثیت رکھتا تھا۔

مگر چوں کہ قرآن مجید میں الفاظ کی خصوصیت تھی، نماز میں اس کا پڑھنا جز ولازم کی حیثیت سے ضروری تھا اور یوں مختلف اوقات میں بھی اس کی تلاوت کو عبادت قرار دیا گیا تھا اس لئے اس کی بعینہٖ حفاظت کا اہتمام زیادہ ہوا۔ اسے بروقت صحابہ سے قلم بند کرایا گیا اسے بکثرت افراد نے کُلاًّ یا جُزءً حفظ کیا اس لئے اسے تواتر کا ایسا درجہ حاصل ہوا کہ وہ بحیثیت سند بھی قطعی قرار پا گیا۔ احادیث کو کسی عقیدہ یا حکم شرعی کی سند میں پیش کیا جاتا ہے تو نہیں کم اشخاص نے سنا اور ان سے بھی کم تر اشخاص نے حفظ کیا اس لئے مقام اثبات میں باعتبار سند ان کو وہ قطعیت حاصل نہ ہوئی اور ان میں راویوں کے جانچ پڑتال کا سوال پیدا ہو گیا جس میں احادیث قدسیہ اور احادیث نبویہ بالکل یکساں حیثیت رکھتے ہیں اور اس لئے سوائے شیخ حر عاملی کی کتاب کے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، یا بعض علمائے اہل سنت کی دو ایک کتابوں کے جنہوں نے احادیث قدسیہ کو جمع کیا ہے۔ ان کے علیحٰدہ مجموعے بھی تیار نہیں ہوئے بلکہ دوسرے احادیث ہی کے ساتھ ان کی بھی متفرق طور پر اندراج ہو گیا۔

قرآن کے اصطلاحی معنیٰ:

قرآن مجید کے یہ اصطلاح معنیٰ کہ ''وہ کلام جو بطور وحی حضرت رسولؐ خدا پر بحیثیت معجزہ اتارا گیا ہے'' ایک ایسے ساری وجاری مفہوم کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے لحاظ سے کُل اور جُزء کم اور زیادہ یہاں تک کہ ایک آیت بلکہ بعض اجزائے آیت بھی ''قرآن'' کا مصداق ہیں بلکہ ایک لفظ پر بھی جبکہ اس کا لکھا جانا جز و قرآن ہونے کے قصد سے معلوم ہو اس لئے فقہ کی رو سے بغیر طہارت اس کا مس کرنا بھی حرام ہوگا لیکن جیسا کہ صاحب معالم کو اس حقیقت کی طرف توجہ ہوئی ہے بظاہر دوسری وضع کے ساتھ یہ لفظ اس پوری کتاب کے نام کے لئے معیّن ہوئی ہے جو اس وحی کے اجزاء کا مجموعہ ہے۔ اس طرح ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت اور ایک ایک سورہ کو پہلے معنیٰ کے لحاظ سے قرآن کہنا درست ہے اور دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے جزء قرآن۔

ہمارے گذشتہ بیان سے یہاں تک یہ پتہ چلا کہ قرآن کے لغوی و اصطلاحی سب ملا کر تین معنیٰ ہیں۔ ایک بمعنی مصدر یعنی جمع کرنا یا محفوظ کرنا۔ دوسرے وہ ساری وجاری عام مفہوم جس کے لحاظ سے ایک ایک جملہ اور ایک ایک حرف قرآن ہے۔ تیسرے اس پوری کتاب کا نام خود قرآن کریم میں لفظ قرآن کے ان تینوں معنوں کی سند موجود ہے۔

(۱) اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ.

یہاں لفظ قرآن کی اضافت کتاب کی طرف اور جمع پر عطف بتا رہا ہے کہ اس کے معنیٰ مصدری یعنی ضبط و حفظ مراد ہیں۔

(۲) اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ (سورۂ واقعہ)

یہاں قرآن وہی جامع اور عام مفہوم مراد ہے جو جزء و کل سب پر صادق ہے اور اسی لئے بغیر طہارت مس کرنے کی ممانعت کل قرآن سے مخصوص نہیں بلکہ اجزاء قرآن میں ثابت ہے۔

(۳) وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ (سورۂ حجر)

ہم نے آپ کو عطا کیں سات دو رنگ والی آیتیں اور قرآن عظیم

یہاں قرآن کا اطلاق مجموعہ کتاب پر ہے جس سے سورہ حمد کا صرف بنظر اہمیت و خصوصیت الگ کرکے ذکر کیا گیا ہے اور قرآن کے اسی لحاظ سے حضرت علیؑ کا قول وارد ہوا ہے کہ جو کچھ قرآن میں ہے وہ سورہ حمد میں ہے جس کی تشریح انشاء اللہ سورہ حمد کی تفسیر میں سامنے آئے گی۔

دوسرا تبصرہ

کلام الٰہی کے معنی اور قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا معرکہ

چوں کہ یہ دونوں مسئلے مبادی و مقدّمات کے لحاظ سے ایک ہی بنیادی اساس پر مبنی ہیں اس لئے ہم ان کو سمو کر عام فہم طور پر واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے لئے ذیل کے دو مقدموں کا سمجھنا ذہن نشین کرنے کے لئے ضروری ہے۔

(۱) صفات ثبوتیہ:

سنی اور شیعہ دونوں کے علم کلام کی کتابوں بلکہ چھوٹے دینیات کے رسالوں تک میں ’’اللہ کے صفات‘‘ کا ذکر ہوتا ہے اور بچوں کو یاد کرایا جاتا ہے کہ اللہ کے اتنے ’’صفات ثبوتیہ‘‘ ہیں یعنی وہ باتیں جو خدا میں پائی جاتی ہیں اور اتنے ’’صفاتِ سلبیہ‘‘ ہیں یعنی وہ باتیں جو خدا میں نہیں پائی جاتیں۔

صفات ثبوتیہ کی تعداد آٹھ بتائی جاتی ہیں اور ان میں عالم، قادر، حیّ، مرید مدرک وغیرہ کے ساتھ متکلم بھی آتا ہے

(۲) صفات الٰہی کے بارے میں اختلاف

صفات الٰہی کے بارے میں شیعی نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ عین ذات ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بس ذات الٰہی ہے جس کے کمال کے مختلف پہلوؤں کی تعبیر مختلف صفات سے ہوتی ہے اس طرح بس مقام لفظ میں ذات کے علاوہ کچھ صفات ہیں مگر مقام حقیقت میں ذات کے علاوہ صفات کوئی چیز نہیں ہیں۔ جیسا کہ امام الاٰلٰہیّین حضرت علی ابن ابیطالبؑ کا ارشاد ہے جو نہج البلاغہ کے پہلے ہی خطبہ میں درج ہے کہ:

من كمال الاخلاص له نفي الصفات عنه لشهادة كل صفة أنّها غير الموصوف و شهادة كل موصوف أنّهٗ غير الصفت.

اللہ کی خالص توحید کی تکمیل اس سے ہے کہ اس سے صفات کی نفی کرے کیونکہ موصوف اور صفت کے الفاظ باہم مغایرت کا پتہ دیتے ہیں اور اللہ میں ذات سے مغایر کوئی چیز نہیں ہے۔

اہل سنّت قائل ہیں کہ یہ آٹھ صفتیں ذات کے علاوہ وجود رکھتی ہیں۔ اس طرح ایک ذات الٰہی ہے اور آٹھ صفتیں اور یہ سب قدیم ہیں یعنی ان کی ہستی ہمیشہ سے ہے۔ کیونکہ اگر ان کا وجود عدم کے بعد مانا جائے تو وہ مخلوق ہوگی اور اس طرح ان کی خلقت کے پہلے اللہ نہ عالم ہوگا نہ قادر ہوگا، نہ حیّ ہوگا، نہ مدرک ہوگا وغیرہ وغیرہ

نتیجہ:

ان دونوں مقدموں سے اہل سنت کے نقطۂ نظر سے نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ کلام الٰہی قدیم ہے کیونکہ وہ خالق کی صفت ہے اور جتنے صفات الٰہیّہ ہیں وہ قدیم ہیں اور قرآن ہے کلام اللہ لہٰذا قرآن کو مخلوق کہنا کفر ہے۔

کلام الٰہی کیا ہے؟

اب دیکھنا ہے کہ کلام جو اللہ کی صفت ہے اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

"ہمارا کلام" ہمارے لب و دہن سے نکلتی ہوئی آواز ہے جو مختلف مقاطع پر رکتی ٹھہرتی، بڑھتی گھٹتی ہوئی مختلف حروف کی تشکیل کرتی اور ان سے مختلف الفاظ کی صورت گری کرتی ہے اس کی سیّال ہستی ہے۔ وہ بے ثبات وجود رکھتا ہے اس کا ہر دوسرا جزء بغیر پہلے جزء کے فنا ہوئے آنہیں سکتا۔ اس کا ہر حاضر بات کہتے کہتے غائب اور ہر حال زبان ہلانے کے ساتھ ماضی ہو جاتا ہے۔

ہمارا وجود غیر مستقل ہے اور ہماری ہستی خود نفس کے آمد و شد کی رہینِ احسان ہے۔ اس لئے ہمارا کلام بھی یہ ہوسکتا ہے۔ ہم اعضاء و جوارح کے پابند ہیں، ہم جسم و جسمانیات سے بے نیاز نہیں ہیں۔ اس لئے ہماری زبان بھی، تالو بھی، حلق بھی ہے اور حنجرہ بھی، ذہن کی فضا بھی ہے اور اس میں آواز بھی حادث ہیں تو محلِّ حوادث بھی، اس لئے ہمارا کلام وہی ہے جو ہمارے دہن سے نکلے ہماری زبان سے صادر ہو اور ہماری آواز کے ساتھ مخاطب کے گوش گزار ہو۔

"خدا کا کلام" بھی اگر اسی حیثیت سے سمجھا جائے تو اس میں اور ہم میں فرق کیا رہا۔ غیر مستقل وجود کے ساتھ فوراً ہی سپردِ عدم ہو جانے والے الفاظ آواز کے اتار چڑھاؤ کی پیداوار، ان کا مرکز ذات احدیت ہو تو وہ خود تغیر سے بری حوادث کے دسترس سے بلند و برتر قدیم و سرمدی کب رہ جائے گا؟

وہ محل حوادث ہو تو عقلی طور پر خود بھی حادث قرار پائے گا۔

اس لئے کسی باہوش انسان کی یہ مجال نہیں کہ وہ خدا کے کلام کے معنی اس کے دہن سے نکلے ہوئے الفاظ و کلمات قرار دے۔ پھر اس کا کلام کیا ہو سکتا ہے؟

فرقۂ اشاعرہ نے جس کے معنی اب جمہور اہلسنت کے ہیں (کیونکہ ان میں کا دوسرا فرقہ یعنی معتزلہ اب تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اس کا دنیا کے کسی خطہ میں غالباً وجود نہیں ہے) اس کا حل "کلام نفسی" کی صورت میں تجویز کیا۔

کلام نفسی کا تصور:

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ الفاظ و کلمات کا سلسلہ جو ہماری زبان پر آتا ہے یہ پورا سلسلہ اسی شکل و صورت میں ہمارے ذہن کے اندر موجود ہوتا ہے۔ خدا چوں کہ زبان و دہن نہیں رکھتا، اس لئے یہ صدائیں اس کی ذات میں نہیں پائی جاسکتیں، مگر یہ اندرونی قسم کا سلسلہ کلام کا اس کی ذات میں اس کے علم و قدرت کی طرح ازل سے موجود رہتا ہے۔ یہ اصل میں خالق کی صفت ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قدیم ہے۔

یہ امکانی حد تک ان کے مسلک کی تشریح ہے جو ان کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے۔ علّامہ نیشاپوری "غرائب القرآن" میں لکھتے ہیں:

منکرو الکلام النفسی اتفقوا علی اَنّ الکلام اسمہ لھذا الالفاظ و الکلمات والاشاعرۃ یثبتون الکلام النفسی و یقولون اَنّ الکلام لفی الفؤاد و انما جعل اللسان علی الفؤاد دلیلا.

کلامِ نفسی کا انکار کرنے والے اس پر متفق ہیں کہ کلام ان الفاظ اور کلمات کا نام ہے اور اشاعرہ کلام نفسی کو ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں

کہ اصل کلام دل میں ہوتا ہے اور زبان تو بس اس دل والے کلام کو ظاہر کرنے والی قرار دی گئی ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ اصلاً علم کلام کی بحث ہے جو الٰہیات سے متعلق ہے اس لئے یہاں اس کی مکمل جانچ نہیں ہوسکتی مگر جہاں تک ہمارے موضوع کتاب سے تعلق ہے، یہ سوال ضرور اہمیت رکھتا ہے کہ بالفرض یہ کلام نفسی جو ازل سے موجود بتایا جاتا ہے، بجائے خود کوئی معقولیت رکھتا ہو مگر جس بناء پر خالق کو متکلم ماننے کی ضرورت ہے یعنی ارشاد قرآنی۔

كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿١٦٤﴾

اللہ نے موسیٰؑ سے پورے طور پر کلام کیا۔ (سورۂ نساء)

تو آخر اس ازلی وجود کو جو ذات کے ساتھ تھا، طور پر جانے کے بعد موسیٰؑ سے کیا تعلق پیدا ہوا جو وہ اس وقت سے کلیم اللہ قرار پائے اور اس کلام ازلی کا آخر میں حضرت پیغمبر خدا ﷺ سے کیا ربط قائم ہوا جس سے قرآن جو حضرت پر باقساط پورے دَورِ رسالت میں تدریجی طور پر نازل ہوا کلام اللہ ہو گیا۔

شیعی نقطۂ نظر

شیعہ بنیادی حیثیت سے شروع سے آخر تک ان نظریات کے خلاف ہیں۔ ہم تو ذات الٰہی کو قدیم ہونے میں یکتا اور ازلی ہونے میں لاشریک جانتے ہیں۔ ہم اس کی ذات کے لئے صفات قرار ہی نہیں دیتے جو اس کی ذات کے علاوہ قدامت کا درجہ رکھتے ہوں تو کلام کو کسی بھی معنی میں اس کی ذات میں قائم کیوں کر مان سکتے ہیں۔

ہم خدا کے متکلم ہونے کے معنی صرف یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خالق کلام ہے اور جس کلام کو وہ اپنی طرف انتساب کے ساتھ خلق فرمائے وہ اس کا کلام قرار پاتا ہے۔

اب یہاں جبر و اختیار کی منزل میں چوں کہ ہمارا اور اہلسنت کا راستہ الگ الگ ہے، لہٰذا ہماری اس تشریح میں کہ خدا خالق کلام ہوتا ہے انہیں کوئی خصوصیت محسوس نہ ہوگی۔ وہ کہیں گے کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ خدا ہر اس گفتگو کا جو کسی انسان کی زبان سے صادر ہوتی ہے، خالق ہے، لہٰذا یہ سب ہی کلام کلام اللہ قرار پاتا ہے لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ ہم انسانوں کے ذاتی افعال واقوال کا ذمہ دار خود انسانوں کو سمجھتے ہیں اور ان کا وجود میں لانے والا خود انہیں کو جانتے ہیں ان کو اللہ کے ساتھ اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ اعضاء و جوارح اور آلات و ذرائع جن سے اعمال و اقوال صادر ہوتے ہیں، خدا کے مخلوق ہیں لیکن ان افعال واقوال کا خود صدور ہرگز خداوند عالم کی ایجاد و تخلیق کا نتیجہ نہیں۔

اس طرح یہ دائرہ بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے علاوہ ایک قید ہم اور لگا چکے ہیں۔ خدا کا کلام وہ سمجھا جائے گا جو انسانی ارادہ و اختیار کار گزاری اور صناعی سے خارج ہو اور پھر خداوند عالم کی طرف سے بحیثیت متکلم اس کا استناد نمایاں ہو۔ لہٰذا گر آواز اس کی قدرت خاص سے کسی شئے میں پیدا ہوئی مگر نسبت اس کی اللہ نے اپنی طرف نہیں دی تو وہ باوجود مخلوق الٰہی ہونے کے منسوب اسی شئے کی طرف ہوگی جس میں وہ آواز پیدا ہوئی ہے۔ جیسے سنگریزوں کا دست رسالت مآبؐ میں تسبیح پڑھنا سوسمار کا آپ کی رسالت کی گواہی دینا وغیرہ۔ (جیسا کہ بعض روایات میں ہے)۔ یا بچہ کا پاک دامنی یوسفؑ کی گواہی دینا۔ (جیسا کہ قرآن مجید میں مذکورہ ہے مشہور تفسیر کی بناء پر) اور حضرت داؤدؑ کے ساتھ دیوار و در، صحرا و فضا کا مشغول حمد و تسبیح ہونا، اس سب کو کلام الٰہی کہنا درست نہ ہوگا۔ بلکہ اسے یوں کہا جائے گا کہ سنگریزوں نے قدرت خدا سے تسبیح کی، بچہ نے قدرت خدا سے گواہی

دی، دیوار ودر نے قدرت خدا سے حمد وتسبیح ادا کی۔ ان سب کو کلام الٰہی کہنا درست نہ ہوگا۔ بلکہ اسے ہم یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں براہ راست کلام خلق نہیں کیا جاتا بلکہ اس شئے میں کلام کرنے کی طاقت خلق کی جاتی ہے جس کی بناء پر کلام وہ خود اسی شے کا ہوتا ہے، خدا کا کلام نہیں ہوتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خداوند عالم نے وہ کلام اپنی طرف نسبت کے ساتھ خلق فرمایا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت حق سبحانہ تعالیٰ نے اس شئے کو اپنا ترجمان قرار دیتے ہوئے جو بات اسے کہنا تھی اسے بطور آواز اس شئے میں خلق کردیا۔ جیسے درخت میں سے آواز موسیٰؑ کے لئے اِنّی آنَا رَبُّكَ... الی آخرہ بے جان چیز کی آواز ہوبہو، خدا کی قدرت خاص کا نتیجہ۔ پھر طرز کلام، لب ولہجہ، عنوان تخاطب سے ظاہر کہ آواز کا محل درخت ہے مگر کلام کسی اور کی طرف سے ہے۔ نہیں تو درخت خود خدا ٹھہرتا۔ موسیٰؑ کا پروردگار خود درخت بن جاتا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ معرفت رکھتے تھے۔ درخت کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئے۔ سمجھے کہ درخت مجازی پردہ ہے جس میں متکلم حقیقت اپنی خلق کی ہوئی آواز کے ساتھ مصروف کلام ہے۔ یہ خدا کا پہلا کلام تھا اور اس کے بعد بھی جب گفتگو ہوئی تو ایسی ہی کسی شئے کے ذریعہ سے جس طرح طُور پر گفتگوئیں ابر کی صورت سے ہوئی تھیں، جیسا کہ توریت میں تذکرہ ہے۔

یہ صورت وہ تھی جہاں کلام کا مظہر بےشعور وارادہ ناقابل تکلم شئے ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کلام کسی ذی شعور باارادہ واختیار، قابل نطق وتکلم انسان کی زبان پر آئے اور ہمارے گوش زد ہو، مگر کلام ایسا ہو کہ جو اس انسان کے ارادہ واختیار کا نتیجہ قرار نہ پاسکتا ہو اور وہ کہتا بھی ہو کہ یہ میرا کلام نہیں ہے بلکہ اس کا انتساب خالق کی جانب ہو تو یہ کلام بھی خداوند عالم کا کلام قرار پائے گا جس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس نے اپنے کلام کا حامل وترجمان اس انسان کو قرار دیا ہے۔

اب عقلاً اس کی کئی صورتیں متصور ہیں۔

ایک یہ کہ براہ راست اس رسول کی زبان پر اس کلام کو خلق فرمائے لیکن اس کے لئے ضرورت ہوگی کہ وہ کچھ عرصہ تک رسول کی زبان اور ان کے دل ودماغ سے ذاتی ارادہ واختیار کو سلب کرکے اسے مسخر بنانے اور قہری وغیر اختیاری طور پر کچھ الفاظ کو ان کی زبان پر جاری کرے اس لئے کہ اگر ارادہ واختیار باقی رہا اور اس کی شرکت سے کلام ظہور میں آیا تو وہ اس انسان کا کلام ہوگا نہ کہ اللہ کا کلام۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی غیر ذی روح ہستی مثلاً دیوار ودر پتھر وغیرہ میں خلق کیا جائے اور رسول کے گوش گزار ہو۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کلام قدرت کی طرف سے عالم اعلیٰ کے کسی محل میں خلق ہو اور پھر کسی ذریعہ سے رسول تک پہنچایا جائے۔

پہلی صورت ایک کامل انسان اور مصلح خلق کے لائق نہیں ہے کیوں کہ ایک صاحب شعور واختیار کا ایک وقت میں اپنی زبان پر بالکل بےقابو ہوجانا کمال انسانی کے خلاف ہے۔ پھر یہ کہ حکمت الٰہی کے اقتضا سے رسولؐ کی تبلیغ وتعلیم مصلحت وقت کے لحاظ سے ہونا ضروری تھی۔ اس لئے کلام الٰہی کے اجراء کے لئے ایسی صورت ہونا چاہئے تھی کہ اس کا پہنچنا رسولؐ تک ہر وقت اور ہر موقع پر ہوسکتا ہو اور آپؐ کی زبان سے اس کی تبلیغ اشخاص اور حالات کو دیکھ کر محدود یا غیر محدود طور پر ہوا کرے۔ یہ بات پہلی صورت میں نہیں ہے اسی طرح دوسری صورت میں بھی یہ بات پورے طور پر حاصل نہیں ہوسکتی۔

بنی اسرائیل کے ضروریات محدود تھے حضرت موسیٰؑ کے لئے ایک خاص وقت کا تقرر ہوگیا کہ وہ طور کی چوٹی پر چلے جاتے تھے۔ ابر آتا اور اُن تک کلام پہنچتا۔ اب وہ واپس آکر جن جن باتوں کی تبلیغ کی ضرورت ہوتی اپنی امت کو تعلیم دیتے تھے۔

ہمارے رسولؐ کے لئے یہ بات نہیں ہوسکتی تھی۔

ان کو دین و دنیا کی ضروریات پر حاوی ایک نظام کا حامل بنایا گیا تھا اس لئے ان میں اور افراد خلائق میں ہر وقت رابطہ قائم رہتا تھا اور طرح طرح کے اشخاص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھیرے رہتے تھے اور خلوت، جلوت، سفر و حضر، منزل و طریق ہر موقع و محل پر کلام الٰہی کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچنے کی ضرورت تھی لہٰذا کسی جسمانی چیز ا ور دیوار و در، درخت اور پتھر، ہوا و اَبر میں ---آواز کا پیدا کرنا حکمت ربانی کے خلاف تھا۔ اس لئے آپؐ کے لئے کلام الٰہی پہنچانے کا تیسرا طریقہ اختیار کیا گیا۔

الفاظ کی خلقت اور وہ بھی ضروری نہیں کہ آواز کی صورت میں ہو بلکہ ہوسکتا ہے کہ یہاں مبدا خلقت میں نقوش ہی پیدا کئے گئے جو آواز نہیں ہوتے بلکہ آوازوں کی علامت ہوتے ہیں اور اسی کے اعتبار سے اس کلام کا نام ''کتاب'' ہوا ہوا اور اس کتاب کو قرآن میں ''مکنون'' (چھپا ہوا) کہا گیا ہوا اور اس کے محل کا نام ''لوح'' بتایا گیا اور تحریر چوں کہ ''قلم'' سے وابستہ ہوتی ہے لہٰذا قرآن میں سب سے پہلے وحی میں اس کا ذکر آیا کہ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ''قلم کے ذریعہ سے اس نے علم کا سرمایہ فراہم کیا۔

اور حدیث میں آیا۔

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ سب سے پہلے جسے اللہ نے پیدا کیا وہ قلم ہے

اور یہ بات ہے کہ اس ملاء اعلیٰ کی چیزوں کو پوری نوعیت و کیفیت کو اس عالم مادی میں محصور ہونے کی حالت میں ہم نہیں سمجھ سکتے۔

کال کوٹھری میں پیدا ہو کر آنکھ کھولنے والا ''صحن'' ''میدان'' صحرا اور فضا'' کو لفظاً سن سکتا ہے اور اجمالی طور پر (بشرطیکہ کہنے والے پر اعتماد رکھتا ہو) اتنا سمجھ بھی لے گا کہ یہ سب چیزیں ضرور کچھ ہیں، کیا ہیں۔ اس کا نہ وہ صحیح تصور کرسکتا ہے نہ اسے ان چیزوں کا تصور کرایا جا سکتا ہے ایسے ہی بیت معمور، لوح محفوظ، لوحِ محو و اثبات وغیرہ سب غیبی نام کی چیزیں ہیں جن کو اجمالی طور پر کہنے والے (معصوم رہنمایانِ دین) پر اعتبار (ایمان) کی شرط کے ساتھ ماننا ضروری ہے مگر ان کی حقیقت کے سمجھنے کا مطالبہ ایک دور از کار بات ہے۔

بہرحال یہ یقینی ہے کہ وہ لکڑی، تانبے، لوہے یا سونے، چاندی کی کوئی تختی نہیں ہے بلکہ وہ عالم روحانیات سے متعلق چیز ہے۔ آسمانی فرشتوں کے پڑھنے کے قابل وہ قرآن کا مرکز اول ہے جہاں قرآن کا وجود پہلے ہو چکا۔

نزول قرآن کے معنی

پھر جب رسولؐ مبعوث بر سالت ہوئے تو موقع و محل کے اقتضاء سے جیسی ضرورت پیش آئی اور جیسا موقع درپیش ہوا ملک مقرب یعنی جبرائیلِ امین رسولؐ تک اس کے پہنچانے پر مامور ہوئے اور اسے نازل ہونا کہتے ہیں۔

وحی کی صورتیں

اگرچہ روایات بتاتے ہیں کہ اکثر جبرائیل امین وحیۂ کلبی کی شکل میں مجسم صورت سے بھی آئے ہیں مگر تنزیل قرآن کے لئے ان کا اس طرح آنا ضروری نہ تھا۔ نہ یہ لازم تھا کہ وہ آواز کے ساتھ رسولؐ کو قرآن کی آیتیں سنائیں بلکہ فرشتہ اپنی مشاہدہ انسانی کے ماوراشکل میں بھی آتا اور پیغمبرؐ کے دل و دماغ سے براہ راست رابطہ قائم کرکے کلام الٰہی پہنچاتا۔ اس لئے قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٣﴾ عَلَىٰ قَلْبِكَ.

اسے جبرائیلؑ امین نے آپؐ کے دل پر اتارا ہے (شعراء۔ ۱۹۳)

جب پیغام زبانی پہنچے ملک کے ذریعہ سے یعنی وہ آ کے کوئی سورہ یا آیت رسولؐ تک پہنچائے، تب بھی وہ کلام الٰہی اس اعتبار سے ہے کہ یہ الفاظ جو ملک کی زبان پر آرہے ہیں وہی ہیں جو دست قدرت سے لوح محفوظ پر تحریر ہوئے ہیں۔

اسی نسبت کے لحاظ سے وہ کلام اللہ ہے اور مرکز اعلیٰ سے وہ بذریعہ ملک آتا ہے۔ رسولؐ تک اس لحاظ سے منزل من اللہ ہے (اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ) اور جبرائیل امین کے ذریعہ سے اترا ہے۔ اس لئے ارشاد ہوا: 'نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ'، اور رسولؐ کے گوش گزار ہونے کی صورت میں وہ جبرائیل کی زبان کا ہے۔ اس لئے اس کی نسبت جبرائیل کی طرف بھی دی گئی ہے۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿١٩﴾ ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ﴿٢٠﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ﴿٢١﴾

لیکن عین اس وقت کہ جب وہ رسولؐ کے گوش گزار ہوتے ہوئے "قول روح الامین" ہے۔ چوں کہ وہ قول ترجمان ہے اسی کلام کا جو خالق متعال کی جانب سے اس سے پہلے وجود میں آچکا ہے۔ وہ کلام جبرائیل نہیں بلکہ کلام رب العالمین ہے۔

خلق قرآن کا معرکہ

ہمارے نزدیک صفات الٰہی میں بحث اور کلام نفسی کے تصور یا عدم تصور کا بھی نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہئے تھا کہ خلق قرآن کا مسئلہ اس طرح نزاع بن جائے جیسا کہ بنا اور جس کی تفصیل بقدر ضرورت ابھی سامنے آئے گی۔

شیعہ نقطۂ نظر سے تو ظاہر ہے کہ ہم متکلم ہونے کے معنی ہی خالق کلام کے قرار دیتے ہیں لہٰذا کسی بھی معنی سے کلام کے غیر مخلوق ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ صفات ثبوتیہ میں اس کا شمار بھی تحقیقی حیثیت سے شیعی مسلک کے لحاظ سے درست نہیں ہے اس لئے کہ توحید کے عنوان کے ماتحت جو صفات بیان کیئے جاتے ہیں وہ صفات ذات ہیں۔ اللہ کا متکلم ہونا جب کہ بمعنی خالق کلام ہے تو وہ صفات افعال میں سے ہے۔ صفات افعال جتنے ہیں وہ اصول دین میں سے دوسری اصل عدل میں مندرج ہیں۔ لہٰذا متکلم مثل رؤف، رحیم، رازق، خالق وغیرہ کے، ان اسمائے حسنیٰ میں سے ہوسکتا ہے جو افعال الٰہی کو ظاہر کرتے ہیں۔

بعض دینیات کی کتابوں میں صفات ذات میں درج کرنے کی معقولیت کے لئے متکلم کے معنی یہ لکھے ہیں کہ وہ جس چیز میں چاہے کلام پیدا کرے یعنی اسے قدرت کی طرف راجع کیا ہے مگر اس صورت میں متکلم کو کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ خالق بھی اس معنی میں صفات ثبوتیہ میں ہونا چاہئے کہ وہ جو چاہے پیدا کرے اور رازق بھی اس معنی سے کہ وہ جسے چاہے رزق دے اور محی اور ممیت، معطی اور صانع، مبدی اور معید وغیرہ بھی۔

اصل یہ ہے کہ یہ آٹھ صفات ثبوتیہ کی فہرست ہمارے ائمہ معصومینؑ یا اُن کے پیرو علماء کی مرتب کی ہوئی ہے ہی نہیں بلکہ ہمارے علماء کو جب علم کلام میں کتابیں لکھنے کا موقع ملا تو اہل سنت کے علم کلام کی کتابیں موجود تھیں جن میں صفات ثبوتیہ کا عنوان قائم کر کے آٹھ صفتیں درج کی گئی تھیں ہمارے علماء کو ان میں سے ہر چیز کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کے اظہار کے لئے تصنیفی حیثیت سے اس کی ضرورت ہوئی کہ وہ ان میں سے ہر عنوان کو بجنسہ ایک سرخی بنا کر اس کے تحت میں جو اپنا نقطۂ نظر اور مخالف افراد سے رد و قدح ہے اسے پیش کریں۔ اس بناء پر ان آٹھ صفات کی سرخیاں قائم کی گئیں اور پھر اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصل حقیقت میں ذات کے علاوہ کچھ صفات ہیں ہی نہیں اور مقام

مفہوم میں تمام صفات کا مرجع صرف دو صفتیں ہیں۔علم اور قدرت باقی سب انہیں کی شاخیں ہیں اور متکلم ہونا جس معنی سے درست ہے وہ صفت ذات نہیں بلکہ صفت فعل ہے جسے بلا وجہ صفات ثبوتیہ میں داخل کر دیا گیا ہے۔یہ صاف صاف شیعی نقطہ نظر ہے۔اب آیئے! اہلسنت کے نقطہ نظر سے دیکھیں۔

قطع نظر اس بنیادی اختلاف سے جو ہمیں ان سے صفات کے بارے میں خاص متکلم کے صفات الٰہی میں درج ہونے کے سلسلہ میں ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں اسمائے الٰہی کے طور پر بحیثیت وصفت جیسے: **الخالق البارى المصور۔ المومن المهيمن العزيز۔ الجبار المتكبر** ہے۔

اس طرح کہیں قرآن میں **المتكلم** کا لفظ نہیں ہے جو کچھ بھی ہے وہ بطور فعل اس کی طرف اسناد ہے جیسے: **كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا**۔ یا بحیثیت اضافت حتّٰی **يسمع كلام الله** تو اب جو شے افعال الٰہی میں داخل ہوتی ہے وہ **كلّم** کا مصدر یعنی **تكليم** اور یہ کام جس شے سے متعلق ہوتا ہے وہ کلام ہے۔تو جس طرح خلق فعل الٰہی ہے جو متعلق ہوتا ہے مخلوق مثلاً **سما وارض** سے تو اس کی وجہ سے **سماء وارض** نہ صفات الٰہی میں داخل ہوتے ہیں نہ ان کے قدیم ہونے کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

عطائے رزق اللہ کا فعل ہے۔ **اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ**. لیکن اس کی وجہ سے وہ اشیاء جو متعلق فعل رزق ہوتے ہیں صفت الٰہی نہیں بنتے۔نہ قدیم قرار دیئے جا سکتے ہیں تو اسی طرح تکلیم ایک فعل ہے جو کلام سے متعلق ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے اس فعل کا متعلق یعنی کلام صفات میں کیوں قرار پائے اور اس کے قدیم ہونے کا تصور کیوں کیا جائے؟

اب جب کہ کلام کے صفت الٰہی ہونے ہی کی از روئے قرآن کوئی بنیاد نہیں ہے تو کلام نفسی کے اختراع کی کوئی ضرورت پیدا نہیں ہوتی لیکن کلام نفسی ماننے کے بعد پھر بھی یہ بات تو متفقہ حیثیت سے تسلیم شدہ ہونا چاہئے تھی کہ یہ الفاظ وکلمات جو مجتمعہ حیثیت سے بحالت موجودہ ''قرآن'' کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں جو کاغذ پر لکھے جاتے ،سینہ میں محفوظ کئے جاتے ، زبان سے پڑھے جاتے ہیں ، یہ حادث ہیں قدیم نہیں۔ اس لئے کہ اگر یہی قدیم ہوتے تو اکثریت کو خدا کے متکلم ثابت کرنے کی غرض سے کلام نفسی کے ایجاد کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔

یہ الفاظ حادث ہیں اور خدا محل حوادث نہیں۔اسی لئے تو کلام نفسی کے تخیل کی ضرورت ہوئی اور جب یہ الفاظ حادث ہیں تو ہر حادث کے لئے موجد اور خالق کی ضرورت ہے۔لہٰذا مخلوق بھی ضرور ہوں گے۔

یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں تھا جس میں خواہ مخواہ کی الجھنیں پیدا ہوتیں لیکن افسوس ہے کہ بحث ونظر کے سد باب اور قوائے عقلی کے تعطل نے جسے قرآن اور تعلیمات نبویؐ کے بالکل برخلاف بظاہر کچھ سیاسی مصالح سے رسالت مآبؐ کے بعد ضروری سمجھا گیا تھا اکثر مسلمانوں کے فکر ونظر کی قوتوں کو اس درجہ بے کار کر دیا تھا کہ وہ معنی اور مفہوم پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے سے قاصر ہو کر الفاظ اور تعبیرات کے غلام ہو گئے تھے۔لہٰذا وہ قرآن کو مخلوق کہنا اس کی توہین سمجھتے اور بہت بڑا جرم خیال کرتے تھے۔

چنانچہ علامہ نیشاپوری نے اپنی تفسیر ''غرائب القرآن'' کے مقدمات میں دسواں مقدمہ اسی بحث میں لکھا اور اس میں تحریر کیا ہے:

ذكر قومه من ائمة الا مة ان كلامه الله تعالىٰ قديمه بعد ان عنوا بكلامه هذه الحروف المنتظمة المسموعة اما ان كلامه تعالىٰ هو هذه الحروف فلقوله تعالىٰ اوان احد من المشركين استجارك فاجره حتىٰ يسمع

کلا مه الله و معلومه ان المسموع لیس الّا من هذه الحروف واما انها قدیمة فلان الکلامه صفة الله تعالی و من المحال قیامه الحادث بالقدیمه و ایضا کل حادث متغیر و التغیر علیٰ ذات الله تعالیٰ و صفاته محال

اسلامی جماعت کے بڑے پیشواؤں میں سے بہت سوں نے کہا ہے کہ اللہ کا کلام قدیم ہے اور پھر کلام سے ہی مرتب حروف مراد لئے ہیں جو سنائی دیتے ہیں۔ یہ کہ کلام الٰہی یہی حروف ہیں، اس آیت سے ثابت ہے کہ قرآن میں ہے ''مشرکین میں سے اگر کوئی آپ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دیجئے۔ یہاں تک کہ وہ کلام خدا سنے اور ظاہر ہے کہ جو چیز سنی جاتی ہے وہ یہی حروف ہیں اور یہ کہ وہ قدیم ہیں اس بناء پر ہے کہ کلام اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور حادث کا قیام قدیم میں محال ہے اور نیز ہر حادث متغیر ہے اور تغیر ذات الٰہی اور اس کے صفات میں محال ہے

اب ملاحظہ کیجئے کہ یہ نقطہ نظر جو بیان کیا گیا ہے اس میں اول اور آخر میں کیسا ٹکراؤ ہے۔ کلام الٰہی یہی حروف ہیں جو سنے جاتے ہیں اور پھر وہ قدیم ہیں اس لئے کہ اللہ کی صفت ہیں یعنی وہ صفت اللہ سے الگ ہو کر ہمارے پردہ گوش سے ٹکراتی ہے یا اللہ سبحانہ (معاذ اللہ) اس صفت سمیت آکر ہمارے آلہ سماعت سے متصل ہوتا ہے۔ پھر یہ حروف اس وقت ہمیں سننے میں آرہے ہیں تو وجداناً وہ حادث ہیں اور حادث ذات الٰہی میں قائم نہیں ہوسکتا۔

پھر بھی یہ ماننا ضرور ہے کہ یہی آوازیں کلام اللہ ہیں اور وہ قدیم ہیں۔

ان تمام باتوں کو بیک وقت قبول کرنا بغیر عقل کو ''خیر باد'' کہے ہوئے کیوں کر ممکن ہے مگر علماء کا جم غفیر بھیڑ یا دھسان طور پر یہ سب مان رہا تھا اور اسے داخل عقائد مسلّمات کر رکھا تھا۔

یہ سادگی کا طلسم مسلّمہ عقیدہ کی صورت میں خاموش اطمینان کے ساتھ قائم رہتا۔ اگر تیسری صدی ہجری کے ابتدائی دور میں مامون الرشید خلیفہ المسلمین عباسی کا ذوق تحقیقی اس کے خلاف مصروف جہاد نہ ہوتا۔ یہ خلیفہ اپنے پیش رَو دوسرے اموی و عباسی خلفاء کے برخلاف لہو ولعب اور عیش و عشرت میں مصروف ہونے کے بجائے ایک حد تک علمی تحقیقات اور وسعتِ علوم وفنون کا دلدادہ تھا۔ اس نے علم حدیث اور فقہ کی تحصیل بڑی تکمیل کے ساتھ کی اور فلسفہ وحکمت میں کافی وقت صرف کیا تھا۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۳۱۰)

اس کی آنکھوں میں ایسی باتیں کھٹکتی تھیں جن کی بنیاد صرف عقل کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے پر قائم ہوئی ہے۔ چنانچہ قرآن کے زیر بحث مسئلہ پر اس نے سنجیدگی سے غور کیا اور الفاظ قرآن کے قدیم و غیر مخلوق ہونے کو ایک لایعنی خلاف عقل بات قرار دے کر یہ اعلان کر دیا کہ قرآن مخلوق ہے اس کا قدیم کہنا کسی صورت سے صحیح نہیں ہے۔

طبری نے اس کا آغاز ۲۱۲ھ میں بتایا ہے۔

فیها اظهر المامون القول بخلق القرآن

اس سال مامون نے قرآن کے مخلوق ہونے کا قول ظاہر کیا۔

سطحی نظر رکھنے والے ارباب ظاہر اور محدّثین یقیناً اس سے متفق نہیں ہوسکتے تھے اُنہوں نے سخت اختلاف کیا یہاں تک کہ شورش پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہوگیا۔ لہٰذا مامون نے چند سال تک کے لئے اس مسئلہ میں سکوت اختیار کیا۔

کاش یہ بحث صرف علمی وتحقیقی دائرہ میں محدود رہتی مگر کیا کیا جائے کہ عام تشدد آمیز ذہنیت کے علماء ومحدثین نے اس بحث کو اسلام اور کفر

کا سوال بنالیا۔مولانا شبلی نعمانی نے اپنی کتاب ’’علم الکلام‘‘ کے حصہ اول میں اس تشدد آمیز ذہنیت پر کافی افسوس کیا ہے۔ہم اس اختلاف اور محدثین کے متشددانہ اقوال کے نمونے ان ہی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں :

مسائل اختلافیہ میں ایک یہ بھی تھا کہ کلام الٰہی قدیم ہے یا مخلوق و حادث؟ معتزلہ کہتے تھے کہ کلام الٰہی جو خدا کی صفات قدیمہ میں سے ہے وہ قدیم ہے ا۔لیکن جو الفاظ آنحضرت ﷺ پر نازل ہوتے تھے وہ مخلوق اور حادث تھے۔محدثین کہتے تھے کہ کلام الٰہی ہر حال میں قدیم ہے۔زیادہ تدقیق سے دونوں کا حاصل ایک ہی ٹھہرتا ہے لیکن دونوں فرقہ نے اس مسئلہ کو کفر واسلام کی حدفاصل قرار دیا۔

امام بیہقی نے کتاب ’’الاسما الصفات‘‘ میں اس بحث پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے ہم اس کی سند سے اس موقع پر چند بڑے بڑے محدثین کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

وکیع بن الجراح:

مَن زعم ان القراٰن محدث فقد کفر ۔ جس شخص کا یہ خیال ہے کہ قرآن حادث ہے وہ کافر ہے

یزید بن ہرون:

مَن زعم ان کلام اللہ مخلوق فهو والذی لآ اِلٰہ اِلاَّ هو عندی زندیق

جو شخص کہتا ہے کہ کلام الٰہی مخلوق ہے وہ خدا کی قسم زندیق ہے

مزنی شاگرد شافعی:

مَن قال اَنَّ القراٰن مخلوق فهو کافر جو شخص کہتا ہے کہ قرآن مخلوق ہے وہ کافر ہے

امام بخاری:

نظرت نی کلام الیهود و النصاریٰ والمجوس فهارایت قوما اضل فی کفرهم من الجهمیة وانی لا ستجهل من لا یکفرهم میں نے یہودیوں،عیسائیوں اور مجوسیوں سب کے کلام دیکھے ہیں جہمیہ کے برابر کوئی ان میں سے کافر،جاہل نہیں میں اس کو جاہل سمجھتا ہوں جو جہمیہ کو کافر نہ سمجھے۔

عبدالرحمٰن بن مہدی:

لورایت رجلا علی الجسر وبیدی سیف یقول القراٰن مخلوق ضربت عنقه

اگر میرے ہاتھ میں تلوار ہو اور کسی کو پل پر یہ کہتے سن لوں کہ قرآن مخلوق ہے تو اس کی گردن ماردوں

بعض محدثوں نے جن میں امام بخاری بھی شامل ہیں اس مسئلہ میں یہ تفریق کی تھی کہ قرآن مجید کا جو تلفظ کیا جاتا ہے۔یہ مخلوق ہے اور حادث ہے لیکن محدثین نے اس کی بھی سخت مخالفت کی۔ذہلی،امام بخاری کے استاد تھے اور صحیح بخاری میں بہت سی حدیثیں ان کی روایت سے مذکور ہیں۔انہوں نے امام بخاری کا جب یہ قول سنا تو عام حکم دے دیا کہ جو شخص یہ لفظ کہے کہ ’’لفظی بالقرآن مخلوق‘‘ وہ ہماری مجلس میں نہ آنے پائے۔

چنانچہ اس واقعہ کو حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ ابن شداد نے ایک تحریر میں لکھا تھا کہ "لفظی بالقرآن مخلوق" یہ تحریر امام احمد بن حنبل کے سامنے پیش ہوئی تو انہوں نے اس فقرہ کو کاٹ دیا اور کہا کہ قرآن جس صورت میں ہو غیر مخلوق ہے۔

ابوطالب نے کہا تھا کہ امام احمد بن حنبل قرآن کے تلفظ کو مخلوق کہتے ہیں۔ امام بن حنبل کو خبر ہوئی تو غصہ سے کانپنے لگے اور ابوطالب کو بلا کر اس بات کی باز پرس کی۔ (علم الکلام حصہ مطبوعہ انوار المطابع ص ۱۷)

غالباً اسی متشددانہ رویہ کا نتیجہ تھا کہ مامون الرشید کو اس مسئلہ میں کد ہوگئی ایک تو بادشاہوں کا دماغی توازن ہر بات میں اعتدال کے حدود پر قائم نہیں رہتا، وہ جس بات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس میں حد سے بڑھ جاتے ہیں اور انہماک ان کا افراط کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔

دوسرے عموماً افراد انسانی کی ذہنیت کہ جس بات میں ان کی زیادہ مخالفت ہو، اس میں ان کو زیادہ کاوش اور ردعمل کی کوشش پیدا ہوتی ہے۔

اس کا نتیجہ تھا کہ مامون الرشید نے عارضی طور سے چند سال کے لئے سکوت اختیار کرکے ایک مرتبہ اپنے عقیدہ خلق قرآن کی حمایت میں جہاد کی ٹھان لی۔ اور اسحاق بن ابراہیم خزائی کو جو بغداد میں گورنر کی حیثیت سے تھا، ایک مبسوط خط کے ذریعہ سے حکم دیا کہ وہ تمام علمائے وقت کو جمع کرکے خلق قرآن کے مسئلہ میں ان کے خیالات دریافت کرے اور جو اس کے منکر ہوں انہیں سخت سے سخت سزا کا حکم دیا جائے۔

طبری نے ۲۱۸ھ کے واقعات میں اس تاریخی یادگار خط کو نقل کیا جس کے اہم اجزاء کا مضمون جس میں خلق قرآن کے علمی دلائل بھی درج کئے گئے ہیں حسب ذیل ہے۔ "اینجانب کو معلوم ہوا ہے کہ سواد اعظم اور جمہور افراد عوام اور پست طبقہ کی رعیت میں سے جن کو قوت نظر اور طاقت استدلال نہیں ہے اور نور علم سے بہرہ مند نہیں ہوئے ہیں۔ تمام اطراف ملک میں بالکل خدا کے مرتب سے ناواقف اور دین خدا کی حقیقت اور اس کی توحید اور ایمان سے کور چشمی و گمراہی میں مبتلا اور اس کے روشن نشانوں اور واجبی راستے سے منحرف اور اس بات سے قاصر ہیں کہ وہ اللہ کو اس کی شان کے مطابق اوصاف کے ساتھ خیال کریں اور اس کی حقیقت معرفت کو حاصل کریں اور اس میں اور اس کے مخلوق میں فرق سمجھ سکیں۔ اس لئے کہ ان کے افکار کمزور ان کی عقلیں ناقص اور وہ غور وفکر اور یادداشت میں کمزور ہیں۔

انہوں نے مساوات قرار دے دی اللہ اور اس کے نازل کردہ قرآن میں اور وہ سب کے سب متفق ہو گئے اور اس پر کہ یہ قدیم و ازلی ہے اور اللہ کی مخلوق نہیں ہے حالانکہ خداوند عالم کتاب محکم میں ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّا جَعَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا۔ ہم نے بنایا ہے اس کو عربی قرآن۔ (زخرف۔ ۳)

ظاہر ہے کہ جو چیز خدا نے بنائی ہو وہ اس کی پیدا کی ہوئی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا ہے:

ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ وَجَعَلَ ٱلظُّلُمَٰتِ وَٱلنُّورَ

حمد ہے اس اللہ کے لئے جس نے خلق کیا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا تاریکیوں و روشنی کو (انعام۔۱)

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوا: كَذَٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ

اس طرح ہم تم سے واقعات بیان کرتے ہیں اس دور کے جو پہلے گزر گیا۔ (طٰہٰ۔۹۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس کے بعد یہ کلام وجود میں آیا ہے

نیز ارشاد کیا: الٓر ۚ كِتَٰبٌ أُحْكِمَتْ ءَايَٰتُهُۥ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ①

یہ کتاب وہ ہے جس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں اور پھر حکیم خبیر (خدا) کی طرف سے اس کی تفصیل کی گئی ہے۔ (سورۂ ہود۔۱)
جو شے محکم شدہ اور تفصیل کی ہوئی ہو اس کے لئے کوئی محکم بنانے والا اور تفصیل کرنے والا ہو گا۔ وہی اس کا خالق اور موجد قرار پائے گا۔
پھر انہی لوگوں نے غلط بات پر بحث شروع کر دی اور وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہی اہل حق اہل سنت اور اہل جماعت ہیں اور ان کے سوا جتنے ہیں، سب اہل باطل کافر اور تفرقہ پرداز ہیں۔ اس طرح انہوں نے عوام میں ہنگامہ برپا کر دیا۔۔۔ تمہیں چاہیے کہ جتنے قاضی تمہارے یہاں ہوں سب کو جمع کرو اور ان کے سامنے ہمارے خط کو پڑھ کر سناؤ اور خلق و حدوث قرآن کے متعلق ان کے خیالات دریافت کرو اور یہ واضح کر دو کہ خلیفۃ المسلمین اپنی حکومت میں کوئی منصب ایسے شخص کو سپرد کرنا مناسب نہیں سمجھتے جس کے دین اور خالص توحید پر انہیں بھروسہ نہ ہو۔ جب وہ اس کا اقرار کر لیں اور خلیفہ کی رائے سے متفق اور ہدایت و نجات کے راستے کے سالک ہوں تو انہیں حکم دو کہ وہ اس مسئلہ کو ان تمام شواہد و دلائل کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کریں اور ان سے ان کے عقیدہ کے متعلق دریافت کریں جو قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار نہ کرے، اس کی گواہی قبول نہ کی جائے۔ اس کے بعد ان تمام قاضیوں کی کارگزاری کی رپورٹ تمہیں میرے پاس بھیجنا ہو گی اور اس کے بعد ان کی نگرانی کرتے رہنا کہ وہ اس پر برقرار ہیں یا نہیں اور برابر ان حالات کی تفصیلی اطلاع میرے پاس بھیجتے رہو۔'' آخر میں مراسلہ کی تاریخ۔ ربیع الاول ۲۱۸ھ
چوں کہ مامون الرشید بادشاہ ہونے کے ساتھ ایسا تھا کہ حافظ سیوطی لکھتے ہیں:
کان یعد من کبار العلماء اس کا شمار بڑے علماء میں ہوتا ہے
اس لئے وہ علماء کے متشدانہ فتوائے کفر کے سامنے سپر انداختہ ہونے کے بجائے خود قوت استدلال کے ساتھ اپنے حریفوں کو کافر ثابت کرنے کے درپے ہوا اور ملوکانہ اقتدار کے ساتھ انہیں کافر کی پاداش دینے پر بھی تیار ہو گیا۔ تاریخ کا بیان ہے کہ اس کے بعد سوا امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح عجل کے باقی جتنے فقہاء و محدثین تھے سب نے خلق قرآن کے عقیدہ کا اعلان کر دیا۔ سیوطی کے الفاظ یہ ہیں کہ:
اِنَّہُمْ تَوَقَّفُوْا اَوَّلاً ثُمَّ اَجَابُوْہُ تَقِیَّۃً
ان لوگوں نے پہلے کچھ تامل سے کام لیا پھر تقیہ کے طور پر موافقت ظاہر کی
ان تقیہ کرنے والوں میں یحییٰ بن معینؔ جیسے حفاظ وائمہ فن حدیث تھے۔ حافظ یحییٰ بن معین فرماتے تھے کہ: **اجبنا خوفا من السیف**: ہم نے تلوار کے ڈر سے موافقت کی بعض علماء نے جنہیں موقع ملا ترک وطن کیا۔ چناں چہ حافظ احمد بن عبداللہ بن صالح ابوالحسن عجلی کوفی متوفی ۲۶۱ھ کے حال میں ہے:
خرج الی المغرب ایّام فتنۃ القراٰن و سکن طرابلس الغرب
یہ خلق قرآن والے ہنگامہ میں مغرب کی طرف نکل گئے اور طرابلس مغربی میں قیام کیا۔ (ہدایت العارفین جلد نمبر ۱ کالم ۴۹)
کچھ عرصہ کے بعد مامون کی مدت حیات ختم ہو گئی اور اس کے بعد کے سلاطین رائے عامہ کے پیرو ہو گئے اس طرح یہ ہنگامہ ختم ہوا پھر بھی کچھ عرصہ تک مصنفین اس موضوع پر قلم فرسائی کرتے رہے۔ چنانچہ ابن ندیم نے اس سلسلہ کی ایک کتاب کا حوالہ دیا ہے: الفہرست کے صفحہ ۶۳ کتاب خلق القرآن، الابن الروَاند بعد میں اہلسنت میں قرآن کا قدیم اور غیر مخلوق ہونا بالکل مسلمات میں سے ہو گیا لیکن شیعی نقطہ نظر بالا تفاق اس کے خلاف رہا جس پر عملی حیثیت سے سابق میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

تیسرا تبصرہ

نزول قرآن کی تاریخ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تدریجی حیثیت سے موقع محل کے اقتضا سے نازل ہوتا تھا اوراسی اعتبار سے اس میں ماضی، مستقبل اور حال کے واقعات کی تفریق ہوئی ہے یعنی پہلے ہوچکنے والے واقعات ماضی کے الفاظ سے اور بعد میں ہونے والے مستقبل کی حیثیت میں اور موجودہ حالات کا تذکرہ حال کی صورت میں کیا گیا ہے۔ وہ روز وقوع واقعہ آنے والی آیت میں (الیوم) یعنی (آج) کی لفظ اور آئندہ کے تذکرہ میں حرف سین (س) اور لفظ سَوۡفَ کے ساتھ قریب اور بعید کے حدود قائم کرتا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کے نزول کی کوئی ایک تاریخ مقررہ کرنا صحیح نہیں، کیوں کہ وہ تئیس برس کے عرصہ میں جستہ جستہ اترا ہے۔

لیکن جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں نزول قرآن کی تاریخ کا ذکر ملتا ہے۔

ایک طرف یہ ارشاد کہ شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ "رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا"۔ اس میں قرآن مجید اتارنے جانے کو گیارہ مہینوں سے ہٹا کر ایک مہینہ میں محدود کیا گیا۔ دوسری طرف ارشاد ہوا:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ہم نے اس کو ایک بابرکت رات میں نازل کیا۔ (سورہ دخان۔ ۳)

اس سے پتہ چلا کہ یہ تنزیل کسی خاص رات میں ہوئی ہے اور اب دونوں آیتوں کو ملا کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ماہ رمضان کی کوئی ایک رات ہے اور پھر ایک پورا سورہ "سورۂ قدر" اس میں انضباط مکمل طریقہ سے کیا گیا کہ:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ ہم نے اس کو شب قدر میں اتارا ہے

اب ان تینوں آیتوں سے یہ تعین ہوا کہ نزول قرآن شب قدر میں ہوا ہے اور وہ ماہ رمضان کی ایک رات ہے۔

اب وہ کہ جو قرآن کو قدیم اور بطور کلام نفسی کے ازل سے ذات الٰہی میں ثابت سمجھتے ہیں ان کے لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ الفاظ جو کاشف اور حاکی ہیں کلام حق کے، وہ تو کسی ایک وقت پر نازل نہیں ہوئے بتدریج اترے۔ لہٰذا ان کی یہ تاریخ ہو نہیں سکتی اور قدیم چیز قدیم ہے اس کی کوئی ابتداء نہیں پھر اس کیلئے تاریخ مقرر کرنے کے کیا معنی؟

لیکن ہم کہ جو قرآن کو حضرت احدیّت کا مخلوق جانتے اور اسی حیثیت سے اس کو کلام الٰہی مانتے ہیں ان آیات کی بتائی ہوئی تاریخ کو اسی انشاء و خلق قرآن سے متعلق سمجھتے ہیں جو عالم ملاءِ اعلیٰ میں صورت پذیر ہوا یا تنزیل کی لفظ کے لحاظ سے مراد "تنزیل اول" ہے جو لوح محفوظ سے "بیت معمور" کی طرف ہوئی، جس کا حدیث معصوم میں ذکر ہے ([1])۔

اور پہلے بیان ہو چکا کہ وہاں کے اشیاء ہمارے اس عالم سے تعلق نہیں رکھتے جہاں کے واقعات ہمارے "فن تاریخ" کا موضوع بحث بن سکتے ہیں۔

---

[1] ۔سئل الصادق فقال انزل جملة و حدة شهر رمضان الی البیت المعمور ثم نزل من البیت المعمور الی النبی صلی اللہ علیہ والہ فی طول عشرین سنة (تفسیر علی بن ابراهیم قمی)

چوتھا تبصـــرہ

اعجاز قرآن

معجزہ کے معنی

معجزہ وہ غیر معمولی چیز ہے جو کسی نبی کو دعوائے نبوت یا کسی اور الٰہی منصب والے کو اس کے منصب کے ثبوت میں خداوند عالم کی جانب سے عطا ہو، جس کے مقابل لانے سے اس کے حدود منصب کے تحت والی دنیا کی تمام طاقتیں عاجز ہوں۔

بعض لوگ اسے مادی حیثیت میں محدود سمجھ لیتے ہیں۔ جیسے: ماہتاب کا شق ہونا آفتاب کا پلٹنا سنگریزوں کا تسبیح کرنا اور ایسی ہی باتیں جو ہوں وہی ان کے نزدیک معجزہ کہلاتی ہیں۔

اس لئے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جو لوگ اپنے عقول کے اعتبار سے اتنے ترقی یافتہ ہوں کہ وہ حقائق پر غور کر سکیں، ان کے لئے ان مادی مظاہرات کی کیا ضرورت؟

یہ خیال اول تو اس لئے غلط ہے کہ صاحبان منصب ہدایت صرف ایسے ترقی یافتہ افراد کے لئے نہیں آتے بلکہ ان کے دائرہ عمل میں خواص کے ساتھ عوام بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا معیار ذہن کے لحاظ سے ان کے پاس دلائل حقانیت ہونا چاہئیں۔ دوسرے یہ کہ معجزہ نام صرف ان مادی مظاہرات کا نہیں ہے بلکہ معجزہ ان غیر معمولی آثار کا نام ہے جو ایک مدعی نبوت میں اس کے دعویٰ کی خصوصی دلیل بن سکیں خواہ وہ ازقبیل افعال ہوں جیسے کورِ مادرزاد اور برص وجذام کے مبتلا کو صحت دینا، مردوں کو زندہ کرنا اور مٹی سے پرندکی صورت بنا کر اس میں پھونک مار کر سچ مچ کا طائر بنا دینا۔ یہ معجزات جو حضرت عیسیٰؑ کو عطا ہوئے اور عصا کا دریا پر مارنا جس سے دریا میں راستے بن جائیں اور پتھر پر مارنا کہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلیں اور عصا کو اژدہا بنا دینا جو حضرت موسیٰؑ کے معجزے ہیں یا ازقبیل کلام جیسے: قرآن مجید جو ہمارے رسولؐ کا معجزہ ہے یا ازقبیل صفت، جیسے ہمارے رسولؐ کے بہت سے خصوصیات جسم اقدس کا سایہ مفقود ہونا، غیر معمولی خوشبو، پس پشت کی چیز کا اس طرح دکھائی دینا جیسے سامنے کی چیز اور ایسی بہت سی باتیں یا اس شخص کے تعلق سے غیر معمولی حالات کا پیدا ہونا، جیسے: قوم فرعون پر جوؤں، مینڈکوں اور خون وغیرہ کے عذاب کا آنا جس کا تذکرہ قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ ہے۔ یہ تمام باتیں معجزات میں داخل ہیں اس طرح خواص وعوام کی سطح ذہن کے لحاظ سے معجزات مختلف ہو سکتے ہیں ایک بلند مرتبہ فلاسفر کے لئے وہ رموز واسرار عقلی معجزہ ہوں گے جو اس کے کلام میں ودیعت ہیں لیکن سطحی نظر رکھنے والے انسانوں کے لئے جو حقائق کلام کی رفعتوں کو نہیں سمجھ سکتے وہی مادی مظاہرات معجزہ قرار پائیں گے۔

معجزہ کی ضرورت:-

انسانی افراد اپنی افتاد طبع کے لحاظ سے اقتدار پسندی وجاہ طلبی کے پتلے ہوا وہوس کے مجسمے اور ذاتی ونفسانی اغراض کے بندے ہوتے ہیں۔ انہیں کسی ایسی بات کا دعویٰ جس میں اپنی سیادت تسلیم ہوتی، اپنی بات بالا ہوتی اور دوسرے بہت سے سادہ لوح افراد کے دلوں پر ان کی

حکومت کا سکہ قائم ہوتا ہو بہت خوشگوار معلوم ہوتا ہے ان کو اس میں کسی واقعیت کا لحاظ پس وپیش کرنے پر آمادہ نہیں کرتا بلکہ ایک وقتی شان وشوکت ان کو بڑے سے بڑے غلط دعویٰ پر آمادہ کرسکتی ہے جس کی آخری حد خدائی کے دعوائے باطل تک پہونچتی ہے۔ اس کے آگے کوئی زینہ ہی نہیں کہ قدمِ ادّعاء، وہاں تک پہنچے۔

نبوت اور رسالت اور ایسے ہی کسی خدائی منصب کا بلا شبہ روحانی اقتدار سیادت اور حق فرماں روائی کے ساتھ لازم وملزوم کا رشتہ ہے بلکہ ایک پیشوائے دین کا اپنے ماننے والوں پر اقتدار اس سے زیادہ ہوتا ہے جتنا ایک بادشاہ کا اپنی رعایا پر اس لئے کہ بادشاہ کے سامنے سر جھکتے ہیں اور پیشوا کے لئے دل جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ لہٰذا عام انسانی افراد کے اقتدار پسند طبائع اس جامہ کو زیب تن کرنے اور اس منصب کے غلط دعوا یدار ہونے پر بڑی جرات کے ساتھ آمادہ ہوجاتے ہیں۔

اس میں آسانی یوں محسوس ہوتی ہے کہ دنیاوی مناصب ظاہری اسباب اور مادی ساز وسامان سے وابستہ ہوتے ہیں تو وہ سامان جس کے پاس نہ ہوں اس کے لئے ان مناصب کے دعوے کے کوئی معنی نہیں ایک بے تاج وتخت، بے مال ودولت، زاویہ نشین فقیر یہ دعوی کرے کہ میں بادشاہ یا وزیر ہوں یا رکن سلطنت ہوں تو لوگ اسے دیوانہ سمجھ کر ذریعہ تفریح بنالیں گے۔ کوئی اسے ماننے اور تسلیم کرنے پر آمادہ کہاں ہوگا لیکن نبوت ورسالت وغیرہ، یہ مناصب کسی ظاہری ساز وسامان سے وابستہ نہیں ہوتے بلکہ وہ روحانی پیغام اور وحی والہام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں تو کسی کو ان کے ادعاء میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ انسانی لوازم زندگی کے اعتبار سے انبیاء ومرسلین بھی عام افراد بشری کی طرح ہوتے ہیں بے شک ان کا ذاتی جوہر ایسا بلند ہوتا ہے کہ قدرت کی طرف سے وہ بلند منصب کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ عامۃ الخلائق خدا تک جا نہیں سکتے کہ خود اس سے پوچھ لیں کہ اس نے اس شخص کو اپنے منصب کے لئے مقرر کیا ہے یا نہیں، تو اب اس دعویٰ کر لینے میں دشواری ہے کہ مجھ کو خدا نے اس عہدے کے لئے منتخب کیا ہے اور تمام خلق کی رہنمائی کے لئے قرار دیا ہے چنانچہ ہر قوم کے نزدیک متفقہ طور پر بعض ایسے لوگ ہیں جنھوں نے غلط طریقہ پر نبوت کا دعویٰ کیا اور کسی باطل مذہب کی بنیاد قائم کی۔

ایک قانون کا مرتب کرلینا اور دنیا کی رفتار پر نظر کر کے کچھ اصول قرار دے لینا جن کو "شریعت الٰہیہ" کے نام سے پیش کیا جائے، کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

یہ فیصلہ کہ اس کے تمام احکام صحیح اصول پر مبنی ہیں یا نہیں؟ عام افراد کے حدودِ دسترس سے باہر ہے۔ اس لئے کہ انسانی فلاح وبہبود کے سلسلہ میں عقلائے زمانہ کے خیالات ایک نقطہ پر متفق نہیں چہ جائے کہ عام افراد۔

اب اگر اس مدعی نبوت وغیرہ کے پاس جو حقیقۃً خدا کا فرستادہ اور اس کی طرف کے منصب کا حامل ہے صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہو کہ میں خدا کی طرف سے مقرر ہوا ہوں اور اس دعویٰ کی تصدیق کے لئے کوئی ثبوت نہ ہو تو اس میں اور ان لوگوں میں جو غلط طور پر یہی دعویٰ کررہے ہیں فرق ہی کیا رہا اور عام افراد پر کیوں کر یہ فرض عائد کیا جائے کہ وہ اس سچے نبی کے قول کو تسلیم کریں، اس کے دعویٰ کو سر آنکھوں پر رکھیں اور اس کی اطاعت کریں اور دوسروں کے دعوے سے انکار کریں اور ان کی شریعت کو تسلیم نہ کریں۔

اس کے لئے عقل ضروری سمجھتی ہے کہ یقیناً وہ شخص جو خدائے حکیم وخبیر کا حقیقی نمائندہ ہے، اس کے لئے خدا کی جانب سے خصوصی طور پر ایسی کوئی بات ہونا چاہئے جیسے وہ بحیثیت دلیل دعوئے نبوت پیش کرے اور جس کے مقابلے میں دنیا کی طاقتیں عاجز ہوں ورنہ ان دیکھا خدا جو بغیر

اپنے آثار قدرت کے نہ پہنچانا جا سکا اس کے سفیر کو ہم بغیر آثار کے کیوں کر پہچانیں۔
اب وہ آثار جو کسی ذات کی معرفت پیدا کر سکتے ہیں، کیسے ہونے چاہئیں، اگر وہ آثار اس کے اور اس کے غیر میں مشترک ہیں تو وہ خصوصی طور پر اس کا تعارف کیوں کر سکتے ہیں تو ضرورت ہے کہ آثار ایسے ہوں جو اس ذات سے مخصوص ہیں۔ وہ ذریعہ معرفت بن سکتے ہیں تو جس طرح خدا کے وجود کی دلیل وہی آثار بن سکتے ہیں جن پر خدا کے سوا کوئی قادر نہ ہو تو اس کی طرف کے عطا کردہ منصب کا ثبوت بھی ایسی ہی نشانیوں سے ہوسکتا ہے جو اس کی طرف صاحب منصب سے مخصوص ہوں۔ مخصوص ہونے ہی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی دوسرا اس کے مثل پیش کرنے پر قادر نہ ہو۔ اسی کو کہتے ہیں "معجزہ"۔

معجزہ اور اثبات حقانیت

یہ امر ایک حد تک محل بحث رہا ہے کہ معجزہ سے کسی نبی کی سچائی پر کیوں کر روشنی پڑتی ہے؟
بہت سے لوگ معجزہ کی حقیقت کو صرف ایک غیر معمولی عجیب اور غریب کرتب میں منحصر سمجھ کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ ایسی باتیں تو اکثر جادوگر، شعبدہ باز بھی پیش کر دیتے ہیں یا بعض غیر معمولی طاقت کے انسان اکثر ایسے کام کرتے ہیں جن سے عام افراد قاصر نظر آتے ہیں تو کیا ان میں سے ہر ایک معجزہ سمجھا جائے گا، اور اگر نہیں تو اس میں اور معجزات انبیاء میں کیا فرق ہے؟
یہ سوال حقیقتاً دلیل اعجاز کے متعلق ناسمجھی پر مبنی ہے۔
اعجاز کی بنیاد ایک باریک خصوصیت پر ہے جس کی وجہ سے ایک قسم کا عجیب وغریب مظاہرہ ایک مدعی نبوت کے لئے دلیل اعجاز اور سبب ثبوت نبوت ہوتا ہے اور اسی قسم کا مظاہرہ ایک ساحر اور جادوگر کا یا کسی غیر معمولی انسان کا کوئی مخصوص کمال اس کا معجزہ نہیں ہوتا اور دلیل نبوت قرار نہیں پاتا۔
غور سے ملاحظہ ہو۔ حضرت حق عزاسمہ حکیم علی الاطلاق نقص وعیب سے بری اور ظلم و دروغ باطل کی حمایت سے بلند وبرتر ہے اس کے دامن حکمت پر کسی باطل پروری اور ناحق کوشی کی حمایت کا دھبہ نہیں پڑسکتا۔
ہمارے ایسے عام افراد میں کوئی ہماری جانب سے ایک غلط بات کی اشاعت کرے، ہمارا نام لے کر کسی غلط امر کا ادعا کرے اور ہماری طرف سے کوئی شناخت ثبوت میں پیش بھی کرے جس سے عام اشخاص کا دھوکا کھا جانا اصول فطرت کے لحاظ سے حق بجانب ہو تو ہمارا فرض ہے کہ ہم حقیقت کا اظہار اور واقعیت کا اعلان کر دیں اور اپنی ذمہ داری کو اس سلسلہ میں پورا کریں۔
ایک گندم نما جو فروش، ریا کار وظاہر دار، زہد وتقویٰ کا بیوپاری اور بناوٹی ورع وتقویٰ کا دوکاندار میری طرف سے اجازہ اجتہاد یا پیش نمازی میرے جعلی دستخط اور مہر سے بنا کر اطراف وجوانب شہر ودیہات میں جا تا خلق خدا کی گمراہی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اس صورت میں لوگوں کا تو یہ فرض ہے کہ جب وہ میری طرف نسبت دے کر اپنی اشتہاری پیش نمازی یا اجتہاد کی دعوت دے تو وہ اس سے دلیل اور سند کا مطالبہ کریں لیکن جب اس نے اس مطالبہ کے جواب میں دستخطی ومہری سند پیش کر دی تو عوام کا فرض ختم ہو چکا۔ اب اگر مجھے اس کی اطلاع ہو تو میرا لازمی فریضہ یہ ہے کہ میں اس کا اعلان کر دوں کہ یہ میرے دستخط اور مہر نہیں ہیں میری طرف ان کی نسبت غلط ہے اور اگر میں سکوت کرتا ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے میں اس کے دعویٰ کی تصدیق کرتا اور عملی حیثیت سے اس کی تائید کرتا ہوں۔

اب میرا یہاں تو یہ ممکن ہے کہ میں باوجود اس فریضہ کے عاید ہونے کے اپنے فرض کو محسوس نہ کروں یا احساس ہونے کے باوجود کسی روپہلی، سنہری مصلحت کی وجہ سے اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کر کے حمایت باطل اور گمراہی خلق کی ذمہ داری اپنے سر لے لوں لیکن خداوند عالم کے یہاں تو یہ ممکن نہیں ہے۔

جب خدا کی طرف سے ایک شخص نے کسی منصب کا دعویٰ کیا جو رہنمائی اور پیشوائی خلق کی نوعیت رکھتا ہے۔ مثلاً اس نے اظہار کیا کہ مجھے خدا نے نبوت و رسالت کے شرف سے ممتاز کیا اور سفارت کے عہدہ جلیلہ سے سرفراز کیا تو عامہ خلائق کا فرض ہے کہ وہ اس سے دلیل کا مطالبہ کریں اور ثبوت نبوت کے لئے ایسی کسی خاص بات کے پیش کرنے کی خواہش کریں جس سے دوسرے قاصر ہیں۔ اب اگر اس نے عام انسانوں کے طاقت واقتدار کے حدود سے بالاتر اور عام بشری دائرہ قدرت سے باہر کوئی ایسا امر پیش کر دیا جس سے انسانی کمال کا ہاتھ کوتاہ نظر آیا۔ اس نے کہا کہ یہ طاقت مجھے خدا کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور یہ میری سچائی کا ثبوت ہے

اس کے بعد اگر خدا ہمارا ایسا شخص ہوتا جس پر بے خبری اور سہو ونسیان وغیرہ کا امکان ہوتا تو ممکن ہے عرصہ تک اس کی خاموشی بے خبری کے سبب سے حق بجانب قرار پاسکتی، لیکن عالم و حکیم خدا، حاضر وناظر خدا اور نظام کائنات کا مدبر خدا اگر اس کے بعد خاموش رہا یعنی اس کے دعویٰ کو برقرار رہنے دیا۔ اس طرح کہ نہ اس کے ادعائے بے مثالی کو توڑنے کے لئے خود اس کی طاقت سلب کی اور نہ اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے کو طاقت عطا کی تو سمجھنا پڑے گا کہ اس نے اس کی نمائندگی کا امضا، سفارت کا اقرار اور عہدہ کی تائید اور اس کے دعوائے نبوت ورسالت وغیرہ کی عملی طور پر تصدیق کر دی ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ سچا صاحب منصب ہے اگر ایسا نہیں تو اللہ پر حمایت باطل گمراہی خلق اور پامالی حق کا الزام آتا ہے جو کسی طرح اس کی شان جلال وکمال کے لئے جائز نہیں ہے۔

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ معجزہ میں جو روح اعجاز دوڑتی ہے وہ اس روحانی پیشوائی کے دعویٰ کی بناء پر ہے جو اس قدرت نمائی کا انتساب خدا کی طرف کر دیتا ہے اور جس کے بعد خالق پر ذمہ داری عاید ہوجاتی ہے لیکن اگر کوئی ایسا دعویٰ نہیں ہے تو لاکھ کوئی عجائبات پیش کرے اور حیرت انگیز کام انجام دے ہر موقع پر اللہ کا یہ فرض تھوڑی ہے کہ ہر بات کے مقابلہ میں ایک بات اور ہر چیز کے جواب میں ایک چیز پیش کرتا رہے۔ آخر اس صورت میں یہ سلسلہ کہیں پر ختم بھی تو ہوگا وہ آخری چیز لاجواب ہی ہوگی کیوں کہ اس کی کوئی مثال موجود نہ ہوگی۔

ان عجیب مظاہروں، حیرت انگیز کرتبوں اور تعجب خیز کارگزاریوں سے جب خدا پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی تو ان عجیب کارناموں کا برقرار رہنا کسی خاص حقیقت کی دلیل قرار نہیں پاتا۔

مذکورہ بالا بیان کی بناء پر معجزہ کی بنیاد حسب ذیل ارکان پر ہے جن کے بغیر کوئی چیز معجزہ سمجھی نہیں جاسکتی۔

(۱) منصب روحانی مثلاً نبوت کا ادعا۔

(۲) غیر معمولی امر ہونا جو اس حلقہ میں کہ جو دعوائے منصب کا مخاطب ہے تمام افراد کے دائرہ اقتدار سے باہر ہو اس لئے کہ اگر ایسا امر ہو جس پر دوسرے اشخاص بھی قدرت رکھتے ہیں تو وہ کسی مرتبہ وعہدہ کی دلیل نہیں بن سکتا۔

(۳) اس دعویٰ کے بعد کسی ایسے شخص کا پیدا نہ ہونا جو اس دعویٰ کو توڑ کر اسے باطل کر سکے۔

(۴) حالات اور خصوصیات کی بناء پر کسی ایسے امر کا موجود نہ ہونا جو اس مدعی نبوت کے دعویٰ کا قطعی بطلان کرنے کے لئے کافی ہو۔ اس

لئے کہ اگر ایسا ہوا یعنی کوئی ایسا امر پایا گیا جو اس کے دعویٰ کو باطل ثابت کرنے کے لئے کافی ہے جیسے مستند تسلیم شدہ نبی سابق کا اعلان کہ میرے بعد آنے والا مدعی نبوت غلط گو ہوگا یا یہ اعلان کہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، یا خود اس شخص کا جو مدعی منصب ہے فاسق و فاجر اور اپنی سابقہ زندگی کے لحاظ سے بالکل ناکارہ ہونا جس کے ساتھ اس کا بعہدہ نبوت وغیرہ منتخب ہونا قطعی دلائل عقلیہ اور خداوند عالم کے مواعید یقینیہ کے خلاف ہے تو ایسے شخص کا مدعی ہونے کے ساتھ کسی غیر معمولی امر کا اظہار بھی اس کی نبوت کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہے اس لئے کہ ثبوت تو خداوند عالم پر ذمہ داری عاید ہونے کی بنیاد پر تھا اور یہاں اس کی ذمہ داری نبی سابق کے اعلان یا ان قطعی دلائل سے جو ایسے شخص کی نبوت کے منافی ہیں پوری ہو چکی ہے، جو خدا کی طرف سے حجت تمام ہونے اور خلق کو گمراہی سے محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہے۔لہٰذا اب خداوند عالم کو اس مدعی نبوت کے دعویٰ کو خصوصی طور پر کسی طریقہ سے باطل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

معجزہ کا سحر اور غیر معمولی انسانی کمالات سے تفرقہ

معجزہ کے ارکان میں سے پہلا اور تیسرا رکن وہ ہے جو معجزہ کو سحر اور جادو سے الگ کر دیتا ہے یقیناً جادو میں بھی ایک حیرت انگیز صورت کا مظاہرہ ہوتا ہے لیکن یا تو اس کے ساتھ دعوائے نبوت وغیرہ ہوتا نہیں اس لئے خداوند عالم پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی یا اگر دعوئے نبوت و رسالت کے ساتھ یا کسی سچے نبی کے دعوئے نبوت اور معجزہ کے مقابلہ میں ہو تو اللہ اس کے ابطال کا سامان کر دیتا ہے جیسا کہ ساحران فرعون کے قصہ میں واقع ہوا۔بہت سے وہ اشخاص جنہوں نے حقیقت معجزہ اور دلیل اعجاز پر غور نہیں کیا ہے، اعجاز نبوت کے مقابلہ میں بہت سے اشخاص کے ذاتی کمالات کو پیش کر دیتے ہیں۔

مثلاً یہ کہتے ہیں کہ قرآن بحیثیت فصاحت و بلاغت اگر اس لئے معجزہ ہے کہ اس کا مثل کوئی نہیں لا سکا تو بہت سے علمی و ادبی آثار مختلف ادباء کے مختلف زبانوں میں ایسے ہیں جن کا مثل و نظیر اب تک باوجود کوشش و کاوش کے وجود میں نہیں آ سکا، جیسے شاہنامہ فردوسی اور گلستان سعدیؔ، اردو میں مثنوی میر حسن اور مراثی میر انیسؔ انگریزی میں شکسپیر وغیرہ کے آثار قلمی اور ادبی کارنامے اس کا جواب ہمارے مذکورہ بالا بیانات سے ظاہر ہے۔اول تو مذکورہ بالا مظاہرات کا موقع ظہور اس وقت ہے کہ جب ختم نبوت کے اعلان اور ائمہ دین کے نام بنام تعیین نے کسی مدعی منصب الٰہی کے لئے دروازہ بند کر دیا ہے۔اس لئے چوتھے رکن کی بناء پر دلیل اعجاز مکمل نہیں ہے اور ان مظاہرات سے حقیقت اعجاز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

پھر یہ کہ فردوسیؔ، سعدیؔ، میر حسنؔ، میر انیسؔ اور شکسپیر وغیرہ کے کارناموں کے ساتھ کوئی دعویٰ ایسا وابستہ نہیں ہے جس کے ابطال کی اللہ کی ضرورت ہو۔

دنیا میں مختلف طرح کے کلام ہوتے ہیں کچھ معمولی اور کچھ غیر معمولی، اللہ کو کیا لازم ہے کہ وہ ہمیشہ ان کاموں میں ناکامی پیدا کرتا رہے آخر یہ دل دماغ بھی تو اسی کے خلق کردہ ہیں جن سے یہ غیر معمولی کارنامے ہو رہے ہیں پھر وہ اپنی پیدا کی ہوئی صلاحیتوں کے جوہروں کو روبکار آنے سے کس لئے مانع ہو؟

سحر بھی عالم اسباب کے ماتحت ہے۔دنیا میں جتنے اسباب کارفرما ہیں سب اللہ کے خلق کردہ ہیں یہ اور بات ہے کہ بعض اسباب سے کوئی خاص کام لینے میں عام حالات میں اس نے روکا ہو۔چناں چہ سحر ایسی ہی چیز ہے جو ممنوع قرار دی گئی ہے لیکن اسے بے اثر بنانا ہر حال میں اللہ کو لازم ہو، اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ غیر معمولی چیز یا خارق عادت تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اس عام دستور کیخلاف ہے جو ہماری آنکھوں نے قانون قدرت کے ماتحت عام طور سے دیکھا ہے لیکن اکثر عام اسباب کے سلسلہ میں نتائج ایسے غیر معمولی ہوجاتے ہیں جن کو دنیا بے مثال کہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ ایک طبیب بعض اوقات ایسے مریضوں کو اچھا کر دیتا ہے جن کا اچھا ہونا اس کے قبل دنیا نے نہیں دیکھا تھا، ایک انشاء پرداز بسا اوقات ایسی تحریر لکھ دیتا ہے جس کی نظیر اس کے پہلے آنکھوں کے سامنے نہیں آئی تھی، ایک شاعر بسا اوقات ایسا شعر کہہ جاتا ہے جیسا شعر اس کے قبل نہیں ہوا تھا، ایک کاتب کے ہاتھ سے بسا اوقات ایسے نقوش نکل جاتے ہیں جن کے مثل پہلے آنکھوں نے نہیں دیکھے تھے۔

ہوسکتا ہے کہ اس طبیب، انشاء پرداز، شاعر یا کاتب کو اپنے اس نتیجہ عمل پر پورا بھروسہ بھی ہو اور وہ دنیا کو دعوت بھی دے کہ اگر کوئی میرا مدمقابل ہو تو اس کے مثل بنا کر پیش کرے۔ سعدی اپنی گلستان پر، یاقوت مستعصمی اپنے کتبوں پر اور میرانیس اپنے مرثیوں پر بجا طور سے فخر کرسکتے تھے اور بے نظیر ہونے کا دعویٰ بھی اپنے حدود میں درست تھا۔

اللہ کو کیا ضرورت کہ وہ ان میں سے ہر ایک کے دعویٰ کو غلط ثابت کرے۔ اس لئے کہ بہر حال وہ نتیجہ کمال ہے اسی کے ایک مخلوق کا اور اس کے عطا کردہ طاقتوں کا کرشمہ ہے۔ وہ اگر اس کے دعوائے کمال کو باطل کرنے کے لئے ایک کو پیدا کرے تو پھر ضرورت ہے کہ اس کی بے مثال باطل کرنے کے لئے ایک اور پیدا کیا جائے اور پھر اس کے لئے تیسرا، یہ سلسلہ چلتا رہے تو کہیں پر تو ختم ہوگا تو جو آخر میں ہوگا اس کا دعویٰ پھر لا جواب رہے گا۔ پھر اگر پہلے ہی صاحب کمال کے ادائے بے مثالی کو برقرار رہنے دیا جاتا تو کیا حرج تھا۔ لہٰذا بلا شبہ ہر دور میں ایسی قابلیت کے اشخاص پیدا ہوسکتے ہیں جن کی ایسی قابلیت ان کے غیر میں مفقود ہے اور ایسے نمونے کمال کے سامنے آسکتے ہیں جن کا مثل ونظیر موجود نہ ہو۔

مگر یہ سب اسی وقت تک ٹھیک ہے جب تک اس کے ساتھ کوئی دعویٰ کسی خداوندی منصب کا نہیں ہے لیکن اگر کوئی اپنے نتیجہ کمال کو یہ کہہ کر پیش کرے کہ اللہ نے مجھے اس عہدہ پر مقرر کیا ہے اور یہ میرا کارنامہ اس کا ثبوت ہے تو اللہ کو لازم ہے کہ وہ کسی کو اتنی قوت عطا کردے کہ وہ اس کے خلاف مظاہرہ کرکے باطل کردے۔

قرآن معجزہ ہے اس لئے کہ وہ ثبوت نبوت میں پیش کیا گیا اور پھر دنیا کو دعوت دی گئی کہ اگر وہ اس رسول کی رسالت میں شک رکھتی ہے تو اس کی مثال پیش کرے۔ اس کے بعد بھی جب دنیا قاصر رہی تو معلوم ہوا کہ وہ حقیقتاً انسانی طاقت سے خارج خدا کی خاص قوت وقدرت کا کرشمہ مخصوص امتیاز اور روحانی اختصاص ہے اور یہ معجزہ ہے جسے ثبوت نبوت کے لئے خالق نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کیا ہے۔

قرآن میں معجزات انبیاؑ کا تذکرہ

بہت سے افراد جنھوں نے اپنے دل خواستہ اور ساختہ و پرداختہ انبیا کا حلقہ اطاعت زیب گردن کیا ہے اور زمانہ کے موجودہ دور سے قریب ہونے کی وجہ سے ان کے لئے وہ کچھ معجزات اور خوارق عادات کے ظہور کے ادعا کی جراًت نہیں رکھتے، وہ اس کی اپنی کمزوری اور سرمایہ اعجاز سے بے مائیگی وتہی دستی کو معجزات انبیا کے انکار سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ انبیاء عجیب وغریب مظاہرات پیش کرکے اپنی نبوت تسلیم نہیں کراتے تھے بلکہ صرف ان کی روحانیت تھی جو ان کے لئے قلوب کو جذب کرتی اور لوگوں کو ان کا گرویدہ بناتی تھی۔

وہ اس سلسلہ میں قرآن کے اندر معجزات انبیاء کے تذکرہ کے وجود کا بھی انکار کردیتے ہیں اور یہ کہتے ہی کہ قرآن میں کہیں معجزہ کو دلیل نبوت نہیں بتایا گیا ہے اور نہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے قرآن نے معجزات کا ادعاء کیا ہے۔

یہ خیال بالکل غلط ہے۔قرآن مجید نے اکثر انبیاء کے معجزات کا تذکرہ صاف اور صریحی الفاظ میں درج کیا ہے۔ بے شک اس کو ''معجزہ'' کے نام سے یادنہیں کیا ہے بلکہ ''آیت'' اور ''بیّنہ'' کی لفظ سے تعبیر کیا ہے۔اسی کو متکلمین اپنی اصطلاح میں ''معجزہ'' کہتے ہیں۔

الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنس کر معانی سے کنارہ کشی کرنا صحیح نہیں ہے ہم کو لفظ معجزہ پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے کہ ہم آپ کے اس لفظ کو قرآن میں تلاش کریں اور اس کی تعریف ڈھونڈھیں۔قرآن کوئی فرہنگ یا مجموعہ مصطلحات نہیں ہے کہ اس میں لفظ معجزہ اور اس کی تعریف مذکور ہو۔ بے شک ہم کو اس قسم کی دلیل نبوت کا جسے متکلمین اپنی اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں اور جس کے وجود کو ثبوت نبوت میں ضروری سمجھتے ہیں۔ قرآن میں پتہ لگانا چاہیئے اگر اس کا پتہ لگ جائے تو الفاظ میں اختیار ہے اور نام رکھنا آپ کے ہاتھ میں ہے۔آپ اس کو ''معجزہ'' کہیں جیسا کہ اس لفظ کے معنی لغوی (عاجز کردینے والی چیز) کی مناسبت سے متکلمین کی اصطلاح ہے یا جس لفظ سے قرآن مجید نے ان دلائل کی تعبیر کی وہ،اس لفظ سے تعبیر کیجئے یا کوئی نام اپنے دل سے تجویز کر لیجیے کم سے کم مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

اب میں دکھلاؤں کہ قرآن مجید میں اس قسم کی دلیل نبوت کا پتہ ہے یا نہیں اور اسی ذیل میں معلوم ہوگا کہ قرآن نے کس طرح صداقت نبی کی دلیل عقلی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قرآن مجید نے حیرت انگیز مظاہرات قدرت اور دلائل نبوت کو جنہیں انبیاء پیش کیا کرتے تھے ''آیات'' اور ''بینات'' کے نام سے پیش کیا ہے۔ملاحظہ ہو:

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ
نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

قبیلہ ثمود کی طرف ہم نے بھیجا ان کے بھائی صالح کو انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت کرو اللہ کی اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ''بینہ'' آ گیا ہے۔یہ خدا کا خاص (پیدا کردہ) ناقہ جو تمہارے لئے ''آیت'' (نشانی) ہے تو اس کو چھوڑے رکھنا کہ یہ خدا کی زمین میں اپنی غذا حاصل کرے اور تم اسے کوئی برائی نہ پہنچانا جس سے تم دردناک عذاب میں مبتلا ہو۔(سورۂ اعراف آیت ۷۳)

اس میں ناقۂ صالح کو ''بیّنہ'' اور اسی کو ''آیت'' کہا گیا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ
جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾
فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

پھر ہم نے ان انبیاء کے بعد مبعوث کیا موسیٰؑ کو اپنی ''آیتوں'' کے ساتھ فرعون اور اس کے گروہ کی طرف تو ان لوگوں نے ان آیتوں پر ظلم کیا۔اب ذرا دیکھو کہ فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہے اور موسیٰؑ نے کہا تھا کہ اے فرعون! یقیناً میں خداوند عالم کی طرف سے فرستادہ ہوں اور میرے اوپر لازم ہے کہ میں سوا سچی بات کے خدا کی طرف کسی بات کی نسبت نہ دوں۔میں تمہاری طرف ''بینہ'' لے کر تمہارے رب کی طرف سے

آیا ہوں بنی اسرائیل کو میرے ساتھ روانہ کردے فرعون نے کہا کہ اگر تم کوئی ''آیت'' لائے ہو تو اسے پیش کرو اگر سچے ہو یہ سن کر موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینک دیا جو ایک مرتبہ صاف اژدھے کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ اور انہوں نے اپنا ہاتھ نکالا جو تمام دیکھنے والوں کی نظر میں چمکدار نظر آیا۔ (سورۂ اعراف آیات ۱۰۳ تا ۱۰۸)

یہاں عصائے حضرت موسیٰؑ اور ید بیضاء کو ''بینہ'' اور ''آیت'' قرار دیا گیا ہے اس کے بعد ساحران فرعون کی آواز نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے معجزات کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے فرعون سے کہا:

وَمَا تَنۡقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتۡنَا ؕ رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّتَوَفَّنَا مُسۡلِمِيۡنَ ﴿۱۲۶﴾

تو ہم سے کس بات پر ناراض ہوتا ہے سوائے اس کے کہ ہم اپنے پروردگار کی آیتوں پر ایمان لائے جبکہ وہ ہمارے پاس آئیں پروردگار! ہم پر صبر کو غالب کردے اور ہمیں ایمان کی حالت میں دنیا سے اٹھا۔ (سورۂ اعراف آیت ۱۲۶)

اس کے بعد:

وَقَالُوۡا مَهۡمَا تَاۡتِنَا بِهٖ مِنۡ اٰيَةٍ لِّتَسۡحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحۡنُ لَكَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳۲﴾ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمُ الطُّوۡفَانَ وَالۡجَرَادَ وَالۡقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۚ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا وَكَانُوۡا قَوۡمًا مُّجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۳۳﴾

ان لوگوں نے کہا جو بھی چاہو تم ''آیت'' ہمارے سامنے پیش کرو کہ ہم پر اس کے ذریعہ سے جادو کرو ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں تو اس وقت ہم نے ان پر بھیجا طوفان اور ٹڈیوں کا لشکر اور جوئیں اور مینڈک اور خون کھلی ہوئی آیتیں'' مگر انہوں نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور وہ گنہگار لوگ تھے۔ (سورۂ اعراف آیات ۱۳۲، ۱۳۳)

اس میں پہلے جزء سے صاف ظاہر ہے کہ ''آیت'' اس نوعیت کی چیز کو کہا گیا ہے جن میں کفار جادو کی صورت پاتے تھے اور آخر آیت میں طوفان، جراد، قمل، ضفادع اور دم، ان تمام غیر معمولی درجہ پر آنے والی آفتوں کو ''آیات مفصلات'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوۡمِهِمۡ فَجَآءُوۡهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡا بِمَا كَذَّبُوۡا بِهٖ مِنۡ قَبۡلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطۡبَعُ عَلٰى قُلُوۡبِ الۡمُعۡتَدِيۡنَ ﴿۷۴﴾

پھر ہم نے بھیجے ان کے بعد کچھ رسول ان کی قوم کی طرف اور وہ رسول ان کے سامنے لائے ''بینات'' مگر وہ کب ایمان لانے والے تھے اس چیز پر جس کے پہلے تکذیب کر چکے تھے۔ (سورۂ یونس آیت ۷۴)

اس میں نوحؑ کے بعد مبعوث ہونے والے رسولوں کے ساتھ ظاہر ہونے والے امور کو اجمالی طور پر ''بینات'' سے تعبیر کرتے ہوئے پھر ارشاد ہوا ہے۔

ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ مُّوۡسٰى وَهٰرُوۡنَ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسۡتَكۡبَرُوۡا وَكَانُوۡا قَوۡمًا مُّجۡرِمِيۡنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الۡحَـقُّ مِنۡ عِنۡدِنَا قَالُوۡۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوۡسٰٓى اَتَقُوۡلُوۡنَ لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمۡ ؕ اَسِحۡرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفۡلِحُ السّٰحِرُوۡنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا لِتَلۡفِتَنَا عَمَّا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوۡنَ لَكُمَا الۡكِبۡرِيَآءُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَمَا نَحۡنُ لَكُمَا بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۷۸﴾ وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ ائۡتُوۡنِىۡ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيۡمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمۡ مُّوۡسٰٓى اَلۡقُوۡا مَاۤ اَنۡتُمۡ مُّلۡقُوۡنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّاۤ

اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾

پھر ہم نے بھیجا ان کے بعد موسیٰؑ و ہارون کو فرعون اور اس کے گروہ کی طرف اپنی ''آیتوں'' کے ساتھ تو انہوں نے ہٹ دھرمی کی اور وہ بڑے گنہگار لوگ تھے۔ تو جب ان کے پاس ان کے پروردگار کے پاس سے سچی حقیقت پیش ہوئی تو انہوں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ موسیٰؑ نے کہا کیا تم سچی بات کو جو تمہارے پاس آئی ایسا کہتے ہو؟ کیا جادو ہو سکتا ہے؟ حالانکہ جادوگر کامیاب نہیں ہوا کرتے۔ انہوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم کو اس سے منحرف کر دے جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا اور تم دونوں کیلئے اس سرزمین پر بڑائی ہوجائے اور ہم تم دونوں پر ایمان لانیوالے نہیں اور فرعون نے کہا کہ میرے پاس ہر کامل جادوگر کو لاؤ تو جب سب جادوگر جمع ہوئے موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ دکھاؤ جو کرتب تم دکھا سکتے ہو جب انہوں نے پھینکا اپنی رسیوں کو تو موسیٰؑ نے کہا کہ جو تم نے پیش کیا ہے وہ سحر ہے اللہ یقیناً اسے بھی باطل کر دے گا اللہ مفسدہ پردازوں کے کام کو سرسبز نہیں کرتا ہے اور جو بات حق ہے اسے وہ اپنے حکم سے پورا کرتا ہے اگرچہ گنہگار لوگ اس کو برا سمجھیں۔ (سورۃ یونس آیات ۷۶ تا ۸۲)

ان آیات میں پورے طور پر اس دلیل عقلی کا خلاصہ موجود ہے جو معجزہ وسحر کے تفرقہ میں ہم نے بیان کیا ہے۔ آیات کے مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ ظاہری صورت سے جو امر بطور دلیل نبوت نبی کو عطا ہوا تھا وہ ویسی ہی نوعیت رکھتا تھا جو سحر کی ہوتی ہے یعنی غیر معمولی اور خارق عادت اور خلاف نظام عام اسی بناء پر ان لوگوں نے کہا کہ اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ اور یہی خیال کر کے فرعون نے مقابلہ کے لئے ساحروں کو دعوت دی لیکن پیغمبر نے اس مختصر جملہ سے کہ: أَسِحْرٌ هٰذَا وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ، فلسفہ اعجاز اور آیت الٰہی اور کرشمہ ساحری کے فرق پر مکمل روشنی ڈال دی۔ اس میں اعجاز اور سحر کے مابین فرق کا معیار جو بتلایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہ سحر ہوگا تو اس کی کامیابی اور سرسبزی باقی نہیں رہ سکتی اس لئے کہ اللہ پر لازم ہے کہ وہ اس کا ابطال کر دے اور اگر وہ سرسبز و کامیاب ہوا اور اس کا ابطال نہ ہو تو سمجھو کہ حقیقۃً سحر نہیں بلکہ اعجاز ہے اور اس معیار کو اس سے زیادہ واضح الفاظ میں دوسری آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جب موسیٰؑ علیہ السلام نے ساحروں کی کارستانی دیکھی تو فرمایا۔ ''یہ جو تم نے کیا سحر ہے یقیناً خدا اس کو باطل کر دے گا۔ خدا کبھی فساد برپا کرنے والوں کے کام کو سرسبز نہیں کرتا۔''

معلوم ہوا معیار سحر یہ ہے کہ اللہ اس کو باطل کر دے وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ۝ یعنی جو واقعی حق ہے اور سچ مچ خدا کی طرف کی نشانی ہے، اس کو وہ اپنے مظاہرات قدرت کے ساتھ برقرار رکھتا ہے چاہئے گنہگار لوگوں کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے۔ یہ معیار اعجاز ہے۔ اب اس سے بڑھ کر دلیل عقلی کی طرف اشارہ کیا ہوگا؟

ان آیات سے یہ امر بھی ظاہر ہے کہ اس مظاہرہ قدرت کو جسے ''آیت'' اور ''بینہ'' کہا گیا ہے دلیل نبوت اور معیار حقانیت کی صورت میں پیش کیا ہے بلکہ درحقیت ''بیّنہ'' کہنا ان مظاہرات کو اسی اعتبار سے ہے کہ وہ کھلی ہوئی دلیل سچائی کی ہیں اور ''آیت'' کہنا اس لحاظ سے ہے کہ وہ حقانیت کی نشانی ہیں۔

اس کی علاوہ ملاحظہ ہو:

اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ

رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

داخل کروا اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں، وہ نکلے گا روشن، بغیر کسی بری صورت کے اور ملا دو اپنی طرف اپنے بازو کو دہشت سے، یہ دونوں دلیلیں ہوں گی تمہارے پروردگار کی طرف سے فرعون اور اس کے پاس کے بڑے آدمیوں کی جانب۔ (سورۂ قصص۔ ۳۲)

اس آیت میں صاف صاف حضرت موسیٰ کے معجزات کو ''برہان'' یعنی دلیل نبوت کہا گیا ہے۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات:

جب کہ یہ امر ثابت ہو گیا کہ قرآن میں معجزات کو ''آیات وبینات'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اب قرآن میں تلاش کیجئے، آپ کو حسب ذیل ستائیس مقامات پر واضح اور صاف الفاظ میں ثبوت ملے گا کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی معجزات عطا ہوئے ہیں:

(۱) وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

یقیناً ہم نے اتارے ہیں آپ پر روشن معجزات اور نہیں انکار کر سکتے ان کا مگر فاسق لوگ۔ (سورۂ بقرہ)

(۲) وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

جو لوگ علم نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں کیوں ہم سے خدا بات نہیں کرتا یا کوئی خاص معجزہ ہمارے پاس کیوں نہیں آتا۔ ایسا ہی کہا تھا انہوں نے جو ان کے پہلے تھے انہیں کا سا قول ان سب کے دل ایک سے ہیں۔ یقیناً ہم نے معجزات ظاہر کر دیئے ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین لائیں۔ (سورۂ بقرہ)

(۳) فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾

اگر تم نے لغزش کی، بعد اس کے کہ معجزے تمہاری طرف آ چکے تو جان لو کہ اللہ زبردست ہے ہر کام ٹھیک کرنے والا ہے۔ (سورۂ بقرہ)

(۴) كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ

کیوں کر خدا راہ راست پر لائے گا ان لوگوں کو جنہوں نے ایمان لانے کے بعد پھر کفر کیا حالانکہ انہوں نے گواہی دی کہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس معجزے آئے۔ (سورۂ آل عمران)

(۵) وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴﴾

ان لوگوں کے سامنے جو بھی معجزہ ان کے پروردگار کی طرف سے آتا ہے یہ اس سے روگردانی ہی کرتے ہیں۔ (سورۂ انعام)

(۶) قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾

ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو ان لوگوں کی باتوں سے رنج ہوتا ہے تو یہ آپ ہی کو نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کے معجزوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔ (سورۂ انعام)

(۷) وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾

جنہوں نے جھٹلایا ہمارے معجزوں کو یہ بہرے ہیں اور گونگے ہیں تاریکی میں مبتلا ہیں۔ (سورۂ انعام)

(۸) وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ

جب آئیں آپ کے پاس وہ لوگ جو ہمارے معجزوں پر ایمان لاتے ہیں تو کہیے کہ سلامتی تمہارے واسطے ہے تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر فرض کرلیا ہے رحمت سے کام لینا ۔ (سورۂ انعام۔ ۵۴)

(۹) وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ

جب ان کے پاس کوئی معجزہ آتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ویسی ہی باتیں نہ آئیں جو اور پیغمبروں کو ملی تھیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنا پیغام کس طرح بھیجے۔ (سورۂ انعام۔ ۱۲۴)

(۱۰) فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا

یقیناً آیا تمہارے پاس معجزہ تمہارے پروردگار کی جانب سے اور ہدایت و رحمت تو پھر کون زیادہ ظالم ہوگا اس سے کہ جو اللہ کی طرف کے معجزات کی تکذیب کرے اور ان سے روگردانی کرے۔ (سورۂ انعام۔ ۱۵۷)

(۱۱) وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

جب ہم کسی ایک معجزہ کے بجائے بدل کر دوسرا معجزہ بھیج دیتے ہیں اور اللہ زیادہ واقف ہے اس چیز کے متعلق جسے وہ اتارتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم تو اپنے دل سے گھڑتے ہو بلکہ اکثر ان میں سے علم نہیں رکھتے۔ (سورۂ نحل۔ ۱۰۱)

(۱۲) اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

وہ جو ایمان نہیں رکھتے اللہ کے معجزات پر اللہ انہیں جبراً راہ راست تک نہیں پہنچائے گا اور ان کے لئے دردناک سزا مقرر ہے۔ (سورۂ نحل۔ ۱۰۴)

(۱۳) وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا

اور ہم ان کو روزِ قیامت اندھا، گونگا اور بہرا محشور کریں گے یہ ان کا بدلا ہے اس کا کہ انہوں نے ہمارے معجزات سے انکار کیا۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ ۹۸)

(۱۴) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا

اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس کو اس کے پروردگار کی طرف کے معجزات کے ذریعہ سے یاددہانی کی گئی مگر اس نے روگردانی کی۔ (سورۂ کہف۔ ۵۷)

(۱۵) اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا

کیا دیکھا آپ نے اس شخص کو جس نے انکار کیا ہمارے معجزات کا۔ (سورۂ مریم۔ ۷۷)

(۱۶) وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾

اوراسی طرح اتارا ہے ہم نے اسے روشن معجزوں کی حیثیت سے اور اللہ منزل تک پہنچا تا ہے جسے چاہتا ہے۔(سورۂ حج۔ ۱۴)

(۱۷) وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور وہ جو اپنے پروردگار کے معجزات پر ایمان لاتے ہیں۔(سورۂ مومنون۔ ۵۸)

(۱۸) وَاَنْزَلْنَا فِیْهَاۤ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ

اور ہم نے اس میں معجزات اتارے ہیں جو روشن ہیں۔(سورۂ نور۔ ۱)

(۱۹) وَلَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ

یقیناً ہم نے تمہاری طرف اتارے ہیں واضح معجزات اور ویسی ہی باتیں جو پہلے والوں کو ملی تھیں۔(سورۂ نور۔ ۳۴)

(۲۰) لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۴۶﴾

ہم نے تارے ہیں روشن معجزات اور اللہ جس کو چاہتا ہے راہ راست تک پہنچنے کو توفیق خاص عطا کرتا ہے۔(سورۂ نور)

(۲۱) وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا

اور کہیے! الحمد للہ! عنقریب ہم تمہیں معجزات دکھائیں گے جنہیں تم پہچانتے ہو گے (سورۂ نمل۔ ۹۳)

(۲۲) وَاِذَا رَاَوْا اٰیَةً یَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَقَالُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۵﴾

جب وہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہے مگر کھلا ہوا جادو۔(سورۂ صافات۔ ۱۴، ۱۵)

(۲۳) وَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ ۖۗ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾

اور دکھلا رہا ہے تم کو وہ اپنے معجزات تو اللہ کے کن کن معجزات کا تم انکار کرو گے۔(سورۂ مومن۔ ۸۱)

(۲۴) وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْئًا ۨاتَّخَذَهَا هُزُوًا

جب ہمارے معجزات میں ان کو کسی کا علم ہوتا ہے تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔(سورۂ جاثیہ۔ ۹)

(۲۵) وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۷﴾

اور جب ان کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں ہمارے روشن معجزات تو جو لوگ انکار کرتے ہیں وہ حق کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔(سورۂ احقاف۔ ۷)

(۲۶) وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۶﴾

اور جب کہا عیسیٰ بن مریمؑ نے کہ اے بنی اسرائیل! میں اللہ کا رسول ہوں، تمہاری جانب تصدیق کرنے والا اس توریت کی جو میرے پہلے تھی اور بشارت دینے والا ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہوگا۔ اب جب وہ آیا ان کی طرف معجزات کے ساتھ تو انہوں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔(سورۂ صف۔ ۶)

(۲۷) وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنَةُ ﴿۴﴾

اورنہیں اختلاف کیاان لوگوں نے کہ جنہیں کتاب عطاہوئی مگر بعداس کے کہ ان کی طرف معجزہ آ گیا۔(سورۂ بینہ۔۴)

ان تمام آیات سے صاف ظاہر ہے کہ رسالت مآب بھی اسی طرح ''آیات'' اور ''بینات'' کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے جس طرح سابقہ کے انبیاء۔اس کے علاوہ آیات ۲۲، ۲۵، ۲۷، میں بار باراس تذکرہ سے کہ وہ لوگ سحر کہتے تھے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو غیر معمولی اور تمام انسانی طاقتوں سے بالاتر مظاہرات نظر آرہے تھے جس کا جواب ان کے پاس سواالزام جادوگری کے اور کچھ نہ تھا۔

اب اسے تعصب کی بناء پر دھاندلی کے سوا کیا کہا جائے کہ عیسائی مبلغین اس پر زور دیتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معجزہ دکھانے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ انہیں خداوند عالم کی جانب سے معجزات عطا کئے گئے۔ پادری فندر صاحب نے اپنی کتاب ''میزان الحق'' میں اس پر کافی خامہ فرسائی کی ہے۔

ان کی دیکھا دیکھی بعض دوسرے کم نظر افراد بھی صدا بلند کر بیٹھتے ہیں۔

ابھی حال ہی میں ایسے اشخاص میں سے ایک نے اس بارے میں قرآن کی ۱۴ آیتوں سے استدلال کی کوشش کی ہے۔ مگر جب ہم ان لوگوں کی استدلالی کائنات پر غور کرتے ہیں تو اصلی حقیقت صاف معلوم ہوجاتی ہے۔

بات یہ ہے کہ سنت الٰہیہ یہ رہی ہے کہ تمام انبیاء کے معجزے یکساں نہ تھے بلکہ ہر نبی کو حکمت ومصلحت کے اعتبار سے خاص معجزات عطا ہوئے۔ ہمارے رسول کو بھی اللہ کی طرف سے خاص معجزات دیئے گئے۔

مشرک لوگ عناد اور تعصب سے ان تمام معجزوں سے سرتابی کرتے ہوئے کبھی مضحکہ کے انداز میں اور کبھی بہانے کے طور پر نئے نئے معجزوں کی فرمائش کرتے تھے، حقیقت طلبی کے جذبہ سے نہیں، بلکہ صرف اپنے انکار کی سخن پروری کے لئے اور کبھی یہ تقاضا کرتے تھے کہ بالکل وہی معجزے جو سابق انبیا کو مل چکے ہیں، ان کو بھی دیئے جائیں۔ ان کے جواب میں کبھی یہ کہا گیا ہے کہ یہ معجزات پہلے انبیاء کو عطا ہوئے، پھر بھی تو لوگوں نے تکذیب کی۔ پھر اب انہی معجزات کے دکھانے کا کوئی حاصل نہیں۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ۔ (بنی اسرائیل۔۵۹)

اور کبھی خالق کی طرف سے یہ کہا گیا کہ اگر یہ معجزے دیکھیں گے، تب بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ (سورۂ انعام۔۱۰۹)

اور کبھی یہ کہا گیا کہ معجزے تمہارے سامنے موجود ہیں۔ اگر تم ایمان لانا چاہتے ہو تو وہ کافی ہیں۔

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ (سورۂ بقرہ۔۱۱۸)

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہر فرد کی فرمائش پر ہی معجزہ ہونے لگے تو معجزہ بازیچہ اطفال بن جائے اس کی غیر معمولی عظمت واہمیت باقی ہی نہ رہے۔ یقیناً آیات اور معجزات کا پیش کرنا صرف لوگوں کی طلب پر نہیں ہوتا بلکہ خود نبی ورسول کی مرضی پر بھی نہیں ہوتا۔ وہ صرف خداوند عالم کی حکمت ومصلحت کی بناء پر ہوتا ہے اور اسی لئے ارشاد ہوا ہے:

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ

کسی رسول کو اختیار نہیں کہ وہ کسی آیت کو ظاہر کرے مگر خدا کے حکم سے (سورۂ رعد۔۳۸)

اور اسی کو خاص انداز میں رسولؐ کو مخاطب کر کے ارشاد کیا جس سے درحقیقت عام لوگوں کو تنبیہ مقصود ہے:

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ (سورۂ انعام۔۳۵)

اگر آپ پر ان کی روگردانی بہت سخت ناگوار گزرتی ہے تو اگر آپ میں قدرت ہو زمین میں کوئی سرنگ لے جانے یا آسمان پر سیڑھی لگانے کی تو ایسا کیجئے اور کوئی آیت پیش کر دیجئے (ایسی جسے یہ لوگ ضرور ہی مان لیں)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی پیش کی ہوئی آیتیں ان کے ایمان لانے کے لئے بے کار ثابت ہوئیں تو اب رسولؐ کے امکان میں نہیں ہے۔۔کہ ایسی آیت پیش کریں جس سے وہ ضرور ہی ایمان لے آئیں اور رسولؐ کی زبانی ان لوگوں کے مختلف مطالبات کے جواب میں یہ کہلایا گیا ہے کہ۔۔۔ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ پاک ہے خدا کی ذات کیا میں کچھ اور ہوں سوا ایک انسان کے جو رسالت کے عہدہ پر مقرر ہوا ہے یعنی میں اللہ کے ارادہ کا پابند ہوں اور اس کے خلاف کوئی قدرت نہیں رکھتا۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ (سورۃ الاعراف۔۲۰۳)

جب آپ کوئی خاص آیت پیش نہیں کرتے، تو وہ کہتے ہیں آپ نے اس آیت کو پیش کرنے کے لئے کیوں منتخب نہ کیا؟ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے دوسری آیتیں پیش ہو چکی تھیں) کہیے کہ میں تو وحی ربّانی کا پابند ہوں۔ یہ تمہارے پروردگار کی بصیرت افروز نشانیاں اور مومنین کی ہدایت ورحمت کے ذریعہ موجود ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی ضرورت ہرگز نہیں ہے کہ جس آیت کا مطالبہ جس وقت ہو وہ ضرور ہی ان کی خواہش کے مطابق پیش کر دی جائے لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب خداوند عالم کی طرف سے درحقیقت ایسے آیات ومعجزات پیش ہو چکے ہوں جو اس نبی کی حقانیت ثابت کرنے کیلئے کافی ہوں۔لہٰذا کسی شخص کے دعویٰ نبوت کے بعد مطلق معجزہ کا مطالبہ حق بجانب ہوگا۔

لیکن معجزہ کے سامنے آنے کے بعد کسی معجزہ خاصہ کا مطالبہ ضروری نہیں کہ پورا ہو۔لہٰذا ایک طرف مذکورہ بالا آیات سے عیسائی حضرات کی مطلب برآری کی حضرت رسولؐ اکرم کو مثل انبیاء سابق معجزات ملے ہی نہیں تھے ورنہ آپ معجزہ کی خواہش کو اس طرح مسترد کیوں کرتے ہرگز صحیح نہیں ہے جبکہ انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ کے مطالبہ پر نہ صرف انکار کرنا بلکہ معجزہ کی خواہش کرنے والوں کو سخت وسست کہنا اور اپنے پاس سے نکال دینا اور یہ تصریح کرنا کہ اس زمانہ والوں کو کوئی نشانی نہ دکھلائی جائے گی، موجود ہے۔

دوسری طرف بہائی اور قادیانی جماعتوں کا یہ استدلال بھی غلط ہے کہ نبی ورسول کے لئے معجزہ کی ضرورت ہی نہیں اور نہ کسی کو نبی سے معجزہ کے مطالبہ کا حق ہے۔ یہ آیات قرآنی سے ثابت بھی نہیں ہوتا اور عقلاً بھی درست نہیں ہے معجزہ یعنی کوئی حقیقت کی خاص نشانی اگر نہیں ہے تو اس نبی پر ایمان لانے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور سچے جھوٹے میں امتیاز کا کوئی معیار نہیں ہوگا۔

اعجاز قرآن

صدر المتالہین اپنی شرح اصول کافی (مطبوعہ ایران ۱۴۴۱) میں لکھتے ہیں کہ معجزہ وہی ہے جو رسالت کی دعویٰ کے ثبوت میں اعلان بے مثالی کے ساتھ پیش ہوا اور پھر دنیا اس کے مقابلہ میں عاجز ہے قرآن میں یہ تمام باتیں موجود ہیں۔ اسے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حقانیت کی دلیل بنا کر پیش کیا۔ فصحائے عرب کو دعوت مقابلہ دی اور جوش دلانے والے انداز میں ان کے جذبہ غیرت وحمیت کو تازیانے لگائے مگر وہ باوجود فصاحت کلام وطاقت بیان میں نازش وافتخار کے قرآن مجید کے جواب سے عاجز وقاصر رہے اور بجائے جواب دینے کے مرنے مارنے پر تیار ہو گئے جس میں انتہائی جانی اور مالی نقصانات برداشت کرنا پڑے۔

حالانکہ قرآن اول روز سے ان کی ان تمام زحمتوں اور مشقتوں کا معمولی سا حل پیش کر رہا تھا کہ وہ اس کے جواب میں پورا نہ سہی، چھوٹے ہی کسی سورہ کا جواب پیش کر دیں۔

یقیناً اگر انہیں اس پر قدرت ہوتی تو وہ قرآن کے مطالبہ کے مطابق عوض جنگی ہنگامہ آرائی کے ادبی معرکہ آزمائی کرتے اس صورت میں بغیر کسی خونریزی اور نتیجہ تباہی و بربادی کے اسلام کی آواز پست ہو جاتی لیکن جب انہوں نے قرآن کے پے در پے تازیانوں کے باوجود اس میدان سے گریز ہی پسند کیا اور حرب وضرب، جنگ وجدال کو اس کے تمام مہلک نتائج کے باوجود مقابلہ کے لئے اختیار کیا تو اس سے ان کی عاجزی طشت از بام ہو گئی اور قرآن مجید کا معجزہ ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا۔

شیخ صدر الدین شیرازی کے لفظوں میں:

دفع تحذی المتحدی بنظم الکلام اھون من الدفع السیف۔

دعوائے بے مثالی کرنے والے کی رد۔ ایک کلام مرتب کر کے آسان ہونا چاہئے تھی، بہ نسبت تلوار کے ساتھ مقابلہ کے

علامہ نیشاپوری نے کہا ہے:

فاضطرتھم التعجیز الی ایثار الاصعب علی الاسھل فتبین ان الاسھل فی النظر الاصعب فی نفس الامر و ذالک من اول الدلیل علی حقیقۃ المنزل و صدق المنزل علیہ

یہ معجزانہ حیثیت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے آسان راستے کو چھوڑ کر مشکل راستہ اختیار کیا جس سے ثابت ہوا کہ جو ظاہری نگاہ میں آسان تھا (یعنی قرآن کا جواب پیش کرنا) وہ حقیقت میں زیادہ مشکل تھا اور یہ بہت بڑا ثبوت ہے اس کلام کی حقانیت کا جو اتارا گیا اور اس شخص کی سچائی کا جس پر وہ اتارا گیا ہے۔ (غرائب القرآن۔ ج ۱۔ ص ۲)

پھر جب اس دور کے فصحائے عرب باوجود اس اقتدار خاص اور کمال کے قرآن کے مقابلہ میں عاجز رہے تو دوسروں کو مجال دم زدن کہاں ہو سکتی ہے۔ اس عاجزی کا تعلق براہ راست اگرچہ فصحائے عرب سے تھا مگر اس سے حقانیت کا جو ثبوت ہے وہ ہمہ گیر حیثیت رکھتا ہے اس لئے یہ معجزہ خاص عرب کے لئے نہیں تھا بلکہ تمام خلق کے لئے۔

اس پہلو کو قدیم ترین عربی کے ادیب عمرو بن بحر جاحظ نے ان الفاظ میں نمایاں کیا ہے۔

ان عجز العرب عن مثل نظم القرآن حجۃ علی العجم من جھۃ اعلام العرب العجم انھم کانوا عن ذالک

عجزة.([1])

قوم عرب کا قرآن کے سے کلام کو پیش کرنے سے عاجز رہنا غیر عرب تمام دنیا کے سامنے حقانیت کا ثبوت ہے جب کہ قوم عرب نے اپنی عاجزی کا اس کے مقابلہ سے اظہار کر دیا ہے۔(البیان والتبیین ۔ج۳۔ الطبعة الاولیٰ ۔ص۱۷۱و ط۴ھ ص ۲۷۰)

اور پھر اس پر حقیقت یہ ہے کہ نزول قرآن کو چودہ سو برس ہوگئے اور قرآن اسی ایک آواز سے اپنی مقابل دنیا کے ہر طبقہ کو صدا دے رہا ہے اور عالم کی فضا اس کے دعوائے بے مثالی سے گونج رہی ہے اور اس کے مخالف اپنی تحریک کی اشاعت اور قرآن کی مخالفت میں سلطنتوں کی طاقت، مال ودولت کا زور اور گراں قدرت خزانوں کا سرمایہ صرف کرتے رہے ہیں۔

لیکن قرآن کی آواز (لا یاتمن بمثلہ) آج تک سچی ہے۔اور سب طرح کی مخالفتیں اور قرآنی عظمت کے گھٹانے کی سرتوڑ کوششیں ہوئیں قرآن پر (بزعم خود) ادبی اعتراضات کئے گئے۔قرآن واقعات کو بخیال خود مشکوک ثابت کیا گیا۔قرآن کے مضامین کو کتب سابقہ سے ماخوذ بتایا گیا۔قرآن میں مسلمانوں کی کتابوں سے تحریف کے ثبوت پیش کئے مگر یہ نہ ہوا کہ کوئی ایک قرآن کے کل نہ سہی، بعض کا جواب تحریر کر دیتا۔

جیسا کہ صدر شیرازی نے تحریر فرمایا:

لو کان بظهر فان ارذل الشعراء لم تحدّوا بشعرهم و عورضوا ظهرت المعارضات و المناقضات الجارية بينهم

اگر ایسا کبھی بھی ہوا ہوتا تو نمایاں ہوتا اس لئے کہ معمولی شعراء نے جب اپنے کلام کے لئے چیلنج کیا اور ان کے جواب دیئے گئے تو یہ مقابلے والے جوابات شہرہ آفاق ہوگئے۔(شرح اصول اصول کافی مطبوعہ ایران۔ص ۴۴۱)

پھر یہاں صورت حال یہ ہے کہ حقانیت قرآن کی مخالف جماعتیں بکثرت ہیں۔چاہے وہ جواب کسی ایک مذہب یا جماعت کی کسی فرد کا نتیجہ قلم ہوتا ہے مگر یہ تمام جماعتیں اس کی اشاعت میں متفق ہوجاتیں بلکہ اگر وہ بالکل اس کے مثل نہیں، کچھ اس کے لگ بھگ اور ذرا قریب بھی ہوتا تو یہ لوگ اپنے تعصب سے اسے قرآن سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے اور سب مل کر یہ کہتے کہ قرآن کا دعویٰ (معاذ اللہ) غلط ہوگیا۔جب ایسا نہیں ہوا تو صاف ثابت ہوا کہ قرآن کے مقابلہ میں دنیا کی طاقت حقیقۃً قاصر تھی، قاصر ہے اور یقین کرنا چاہیے کہ ہمیشہ قاصر رہے گی۔

سلسلہ معجزات میں قرآن کا امتیاز

تمام انبیاء آیت وبینات یعنی معجزات کے ساتھ مبعوث ہوئے لیکن ان کی نبوتوں کے چراغ خاموش ہوگئے اس لئے کہ ان کی بنیاد ایسے معجزات پر تھی جو وقتی حیثیت رکھتے تھے۔اس وقت وہ منکروں پر اتمام حجت کے لئے کافی تھے مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ان کی صحت وواقعیت روایات اور مختلف المضمون حکایات کی رہین منت ہوگئی۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر یہود سے موسیٰؑ کی نبوت کا ثبوت کوئی شخص منکر ہو کر طلب کرے یا عیسائیوں سے عیسیٰؑ کی نبوت کا، تو انہیں سوا خاموشی کے چارہ کار نہیں کیوں کہ ان کی کوئی نشانی جیتی جاگتی ہوئی حیثیت نہیں رکھتی اور کسی نبی نے ایسا معجزہ اپنے بعد نہیں چھوڑا جو تمام اہل عالم

([1])۔البیان والتبیین جلد۳۔الطبقہ الاولیٰ ص۱۷۱ و ط ۴ ص ۲۷۰

کے سامنے رکھ دیا جائے کہ ہر زمانہ کے لوگ اپنے اپنے دور کے ذرائع اور اپنے ترقی یافتہ دماغوں کے معیار سے اس کا جانچ سکیں اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کر سکیں۔

بس ایک پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جنہوں نے معجزہ ایسا پیش کیا جو آپؐ کی نبوت کے لئے ہر دور میں دلیل حسّی کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر زمانہ میں حضرت کی نبوت کو تقلیدی حیثیت سے نکال کر تحقیقی دائرہ میں لانے کا ضامن ہے یہ قرآن ہے جس کے زیر دامن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا چراغ انقلابات زمانہ کی ہزاروں آندھیوں میں بھی روشن ہے اور اپنے اعجاز کی روح کے لئے ہوئے ہر انسان کو غور وخوض کی دعوت دیتا ہے اور ہر ادیب جو قرآن کی زبان کو بحیثیت عربی کے سمجھ سکتا ہے (چاہے وہ ایمان رکھنے والوں میں سے نہ ہو) پہلی نظر میں یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک زندہ زبان کے ایک اہم کارنامے کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہی دلچسپی اسے کچھ زیادہ غور پر آمادہ کر دے تو وہ آخر میں یقین کرے گا کہ وہ ایک زندہ نبوت کی زندہ دستاویز کا مشاہدہ کر رہا ہے۔

قرآن مجید کی حیثیتِ اعجاز

وہ لوگ جو قرآن مجید کو معجزہ سمجھتے اور خداوندی کلام تسلیم کرتے ہیں ان میں اس حیثیت سے تھوڑا سا اختلاف ہو گیا ہے کہ قرآن مجید کس حیثیت سے معجزہ ہے؟ جناب سید مرتضیٰ علم الہدیٰؒ اس کے قائل ہو گئے کہ قرآن صرف وسلب قوی کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خالق کی قوت قاہرہ کا یہ ایک کرشمہ ہے کہ جب کوئی قرآن کا جواب لکھنا بھی چاہئے تو اس کی قوت سلب ہو جائے اور اس کی طاقت جواب دیدے۔

اگر چہ منطقی طور پر نتیجہ اعجاز کے لحاظ سے اس قول سے کوئی نقصان نہیں ہوتا مگر واقعیت کے لحاظ سے وہ درست نہیں ہے باوجود سید کی جلالت قدر کے جمہور علماء نے اس کو رد کر دیا۔ کیونکہ ان کے قول کا مطلب یہ قرار پاتا ہے کہ قرآن میں خود کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کا جواب لانے سے فصحائے عرب قاصر ہوتے لیکن یہ اللہ کی قدرت ہے کہ اس کا جواب دینے پر کسی کو قدرت نہیں ہوتی اور جب کوئی شخص اس کا جواب لکھنا چاہئے تو اس کی قوت کو سلب کر دیتا ہے اور موانع پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن بے لوث وجدان کا فیصلہ ہے کہ جب ہم جواب کی نیت سے خالی الذہن ہو کر بغیر کسی خیال معارضہ ومقابلہ کے بھی آیات قرآن پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ انسانی سطح سے بلند شان رکھتا ہے چنانچہ شریف مرتضیٰ کے چھوٹے بھائی جامع نہج البلاغہ علامہ شریف رضی جو عربی ادب میں بڑے بھائی سے اونچا درجہ واقعاً چاہے نہ رکھتے ہوں لیکن بحیثیت ادیب ان سے زیادہ نمایاں ضرور ہیں اپنی بیش قیمت تصنیف "حقائق التاویل" مطبوعہ نجف اشرف (صفحہ ۱۰۲) میں لکھتے ہیں:

انه ليرىٰ فيه عند الانفراد بتلاوته من غرائب الفصاحة و نواقب البلاغته و نوادر الخواطر عن الكلام عليه والايضاح من عجائب ما فيه.

انسان جب تنہائی میں اس کی تلاوت کرے تو فصاحت کے ایسے عجائب انداز بلاغت کے حیرت ناک اسلوب بے مثال الفاظ اور حکمتوں کے ایسے سرچشمے دیکھے گا جس پر گفتگو کرنے اور ان عجائبات کی تشریح کرنے سے انسانی ذہن عاجز ہو گا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اعجازی صفت خود قرآن میں مستقل طور پر موجود ہے، نہ یہ کہ کسی آدمی کے مقابلہ کی نیت سے قلم اٹھاتے وقت ہر دفعہ اللہ کی طاقت کے لئے حرکت میں آنے کی ضرورت ہو اور ایسے آدمی کے مقابلہ میں خاص طور سے وہ اپنی قدرت سے کام لیا کرے۔

ایک دوسرا خیال جو بالکل غلط ہے، یہ ہے کہ قرآن بحیثیت اپنی فصاحت و بلاغت کے معجزہ نہیں ہے اور نہ باعتبار اپنے الفاظ و معانی کی

جامعیت کے بلکہ اس کے معجزہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک مکمل اور کامل اثر ونفوذ رکھنے والا قانون ہے اور اس میں حسب اقتضائے زمانہ انسان زندگی کے تمام شعبوں کے لئے احکام بوجہ اتم موجود ہیں۔

یہ خیال اس لئے صحیح نہیں ہے کہ اس صورت میں قرآن مجید کے بس مجموعی طور پر مقابلہ کا سوال پیش کیا گیا ہوتا نہ کہ دس سورتوں کے مقابلہ کی دعوت بلکہ آخر میں صرف ایک سورہ کے جواب کی طلب پھر یہ کہ لا جوابی کا اعلان تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ ابتدا ہی سے ہونے لگا، لیکن یہ جہت اعجاز پیدا ہوتی ہے پورے قرآن کی تنزیل کے بعد اگر اس کے معجزہ ہونے کے یہ معنی ہوتے تو مطالبہ جواب کا تمام قرآن کے نازل ہونے کے بعد ہوتا نہ کہ اثنائے تنزیل میں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہت اعجاز کوئی ایسی ہے جو کل وجز میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔

بے شک یہ بھی درست نہیں ہے کہ قرآن کی اعجازی حیثیت بس فصاحت و بلاغت میں منحصر ہے، فصحائے عرب کے لئے وہ بحیثیت فصاحت معجزہ تھا مگر چوں کہ وہ ہر زمانہ میں باقی رہنے والی دلیل بیّن بنا کر بھیجا گیا لہٰذا اس میں بلند اور پست ظاہر بین اور دوررس ہر درجہ کے دماغوں کے لئے جہات اعجاز موجود ہیں اور فصاحت و بلاغت والے اعجاز کے علاوہ وہ باعتبار معارف وحقائق، باعتبار نکات و دقائق، باعتبار جامعیت و وسعت علوم، باعتبار متانت وبلندی تہذیب اور پھر باعتبار اپنے تعلیمات و ہدایت کے ہر دور زمانہ کے لئے معجزہ ہے۔

قرآن کے تازہ ترین معجزات

طبیعات وفلکیات میں دنیا برابر ترقی کرتی جارہی ہے اور اسی میں کوئی شبہہ نہیں کہ بہت سے دروازے حکمت وفلسفہ کے جو سابق زمانہ میں بند تھے وہ اب کھل گئے ہیں یا کھل رہے ہیں اور سینکڑوں رموز جو اس کے پہلے راز سربستہ کی حیثیت رکھتے تھے اب منکشف ہوتے جاتے ہیں۔

اگر چہ ان انکشافات میں کچھ ظنی یا وہمی بھی ہوتے ہیں اور ان میں انداز، تخمین یا تخیل اور تمثیل وقیاس کی آمیزش ہوتی ہے اس لئے میں اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ مذہبی آیات وروایات کو کھینچ تان کر جدید تحقیقات پر منطبق کیا جائے۔

یہ کوشش اس لئے صحیح نہیں کہ انسانی فلسفہ وعلم تبدیل ہونے والی چیز ہے اور دین ثابت و برقرار حقیقتوں پر مبنی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ثابت ولازوال چیز کا متغیر اور تبدیل چیز سے دائمی طور پر تطابق نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا اگر دینی تصریحات کسی موجود تحقیقات فلسفی کے خلاف ہوں تو ہمیں یہ ماننا ناگزیر ہے کہ فلسفہ ابھی اس بلندی کے درجہ تک نہیں پہنچا کہ اس حقیقت کا صحیح انکشاف ہوسکے۔ پھر بھی اس میں شبہہ نہیں کہ سائنس کے بعض تازہ معلومات ایسے ہیں جن کا پتہ قرآن اور احادیث سے صاف صاف چلتا ہے۔ اس قسم کے آیت ہم کو قرآن کے تازہ ترین اعجاز کے پہلو سے روشناس کرتے ہیں کہ وہ چیزیں جو ہزاروں سال تک پردہ خفا میں رہیں اور اب ہزاروں قسم کے جدید آلات رصد یہ اور مختلف قسم کے دوربینوں سے ان کا پتہ چلایا گیا ہے نبی امیؐ کے لائے ہوئے قرآن میں وہ تیرہ چودہ سو برس پہلے مذکور تھیں۔

بعض آیتیں قرآن کی ایسی ہیں کہ ان کو جب ہیئت قدیم کے قدیمی مسلمات کی بناء پر جانچا گیا تو کسی طرح ان کے ظاہری طور پر معنی سمجھ میں نہ آئے لہٰذا مفسرین نے جو ان علوم کو بالکل درست مانتے تھے ان آیات میں تاویلات سے کام لیا لیکن اب جس وقت کی ہیت نے پلٹا کھایا ہے اور علم کے دور میں انقلاب آیا ہے تو وہ آیات بغیر تاویل کے اسی حقیقت کو ظاہر کررہے ہیں جن کا انکشاف اب ہوا ہے۔ عراق کے فلسفی عالم علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی نے ایک کتاب ''الھیئۃ دارالاسلام'' تقریباً آج سے نصب صدی پہلے تحریر فرمائی تھی جو عراق میں شائع ہوئی اور اس کا اردو

ترجمہ مولانا محمد ہارون صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ نے ''البدر التمام'' کے نام سے کیا جو دفتر ''البرہان'' لدھیانہ سے شائع ہوا۔

اس میں اگر چہ بہت سے تاویلات پہلی قسم میں داخل ہیں جن کی نوعیت سے میں اختلاف کا اظہار کر چکا ہوں لیکن بہت سے نمونے دوسری قسم کے بھی موجود ہیں اور بعض مسائل انکشافات جدید کے واقعی قرآن و احادیث کے تصریحات سے پورے طور پر ثابت ہوتے ہیں جن میں کسی تاویل سے کام نہیں لیا گیا ہے۔

مصر کے مشہور عالم شیخ طنطاوی جوہری کی کتاب ''القران و العلوم العصریہ'' اور شیخ عبدالحلیم علی بدیر ازہری کی کتاب ''القرآن و العلوم العصریہ'' اور ''معجزات القرآن العشرین'' بھی اس سلسلہ میں اچھی کتابیں ہیں لیکن شیخ طنطاوی نے جو اس رنگ میں پوری تفسیر لکھ ڈالی ''جواہرا القرآن'' وہ ویسی ہی دور از کار تاویلات اور غیر قانونی علوم کی بہتات سے باوجود اپنی وسعت دامن اور مصنف کی انتہائی عرق ریزی کا ثبوت ہونے کے بحیثیت تفسیر غیر مقبول شے بن گئی۔ عم معظم مولانا سید احمد صاحب قبلہ علامہ ہندی کی کتاب ''فلسفہ الاسلام'' میں بھی قرآن اور علوم عصریہ میں تطابق کے سلسلہ میں کافی فکر انگیز مواد موجود ہے جس کے بہت سے اجزاء غیر مطبوعہ رہ گئے اور معلوم نہیں قلمی شکل میں بھی محفوظ ہیں یا نہیں۔

قرآن کے امتیازی خصوصیات بحیثیت اسناد واعتبار

ہم نے اپنی کتاب ''تحریف قرآن کی حقیقت'' میں بہت تفصیل کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی ہے، کہ جتنی کتابیں اس وقت الہامی سمجھی جاتی ہیں اور وحی آسمانی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں ان کے متعلق اگر خود ان کے ماننے والوں کے تحریرات کی روشنی میں نظر کی جائے تو ان کی تاریخ زندگی ایسے حوادث و انقلابات کا مجموعہ نظر آتی ہے جن کی بناء پر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے کسی جزء کا بھی دنیا میں وجود باقی ہے اور جسے اب اس کے متبعین سر اور آنکھوں پر رکھ رہے ہیں اور خدا کا کلام سمجھتے ہیں اس میں کوئی آدھا یا چوتھائی جزء بھی ایسا ہے جو اس حقیقی وحی سے عیناً مطابق ہو جو پیغمبروں پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے برخلاف جب ہم اسلامی کتاب ''قرآن کریم'' پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ایسی تمام کمزوریوں سے بلند نظر آتی ہے اور اس کی تاریخ ایسے خصوصیات پر مشتمل ملتی ہے جو اس کے استناد و اعتبار کے ضامن ہیں۔

پہلی خصوصیت:

امت اسلامیہ کو جو قرآن مجید کی امانت دار اور اس کی حفاظت و نگہداشت کی براہ راست ضامن سمجھی جا سکتی ہے، وہ حقیقی معنی میں باختلاف زمانہ اس کے صحیح تعلیمات سے کتنی ہی دور جا پڑی ہو اور اس کی بناء پر اہل معنی اس پر ارتداد کا حکم لگا دیں لیکن ایسا کوئی وقت نہیں آیا کہ اس نے قرآن کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کا معاذ اللہ اعلان کیا ہو اور برملا کفر و شرک اختیار کیا ہو بلکہ جس وقت سے مسلمانوں نے دنیائے وجود میں قدم رکھا ان کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہوتی رہی اور وہ برابر اسلام کو اپنا نشان قومیت اور قرآن کو اپنا طرہ دستار بنائے رہے

دوسری خصوصیت:

قرآن مجید کے متعلق کبھی کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی کہ اس کا نسخہ کسی خاص فرد یا جماعت کے پاس محدود رہے بلکہ عام طور پر مسلمانوں کو یہ حق حاصل رہا کہ وہ اسے لکھیں نقل کریں اور از بر یاد کریں۔

تیسری خصوصیت:

قرآن اپنی اصلی زبان (عربی) میں موجود ہے اور صرف اتنا نہیں بلکہ ہر مسلمان قرآن بس اسی کو سمجھتا ہے جو خاص الفاظ پر مشتمل ہے ان کے شرعی احکام بھی اسی قرآن سے تعلق رکھتے ہیں، نماز میں اس کا پڑھنا لازم اور دوسرے اوقات میں اس کی تلاوت باعث اجر وثواب یہ احکام تراجم قرآن پر مرتب نہیں ہیں ترجمہ جس زبان کا ہو وہ ترجمہ ہی کہلاتا یہ کوئی مسلمان اسے قرآن نہیں سمجھتا۔

چوتھی خصوصیت:

قرآن مجید کے آیات کو متفرق طور پر خود رسالت مآبؐ بوقت ورود ہی قلمبند کرالیا کرتے تھے اور پھر ان متفرق آیات کو بعد حضرتؐ کی وفات کے تقریباً فوراً ہی کتابی شکل میں جمع کرلیا گیا جن کی تصدیق وقتاً فوقتاً ان ہستیوں نے کی جنہیں حفاظت قرآن کا ذمہ دار بنایا گیا تھا۔

پانچویں خصوصیت:

قرآن میں خود قدم قدم پر اس کے مُنَزِّلٌ مِنَ اللہ ہونے کا اعلان ہے اور کسی دوسرے شخص کا کیا ذکر رسول کا ذاتی کلام ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

چھٹی خصوصیت:

قرآن کی اصلیت وحقانیت کے بارے میں مسلمانوں میں باوجود آپ کے سینکڑوں اختلافات کے کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ اس اسے متفقہ حیثیت سے کلام الٰہی سمجھتے ہیں۔

ساتویں خصوصیت:

قرآن کے متعلق اس کے ماننے والے اس نقطہ پر متفق ہیں کہ وہ دنیا کے آخری دور تک رہنما بنا کر بھیجا گیا ہے اور اس کے تعلیمات کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہیں ہیں۔

آٹھویں خصوصیت:

قرآن جب سے کتاب شکل میں مدون ہو کر مسلمانوں میں منتشر ہوا، اس کی ایک ایک لفظ کی ہر دور میں جانچ پڑتال ہوتی رہی اور تمام مسلمان بلاتفریق فرقہ اس کی کتاب، قرات اور تفسیر وتشریح کی طرف متوجہ رہے جس سے قرآن مجید میں اب کسی دور میں تصرف اور تحریف کا امکان نہیں رہا۔

نویں خصوصیت:

قرآن مجید کا انداز بیان خود ہی اپنا معیار ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی بڑے سے بڑے فصیح کلام میں بھی قرآن کا ایک جملہ آجاتا ہے تو وہ اس طرح نمایاں ہوتا ہے جیسے سنگریزوں میں موتی اور نہیں تو ستاروں میں ماہتاب۔

پانچواں تبصرہ

جمع وتدوین قرآن

قرآن مجید تدریجی حیثیت سے تیئس برس کے عرصہ میں رسالت مآبؐ پر نازل ہوا۔ مختلف حالات اور واقعات کی مناسبت سے آیات اور کبھی پورے پورے سورے آپؐ پر اترتے اور آپؐ ان کی تبلیغ فرما دیتے تھے اور کوئی لکھنے والا جب آجاتا تھا تو اسے کاغذ یا چمڑے یا درخت کی چھال جو کچھ ملتا اس پر لکھوا دیا کرتے تھے۔

لیکن عرب میں کتابت اور قرات کا رواج بہت کم تھا اس لئے ذوق حفظ ان میں ترقی پر تھا۔ لہٰذا قرآن کے لئے بھی شروع میں حفظ ہی کا طریقہ اختیار کیا گیا اور بیرون جات میں جہاں جہاں لوگ مسلمان ہوتے وہاں قرآن کی تعلیم کے لئے معلمین کو روانہ کیا جاتا تھا اور جتنا جس کو ممکن ہوتا تھا اتنا اس کو قرآن حفظ کراتے تھے لیکن یہ حفظ تنہا حفاظت وحی الٰہی کی ضمانت نہیں بن سکتا تھا جب تک وہ کتابی شکل میں مدون اور محفوظ نہ ہو۔

رسولؐ کے حکم سے بروقت جو کتابت ہوتی تھی وہ متفرق اور غیر مرتب صورت رکھتی تھی اس لئے بعد رسولؐ جو سب سے اہم ضرورت تھی وہ یہ کہ ان اجزاء کو مرتب صورت سے کتاب کی شکل میں لے آیا جائے۔

مگر یہ عام صحابہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ کتاب کے اوراق ہوں تو انتہائی زحمت کے ساتھ سہی کوئی ان کی ترک ملا دے مگر آیتیں قرآن کی جو متفرق چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹکڑوں' چمڑے کے حصوں اور درخت خرما کی چھالوں پر ہوں، ایک ڈھیر کی صورت میں کسی انسان کے سامنے رکھ دی جائیں تو کس میں قدرت ہے کہ انہیں اصل سلسلے کے مطابق مرتب کر دے۔

پھر صحابہ تو ہر وقت رسولؐ کی خدمت میں موجود نہیں رہتے تھے ان میں سے بہت سے حضرات بعد ہجرت اسلام لائے تھے اور قرآن اس کے پہلے سے نازل ہو رہا تھا۔ ان میں زیادہ تر تجارت پیشہ اور کاروباری لوگ تھے ان میں سے اکثر بس نماز میں پڑھنے بھر کے لئے جتنے قرآن کی ضرورت تھی وہ یاد کر لیتے تھے پورا قرآن ہر ایک آدمی کہاں یاد کر سکتا تھا چہ جائیکہ اس کے آیات کی پوری ترتیب اور شان نزول اس کے لئے ایسی ہستی کی ضرورت تھی جسے خاص طور پر خدا اور رسولؐ کی طرف علم قرآن عطا ہوا ہو جو آیات کی ترتیب اور شان و کیفیت نزول سے پورے طور پر مطلع ہو یہ ذات حضرت علی بن ابیطالبؑ کی تھی جو خالق کی جانب سے اس فریضہ کو انجام دینے کے ذمہ دار تھے اور رسولؐ نے انہی کو تمام دینی امانتوں کا محافظ بنایا تھا۔ چنانچہ پیغمبر خدا کی ودیعتیں سب انہیں کے سپرد تھیں اور وہ قرآن کا مکتوبی ذخیرہ بھی تمام و کمال انہی کے پاس تھا اور رسالت مآبؐ نے آپ کے لئے اعلان فرما دیا تھا کہ عَلِيٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ وَ الْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِيٍّ "علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ" اور اس سلسلے کا نام لے کر جس کی پہلی کڑی آپ تھے قرآن کے ساتھ مرکز تمسک قرار دیا تھا اس طرح کہ اِنِّیْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِيْ اَهْلَبَيْتِيْ۔ مگر رسولؐ کی وفات کے بعد جب اقتدار اپنے مرکز سے ہٹا تو ارباب اقتدار کے سیاسی مصالح اس کے متقاضی نہ تھے کہ قرآن کے ساتھ علی ابن ابیطالبؑ کا نام ہر مسلمان کے ذہن پر نقش ہو۔ لہٰذا باوجودیکہ حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام نے سب سے مقدم یہی کام سمجھا اور اسے اس سرگرمی سے انجام دیا کہ قسم کھائی کہ ردا اپنے دوش پر نہ ڈالوں گا اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر سے باہر نکل کر کہیں آؤں جاؤں گا نہیں جب تک

قرآن کو کتابی صورت سے اس کی تنزیلی ترتیب کے مطابق جمع نہ کر دوں۔ چنانچہ چند ہی روز میں آپ نے اس کام کو انجام دے دیا، مگر جب اسے آپ نے ارباب اقتدار کے سامنے پیش کیا تو وہاں سے اسے رد کر دیا گیا اور کہا' ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ خاموشی کے ساتھ اپنے اس جمع کردہ مصحف کو واپس لائے اور اپنے ذخیرہ خاص میں محفوظ کر دیا۔

اب کچھ عرصہ تک اہل اقتدار ملک کے مختلف اطراف میں بھڑکتے ہوئے بدامنی کے شعلوں کو بجھانے میں مصروف رہے' جب اس سے فرصت ہوئی اور ان لڑائیوں میں حفاظ قرآن کی کثیر تعداد قتل ہوگئی اور خوف پیدا ہوا کہ حاملانِ قرآن کے قتل ہونے کے سبب کہیں قرآن کا کثیر حصہ تلف نہ ہو جائے تو اس وقت جمع قرآن کی ضرورت محسوس کی اور اس خدمت کو زید بن ثابت کے سپرد کیا گیا جو رسالت مآبؐ کے آخری زمانہ کے کم عمر صحابہ میں سے ایک فرد تھے اور حفظ قرآن شوق و ذوق سے کیا تھا، انہوں نے بڑی جانفشانی و عرق ریزی کے ساتھ کچھ اپنے حافظہ کی مدد سے اور کچھ صحابہ کے پاس سے متفرق طور پر تھوڑے تھوڑے اجزاء جو تھے، ان سب کو سامنے رکھ کر اور دوسرے صحابہ سے پوچھ کر قرآن مجید کو حکومت وقت کے زیر سایہ جمع کیا۔

اب یہ وہی حکومت کے سیاسی تقاضے تھے کہ جمع قرآن کیلئے اتنے پاپڑ بیلنے کے بجائے اس ایک ذات کی انجام دی ہوئی خدمت سے فائدہ اٹھایا جاتا جو مسلم طور پر سے بڑی عالم قرآن ہستی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے ترتیب آیات تنزیل کے مطابق نہ ہو سکی اور اس سے یہ بڑا علمی خسارہ ہو گیا کہ ناسخ و منسوخ کی شناخت مشکل ہوگئی اور بعض آیات کی تاویل و تفسیر جو خود سیاق و سلسلہ کلام سے معلوم ہو جاتی اب دشوار ہو گئی جس پر اثنائے تفسیر میں ہم جا بجا روشنی ڈالیں گے۔

لیکن یہ خود معنوی طور پر قرآن مجید کے اسلوب کا ایک معجزہ تھا کہ غیر مرتب شکل میں یکجا ہونے کے بعد بھی اس کے آیات کی افادیت برقرار رہی اور اس کی معجزانہ شان فصاحت و بلاغت کو صدمہ نہیں پہنچا۔ اس کے ساتھ چونکہ حضرت علیؑ ابن ابیطالب علیہ السلام نے اس کے بالمقابل اپنے جمع کردہ قرآن کی اشاعت کرنا ضروری نہیں سمجھی۔ اس سے یقینی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ موجودہ صورت سے جو کتاب جمع ہوئی اس میں کوئی فروگذاشت ایسی نہیں ہوئی ہے جس سے اس کی حقانیت کو صدمہ پہنچا ہو۔ اس طرح واقعی و حقیقی اجماع ہو گیا اس قرآن کی حقانیت پر جو بین الدفتین موجود ہے جس میں کسی اسلامی فرقہ کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

چھٹا تبصــرہ

نفیٔ تحریف

اگر حضرت امیر المومنین علیؑ بن ابیطالبؑ اس قرآن کی اشاعت پر جوارکان حکومت کی جانب سے مرتب کیا گیا تھا صرف سکوت اختیار فرماتے تو بھی وہ اس کی حقانیت کی دلیل ہوتا واقعہ یہ ہے کہ حضرت نے اس پر سکوت ہی نہیں فرمایا بلکہ اپنے کلمات میں گویا اس پر مہر تصدیق ثبت کردی۔اس کے اتباع کی دعوت دی اور اسے معاش اور معاد کے تمام معاملات میں حجت خدا بتلایا۔

اسے میں ہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ہر نقطہ نظر کے شیعہ اس پر متفق ہیں چنانچہ ''عقائد و مسلمات'' کے نعرے لگانے والی جماعت کے ایک رکن رکین مولوی سبط الحسن صاحب ھنسوی اپنے مضمون ''تاریخ خط و خطاطی میں علیؑ کا مقام'' (شائع شدہ الارشاد بڈگام کشمیر جمادی الثانی و رجب ۸۶ ۱۳ھ اکتوبر و نومبر ۱۹۶۶ء میں لکھتے ہیں:

''باوجود مصروفیت حضرتؑ نے متعدد نسخے قرآن کے تحریر فرمائے جو نقل ہیں اسی نسخہ قرآن کی جس پر امت نے اجماع کیا تھا گویا اس عمل سے امیر المومنینؑ نے مروجہ مصحف کے کلام الٰہی ہونے کی تصدیق فرمادی جو آپ نے منصب امامت کا فرض اولین تھا۔(الارشاد۔ص ۲۷)

نہج البلاغہ میں جو آپ کے ارشادات کا مجموعہ ہے اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں

ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

اَللّٰهَ اللّٰهَ اَيُّهَا النَّاسُ فِيمَا اسْتَحْفَظَكُمْ مِنْ كِتَابِهِ، وَاسْتَوْدَعَكُمْ مِنْ حُقُوقِهِ، فَإِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهُ لَمْ يَخْلُقْكُمْ عَبَثًا، وَلَمْ يَتْرُكْكُمْ سُدًى، وَلَمْ يَدَعْكُمْ فِي جَهَالَةٍ وَلَا عَمًى، قَدْ سَمَّى آثَارَكُمْ، وَعَلِمَ أَعْمَالَكُمْ، وَكَتَبَ آجَالَكُمْ، وَأَنْزَلَ عَلَيْكُمُ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَعَمَّرَ فِيكُمْ نَبِيَّهُ أَزْمَانًا، حَتَّى أَكْمَلَ لَهُ وَلَكُمْ. فِيمَا أَنْزَلَ مِنْ كِتَابِهِ دِينَهُ الَّذِي رَضِيَ لِنَفْسِهِ.

اللہ کا پاس کرواے لوگو! کتاب خدا کے بارے میں جس کا محفوظ رکھنا اس نے تم سے چاہا ہے اور تمہیں اس کے حقوق کا امانتدار بنایا ہے کیوں کہ اللہ نے تم کو بیکار نہیں پیدا کیا اور نہ یوں ہی چھوڑ رکھا ہے اور نہ تمہیں بے خبری اور اندھے پن میں چھوڑ دیا ہے اس نے تمہارے حالات مقرر کردیئے اور تمہاری کارگزاریوں پر نشان کھینچ دیئے ہیں اور تمہاری عمریں قلمبند کردی ہیں اور تم پر کتاب اتاری ہے جس میں ہر چیز کا بیان ہے اور اس نے تمہارے درمیان اپنے نبیؐ کو ایک زمانہ تک زندہ رکھا یہاں تک کہ اس نے ان کے لئے اور تمہارے لئے اس کتاب میں جو اتاری ہے اپنے اس دین کو مکمل کردیا ہے جسے اس نے اپنا پسندیدہ قرار دیا ہے۔(خطبہ ۸۴)

دوسرے خطبہ میں ہے:

تَعَلَّمُوا الْقُرْآنَ فَإِنَّهُ أَحْسَنُ الْحَدِيثِ، وَتَفَقَّهُوا فِيهِ فَإِنَّهُ رَبِيعُ الْقُلُوبِ، وَاسْتَشْفُوا بِنُورِهِ فَإِنَّهُ شِفَاءُ الصُّدُورِ، وَأَحْسِنُوا تِلَاوَتَهُ فَإِنَّهُ أَنْفَعُ الْقَصَصِ.

قرآن کی تعلیم حاصل کرو، اس لئے کہ وہ بہترین کلام ہے اور اس کے سمجھنے کی صلاحیت حاصل کرو کہ وہ کشت دل کے لئے بہار ہے اور اس کی روشنی سے اپنی بیماریوں کو دور کرو اس لئے کہ وہ سینوں کے لئے شفاء ہے اور اس کی تلاوت خوب کرو کیوں کہ وہ واقعات کا بہترین تذکرہ ہے۔(خطبہ ۱۰۸)

تیسرے موقع پر تحکیم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا لَمْ نُحَكِّمِ الرِّجَالَ، وَاِنَّمَا حَكَّمْنَا الْقُرْآنَ. وهذَا الْقُرْآنُ اِنَّمَا هُوَ خَطٌّ مَسْتُورٌ بَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ لَا يَنْطِقُ بِلِسَانٍ، وَلَا بُدَّ لَهُ مِنْ تَرْجُمَانٍ، وَاِنَّمَا يَنْطِقُ عَنْهُ الرِّجَالُ. وَلَمَّا دَعَانَا الْقَوْمُ اِلَى اَنْ نُحَكِّمَ بَيْنَنَا الْقُرْآنَ لَمْ نَكُنِ الْفَرِيقَ الْمُتَوَلِّيَ عَنْ كِتَابِ اللهِ.

ہم نے انسانوں کو حکم نہیں بنایا تھا بلکہ قرآن کو حکم بنانے پر راضی ہوئے تھے اور یہ قرآن وہی ہے جو دونوں دفتیوں کے درمیان لکھا ہوا تحریر کی صورت موجود ہے وہ زبان سے تو بولتا نہیں، اس کے لئے ترجمان کی ضرورت ہے۔انسان وہ ہوتے ہیں جو اس کی ترجمانی کرتے ہیں اور جب ان لوگوں نے ہم کو دعوت دی کہ ہم قرآن کو حکم قرار دیں تو ہم ایسی جماعت نہیں بنے کہ جو قرآن سے روگردانی والی ہو۔(خطبہ ۱۲۳)

چوتھے موقع پر ایک کلام کے ضمن میں ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا حُكِّمَ الْحَكَمَانِ لِيُحْيِيَا مَا اَحْيَا الْقُرْآنُ، وَيُمِيتَا مَا اَمَاتَ الْقُرْآنُ، وَاِحْيَاؤُهُ الاجْتِمَاعُ عَلَيْهِ، وَاِمَاتَتُهُ الافْتِرَاقُ عَنْهُ، فَاِنْ جَرَّنَا الْقُرْآنُ اِلَيْهِمُ اتَّبَعْنَاهُمْ، وَاِنْ جَرَّهُمْ اِلَيْنَا اتَّبَعُونَا.

دونوں حکم اس لئے مقرر ہوئے تھے کہ وہ زندہ کریں اس بات کو جسے قرآن زندہ کرے اور مردہ کریں اس بات کو جسے قرآن مردہ کرے قرآن کی بات کو زندہ کرنے کے معنی اس پر متفق ہونا ہے اور اسے مردہ کرنا اس سے الگ ہونا تو اگر قرآن ہمیں کھینچے ان کی طرف تو ہم ان کے سامنے گردن جھکالیں اور اگر انہیں کھینچے ہماری طرف تو وہ ہمارے سامنے سر جھکادیں۔(خطبہ ۱۲۵)

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

كِتَابُ اللهِ بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ، نَاطِقٌ لَا يَعْيَا لِسَانُهُ، وَبَيْتٌ لَا تُهْدَمُ اَرْكَانُهُ، وَعِزٌّ لَا تُهْزَمُ اَعْوَانُهُ.

اللہ کی کتاب تمہارے درمیان موجود ہے یہ وہ بات کرنے والا ہے جس کی زبان تھکنے والی نہیں اور وہ عمارت ہے جس کے ستون گرنے والے نہیں اور وہ مرکز عزت ہے جس کے حمایتی شکست کھانے والے نہیں۔(خطبہ ۱۳۱)

ایک اور موقع پر ہے:

اِنَّهُ سَيَأْتِي عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِي زَمَانٌ لَيْسَ فِيهِ شَيْءٌ اَخْفَى مِنَ الْحَقِّ، وَلَا اَظْهَرَ مِنَ الْبَاطِلِ، وَلَا اَكْثَرَ مِنَ الْكَذِبِ عَلَى اللهِ وَرَسُولِهِ، وَلَيْسَ عِنْدَ اَهْلِ ذٰلِكَ الزَّمَانِ سِلْعَةٌ اَبْوَرَ مِنَ الْكِتَابِ اِذَا تُلِيَ حَقَّ تِلَاوَتِهِ، وَلَا اَنْفَقَ مِنْهُ اِذَا حُرِّفَ عَنْ مَوَاضِعِهِ، وَلَا فِي الْبِلَادِ شَيْءٌ اَنْكَرَ مِنَ الْمَعْرُوفِ، وَلَا اَعْرَفَ مِنَ الْمُنْكَرِ فَقَدْ نَبَذَ الْكِتَابَ حَمَلَتُهُ، وَتَنَاسَاهُ حَفَظَتُهُ؛ فَالْكِتَابُ يَوْمَئِذٍ وَاَهْلُهُ مَنْفِيَّانِ طَرِيدَانِ، وَصَاحِبَانِ مُصْطَحِبَانِ فِي طَرِيقٍ وَاحِدٍ لَا يُؤْوِيهِمَا مُؤْوٍ؛ فَالْكِتَابُ وَاَهْلُهُ فِي ذٰلِكَ الزَّمَانِ فِي النَّاسِ وَلَيْسَا فِيهِمْ، وَمَعَهُمْ وَلَيْسَا مَعَهُمْ! لِاَنَّ الضَّلَالَةَ لَا تُوَافِقُ

الْهُدٰی، وَاِنِ اجْتَمَعَا. فَاجْتَمَعَ الْقَوْمُ عَلَی الْفُرْقَةِ، وَافْتَرَقُوا عَنِ الْجَمَاعَةِ، کَاَنَّهُمْ اَئِمَّةُ الْکِتَابِ وَلَیْسَ الْکِتَابُ اِمَامَهُمْ. فَلَمْ یَبْقَ عِنْدَهُمْ مِنْهُ اِلاَّ اسْمُهُ، وَلَا یَعْرِفُونَ اِلاَّ خَطَّهُ وَزَبْرَهُ.

یقیناً میرے بعد ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں کوئی شے حق سے زیادہ مخفی اور باطل سے زیادہ ظاہر نہ ہوگی اور اللہ اور اس کے پیغمبر پر جھوٹ باندھنے سے زیادہ کوئی چیز نہ ہوگی اور اس زمانہ والوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی چیز بے قیمت نہ ہوگی جب اسے ٹھیک (صحیح مفہوم کے ساتھ) پڑھا جائے اور اس سے زیادہ کوئی چیز چالو نہ ہوگی جب کہ اس کا بے محل استعمال کیا جائے اور دنیا میں نیکی سے زیادہ کوئی برائی اور برائی سے زیادہ کوئی نیکی نہ ہوگی تو قرآن کو اس کے حامل افراد نے پس پشت ڈال دیا ہوگا اور اس کے حافظوں نے اسے بھلا دیا ہوگا تو اس دن قرآن سے سچے اہل قرآن شہر بدر ہوں گے، وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہوں گے ایک ہی راہ میں کہ ان دونوں کو کوئی پناہ دینے والا نہ ہوگا، تو قرآن اور اس کے والے اس دور میں آدمیوں میں ہوں گے اور پھر بھی ان میں نہ ہوں گے اور ان کے ساتھ نہ ہوں گے اس لئے کہ گمراہی ہدایت کے موافق نہیں ہوا کرتی چاہے ایک جگہ پر دونوں ہوں تو لوگ افتراق پر متحد اور نقطہ اجتماع سے منتشر ہوں گے۔

گویا وہ خود قرآن کے پیشوا ہیں اور قرآن اُن کا پیشوا نہیں ہے تو اُن کے پاس قرآن کا صرف نام باقی ہوگا اور وہ بس اس کے خطوطِ تحریری اور نقوشِ مکتوبی کو پہچانتے ہوں گے۔ (خطبہ ۱۴۵)

ایک کلام کے ذیل میں ارشاد فرماتے ہیں:

وَعَلَیْکُمْ بِکِتَابِ اللهِ، فَاِنَّهُ الْحَبْلُ الْمَتِیْنُ، وَالنُّوْرُ الْمُبِیْنُ، وَالشِّفَاءُ النَّافِعُ، وَالرِّیُّ النَّاقِعُ، وَالْعِصْمَةُ لِلْمُتَمَسِّكِ، وَالنَّجَاةُ لِلْمُتَعَلِّقِ، لَا یَعْوَجُّ فَیُقَامَ، وَلَا یَزِیْغُ فَیُسْتَعْتَبَ، وَلَا تُخْلِقُهُ کَثْرَةُ الرَّدِّ، وَوُلُوْجُ السَّمْعِ، مَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ، وَمَنْ عَمِلَ بِهِ سَبَقَ.

دیکھو کتاب خدا پر عمل کرتے رہو اس لئے کہ یہ ریسمانِ محکم، ضیائے روشن، فائدہ پہنچانے والی دوا اور سیرابی کا سامان اور دامن تھام لینے والے کے لئے ذریعہ حفاظت اور وابستہ ہوجانے والے کے لئے نجات کا وسیلہ ہے وہ کبھی کج ہونے والا نہیں کہ اس کو سیدھا کرنے کی ضرورت ہو اور نہ وہ صحیح راستہ سے مڑنے والا ہے کہ اسے پلٹانا پڑے بار بار پڑھنا اور گوش زد ہوتے رہنا اس کو کہنہ نہیں کرتا جو اس کے موافق بات کہے وہ سچا ہی ہوگا اور جو اس پر عمل کرے وہ بازی مار لے گا۔ (خطبہ ۱۵۴)

ایک خطبہ میں ہے:

وَاسْتَتِمُّوْا نِعْمَةَ اللهِ عَلَیْکُمْ بِالصَّبْرِ عَلٰی طَاعَةِ اللهِ وَالْمُحَافَظَةِ عَلٰی مَا اسْتَحْفَظَکُمْ مِنْ کِتَابِهِ.

اللہ کے فضل و کرم کو اپنے او پر مکمل کراؤ اطاعت الٰہی کے راستے پر قائم رہنے کے ساتھ اور جس کتاب کی حفاظت کے تم ذمہ دار بنائے گئے ہو اسے پورے طور پر محفوظ رکھنے کے ساتھ۔ (خطبہ ۱۷۱)

ایک مقام پر:

وَاعْلَمُوْا اَنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ هُوَ النَّاصِحُ الَّذِیْ لَا یَغُشُّ، وَالْهَادِی الَّذِیْ لَا یُضِلُّ، وَالْمُحَدِّثُ الَّذِیْ لَا یَکْذِبُ، وَمَا جَالَسَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ اَحَدٌ اِلاَّ قَامَ عَنْهُ بِزِیَادَةٍ اَوْ نُقْصَانٍ: زِیَادَةٍ فِیْ هُدًی، اَوْ نُقْصَانٍ مِنْ عَمًی. وَاعْلَمُوْا اَنَّهُ لَیْسَ عَلٰی

اَحَدٍ بَعْدَ الْقُرْآنِ مِنْ فَاقَةٍ، وَلَا لِاَحَدٍ قَبْلَ الْقُرْآنِ مِنْ غِنًى فَاسْتَشْفُوْهُ مِنْ اَدْوَائِكُمْ، فَاِنَّ فِيهِ شِفَاءً مِنْ اَكْبَرِ الدَّاءِ، وَهُوَ الْكُفْرُ وَالنِّفَاقُ، وَالْغَيُّ وَالضَّلَالُ، فَاسْاَلُوا اللهَ بِهِ، وَتَوَجَّهُوا اِلَيْهِ بِحُبِّهِ، وَلَا تَسْاَلُوا بِهِ خَلْقَهُ، اِنَّهُ مَا تَوَجَّهَ الْعِبَادُ اِلَى اللهِ بِمِثْلِهِ. وَاعْلَمُوا اَنَّهُ شَافِعٌ مُشَفَّعٌ، وَقَائِلٌ مُصَدَّقٌ، وَاَنَّهُ مَنْ شَفَعَ لَهُ الْقُرْآنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفع فِيهِ، وَمَنْ مَحَلَ بِهِ الْقُرْآنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صُدِّقَ عَلَيْهِ، فَاِنَّهُ يُنَادِي مُنَادٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: اَلَا اِنَّ كُلَّ حَارِثٍ مُبْتَلًى فِي حَرْثِهِ وَعَاقِبَةِ عَمَلِهِ، غَيْرَ حَرَثَةِ الْقُرْآنِ؛ فَكُونُوا مِنْ حَرَثَتِهِ وَاَتْبَاعِهِ، وَاسْتَدِلُّوهُ عَلَى رَبِّكُمْ، وَاسْتَنْصِحُوهُ عَلَى اَنْفُسِكُمْ، وَاتَّهِمُوا عَلَيْهِ آرَاءَكُمْ، وَاسْتَغِشُّوا فِيهِ اَهْوَاءَكُمْ.

یقین جانو کہ یہ قرآن وہ خیرخواہ ہدایت کرنے والا ہے جس سے دھوکے کا خطرہ نہیں اور وہ رہنما ہے جس سے گمراہی کا اندیشہ نہیں اور وہ باتیں کرنے والا ہے جس کے یہاں جھوٹ کا گزر نہیں کوئی اس قرآن کا ہمدم نہیں بنا مگر اس میں زیادتی پیدا ہوئی یا کمی زیادتی ہدایت میں یا کمی جہالت کے اندھے پن میں اور یقین جانو کہ قرآن کے ساتھ کسی کو احتیاج باقی نہیں رہتی اور بغیر قرآن کے استغنا نہیں ہوتا تو اسے تم اپنے دردوں کی دوا بناؤ اور اپنی مصیبت کے وقت اس سے مدد لو اس لئے کہ اس میں سب سے بڑے مرض کی دوا ہو اور وہ کفر ونفاق، کور باطنی وگمراہی ہے تو اس قرآن کے ذریعہ سے اللہ سے سوال کرو اور اس کی محبت کے ساتھ اس کی طرف رخ کرو اور اس کے ذریعہ اس کی مخلوق سے سوال نہ کرو اور اس کی ایسی کوئی دوسری چیز نہیں جس کے ساتھ اللہ کی طرف رخ کیا جائے اور یقین جانو کہ وہ شفاعت کرنے والا ہے اور اس کی شفاعت مقبول ہے اور وہ کہنے والا ہے اور اس کی بات باور کی جانے والی ہے اور جس کی سفارش روز قیامت قرآن کر دے اس کے سہارے اس کی سفارش منظور ہوگی اور جس کا شکایت روز قیامت قرآن کر دے تو اس کے خلاف اس کا شکایت سنی جائے گی تو قیامت کے دن آواز دی جائے گی کہ ہر کاشتکار آج اپنی کاشت کے حساب میں مبتلا ہوگا۔ سوا قرآن کی کاشت کرنے والوں کے تو کیوں نہ تم لوگ اس کی کاشت کرنے والے ہو اور اسی کی پیروی کرنے والے بنو اور اسے اپنے پروردگار کی طرف رہنما بناؤ اور اپنے نفوس کے خلاف اس کی نصیحتوں کو قبول کرو اور اس (کے مطالب) میں اپنے ذاتی خیالات پر بے اعتمادی کرو اپنی نفسانی خواہشوں کو اس میں غلط سمجھو۔ (خطبہ ۱۷۴)

سابق کے ایک خطبہ میں آئندہ زمانہ کے متعلق دنیاوالوں کی جو تصویر کشی کی گئی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ دیندار افراد اپنے طرز عمل کی خود جانچ کرتے رہیں کہ وہ تو اس راہ پر نہیں جارہے ہیں جس کی خبر دی گئی تھی اور جس سے ڈرایا گیا تھا۔

اس کے آخر میں یہ جملہ کہ کتاب و اہل کتاب اس وقت لوگوں کے درمیان موجود ہوں گے مگر نہیں اس لئے کہ ہدایت اور گمراہی ایک نقطہ پر اکٹھا نہیں ہوتی، اس سے اسی قرآن کو جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے، حقانیت پر روشنی پڑتی ہے اور پھر آخر میں یہ فقرہ کہ لَا يَعْرِفُوْنَ اِلَّا خطّهٗ و زبره"، وہ بس اس کے خطوط تحریری اور نقوش مکتوبی کو پہچانتے ہوں گے، اس امر کی صریحی دلیل ہے کہ تحریف سے معنوی تراش خراش مراد ہے۔ الفاظ قرآن بالکل محفوظ ہوں گے۔

یہ ہیں حقیقی حافظ قرآن اور سب سے پہلے جامع قرآن حضرت علیؑ بن ابیطالب کے ارشادات جو بین الدفتین موجود و متداول قرآن کی سالمیت پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں۔

دیگر آئمہ اہلبیتؑ کے ارشادات

امیرالمومنینؑ کے بعد دوسرے ائمہ معصومین علیہم السلام بھی برابر اس کی تبلیغ فرماتے رہے جس میں سے چند عناوین کے تحت میں تھوڑے سے ارشادات ذیل میں درج ہیں:

قرآن وحدیث کی صحت کا معیار

یہ احادیث جن میں احادیث کی صحت وعدم صحت کا معیار قرآن مجید کو بتایا گیا ہے۔خود جوامع حدیث میں اس کثرت سے ہیں کہ وہ تنہا اس قرآن کے حجت کے لئے دلیل قطعی ہو گئے ہیں ان میں سے پانچ حدیثیں جو اصول کافی میں موجود ہیں حوالہ قرطاس کی جاتی ہیں:

(۱)عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال قال رسول اللہ ﷺ ان علی کل حق حقیقةً و علی کل صواب نورا فما وافق کتاب اللہ فخذوہ وما خالف کتاب اللہ فدعوہ.

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد کیا ہر حق کے لئے حقیقت ہے یعنی حق نما علامتیں اور ہر واقعیت کے لئے روشنی ہے تو جو چیز کتاب خدا کے موافق ہو اسے لے لو۔ اور جو چیز کتاب خدا کے خلاف ہو اسے ترک کر دو۔

اس میں اصل حدیث جو بیان ہوئی ہے وہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے لیکن امامؑ جس وقت اسے بیان فرمارہے ہیں اسوقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں یہی مرتب شدہ قرآن ہے جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے تو امامؑ کے اس ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کرنے سے ظاہر ہے کہ اس کا انطباق اس قرآن موجود متداول پر ہے۔

(۲) سائت ابا عبداللہ علیہ السلام عن اختلاف الحدیث یروی بہ من تثق بہ و من لا تثق بہ قال اذا ورد علیکم حدیث فوجدتم لہ شاھدا من کتاب اللہ عزوجل او من قول رسول اللہ والا فالذی جآء کم اولی بہ.

امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ ہمارے سامنے مختلف احادیث آتی ہیں جن میں سے بعض کے راوی موثق اور بعض کے غیر موثق ہیں اور پھر ان کے مفاد میں اختلاف ہے (ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے) حضرت نے فرمایا جب تمہارے سامنے کوئی حدیث پیش ہو اور اس کا کوئی شاہد کتاب خدا یا کسی مستند ارشاد رسولؐ میں موجود تو اس پر عمل کر وورنہ جو شخص اس روایت کو نقل کر رہا ہے وہی اس کا زیادہ حقدار ہے یعنی اسے اس کی طرف واپس کردو۔

(۳) عن ایوب بن الحر قال سمعت اباعبداللہ علیہ السلام یقول کل شیءٍ مردود الی الکتاب والسنة و کل حدیث لا یوافق کتاب اللہ فھو زخرف.

ایوب بن الحر کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ (امام جعفر صادق علیہ السلام) سے سنا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہر شے میں کتاب وسنت کی طرف رجوع لازم ہے اور جو حدیث کتاب خدا کے موافق نہ ہو وہ بناوٹی ہے

(۴)عن ایوب بن راشد عن اباعبداللہ علیہ السلام قال مالم یوافق من الحدیث القراٰن فھو زخرف.

ایوب بن راشد کہتے ہیں کہ ابوعبداللہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ہر شے میں کتاب وسنت کی طرف رجوع لازم ہے اور جو

حدیث کتاب خدا کے موافق نہ ہو وہ بناوٹی ہے۔

(۵) عن ھشام بن الحکم و غیرہ عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال خطب النبی صلی اللہ علیہ و آلہ فقال ایھاالناس! ما جاء کم یوافق کتاب اللہ فانا قلتہ و ما جاء کم یخالف کتاب اللہ فلم اقلہ.

ہشام بن الحکم وغیرہ سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منیٰ میں خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں کہا کہ جو حدیث تمہارے سامنے ایسی پیش ہو کہ وہ کتاب خدا کے موافق ہے تو وہ میرا قول ہے اور جو ایسی حدیث ہو کہ کتاب خدا کے مخالف ہو وہ میرا قول نہیں ہے

کافی کے علاوہ دوسرے کتب احادیث میں ایسی ہی حدیثیں اس سے زیادہ موجود ہیں اور سب کا متفقہ مطلب یہ ہے کہ قرآن احادیث کی جانچ کا معیار ہے۔

قرآن کی مخالفت کفر

عن ابی عمر عن بعض اصحابہ قال سمعت اباعبداللہ علیہ السلام یقول من خالف کتاب اللہ و سنّۃ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ فقد کفر.

ابی عمرو غیرہ سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص کتاب الٰہی اور سنت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرے وہ کافر ہے۔

قرآن نشان ہدایت

(۱) عن طلحہ بن زید عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال انّ ھذا القرآن فیہ منار الھدی و مصابیح الدجیٰ فلیجل جال بصرہ و یفتح للضیاء نظرہ فان التفکر حیوۃ قلب البصیر کما یمشی المستنیر فی الظلمات بالنور.

طلحہ بن زید سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا بلاشبہ یہ قرآن (یعنی یہی جو تمہارے ہاتھوں میں ہے) اس میں نشان ہیں ہدایت کے اور چراغ ہیں تاریکی شب کے جسے منظور ہو وہ اس سے اپنی بصیرت کو جلا دے اور اس کی روشنی کے لئے اپنی آنکھ کھولے کیوں کہ غور و فکر صاحب بصیرت کے دل کی زندگی ہے جس طرح روشنی سے انسان تاریکی میں رات قطع کرتا ہے۔

(۲) عن ابی جمیلہ قال قال اباعبداللہ علیہ السلام کان فی وصیۃ امیر المومنین علیہ السلام اصحابہ اعلموا انّ القراٰن ھدی النھار و نور اللیل المظلم علی ما کان من جھد و فاقہ.

ابی جمیلہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ امیر المومنینؑ اپنے اصحاب کو تاکید کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ قرآن دن کا رہنما اور شب تاریک کا نور ہے جو سخت ترین ضرورت کے موقع پر کارآمد ہے۔

قرآن جنت کا رہنما اور جہنم سے سد راہ

عن ابی بصیر قال سمعت اباعبداللهؑ یقول.ان القراٰن زاجرواٰمر یأمر بالجنة ویزجر عن النار.

ابی بصیر سے روایت ہے کہ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ قرآن روکنے والا اور حکم دینے والا ہے۔حکم دیتا ہے جنت میں جانے کا روکتا ہے جہنم سے۔

اس کے علاوہ: تلاوت قرآن کے فضائل،حامل قرآن کا درجہ،حفظ قرآن کا ثواب،تعلیم قرآن کی اہمیت،تدبر فی القرآن کا حکم۔یہ وہ ابواب ہیں جن میں احادیث حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں اور اصول کافی کا آخری حصہ ان احادیث سے مملو ہے۔

پھر وہ مقامات ہیں جہاں ائمہ معصومینؑ نے احکام شرعیہ کے لئے آیات قرآن سے استدلال کرکے علمائے دین کوظواہر قرآن سے استفادہ احکام کا سبق دیا ہے۔

اس کے علاوہ امام جعفر صادقؑ اور دیگر ائمہ معصومینؑ نے امام ابوحنیفہ اور دوسرے فقہائے جمہور کو جب ان کے اجتہادی ماخذوں کی کمزوری پر متنبہ کیا تو یہ فرمایا کہ تم محکم و متشابہ، ناسخ ومنسوخ، تنزیل وتاویل کا علم نہیں رکھتے لیکن کبھی یہ نہیں کہا گیا یہ قرآن محرّف ہے اس لئے اس سے استفادہ احکام درست نہیں ہے۔

فقہ جعفری کے احکام متعلقہ قرآن

یہ فقہ جس پر شیعوں کا عمل ہے ائمہ اہلبیتؑ کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہے جو جمہور امت میں فقۂ جعفری کے نام سے موسوم ہوگئی ہے۔اس کے تمام احکام بھی اسی ''بین الدفتین'' کتاب سے متعلق ہیں جو ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں۔

دیکھئے فقہ کی کتابیں: خط مصحف کو بغیر طہارت چھونا حرام اور حواشی و بین السطور کا چھونا بھی مکروہ سجدہ والے سوروں کا جنب وغیرہ کے لئے پڑھنا حرام ہے اور دوسرے سوروں کی سات آیتوں سے زیادہ کا پڑھنا مکروہ۔کافر کے ہاتھ قرآن کا ہدیہ کرنا حرام اور کافر کی ملکیت قرآن کے لئے ناجائز موجودہ قرآن کے علاوہ کسی بھی جزء کا بحیثیت قرآن نماز میں پڑھنا حرام نجاست کا قرآن تک پہنچانا گناہ عظیم اور احکام شرعیہ کہ ادلہ اربعہ میں قرآن کا پہلا درجہ ان تمام مقامات پر اور اس کے علاوہ جہاں بھی کسی شیعی عالم کے کلام میں قرآن کا نام آتا ہے اس سب سے مراد یہی قرآن ہوتا ہے جو سب کے سامنے موجود ہے۔

تفسیر اور دیگر علوم قرآن کے بارے میں

آئمہ اہلبیتؑ اور پھر ہر صدی کے علمائے شیعہ کی خدمات

سب سے پہلے تو امیر المومنینؑ کا جو جمع کردہ قرآن تھا اس میں صرف متن قرآن نہ تھا بلکہ الفاظ قرآن کے وہ تشریحات بھی تھے جو حضرت پیغمبر خدا پر منزل من اللہ تھے اور جن کو ائمہ اہلبیتؑ کے احادیث میں تنزیل قرآن یعنی قرآن کے معنی تنزیل کیا گیا ہے چناں چہ احتجاج طبرسیؒ میں اس کے لئے خود حضرت امیر علیہ السلام کا ارشاد درج ہے کہ:

ولقد جئتهم بالكتاب كملا مشتملا على التنزيل والتأويل

میں نے ان کے سامنے پورا قرآن پیش کیا جو تنزیل اور تاویل دونوں پر حاوی تھا۔

اسی لئے اس کے متعلق محمد بن سیرین کا قول تھا:

لو اصيب ذالك الكتاب كان فيه العلم۔ (تاریخ الخلفاء۔ص ۱۸۴)

اگر وہ کتاب لوگوں کے ہاتھ آجاتی تو ایک بڑا علمی ذخیرہ اس میں ہوتا۔

اس کے علاوہ آپ نے اقسام علوم قرآن اور ان کے امثلہ کو بسط وتشریح کے ساتھ یکجا محفوظ کیا۔ چناں چہ شیخ جلیل ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم بن جعفر نعمانی کی کتاب جو تفسیر نعمانی کے نام سے مشہور ہے اسی ایک حدیث پر مشتمل ہے جو امیر المومنینؑ سے منقول ہے اور اس میں حضرت نے آیات قرآن کی ساٹھ قسمیں قرار دی ہیں اور ہر قسم کی ایک مثال ذکر فرمائی اور اس کی تفسیر ارشاد فرمائی۔

سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے اس کتاب کا خلاصہ تحریر فرمایا جو شیخ حر عاملی تک پہنچا تھا اور انہوں نے وسائل الشیعہ میں احکام فقہیہ کے متعلق مضامین کو اس سے اخذ کیا ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے بحار کی اس جلد میں جو قرآن مجید سے متعلق ہے ایک باب یہ قائم کیا ہے کہ:

باب ما ورد عن امير المومنين عليه السلام فى اصناف آيات القرآن و انواعها و تفسير بعض آياتها برواية نعمانى هى رسالة مفردة مدونته كثيرة الفوائد نذكرها من فاتحتها الى خاتمتها.

اس باب میں امرالمومنینؑ کی وہ حدیث ہے جو آیات قرآن کے اقسام اور ان میں سے بعض آیات کی تفسیر میں نعمانی کی روایت سے وارد ہوئی ہے اور یہ ایک مستقل تصنیف شدہ رسالہ ہے جو بہت فوائد پر مشتمل ہے ہم اسے شروع سے آخر تک پورا نقل کرتے ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم کی ابتداء میں جو آیات قرآن کے اقسام درج ہیں انہیں بھی جہاں تک دیکھا جائے اس حدیث امیر المومنینؑ کا خلاصہ ہے۔

بہرحال سب سے پہلے علم تفسیر کی تدوین امیر المومنؑ کے ہاتھوں ہوئی ہے۔

پھر امام محمد باقرؑ نے تفسیر تحریر فرمائی جس کا پتہ ابن ندیم نے فہرست میں دیا ہے اور علم تفسیر کے مصنفات کے ذکر میں لکھا ہے۔

كتاب الباقر محمد بن على بن الحسين رواه عنه ابو الجارود زياد بن المنذر رئيس الجاروديته الزيدية

محمد باقرابن علی بن الحسین علیہم السلام کی کتاب جسے ان سے ابوالجارودزیاد بن المنذررئیس فرقہ زیدیہ جارودیہ نے نقل کیا

جیسا کہ ابن ندیم نے لکھا ہے بے شک ابوالجارودایک زیدی فرقہ کے پیشواہو گئے تھے مگر یہ ان کے آخرعمر کی بات ہے جب انہوں نے اس تفسیر کی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے کی ہے تو اس وقت وہ جماعت امامیہ میں داخل تھے چناں چہ ابوبصیریحییٰ بن قاسم اسدی اور بعض دیگر معتبر رواۃ شیعہ نے اس تفسیر کی ان سے روایت کی اور کتب شیعہ میں تفسیر قرآن کے متعلق جو بہت روایات مذکور ہیں ان کے متعلق یہ خیال کرنا درست ہے کہ وہ اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

اس کے بعد امام حسن عسکری علیہ السلام گیارہویں امام نے تفسیر قرآن میں جو افادیت فرمائی ان سے حسن بن خالد برقی نے ایک سوبیس حصوں پر مشتمل تفسیر مرتب کی۔

یہ اس کتاب کے علاوہ تھی جو تفسیر امام حسن عسکریؑ کے نام سے مشہور ومطبوع ہے لیکن اس کی نسبت حضرتؑ کی طرف درست نہیں ہے۔

یہ تمام علمی کاوشیں اسی قرآن سے متعلّق تھیں جو جمہور اہل اسلام کے ہاتھوں میں موجود ہے۔

اور جب خود ائمہ معصومین علیہم السلام کو اس بارے میں اتنا اہتمام تھا تو اصحاب ائمہؑ جنہیں صدر اول میں علمائے شیعہ کی حیثیت حاصل ہے ان کی بھی توجہات اس محور پر گردش کرتے رہے چنانچہ اصحاب وتلامذہ حضرت امیرالمومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام میں سے جن کا نام بحیثیت مفسر بہت نمایاں ہے وہ جناب عبداللہ بن عباس ہیں اگرچہ ان کے نام سے جو تفسیر "تنویر المقیاس" مطبوع ومتداول ہے وہ مثل تفسیر امام حسن عسکریؑ کے بے وزن و بے اعتبار رہے۔

ان کے علاوہ امیرالمومنینؑ کے تلامذہ با اختصاص میں میثم بن یحییٰ تمار ہیں جنہوں نے جناب ابن عباس سے کہا:

اسئلنی ماشئت من تفیسر القران فانی قرات تنزیله علی امیر المومنین علیہ السلام و علّمنی تاویله. (رجال کشی)

مجھ سے تفسیر قرآن کے متعلق جو پوچھنا ہو دریافت کر لیجئے اس لئے کہ میں نے قرآن کو تمام وکمال جناب امیرؑ سے حفظ کیا ہے اور انہوں نے مجھ کو اس کی تاویل کی تعلیم دی ہے۔

اور جناب ابن عباس نے ان مضامین کو جو انہوں نے بتلائے قلمبند کیا۔

اس کے بعد دوسرا طبقہ جناب عبداللہ بن عباس کے شاگردوں کا ہے جو امام زین العابدینؑ کے اصحاب میں سے ہیں جیسے سعید بن جبیر، ابوصالح، میزان البصری اور طاؤس بن کیسان ابوعبداللہ یمانی متوفی ۱۰۶ھ۔

تیسرا طبقہ امام محمد باقر علیہ السلام کے اصحاب کا ہے اس زمانہ میں اہلبیتؑ کے فیوض علمیہ ذرا آشکار طور پر لوگوں کو پہنچ رہے تھے لہٰذا فن تفسیر کو بھی اس زمانہ میں کافی ترقی ہوئی اور حضرت کے متعدد اصحاب بحیثیت مفسر کتب سیر کے صفحات پر نمایاں ہیں مثلاً جابر بن یزید جعفیؒ، عطیہ عوفی، محمد بن حسن بن ابی سارہ رؤسی، سدی کبیر اسمٰعیل بن عبدالرحمن ابومحمد قرشی کوفی۔ ابان بن تغلب محمد بن سائب کلبی اور ابوحمزہ ثمالی ان میں سے متعدد افراد کے تفاسیر کا تذکرہ ابن ندیم نے اپنی مشہور ومعروف فہرست میں کیا ہے۔

اس کے بعد امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں مخّل بن جمیل اسدی کوفی اور وہیب بن حفص ابوعلی ہیں۔ انہوں نے امام موسیٰ کاظمؑ سے بھی احادیث اخذ کی اسی دور کے معلّی بن محمد بصری جن کے تصانیف میں کتاب الفہرست بھی ہے۔

ہشام بن سالم، حمزہ بن حبیب، علی بن ابی حمزہ بطائی، حصین بن مخارق ابوجنادہ سلولی، عبداللہ بن عبدالرحمن، المسمعی البصری اور مشہور ماہر کیمیا وریاضی وفلسفہ جابر بن حیان طرسوسی۔

اس کے بعد امام موسیٰ کاظمؑ کے وہ اصحاب ہیں جنہوں نے حضرت صادقؑ کے زمانہ کو نہیں پایا۔عیسیٰ بن داوٗد النجار کسائی علی بن حمزہ، یونس بن عبدالرحمن، محمد بن خالد برقی، حسن بن محبوب ابوعلی مراد۔

پھر وہ طبقہ ہے جو امام رضاؑ اور آپ کے بعد کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں جیسے حسن بن علی فضال، دارم بن قبیصہ تمیمی دارمی، مشہور نحوی فراء ابوزکریا، یحییٰ بن زیاد، اقطع کوفی، حسن بن سعید بن حماد کوفی اہوازی اور ان کے چھوٹے بھائی حسین بن سعید، علی بن اسباط کوفی علی بن معزیار اہوازی، عبداللہ بن صلت ابوطالب قمی، ابوالعباس مبرد اور احمد بن محمد بن عیسیٰ قمی۔

اس کے بعد کا طبقہ: وہ ہے جس نے امام محمد تقیؑ اور آپ کے بعد کے ائمہؑ سے روایت کی ہے ان میں احمد بن محمد بن خالد برقی ہیں۔محمد بن ارومہ ابوجعفر قمی، علی ابن حسن بن علی بن فضال، حسن بن خالد برقی جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

یہاں سے ائمہ علیہم السلام کے ظہور کا دور ختم اور اصحاب ائمہ علیہ السلام کا سلسلہ قطع ہو جاتا ہے۔اب وہ علماء ہیں جو ائمہ معصومینؑ کی صحبت سے بہرہ اندوز نہیں ہوئے ان میں بھی ہر دور میں برابر تفسیر قرآن کے مصنفین ہوتے رہے۔

تیسری صدی ہجری کے علماء زمانہ غیبت کے پہلے طبقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان میں تفسیر قرآن کے مصنفین میں محمد بن ابوالقاسم ابو عبداللہ ماجیلویہ، سعد بن عبداللہ بن ابی خلف اشعری قمی، احمد بن صبیح اسدی، ابراہیم بن محمد بن سعید ثقفی سلمۃ بن الخطاب برادستانی عیاشی محمد بن مسعود بن محمد بن عیاش سلمی سمرقندی علی بن ابراہیم قمی فرات بن ابراہیم کوفی محمد بن علی شلمغانی وغیرہ ہیں۔

ان کے بعد وہ طبقہ ہے جو چوتھی صدی ہجری تک باقی تھا ان میں علی بن بابویہ قمی، عبدالعزیز بن یحییٰ الجلودی، ابوبکر صولی محمد بن حسن ابن الولید القمی، احمد بن محمد بن حسین بن حسن بن دول قمی اور علی بن احمد ابوالقاسم کوفی وغیرہ تھے۔

چوتھی صدی ہجری کے مخصوص: علماء میں جو تفسیر کے مصنف ہیں شیخ صدوق محمد ابن علی بن بابویہ قمی، محمد بن علی بن عبدک ابوجعفر جرجانی، ابومنصور حرام نیشاپوری، موسیٰ بن اسمٰعیل محمد بن ابراہیم بن جعفر کاتب نعمانی، عبدالرحمن بن حسن قاشانی، حسن بن موسیٰؑ نوبختی وغیرہ ہیں۔

پانچویں صدی میں شیخ مفید محمد بن محمد بن نعمان بغدادی، حسین ابن علی بن الحسین ابوالقاسم وزیر مغربی اور پھر شیخ مفید کے تلامذہ سید رضی موسوی جامع نہج البلاغہ اور ان کے بڑے بھائی علم الہدیٰ سید مرتضیٰؒ۔محمد بن احمد وزیر عمیدی، شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسی، علامہ کراچکی، اسمٰعیل بن علی بن حسین بن سمان شیخ محمد بن احمد بن علی قتال نیشاپوری محمد بن ابی الخیر ہمدانی وغیرہ ہیں۔

اب چھٹی صدی: شروع ہوجاتی ہے اس میں شیخ ابوالفتوح رازی سید عزالدین علی بن ضیاالدین فضل اللہ الحسنی الروندی اور امین الاسلام شیخ ابوعلی طبرسی مصنف تفسیر مجمع البیان، قطب الدین روندی ابن ادریس حلی۔محمد بن حسین قتال فارسی نیشاپوری اور ابن شہرآشوب مصنف متشابہ القرآن وغیرہ ہیں۔

ساتویں صدی: میں سید احمد بن طاوٗس اور علامہ حلیؒ

آٹھویں صدی: میں ملا عبدالرزاق کاشی، شیخ قطب الدین رازی، شیخ مقداد بن عبداللہ سیوری حلی، ابن متوج بحرانی۔

نویں صدی: میں سید بہاء الدین علی بن سید غیاث الدین عبدالکریم حسینی ،کمال الدین حسن بن محمد استرآبادی۔

دسویں صدی: میں امیر غیاث الدین منصور حسینی شیرازی ،شاہ طاہر دکنی ،شہید ثانی شیخ زین الدین عاملی ،ابوالغنائم عبدالرزاق کاشانی، علی بن حسن زواری ،محمد بن احمد خواجگی شیرزی ،ملافتح اللہ کاشانی ،ملااحمد بن محمد مقدس اردبیلی ،ملاخلیل قزوینی شارح اصول کافی اور فیضی جو ہندوستان میں محتاج تعارف نہیں ،سید حسین خلخالی اور قاضی نوراللہ شوستری جو شیعان ہند میں شہید ثالث کے لقب سے مشہور ہیں۔ مرزا محمد استرآبادی ،سید محمد بن زین العابدین حسینی استرآبادی ان میں سے بعض گیارہویں صدی تک رہے ہیں۔

خاص گیارہویں صدی میں احمد بن زین علوی معزالدین اردستانی ،نعمت خان عالی ،رضی الدین محمد قزدینی ،شیخ بہاء الدین عاملی ،میر محمد ہادی حسینی مرعشی سوستری ،تاج الدین حسن بن محمد اصفہانی ،ملانظام سادجی ،ملابدیع الزمان ہرمذی اصفہانی ،ملاصدار شیرازی ،ملامحسن کاشانی صاحب تفسیر صافی ،شیخ فخر الدین طریحی ،شیخ حسین بن شہاب الدین عاملی ،سید شرف الدین علی حسینی استرآبادی ،محمد بن محمد محسن الفیض الکاشانی ،نورالدین محمد کاشانی ،ملامحمد طاہر قمی ،سید ہاشم بحرینی ،شیخ جواد کاظمی ،حسام الدین طریحی ،شیخ حسین بن مطر جزائری ،عبدعلی بن جمعہ عروسی حویزی ،عبدعلی بن رحمہ حویزی ،شیخ عبدالقاہر بن حاج عبد بن رجب عبادی حویزی ،سید علی خان حویزی ،شیخ فرج اللہ حویزی ،سید محمد رضا حسینی ،احمد بن حسن حر عاملی ،محمد حسین بن محمد قمی ،محمد مومن سبزواری ،امیر محمد طالقانی ،شیخ علی بن شیخ حسین کربلائی ،مرزا محمد رضا قمی۔

بارہویں صدی: میں سید نعمت اللہ جزائری ،محمد صالح خاتون آبادی ،محمد اسمٰعیل خاتون آبادی امیر ابراہیم بن محمد معصوم قزوینی ،شیخ سلیمان بن عبداللہ بحرینی ،محمد بن عبدالفتاح سراب تنکاینی ،شیخ عبداللہ بحرینی ،ملاعبداللہ مجلسی ،میرزا عبداللہ آفندی مصنف ریاض العلماء سید نورالدین ابن سید نعمت اللہ جزائری ،سید عبداللہ بن سید نورالدین شوستری ،سید بہاء الدین محمد بن محمد باقر حسینی مختاری نائینی فاضل ہندی بہاء الدین محمد تاج الدین اصفہانی ،سید محمد حیدر موسوی عاملی ،ابوالحسن شریف فتونی عاملی شیخ احمد جزائری ،محمد اسمٰعیل مازندرانی ،شیخ محمد رضا ہمدانی ،سلطان محمد بن حیدر بن محمد جنابذی شیخ علی حزیں سلیمان جرجی۔

اس کے بعد تیرہویں صدی ہے جس کا آغاز سے جناب غفرآن مآب طاب ثراہ کے قیام لکھنؤ نے لکھنؤ کو شیعہ علمی مراکز کی حیثیت دی آپ کے تلامذہ میں سے مولوی یاد علی صاحب نصیرآبادی نے فارسی میں تفسیر لکھی جو دو جلدوں میں ہے اور اسی دور میں میرزا محمد اخباری نے تفسیر لکھی اور جناب غفرآن مآب کے فرزند سید سید علی نے اردو زبان کی سب سے پہلی تفسیر تحریر کی۔

ان کے علاوہ ہندوستان اور ایران اور عراق میں جن لوگوں نے مکمل تفسیریں لکھیں یا کسی ایک شعبہ تفسیر میں کام کیا، وہ حسب ذیل ہیں سید عبداللہ شبر کاظمی ،حاج میرزا لطف علی بن میرزا احمد تبریزی اخوند ملا مہر علی تبریزی خوئی ،حاج ملا عبدالوہاب قزوینی جناب غفرآن مآب کے چھوٹے فرزند سید العلماء مولانا سید حسین اور شاگرد مفتی سید محمد قلی کنتوری اور سید العلماء کے فرزند ممتاز العلماء مولانا سید محمد تقی صاحب تفسیر ینابیع الانواز ،آقا محمد حسین باشتہ طلائی ،سید رجب علی خاں جگرانوی ،ملا علی قاریوزآبادی حاج محمد نجف کرمانی ،حاج محمد صالح برغانی ،محمد بن سلیمان تنکانی ،ملاحسن علی تولسیر کانی ،ملامحمد تقی ہروی حائری ،سید مہدی قزوینی ،حاج ملا رضا ہمدانی ،ملا سلطان گون آبادی ہمارے جدامجد فردوس مکان الحاج سید محمد ابراہیم ،شیخ محمود چشتی عراقی ،تاج العلماء مولانا سید علی محمد ،مولوی عمار علی پانی پتی ،شیخ محمد حسین اصفہانی نجفی ،حاج میرزا محمد علی قراجہ داغی محقق شہرستانی حاج میرزا محمد حسین حائری ،شیخ حسن شہرودی تبریزی ،مولانا ابوالقاسم قمی لاہوری صاحب تفسیر لوامع التنزیل اب ہماری چودھویں صدی

آ گئی ہے اس میں ہندوستان میں جنہوں نے ہم سے پہلے تفسیر کے سلسلہ میں کام کیا شمس العلماء مولانا سید علی حائری۔ مولانا سید محمد محسن زنگی پوری، مولانا سید احمد حسین امروہوی، مولانا اعجاز حسین امروہوی، حافظ فرمان علی صاحب مترجم قرآن، مولانا محمد ہارون زنگی پوری، مولانا مقبول احمد صاحب دہلوی، مولانا سید راحت حسین صاحب گوپال پوری مولانا سید محمد رضی صاحب زنگی پوری۔

ایران میں ملا حسین سجاسی مقیم زنجان، اخوند ملا حسیب اللہ کاشانی، اخوند ملا محمد تقی کاشانی، شیخ محمد حسین شیرازی، سید محمد رضا حسینی کاشانی پشت مشہدی، آ قا حسین نجم۔ آبادی طہرانی، شیخ علی اصغر بیرجندی، شیخ محمد باقر بیرجندی اور شیخ محمد نہاوندی اور ہمارے دور کے علامہ سید محمد حسین طباطبائی۔

عراق میں شیخ مرتضیٰ نظام الدین حلّی کاظمینی، آقا فتح علی زنجانی، سید علی طباطبائی یزدی حائری، سید عبدالحسین حسینی آل کمولہ نجفی اور ہمارے دور کے مجاہد قلمی اکبر شیخ محمد جواد بلاغی طاب ثراہ صاحب تفسیر آلاء الرحمن آقا میرزا ہادی خراسانی مجتہد کربلائے معلیٰ، شیخ محمد اشکوری نجفی اور اب عصر حاضر کے مرجع خلائق استاد علام الحاج سید ابوالقاسم خوئی دام ظلہ۔

ظاہر ہے کہ یہ طبقات مفسرین شیعہ پر کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ یہ تو سردست جو نام ہر صدی کے پیش نظر تھے ان کی ایک مجمل فہرست ہے جو ایک منصف مزاج یا غیر جانبدار صاحب عقل کو یہ احساس پیدا کرنے کیلئے قطعی کافی ہے کہ چودہ صدی کے قریب طویل دور زمانہ کے ہر جزء میں اتنے علماء افاضل اور اہل قلم کی دماغی طاقتیں، صلاحیتیں اور وقت پوری جانفشانی اور عرق ریزی کے ساتھ ایک ایسی چیز پر صرف نہیں ہو سکتے جسے وہ دینی حیثیت سے کوئی اہمیت (معاذ اللہ) نہ دیتے ہوں۔ ایسا تصور یا بس کوئی انتہائی متعصب کر سکتا ہے یا دیوانہ۔

علماء شیعہ کی یہ مسلسل کاوشیں جو بین الدفتین موجود ہیں اسی کتاب سے متعلق ان کی نظر میں اس کی دینی اہمیت کا قطعی ثبوت ہیں۔

نفی تحریف کے متعلق علماء شیعہ کے تصریحات

گذشتہ دلائل وشواہد کے بعد ضرورت تو باقی نہیں رہتی پھر بھی ذیل میں مختلف ادوار زمانہ کے چند اکابر علماء کے تصریحات بھی اس بارے میں درج کر کے اس تبصرہ کو ختم کیا جاتا ہے۔

(۱) راس المحدثین شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمی جن کی کتاب "من لا یحضرہ الفقیہ" شیعوں کے کتب اربعہ میں داخل ہے، اپنے "اعتقادات" میں تحریر فرماتے ہیں:

اعتقادنا ان القراٰن الذی انزل اللہ تعالی علی نبیہ محمد ﷺ ھو ما بین الدفتین ھو ما فی ایدی الناس لیس باکثر من ذالك. و من نسب الینا انا نقول انہ اکثر من ذالك فھو کاذب.

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن جس کو اللہ نے اپنے پیغمبر حضرت محمد مصطفی ﷺ پر نازل کیا تھا وہ یہی ہے جو دونوں دفتیوں کے درمیان ہے اور لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہے اور وہ اس سے زیادہ نہ تھا اور جو شخص ہماری طرف اس قول کی نسبت دے کہ وہ اس سے زیادہ تھا، وہ جھوٹا ہے۔

(۲) جناب سید مرتضیٰ علم الہدی رحمۃ اللہ علیہ نے مسائل طرابلسیہ میں تحریف قرآن کا انکار کیا ہے یہ کتاب ہمارے سامنے نہیں ہے مگر ان کا یہ قول ان کے شاگرد جناب شیخ طوسی نے تبیان میں اور علامہ طبرسیؒ نے تفسیر مجمع البیان میں درج کیا ہے۔

(۳) شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسیؒ اپنی عظیم الشان تفسیر "تبیان" میں تحریر فرماتے ہیں:

اما الكلام فی زیادته و نقصانه فمالا یلیق به لان الزیادةفیه مجمع علٰی بطلانه والنقصان منه فالظاهر ایضًا من مذهب المسلمین خلافه و هو الالیق بالصحیح من مذهبنا كما نصره المرتضٰی و هو الظاهر من الروایات.

قرآن میں زیادتی وکمی کی گفتگواس کی شان کے خلاف ہے اس لئے کہ زیادتی کے بطلان پرتو اجماع ہے اورکمی کے متعلق عموماً مسلمانوں کے مذہب کو ظاہر کیا ہے کہ اسکا تصور غلط ہے اور ہماری جماعت کا بھی صحیح طور پر مذہب یہی کہا جا سکتا ہے جس کو سید مرتضٰی نے تقویت دی ہے اور وہ ائمہؑ کے روایات سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

(۴) امین الاسلام شیخ ابوعلی طبرسیؒ ''تفسیر'' مجمع البیان میں لکھتے ہیں:

اما الزیادة فیه فمجمع علی بطلانه وأما النقصان فیه فقد روٰی جماعة من اصحابنا و قوم من حشویة العامة ان فی القراٰن تغیرا ونقصانا والصحیح من مذهب اصحابنا خلافه وهو الذی نصره المرتطی قدس الله روحه۔

قرآن میں زیادتی کا ہونا تو باجماع باطل ہے اور کمی کے متعلق کچھ شیعہ اور سنی ظاہر بین محدثین نے روایات نقل کی ہیں کہ اس قرآن میں کچھ تغیر وتبدیل اور نقصان ہوا ہے لیکن ہمارے علماء میں جو صحیح مذہب ہے وہ اس کے خلاف ہے اور یہی وہ ہے جسے جناب سید مرتضٰی قدس اللہ روحہ ، نے ثابت کیا ہے۔

(۵) فاضل تونی ملاعبداللہ بشرینی خراسانی شرح وافیہ مطبوعہ لکھنؤ ۲ ۵، ۵۳ میں لکھتے ہیں:

قد وقع الخلاف فی تغیره فقیل ان فی زیادةو نقصانا و به روایات كثیرة رواها الكلینی علی بن ابراهیم فی تفسیره والمشهور أنه محفوظ ومضبوط كما انزل لم یتبدّل ولم یتغیّر حفظه الحكیم الخبیر.

قرآن مجید میں تغیر وتبدیل کے متعلق اختلاف ہوا ہے بعض نے کہا ہے کہ اس میں کچھ کمی اور زیادتی ہوئی ہے اور اس کے متعلق بہت سے روایتیں بھی آئی ہیں جنہیں کلینی اور علی بن ابراہیم نے درج کیا ہے لیکن زیادہ تر علماء کا قول یہ ہے کہ وہ جتنا نازل ہوا تھا اتنا ہی محفوظ وسالم ہے اور اس میں تغیر وتبدیل نہیں ہوا ہے خداوندعالم نے اس کی حفاظت فرمائی ہے۔

(۶) محقق ثانی شیخ علی بن عبدالعالی کرکی مصنف ''جامع المقاصد'' آپ نے ایک مستقل رسالہ قرآن مجید میں کمی واقع نہ ہونے کے متعلق تحریر فرمایا۔

(۷) علامہ شیخ بہاء الدین عاملی فرماتے ہیں:

اختلفوا فی وقوع الزیادة و النقصان فیه و الصحیح أن القراٰن العظیم محفوظ عن ذالك زیادة كان أو نقصانا و یدل علیه قوله تعالی: وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ.

کمی اور زیادتی کے بارے میں اختلاف ہوا ہے اور صحیح یہ ہے کہ قرآن کریم اس سے زیادتی اور کمی دونوں اعتبار سے محفوظ ہے اور اس پر آیت قرآن دلالت کرتی ہے کہ ''ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔

اس قول کو شیخ جواد بلاغی طاب ثراہ نے آلاء الرحمن میں درج فرمایا ہے۔

(۸) شیخ محمد حسن آشتیانیؒ بحرالفوائد فی شرح الفرائد معروف بحاشیہ آشتیانی بررسائل مطبوعہ ایران ۹۹ میں لکھتے ہیں:

المشھور بین المجتھدین الاصولیین بل اکثر المحدثین عدم وقوع التغیر مطلقا بل ادعی غیر واحد الی الاجماع علی ذالك سیّما بالنسبة الی الزیادة.

کمی اور زیادتی کے بارے میں اختلاف ہوا ہے اور صحیح یہ ہے کہ قرآن کریم اس سے زیادتی اور کمی دونوں اعتبار سے محفوظ ہے اور اس پر آیت قرآن دلالت کرتی ہے کہ ''ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔

اس قول کو شیخ جواد بلاغی طاب ثراہ نے آلاء الرحمن میں درج فرمایا ہے۔

(۸) شیخ محمد حسن آشتیانیؒ بحر الفوائد فی شرح الفرآئد معروف بحاشیہ آشتیانی بررسائل مطبوعہ ایران ۹۹ میں لکھتے ہیں:

قول مشہور مجتہدین اصولیین بلکہ اکثر اخباری علماء کے درمیان بھی یہ ہے کہ قرآن میں تغیر وتبدیل بالکل نہیں ہوا ہے بلکہ متعدد حضرات نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے خصوصاً زیادتی نہ ہونے کے متعلق۔

(۹) جناب شیخ جعفر نجفی طاب ثراہ اپنی مشہور ومعروف کتاب ''کشف الغطاء'' میں تحریر فرماتے ہیں:

لاریب انّہ محفوظ من النقصان بحفظ الملك الدّیّان کما دلّ علیہ صریح القرآن واجماع العلماء فی کل زمان.

بلاشبہ وہ کمی سے محفوظ ہے خالق کریم کی حفاظت کے سبب سے جس پر قرآن صریحی طور سے دلالت کرتا ہے اور اسی پر ہر زمانہ میں علماء کا اجماع رہا ہے۔

(۱۰) سید محمد مہدی رضوی نے اعتقادیہ صدوقؒ کی شرح فارسی میں لکھی ہے جس کا سال تصنیف ۱۲۶۱ھ ہے اس کا قلمی نسخہ ہماری نظر سے گزرا ہے اس میں ۶۵ پر ہے:

''فصل بست ونہم دربیان آنکہ قرآن کلام حق تعالیٰ وحی فرستادہ اوست''

اس کے ذیل میں لکھا ہے:

خداوندنگاہ دراندہ است اززیادہ ونقصان وانعدام: آن ازمیان مردمان------------ پھر ہے۔

''فصل سیم اعتقاد درباب مبلغ قرآن ومنزل مجموع آن شیخ مہرورروح اللّٰہ روحہ می فرماید کہ اعقاد ما آنست کہ قرآن کہ حق تعالیٰ آں رابرپیغمبر خود محمد رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرستادہ ہمانست کہ مکتوب ومرقوم شدہ وجمع درمجلہ گشتہ دردست مردمانست وزیادہ برین نیست وہر کہ نسبت دہد بما طائفہ امامیہ اثناء عشریہ کہ میگوئم قرآن زیادہ بریں است دروغ گفتہ وغیرہ واقعی بما استنادکردہ وآن کہ مردیست ازثواب ختم مجموع آن وجائز نمودن خواندن زیادہ ازیک سورہ دریک رکعت فریضہ مصدق آنست کہ ما بیان نمودیم کہ قرآن زیادہ ازین نیست کہ دردست خلائق است وہمچنیں مردیست۔

درباب نہی ازخواندن تمام قرآن دریک شب وآں کہ جائز نیست ختم تمام قرآن درمدت کمتر ازسہ روز نیز مصدق آنست کہ مابیانمودیم درباب آن کہ قرآن زیادہ بریں نیست۔''

(۱۱) ہمارے دور کے بہت بڑے محقق مجتہد مجاہد علامہ شیخ محمد جواد بلاغیؒ نے اپنی کتاب آل ء الرحمن فی تفسیر القرآن' جلد ا مطبوعہ مطبع ''العرفان'' صیدا میں پہلے توصفحہ نمبر ۱۸ پر جمع قرآن کے تذکرہ کے بعد لکھا ہے۔

فلم یتفق لامر تاریخی من التواتر و بداھة البقاء مثل ما اتفق للقراٰن الکریم کما وعدالله جلّت الاوہ بقوله سورة الحجر: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ. و قوله فی سورة القیامة: اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ. و لمن سمعت فی الروایات الشاذة شیئا فی تحریف القراٰن وضیاع بعضه فلا تقم لتلك الروایات وزنا.

کسی تاریخی بات کو یہ تواتر نصیب نہیں ہوا اور بدیہی طور پر باقی ہونے کا ثبوت جیسا قرآن مجید کے لئے حاصل ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا۔ سورہ حجر کی آیت میں ہے کہ "ہم نے اس قرآن کو اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کریں گے" اور سورہ قیامت میں کہ ہمارے ذمہ ہے اس کا یکجا کرنا اور اس کا برابر پڑھتے جاتے رہنا اور اگر شاذ روایت میں کوئی ایسی بات سنو جس سے قرآن میں کچھ تغیر و تبدیل کا ذکر ہو یا یہ کہ اس کا کوئی حصہ تلف ہو گیا تو ان رویات کا کوئی وزن نہ سمجھو۔

اس کے بعد ۲۵ پر مستقل عنوان قائم کیا ہے:

قول الامامیة بعدم النقصیة فی القراٰن

فرقہ امامیہ کا قول کہ قرآن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

پھر اس ذیل میں صدوقؒ اور ان کے بعد والے علماء کے ارشادات نقل کئے ہیں اور جن روایات سے تحریف کا توہم ہوتا ہے ان کی سند و دلالت پر بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ توہم درست نہیں ہے۔ ان ارشادات کو آخر کتاب میں افادات بلاغی کے تحت میں درج کیا جائے گا۔

(۱۲) ماضی قریب کے سب سے بڑے مشہور و معروف مرجع تقلید آقا سید محسن حکیم طباطبائی علیہ الرحمہ کی نگرانی میں ایک نصاب دینیات کا سلسلہ طلاب مدارس کے لئے الاسلام دین وحیاۃ کے نام سے علامہ سید موسیٰؒ صدر کا تحریر کردہ شائع ہوا ہے جو ۱۹۶۶ء میں بیروت میں طبع ہوا ہے اور کے چھٹے حصہ میں صفحہ نمبر ۱۵ پر ہے۔

القراٰن الذی بین ایدینا الاٰن هو نفس القراٰن الذی انزله الله علی عبده محمّد ﷺ و نحن نؤمن به و کل ما جاء فیه و لقد حماه الله من اعدائه و من المنافقین فلا تغیر فیه و لا تبدیل و لا زیادة و لا نقصان و لم یزد علیه کلمة و لا حروف و لم ینقص منه کلمة و لا حرف و لا یأتیه الباطل من بین یدیه و لا من خلفه.

قرآن جو ہمارے سامنے موجود ہے یہ وہی قرآن ہے جو اللہ نے اپنے بندہ خاص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا تھا اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ہر اس چیز پر جو اس میں درج ہے اور اللہ نے محفوظ اس کو رکھا ہے اس کے دشمنوں سے اور منافقوں سے تو نہ اس میں تغیر ہے اور نہ تبدیل اور نہ زیادتی اور نہ کمی اور اس میں ایک لفظ اور ایک حرف کی بھی زیادتی نہیں ہوئی ہے اور نہ ایک لفظ اور ایک حرف کی کمی ہوئی ہے اور باطل کا دسترس اس پر کسی بھی رخ سے نہیں ہے۔

(۱۳) زمانہ حال کے ایک مرجع تقلید آیۃ اللہ آقائے سید محمد کاظم شریعتمداری بانی ادارہ تبلیغات اسلامیہ قم (ایران) اپنے ایک مکتوب میں جو اسلامی شخصیتوں کے نام تحریر فرمایا ہے۔ اور رسالہ "فعالیتہای در راہِ وحدت اسلام" مطبوعہ ایران کے ۶ پر درج ہے۔

ان الحجاج الایرانیین القادمین من زیادة بیت الله الحرام قد جاء و نابهذه الرسالة و راینا فیها ما لا یعتقد به ای فرد شیعی فی ای مکان کالقول بتحریف القراٰن الکریم العیاذ بالله.

صفحہ ۸ پر فارسی میں ہے:

"حجاج ایرانی که از زیارت بیت اللّٰه الحرام برگشتند مقداری ازیں رساله را نزد ما آوردند و ملاحظه نمودیم که چیزهائے در آن نوشته شده است که بیچ مرد شیعی درج هیچ جا بان معتقد نیست از قبیل (العیاذ بالله) قول تحریف قرآن کریم" (ترجمه نامه حضرت آیة اللّٰه شریعت مداری به شخصیت هائے اسلامی)

مطلب یہ ہے کہ

"حج کے موقع پر بعض غیر شیعہ افراد نے ایک پمفلٹ تقسیم کیا ہے جس میں شیعوں کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دی گئی ہیں جن کا کوئی شیعہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں اعتقاد نہیں رکھتا۔ جیسے قرآن مجید کا (معاذ اللہ) محرّف ہونا۔"

(۱۵) ادارہ تبلیغات اسلامیہ قم ہی سے ایک رسالہ شائع ہوا ہے ندای فکری برائے مسیحیان مسیحیت شمارہ ۱۳ اس میں ۹ پر لکھا ہے:

قرآن کریم درحال حاضر بہمان شکل که ہزار و چهار صد سال قبل بر پیغمبر محمدؐ نازل شده دست نخورده باقی مانده است --- و از نخستن روزہائے که قرآن از زبانِ پیامبر نقل شده است حتی یک کلمه ہم تغیّر و تبدّل در آں رخ نداده و بہمان صورتیکه وحی شده باقی مانده است۔

قرآن مجید اس وقت تک اسی شکل میں کہ جس طرح چودہ سو برس پہلے حضرت پیغمبر اسلام ﷺ پر اترا تھا بغیر کسی تصرف کے باقی رہا ہے اور شروع دن ہی سے جب قرآن حضرت پیغمبر خدا کی زبانی پہنچا ہے ایک لفظ کا بھی تغیر و تبدیل اس میں نہیں ہوا ہے اور اسی صورت پر کہ جس طرح وحی ہوئی تھی، باقی رہا ہے۔

(۱۶) "معارف الاسلام" لاہور شمارہ دسمبر ۱۹۶۸ء میں صفحہ ۲۸ پر مولانا مرزا احمد علی امرتسری اعلی اللہ مقامہ نے مجلہ آستان رضوی مشہد مقدس" سے اقتباسات درج کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مسلم اور محقق ہے کہ" قرآن مقدس علوی ہمیں قرآن موجود است" موجود قرآن ہی حضرت علیؑ کا مقدس قرآن ہے "قرآن کریم ہرگز دست خوش صدمت تحریف و زیادت نقصان نہ گردیدہ (خدائے قرآن این مہیمن جاوید آسمانی را بر طبق وعدۂ صدق خویش نگہبانی کردہ چنانچہ فرمودہ است اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ٥ (حجر آیت ۹)

ودرایں کتاب حق کہ از مصدر حقیقت یزادانی فرود آمدہ ہرگز باطلے راہ نیافتہ ونخواہد یافتہ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيۡزٌ لَّا يَاۡتِيۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ حَكِيۡمٍ حَمِيۡدٍ ○ (حم سجدہ۔ ۴۱، ۴۲)

یعنی: قرآن حکیم میں کوئی تحریف یا زیادتی یا کمی نہیں ہوئی اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے وعدہ کے مطابق اس کی حفاظت کی جیسا کہ اس نے فرمایا ہے کہ ہم ہی نے قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس کتاب حق میں جو مصدر حقیقت سے اتری ہے کبھی بھی باطل کو راہ نہیں ملی اور نہ ملے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ کتاب عزیز ہے۔ اس کے پاس باطل نہ سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ حکمت والے قابل تعریف خدا کی طرف سے اتری ہوئی کتاب ہے" علمائے کبار شیعہ صریحاً عقیدہ خود را مبنی بر صحت وسندیت وعدم زیادت ونقصان قرآن بیان کردہ اند" یعنی شیعہ اثناء عشریہ اصولیہ کے اکابر علماء کا عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ قرآن وہی اور اسی صورت میں ہے جس میں حضرت سرور کائنات علیہ التحیات پر نازل ہوا تھا اس میں نہ تحریف ہوئی، نہ زیادتی ہوئی، نہ کمی ہوئی۔

(۱۷) خود میں نے تقریباً تینتالیس سال قبل اس موضوع پر ایک بسیط کتاب تحریر کی جس کا امامیہ مشن لکھنؤ سے جمادی الاول ۱۳۸۶ھ میں تیسرا ایڈیشن نکلا ہے اور اس کے علاوہ کئی ایڈیشن امامیہ مشن پاکستان کی طرف سے لاہور میں نکلے ہیں اس کے کچھ اقتباسات مذکور بالا تیسرے ایڈیشن کے صفحات کے حوالے سے ذیل میں درج ہیں۔

صفحہ ۶ ''اسلام کے لئے کچھ اصول اساسی ہیں کہ انہی کے اعتقاد کا مجموعہ اسلام کہا جاتا ہے اور ان میں تمام فرقہ اسلامیہ باوجود اپنے آپس کے اختلافات کے برابر شریک ہیں''۔

بنیادی اصول الوہیت، رسالت، کتاب منزل، یعنی قرآن مجید اور روز قیامت یعنی معاد ہیں''۔

صفحہ ۷۔ ''لازم یہ ہے کہ تمام فرق اسلامیہ کے اس متفقہ عقیدہ کو کہ قرآن مجید وحی سماوی اور کتاب ربانی منزل من اللہ رسولؐ کا اعجاز ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں اور نہ اس میں ذرہ برابر باطل کا شائبہ ہے اور اس پر ایمان و اعتقاد کامل تمام مسلمانوں کے اسلام کا جزو اعظم ہے'' اسی متفقہ و متحدہ صورت پر باقی رہنے دیا جائے۔

صفحہ ۱۰۔ ''پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ حضرت کی نبوت دنیا کے آخری دور تک ہر وقت زندہ ہے کیوں کہ حضرتؐ کی نبوت و رسالت کی بنیاد صرف ان وقتی معجزات پر نہ تھی جو اس زمانہ میں موجود ہونے والے اشخاص ہی کے سر تسلیم کو خم کرا سکتے بلکہ حضرت کے دعوے کی بنیاد اس قرآن مجید پر ہے جو چودہ سو برس کے قریب گزرنے کے بعد بھی اس وقت زندہ ہے اور دنیا کو حق کی طرف دعوت دے رہا ہے۔

دنیا تہی دست ہے جب کہ اس کے پاس قرآن کے مثل کوئی کتاب نہیں لیکن مسلمان قرآن کی بدولت اس خزانہ عامرہ کے مالک ہیں جس کی نظیر صفحہ روزگار میں مل ہی نہیں سکتی۔''

صفحہ ۴۸۔ ''قرآن مجید کی اصلیت و حقیقت کے متعلق مسلمانوں کے اندر باوجود آپس کے ہزار ہا گوناگوں اختلافات کے کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ وہ متفقہ حیثیت سے اس نقطہ پر مجتمع ہیں کہ قرآن مجید خداوند عالم کا نازل کردہ رسول عربی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل شدہ ہے اور یہ کہ اس میں کسی انسان کی ساخت و پرداخت کو کوئی دخل نہیں ہے''۔

صفحہ ۲۰۴۔ (عنوان ''تمام بحث کا آخری نتیجہ یا میرا عقیدہ'')

موجودہ قرآن کلام الٰہی، وحیٔ آسمانی، رسولؐ کا اعجاز اور مسلمانوں کے لئے واجب العمل ہے اس کے کسی جزء یا کل کے مفاد کی مخالفت، مخالفت خدا ہے اور اس کا اتباع ہر مسلمان کا رکن مذہب اور اہم ترین فریضہ ہے اس قرآن کے علاوہ کسی سورہ کسی آیت اور کسی حرف کو بھی جزء قرآن سمجھنا درست نہیں ہے اور نہ اس پر احکام قرآن مرتب ہو سکتے ہیں''۔

ساتواں تبصرہ

قراءسبعہ اور سبعۃ احرف

قرآن مجید جب سے یکجا ہو کر مکتوبی صورت سے عالم اسلامی میں منتشر ہوا اس کے حروف و الفاظ اور رسم الخط کی انتہائی حفاظت کی گئی اور اس کے الفاظ کی صورت و ہیئت میں کسی قسم کی تبدیلی روا نہ سمجھی گئی جس کی بناء پر اس کو وہ تواتر کا درجہ حاصل ہوا جو دنیا کی کسی کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

یہاں تک کہ بعض املا کی غلطیاں جو پہلے کاتب سے اتفاقاً ہو گئی تھیں جیسے لا اذبحنه کا درمیانی الف اور اسی طرح لا اوضعوا کا بیچ کا الف وہ اب تک قائم رکھیں گئیں اور قرآن کی کتاب میں اس الف کو ترک نہیں کیا جاتا۔

یہ معنوی حیثیت سے چاہے بلاضرورت سمجھا جائے یا مضحکہ خیز بھی ہو، مگر انضباط و اعتبار کی حیثیت کو اس سے کافی تقویت پہونچتی ہے یورپ میں اس وقت بعض قلمی قدیم کتابوں کا بالکل فوٹو اتار کر شائع کر دیا جاتا ہے یا اگر اس کو نقل کراتے ہیں تو یہ ملحوظ رکھتے ہیں کہ جو لفظ جس طرح لکھا ہے اس کو اسی صورت سے نقل کیا جائے اس میں اگر کہیں کتابت اور املاء کی غلطی ہوتی ہے تو اس کو باقی رکھتے ہیں اور حاشیہ پر یا فٹ نوٹ میں لکھ دیتے ہیں کہ یہ لفظ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

بظاہر اس میں یہ غلطی ہے اور صحیح یوں ہے اس طرح حفاظت اور اہتمام پر روشنی پڑتی ہے جس سے کتاب کے اعتبار کو قوت حاصل ہو جاتی ہے لیکن جس طرح موجودہ زمانہ میں قاری ہوتے ہیں جن میں سے بعض قرآن مجید کے پڑھنے میں طریقہ تلفظ اور ادائے حروف کے سلسلہ میں ایسی فنکاریاں کرتے ہیں کہ لفظ کی آواز میں کچھ کا کچھ انقلاب آ جاتا ہے۔

اسی طرح صدر اسلام میں بھی قاریان قرآن بہت سے تھے اور ہر ایک کا طریقہ قرات ادائے حروف میں مختلف تھا۔ اس سے بہت سی قرائتیں پیدا ہو گئیں اور ہر ایک قاری کے جو شاگرد تھے وہ استاد کی پیروی میں اسی طریقہ خاص کے پابند ہو گئے۔

ان قاریوں کی قرائتیں نہ رسولؐ سے لی گئی تھیں اور نہ ائمہ معصومینؑ میں سے کسی سے اخذ کی گئی تھیں اس لئے انہیں دینی حیثیت سے سند کوئی حاصل نہ تھی پھر ان کی تعداد بھی کوئی محدود نہ تھی بلکہ یہ کثیر التعداد اشخاص ہر زمانہ میں پیدا ہوتے رہتے تھے جو اپنے ذوق طبعی کے لحاظ سے ادائے الفاظ میں جدّتیں کرتے تھے اور اسے مستقل قرأت کا درجہ دیتے تھے۔

لیکن بالکل اسی طرح جیسے فقہاء کی کثیر التعداد جماعت میں جب بادشاہ کی نظر توجہ اور عام خلقت کے میلان طبع نے چار آدمیوں کو خاص طور سے پسند کر لیا تو اہلسنت میں وہ چاروں بزرگ اس طرح مستند قرار پا گئے کہ ان کے بعد اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔

اسی طرح ان تمام قاریان قرآن میں سے سات آدمیوں کو منتخب کر کے انہیں ''قراءسبعہ'' کے نام سے تمام امت کا مرکز قرار دے دیا گیا کہ انہی سات آدمیوں میں سے کسی ایک شخص کی قرأت کے مطابق پڑھنا جائز ہے۔

ان ساتوں قرأتوں پر اتفاق کر لینے کے بعد دینی ماخذوں میں ان کے لئے سند تلاش کی گئی تو ایک حدیث دستیاب ہو گئی کہ

''نزل لقران''''علی سبعۃ احرف'' قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے''۔بس اس کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ ساتوں قرأتیں وہ ہیں جومنشائے الٰہی کے مطابق ہیں۔

حالانکہ خود یہ حدیث اپنے لفظ و معنی کے اعتبار سے اس درجہ مضطرب ومبہم ہے کہ حافظ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ اس میں چالیس قول ہیں۔

اس سب کے برخلاف ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی یہ حدیث قرآنی عظمت کے بالکل مطابق ہے کہ:

ان القران واحد نزل من عند واحد

قرآن کی بس ایک شکل ہے اور وہ ایک ذات بے ہمتا کے پاس سے اترا ہے۔

اور ایک حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ سات حرف جو ہیں وہ تفسیری پہلوؤں سے متعلق ہیں۔

عن زرارہ عن ابی جعفر علیہ السلام قال تفسیر القراٰن علی سبعۃ احرف منه ما کان ومنه مالم یکن بعد ذالك تعرفه الائمّة.

زرارہ کی روایت ہے، امام محمد باقر علیہ السلام سے آپؑ نے فرمایا کہ قرآن کی تفسیر کی سات نوعتیں ہیں ان میں کچھ ماضی سے متعلق ہیں جس کا وقوع ہو چکا اور کچھ مستقبل سے متعلق ہیں جس کا وقوع ابھی نہیں ہوا اس سب کا ائمہ معصومینؑ جانتے ہیں۔(بصائر الدّرجات۔مطبوعہ ایران۔ص ۵۲)

''سبعۃ احرف کی یہی تشریح قرآنی عظمت وجلالت سے تناسب رکھتی ہے''۔

آٹھواں تبصرہ

فہم قرآن کے سلسلہ میں مختلف نظریات اور صحیح نقطہ نظر

قرآن فہمی اور تفسیر کلام پاک کے بارے میں مختلف جماعتوں کے نقطہ نظر میں بڑا فرق ہے۔ایک جماعت عقل انسانی کو اس کے معانی سمجھنے سے بالکل ہی قاصر سمجھتی ہے وہ کہتے ہیں کہ قرآن سمجھنے والے خاص افراد تھے جو اب ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں لہٰذا ہم صرف ان حضرات کے اقوال پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں براہ راست قرآن سے ہم کسی حکم شرعی یا مسئلہ اعتقادی کو نہیں سمجھ سکتے یہ ہمارے یہاں کی اخباری جماعت ہے جس نے ادلہ احکام سے کتاب الٰہی کو بالکل خارج کر دیا ہے اور اپنے عمل کا دارومدار صرف اخبار واحادیث پر رکھا ہے۔

دوسری طرف وہ جماعت ہے جو قرآن مجید کے ہدایات کو اپنے لئے کافی قرار دے کر سنت کو بالکل نظر انداز کرتا ہے۔ یہ فرقہ مسلمان میں ''اہل قرآن'' کے نام سے موجود ہے جو اپنے تمام افعال وعبادات اور دیگر احکام شرعیہ کی بنیاد قرآن مجید پر رکھنے کا دعویدار ہے یہ دونوں ہی مسلک افراط وتفریط کے کرشمے ہیں۔

قرآن کے لئے پہلے ہی پارے کے آغاز میں یہ اعلان موجود ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ یہ رہنما ہے پرہیز گاروں کے لئے دوسری جگہ کہا گیا ہے ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس کا دائرہ بجائے خود تمام انسانوں کے لئے صدائے عام کی حیثیت رکھتا ہے۔ بیشک اس صدا پر آتے وہی ہیں جو متقین ہیں یعنی اندیشہ انجام اور فکر نجات رکھتے ہیں کہیں اس کو ضیاء (روشنی) کہیں ذکر (یاد آوری کا سامان) کہیں تبصرہ (آنکھیں کھولنے والا) کہیں شفاء لما فی الصدور (سینوں کے اندرونی امراض کا شک وشبہہ اور کفر ونفاق وغیرہ کا علاج) کہیں فرقان (حق و باطل میں جدائی ڈالنے والا) اور کہیں بیان (حقیقتوں کا واضح کرنے والا) وغیرہ وغیرہ کہا گیا ہے جس سے مجموعی طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ یقیناً وہ عام خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کے لئے اتارا گیا ہے اور دنیا کو اس کے مندرجہ مضامین پر غور کرنے، اس سے نتیجہ نکالنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت ہے وہ صرف بطور اوراد وادعیہ کے زبانوں سے تلاوت کر لینے اور بطور تعویذ ونقش کے گلے میں ڈال لینے اور بطور ایک محترم اور مقدس چیز کے سر آنکھوں پر رکھ لینے اور بوسہ دینے کیلئے نازل نہیں ہوا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اس کا مطالب وحقائق سے فائدہ اٹھایا جائے ،اس میں غور وخوض کیا جائے، نیز اس سے اپنی عملی زندگی کے لئے سبق حاصل کئے جائیں۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن مجید ایک خاموش رہنما ہے وہ تعلیم کی عملی تشریح نہیں کر سکتا اور پھر اس میں اکثر مضامین بطور اجمال بیان ہوئے ہیں۔ لہٰذا قرآن کے ساتھ ناطق رہنما کی ضرورت ہے جو اس کے تعلیمات کو اپنے عمل سے دنیا کے ذہن نشین کرے، اس کے مجملات کی تفصیل سمجھائے اور اس کے مبہمات کی توضیح وتفصیل کرے۔

یہ معلّم اپنے زمانہ میں پیغمبر خدا ﷺ تھے اور اس لئے خود قرآن مجید نے حضرت کی پیروی کی دعوت دی۔ (قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ)۔ اور لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اور اسی سے کتاب کے ساتھ سنت کا ماخذ احکام ہونا ظاہر ہے۔

پھر رسولؐ نے اپنے بعد کے لئے اپنے خاص اہلبیت کو جو تعلیمات قرآنی کا مکمل نمونہ تھے قرآن کا ساتھی بتایا اور قیامت کے لئے ان

دونوں کے ساتھ کا اعلان فرمایا۔

یہ حضرت کی مابین فریقین متفق علیہ حدیث ہے جس کا مشہور و معروف متن یہ ہے

اِنِّی تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِی اَھْلَبَیْتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ وَاَنَّھُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ.

میں تم میں دوگرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں اللہ کی کتاب اور میری عترت جو میرے اہلبیتؑ ہیں جب تک تم ان دونوں سے تمسک رکھوگے میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ اور یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ یہ دونوں وارد ہوں میرے پاس حوض کوثر پر قیامت کے روز۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسولؐ کے بعد قرآن کے ساتھ رہنمائی میں اہلبیتؑ کا مقام ہے۔ اس لئے قرآن مجید کی تعلیم پر صحیح عمل کے لئے جس طرح احادیث رسولؐ کو سامنے رکھنا ضروری ہے، اسی طرح آپؐ کے ان جانشینوں کے ارشادات کو جن کا حضرتؐ نے عترت اور اہل بیتؑ کی لفظوں کے ساتھ تعارف کرایا ہے۔

اس کے بالمقابل یہ نعرہ کہ حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰهِ "ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے"۔ پہلے تو ہنگامی طور پر بلند ہوا۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری دور حیات میں جب حضرتؐ کی علالت پوری شدت پر تھی اور آپؐ نے قلم و دوات اور کاغذ طلب فرمایا کہ اپنے بعد کے لئے جو ذریعہ ہدایت ہے اس کی تحریری دستاویز چھوڑ جائیں تو کسی سیاسی پیش بندی کے طور پر یہ جملہ کہہ کے حضرتؐ کو آپ کے منصوبے کی تکمیل سے باز رکھا گیا مگر اس کے بعد بطور مسلک اس پر کوئی عمل نہیں کیا گیا ورنہ حضرت فاطمہ زہراؑ کو میراث سے محروم کرنے کے لئے اپنی ہی روایت کردہ ایک حدیث کو سند قرار نہ دیا جاتا اور اسی طرح برابر پیش آمدہ مسائل شرعیہ میں رسولؐ کے ارشادات اور فیصلوں کی تلاش کی جاتی تھی اور ان کو حجت مانا جاتا تھا بلکہ لاشعوری طور پر سہی برابر اس حَسْبُنَا کے تصور کی ردھوتی رہی۔ احادیث رسولؐ سے بھی اور اقوال علماء سے بھی چناں چہ عبیداللہ بن رافع کی روایت ہے کہ حضرت پیغمبرؐ خدا نے فرمایا:

لا الفین احدکم متکیا علیٰ اریکة یا تیه الامر من امری بما امرت به او نهیت عنه فیقول لا ادری ما وجدناه فی کتاب الله.

ایسا میں نہ دیکھوں کہ تم میں کوئی (اطمینان سے) گاؤ تکیہ سے لگا بیٹھا ہو اور میرا کوئی حکم اوامر یا نواہی کے قبیل سے اس کے سامنے آئے اور وہ کہے میں اسے نہیں جانتا ہم نے اسے کتاب الٰہی میں تو پایا نہیں ہے۔

اسے محی السنہ بغوی نے شرح السنۃ میں درج کیا ہے اور کہا ہے ھذا حدیث حسن یہ با عتبار سند حسن حدیث ہے۔ (دراسات اللّبیب۔ ص ۵۵)

ایک جگہ یہ الفاظ ملتے ہیں کہ:۔

لا عرفن رجلا اتاه الامر من امری ما امرت به اذ نهیت عنه فیقول ما ھٰذا عندنا کتاب الله لیس ھٰذا فیه.

مجھے خوب معلوم ہے ایسا شخص جس کے پاس میرا کوئی حکم اوامر یا نواہی میں سے پہنچے تو وہ کہے یہ کیا ہے؟ ہمارے پاس کتاب خدا موجود ہے اس میں تو یہ نہیں ہے۔

ایک روایت مقدام بن معدی کرب کندی کی ہے۔

اِنَّ رسول اللہ ﷺ قال یو شك الرجل متكیا علی اریكة یحدث بحدیث من حدیثی فیقول بیننا وبینكم كتاب اللہ عز و جل فما وجدنا فیہ من حلال استحللناہ وما وجدنا فیہ من حرام حرمناہ آلا وان ما حرّم رسول اللہ ﷺ مثل ما حرّمہ اللہ عزوجل.

جناب رسول خدا ﷺ کا ارشاد ہے کہ جلد ہی ایسا وقت آئے گا کہ ایک شخص گاؤ تکیہ سے لگا بیٹھا ہوگا اور اس کے سامنے میری حدیث پیش ہوگی وہ کہے گا کہ ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کن کتاب الٰہی ہے تو جو اس میں ہمیں حلال نظر آئے گا اسے ہم حلال سمجھیں گے اور جو اس میں حرام ملے گا اسے حرام سمجھیں گے خبردار آگاہ رہو کہ جسے رسولؐ خدا نے حرام کیا وہ ویسا ہی ہے جیسے اللہ نے حرام کیا ہو

ان دونوں حدیثوں کو عبدالکریم بن محمد سمعانی نے 'ادب الاملاء والاستملاء'' مطبوعہ مطبع بریل لیدن ۱۹۵۲ء صفحہ ۳ و ۴ میں درج کیا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر حَسۡبُنَا کِتَابَ اللہ کی کوئی رد ہوسکتی ہے جو خود حضرت پیغمبر خدا ﷺ نے فرمائی ہے اور اس کے بعد برابر صحابہ اور تابعین اور علمائے اسلام بلاتفریق فرقہ شعوری یا لاشعوری طور پر اس تصور کی رد کرتے رہے۔

چنانچہ اسی ''ادب الاملاء والاستمال ء'' صفحہ ۴ میں مشہور صحابی رسولؐ جناب عمران بن حصینؓ کا قول درج ہے کہ احادیث کے ذکر پر ایک شخص نے کہہ دیا کہ ارے حدیث کا ذکر چھوڑو ہم سے کتاب الٰہی کی بات کرو تو اس پر انہوں نے فرمایا:

انك احمق اتجد فی كتاب اللہ الصلوٰۃ مفسرۃ اتجد فی كتاب اللہ الصّوم مفسراً آفی القراٰن حكم ذٰلك والسنة نفسر ذالك.

تم بے وقوف ہو کیا کتاب الٰہی میں تمہیں نماز کی تفصیل ملتی ہے کتاب الٰہی میں روزہ کا تفصیلی بیان ملتا ہے۔ یہ سب احکام قرآن بیان کیئے ہیں اور تفصیلات سنت سے معلوم ہوتے ہیں۔

بلاتفریق فرقہ فقہ اسلامی یعنی علم شریعت کی تدوین اسی اصول پر ہوئی جو حَسۡبُنَا کی باجماع امت عملی ردتھی اسے وضاحت کے ساتھ ملا محمد عبدالصمد پشاوری نے اپنی کتاب طلب الادب میں جو قاضی شوکانی کی کتاب ادب الطلب کی تلخیص ہے اور جسے ہندوستان کے مشہور عالم نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے اپنے اہتمام سے بھوپال میں چھپوایا ہے تحریر کیا ہے وہ لکھتے ہیں (صفحہ ۳۹)

إذا لم یتقن علم السنة ولم یعرف صحیحه من سقیم ولم یعول علیٰ اهل هٰذاالفن فی اصدارہ وایرادہ كانت مصنّفا تہ مبنیّة علیٰ غیراساس لان علم الفقه هوما خوذ سنّة الا ماصرح بحكمة القرآن الكریم وهو قلیل.

جب کوئی شخص سنت کا علم کافی نہ رکھتا ہوگا اور احادیث میں درست و نادرست کا امتیاز نہ کرے گا اور اس فن کے ماہرین پر دلائل قائم کرنے اور نتیجہ نکالنے میں بھروسا نہ کرے گا تو اس کے تصانیف بے بنیاد ہوں گے اس لئے کہ علم فقہ کا ماخذ عموماً سنت ہے سوا ان امور کے جن کے

حکم کی صراحت قرآن مجید میں ہوگئی ہے اور وہ بہت کم ہیں

ہندوستان کے متاخرین اہل قلم بھی بلاتفریق فرقہ اس نعرہ حَسْبُنَا کی چاہئے لاشعوری طور پر ہو رد کرتے رہے ہیں جن میں سے یہاں صرف مولانا ابوالکلام کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے وہ فرماتے ہیں۔

''انسانی سعادت کے لئے تعلیم محض بالکل بیکار ہے جب تک کہ اس تعلیم کے زندہ نمونے بھی انسانوں کے ساتھ نہ ہوں جو اثر طبیعت منفعلہ انسانیہ پر ایک انسانی نمونہ عمل کا پڑتا ہے وہ محض تعلیم کی سماعت سے نہیں پیدا کیا جاسکتا اخلاق کی کتابیں اپنے موثر تعلیمات سے انسانوں کو رلاسکتی ہیں مگر ان کے دلوں کو نہیں پھیر سکتیں۔

عدالت کا قانون مجرم کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال سکتا ہے لیکن اس کے جرم سے باز نہیں رکھ سکتا حکماء کے حکیمانہ نصائح نیکوں کی بڑی بڑی تعریفیں اور بروں کی بڑی بڑی برائیاں بتلاسکتے ہیں لیکن کسی برے انسان کو نیک نہیں بنا سکتے''۔

''بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد''

لیکن برخلاف اس کے اگر ایک پاک انسان اپنی زندگی کے اندر نیکی کا عملی نمونہ رکھتا ہو اور اس کے اعمال حیات راستبازی کے لئے اسوہ کا حکم رکھتے ہوں تو وہ صرف اپنا نمونہ دکھلا کر نہ صرف افراد اشخاص کو بلکہ اقوام واُمم کے عمال کو یکسر پلٹ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت خلق اللہ کے لئے صرف کتابوں اور شریعتوں ہی کو نہیں بھیجا بلکہ اس کے ساتھ انبیاء کرام علیہم السلام کا (کہ ان کے حاصل تھے) عملی نمونہ بھی دکھلادیا وہ جس دستور العمل کی طرف قوم کو بلاتے تھے اس کا عملی پیکر خود ان کی پاک ومطہر زندگی تھی۔

اگر شریعت بصورت قانون تختیوں اور کاغذوں پر منقوش تھی تو بصورت وجود حیّ وقائم ان کی زندگی کے اندر بھی پڑھی جاسکتی تھی اگر اس کی آیات بینات حروف واصوات کی شکل میں دنیا کو دعوت دیتی تھیں تو انبیاء کرام کی زندگی عمل وفعل کے اندر سے اس کی تصویر دکھلاتی تھی۔ اگر قانون کہتا تھا کہ انسان کو ایسا کرنا چاہئے تو حیات نبوت ثابت کرکے دکھلادیتی تھی کہ اس طرح کیا گیا اور اس طرح کیا جاسکتا ہے۔

''داستان کربلا مطبوعہ حیدرآباد دکن صفحہ ۲۴۲ یاد حسین علیہ السلام از مولانا ابوالکلام آزاد۔''

یہی ضرورت تھی جس کے لئے بعد رسولؐ بھی ایسی ہستیوں کی ضرورت تھی جو قرآن کی تعلیم کا مکمل نمونہ اور اپنے قول وعمل سے اس کے شارح ومفسر ہوں۔ اسی ضرورت کی تکمیل پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث ثقلین سے فرمائی۔

قرآن مشکل ہے یا آسان

حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ کا نعرہ جو ہم سے دور لگا تھا اور اس کی صدائے بازگشت بیگانوں کے حلقوں اہل قرآن پرویز اور طلوع اسلام کی شکلوں میں بلند ہوئی جس پر سیر حاصل تبصرہ ہو چکا، نجانے کس طرح ہمارے آس پاس اس کا ایک دھاکہ ہو گیا۔ بعض خود روقسم کے دعویداران تحقیق کے قلم سے ان الفاظ میں کہ ’’قرآن آسان ہے‘‘۔ بایں معنی کہ ہر شخص ترجمہ پڑھ کے قرآن سے مطلب نکال لے، یہ اس کی ہدایت کے لئے کافی ہے کوئی ضرورت نہیں کہ وہ تفاسیر کی طرف رجوع کرے اور اہل علم کی تشریح کا پابند ہوں۔ اس کے دلائل حسب ذیل دیئے گئے ہیں:

پہلی دلیل: قرن اول کے مسلمانوں نے قرآن پر عمل کر کے انتہائی ترقیاں حاصل کیں مگر اب مسلمان دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اس کے معنی اور مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھتے ہیں اور اس کی ذمہ داری علمائے مذہب پر ہے جنہوں نے عام لوگوں کو اپنے پھندے میں پھانسے رکھنے کے لئے عجیب وغریب معنی اور تفسیریں لکھنا شروع کیں، عجیب وغریب مسئلے گھڑتے ان مسئلوں کو قرآنی آیات سے مطابق کرنے کی کوشش میں قرآنی آیتوں کو وہ معنی پہنائے گئے جو کہ کسی صورت سے پیدا نہیں ہو سکتے تھے لہٰذا یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن کے معنی اور مطلب کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس طرح سے اس گروہ نے مسلمانوں کو قرآن مجید سے دور رکھا، حالانکہ اگر اس کے معنی عوام نہیں سمجھ سکتے تھے تو لوگ اسلام کیسے لائے تھے۔ یاد رہے کہ رسول ﷺ کی رحلت کے ڈیڑھ سو سال بعد تک اسلام میں کوئی فرقہ نہ تھا۔ ہر فرقہ اپنے اصولوں کی پیچ میں یا بادشاہت کی لاگ میں قرآن کے آیات کو اپنے مفید مطلب معنی پہنانے لگا اور کچھ دن بعد وہ اس کا ایمان ہو گیا۔

دوسری دلیل: کسی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایسی صاف اور آسان زبان میں ہو کہ پڑھنے والا لکھنے والے کے مطلب کو سمجھ سکے اگر نہ سمجھ سکے تو لکھنے والا قصوروار ہے نہ کہ پڑھنے والا لہٰذا کسی کتاب کا مشکل زبان میں ہونا اس کا عیب ہے نہ کہ خوبی قرآن بلیغ ہے اور بلیغ وہی کلام ہے جس سے کہنے والے کا مقصد سننے والے کے ذہن میں صحیح طور سے پہنچے۔

تیسری دلیل: ہم خود قرآن سے پوچھیں کہ وہ اس معاملہ میں کیا کہتا ہے؟

قرآن میں ہے کہ ہم قرآن کو ایسی کھلی اور صاف زبان میں بیان کرتے ہیں جس کو تم سمجھ سکو، اگر اس کو ایسی زبان میں نازل کیا جاتا جس کو تم نہ سمجھ سکتے تو کوئی ایمان نہ لاتا۔ عربی کے معنی خود صاف اور کھلی ہوئی زبان کے ہیں۔

۱۔ الٓرٰ قف کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ۝۱ (ھود۔۱)

وَلَقَدْ جِئْنٰھُمْ بِکِتٰبٍ فَصَّلْنٰہُ عَلٰی عِلْمٍ ھُدًی وَّرَحْمَۃً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝۵۲ (اعراف۔ ۵۲)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نے کتاب بھیجی ہے وہ حکیم بھی ہے واقف کار بھی اس نے ہر طرح سمجھ بوجھ کر کتاب کو تفصیل وار بیان کر دیا ہے۔

۱۔ حٰمٓ ۝۱ تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝۲ کِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝۳ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَکْثَرُھُمْ فَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ۝۴ (حٰم السجدہ۔۱ تا ۴)

۲۔ وَلَوْ جَعَلْنٰہُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِیًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ ءَاَعْجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ ط (حٰم السجدہ۔۴۴)

ان آیتوں سے دو باتیں بالکل صاف ہوگئیں ۔

(۱) قرآن عربی زبان میں اس قوم کے لئے جو عربی جانتی تھی یعنی جس کی مادری زبان عربی تھی، کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور ایسی زبان میں قرآن نہیں ہے جس کو عرب نہ سمجھ سکتے تھے اور

(۲) ایمان نہ لانے کی یہ وجہ نہیں تھی کہ لوگ سمجھتے نہ تھے بلکہ منہ پھیر کر چل دیتے تھے اور سنتے ہی نہ تھے یعنی صحیح طور سے متوجہ نہیں ہوتے تھے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ''ہم نے تو قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے تو ہے کوئی جو نصیحت حاصل کرے۔'' اس ایک آیت کو سورۂ القمر کے اندر چار مرتبہ دہرایا گیا ہے کیا اس سے زیادہ زوردار الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن آسان ہے۔

چوتھی دلیل: ہم خود قرآن کو پڑھیں اور دیکھیں کہ سمجھ میں آتا ہے یا نہیں؟

قرآن کے لفظی معنی لیکچر کے ہیں قرآن میں ۱۱۴ سورے ہیں ہر سورہ بجائے خود ایک لیکچر ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ان لیکچروں کے درمیان میں لوگوں نے سوالات کر دیئے ہیں۔ ان کا جواب دے کر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔

موضوع قرآن حسب ذیل ہیں:

(۱) خدا کی عبادت کرو (توحید)

(۲) ایک ایسے دن پر ایمان لاؤ جس دن اپنے کئے دھرے کا جواب دینا ہوگا (یعنی قیامت)

(۳) ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہئے اور لڑائی کے وقت کیسا برتاؤ کرنا چاہئے اور لڑائی کیسی لڑنی چاہئے (یعنی معاشرتی وجنگی احکامات وغیرہ)

(۴) ذیل کے اعتراضات اور ان کے جوابات ان میں کے دو اعتراض حضرت محمدؐ پر ہیں اور دو قرآن پر

(الف) رسولؐ خدا پر دو اعتراض:

(۱) چوں کہ حضرت محمدؐ ایسے انسان ہیں جیسے انسان ہوا کرتے ہیں لہٰذا حضرت محمدؐ رسول نہیں ہو سکتے۔

(۲) چوں کہ محمدؐ معجزہ نہیں دکھاتے ہیں لہٰذا رسول نہیں ہو سکتے۔

(ب) قرآن پر دو اعتراض:

(۱) قرآن نازل وازل کچھ نہیں ہوا، حضرت محمدؐ کی من گھڑت ہے۔

(۲) پہلے خدا کی بھیجی ہوئی کتابیں موجود ہیں لہٰذا اب ایک اور کتاب نازل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

(۵) پرانے رسولوں کے قصے:۔

ان لیکچروں کا مضمون بہت چھوٹا سا ہے ان مضمونوں کو ہر لیکچر میں دہرایا گیا ہے۔

کہیں لوگوں نے سوالات بھی کئے ہیں خاص معاملات بھی آپڑے ہیں سوالات کے جوابات اور معاملوں کے متعلق حکم بھی دے دیئے گئے ہیں۔ اوپر بیان کیے ہوئے موضوع قرآن کو مدنظر رکھ کر قرآن کو پڑھیے اور پھر دیکھئے کہ قرآن سمجھ میں آتا ہے یا نہیں قرآن میں ایک ہی بات کو بار بار دہرایا گیا ہے اس سے مقصد یہ ہے کہ کسی طرح سے تو بات لوگوں کے دماغوں میں سمائے۔ اگر ایک لفظوں میں بات سمجھ میں نہیں آئی تو اسے

دوسرے لفظوں میں بیان کیا گیا، اگر ایک طریقہ سے بات سمجھ میں نہیں آئی تو اسے دوسرے طریقہ سے بیان کیا گیا اگر اصول سمجھ میں نہ آیا تو مثال دی گئی ان اصولوں کو قصوں کی شکل میں بیان کیا گیا۔ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن جاہل سے جاہل اور عالم سے عالم دونوں کیلئے ہے۔

دوسرا اصول قرآن کو بلکہ ہر کتاب کو سمجھنے کا اس کے معنوں پر غور کرنا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا .(ق۔۳۷)

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ (محمّد۔ ۲۴)

تیسری بات: مترجم قرآن میں بریکٹ ( ) کے اندر جو لکھا جاتا ہے ترجمہ کرنے والا اپنی طرف سے بڑھاتا ہے قرآن میں ایسے کوئی لفظ نہیں ہوتے۔

چوتھی بات: اگر قرآن کے معنی قرآن ہی سے سمجھ میں آجائیں تو تفاسیر وغیرہ سب بیکار ہیں۔

پانچویں بات: آیتوں کے شان نزول کے جھگڑے بھی عام طور سے بیکار ہیں کیوں کہ ہر فرقہ نے شان نزول اپنے مطلب کے موافق گڑھ رکھی ہے آیت میں اصول بیان کیئے جاتے ہیں وہ اصول جب کبھی ایسا واقعہ ہوگا اس پر چسپاں ہوں گے۔ یہ بات بھی کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی کہ بے جوڑ آیتیں نازل ہوا کرتی تھیں۔ عام طور سے سورے نازل ہوتے تھے۔ یہ تھیں وہ اصولی باتیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن بالکل آسان چیز ہے اور اس کے لئے تفسیر کی ضرورت نہیں ہے مگر کیا یہ نتیجہ درست ہے؟ اس کے لئے ایک ایک کر کے مذکورہ پہلوؤں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

قرنِ اوّل کے مسلمانوں کا عمل بالقرآن

کیا یہ سچ ہے کہ قرنِ اوّل کے مسلمانوں نے قرآن پر عمل کر کے انتہائی ترقی حاصل کی؟

شخصیتوں سے مرعوب ہوئے بغیر دل کی لگتی کہیے قرآن کو سامنے رکھ کر بتایئے کہ قرآن میں کیا کہیں اس کا حکم ہے کہ تلوار لے کر آس پاس کے ممالک پر فوج کشی کرو، امن عالم کو غارت کرو اور لوگوں کو زبردستی اسلام لانے پر مجبور کرو۔ اگر یہ سب عمل بالقرآن ہو تو غیر مسلمین کا یہ اعتراض بالکل درست ہوگا کہ اسلام خونریزی کا حامی ہے اور وہ تلوار کے زور سے اپنی اشاعت کراتا ہے کیا اپنے کسی دعوے کی حمایت کے لئے اسلام کے دامن کو داغ دار بنادینا گوارا کیا جاسکتا ہے؟

کیا قیصر و کسریٰ کے نظام حکومت کا رواج تعلیم قرآن کے مطابق تھا؟

کیا سرمایہ داری اور سرمایہ پرستی کا رواج جس کے خلاف جناب ابوذر غفاریؓ احتجاج کرنے اٹھے تھے عمل بالقرآن کا نتیجہ تھا؟

کیا دمشق اور بغداد کی جہانداریاں صاف ستھرے اور سادے اسلام اور تعلیم قرآن کے موافق تھیں؟ کیا عیش و عشرت کی گرم بازاریاں اور توبہ شکن حلقوں میں ''مقدس'' درباروں کی آتش آشامیاں قرآن کی رو سے بالکل مناسب تھیں کیا جمل اور صفین کی میدان داریاں، خود مسلمانوں کے گلوں پر مسلمانوں کی شمشیر آزمائیاں اور آپس کی فتنہ سامانیاں تعلیم قرآن پر عمل کا مظاہرہ تھیں؟

حقیقتوں پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ الفاظ میں اتنی طاقت ہرگز نہیں کہ وہ انسانی حافظہ سے واقعات کی یاد فراموش کرسکیں۔

کیا کربلا کا تاریخی واقعہ کسی عبارت آرائی کے زور سے مٹ سکتا ہے؟ اور کیا جنگ حرہ اور مدینہ مکہ کی شرمناک داستانیں فنا ہو جائیں گی؟
ممکن ہے کہ ''خیر القرون'' کو سراہنے والے مسلمان آج ناواقف غیر مسلموں کے سامنے پرانے زمانہ کے مسلمانوں کو قرآن کا جامہ پہنا دیں اور ان کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھالیں مگر تاریخ کی دوربین سے اس زمانہ کے حالات کا مطالعہ کرنے والے ''گھر کے بھیدی'' مسلمان بھی کیا اس فریب خیال کا شکار بن سکیں گے؟

بڑے نیک طینت، بڑے پاک باطن
ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

گنتی کے آدمیوں کو چھوڑ کر جن کی بدولت خواہ اس زمانہ کو ''خیر القرون'' کہہ لیجئے اور خواہ جو مقدس نام چاہئے بنالیجئے جہاں تک عام حالات کا تعلق ہے، اتنی تاریکی نظر آرہی ہے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کا ''دور جہالت'' اس کے سامنے مات ہے صرف اس لئے کہ عام طور پر نہ مسلمانوں نے قرآن میں تدبر کیا نہ قرآن کے معانی کی تشریح میں حقیقی رہنماؤں کا دامن تھا ما نہ ان عملی مثالوں پر نظر ڈالی جنھوں نے اپنی سیرت کو قرآنی تعلیمات کی تصویر بنا رکھا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ قرآن کو اپنی ناقص سمجھ ذاتی خیالات اور نفسانی خواہشوں کا جولان گاہ بنا لیا۔ اسی کا نتیجہ تھی مسلمانوں کی وہ ابتری پراگندگی اور پریشانی جس کا خمیازہ آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔
اب آج بھی مسلمانوں کو اس پردہ میں کہ قرآن مشکل نہیں آسان ہے۔ اسی کی تلقین کی جائے تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی مگر یاد رکھیے کہ اس سے مسلمانوں کی حالت میں کوئی ترقی یا اصلاح نہیں ہوسکتی۔ بے شک اپنی من مانی باتوں کو از روئے قرآن جاہلوں کے ذہن نشین کرنے میں آسانی ہوگی۔ وہ ناواقف بارہے کا سید جو عربی کے سر پیر سے واقف نہیں یہ سن کر خوش ہو جاتا ہے کہ قرآن میں میرے وطن کا نام بڑی مہربانی سے ''برادر'' اس کی لفظ کے ساتھ موجود ہے۔ یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْ بَارَهَا''۔ اس بچارے کو کیا خبر کہ یہ ''اَخ''، برادر کے معنی میں نہیں اور وہ بَارَهَا شہر کا نام نہیں ہے بلکہ ''اخبار'' ایک لفظ ہے جو خبر کی جمع ہے اور وہ ''ھا'' کی طرف مضاف ہے جو مونث کی ضمیر ہے۔ مگر یہ باتیں اس کے سامنے کہی جائیں تو وہ سمجھے گا عالموں کی الٹی سیدھی تاویل ہے اور لہک لہک کر بار بار علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھے گا۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

اس کے نزدیک جمع اور مضاف اور مونث کی ضمیر کی بحثیں اتنی دشوار ہیں کہ ''پاژند'' معلوم ہوتی ہیں اسے تو آسانی اسی میں معلوم ہوگی کہ وہ کہے ''اخ بارھا'' یعنی بارہا جو سادات کی بستی ہے اسے اللہ سبحانہ نے اپنے بھائی کے خطاب سے نوازا ہے۔
یا قرآن میں انگریزی زبان کی لفظ تلاش کرنے والا خوش ہو جائے یہ آیت سن کر:
وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ
وہ اسے یوں سمجھتا ہے کہ ولم یکن لہ کفواً احد سمجھتا ہے کہ ون انگریزی کی لفظ ہے۔
اب اگر کسی بچارے عالم کی شامت آئی اور اس نے کہا یہ ون انگریزی کی لفظ نہیں ہے یہ تو کفو کی لفظ کی جزء ہے اور تنوین سے نون کا تلفظ پیدا ہوا ہے جو اعرابی حرکت ہے کوئی مستقل لفظ نہیں ہے تو وہ فوراً کہے گا۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

اس کے نزدیک یہ عالمانہ تشریح تاویل اور پاژند ہے اور سیدھی سادی بات جو قرآن سے نکلتی ہے وہ وہی کہ ون بمعنی واحد انگریزی ہے اور اس کی تفسیر ہے لفظ ''احد'' اور اس طرح اس کے نزدیک ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن خود اپنا مفسر ہے اور پھر وہ کہتا ہے کہ اگر قرآن کے معنی قرآن ہی سے سمجھ میں آجائیں تو تفاسیر وغیرہ سب بے کار ہیں۔

بتایئے اس ''بوالھوسی'' کا کیا علاج کیا جائے اور اب شیوہ اہل نظر کی آبرو کہاں رہ سکتی ہے۔

یہ بھی دیکھ لیجئے کہ قرآن کے عجیب وغریب معنی اور تفسیریں جو لکھی گئیں عجیب وغریب مسئلے جو گڑھے گئے، قرآنی آیتوں کو وہ معنی پہنائے گئے جو کسی صورت سے پیدا نہیں ہو سکتے تھے یہ سب اسی دور کی پیداوار ہیں جسے ''قرن اول'' کہا جاتا ہے اور جس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے قرآن پر عمل کر کے انتہائی ترقیاں حاصل کیں۔ بعد کے مسلمان تو سب زلہ خوار ہیں انھی اگلے زمانہ کے مفسروں کے اور انھی کی تفسیروں میں سے کسی ایک کو لے کر اس پر اپنے استدلال کی عمارت کھڑی کرتے ہیں مگر وہ مفسرین جن کی تفسیروں نے عجیب وغریب معانی کی بنیاد رکھی اور عجیب وغریب مسائل کی داغ بیل ڈالی وہ وہی صدر اسلام کے مفسرین ہیں جیسے مجاہد ضحاک سدی کلبی، مقاتل وغیرہ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے اقوال سے کتب تفاسیر بھرے پڑے ہیں۔

پھر یقین جانیے کہ عجیب وغریب معانی کی ایجاد اور تاویلوں کی تراش وخراش سب اسی اصول کے ماتحت تھی کہ قرآن آسان ہے اور ہر شخص اپنی سمجھ سے اس کے معنی بتا سکتا ہے یہی وہ خیال تھا جو جمہور اسلام میں عام طور پر پھیلا یا گیا اور اس کے ماتحت قرآن کے آیات بازیچہ اطفال بنا لئے گئے۔ اس کے برخلاف اہلبیتؑ رسولؐ کا یہ اعلان تھا کہ قرآن کے معنی ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے لئے بڑے معلومات کی ضرورت ہے ان کا اعلان یہ تھا کہ قرآن فہمی آسان نہیں بہت مشکل ہے اور اس کے لئے خاص رہنما یان دین کے ساتھ جن کو رسولؐ کی تشریحات براہ راست پہنچے ہیں تمسک کی ضرورت ہے۔

جمہور اسلام نے ائمہ اہلبیتؑ کی اس تعلیم کو نہ پہلے کبھی مانا اور نہ بعد میں۔ اب تسلیم کرتے ہیں۔ پھر اس ترقی وتنزیل کو جو جمہور مسلمین کے ساتھ متعلق ہے اس عقیدہ سے کس طرح وابستہ کیا جا سکتا ہے؟ مسلمانوں نے کسی وقت انتہائی ترقی کی اور اب مسلمان دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل ہو گئے یہ ممکن ہے بجائے خود حقیقت ہو مگر اس کا قرآن فہمی کے کسی نظریے سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہے۔

اس کا سبب اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہ کہ مسلمان شروع شروع اس سادہ اور مساویانہ نظام زندگی پر بر بنائے عادت چلتے رہے جس کو پیغمبر اسلام نے رائج کیا تھا اور فطرت کے اس پیغام کو لے کر آگے بڑھے جو دلوں پر قبضہ کرنے کی طاقت رکھتا تھا، اس لئے وہ فتوحات حاصل ہوئے جنہیں آج ان کی بہت بڑی ترقی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن یہی ترقی تنزلی کا پیش خیمہ بن گئی اس لئے کہ ان میں ملوکیت کا دور دورہ ہو گیا اور سلطنت وکامرانی نے عیش وعشرت کا عمل دخل کر دیا۔ کچھ دن تک دلوں پر بیٹھی ہوئی دھاک نے قوموں کا سر اٹھنے نہ دیا لیکن جب ان کی عملی کمزوریاں طشت از بام ہوئیں اور ان کے راز ہائے درون خلوت، افسانہ ہر انجمن بن گئے تو سرگرم عمل قوموں کی جرات بڑھی۔ ان کی آپس کی رقابتوں اور داخلی کمزوریوں نے دشمن کی امداد کی اور آخر وہ ہوا جس کی بناء پر آج کہا جا رہا ہے کہ مسلمان سب سے زیادہ ذلیل ہیں۔ اگر ان کی ترقی

قرآن کے سچے اصول کو سمجھ کر انہی حدود و قواعد کے اندر ہوتی جو قرآن کے تعلیم کردہ ہیں تو وہ کبھی تنزیل سے تبدیل نہ ہوتی۔

وہ جماعت جو اقلیت میں تھی جس کے سرگروہ اہلبیتؑ معصومین تھے، انہوں نے قرآن کے بارے میں مطلق العنانی اور غیر مشروط آزاد روی کی اجازت نہیں دی بلکہ اس کے لئے حدود و قواعد مقرر کیئے اور ان کے تحت میں تدبر فی القرآن سے کام لیا ان کے مختصر گروہ نے ہزاروں مادی شکنجوں کے اندر گرفتار رہ کر بڑے روحانی فتوحات کئے اور دنیا میں کوئی جماعت ایسی نہیں بتلائی جا سکتی جس نے اتنے مشکلات اور مصائب کے باجود اس طرح اپنی ہستی کو برقرار رکھا ہو اور اپنے دائرہ میں توسیع جاری رکھی ہو، یہاں تک کہ اس وقت دنیا کے ہر گوشہ میں کچھ نہ کچھ افراد اس اصول مسلک اور طریقہ کے پابند موجود ہیں۔

اسے چاہئے کوئی ترقی سمجھے یا تنزیل، بہر حال وہ ایک محدود اور معتدل سطح پر ہمیشہ رہے۔ نہ دوڑ کر زیادہ چلے اور نہ گرے مگر رہے یہ ہمیشہ اسی راستے پر کہ قرآن فہمی کوئی آسان بات نہیں، مشکل ہے اور اس لئے انہوں نے تنہا قرآن کو اپنی رہنمائی کے لئے کافی بھی نہیں سمجھا بلکہ اہلبیتؑ کے دامن سے تمسک ضروری خیال کیا۔ اب اگر ان میں روحانی حیثیت سے کچھ تنزل نظر آ رہا ہو تو اس کا سبب یہ سمجھنا چاہئے کہ ان میں بھی اب ایسے لوگ پیدا ہونے لگے ہیں جو ''ہمرنگ جماعت'' بن کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ قرآن کا سمجھنا آسان ہے اور ہر شخص بذات خود اس سے نتیجہ نکال سکتا ہے اور اس کے لئے کسی غیر کی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے دوستوں یہ خیال ہماری قومی زندگی کے لئے راس نہیں ہے۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ رسولؐ کی رحلت کے ڈیڑھ سو سال بعد تک اسلام میں کوئی فرقہ نہ تھا۔

غالباً اس ادّعاء کے موقع پر پیش نظر ایران یا پنجاب اور حیدر آباد کے بابی، بہائی قادیانی، چکڑالوی اور مہدوی فرقے یا اپنے ہندوستان کے بریلوی اور دیوبندی فرقے ہیں جو انہی آخری دنوں کی پیداوار ہیں ورنہ جہاں تک اسلام کے ان فرقوں پر نظر ڈالی جاتی ہے جن کے عقائد کتابوں میں مدون ہیں اور جن کے اختلافی مسائل پر بحث سے علم کلام کی تشکیل ہوئی ہے وہ تمام فرقے رسولؐ کی رحلت کے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر صدر اسلام کے واقعات پر نظر ڈالئے تو ان سے بھی معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں بھی قرآن کی مختلف تاویلیں کی جاتی تھی اور اس کے معانی میں اکثر دشواری محسوس کی جاتی تھی پھر بتائے کہ کون سا وہ دور ہو سکتا ہے جب قرآن کے معانی و مطالب بالکل متفقہ حیثیت رکھے تھے اور ان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

بے شک قرآن کے مشکل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ بالکل ''چیستان'' ہے یعنی اس سے کوئی کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔

یقیناً اہل زبان اس کے ظاہری معانی سے بہرہ اندوز ہوئے اور اسی کا اثر تھا کہ مشرکین دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور انہوں نے اس کے غیر معمولی اعجاز کا اندازہ کیا مگر غیر عربی داں طبقہ کے لئے یہ بات بھی مفقود ہے ان کے لئے قرآن کو آسان کہہ دینے کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔

(۲) بلاغت کا مفہوم

کسی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایسی صاف اور سادہ زبان میں ہو کہ پڑھنے والا لکھنے والے کے مطلب کو سمجھ سکے۔ سوال یہ ہے کہ پڑھنے والا کون؟ ہر پڑھنے والا خواہ وہ زبان داں ہو یا غیر زبان داں سمجھدار یا ناسمجھ؟ حاضر الذّہن ہو یا پریشان دماغ؟ اگر بلاغت کا معیار یہ ہے اور کسی کتاب کی خوبی یہی ہے تو عالم امکان میں کوئی کتاب بلکہ کسی متکلم کا ایک جملہ بھی اس معیار پر ٹھیک نہیں اترتا۔

جب تک دنیا میں زبانیں مختلف ہیں جب تک کہ دل و دماغ کی طاقتیں جداگانہ ہیں جب تک سننے والوں کی کیفیتوں میں اختلاف ہے

اس وقت تک تو یہ ناممکن ہے کہ کسی کلام سے ہر پڑھنے والا پورا فائدہ اٹھا سکے اس لئے کم ازکم آپ کو یہ قید تو لگانا ہی پڑے گی کہ جس زبان میں وہ کلام ہے اس زبان کے واقف کار اس کلام کو سمجھ سکیں اور اس قید کے لگانے کی وجہ سے ہی قرآن کی اس آسانی سے اردو داں طبقہ کی محرومی ظاہر ہے۔

خود ایک زبان میں مختلف مقامات کے محاوروں میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ ایک کلام سب کے لئے مساوی نہیں ہوسکتا۔ مختلف شہروں کی زبان جدا، شہر اور دیہات کی زبان بالکل الگ الگ بلند اور سفید پوش طبقہ اور بازاری لوگوں کی زبان علیحدہ اور مردوں، عورتوں کی زبان مختلف ہوتی ہے اس لئے زبان کے اکثر فقرے ایسے ہوں گے جو کسی کے لحاظ سے آسان اور کسی کے لحاظ سے مشکل ہوں نتیجہ صاف ہے کہ سب کے لئے ان کی آسانی قائم نہیں رہ سکتی۔ اب میں نہیں سمجھ سکتا کہ بلاغت کے مذکورہ معیار پر کون سا وہ کلام ہوگا جو بلیغ کہا جا سکے؟

کہا جا سکتا ہے کہ بلیغ کلام وہ ہے جو مخصوص مخاطبین کے لحاظ سے جن کو براہ راست متوجہ کر کے وہ کلام کیا جا رہا ہے دشوار گزار نہ ہو مگر اس صورت میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہر شخص کے لئے آسان ہی ہوگا اور کسی کو اس کے سمجھنے کے لئے شرح اور تفسیر کی ضرورت نہ ہوگی۔

پھر قرآن کی اگر وہ حیثیت ہے جیسا کہ معترض نے کہا ہے کہ وہ لیکچروں کا مجموعہ اور ان لیکچروں کے ضمن میں جو خاص سوالات ہوئے ہیں ان کا جواب بھی ہے تو بالکل ظاہر ہے کہ لیکچر کے ماحول، حاضر الوقت اشخاص کے معیار فہم اور سائلین کی ذہنیت کا لحاظ ضروری ہے یہی بلاغت کا حقیقی تقاضا ہے اس سے عمومی آسانی کا نتیجہ کہیں برآمد ہوسکتا ہے۔

اس پر بھی غور کر لیجئے کہ زبان میں زمانہ کے امتداد سے کتنے انقلابات ہو جاتے ہیں قرآن کی تنزیل کو ساڑھے تیرہ سو برس ہوئے ہیں غیر ممکن ہے کہ اس مدت میں تمام محاورات اپنی اصلی حالت پر باقی رہیں نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے خالص عرب اہل زبان بھی قرآن کے معانی کی صرف اپنی زبان دانی کے بھروسے پر نہیں سمجھ سکتے بلکہ انہیں بھی قدیم محاورات عرب کے تتبع قدیم ذخیرہ ادب پر عبور اور آیات و احادیث کے مختلف استعمالات میں غور و خوض کی ضرورت ہے اور اس لحاظ سے قرآن کے لئے بھی بالکل آسان نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جہاں تک فصاحت اور سلاست کا تعلق ہے وہ الفاظ کے لغوی معنی اور کلام کے عرفی مفاہیم ہو سکتے ہیں لیکن جو کسی خاص شعبہ کے اصلاحات ہوتے ہیں وہ بہر حال اس شعبہ کے ماہرین کی تشریح پر موقوف ہوں گے۔ قرآن ایک خاص شریعت کا ترجمان بن کر آیا تھا، اس لئے اس میں اس قسم کے الفاظ اور معنی کی کمی نہیں ہے۔ صلوۃ، زکوۃ، حج، صیام، خمس، انفال، جہاد، وغیرہ سب اصطلاحی لفظ ہیں ان کی تشریح ہرگز صرف زبان دانی کی بناء پر نہیں ہوسکتی اس کے لئے ماہرین شریعت کی تفسیر کی ضرورت ہوگی۔

اس صورت میں کیوں کر کہا جا سکے گا کہ قرآن بالکل آسان ہے اور ہر شخص اسے سمجھ سکتا ہے۔

پھر اب غور کیجئے کہ کلام کا مشکل ہونا جو بلاغت کے خلاف ہے اور جس کے لحاظ سے کلام آسان ہونا چاہئے وہ کیا ہے؟

اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کلام میں عام اصول محاورہ کے خلاف کوئی ایسا الجھاؤ ہو جس کی وجہ سے محاورہ سے واقف اہل زبان اس کے معنی کو نہ سمجھ سکیں خواہ وہ الجھاؤ ترکیب نحوی کے لحاظ سے ہو۔ اس کو اصطلاحاً تعقید لفظی کہتے ہیں یا بعید از ذہن استعارات و کنایات کے استعمال سے ہو اس کو تعقید معنوی کہتے ہیں یا الفاظ ایسے صرف کئے گئے ہوں جن کے اس مفہوم کے لئے جو متکلم نے مراد لیا ہے عام طور پر فصحائے اہل زبان کچھ دوسرے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ان الفاظ سے وہ واقف نہیں ہیں اس کو "غرابت" کہتے ہیں۔

لیکن اگر کلام بجائے خود اصول محاورہ کے مطابق ہے اور انہیں الفاظ پر مشتمل ہے جو اس کے دور ور دو میں فصحاء کی زبانوں پر چڑھے

ہوئے تھے مگر اب ہمارے لئے مشکل ہے اس وجہ سے کہ ہم اس زبان سے اس دور کی زبان کے خصوصیات سے ناواقف ہو گئے ہیں تو اس طرح مشکل ہونا ہرگز کلام کا عیب نہ ہوگا بلکہ ہمارا نقص ہوگا کہ ہم اس کے سمجھنے کے لائق نہیں ہیں۔

اس کے بعد یہ دیکھئے کہ ایک ہوتے ہیں کلام کے لفظی معنی یہ تو ایک کلام ہے جو کہ سلیس زبان میں ہے ہر زبان داں جو ان محاورات سے واقف ہو سمجھ لے گا اور اگر نہ سمجھے تو خیر مان لیجئے کہ کلام کا نقص ہے لیکن ایک ہوتے ہیں وہ مطالب جو لفظی معانی کی تہوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ جتنا غور کیا جائے اتنے نتائج اور حقائق کلام سے زیادہ منکشف ہوتے جائیں۔ یہ وہ چیز ہے جو متکلم کی بلندی اور قابلیت کے لحاظ سے گہری ہوتی چلی جاتی ہیں اور کلام کے اس حیثیت سے سمجھنے کے لحاظ سے انسانی جماعت کا مجمع اتنا ہی چھٹتا جاتا ہے جتنا بلند متکلم کا وہ کلام ہے۔

اب اگر یہ صحیح ہے کہ قرآن ایک غیر معمولی درجہ کا کلام ہے تو ضرور اس میں یہ بلندی موجود ہوگی اور یقیناً انسانی دماغ کی ایک بلند سطح ہی وہ ہوگی جو اس کے معانی و نکات کا اچھی طرح ادراک کر سکے۔

اگر اس میں یہ بات نہیں ہے اور وہ بالکل ہی سطحی باتوں پر مشتمل ہے جن کو ہر معمولی انسان پوری طرح سمجھ لیتا ہے اور اس کے آگے اس میں کچھ تو یہ آسانی ''یقیناً'' اس کا نقص ہے۔

(۳) قرآن سے ثبوت

اب خود قرآن سے پوچھئے کہ وہ کیا کہتا ہے؟

اپنے کو آسان بتاتا ہے یا مشکل؟ اس کے لئے ذیل کے آیات ملاحظہ ہوں:

(۱) متعدد آیات میں رسولؐ کے فرائض میں تلاوت آیات کے ساتھ تعلیم کتاب کو قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (سورۃ بقرہ۔۱۲۹)

يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (سورۃ بقرہ۔۱۵۱)

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (سورۃ آل عمران۔۱۶۴ و۔ سورۃ جمعۃ ۲)

اس سے ظاہر ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام تھا آیات کتاب کو پڑھ کر سنانا (یہ کام الفاظ سے متعلق ہے) اور اس کتاب کی تعلیم دینا (یہ معانی سے متعلق ہے)

اگر قرآن آسان ہوتا اس طرح کہ ہر شخص اس سے خود ہی سب کچھ سمجھ لیتا تو تعلیم کی ضرورت نہ تھی۔

(۲) هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (آل عمران۔۷)

''اس نے آپؐ پر کتاب اتاری ہے جس میں کچھ تو کھلی ہوئی آیتیں ہیں جو ''ام الکتاب'' ہیں اور کچھ ''متشابہ'' ہیں۔ فتنہ پردازی اور تاویل سازی کے لئے، حالانکہ نہیں جانتا اس کی تاویل کو مگر خدا اور ''راسخین فی العلم'' کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں سب ہمارے پروردگار کی جانب سے ہے اور نہیں اس سے اثر لیتے مگر وہ لوگ جو سمجھدار ہوں۔''

اب آپ دیکھیے کہ قرآن خود بتلا رہا ہے کہ اس میں دو قسم کی آیتیں ہیں کچھ آسان اور کچھ مشکل اور یہ کہ مشکل آیتوں کی اصلی تاویل کو سب نہیں جانتے بلکہ اس کے جاننے والے مخصوص ہیں میں نے ترجمہ میں ''ام الکتاب'' اور ''متشابہ'' کی اصلی لفظوں کو اس لئے لکھ دیا کہ قرآن کو آسان کہنے والے خود ہی ان کے معنی سمجھ لیں تفسیر کی کیا ضرورت؟

اور دوسرے اشخاص کے لئے اس کے واسطے مستقل تبصرہ آئے گا جس میں اس کی مکمل تشریح کی جائے گی۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ.

یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے بابرکت تاکہ یہ لوگ اس کے آیات میں غور کریں اور تاکہ صاحبان عقل اس سے اثر قبول کریں جو شئے بالکل کھلی ہوئی اور آسان ہو اس کے لئے غور کی ضرورت نہیں ہوتی نیز صاحبان عقل وفہم سے مخصوص کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بالکل سطحی مطالب پر مشتمل نہیں ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا.

تو وہ کیا قرآن میں غور نہیں کرتے؟ کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں

اس آیت میں لوگوں سے شکوہ کیا گیا ہے کہ اگر قرآن بالکل سطحی ہوتا تو غور وخوض کی ضرورت نہ ہوتی

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ.

اس میں یاددہانی ہے اس کے لئے جو دل ودماغ رکھتا ہو یا کان لگائے اس حالت میں کہ حاضر الذہن ہو

جو چیز بالکل سطحی اور آسان ہوتی ہے اس کے لئے ان شروط کی ضرورت نہیں ہے ہر شخص خود ہی آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔

اب جو آیتیں بتلائیں۔کہ قرآن آسان ہے ان کے معنی وہی سمجھنا چاہئیں جو ہم نے ''بلاغت'' کی بحث میں اس سے پہلے لکھے ہیں یعنی اس کلام میں عام اصول محاورہ کے خلاف کوئی ایسا الجھاؤ نہیں ہے جس کی وجہ سے اصول محاورہ سے واقف اہل زبان اس کا مطلب نہ سمجھ سکیں اور یہ کہ اس کی زبان آسان ہے نہ یہ کہ اس کے مطالب سطحی ہیں جن کو ہر شخص بغیر کسی غور وتامل یا تعلیم کے سمجھ سکتا ہے۔

اب ان آیات پر نگاہ بھی ڈال لیجئے۔

کچھ وہ آیتیں ہیں جن میں قرآن کے (مفصل) ہونے کا ذکر کیا گیا ہے مگر اس کی تفصیل میں خود قید موجود ہے (لقوم یعلمون)

ملاحظہ ہو آیت ۱ تا ۳ حم السجدہ

حٰمٓ ۝۱ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۳

دوسری آیت وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۱۱ (سورہ توبہ۔۱۱)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کا مفصل ہونا ہر شخص اور ہر جماعت کے لحاظ سے نہیں ہے پھر ان آیات سے یہ نتیجہ کیوں کر نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن ہر شخص کے لئے آسان ہے اور اہل علم کی تشریح وتفسیر کی ضرورت نہیں ہے۔

کچھ وہ آیات ہیں جن میں قرآن کی زبانوں کو ''مبین'' کی لفظ سے یاد کیا ہے مگر ان سے جو نتیجہ نکلتا ہے، وہ خود قرآن کو آسان کہنے والے کی زبان سے سن لیجئے:

قرآن عربی زبان میں اس قوم کے لئے جو عربی جانتی تھی یعنی جس کی مادری زبان عربی تھی کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور ایسی زبان میں قرآن نہیں جس کو عرب نہ سمجھ سکتے تھے۔

اب بتائیے کہ اس آسانی سے غیر عربی داں طبقہ کو بلکہ ان کو جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے وہ بہر حال زبان کی تشریح و تفصیل کے محتاج ہوں گے اور تفسیر کی ضرورت باقی رہے گی۔

یاد رکھنا چاہئے کہ جو ایک زبان میں زیادہ آسان ہوگا، وہی دوسری زبان میں زیادہ مشکل ثابت ہوگا۔

بات یہ ہے کہ زبان کی آسانی روز مرہ کے محاورات کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے اور محاورے ہی وہ ہوتے ہیں جن کا ترجمہ بعض اوقات مشکل اور بسا اوقات غیر ممکن ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر اپنی زبان میں مشکل عبارت ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میں استعارے کنائے صرف ہوئے ہیں یا دقیق مطالب ہیں اور یہ دونوں چیزیں وہ ہیں جو دوسری زبان میں منتقل ہو سکتی ہیں۔

پھر اگر قرآن کو عربی زبان والوں کے لئے آسان کہا بھی گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکل سکتا ہے کہ وہ سب کے لئے آسان ہے اور مطلب تو یہی تھا کہ ہمارے اردو دان طبقہ کو آسانی پیدا ہوا ور انہیں علماء سے دریافت کرنے اور تفسیر و تشریح کی جستجو کی ضرورت نہ ہو مگر یہ مطلب قرآن کی آیتوں سے کسی طرح نہیں نکلتا۔

(۴) قرآن کا مطالعہ

ہم خود قرآن کو پڑھیں اور دیکھیں کہ سمجھ میں آتا ہے یا نہیں۔ مجھے نہیں معلوم قرآن کو پڑھ کر دیکھنے کا کیا مطلب ہے؟ اصل الفاظ قرآن کو دیکھ کر؟ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں سمجھنا عربی دانی پر موقوف ہے اور غیر عربی دان ہرگز نہیں سمجھیں گے۔

یا یہ مطلب ہے کہ ترجمہ کو پڑھ کر؟ بظاہر مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس کے ثبوت میں بہت سا وقت قرآن کی آیتوں کے ترجمے پیش کرنے پر صرف کیا گیا ہے۔ مگر یاد رکھیئے کہ یہ ترجمے سب عربی دان لوگوں کے کئے ہوئے ہیں اگر یہ سمجھ میں آجاتے ہیں تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ یہ ترجمے آسان ہیں لیکن یہ نہیں ثابت ہوگا کہ قرآن بالکل آسان ہے۔

آسان ہونے کے ثبوت میں اپنی سمجھ کا مظاہرہ اس طرح کرنا کہ قرآن کے معنی لیکچر کے ہیں (حالانکہ یہی غلط ہے قرآن کے لفظی معنی ''لیکچر'' کے نہیں بلکہ ''ریڈنگ'' کے ہیں) اور ان لیکچروں کا موضوع یہ ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، قیامت پر ایمان لاؤ وغیرہ یہ سب باتیں بالکل آسان ہیں لہٰذا قرآن آسان ہے۔ میرے خیال میں اگر آسان ہونے کا یہی معیار ہے کہ اس طرح کا ایک خلاصہ آدمی سمجھ لے تو دنیا کی کوئی کتاب مشکل نہیں ہے۔

بڑی سے بڑی فلسفہ کی دقیق کتاب آسان ثابت کی جا سکتی ہے یہ کہہ کر کہ اس کا موضوع یہ ہے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے اور کن باتوں کے کیا اسباب ہیں اور منطق کی کتاب اس کا موضوع یہ ہے کہ کن طریقوں سے نا معلوم باتیں معلوم کی جائیں۔ وغیرہ وغیرہ مگر کوئی کتاب جو مشکل ہوتی ہے وہ ان جزئیات اور خصوصی مطالب کے لحاظ سے جو اس عام موضوع کے تحت میں بیان کے گئے ہیں۔۔ اس لئے قرآن کو بھی اس مجمل خلاصہ کے اعتبار سے نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ اس کے تفصیلی مضامین کے لحاظ سے تب آسان اور مشکل ہونے کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔

قرآن کی آسانی کے ثبوت میں بہت سی آیتوں کے تراجم پیش کیئے گئے ہیں مگر یاد رکھیے کہ تراجم سب تفسیر کے ماتحت ہیں یعنی جس قسم کی

تفسیر کو مترجم نے قبول کیا ہے اس کے مطابق آیت کا ترجمہ کیا ہے ان تراجم سے مدد لینا حقیقتاً تفاسیر کا پابند بننا ہے پھر تفسیر سے بے نیازی کا دعویٰ کیوں کر قابل قبول ہوسکتا ہے۔

ترجمے صرف تحت اللفظی معنی پر مشتمل نہیں ہوا کرتے ورنہ بعض اوقات شاید ان سے کچھ بھی مطلب سمجھ میں نہ آئے بلکہ بریکٹ میں توضیحی الفاظ محذوفات کی خانہ پری کے لئے ضمیے درج کیے جاتے ہیں ان کا اقرار خود سابقہ دلائل کے ذیل میں موجود ہے کہ: ''مترجم قرآن میں بریکٹ ( ) کے اندر جو لکھا جاتا ہے وہ ترجمہ کرنے والا اپنی طرف سے بڑھاتا ہے قرآن میں ایسے کوئی لفظ نہیں ہوتے۔''

اس طرح کے ترجموں کو حقیقتاً ایک مختصر تفسیر سمجھنا چاہئے پھر ان ترجموں کی مدد سے اگر قرآن آسان ہو گیا تو اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکلے گا کہ وہ بغیر تفسیر کی مدد کے خود آسان ہے۔

بے شک اگر قرآن کے معنی قرآن ہی سے سمجھ میں آ جائیں تو تفاسیر وغیرہ سب بیکار ہیں مگر یہ اس وقت ہے جب کوئی شخص تنہا الفاظ قرآن سے معنی سمجھ لے لیکن اگر اس نے مترجمین کی تفسیروں سے مدد لے کر معنی سمجھے تو تفاسیر بیکار کہاں ثابت ہوئے؟

شان نزول کو بیکار سمجھنا یہ کہہ کر کہ ''عام طور سے جو اصول بیان کے جاتے ہیں وہ اصول شان نزول کے پابند نہیں ہوتے بالکل غلط ہے اکثر آیتیں بنیادی حیثیت سے شان نزول ہی سے مخصوص ہیں مثلاً قرآن میں کہا گیا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ۔۔۔ الخ (المائدہ ۔ ۳)

''آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کیا''۔ اب جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو کہ آیت کس دن اتری؟ ''آج سے کیا مطلب سمجھا جائے؟

یا یہ آیت کہ: اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ (المائدہ ۔ ۵۵)

اگر خصوصیت واقعہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ عام اصول کہاں ہے کہ جو حالت رکوع میں زکوۃ دے۔ اس کے واسطے ولایت ضرور ثابت ہو یا یہ آیت کہ۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۔ (بقرہ ۔ ۱۸۷) آخر کس اصول کی حامل ہے؟

یہ کہنا کہ ''عام طور پر سورے نازل ہوتے تھے، متفرق آیتیں نہیں اترتی تھیں، حقیقت کے بالکل خلاف ہے چھوٹے سورے تو خیر اکثر ایک ساتھ اترے ہونگے مگر جو بڑے سورے ہیں ان میں خود آیت کا مضمون صاف بتلاتا ہے کہ وہ مختلف موقعوں پر اتری ہوئی ہیں اگر سورے ایک ساتھ نازل شدہ ہوتے تو آیتوں میں ناسخ اور منسوخ آیت ایک ہی سورہ میں موجود نہ ملتی خصوصاً اس طرح کہ ناسخ پہلے اور منسوخ بعد کو نیز مکی اور مدنی آیتیں مخلوط نہ ہوتیں حالانکہ موجودہ ترتیب قرآن میں یہ سب کچھ باتیں ہیں۔

اس کا ذکر ہمارے رسالہ ''تحریف قرآن کی حقیقت'' میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

اب مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں ہر شخص فیصلہ کرسکتا ہے کہ قرآن مشکل ہے یا آسان۔

نواں تبصرہ

تفسیر واصول تفسیر

تفسیر بالرائے کے معنی تنزیل وتاویل میں فرق

محکم ومتشابہ میں امتیاز اور تفسیر قرآن کے شرائط

گزشتہ تبصرہ میں فہم قرآن کے بارے میں جوافراط وتفریط کی کارفرمائیاں ہیں، ان کا تذکرہ ہو چکا جن سے ایک طرف ہمارے یہاں اخباری حضرات پیدا ہوئے اور دوسری طرف اہلسنت میں ''اہل قرآن'' یا پرویزی جماعت کا وجود ہوا۔

یہ تو منظم جماعتیں ہیں جنہوں نے ایک طرف مستقل فرقوں کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ان کے علاوہ غیر ذمہ دارانہ طور پر انفرادی خود رائیوں کے کرشمے ہیں جن میں ایک طرف موجودہ زمانہ کا (بخیال خود) ''روشن خیال'' گروہ ہے جو اپنی آزادروی کے لئے قرآن مجید کے اجمال سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ نعرہ بلند کرتا ہے کہ قرآن سے ثبوت ہونا چاہئے اور جب قرآن مجید میں اس کا ذکر نہیں ہے تو ہم سے اس کی پابندی کا مطالبہ کس لئے؟

کچھ خودرَو قسم کے محققین ہیں جو قرآن فہمی کے مبادی کو طے کیئے بغیر فہم قرآن کے مدعی ہو کر اپنے طبع زاد خیالات کو قرآن کے سرمنڈھتے ہیں۔

بعض واعظین نکتہ آفرینی کے ذوق میں یا مجمع سے داد حاصل کرنے کے لئے یا نادانی کے باوجود ہمہ دانی کے مظاہرہ میں آیات قرآن کے لئے ایسے طبعزاد معانی کا اختراع کرتے ہیں جو الفاظ کتاب الٰہی سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔

مذکورۂ بالا بے راہ رویوں کے دیکھنے کے بعد جب ہم ہادیانِ دین کے ارشادات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کا مضمون ہمیں بظاہر مختلف نظر آتا ہے۔

ایک طرف تو قرآن مجید سے استفادہ کی دعوت دی گئی ہے احکام شرعیہ میں بطور استدلال آیات قرآن کو اس پیرائے میں پیش کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آیات اس حکم کے سمجھنے کے لئے کافی ہیں اور اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن مجید کے معانی کا سمجھنا عام اہل علم وفضل کے لئے ناممکن شے نہیں ہے۔

دوسری طرف یہ ارشاد ہوا ہے کہ اِنّما یعرف القران مَنْ خوطب بہ ِ قرآن کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اسکے حقیقی مخاطب ہیں''۔

اس کے ساتھ تفسیر بالرّائے کو گناہ عظیم بتلاتے ہوئے ارشادکیا:

مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَاْ یِہٖ فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ.

جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی وہ اپنا ٹھکانا آتش جہنم میں بنالے۔

یہ بھی ارشادکیا کہ:

مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَاْ یِہٖ فَاِنْ اَصَابَ فَقَدْ اَخْطَاءَ.

جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی اس نے اگر ٹھیک بھی کہا تو بھی غلطی کی۔

مطلب یہ ہے کہ جو معنی اس نے اپنی رائے سے بتائے ہیں، چاہے اتفاق سے وہ صحیح بھی ہوں لیکن یہ کام بہرحال غلط ہے جو اس نے کیا۔اس طرح قرآن مجید میں عقل آرائیوں کا سدباب کردیا۔ضرورت ہے کہ ایک طرف مذکورہ سابق حدافراط یا تفریط تک نکل جانے والے خیالات کی تعدیل کی جائے یعنی اس نقطۂ اعتدال کا پتہ لگایا جائے جہاں تک تفسیر قرآن کے سلسلہ میں جانا درست ہے اور جس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں اور دوسری طرف ان احادیث واخبار میں مطابقت پیدا کر کے ان کو ایک نقطہ پر جمع کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ ان کا مجموعی طور پر مفاد کیا ہے؟

اس کے لئے حسب ذیل تمہید پر غور سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے الفاظ سے استفادہ معانی جو الفاظ و معانی کے مخصوص ارتباط کا نتیجہ ہے غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعدد مرتبے اور مختلف درجے ہیں۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ لفظ جو کسی معنی کے لئے وضع ہوئی ہے جب گوش گزار ہو تو فوراً ذہن اس معنی کی طرف منتقل ہو جائے اور وہ معنی دماغ میں گردش کرنے لگیں اس کے لئے یہ ضرورت یہ نہیں یہ کہ متکلم نے وہی معنی مراد بھی لئے ہوں، بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس لفظ کا اظہار کرنے والا کوئی بافہم و شعور متکلم ہو، بلکہ دروازہ کے کھولنے بند کرنے میں اس کے چوکھٹ بازو اور چولوں سے اگر آواز نکلتی ہو اور کسی خاص لفظ کی تشکیل کررہی ہو جو کسی معنی کی حامل ہے تو ذہن میں وہ معنی آئیں گے ضرور، حالانکہ معلوم ہے کہ وہ کسی متکلم کے زبان و ذہن کی لفظ نہیں کہ اس سے یہ معنی مراد بھی ہوں۔یہ دلالت، دلالت تصوریہ ہے کہ اس لئے کہ لفظ کے سننے کے بعد صرف معنی کا خطور ذہن میں ہوتا ہے اس پر کوئی حکم ایجابی یا سلبی نہیں لگایا جاتا لہٰذا تصور ہی تصور ہے تصدیق کا پتہ نہیں ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ لفظ کے استعمال کے ساتھ معنی ذہن میں آئیں اور اس طرح کہ متکلم نے یہی معنی مراد بھی لئے ہیں اور استعمال لفظ کا اسی معنی میں کیا ہے۔اس کو کہا جائے گا دلالت تصدیقیہ اس لئے کہ یہاں تصور ہی تصور نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ حکم بھی ہے کہ متکلم نے یہی معنی مراد لئے ہیں۔

یہ دلالت اسی وقت پیدا ہوگی جب متکلم فہم و شعور رکھتا ہوا اور اس نے ارادہ کے ساتھ کلام کیا ہو لہٰذا دروازہ سے سنائی دینے والی آواز میں یہ دلالت پائی نہیں جاسکتی اس طرح اگر متکلم باشعور ہستی ہو مگر بوقت تکلم معلوم ہے کہ قصد و ارادہ موجود نہیں ہے جیسے: سرسامی کا ہذیان اور مست بے ہوش کی بکواس، اس صورت میں بھی دلالت تصدیقیہ کا وجود نہ ہوگا۔

دلالت تصوریہ تو لفظ کے گوش زد ہوتے ہی فوراً پیدا ہوتی ہے اور بدلتی نہیں لیکن دلالت تصدیقیہ برقرار صورت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کلام ختم ہو جائے اور کوئی قرینہ اس کے خلاف نہ آئے اس لئے کہ اکثر خاتمہ کلام کے موقع تک ایسے قرائن آجاتے ہیں جو لفظ کو پہلے معنی سے ہٹا کر کسی دوسرے معنی کا جامع پہنا دیتے ہیں مثلاً متکلم کی زبان سے نکلا ''رَآیتُ اَسَداً'' جس کا ترجمہ ہے ''میں نے شیر دیکھا''۔یہاں مخاطب کے کان میں لفظ ''اَسَداً'' پہونچتے ہی ''شیر'' کے معنی ضرور آجائیں گے اور شیر بھی وہی جو جنگل والا ہے یہ دلالت تصوریہ ہے کہ اور ابھی ذہن میں خیال بھی یہی ہوتا ہے کہ وہی مراد ہے لیکن مختتم طور پر یہ فیصلہ کہ یہی مراد ہے اس وقت ہوگا کہ جب اس کی بعد ''یرمی'' کا لفظ نہ آجائے یعنی وہ

تیراندازی کرتا ہے۔ اگر یہ یا ایسی ہی کوئی لفظ آ گیا تو دلالت تصدیقیہ منقلب ہو جائے گی اور یہ سمجھا جانے لگے گا کہ اس سے مراد مجازی معنی ہیں یعنی بہادر انسان۔

ان دونوں دلالتوں کے بعد تیسرا درجہ یہ ہے کہ کلام کے مقصود اصلی کا پتہ چلا یا جائے کیوں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ کے بجائے خود معنی کچھ ہیں اور وہ بحیثیت استعمال الفاظ مراد بھی ہیں لیکن اصلی مقصود وہ نہیں ہیں بلکہ اس معنی سے ذہن کا منتقل کرنا منظور ہے کسی اور چیز کی طرف جو درحقیقت بتلانا منظور ہے جیسے کنایہ کی صورت میں کہنے والا کہتا ہے میں اب تمہارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا''۔

اس جملہ میں کوئی لفظ اپنے اصلی معنی کے علاوہ دوسرے معنی میں مستعمل نہیں ہے لیکن پھر بھی اصلی مقصود اس جملہ کے کہنے سے یہ نہیں ہوتا کہ ''میں قدم نہ رکھوں گا'' بلکہ یہ کہ ''میں آؤں گا نہیں'' اس بناء پر اگر وہ خود اپنے پیروں پر اس کے گھر میں نہ جائے بلکہ کسی سواری پر داخل ہو تب بھی اس کا عمل اس کے قول کے خلاف قرار پائے گا۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ لفظ معنی اور مقصود کلام اس سب کے تمام ہونے کے بعد سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ اس کلام سے اشارہ کس امر کی طرف ہے۔ مثلاً اتفاق سے مخاطب نے کبھی اس متکلم سے کہا تھا کہ میں تمہارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا۔ آج یہ اسی طرح کہہ رہا ہے کہ میں تمہارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا اور اس کا اشارہ اس کے کہنے سے اس طرف ہو کہ یہ بدلا ہے تمہاری اس دن کی بات کا جو تم نے کہی تھی یہ قسم پہلے تینوں درجوں سے بالکل مختلف ہے وہ درجے لفظ اور اس کے معنی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ چیز جسے ہم نے چوتھے درجہ پر قرار دیا ہے لفظ اور اس کے معنی سے بالکل خارج ہے۔

اس بناء پر کسی شخص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں نقل بالمعنی کی صورت میں یہ حق حاصل ہے کہ انسان ان الفاظ کے تحت اللفظی معنی کو الفاظ کی الٹ پلٹ کے ساتھ جو معنی کی تبدیلی کا باعث نہ ہو یا مرادفات کے استعمال کے ساتھ بیان کرے۔ مثلاً پاؤں اس کے گھر میں نہ رکھوں گا اسے بیان کردے کہ اس نے کہا میں اس کے یہاں قدم نہ رکھوں گا''۔

کیوں کہ ان الفاظ کے معنی یہ ہیں اس لئے ان الفاظ کا بھی منسوب کرنا اُس کی طرف صحیح ہے اِسی طرح جو اصل مقصود ان الفاظ کا جو سمجھ میں آیا ہے اسے بھی منسوب کرسکتا ہے۔ مثلاً، کہے کہ اس نے کہا میں اُس کے یہاں اب کبھی نہیں جاؤں گا۔

مگر وہ خارجی چیز جو چوتھی قسم میں ذکر کی گئی ہے جو کلام سے بطور اشارہ نکالی جاتی ہے وہ ہرگز مقولہ متکلم قرار نہیں پاسکتی اور نقل قول کے موقع پر اس کا ذکر صحیح نہیں ہے مثلا مذکورہ بالا مثال میں یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس نے کہا ''یہ تمہاری اس دن کی بات کا جواب ہے کیوں کہ اس نے یہ بات کہی ہرگز نہیں تھی بلکہ اس کی بات سے جو اس نے کہی تھی ہم نے اپنے ذہن سے یہ اشارہ پیدا کیا تھا لہٰذا سے اس قائل کی طرف بطور مقولہ منسوب کرنا کسی صورت سے صحیح نہیں ہے۔

دوسرا فرق ایک اور ہے وہ یہ کہ الفاظ کے پہلی قسم کے معنی ہمیشہ ایک ہی ہو سکتے ہیں یہ ناممکن ہے کہ ایک لفظ سے بوقت واحد ایک زیادہ معنی مقصود ہوں لیکن یہ معانی کہ جو بطور اشارہ نکل سکتے ہیں وہ ایک سے بہت زیادہ ہوسکتے ہیں بلکہ کلام اتنا ہی اعلیٰ پایہ کا ہوگا جتنے اس قسم کے معانی اس میں زیادہ پیدا ہوسکیں۔

پہلی قسم کے معانی الفاظ کی واضح لغوی سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر قرائن لفظیہ ومعنویہ سے وابستہ ہیں جو بہر حال محدود ومنضبط ہیں لیکن

دوسری قسم کے معانی میں سننے والے کی ذہنیت اور اُفتادِ طبع کا بڑا دخل ہے کیوں کہ یہ معنی لفظ کے تحت میں نہیں ہوتے بلکہ لفظ کے معنی ومطلب کو سمجھ کر پھر سامع خود ایک رائے قائم کرتا ہے جس میں اکثر سامع کے حسن ظن یا بدگمانی وغیرہ کا اثر ہوتا ہے اور وہ متکلم کے ذہن میں بھی نہیں ہوتے جیسے محفل میں ایک شخص درزی پیشہ کسی کے ان الفاظ کو کہ ''خدا کے فضل سے مجھے چوری کی عادت کبھی نہیں رہی ہے''۔سن کر یہ رائے قائم کرلے کہ اس میں مجھ پر تعریض منظور ہے کہ اس شخص کی چوری کی عادت ہے جیسا کہ کہاوت ہے ''چور کی داڑھی میں تنکا''

اسی طرح سابق وحال کے حالات کو پیش نظر رکھ کر کبھی یہ اشارہ پیدا کرلیا جاتا ہے حالانکہ متکلم کو بہ وقت کلام ان حالات کا لحاظ نہیں ہے۔

غرض یہ کہ اس قسم کے اشارے پیدا کرنے میں وسعت بہت بڑی ہے مگر اس میں قدم قدم پر غلطیاں واقع ہونے کا امکان ہے۔

ایک شخص کسی کو اپنا دشمن سمجھتا ہے لہٰذا اس کی ہر بات میں اپنے لئے کچھ نہ کچھ برا پہلو پیدا کرتا ہے حالانکہ بہت ممکن ہے کہ اس نے نیک نیتی کے ساتھ وہ کلام کیا ہو اور کسی برے پہلو کا قصد نہ رکھا ہو اور ایک شخص جو دوسرے کو اپنا دوست سمجھے ہوئے ہے وہ اس کی ہر بات میں محبت ہی کا پہلو محسوس کرتا ہے چاہے اس بات کرنے والے کے ذہن میں نہ ہو۔ یہ چار درجے ہیں جو کسی نہ کسی طرح مقصود کلام کی تعیین کے مرحلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک پانچویں چیز ہے اور وہ تعیین مصداق کلام یعنی لفظ کے جو بھی معنی کسی نہ کسی صورت سے سمجھ میں آئے ہیں اب یہ دیکھا جائے کہ وہ معنی کس فرد میں پائے جاتے ہیں اور کون ان کا مصداق یا مصداق کی فرد ِاکمل قرار پاتا ہے۔

اس کا شرح کلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بالکل خارجی اور واقعاتی اور کبھی کبھی اعتقادی چیز ہوتی ہے۔

عام کلام میں جسے شرح کہتے ہیں اسی کو قرآن کی نسبت سے تفسیر کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا تفسیر کا تعلق تو کسی نہ کسی درجہ میں معنی کلام الٰہی کے ساتھ ہوتا ہے اب کسی لفظ کے اس معنی کو برقرار رکھتے ہوئے اگر مشاہدہ، تجربہ یا عقل یا موجودہ تحقیقات کی رہنمائی سے کام لے کر اس کے کسی ایسے مصداق کا اظہار کیا جاتا ہے جسے سابق میں نہیں لکھا گیا تو یہ ''تفسیر بالرائے کے تحت میں مندرج نہیں ہوسکتا۔

مثلاً

(۱) قرآن مجید میں ہے:

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ. اس کے معنی صاف ظاہر ہیں کہ خداوندعالم مالک ہے دومشرقوں کا اور دومغربوں کا مشرق سے مراد بھی جیسا کہ اس کے ظاہری معنی ہیں مشرق آفتاب اور مغرب سے مراد مغرب آفتاب۔

اب اگر کوئی شخص یہ کرے کہ اس کے معنی کو بدل دے اپنی عقل پر زور دے کر مثلا یہ کہہ دے کے مشرقین سے مراد ''مشرق آفتاب نبوت اور مشرق خورشید امامت ہے یہ تو یقیناً معنی میں تصرف ہے اس لئے ہماری آئندہ بحث سے تعلق رکھتا ہے لیکن مشرق ومغرب کے ظاہری معنی کو برقرار رکھتے ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کرنا کہ یہ دومشرق اور مغرب کون سے ہیں؟ تفسیر نہیں ہے۔

سابق زمانہ کے مفسرین نے مشرقین ومغربین کا مصداق گرمی اور جاڑے کا مشرق ومغرب قرار دیا، اس لئے کہ ان کے ذرائع معلومات محدود تھے۔ ان کو اس زمانہ کے ایسے انکشافات حاصل نہ ہوئے تھے۔ اب اگر کوئی شخص موجودہ زمانہ کے حاصل شدہ معلومات کی بناء پر

یہ کہے کہ مشرقی ومغربین کا حقیقی مصداق امریکہ کے انکشاف سے سامنے آیا ہے اور دو مشرق اور دو مغرب اس قطر زمین پر جدھر ہم ہیں اور اس قطر زمین پر جدھرا مریکہ واقع ہے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور یہ آیت قرآن کی امریکہ کے وجود کا پتہ دے رہی تھی جسے اسی وقت کے لوگ نہ سمجھے تھے اور یہ اس کا ایک اعجازی پہلو ہے جواب سامنے آیا ہے تو یہ تفسیر بالرائے نہ ہوگا اس کے لئے ہم کو قول معصوم سے سند کی ضرورت نہیں ہے جب کہ خود قرآن مجید میں بغیر کسی تصرف معنوی کے دو مشرق اور دو مغرب کا ذکر موجود ہے اور اب تک ہم اپنی کوتاہی معلومات سے دو مشرقوں اور دو مغربوں کا اتنا نمایاں طور پر علم نہ رکھتے تھے جو اسے ہمیں حاصل ہے تو ہم کیوں نہ المشرقین اور المغر بین کا مصداق انہیں سمجھیں یہ ہرگز گناہ نہیں ہے۔

(۲) رَبُّ المشا رِقِ وَرَبُّ الْمَغَارِبِ.

یہاں دو ہی مشرقوں اور دو ہی مغربوں کا نہیں بلکہ اس سے زیادہ مشرقوں اور مغربوں کا پروردگار اُسے بتایا جارہا ہے اس کے سمجھنے میں سابق زمانہ کے مفسرین کو بڑی دشواری پیش آئی آفتاب تو ایک ہے پھر بہت سے مشرق اور بہت سے مغرب کہاں سے آئے اس لئے بیچاروں نے مشارق ومغارب سے مراد ہر دن کا مشرق اور مغرب قرار دیا کہ آفتاب اپنی ذاتی شرکت کی بناء پر سال میں ہر دن ایک نئے مشرق سے نکلتا ہے اور ایک نئے مغرب میں ڈوبتا ہے اس بناء پر مشارق اور مغارب کہا گیا ہے۔

لیکن اب جب کہ تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ آفتاب ایک نہیں ہے جتنے ستارے ثابت کہے جاتے رہے ہیں ان میں سے ہر ایک آفتاب کی حیثیت رکھتا ہے جس کا مستقل نظام ہے اور اس نظام کے تحت میں ہر ایک کے سیارے ہیں۔

ان تمام آفتابوں کے لئے اپنے سیارات کے اعتبار سے طلوع ہے اور غروب اس لئے مشارق اور مغارب کا مصداق بلاتکلف ان آفتابوں کے مشرق اور مغرب ہیں۔

ایسا کہنا اگر صرف ذاتی عقل کے صرف کرنے سے بھی ہو تو بھی تفسیر بالرائے نہ ہوگا، چہ جائیکہ واقعہ یہ ہے کہ آفتابوں کا متعدد ہونا ائمہ معصومینؑ کے احادیث میں بھی وارد ہوا ہے تو احادیث سے بھی مشارق اور مغارب کے اس مفہوم کو سمجھا جاسکتا ہے۔

(۳) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عالم متعدد ہیں اور حضرت احدیت ان تمام عوالم کا پروردگار ہے۔

معنی آیت کے صاف ہیں ان میں کوئی گنجلک نہیں ہے مگر یہ بہت سے عالم کون ہیں؟

ذہن میں تصور تو یہی تھا کہ عالم بس ایک ہے جس میں ہم بسے ہوئے ہیں۔ تو اب یہ بہت عالم کیا ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا بیچارے مفسرین نے سوچ سوچ کر یہ کہا کہ عوالم سے مراد انواع کائنات ہیں یعنی پتھر ایک عالم ہے درخت ایک عالم ہیں جانور ایک عالم ہیں اور آدمی ایک عالم ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں یہ سب تو اسی ایک عالم کے اجزاء ہیں بہت سے عالم کہاں ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ اس کے آگے اس وقت نظر کی رسائی نہ تھی اب جبکہ یہ ثابت ہو گیا کہ دنیا اس نظام شمسی میں محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے نظام بھی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے سیارات ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری اس دنیا کی طرح ایسی کتنی پوری پوری دنیائیں موجود ہیں تو اب عالموں کے بہت تعداد میں ہونے کا مسئلہ ہو گیا۔

اب اگر ہم کہیں کہ قرآن نے پہلے ہی اس جہان کے آگے دوسرے جہانوں کے وجود کا پتہ دیا تھا تو اسے تفسیر بالرائے کے تحت میں لانا صحیح نہیں ہوگا۔ حالانکہ یہ بھی احادیث سے ثابت ہے کہ عالم ایک نہیں بلکہ بہت ہیں۔

اس طرح کی آیتیں قرآن مجید کی اور ہیں جن کے معنی کا انطباق تحقیقات جدیدہ پر بہت نمایاں ہے جنہیں بعض اہل قلم نے مستقل طور پر موضوع تصنیف بنایا ہے مگر یہاں مثال کے لئے اتنا ہی کافی معلوم ہوتا ہے اور اس قسم کے نمونے جتنے آئیں جہاں معنی ومطلب میں کوئی تبدیلی نہ کی جا رہی ہو بلکہ مصداق کو نمایاں کیا جا رہا ہو اس کے لئے کبھی حدیث و تفسیر کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے اپنی عقل اپنے مشاہدہ اور جدید معلومات سے ثابت کیا جاسکتا ہے اور وہ ہرگز ہرگز تفسیر بالرائے کے تحت میں مندرج نہ ہوگا۔

تفسیر معانی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اسی کے معنی ہیں:

''کَشْفُ الْمُبْهَمِ''یعنی استفہام مستعمل ہے یعنی کسی امر کو واضح کرنے کی خواہش علامہ سید رضی جامع نہج البلاغہ اپنی کتاب حقائق التاویل صفحہ ۱۳ میں تحریر فرماتے ہیں۔

معنی التفسیر والتاویل انما یکون لما غمض وخفی ولم یعلم بظاهر ہ و هٰذا صفة المتشابه واما المحکم الذی یعلم بظاهر ہ فلا حاجة بأحدالیٰ تعلیمہٖ لأنّ اهل اللسان فیه سواسیة.

تفسیر و تاویل کا معنی کے لحاظ سے تعلق ایسی چیز کے ساتھ ہے جو گہری ہو باریک ہو اور سطحی نگاہ سے معلوم نہ ہو۔ یہ بات متشابہات میں ہوتی ہے لیکن محکم آیتیں جن کا مفہوم کھلا ہوا ہو ان میں کسی کو تعلیم کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ تمام اہل زبان ان میں یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔

اب ہم نے معانی الفاظ اور ان کے سمجھنے کے سلسلہ میں سابقاً جو درجے لکھے تھے ان پر نظر ڈالئے تو ان میں پہلا ایک قہری حیثیت رکھتا ہے جو لفظ کے کسی معنی کے لئے وضع ہونے اور اس کا علم حاصل ہونے کا نتیجہ ہے یہ لفظ کے سنتے ہی معنی کا ذہن میں آنا طبعی لازمی ہے لہٰذا تفسیر بالرائے کا اس سے تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔

دوسرا درجہ یعنی الفاظ کو سن کر قرائن حالیہ ومقالیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ رائے قائم کرنا کہ اس لفظ کے یہ معنی ہیں یہ بھی ہر زبان دان کا فطری حق ہے جو سلب نہیں ہوسکتا بے شک یہ حق اس وقت سلب ہو جاتا ہے جب متکلم نے اس کی صراحت کردی ہو کہ اس کا کلام عام محاورات پر مبنی نہیں ہے بلکہ تمام تر اس کے ذاتی اصطلاحات پر مبنی ہے یا کلام کچھ اس طرح کا ہو کہ اس سے روز مرہ کے محاورات کے ماتحت کوئی معنی نکلتے ہی نہ ہوں اس طرح تو دوسری کیا پہلی قسم کی دلالت بھی جو وضع الفاظ پر مبنی ہے حاصل نہ ہوگی۔

قرآن میں بس حروف مقطعات کو چھوڑ کر جو اس آخری قسم میں داخل ہیں باقی پوری کتاب میں یہ بات نہیں ہے اسے کہہ دیا گیا ہے وہ عربی زبان میں ہے اور اس میں غور و تامل کا حق ہی نہیں دیا گیا ہے بلکہ دعوت دی گئی ہے اَفَلاَ یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ (یہ لوگ قرآن میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں)۔ اس کی سچائی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہوا:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا. (نساء۔ ۸۲)

اگر یہ غیر خدا کی جانب سے ہوتا تو انھیں اس میں بڑا اختلاف نظر آتا۔

اگر قرآن ایسا ہوتا کہ اس کے معنی ہی کسی کی سمجھ میں نہیں آتے تو اس میں غور و فکر کی دعوت کیوں دی جاتی ہے اور پھر اس میں اختلاف ہونے نہ ہونے کا اندازہ انہیں کیوں کر ہوسکتا تھا؟

اس میں صاف موجود ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا (ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا ہے) بلکہ ارشاد ہوا بِلِسَانٍ

عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ o (یہ صاف کھلی ہوئی عربی زبان میں ہے“۔)
غور کیا جائے تو عقلی دلیل بھی ان آیات کے مفاد میں مضمر نظر آتی ہے۔
قرآن مجید رسالت مآب ﷺ کا معجزہ ہے اور اعجاز کا دار و مدار اس پر ہے کہ جس چیز میں اس دور کے لوگوں کو ادعائے کمال ہو اس میں ان کی طاقتوں کو شکست دی جائے جس کی تشریح بحث اعجاز میں آ چکی ہے۔
ہمارے رسولؐ کے زمانہ میں فصاحت و بلاغت کا دور دورہ تھا لہٰذا آپ کو معجزہ اسی نوعیت کا عطا ہوا جو قرآن مجید ہے۔
اب اگر یہ کسی اور زبان میں ہو جو ان کی زبان سے الگ ہے تو اس کے سبب سے اس کا اعجازی پہلو ختم ہو جائے گا اور قوم پر حجت تمام نہ ہوگی اس لئے ایک زبان کے بڑے سے بڑے ماہرین کا دوسری زبان کی چیز کے جواب سے عاجز ہونا کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے جو دلیل حقانیت بن سکے۔
متعدد آیات میں اس امر کا اظہار کہ یہ قرآن عربی زبان میں غالباً اس اعجازی پہلو کے نمایاں کرنے کے لئے کہ دیکھو یہ کوئی نئی زبان ہے بلکہ یہ اسی زبان کے روز مرہ میں ہے جس میں تم کو فصاحب و بلاغت کا انتہائی دعویٰ ہے اس کے باوجود تم اس کے جواب سے عاجز ہو تو سمجھو کہ یہ کسی بالا دست طاقت کا اتارا ہوا ہے۔
اب جب یہ بات یقینی طور پر ثابت ہوگئی کہ قرآن مجید کی کوئی الگ زبان نہیں ہے تو اس کے بعد ہر عربی زبان والے کو اس کے معانی و مطالب سمجھنے کا حق حاصل ہے جس میں محاورات عرب سے واقفیت کے سوا کوئی شرط نہیں ہے۔
بے شک یہ صورت حال دردانگیز ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر شخص جو عربی سے کوئی حس و مس نہ رکھتا ہو وہ بھی قرآن فہمی کا مدعی ہے۔
اس کو سوادماغی ”بوالہوسی“ کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا جس کے بعد ”شیوہ اہل نظر“ کی آبرو کا جانا یقینی ہے۔
اس کے بعد تیسرا درجہ یعنی کلام کے مقصود اصلی کی تعیین بضمیمۂ قرائن ہیں اور اس لئے ہر لفظ کے معنی میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ اس سے کسی بھی دوسرے معنی کو بطور مقصود اصلی قرار دے دیا جائے بلکہ وہ دوسرے معنی ایسے ہی ہو سکتے ہیں جو اس لفظ کے اصل معنی کے ساتھ اتنا قریبی تعلق رکھتے ہوں کہ ایک سے دوسرے کی طرف ذہن منتقل ہو سکے اور اس لئے الفاظ کے محاورات و اصطلاحات سے واقفیت کی صورت میں جس طرح انسان ان کے تحت اللفظی معانی کے سمجھنے کا حق رکھتا ہے اسی طرح ان معانی کے مطلب اور مقصود اصلی کے استفادہ کا حق بھی ہے۔
اسی لئے کثیر التعداد احادیث میں مختلف مقامات پر ائمہ معصومین علیہم السلام نے احکام شرعیہ کے استفادہ کے لئے آیات قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے رواۃ احادیث کو یہ حق دیا ہے کہ وہ قرآن مجید سے شرعی احکام کو حاصل کریں۔
بے شک یہ امر ملحوظ رہے کہ کنایات اور مجازات کی تعیین میں ان تمام اصول و شرائط کو مدنظر رکھنا ہوگا جو اہل زبان نے مقرر و معین کیے ہیں مثلاً یہ کہ اگر معنی حقیقی کا مراد لینا ممکن ہے اور اس کے خلاف کوئی قرینہ نہیں ہے تو خواہ مخواہ معنی مجازی یا کنایہ پر اس کا محمول کرنا درست نہیں ہے اور صرف اپنی ذاتی رائے سے جو کسی عقلی یا نقلی دلیل پر مبنی نہیں ہے ایسا کرنا تفسیر بالرائے ہوگا۔ اس کے علاوہ جب معنی حقیقی کا مراد لینا ممکن نہ ہو تو پھر اسے کنایہ یا مجازی معنی کو مراد لینا درست ہوگا جو محاورہ اور استعمال عرفی کے مطابق ہوں ایک ایسے بعید معنی پیدا کرنا جو اس معیار کے تحت میں داخل نہ ہوتے ہوں اصول تکلم کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے اور اس صورت میں یہ کہنا کہ مراد خدا وندی یہ ہے تفسیر بالرائے ہوگا۔

تفسیر بالرائے کی چند مثالیں

(۱) قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کا ذکر ہے

..............................کبھی خالق کی زبانی:

(۱) تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِإِذْنِيْ. (مائدہ۔۱۱۰)

(۲) تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِإِذْنِيْ. (مائدہ۔۱۱۰)

(۳) تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِإِذْنِيْ. (مائدہ۔۱۱۰)

☆--------------اور کبھی خود حضرت عیسیٰؑ کی زبانی

(۱) اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللّٰهِ o (آل عمران ۴۸)

(۲) اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِإِذْنِ اللّٰهِ o (آل عمران۔۴۸)

مفہوم ان جملوں کا عربی لغت اور روزمرہ کے لحاظ سے بالکل صاف ہے جسے ہر عربی دان بلا تکلف الفاظ کے سنتے ہی سمجھ لیتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مٹی سے ایک مجسمہ بصورت طائر بناتے تھے اور اس میں پھونکتے تھے وہ بحکم خدا سچ مچ کا پرندہ بن جاتا تھا۔

(۲) کورمادرزاد اور کوڑھی کو شفا بخشتے تھے۔

(۳) مردوں کو بحکم خدا زندہ کرتے تھے۔

ہر آدمی جو عربی سے اس حد تک واقف ہو کر ان الفاظ کے معنی سمجھ سکے وہ ان الفاظ کو سن کر فطری طور پر یہی معنی سمجھے گا پھر یہ کسی اصول عقلی کے خلاف بھی نہیں ہے بلکہ ان میں کی ہر بات خالق کی قدرت کے دائرہ میں ہے اور اس لئے اس کی جانب سے اس کے کسی خاص بندہ کے ہاتھ سے ان کاموں کا وقوع میں آنا ممکن ہے۔

مگر اب ایک طبقہ ہے جو طے کیے ہوئے ہے کہ ہم معجزہ کی قسم کی باتوں کو نہیں مانیں گے اس کے ایک خاص نمائندہ نیاز صاحب فتحپوری تھے۔ انہوں نے الفاظ آیت کے عجیب عجیب معانی بتلائے ہیں۔

''مٹی سے'' کی لفظ سے مراد ہے انسان کہ جو مٹی سے بنایا گیا ہے۔

''پرندے کی صورت'' اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں صلاحیت پیدا کی جائے فضائے روحانیت میں اڑنے کی۔

''پھونکنے'' سے مراد ہے۔ ہدایت کی روح کا پہنچانا اور تکون طیرا باذن اللہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ معارف وہدایت کو حاصل کر کے ہوائے معرفت میں پرواز کرنے لگتا ہے۔

''اندھے اور کوڑھی کو شفا دیتے کے معنی' ان لوگوں کو ہدایت کرنا جو بالکل علوم ومعارف سے بے بہرہ تھے اور۔

''مُردوں کو ذندہ کرنے کے معنی ہیں کافروں کو مومن بنانا اور گمراہوں کو ہدایت کرنا۔

مولانا مرزا احمد علی امرتسری نے اپنے رسالہ بابیت ومرزائیت کا تقابل صفحہ ۳۱ میں ان لوگون کے طبع زاد تاویلات میں بھی ان آیات کا

یہی مفہوم لکھا ہے کہ ''ہیت طیر وغیرہ انسانی خاکی پیکر اور طیر روحانی پرواز پھونک سے مراد لی گئی ہے۔

(۲) قرآن مجید میں روز قیامت اور اس کے علامات حشر ونشر اور مردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے کا بہت آیتوں میں تذکرہ ہے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کوئی چیز قرآن میں اس کثرت کے ساتھ اور اتنی اہمیت دے کر بیان نہیں کی گئی ہے جس قدر روز قیامت کا تذکرہ لیکن بہاء اللہ مازندرانی کی امت جو ''بہائی'' کے نام سے معروف ومشہور ہے، ان تمام آیتوں کے معانی دوسرے کہتی ہے۔ وہ ''قیامت'' سے مراد ظہور الٰہی یعنی خداوند عالم کے خاص نمائندہ کا ظہور جو ان کے نزدیک بہاء اللہ تھے۔

''نفخ صور'' سے مراد ہدایت کرنے والے کی آواز مردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے سے مراد بے علم وعرفان افراد کا روح علم سے زندہ ہونا قرار دیتے ہیں اور اس طرح دنیائے لفظ ومعنی میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔

(۳) قرآن کی آیت ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

''مہر لگا دی خدا نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ان کے لئے سخت عذاب ہے''۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ کفار ومشرکین کی مذمت ہے لیکن صوفیا کے ایک طبقہ نے جنہیں ایران میں اہل عرفان کہا جاتا ہے اس کو اہل معرفت ارباب عشق صادق کی مدح قرار دیا ہے۔

خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی یعنی علامت قرار دے دی کہ یہ خاص میرے لئے ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردے ہیں یعنی ماسوا اللہ کوئی چیز ان کی نظر میں آتی ہی نہیں اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے یعنی وہ محبت کی سختیوں کو جھیل رہے ہیں اور پھر عذاب عذوبت سے بھی مشتق ہے جس کے معنی خوشگوار کے ہیں اور محبت کی سختی میں ایک خاص خوشگواری وشیرینی ہوتی بھی ہے۔

(۴) یہ اور اس کے بعد کے چند تاویلات ''بابیت و مرزائیت کا تقابل'' رسالہ میں مولانا مرزا احمد علی صاحب امرتسری نے درج کیے ہیں جن میں کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔

باب وبہاء کے تاویلات: ''بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا وَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا۔ '' پہاڑ چلائے جائیں اور وہ پراگندہ غبار کی طرح نظر آئیں گے''۔ مطلب یہ ہے کہ جب احکام بوسیدہ ہوجائیں گے اور ان سے تاثیر اٹھا دی جائے گی اور نئے احکام ان کی جگہ پر قائم ہوجائیں گے تو اس وقت علماء کی باتیں ایسی بے تاثیر ہوجائیں گی کہ وہ لوگوں کی نظروں میں پراگندہ غبار کی طرح ہوجائیں گی مطلب یہ ہے کہ نئی شریعت قائم ہوگی جس کی وجہ سے علماء کی پرانی باتیں تاثیر نہیں رکھتیں (بحر العرفان صفحہ ۲۷)

(۵) وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (زمر۔٦٧) یعنی ''قیامت کے دن زمین اپنے برکات روک لے گی اور سارے آسمان اپنے برکات لپیٹ دیں گے مطلب یہ ہے کہ دلوں کی زمین اور آسمان جس سے مراد پہلی شریعت ہے۔ وہ لپیٹ یعنی منسوخ کر دی جائیں گی یعنی اسلامی شریعت ختم ہوجائے گی اور باب وبہاء کی شریعت جاری ہوگی اور یہ زمانہ قائم آل محمدؑ باب کا ہوگا۔

(٦) ''اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ'' ''یعنی نماز کو آفتاب ڈھلنے سے رات کو اندھیرے تک قائم کرو مطلب اس کا یہ ہے کہ محمد عربی ﷺ کی شریعت کا زمانہ جو ۱۲۶۱ء تک ہے اس وقت تک نماز پڑھو۔ اس کے بعد قائم آل محمد (یعنی باب) ظاہر ہوگا اور اسلامی شریعت منسوخ ہوجائے گی تو نماز پڑھنے کا حکم بدل جائے گا حروف تہجی کے اعداد سے غسق اللیل کے عدد ۱۲۶۱ ہوتے ہیں اس آیت کا

مطلب یہ ہے کہ نماز کو شریعت محمدیہ کے قائم ہونے کے وقت ۱۲۶۱ سال تک قائم کرو اس کے بعد یہ حکم ختم ہے اس لئے کہ دوسری شریعت نازل ہوگی اور وہ باب کے زمانہ کا وقت ہے

(۷) مرزا غلام احمد لکھتے ہیں ''دَآبَّۃَ الْاَرْضِ'' سے مراد وہ علماء اور واعظین ہیں جو آسمانی قوت اپنے میں نہیں رکھتے۔(ازالہ اوہام ص ۵۰)

(۸): وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللهُ بِبَدْرٍ. صاف اس میں جنگ بدر کا ذکر ہے مگر مرزا صاحب قادیانی آیت مذکور کے عدد چودہ سو نکال کر فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہمارے ماننے والوں کی مدد ہے۔(اعجاز مسیح۔ص ۱۸۳)

(۹) ''بابیت و مرزائیت کا تقابل'' اس کی مندرجہ مثالوں کے بعد ایک اپنے قریب کی مثال بس اور ملاحظہ کریجئے۔

ہم سب کے جانے پہچانے اور میرے خاص طور پر کرم فرما بزرگ مصور فطرت خواجہ حسن نظامی کے مضامین کا مجموعہ ''سی پارۂ دل'' کے نام سے شائع ہوا ہے اور اردو کے بعض امتحانات کے کورس میں داخل ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

''قرآن شریف میں سب سے پہلے الٓمّ کا لفظ تم نے پڑھا ہوگا اس میں اشارہ ہے کہ آل محمد ﷺ اس کتاب 'علم' کو جس میں کچھ شک نہیں عالمگیر کرنے کے لئے کھڑی ہوگی۔ چنانچہ سر سید احمد خاں نے جو محمدی آل سے تھا یہ کام شروع کیا اور اب آغا خان جو زمرہ آل رسالت سے ہے اس کی مدد کرنا چاہتا ہے۔(صفحہ ۴۵۵)

ان تفسیرات یا تاویلات میں سے بعض کا تعلق چوتھے درجہ سے ہے یعنی الفاظ کے معانی و مطالب پورے ہو چکنے کے بعد یہ پتہ لگانا کہ اس سے اشارہ کا ہے کی طرف ہے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ الفاظ کے معنی و مطلب سے خارج چیز ہے اس لئے نہ افہام و تفہیم کی حدود اسے اپنے اندر لیتے ہیں اور نہ محاورہ کے اصول اس کو معتبر قرار دیتے ہیں اس لئے یہ معنی جو اشارتاً نکالے جاتے ہیں انہیں متکلم کی طرف منسوب کرنا درست نہیں ہے۔

قرآن مجید میں ایسے اشارات و رموز موجود ضرور ہیں اور یہی وہ ہیں جنہیں ''باطن قرآن'' بتلایا گیا ہے اور ان بطون میں تہہ در تہہ کثرت ہو سکتی ہے اس لئے یہ بھی آیا ہے کہ: اِنَّ الْقُرْاٰنَ سَبْعِیْنَ بَطْناً'' (قرآن کے ستّر باطن ہیں کیوں کہ ظاہر قرآن کی بنیاد معانی الفاظ پر ہوتی ہے اور معنی ایک لفظ کے بوقت واحد ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے ہیں باطن کی بنیاد رموز و اشارات پر ہوتی ہے اور اشارہ ایک چیز سے متعدد امور کی طرف ممکن ہے۔

ظاہر قرآن وہ ہے جس کے متعلق پہلے ہم نے اس پر زور دیا ہے کہ اس کے سمجھنے اور اس پر بنیاد عقیدہ و عمل رکھنے کا سب کو حق ہے بشرطیکہ انسان عربی زبان سے کما حقہ واقف ہو لیکن باطن قرآن اس کے مخصوص اہل ہوتے ہیں اور ہر شخص کو اس میں طبع آزمائی کا حق نہیں ہے کیوں کہ ان اشارات کی تعیین جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے زیادہ تر سامع کی افتاد طبع اور ذہنیت کی تابع ہوا کرتی ہے اور اس لئے عام اشخاص کے کلام میں جب ہم اس قسم کے اشارات کی تعیین کریں تو وہ اکثر واقع کے مطابق نہیں ہوتی بلکہ سوء ظن یا سابق وحال واقعات کیلئے بنیادی جوڑ توڑ کا نتیجہ رہتی ہے اور متکلم کو وہ اشارہ یا تعریض مدنظر نہیں ہوتی جسے ہم نے اس کے سر منڈھ دیا ہے۔

پھر جب معمولی اشخاص کے کلام میں عقل انسانی مکمل رہنمائی نہیں کرتی تو خداوند عالم کے کلام میں یہ غیر مکمل عقول کہاں صحیح نقطہ تک رہبری کر سکتے ہیں۔ لہٰذا غلطی کا ہونا اس میں ناگزیر ہے۔ قرآن میں ایسے رموز و اشارات کی تعیین اور ظاہر لفظ سے آگے معانی پیدا کرنا یقیناً تفسیر

بالرائے ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے الفاظ کے ظاہر معنی کو سمجھ کر اس کے مضمون کو بیان کرنا ہرگز تفسیر نہیں ہے کیوں کہ تفسیر کے معنی تو غیر ظاہر کو ظاہر بنانے کے ہیں۔ یہ اسی پر منطبق ہے جس میں ایک غامض و مخفی امر کا کشف ہوتا ہے اور وہ یہ چوتھی صورت ہے۔

پھر اس کے علاوہ ممانعت تفسیر بالرائے کی ہوئی ہے پہلے مراتب ومدارج جو ہیں ان کی بنیا محاورات عرب کے تتبع زبان دانی اور واقفیت الفاظ ومعنی پر ہے وہ اگر چہ عقل پر موقوف ہے بایں معنی کہ ایک مجنون اس مرحلہ کو بھی ممکن ہے طے نہ کر سکے لیکن ان معانی کی تعین کسی عقل غور وخوض سے تعلق نہیں رکھتی نہ ان میں رائے کا دخل ہے۔ برخلاف چوتھے درجہ کے کہ وہ نہ تو تتبع لغات پر مبنی ہے اور نہ زبان دانی و وسعت نظر سے متعلق بلکہ پورے طور پر اس میں عقل آرائی اور طبع آزمائی کو دخل ہے کہ ہونہ ہو، متکلم نے اس کلام سے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے یہ چیز وہ ہے جس سے ممانعت ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک چیز ہے تفسیر بالرائے سمجھنا چاہئے وہ یہ ہے کہ آدمی قرآن کے الفاظ پر قرآن فہمی کی خاطر نظر ہی نہ کرے کہ اس سے واقعی سمجھ میں کیا آتا ہے بلکہ خود ایک رائے قائم کرلے اور پھر کوشش کر کے آیات قرآن کو ایسے معانی کا جامہ پہنائے جن سے اس کی رائے کی تائید ہوتی ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قرآن کو اپنی رائے کا تابع بنا رہا ہے اکثر واعظین کی تفسیر بالرائے یہی نوعیت رکھتی ہے۔

ہم نے جو تفسیر بالرائے کا مفہوم لکھا ہے اسے علمائے فریقین کی تائید حاصل ہے۔

ایک طرف صدر المتالہین شیرازی تحریر فرماتے ہیں:

قد غلب علیٰ طبایع اکثر الناس ان لا معنی القرآن الا ما نقل علی ابن عباس و سایر المُفَسِّرِیْن ومنشاء ھجرھم التجاوز عن الظاھرہ المشھور امور کثیرۃ اظھرھا امران احدھما غلبۃ احکام الظاھر علیھم وقصور افھامھم عن درك بواطن القرآن واسرار الآیات والثانی فی الحدیث المشھور حیث لم یفھمو المراد منه وما معنی التفسیر بالرّائے.

وقال امیر المو منین علیہ السلام الا ان یوتی اللہ تعالیٰ عبدًا فھما فی القرآن فان لم یکن سوٰی حفظ الترجمة المنقول فما معنی الفھم.

وقال علیہ السلام لَو شِئتُ لا وقرت سبعین بعیرا من تفسیر فاتحۃ الکتاب و فی روایۃ من تفسیر الفاتحه و تفسیر ظاھرھا فی غایۃ الاختصار.

واما قوله من فسّر القرآن برأیه والنھی عنه فیحمل علیٰ احد وجھین الا ول ان یکون له فی الشئ رای الیه میل من طبعه وھواہ فتیاول القرآن علیٰ وفق رایٔه فیکون قد فسّر برائیه ای رایه حمله علیٰ ھٰذا ولو لا رایه لما ترجّح عنده ھٰذا والوجه الثانی ان یّتَسَارَعُ الیٰ تفسیر القرآن بمجرّد العربیة من غیر استفسارھا بالسّماع والنقل فیما یتعلق بقرا،ته وما فیه من الا لفاظ المبھمة وما فیه من الحذف والاضمار والتقدیم والتا خیر والاختصار واکثر المفسّرین غیر العرفأ منھم فی ھٰذا الخطر .(مفاتیح الغیب۔۲۳)

بہت سے لوگوں کے ذہن پر یہ بات چھائی ہوئی ہے کہ قرآن کے کوئی اور معنی ہو ہی نہیں سکتے سوائے اس کے کہ جو ابن عباس اور دوسرے مفسرین کی زبانی وارد ہو گئے ہیں اور مشہور سطحی معنی کے دائرہ سے باہر نکلنے کو ممنوع قرار دینے کا سبب بہت سے امور ہیں جن میں زیادہ نمایاں دو باتیں ہیں پہلے خود ان کے ذہن پر سطحیت کا حاوی ہونا اور ان کی سمجھ کا قرآن کی باریکیوں سے کوتاہی اور آیات قرآنی کے اندرونی رازوں سے قاصر ہونا اور دوسرے وہ مشہور حدیث کہ انہوں نے اس کے مقصد کو صحیح طور پر سمجھا نہیں اور ان کے ذہن میں نہیں آیا کہ تفسیر بالرائے کے معنی کیا ہیں۔حالانکہ جناب امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے کہ سوا اس کے کہ اللہ کسی بندہ کو قرآن کی سمجھ عطا کرے تو اگر بس سنے سنائے ترجمہ کا یاد کر لینا ہی ہے تو قرآن فہمی کے معنی کیا ہیں۔

اور حضرتؑ نے فرمایا اگر میں چاہوں تو ستّر اونٹ فاتحۃ الکتاب اور ایک روایت میں فاتحہ کی تفسیر سے بھر دوں حالانکہ ظاہری مفہوم کی سورۂ حمد کی تفسیر انتہائی مختصر ہے۔

رہ گیا یہ ارشاد کہ جو قرآن کی اپنی رائے سے تفسیر کرے اور اس کی ممانعت تو اسے دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پر محمول ہونا چاہئے ایک یہ کہ کسی معاملہ میں اس کی ایک رائے ہے اور اس کی طبیعت کا رجحان ہو چکا ہے تو وہ قرآن کی تاویل اس طرح کرتا ہے جو اس کی رائے کے موافق ہو اس طرح وہ تفسیر اپنی رائے کے سبب سے کر رہا ہے یعنی اس کی رائے اس تفسیر کی محرّک ہوئی ہے اور اس کی رائے نہ ہوتی تو یہ پہلو اس کی نظر میں مرجح نہ ہوتا دوسرے یہ کہ صرف عرب دانی کے سہارے سے وہ تفسیر قرآن جھٹ پٹ کر دیتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے حل طلب الفاظ کی تشریح اور مبہم کلمات کی توضیح میں نیز جو اس میں حذف یا اضمار یا تقدم و تاخر یا اختصار ہے ان سب میں اور باخبر علمائے سلف کے تشریحات پر بالکل نظر نہ کرے اور سوا صاحبانِ معرفت کے اکثر مفسرین اس خطرہ سے دوچار رہتے ہیں۔

دوسری طرف اہلسنت میں سے علامہ نیشاپوری رقمطراز ہیں:

ذکر العلماء ان النھی عن تفسیر القرآن بالرایے لا یخلو امان یکون المراد بہ الاقتصار علی المنقول والمسموع وترک الاستنباط او المراد بہ امر اخر و باطل ان یکون المراد بہ ان لا یتکلّم احد فی القرآن الا بما سمعہ فان الصحابۃ قد فسّروا القرآن واختلفوا فی تفسیرہ علیٰ وجوہ ولیس کل ما قالوہ سمعوہ کیف وقد دعا النبیﷺ لابن عباس اَللّٰھُمَّ فَقِّھْھُمْ فی الدّین وعلمہ التاویل فان کان التاویل مسموعا کالتنزیل فما فائدۃ تخصیصہ بذالک وانّما النّھی یحمل علیٰ وجھین احدھما ان یکون لہ فی الشئ رای والیہ میل من طبعہ وھواہ فَیُاَوّل القرآن علیٰ وفق ھواہ لیحجّ علیٰ تصحیح غرضہ ولولم یکن لہ ذالک الرای والھویٰ لَا یُفْھَمُ لہ من القرآن ذالک المعنی وھٰذا قد یکون مع العلم بان المراد من الایۃ لیس ذالک ولکن یلبس علیٰ خصمہ وقد یکون مع الجھل وذالک اذا کانت الایتہ محتملۃ فمیل فھم الی الوجہ الذی یوافق غرضہ ویرجّ ذالک الجانب برأیہ وھواہ ولولا رایہ لماکان یترجّح عندہ ذالک الوجہ وقد یکون لہ غرض صحیح فیطلب لہ دلیلا من القرآن ویستدل علیہ بما یعلم انہ ما ارید بہ کمن یدعوا الی مجاھدۃ القلب القاسی فیقول المراد بفرعون فی قولہ تعالیٰ اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی ھو النفس الوجہ الثانی ان یتسارع الی تفسیر القرآن بظاھر العربیۃ من غیر

استظها ر بالسماع والنقل فیما یتعلق بغریب القرآن و ما فیه من الالفاظ المبهمة والاختصار والحذف والاضمار والتقدیم والتّا خیر فالنقل والسماع لا بدّ منه فی ظاهر التفسیر اولا لیتقی به مواضع الخلط ثم بعد ذالك یتبع التفهیم والا ستنباط وما عدا هٰذین الوجهین فلا یتطرق النهی الیه ما دام علی قوانین العلوم العربیّة والقواعد الاصلیة والفرعیّة.

علماء نے کہا ہے کہ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے یا تو یہ مقصود ہے کہ صرف سابق سے سنے جاتے ہوئے تشریحات پر اکتفاء کرے اور اپنی ذہنی صلاحیتوں سے حقیقت کے سمجھنے میں بالکل کام نہ لے یا اس سے مقصود کچھ اور ہے؟ وہ تصور بالکل غلط ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص قرآن کے بارے میں کوئی بات نہ کہے سوا اس کے جو اس کے کانوں تک پہنچ چکا ہے اس لئے کہ صحابہ نے قرآن کی تفسیر بیان کی ہے اور ان میں تفسیر میں اختلاف اقوال بھی نظر آتا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ جو بھی انہوں نے زبان سے کہا ہے وہ ان کے گوش زدہی ہوا ہو اور یہ کیوں کر ہوسکتا ہے جبکہ حضرت پیغمبر ؐخدا نے ابن عباس کے لئے دعا کی کہ خداوندا اسے دین کے بارے میں سمجھ اور اسے تاویل کا علم عطا کر۔ اب اگر تاویل بھی مثل تنزیل کے سننے سے وابستہ ہوتی تو علم تاویل کی دعا کو ان سے مخصوص کرنے کا فائدہ کیا ہوگا لہٰذا ممانعت کو دو میں سے کسی ایک پہلو پر محمول کرنا چاہیے ایک یہ کہ اس کی کسی معاملہ میں کوئی رائے ہو اور اس کی طبیعت کا رجحان ہو تو وہ قرآن کی تاویل اپنی خواہش کے موافق تراشے تاکہ اپنی مطلب برآری کے لئے قرآن سے استدلال کرسکے اور اگر اس کا یہ رجحان طبع نہ ہوتا تو یہ معنی الفاظ قرآن سے اس کے ذہن میں نہ آتے اور یہ کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ اس شخص کو خود معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا یہ مقصد نہیں ہے لیکن وہ اپنے مدمقابل کو دھوکا دینا چاہتا ہے اور کبھی ناواقفیت کی صورت سے ہوتا ہے اور یہ اس وقت کہ جب آیت میں احتمال اس مفہوم کا ہوتا ہے تو اس کے ذہن کا رجحان اسی پہلو کی طرف ہوجاتا ہے جو اس کے مطلب کے موافق ہے اور اس پہلو کو اس کی رائے اور خواہش کی وجہ سے ترجیح ہوجاتی ہے اور اگر اس کی یہ رائے نہ ہوتی تو اس کے ذہن میں اس رائے کو ترجیح نہ ہوتی اور کبھی اس کی غرض کوئی صحیح ہوتی ہے اور اس کے لئے قرآن سے دلیل تلاش کرتا ہے اور اس پر استدلال کرتا ہے ایسی آیت سے جس کے متعلق اسے معلوم ہے کہ یہ اس کا مطلب نہیں ہے جیسے کوئی نفس امارہ کے مقابلہ کی دعوت دینا چاہتا ہو اور کہے کہ اس آیت میں کہ ”فرعون کی طرف جاؤ اس نے بڑی سرکشی اختیار کر رکھی ہے“ فرعون سے مراد نفس امارہ ہے دوسری صورت یہ ہے کہ تفسیر قرآن میں بس عربی زبان کے پہلو کو سامنے رکھ کر جلد بازی سے کام لے۔ اور لغات قرآنی کے حل اور مبہم الفاظ کی تشریح اور جہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے اور کچھ اجزاء محذوف ہیں اور ضمیروں کی تعیین اور مقدم اور موخر کی تمیز میں علمائے سلف کے کلمات پر بالکل نظر نہ کرے یہ درست نہیں ہے کیوں کہ سب سے پہلے اب تک کے مفسرین کے کلمات کو دیکھنے کی ضرورت ہے تاکہ غلطیوں سے بچ سکے پھر اس کے بعد ذہانت اور فکر و استنباط کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور ان دونوں صورتوں کے علاوہ عقل وفہم سے تفسیر کرنے کی ممانعت نہیں ہے جب تک کہ وہ عربی ادب کے قاعدوں کے موافق اور اصولی وفروعی طور پر ثابت شدہ ضوابط کے مطابق رہے۔

ہوسکتا ہے کہ جو اصول پیش کیا گیا ہے اس معیار کے مطابق خود علامہ صدرالدین شیرازی کی تفسیر اکثر مقامات پر حدود سے متجاوز ہو اور اس لئے ہم اسے تفسیر بالرائے میں داخل سمجھیں اور علامہ نیشاپوری نے جو اقوال صحابہ کا حوالہ دیا ہے چوں کہ صحابہ معصوم نہیں ہیں اور ہم ان کے اقوال کو حجت شرعیہ نہیں سمجھتے اس لئے ممکن ہے خود ان کے بعض اقوال ہمارے نزدیک تفسیر بالرائے کا مصداق ہوں لیکن اصولی طور پر دونوں مختلف المسلک عالموں نے تقریباً متفق علیہ طور پر جو تفسیر بالرائے کا مفہوم قرار دیا ہے وہ تقریباً ناقابل اختلاف ہے اور اس لئے متاخرین علمائے محققین

میں جناب شیخ مرتضیٰ انصاری نے بھی رسائل میں تفسیر بالرائے کا مطلب یہی قرار دیا ہے۔

محکم اور متشابہہ

قرآن مجید نے خود آیات قرآنی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَيۡغٌ فَيَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِيۡلِهٖ ‌ۚ وَمَا يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ‌ؔ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِى الۡعِلۡمِ (آل عمران۔۷)

اس میں کچھ تو محکم آیتیں ہیں جو اس کتاب میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں اور کچھ متشابہہ ہیں تو وہ جن کے دلوں میں کجی ہے متشابہہ آیتوں کے درپے رہتے ہیں تا کہ فتنہ پردازی کریں اور طرح طرح کی تاویلیں تراشیں حالانکہ اس حصہ کی حقیقی تاویل سے سوا اللہ اور راسخون فی العلم کے کوئی واقف نہیں ہے

یہ تفریق اسی لحاظ سے ہے کہ بعض آیات وہ ہیں جن کے ظاہری معنی لغت عرب اور عام زبان دانی کے اصول اور محاورات کے مطالعہ سے سمجھ میں آجاتے ہیں ان کے سمجھنے اور اتباع کرنے کا ہر شخص کو حق دیا گیا ہے اور ان معانی کا سمجھنا ان سے نتائج کا پیدا کرنا اور ان کے مصداق کا تلاش کرنا تفسیر بالرائے نہیں ہے اور انہی ظاہری معنی کو تنزیل قرآن کہا جاتا ہے اور کچھ مجمل و مبہم الفاظ ہیں جن کے معانی لغت اور محاورات سے متعین نہیں ہوتے جیسے: مقطعات: الٓر، الٓمّٓ، حٰمٓ عٓسٓقٓ وغیرہ یا جو لغوی معنی ہیں وہ عقلاً مراد نہیں ہو سکتے اور اس کے علاوہ کوئی ظاہری مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے معانی رموز و اشارات کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِىۡ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ اور دَنٰى فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوۡسَيۡنِ اَوۡ اَدۡنٰى وغیرہ

ان کے اصلی مفہوم کا حتم و جزم کے ساتھ متعین کرنا راسخون فی العلم کے سوا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

جن آیات کا لغوی حیثیت سے کوئی ظاہری مفہوم ہے اور کوئی قرینہ انکے خلاف نہیں ہے ان میں بھی بطور رمز و اشارہ کوئی باطنی معنی ہو سکتے ہیں بلکہ بعض احادیث میں ہے کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہوتا ہے اور باطن میں بھی باطن یہاں تک کہ بات ستر باطنون تک پہونچتی ہے۔

مذاقِ تصوف رکھنے والے طبقہ نے جو ایران میں عرفاء کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں ان احادیث کی بناء پر باطنی معنی نکالنے میں بڑی طبیعت کے جولانیاں دکھائی ہیں جن میں محی الدین ابن عربی سرخیل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ملا محسن فیض کا شانی کی تفسیر صافی کسی حد تک اس رجحان کی حامل ہے اور تفسیر نیشاپوری میں تقریباً ہر آیت میں پہلے ظاہری معنی کے مطابق تفسیر لکھی گئی ہے اور پھر باطنی طور پر تفسیر میں اشہب قلم کو رواں کیا ہے اور ایک فرقہ نے تو اہل مذاہب میں سے اس پہلو کو اتنا مرکزی نقطہ نظر بنایا کہ اس کا نام فرقہ باطنیہ ہو گیا۔ بوہرہ اور آغا خانی اسمٰعیلی جماعتیں اسی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں ان میں بھی ایک حلقہ ایسا ہے جو باطن کے ساتھ ظاہر کو نظر انداز نہیں کرتا ان سے کسی حد تک ہمیں بھی اتفاق ہو سکتا ہے لیکن دوسرا گروہ ہے جو باطن کو لے کر ظاہر کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے ان سے کسی بھی منزل میں اتفاق ہونا تقریباً ناممکن ہے۔

ایسے آیات قرآن مجید کہ جن کا ظاہری مفہوم لغت کے اصل موضوع کا معنی کے لحاظ سے مراد ہونا عقلاً غیر ممکن ہے ان میں انتہا پسندانہ نقطہ یہ ہے کہ عقل کو صدائے فریاد بلند کرنے دو تم وہی معنی مانو جو بتقاضائے لغت قرآن و حدیث سے سمجھ میں آتے ہوں اس سے اسلام میں فرقہ مجسمہ کا وجود ہوا جس نے "اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰى" کی بناء پر اللہ کو جسمانی طور پر عرش پر بیٹھنے والا اور يَدَاهُ مَبۡسُوۡطَتَانِ وغیرہ کی

بناء پر اعضاء و جوارح پر مشتمل بیان کیا اور نجدی وہابی جماعت کے پیشوائے اعظم ابن تیمیہ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ دوسرے اہل سنت جو مجسمہ ہونے سے بچنا چاہتے ہیں اکثر ان آیات و احادیث کو ظاہری معنی پر قرار رکھتے ہوئے "بِلَاکَیْفَہٗ" کے قائل میں یعنی ان کا تصور یہ ہے کہ استوٰی کے معنی بیٹھنے ہی کے لو مگر بیٹھنے کی کیفیت کیا ہے؟ اسے کہو کہ ہم سمجھ نہیں سکتے یں کے معنی ہاتھ ہی کے کہو مگر ہاتھ اس کے کس طرح ہیں؟ اسے نہ سوچو۔ اس طرح وہ بخیال خود تجسیم سے محفوظ رہتے ہیں چنانچہ روایت کے بھی وہ آنکھوں سے دیکھنے ہی کے معنی میں قائل ہیں پھر بھی کہتے ہیں کہ اس سے جسم ہونا لازم نہیں آتا اور اس لئے باوجودیکہ یہ بات ہمارے نزدیک خلاف عقل ہے اور روایت بلا شبہ مستلزم تجسیم ہے پھر بھی ہم عام طور پر اہلسنت کو مجسمہ نہیں کہہ سکتے اس اصول کی بناء پر کہ لازم مذہب مذہب نہیں ہے۔

اس کے برخلاف دوسرے سرے پر نقطہ نظر فلاسفہ و حکماء کا ہے جو ایسی تمام چیزوں کو جن کی نوعیت کا سمجھنا ہماری عقل کے احاطہ سے خارج ہے صرف تخئیل و تمثیل پر مبنی قرار دیتے ہیں یہاں تک کہ نعیم جنت اور عذاب دوزخ کے تذکروں کو بھی مثالی حیثیت دیدیتے ہیں۔

یہ نقطہ نظر اس لئے نا قابل قبول ہے کہ اس طرح کسی بھی واقعہ کے اظہار کا دروازہ بند ہو جائے گا کیوں کہ ہر متکلم کے الفاظ میں یہ پہلو پیدا کیا جا سکتا ہے کہ یہ صرف محاکات کی حیثیت رکھتے ہیں تو پھر کسی واقعہ کو اگر سچ مچ بیان کرنا ہو تو الفاظ کہاں سے آئیں؟

صحیح نقطہ نظر جو اعتدال کا نقطہ ہے یہ ہے کہ جب الفاظ کے ظاہری معنی ایسے ہوں کہ کوئی قرینہ لفظی و عقلی ان کے خلاف نہیں ہے تو اس لفظ کا مطلب وہی لینا چاہئے جو لغت و عرف کے لحاظ سے ان الفاظ سے سمجھ میں آتے ہیں لیکن اگر اصلی معنی لفظ کے ایسے ہوں جو عقلاً ممکن نہیں ہیں لیکن محاورات عرفی کے لحاظ سے کوئی قریب ترین مجازی معنی الفاظ کے موجود ہیں جو عقلاً بھی درست ہو سکتے ہیں۔ تو اس لفظ کو ایسے معنی پر محمول کرنا بھی بلا تکلف صحیح ہے جیسے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی کا مفہوم بجائے تمکن جسمانی کے جو عقلاً غیر ممکن ہے غلبہ و استیلا بحیثیت قدرت کے معنی میں اور یَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ کے معنی جسمانی ہاتھوں کے بجائے جو عقلاً خدا کے لئے نہیں ہو سکتے اقتدار و اختیار کے معنی میں لینا جو عرف عام کے بالکل مطابق ہیں اس صورت میں بھی الفاظ قرآن کو مجمل نہیں سمجھا جا سکتا اور توقف یا تحیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر ایسے کوئی عرفی معنی اس لفظ کے موجود ہی نہ ہوں اور ان کا مفہوم صرف اشارات و کنایات ہی کے طور پر ذہن سے نکالا جا سکتا ہے جو مختلف ذہنی پیمانوں کے لحاظ سے مختلف ہو سکتا ہے تو یہ وہ متشابہات ہوں گے جن کے اصل معنی کو راسخون فی العلم کے حوالے کرنا چاہئے اور ان میں ذہانت سے کچھ پہلو سمجھ میں آئے تو اسے بطور احتمال امکانی طور پر کہنا درست ہے لیکن حتم و جزم کے ساتھ کچھ کہنے کی جراءت نہ کرنا چاہئے۔

تعجب ہے کہ علامہ صدر الدین شیرازی جو دور آخر میں فلاسفہ و اہل معقول کی صف اول میں ہیں اگرچہ نتیجہ وہ بھی متشابہات میں اسی مسلک سے متفق معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ اس ظاہر پرستی سے بہت حد تک راضی نظر آتے ہیں جسے اللہ کی تجسیم ایسے کفر عظیم کا تصور پیدا ہوا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے ممکن ہے اپنی تفسیر میں خود ان کا قلم اس جادہ سے کسی ایک یا بہت جگہ ہٹ گیا ہو مگر اصولاً وہ ہمارے بیان کردہ نقطہ اعتدال کو پیش کرتے ہوئے بھی ظاہری مفاہیم کو باقی رکھنے کے شدت کے ساتھ حامی معلوم ہوتے ہیں۔

جسے اپنی کتاب مفاتیح الغیب صفحہ ۲۴، ۲۵ (مطبوعہ ایران) میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

سابق اور حال تبصرہ کے بیانات کی رُو سے غور و فکر کرنے کے بعد حسب ذیل نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید کا ترجمہ ظاہری معنی الفاظ کے تحت اللفظی معنی کہنے کا حق ہر واقف زبان عربی کو ہے جسے عربی الفاظ کے معانی پر اتنا عبور

حاصل ہو کہ وہ لغت کی مدد سے سہی ہر لفظ کے معنی سمجھ سکتا ہو اور قرائن مقام کی مدد سے مشترک الفاظ کے متعدّد معانی میں سے کسی ایک معنی کی تعیین کر سکتا ہو لیکن ایسے اشخاص کا ترجمہ قرآن کے لئے کھڑا ہونا جو عربی کے محاورات سے اس طرح واقف نہیں ہیں خود غلطی میں مبتلا ہونا اور دنیا کو گمراہی میں ڈالنا ہے افسوس ہے کہ عموماً تراجم قرآن جو رائج ہیں ان میں متعدد ایسے ہی اشخاص کے قلم سے ہیں اور اس لئے ان کا ضرر نفع سے زیادہ ہے۔

(۲) قرآن مجید کے معانی و مطالب میں جہاں تک ظواہر قرآن کے دائرہ کے اندر ہیں ہر شخص کو غور و فکر کرنے کا حق اور نتائج نکالنے کی گنجائش ہے اور قرآنی آیات سے ان کے ظواہر معانی کی بناء پر استدلال بھی ہر شخص کے لئے صحیح ہے بشرطیکہ اس میں اصول محاورہ و تکلم کا لحاظ رکھا جائے اس کے علاوہ عام و خاص مطلق و مقید منسوخ و ناسخ اور مجمل و مبین کا لحاظ بھی ضروری ہے بغیر اس کے تفسیر لکھنے کا حق نہیں ہے۔

(۳) قرآن کے مضامین پر غور و فکر کرنے سے جو رموز و اسرار پیدا ہوں علمی نکات برآمد ہوں، فلسفی انکشافات کا پتہ چلے اور ادبی محاسن کا اندازہ ہو، انہیں سمجھنا اور ان کا نمایاں کرنا مستحسن خدمت ہے جس کے مقبول ہونے کے لئے معانی و مطالب کو بیان شدہ معیار پر سمجھنے کے ساتھ ذوق سلیم قوت نظر اور ایک حد تک ذہانت و ذکاوت کی ضرورت ہے ہاں اس قسم کی نکتہ پردازی و موشگافی بارگاہ تفسیر میں اسی وقت مقبول ہو سکے گی جب اس علمی نکتہ رمز یا انکشاف کے ثابت کرنے کے لئے اصل معنی قرآن میں کوئی تغیر کرنے کی ضرورت نہ پڑی ہو اور اس کے انہی معانی سے کہ جن کرنے کا معیار ابھی بیان ہو چکا ہے، وہ نکات و رموز پیدا ہوئے ہوں۔

(۴) قرآن مجید کے اصلی معانی و مطالب کو محفوظ رکھنے کے ساتھ ان کے مصداق صحیح کا پتہ لگانے میں اگر تاریخی جغرافیائی یا سائنس کے معلومات اور جدید انکشافات سے مدون رہی ہو تو ان معلومات سے مدد لے کر قرآنی آیت کے صحیح مصداق کا پتہ چلانا کوئی نامناسب امر نہیں ہے۔

(۵) 'مُتَشَابِهَات'، یعنی ایسے آیات میں جن کے ظاہری معنی نمایاں طور پر متعین نہیں ہیں عقل سے کام لے کر اشارات و رموز تجویز کرنے کا بطور حتم و جزم سوا 'راسخون فی العلم' کے کسی کو حق نہیں ہو سکتا۔

بے شک اگر عقل پر زور دے کر کچھ اشارات بطور امکان و احتمال پیدا کئے جائیں تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا بلکہ اس کا دروازہ اس وقت بھی بند نہیں ہوگا کہ جب کسی حدیث نے کسی رمز و اشارہ کی تشریح کر دی ہو۔ اس لئے کہ ایک خاص اشارہ کی تشریح ہو جانے سے انحصار ثابت نہیں ہوتا جب کہ خود احادیث سے ثابت ہے کہ بواطن قرآن میں کثرت ہوتی ہے لہٰذا یہ امر غیر ممکن نہیں ہے کہ اور پہلو بھی پائے جاتے ہوں جن کا احتمالی طور پر ذاتی غور و فکر سے استخراج کیا جا سکے۔

(۶) وہ آیات جن کے اصلی معنی جو باعتبار لغت ہیں' قرینہ عقلی یقینی کی بناء پر مراد نہیں لئے جا سکتے جیسے الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى يَدُ اللهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ وغیرہ ان میں معنی حقیقی کو ترک کرنے کے بعد اگر اصول محاورہ کے ماتحت کوئی قریبی معنی پائے جاتے ہوں جیسے "ید" کے معنی "ہاتھ" نہ ہونے کے بعد "قدرت و طاقت" تو یہ 'متشابہات' نہ سمجھے جائیں گے ہاں جب ایسے کوئی معنی موجود نہ ہوں تو آیت متشابہات میں سے قرار پائے گی۔ ان میں اگر کوئی بات سمجھ میں آئے تو اس کا بطور احتمال ظاہر کرنا درست ہے۔ وثوق کے ساتھ بغیر راسخون فی العلم کی سند کے کچھ کہنا صحیح نہیں ہے۔

(۷) وہ الفاظ جن کے ظاہری معانی موجود ہیں ان میں بطور رمز و اشارہ کوئی معنی احتمالی طور پر بتائے جا سکتے ہیں لیکن حتم و جزم کے ساتھ نہیں ۔۔ اس لئے کہ تاویل آیات کی راسخون کا حصہ ہے۔

(۸) کسی تاویل کے احادیث میں وارد ہونے کے بعد بھی الفاظ قرآنی کے جو اصلی معنی باعتبار لغت ہیں وہ نظر انداز نہیں ہوں گے بلکہ اعتقاد وعمل جس سے بھی ان کا تعلق ہے اس کا ان کے مواقف برقرار رکھنا ضروری ہوگا۔

یہی بہت بڑا فرق ہے معنی مجازی میں کہ جو لفظ کے اصلی معنی کو چھوڑ کر مراد ہوتے ہیں اور معنی رمزی میں کہ جو بطور اشارہ مقصود ہوتے ہیں پہلی صورت میں اصلی معنی کا نظر انداز کرنا ضروری ہوتا ہے جیسے "استوٰی" کے معنی تمکین جسمانی کے اور "یدٌ" کے معنی جسمانی ہاتھ کے لیکن دوسری صورت میں اصلی معنی بھی محفوظ رہتے ہیں اور ان کی پابندی لازم ہوتی ہے۔

اسے اپنے روزمرہ کے محاورات پر نظر کر کے سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً: ایک شخص نے کہا کہ "فلاں محفل میں جو گیا" دیکھا شیر بیٹھا ہے، محفل کا ذکر کرنا قرینہ ہے اس کا کہ شیر سے کوئی بارعب و ہیبت انسان مراد ہے اصلی شیر نہیں ہے اب اگر اس متکلم نے کسی دن یہ کہا کہ میں نے سب جانور دیکھے شیر آج تک نہیں دیکھا، تو اس پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ تم نے ابھی اس دن کہا تھا کہ میں نے شیر دیکھا۔ اس لئے کہ اس دن شیر سے مراد بقرینہ جب شیر صفت انسان قرار ابھی دیا گیا تو اس کا تعلق اس جانور سے نہیں رہا جس کا نام شیر ہے۔ اس لئے وہ ثبوت اور نفی کے خلاف نہیں ہے جو اس کے کلام میں ہے۔

اس کے برخلاف دوسرا جملہ ملاحظہ: ایک شخص کسی ایسے انسان پر تعرض کرتے ہوئے جس کی آنکھوں میں بصارت کم ہے یہ کہے کہ خدا کے فضل سے میری آنکھوں میں بصارت کم نہیں ہے۔

اس سے کہنا تو مقصود یہی ہے کہ اس دوسرے شخص کی آنکھوں میں بصارت کی کمی ہے لیکن اس کی بناء پر وہ خود اپنے الفاظ سے غیر متعلق نہیں ہو سکتا یعنی اس کا یہ کہنا جب ہی درست ہوگا۔ جب واقعی خود اس کی آنکھوں میں بصارت کی کمی نہ ہو لیکن اگر تھوڑی دیر میں اس نے خود ضعفِ بصارت کی شکایت کی تو اس کا وہ کلام لغو اور مہمل ہو جائے گا اس کی وجہ یہی ہے کہ تعرض واشارہ کی صورت میں اصل معنی نظر انداز نہیں ہوتے بلکہ ان کے محفوظ رہتے ہوئے اشارہ کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔

قرآن میں ان دونوں کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) احادیث میں بتایا گیا ہے کہ قرآن میں بہت باتیں إِيَّاكَ اَعْنِيْ وَاسْمَعِيْ يَا جَارَة کے طور پر کہی گئی ہیں یعنی خطاب کسی سے ہے اور مقصود کسی اور کو سنانا ہے۔

جیسے یہ آیت:

لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ.(زمر ۔ ۶۵)

اگر آپ شرکت اختیار کیجئے تو آپ کے تمام اعمال رائیگاں ہو جائیں گے اور آپ گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوں گے۔

یہ تنبیہہ حقیقۃً رسول سے متعلق نہیں ہے بلکہ دوسرے اشخاص سے متعلق ہے جسے رسول پر رکھ کے وارد کیا گیا ہے اب کوئی شخص استدلال کرنا چاہئے یا اعتراض کرے کہ کلمہ "ان" عربی میں محتمل الوقوع بات کے لئے آتا ہے رسول سے کہنا کہ لئن اشرکت پتہ دیتا ہے کہ آپ سے معاذ اللہ شرکت کے وقوع کا احتمال تھا اور یہ آپ کی عصمت کے خلاف ہے تو یہ استدلال یا اعتراض درست نہ ہوگا۔ اس لئے یہ خطاب جب دوسروں کی تنبیہہ کے لئے ہو گیا تو اس کے نتیجہ کا تعلق رسولؐ کے ساتھ باقی ہی نہیں رہا بلکہ دوسروں سے ہو گیا۔

(۲) قرآن میں بہت جگہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ یا اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وغیرہ ہے جس کے معنی ادائے نماز کے ہیں اگر بعض روایات میں یہ نظر سے گزرے کہ اقامہ صلوٰۃ سے اشارہ ہے ولایت کے عقیدہ کی طرف جو سبب درستی عبادات ہے تو بلاشبہہ یہ اشارہ اپنی جگہ درست ہوگا لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ یہ آیت وجوب نماز کی دلیل ہی نہ رہے اور کہا جائے کہ اس سے تو'' ولایت ائمہ معصومین'' مراد ہوگئی۔ اب اس کو نماز سے کیا تعلق یہ مغالطہ ہوگا جس کا واقعیت سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس آیت میں یقیناً نماز کا حکم ہے اور اشارہ وجوب ولایت کی طرف بھی ہوسکتا ہے۔

یہاں یہ نہیں ہے کہ پہلے معنی نظرانداز ہوگئے اور اب بطور استعمال لفظی دوسرے معنی مراد ہوں۔

تاویل آیات کی مختلف اقسام

آیات قرآن کی تفسیر و تاویل جو احادیث میں مذکور ہوتی ہے اس کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں جن میں اکثر اشخاص کو اشتباہ ہوتا ہے اور اس لئے نتائج کے اخذ کرنے میں دھوکا کھاتے ہیں۔

(۱) بعض احادیث ایسی ہوئی ہیں کہ ان میں کسی آیت کے شان نزول اور مورد ورود کی تعین کی جاتی ہے کہ یہ آیت کس موقع پر اتری تھی اس قسم کی احادیث سے ان آیت کے عموم پر جب کہ الفاظ عام ہوں کوئی اثر نہیں پڑسکتا بے شک اگر الفاظ آیت ہی کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کر رہے ہوں ان میں خود ہی عموم پایا نہ جاتا ہو تو حدیث اس وقت میں اس تاریخی انکشاف کی حیثیت رکھتی ہوگی کہ یہ شخص خاص کون تھا جس کے بارے میں یہ آیت اتری ہے دونوں قسموں کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا يَسْتَوٗنَ. (السجدہ۔۱۸)

کیا جو مومن ہو وہ مثل اس کے ہے کہ جو فاسق ہو۔؟ نہیں یہ سب برابر نہیں ہیں۔

احادیث سے ثابت ہے کہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ سے ولید بن عقبہ نے بحث کی اور اپنی بلندی جتائی۔ اس پر یہ آیت اتری جس میں مومن سے مراد حضرت علیؑ اور فاسق سے مراد ولید بن عقبہ ہے۔ لیکن اس خصوصیت کے معلوم ہونے کے بعد بھی الفاظ آیت سے جو کلیہ سمجھ میں آتا ہے کہ مومن اور فاسق عزت و احترام اور حقوق میں مساوی نہیں سمجھے جاسکتے اپنی جگہ قائم ہے۔

اس ولید کے بارے میں دوسری آیت جو قرآن میں ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا.

اے ایمان لانے والو! اگر فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کرلیا کرو (حجرات ۶)

یہ بھی محل آیت کے خاص ہونے کے باوجود حکم عام کی حامل ہے کہ فاسق کی خبر کو معتبر نہیں سمجھنا چاہیے۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ (بقرۃ۔۱۸۷)

جائز ہے تمہارے لئے شب ماہ صیام مقاربت کرنا اپنی عورتوں کے ساتھ وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے خدا کو معلوم ہے کہ تم خیانت کیا کرتے تھے اب اللہ نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں معاف کردیا

اس آیت میں پہلا جزء پہلی قسم سے تعلق رکھتا ہے اس میں عموم ہے اگرچہ مورد نزول معیّناً شخاص سے متعلق تھا لیکن حکم عمومی حیثیت رکھتا

ہے۔لہٰذا ہمیشہ کے لئے قائم ہے۔دوسرا جزء کہ ''خدا کو معلوم ہے کہ تم خیانت کرتے رہے ہو، مگر خدا تم کو معاف کرتا ہے''۔یہ بیان واقعہ ماضی کی حیثیت رکھتا ہے جو مخصوص افراد سے متعلق ہے جن کے اسماء روایات میں درج ہیں اس سے کوئی عمومی کلیہ نہیں برآمد ہوتا جسے مجرمین اپنے لئے گزشتہ جرائم کے عفو کا پروانہ قرار دیں۔

اس قسم میں کبھی الفاظ عام ہوتے ہوئے بھی قرینہ مقام اور سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خاص اشخاص سے متعلق ہے اور ان میں کسی حکم عام کا اعلان نہیں ہے۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ. (مائدہ۔۵۵)

تمہارا حاکم اللہ ہے اور اس کا پیغمبر اور وہ ایمان والے جو نماز قائم رکھتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اس حالت میں کہ وہ رکوع میں ہیں۔

یہاں ایسا ہی ہے کہ الفاظ کے عام ہوتے ہوئے سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ یہ ایک خاص منصب کا اعلان ہے جس میں نام کے بجائے تعارف شخصیت کے طور پر یہ اوصاف لائے گئے ہیں۔

لیکن بعض مقامات پر احادیث کسی وسیع عنوان کی فرد اکمل کا پتہ دیتے ہیں یہ آیات پہلی ہی قسم میں داخل ہوں گے یعنی وہ اپنے عموم پر باقی رہیں گے اور ان میں فرد کے ساتھ اختصاص پیدا نہ ہوگا جیسے بعض روایات میں ہے کہ جہاں جہاں قرآن مجید میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ ہیں، اس سے مقصود ائمہ معصومینؑ ہیں اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ حضرات اس مفہوم کے مصداق اتم و اکمل ہیں لیکن اس سے بعض گمراہ اشخاص کا یہ گمراہ کن نتیجہ نکالنا کہ جو جو احکام اس عنوان سے مخاطب کر کے کہے گئے ہیں وہ تمام احکام ائمہ سے مخصوص تھے اور ان کا تعلق ہم سے نہیں ہے بالکل غلط ہے اس کے لئے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کی لفظ کے استعمال کو اس مقام پر دیکھنا چاہئے جہاں بعد والا حکم ائمہ سے متعلق ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ. (نساء۔۵۹)

اے ایمان والا اللہ کی اطاعت کرو اور پیغمبرؐ کی اطاعت کرو اور صاحبان امر کی جو تم میں سے ہیں

یہاں اگر يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا کو ائمہ سے مخصوص کر دیا گیا تو ہو اولی الامر کون ہوں گے جن کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا ہے ایک آیت اس طرح ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ. (نساء۔۱۳۶)

اے ایمان لانے والوں ایمان اختیار کرو اللہ اور اس کے پیغمبرؐ پر۔

یہاں ماننا پڑے گا کہ پہلے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا سے مراد اقرارا یمان کرنے والے ہیں اور مطالبہ ان سے یہ ہے کہ وہ دل سے واقعی ایمان اختیار کریں اور ایسی ہی متعدد آیتیں قرآن مجید میں ہیں جن سے معصومینؑ کا مراد لیا جانا ان کی شان بلند کے خلاف ہے۔

اور اسی سے بہت سے ان روایات کے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے جن کے متعدد آیات میں احکام کا تعلق خاص ذات سے نہیں ہے لیکن ان روایات میں یہ ہے کہ یہ آیات شان امیر المومنینؑ میں ہیں۔

علامہ صدر الدین شیرازی فرماتے ہیں:

ومن ھٰذا القبیل ما یروی من الائمۃؑان الصراط المستقیم ھُوا میر المومنین ؑ والنَّبَاِالْعَظِیْمِ الَّذِیْ ھُمْ فِیْہِ مُخْتَلِفُوْنَ امیر المومنین وان اِنَّہٗ فِیْٓ اُمِّ الْکِتٰبِ لدینا لعلی حکیم ھو علی بن ابیطالب وان قولہ تعالیٰ وبِئْرٍ معطلۃوقصر مشید ، الاول ھو الامام الصامت والثانی ھو الا مام الناطق وامثال ذٰلك فی اٰیت کثیرۃ.(شرح اصول کافی طبع ایران ۔ص ۴۰۳)

اسی طرح کی وہ روایتیں ہیں جوائمہ معصومینؑ سے وارد ہوئی ہیں کہ صراط مستقیم جناب امیرالمومنینؑ ہیں اور نباء عظیم (بڑی خبر) جس میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں حضرت امیرالمومنینؑ ہیں اور یہ کہ انہ فی الکتب والی آیت میں علی حکم سے مراد حضرت علی بن ابی طالبؑ ہیں اور یہ آیت جس کے معنی ہیں ''بندکنواں'' اور'' مضبوط محل'' اس میں پہلے سے مراد وہ امام جو زبان کھول سکے اور اس طرح کا مضمون بہت سی آیتوں میں ہے۔

اسی سے ان روایت کا مطلب بھی واضح ہوتا ہے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ ثلث قرآن شان امیرالمومنینؑ میں نازل ہوا۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ جہاں جہاں بھی کوئی صفت مدح قرآن مجید میں ہے اس کے مفہوم کی فرد نمایاں امیرالمومنینؑ ہیں اسی طرح آیات مذمت کا تعلق اعداء اہلبیتؑ کے ساتھ بحیثیت امتیازی افراد مصداق کے ہے چاہے وردو ان کا امم سابقہ کے کفار وفجار کے سلسلہ میں ہوا ہو۔ بے شک بعض احادیث ایسے ہوتے ہیں جن میں کسی عموم آیت میں تخصیص یا اطلاق میں تقیید کی جاتی ہے یہ احادیث اگر بجائے خود شرائط حجیت کے حامل ہوں تو یقیناً عموم یا اطلاق آیت کی تخصیص یا تقیید کا باعث ہوں گے جیسے قرآن میں زوجہ کی میراث بتاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

وَلَھُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَھُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ. (نساء ۱۲)

اوران کے لئے چوتھا حصہ ہے تمہارے متروکہ کا۔ اگر تمہارے لئے اولاد موجود نہ ہو اور اگر تمہارے اولاد ہو تو انہیں آٹھواں حصہ ملے گا۔

اس میں ما ترکتم یعنی متروکہ کا لفظ مطلق ہے جس میں منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد دونوں قسمیں داخل ہیں لیکن جب احادیث معتبرہ سے ثابت ہوجائے کہ زوجہ کو غیر منقولہ میں بالکل یا عین جائیداد میں حصہ نہ ملے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اطلاق آیت میں ایک قید ثابت ہوگئی۔

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ متعدد آیات قرآن سے ملا کر کوئی مطلب نکالا جائے اس کی دونوعتیں ہیں ایک یہ کہ ان دو یا اس سے زیادہ آیتوں میں سے کسی میں کوئی معنوی تصرف نہ کیا جائے بلکہ ہر ایک اپنے اپنے ظاہری معنی پر برقرار رکھی جائے اور پھر بھی آیات کے مجتمع ہونے سے کوئی ایسا مطلب نکل آتا ہے جو ان میں سے کسی ایک آیت میں باعتبار الفاظ مذکور نہ تھا۔ یہ صورت درست ہے اور جو مطلب اس طرح سے پیدا ہو یقیناً قابل اعتبار ہے

مثال: قرآن مجید میں ایک جگہ مدت رضاع یعنی بچوں کو دودھ پلانے کی میعاد مقرر کی گئی ہے دو برس

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ. (بقرۃ۔ ۲۳۳)

ماؤں کا حق ہے کہ وہ اپنے بچوں کو دو برس تک دودھ پلائیں۔

دوسری جگہ حمل اور رضاعت کی مجموعی مدت کم از کم ڈھائی برس بتائی گئی ہے۔

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَھْرًا ۭ (احقاف۔۱۵)

اس کے حمل اور دودھ بڑھائی کی سب مدت تیس مہینے ہے

جب دونوں آیتوں کو ملا دیا جائے اور تیس مہینے کی مجموعی مدت حمل و رضاعت میں سے دوبرس یعنی چوبیس مہینے رضاعت کے منہا کر دیئے جائیں تو حمل کی مدد کے لئے چھ مہینے بچتے ہیں اس سے ثابت ہوا کہ اقل مدت حمل چھ ماہ ہے یہ حکم شریعت قرآن مجید سے مستنبط ہے اگر چہ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں مذکورہ نہیں ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ یہ نتیجہ اجتماعی ظواہر الفاظ پر مبنی نہ ہو بلکہ دو یا اس سے زیادہ آیتوں میں سے کسی ایک آیت میں کسی حدیث نے کوئی تاویلی معنی بتائے ہوں انسان اس تاویل کو لے کر دوسری آیتوں میں بھی جہاں اس طرح کا کوئی لفظ مذکور ہوئی وہی معنی قرار دے لے اور اس سے کوئی خاص نتیجہ نکالے یا کسی مشترک لفظ سے ایک جگہ بقرینہ مقام ایک معنی مراد ہوں تو اب جہاں کہیں وہ لفظ بغیر اس قرینہ کے آئے وہاں بھی وہی معنی قرار دیئے جائیں یا ایک جگہ بطور مجاز کسی معنی میں استعمال ہوا اور دوسری جگہ قرینہ مجاز کے مفقود ہوتے ہوئے بھی اسی معنی پر محمول کرے یہ جوڑ توڑ آیتوں کا ہرگز درست نہیں ہے۔

بے شک یہ صحیح ہے کہ ''القرآن یفسر بعضه بعضًا '' قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت کی تشریح کرتی ہے مگر یہ اسی دائرہ میں ہے جس کا قاعدہ محاورہ و تکلم تقاضا رکھتے ہیں جیسے عام کی تخصیص مطلق کو تقئید اور اضمار کی تعیین۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے عموماً کسی دانش مند متکلم کا ایک وقت کا کلام دوسرے وقت کے کلام کا مبین وشارح قرار پاتا ہے،یہی صورت قرآن مجید میں بھی ہوگی۔ نہ یہ کہ ہر جگہ ایک آیت کا دوسری آیت میں پیوند لگا کر معنی پیدا کر لئے جائیں چاہئے وہ اصول محاورہ کے بالکل خلاف ہوں جیسے ایک جگہ صلوۃ درود کے معنی میں ہے۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلٰٓئِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيماً. (احزاب-۵۶)

یہاں اس فعل کا اسناد اللہ کی طرف اس کا قرینہ ہے کہ نماز مراد نہیں بلکہ رحمت اور اس کی مناسبت سے بعد میں طلب رحمت مراد ہے۔

اب جہاں یہ قرینہ موجود ہو جیسے: إِنَّ اللّٰهَ يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وہاں یہ معنی مراد لئے جائیں گے مگر مخالفین شریعت اب ان آیات کی بناء پر أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ اور يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ اور إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا. اور ایسی ہی بکثرت آیات میں جو صلوٰۃ اور اس سے مشتق الفاظ ہیں ان سب کو درود کے معنی میں قرار دے کر نماز سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیں تو سعی نا مشکور کسی طرح حق بجانب قرار نہیں دی جاسکتی۔

واعظین ومقررین اس طرح کے بہت جوڑ توڑ کیا کرتے ہیں اس میں قدم قدم پر تفسیر بالرائے ہوتی ہے جو سخت ترین گناہ ہے۔

مختصر یہ ہے کہ تفسیر قرآن کا مسئلہ بڑا نازک ہے۔ اس میں وسعت بھی اتنی ہے جو ان تنگ خیال افراد کے تصور سے آگے ہے جو بالکل تابع لفظ رہنا چاہتے ہیں اور ذرا غور وفکر کر کے جو کوئی حکمت اور نکتہ حقیقت قرآن سے نکالا جائے جو سابق کی کتابوں میں مذکور نہ ہوا سے تفسیر بالرائے کہہ دیتے ہیں اور پھر اس میں تنگی بھی بہت ہے جو ان لوگوں کے حدود تخیل سے بہت تنگ ہے جو قرآن مجید کے آیات کی آنکھ بند کر کے اپنے دل سے تفسیر شروع کر دیتے ہیں اور زمین وآسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ ہمیں اس تبصرہ کو اتنے طولانی بنا دینے کی ضرورت پڑی ہم نے اس میں جو اصول قواعد قرار دیئے ہیں انہیں اگر انسان پیش نظر رکھے تو امید ہے کہ وہ نقطہ اعتدال پر قائم رہ کر تدبر فی القرآن کے برکات سے بہرہ مند بھی ہوگا اور تفسیر بالرائے کے عمیق گڑھوں میں گرنے سے محفوظ بھی رہے گا۔

افادات بلاغیؒ

از

مقدمات تفسیر آلاء الرحمٰن

فی

تفسیر القران

جلد اوّل

مبطع "العرفان صیدا

سنہ ۱۳۵۱ھ --- سنہ ۱۹۳۳ء

تمہید

حجۃ الاسلام آیت اللہ شیخ محمد جواد بلاغی طاب ثراہ سامرا کے حوزہ علمیہ کے فارغ التحصیل اور آیت اللہ میرزا محمد تقی شیرازی کے حلقہ درس کے فیضیاب فقہ اور اصول میں بھی اس معیار پر فائز تھے جو ایک بلند پایہ مجتہد کا ہوتا ہے مگر آپ نے خاص طور پر دینی ضرورت کا احساس فرما کر ان علوم دینیہ میں مجاہدانہ طور پر زندگی گزاری جن کی جانب عموماً عراق وایران کے مجتہدین توجہ نہیں فرماتے چنانچہ مادّیین اور نصاریٰ وغیرہ کی رد میں ''الھدیٰ الی دین المصطفیٰ'' اور ''الرحلۃ المدرسیۃ'' اور ''انوار الھدیٰ'' وغیرہ ان کی عظیم الشان کتابیں ہیں آخری عمر میں انہوں نے تفسیر قرآن لکھنا شروع کی تھی جو افسوس ہے کہ عمر کی بیوفائی سے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی وہ شام کے شہر صیدا میں زیر طبع تھی جب میں عراق سے مراجعت کر کے ہندوستان آ گیا۔

میرے ہندوستان آنے کے بعد ممدوح کی تفسیر کی پہلی جلد طبع ہو کر ہندوستان آئی اور مجھ تک پہونچی جس میں آغاز تفسیر کے قبل ۴۸ صفحات میں کچھ اہم مقدمات تمہیدی حیثیت سے درج کئے گئے ہیں۔ جب میں نے تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا تو مستقل جلد مقدمہ تفسیر قرآن کے نام سے لکھی جو ۲۷۲ صفحات پر مشتمل تھی اس میں بنظر افادیت کچھ مضامین سرکار مرحوم کے زیادہ تر ان کے حوالے کے ساتھ درج کر دیئے گئے تھے اسے بعض اہل اغراض نے غلط فہمی پھیلانے کا ذریعہ بنایا۔

اب اس مرتبہ مناسب معلوم ہوا کہ ان مضامین کو اصل کتاب سے خارج کر کے سرکار بلاغی اعلی اللہ مقامہ کے اہم افادات کو آخر میں بطور ضمیمہ شامل کر دیا جائے تاکہ حقیقت مشتبہ بھی نہ ہو اور اس کتاب کے ناظرین موصوف کے گرانقدر افادات سے محروم بھی نہ رہیں۔ والسلام

علی نقی النقوی

(ا)

قرآن مجید کی معجزانہ حیثیت کا ایک خاص پہلو

معجزہ قرآنی کی ایک اہم خصوصیت جو دنیا کے کسی دوسرے معجزہ میں پائی نہیں جاتی یہ ہے کہ اعجاز کے جتنے ارکان ہیں ان سب کو وہ خود اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اور مقدمات وقرائن خارجیہ یا صرف عقل پر منحصر نہیں ہیں۔

دوسرے معجزات کی یہ صورت ہے کہ خارق عادت آنکھوں کے سامنے پیش ہو لیکن اس کے معجزہ ہونے میں جتنی باتوں کی ضرورت ہے وہ خود اس میں مضمر نہیں ہیں۔

وہ ایک خاموش مشاہدہ غیبی ہوتا ہے جو اپنی زبان سے یہ اعلان نہیں کرتا کہ میرا ظاہر کرنے والا مدعی نبوت وغیرہ بھی ہے جو ایک خارق عادت کے معجزہ ہونے کا رکن اعظم ہے اس کے لئے ضرورت ہوگی کہ علیحدہ سے اس شخص کے دعاوی کو دیکھا جائے تاکہ معلوم ہو کہ وہ مدعی کسی منصب کا ہے یا نہیں؟

پھر اس مظاہرہ سے اس استدلال کی بنیاد سمجھ میں نہیں آتی کہ خارق عادت امر کے ظاہر کرنے سے اس کے مظہر اور دعویدار نبوت کی سچائی کیوں کر ثابت ہوتی ہے؟ اس کے لئے پھر عقل کو درمیان میں لانے کی ضرورت ہے کہ وہ دلیل کو ترتیب دے اور بتلائے کہ خارقِ عادت کا ظاہر کرنا کس طرح دعویدار منصب کی سچائی کا ثبوت ہوتا ہے؟

پھر وہ خرق عادت کا مظاہرہ یہ بھی نہیں بتاتا کہ میرا ظاہر کرنے والا اپنی سیرت وکردار کے لحاظ سے کیسا آدمی ہے اور یہ بھی ثبوت اعجاز کا بڑا رکن ہے کیوں کہ اگر مدعی نبوت ایک ایسا شخص ہے جس کا سابقہ زندگی اور افعال واعمال کی گندگی یہ خود اس کے دعوے کے رد کرنے کے لئے کافی ہے تو اس صورت میں وہ لاکھ غیر معمولی کرتب دکھلائے کسی طرح خدا پر ذمہ داری عائد نہ ہوگی اور اسے ان عجیب وغریب مظاہرات کو باطل کرنے کی ضرورت نہ ہوگی لہٰذا خوارق عادات کے ساتھ یہ الگ سے اس مدعی منصب کی سیرت سابق وحال زندگی میں دیکھنے کی ضرورت ہوگی کہ اس کے افعال کیسے ہیں اور وہ اس کو خدا کی طرف سے کسی منصب کے لائق ثابت بھی کرتے ہیں؟

یقیناً وہ تمام معجزات ان تمام اعتبارات سے بالکل گنگ اور خارجی تحقیقات اور عقلی غور وفکر کے دست نگر اور ممنون احسان ہوتے ہیں۔

لیکن یہ قرآن مجید کی خصوصیت ہے کہ وہ معجزہ اور اعجاز کے جتنے ارکان وخصوصیات ہیں وہ سب اسی میں موجود ہیں اور کہیں اس سے علیحدہ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

پہلا امر:

قرآن مجید میں صاف صاف اپنے حامل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعویٰ نبوت ورسالت کا اظہار موجود ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات ذیل:

قُلْ يَآأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعاً. (اعراف۔۱۵۸)

کہیے کہ اے گروہ مردم میں خدا کا رسول ہوں تم سب کی طرف

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى. (نجم ۲ تا ۴)

تمہاری ہدایت کرنے والا شخص نہ تو گمراہ اور نہ سرگشتہ وہ اپنی خواہش دل سے کلام ہی نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس پر اتاری جاتی ہے

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ. (سورۂ فتح۔۲۹)

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں کے مقابلہ میں بڑے سخت ہیں

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّـبِيّٖنَ ۝ (سورۂ احزاب۔۴۰)

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہیں تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ لیکن خدا کے رسول اور فہرست انبیاء کے ختم کرنے والے ہیں۔

دوسرا امر:

اس نے اپنے غیر معمولی درجہ اعجاز کو آپ کی نبوت و رسالت کی دلیل بتلایا اور کہا کہ اگر تم کو ان کی سچائی اور حقانیت میں شک ہو تو اس کے مثل پیش کرو اور اگر ایسا نہ کر سکو فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ تو سمجھ لو کہ وہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ (ہود۔۱۴)

اس طرح اعجاز کے وجہ استدلال عقلی کو اہل عقل کے متنبہ کرنے کے لئے ذکر کیا۔

تیسرا امر:

اس نے جناب رسالت مآبؐ کے اخلاق کی پاکیزگی اور کمال طہارت کو متعدد آیات میں ظاہر کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ آپؐ کی زندگی اخلاق حسنہ سچائی اور پاکیزگی کا نمونہ رہی ہے جس کی بناء پر آپؐ کی سیرت آپؐ کے بلند دعوے کے شایان شان ہے ارشاد ہوا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝ (سورۂ قلم۔۴ اور ۹)

یقیناً آپ بڑے اخلاق کے درجہ پر فائز ہیں۔ ان لوگوں کی یہ آرزو ہے کہ آپ سے کسی دورنگی کا ظہور ہو تو یہ بھی دورنگی سے کام لیں۔

نیز آپ کے تعلیمات کی پاکیزگی کے متعلق ارشاد کیا:

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ. (سورۂ اعراف۔۱۵۷)

وہ انہیں اچھی باتوں کا حکم دیتے اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں۔

اور خود اپنے مندرجہ تعلیمات پر اہل نظر کو سنجیدگی سے غور کرنے کا موقع دیتے ہوئے ارشاد کیا

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِىَ اَقْوَمُ. (سورۂ بنی اسرائیل۔۹)

یقین جانو کہ یہ قرآن دعوت دیتا ہے ایسی باتوں کی طرف جو بالکل سیدھی سیدھی اور صحیح ہیں۔

اس طرح قرآن مجید نے تمام وہ پہلو جو ایک معجزہ کی صحت کے سلسلہ میں غور کے قابل ہوا کرتے ہیں سب خود ہی پیش کر دیئے اور اہل نظر کی نظر کے سامنے رکھ دیئے جس کے بعد غور کرنا نہ کرنا خود ان اشخاص کے حسن اختیار اور سوء اختیار کا نتیجہ ہوگا اور حجت پوری قوت کے ساتھ تمام ہوگئی۔

(۲)

اعجاز قرآن کے مختلف رخ

تاریخی حیثیت

حضرت رسول ﷺ کو کوئی ویسا فرض کر لے جیسا ان کے دشمن کہتے ہیں کہ انہوں نے توریت اور انجیل کے مندرجہ واقعات افواہی حیثیت سے عام اشخاص سے سنے اور انہیں قرآن میں درج کر دیا۔

اس کا نتیجہ کیا ہونا چاہئے؟ یہ کہ توریت وانجیل میں جس طرح واقعات کا تذکرہ ہوا ہے اس کے ساتھ قرآن مندرجہ واقعات ایسے اضافے اختلافات اور حواشی ہوتے جن میں واقعت کے متانت اور استحکام کا پتہ نہ ہوتا اور افواہی باتوں کی خرافت آمیز داستانوں کا اثر بہت نمایاں ہوتا یعنی توریت وانجیل کے مندرجہ واقعات میں اگر خلاف عقل وفطرت اور منافی اصول دینیہ باتیں نہ تھیں تو اس میں نظر آتیں اور اگر تھیں تو اس میں بہت بڑھ جاتیں۔

لیکن جب ہم توریت وانجیل کے مندرجہ واقعات اور پھر قرآن مجید میں انہی واقعات کے تذکرہ کو دیکھتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ بائبل کے واقعات میں اس درجہ دور از کار اور خرافت آمیز روایات کی بھر مار ہے کہ کسی طرح عقل و مذہب کے رو سے انہیں صحت کی سند کا دیا جانا ممکن نہیں ہے اور قرآن انہی واقعات کو تمام ان خرافتوں اور دور از کار باتوں کو حذف کر کے ایسے صحیح اور موافق فطرت انداز سے پیش کرتا ہے جسے عقل اصلیت کی سند دینے پر مجبور ہے۔

ملاحظہ ہو توریت کتاب پیدائش فصل ۳ میں حضرت آدمؑ کے ممنوعہ درخت سے تناول فرمانے کا قصہ اور اس میں جو کچھ دُور از کار باتیں ہیں جن سے خدا کی طرف غلط بیانی اور فریب کاری کا الزام عائد ہوتا ہے۔

اور فصل ۱۵ میں ابراہیمؑ کا واقعہ کہ ان کو خدا کے وعدہ میں شک ہوا شام میں زمین عطا کئے جانے کے متعلق اور فصل ۱۸۔۱۹ میں ملائکہ کے آنے کا تذکرہ ابراہیمؑ کے پاس ولادت اسحاقؑ کو خوشخبری لے کر اور کتاب خروج فصل ۳ میں خداوند عالم کا خطاب موسیٰؑ سے درخت کے ذریعہ سے اور اس کا وہ ضمیمہ جس سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کی تعلیم موسیٰؑ کو شروع ہوتی تھی غلط بیانی کے سبق کے ساتھ اور فصل ۲ ۳ میں ہارون کا قصہ کہ انہوں نے گوسالہ تیار کرایا تھا جو خدائے بنی اسرائیل کی حیثیت سے قرار دیا جائے اور انہوں نے اس کے لئے قربانی اور عبادت کے طریقے مقرر کئے تھے۔

ان تمام واقعات کا ایک دفعہ توریت میں مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں کیا کیا باتیں ایسی ہیں جو کسی طرح عقل ودین کی روشنی میں صحیح تسلیم کیے جانے کے قابل نہیں ہیں جن سے جلالِ الٰہی اور طہارت انبیاء پر دھبہ آتا اور بہت سے اصول عقلیہ کو دھچکا پہونچتا ہے اور پھر انہی واقعات کو قرآن مجید میں نکال کر ملاحظہ کیجئے معلوم ہوگا کہ قرآن مجید میں تمام وہ زوائد حذف ہیں جو مذکورہ بالا حیثیت سے نا قابل قبول تھے اور اس میں تمام واقعات ایسے انداز سے بیان ہوئے ہیں جو کسی طرح شان حضرت الٰہی اور شان انبیاء ومرسلین کے خلاف نہیں ہیں۔

ملحقات توریت میں جو واقعات مذکور ہیں وہ بھی کچھ کم افسوسناک نہیں ہیں حضرت ایوبؑ کی طرف انتہائی جزع فزع اور خدا سے شکوہ

بلکہ اس پر اعتراض کی نسبت حضرت داؤدؑ کی طرف زنا کاری کی شرمناک نسبت حضرت سلیمانؑ کی طرف کفر وشرک کے رواج دینے کی نسبت وغیرہ وغیرہ ایسے واقعات جو ایک لحظہ کے لئے صحیح تسلیم نہیں کئے جاسکتے۔

بلکہ توریت اور اس کے ملحقات میں مذکورہ بالا امور سے بڑھ کر بعض باتیں ملتی ہیں جیسے حضرت لوطؑ کی طرف شراب خوری اور نشہ شراب میں اپنی دونوں لڑکیوں کے ساتھ زنا کاری، حضرت یعقوبؑ کی خدا کے ساتھ کشتی حضرت یعقوبؑ کے اپنے والد کے ساتھ فریب کاری، خدا کا مشورہ آسمانی فرشتوں کے ساتھ کہ آخاب بادشاہ بنی اسرائیل کو گمراہ کیا جائے اور اس کے علاوہ بہت باتیں جن سے پرانے عہد نامہ کے صفحات پورے طور پر مملو نظر آتے ہیں۔

انجیل مقدس جو حضرت مسیحؑ کی تاریخ زندگی ہے اس میں بھی اختصار و کمی صفحات کے باوجود حضرت مسیحؑ کی طرف ایسے واقعات کی نسبت موجود ہے جو کسی طرح اُن کی شان کے لائق نہیں ہے جیسے شراب خوری غلط بیانی ماں اور بھائیوں کے ساتھ بداخلاقی اور نامحرموں کے ساتھ اخلاق سوز بے باکی۔

بلاشبہ قرآن مجید کے زمانہ میں اور اس کے قبل انبیاء ومرسلین کے تاریخی معلومات کے لئے یہود، قسیسین، نصارٰی کی تعلیمات کے سوا کوئی سرچشمہ نہ تھا اور توریت وانجیل ہی کے مندرجات تھے جو احبار یہود و قسیسین نصارٰی کے نوکِ زبان تھے۔

تو رسول اسلامؐ نے اگر ان تعلیمات کو یہود ونصارٰی کے علماء سے حاصل کیا ہوتا تو وہ تمام خرافات جو ان کی کتابوں میں مذکور تھے اس حد تک تو آپؐ کے یہاں بھی ملتے جو عام عیسائی علماء کے یہاں از قبیل مسلمات تھے اور اگر آپ ان کو صرف افواہی حیثیت سے صرف عوام کی زبانی سن کر نقل کرتے جیسا کہ عام عیسائی مولفین ظاہر کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو عام نظام عادات کے مطابق اس میں توریت ار وانجیل کے اصل مندرجات سے بدرجہ زیادہ خرافات اور دور از کار باتیں آجاتیں لیکن اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے واقعات کے جو بائبل میں واقعیت کی شان کے بالکل خلاف تھے بالکل ذکر ہی نہیں کیا اور جن واقعات کا بائبل کے ذکر کیا ان کو تمام اضافوں سے الگ کرکے جو اس واقعہ کو واقعیت کے حدود سے الگ پھینکنے کے ذمہ دار تھے۔

اس سے ایک غیر جانبدار انسان کی عقل کو صاف اس نتیجہ تک پہنچنا چاہئے کہ درحقیقت واقعات کی مسخ شدہ صورت وہ تھی جو توریت و انجیل میں رائج ہوگئی تھی اور خدائے قدوس نے جس کا کام بندگان خدا کی ہدایت ہے اپنے اس رسول کو جو خاتم المرسلین ہے ان تمام صحیح واقعات کی اصل صورت میں تعلیم دی تاکہ توریت وانجیل میں پڑی ہوئی خرابیوں کی اصلاح ہوجائے اور گمراہ کن خیالات کا جو جلال الٰہی اور شان انبیاء کے منافی واقعات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں قلع قمع اور آئندہ کے لئے سدباب ہوجائے۔

استدلالی حیثیت سے

قرآن کے محل نزول پر غور کیجئے عرب کی جہالت کفر وشرک کا دور دورہ گمراہی کی شدت عقلوں کی تاہ نگاہوں کی ظاہری بینی علوم وفنون سے اجنبیت اور منطق وفلسفہ سے بالکل ناشناسی اس سب کو دیکھے اور پھر قرآن مجید کے معارف وحقائق سے بھرے ہوئے آیات کی تلاوت کیجئے خاص مسائل توحید اور عدل ونبوت کے مضبوط استدلات کا مطالعہ کیجئے ان آیت کے عمق کو دیکھئے باریک بین دقیق فلسفی نگاہوں سے ان کے معانی پر غور کیجئے معلوم ہوگا کہ وہ کس پایہ کا کلام ہے اور ذہن فیصلہ کرے گا کہ عقل وعادت فطرت وطبیعت کی رو سے اس طرف میں پیدا ہونے والے کسی

انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔

اس کے ساتھ بائبل کے ان استدلالوں پر نظر ڈالئے جو حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں تو محسوس ہوگا کہ ان طریقوں سے اثبات مطلب کی ناکام کوشش کسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے شایان شان نہیں ہے۔۔۔ یہاں تک کہ بعض مقامات پر تعدادالٰہ اور شرک تک کا نتیجہ برآمد ہوتا ہے ایسی کمزوریوں سے قرآن منزہ و مبرا ہے۔

تشریعی حیثیت سے

اس کا عام ذہن پورا اندازہ تو نہیں کر سکتے مگر بہت سے صحیح ذوق اور پختہ عقل رکھنے والے افراد جنہوں نے دنیا کے قوانین و اصول انتظامی کا انتقادی نظر سے مطالعہ کیا ہے موازنہ کر کے دو قسم کی تعلیموں میں اتنا ضرور سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں سے کون روح انتظامی کے ساتھ زیادہ موافق اور مفاد اجتماعی کے مطابق اور کہاں تک عملی ہے اور فطرت کے ساتھ سازگار اس کے علاوہ اس کا سمجھ لینا تو ہر شخص کے لئے آسان ہے کہ کس قانون میں جامعیت پائی جاتی ہے اور شخصی ونوعی، انفرادی و اجتماعی ہر قسم کے احکام پر حاوی ہے۔

بلاشبہ قرآن مجید کے نزول کے زمانہ میں ایک شریعت موجود تھی شریعت موسویہ جو یہود و نصاری دونوں کے نزدیک مسلم تھی اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف نسبت رکھنے والا ایک آئین تھا جو اگرچہ اس اعلان کی بناء پر کہ زمین و آسمان ٹل جائیں مگر موسیٰؑ کی شریعت کا ایک شوشہ نہیں ٹل سکتا شریعت موسوی کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ہونا چاہئے لیکن وہ عمل طور پر شریعت موسویہ کے خلاف ایک مستقل چیز بن گیا تھا۔

اس کے علاوہ ایران میں زرتشتی مذہب سے تعلیمات تھے اور زردشت کی ایک مستقل شریعت تھی جو زندہ حیثیت رکھتی تھی اور ہزاروں آدمیوں کو اپنا پابند بنائے ہوئے تھی۔

کوئی بھی دین اگر اساسی حیثیت سے صحیح ہے تو اس کی شریعت کے اجزاء اصلی یقیناً وہی ہو سکتے ہیں جو خدائے قدوس کے نازل کردہ ہیں یہ اور بات ہے کہ بعد کی تراش خراش نے ان میں تبدیلی کر دی ہو اور طرح طرح سے مسخ کر دیا ہو۔

شریعت موسوی اور عیسوی اس کی یقینی مثال ہے۔

زردشت کے متعلق چوں کہ قرآن نے نبوت کی گواہی نہیں دی ہے لہٰذا اسے قطعی حیثیت حاصل نہیں ہے لیکن قرائن اور بعض اخبار و آثار کی بناء پر بہت سے لوگ نبوت کے قائل ہیں جس کی نفی کے لئے بھی قطعی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اس صورت میں اگر ان شریعتوں میں کچھ ایسے احکام موجود ہوں جو قرآنی احکام کے ساتھ متحد ہیں تو اس میں کوئی اعتراض ان کی بات نہیں ہے لیکن دیکھنے کا امر یہ ہے کہ قرآن میں ان مشترک احکام سے بہت زیادہ اور زندگی کے بہت سے ایسے شعبوں کے متعلق کتنے ایسے احکام و قوانین ہیں جن کا مذکورہ بالا شریعتوں میں صراحۃً وجود کیسا اشارہ بھی نہ تھا۔ اس سے بے لوث ضمیر کو اس نتیجہ تک پہونچنا چاہئے کہ اس شریعت کو طویل عمر زمانہ کے ضروریات کے مطابق اسی خدا نے نازل کیا ہے جس نے ان شریعتوں کو ان کے محدود زمانہ کے لحاظ سے محدود احکام پر مشتمل نازل کیا تھا اور اسی لئے آخر عمرِ دنیا تک اس میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اخلاقی حیثیت سے

بلاشبہہ علم اور تربیت کا انسان کے اخلاق پر بڑا اثر پڑتا ہے جہالت اور علوم صحیحہ سے ناواقفیت بڑی سے بڑی بداخلاقیوں کا سرچشمہ ہوتی ہے اور اخلاق کی جان جو کچھ بھی ہے وہ ملکات نفسیہ او رقوائے طبعیہ میں اعتدال کے نقطہ کی پابندی اور افراط وتفریط سے کنارہ کشی ہے۔

بڑے بڑے معلم کے تعلیمات اس وقت بے قیمت ہیں جب وہ یا تو تفریط کی وجہ سے اس حد تک کمزور ہوں کہ ان سے امن وانتظام اورتحفظ وتہذیب وشائستگی کا مقصد حاصل ہی نہ ہوتا ہو اور یا افراط کے لحاظ سے اس درجہ زیادہ ہوں کہ وہ نفسانی طرف کے تقاضوں کی بناء پر کبھی ممنون عمل بن ہی نہ سکیں۔

توریت اور انجیل مرّوجہ کے اخلاقی تعلیمات کی نوعیت انہی دونوں راستوں میں تقسیم ہے اول الذکر افراط اور ثانی الذکر تفریط کے لحاظ سے اعتدال سے علیحدہ ہیں۔

لیکن قرآن مجید کی تعلیم ہر شعبہ حیات میں حدوسط کا درجہ رکھتی ہے وہ افراط وتفریط دونوں سے مبرا ہے۔ اور اس لئے ہر شخص کے لئے ممکن العمل اور تہذیب وشائستگی کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔

یہ خصوصیت بھی قرآن مجید کی وہ ہے جو اس کو تمام کتب ادیان میں ممتاز درجہ عطا کرتی ہے اور اس کے ساتھ جب عرب کی جہالت اور رسول عربیؐ کے ماحول کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے گا تو ماننا پڑے گا کہ وہ الہامی وآسمانی حیثیت رکھتی ہے اور یقیناً خداوند عالم کی جانب سے نازل شدہ ہے۔

(۳)

نفیٔ تحریف

فرقہ امامیہ کا قول کہ قرآن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی

واضح ہو کر طبقہ محدثین کے استاد کل جن کی دقت نظر احادیث کے نقل کرنے میں شہرہ آفاق ہے یعنی جناب صدوقؒ کتاب الاعتقادات میں تحریر فرماتے ہیں:

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن جسے خداوند عالم نے اپنے نبیؐ پر نازل فرمایا وہ یہی ہے جو دونوں دفیتوں کے درمیان موجود ہے اور وہ اس سے زیادہ نہیں ہے اور جو شخص ہماری طرف نسبت دے کہ ہم اصل قرآن کو اس سے زیادہ مانتے ہیں وہ بالکل جھوٹا ہے موصوف نے ان تمام روایات کو جو کمی کے بارے میں وارد ہوئی ہیں دوسرے معانی پر محمول کیا ہے۔

''فصل الخطاب'' کے اواخر میں شیخ مفیدؒ کی کتاب مقالات سے یہ عبارت درج کی ہے کہ ''فرقہ امامیہ'' میں بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ایک کلمہ، ایک آیت اور حروف کی بھی کمی نہیں ہے بے شک جناب امیرؑ کے جمع کردہ قرآن میں جو تاویل اور تفسیر اس کے معانی کی اس کے اصل شان نزول کے موافق ہوئی تھی وہ کم کردی گئی ہے اور جناب سید مرتضی علم الھدیٰؒ کا بھی قول ہے کہ قرآن میں کوئی کمی نہیں ہے اور معدودے چند افراد جو فرقہ امامیہ اور حشویہ میں کے اس کے خلاف قائل ہو گئے ہیں وہ توجہ کے بھی مستحق نہیں ہیں اس کے خلاف قول ہے وہ اخباریوں میں سے افراد کی طرف منسوب ہے جنہوں نے کچھ ضعیف روایتوں کو صحیح سمجھ کر یہ قول اختیار کرلیا ہے۔

شیخ طوسیؒ کی کتاب تفسیر ''تبیان'' کے شروع میں ہے کہ قرآن مجید کے متعلق زیادتی یا کمی کا سوال اٹھایا جانا بھی مناسب نہیں ہے اس لئے کہ زیادتی کے نہ ہونے پر تو اجماع ہے اور کمی اس کے متعلق بھی تمام مسلمانوں کے مذہب کا ظاہر یہ ہے کہ واقع نہیں ہوئی اور خصوصیت سے ہمارے مذہب میں بھی صحیح قول یہی ہے اور اسی کی حمایت جناب سید مرتضیؒ نے کی ہے اور احادیث سے بھی وہی ظاہر ہے بے شک شیعہ اور سنی کی طرف سے بہت سی روایتیں ایسی وارد ہوئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سی آیتیں قرآن کی کم ہوگئیں اور بعض اپنی جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ پہنچ گئیں لیکن یہ روایتیں بطریق احاد منقول ہیں جن پر نہ علم کی بنیاد ہوسکتی ہے نہ عمل کی اور بہتر یہ ہے کہ ان روایات سے کنارہ کشی ہی اختیار کی جائے۔''

تفسیر مجمع البیان میں بھی بالکل اس سے اتفاق کیا ہے اور کشف الغطاء کتاب قرآن میں ہے کہ ''آٹھواں مبحث نقص قرآن کے بارے میں یقیناً قرآن مجید نقص کے عیب سے محفوظ ہے خدا کی غیبی حفاظت کے ساتھ جس پر صریحی قرآن کی آیت دلالت کررہی ہے اور ہر زمانہ کے علماء کا اجماع بھی اسی کے موافق ہے اور شاذ و نادر بعض لوگوں کا قول قابل توجہ نہیں ہے اور جو جو روایت ایسے ہیں کہ ان نقص قرآن کا پتہ چلتا ہے ضرورت مذہب ان کے ظاہر پر عمل سے مانع ہے لہٰذا کسی نہ کسی طرح ان کی تاویل کرنا چاہیئے۔

شیخ بہائیؒ کا قول ہے کہ زیادتی اور نقصان کے متعلق اختلاف ہے اور صحیح یہی ہے کہ قرآن ہر طرح کی زیادتی و کمی سے محفوظ ہے اور قول

خداوند عالم کہ ''ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں اس کی دلیل ہے'' اور یہ جو مشہور ہے کہ بعض جگہ امیر المومنینؑ کا نام تھا وہ حذف ہو گیا جیسے:

يَآ اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فِيْ عَلِيٍّ۔ وغیرہ یہ بالکل غیر معتبر ہے:

اور سید محسن بغدادی نے ''شرح وافیہ'' میں لکھا ہے کہ ہمارے علماء میں جو قول مشہور ہے اور جس پر اجماع کا دعویٰ ہوا ہے وہ یہی ہے کہ کمی واقع نہیں ہوئی۔

اور محقق ثانی علی بن عبدالعالی کرکی نے ایک مستقل رسالہ قرآن مجید میں کمی نہ ہونے کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔ پھر انہوں نے صدوق کا کلام ذکر کیا ہے اور بطور اعتراض ان احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے جن سے نقص قرآن کا پتہ چلتا ہے جواب دیا ہے کہ حدیث جب قرآن اور احادیث متواترہ یا اجماع کے خلاف ہو اور اس کی تاویل ممکن نہ ہو تو اسے ساقط کرنا چاہئے۔

ان تمام علماء کے برخلاف ہمارے ہم عصر محدث (فاضل نوری) نے فصل الخطاب میں کوشش کے ساتھ ان روایات کو جمع کیا جن سے وہ قرآن میں کمی واقع ہونے پر استدلال کرتے ہیں اور ان روایت کے اسناد میں کثرت پیدا کی ہے ان روایتوں سے کہ جو مرسل طریقہ (یعنی بغیر ذکر سند کے) تفسیر عیاشی و فرات بن ابراہیم وغیرہ میں مذکور ہیں۔ حالاں کہ جو شخص جستجو کرے اور ذوق تحقیق رکھتا ہو وہ یقین کرے گا کہ یہ مرسل روایتیں انہی چند مسند روایتوں سے ماخوذ ہیں جو کسی طرح صحیح ہو ہی نہیں سکتیں اور بعض آپس میں اتنا اختلاف رکھتی ہیں کہ خود ہی متعارض ہو جاتی ہیں اس مختصر کتاب میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ان آخری دونوں قسموں کو توضیح کے ساتھ لکھا جائے اس کے علاوہ اکثر مستند روایتیں جو ہیں ان کی سندیں چند اشخاص تک منتہی ہوتی ہیں جن میں سے کسی کے متعلق علمائے رجال لکھتے ہیں کہ وہ لا مذہب شخص ہے اس کی حدیثیں کمزور اور روایتیں متروک ہیں کسی کے متعلق یہ کہ اس کے احادیث اور مذہب دونوں مشکوک ہیں اس کی حدیث کبھی قابل قبول ہوتی ہے اور کبھی ناقابل قبول، اور وہ کمزور راویوں سے احادیث کو نقل کرتا ہے اور کسی کی نسبت یہ لکھا ہے کہ وہ بہت زیادہ غلط بیان اور ناقابل اعتبار ہے میں جائز نہیں سمجھتا کہ اس کی تفسیر سے ایک روایت بھی نقل کروں اور یہ کہ وہ واقفی ہونے میں مشہور ہے اور امام رضاؑ سے سخت عداوت رکھتا تھا اور کبھی یہ کہ اس کی روایتیں بالکل خراب ہوتی ہیں اس کی غلو کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے راویوں کی تعداد کی کثرت کوئی فائدہ نہیں دے سکتی اور گر ہم چشم پوشی کر کے اتنے بڑے اہم موضوع پر ان لوگوں کی روایات کو قبول بھی کر لیں تو دوسری متعدد روایتوں کی بناء پر ہمیں ان روایات کے معنی میں یہ کہنا چاہئے کہ جو فقرات ان میں حذف شدہ بتلائے گئے ہیں وہ تفسیر کی حیثیت رکھتے تھے یا تاویل تھے یا بیان تھے اس فرد کا جو یقیناً اس عموم کے تحت میں داخل ہے اپنے اظہر افراد اور مستحق ترین شخصیت ہونے کی جہت سے حکم عام کے ساتھ یا اس فرد کا جو عموم کے ضمن میں تنزیل قرآن کے وقت خصوصیت سے ملحوظ تھی۔ یا اصل جس کے بارے میں آیت نازل ہوئی تھی یا جو مبہم الفاظ (مائے موصولہ وغیرہ) سے مراد اصلی تھی۔ انہی آخری تین پہلوؤں پر محمول ہونا چاہئے ان روایت کو جن میں لکھا ہے کہ یہ تنزیل ہے اور اس کو جبرائیل لے کر آئے تھے اور اس معنی کی دلیل خود ان روایت میں جمع کا عمل میں لانا ہے اور تحریف سے مراد تحریف معنوی ہے جس کے شاہد امام محمد باقرؑ کی وہ تحریر ہے جو آپ نے سعد خیر کو لکھی ہے اور جو کافی کی کتاب روضہ میں مذکورہ ہے اور اس میں لکھا ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے کتاب خدا کا پس پشت ڈال دینا یہ تھا کہ انہوں نے اس کے مکتوبی الفاظ کو تو قائم رکھا اور اس کی جو مقررہ حدیں تھیں ان میں تحریف یعنی تبدیلی کر دی اسی طرح وہ روایات جن میں یہ ہے کہ مصحف جناب امیرؑ یا مصحف ابن مسعود میں اس طرح لکھا ہے اس سے مراد یہی ہے

کہ بطور تفسیر و تاویل تحریر تھا اس کی شہادت دینے کے لئے موجود ہے جناب امیرؑ کا قول جو آپ نے زندیق سے فرمایا'' میں ان کے پاس لایا پوری کتاب جو تنزیل اور تاویل دونوں پر مشتمل تھی''۔

ان روایات میں سے جن کی نسبت ہم نے اشارۃً تحریر کیا یہ ہے کہ فاضل معاصر (محدث نوری) نے چار روایتیں درج کی ہیں جن میں یہ ہے ''بولایۃ علی'' کا فقرہ مصحف حضرت فاطمہؑ میں تحریر تھا کسی میں ہے کہ وہ مصحف فاطمہؑ میں یونہی تھا اور واضح ہونا چاہئے کہ جناب فاطمہؑ کی مصحف قرآن نہیں تھا بلکہ وہ ایک کتاب تھی جس میں علمی رموز و اسرار کا تذکرہ تھا جیسا کہ اصول کافی کی متعدد روایتوں سے جو صحیفہ اور مصحف اور جامعہ کے باب میں درج ہیں ثابت ہوتا ہے ان میں امام جعفر صادقؑ کا یہ قول ہے کہ اس میں تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے کہیں یہ ہے کہ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ اس میں قرآن ہے جیسا کہ صحیح و حسن حدیثوں میں وارد ہوا ہے۔

اس کے علاوہ کافی میں اس باب میں کہ ائمہ معصومینؑ لوگوں پر گواہ ہیں صحیح حدیث برید کی امام محمد باقرؑ سے اور دوسری حدیث امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ ان دونوں حضرات نے آیت کے بارے میں کہ جَعَلۡنَا کُمۡ اُمَّةً وَّ سَطاً فرمایا امت وسطیٰ ہم ہیں۔امیر المومنینؑ سے اس کی تفسیر میں وارد ہوا ہے کہ ہم وہ ہیں جن کے بارے میں خدا نے فرمایا کہ ''ہم نے تم کو امت وسطیٰ قرار دیا''۔اب جو مرسل طور پر تفسیر نعمانی و تفسیر سعد میں وارد ہے کہ آیت میں ائمہ وسطیٰ ہے۔

اس کو تفسیر ہی پر محمول کرنا چاہئے اور یہ کہ معنی امۃ وسطیٰ کے ائمہ وسطا تھے جس کو لوگوں نے بدل دیا نیز کافی میں اس باب میں ائمہ معصومینؑ ہادی اور رہنما ہیں۔فضل کی روایت ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے اس آیت کے معنی دریافت کیے کہ لِکُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے حضرت نے فرمایا کہ ہر امام رہنما ہے اس طبقہ کا جس میں وہ ہے اور برید کی روایت ہے امام محمد باقرؑ سے اسی آیت کی تفسیر میں کہ رسالت مآب مُنۡذِر (عذاب الٰہی سے خوف دلانے والے) ہیں اور ہر زمانہ میں ہم میں سے ایک رہنما ہے جو رسالت مآبؐ کے احکام کی طرف ہدایت کرتا ہے اور رسالت مآبؐ کے بعد جو رہنما ہوئے ہیں وہ جناب امیرؑ ہیں اور ان کے بعد کے اوصیاء یکے بعد دیگرے اسی کے مثل ہیں۔

روایت ابوبصیر کی امام جعفر صادقؑ سے اور روایت عبد الرحیم قصیر کی امام محمد باقر علیہ السلام سے ان سب میں یہی ہے کہ رسالت مآبؐ منذر ہیں اور علی ابن ابی طالبؑ ہادی اور اس مضمون کی روایتیں اہل سنت کے یہاں بھی ہیں ابو ہریرہ اور ابو برزہ اور ابن عباس اور نیز خود امیر المومنینؑ کے اسناد سے اور حاکم نے مستدرک میں اس روایات کو صحیح السند قرار دیا ہے۔

ان تمام روایات کے ہوتے ہوئے بھی کیا کوئی شخص پسندیدگی کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔فصل الخطاب کی اس کاوش کو جو انہوں نے بعض متاخرین کی تفسیروں سے اور میر باقر داماد کے حاشیہ اقتباسات سے بعض روایتوں کے درج کرنے میں اختیار کی ہے اور لکھا ہے کہ روایات شیعہ اور سنی دونوں طریقوں سے کثرت کے ساتھ ہیں کہ اصل آیت یوں تھی کہ۔اِنَّمَا اَنۡتَ مُنۡذِرُ الۡعِبَادِ وَعَلِیٌّ لِکُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ (بس تم میرے بندوں کے ڈرانے والے ہو اور علیؑ ہر قوم کے لئے رہنما ہیں)۔یہ ایک شعر جس کو قصیدہ خوان پڑھ سکتے ہیں باقی کوئی شخص جو عربی زبان میں ایک درجہ رکھتا ہو وہ اسے گوارا نہ کرے گا کہ اس کی طرف اس شعر کے نظم کرنے کی نسبت دی جائے اور طرق شیعہ و اہلسنت کا جو حوالہ دیا گیا ہے تو بے شک وشبہہ ان طرق میں سوا اس کے جو ہم نے سابقاً درج کیا اور کچھ نہیں اور وہ اس سے جو محدث نوری نقل کر رہے ہیں مختلف ہے۔

''قیاس کن زگلستان من بہار مرا''

نیز کافی کی روایت ہے جو ابوحمزہ سے امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ: کفار کا قول: رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ اس سے مراد ولایت علی بن ابی طالبؑ کا انکار تھا۔ یہ الفاظ صراحۃً بتلا رہے ہیں کہ یہ تفسیر کی حیثیت سے ہے اس صراحت کے سبب سے توضیح ہو جائے گی۔ ابوبصیر کی ان دونوں ضعیف روایتوں کی جن سے بظاہر یہ پتہ چلتا ہے کہ بولا یۃ علی کی لفظ قرآن میں داخل تھی اور وہ حذف کردی گئی ہے۔

عمر بن حنظلہ کی روایت ہے امام جعفر صادقؑ سے سورہ بقرہ کی اس آیت میں کہ متاعًا اِلَی الحول غیر اخراج آپ نے فرمایا مخرجات عبارت کو دیکھتے ہوئے شبہہ بھی نہیں ہو سکتا سوا اس کے کہ یہ مخرجات کا فقرہ بطور تفسیر بیان ہوا ہے یعنی اخراج کی لفظ سے مخرجات مراد ہے نہ یہ لفظ یہاں پر تھی اور وہ قرآن مجید سے کم کر دی گئی ہے لیکن کتاب فصل الخطاب میں اس کو بطور بیان نقصان درج کیا ہے۔

نیز ان روایات میں سے محمد بن مسلم کی صحیح السند و روایت ہے امام جعفر صادقؑ سے جو کتاب کافی میں باب ''منع الزّکٰوۃ'' کے شروع میں درج ہے اس میں ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا یہی مراد ہے اس ارشاد حضرت احدیت سے کہ ان لوگوں کو طوق پہنائے جائیں گے اس شے کے جس کے ساتھ انہوں نے بخل کیا ہے یعنی جو انہوں نے بخل کیا ہے مال زکوۃ میں سے یہ روایت بالکل صراحت کے ساتھ اس امر کو بتلاتی ہے کہ من الزکوۃ کی لفظ بطور تفسیر ہے جو امامؑ نے بیان فرمائی ہے۔ نہ یہ کہ وہ جزء قرآن ہے اور اس روایت کی یہ صراحت شرح قرار پائے گی ابن عمیر والی مرسل نے روایت کی جو امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ قول باری تعالیٰ ہے۔ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ مِنَ الزَّكٰوةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ٥

اور اس روایت کے معنی بھی وہی ہوں گے کہ مابخلوا بہ سے مراد من الزکوۃ ہے نہ یہ کہ وہ قرآن کا جزء ہے اور کم کر دیا گیا ہے

نیز انہی روایات میں سے صحیحہ ابوبصیر ہے امام جعفر صادقؑ سے جیسا کہ کافی میں باب ''نَصّ عَلَى الْاَئمہ ''میں مذکور ہے اس روایت میں ہے کہ ابوبصیر نے عرض کیا لوگ کہتے ہیں کہ خداوند عالم نے حضرت علیؑ اور آپ کی اولاد کا نام قرآن میں ذکر کیوں نہ کر دیا حضرت نے فرمایا ان لوگوں سے کہو کہ رسالت مآبؐ پر قرآن میں یہ نازل ہوا کہ نماز واجب ہے لیکن خدا نے یہ بیان نہیں فرمایا کہ مغرب کی تین رکعت ہے اور عشاء کی چار رکعت یہاں تک کہ رسالت مآبؐ وہ تھے جنہوں نے لوگوں کے سامنے اس کی تفسیر عمل کر کے ظاہر فرمائی اور اسی طرح قرآن نے اجمال سے زکوۃ و حج کے بارے میں کام لیا اور رسولؐ خدا نے تفصیل بتلائی۔ اس روایت سے ظاہر ہے کہ امامؑ نے لوگوں کے اس قول کی رد نہیں فرمائی کہ قرآن مجید میں امیر المومنینؑ کا نام صراحۃً مذکور نہیں بلکہ اس کے دوسرے نظائر پیش کر کے ان کے استدلال کی رد فرمائی۔

اس کی گواہ وہ روایت بھی ہے جو کافی میں اس کے تھوڑی دور بعد صحیحہ فضلاء میں وارد ہے امام محمد باقرؑ سے اور ابوالجارود کی روایت حضرتؑ سے اور ابوالدیلم کی روایت حضرت امام جعفر صادقؑ سے کہ ان دونوں بزرگوں نے مقام استدلال میں اپنے اصحاب کے سامنے جب کہ تقیہ کا موقع بھی نہ تھا يَآيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ۔ (مائدہ۔ ٦٧) کی تلاوت فرمائی اور اس میں ''فی علی'' نہیں کہا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض روایتوں میں جو اس مقام پر یا دوسرے مقامات پر ''فی علی'' کی لفظ ہے وہ بطور تفسیر و بیان ہے جیسے جبرائیل بطور وحی خدا کی طرف سے لائے ہیں لیکن جزء قرآن نہیں ہے اور اس طرح کی وحی تو ہر کلام رسالت مآبؐ کے موافق ہوتی تھی اس لئے کہ (قرآن میں موجود ہے) آپ اپنی خواہش نفس سے بات ہی نہیں کرتے جو کچھ آپ کا کلام ہوتا ہے وہ وحی ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔

نیز ان روایات میں سے فضیل کی روایت ہے۔امام رضاؑ سے کافی کے باب ''معنی التنزیل فی الولایۃ''میں کہ راوی نے عرض کی یہ آیت هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ٥ حضرت نے فرمایا یعنی امیر المومنینؑ۔راوی نے عرض کیا یہ تنزیل ہے؟ حضرت نے فرمایا ہاں اس روایت میں حضرت نے امیرالمؤمنینؑ کا نام یعنی کی لفظ کے ساتھ ذکر کیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ جزء قرآن نہیں ہے بلکہ بیان مراد اور ھذا کی لفظ کے اصلی مشارالیہ کے طور پر ہے۔اب سائل کا یہ پوچھنا کہ یہ تنزیل ہے؟ اور حضرت کا فرمانا کہ ہاں اس سے صاف ظاہر ہے کہ تنزیل سے مراد جزء قرآن ہی نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ جو چیز قرآن کی کسی آیت میں خصوصیت کے ساتھ مراد ہو اس کو وہ حضرات تنزیل کے لفظ سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

یہ روایت اور اس کی ایسی دوسری روایتیں تمام ان دلائل کو ختم کر دیتی ہیں جن سے فصل الخطاب کے اوراق پر کئے گئے ہیں۔

اور ان روایات کی حقیقت بھی اس سے پہلے کھولی جا چکی ہے اور انہی مطالب کی طرف جو ہم نے بیان کیے علمائے اعلام کے کلمات میں جو ہم نے نقل کیے تھے اشارہ موجود ہے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ یہ روایت ضعیف السند ہے اور اسی طرح بعض اس کے قبل کے روایات تو ہم جواب میں کہیں گے اکثر روایتیں جنہیں فصل الخطاب نے نقل کیا ہے وہ ایسی ہی یا اس سے زیادہ ضعیف السند ہیں اس کے علاوہ ہم نے جو صحیح السند روایتیں پیش کی ہیں وہ کیا کم ہیں اور وہ اثبات مطلب کے لئے کافی ہیں ان لوگوں کے واسطے جو صاحبان عقل و تمیز ہوں۔

(۴)

قرآن مجید کی قرأت

قرآن مجید کے آیت کی مادی اور صوری حیثیت اور عام طور پر جو اس کے پڑھنے کا طریقہ ہے وہ نسل درنسل چودہ سو برس میں برابر مسلمانوں کے اندر محفوظ و برقرار رہا ہے اور قراء سبع یا ان کے علاوہ دوسرے قاریوں کی قرا تیں جو کتابوں کے اندر درج ہیں کبھی عمومی حیثیت سے اس پر اثر انداز نہیں ہوئیں اور نہ صحیح بخاری اور مسند حاکم وغیرہ میں مختلف صحابہ کی زبانی جو بکثرت مختلف قراءتیں ہیں جنہیں کنز العمال میں درج کیا گیا ہے اس عمومی انداز قراءت کو متاثر بنا سکیں۔

پھر یہ کہ یہ سات یا مزید اضافہ کے ساتھ دس قراءتیں جتنی ہیں وہ بعض الفاظ کی صورت سے بس تعلق رکھتی ہیں نہ یہ کہ وہ کسی لفظ کی کمی یا زیادتی کو بتاتی ہوں اور اس کے بعد بھی وہ آحاد کی روایتیں ہیں دوسرے اشخاص آحاد کی زبانی جن سے کوئی گمان بجائے خود بھی بحد وثوق واطمینان پیدا نہیں ہوتا چہ جائیکہ خود وہ آپس کے تعارض واختلاف کی وجہ سے کمزور بھی ہیں اور پھر اس رسم الخط کے خلاف ہیں جو عام مسلمانوں کے درمیان ایک ہزار برس سے زیادہ کی طولانی مدت میں قائم و برقرار رہا ہے اور قراء سبعہ میں سے ہر ایک صرف ایک راوی کی حیثیت رکھتا ہے جس کی عدالت اور وثاقت بھی ثابت نہیں ہے اور وہ ایسے ایسے احاد سے روایت کرتا ہے جن میں زیادہ تر اسی کی ایسی حیثیت رکھتے ہیں اور پھر خود ان کے بعد ان سے روایات کرنے والے بھی اسی قسم کے اشخاص ہیں چناں چہ عاصم کے دو شاگرد ہیں جن کے ذریعہ سے عاصم کی قراءت کا دنیا کو علم ہوا ہے مگر خود ان دونوں میں عاصم کی قراءت کے متعلق اکثر اختلاف ہوتا ہے کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔

اس طرح نافع کے دو شاگرد ابن کثیر سے روایت کے سلسلہ میں ایسا ہی ہے۔

اور ابوعمر بن العلا کے صرف ایک شاگرد یزیدی اور ان کے دو شاگرد ابوعمرو اور ابوشعیب۔

☆ ابن عامر سے سلسلہ روایت میں کچھ دوسرے اشخاص کے واسطہ سے ذکوان اور ہشام

☆ حمزہ کے ایک شاگرد سلیم اور ان کے دو ۲ راوی خلف اور خلاّد

☆ کسائی کے بھی دو ۲ راوی ابوعمر اور ابوالحارث

اب جبکہ ہر طبقہ میں سے ایک اور دو راوی ہوتے رہے اور وہ بھی باہمی اختلاف کے ساتھ تو تواتر کا دعوی بے بنیاد نہیں تو کیا ہے؟

پھر یہ کہ ان آحاد قراءتوں کی سندوں میں سے کوئی اہلسنت کے اصطلاح کے مطابق بھی صحیح کی تعریف میں داخل نہیں ہے چہ جائیکہ مذہب امامیہ کے معیار پر اس کے بعد نہایت حیرت ناک ہے کسی کا یہ کہنا کہ یہ ساتوں قراءتیں تواتر کا درجہ رکھتی ہیں اور یہ قاری عموماً تھوڑے سے فرق سے باوجود زیادہ تر اس رسم الخط کے موافق رہتے ہیں جو عام طور پر رائج ہے سوا شعبہ کی زبانی والی عاصم کی قراءت کے جو کبھی کبھی اس سے الگ ہوتی ہے اس لئے اس رسم الخط سے جو عموماً قرآن کا ہے برطرف کر کے کسی دوسرے انداز سے پڑھنا کسی طرح درست نہیں ہے خصوصاً جبکہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ:

اِقْرَاءُوْا كَمَا يَقْرَأُ النَّاس............اس طرح پڑھو جس طرح لوگ پڑھتے ہیں

اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ جو عام طریقہ قراءت کا ہے اس سے انحراف نہ کرو۔

ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ سات یا دس قراءتیں جو ہیں، وہ زیادہ تر کسی لفظ کی شکل وصورت میں عربی صرف واشتقاق کے مختلف طریقوں یا لغوی معنی کے لحاظ سے کچھ تبدیلیوں سے متعلق ہیں۔ جیسے: علیھم الیھم اور لدیھم میں ھم کی ھ (ہ) کو کسرہ دیا جائے یا ضمہ اور تظاھرون کی لفظ میں ظ تشدید کے ساتھ یا بغیر تشدید کے تو ان میں جس قراءت کے بھی مطابق پڑھیں اسے صحیح ہونا چاہیے مگر حقیقت میں تلاوت قرآن تو یہ ہے کہ جو لفظ بصورت وحی رسولؐ اتری ہوا سے پڑھا جائے نہ یہ کہ اپنے عربی قواعد کے معلومات کی بناء پر جس جس طرح وہ لفظ صحیح ہوتا ہو اس طرح اس کا ادا کرنا لہٰذا ہمیں یقین نہیں تو قوی سے قوی گمان اس لفظ کا حاصل کرنا ہے جو رسولؐ پر نازل ہوئی تھی اور وہ اس طریقہ پابندی سے وابستہ ہے جو عام مسلمانوں میں صدر اول سے اب تک رائج رہا ہے۔

رہ گیا ان قراءتوں کے اعتبار کے لئے سبعۃ احرف والی حدیث سے استناد، وہ انتہائی کمزور ہے۔

اول تو نزل لقرآن علی سبعۃ احرف والی حدیث اپنے لفظ و معنی کے اعتبار سے اس درجہ مبہم مضطرب اور تاریک ہے کہ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں اس کے معنی درج کرتے ہوئے لکھ دیا ہے کہ:

اختلف فی معنی سبعۃ احرف علیٰ اربعین قولا۔

اس سات حرفوں کے معنی میں چالیس مختلف قول وارد ہوئے ہیں

ان میں پینتیس ۳۵ قول ابن حیان کی کتاب سے درج بھی کئے ہیں اس کے بعد پھر خود حافظ سیوطی نے لکھا ہے:

وقد ظن کثیر من عوام انّ المراد بھا القراءات السبعۃ وھو جھل قبیح.

اور بہت سے عوام نے یہ گمان کیا ہے کہ اس سے مراد ساتوں قراءتیں ہیں اور یہ بہت بری جہالت کا مظاہرہ ہے

دوسرے یہ کہ مستدرک حاکم میں ان شرائط صحت کے ساتھ جو صحیحین کی حدیثوں کا معیار ہیں ابن مسعود کی روایت ہے حضرت پیغمبر خدا سے کہ:

نزل القرآن من سبعۃ ابواب علیٰ سبعۃ احرف زاجراً و اٰمراً وحلا لاً وحراماً و محکماً و متشابھاً وامثالاً.

قرآن مجید سات بابوں کے قبیل سے سات حرفوں پر نازل ہوا ہے ممانعت ہے، حکم ہے، حلال ہے، حرام ہے، محکم ہے، متشابہہ ہے اور امثال ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سات حرفوں سے مراد سات باب ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں آیات موجود ہیں۔

اسی کے مطابق ابن جریر کی روایت میں ابوقلابہ کی زبانی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

انزل القراٰن علیٰ سبعۃ احرف امر و زاجر و ترغیب و ترھیب و جدل و قصص و مثل.

قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے امر نہی، ترغیب، تہدید، بحث، مباحثہ، قصص اور امثال

اور ابن جریر سنجری ابن المنذر اور ابن الانباری نے ابن عباس کی زبانی حضرت کا ارشاد نقل کیا ہے کہ:

إِنَّ الْقُرْاٰن علیٰ اربعة احرف حلال و حرام. الخ

قرآن چار حرفوں پر ہے حلال، حرام وغیرہ

اور سنجری نے کتاب ابانہ میں حضرت علیؑ سے روایت کی ہے:

انزل القراٰن علیٰ عشرة احرف بشیر و نذیر و ناسخ و منسوخ وعظة و مثل و محکم و متشابه و حلال و حرام.

قرآن دس حرفوں پر اتارا گیا ہے خوشخبری تخویف وتحدید، ناسخ ومنسوخ، موعظہ وامثال، محکم ومتشابہ اور حلال وحرام

تیسرے اہلسنت کی کتابوں میں ان کے معیار پر بہت عمدہ سندوں کے ساتھ ایسی حدیثیں اس سلسلہ میں ہیں جو قطعی نا قابل قبول اور عقلی طور پر واہیات اور خرافات میں داخل ہیں جیسے احمد بن حنبل کی روایت ابوبکرہ سے کہ حضرت رسولؐ خدا نے تقاضہ کر کے جبرائیلؑ سے قرآن کی قراءت کے الفاظ میں ردوبدل کی اجازت حاصل کی یہاں تک کہ سات حرفوں تک تعداد پہونچی جبرائیلؑ نے کہا:

کلّها شاف کاف مالم تختم اٰیة عذاب برحمة واٰیة رحمة بعذاب.

یہ سب طریقے کافی اور شافی ہیں جب تک آیت عذاب کو رحمت پر اور آیت رحمت کو عذاب پر ختم نہ کیا جائے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جتنی چاہے الفاظ میں تبدیلیاں ہوجائیں بس اتنا نہ ہو کہ آیت عذاب آیت رحمت اور آیت رحمت آیت عذاب ہو جائے۔ دوسری حدیث میں ان جائز تغیرات کی مثال بھی دی گئی کہ جسے تعال کی جگہ اقبل ھلم اذھب اور اسرع کی جگہ اعجل وغیرہ

☆اسی طرح کی روایت طبرانی نے ابوبکرہ سے اور احمد وطبرانی دونوں نے ابن مسعود سے نقل کی ہے۔

☆ابوداؤد کی حدیث میں ہے:

لیس منها الاّ شاف کاف ان قلت سمیعا علیما. عزیزا حکیما مالم تختم اٰواٰیة عذاب برحمة بعذاب.

یہ سب طریقے شافی وکافی ہیں اگر تم سمیعا علیما کہو یا عزیزا حکیما کہو جب تک کہ آیت عذاب کو رحمت سے اور آیت رحمت کو عذاب سے بدلا نہ جائے۔

☆ابن جریر نے ابوہریرہ کی زبانی حضرتؐ سے روایت کی ہے:

إِنَّ هٰذا القراٰن نزل علیٰ سبعة احرف فاقرؤ ولا حرج ولکن لا تجمعوا ذکر رحمة بعذاب ولا ذکر عذاب بمغفرة.

یہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے لہٰذا تم شوق سے خاطر خواہ پڑھو کوئی مضائقہ نہیں ہے بے شک رحمت اور عذاب کی آیتوں کے خلط ملط نہ کرو۔

☆اور احمد بن حنبل نے عمر کی حدیث درج کی ہے کہ:

القراٰن کله صواب مالم تجعل مغفرة عذابا او عذابا مغفرة.

قرآن جس طرح بھی پڑھو ٹھیک ہی ہوگا جب تک کہ مغفرت کو عذاب اور عذاب کے مغفرت نہ بنادو۔

ان روایت کے لحاظ سے قرآن کی شان اعجاز تو بالکل بے حقیقت چیز ہو جاتی ہے اور سوا ایک محدود تبدیلی کے جس کی ممانعت کی گئی ہے باقی ہر طرح کی تحریف کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے جس کے بعد سالمیت قرآن کی لفظ کے معنی کوئی نہیں رہتے۔

چوتھے معتبر کتب اہل سنت میں ایسے تصریحات موجود ہیں جن سے اختلاف قراءت کی کوئی صحیح بنیاد باقی نہیں رہتی جیسا کہ ابن انباری نے یہ صراحت درج کی ہے کہ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، زیدؓ بن ثابت اور تمام مہاجرین وانصار کی ایک ہی قرائت تھی اور ابن ابی داؤد نے سند متصل کے ساتھ انس سے روایت کی ہے انہوں کہا کہ میں نے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؑ سب کے پیچھے نماز پڑھی ہے وہ سب مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پڑھتے تھے اور یہ بھی روایت لکھی ہے کہ سب سے پہلے جس نے مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پڑھا وہ مروان بن حکم تھا۔

پانچویں جو فیصلہ کن چیز اس بحث میں ہے، وہ امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے جو بطریق شیعہ سند متصل کے ساتھ کافی میں وارد ہے۔

إِنَّ القرآن واحد نزل من عند واحد ولكن الا ختلاف يجئ من قبل الرُّواة.

قرآن بس ایک ہے اور ایک ذات کے پاس سے نازل ہوا ہے مگر اختلاف پیدا ہوتا ہے مختلف راویوں کی وجہ سے

اور صدوقؒ نے اپنے اعتقادات میں بطور مرسل امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے اور کافی میں بطور صحیح فضیل بن یسار سے منقول ہے کہ:

قلتُ لا بی عبد اللهؑ إِنَّ النَّاس يقولون أَنَّ القرآن نزل على سبعة احرف فقالؑ كذبوا ولكنهٗ نزل على حرف واحد من عند الواحد.

میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا لوگ کہتے ہیں کہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے حضرت نے فرمایا وہ جھوٹے ہیں بلکہ وہ ایک حرف پر نازل ہوا ہے ایک ذات کی جانب سے اور اس کی موید یساری کی روایت بھی ہے جو امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ دونوں سے ہے۔

(۵) اصول تفسیر

اس سلسلہ میں چند پہلو قابل تبصرہ ہیں

(۱)مفرد الفاظ اور عربی زبان میں ان کے معانی کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن مجید عربی زبان کی سب سے زیادہ فصیح سب سے زیادہ عام عربوں میں رائج اور مانوس بولی میں اترا تھا لہٰذا عام طور پر اس کے تحت لفظی معانی قوم عرب کے افراد سے پوشیدہ نہ تھا سوا شاذ و نادر بعض الفاظ کے جو کسی سبب سے بعض افراد کو معلوم نہ ہو۔ جیسا کہ سورعبس میں ارشاد الٰہی ہے۔ وَفَا كِهَةً وَّ اَبًّا وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا. مگر جب غیر عرب دوسری قومیں مشرف بہ اسلام ہوئیں اور آپ کے میل جول سے امتداد زمانہ کے ساتھ خود عرب زبان میں تبدیلیاں ہوگئیں تو اب بہت ایسے الفاظ ہوگئے جو نزول قرآن کے وقت عام فہم تھے اور اب عربی روزمرہ والی زبان کے بدل جانے سے وہ الفاظ غیر عام فہم ہو گئے یہاں تک یہ واقفیت کی کمی خواص یعنی زمرہ علماء میں شمار ہونے والے اشخاص تک بھی پہونچ گئی تو اب کتب لغت سے مدد لی جانے لگی۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ مفردات الفاظ کو لغت اور محاورہ کے مطابق حل کرنے کی بنیاد زیادہ تر ذاتی حیثیت سے عربی ادب کی مزاولت اور موارد استعمال کے تتبع پر قائم ہونا چاہئے صرف کتب لغت میں دیکھ لینے سے صحیح نقطہ حقیقت کے پہنچنا جوئے شیر لائے سے کم نہیں ہے۔

مثال کے طور پر ہم ایک معمولی لفظ لمس اور اس کے ساتھ لفظ مس کو دیکھتے ہی اس میں لغت کی کتابوں میں وہ گڈ مڈ یا گڑبڑ ہے جس کے بعد لغت سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

نہایۃ اللّغتہ میں ہے لفظ مس کے معنی ہیں :

مست الشئ اذا لمسته بيدك.

کہا جاتا ہے میں نے اس چیز کو مس کیا جبکہ اپنے ہاتھ سے اس کا لمس کیا ہو

اب قاموس میں لمس کے معنی دیکھئے تو ملے گا:

لمسه مسته بيده ومسسه اى لمسه.

اسے لمس کیا یعنی اپنے ہاتھ سے مس کیا اور میں نے اسے مس کیا یعنی لمس کیا

اور مصباح میں ہے:

مسته افضيت اليه يدى من دون حائل هٰكذا اقيّده.

میں نے اسے مس کیا یعنی اپنا ہاتھ اس تک پہنچایا بغیر کسی کے اس طرح اس میں قید لگائی ہے

اور اس کے قبل لکھ چکے ہیں:

لمسه افضى اليه باليد هٰكذا فسّروه

اسے لمس کیا یعنی ہاتھ اس تک پہنچایا اس طرح اس کی تفسیر ہوئی ہے

ابن درید نے کہا ہے:

اصل اللمس باليد للمتصرف من الشئ.

لمس دراصل ہاتھ سے ہوتا ہے کہ کچھ اس چیز کو پہچانا جائے

اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ:

لمست مسست و کل ماسّ لامس.

''میں نے لمس کیا'' یعنی میں نے مس کیا اور ہر مس کرنے والا لمس کرنے والا ہے۔

اور فارابی نے کہا ہے کہ لمس مس ہے اور تہذیب میں ابن الاعرابی سے منقول ہے کہ لمس کسی شے کا مس کرنا ہے اور مس کو لکھا ہے کہ مس کے معنی ہیں کسی شے کا مس کرنا ہاتھ سے جوہری نے کہا ہے کہ لمس کے معنی ہیں مس پھر مصباح میں حل لغت کے بعد لکھا ہے:

إِذَا كَانَ اللَّمْسُ هُوَالْمَسُّ فَكَيْفَ يُفَرِّقُ الْفُقَهَاءُ بَيْنَهُمَا.

جب کہ لمس اور مس ایک چیز ہے تو معلوم نہیں فقہاء ان دونوں میں فرق کیوں قرار دیتے ہیں؟

مگر حقیقت یہ ہے کہ فقہاء معانی الفاظ کو صحیح طور سے سمجھنے میں ان لغوبین سے زیادہ نظر رکھتے ہیں اس لئے کہ ان کی عمریں گزرتی ہیں کتاب وسنت کی سیر اور کلام عرب کے تتبع میں انہوں نے بہت خوب سمجھا ہے اور ٹھیک کہا ہے کہ لمس اور مس دونوں میں باعتبار معنی کے فرق ہے۔

''لمس'' کسی شے کا خاص طور سے چھونا ہے ایک ایسے حصہ جسم سے اپنے کہ جس میں احساس کی طاقت ہو خاص طور پر چھونے کا مطلب یہ ہے کہ چھونا اسی قصد سے ہو کہ اسے شے کا احساس کیا جائے صرف ہاتھ سے چھونے کی خصوصیت نہیں ہے مگر ہر طرح سے چھونے کی تعمیم بھی نہیں ہے اگر کسی اور حصہ جسم سے اس مقصد سے چھوا جائے کہ احساس حاصل ہو تو وہ بھی لمس ہوگا لیکن اکثر یہ لمس ہاتھ ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے کیوں کہ وہ آسان ذریعہ ہے اور اس کا احساس زیادہ قوی ہے۔ مگر ''مس'' کے معنی ہیں چھو جانا دوسری شے کا اس میں قصد احساس کی خصوصیت نہیں ہے اور ہاتھ کے ذریعہ سے ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ جو شخص موارد استعمال کا تتبع کرے وہ تصدیق کرے گا کہ لمس اور مس کے یہی معنی ہیں جو تحریر ہوئے ہیں اور لغوییّن کی ایک بات بھی ٹھیک نہ تھی۔

اس کی دوسری مثال لفظ توفی ہے کہ اس میں اہل لغت کے کلمات میں بڑا اضطراب ہے کسی نے اس کے معنی اَمَاتَہ ''موت دینا'' لکھ دیئے اس کے اتباع میں اکثر مفسرین نے سورہ آل عمران کی آیت يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ میں یہ معنی لکھ دیئے کہ ''اے عیسٰی میں تمہیں موت دینے والا ہوں'' کسی نے کہا اُمِیْتُكَ حتف انفك ''تمہیں ایسا کروں گا کہ اپنی موت مرو''۔ کسی نے اس کے ساتھ اپنے عقیدہ حیات مسیحؑ کو سنبھالتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ

مُمِيْتُكَ فِي وَقْتِكَ بعد النزول من السماء.

تمہیں موت دی جائے گی تمہارے وقت پر آسمان سے اترنے کے بعد

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے نہ اس لفظ کے فلسفہ لغوی پر نظر ڈالی نہ اس کے ''مبدا'' اشتقاق پر نہ ''انقلاب تعریفی'' پر نہ قرآن مجید

کے محاورات پر نہ عرب کے استعمالات پر ورنہ ہرگز ہرگز وہ توفی کے معنی موت کے نہ قرار دیتے اور واقعہ یہ ہے کہ کسی ایک جگہ بھی قرآن یا غیر قرآن میں ''توفی'' بمعنی موت نہیں ہے بلکہ اس کے معنی ہیں لینا اور پورا کرنا یہ کبھی موت کی صورت سے ہوتا ہے، کبھی نیند کی صورت سے اسی طرح کبھی زندہ زمین سے آسمان پر اٹھا لئے جانے کے ساتھ ہوسکتا ہے اور خود قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال جس جس انداز سے ہوا ہے وہی اس حقیقت کے اظہار کے لئے کافی ہے جیسا کہ سورہ زمر میں ہے:۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى. (زمر۔۴۲)

اللہ توفی کرتا ہے نفوس کی ان کی موت کے وقت اور جنہیں موت نہیں آئی ہے ان کے سونے کے عالم میں تو روک لیتا ہے اس کو جس پر موت کا فیصلہ ہوا ہے اور بھیج دیتا ہے واپس دوسرے نفس کو ایک خاص مدت تک کیلئے۔

یہاں اگر یوں معنی کیے جائیں کہ اللہ نفوس کو ان کی موت کی صورت میں موت دیتا ہے تو کوئی معقول بات نہ ہوگی اور پھر مزید برآں کہ جسے موت نہیں آئی ہے اسے اس کی نیند کے عالم میں موت دیتا ہے یعنی چہ؟

اسی طرح ارشادِ الٰہی سورۂ انعام میں ہے:۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ. (انعام۔۶۰)

اور وہ، وہ ہے جو رات کو تمہاری توفی کرتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم نے دن کو کیا ہے پھر وہ دن میں تمہیں اٹھاتا ہے تاکہ مقررہ مدت پوری ہو پھر اسی کی طرف تمہارا پلٹنا ہوگا۔

یہاں بھی رات کو توفی کرنے کے معنی ہیں نیند کا طاری کرنا پھر اللہ بیداری کی صورت میں انہیں دن آنے پر اٹھاتا ہے تاکہ جو عمریں ان کی مقررہ ہیں انہیں پورا کرے پھر آخر میں مرنے اور قیامت میں اٹھائے جانے کی صورت سے اللہ کی طرف انہیں پلٹنا ہوتا ہے۔

اور جیسے کہ سورہ نساء میں ارشادِ الٰہی ہے۔(آیت۔۱۵)

حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ. یہاں ہم اگر یہ ترجمہ کریں کہ موت انہیں موت دے تو کوئی معنی نہ ہوں گے معنی اس کے وہی ہیں کہ موت ان کی مدتِ عمر کو پورا کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن اور غیر قرآن عرب کے کلام میں جہاں توفیٰ یا اس سے مشتق الفاظ آئے ہیں تو اس کے کسی شے کو پورا پورا لینے ہی کے معنی ہوتے ہیں جیسا کہ سکوں میں ''درہم وافی'' کا محاورہ ہے یعنی وہ سکہ جس میں کچھ کمی نہیں ہے اور یہ معنی توفی کے اہل لغت نے بھی درج کیے ہیں اور کہا ہے کہ توفاہ اور استوفاہ کے ایک ہی معنی ہیں اور اس کا شاہد شاعر کا یہ قول ہے:

ان بنی الادرد لیسو الاحد ولا توفّاھم قریش فی العدد.

بنوادرد کسی کی ملکیت نہیں ہیں اور نہ قریش تعداد میں ان کی توفی کر سکتے ہیں

یعنی ان کو پورا پورا لے نہیں سکتے لیکن میں کہتا ہوں کہ استیفا اور توفیٰ کے معنی میں اشتقاق کے زیر اثر ایک فرق نمایاں ہے۔

استیفاء باب استفعال کا مصدر ہے جیسے استخراج اس میں تدابیر کے ساتھ کسی شے یا مطالبہ کا پورا پورا حاصل کرنا نکلتا ہے اور توفی معنی میں کسی شے کا پورا حاصل کرنا نکلتا ہے قدرت کے ساتھ اس میں تدابیر کا ہونا ظاہر نہیں ہوتا اور اخذ کے معنی بس لینے کے ہیں اس میں پورے کا مفہوم نہیں ہے۔

اس آیت میں کہ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا میں یتوفّٰی فعل ہے جس کا مفعول الانفس معطوف علیہ ہے اور اسی پر اَلَّتِيْ لَمْ تَمُتْ کا عطف ہے اسی طرح ایک لفظ توفی یتوفی دو ۲ سے متعلق ہے ایک انفس اور دوسرے اَلَّتِيْ لَمْ تَمُتْ اب اگر یتوفی کے معنی لیں ''موت دیتا ہے'' تو الانفس تعلق کے ساتھ تو یہ معنی بن جائیں گے کہ نفوس کو موت دیتا ہے۔ مگر جنہیں موت نہیں آئی، اُنہیں موت دیتا ہے اس کے کیا معنی؟

کوئی کہے کہ وہاں توفی کے معنی بطور مجاز زندہ اٹھا لینے کے لئے لیں گے مگر جب یتوفی کا لفظ ایک ہے تو یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ ایک مفعول کے ساتھ تعلق میں اس کے کچھ معنی ہوں اور دوسرے مفعول کے ساتھ اس کے معنی کچھ اور ہوں۔

اور حقیقت امر وہی ہے کہ توفی کے ایک عام معنی ہیں اور وہ کسی شے کو پورا پورا لے لینا ہے خواہ عالم زندگی سے الگ کر کے یا عالم بیداری سے یا زمین اور اس دنیا کی اجتماعی زندگی سے علیحدہ کر کے آسمان کی طرف اٹھا کر جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے لئے ہوا۔

(۲) مفردات الفاظ کے حل کر چکنے کے بعد دوسری منزل ان الفاظ کے باہمی ارتباط پر نظر کرنا ہے۔ اس کا تعلق علم نحو سے ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اس میں بھی نحویوں کے بنائے ہوئے قاعدوں سے زیادہ ذاتی محاورات کے مطالعہ اور عربی کلام کے اسلوب سے انس اور واقفیت پر دار و مدار ہونا چاہئے۔

علم نحو کی کتابیں اس وقت کے لئے خوب ہیں جب کہ انسان عربی سے ناشناس ہو اور عربی زبان کو حاصل کرنا چاہ رہا ہو۔ اس وقت کے لئے نحو کی بنیادی قواعد بیشک ایسے ہیں جن کو پیش نظر رکھ کرا سے آگے بڑھانا اور تحصیل علم عربی میں مصروف ہونا چاہئے لیکن جب انسان کو ملکہ عبارت کے سمجھنے اور صحیح پڑھنے کا پیدا ہو گیا اب اس کو نحو کی کتابوں اور نحویوں کی دور از کار باتوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑتا وہ جتنا آگے بڑھتا ہے سیر و تتبع کلام فصحاء میں اس کے سامنے نئے نئے اسلوب پیش کرتا جاتا ہے جو ان حدود سے بالکل آگے ہے جن تک نحوی لوگ پہنچ سکے ہیں۔

یعنی سمجھنا چاہئے کہ نحوین کی بہت سی باتیں بالکل ڈھکوسلے کی ہوتی ہیں جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔

مثلاً ایک شاعر کا مصرع ہے:

جاءوا بمذق هل رايت الذئب اقط

''لائے وہ دودھ جس میں پانی ملا ہوا تھا، کیا تم نے بھیڑیا کبھی دیکھا ہے''۔

یہ ایک خاص انداز کلام ہے جس سے زبان شناس افراد لطف اٹھا سکتے ہیں۔

اب ہمارے نحوی اصحاب اس کی ترکیب کہنے بیٹھے الفیہ کے شارحین نیز دوسری نحوی کتابوں کے مصنف لکھتے ہیں کہ اس کلام کی تقدیر یوں ہے:

جاءوا بمذق مقول فيه هل رأيت الذئب قط.

وہ لوگ ایسا پانی ملا ہوا دودھ لائے جس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ تم نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟

اب خدا ہی کو معلوم ہے کہ اس توجیہ سے بیچارے شاعر کی روح پر کیا گذری؟

وہ تو دودھ کی رنگت کی تصویر کھینچنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ رنگ پیش نظر ہو جائے جو پانی کی کثرت سے دودھ میں نظر آرہا تھا اس نے یہ الفاظ ایک خاص مصوری کے انداز پر کہے تھے ذی علم محقق ارباب نحو نے ترکیب نحوی کی فکر میں اس کو یوں کہا کہ "دودھ ایسا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟" "یہ" "کبھی بھیڑیا دیکھا ہے۔" "اس کلمہ مقدر مقول فیہ" جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کے ذریعہ سے دودھ کی صفت قرار پا گیا لیکن کیا اس طرح شاعر کا اصلی مقصود حاصل ہوتا ہے کیا شاعر یہی کہنا چاہتا تھا؟ نہیں ہرگز نہیں آخر دودھ کے بارے میں اس کے کہے جانے کے کیا معنی کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ هل رایت الذیب قط تم نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے بالکل مستقل استفہامی جملہ ہے جس کی سابق کلام کے ساتھ ترکیبی حیثیت سے کوئی آویزش نہیں ہے وہ صرف ظاہر کرنے والا ہے دودھ کی ایک صفت کو جو شاعر کے ذہن میں ہے کلام کا جزء نہیں ہے وہ یہ کہ لو نہ کلون الذئب دودھ ایسا تھا کہ جس کا رنگ ہو بہو بھیڑیے کا سا تھا اس کو دل میں رکھ کر اس نے سامعین کے ہر فرد سے سوال کیا ہے هل رایت الذئب قط تم نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے یعنی اگر تم نے دیکھا ہو تو تم تصدیق کروگے کہ بیشک دودھ اسی رنگ کا ہے۔

اب دیکھیے کہ یہ معنی کہیں بھی نحویین کی ساختہ و پرداختہ ترکیب سے پیدا ہوتے ہیں؟

نحویین کے اس طرح کے ڈھکوسلوں کی آماجگاہ قرآن مجید کی آیتیں بھی بنی ہیں جس کی مثال ایک یہ ہے کہ قرآن میں متعدد جگہ لَآ اُقْسِمُ کا لفظ ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ۔ لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ وغیرہ ان آیات کی تفسیر میں جار اللہ زمخشری ایسا متبحر عالم نحو ولغت ایسا گھبرایا ہوا نظر آتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

پہلی آیت:

☆فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ ○ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ (سورہ واقعہ) میں نہیں قسم کھاتا ستاروں کے غروب ہونے کے مقامات کی حالانکہ یہ قسم اگر تم جانو بہت عظیم ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ لا اقسم کے معنی ہیں اقسم قسم کھاتا ہوں اور لا زائد ہے جیسے

دوسری آیت:

☆لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ میں زائد ہے۔ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ: میں نہیں قسم کھاتا روز قیامت کی اور نہیں قسم کھاتا انسان کے نفس کی جو معصیتوں پر ملامت کرتا ہے یہاں ارشاد ہوتا ہے کہ لائے نافیہ کا آنا فعل قسم پر کلام عرب میں بہت شائع وذائع ہے مثلاً امرالقیس نے کہا ہے:

"لَا و ابيك ابنة العامری لَا یدّعی القوم آنی آفر"۔ "نہیں قسم تیرے باپ کی اے عامری لڑکی! قوم والے نہیں دعویٰ کر سکتے کہ میں جنگ سے فرار کرتا ہوں"۔

غویہ بن سلمہ نے کہا ہے:

الا نادت امامة باحتمال   لتحزننی فلا بك لا ابالی

"امامہ (شاعر کی معشوقہ) نے اعلان کیا ہے کہ وہ اب کہیں اور روانہ ہو جائے گی تا کہ مجھے رنج پہنچائے تو نہیں قسم تمہاری میں کوئی پرواہ نہیں کروں گا۔

اس کلمہ "لا" کا فائدہ قسم میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ زائد ہوتا ہے جیسے: لِئَلَّا یَعْلَمَ اَهْلُ الْکِتٰبِ۔ پھر ادھر ادھر کی کچھ باتوں کے بعد جو نا قابل قبول ہیں کہتے ہیں حق یہ ہے کہ لا نفی ہی کے لئے ہوتا ہے اور معنی یہ ہوتے ہیں کہ میں اس شے کی قسم اس کو عظمت عطا کرنے کے لئے نہیں کھاتا ہوں۔ اس کی دلیل ہے یہ آیت:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ، گویا حرف نفی کے داخل کرنے سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ میرا قسم کھانا اس شے کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے قسم نہ کھانے کے برابر ہے کیوں کہ وہ شے خود ہی عظیم ہے۔

یہ جناب زمخشری کا کلام عجیب وغریب ہے کہاں فعل قسم یعنی اُقْسِمُ یعنی قسم پر لائے نفی کا داخل ہونا جیسا کہ قرآن کی محل بحث آیت میں ہے اور کہاں امرالقیس اور غویہ بن سلمہ کے کلام میں حرف نفی یعنی "لا" کا حرف قسم یعنی "وْ" اور "ب" کے پہلے آجانا اور پھر قسم کے بعد اس لا کا دہرایا جانا جو شاہد میں پیش کیا گیا ہے۔

ان اشعار میں لا کا قسم سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے بلکہ وہ اس منفی جملہ کا جو قسم کے ساتھ کہا جا رہا ہے اور بعد میں بطور جواب قسم آنے والا ایک جزء ہے جسے بطور تاکید دہرانے کے لئے ایک دفعہ قسم سے پہلے لا یا گیا ہے اور دوسری دفعہ فعل منفی کے ساتھ بعد قسم اس کی نظیر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے کہ:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ. (نساء۔ ۶۵)

تو نہیں خدا کی قسم وہ ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے نزاعات میں آپ کے فیصلہ پر راضی نہ ہوں

اس کو کیا نسبت اس کلمہ "لا" سے جو خود فعل قسم پر داخل کیا گیا ہو جیسا لَآ اُقْسِمُ والی آیتوں میں ہے۔

تیسری آیت

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ. (حاقہ۔ ۳۸۔ ۳۹)

میں نہیں قسم کھاتا ان چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو اور ان چیزوں کو جو تم نہیں دیکھ سکتے

اس کی تفسیر میں لکھا ہے "یہ قسم ہے تمام اشیاء کی" سورہ بلد میں ہے۔

چوتھی آیت

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ.

"میں نہیں قسم کھاتا اس شہر کی" اور اس کے معنی یہ ہیں کہ "قسم کھاتا ہوں"

اسی طرح سورہ مَعَارِج تَکْوِیر اور اِنْشِقَاق میں لَآ اُقْسِمُ کے معنی اُقْسِمُ کے قرار دیئے ہیں۔

دوسرے مقامات جہاں حرفوں کوزائد کہا گیا ہے: مثلاً: سورۂ حدید میں: لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ۔اس کے معنی زمخشری نے قرار دیئے ہیں لیعلم اھل الکتب ''تاکہ اہل کتاب کومعلوم ہو'' دوسرے کچھ علماء نے بھی زمخشری کی ہمنوائی فرمائی ہے۔

افسوس ناک نتیجہ:

اس کانتیجہ یہ ہوا کہ دشمنانِ قرآن کوقرآن پر اعتراض کا موقع مل گیا کہ اس میں بھرتی کے زائد الفاظ ہیں مگر کتاب ''الہدیٰ الی دین'' کے حصہ اول صفحہ ۳۵۴ و ۳۵۵ میں زیادتی الفاظ کے اس تصور کا بطلان ثابت کیا گیا ہے اور تمام آیتوں میں لا کے معنی بتائے گئے ہیں مثلا سورہ حدید کی آیت:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ (حدید۔۲۸۔۲۹) (سپارہ۔۲۷)

اے ایمان لانے والو! تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسول کا اقرار کرو تو وہ عطا کرے گا تمہیں دہرا حصہ اپنی رحمت کا اور قرار دے گا تمہارے لئے ایک روشنی جس کی مدد سے راستہ طے کروگے اور تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے مہربان تاکہ نہ سمجھیں اہل کتاب کہ وہ لوگ، (جو ایمان لائے) کچھ قدرت نہیں رکھتے، اللہ کے فضل وکرم کے کسی جزء پر بھی اور بلاشبہہ فضل واحسان اللہ کے ہاتھ میں ہے۔وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے

اس آیت میں یہ لوگ لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ میں لا کو زائد مانتے ہیں اور اس کے معنی یہ قرار دیتے ہیں کہ ''تاکہ معلوم ہوا اہل کتاب کو''۔

ان لوگوں کی آخر سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ خدا کو اس کی کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس کو کہنا ہو کسی بات کے بارے میں کہ وہ اس طرح ہے مگر وہ اس میں نفی کا کلمہ بڑھا کر جملہ ایسا کہہ دے جس کے معنی یہ ہوں کہ ایسا نہیں ہے! یہ صرف معنی میں عدم تدبیر کا نتیجہ ہے اگر غور سے کام لیتے تو معلوم ہوتا کہ لا زائد نہیں ہے وہ نفی کے معنی رکھتا ہے اور وہ نفی مقصود متکلم کا جزء ہے۔

مطلب آیت کا ٹنگلک بھی نہیں ہے۔ بالکل صاف ہے جو آیت کے پہلو میں درج شدہ ترجمہ سے ظاہر ہے مطلب یہ ہے کہ اگر اہل ایمان تقویٰ اختیار کریں گے تو خدا کی خاص رحمتوں سے سرفراز ہوں گے اور وہ ان کو نور عطا کرے گا اور ان کی مغفرت کرے گا۔اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلمین، یہود ونصاریٰ جو اس وقت مسلمانوں کو بالکل بے بس اور بے اقتدار دیکھ رہے ہیں انہیں اس کے بعد یہ پتہ نہ چلے گا اور وہ یہ محسوس نہ کریں گے کہ یہ بے بس ہیں اور ان کا کوئی اقتدار نہیں ہے اور نیز اس لئے کہ فضل واحسان تو خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

اب ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ کلمہ نفی لا رکن کلام ہے یا نہیں اور بغیر اس کے معنی ناقص ہو جاتے ہیں یا نہیں کچھ اور مقامات جہاں لا کو زائد سمجھا گیا ہے۔

(۱) سورہ اعراف کی آیت:

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ (اعراف۔۱۲)

کہا کون سی چیز تجھے مانع ہوئی کہ تو سجدہ نہ کرے جبکہ میں نے تجھے حکم دیا کہا میں اس سے بہتر ہوں مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ یہاں بھی صاحب کشاف نے کہا ہے کہ الا تسجد میں لا زائد ہے اس دلیل سے کہ دوسری جگہ قرآن میں سورہ ص میں ہے:

مَا مَنَعَكَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَىَّ ؕ (ص۔۷۵)

تجھے کون امر مانع ہوا اس سے کہ تو سجدہ کرے اسے جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا

اور یہ ویسا ہی ہے جیسے لِئَلَّا يَعۡلَمَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ کے معنی ہیں لِيَعۡلَمَ : میں کہتا ہوں کہ جو شخص سورہ اعراف اور سورہ ص دونوں جگہ کی آیتوں پر غور کرے اس کی سمجھ میں آئے گا کہ لا زائد نہیں ہے بلکہ سورہ اعراف میں لا اشارہ کے لئے آیا ہے اس امر کی طرف جس کی سورہ ص کے آیات میں صراحت ہے۔

بات یہ ہے کہ کوئی کام جو وقوع میں نہ آئے تو اس کے وقوع سے جو امر مانع ہوتا ہے جیسے: ضد، ملامت، غفلت، عاجزی یا کاہلی اور وہ باعث ہوتا ہے اس کے ترک کا اور تعمیل حکم سے روگردانی کا محرک ہوتا ہے سورہ ص میں پہلے مقام سرزنش میں مانع پوچھ گیا ہے ان الفاظ میں کہ " تجھے کون سا امر اس سے مانع ہوا کہ تو سجدہ کرے" اور پھر اس مانع کو ظاہر کر دیا گیا۔۔ یہ کہہ کر کہ:

اَسۡتَكۡبَرۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡعَالِيۡنَ ○ (ص۔۷۵)

تو نے کیا گھمنڈ سے کام لیا یا تو اونچے لوگوں میں سے ہے۔

اور سورہ اعراف میں مانع کو دریافت کیا گیا ہے جو باعث ترک سجدہ ہوا۔ معنی کلام کے یہ ہیں کہ سجدہ سے کون سا امر مانع تھا جس کے باعث تو نے سجدہ نہ کیا؟ اور پھر شیطان کی زبانی اس باعث کو ظاہر کیا ہے کہ:

اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ خَلَقۡتَنِىۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡنٍ.

میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا۔

(۲) سورہ طہٰ آیت

قَالَ يٰهٰرُوۡنُ مَا مَنَعَكَ اِذۡ رَاَيۡتَهُمۡ ضَلُّوۡۤا ○ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيۡتَ اَمۡرِىۡ ○ (سورۂ طٰهٰ آیت۔ ۹۲۔۹۳)

(موسیٰؑ نے) کہا اے ہارون کیا امر تمہیں مانع ہوا جب تم نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہوگئے کہ تم میرے پیچھے نہ آؤ تو کیا تم نے میرے حکم سے عدول کیا؟

یہاں اَفَعَصَيۡتَ کی ف (جس کا ترجمہ "تو" ہے) یہ بتاتی ہے کہ اس سے پہلے پیچھے آنے کا مانع جو باعث ہوا عدولِ حکمی کا، دریافت کیا گیا ہے۔ مگر صاحبِ کشاف نے یہاں بھی کہا ہے کہ لا زائد ہے۔ معنی یہ ہیں کہ کیا امر تمہیں مانع ہوا اس سے کہ تم میرے پیچھے آ ؤ۔

(۳) ارشاد الٰہی ہے:۔

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرۡيَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَاۤ اَنَّهُمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ.(انبیاء۔ ۹۵)

اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کیا اس پر حرام ہے کہ وہ نہ پلٹیں۔

کشاف میں ہے کہ پلٹنے سے مراد کفر کو چھوڑ کر اسلام کی طرف رجوع ہونا ہے اور لا زائد ہے۔ لیکن اس کی ضرورت کیا ہے کہ پلٹنے سے

مراد اسلام کی طرف پلٹنا لیا جائے تا کہ لا زائد قرار پائے۔ کیوں نہ اس سے مراد لیا جائے توبہ و انابت اور اقرار ایمان کی طرف رجوع ہونا آثار عذاب کے دیکھنے کے بعد جیسے فرعون کا اقرار ایمان ڈوبنے کے وقت جس کا ذکر سورۂ یونس میں ہے۔ یا جس کا تذکرہ سورۂ نساء میں ہے۔

اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ. (نساء۔۱۸)

جب ان میں سے کسی کے سر پر موت آ کر کھڑی ہو تب وہ کہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں

اور جیسا کہ سورہ مومنون میں مشرکوں اور ظالموں کے تذکرہ میں ہے

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّىْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ. (مؤمنون۔۹۹۔۱۰۰)

جب ان میں سے کسی کو موت آنے لگتی ہے تو وہ کہتا ہے اے پروردگار مجھے واپس کردے شاید کہ میں اب نیک اعمال کروں تو یہ سب توبہ و انابت کی طرف رجوع کی مثالیں ہیں مگر آثار عذاب کے مشاہدہ کے بعد یہ رجوع قبول نہ ہوگی بس اسی طرح اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ ان بستیوں والے جنہیں اللہ نے ہلاک کیا ان پر حرام ہے یعنی ناممکن ہے فطری طور پر کہ وہ عذاب کے آثار دیکھنے کے بعد اقرار ایمان اور توبہ و انابت کی طرف رجوع نہ ہوں۔

(۴) سورہ آل عمران کی آیتیں:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّىْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ (آل عمران۔۷۹۔۸۰)

کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ اللہ سے کتاب و حکمت اور نبوت عطا کرے پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کو میرے بندے بن جاؤ بلکہ (وہ تو یہی کہیں گے کہ) اللہ والے بنو اس بناء پر کہ تم کتاب الٰہی کی تعلیم دیتے رہو اور اسے پڑھتے پڑھاتے رہو اور نہ یہ کہ وہ حکم دے کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا بنالو۔ اس میں لا یا مرکم کا عطف ہے یقول پر جس کا ثُمَّ کے ساتھ عطف تھا ما کے بعد والے جملہ منفی پر یعنی یہ حق نہیں کہ وہ یوں کہے اور نہ یہ کہ وہ حکم دے تو یہ بعد کی نفی اس پہلی نفی میں زور پیدا کرنے کے لئے ہے جسے دوسرے قول کے طور پر کشاف نے بھی درج کیا ہے اور کہا ہے کہ اس صورت میں لا زائد نہیں ہوگا۔

مذکورہ بالا آیات میں لا کو زائد قرار دینے میں زمخشری منفرد نہیں ہیں بلکہ بہت سے مفسرین اور نحویین اس توہم میں مبتلا ہیں۔

حالانکہ اگر کلام عرب میں لا کا زائد ہونا نظم اور نثر میں رائج ہو تب بھی ان آیات قرآن میں جب کہ نفی کی صورت میں معنی بنتے ہیں تو لا کو زائد قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں اور حقیقت کلام عرب میں بھی سوا شاذ و نادر اکا دکا اشعار کے جنہیں انہی زائد کہنے والوں نے تلاش سے نکال کر درج کیا ہے اور ا ہم ان اشعار کے متعلق وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کس دور میں کہے گئے ہیں باقی ہمیں عام طور پر اس کی مثالیں نہیں ملتیں۔

بعض آیات قرآن میں تو زمخشری نے بھی لا کے زائد کہنے والوں سے اتفاق نہیں کیا ہے جیسے سورہ انعام میں:

وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (انعام۔۱۰۹)

اور تمہیں بھلا کیا خبر کہ جب وہ معجزے آئیں گے تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اور اسی سورہ میں:

قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمۡ عَلَيۡكُمۡ اَلَّا تُشۡرِكُوۡا .(انعام۔۱۵۱)

کہیے کہ آؤ میں بیان کروں تم سے وہ باتیں جن کی تمہارے پروردگار نے تم پر پابندی عائد کی ہے تم شرک نہ کرو۔

مگر سورہ نساء کی اس آیت میں کہ:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوۡكَ .(نساء۔۶۵)

تو نہیں قسم تمہارے پروردگار کی وہ ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک آپ کو ثالث نہ مانیں۔

لکھ دیا ہے کہ فَلَا وَرَبِّكَ کے معنی ہیں: فَوَرَبِّكَ جیسے دوسری جگہ ہے:فَوَرَبِّكَ لَنَسۡـَٔلَنَّهُمۡ ''تو قسم تمہارے پروردگار کی ہم ان سے ضرور سوال کریں گے''۔ یہاں لا بڑھایا گیا ہے قسم کے مضمون کو پرزور بنانے کے لئے جیسے:لِئَلَّا يَعۡلَمَ میں بڑھایا گیا ہے علم کی ضروری ہونے پر زور دینے کے لئے۔

ان چند سطروں میں جو انتشار خیال ہے وہ قابل عبرت ہے اور اتنی تفصیل اس بحث کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔

شریف رضی نے حقائق التاویل میں بعض لوگوں کا قول واؤ کی زیادتی کے بارے میں چند آیات قرآن کی ذیل میں نقل کیا ہے مثلاً سورہ آل عمران میں وَلَوِ افۡتَدٰى بِهٖ اور سورہ ابراہیم ہیں: وَلِيُنۡذَرُوۡا بِهٖ اور سورہ زمر میں: وہ واؤ عطف ہے ایسے معطوف کے ساتھ جس کا معطوف علیہ لفظاً محذوف ہے مگر سیاق کلام سے ظاہر ہے۔اور بھی مقامات پر یہ علمائے نحو کا اسلوب قرآن سمجھنے سے قاصر ہونا ہے جس کی بناء پر ان کے تردد اور اضطراب کی وجہ سے دشمنان قرآن کو قرآن پر اعتراضات کا موقع ملا ہے اور اس کے بعض نمونے اور ان کی تشریح کتاب الہدی حصہ اول میں اور بالخصوص تیرہویں مقدمہ میں ۳۲۱ سے آخر کتاب تک سیر حاصل طور پر کی گئی ہے۔

ان صاحبان فن کی فنکاریوں سے قرآن فہمی میں دشواریاں پیدا ہوئی ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت سے قرآنی محاورات واستعارات صدر اسلام میں کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں سمجھے گئے اور بعد میں جبکہ فطری ادب عربی کی بہار خزاں سے بدل گئی تو وہ معرکتہ الآرا مسائل بن گئے۔ جیسے ''اضلال'' کی نسبت خداوند عالم کی جانب جو بہت سے آیات میں ہے وہ حقیقتاً انسانی نفس امارہ کی دسیسہ کاریوں کے ساتھ توفیق الٰہی کے سہارے کی ضرورت ثابت کرنے والی ایک نہایت حسین مجازی تعبیر تھی جس کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ انسان کی بداعمالی کا ایک درجہ وہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس کے نفس کے سپرد کر دیا جائے جس کا اثر انسان کی گمراہی کی شکل میں ویسا ہی قوت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔جیسا گمراہ کرنے کا اثر ہو سکتا ہے اسی شباہت کے لحاظ سے بطور استعارہ اس کی تعبیر اضلال یعنی گمراہ کرنے کے ساتھ ہوئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو توفیق الٰہی کی نعمت کی قدر ہو۔

ضلال کے اطلاق میں اس مجازی پہلو کا قرینہ قرآن کی وہ صاف آیتیں ہیں جیسے سورہ اعراف میں: آیت ۲۸

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ ؕ

بیشک اللہ برے کام کی تحریک نہیں کرتا

اور سورۂ نحل میں

اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ وَاِيۡتَآئِ ذِى الۡقُرۡبٰى وَيَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ وَالۡبَغۡىِ ۚ يَعِظُكُمۡ لَعَلَّكُمۡ

تَذَکَّرُوْنَ○ (النحل۔۹۰)

بلاشبہ اللہ عدالت، بھلائی اور صاحبان قرابت کے حقوق کی ادائیگی کے لئے تحریک کرتا ہے اور شرمناک کام برائی اور ظلم وتعدی سے روکتا ہے اس طرح تمہیں نصیحت کرتا ہے شاید تم اثر قبول کرو۔

اللہ کا اپنی ثنا وصفت میں اسے بیان کرنا کہ وہ اچھائی کی تحریک کرتا اور برائی سے روکتا ہے اس کا قطعی ثبوت ہے کہ گمراہ کرنے کی نسبت اس کی طرف مجاز ہے۔اور بھلا گمراہ کرنے کی نسبت اس کی طرف بطور حقیقت کیوں کر ہو سکتی ہے جبکہ وہ گمراہوں کی مذمت کرتا ہے۔انہیں ان کی گمراہی پر سزا دیتا ہے اور ان کی طرح طرح سے سرزنش کرتا ہے مثلاً:

کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ / لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَکۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ / لِمَ تَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَمَا لَکُمۡ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ / فَمَا لَہُمۡ عَنِ التَّذۡکِرَۃِ مُعۡرِضِیۡنَ / وَمَا ذَا عَلَیۡہِمۡ لَوۡ اٰمَنُوۡا۔

کیوں کر تم اللہ کا انکار کرتے ہو کیوں حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو۔ کیوں اللہ کے راستے سے روگردانی کرتے ہو؟ تو کیا ہو گیا ہے تمہیں! تم کیسے فیصلے کرتے ہو تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔تو آخر انہیں کیا ہے کہ وہ نصیحت سے روگردانی کرتے ہیں اور آخر ان کا کیا نقصان تھا اگر وہ ایمان لاتے۔

یہ بحث تفصیلی طور پر علم کلام کے کتب میں درج ہے اور کافی حد تک حصہ سوم رحلہ مدرسہ ۲۹ تا ۴۲ میں موجود ہے۔

اس کی ایک مثال قرآن مجید کی آیت الرحمن علی العرش استوی ہے جس میں قرآن مجید کے واضح آیات اور عقلی دلائل پر جو قطعی ہیں، اگر نظر رکھی جاتی تو سمجھ میں آتا کہ عرش سے یہاں پر شان قدرت وجلال اور ازل وابد میں عالم ملکوت پر اس کا اقتدار مراد ہے اور ہماری کوتاہ ذہنیتوں کے لئے جو محسوسات کے دائرہ میں گرفتار ہیں، اس کی تشبیہ دی گئی ہے اس تخت سلطنت سے جس پر سلاطین زمانہ متمکن ہوتے ہیں لیکن ظاہر پرستوں کی اس عجوبہ آفرینی کو کیا کیا جائے کہ ابن مردویہ اور خطیب نے اپنی تاریخ میں اور ابن منصور نے اپنے سنن میں حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بروایت عمر بن الخطاب یہ حدیث درج کر دی۔اسی آیت الرحمن علی العرش استوی کے ذیل میں کہ وہ عرش پر اس طرح بیٹھتا ہے کہ عرش کے چرچرانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔کنیز العمال جلد ۶ ۲۲۲ اور منتخب کنز العمال میں بھی یہ احادیث درج ہیں۔میزان الاعتدال ذہبی میں عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ۔کی تفسیر میں مجاہد کی زبانی نقل کیا ہے کہ خدا حضرت کو عرش پر اپنے پاس بٹھائے گا۔

کنا شو اھد الحق شیخ یوسف بنہانی ۱۳۰ پر ہے کہ ابن تیمیہ کے تصانیف سے ایک کتاب العرش ہے۔ کشف الظنون میں ہے کہ اس میں لکھا ہے کہ اللہ عرش پر بیٹھتا ہے اور اس میں ایک جگہ خالی رکھی ہے جس میں رسول خدا اس کے پاس بیٹھیں گے۔جیسا کہ ابوحیان نے آیت قرآن وسع کر سیہ السموات والارض کی تفسیر میں درج کیا ہے اور اس میں بھی احمد بن تیمیہ کی کتاب العرش کا حوالہ دیا ہے اور اسی آہنگ پر محمد بن عبدالوہاب نجدی کا ترانہ ہے۔اپنے مطبوعہ رسالہ میں جو دیگر رسائل کے ساتھ ایک مجموعہ کے اندر مکہ معظمہ میں طبع ہوا ہے اور صفحہ ۱۵۵ و ۱۵۶ میں یہی باتیں اسی میں درج ہیں۔

یہ ہے بقدر ضرورت سرکار بلاغی کے افادات کا خلاصہ

تفسیر فصل الخطاب

جلداول

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ---------------------------------144

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ---------------------------------160

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرَان---------------------------------449

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوۡرَۃُ الۡفَاتِحَۃِ

سورہ کے لفظی اور اصطلاحی معنی:

سورہ کے لفظی معنی جو اس کے معنی اصطلاحی کے ساتھ قریبی مناسبت رکھتے ہیں۔شہر پناہ [1] کی دیوار یا ''احاطہ'' کے ہیں لہٰذا ایک قرآنی آیات کے مجموعہ کا جو حضرت احدیت کی طرف سے ایک خاص نام کے ساتھ نازل کیا گیا سورہ نام قرار دیا گیا ہے۔گویا وہ ایک ''احاطہ'' ہے جو کچھ آیات کے گرد گھیر دیا گیا ہے۔قرآن مجید کی تقسیم صرف سوروں کی طرف منجانب اللہ ہے اس کے علاوہ پاروں [2] ربعوں [3] اور رکوعوں [4] کی طرف تقسیم بعد میں قاریوں کی کارستانی ہے جس سے پڑھنے میں سہولت پیدا کرنا منظور تھی۔

قدیم زمانہ میں صفحات کی تعداد کے بجائے حروف کے شمار سے کتابوں کے حجم کا تعین ہوتا تھا مثلاً کہا جاتا تھا فلاں کتاب پچاس ہزار بیتوں کی ہے اور بیت کے معنی ہوتے تھے حرفوں کی ایک خاص تعداد مثلاً پچاس حرفوں کو ایک بیت کہتے تھے پاروں کی تقسیم میں بس اسی اعتبار سے برابر کے اجزاء ہیں کہ ان میں حرفوں کی تعداد تقریباً برابر برابر ہو جائے۔اس میں معنی و مفہوم پر بالکل نظر نہیں کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک بات آدھی پہلے پارے میں چلی جاتی ہے آدھی دوسرے پارے میں تو جب الگ الگ پارے ہوں، جیسا کہ اکثر رائج ہے تو بعض اوقات ایک پارہ کی پہلی آیت کا مطلب سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے جب تک اس کے قبل کا پارہ نکال کر دیکھا نہ جائے کہ اس میں کیا ذکر چل رہا تھا؟

بعد رسول خلفاء کی طرف سے جو قرآن جمع کیا گیا اس میں اکثر ایک سورہ کی آیتیں دوسرے سوروں میں چلی گئیں مگر بعض سورے جو شروع سے آخر تک ایک خاص ساخت رکھتے ہیں ان میں یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ شروع سے اسی صورت پر تھے جس طرح اس وقت موجود ہیں۔ سورہ حمد ایسے ہی سوروں میں سے ہے اس کے علاوہ چوں کہ اس سورہ کا نماز میں بالتکرار پڑھنا فرض عین ہے لہٰذا زمانہ رسولؐ ہی سے اس کو ترتیب

---

[1] ۔سورۃ المدینۃ حائطہا (راغب)

[2] ۔قرآن کے ۳۰ حصے مہینے کہ تیس دنوں کے اعتبار سے کر کے ہر حصہ کا نام عربی میں ''جزؤ'' قرار دیا گیا ہے جسے فارسی اور اردو میں پارہ کہتے ہیں۔اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر دن ایک پارہ پڑھ کر مہینہ بھر میں پورا قرآن بآسانی ختم کیا جاسکے۔

[3] ۔پارہ کے چار حصے کر کے ہر حصہ کو رُبع کہا جاتا ہے۔پہلے رُبع کے ختم پر تو رُبع ہی لکھا جاتا ہے۔دوسرے پر نصف اور تیسرے پر ثلث یعنی ثلثہ ارباع ''تین چوتھائی حصے''۔

[4] ۔سوروں کی تقسیم رکوعوں پر کی گئی ہے ہر رکوع تقریباً دس آیتوں کا ہے چونکہ جمہور اہل اسلام نماز میں سورہ حمد کے بعد پورا سورہ پڑھنا ضروری نہیں سمجھتے اسلئے عبدالماجد صاحب دریابادی کی لفظوں میں ''یہ اتنی مقدار ہے جو ایک رکعت میں بآسانی پڑھی جاسکتی ہے چھوٹے سوروں میں ہر سورہ کو ایک رکوع قرار دیا گیا ہے چنانچہ سورہ حمد کو بھی ایک رکوع سمجھا جاتا ہے'' علمائے شیعہ کی اکثریت پورا سورہ ضروری سمجھتی ہے اس لئے ہمارے یہاں رکوعوں میں کوئی افادیت نہیں ہے۔

کے لحاظ سے بھی تواتر کا درجہ حاصل ہوگیا جو اس مرتبہ پر بہت کم سوروں کے لئے سمجھا جا سکتا ہے۔

سوروں کے نام:

سوروں کے کچھ نام بھی وقت نزول ہی سے مقرر تھے جو کسی خاص واقعہ، شخص یا لفظ کی مناسبت سے قرار دیئے گئے تھے لیکن انہیں ایسی توقیفی حیثیت حاصل نہیں ہے کہ کسی دوسرے نام کا اطلاق جائز نہ ہو لہٰذا اگر اس واقعہ یا شخص وغیرہ کے علاوہ کوئی اور خصوصی لفظ یا واقعہ بھی اہمیت کے ساتھ کسی سورہ میں مذکور ہو اور اس کی شناخت کا فائدہ دے سکتا ہو یا کوئی خاص نمایاں صفت کسی سورہ کی ہو تو کیا مضائقہ ہے کہ اس سے بھی اس سورہ کو یاد کیا جا سکے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ایک ایک سورہ کے کئی کئی نام کتابوں میں وارد ہیں۔ ان سب ناموں کا من جانب اللہ یا از جانب رسول اللہ ہونا ثابت نہیں ہے۔

سورۂ حمد کے نام:

تمام سوروں میں سب سے زیادہ نام سورہ حمد کے وارد ہوئے ہیں اور یہ اس کی عظمت کا مقتضا ہے۔ سیوطی نے اتقان میں ۲۵ نام تک گنوائے ہیں۔ ان میں سے مشہور و معروف نام فاتحۃ الکتاب یا الفاتحہ و ام الکتاب اور السبع المثانی اور سورہ حمد ہیں۔ "فاتحۃ الکتاب" نام احادیث میں زیادہ آیا ہے فاتحہ کے معنی ہیں افتتاح یعنی آغاز کرنے والی چیز یہ نام اگر آغاز تنزیل سے ثابت ہو جائے تو وہ اس کی دلیل ہوگا کہ کم از کم اس سورہ کا محل وقوع یقیناً مطابق منشائے الٰہی ہے۔

ان ناموں کے علاوہ دوسرے نام غیر مشہور ہیں اور صرف کتابوں میں درج ہیں جیسے: الاساس سورۃ تعلیم المسالۃ سورۃ الکنز، الشفاء والشافیۃ سورۃ الصلوۃ الکافیہ الوافیۃ جنہیں علامہ نیشاپوری نے غرائب القرآن میں درج کیا ہے۔

سورۂ حمد کی جامعیت:

جامعیت اس سورہ کی یہ ہے کہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے اسے تمام قرآن کا خلاصہ بتایا ہے۔ یہ بات جمہورات میں شہرت پاگئی چنانچہ ابن ندیم نے اپنی فہرست میں دو جگہ (ص ۶۳ و ص ۲۵) ابوزید بلخی کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے: فی ان سورۃ الحمد نتوب عن جمیع القرآن ہمارے فہم کے مطابق اس کی تشریح یہ ہے کہ تمام قرآن کا مقصد اصلی دو ۲ باتیں، اعتقاد اور عمل۔ اعتقاد کے دو ۲ شعبے ہیں؛ مبدأ اور معاد۔ اور عمل کے دو شعبے ہیں اچھے اوصاف سے اتصاف اور برے اوصاف سے اجتناب۔ سورہ حمد ترتیب وار ان تمام امور پر مشتمل ہے۔ الحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم مبداء اول یعنی حضرت احدیت کا اعتقاد۔ مالک یوم الذین معاد یعنی آخرت ایاك نعبد و ایاك نستعین اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم اچھے اعمال سے اتصاف اور غیر المغضوب لیھم ولا الضالین برے اعمال سے اجتناب معلوم ہوتا ہے کہ سورہ حمد ایک متن ہے اور تمام قرآن اس کی شرح۔ وہ اجمال ہے اور مجموعہ کلام مجید اس کی تفصیل۔

زمانۂ نزول:

قرآن مجید کے سوروں کی ایک تقسیم باعتبار زمانۂ نزول ہے یعنی کچھ مکی سورے ہیں وہ ہیں جو قبل ہجرت رسولؐ نازل ہوئے اور کچھ مدنی ہیں جو بعد ہجرت نازل ہوئے چاہے ان کا نزول مدینہ کے اندر نہ ہوا ہو سورہ حمد کے متعلق اختلاف ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوا ہے یا مدینہ میں یا دونوں جگہ صحیح یہ ہے کہ وہ مکی ہے یعنی جب رسول مکہ معظّمہ میں تھے تب ہی نازل ہوا۔ بلکہ تحقیق یہ ہے کہ وہ بالکل شروع شروع اترا ہے اس لئے کہ نماز بعثت کے بعد ہی سے جاری ہوگئی تھی اور سورہ حمد نماز کا لازمی جزو ہے۔

پاکستان کے ایک باخبر اور سنجیدہ صاحب قلم سید حشمت حسین صاحب جعفری نے اپنے مضمون میں جس کا عنوان ہے ”ابتداءِ نزول وحی کے متعلق احادیث روایت ودرایت کے آئینے میں“ اپنے موضوع کے سلسلہ کے اقوال کو درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

قول چہارم یہ ہے کہ سب سے پہلے سورہ فاتحہ کا نزول ہوا۔ امام واحدی نے اپنی کتاب ”اسباب النزول“ میں اس بارے میں ایک روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ قول علی بن ابی طالب کا ہے (اسباب النزول للواحدی ص ۱۵ مطبوعہ مصر)۔

اس سے اس قول کی نفی نہیں ہوتی کہ سب سے پہلے سورہ اقراء کی پانچ آیتیں مالم یعلم تک نازل ہوئیں: (المنتظر لاہور ۲۰ فروری و ۵ مارچ ۱۹۶۸ء ص ۹) علامہ نیشاپوری نے غرائب القرآن (مطبوعی ایران ص ۲۶) میں سورہ الحمد کے ناموں کے ذیل میں لکھا ہے:

تسسمیتها بفاتحته الکتاب قیل لا نها اول سورة نزلت من السّمآء۔۔۔روی عن علی بن ابی طالب علیہ السلام انه قال نزلت فاتحته الکتاب بمکة من کنز تحت العرش و الهذا قال اکثر العلماء انها مکیة وخاطاؤ امجاهدا فی قوله انها مدنیة وکیف لا وقد صح عن النبی ﷺ فی حدیث ابی کعب انها من اول مانزل بالقرآن وانها السبع المثانی وسورة الحجر مکیة بلا خلاف

اس کا نام فاتحۃ الکتاب ہوا ہے ایک قول کے مطابق اس لئے کہ وہ سب سے پہلا سورہ ہے جو عالم بالا سے اترا حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ سے روایت ہے فرمایا کہ فاتحۃ الکتاب مکہ میں عرش کے نیچے کے ایک خزانہ سے نکل کر نازل ہوا اسی لئے اکثر علماء نے کہا ہے کہ وہ مکیہ ہے اور مجاہد کے قول کو کہ وہ مدنیہ ہے غلط ٹھہرایا ہے اور کیونکر ایسا نہ ہو جب کہ حدیث صحیح میں ابی بن کعب کی روایت حضرت پیغمبر خداؐ سے ہے کہ یہ قرآن کے ابتدائی نزول شدہ اجزا میں سے ہے پھر یہ کہ اسی سورہ کا ایک نام سبع مثانی ہے جس کا ذکر سورہ حجر میں ہے جو بلا اختلاف مکی سورہ ہے۔

سورۂ حمد کا اندازِ بیان:

غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ سب سے پہلے اقراء کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل ہوئیں جن میں رسول کو کچھ پڑھنے کی ہدایت ہوئی ہے۔ اب اس کے بعد پڑھا کیا جائے؟ اس کی تعلیم کیلئے یوں وحی خاص رسول پر سورہ حمد اتارا گیا کہ اس کی قرات کی جائے۔

اسی سے اس سورہ کے انداز بیان کا راز معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے اجزائے قرآنی سے مختلف کیوں ہے۔ قرآن میں عموماً انداز تخاطب سے نمایاں ہے کہ وہ خداوند عالم کا کلام ہے لیکن سورہ حمد میں انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بندہ کی عرض ہے اپنے خدا کی بارگاہ میں اصل یہ ہے کہ وہ کلام خدا اس معنی سے ہے کہ اللہ کے ارادہ خاص سے مثل بقیہ اجزائے قرآن اس کی انشا ہوئی ہے اور اسی اعتبار سے وہ قرآن مجید کا جزو ہے مگر

ہوبطور کلام الٰہی اتارا نہیں گیا ہے بلکہ بطور تعلیم رسولؐ اور امت رسولؐ کی قرات اور اللہ کی بارگاہ میں عرض داشت پیش کرنے کے لئے اتارا گیا ہے اور جس طرح: قل ربّ زدنی علما: کہیے کہ اے میرے پروردگار میرے علم میں اور اضافہ فرما، اس میں شروع کا لفظ قل جس کا ترجمہ ہوا" کہیے" دعائے عبد کو کلام معبود میں منسلک کرتا ہے اسی طرح سورہ حمد کے پہلے اقرا" پڑھیے"اس سورہ کو کلام الٰہی میں منسلک کرنے کا ذریعہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانیوالا بڑا مہربان ہے"

یہ قرآن مجید کی پہلی آیت ہے اور چوں کہ مثل دوسرے سوروں کے وہ سورہ اقراء کا بھی جزو ہے اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ قرآن کی سب سے پہلی آیت جو اتری ہے وہ بسم اللہ ہی ہے جس کی صراحت بعض کتب اہل سنت میں بھی موجود ہے۔[۱]

آیۃ کے لغوی معنی نشانی کے ہیں۔اس کے علاوہ ایک مستقل پیغام یا خبر کو بھی آیۃ کہا جاتا ہے۔غالباً اسی دوسرے معنی کی مناسبت سے ہر سورہ کی تقسیم آیتوں پر ہوئی یعنی کلام کا ایسا فقرہ جہاں سلسلہ کلام رکنے کی علامت میں ایک لفظ اس طرح آ گیا ہے جیسے شعر میں قافیہ ہوتا ہے۔مگر اس میں قافیہ کے قیود و شرائط کی پابندنہیں ہے۔ اسی لئے اسے سجع کے لفظ سے یاد نہیں کیا جاسکتا ہوں کہ سجع نثر کلام میں وہی ہوتا ہے جو شعر کے قافیہ والی پابندی کے ساتھ ہو۔یہ اختتامی الفاظ اپنی نوعیت کے ساتھ قرآن سے مخصوص ہیں اور ان کا اصطلاحی نام" فواصل" ہے۔

بسم اللہ کی خصوصیت:

اس آیت (بسم اللہ) کی خصوصیت واہمیت اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہر سورہ کی ابتدا میں اتاری گئی اس طرح جتنے قرآن میں سورہ ہیں اتنی ہی تعداد میں یہ آیت ہے۔صرف سورہ برات کا آغاز بسم اللہ سے نہیں کیا گیا اس لئے کہ یہ آیت رحمت ہے اور وہ سورہ عذاب یہ کمی پوری ہوگئی اس طرح کہ سورہ نمل میں حضرت سلیمان کے مکتوب میں جو ملکہ سبا کا نام تھا، یہ آیت یوں آ گئی کہ: انہ من سلیمان وانہ بسم اللہ الرحمن الرحیم اور اس طرح بسم اللہ کی تنزیلی تعداد سوروں کی گنتی کے بالکل برابر ہوگئی۔رسول اللہ ﷺ کے متواتر احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ سورہ کا جزو ہے اور اسی پر آئمہ اہل بیت علیہم السلام کا اجماع رہا ہے جو صحیح السند روایت سے ثابت ہے۔قاریان مکہ اور قاریان فقہائے کوفہ سب اس سے متفق رہے ہیں اور اہل سنت کے آئمہ اربعہ میں سے شافعی اور ان کے متبعین کا مسلک بھی یہی ہے۔[۲]

تواریخ واخبار سے ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ کو بآواز بلند پڑھنے کا طریقہ جناب رسالت مآب ﷺ کے زمانہ سے عہد معاویہ تک برابر قائم رہا۔سب سے پہلے اس میں تعبیر امیر شام معاویہ نے کیا اور مدینہ میں آ کر جب پہلی دفع انہوں نے بغیر بسم اللہ کے رکوع و سجود کے لئے جھکتے وقت تکبیر کو ترک کرتے ہوئے نماز پڑھائی تو مہاجرین وانصار میں شور ہو گیا کہ:

یا معویۃ سرقت من الصّلوۃ این بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم والتکبیر عند الرکوع والسجود.

اے معاویہ تم نے نماز میں سے چوری کی بسم اللہ الرحمن الرحیم کیا ہوگئی اور رکوع وسجود کے وقت تکبیریں کدھر گئیں؟

---

[۱] ۔اول آیت نزلت من اللوح بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم (محاضرۃ الاوائل ص ۱۲)

[۲] ۔غرائب القرآن نیشاپوری جلد ۱ ص ۲۸

مجبور ہو کر معاویہ کو بسم اللہ اور تکبیروں کے ساتھ دوبارہ نماز پڑھنا پڑھی۔

علامہ نیشاپوری لکھتے ہیں کہ:

كان معاوية شديد الشكيمة ذا شوكة فلولا ان الجهر با لتسمية كان مقر را عند كل الصّحا بة لم يجسر وا على ذلك (غرائب القرآن جلد ۱ ص ۲۹)

معاویہ بڑے طمطراق اور شان وشوکت کے آدمی تھے تو اگر بسم اللہ کو باآواز کہنا تمام صحابہ کے نزدیک متفق علیہ نہ ہوتا تو وہ اس کی جرات کبھی نہ کرتے۔

مگر بعد کے مسلمانوں کی اکثریت کا عمل امیر شام ہی والے طریقہ پر ہو گیا جس کے برخلاف ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے نہ صرف یہ کہ بسم اللہ کو جزء قرآن بتایا، بلکہ نماز میں (چاہے وہ اخفاتی ہو) اسے با جزء کہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم والی آیت سب سے زیادہ اس کی مستحق ہے کہ اسے باآواز بلند کہا جائے اور یہی وہ آیت ہے جس کے لئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ:۔

وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۝۴۶ (بنی اسرائیل)

جب آپ پڑھنے میں اپنے واحد پروردگار کا نام لیتے ہیں تو وہ لوگ پیٹھ پھیر کر چلے جاتے ہیں

قرآن کریم کی اس آیت کے بارے میں جناب امیر نے اس حدیث میں جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ یہ بتایا ہے کہ جو کچھ سورہ حمد میں ہے وہ سب بسم اللہ میں ہے۔ اس کی تشریح یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان شعبوں پر غور کیجئے جن کا بیان سورہ حمد کے متعلق آچکا ہے تو ان سب خلاصہ ہے عبد ومعبود کا باہمی تعلق کہ خالق بے نیاز اور مرکز فیض ہے اور مخلوق محتاج اور اس کے فیض کی طالب ہے۔ خالق ومخلوق کا یہ تعلق بسم اللہ سے ظاہر ہوتا ہے جس میں بندہ اپنے خالق کے فیض ورحمت کا پتہ دیتا ہوا اس سے امداد کا طالب ہوتا ہے اس طرح یہ آیت خود ایک معنی سے قرآن مجید کا لب لباب قرار پاتی ہے اور اسی لئے باوجود جزو ہونے کے اس کا انداز سوائے سورہ حمد کے تمام دوسرے سوروں کے عنوان بیان سے مختلف ہے وہ ہر سورہ کا جزء ہے اسی طرح جیسے سورہ حمد قرآن کا جزء ہے مگر جیسے سورہ حمد تمام قرآن کا فاتحہ قرار دیا گیا ہے اور کلام کی ساخت کے لحاظ سے اس سے الگ ہے اسی طرح بسم اللہ ہر سورہ کا جزء ہے مگر ساخت کلام کے لحاظ سے اس سے الگ ہے۔ اس سے ہر سورہ کی ابتداء کر کے یہ رسم قائم کی گئی ہے کہ مسلمان کبھی اپنی ہر تقریر، ہر تحریر اور ہر کام کا اس سے آغاز کریں تاکہ ان کو زندگی کے ہر قدم میں اللہ سے سہارا لینے کا احساس قائم رہے اور اس کا برابر مظاہر ہوتا رہے اس سے سرغرور جھکتا بھی ہے اور ہمت دل بلند بھی ہوتی ہے اور یہ بہت بڑا مقصد ہے جو عاجز وقاصر بندہ کے قادر مطلق پر اعتماد ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اور جسے زندہ رکھنے سے اسلام نے مسلمانوں میں ''خودی'' اور ''بےخودی'' دونوں کو سمو کر انسانی رفعت کی شاہراہ قائم کی ہے۔

اسم کے معنی:

پہلی لفظ بسم اللہ مرکب ہے دو جزوں سے ایک ''ب'' جو عربی میں استعانت یعنی مدد حاصل کرنے کے لئے آتی ہے۔ یہی اس نیاز مندی کے اظہار کا ذریعہ ہے جو بندہ کو اپنے مالک سے مرتبط بناتی ہے دوسرے (اسم) اس کے معنی ہیں نام مگر تحقیق یہ ہے کہ بسم اللہ کا مطلب صرف یہ ہے کہ بندہ اللہ سے مدد حاصل کرنا چاہتا ہے اسم کا لفظ مقام تعبیر میں اس محاورہ کے مطابق لایا گیا ہے کہ کسی بلند ذات کے متعلق جب کوئی کلام کیا

جائے تو یہ کچھ ادب کے خلاف محسوس ہوتا ہے کہ بے دھڑک کسی امر کو خود اُس کی طرف منسوب کیا جائے بلکہ اس سے قریبی تعلق رکھنے والی کسی چیز کو واسطہ بنایا جاتا ہے ”جناب“ اور ”حضرت“ اور ”سرکار“ اس قسم کے الفاظ کی اضافت کسی بڑے نام کے ساتھ اسی لئے ہوتی ہے نیز ”خدام والا شان“ اور ”ملازمان بارگاہ“ اور جدید عربی میں فخامۃ اور جلالۃ اور عظمۃ اور معالی اور سمو وغیرہ کے الفاظ اسی لئے آتے ہیں بس اسی طرح قرآن کریم میں اللہ کی طرف تسبیح اور تحمید اور استعانت کی نسبت میں ’اسم‘ کی لفظ کا واسطہ آیا ہے اور اسی لئے بسم اللہ کے معنی حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے یہی فرمائے ہیں کہ استعین علی اموری کلھا باللہ میں اپنے تمام معاملات میں خدا سے مدد طلب کرتا ہوں (کتاب التوحید صدوق رحمۃ اللہ علیہ)۔۔۔اللہ خدائے برحق کا اسم ذات ہے جس کا اطلاق کسی دوسری ذات پر نہیں ہوسکتا۔[1]

اسم ذات ”اللہ“:

اسم اللہ کے علاوہ جتنے الفاظ اسی کی نسبت استعمال ہوتے ہیں وہ ”اسمائے صفات“ یعنی تعریفی القاب ہیں جو اس کے کسی نہ کسی کمال کے پہلو کو پیش نظر رکھ کر استعمال کئے جاتے ہیں ان میں اگر اختصاص ذات خالق کے ساتھ ہوگا تو باعتبار مفہوم ہوگا اس لئے کہ اس لفظ کے معنی ہی ذات الٰہی میں منحصر ہیں جیسے رحمٰن جس کی تشریح ابھی بعد میں ہوگی لیکن اگر وہ معنی ناقص درجہ پر سہی دوسرے افراد پائے جاتے ہیں تو اس وصف کا اطلاق دوسرے پر بھی درست ہوگا جیسے رحیم عالم قادر وغیرہ لیکن اللہ کا لفظ اس ذات کے لئے قرار دیا گیا ہے جو ان تمام صفات پر جامع وحاوی ہے۔

نام ہونے کا اعتبار سے اس کے اشتقاق کی جتنی بحثیں ہیں وہ میرے نزدیک دور از کار ہیں اور اس لفظ کا ترجمہ بھی کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں ہے خدا یا گاڈ یا اس طرح کے تمام لفظ جو دوسری زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں وہ اسمائے صفات کی جگہ پر تو لائے جاسکتے ہیں مگر لفظ اللہ کے قائم مقام ہرگز نہیں ہوسکتے۔

رحمٰن اور رحیم کا فرق:

رحمن اور رحیم دونوں صفتیں رحم سے مشتق ہیں اور مبالغہ یعنی وصفت کی شدت وقوت کو بتاتی ہیں[2] مگر ان دونوں میں فرق ہے رحمٰن کا اطلاق صرف ذات باری پر ہوتا ہے[3] اور رحیم کا اطلاق غیر پر بھی ہوسکتا ہے جس کی نظیریں قرآن کریم میں بھی موجود ہیں جیسے رسول کے لئے بالمومنین رءوف رحیم اور مومنین کے لئے رحماء بینھم۔

زیادہ تر[4] احادیث سے ان دونوں لفظوں کا فرق یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رحمٰن اس رحمت کو بتاتا ہے جو خالق کی طرف بتقاضائے ربوبیت تمام کائنات سے متعلق ہے اور جس میں مومن اور کافر کی تفریق نہیں ہے۔اس کے جلوے دنیا میں آنکھوں کے سامنے نمایاں ہیں اور رحیم اس رحمت کے

---

[1]۔ اسم لا یطلق الا علیہ سبحانہ و تعالیٰ (مجمع البیان) جناب امیرؑ فرماتے ہیں۔اللہ اعظم اسم من اسماء اللہ عزوجل لا ینبغی ان یتسمّٰی بہ غیرہ (صافی)

[2]۔ اسمان وضعا للمبالغۃ واشتقا من الرحمۃ (مجمع)

[3]۔ لا یطلق الرحمن الا علی اللہ تعالیٰ (راغب)

[4]۔ تلاش سے بعض جگہ اس کے خلاف بھی ملتا ہے جیسے ایک دعا میں ہے: یارحمن الدنیا والاخرۃ ورحیمھا مگر اس کو شاذ یعنی خلاف مشہور سمجھنا چاہئے۔

اظہار کے لئے ہے جو توجہ وعنایت خاص کے طور پر اپنے محبوب اشخاص سے متعلق ہوتی ہے اور یہ مومنین سے مخصوص ہے جس کا نمایاں ظہور آخرت میں ہوگا۔ اس کو امام جعفر صادقؑ نے ان الفاظ میں بتایا ہے کہ الرحمن اسم خاص لصفته عامة والرحیم اسم عام لصفة خاصة (مجمع البیان)[1] رحمٰن کے عموم کو ترجمہ میں "سب کو فیض" کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے اور "ہمہ گیر" ہونے ہی کی بنا پر وہ صفت اللہ میں منحصر ہو گئی ہے:

اے کریمی کہ از خزانہ غیب

گبر و ترسا را ظیفہ خورداری

رہ گئی اپنی موافق طبع اور دل پسند یا متحد الخیال یا اطاعت شعار افراد پر مہربانی یہ اپنے مقدور بھر بندے بھی کر لیتے ہیں۔ چوں کہ مقام توصیف میں قاعدہ یہی ہے کہ موصوف نام کو قرار دیا جاتا ہے جو ذات پر دلالت کرتا ہے اور اس کی توصیف وصف کے ساتھ ہوتی ہے۔ اسی لئے ان الفاظ کی ترتیب میں پہلے اللہ کا لفظ لایا گیا ہے جو نفس ذات کو بتلاتا ہے پھر الرحمٰن کو لایا گیا جو اس کی صفت خاص ہے مثل نام کے اور اس لئے تقریبا اسے لقب کا درجہ حاصل ہے اور پھر الرحیم کہا گیا جس میں صرف توصیف ہے۔ پھر یہ کہ رحمٰن ہونے کے مظاہر چوں کہ عموم رکھتے ہیں اور مومن و کافر سب کے لئے ہیں اس لئے بھی انہیں مقدم ہونا چاہئے اور رحیم ہونے کے مظاہر خصوصیت رکھتے ہیں اور ان کا ظہور بھی بطور نمایاں بعد کو یعنی آخرت میں ہے لہٰذا اسے بعد کو ذکر کیا گیا۔

مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نے خوب لکھا ہے کہ "یہ بات اتفاقی نہیں بہت پر معنی ہے کہ قرآن مجید میں اسم ذات کے بعد جو سب سے پہلا اسم صفاتی ارشاد ہوا ہے وہ صفت رحمانیت کا مظہر ہے۔ لین پول (Lane Poole) انگریز اسی لئے اپنے ہم قوموں کو سنا کر کہتا ہے۔ لوگ یہ بات برابر بھول جاتے ہیں کہ قرآن کے اندر وصفت رحمت پر کتنا زور دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ قرآنی آغاز کلام کی رفعت اس وقت زیادہ نمایاں ہوتی ہے جب اس کے سامنے مسیحیت کا افتتاحی فقرہ لایا جاتا ہے: شروع باپ بیٹے اور روح القدس کے نام سے یہاں آغاز ہی سے تثلیث کا گورکھ دھندا سامنے آجاتا ہے جس کا سمجھنا اور سمجھانا عقل کو خیر باد کہے بغیر ممکن ہی نہیں ہے"۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝٢ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٣

"ہر ایک تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار، سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان، جزا و سزا کے دن کا مالک ہے۔"

حمد اور مدح کا فرق:

اردو زبان کی کوتاہی سمجھنا چاہئے کہ حمد کے لئے کوئی ہم معنی لفظ جو اس کے تمام خصوصیات کی حامل ہو ابھی تک نہیں مل سکا ہے "تعریف" کے ساتھ حمد کا ترجمہ مجبوری کا نتیجہ ہے کیوں کہ تعریف تو مدح کے بھی معنی ہوئے مگر عربی میں مدح اور حمد میں فرق ہے مدح غیر ذی شعور چیزوں کی بھی ہوتی ہے جیسے موتیوں کی چمک، پھولوں کی مہک، سبزہ کی لہک، پانی کی روانی، سورج کی درخشانی، وغیرہ ان کی تعریف مدح کہلائے گی۔ مگر حمد مخصوص ہے ایسے شخص کی تعریف سے جس کے افعال اختیاری حیثیت رکھتے ہوں خواہ ان افعال کا کوئی احسان اس شخص کی گردن پر نہ ہو جو تعریف

---

[1]۔ فالرحمة الرحمانية جميع الموجودات وتشمل كل النعم واما الرحمة الرحيمية فهي مختصة بالمومنين (الصافی)

کر رہا ہے۔[1] رہ گیا شکر اس کے معنی تعریف کے ہیں ہی نہیں بلکہ وہ اس احسان کا جو اپنے ساتھ ہوا ہو کسی طرح اعتراف اور نعمت کی قدر کرنے کا نام ہے جو کبھی عملی طور پر ہوتا ہے اور کبھی قولی طور پر۔ اس صورت میں کہ جب اس کا اعتراف تعریف کی صورت میں ہو تو کہنا صحیح ہوگا الحمد اللہ شکر! یعنی میں اس کی تعریف کرتا ہوں اس کے احسانات کے اعتراف کے لئے۔[2]

حمد اور شکر میں تفرقہ:

ہر تعریف کا ذات الٰہی کی طرف راجع ہونا اس عقیدہ کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ انسانی افعال سب اللہ کے مخلوق ہیں لہٰذا جس نے جو اچھا کام کیا وہ اللہ کی طرف سے ہوا تو جو اس شخص کی تعریف ہو وہ درحقیقت خدا کی تعریف ہے کیوں کہ اس عقیدہ کی بنا پر تو حمد ہی نہیں بلکہ معاذ اللہ مذمت بھی خدا ہی کی طرف عائد ہونا چاہئے بلکہ ہر تعریف کا ذات الٰہی کے لئے ہونا اس بنا پر ہے کہ ہر فعل خیر یا تو براہِ راست اسی کا عمل ہوتا ہے یا دوسرے کا عمل ہے تو اس کی تحریک یعنی ترغیب اور پھر توفیق کے ساتھ ہوتا ہے لہٰذا اس کام کی تعریف بھی آخر میں اس کی طرف راجع ہے لیکن فعل قبیح براہ راست اس سے تو ہوتا ہی نہیں اور دوسرے کی جانب سے ہوتا ہے تو وہ اس کی ترغیب سے نہیں بلکہ ممانعت کے ساتھ ہوتا ہے لہٰذا اس کی مذمت خدا کی طرف راجع نہیں ہوسکتی۔[3]

رب اسم صفت ہے تربیت سے جس کے معنی ہیں تدریجی طور پر کسی شے یا شخص کو اس کے مناسب حال کمال کی منزل تک پہنچانا

"رب" (پروردگار) اور "اب" (باپ):

خداوند عالم خالق بھی ہے اور رب بھی مگر ان دونوں کے مفہوم میں یہی فرق ہے کہ خالق کا لفظ فقط سبب وجود ہونے کو بتا تا ہے اور رب کا لفظ سبب بقا ہونے اور پھر مستقل طور پر اس کی نظر توجہ مخلوقات کی جانب مبذول رہنے کو بتا تا ہے۔ مالک اور ولی وغیرہ پر باضافت رب کا اطلاق کلام عرب میں اسی لئے ہوتا ہے کہ وہ اس شے کے حالات پر نگرانی رکھتے ہیں لیکن اس لفظ کا اطلاق مطلق اور بلا اضافت صرف حق سبحانہ وتعالیٰ پر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اس کا ترجمہ پروردگار کے لفظ کے ساتھ مربی سے زیادہ مناسب ہے کیوں کہ مربی کی لفظ کا ہمارے محاورہ میں ذات الٰہی کے ساتھ اتنا اختصاص نہیں ہے جتنا پروردگار کے لفظ کا ہے۔ عیسائیوں نے اسے اب (یعنی باپ) کہا ہے۔ وہ مجازی تصرف کے بعد بھی صرف سبب وجود ہونے کا اظہار کرسکتا ہے مگر اسلام نے اس کے لئے رب کی لفظ منتخب کی ہے جو ہر ہر لمحہ اس کے فیض اور عنایت کا پتہ دے رہا ہے۔

عالمین کی کثرت:

عالم کے ایک معنی تو ما سوی اللہ کے ہیں اور اس اعتبار سے غیر اللہ تمام وکمال ایک ہی عالم ہے۔ اس کی جمع بنانے کا کوئی حاصل نہیں مگر عرفی طور پر عالم اس ایک دنیا کو کہہ سکتے ہیں جس کے آسمان وزمین سورج ار چاند ہم سے تعلق رکھتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے علم ہیئت کی اصطلاح میں ایک نظا

---

[1]۔ الحمد قول علیٰ انہ مختص بفضلہ اختیارتہ معنیۃ وھی فضلۃ الانعام الیك والی غیرك (نیشاپوری)

[2]۔ شکرا مفعول لاجلہ نحو ستجتہ تعظیما (بلاغیؒ)

[3]۔ لایحمد حامد الّا ربّہ ولا یذم ذام الّا نفسہ (نہج البلاغہ)

م شمسی سے جتنے سیارات متعلق ہیں انہیں ایک عالم سمجھنا درست ہے اب جب کہ تحقیقات جدیدہ نے اور متعدد آفتابوں اوران کے نظاموں کا پتہ چلالیا ہے تو عالمین یعنی بہت سی دنیاؤں کے مفہوم کا سمجھنا زیادہ آسان ہوگیا ہے پیغمبر اسلامؐ اوران کے اہل بیت طاہرین علیہم السلام کے احادیث تو پہلے ہی سے اس کا پتہ دے رہے ہیں ہمارے طرق سے امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے جسے جناب شیخ صدوق ابن بابویہ قمی نے خصال میں وارد کیا ہے کہ:

ان اللہ قد خلق الف الف عالم و الف الف اٰدم

اللہ نے ہزار عالم پیدا کیے ہیں اور ہزار ہزار آدم

اہل سنت کے طرق سے ہے:

عن رسول اللہ ﷺ ان اللہ خلق قبل اٰدم المعلوم عندنا مأ ۃ الف ادم وروی عن جعفر الصادق مثلہ.....اخرج الامام ابو اللییث فی نفسہ وعن ابن عباس رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ ﷺ ان اللہ ثمانیۃ عشر الف عالم ولك دینا کم منہا عالم واحد.(محاضرۃ الاوائل ص ۲۳۹ مصر)

پیغمبر خدا ﷺ کی حدیث ہے کہ اللہ نے ان آدم کے پہلے جو عام طور پر معلوم ہیں ایک لاکھ آدم پیدا کئے اور اسی مضمون کی روایت امام جعفر صادقؑ سے ہے---امام ابواللیث نے اپنی تفسیر میں جناب ابن عباس کے واسطہ سے حضرت رسولِ خدا ﷺ کی حدیث درج کی ہے کہ اللہ کے ۱۸ ہزار عالم ہیں اور تمہاری دنیا میں ایک عالم ہے۔اس کے علاوہ پھر صفحہ ۱۸۱ پر ہے:

روی فی الخبر عنہ ﷺ انہ قال للہ ثمانیۃ عشر الف عالم الدنیا منہا عالم واحد.

روایت میں آنحضرت ﷺ سے وارد ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا اللہ کے ۱۸ ہزار عالم ہیں کہ دنیا ان میں سے ایک عالم ہے۔

پہلے اس قسم کے احادیث بھی ''متشابہات'' کی حیثیت رکھتے تھے لیکن اب موجودہ انکشافات نے زرا ان کی حقیقت سے پردہ ہٹایا ہے۔مصر کے عصری عالم دکتور علی مصطفیٰ شرفہ بک دار لمعارف کے وقت الشیوع رسالہ ''العلم والحیاۃ'' میں دکتور طٰہٰ حسین انطوف الجمیل، عباس محمود العقاد اور فوٗاد صرف ایسے ممتاز عصری علماء کی معاونت سے شائع ہوتا رہا ہے ۱۹۴۵ء کے شمارہ میں لکھتے ہیں:

ما الشمس الا واحد مّن مائۃ الف ملیون شمس بین کل شمس جابر تہا مسیر بضع سنین بسرعۃ الضوء ویتألف من ھٰذا الشموس عالم ھو الذی یظھرلنا لیلا کسحابۃ عظمیٰ من النور تخترف وجہ السماء وتسمیہ نہر لا محترۃ وھٰذا العالم بدور واحد من مائۃ الف ملیون عالم یبلغ قطر کل منہا مات ولا من السّنین الطوالۃ ص۶۷.

یہ ہمارا سورج کروڑ در کروڑ سورجوں میں ایک ہے جن میں ہر ایک سورج کا دوسرے سورج سے فاصلہ روشنی کی رفتار سے کئی کئی سال کا ہے اوران سورجوں سے ایک دنیا ہمیں نظر آتی ہے جو رات کو ہمیں روشنی ایک بڑے بادل کی طرح محسوس ہوتی ہے اور وہ سطح فلک کو طے کرتی ہوئی گزرتی ہے اور ہم اسے کہکشاں کہتے ہیں اور یہ عالم اپنے پورے احاطہ کے ساتھ کروڑ در کروڑ عالموں میں ایک ہے جن میں سے ہر ایک کا عرض وطول ہزار ہزار سال کی مسافت کے برابر ہے اس ذہنیت کے مقابلہ میں جو ہر دن کا ایک خدا قرار دے رہی تھی اور اس وقت جب ہر قبیلہ کا خدا الگ الگ سمجھا جا رہا تھا، اسلام یہ آواز بلند کر رہا تھا کہ وہ تو ایک عالم کا پروردگار نہیں، ہزاروں جہان ایسے ہوں تو سب کا وہی ایک پروردگار ہے۔

اس سے ایک طرف ہر طرح کے شرک کا سدباب کیا اور دوسری طرف اتحاد عالمی کی ایک مستحکم بنیاد قائم کی جس پر آج تک دنیا باوجود انتہائی تہذیب وتمدن کی ترقی کے کوئی عمارت نہیں بنا سکی۔ اس بنیاد پر عمارت اسی وقت قائم ہوسکتی ہے جب اس دین (اسلام) اور کتاب (قرآن) کو عمومی طور پر تسلیم کر لیا جائے جو اس اخوت کا سنگ بنیاد رکھنے والے ہیں۔ یہ ہوگا مگر اسی وقت جب قرآن کا وعدہ:

لِیُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّیۡنِ كُلِّهٖ (فتح۔۲۸ توبہ۔۳۳، صف۔۹)

"تاکہ اس دین کو ہر دین پر غلبہ عطا کرے' پایۂ تکمیل تک پہنچے۔

یہ وہی موقع ہوگا جس کے متعلق کہا گیا ہے:

وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمۡ دِیۡنَهُمُ الَّذِی ارۡتَضٰى لَهُمۡ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِكُوۡنَ بِیۡ شَیۡـًٔا ؕ (سورۂ نور ۵۵)

اور ان کے لئے قائم وبرقرار کرے گا ان کے اس دین کو جسے اس نے پسند کیا ہے اور ضرور خوف کے بدلے میں انہیں امن وسلامتی عطا کرے گا کہ وہ میری عبادت کریں گے اس طرح کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ دنیا کے مضطربانہ اٹھتے ہوئے قدم آخر کو اس منزل پر پہنچ کر دم لیں گے۔

رحمٰن ورحیم کے وصف کی تکرار:

"تمام جہانوں کا پروردگار کہنے کے بعد پھر وہ دو صفت دہرائے گئے جو بسم اللہ میں آچکے تھے سب کو فیض پہنچانے والا اور بڑا مہربان اور یہ تکرار بے محل اس لئے نہیں کہ بسم اللہ اگرچہ سورہ کا جزء ہے اسی طرح جیسے سورہ حمد قرآن کا جزء لیکن معنی کے اعتبار سے وہ اس کا جزو نہیں بلکہ اس پورے کل کا خلاصہ کہا جائے کہ اس بعد والی شرح کا متن ہے جیسا کہ جناب امیرؑ کی حدیث سے ظاہر ہے۔ اور متن کے خاص جزو کا شرح کے ضمن میں آجانا کوئی خلاف توقع امر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان وصفوں کا تذکرہ اگرچہ بسم اللہ میں ہوا تھا مگر وہاں امداد طلب کرنے کے ذیل میں تھا اور یہاں استحقاق حمد کے ثبوت میں محل بدلا ہوا ہے اور مفاد جداگانہ اس لئے تکرار لازم بھی نہیں آتی۔ غور کیا جائے تو الرحمن سے متصل اس کے قبل رب العالمین کی لفظ اس ہمہ گیری کا برہان واضح ہے جو اس وصف کے حق سبحانہ سے مختص ہونے کا اصلی سبب ہے اور الرحیم سے مالک یوم الدین کا بعد میں اتصال الرحیم کے معنی ہیں جو مخصوص رحمت ہے اس کے محل ظہور کا پتہ دینے کا ذریعہ ہے۔

الدین جزا وسزا:

الدّین کے معنی لغت اور اصطلاح میں بہت سے ہیں مگر یہاں اس کے معنی جزا کے ہیں یعنی اعمال کا معاوضہ خواہ اچھا جسے ہمارے محاورہ میں بھی "جزا" کہتے ہیں اور خواہ برا جیسے ہمارے محاورہ میں 'سزا' کہتے ہیں۔

جزا وسزا کی مناسبت اعمال تعیین ہی کا نام 'حساب' ہے اس لئے حدیث میں یوم الدین کی تفسیر روز حساب کے ساتھ ہوئی ہے۔ [1]

جزا وسزا کا پورا نظام ربوبیت اور رحمانیت کا تقاضا ہے کیوں کہ انسان کا کمال لائق شعور واختیار کے ساتھ اطاعت وایمان میں مضمر ہے جس

[1]۔ عن ابی بصیر عن ابی عبداللہ۔ مالک یوم الدین قال: یوم الحساب (علی بن ابراہیم)

کے بالمقابل معصیت وکفر کے اختیار کی قوت ضروری ہے۔اور جب جب دونوں قوتیں کارفرما ہوئی تو خالق کی طرف سے اطاعت کی جانب تحریک اور معصیت سے تخویف کی ضرورت ہوئی اور یہیں سے جزاوسزا کی تفریق قائم ہوئی جو مقتضائے حکمت و عدالت ہے پھر اس کے تحت میں مومنین اوراہل اطاعت توجہات خصوصی کے موردبن کر رحیم کی صفت کے جلوہ گاہ بنتے ہیں۔مالک حقیقی دنیا میں بھی وہی ہے مگر یہاں دوسرے بھی محدود پیمانہ پر سہی مالک ہونے کا دعوی رکھتے ہیں روز جزا کی تخصیص اس لئے ہے کہ اس دن کوئی مالک ہونے کا دعویدار بھی نظر نہیں آسکتا۔لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (مومن آیت ۱۶)اوصاف الٰہی کے بیان میں اللہ کے لفظ کے بعد ربوبیت کا تذکرہ آیا جس کے نمایاں آثار اس دنیا میں سامنے ہیں۔اس کے بعد نظر آگے بڑھی اور آخرت کی طرف گئی کہ وہاں قبضہ صرف اسی کا ہے اس لئے بندہ کی حاجتیں وہاں کے لئے تمام تر اسی سے وابستہ ہیں۔الوہیت انسان کی ہستی سے پہلے ہے۔ربوبیت انسان کی ہستی کے اثناء میں ہے جو اس کی بقاء وتکمیل کا سبب ہے اور یوم الدین کی مملکت آئندہ دور سے متعلق ہے۔ان مختصر الفاظ میں انسان کی نگاہ ماضی حال اور مستقبل سب پر پڑگئی اور خالق کی عظمت کا ایک نقشہ سامنے کھینچ گیا۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴

”تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے بس مدد مانگتے ہیں“۔

عبادت کا مفہوم:

عبادت کے معنی ہیں اظہار تذلل یا حکم کی تعمیل جو کسی کو خدا یا خدا کا اوتار (محل حلول) مان کر اختیار کی جائے مطلق تعظیم جیسے کسی کو دیکھ کر کھڑا ہو جانا یا سلام کو جھکنا یا ہاتھ چومنا یا آستان بوسی کرنا عبادت نہیں ہے۔نہ مطلق حکم کی تعمیل عبادت سمجھی جاسکتی ہے۔

تعظیم اور عبادت میں فرق:

مشرکین اپنے اصنام کو ’اِلٰہ‘ کہتے تھے۔ہندوستان کی مشرک قومیں بھی جن مجسموں کو پوجتی ہیں ان مجسموں کے اصل اشخاص کو اوتار مانتی ہیں۔اس لئے ”تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں“ کے الفاظ کسی نوع عمل کو اللہ سے مخصوص قرار دینے کا اظہار نہیں ہیں کہ مثلاً ہم کھڑے بس تیرے ہی سامنے ہوتے ہیں۔کیوں کہ کھڑا ہونا اس کے سامنے تو حقیقۃً ممکن ہی نہیں اور اس کے غیر کے سامنے مختلف اغراض سے آدمی کھڑا ہوتا ہے۔یا جھکتے تیرے ہی آگے ہیں۔آدمی کو بہت سے اسباب سے بہت سوں کے سامنے جھکنا پڑتا ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم تیرے سوا کسی کو خدا نہیں مانتے نہ کسی کو تیرا اوتار سمجھتے ہیں۔اس لئے بحیثیت خدا کے ہمارا جھکنا صرف تیرے ہی لئے ہے اب اگر اس کے حکم سے کسی کی تعظیم ہو تو وہ تعظیم اس شخص یا اس شے کی طرف منسوب ہوسکتی ہے مگر عبادت وہ خدا ہی کی قرار پائے گی جس کے حکم کی وہ تعمیل ہے۔وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝۳۲ (سورۂ حج)

استعانت اور توسل:

”دوسرا فقرہ تجھ ہی سے بس مدد مانگتے ہیں“ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرے مقابل میں اور تجھ سے بے نیاز ہو کر کسی کو ہم مددگار نہیں سمجھتے۔یوں اسباب ظاہری کی بنا پر گرتا ہوا پاس والے آدمی سے مدد لیتا ہے۔فقیر دولت مند سے مدد لے لیتا ہے۔بلکہ ڈوبتا تنکے تک کا سہارا ڈھونڈ

ھتا ہے مگر یہ سب ظاہری اسباب کی حد تک ہے اس کے پس پردہ ایک مسلمان اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک اور طاقت کو محسوس کرتا ہے جس کے سہارا دیئے بغیر کوئی ظاہری سبب کار براری کے لئے کافی نہیں ہوسکتا وہ خالق کی ذات ہے۔

اسی طرح خالق کے حکم سے گناہوں کی مغفرت یا دعاؤں کی قبولیت کے لئے اس کے مقربین کے ساتھ توسل یہ بھی اس استعانت کے خلاف نہیں ہے جو ذات الٰہی میں منحصر ہے کیوں کہ یہ وسائل اسی کے مقرر کردہ ہیں پھر بھی اصل مرکز اعانت ذات حضرت احدیت ہی ہے۔

سلسلۂ کلام کی بلیغانہ رفعت:

الحمد میں شروع سے ذات الٰہی کا باطور غائب اس کا نام لے کر تذکرہ تھا۔ وہ تمہید تھی جہاں سے اصل دعا شروع ہوئی انداز تخاطب کا ہوگیا۔ یہ انداز کی تبدیلی عربی زبان کے معانی وبیان کی اصطلاح میں ''التفات'' کہلاتی ہے اور نظیریں اس کی ہر زبان کے ادب میں ملتی ہیں یہاں اس میں لطافت یہ ہے کہ اس انداز کی تبدیلی سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بندہ نے حمد وثناء کرتے کرتے معبود کی بارگاہ میں رسائی حاصل کرلی اور اس کی نگاہ کو اپنی جانب موڑ لیا ہے اس میں قریب معنوی کی جو بذریعہ حمد حاصل ہونا چاہئے قرب صوری سے تمثیل بھی ہے اور یہی تصور کمال کے درجہ پر ہوجائے تو نماز کے صحیح معنی میں استعارۃ ''معراج المومن'' بن جانے میں شک ہی کیا ہوسکتا ہے۔

نَعۡبُدُ اور نَسۡتَعِیۡنُ میں جمع کے صیغے ''تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد طلب کرتے ہیں'' اس احساس اجتماعیت کے تحفظ کے لئے ہیں جس کے لئے نماز میں انفرادی سے بدرجہ زیادہ ''جماعت'' کو پسند کیا گیا ہے۔ پھر نماز اگر فرادی بھی ہو تو الفاظ زبان پر یہی ہونا ضروری ہیں گو یا ہر بندہ سے اللہ یہ چاہتا ہے کہ اول تو بارگاہ میں اکیلا حاضر نہ ہو بلکہ سب کے ساتھ مل کر آئے اور اگر اکیلا آتا بھی ہے تو عرض معروض فقط اپنی ذات کی طرف سے نہ کرے بلکہ تمام بنی نوع کا نمائندہ بن کر جو عرض معروض کرے سب کی طرف سے کرے اور جو مانگے سب کیلئے مانگے۔ دوسرا مقام ہوتا تو ''ہم'' کے لفظ سے تخاطب میں عظمت کی شان پیدا ہوتی تھی مگر بڑے کی بارگاہ میں اپنی خدمت پیش کرنے کے موقع پر ''میں'' کے لفظ انانیت کا اظہار کرتی ہے ''ہم'' کے استعمال میں یہ پہلو بھی ہے کہ یہ خود اپنی ہستی کو افراد اور اس کے خدمات کو قابل تذکرہ ہی نہیں سمجھتا۔ اس سے انانیت اور خود غرضی دونوں باتیں ختم ہوجاتی ہیں۔

عبدالماجد صاحب نے بہت صحیح لکھا ہے کہ ''نَعۡبُدُ کے معاً بعد نَسۡتَعِیۡنُ لانا گویا بندوں کی زبان سے یہ کہلانا ہے کہ ہم عبادت تک میں تیری ہی توفیق تیری ہی اعانت، تیری ہی دست گیری کے محتاج ہیں''۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہماری عبادت اس سے استعانت پر مترتب ہے تو نَسۡتَعِیۡنُ پہلے ہونا چاہئے اور نَعۡبُدُ بعد کو یہاں نعبد پہلے ہے اور نستعین بعد کو، یہ اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ بغیر اپنی امکانی کار گزاری کو پیش کئے ہوئے بندہ کو اللہ سے طالب امداد ہونے کا حق ہی نہیں۔

وَالَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا ؕ (عنکبوت۔۶۹)

جو ہمارے راستوں میں جدوجہد کرتے ہیں انہیں ہم منزل مقصد تک پہنچا بھی دیتے ہیں۔

علامہ نیشاپوری لکھتے ہیں:

كانه يقول شرعت فى العبادة فا ستعين بك فى ايما نها حتى لايتمعنى مانع ولا يعارضنى صارف.

(غرائب القرآن ج۱)

گویا بندہ کہہ رہا ہے کہ میں نے عبادت کے لئے قدم تو اٹھا دیا ہے اب اس کے حد کمال تک پہنچنے میں تجھ سے مدد کا خواستگار ہوں کہ میرے لئے کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو: بہرصورت اس سے یہ نتیجہ ظاہر ہے کہ انسانی افعال مخلوق الٰہی نہیں ہیں اور نہ بالکل مطلق العنان ہیں ورنہ اس سے اعانت طلب کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ یہ جبر واختیار کے درمیانی نقطہ ہی پر منطبق ہے جو امر بین الامرین کا مصداق ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿۵﴾

''بتلا تارہ ہم کو سیدھا راستہ''

ہدایت جس کی خصوصی درخواست ہے وہ نہ ہدایت عمومی ہے جو اللہ کی طرف سے تمام خلق کے لئے لوازم ربوبیت سے ہے اور نہ جبراً منزل مقصد تک پہنچا دیتا ہے کیوں کہ وہ کوئی انسانی کمال نہیں ہے بلکہ وہی اعانت ہے جس کی خواہش کا اجمالی طور پر اياك نستعين میں ذکر آیا تھا۔ یہ وہ توفیق ہے جو بندہ کے شامل حال ہوتی ہے جس کی بدولت وہ خیر وفلاح سے قریب آ جاتا ہے مگر راستے پر چلنا خود اس کا ذاتی عمل ہوتا ہے۔

صراط مستقیم:

''سیدھے راستے'' سے مراد خالق کا وہ پسندیدہ راستہ ہے جس میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط اور وہی دین حق ہے۔ وہی اتباع رسول اور اطاعت ائمہ کا ماحصل ہے۔ اسی سے رضائے الٰہی اور اس کے نتیجہ میں نعیم آخرت کا حصول ہے، احادیث کے مختلف الفاظ مثلاً:

(۱) الطريق المؤدى الى محبتك والمبلغ الى جنتك والمانع من ان نتبع اهواء نافنعطب وان نأخذ آرائنا فنهلك. (امام جعفر صادق علیہ السلام)

وہ راستہ جو تیری محبت تک لے جانے والا اور تیری جنت تک پہنچانے والا اور اس سے روکنے والا ہے کہ ہم اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کر کے زحمت ومشقت میں گرفتار ہوں اور اپنی اپنی رائے پر چل کر مبتلائے ہلاکت ہوں۔

(۲) ماقصر عن الغلو وارتفع عن التقصير. (امير المؤمنين علیہ السلام)

جو غلو کی حد سے پیچھے ہو اور کوتاہی کی منزل سے بالا ہو۔

(۳) الطريق الى معرفة الله۔ (امام صادق علیہ السلام)

معرفت خداوندی تک پہنچانے والا راستہ۔

(۴) الامام المفترض الطاعه. (امام صادق علیہ السلام)

وہ امام جس کی اطاعت منجانب اللہ فرض ہے۔

(۵) الطريق الى معرفت الامام. (روايت ابو بصير من امام جعفر صادق علیہ السلام)

امام کی معرفت کا راستہ اور رسولؐ کے بعد بلا فصل جو رہنمائے حق ہے وہ ذات بدرجہ اولیٰ اس کا مصداق ہوگی لہٰذا وارد ہوا ہے۔

(۶) هو امير المؤمنين ومعرفة. [۱]

---

[۱]۔ علی بن ابراهيم

یہ جناب امیرؑ اور ان کی معرفت ہے
یہ سب اسی ایک راستے کے تعارف کی تعبیریں ہیں اور حقیقت ایک ہے۔[1]

دعائے ہدایت کا مطلب:

یہ ظاہر ہے کہ دعا کا تعلق ہمیشہ مستقبل کے ساتھ ہوتا ہے۔ ماضی اور حال امرِ حال ہے۔ اس کے متعلق دعا کے کوئی معنی نہیں۔ لہٰذا جو شخص راہ راست پر نہیں ہے اس کے راہ راست پر آنے کیلئے اللہ کی ہدایت درکار ہے اور جو راہِ راست پر ہے اس کے بھی آئندہ اسی راستے پر چلنے کے لئے اللہ کی اعانت مطلوب ہے۔ اور اس لئے اھدنا کی تفسیر یہ وارد ہوئی ہے کہ ”ہمیں راہ راست پر ثابت قدم رکھ“[2] اس کے معنی یہ ہیں کہ آیندہ زندگی میں راہ راست پر چلنا دونوں ہی کے یہاں توفیق الٰہی سے وابستہ ہے پھر یہ کہ عارف اور منزل حق کا سالک جس منزل پر پہنچتا ہے اس سے بالاتر بھی ایک منزل اسے نظر آتی ہے یہاں تک کہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان تک پر آتا رہا رَبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا اور ہر بلندتر منزل صراط مستقیم ہی کا ایک درجہ ہے جو اھدنا الصراط المستقیم کے ساتھ مطلوب ہے۔ لہٰذا یہ ترجمہ کہ ”بتلا تا رہ ہم کو سیدھا راستہ“ مقام عبودیت میں زیادہ مناسب اور جامع ہے۔

صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ۝۷

”ان کا راستہ جنہیں تو نے اپنی نعمت سے نوازا ہے نہ ان کا جن پر غضب ہے اور نہ انکا جو بھٹکے ہوئے ہیں۔

یہ اس سیدھے راستے کی تشریح ہے جس پر چلانے کی پہلے دعا کی گئی تھی۔ اس میں نعمت سے مراد نعمت دنیا یعنی مال و اولاد وغیرہ نہیں ہے کیوں کہ یہ تو کافروں اور گمراہوں کو بھی ملی ہے اور یہاں انعمت علیھم کا مقابلہ ہے مغضوب الیھم اور ضالین کے ساتھ لہٰذا یہ نعمت صرف وہ ہدایت و توفیق ہو سکتی ہے جو اس کے بہترین طاعت گزار بندوں کے شامل حال رہی (معانی الاخبار حدیث امیر المومنینؑ)۔

دین حق کی معرفت میں اشخاص کی اہمیت:

اس سے ظاہر ہے کہ دین حق کی معرفت اس کے نفس قانون (شریعت) اور کتاب سے اتنی نہیں ہو سکتی جتنی اُن اشخاص کے ذریعہ سے جو اس دین کے اُصول پر بہترین عمل کر کے اس کا ایک جیتا جاگتا مجسّمہ ہو گئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سورۂ حمد میں جو براہ راست عبد و معبود کے درمیان ہے ان بندوں کا ذکر نہ ہوتا جنھوں نے اس کے جادہ رضا پر چل کر اس کی راہ رضا کے سنگ میل یا اس کی منزل مقصود کے لئے منارہ بلند کی حیثیت اختیار کر لی ہے چنانچہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی اپنی تفسیر ماجدی میں نقل کرتے ہیں کہ ”مرشد تھانوی مدظلہ نے فرمایا کہ الذین انعمت علیھم سے اشارہ اس طرف ہو گیا کہ صراط مستقیم میسر نہیں ہوتا بغیر اس کے کہ پیروی اہل صراط مستقیم کی کی جائے اور اس کے لئے محض اوراق کتب کافی نہیں“۔ یہ مخصوص نعمتوں سے نوازے ہوئے بندے کون ہیں؟ ان کی تفصیل خود قرآن مجید میں دوسری جگہ اس طرح آئی ہے:

---

[1]۔ اما الکل واحد عند العارفین باسرارھم (صافی)

[2] عن علی کرم اللہ وجھہ ثبتنا علی الھدایۃ (غرائب القرآن)

وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓـئِكَ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ(سورۂ نساء۔۶۹)

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کریں تو یہ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام و احسان کیا ہے انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں:

''سورہ نساء کی اس آیت کریم سے 'انعمت علیھم' کی مزید تفسیر وتشریح کرنا ایک ایسی مُسلّم اور متفق علیہ تفسیر ہے جسے عہد صحابہ واہل بیت نبوت (رضوان اللہ علیہم) سے لے کر طبقات متاخرہ تک تقریباً تمام ارباب علم ورسوخ نے اختیار کیا ہے اور مفسرین 'خاصہ' و 'عامہ' سب نے اسے قبول کیا ہے چنانچہ جس طرح محدث ابن جریر طبری نے اس کے متعلق مفسرین صحابہ کے آثار جمع کئے ہیں اسی طرح علامہ کلینی اور شیخ طبرسیؒ (صاحب تفسیر مجمع البیان) بھی اس سے انکار نہیں کرتے۔ اس عاجز نے تفسیر 'البیان' میں تصریحات حضرات آئمہ کرام علیہم السلام و اقوال مفسرین خاصہ بھی نقل کردیے ہیں فمن یشاء التفصیل فلیرجع الیہ' (داستان کربلاء مطبوعہ حیدرآباد دکن ص ۲۲)

مولانا کی متداول تفسیر ''ترجمان القرآن'' ہے۔ اس میں ہم نے تلاش کیا تو یہ تفصیل دست یاب نہیں ہوئی اس کے علاوہ تفسیر 'البیان' جس کا حوالہ دیا گیا ہے ہمارے علم میں نہیں ہے۔

اس جماعت کے ذکر کے بعد جن کے قریب لانا ہے ان کے بالمقابل دوسری جماعت کر ذکر بھی ضروری سمجھا گیا ہے جس سے دوری اختیار کرانا منظور ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ صراط مستقیم کی معرفت اور عملی پابندی میں صرف ثبوتی پہلو کافی نہیں ہے جب تک اس کے ساتھ سلبی پہلو یعنی ان اشخاص اور جماعتوں سے بیزاری بھی نہ ہو جو اس صراط مستقیم سے دوری کا باعث ہیں۔

اس ذیل میں دو جماعتوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ جن پر اللہ کا غضب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر عداوۃً حق سے انحراف اختیار کیا ہے۔ دوسرے وہ جو بھٹکے ہوئے ہیں یعنی جو طلب حق میں کوتاہی سے کام لے کر نادانستہ گمراہی میں پڑ گئے ہیں۔ یہ ''نادانستہ گمراہی'' اگر پوری امکانی جدوجہد کے ساتھ ہوتی تو وہ مستوجب ملامت وعقوبت نہیں ہوسکتی تھی لیکن یہ نادانستگی قصور کا نہیں ارادۃً تقصیر یعنی سہل انگاری اور دماغی کاہلی کا نتیجہ ہے لہٰذا معاف کیے جانے کے قابل نہیں ہے۔ پھر بھی یہ جماعت ان سے تو بہتر ہی ہے جو حق کو جاننے کے بعد صرف عداوۃً منحرف رہتے ہیں۔

اب یہ جماعتیں ہیں کون؟ ایک تفسیر یہ ہے کہ المغضوب علیھم سے مراد یہود ہیں جن کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے کہ:

مَنۡ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيۡهِ وَجَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَالۡخَنَازِيۡرَ (مائدہ۔۶۰)

جن پر اللہ نے لعنت کی اور اُن پر غضبناک ہوا اور ان میں سے کچھ کو بندروں اور سوّروں کی شکل میں کردیا۔

اور الضّآلین سے مراد نصاریٰ ہیں جن کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے کہ:

وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَهۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَاَضَلُّوۡا كَثِيۡرًا وَّضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ﴿۷۷﴾ (سورہ مائدہ)

اس جماعت کے خیالات کی پیروی نہ کرو جو پہلے گمراہ ہوئے اور بہت سوں کو گمراہ کیے اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے

یہ تفسیر ہمارے یہاں بھی امام جعفر صادق علیہ السلام سے وارد ہوئی ہے [1] اور مفسرین اہل سنت نے بھی آیات مذکورہ کی بنا پر اسے اختیار کیا ہے [2]۔

ممکن ہے کہ براہ راست تنزیلی طور پر یہ جماعتیں مقصود کلام ہوں اور تبعاً ہر جماعت کے ساتھ تمام افراد ملحق ہوں جو صفات میں ان کے ساتھ شریک ہیں۔ اس لئے ایک حدیث میں آیا ہے المغضوب عليهم النصاب و الضّالّين اهل الشكوك الّذى لا يعرفون الامام [3] (یعنی) مغضوب علیھم سے مراد اہل بیت علیہم السلام سے عداوت کا اظہار کرنے والے ہیں اور ضالین وہ شکوک واوہام میں مبتلا لوگ ہیں جو معرفت امام نہیں رکھتے''۔

یہ بحث کہ اللہ غضب ناک کیوں کر ہوتا ہے، غضب تو انفعال و تاثر کا نتیجہ ہوتا ہے اور خدا ہر تاثر سے بری ہے، اس لئے کوئی وزن نہیں رکھتی کہ یہ غضب سے مخصوص نہیں یہی سوال تو رحمت میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ پھر جب کہ رحمت تاثر و انفعال کا نام نہیں بلکہ اس فعل کا نام ہے جو دوسرے کے لئے بہتری اور فائدہ کا باعث ہو تو غضب کے لئے بھی یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ وہ تاثر و انفعال کے قبیل سے ہے بلکہ وہ کفر نفاق معصیت اور گمراہی کی بناء پر کسی شخص کے مستحق عذاب ہونے کے علم اور اسی علم کے مطابق اس کے ساتھ سلوک کرنے کا نام ہے۔

جیسا کہ عبد الماجد صاحب نے لکھا: غضب الٰہی کا ذکر اگلے آسمانی نوشتوں میں صراحت کے ساتھ ہے، توریت میں بھی اور انجیل میں بھی توریت میں ہے کہ اب تو مجھ کو چھوڑ کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں انہیں بھسم کر دوں (خروج ۳۲: ۱۱) نیز خروج ۳۲: ۱۲ و ۱۱۳ استثنا ،۱۹ و ۲۰ و ۲۱ وغیرہ، انجیل کو عام طور پر سرتا سر حلم ورافت وشفقت کا صحیفہ سمجھا گیا ہے مگر وہ بھی اس ذکر سے خالی نہیں (ملاحظہ و متی ۳: ۸ و امکاشفہ ۱۵، ۹ وغیرہ)''

---

[1] ۔تفسیر علی بن ابراہیم قمی

[2] ۔غرائب القرآن نیشاپوری

[3] ۔عن ابن اذنية عن ابى عبد الله علیہ السلام (تفسیر علی بن ابراہیم)

سُوۡرَةُ الۡبَقَرَةِ

یہ مدنی سورہ یعنی بعد ہجرت کا نازل شدہ قرآن کے تمام سوروں میں سب بڑا سورہ ہے جو ۲۸۶ آیت پر مشتمل ہے [۱]۔

سورۂ بقرہ کے مضامین:

بقرہ گائے اور بیل کو کہتے ہیں۔ چوں کہ اس سورہ میں ایک گائے یا بیل کے ذبح کا قصہ درج ہے، جو کسی اور جگہ قرآن میں نہیں ہے، اس لئے اس نام کے ساتھ موسوم ہوا۔ یہ سورہ علاوہ بسیط ہونے کے اسلام کے بہت سے اہم حقائق اور تعلیمات پر مشتمل ہے، جیسے ایمان بالغیب کی اہمیت، متقین کی شان، منافقین کے اوصاف، اعلان خلافت اور امتحان آدم وملائکہ، متعدد واقعات جناب موسیٰؑ وقومِ بنی اسرائیل، یہود ونصاریٰ کے مزعومات اور ان کی سبق آموز رد، واقعہ ہاروت وماروت، اعلان امامت اور ذریت ابراہیمی میں اس کا بقاء اسلام کی قدامت اور ابراہیم اور ان کے بعد اسحٰقؑ ویعقوب اور اسباطؑ یعنی پیشروان یہود ونصاریٰ کا اس ملت میں مندرج ہونا، تحویل قبلہ حیات شہداء اقسام امتحان فضیلت صبر، احکام حج وعمرہ آیات قدرت حکمِ وصیت، فرضیت واحکام صوم، حکمِ دعا، حکمِ جہاد، دنیا وآخرت کا امتزاج، حدودِ اِتفاق، حرمتِ شراب، حرمت قمار، احکامِ حالات مخصوصۂ نسواں، احکامِ طلاق ورضاع، عدۂ وفات وطلاق، نماز خوف، واقعۂ طالوت، حرمت ربوا، احکام دین ورہن ودیگر معاملات وغیرہ وغیرہ ان میں بہت سے امور ایسے ہیں جن کا صرف سورہ میں ذکر ہے اور کہیں درج نہیں کئے گئے ہیں۔ اس لئے ابتدائے زمانہ نزول سے اس سورہ کی اہمیت قرار پائی ہے۔ ہماری قدیم تفسیر میں بطور حدیث وارد ہے کہ اس ایک سورہ میں پانچ سو احکامِ شریعت درج ہیں [۲]۔

طرق اہل سنت سے وارد شدہ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ان الفاظ میں کرتے تھے کہ:

الذی انزلت علیه سورة البقرة. (صحیح مسلم ج ا ص ۴۱۵)

وہ ہستی جس پر سورہ بقرہ اتارا گیا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

"سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے"۔

اس آیت کی تشریح وتفسیر پہلے ہو چکی ہے۔

---

[۱]۔ "مائتان وثمانون وست اٰیات مدنیة (تفسیر کبیر ج ا ص ۱۵۰) مائتان وست وثمانون فی العدد الکوفی وهو العدد المروی عن امیر المؤمنین" (مجمع البیان ج ا)

[۲]۔ روی ان فی البقرة خمس مائة حکم (علی بن ابراہیم)

الٓمّٓ ①

الف ۔لام ۔میم

مقطعات قرآنیہ اوران کی نوعیت:

ان حروف کو اور ایسے ہی جو بہت سے سوروں کی ابتدا میں ہیں جیسے حٰمٓ، الٓمّٓرٰ، الٓمّٓصٓ وغیرہ ان سب کو ''مقطعات قرآنیہ'' کہتے ہیں ان کے بارے میں صحیح یہی ہے کہ راز ہائے سربستہ ہیں جو مابین خدااور رسول ایک خصوصی پیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فریقین کے یہاں وہ شخصیتیں جن کے اقوال سر آنکھوں پر رکھے جاتے ہیں یہی بتاتی ہیں ایک طرف علامہ رازی لکھتے ہیں:

قال ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ فی کل کتاب سرّ و سرّہ فی القرآن اوائل السوروقال علی علیہ السلام ان لکل کتاب صفوۃ ھذا الکتاب حروف التہجی. (تفسیر کبیر ج ا ص ۱۵۰)

حضرت ابوبکرؓ کا قول ہے کہ ہر کتاب سماوی میں اللہ کا کوئی مخصوص راز ہے اور قرآن میں اس کا راز ان سوروں کے ابتدائی حروف ہیں اور حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ہر کتاب میں ایک خاص منتخب چیز ہے اور اس کتاب کا منتخب ترین جزء یہ حروف ہیں۔

پھر لکھا ہے:

سئل الشعبی عن ھٰذاہ الحروف فقال سرّ اللہ فلا تطلبوہ وروی ابو ظبیان عن ابن عباس قال عجزت العلماء عن ادرکھا وقال الحسین ابن الفضل ھو من المتشابہات. (ص ۱۵۱)

شعبی سے ان حروف کے بارے میں دریافت کیا گیا انہوں نے کہا یہ اللہ کا راز ہے اسے معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو اور ابوظبیان کی روایت ہے ابن عباس نے کہا کہ صاحبانِ علم ان کے سمجھنے سے قاصر ہیں اور حسین بن فضل نے کہا ہے کہ وہ متشابہات میں سے ہیں۔

دوسری طرف علامہ طبرسی لکھتے ہیں:

انّھا من المتشابہات الّتی امتأثر اللہ بعلمھا و لا یعلم تأویلھا الّا اللہ وھٰذا ھو المروی عن أئمتنا.

یہ ان متشابہات میں سے ہیں جن کا علم اس نے اپنے سے مخصوص رکھا ہے اور سوااللہ کے کوئی ان کے مطلب سے واقف نہیں ہے یہی روایت ہمارے آئمہ سے وارد ہوئی ہے۔

جناب تاج العلماء نے اپنے ترجمہ کے حاشیہ میں لکھا ہے:

''یہ متشابہ آیتوں میں قرآن مجید کے بین اور آیتوں کی تفسیر ہوا وہوس اور اپنی خودرائی سے حرام قطعی ہے اور اسی کو تفسیر بالرائے کہتے ہیں''۔

بے شک چوں کہ خود قرآن مجید میں ہماری مانی ہوئی تفسیر کے مطابق متشابہات کے علم میں اللہ کے ساتھ 'راسخون فی العلم'' کا بھی ذکر موجود ہے اس لئے ان مقطعات کے معانی معصومینؑ کے دایرۂ علم میں ہو سکتے ہیں چنانچہ ہماری قدیم تفسیر میں جو زیادہ تر اقوال آئمہ سے ماخوذ ہے الٓمّٓ کے بارے میں ہے جس سے مقصود غالباً تمام مقطعات کے بارے میں بتانا ہے کہ:

ھو حرف من حروف اسم اللہ الا عظم المنقطع فی القرآن الذی یؤلّفہ النبی و الامام فاذا دعابہ اجیب.

(تفسیر علی بن ابراھیم قمی)

وہ اللہ کے اسم اعظم کے کچھ حروف ہیں جو قرآن میں الگ الگ آئے ہیں جنہیں پیغمبر اور امام ترتیب دیتے ہیں تو ان سے جو دعا مانگتے ہیں وہ قبول ہوتی ہے نتیجہ اس کا بھی یہی ہے کہ وہ ہمارے لئے راز سربستہ ہی کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

جن لوگوں نے اپنی ذہنی کاوش کا ان مقطعات کو آماجگاہ بنا کر ان کی حقیقت بتانا چاہی ہے ان کے اقوال کی کثرت بھی خود، مذکورہ بالا حقیقت کی مؤید ہے چنانچہ ان میں سے ان اقوال کی جو علامہ طبری کی جامع البیان یا امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر یا علامہ طبرسی کی مجمع البیان میں درج ہیں تعداد تقریبا ۲۳ تک پہنچتی ہے جن میں سے کوئی بھی کسی معصوم سے وارد نہیں ہے ایسی صورت میں ان کا ذکر کرنا ہی بے کار ہے جب کہ ان ہستیوں نے جن کا حق تھا کہ وہ ایسے مشابہات کی تشریح فرمائیں خود یہ کہہ یا کہ یہ راز قدرت ہے تو پھر اس کے درپے ہونا نبض قرآن انہی کا کام ہو سکتا ہے جو قرآنی الفاظ فی قلوبھم زیغ[۱] کا مصداق ہوں۔

قرآن کے بحیثیت مجموعی ہمارے لئے سرمایہ ہدایت ہونے سے یہ ضروری قرار نہیں پاتا کہ اس کا ہر ہر جزء ہمارے سمجھانے کے لئے نازل کیا گیا ہو بلکہ اسی میں اپنے رسول کے لئے خصوصی رموز واشارات بھی ودیعت کر دیئے جائیں جن کی بقدر ضرورت تبلیغ رسول اور ان کے وارثان علم کی حکیمانہ مصلحت بنی سے وابستہ رکھی گئی ہو تو اس میں اعتراض کی کوئی وجہ نہیں ہے۔خود اسی سورہ میں ہے خَلَقَ لَكُمۡ مَّا فِي الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا (بقرہ۔۲۹) تمام کائنات ارضی تمہارے لئے خلق فرمائی ہے مگر ان میں بے شمار چیزیں وہ ہیں جن کا علم ابھی تک ہم کو نہیں ہے یا علم حاصل ہوا ہے تو مخصوص معلمین کی تعلیم سے اسی طرح قرآن ہمارے لئے نازل ہوا ہے مگر اس کی ہر جزو کا علم ہمیں بالذات حاصل ہونا ضروری نہیں ہے۔

ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَيۡبَ ۛۚ فِيۡهِ ۛۚ هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ۙ۝۲

"یہ خاص کتاب ہے اس میں بدگمانی[۲] کی کوئی گنجائش نہیں ہدایت ہے فکر نجات رکھنے والوں کے لئے"

قرآن خود اپنا وصف پیش کر رہا ہے"کتاب" کی لفظ سے ظاہر ہے کہ اگر چہ تنزیل قرآن کی متفرق آیتوں کی شکل میں بحسب ضرورت وقت ہوتی تھی مگر کوئی ظرف مکان ایسا ضرور تھا جہاں ان تمام آیات کا مجموعہ کتابی شکل میں موجود تھا۔آیتیں جو بھی نازل ہوتی تھیں وہ اسی کتاب کے اجزاء کی حیثیت سے۔

پھر اس کے علاوہ کچھ ایسی بھی وحی ہوتی تھی جو اس کتاب سے علیٰحدہ تھی وہ جب رسولؐ کی زبان پر آگئی ہے تو وہی "حدیث قدسی" کہلائی۔

یہ خواہ بوقت تنزیل فرشتہ تصریح کر دیتا ہو کہ وحی منجملہ قرآن ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خداداد قوت امتیاز تھی جس سے وحی کے وہ حصے الگ رہتے تھے جو بطور قرآن نازل ہوئے ہوں اور وہ الگ کہ جو اس سے علیحدہ ہوں۔

---

[۱]۔ ان کے دلوں میں کجی ہے (پارہ سوم آل عمران)

[۲]۔ الریب تویب من الشك وفیہ زیادة کانه

وحی اترنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کسی صحابی کو بلا کر وہ آیت لکھوا دیتے تھے۔ اسی سے یہ ظاہر ہے کہ ازاول قرآن مجید کا مکتوبی صورت سے محفوظ رکھا جانا ہی منظور الٰہی تھا۔ صرف حفظ اور قراءت پر اعتماد کرنا مقصود نہ تھا۔ نہ ایسا ہے کہ رسول اللہ حسب موقع جو تعلیمات زبان پر لاتے رہے انہیں صحابہ نے بطور یادگار جمع کرلیا ہو۔ یہ حیثیت احادیث کے ان ذخیروں کی ہے جو محدثین کے یکجا کیے ہوئے موجود ہیں۔ قرآن کی کتابی صورت اس سے مختلف ہے۔ وہ خدا کی طرف سے مکتوبی شکل میں اگرچہ نازل نہیں کیا گیا مگر حیثیت اسے کتاب کی منجانب اللہ کی طرف سے حاصل ہے کسی انسان کی طرف سے نہیں۔

''اس کتاب میں شک کی کوئی گنجائش نہیں'' ان آیات اعجاز اور دلائل حقانیت کی بناء پر جو اس کے الفاظ[1]، معانی[2]، تنزیلی پس منظر[3] اور مترتب شدہ نتائج[4] سب میں مضمر ہیں۔

نہ یہ کہ شک کرنے والے اس میں نہیں ہیں۔[5] شک کرنے والے یا تو حقیقۃً ایسے ہیں کہ وہ دل میں شک رکھتے نہیں بلکہ جان بوجھ کر از روئے عناد تصدیق سے گریز کرتے ہیں اور ایسے ہیں کہ جو مبتلائے غفلت ہیں اور ان دلائل پر غور نہیں کرتے اور اسی لئے اس کی ہدایت کی تاثیر سب میں نمودار نہیں ہوتی بلکہ ایک مخصوص جماعت میں نمودار ہوتی ہے جن کے اوصاف متقین اور اس کے بعد کے لفظوں سے بیان کئے گئے ہیں اگر اس میں شک رکھنے یا انکار کرنے والے موجود نہ ہوتے اور سب اس پر یقین کی کیفیت کے ساتھ متوجہ ہوتے تو اس کی ہدایات سے سب فیض یاب کس لئے نہ ہوتے۔

اس سے فیض حاصل کرنے والے وہی ہوں گے جو ان ارشاد و ہدایت کی باتوں پر جنہیں قرآن پیش کرتا ہے غور کریں اور فائدہ اٹھانے کے قصد سے سنیں۔ رہ گئے سرکش مخالف یا بے پرواغافل، وہ اس پر توجہ ہی نہ کریں گے تو ہدایت کا اثر کیا قبول کریں گے بلکہ ہٹ دھرم اور متعصب مخالف تو جتنا ہدایت کی باتیں زیادہ سنتے ہیں اتنا ہی کفر و عناد میں شدت اختیار کرتے جاتے ہیں[6]۔

یہ وہ ہیں جن کے لئے نتیجۃً وہ باعث ہدایت ہونے کے بجائے زیادتی مرض وضلالت کا سبب ہوجاتا ہے جس میں قصور خود ان کا ہے اس کتاب کا نہیں جو درحقیقت مجسمہ ہدایت ہے

گر نہ بیند بروز شپرہ — چشم چشمہ آفتاب را چہ گناہ

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ③

---

[1] ۔ فصاحت وبلاغت

[2] ۔ ان حقائق و معانی کا بیان جن سے اس وقت دنیا ناواقف تھی

[3] ۔ اس کا رسول ﷺ اُمّی کے ذریعہ سے پیش ہونا جس نے اُمیّین ہی کے درمیان پرورش پائی تھی

[4] ۔ اس کے ادعائے اعجاز کے مقابلہ میں مخالف طاقتوں کی سپر اندختگی اور دائمی عاجزی

[5] ۔ ما نفی ان احدا لا یرتاب فیہ وانما المنفی کونہ متعلقا للریب و مظنۃ لہ لانّہ من وضوح الدّلالۃ وسطوع البرھان بحیث لا ینبغی لمرتاب ان یقع فیہ (نیشاپوری)

[6] ۔ فالمؤمن بہ مھتد والکافر بہ محجوج (جامع البیان للطبری)

"جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خیرات کرتے ہیں"۔

اس جماعت کا جس نے قرآن سے فیض حاصل کیا جامع وصف "متقین" کی لفظ سے بیان ہو گیا یہ اس کی تفصیل ہے۔

تقویٰ کا مفہوم:

"تقویٰ" کے معنی خوفناک انجام سے اپنا بچاؤ کرنے کے ہیں مگر متقی کا لفظ جس ڈر کو بتاتا ہے وہ کسی مادی نقصان یا ظاہری طاقت کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ان دیکھی ذات خدا کی عظمت کا احساس اور اس کی ناراضی سے بچنا ہے۔ انسان جب اس سے ڈرتا ہے تو صحیح انسانی فرائض کے ادا کرنے کا خیال رکھتا ہے پھر وہ دنیا کی طاقتوں سے نڈر ہو کر حقانیت کا پابند رہتا ہے۔

ایمان بالغیب کی اہمیت:

حقیقت یہ ہے کہ مادی چیزوں کی حرص اور ان کا خوف ہی اکثر سیدھے راستے سے ہٹانے کا باعث ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ آنکھوں کے سامنے جو آ سکتے ہیں وہ یہی مادی نفع اور نقصان کے ذرائع ہیں۔ جتنا ان مشاہدات سے آدمی متاثر ہو گا اتنا ہی دولت، کثرت اور طاقت کے اصنام کے سامنے جھکنے پر مائل ہو گا اور جتنا ان عالم شہود کے مظاہر سے بے تعلق ہو گا اور ان سب کی طرف سے آنکھیں بند کر کے دل کی آنکھوں کو کھول کر ان دیکھی قوت کی طرف متوجہ ہو گا اتنا ہی اس نقطہ حق کے ساتھ وابستہ ہو گا جو اس سے عدل و احسان کے سوا کبھی برائی اور ناحق کوشی کا روادار نہیں ہوتا۔ اسی لئے قرآن نے متقین کے وصف میں سب سے پہلے ایمان بالغیب کو رکھا ہے کہ یہ سرچشمہ ہے تمام دوسرے اوصاف کا۔ اس میں مرکزی نقطہ تو حق سبحانہ کی ذات ہی ہے جو بہر صورت غیب الغیوب ہے مگر اس کے ساتھ مذہب سے متعلق تمام حقائق جن کا اعتقاد ضروری ہے داخل ہو جاتے ہیں کیوں کہ وہ سب ہی کسی نہ کسی حیثیت سے غیب ہیں [1]۔

مولوی عبدالماجد صاحب نے لکھا ہے "دین کا مغز کہیے یا ایمان کی روح یہی عالم غیب کا عقیدہ ہے یعنی یہ اعتقاد کہ اس عالم مادی سے ماوراء اس کائنات حسی سے اوپر کچھ اور ایک عالم ہے ضرور اور جو اس عالم کے وجود کا قائل نہیں وہ سرے سے مذہب ہی کا قائل نہیں"۔

ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ امام غائب کے تسلیم کرنے میں بھی مومنین متقین کو کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے جو مسلمانوں کے درمیان سب سے آخری منزل امتحان ایمان کی بن گئی ہے جیسا کہ امین الاسلام طبرسی نے لکھا ہے:

ویدخل فیہ مارواہ اصحابنا من زمان غیبۃ المھدی ووقت خروجہ. (مجمع البیان)

اور اس میں داخل ہے وہ جو ہمارے یہاں وارد ہوا ہے امام مہدی کی غیبت اور آپ کے ظہور کے وقت کے بارے میں۔

اس سے علامہ رازی کا یہ اعتراض ختم ہو جاتا ہے کہ عام کی تخصیص بغیر دلیل درست نہیں ہے اس لئے کہ ہم کب اس کے قائل ہیں کہ غیب سے مراد بالخصوص یہی ہے بلکہ ہم اسے ایک فرد کی حیثیت سے اس حکم عام میں داخل سمجھتے ہیں جیسا کہ ہمارے جد اعلیٰ جناب جنت مآب سید نقی صاحب قبلہ نے فرمایا ہے:

لسنا نقول ان المراد بالغیب المھدی لا غیر حتی یلزم تخصیص المطلق من غیر دلیل بل نقول

---

[1] ۔ یدخل فیہ العلم باللہ تعالیٰ و بصفاتہ و العلم بالآخرۃ و العلم بالنبوۃ و العلم بالاحکام و الشرائع (رازی)

المراد به ما غاب عن العباد علمه من امور الدين كما عن الحسن اوما جاء عند الله كما عن ابن عباس وما جاء في المهدي صلوات الله عليه داخل فيه (ينابيع الانوار ج ۱)

ہم یہ نہیں کہتے کہ غیب سے امام مہدی ہی مراد ہیں اور کچھ نہیں تاکہ مطلق کی تخصیص لازم آئے بغیر دلیل بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ دینی باتیں ہیں جو بندگان الٰہی کی نگاہ سے اوجھل ہیں جیسا کہ حسن کا قول ہے یا وہ جو اللہ کی طرف سے آیا ہے جیسا کہ ابن عباس کا قول ہے اور امام مہدی کے بارے میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں وہ اس میں داخل ہیں۔

پھر کوئی شیعہ اگر اس تخصیص کا قائل بھی ہو تو وہ بلا دلیل نہ ہوگا جب کہ اس بارے میں ان ہستیوں کے ارشادات موجود ہیں جو دینی حیثیت کے دلیل قرار پانے کے لئے کافی ہیں [1])۔

اعتقادات کا اصل یعنی ایمان بالغیب کو ذکر کرنے کے بعد دو ۲ وصف اعمال سے متعلق ذکر کیے ہیں جو دو ۲ شعبوں کی نمائندگی کرتے ہیں اول انفرادی فرائض یعنی حقوق اللہ ان سب سے اہم ہے جس کیلئے قرآن مجید میں ہے کہ یہ تمام برائیوں سے روکنے والی چیز ہے (اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ (عنکبوت۔۴۵) اور حدیث میں ہے: ان قبلت قبل ما سواها و ان ردت ردّ ما سواها، اگر یہ قبول تو سب اعمال قبول اور یہ مسترد تو سب اعمال مسترد'۔

دوسرے اجتماعی فرائض یعنی حقوق الناس ان میں انفاق کی صفت کا ذکر کیا گیا ہے جو خلق خدا کو ہر طرح کے فائدے پہنچانے پر شامل ہے [2] جس طرح اس میں مال و دولت داخل ہے جو رزق جسمانی کا ذریعہ ہے اسی طرح علم و معرفت جو رزق روحانی ہے اسی لئے آئمہ اہلبیتؑ سے اس کے معنی وارد ہوئے ہیں: وما علمنا هم يثبون ''اور ہم نے جو تعلیم دی ہے انہیں وہ اس کی اشاعت کرتے ہیں'' اسے علی بن ابراہیم قمیؒ نے اپنی تفسیر میں وارد کیا ہے اور علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں بروایت محمد بن مسلم امام جعفر صادق سے نقل کیا ہے۔

وَالَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِمَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَمَآ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ ۚ وَبِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَ ؕ‏ ﴿۴﴾

''اور جو ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل کیا گیا ہے اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا تھا، اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں''۔

ان ہی متقین کے متعلق جن کے لئے قرآن فیض رساں ثابت ہوتا ہے اوصاف کا ایک دوسرا سلسلہ ہے وہ پہلے اوصاف وہ تھے جو بذات خود ان کے بیش قیمت ذاتی جوہر ہیں یعنی غیب پر ایمان حقوق اللہ اور حقوق الناس سب کی ادائیگی اب یہ ان کے وہ اوصاف امتیازی ہیں جو دوسری جماعتوں کے تقابل سے ان میں نمایاں ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ان کے بالمقابل جتنی دوسری جماعتیں ہیں ان کی صفت امتیازی انکار ہے ایک طرف مشرکین ہیں جو خدا ہی کے منکر ہیں یا اس کے انبیاء پر نازل شدہ تمام ہی تعلیمات کے منکر ہیں اور کسی بھی شریعت و کتاب کے پابند نہیں ہیں

---

[1]۔ جناب شیخ صدوق محمد بن علی بابویہ قمیؒ نے اپنی جلیل القدر کتاب ''اکمال الدین'' میں اس بارے میں امام جعفر صادقؑ کی کئی حدیثیں درج فرمائی ہیں۔

[2]۔ الظاهر انّ الاٰية تعم جميع انواع الصّدقة (ینابیع الانوار)

اسی لئے وہ ''اہل کتاب'' نہیں کہلاتے وہ کسی ''ما انزل'' پر نہ ایمان رکھتے ہیں اور نہ اس کے دعویدار ہیں۔

دوسری طرف اہل الکتاب یعنی یہود ونصاریٰ ہیں یہ فی الجملہ ماانزل پر ایمان کے مدعی ہیں مگر ان میں سے پہلا گروہ یہود، وہ موسیٰ پر نازل شدہ توریت تک تو تسلیم کرتا ہے مگر عیسیٰ علیہ السلام اوران پر نازل شدہ انجیل اور پھر اس کے بعد کا منکر ہے دوسرا گروہ نصاریٰ وہ بخیالِ خود سہی اوران کی انجیل تک مانتا ہے لیکن حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اوران پر نازل شدہ شریعت وکتاب کا انکار کرتا ہے تو جہاں تک ایمان ''بما انزل'' کی صفت کا تعلق ہے مخالف جماعتوں میں سے کچھ میں تو دوسرے سے مفقود ہے دہریین اور مشرکین اور کچھ میں وہ ایمان اس طرح ہے کہ بعض کا ایمان اور بعض کا کفر مگر اس جماعت کا جو قرآن سے ہدایت قبول کرنے والی ہے خاص وصفت یہ ہے کہ ان کے یہاں ایمان ہی ایمان ہے۔ یہ ایمان کے بھی حامل ہیں جس کے یہود مدعی ہیں اس ایمان کے بھی جس کے نصاریٰ مدعی ہیں اور پھر اس کے آگے یہ اس کتاب وشریعت پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے۔

قرآن کی ہدایت سے مسلمان اس کا اعتقاد رکھتا ہے کہ ابتدائے دور کائنات سے ہر قوم اور ہر ملک میں اللہ نے ہادیان دین پیدا کیے ہیں اوران کی حقانیت پر ایمان جزو اسلام ہے۔

گزشتہ انبیاء پر ایمان کی صورت:

بے شک ان میں سے جن جن کے نام قرآن کریم میں آگئے ہیں ان کی رسالت پر بالتفصیل ایمان ہے لیکن جن کے نام نہیں آئے ہیں اور ہمارے لئے کوئی قابل اطمینان ذریعہ ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا نہیں ہے ان کی رسالت کا ہم نام بنام یقین نہیں کرسکتے۔ پھر بھی اجمالی طور پر اس کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو بھی رہ نمایانِ دین جس ملک میں آئے وہ سچے تھے۔ اوراسی لئے ان مذاہب کے قدیم پیشواؤں کے بارے میں جن کے نام ان اہل مذاہب کی زبانی سنے جاتے ہیں ایک مسلمان کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کوئی کلمہ نازیبا اور توہین آمیز جملہ زبان پر لائے جب کہ احتمال ہے کہ وہ بھی ان سچے رہبران دین میں سے ہو جن پر ایمان از روئے قرآن لازم ہے۔

آخرت پر یقین:

دوسری صفت یہ ہے کہ وہ روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں یقین وہ راسخ اعتقاد ہوتا ہے جو انسان کے عمل پر لازمی طور سے اثر انداز ہوتا ہے۔ دوسری جماعتوں میں مشرکین و ملاحدہ کو اس زندگی کے بعد کسی دوسرے دور کا تصور ہی نہیں ہے اور وہ اس مرکز عدالت ہی کے نہیں قائل ہیں جو جزا وسزا کے دینے کا حقدار ہے۔ یہود کے یہاں جزا وسزا کا تصور اس موجود توریت کے رو سے جوان کے یہاں متداول ہے دنیوی ہے توریت میں کفر وعصیان کی سزا میں جو دھمکیاں دی گئی ہیں وہ کھیتیوں کے جل جانے عمریں کم ہوجانے اور اسی طرح کی دوسری باتوں کے قبیل سے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان مادی تحفظات کرنے کے بعد بہت حد تک مطمئن ہوجاتا ہے۔

عیسائیوں نے جزا وسزا کے عقیدہ کو فدیہ مسیح کا اعتقاد قائم کرکے بالکل ختم کردیا اب انہیں اصلاح عمل کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔

مسلمان ازروئے آیات قرآن اس دورحیات دنیا کو عبوری سمجھتا اور آخرت کی منزل کو جزا وسزا کا مرکز جان کر ہر اس اقدام سے باز رہتا ہے جو ظلم وستم اور طغیان وعدوان میں داخل ہو خواہ اس سے دنیوی زندگی میں کتنی ہی بڑی کامیابی حاصل ہو اور عدالت وانصاف سچائی اور امانت

داری بلکہ ایثار قربانی تک کے لئے آمادہ رہتا ہے، چاہے اس میں کتنا ہی اسے نقصان بلکہ دنیوی تباہی تک سے دوچار ہونا پڑے۔
یہ زندگی وہ ہے جو آخرت کے سچے یقین کا لازمی نتیجہ ہے اور اگر مسلمان کی زندگی میں یہ توازن و اعتدال نظر نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ زبان سے اصول عقائد کا مقر ہے مگر دل میں اس کے یقین آخرت کا شائبہ تک نہیں ہے۔

أُولَٰٓئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝٥

"یہ ہوتے ہیں وہ جو اپنے پروردگار کی ہدایت پر قائم ہوں اور یہ ہیں وہ جو ہر حیثیت سے بہتری پانے والے ہیں"

بطور اثر سے موثر پر استدلال کے جسے منطق میں "برہان انّی" کہتے ہیں اس جماعت کو دکھلا کر قرآنی ہدایات کی رفعت کا ثبوت پیش کیا جا رہا ہے۔
کاش آج بھی ایسے مسلمان نظر آئیں جنہیں فخر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر کے انہیں اسلامی تعلیمات کی رفعت پر غور کرنے کی دعوت دی جا سکے۔ اور یہی اصلی اور موثر تبلیغ ہے کونوا دعاۃ بانفسکم قبل السنتکم۔
فلاح کی لفظ کے ترجمہ میں "ہر حیثیت سے بہتری" لکھنا اردو میں اس کے ترجمہ کے لئے کوئی واحد لفظ دستیاب نہ ہونے کا نتیجہ ہے اہل لغت کا قول ہے کہ کلام عرب میں جامعیتِ خیر کے لئے فلاح سے بڑھ کر کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔[1]

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝٦

"بلاشبہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے حق میں یکساں ہے خواہ آپ انہیں ڈرایئے یا انہیں نہ ڈرایئے۔ بہرحال وہ ایمان لائیں گے نہیں"۔

حقیقتوں کا انکار کبھی نادانستہ یا کوشش طلب کے ساتھ عبوری دور کے طور پر ہوتا ہے۔ یہ چاہے اصطلاحی طور پر کافر سمجھے جائیں مگر فعل ارادی کے طور پر ان الفاظ سے کہ "جن لوگوں نے کفر اختیار کیا" یہ جماعت سمجھ میں نہیں آتی۔ ایسی جماعت وہ ہو سکتی ہے جس کا کفر تمہید ایمان بن سکے اور عموماً یہی وہ افراد ہوتے ہیں جو آنکھوں سے پردہ ہٹنے کے بعد اور طلب کی راہ کے منزل تک پہنچ جانے کے بعد حق کو اختیار کر لیتے اور ایمان کے درجہ پر فائز ہو جاتے ہیں۔ ان ہی کے بارے میں رسولؐ کی دعوت و تبلیغ اور تبشیر و انذار کے فوائد مترتب ہوتے ہیں اور انہیں کو کارگاہ اصلاح و ارشاد کا ماحاصل سمجھنا چاہئے۔
الذین کفروا سے یہ جماعت مراد نہیں ہے بلکہ ایسے لوگ مراد ہیں جو حق سمجھنے کے بعد باطل کو اس پر ترجیح دیتے ہیں جس کے لحاظ سے قرآن مجید نے قوم ثمود کے باب میں کہا ہے:

فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ (حٰمٓ سجدہ آیت۔ ۱۷)
انہوں نے اندھے پن کو ہدایت پر ترجیح دی۔
اور کہیں کسی جماعت کے بارے میں: کہا کہ

[1]۔ لیس فی کلام العرب کلہ اجمع من لفظۃ المفلاح لخیر الدّنیا و الاخرۃ کما قال ائمۃ اللّسان (تاج العروس للزبیدی)

أُولَٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ (بقرہ۔۱۷۵)

یہ وہ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی اور بخشش الٰہی کے عوض میں عذاب کو مول لیا ہے۔

ایسے لوگ وہ ہوتے ہیں جن کے بارے میں رسولؐ کی ہدایتیں بے کار ہوا کرتی ہیں اس لئے کہ آنکھوں پر پردہ ہوتو ہٹے اور راہ طلب میں قدم زنی ہو تو کسی رہبر کی دست گیری سہارا دے۔ ایسے ہی گروہ کے متعلق اس آیت میں اپنے رسولؐ کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے کہ ’’چاہے آپ ڈرائیے اور چاہے نہ ڈرائیے یہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اب اگر یہ آیت یہود یا مشرکین کے ایک خاص طبقہ کے متعلق ہے جیسا کہ ابن عباسؓ کا قول ہے[1] اور اسے حافظ ابن جریر طبری نے اختیار کیا ہے[2] تو اسے خالق کی طرف سے وقوع میں آنے والے غیب کی اطلاع سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اسے ایک عام حکم سمجھا جائے جیسا کہ ظاہر آیت ہے تو یہ کوئی پیشین گوئی نہیں ہے بلکہ ان کے کفر اختیاری کے مقتضائے طبیعت کا بیان ہے اور ان کے راہ ایمان پر نہ آنے سے جو رسولؐ کو ذرا رنج پہنچتا ہے اس کی تسکین ہے کہ اگر یہ راہ حق پر نہیں آتے تو اس میں آپ کا کوئی قصور تھوڑی ہے۔ یہ تو ان کے کفر اختیاری کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے ان کے لئے اور ہدایت عدم ہدایت یکساں ہوگئی ہے۔

جناب عبدالماجد صاحب نے یہاں حقیقت کی ترجمانی اچھے عنوان سے کی ہے وہ کہتے ہیں:

’’طبیب حاذق اپنے علم کی رو سے مدتوں پیشتر خبر دے دیتا ہے کہ فلاں بد پرہیز خود رائے مریض اچھا نہ ہوگا۔ کیا اس پیشین گوئی اس اخبار غیب میں اس شفیق طبیب کی خواہش و مرض کو بھی کچھ دخل ہوتا ہے؟

بقول مفسر تھانوی اس کافر کا ناقابل ایمان ہونا اللہ کے اس خبر دینے کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا یہ خبر دینا اس کافر کے ناقابل ایمان ہونے کی وجہ سے ہوا ہے اور ناقابل ہونے کی صفت خود اس کی شرارت و عناد و مخالفت حق کے سبب سے پیدا ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں اس کی پیدائش کے ساتھ استعداد قبولِ حق کی رکھی ہے جیسا حدیث میں آ گیا ہے، مگر یہ شخص خود اپنی ہوائے نفسانی اور خودغرضی کی وجہ سے حق کی مخالفت کرتا ہے یہاں تک کہ ایک روز وہ استعداد فنا ہو جاتی ہے‘‘۔

اسی کو بہت امین الاسلام طبرسیؒ نے ان الفاظ میں کہا ہے:

الصحیح ان نقول ان العلم یتناول الشئ علیٰ ما ھو بہ ولا یجعلہ علیٰ ما ھو بہ فلا یمتنع ان بعلم حصول شئ بعینہ وان کان غیرہ مقدورا۔ (مجمع البیان)

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ علم کسی چیز پر حاوی ہوتا ہے جس طرح پر وہ ہوگی اور وہ اس طرح پر اسے کر نہیں دیتا لہٰذا یہ امر غیر ممکن نہیں ہے کہ کسی معیّن چیز کے ہونے کا اسے علم ہو اگر چہ اس شخص کو اس کے خلاف پر قدرت حاصل ہو۔

---

[1]۔ قال قائلون انھم رؤساء الیھود المعاندون الذین وصفھم اللہ تعالیٰ بأنھم یکتمون الحق وھم یعلمون و ھو قول ابن عباس رضی اللہ عنہ (رازی)

[2]۔ اولیٰ ھٰذہ التأویلات بالآیۃ تاویل ابن عباس (جامع البیان)

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

"مہر کردی ہے اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے سننے کی طاقت پر اور ان کی نگاہوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے"۔

دلوں پر مہر لگنا کفر کا نتیجہ:

قلب سے مراد یہ 'جسمانی عضو' نہیں ہے جسے فن تشریح میں قلب کہا جاتا ہے بلکہ مرکز تعقل و شعور مراد [1] ہے جو اس لفظ کے عرفی معنی ہیں اور خدا کا مہر کر دینا کنایہ ہے اس بات سے کہ اس نے نیک توفیق سلب کر لی بوجہ ان کی ہٹ دھرمی کے اور یہ مطلب نہیں ہے کہ بندوں کو مجبور کر کے ان سے گناہ کرواتا ہے" (تاج العلماء) امام رضاؑ نے فرمایا ہے:

الختم هو الطبع علىٰ قلوب الكفار عقوبة علىٰ كفرهم. (صافی)

"ختم" سے مراد ہے کافروں کے دلوں پر مہر لگا دینا ان کے کفر کی سزا میں ہے۔

اس کی شاہد دوسری آیت قرآن ہے:

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (نساء۔۱۵۵)

اللہ نے ان پر مہر کر دی ہے ان کے کفر کے سبب سے ہمیشہ سے علمائے امامیہ کا یہی مسلک رہا ہے اس کے برخلاف مسلم اکثریت کے علماء زور و شور سے اس کو شیعوں کے عقیدہ عدل کے خلاف ثبوت میں پیش کرتے رہے چنانچہ ابن جریر طبری ایسا قدآور عالم اس آیت کے تحت میں لکھتا ہے کہ:

هٰذه الاٰية من اوضح الادلة علىٰ فساد قول المنكرين تكليف ما لا يطاق. (جامع البیان ج۱ص ۸۸)

یہ آیت سب سے زیادہ واضح دلیل ہے ان لوگوں کے قول کے غلط ہونے کی جو کہتے ہیں کہ ایسی باتوں کا حکم نہیں ہو سکتا جو بندہ کی طاقت سے باہر ہیں۔

مگر کبھی ضمیر کا دباؤ اسلاف کی تقلید پر غالب بھی آجاتا ہے چنانچہ دور حاضر میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس کی تشریح وہی کی ہے جو ہمیشہ سے علمائے شیعہ کرتے رہے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

"اللہ کی طرف سے مہر لگ جانے کا یہ فعل بندہ کے کفر اختیاری کے بعد ہوتا ہے نہ کہ اس کے قبل اس کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ اس کا سبب فطرت سلیم ہر انسان کو عطا ہوئی ہے اور اس میں دلائل حق پر غور و فکر کی استعداد بھی شامل ہے لیکن انسان جب اپنے ارادہ و عقل کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے اور آسمانی ہدایتوں اور خداوندی نشانیوں سے مسلسل منہ موڑے ہوئے قانون شیطانی پر چلنے کی ٹھان لیتا ہے تو سلسلہ غضبی کے ماتحت آجاتا

---

[1]۔ اللطيفة الرّبانيّة التى بها يكون الانسان انسانا (نیشاپوری) فالقلب المعنوى هو العقل (شرح اصول کافی صدرا)

ہے انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ رحمت سے خارج ہوجاتا ہے اور نصرت الٰہی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اب ہر روشنی اسے تاریکی اور ہر تاریکی اسے روشنی نظر آنے لگتی ہے چنانچہ کھلے ہوئے دلائل حق اور روشن سے روشن آیات الٰہی بھی انہیں نظر نہیں آتے۔ یہ سب ثمرہ ہے ان کافروں کے ارادی اغراض عن الحق اور دانستہ کج روی کا''۔

اس طرز بیان کی اور فہم سماعت وبصارت کی قوتوں سے سزا کے طور پر محروی کی مثالیں قدیم صحیفوں میں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔''تم سنا کرو پر سمجھو نہیں تم دیکھا کرو پر بوجھو نہیں تو ان لوگوں کے دلوں کو چرباوے اور ان کے کانوں کو بھاری کر'' (اسعیاء: ۹۔۱۰)

''وہ نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے کہ آنکھیں لیپی گئیں۔ سو وہ دیکھتے نہیں اور ان کے دل بھی سو وہ سمجھتے نہیں'' (اسعیاء ۱۸:۲۴) ''تمہاری آنکھیں جو کہ نبی ہیں موندی ہیں اور تمہارے سروں پر جو کہ غیب میں حجاب ڈالا ہے'' (اسعیاء ۱۰:۲۹) ''میں نے انہیں ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا'' (زبور ۱۱:۱۱ و ۱۲) انجیل میں اس قسم کی مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو رومیوں (۱۱:۷:۱۸ و ۲ تھسلنیکیوں ۱۱:۲)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸

''اور لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے حالانکہ وہ مومن ہیں نہیں''۔

منافقین کا ذکر:

اس کے پہلے اس سورہ میں دو قسم کے آدمیوں کا ذکر ہو چکا ہے ایک مومن یعنی وہ جنہوں نے دل سے اسلام قبول کیا ہے دوسرے وہ جو کھلے ہوئے کافر ہیں اب تیسری جماعت کا ذکر شروع ہوتا ہے یہ ہیں زبان سے اظہار اسلام کرنے اور دل میں کفر کو مضمر رکھنے والے ان کو اصطلاحی طور پر منافق کہتے ہیں۔ پہلی جماعتوں کا ذکر چار آیتوں میں ہو گیا۔ دوسری کا دو آیتوں میں مگر تیسری جماعت کا ذکر یہاں سے شروع ہوا ہے تو تیرہ آیتوں تک مسلسل چلا گیا ہے[1]۔ بات یہ ہے کہ ان ''مار آستین'' طرح کے افراد اور نمائشی دوستوں سے اسلام کو جتنے نقصان پہنچ سکتے تھے اور پہنچے والے تھے وہ اس کے کھلے ہوئے دشمنوں سے نہیں پہنچ سکتے تھے اور نہ پہنچنے والے تھے لہٰذا ضرورت تھی کہ اس جماعت کے افعال اور اعمال اور ان کے کردار کی نوعیت اور ان کی سریت کے خدوخال کے متعلق مسلمانوں کو سختی کے ساتھ متنبہ کیا جائے۔ اب اگر سیرت اسلاف سے آئندہ مسلمانوں کا کسی قسم کا علاقہ نہ ہوتا تو یہ ضرورت صرف صدر اسلام میں ختم ہو جاتی مگر چوں کہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قیامت تک کے مسلمانوں کی ''سیرت سازی'' میں ''گزشتگان'' کے نقوش پا کو بہت بڑا دخل ہے اس لئے اس جماعت کے کردار پر نظر اور قرآنی بیانات کی کسوٹی پر رسولؐ اسلام کے دور کی مسلمان شخصیتوں کے کردار کا جانچنے اور پرکھنے کی مہم قیامت تک مسلمانوں کی ایمانی زندگی کی تشکیل کے لئے لازمی جزء بن گئی اور یہ ایک ایسی اہم ضرورت دینی ہے جس کے مقابل میں اذکروموتاکم بخیر کا اخلاقی قانون استثناء کے رخنہ سے شکستہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

قرآن مجید کے اتنے شدید اہتمام سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ جماعت صرف چند ''سر پھرے'' عبداللہ بن ابی کے اصحاب ہی میں محدود نہ تھی جن کا نفاق نام بنام طشت از بام ہو چکا تھا بلکہ اس جماعت میں ایسے بھی افراد ہو سکتے تھے جن کے باطن پر سیاست کا بہت گہرا پردہ پڑا ہوا تھا

---

[1]۔وصف حال الکفار فی آیتیین و حال المنافقین فی ثلث عشرۃ آیۃ فعی علیہم فیہا خبثہم و نکرہم و فضحہم و سفہھم و تہکم بفعلہم و ستجل طغیانہم و عمہم و دعاہم صما بکما و عمیا و ضرب بہم الامثال الشنیعۃ (نیشاپوری)

اور جن کے نام عام طور پر مسلمانوں کو معلوم نہ تھے جن پر متنبہ کرنے کے لئے دوسری جگہ خود رسولؐ سے ارشاد فرمایا ہے کہ ان میں بعض ایسے ہیں جنہیں آپ بھی نہیں جانتے لَا تَعۡلَمُهُمۡ ؕ نَحۡنُ نَعۡلَمُهُمۡ ؕ (توبہ۔۱۰۱)

يُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ وَمَا يَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ؕ﴿۹﴾

''وہ اللہ اور ایمان والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ حقیقۃً وہ خود اپنے سوا کسی کو دھوکا نہیں دیتے اور انہیں اس کا احساس نہیں ہے''

خدا کو دھوکا دینے کا مطلب:

حقیقت میں جو اللہ کو اس کے صفات جلال وکمال کے ساتھ مانتا ہو وہ اسے دھوکا دینے کا تصور ہی نہیں کرسکتا مگر چوں کہ منافقین کے دل میں اللہ کی معرفت ہے ہی نہیں ان کا اقرار اللہ کے متعلق صرف زبانی ہے اس لئے وہ ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں کہ ان کے کفر باطنی پر پردہ پڑا رہے۔ وہ رسولؐ اور صاحبان ایمان کو اپنی خیرخواہی کا یقین دلاتے رہتے ہیں تاکہ وہ منافع جو ایمان کے ساتھ وابستہ ہیں حاصل ہو سکیں اس طرح براہ راست تو رسولؐ اور اہل ایمان کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر چوں کہ بمقتضائے اسلام رسول کو رسولؐ کہنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے پس پشت اللہ کی طاقت ہے اس لئے نتیجۃً یہ ان کا عمل اللہ کو فریب دینے کی کوشش بن جاتا ہے [۱]۔

اب اس کوشش کا انجام کیا ہوتا ہے؟ اسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ''حقیقتاً'' وہ سوا خود اپنے ہی کسی کو دھوکا نہیں دیتے یعنی مضرت اس دھوکا دینے کی خود انہی تک پہنچتی ہے [۲] اس بناء پر کہ اصل ایمان کا نتیجہ جو نجات آخرت ہے اس سے یہ ان تمام کوششوں کے بعد بھی محروم رہتے ہیں بلکہ اس فریب دہی کی وجہ سے ان کا عذاب صریحی کفار کے عذاب سے بھی زیادہ ہوتا ہے اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِى الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ (نساء ۱۴۵) مگر انہیں اس کا احساس نہیں اس لئے کہ وہ آخرت کے دل سے قائل ہی نہیں وہ تو بس مادی منافع ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور ان منافع کو حاصل کر کے بس اپنے کو فریب دہی میں کامیاب سمجھ لیتے ہیں۔ انہیں کیا خبر کہ اس کے پس پشت کیا برا انجام پوشیدہ ہے۔

چھوٹے پیمانے پر عبادات وفرائض میں ریاکاری کرنے والا اسی حکم میں ہے بڑے خضوع وخشوع کے ساتھ نمازیں ادا کرتا ہے خلق خدا میں مرجعیت حاصل کرنے کے لئے پھر اس پر اللہ سے ثواب کا امیدوار بھی ہے۔ یہ کیا اللہ کو فریب دینے کی کوشش نہیں ہے؟ نتیجہ میں جب یہ سب عبادتیں رد ہوں گی اور ثواب کی دنیا سنسان نظر آئے گی تو محسوس ہوگا کہ اس نے دھوکہ حقیقت میں خود اپنے ہی کو دیا تھا۔ اسی لئے رسولؐ خدا کی حدیث جسے امام جعفر صادقؑ نے روایت کیا ہے:

انما النجاة ان لا تخادعوا الله فيخدعكم فان من يخادع الله يخدعه ويخلع منه الايمان ونفسه يخدع لو يشعر.

---

[۱] ۔ولا تجوز باعتبار ان الجرأة على مخادعة الرسول فى مقدمة الذين آمنوا من حيث انه رسول الله بمنزلة الجرأة على مخادعة الله (البلاغ)

[۲] ۔فوبال خداعهم راجع الى انفسهم (مجمع البيان)

نجات اس میں مضمر ہے کہ اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش نہ کرو نہیں تو وہ ایسا کرے گا تم خود دھوکے میں پڑ جاؤ گے اس لئے کہ جو اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کرے گا نتیجہ میں یہ خود دھوکا کھائے گا اور وہ اس سے ایمان کا لباس اتار لے گا اور یہ خود اپنے کو دھوکہ دے گا اگر اس کو شعور ہو کسی نے پوچھا: وکیف یخادع اللہ'' یہ اللہ کو کیوں کر فریب دینا چاہے گا'' حضرتؑ نے جواب دیا:۔

یعمل ما امرہ اللہ عزو جل ثم یرید بہ غیرہ. (صافی)

جن باتوں کا حکم اللہ نے دیا ہے انہیں انجام دے گا مگر اس کا مقصد رضائے الٰہی نہ ہوگا، کچھ اور ہوگا۔

فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌۢ ۙ بِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ۝۱۰

''ان کے دلوں میں ایک خاص طرح کی بیماری ہے [1] تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھادی اور انہیں ایک دردناک عذاب اس وجہ سے ہوگا وہ جھوٹ بولا کرتے تھے''۔

مرض اور اس کے بڑھانے کا مطلب:

مرض کیا ہوتا ہے؟ اعتدال طبعی سے ہٹ جانا، دل میں اگر ہٹ دھرمی تعصب اور ماحول کے جراثیم وغیرہ کے اثرات نہ ہوں تو طبعاً وہ حق کے قبول کرنے پر مائل ہوگا (کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام) اب اس کے خلاف شک، کفر یا نفاق یہ سب باتیں غیر طبعی اسباب سے پیدا ہوتی ہیں جو قلب کے لئے ایک بیماری کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب اس بیماری کا جو کسی دل میں پیدا ہو چکی ہے نتیجہ یہ ہے کہ جو ہدایت کے پیام جو وعظ ونصیحت کی آیات اس کے سامنے آتی ہیں وہ بجائے اس کو فائدہ پہنچانے کے اس کے عناد و تعصب اور جوش انکار میں اور اضافہ کرتی ہیں جس کی ذمہ داری خود اس کے سوئے مزاج ذاتی پر ہے اس ہدایت وارشاد پر نہیں جس کا اصلی مقصد حقیقتاً ارشاد وہدایت بھی ہے۔

اب یہ ایک انداز تکلم ہے کہ جو قہری نتیجہ کسی امر پر مرتب ہو اس کو استعارۃً بطور غرض (مقصد ذکر کر دیا جاتا ہے جیسے فَالۡتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرۡعَوۡنَ لِيَكُوۡنَ لَهُمۡ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (قصص۔۸) ''فرعون کے گھر والوں نے موسیٰؑ کو اٹھا لیا تا کہ یہ ان کے دشمن جان اور سرمایہ رنج وملال ثابت ہوں''۔ ظاہر ہے آلِ فرعون کا مقصد موسیٰؑ کے اٹھانے سے دشمن جان اور سرمایۂ ملال فراہم کرنا نہ تھا مگر چوں کہ خارج میں نتیجہ یہی مترتب ہوا اور اس لئے کہہ دیا گیا کہ آل فرعون نے انہیں اس کے لئے اٹھایا تھا۔ بس اسی طرح خالق کا مقصود اپنے آیات سے یہ نہیں ہے کہ ان کے مرض میں اضافہ کیا جائے مگر چوں کہ ہوتا یہی ہے جو قرآن کی آیت اترتی ہے جو معجزہ ظاہر ہوتا ہے جو رسولؐ کو فتح حاصل ہوتی ہے، جو اللہ کی جانب سے اپنے رسولؐ پر انعام واکرام ہوتا ہے ہر ایک سے منافقین کی عداوت ان کے اختلاف اور منافقت میں اضافہ ہی ہوتا ہے اس لئے یہ کہہ دیا گیا کہ اللہ نے ان کے مرض میں اضافہ کر دیا'' اس کا عقیدہ جبر سے کوئی تعلق نہیں ہے اسی بناء پر اس فعل الٰہی زادھم کے پہلے آیا ہے فی قلوبھم مرض

---

[1] ۔التنکیر الدّلالۃ علیٰ کونہ نوعا مبھما غیر ما یتعارفہ الناس من الامراض (ابوالسعود)

درمیان میں فائے تفریع لا کر زادھم اللہ مرضا کہا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ پہلا مرض از جانب خدا نہیں ہے اور اس زیادتی مرض کا اصل سبب ہی ذاتی علت ہے لہٰذا اس کا سبب راجع خود ان افراد کے نقوش کی طرف ہے نہ کہ اللہ کے جبر و قہر کی طرف ۔

مولانا عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں ”فزادھم میں حرف ف بہت اہم ہے یہ گویا اس کا اعلان ہے کہ آگے جس فعل کا ذکر آ رہا ہے وہ محض بطور ثمرہ یا نتیجہ کے پیدا ہوا ہے والفاء للدلالة علی ترتّب مضمونہا علیہ (ابوسعود) حق تعالیٰ کی جانب اس قسم کے افعال کا انتساب صرف مجازی حیثیت رکھتا ہے یعنی یہ نہیں کہ اللہ نے خواہ مخواہ ان سے یہ افعال کرا چھوڑے اس نے تو صرف وہ حالات و اسباب پیدا کر دیے جن سے ان بدنصیبوں نے خود اپنے مرض کے بڑھانے کا کام لیا، ورنہ اگر وہ اپنی عقل و ارادہ کا صحیح استعمال کرتے تو انہی اسباب و حالات سے ہدایت بھی پا سکتے تھے“ اس قسم کے افعال کا حق تعالیٰ کی جانب انتساب قدیم صحیفوں کا بھی ایک محاورہ عام ہے ”اسرائیل نے مجھے نہ چاہا تب میں نے انہیں ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا“ (زبور ۸:۱۰۱۱) ”بس خدا نے منہ موڑ کر انہیں چھوڑ دیا کہ آسمانی فوج کو پوجیں“ (اعمال ۷:۴۲) ”خدا نے ان کے دلوں کی خواہشوں کے مطابق انہیں ناپاکی میں چھوڑ دیا کہ ان کے بدن آپس میں بے حرمت کیے جائیں“ (رومیوں ۱:۴۲)

آخر میں علاوہ اس عذاب کے جو منافقین کے لئے پہلے ولھم عذاب عظیم کے الفاظ میں بتایا جا چکا ہے ان کے لئے ایک مزید عذاب کی خبر دی گئی ہے کہ ”ان کے لئے ایک عذاب دردناک اس لئے ہے کہ یہ غلط بیانی سے کام لیتے تھے“ اور اسی بناء پر مجموعی طور سے ان کا عذاب صریح کافروں کے عذاب سے شدید تر ہو گیا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ دنیا میں خرابیاں نہ پھیلاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ارے ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں یاد رہے کہ درحقیقت وہی خرابیاں ڈالنے والے ہیں لیکن وہ اس کا احساس ہرگز نہیں رکھتے“ ۔

فساد فی الارض کے معنی:

”فساد فی الارض“ کے مفہوم میں وہ بداعمالیاں آتی ہیں جو متعدی الی الغیر ہوں یعنی اس کا نقصان دوسروں تک پہنچے [1] گمراہی اگر کسی کی ذات تک محدود ہے تو وہ کفر یا شرک وغیرہ ہے مگر ”فساد فی الارض“ میں داخل نہیں ہوتی لیکن جب وہ دوسروں کو راہ راست سے ہٹانے کی کوشش میں منتقل ہو جائے تو ”فساد فی الارض“ میں داخل ہے۔

گناہ کچھ تو براہ راست اس عنوان کے تحت میں داخل ہیں جیسے چغل خوری یا کسی دوسری صورت سے لڑاونے کی کوشش اور کچھ ایسے ہیں کہ وہ جب تک صرف انفرادی حیثیت رکھیں ”فسق و ظلم“ ”اسراف“ اور ”معصیت“ وغیرہ ہیں اور اپنی جگہ فساد بھی ہیں مگر ”فساد فی الارض“ اس

---

[1]۔ الاظھر ان یراد بہ الفساد الذی یتعدی دون ما یقف علیھم (رازی)

وقت قرار پائیں گے جب انسان ان معاصی کی طرف دوسروں کو دعوت دینے لگے اور انہیں اپنا مشن قرار دے لے۔

منافقین کے دل میں جو شک یا انکار ہے وہ اگر بس اسی دائرہ میں محدود رہتا تو اسے ایک انفرادی گمراہی کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے اجتماعی گناہ قرار نہ پاتا۔ مگر چوں کہ اسے ''منافقت'' کے سایہ میں چھپانا خود ہی کچھ اغراض کی خاطر ہوتا ہے جن سے اس نظام کو نقصان نہ پہنچانا مدنظر ہوتا ہے جو اصلاحِ عالم کی کفیل ہے پھر اس دورنگی کو نباہنے کے لئے انہیں بہت کچھ ایسی باتیں کرنا پڑتی ہیں جن سے امن عامہ کو خلل پہنچنے کا قوی امکان ہوتا ہے جیسے لگائی بجھائی کرنا ادھر آ کر انہیں برا کہنا، اور ادھر جا کر انہیں برا کہنا مومنین کے ساتھ استہزاء و تمسخر کرنا اور کافرین کی ان کے منصوبوں میں ہمت افزائی اور در پردہ امداد کرنا۔ یہ سب باتیں وہ ہیں جو انہیں فساد فی الارض کے جرم کا مرتکب بنا دیتی ہیں اب چاہیے وہ کتنی ہی پردہ داری سے کام لیں مگر اصلیت کھل ہی جاتی ہے چنانچہ جب ان کی دسیسہ کاریوں کی اطلاع اہل ایمان میں سے کسی کو ہو جاتی ہے تو وہ انہیں نصیحت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ اپنی مفسدانہ روش ترک کر دو تو وہ اپنی طرف اس جرم کی نسبت سے انکار کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم تو بس اصلاح کرنے والے ہیں یعنی فساد کی طرف ہم کبھی جاتے ہی نہیں اس کے جواب میں خالق یہ اعلان فرماتا ہے کہ وہ تو فسادہی فساد کرنے والے ہیں۔

اصلاح کا نام و نشان تک ان کے کردار میں نہیں ہے الا کلمہ تنبیہ ہے لہٰذا اس کا ترجمہ ''آگاہ ہو'' اور ''خبردار ہو جاؤ'' کیا جاتا رہا ہے [1] ہم نے موجودہ محاورہ کے لحاظ سے یاد رہے ترجمہ کیا ہے عبدالماجد صاحب نے صحیح کہا ہے کہ 'لفظ'' اجی' میں اگر متانت کی کمی نہ ہوتی تو اردو میں اس مفہوم کے لئے یہی بہترین لفظ ہوتا۔

''انہیں احساس نہیں ہے' اس لئے کہ وہ اپنی منافقت کی رو یا اپنی حصول منفعت کی دھن میں ان نتائج پر غور نہیں کرتے جو ان کے اس طرز عمل پر مترتب ہوتے ہیں جس کے نقصانات کی لپیٹ میں اکثر وہ خود بھی آ جاتے ہیں اور اسی لئے اگر وہ ان نتائج پر غور کرتے تو شاید خود ہی چاہے دین حق کو دل سے اختیار نہ بھی کرتے لیکن اس مفسدانہ روش کو تو ضرور ترک کر دیتے۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوۡٓا اَنُؤۡمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰـكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ۝١٣

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جیسے سب آدمی ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم بیوقوفوں کی طرح سے ایمان قبول کریں یاد رہے کہ درحقیقت یہ خود بیوقوف ہیں مگر انہیں خبر نہیں ہے''۔

معیار عقل و بے عقلی:

ایمان کا اظہار تو وہ جماعت خود ہی کرتی تھی مگر اس کے ساتھ ان کے افعال و اعمال سے اکثر دورنگی نمایاں ہو جاتی تھی تو بعض مسلمان جو ان سے اتفاقاً ذاتی تعلقات رکھتے تھے ان کو نصیحت کرنا چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ایمان لائے ہو تو اس دورنگی سے کیا فائدہ! صدق دل سے

---

[1] ۔ آگاہ ہو تاج الاعلاء) خبردار ہو (فرمان علی صاحب)

اس طرح ایمان لاؤ جیسے اور سچے مسلمان ایمان لائے ہیں یعنی وہ جن کے خلوص وصدق ویقین کا علم ان منافقین کو بھی تھا اور انہی کو الناس سے تعبیر کیا گیا ہے[1] جس سے اشارہ اس طرف بھی ہے کہ تمہارا عمل جو منافقت اور فتنہ پردازی کا ہے وہ حقیقتاً انسانیت کے بھی بالکل خلاف ہے وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ اصل عقل مندی کا طرز عمل تو وہی ہے جسے ہم اختیار کیے ہوئے ہیں کہ اگر بعد میں مشرکین کو فتح حاصل ہو تو ہم ان کے بھی اچھے بنے رہیں اور اگر مسلمانوں کو مختتم فتح نصیب ہو تو ان کے ساتھ بھی ہم لگے رہیں اور جو فوائد حاصل ہو سکتے ہوں وہ حاصل کرتے رہیں ''سیاست'' اسی کا نام ہوتا ہے۔ رہ گئے یہ لوگ جنہیں تم پیش کرتے ہو کہ بس جدھر ہو گئے ادھر ہو گئے یہ تو ہیں احمق یعنی ناعاقبت اندیش کیوں کہ اپنے مستقبل کو خطرہ میں ڈال رہے ہیں۔

یہی ہے وہ رائے جو سیاست دنیا کے ماہرین کی طرف سے ہر اس شخص کے متعلق قائم کی جاتی ہے جو سچائی کا پابند ہو۔ اور یہی وہ عقل کا معیار ہے جس کے پیش نظر حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے تھے: ''لو لا الذین لکنت ادھی العرب'' ''اگر دینی پابندیاں پیش نظر نہ ہوتیں تو میں عرب میں سب سے بڑا سیاست داں مدبر نظر آتا''۔

مگر حقیقت امر یہ ہے کہ یہ ملمع کار سیاست جو دنیا کو بنائے اور آخرت کو برباد کرے عقل کا مقتضا نہیں ہے۔

اصل عقل تو وہ ہے جو ابدی زندگی کے مفاد کو پیش نظر رکھے۔

اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ ان کی یہ طرز عمل ہلاکت خیز ہے جب عذاب ابدی کا منظر ان کے سامنے آئے گا اور وہ دیکھیں گے کہ وہ کافروں سے بھی بدتر عقوبت کے سزاوار قرار پائے ہیں۔

اس لئے کہا گیا ہے کہ حقیقت میں بے وقوف یہی ہیں مگر ابھی ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں لہٰذا انہیں اس کی خبر نہیں ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾

''اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں کہ جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے ایمان اختیار کیا اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ تخلیہ میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یقین جانو ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو فقط بنا رہے تھے [2]۔

اس میں منافقین کے کردار کی مکمل تصویر کشی ہے جو ہر دور میں اس جنس کی مخلوق میں ہر باخبر کو محسوس ہو سکتی ہے۔

وہ ایسے صاحبانِ ایمان سے مل کر جو کسی حد تک اثر ورسوخ رکھتے ہیں ان کو اپنی یگانگی کا یقین دلانا چاہتے ہیں اور جب اپنے شیطانوں یعنی اپنی جماعت کفار کے سرگرداں لوگوں کے پاس جاتے ہیں تو وہاں اپنی پوزیشن صاف رکھنے کی کوشش میں یہ کہتے ہیں کہ ہم تو ان مسلمانوں کے ساتھ استہزاء کر رہے تھے۔

---

[1]۔ فان اسم الجنس کما یستعمل فی مسماہ یستعمل فی ما یکون جامعا للمعانی الخاصۃ المقصودۃ عنہ (ابوالسعود)

[2]۔ ہم تو فقط ٹھٹھے بازی کرتے ہیں (تاج العلماء)

استہزاء کے معنی ہیں ایسا مذاق جس میں دوسرے کی تحقیر ہو اور اسی لئے ان کا یہ جملہ کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ تمسخر کرتے ان کا مذاق اڑاتے ہیں خالق کو اتنا ناگوار ہوا کہ فوراً اس کا جواب دیا گیا جو اس کے بعد آیت میں مذکورہ ہے۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١٥﴾

''اللہ خود انہیں بناتا ہے[1] اور انہیں ان کی سرکشی میں ڈھیل دیتا ہے کہ یہ اندھے پن میں مبتلا رہیں''۔

قرآن کریم میں خالق کی طرف محل وقوع اور سیاق کلام کی مناسبت سے کچھ ایسے الفاظ صرف ہوئے ہیں جنہیں اس نظم و ترتیب کلام سے علیحدہ کر کے اگر اس کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کی شان کے خلاف ہے۔ استہزاء اسی طرح کا ایک لفظ ہے اگر بلا کسی تمہید کے اللہ کو مستھزئ ''تمسخر کرنیوالا'' کہا جائے تو یہ کوئی مناسب امر نہ ہوگا لیکن جس صورت سے قرآن میں ان الفاظ کو صرف کیا گیا ہے اس صورت سے استعمال کرنے میں مکر اور استھذاء وغیرہ کا مفہوم ہی دوسرا ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے مکر کرنے والوں کے مکر کو توڑنا اور ان کے استہزاء کا جواب دینا جسے دوسری لفظوں میں مجازاۃ استہزاء سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

خدا کی طرف سے استہزا کا مطلب:

چوں کہ انہوں نے مومنین کے متعلق اس لفظ کا استعمال کیا تھا جو حقارت کا پتہ دیتی ہے ظاہر ہے کہ مومنین کی یہ تحقیر صرف دین الٰہی کے اختیار کرنے کی وجہ سے درپیش ہوئی ہے لہٰذا انہوں نے جو لفظ مومنین کے لئے استعمال کیا تھا اسے اللہ نے اپنی طرف سے ان کی جانب پلٹا دیا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل اللہ کے ساتھ جو برا سلوک کیا جائے اس کا جواب دینے کی ان کو ضرورت نہیں ہوتی بلکہ انکی طرف سے اللہ خود جواب دینے کے لئے آگے آجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ کے سامنے کسی بندہ کی کہاں پیش جا سکتی ہے امام رضاؑ نے فرمایا ہے: ان اللہ لا یستھزی بھم ولکن یجاز بھم جزآء الاستھزآء (روایت صدوقؒ) ''اللہ ان کا از خود مذاق نہیں اڑاتا بلکہ ان کے مذاق اڑانے کی سزا دیتا ہے'' اسی کو جناب تاج العلماء نے ان الفاظ میں کہا ہے کہ خدا کا چھل کرنا یہ ہے کہ مسخرے کو مسخرے پن کی سزا دے (حاشیہ ترجمہ)

پھر یہ ان کے علم کی سزا بظاہر مشابہت بھی رکھتی ہے ان کے اسی عمل سے جسے وہ تمسخر و استہزاء کہتے ہیں یعنی مسلمانوں کے پاس آکر ظاہر کرتے ہیں ہم مسلمان ہیں اور باطن میں کافر کے کافر رہتے ہیں اسی قسم کا سلوک ان کے ساتھ اللہ نے بھی کیا ہے کہ ظاہر میں ان پر احکام اسلام جاری کر دیے مثلاً ذبیحہ انکا حلال جسم ان کا پاک توریث و نکاح وغیرہ مسلمانوں کا سا برتاؤ مگر باطن میں وہ کافر کے کافر ہی رہے اسی لئے آخرت میں وہ کافر کیسے بلکہ کافر سے بدتر قرار دیے گئے تو اگر اس طرح کا عمل بنانا اور تمسخر کرنا ہے تو نتیجہ میں دیکھیے کہ بنا کون اور تمسخر کس کا ہوا[2]؟

مولوی عبد الماجد صاحب لکھتے ہیں کہ ہنسی اور تمسخر کا انتساب ذات باری تعالیٰ کی جانب قدیم صحیفوں میں موجود ہے تو اے خداوندان پر

---

[1]۔ خدا بھی چھل کرتا ہے اُن سے (تاج العلماء)

[2]۔ فاستعیر لذلك لفظ الاستھزاء طشا بهة له فی ابتها جهم بظاهر الامهال والتخویل مع انه مقرون بالاستهانة بهم واعداد العذاب الالیم (بلاغی)

ہنسے گا تو ساری قوموں کو مسخرہ بنائے گا (زبور ۹ ۸۱۷) میں تمہاری پریشانی پر ہنسوں گا اور جب تم پر دہشت غالب ہوگی تو میں ٹھٹے ماروں گا (امثال ۱: ۲۶)

یمدّھم کے لفظی معنی ہیں ان کے لئے زیادتی کرنا ہے مگر اللہ اپنی طرف سے کفر یا سرکشی میں اضافہ پسند نہیں کرتا یہ کفر اور سرکشی تو خود ان کی طرف سے ہے مگر اللہ ان کی عمر کی رسی دراز کرتا ہے اسباب عیش میں ان کے لئے اضافہ کرتا ہے اس کے ساتھ ان کی بد اعمالیوں کے باعث اپنی توفیق کا دامن ان سے سمیٹے رکھتا ہے نتیجۃً ان کے سوا اختیار کے ہاتھوں اللہ کی نعمتیں جو خود اس کی طاعت و عبادت کی محترک ہونا چاہیں ان کے لئے مزید سرکشی کا باعث ہوتی ہیں اور یہ خدا کی جانب سے ڈھیل بھی اسی سلوک کا ایک جزو ہے جیسے پہلے کہا گیا تھا کہ اللہ خود انہیں بنا تا ہے [۱]۔

آخری لفظ یعمھون کا ہے۔ عمہ دل کے اندھے پن کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ بے بصیرتی کے ساتھ اپنی زندگی حقیقی اچھائی اور برائی کی تمیز کے بغیر گزارتے ہیں جس طرح اندھا راستون میں ٹھوکریں کھاتا ہے اسی طرح یہ زندگی کے پر پیچ راستوں میں بغیر کسی امتیاز اور بلا کسی رہ نما کے سہارے کے بھٹکتے پھرتے ہیں۔

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَٰلَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَٰرَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ⑯

”یہ ہیں وہ جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی تو نہ ان کے بیوپار نے نفع ہی دیا اور نہ انہیں ہدایت ہی نصیب ہوئی“۔

متقین کے بعد جو أُولَٰٓئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ تھا اس کا بظاہر یہ جواب ہے جو منافقین کے ذکر کے بعد وارد ہوا ہے یعنی سورہ کی ابتداء میں جو کردار بیان ہوا تھا وہ ہدایت الٰہی پر قائم رہنے والوں کی شان ہے اور یہ کردار جو بعد کی کئی آیتوں میں بیان ہوا جن کی تفسیر سابقاً بیان ہوئی یہ ان کا ہے جنہوں نے بالاختیار متاع گراں مایہ ہدایت کے بدلے ضلالت کو ترجیح دی اور اسی ترجیح دینے کو مجازاً خریداری کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے اس لئے کہ وہ ہدایت اگر چہ ان کے پاس موجود نہ تھی مگر چوں کہ وہ ان کے بالکل امکان میں تھی اور وہ چاہتے تو بلا مانع و مزاحم اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے اس لئے وہ گویا ان کے قبضہ میں تھی اور اب جو انہوں نے ترک کر کے گمراہی پسند کی یہ ایسا ہے کہ جیسے انہوں نے مقبوضہ ملکیت کو ہاتھ سے دے کر اس کی قیمت میں گمراہی حاصل کی [۲]

اب گزشتہ فقرہ أُولَٰٓئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ کے ساتھ أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَٰلَةَ بِالْهُدَىٰ کو رکھ دیجئے تو دونوں سے یہ صاف ظاہر ہو جائے گا کہ سابق میں جو ھدی للمتقین کہا گیا تھا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خالق کی جانب سے اسے پہلے ہی محدود کر دیا

---

[۱]۔ ھذا بمنزلۃ التفسیر لما استعیر لہ لفظ استھزآء (بلاغیؒ)

[۲]۔ فان قیل کیف اشتروا الضللۃ بالھدیٰ وما کانوا علیٰ ھدی قلنا جعلوا التمکنھم منہ کانہ فی ایدیھم فاذا ترکوہ ومالوا الی الضللۃ فقد استبدلوھا بہ (رازی)

”ایمان کا قبول کر لینا ان منافقین کے بالکل اختیار کے اندر ہے لیکن اس کے بجائے انھوں نے روش کفر اختیار کی“ (دریابادی)

گیا ہے۔ درحقیقت اس کی طرف سے تو وہ ہدایت سب ہی کے لئے ہے یہ کہ اس سے فائدہ صرف متقین کو حاصل ہوتا ہے اور کافرین ومنافقین محروم رہتے ہیں یہ خود ان دونوں کے اختیار کا فرق ہے اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (سورۂ دہر)
اس فقرہ میں جو مومنین کے لئے آیا تھا نتیجہ ان کے حسن اختیار کا دکھلایا تھا ان لفظوں میں کہ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ فلاح کے معنی جیسا کہ وہاں بیان ہوا دنیا وآخرت کی بہتری کے ہیں اس کے بالمقابل منافقین کے لئے نتیجہ ان کے سوء اختیار کا ریہ دکھلایا گیا ہے کہ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ یہ فلاح کے بالمقابل دنیا وآخرت دونوں کے خسارے کا اظہار ہے یعنی ان کے اس بیوپار سے نہ تو دنیا ہی میں انہیں کوئی فائدہ حاصل ہوا کیوں کہ فائدہ تو وہی سمجھا جا سکتا ہے جو سرمایہ سے زیادہ قیمت رکھتا ہو۔ یہاں ہدایت الٰہی کے ذریعہ سے جو ان کے لئے انفرادی اور اجتماعی مفادات حاصل ہو سکتے تھے وہ سب ان کے ہاتھ سے گئے جس کے برابر بھی کوئی شے ان کو نہیں مل سکی چہ جائیکہ اس سے بہتر پھر یہ کہ وہ ہدایت بھی محروم ہوئے جو نجات اخروی کی ذمہ داری تھی۔ لہٰذا آخرت کی کامیابی تو کیا ملتی ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب کا استحقاق انہیں حاصل ہو گیا اور اس سے بڑھ کر خسر الدّنیا والا خرۃ کا مصداق اور کیا ہو سکتا ہے!!

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾

"ان کی مثال[۱] اس شخص کی سی ہے جس نے آگ سلگائی مگر جب اس آگ نے اس کے گرد وپیش میں اجالا کر دیا، اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا اس حال میں کہ انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا"۔

منافقین کی مثال:

یہ منافقین کے حالات کی تصویر کشی ہے۔
جو کافر ہیں وہ تو ایک مستقل حال میں ہیں جسے روحانی نقطۂ نظر سے اندھیرا ہی اندھیرا سمجھا جا سکتا ہے مگر منافقین انہوں نے پیغمبرؐ کے پاس آ کر اظہار اسلام کیا۔ اس کی وجہ سے وہ اس نورِ حقیقت سے قریب آ گئے جو دین ودنیا کی ہدایت کا ذریعہ ہے اور اس طرح ایک آگ گویا انہوں نے سلگائی جس سے فائدہ اٹھانا ان کے لئے آسان تھا۔ اس آگ کی روشنی گرد وپیش میں پھیل گئی یعنی سینکڑوں طالبانِ حق اس کے نور سے منور ہوئے اور اس کی وجہ سے دنیا وآخرت کی کامیابی پر فائز ہوئے مگر خود یہ منافقین چوں کہ انہوں نے دل میں انکار وعناد چھپا رکھا اور کھلے دل سے آیاتِ حقیقت پر غور نہیں کیا لہٰذا ان کی آنکھوں کے سامنے سے وہ جو ایک جھلکی روشنی کی کبھی نمودار ہوئی تھی وہ بھی بالکل غائب ہو گئی اور توفیقات الٰہیہ کے سلب ہو جانے سے جو ان کے سوء اختیار کا نتیجہ ہے ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے[۲]

---

[۱]۔ ان کی ہائی (تاج العلماء)

[۲]۔ ولا جل ان ینوہ اللہ بما للتوفیق والتسدید من الاثر الشریف فی تائید العقل علی مکافحتہ لوساوس الشیطان ونزعات النفس الامارۃ واھوائہا عبر عن حالھم فی غیّھم علی سبیل المجاز واستعارۃ التشبیہ بانھم حینئذ ذھب اللہ بنورھم (البلاغی)

دوسری تفسیر اس تمثیل کی یہ ہے کہ ان منافقین نے جب اظہار اسلام کیا تو اس کے نتائج نمودار ہوئے ان احکام کی صورت میں جو ان کے اسلام پر مرتب ہوئے جیسے مالِ غنیمت سے حصہ ملنا جان و مال کا محفوظ ہونا، اسلامی معاشرہ میں برابر کا درجہ دیا جانا وغیرہ یہ ہے وہ روشنی جو گرد و پیش میں پھیل گئی مگر اس کے بعد جب آنکھ بند ہو کے کھلی یعنی آخرت کی منزل سامنے آئی تو وہ سب برکات نظر آئے۔ اب عذاب آخرت اور اس کی سختیوں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا[1]۔

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾

''بہرے گونگے اندھے ہیں وہ پلٹیں گے نہیں''۔

اس آیت کی وضاحت دوسرے مقام پر خود قرآن کی دوسری آیت سے معلوم ہوتی ہے کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (اعراف آیت ۱۷۹) وہ بہرے اس معنی میں نہیں کہ ان کے کانوں میں سننے کی طاقت نہیں کان ہیں اور کانوں میں ذاتاً سننے کی قوت بھی ہے مگر وہ ان کانوں سے صدائے حق سننے کا کام نہیں لیتے لہٰذا نتیجۃً وہ مثل بہرے کے ہو گئے ہیں زبانیں ہیں مگر تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کلمۂ حق کے ساتھ گویا نہیں ہوتیں۔ اس اعتبار سے ''گونگے'' ہیں۔ آنکھیں ہیں مگر ان سے آیاتِ حقیقی پر نظر نہیں ڈالتے اور تعصب کے پردے ایسے پڑے ہیں کہ جلوۂ حق انہیں نظر نہیں آتا اس لحاظ سے وہ اندھے ہیں[2]۔

اب جب ان کی دشمنی اور ضد سے یہ ثابت ہے تو یہ امید کب کی جا سکتی ہے کہ وہ باطل سے حق کی طرف رجوع کریں اور اس مسلک سے جس پر قائم ہیں پلٹ کر کوئی دوسرا مسلک اختیار کریں۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾

''یا جس طرح بارش آسمان کی جس میں تاریکیاں ہوں اور گرج اور چمک وہ گرنے والی بجلیوں سے مرنے کے ڈر سے اپنی انگلیاں کانوں میں دے لیتے ہیں حالانکہ اللہ کافروں کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے''۔

دوسری مثال:

یہ اسلام اور اس میں منافقین کے کردار کی کچھ دوسری حیثیتوں سے تمثیل ہے۔

اسلام اور اس کے برکات کیا ہیں؟ ایک موسلا دھار بارش جو عالم بالا سے ہو رہی ہے جس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں مگر مخالفین حق کافرین اور منافقین کے لئے اس میں تاریکیاں ہیں گرج ہے اور چمک ہے کیوں کہ اسلام کے غلبہ و رفعت سے ان کی آنکھوں میں دنیا سیاہ ہے اور اپنے

---

[1]۔ وھٰذا ھو المروی عن ابن عباس و قتادۃ و الضحاک و السدی (مجمع البیان)

[2]۔ لما لم تصل الیھم منفعۃ ھٰذہ الاعضاء فکانھم لیس لھم ھٰذہ الاعضاء (مجمع)

مستقبل کے لئے ان کا دل دہلا جاتا ہے اور آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں غزوات میں اسلامی فتوحات اور ان میں آئندہ کیلئے انکے مستقبل کے متعلق ہلاکت و تباہی کی جو تخویف و تہدید نظر آتی ہے اور اس کے متعلق وحی الٰہی کے جو پرزور اعلانات ان کے سامنے آتے ہیں ان کے سننے کی تاب بھی انہیں نہیں ہے اس سبب سے ان کے دل لرزنے لگتے ہیں اور وہ ان تاثرات سے بچنے کے لئے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں یعنی کسی نہ کسی طرح ان کے سننے سے گریز کرتے ہیں مگر یہ ان کا کانوں میں انگلیاں دینا یعنی سننے سے گریز کرنا اس شتر مرغ سے علیحدہ نہیں ہے جو آندھی کے ڈر سے ریگ میں سر چھپا لیتا ہے وہ اس طرح اس عظیم انقلاب کے اثر سے محفوظ کہاں رہ سکتے ہیں اسی کو ان الفاظ میں بتایا گیا ہے اللہ ہر طرف سے کافروں کو گھیر ہوئے ہے وہ اس سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾

"قریب ہے کہ بجلی ان کی نگاہوں کو خیرہ کردے [1] جب وہ ان کے لئے اجالا کرتی ہے تو وہ اس روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا ہوجاتا ہے تو وہ کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور اگر خدا چاہتا تو ان کے سننے اور دیکھنے کی طاقتوں کو زائل ہی کردیتا۔ بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

منافقین کو نہ کوئی حق طلبی کا جذبہ ہے۔ نہ وہ حق کو حق سمجھ کر اختیار کرنا چاہتے ہیں بلکہ اپنے دیرینہ کیش سے محبت کی وجہ سے انہیں دین حق کی کامیابیوں سے تکلیف ہوتی ہے مگر وہ اپنے دنیاوی مفادات کے تحفظ کے درپے ہیں اس لئے وہ اسلام کی روزافزوں ترقیوں اور کامیابیوں سے غیر متعلق نہیں رہنا چاہتے۔ ان کی قلبی تکلیف کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان فتوحات کو نظر بھر کر دیکھنے کی بھی تاب نہیں رکھتے اور قریب ہے کہ یہ چمک ان کی نگاہوں کو خیرہ کردے۔ اور اس دنیوی مفاد کے تحفظ کی فکر باعث ہوتی ہے کہ جب یہ فتوحات حاصل ہوں تو وہ دو چار قدم بڑھ کر اپنے کو مسلمانوں سے قریب تر بنانے کی کوشش کریں لیکن جب اتفاق سے یہ فتح وظفر کا سلسلہ رک جاتا ہے اور کہیں مسلمانوں کی وقتی شکست زحمت و تکلیف پیش آجاتی ہے تو پھر فوراً یہ بڑھتے ہوئے قدم رک جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ کہ وہ دل سے حقانیت اسلام پر غور نہیں کرتے اسی بناء پر قرآن نے جھنجھلائے ہوئے لفظوں میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے انہیں آنکھوں اور کانوں کی نعمت سے کلیۃً محروم نہیں کردیا ہے ورنہ جب کہ یہ ان آنکھوں اور کانوں سے کام نہیں لیتے، کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں اور آنکھوں سے ان جلوؤں کے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے تو یہ آنکھ اور کان اس قابل نہیں ہیں کہ ان کے پاس باقی رکھے جائیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

[1] ۔ چوندھیادے (تاج العلماء)

تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۱﴾

"اے انسانو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور انہیں بھی جو تمہارے پہلے تھے عجب نہیں کہ تم اپنے بچاؤ کا سامان کرسکو"۔

عبادت کا ہمہ گیر حکم اور اس کا فلسفہ:

مخصوص طریق عبادت جیسے روزہ وغیرہ کا جہاں قرآن میں حکم دیا ہے وہاں یا ایہا الذین امنوا کہہ کر پکارا ہے اس لئے کہ جنہوں نے اصل رسالت وشعریت کو تسلیم ہی نہیں کیا سے جزئیات احکام اور طریق عبادت کے بتانے کا کوئی محل نہیں مگر مطلق عبادت یعنی خدا کی بارگاہ میں احساس بندگی کی پیش کش کی طرف جو توجہ دلائی جارہی ہے یہاں یاایّھا الناس کہہ کر مخاطب کیا جارہا ہے اس لئے کہ خالق کی عبودیت کا جب احساس پیدا ہوگا اسی وقت تو وہ رسول کی دعوت پر لبیک کہنے اور کم از کم اس پیام پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے اور اسی لے یہ احساس عبودیت جس کی دعوت دی گئی ہے اس کا نتیجہ بتایا ہے "لعلکم تتقون"۔

اتقاء کے معنی ہیں کسی خطرہ سے بچنے کا سامان کرنا۔ چوں کہ خالق کی طرف ذہن کی توجہ ہونے کے ساتھ انسان کو یہ فکر ہونا چاہئے کہ اس کے مجھ پر کچھ حقوق ہیں اور ان حقوق کے ادا نہ کرنے سے میں مستحق سزا ہوں گا۔ اسی سے خطرہ کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اسی خطرہ سے تحفظ کے لئے اس کی طرف سے رسالت کا ادعاء رکھنے والے کی باتوں پر کان لگانے اور ان کی سچائی پر غور کرنے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے جس پر آئندہ کے تمام ذرائع نجات کا انحصار ہے۔

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾

"جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور اوپر سے پانی برسایا تو اس سے پھلوں کے قبیل سے تمہاری غذا برآمد کی اب اس کے بعد جان بوجھ کر اللہ کے لئے برابر دار نہ بناؤ"۔

قرآن مجید میں زمین آسمان اور دیگر کائنات عالم کو جو ذکر ہے وہ اس مقصد کے لئے نہیں ہے کہ ان کی حقیقتوں اور ماہیتوں کو بیان کیا جائے بلکہ ایک تو ان کے افادی پہلوؤں کو جو بنی آدم سے متعلق ہیں نمایاں کر کے اللہ کی نعمتوں کا احساس کرانا منظور ہے اور دوسرے ان کی عظمت اور حیرت انگیز خلقت کی طرف توجہ دلا کر خالق کی عظمت وقدرت کی طرف توجہ دلانا مطلوب ہے۔ زمین چاہے کروی ہو اور چاہے مسطح بہر حال

جہاں تک ہمارے لئے اس کارآمد اور محسوس پہلو کا تعلق ہے وہ ایک بچھونے ہی کی حیثیت رکھتی ہے [۱] اور اس میں خاص توجہ دلانے والا جزیہ ہے کہ یہ بچھونا کس نے قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ اس نے جس نے اس زمین کو خلق فرمایا۔ اسی طرح آسمان وہ ٹھوس جسم ہے یا سیال مادہ ہے اسے قرآن کچھ نہیں بتاتا بے شک اس کی مخصوص شکل جو ہر آنکھ کے سامنے ہے وہ یہی کہ وہ ہمارے سروں پر ایک چھت کی طرح بلند ہے بس اسی کو سامنے رکھ کر اس کے خالق کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔

اس کو سائنس اور ریاضی کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے ان کی حقیقتوں کو معلوم کرنے میدان میں فہم بشری کو تگ ودو کی پوری آزادی حاصل ہے [۲]۔

السماء کا لفظ جو پہلی دفعہ ہے وہ تو آسمان کے معنی میں ہے اور دوسری جگہ اس کی سمت یعنی اوپر کا رخ مقصود ہے۔ عربی میں بلندی کے رخ کی ہر شے کو سماء کہتے ہیں [۳]۔

زمین اور آسمان کا تذکرہ کے بعد ان کے مابین جس نعمت الٰہی کا ظہور ہوتا ہے وہ باران رحمت ہے۔ اس کا اتارنے والا بھی وہی ہے جس نے آسمان اور زمین پیدا کیے۔

جاہلیت والے عرب چاہے پرستش کتنے ہی اصنام کی کرتے ہوں اور اللہ کو بالکل بھول گئے ہوں مگر تحت الشعوری طور پر یہ ان سب کو احساس تھا کہ پیدا کرنے والا آسمان و زمین وغیرہ کا ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے خود قرآن مجید میں ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (لقمان آیت ۲۵، زمر ۳۸)

اور اگر ان سے پوچھو آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ نے۔

دوسری جگہ ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (عنکبوت ۶۱)

اور اگر ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور آفتاب و ماہتاب کس کے قبضہ میں ہیں تو کہیں گے اللہ کے۔

مگر عبادت کے محل پر وہ اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کے سامنے بھی جھکتے تھے اور اس وقت عملی طور پر یہ چیز بھول جاتے تھے کہ اصل جو ہے وہ اللہ ہے یہ چیزیں کچھ بھی نہیں ہیں قرآن نے ان کے اسی تحت الشعوری احساس کو ابھارتے ہوئے ان کو ان کے عمل کی غلطی کا احساس پیدا کر دیا ہے اور اسی لئے کہا گیا: ''یہ جانتے ہوئے اب تو اللہ کے لئے ہمسر نہ تیار کرو''۔

غالباً دوسری قومیں جنھوں نے بے شمار دیوی اور دیوتا قرار دے لئے ہیں وہ بھی تحت الشعوری طبقاتِ نفس میں کسی ایک واحد ذات کو مانتی ہیں جو ان سب سے بالاتر ہے اس کے بعد قرآن کی یہ آیت ان کے لئے بھی ایک لمحۂ فکر پیدا کرنے کے لئے کافی ہے کہ اگر ایک ذات اس تمام

---

[۱]۔ یكفي في النعمة علينا ان يكون في الارض بسائط وصوا ضع مفروشة ومسطوقه وليس يجب ان يكون جميعها كذلك (مجمع البيان) فسواء كانت كذلك اوعلىٰ شكل الكرة فالا فراش غير فستنكرو لامدفوع لعظم جرمها وتباعد اطراف (نیشاپوری)

[۲]۔ وليس في ذلك صراحة بموافقة الهيئة القديمة ولا صراحة بمخالفة الهيئة الحديدة (بلاغؔ)

[۳]۔ كل شئ كان فوق شيء اخر فهو لما تحته سماء (طبری)

کائنات کے لئے کافی ہے تو اس کے مقابل میں ان تمام دیویوں، دیوتاؤں کے ماننے کی کیا ضرورت ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

"اور اگر تم اس کی طرف سے جو ہم نے اپنے بندہ پر اتارا شک میں مبتلا ہو تو اس قبیل کا ایک سورہ لے آؤ اور جو اللہ کو چھوڑ کے حامی تمہارے ہیں انہیں بھی بلا لو اگر تم سچے ہو"۔

قرآن کے مثل لانے کا مطالبہ اور دنیا کی عاجزی:

پہلے جو کہا گیا تھا کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں، اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ اس میں کوئی شک کرنے والا نہیں بلکہ مقصود اس سے یہ تھا کہ اس کتاب میں ادلہ حقانیت ایسے نمایاں ہیں جو شک کی گنجائش نہیں رکھتے اب اگر شک ہوگا تو ان دلائل سے بے توجہی کی بناء پر شک کا اظہار ہوگا تو بر بنائے عناد ان دلائل سے چشم پوشی کی بناء پر دونوں صورتوں میں بالمقابل ان خصوصیات کی طرف ذہن کا متوجہ کر دینا کافی ہے جس کا نتیجہ پہلی صورت میں ازالہ غفلت ہوگا اور دوسری میں اتمام حجت۔

اس ذہن کے متوجہ کرنے کے لئے قرآنِ کریم نے یہ نفسیاتی طریقہ اختیار کیا کہ گرم سے گرم الفاظ اور تیز سے تیز تر انداز میں بھی انہیں اس کا مثل لانے اور اس کے جواب میں دوسری کتاب تیار کرنے کی دعوت دی جائے۔ وہ غیور، باحمیت اور پرجوش عرب جوبات پر جان دینے تک کے لئے تیار ہو جاتے ہیں ان طعنوں ان سرزنشوں ان مبارزطلبیوں کو سن کر ضرور اپنی پوری غور وفکر کی طاقتوں سے اس کا جواب تیار کرنے کی کوشش کریں گے اور یہ یقینی ہے کہ وہ ناکام اور عاجز رہیں گے۔ اس عاجزی کے بعد اگر وہ بے ہوش ہیں تو ہوش میں آئیں گے اور ضرور ان خصوصیات کی طرف متوجہ ہوں گے جو اس قرآن میں مافوق البشر درجہ تک مضمر ہیں تب انہیں ایمان لانے کے سوا چارہ کار نہ ہوگا اور اگر وہ بر بنائے عناد انکار کرتے ہیں تب بھی کم از کم اس کے بعد ان کی پیشانی پر عرق انفعال محسوس ہوگا اور اب زبان کھولنے کا موقع نہ رہے گا۔

یہ خاص بات ہے کہ اس عظیم اور پرجلال تحدی کو رسولؐ کی زبانی پیش نہیں کیا گیا تاکہ اس میں انانیت کا پہلو پیدا نہ ہو بلکہ اسے براہ راست خالق نے اپنی ذات کو عظمت وجلال کی شان کے ساتھ "ہم" کے لفظ سے یاد کر کے یوں پیش کیا ہے کہ اگر تمہیں اس میں جو ہم نے اپنے "بندہ" پر نازل کیا ہے کوئی شک ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں خود رسولؐ کے ذاتی اقتدار اور ہنر آفرینی کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ رسولؐ اس کے اظہار کا صرف ایک واسطہ ہیں اور کچھ نہیں اور یہی درحقیقت وہ نقطۂ شک ہے جسکے بالمقابل یہ دعوت دی گئی ہے یعنی مشرکین اسے خود رسولؐ کا ذاتی کلام کہتے تھے۔ قرآن اسی کے بالمقابل میں جہاد کرنا چاہ رہا ہے اور انہیں متنبہ کرتا ہے کہ اگر رسولؐ کا ذاتی کلام ہوتا تو کوئی وجہ نہیں کہ تم باوجود فصاحت و بلاغت میں انتہائی کمال رکھنے کے اس کا مثل نہ لا سکو۔

اب اگر موجودہ زمانے کے بعض تجدد پسند افراد اسے خود رسولؐ کی دماغی پیداوار قرار دیتے ہیں اور "من اللہ" ہونے کے مفہوم صرف یہ قرار دیتے ہیں کہ وہ خداداد طاقتوں کا نتیجہ ہے تو یہ حقیقت میں اسی مقابل نقطہ کی صدائے بازگشت ہے جس کے خلاف اس آیت اور اس کی ایسی

متعدد آیتوں میں قرآنِ کریم نے ایک مستقل محاذ قائم کر رکھا ہے۔

مقابل والے کھلم کھلا شک کیسا، انکار کا اظہار کر رہے تھے۔ مگر چوں کہ قرآنی آیات میں حقانیت و اعجاز کے ایسے نمایاں آثار موجود ہیں کہ یہ شک ہونا نہ چاہئے اس لئے قرآن گویا اسے باور نہیں کرانا چاہتا کہ انہیں واقعی شک ہے اس لئے کہا کہ ''اگر واقعی تم کو شک ہے'' یہ چونکانے کا پہلا تازیانہ ہے۔

''تو اس کے ایسے کلام میں سے (پوری کتاب نہ سہی) ایک سورہ ہی لے آؤ''۔ یہ دوسرا تازیانہ ہے اس میں یہ امر کہ وہ پوری کتاب پیش کر دیں، اسے تو روزِ اوّل ان کے حوصلہ اور ہمت ہی سے بلند قرار دے دیا گیا۔ اس کے بعد تو اگر انہیں ممکن ہوتا تو ضد ہو جاتی کہ اچھا تو سہی جو ہم پوری کتاب ہی لے آئیں۔ مگر قرآن نے تو مطالبہ بہت تخفیف کے ساتھ پیش کیا ہے کہ تم ایک سورہ ہی پیش کر دو۔ اس میں بھی قید نہیں کہ طویل سورہ یا مختصر یہ دوسرا تازیانہ ہے اور بہت سخت پھر اس کے بعد یہ کہ تم اگر اکیلے ایسا نہ کر سکو تو اللہ کو چھوڑ کر جو تمہارے مددگار ہیں ان کو جمع کر لو یہ تیسرا تازیانہ ہے ''اگر تم سچے ہو'' سچے کس بات میں! اسی میں کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہیں ہے۔ اس سے انہیں نتیجہ کی جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر تم اجتماعی طاقت سے بھی ایسا نہ کر سکو، تو تمہیں سمجھنا چاہیے کہ تمہارا خیال غلط ہے۔ یہ حقیقتاً کسی انسانی طاقت کا نتیجہ ہے ہی نہیں بلکہ یہ بذاتِ خاص اللہ کا نازل کردہ ہے اور اسی کا کلام ہے۔ کسی آدمی کا کلام نہیں ہے۔

مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی اس ذیل میں رقم طراز ہیں: ''قرآنِ مجید اپنی زبان کی فصاحت اور حسنِ انشاء کے لحاظ سے بھی یقیناً بے نظیر ہے جیسا کہ عرب کے بڑے بڑے ماہرین ادب تسلیم کر چکے ہیں لیکن یہاں جو تحدی کی جا رہی ہے اس کا مخاطب یا ایہا الناس کے ماتحت سارا عالم ہے صرف قریش یا اہل عرب نہیں۔ اس لئے قرآن مجید کو یہاں صرف انشاء و فصاحت تک محدود رکھنا اس کے عام و عالمگیر چیلنج کو محدود کر دینا ہے۔ قرآن نے اپنی حقیقت خود یہ بیان کر دی ہے کہ وہ ھدی للمتقین کتاب ہدیٰ ہے یعنی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں کا جامع نظام مکمل، ہمہ گیر و ہر جہتی دستور العمل۔ اس کے علاوہ اس کی اور جتنی حیثیتیں ہیں، تبعی و ضمنی ہیں۔ وہ یہاں پیش اپنے سب سے بڑے وصف کو کر رہا ہے، اور پکار کے کہہ رہا ہے کہ جو ہدایتیں اور بصیرتیں میرے ایک سورہ کے اندر موجود ہیں اب اگر تم اپنی متحدہ کوشش اور جدوجہد سے بھی اس کے مقابلہ میں کوئی چیز پیش کر سکتے ہو تو لاؤ دکھاؤ۔ من مثلہ میں مثلیت کی تفسیر پر بہترین روشنی خود قرآن مجید ہی سے پڑتی ہے: قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (قصص۔ ۴۹) ھو اھدی کے ایجاز میں سب کچھ آ گیا''۔

یہ امر کہ قرآن مجید بحیثیت فصاحت و بلاغت ہی نہیں بلکہ اور دیگر حیثیتوں سے بھی معجزہ ہے علامہ بلاغیؒ کی عربی تفسیر ''آلاء الرحمٰن'' کے مقدمہ اور پھر اردو میں ہمارے ''مقدمہ تفسیر میں کافی بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لیکن یہ امر کہ اس آیت میں مخاطب یا ایہا الناس کے ماتحت سارا عالم ہے اس صورت میں پایۂ ثبوت کو پہنچ سکتا ہے کہ جب موجودہ نظمِ قرآنی ہی کی مطابقت سے یہ مان لیا جائے کہ یہ آیت تنزیل میں بھی گزشتہ آیات سے مرتبط ہے۔

دوسری صورت میں جب کہ اس کا مخاطب براہ راست قومِ عرب اور بالخصوص قریش کو مانا جائے تو پھر دوسرے افراد کے مقابلہ میں عنوان استدلال دوسرا ہو جائے گا۔ یعنی قوم عرب اور قریش کی اس کے اس تحدی اور دعوت مقابلہ کے سامنے سپر اندا ختگی خود تمام عالم سے اس کی حقانیت تسلیم کرانے کے لئے حجت ہو گی۔ اس لئے چاہے چیلنج کا رخ ایک محدود سمت کے ساتھ مخصوص ہو مگر نتیجہ اس کا تمام عالم کے لئے مشترک

حیثیت رکھا ہے اور وہ کسی جماعت میں محدود نہیں ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۴﴾

''اب اگر تم نے ایسا نہ کیا اور ہرگز نہ کرو گے تو پھر بچنے کا سامان کرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور وہ کافروں کے لئے مہیا ہے''۔

یہ گزشتہ تازیانوں کے بعد ایک نہیں بلکہ ایک ساتھ متعدد تازیانے ہیں جن کی چوٹ سے اگر ذرہ برابر بھی امکان ہوتا تو وہ بلبلا کر بغیر جواب لائے ہوئے قرار نہ لیتے۔

سچائی پر اعتماد تو دیکھئے کہ ایسے مخالف ماحول میں دشمنوں کی اس کثرت کے درمیان داعی حق حتم و جزم، سکون واطمینان بلکہ یقین کے ساتھ کہہ رہا ہے ''تم ہرگز ہرگز اس کا مثل نہیں لاؤ گے۔''

ذمہ دار انسان کے لئے اتنے حتم و جزم اور یقین کے ساتھ اپنے مستقبل کے کسی فعل کے اعلان میں دشواری ہوتی ہے چہ جائیکہ دوسرے کا عمل اور وہ بھی مخاطب جماعت کا۔

یہ اعلان خود اس کا سب سے بڑا محرک ہوسکتا ہے کہ وہ اب اپنی پوری طاقت صرف کر کے اسے غلط ثابت کرنے کی کوشش کریں اب اگر ایسا نہ ہوا اور قرآن کی سچائی پورے طور پر ثابت ہوئی تو ہر کھلے ہوئے دل سے غور کرنے والے کو یہ ماننا پڑے گا کہ قرآن کا مثل لانا یقیناً طاقتِ بشری سے باہر تھا۔

بقول عبدالماجد صاحب ''قرآن کے چیلنج کو ساڑھے تیرہ سو سال سے اوپر ہی ہو چکے ہیں اور دنیا کے کتب خانے اس کتاب سازی کے عہد میں، قرآن کے برابر کیا معنی تقریباً برابر کتاب سے بھی یکسر خالی ہیں۔

''(ہرگز نہیں کرو گے یعنی) قیامت تک، اللہ اکبر! کس زور کی تحدی ہے اور وہ بھی ایک اُمی کی زبان سے! اپنی عقل و حکمت اپنے علوم و فنون پر ناز رکھنے والوں کو کیسا جوش اس وقت بھی آیا ہوگا اور آج بھی آ رہا ہے لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔''

''اگر ایسا نہ کیا اور ہرگز نہ کرو گے'' یعنی اگر تم مثل اس کا نہ لائے اور ہرگز نہ لاسکو گے، اس کی جزا یعنی اس ''اگر'' کا نتیجہ درحقیقت یہ ہے کہ ''پھر ایمان لے آؤ'' تسلیم کرلو کہ یہ بے شک اللہ کی طرف کا کلام ہے اور محمد مصطفیؐ اس کے رسولؐ ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی اگر تم نے نہ مانا اور اپنے عناد پر اصرار قائم رکھا تو پھر اس کا نتیجہ وہ آخرت کا عذاب ہے جسے ''آتش جہنم'' کہتے ہیں، کیوں کہ وہ کافرین ''یعنی جان بوجھ کر انکار کرنے والوں ہی کے لئے مہیا ہے۔ اس دعوتِ ایمان کو جو تمامیت حجت کا لازمی نتیجہ ہونا چاہیے اور پھر اس دعوت کو قبول نہ کر کے کفر پر قائم رہنے کی پاداش، ان دونوں کو انتہائی اختصار کے ساتھ فاتقوا النار التی... الخ کے الفاظ میں کہہ دیا گیا ہے یعنی اب اس حجت کے قائم ہو جانے کے بعد انکار کا نتیجہ اس قسم کی آگ ہے (جس کے بصورت بقائے انکار تم یقینی مستحق قرار پاؤ گے اس سے بچاؤ کا سامان صرف یہ ہے کہ کھلے دل سے حقیقت کا اعتراف کرلو اور کفر سے ہٹ کر ایمان کا راستہ اختیار کرلو۔

آتشِ جہنم کا عذاب تو درحقیقت نافرمان آدمیوں ہی کے لئے ہے مگران آدمیوں ہی کے لئے اس سے بڑھ کر توہین یا سزا کیا ہوگی کہ ان کے وہ معبود بھی جن کی وہ پرستش کرتے تھے اسی آگ میں جھونک دیے جائیں۔ یہ ان پتھروں کو سزا دینا نہیں ہے بلکہ ان آدمیوں ہی کے عذاب کی تکمیل ہے۔ اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ اس آگ کا ایندھن یہ آدمی بھی ہیں اور وہ پتھر بھی جوان کے معبود تھے [1] اور پھر چوں کہ وہ انہیں تصور کرتے تھے کہ یہ اللہ کے یہاں ہماری سفارش کریں گے تو آج انہیں بھی انہی کے ساتھ جھونک کر دکھلا دیا گیا کہ یہ سفارش کیا کریں گے، یہ اللہ کے مقابلہ میں ایسے بے بس ہیں [2]۔

''اعدّت''، یعنی مہیا کی گئی ہے، کے لفظ سے ظاہر ہے کہ دوزخ خلق ہو چکا ہے اور موجود ہے مگر پردۂ غیب میں ہے جس پر ''ایمان بالغیب'' کا شعار رکھنے والوں کو کسی قسم کے شک وتردد کا محل نہیں ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوۡا مِنۡهَا مِنۡ ثَمَرَةٍ رِّزۡقًا ۙ قَالُوۡا هٰذَا الَّذِىۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَاُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمۡ فِيۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۵﴾

''اور مژدہ دو ان کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے کہ ان کے لئے بہشت کے گھنے باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں۔ جب بھی انہیں ان میں سے کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو پہلے ہمیں کھانے کو مل چکا ہے، حالانکہ انہیں وہ ملتا جلتا ہوا دیا گیا ہے اور ان کے لئے ان بہشتوں میں پاک بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے''۔

بشر (مژدہ دو) کا مخاطب رسول بھی ہوسکتے ہیں اور مخاطب غیر معیّنکی حیثیت سے یہ مقصود بھی ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ اس خوش خبری کے قابل ہیں۔ لہٰذا کوئی بھی ہو اسے حق ہے کہ وہ انہیں یہ مژدہ پہنچادے۔

قرآن کریم میں اکثر مقامات جہاں اس قسم کی مفرد تخاطب ہے جیسے اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ يُكَذِّبُ بِالدِّيۡنِ، اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ وغیرہ ان میں یہ دونوں احتمال ہیں مگر میرے نزدیک ان میں سے اکثر مقاماتِ ترجیح دوسرے ہی پہلو کو ہے جیسے آج کل کے طرزِ تحریر میں ''ذرا دیکھوتو'' یا ''ملاخطہ کیجئے'' کہا جاتا ہے اور اس سے مقصود کوئی خاص شخص نہیں ہوتا۔

ایمان اور عمل صالح:

مژدہ کے مستحق کون ہیں! وہ جو ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں، یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآنِ کریم میں کسی ایک جگہ بھی جنت اور

---

[1]۔ الظاهر ان كون الناس والحجارة وقود النار اى حطبها يريد به اصنامهم النحوتة من الحجارة كفر له تعالىٰ انكم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم (مجمع البیان)

[2]۔ لما اعتقد الكفار فى حجاتهم المعبودة من دون الله انها الشفعاء (رازی)

نعیمِ آخرت کی بشارت صرف ایمان پر مرتب نہیں کی گئی ہے بلکہ ہر جگہ ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کا ذکر ضروری سمجھا ہے۔ اس کے بعد کاش ان کی آنکھیں کھلیں جو صرف ''جماعت مؤمنین'' کا لقب اختیار کر کے اپنے کو اعمالِ صالحہ سے بے نیاز سمجھ لیتے ہیں' اور 'مومن' ہونے کے بعد حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پابندی کے بغیر ہی نعماتِ بہشت کے خوابِ خوشگوار میں مست ہیں۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ صرف اعمال کی پابندی کرنا اور اصول عقائد کی خبر نہ رکھنا بھی نجات کے لئے ہرگز کافی نہیں ہے۔

مولوی عبدالماجد صاحب نے بالکل درست لکھا ہے: ''نیک عمل کے سمجھنے میں بہت سوں کو دھوکا ہوا ہے اور یہ مغالطہ آج کل بہت عام ہو گیا ہے سمجھا یہ جانے لگا ہے کہ نیکی اور ایمان ایک دوسرے سے بالکل الگ اور بے تعلق چیزیں ہیں اور پھر اس مفروضہ کی ایک فرع یہ قائم کی گئی ہے کہ کوئی شخص ممکن ہے کہ بہت صالح اعمال کا ہو، لیکن ایمان سے یک لخت محروم ہے۔ حالانکہ یہ تخیل ہی سراسر غلط ہے نیکی ایمان سے الگ نہیں۔ ایمان ہی عملی شکل کا نام ہے۔ ایمان جب تک قلبی ہے ایمان ہے۔ اگر قولی و لسانی ہے تو اسلام ہے اور وہی ایمان جب عمل سے ظاہر ہونے لگتا ہے تو اس کا نام حسن عمل، حسن کردار یا عمل صالح پڑ جاتا ہے اور حسن عمل کے معنی ہی یہی ہیں کہ وہ عمل رضائے الٰہی کے مطابق ہو، کوئی نیکی اگر پیش کی جاتی ہے جس کی تہہ میں جذبہ ایمانی خفیف سا بھی موجود نہیں تو نیکی کی صرف صورت ہے نیکی کی صرف نقل ہے اور جس طرح نماز کی نقل محض نماز نہیں اسی طرح کسی نیکی کی نقل پر اطلاق نیکی کا نہیں ہوسکتا۔ عمل نیکی کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ وہ عمل ضابطۂ شریعت کے مطابق ہو'۔

اس میں صرف یہ جزو قابل ترمیم ہے کہ ''ایمان جب قولی و لسانی ہو تو اسلام ہے۔ ایسا ہی نہیں بلکہ عملی بھی بایں معنی کہ اعمال صالحہ کے مطابق شریعتِ اسلام ظاہری طور پر پابندی ہے مگر اصولِ اعتقاد قلبی طور پر مستحکم نہیں ہیں تو وہ بھی اسلام ہی ہوگا۔

اس کے ساتھ بھی قابل لحاظ ہے کہ جب خوش خبری، نوید اور مژدہ جہاں بھی ہے اس میں جس طرح ایمان تنہا نہیں ہے اسی طرح ''عمل صالح'' بھی تو اب اس بحث کی اہمیت ہی نہیں رہتی کہ بغیر ایمان عملِ صالح ہوسکتا ہے یا نہیں، جب کہ قرآن کریم نے عمل صالح کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا ہے تو بغیر ایمان تنہا اعمالِ صالحہ ہوں بھی تو نجات کا استحقاق سمجھنا قرآنِ کریم کی رو سے غلط ہی قرار پائے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ ایمان اور اعمالِ صالحہ میں ایک فرق بھی قرآن کریم سے ثابت ہے اور وہ یہ کہ استحقاق اور وعدہ جنت میں ہیں تو دونوں ضروری، لیکن اگر ایمان ہے اور اعمال صالحہ میں کمزوری ہے تو بطور عفو و کرم مغفرت کا امکان ہے۔ لیکن اگر ایمان ہی نہیں ہے تو پھر مغفرت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ قرآن میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ. (نساء۔ ۴۸ و ۱۱۶)

یقیناً اللہ اسے کبھی نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ جو گناہ ہوا سے جس کے لئے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔

آخری لفظ لمن یشاء سے ظاہر ہے کہ یہ مغفرت بطور وجوب اور بحیثیت عموم نہیں ہے بلکہ بطور امکان اور بطور ایجاب جزائی ہے لہٰذا اس کے بالمقابل جو نفی ایمان کی صورت میں لا یغفر کے لفظ سے دیا گیا ہے وہ بطور امتناع اور بطور سلب کلی ہوگا اور اس کے بعد ان دونوں کی مقابل جماعت یعنی ایمان اور عملِ صالح دونوں درجوں پر فائز افراد کے لئے جو مژدہ نجات اور نعیم جنت کا ہے وہ بطور وجوب اور بطور ایجاب کلی ہے جس میں کسی استثناء کی گنجائش نہیں ہے اور یہی وہ ہے جس کا عقلی طور پر عدل الٰہی بھی متقاضی ہے۔

باغ کا یہ وصف کہ اس کے نیچے سے نہریں جاری ہیں اس لحاظ سے لایا گیا ہے کہ باغ اصل میں زمین نہیں بلکہ درختوں کا نام ہوتا ہے اس

لئے نہریں اگر چہ زمین کے اوپر ہیں مگر باغوں کے لحاظ سے انہیں نیچے ہی کہنا درست ہے[۱]۔

''جب بھی انہیں کھانے کو ملے گا وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم دنیا میں کھا چکے ہیں۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخرت کے پھل جنس کے اعتبار سے وہی ہوں گے جو دنیا میں ہوا کرتے ہیں اور ''جب بھی'' کے الفاظ جو بطور کلیہ ہیں' ان سے ظاہر ہے کہ آخرت کے میوے محدود ان ہی اقسام میں نہیں ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے اس لئے کہ عرب ان سے واقف تھے۔ کیوں کہ اہل جنت کا دائرہ کسی خاص قوم و ملک والوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر ملک کے ایمان و عمل صالح اختیار کرنے والے اس ''مژدہ'' کے عموم میں برابر کا حصہ رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ پھل ہر ملک کے مختلف ہوتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ میوے جن کا ذکر قرآن میں نام کے ساتھ ہے، بعض مما لک میں پیدا ہی نہ ہوتے ہوں لیکن قرآن ان میں سے ہر شخص کا ہر ایک میوہ کے ملنے کے وقت یہ قول بیان کر رہا ہے کہ یہ وہی ہے جو دنیا میں ہمیں ملا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک کو وہی پھل ملیں گے جنہیں وہ دنیا میں شوق سے کھا تا رہا ہے۔ جب ہی تو وہ یہ کہے گا ارے یہ تو وہی ہے جو دنیا میں ہم کھا چکے ہیں[۲]۔

قرآنِ کریم نے ان کے اس قول کو حق بجانب بھی قرار دیا ہے اور واقعہ کے اعتبار سے کسی حد تک غلط بھی یعنی ان کا یہ کہنا اس لئے حق بجانب ہے کہ شکل و صورت اور شمائل میں وہ اس دنیا ہی کے پھلوں کی طرح ہیں لہٰذا انہیں یہ کہنا ہی چاہیئے کہ یہ وہی ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ان پھلوں سے حقیقت کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک ہی ساتھ ایک لفظ 'متشابہا'، سے ظاہر کی گئی ہیں کیوں کہ مشابہت ہمیشہ دو ایسی ہی چیزوں میں ہوتی ہے جو ذاتاً مغایرت رکھتی ہوں لیکن کسی صفت یا صورت میں ملتی جلتی ہوں۔

آخر میں اہل جنت کیلئے **ازواج مطہرۃ** کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں حوریں بھی آسکتی ہیں اور جن نیک شوہروں کی دنیا والی نیک بیویاں اس لائق ہوں کہ وہ بہشت میں اپنے شوہروں کے ساتھ رکھی جائیں وہ بھی داخل ہوسکتی ہیں۔

مطہرۃ کے لفظ میں ان جسمانی حدث و خبث والی کثافتوں سے پاکیزگی بھی داخل ہے جو جنت کے لئے موزوں نہیں ہیں اور اخلاقی برائیوں سے بھی۔

جب کہ ازواج حوروں کے قبیل سے ہوں تو اس وصف سے متصف ہونا ظاہر ہے اور دنیاوی بیویاں بہشت میں داخل ہونے کے بعد ان کے طبائع جسمانی و روحانی میں بھی وہ اعتدال پیدا ہوگا کہ جسمانی و روحانی کثافتیں جو دنیا کی مادی آب و ہوا کے لوازم میں سے ہیں وہاں باقی نہ رہیں گی اور اس لئے وہاں وہ **ازواج مطہرۃ** کے لقب کی مستحق قرار پاسکیں گی[۳]۔

آخری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ اہل جنت ان نعمات میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو نعیم جنت میں دنیا کی ہر لذت و راحت سے ایک ایسا امتیاز پیدا کرتی ہے کہ وہاں کی جنت کوئی ایک چھوٹی سی چھوٹی نعمتِ دنیا کی تمام نعمتوں کے مجموعہ سے زیادہ بیش قیمت قرار پا

---

[۱]۔ اراد اخبر عن ماء انهارها بانّها جارية تحت الاشجار لان الماء اذا كانت تحت الارض فلا حظه فيها للعيون (مجمع البیان)

[۲]۔ معناه هذا الذى رزقنا من قبل فى الدنيا عن ابن عباس و ابن مسعود قال الشيخ ابو جعفر و اقوىٰ الاقوال ابن عباس (مجمع البیان)

[۳]۔ قيل هنّ الحور العين و قيل هن من نسآء الدنيا قال الحسن هن عجائزكم الغمض الرمض الغمش طهرن من قذرات الدنيا۔

جاتی ہے کیوں کہ دنیا کی ہرنعمت چاہے کتنی ہی لذیذ کیوں نہ ہو بہرحال فانی ہے اور آخرت کی ہر ہر نعمت ہمیشہ کے لئے باقی ہے اور اسی لئے مفادِ آخرت کے مقابلہ دنیا کا بڑے سے بڑا مفاد بھی نظرانداز کیے جانے کے قابل ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کو مرضیِ خالق کے مقابلہ میں نہ کسی لالچ میں مبتلا ہونا چاہیے اور نہ کبھی کسی خوف سے متاثر۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٦﴾

”بلا شبہ اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ وہ مچھر یا اس سے بھی بڑھ کر کسی چیز کی کوئی مثال بیان کرے اب وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ یقیناً حق ہے ان کے پروردگار کی طرف سے' اور جو لوگ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آخر اللہ کا اس طرح کی مثال سے کیا مطلب ہے؟ وہ اس سے بہت سوں کو گمراہی میں ڈالتا ہے اور بہت سوں کی ہدایت کرتا ہے۔ اور گمراہی میں نہیں ڈالتا مگر بداعمالوں کو۔“

قرآن میں مثالوں کا مقصد:

ذہنِ انسانی محسوسات سے مانوس ہے اس لئے وہ کسی حقیقت کا اس وقت تک آسانی کے ساتھ تصور نہیں کرتا جب تک کہ اسے کسی حسی شکل کی مثال دے کر اور مشاہدہ میں آئی ہوئی کسی واقعیت کی نظیر سامنے لا کر پیش نہ کیا جائے اسی لئے قرآنِ کریم میں حقیقتوں کے اظہار کے لئے مثالوں سے کام لیا گیا ہے اور اقسامِ قرآن میں 'امثال' کو ایک مستقل جگہ حاصل ہے۔ اس میں جیسے بڑی چیزوں کی مثالیں ہیں جیسے آفتاب و ماہتاب وغیرہ، ویسے ہی مخلوقاتِ الٰہی میں بعض چھوٹی چیزوں کی مثالیں دی گئی ہیں جیسے ایک جگہ انسان کی عاجزی دکھانے کے لئے آیا ہے:

وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْــــًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ۔ (حج ۳)

اگر مکھی ان سے ذرا سی کوئی چیز چھین لے جاتی ہے تو یہ اسے اس کے ہاتھ سے چھڑا نہیں سکتے طالب و مطلوب دونوں ہی کمزور (یعنی انسان بھی کمزور مخلوق ہے وہ مکھی ویسے ہی کمزور ہے)۔

کون کہہ سکتا ہے کہ مقصدِ کلام کے لحاظ سے یہاں مکھی کے علاوہ کسی بڑے جانور مثلاً شیر بھیڑیے وغیرہ کا تذکرہ بھی مناسب ہو سکتا تھا مگر معاندین کے لئے تو اعتراض کا کوئی بہانہ چاہیے۔ انہوں نے اس کو سرمایہ اعتراض بنا لیا کہ واہ خالق کائنات کے کلام ہونے کا دعویٰ اور اس میں مچھر مکھی ایسی حقیر مخلوق کا ذکر، اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔

خدا اس سے نہیں شرماتا یعنی اسے اپنی اور اپنے کلام کی شان کے خلاف نہیں جانتا کہ اس میں مچھر یا اسے بھی بڑھ کر یعنی اس سے بھی زیادہ

چھوٹی کسی شے کی مثال دی جائے کیوں کہ مثال کا مقصد تو کسی حقیقت کو ذہن سے قریب لانا ہوتا ہے۔ اب وہ حقیقت اگر بڑے قدو قامت والی چیز کے ذریعہ سے سامنے آتی ہے تو اس کی مثال دی جائے گی اور چھوٹی چیز کے ذریعہ سے یہ مقصد پورا ہوتا ہے تو اس کا ذکر کرنا بلاغت کے لحاظ سے ضروری ہوگا۔ جو صاحبانِ ایمان ہیں وہ مثال کے چھوٹے اور بڑے ہونے کو نہیں دیکھتے بلکہ اس حقیقت پر نظر کرتے ہیں جو اس کے تحت میں ہے اس سے ان کے علم ویقین میں اضافہ ہوتا ہے اور جو جان بوجھ کر کفر اختیار کیے ہوئے ہیں وہ بطور طنز واستہزاء کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کا بھلا ایسی مثال سے کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ اب یہ فقرہ کہ ''بہت سوں کو اس سے گمراہی میں ڈالتا اور بہت سوں کی ہدایت کرتا ہے'' ان ہی کافروں کے قول کا تتمہ بھی ہوسکتا ہے۔ گویا وہ اللہ پر تفرقہ اندازی کا الزام عائد کرتے ہیں کہ ایسی مثالوں کا لانا اور زیادہ لوگوں کو شکوک پیدا کرنے کا ذریعہ ہے تو آخر اس سے فائدہ کیا ہے اور جواب اس کا اس کے بعد اللہ کی طرف سے یہ ہے کہ گمراہ تو صرف وہ ہوتے ہیں جو پہلے ہی سے بداعمال ہیں یعنی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں لہٰذا ان کی گمراہی کا سبب حقیقتاً اللہ کا ان مثالوں کو پیش کرنا نہیں ہے بلکہ خود ان کے سوءِ اختیار کا نتیجہ ہے کہ وہ اس سے گمراہ ہوتے ہیں [1]۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کافروں کا کلام اس جملہ پر ختم ہوگیا کہ اللہ آخر اس سے چاہتا کیا ہے! اور اس کے بعد کلام الٰہی یہ ہے کہ اللہ اس سے بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت کرتا ہے۔ اس صورت میں یہ اس قبیل سے ہوگا جیسے اس کے پہلے ''فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا۔''

حقیقت میں اللہ کو مقصود کسی کا گمراہ کرنا نہیں ہوتا لیکن چوں کہ نتیجہ یہی مرتب ہوتا ہے کہ اس کی ان مثالوں سے کچھ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور کچھ اپنے تعصب وعناد سے مزید گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں اس لئے اس کی نسبت اللہ کی طرف دے دی گئی ہے اور پھر اس کی تشریح بعد میں کی گئی ہے کہ یہ گمراہی ان ہی لوگوں کے لئے ہے جو پہلے سے راہِ حق سے ہٹے ہوئے ہیں اور اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ گمراہی خود انسان کو بداعمالی اور سوءِ اختیار کا نتیجہ ہے نہ کہ اللہ کی طرف ہے خواہ مخواہ ان کو گمراہ کرنے کا ارادہ ہے۔

بہرصورت آخری فقرہ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ہے یہ امر بالکل نمایاں ہے کہ گمراہ کرنے کی نسبت اللہ کی طرف عقیدہ جبر سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی [2]۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٢٧﴾

جو اللہ سے کیے ہوئے معاہدہ کو اس کے استحکام کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جس رشتہ کے ملائے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اسے وہ کاٹ ڈالتے ہیں اور دنیا میں خرابی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو گھاٹے میں رہنے والے ہیں''۔

یہ اوصاف ہیں ان فاسقین کے جن کے لئے قرآنی امثال سے گمراہی کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور ان کی یہ گمراہی طبیعتِ فسق کا نتیجہ ہے اس

---

[1] ۔وھٰذا وجہ حسن (مجمع البیان)

[2] ۔ان الرجل اذا ضل باختیارہ عند حصول شئی من غیر ان یکون لذلک الشئی اثر فی اضلالہ فیقال لذلک الشئی انہ اضلّہ (رازی)

لئے یہی اوصاف مطلق فاسقین کے ہر دور میں قرار پائیں گے۔

اللہ سے کیا ہوا معاہدہ ان منافقین کے لئے جو اظہارا سلام کر چکے تھے کھلا ہوا ہے کیوں کہ جب انہوں نے آ کر رسولؐ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور آپ کی رسالت کو تسلیم کیا تو اس سے وفاداری اور احکام کی تعمیل کا عہد و پیمان ظاہر ہے۔اب جب کہ وہ اس کے بعد برابر رسولؐ کے درپے آزار رہتے ہیں اور احکام کی تعمیل پر اعتراضات کے پہلو ڈھونڈتے رہتے ہیں تو عہد شکنی کے مجرم ہونے میں ان کے شک ہی کیا ہوسکتا ہے رہ گئے وہ کافر جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا ان کے لئے یہ عہد وہ عہدِ فطرت ہوسکتا ہے جو اللہ کی خالقیت اور ربوبیت کے اقتضاء سے مطالبۂ عبودیت کے طور پر ان سے بواسطۂ عقل وضمیر ابتدائے سنِ شعور ہی سے موجود ہے اور جس کے خلاف عمل کرنا اس عہد کے توڑنے کے مترادف ہے[1]۔

پھر اس عہد کی تجدید انبیاء ومرسلین کی زبان سے بھی ہوتی رہی ہے جو یقیناً ہر ملک اور ہر قوم میں ابتدائے تکوینِ بشر سے آتے رہے ہیں۔

اگرچہ زیادہ نمایاں مصداق اس کے یہود ونصاریٰ ہیں جو ''اہل کتاب'' کہلاتے ہیں۔ان کو پہلے سے نبی آخر الزمانؐ کی بشارتیں دے دی گئی تھیں۔اب یہ اسے نہیں مانتے تو عہد شکنی نہیں تو کیا ہے؟

لطف یہ ہے کہ بائبل کا نام بھی خود یہود ونصاریٰ کی اصطلاح میں عہد ہی ہوگیا ہے چنانچہ توریت اور اس کے ملحقات ''عهدقديم'' (پرانا عہد نامہ) اور انجیل اور کے ملحقات (عهدجديد)(دنیا عہد نامہ) کہلاتے ہیں۔

''جس رشتہ کے ملائے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اسے توڑتے ہیں'' اس میں تمام 'حقوق' داخل ہیں۔حقوق اللہ بھی اور حقوق الناس بھی رشتہ کے ملائے رکھنے کا مطلب ہے۔حقوق کو ادا کرتے رہنا اور توڑنے کا مطلب ہے ان حقوق کو ادا نہ کرنا بلکہ ان کی عملی مخالفت کرنا[2]۔

فساد فی الارض کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔دوسروں کو کفر یا معصیت کی دعوت دینا اور خلقِ خدا کی گمراہی کا سامان کرنا بدترین قسم کا فساد فی الارض ہے اور ظاہر ہے کہ آیاتِ قرآن پر نکتہ چینیاں جو وہ لوگ کرتے رہتے تھے ان کا مقصد یہی تھا کہ لوگوں کے عقائدِ حقہ میں تزلزل پیدا کریں۔

''یہ لوگ گھاٹا اٹھانے والے ہیں'' دنیا میں بھی کیوں کہ کوئی جماعت ان پر اعتماد نہیں کرتی اور خود ان کے دل کو سکون واطمینان نصیب نہیں ہوتا اور آخرت میں بھی عذابِ ابدی کی شکل میں۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٨﴾

''کس طرح تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو اسی نے تمہیں جان دار بنایا وہی تمہیں موت دے گا

---

[1]۔نقضهم لذلك تركهم الاقرار بما قد ثبت صحته لهم بالادلة (مجمع البیان)

[2]۔ قيل معناه الامر بوصل كل من امر الله بصلته من اوليائه والقطع والبراءة من اعدائه وهذا اقوى لانه اعمّ ويدخل فيه الجميع (مجمع البیان)

اور وہی تمہیں زندگی دے گا پھر انجام میں اسی کی طرف تمہارا رجوع ہوگا“۔

”کس طرح“ کالفظ اصل میں تو سوال کو بتلاتا ہے مگر کلام الٰہی میں جہاں سوال کا کوئی لفظ آئے اس سے مقصود استفہام کے علاوہ کچھ اور ہی ہوتا ہے اس لئے کہ استفہام یعنی دریافتِ حال کا امکان اس کے لئے ہے جو حقیقت سے ناواقف ہو اور ظاہر ہے کہ خالق کی ذات علام الغیوب ہے کوئی بھی حقیقت اس سے مخفی نہیں ہے لہٰذا کیوں کر اور کس طرح سے بھی دریافتِ سبب مقصود نہیں ہوسکتا بلکہ اس سے زجر وتوبیخ مقصود ہوتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں انکار نہ کرنا چاہیے[1]۔

کیوں نہ! انکار کرنا چاہیے؟ اس لئے کہ اللہ کی قدرت کے کرشمے خود تمہارے ہی اندر نمایاں ہیں۔ تم بے جان تھے ان مواد سے لے کر جن سے انسان کی خلقت ہوتی ہے شکم مادر میں اس وقت تک کہ جب تک اس میں جان پڑے وہ بے جان تھا۔ پھر جان ڈال کر اسے اس نے ذی حیات بنایا، پھر وہی اسے عمر پوری ہونے پر موت دیتا ہے، پھر وہی دوبارہ زندہ کرے گا۔ یہ حشر والی زندگی ہے جس پر مختتم جزا وسزا کا دارمدار ہے۔ اس زندگی کے بعد حساب وکتاب وغیرہ منازلِ آخرت درپیش ہوں گے اور اس کے بعد آخری انجام جو مومنین کا بہشت اور کافرین کا دوزخ کی شکل میں نمودار ہوگا یہ بھی خالق ہی کی جانب سے ہوگا اور اس کا فیصلہ صرف خالق کی مرضی پر موقوف ہے۔ اس معنی سے کہا گیا ”**ثم الیه ترجعون**“ یعنی تمہارا معاملہ اس کے بعد اسی کے ہاتھ میں ہوگا[2]۔

هُوَ الَّذِيۡ خَلَقَ لَكُمۡ مَّا فِي الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ۚ ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰٮهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ ‌ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۲۹﴾

”وہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے سب، پھر آسمان کی طرف رخ کیا تو انہیں سات آسمانوں کی صورت میں درست کیا اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے“۔

خلقت آسمان وزمین:

یہ انسانی رفعت وعزت کا وہ پیغام ہے جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے اور جسے پیش نظر رکھنے سے ہر قسم کے شرک یعنی غیر اللہ کی پرستش کا سدباب ہوتا ہے۔

انسان نے کائناتِ عالم کو دیکھ کر ان میں اپنے کو حقیر سمجھا۔ وہ جسامت میں پہاڑوں سے بہت کم نظر آیا، نشوونما میں درختوں سے بہت پیچھے دکھائی دیا، ضروریاتِ زندگی کے پورا کرنے میں جانوروں کا محتاج محسوس ہوا تو وہ ان میں سے ہر چیز کے سامنے جھکنے لگا لیکن اگر وہ اسے پیش نظر رکھے کہ دنیا کی ہر چیز اس کے لئے پیدا ہوئی ہے، اس لئے اسے ان میں سے ہر ایک چیز سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے اور کسی کے سامنے جھکنے کی ضرورت نہیں تو کبھی ان میں سے کسی کو معبود نہ بناتا ہاں احسان اس کا مانتا اور معبود اسی کو بناتا جو ان سب چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے اور جس نے

---

[1]۔ کیف فی الاصل سئوال عن الحال۔ ومعناه فی الایة التوبیخ (مجمع البیان)

[2]۔ کما یقال رجع امر القوم الی الامیر ولا یراد به الرجوع من مکان الی مکان وانما یراد به ان النظر صار له خاصة (مجمع البیان)

اس انسان کو وہ قویٰ عطا فرمائے ہیں جن سے کام لے کر وہ ان تمام عالم کی چیزوں کو تسخیر کر سکتا ہے۔

زمین اور اس کے اندر کی چیزوں کے ذکر کے بعد یہ کہنا کہ ''پھر آسمان کی طرف رخ کیا'' اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمین کی خلقت آسمان سے پہلے ہے حالانکہ دوسری جگہ قرآن میں آیا ہے وَالۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا، زمین کو اس کے بعد بچھایا (نازعات۔۳۰)

دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آسمان ایک واحد شکل میں زمین سے پہلے خلق ہوا۔ اس کے بعد زمین کی تخلیق ہوئی اور زمین کی خلقت کے بعد پھر آسمان کو سات طبقوں پر تقسیم کیا گیا۔ اسی لئے استوٰی کی لفظ کے ساتھ السماء بطور مفرد آیا ہے اور اس کے بعد سبع سموت کی صورت میں اس کے درست کیے جانے کا ذکر ہے۔

یہ آسمان جو ہمیں نظر آتا ہے اگر 'حدِ نظر' کا نام ہو بھی تب بھی اس کے آگے کیا ہے اس کے متعلق کون بتا سکتا ہے؟ پھر جب کہ خالق خود اسے سات کی تعداد میں بتائے تو انکار کا سبب ہی کیا ہو سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ان سات کی شکل و کیفیت کو نہ سمجھ سکیں۔

آخری فقرہ وَهُوَ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيۡمٌ جسے ہر دور کی سائنس کے بلند بانگ دعووں کو پیش نظر رکھ کر ہی لایا گیا ہے کہ آسمانوں کے بارے میں تمہارا سرمایہ حقیقت میں جہل کے سوا کچھ نہیں ہے پھر جہل کی بنیاد پر علیم خبیر خالق کے بیان کی نفی کا حق تمہیں کہاں پہنچ سکتا ہے۔

ہاں اس سات کہنے سے بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ اس بارے میں ہیئتِ قدیم والوں کی تفصیلات کو قبول کر لیا جائے کیوں کہ ان کی بنیاد بھی ظن و تخمین کے سوا کچھ نہیں ہے۔

وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓـئِكَةِ اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً ؕ قَالُوۡٓا اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾

''اور اس وقت جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک جانشین بنانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا: 'کیا تو اس میں ایسے نائب کو بنائے گا جو اس میں خرابی پھیلائے اور خون خرابہ کرے' حالاں کہ ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے اور تیری پاکیزگی کو سراہتے رہتے ہیں اور اس نے کہا 'یقین جانو کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔

خلافتِ آدمؑ کا اعلان:

یہ کائناتِ عالم میں اشرف المخلوقات انسان کی ''آمد آمد'' کا ذکر ہے جب کہ یہ مخلوق ابھی عالم انوار و ارواح میں تو تھا مگر دنیائے اجسام اس سے خالی تھی۔ اس کے اس عالم میں آنے سے پہلے خالقِ کریم نے اپنے فرشتوں کو اس کے آنے کی خبر دی۔

فرشتے نور سے پیدا کیے ہوئے صاحبِ احساس و شعور وہ مخلوق ہیں جن میں ہوا و ہوس اور جذبات کا پتا نہیں اور اس لئے سرشت ہی کے اعتبار سے معصوم ہیں۔ ان کو خالق منتظر و مشتاق بنانا چاہتا ہے ایک نئی قسم کے مخلوق کا جو مادیت اور روحانیت کا مجموعہ ہوگا اور اس کا پہلا فرد آدمؑ ہیں

جن کے آنے کی ملائکہ کو اطلاع دی جارہی ہے ان الفاظ میں کہ زمین میں ایک جانشین قرار دینا چاہتا ہوں۔

"جانشین کے کیا معنی؟ جو دوسرے کی نیابت میں کوئی ایسا کام انجام دے جس کا اصل ذمہ دار وہ دوسرا ہے۔ اب یہ جانشینی خواہ اصل شخص کی غیبت کی وجہ سے ہو یا انتقال کی وجہ سے اور خواہ اس لئے کہ خود اس کے لئے اس کام کے انجام دینے میں کچھ موانع پائے جاتے ہیں، خالق کی طرف سے جانشین کا مقرر کیا جانا اسی تیسرے سبب سے ہے۔

اصل میں خلائق کی ہدایت وتنظیم تقاضائے "ربوبیت" ہے، اس لئے ذمہ دار اس کا وہ خود ہے مگر وہ جسم و جسمانیات سے منزّہ ومبّرا ہے اور خلائق جن کی ہدایت کرنا ہے اور وہ مادیت کے شکنجہ میں اسیر ہیں لہٰذا بلا واسطہ اس کی طرف سے فیض حاصل کرنے کی ان میں صلاحیت نہیں۔ اس وجہ سے ضرورت ہوئی کہ وہ ان ہی میں سے کسی نفس کاملہ کو اپنے فیوض کا مرکز بنا کر ہدایت وتنظیم ملت کا کام سپرد کرے اور وہ اس ہدایت کے فریضہ کو جو اصل میں اللہ سے متعلق ہے اس کی طرف سے انجام دے کر خلقِ خدا پر حجت تمام کرے ان ہی خلفاء میں سے ہر ایک کا نام نبی اور رسول اور کسی وقت امام ہوتا ہے، جن کا تقرر صرف اللہ کے اختیار خاص سے وابستہ ہے، کسی دوسرے کو اس میں دخل نہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے خلیفہ کے لفظ کے معنی بتائے ہیں:

یکون حجۃ لی فی ارضی علیٰ خلقی (تفسیر صافی)

وہ روئے زمین پر میری مخلوق کے مقابلہ میں میری حجت تمام ہونے کا ذریعہ ہوگا

علمائے جمہور بھی زیادہ تر اس سے متفق ہیں چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس کے معنی میں لکھا ہے:

یخلفنی فی الحکم بین خلقی و ذلک الخلیفۃ ھوادم ومن قام مقامہ فی طاعۃ اللہ والحکم بالعدل بین خلقہ[1] بن جریر عن ابن عباس و ابن مسعود خلیفۃ اللہ فی ارضہ لاقامۃ احکامہ و تنفیذ قضایاہ معالم[2]

نسل انسانی خود اپنی صلاح وفلاح کے لئے اس کی محتاج تھی اور محتاج ہے کہ اپنے کسی ہم جنس کے واسطہ سے شریعت الٰہی سے استفادہ کرے اور سلسلہ نبوت اسی غرض سے قائم ہوا ہے و کذلک کل نبی استخلفھم اللہ فی عمارۃ الارض و سیاسۃ الناس و تکمیل نفوسھم و تنفیذ امرہ فیھم[3] (بیضاوی)

اس کے علاوہ یہ ہے کہ خالق کا ئنات کے ساتھ اگرچہ تمام عوالم کا تعلق یکساں ہے بایں معنی کہ وہ سب کا خالق اور مالک ہے مگر نسبتی حیثیت سے عرش کو سریر سلطنت ربانی کا درجہ دیا گیا ہے کہ اور اس کے لحاظ سے زمین اس شرف سے محروم ہے لہٰذا خالق کو منظور ہوا کہ زمین بھی ایک دار السلطنت ہونے کے شرف سے محروم نہ رہے لہٰذا کہا گیا کہ میں زمین میں اپنا نائب قرار دینا چاہتا ہوں یعنی ایک ایسا شخص جو زمین میں بجائے میرے ہو۔

---

[1]۔ وہ میرا جانشین ہوگا میرے مخلوقات کے درمیان حکومت کرنے میں، اور یہ جانشین آدم تھے اور جو ان کے قائم مقام ہوئے اطاعتِ الٰہی اور خلائق کے درمیان عدالت کے ساتھ فیصلہ کرنے میں۔

[2]۔ اللہ کا جانشین اس کی زمین میں اس کے احکام کو قائم کرنے اور اس کے فیصلوں کو جاری کرنے میں۔

[3]۔ اسی طرح ہر پیغمبرؑ ان سب کو اللہ نے خلیفہ بنایا زمین کے آباد کرنے اور لوگوں کا نظم قائم کرنے اور ان کے نفوس کو کمال کی منزل تک پہونچانے اور خدا کے فرمان کو ان کے درمیان جاری کرنے میں۔

ملائکہ کا سوال وجواب:

اب اس نائب کے متعلق چوں کہ ملائکہ کو خالق کی طرف سے علم دیا جا چکا تھا کہ اس کی خلقت مٹی سے ہوگی۔ نیز انہیں مٹی کے خواص معلوم تھے کہ اس سے پیدا شدہ مخلوق میں جذبات نفس کا ہونا جو سرمایہ جنگ وجدال ہوتے ہیں ضروری ہے اس کے ساتھ انہیں انسان کے علمی جوہر کمال اور اس نوع کی معصوم ہستیوں کی عظمتِ کردار کا اس وقت تک علم نہ تھا اور اس لئے ان کے ذہن میں یہ تھا کہ خود ان سے بڑھ کر کوئی مخلوق مقامِ عبودیت میں بلند اور تقربِ الٰہی میں ان سے آگے نہیں ہے۔ اب جو خالق کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ ''میں زمین میں اپنا جانشین مقرر کرنے والا ہوں'' اور یہ خلافت الٰہیہ کا منصب انہیں اپنے خلاف محسوس ہوا لہٰذا فطری طور پر ان میں ایک اضطراب پیدا ہوا جس نے اس سوال کی شکل اختیار کی: ''کیا اسے مقرر کیا جائے گا جو زمین میں خرابی پھیلائے اور خونریزی کرے''؟ یہ سوال نہ اعتراض تھا، نہ اس میں کوئی جذبہ مخالفت کارفرما تھا کیوں کہ یہ باتیں ملائکہ کی عصمت کے خلاف ہیں بلکہ وہ صرف ایک قلبی اضطراب کا مظاہرہ تھا جو ان کے قصورِ علم کا لازمی نتیجہ تھا۔

خالق نے فعلاً ان کے اس سوال کی تفصیلی جواب نہیں دیا بلکہ مجمل طور پر ایسا جواب دیا جس سے پتہ چلتا تھا کہ قدرت کا راز ہے جس کا بتانا اس وقت مناسب نہیں ہے یا ملائکہ میں ابھی اس کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٣١﴾

''اور اس نے آدمؑ کو وہ تمام نام سکھا دیے پھر ان اشخاص کو فرشتوں کے سامنے پیش کر کے فرمایا بتاؤ مجھے ان کے نام اگر تم سچے ہو''۔

یہ اب آدمؑ کی خلقت کے بعد اسی سوال کے جواب کا انتظام کیا گیا ہے اور اس کے لئے ایک مجلس امتحان کی ترتیب کا اہتمام ہوا ہے۔

سب سے پہلے آدمؑ کو تمام ناموں کی تعلیم دی گئی عامہ مفسرین نے اس کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز جمادات نباتات اور حیوانات ہر چیز کے نام مگر کیا یہ ''فرہنگِ لغت'' کا علم کوئی ایسی بلند فضیلت ہے جو ملائکہ کے مقابلہ میں معیار شرف بن سکے، بعض مفسرین نے اس میں یہ عقلی تصرف کیا ہے کہ علم اسماء میں حقیقتوں صفتوں اور تمام چیزوں کی خاصیتوں کا علم بھی داخل ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ اسماء کے عرفی مفہوم سے خارج ہے اور یہ ظاہر ہے کہ الفاظ عرفی مفاہیم پر محمول ہوتے ہیں نہ کہ ان معانی پر جو عقلی توجیہات کی مدد سے کھینچ تان کر قرار دیے جا سکیں۔

تعلیم اسماء اور امتحان آدمؑ وملائکہ:

پھر یہ کہ اس کے بعد کہا گیا ہے ثم عرضھم علی الملئکۃ ''پھر انہیں ملائکہ کے سامنے پیش کیا'' اس میں ھم ایسی ضمیر ہے جو ذوی العقول کے لئے آتی ہے یہ ضمیر اسماء کی طرف نہیں پھر سکتی چنانچہ اسماء کے لئے جو ضمیر اس کے قبل پھیری جا چکی ہے وہ کلھا میں واحد مونث کی ہے کلھم نہیں کہا گیا ہے نہ کہنا صحیح ہے اسی لئے تمام مفسرین یہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ھم کی ضمیر اسماء نہیں بلکہ مسمیات کی طرف پھرتی ہے یعنی وہ چیزیں جن کے نام تھے اور اسی لئے اس کے بعد ہے انبئونی باسماء ھٰؤلاء ''مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ'' یہ نہیں کہا گیا کہ انبئونی

بھذہ الاسماء مجھے یہ نام بتاؤ' اس سے صاف ظاہر ہے کہ پیش جو کیے گئے ہیں وہ اسماء نہیں اصحاب اسماء ہیں۔اب اگر اسماء سے مراد ہر شے یعنی کیڑوں مکوڑوں تک کے نام ہیں اور وہ بھی قیامت تک کی چیزوں کے تو ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں اس وقت وجود میں نہ آئی تھیں یہ تو قیامت کے ظرف زمان میں پیدا ہوں گی۔ ذوی العقول میں چوں کہ ایک جسم ہے اور ایک روح اور ارواح کے بارے میں اہل مذہب کا عقیدہ اور مذہبی نصوص کا بیان ہے کہ وہ اجسام سے قبل پیدا ہوئے تھے اور ان ہی میں سے بلند مرتبہ ارواح کو ان کے کمال وصفائے جوہر کی بناء پر انوار بھی کہا گیا ہے تو ان کا عالم ارواح یا عالم انوار میں وجود درست ہے اور اسی عالم میں ملائکہ کے سامنے ان کا پیش کیا جانا صحیح و معقول ہے مگر خالص مادی چیزوں میں یہ بات نہیں ہے۔اب ایک طرف ھم اور ھؤ لاء دونوں کلموں کا لفظی قرینہ اور دوسری طرف یہ عقلی قرینہ کہ تمام اشیاء پیش کیے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ دونوں قرینے الاسماء کلھا کے دائرہ میں اس تخصیص کے سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ اس سے تمام چیزوں کے نام مراد نہیں ہیں بلکہ کچھ صاحب عقل شخصیتوں کے نام مراد ہیں۔ یہ شخصیتیں وہی ہیں جن کا تعارف اور جن کی پاک سیرت کو ظاہر کرنے والے خط و خال ہی ملائکہ کو عظمت بشری محسوس کروا کے خلافت کے لئے اس کے انتخاب کے متعلق ان کے سوال کا پورا پورا جواب بن جائیں۔

یہ امر پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جس چیز کے تعلم کا آدمؑ کے لئے ذکر کیا گیا ہے وہ فقط اسماء میں مسمّیات یعنی وہ اشخاص جن کے وہ نام تھے آدمؑ کے سامنے پیش نہیں کیے گئے تھے اور جس چیز کا ملائکہ سے سوال ہوا ہے وہ فقط اسماء نہیں ہیں بلکہ مسمیات پیش کر کے یہ کہا گیا ہے کہ اگر سچے ہو تو ان کے نام بتاؤ یعنی ان مسمیات کو دیکھ کر اسماء کی تطبیق کر و اور بتاؤ کہ کون کس کا نام ہے؟ یہ حافظہ کا امتحان نہیں بلکہ ذہانت کا امتحان تھا جس میں انسان ملائکہ سے افضل ثابت ہوا ہے[1]۔

اب اس سلسلہ میں جو قابل غور فقرہ رہ گیا ہے وہ قولِ خالق ان کنتم صادقین ہے۔یعنی ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مخاطب جماعت کسی نہ کسی لحاظ سے سچائی کے معیارِ سے الگ ضرور ہے اور یہ ملائکہ کی عصمت کے خلاف معلوم ہوتا ہے مگر معلوم ہونا چاہیے کہ ''صدق'' کا وہ مفہوم جو اسے ''کذب'' کے مقابل قرار دیتا ہے، علوم لِفظیہ کی ایک اصطلاح ہے اور اس کے لحاظ سے تو ملائکہ کے بارے میں ''صادق' یا اس کے خلاف کچھ کہنے کی گنجائش نہیں کیوں کہ ان کا کلام اتجعل فیھا الخ جو اس کے پہلے ہوا تھا وہ خبر تھا ہی نہیں بلکہ استفہامی جملہ تھا جس میں صدق اور کذب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ماننا پڑے گا کہ یہ صدق کچھ اور ہے اور اس کا تعلق بھی اس جملہ کے علاوہ کسی اور چیز کے ساتھ ہے۔

حقیقتِ امر جہاں تک غور کرنے سے سمجھ میں آتی ہے اور بعض احادیث بھی اس کے مؤید ہیں یہ ہے کہ یہ الفاظ تو اتنے ہی تھے کہ جو زبان پر آئے مگر ان کا ایک پس منظر تھا جو قلب کے اندر مضمر تھا اور وہ یہ خیال کہ ہم سے بڑھ کر کوئی مخلوق نہیں ہے اور ہم سب سے افضل و برتر ہیں[2]۔

---

[1]۔ الاسماء کلھا ای اسماء ھؤلاء الھداۃ وروی الصدوق بسندین معتبرین عن الصّادق علیہ السلام ان اللہ تبارک وتعالیٰ علم اٰدم اسماء حججه کلھا ثم عرضھم وھم ارواح علی الملئکۃ فقال انبئونی باسماء ھٰؤلاء عرضھم وھم ارواح طاھرۃ وانوار قدسیۃ تضئ بالھدی والطھارۃ والعصمۃ الا ختیاریۃ علی الملئکۃ لیعرفوا فضلھم الفائق ویظھر لھم شئی من حجۃ الحکمۃ فی خلق اللہ للبشر علمه بالّذین تشرق الارض بنورھم وتقوم بھم الحجۃ علی الملئکۃ (البلاغی)

[2]۔ انھم قالوا فی انفسھم ما کنا نظن ان یخلق اللہ خلقا اکرم الیه منّا نحنا خوان اللہ وجیرانه واقرب الخلق الیه (روایت عیاشی)

یہ خیال کوئی گناہ نہیں ہے جس پر کسی سزا کا استحقاق ہوا اور جو عصمتِ ملک کے خلاف ہو بلکہ وہ ایک نظری قصور ہے جو نقصِ علم کا لازمی نتیجہ ہے اور جس کے دور کرنے کے لئے بعد میں امتحان کے ذریعہ سے ان کو ادراک پیدا کر دیا گیا اس کا کہ وہ اس منصب کے اہل نہیں ہیں اور انسان اس منصب کے ضروری شرائط میں ان سے افضل وہ برتر ہے۔کلامِ ملک میں کوئی جزء واقعہ کے خلاف نہ تھا مگر اس سوال کے پس پشت جو ذہنیت کام کر رہی تھی وہ حقیقت کے خلاف تھی اور صادق نہ تھی اور اسی کے لحاظ سے موقع امتحان میں کہا گیا کہ ''اگر سچے ہو تو ان اشخاص کے نام بتاؤ اس امتحان سے ملائکہ کو ان کے نقص کا احساس بھی پیدا کر دیا اور ان افرادِ انسانی کا جو اعلانِ خلافت کا حقیقی مرکز تھے ملائکہ سے تعارف کر کے ان کی عظمت وجلالت کا علم بھی عطا کر دیا''۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾

''انہوں نے کہا تو ہر برائی سے دور ہے ہمیں تو سوا اس کے جو تو نے ہمیں بتا دیا اور زیادہ کچھ علم نہیں ہے یقیناً تو بڑا جاننے والا مناسب ہی کام انجام دینے والا ہے''۔

انسان کی خصوصیت تمام انواع کائنات میں کیا ہے؟اختیاری طور پر علمی وعملی ترقی کی لامحدود صلاحیت انسان کے علاوہ جتنی مخلوق ہے خواہ اس سے پست ہو جیسے جمادات نباتات اور حیوانات اور خواہ باعتبار صفائے جوہر اس سے بلند ہو جیسے ملک ان میں جتنے خالق کے عطا کردہ کمالات ہیں وہ تو فعلی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان عطایائے الٰہی سے پھر خود اپنی قابلیت سے آگے بڑھنے کی طاقت ان میں یا تو نہیں ہے اور یا ہے تو بہت محدود ہے۔

انسان اور ملائکہ کے مقابلہ میں اگر صرف بتائی ہوئی چیز کے بتانے کا سوال ہوتا جو حافظہ کا امتحان ہوتا ہے تو اس میں ملک کے پیچھے ہٹنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا اس لئے کہ وہ سہو ونسیان سے برتر ہے مگر یہاں سوال اس سے زیادہ تھا۔بتائے گئے تھے اسماء اور سوال تھا ان کو مسمیات سے مطابق کرنے کا۔یہ امتحان عقل وفراست کا تھا۔یہ ایسی چیز کا سوال تھا جو بتائے ہوئے حدود سے خارج تھا اور اسی لئے ملائکہ نے اظہار عجز کیا ان الفاظ میں کہ ''بس ہمیں اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہم کو بتا دیا ہے'' یعنی ہمارے بس کی یہ بات نہیں ہے کہ ہم اس سے زیادہ کچھ بتا دیں۔

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْھُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَھُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

''اس نے ارشاد کیا اے آدمؑ تم انہیں ان لوگوں کے نام بتا دو تو جب انہوں نے ان کے نام انہیں بتا دیے تو اس نے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمان اور زمین کے چھپے ہوئے رازوں کو جانتا ہوں اور میں وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور وہ بھی جو تم دلوں میں چھپائے ہوئے تھے''۔

جب ملائکہ کی طرف سے اظہار عجز ہو گیا تو اب نظر قدرت متوجہ ہوئی آدمؑ کی طرف ہاں انسان! یہ تیرے جوہر کھلنے کا وقت ہے تو بتادے کہ ان ناموں میں سے کون ان شخصیتوں میں سے کس کا نام ہے؟ آدمؑ نے نوعِ انسانی کی خصوصیت امتیازی کو محک اعتبار پر کامل عیار ثابت کرتے ہوئے اپنی اس قوت تمیز سے کام لیا جس کے وہ بدرجہ کمال حامل تھے۔ اسماء کو دیکھا، مسمیات پر نظر کی مناسبتوں کا لحاظ کیا اور ٹھیک ٹھیک بتادیا کہ یہ ان کا نام ہے اور یہ ان کا۔ اس طرح انسان کا امتیاز ملائکہ کے مقابلہ میں ثابت ہو گیا اور خالق کو بہت عرصہ قبل اپنے اس جواب کی عملی تصدیق نظر ملائکہ میں ہو جانے سے بطور نازش اسے یاد دلانے کا موقع حاصل ہوا کہ دیکھو میں نے نہ کہا تھا جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے یعنی اب تم خوب سمجھ گئے کہ تمہیں چھوڑ کر انسان کو خلافت کے لئے کیوں منتخب کیا گیا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

"اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا اس نے انکار اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔"

حکم سجدہ اور ابلیس کا انکار:

یہ سجدہ جس کا حکم دیا گیا تھا اس کی نوعیت کیا تھی؟ قول قوی یہ ہے کہ وہ پیشانی کے جھکانے ہی کے معنی میں ہے اور وہ آدم ہی کو سجدہ تھا تعظیمی طور پر علامہ طبرسیؒ نے اس کو کہا ہے المروی عن ائمتنا (مجمع) اور قرآن کے الفاظ بھی اسی کے شاہد ہیں کیوں کہ سجدہ کی اضافت ل کے ساتھ ہوئی ہے (لآدم) جو مسجود کا پتہ دیتی ہے قبلہ کے لئے الیٰ آنا چاہیے ل نہیں۔

ابلیس کا سجدہ سے انکار کرنا اس تکبر کی بناء پر ان سے بہتر ہوں ان کو سجدہ کیوں کروں، یہ بھی اس کا موید ہے اگر وہ فقط سمت قبلہ کی حیثیت رکھتے ہوتے اور ان کی تعظیم اس میں مضمر نہ ہوتی تو ابلیس کی رگ حمیت کو کوئی جنبش نہ ہوتی۔

بے شک اسلام میں اس طریقہ تعظیم کا استعمال غیر اللہ کے لئے ممنوع ہو گیا ہے لیکن قبل الاسلام اس کی ممانعت نہ تھی [1]۔

ابلیس کے متعلق اسلام کا قطعی عقیدہ یہ ہے کہ وہ ایک مخلوقِ خاص کا نام ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور جس سے قرآن مجید کے مندرجہ واقعات حقیقی طور پر متعلق ہیں۔ اس کے خصوصیات جو قرآن کریم سے ثابت ہیں حسب ذیل ہیں:

وہ ایک مخلوق ہے جو آگ سے پیدا کیا گیا ہے (اعراف آیت ۱۲ وص آیت ۷۶)

وہ ذی شعور و ذی حیات ذات ہے جو سوچ، سمجھ، خیال اور گمان کے اوصاف سے متصف ہوتی ہے (سبا۔ ۲۰)

اسے قیامت تک کے لئے زندہ رہنے کا موقع دیا گیا ہے (سورۂ اعراف۔ ۱۴۔ سورۂ حجر۔ ۳۶ تا ۳۸۔ سورۂ ص۔ ۷۹ تا ۸۱)

---

[1] ۔ وکان سجود الملئکة لادم تکرمة لاٰدم وطاعة للہ لا عبادة لاٰدم (جامع البیان للطبری) اصح الا قوال ان لسجود کان بمعنی وضع الجبهة ولکن لا عبادة بل تکرمة وتحیة کالسلام (نیشاپوری)

اس کا ایک قبیلہ ہے جو حقیقت نوعیہ میں اس کے ساتھ شریک ہے ان کی صفت یہ ہے کہ وہ ہمیں دیکھتے ہیں ہم انہیں نہیں دیکھتے ان سب کو شیاطین کہتے ہیں (اعراف ۲۷)

اس کا قبیلہ اس کی نسل اولادی ہی کی ایک جماعت ہے جو افرادِ انسانی کو غلط راستوں پر لے جانے کی مہم میں مصروف رہتی ہے (کہف۔ ۵۰)

اطلاقات قرآنیہ پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابلیس ان میں سے اس فرد اول کا نام ہے جس سے حضرت آدمؑ ابوالبشر کے واقعات کا تعلق ہے اور الشیطان سے اکثر وہی مراد ہوتا ہے۔

ابلیس کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ فرشتہ نہ تھا بلکہ جنات میں سے تھا۔ شیخ مفید علیہ الرحمہ نے اس کے متعلق کہا ہے:

وقد جاءت به الاخبار المتواتر عن ائمة الھدٰی وھو مذھب الامامیة۔

اس کے متعلق رہنمایانِ دین سے متواتر حدیثیں وارد ہوئی ہیں اور یہ تمام علمائے امامیہ کا مذہب ہے۔

خود قرآن مجید میں بھی ایک جگہ آیا ہے:

اِلَّآ اِبۡلِيۡسَ ؕ كَانَ مِنَ الۡجِنِّ فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهٖ. (کہف ۵۰)

سوا ابلیس کے وہ جنات میں سے تھا تو اس نے اپنے پروردگار کے حکم کی مخالفت کی۔

اس آیت پر نظر ڈالنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن میں یہ تصریح اس ذہنی خلفشار کو دور کرنے کے لئے ہے کہ ملک ہو کر اس سے معصیت کا صدور کیوں کر ہوا اور اسی لئے فائے تفریع کے ساتھ اس پر مرتب کر کے کہا گیا ہے ففسق عن امر ربه وہ جن میں سے تھا لہٰذا اس نے حکم رب سے انحراف کیا بے شک وہ ملائکہ سے حقیقۃً خارج ہونے کے باوجود چوں کہ ظاہراً صفوف ملائکہ میں داخل تھا اس لئے اسجدوا کا حکم جو پوری جماعت سے متعلق قرار دیا گیا تھا اس میں وہ بھی شریک قرار پایا اور اسی لئے ملائکہ کی اطاعت کے ذکر کے بعد اسکی مخالفت کو بصورت استثناء بیان کیا گیا۔ یہ مخالفت کر کے اس نے اپنی اس رگ مخالفت کا اظہار کر دیا جو حقیقت نوعیہ میں نوع ملائکہ سے مغایرت کی وجہ سے اس میں موجود تھی اور اس کے بعد وہ ظاہری طور پر بھی جمعیت ملائکہ سے خارج کر دیا گیا۔

وَ كَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ کا فقرہ بھی بظاہر اس مفہوم کا حامل ہے کیوں کہ اس کے قبل ''انکار کیا'' اور تکبر سے کام لیا سب افعال حدوثی ہیں جو ایک امر کے اس وقت وقوع میں آنے کا اظہار کرتے ہیں اور وہ کافروں میں سے تھا یہ جملہ فعل ثبوتی پر مشتمل ہے جو صفت کے پہلے سے مستقل ثبوت کا پتہ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ از اول اس نوع میں داخل نہ تھا جس کی شان سے اطاعت ہی اطاعت ہوتی ہے بلکہ یہ اس نوع کا فرد تھا جو اس کے پہلے کفر وعناد اختیار کر چکی تھی یعنی جنات جن سے زمین کو پاک کیا گیا تھا۔ یہ صرف اپنے اس وقت تک کے شخصی کردار کی بدولت اس سے الگ کر کے ملائکہ کی جماعت میں پہنچا دیا گیا تھا مگر اب اپنے دوسرے ہم جنسوں کے ساتھ اس اشتراک فطرت کا جو اسے پہلے سے حاصل تھا ثبوت بہم پہنچا دیا۔

وَقُلۡنَا يٰۤاٰدَمُ اسۡكُنۡ اَنۡتَ وَزَوۡجُكَ الۡجَـنَّةَ وَكُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَيۡثُ شِئۡتُمَا ۖ وَلَا

تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

"اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں قیام کرو اور جیسا تمہارا جی چاہے اس میں سے مزے اور بے فکری کے ساتھ غذا حاصل کرو اور اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم حد سے قدم بڑھانے والوں میں سے ہو گے۔"

جنت میں آدم کا قیام اور ترک اولیٰ:

جَنّت لغت میں ہر گھنے باغ کو کہتے ہیں۔ آئمہ اہلؑ بیت کے متعدد احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے باغوں میں سے ایک تھا جس میں سورج اور چاند طالع ہوتے ہیں مگر اس کے بعد بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ اسی زمین کا ہو جب کہ نظامِ شمسی میں دوسرے سیّارات بھی ہیں جن کی فضا اور آب وہوا اس زمین سے زیادہ صالح ومتعدل سمجھی جاسکتی ہے[1]۔

بے شک خود قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے یہ یقینی طور پر ظاہر ہے کہ وہ جنت جہاں آدمؑ تھے اس زمین کے عوارض و اسقام سے بری تھی:

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ (سورة طه)

تمہارے لئے یہاں یہ ہے کہ تم بھوکے نہیں ہوتے اور برہنہ نہیں ہوتے اور نہ تمہیں پیاس لگتی ہے نہ بھوک کی تکلیف ہوتی ہے

اور اس آیت میں جس کی تشریح کی جارہی ہے "رغداً" کی لفظ سے بظاہر ان ہی خصوصیات کی طرف اشارہ ہے کہ زمین کی زندگی کے ساتھ محنت ومشقت دست وگریباں ہے۔ یہ بات اس جگہ نہیں تھی کہ جہاں آدمؑ کو رکھا گیا تھا۔

آدم کے ساتھ سکونت میں ان کی رفیق زندگی بھی شریک تھیں۔ جنہیں قرآن مجید نے ہر جگہ آدم کی اضافت کے ساتھ زوج کے لفظ سے یاد کیا ہے جیسے اردو میں زوجہ کہا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سلسلۂ اناث کی پہلی فرد جسے آدم کے لئے شریکِ حیات قرار دیا گیا تھا وجود میں آچکی تھی۔

ان کی خلقت کس طرح ہوئی تھی اور ان کا نام کیا تھا اس کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے روایات میں ان کا نام حواء وارد ہوا ہے۔

اس کے علاوہ جو چیز قرآن سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جنت میں ہر چیز سے غذا حاصل کرنے کی آزادی کے ساتھ انہیں کسی مخصوص درخت سے منع کیا گیا تھا کہ اس کے قریب نہ جانا۔

کلامِ عرب میں جس کی نظیریں قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر بھی موجود ہیں "قریب نہ جانا" کے لفظ کا استعمال کسی شے سے متعلق عمل سے ممانعت کے مفہوم میں ہوتا ہے جیسے:

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ. (بنی اسرائیل ۳۴)

---

[1]۔روی الكلينی وابن بابو به مسند او القمی مر فو عا عن ابی عبدالله ان جنة ادم من جنان الدنيا وهذا لا يستلزم كو نها فی الارض (البلاغی)

مال یتیم کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہتر سے بہتر ہو۔

وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيۡلًا ۝۳۲. (بنی اسرائیل)

اور زنا کاری کے پاس نہ جاؤ یہ بڑا شرمناک کام ہے اور بہت برا راستہ ہے۔

وَلَا تَقۡرَبُوۡهُنَّ حَتّٰى يَطۡهُرۡنَ. (بقرہ ۲۲۳)

ان عورتوں کے پاس نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں۔

لہٰذا یہاں کلا منہا رغدا ''اس سے بآرام کھاؤ'' کے بعد بقرینہ سیاق ولاتقرباء سے مراد اس درخت سے کھانے کی ممانعت ہے۔

یہ درخت کون سا تھا؟ ھذہ الشجرۃ ''اس درخت'' کہنے سے ظاہر ہے کہ حضرت آدمؑ کے لئے مخصوص طریقہ پر اس درخت کی تعیین ہوگئی تھی مگر اشارہ کے ساتھ تعیین کا خاصہ یہ ہے کہ مقصود صرف لفظوں سے معیّن نہیں ہوا کرتا۔ اس میں کوئی عمل جو مفید اشارہ ہو ضرور دخیل ہوتا ہے۔ اسے مخاطب اسی عمل کی مدد سے سمجھا کرتا ہے مگر دوسروں کے لئے جب کہ حکایت صرف الفاظ کی کردی گئی ہو یا تحریر میں صرف الفاظ آجائیں تو اس کا سمجھنا کلام سے غیر ممکن ہو جایا کرتا ہے اور ایسے ہی وہ مقامات ہیں جہاں نمایاں طور پر کتاب کا غیر کافی ہونا ثابت ہوتا ہے ایسے مقامات پر تفسیر و تشریح کی طرف تشنگی بالکل بدیہی حیثیت رکھتی ہے۔ اب اگر روایات اس بارے میں مختلف ہوگئے تو پھر اس کی تعیین کا کوئی ذریعہ ہے بھی نہیں اور وہ کچھ ضروری بھی نہیں جبکہ ہمارے ایمان و عمل کا اس کے سمجھنے سے کوئی تعلق نہیں [1]۔

جس چیز کا سمجھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ یہ نہی کس قسم کی تھی اس کیلئے تحقیق یہ ہے کہ نہی مولوی نہ تھی بلکہ ارشادی تھی۔ نہی مولوی وہ ہے جو بحیثیت حاکم قانونی طور پر کی گئی ہو۔ اس کی مخالفت میں سزا کا استحقاق ہوتا ہے اور اسی کی مخالفت کا نام گناہ ہے جو عصمت انبیاء کے خلاف ہے اور نہی ارشادی کی حیثیت ایک ''ناصحانہ مشورہ'' کی ہوتی ہے جس کی مخالفت میں کچھ قہری مضرتین مضمر ہوتی ہیں جنہیں سزا نہیں بلکہ عمل کا صرف نتیجہ سمجھا جاسکتا ہے جیسے طبیب کا مریض کو کہنا کہ فلاں فلاں چیز نہ کھانا اب اگر اس نے کھایا اور نقصان ہوا تو یہ کہنا درست نہیں ہے کہ طبیب نے مخالفت کی سزا دی جو یہ ان تکالیف میں مبتلا ہوا بلکہ طبیب نے اپنے علم کی بناء پر جن مضرتوں کی خبردے دی تھی وہ اس امر پر مرتب ہوئیں جو درحقیقت اس عمل کا لازمی نتیجہ تھیں۔

قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ بتایا ہے کہ حضرت آدمؑ کو جو ممانعت کی گئی تھی تو پہلے سے اس کی مخالفت کے نتائج بتادیئے تھے اس طرح کہ ابلیس کی عداوت پر انہیں متنبہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا تھا: لا یخر جنکما من الجنة فتشقی ان لك الا تجوع فیها و لا تعرٰی انك لا تظمأ فیها و لا تضحٰی دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو بہشت سے نکالنے کا باعث ہو جائے جس کی وجہ سے تم مشقت میں گرفتار ہو جاؤ۔ یہاں تو تمہارے لئے ہے کہ تم بھوکے نہیں ہوتے برہنہ نہیں ہوتے پیاس نہیں لگتی اور تمہیں دھوپ کی تکلیف پیش نہیں آتی اسی سے ظاہر ہے کہ یہ نہی مولوی نہیں ہے اب جب کہ ایک جگہ نتائج کی تفصیل موجود ہے تو زیر نظر آیت میں فتکونا من الظالمین کے اجمال کو بھی اسی مفہوم کا

---

[1] ۔الم یضع لعبادہ دلیلا علیٰ ذلك فی القراٰن ولا فی السنة الصحیحة (طبری) ولا علم لنا بایّة شجرة كانت علی التعیین فلا حاجة ایضا الیٰ بیانه (رازی)

حامل ماننا پڑے گا۔

ظلم کے معنی لغت میں وضع الشئی فی غیر محلّه کے ہیں اور قرآن کریم نے اس کی جامع تعریف کر دی ہے کہ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ یعنی ''اللہ کی مقرر کردہ حدوں سے قدم آگے بڑھانے والے ظالمین ہیں'' لیکن حد کو دیکھنا پڑے گا کہ وہ بطور وجوب والزام قرار دی گئی ہے یا بطور ندب واستحباب یا بحیثیت ارشاد اس اعتبار سے ظلم کا حکم مختلف ہو جائے گا وہ ظلم جو حد وجوبی سے تجاوز کی صورت میں ہو گناہ ہوگا اور جو کسی دوسری قسم کی حد سے تجاوز ہو وہ زیادہ سے زیادہ ''ترک اولیٰ'' کا مصداق قرار پاسکتا ہے گناہ نہ ہوگا جو عصمت کے منافی ہو[1]۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝٣٦

''اس کے بعد شیطان نے ان کا قدم پھسلا کر وہاں سے ہٹانے کا سامان کیا تو انہیں جس میں وہ تھے اس سے نکلوا دیا اور ہم نے کہا کہ اتر جاؤ تم میں ایک کا ایک دشمن ہوگا اور تمہیں زمین پر ٹھہرنے اور ایک میعاد تک فائدہ اٹھانے کا موقع ہوگا۔''

شیطان سے مراد وہی ابلیس ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے وہ اس کا نام تھا یہ اس کا وصف ہے جو اب اس کی شرارت کے ظہور کے بعد اس کے لئے ہمیشہ کے واسطے ثابت ہو گیا[2]۔

زلّ کے معنی قدم کا پھسلنا اور ازلّ کے معنی ہیں ''پھسلایا'' اس کے مفہوم میں یہ مضمر ہے کہ اس عمل میں مخالفت الٰہی کا قصد وارادہ نہ تھا اب پھسلنے میں چوں کہ ایک جگہ سے ہٹنے کا تصور شریک ہے اس لئے اس کے متعلق عنها کے لفظ سے ذکر کیا گیا یہ ضمیر جنت کی طرف راجع ہے[3]۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ شیطان کے کہنے سے جو کچھ ضرر مترتب ہوا وہ بس جنت سے ہٹنا تھا۔ یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ وہ نہی جس کی مخالفت ہوئی ''ارشادی'' تھی نہی مولوی نہ تھی ورنہ اس کے نتیجہ میں سب سے بڑی چیز مالک کی ناراضی بیان ہونا چاہیے تھی۔ اور اسی نقصان ومضرّت کی پھر تشریح یہ کی گئی کہ اس عیش وآرام سے جس میں وہ تھے شیطان ان کے نکلنے کا باعث ہو گیا یہی وہ مضرت تھی جس سے بچانے کے لئے وہ ممانعت ہوئی تھی اور اس کی تکمیل اس حکم الٰہی سے ہوگئی کہ اترو بس اب زمین پر تمہیں ایک مدت تک رہنا اور عمر گزارنا ہوگا۔

---

[1]۔ والنهى فى لا تقر باللتنزية اوللتحريم الاصح الاول. ليرجع حاصل معصية الى ترك الاولىٰ فيكون اقرب الىٰ عصمة الانبياء (نيشا پوری) والنهى هٰهنا للارشاد لا للتحريم (فتكونا من الظالمين) لا نفسكما بالخروج من النعيم الى التعب ومثل هٰذا الظلم لا يستوجب ذما ولا يعد ذنبا (بلاغى)

[2]۔ الشيطان فيعال من شطن اى بعد سمى به لبعده عن الخير وعن الرحمة (بغوى)

[3]۔ ازلهما عن الجنة بمعنى... ابعدهما منها. فان الازلال والازلاق يقتضى زوال الزّال عن موضوع البتة (ابوالسعود)

اس کا ظاہری مفہوم اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ وہ جنت زمین پر نہ تھی۔

اس شیطان کی وسوسہ انگیزی کے پہلے ضمیریں تثنیہ کی تھیں ''دونوں اس جگہ رہو' دونوں جس طرح چاہیے کھاؤ پیو' دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا'' نہیں تو تم دونوں ظالموں میں سے ہوگے ---ان کے مخاطب حضرت آدمؑ وحضرت حواؑ تھے۔اب ابلیس کا ذکر آ گیا تو تین ہو گئے اس لئے اهبطوا اترو اور بعضكم لبعض عدو تم میں ایک کا ایک دشمن ہو گا۔جمع کی ضمیریں صرف ہوئی ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سجدہ نہ کرنے کے بعد شیطان مجمع ملائکہ سے تو خارج کر دیا گیا تھا مگر مکانی طور پر عالم اعلیٰ سے نکالا نہیں گیا تھا اور اسی لئے اس جنت میں آدمؑ وحواؑ تک پہنچ سکا۔اب اس وسوسہ انگیزی کے بعد اس کو مکانی طور پر بھی وہاں سے نکالا گیا جو اس کے لئے تو بطور سزا ہی تھا کیوں کہ وسوسہ انگیزی اس کا بطور شرارت ارادی فعل تھا اور آدمؑ وحوا کیلئے یہ ان کے فعل کا لازمی نتیجہ تھا جسے مرتب ہونا اب ضروری تھا اتنی وہ باتیں ہیں جو قرآن کریم سے ثابت ہوسکتی ہیں اس کے آگے جو تفاصیل روایات میں درج ہیں ان کی حقیقت مولوی عبدالماجد دریابادی کے قلم سے سنیئے وہ لکھتے ہیں:

''بائبل میں ہے کہ یہ بہکانے والا سانپ کی صورت میں گیا ،اس نے آ کر پہلے حضرت حواؑ کو بہکایا اور پھر انہوں نے حضرت آدمؑ کو بھی ترغیب کی ہمارے مفسرین نے بھی ایک طویل قصہ نقل کیا ہے جس میں شیطان سانپ طاؤس سب کا ذکر آتا ہے۔ یہ قصہ بجائے خود کہاں تک صحیح ہے اس سے یہاں بحث نہیں کہنا صرف یہ ہے کہ یہ اسلامی عقائد میں بہرحال داخل نہیں اور اس کا آخذ قرآن وسنت نہیں بلکہ اسرائیلی روایات ہیں جو اہل تفسیر زیادہ محتاط ومحقق ہوئے ہیں وہ اس سے الگ ہی رہے ہیں بلکہ اس سے احتیاط ہی کی تنبیہ کی گئی ہے:

اعلم ان هذا و امثاله مما يجب ان لا يلتفت اليه[1] (كبير) و قد اكثر المفسرون فى نقل قصص كثيرة فى قصة ادم و حوا و الحية والله اعلم بذلك[2] (بحر) و قد ذكر المفسدون ههنا اخبار اسرائيلية[3] (ابن كثير)

علامہ بلاغیؒ نے لکھا ہے:

قد رويت فى كيفية وصوله اليها والوسوسة والمخاطبة بالاغواء روايات لم تصح.(آلاء الرحمن)

شیطان حضرت آدمؑ اور حضرت حواءؑ تک کیوں کر پہنچا اور وسوسہ انگیزی کس طرح کی اور کہاں انہیں ورغلایا اس سب کے بارے میں ایسی روایتیں آئی ہیں جو پایہ صحت تک پہنچی ہوئی نہیں ہیں۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

''اس کے بعد آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھ لئے تو اس نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا بہت مہربان ہے۔''

---

[1]۔معلوم ہونا چاہیے کہ یہ اور ایسی روایتیں وہ ہیں جن کی طرف توجہ نہ کرنا واجب ہے۔

[2]۔مفسرین نے بکثرت قصے آدم اور حوا اور سانپ کے بارے میں درج کیے ہیں اور حقیقت حال سے بس اللہ واقف ہے۔

[3]۔مفسرین نے یہاں بہت سی اسرائیلی روایتیں درج کردی ہیں۔

توبہ اور اس کی نوعیت:

درخت کے قریب جانے سے ممانعت جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا اگرچہ مولوی نہ تھی، ارشادی تھی مگر اس قسم کی بھی خالق کی ہدایت سے عملی انحراف ایک بلند درجۂ اطاعت کے لحاظ سے پست ضرور تھا اور اس معنی سے اسے ترک اولیٰ کہنا درست ہے اور اسی لئے وہ اگرچہ اصطلاحی گناہ نہیں جو منافی عصمت ہو مگر ایک نبی کو اس بلند تر درجہ سے اپنے پیچھے ثابت ہونے کا احساس اتنا ہی کرب اور بے چینی سے مبتلا کرتا ہے جتنا ایک واقعی گنہ گار کو اس کا گناہ بلکہ یہ گنہ گار چوں کہ اپنے ضمیر میں اتنی بیداری نہیں رکھتا اور اس کی نگاہ میں عظمت معبود کا اتنا احساس نہیں اس لئے یہ اتنی تڑپ محسوس نہیں کرتا جتنا خالق کا ایک معصوم بندہ صرف کسی مستحب کے ترک ہونے بلکہ بسا اوقات اپنے ذوق وحوصلہ اور ولولۂ اطاعت کے درجہ تک عبادت سے قاصر رہنے کی وجہ سے تڑپ محسوس کرتا ہے۔

اب اگر بندہ واقعی گنہ گار ہوتا تو خالق کی ناراضگی نگاہ مرحمت کو اس سے ہٹائے ہوئے ہوئی۔ اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ خود اس کی طرف متوجہ ہو کر اسے توبہ کا کوئی ذریعہ بتائے۔

یوں عمومی طور پر عفو گناہان کے لئے دعاؤں کا وارد ہو جانا اور چیز ہے اور کسی بندہ کی طرف خصوصیت کے ساتھ نگاہ توجہ الٰہی کا مبذول ہونا اور چیز ہے یہ توجہ تو خود بتاتی ہے کہ بندہ حقیقی معنی میں گنہ گار نہیں ہے صرف ذوق عبودیت کی بلندی سے بارگاہ الٰہی میں اپنے مجرم ہونے کا تصور قائم کر کے دل میں کڑھ رہا ہے، پریشان ہے اور ایک اضطراب محسوس کر رہا ہے اس لئے خداوند کریم کا لطف خصوصی اور تفضّل امتیازی اس بندہ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی تسلی کا سامان بہم پہنچاتا ہے اس طرح کہ اسے خود کچھ انداز توبہ سکھاتا ہے کہ اچھا تم سے اگر کچھ کمی ہوئی ہے جس سے تم اپنے کو مجرم محسوس کرتے ہو تو یہ میرا بتایا ہوا انداز اختیار کرو پھر اس کے بعد جو کمی تم سے ہوئی تھی وہ کالعدم ہو جائے گی اسی کو کہتے ہیں توبہ کا قبول ہونا۔

اب اس توجہ باری کو دیکھ کر اور اس ہدایت ربانی پر عمل کر کے اس عبد الٰہی کو گونہ سکون محسوس ہوتا ہے اور یہ خالق کی عنایت اس کے زخم پر پھاہا رکھ کر اب آیندہ زندگی میں ایک بلند تر معیار طاعت وعبادت کی عملی پابندی کے لئے اسے ذوق وشوق اور نیا حوصلہ بخشنے میں مددگار ہوتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ یہاں نہ حقیقت میں گناہ تھا اور نہ گناہ سے توبہ اور اس کی قبولیت بلکہ صرف وہ آدمؑ کی جلالت کے لحاظ سے ایک بلند تر مرتبہ سے پیچھے رہنا تھا اور اسی کے شدت احساس کے ساتھ آیندہ سے اس سے باز رہنے کا عزم توبہ تھا اور خالق کی طرف سے ان کو اپنی پوری مہربانی وعنایت کے استحقاق کی اطمینان دہانی قبولِ توبہ ہے۔

اس سے سیاق کلام ربانی میں ایک طرح کے اختلاف اسلوب کا راز معلوم ہوگا وہ یہ کہ ممانعت جو درخت کے پاس جانے سے ہوئی تھی اس میں آدمؑ اور حواؑ دونوں شریک تھے اور وہاں صیغے تثنیہ کے صرف ہوئے تھے مگر اس کے بعد توبہ کے لئے الفاظ سیکھنے سکھانے اور اس کے بعد توبہ کی قبولیت کے محل پر صرف آدمؑ کا نام لیا گیا اور مفرد ہی صیغے صرف ہوئے اس کا کیا سبب ہے؟ سبب یہی ہے کہ اگر وہ قانونی گناہ ہوتا تو قانون چوں کہ عام ہوتا ہے اس لئے جرم مشترک ہوتا اور توبہ اور اس کی قبولیت دونوں کے لئے ضروری ہوتی مگر چوں کہ وہ گناہ تھا ہی نہیں بلکہ ترک اولیٰ تھا صرف آدمؑ کی جلالت قدر کے لحاظ سے اور قبول توبہ اسی احساس کے مقابلہ میں تسلی دہانی تھی، اس لئے ان چیزوں کا تعلق صرف آدمؑ سے رہا۔ ترک اولیٰ جناب آدمؑ کا تھا اس پر اضطراب اور بے چینی اور جیسا کہ روایات میں ہے شدت گریہ سب آدمؑ کے لئے ہوا اور اسی لئے الفاظ توبہ سکھانے کی ضرورت آدمؑ کو ہوئی اور قبولِ توبہ کی تصریح بھی ان کی نسبت ہوئی یہ اور بات ہے کہ جب آدمؑ نے الفاظ سیکھ لئے تو حواؑ کو بھی سکھا دئے ہوں اور دونوں

نے زبان پر جاری کر لئے ہوں جیسا کہ دوسری جگہ ہے قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا٘ وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۲۳﴾ (اعراف) یا ہم کہیں کہ حوا بھی طبقہ خواتین میں کسی خاص درجہ رہنمائی پر فائز تھیں۔اس لئے وہ کسی حد تک ان کے لئے بھی ترک اولیٰ تھا اور اس لئے انہیں اتنی بے چینی نہ سہی جو حضرت آدمؑ کو تھی پھر بھی انفعال ہوا اور انہوں نے الفاظ توبہ کے ادا کرنے میں آدمؑ کے ساتھ شرکت کی۔

قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا مِنۡهَا جَمِيۡعًا ۚ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾

”ہم نے کہا تم سب اس سے اتر جاؤ۔اس کے بعد اگر میری طرف سے تمہاری جانب کوئی ہدایت پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ انہیں رنج پہنچے گا۔“

قبول توبہ کے بعد پھر بھی اترنے کا حکم ہونا اس کی دلیل قوی ہے کہ زمین پر اتارا جانا آدمؑ وحواّء کے لئے بطور سزائے جرم نہ تھا۔ورنہ قبول توبہ کا اعلان ہو چکنے کے بعد پھر سزا کے برقرار رہنے کے کوئی معنی نہیں۔

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ سزا نہیں تھی بلکہ درخت کے قریب جانے کا لازمی اثر تھا جس کا مرتب ہونا بہر حال ضروری تھا اور واقعہ تو یہ ہے کہ آدمؑ اسی زمین کی خاطر پیدا ہی ہوئے تھے جیسا کہ خلقت کے پہلے ہی ملائکہ کو خبر یہی دی گئی تھی کہ انی جاعل فی الارض خلیفة میں زمین میں جانشین قرار دینے والا ہوں“۔درخت سے تناول کر لینا زمین پر بھیجے جانے کا فوری سبب ہو گیا اور اگر یہ سبب وقوع میں نہ آتا تو کچھ مدت تک اور جنت میں رہنے دیا جاتا مگر آخر میں پھر اس زمین پر بھیجے جاتے جس سے ان کے مقصدِ خلقت کی تکمیل بہرحال وابستہ تھی۔

اب قلنا اھبطوا کے بعد جو خطاب ہے وہ آدمؑ اور حواؑ کو سامنے رکھ کر اس پوری نوع سے ہے جو ان کی ذریت میں سے اس معمورہ ارض کو نسلاً بعد نسلٍ آباد کرے گی۔اور اب اس حکم سے قوانین تکلیفیہ کا آغاز ہو رہا ہے جس کے ساتھ جزا وسزا کا وعدہ ووعید بھی موجود ہے یعنی نوعِ انسانی کے سامنے انبیاء ومرسلین کی زبانی جو تعلیمات پہنچتے رہیں گے ان کی جو اطاعت کریں گے انہیں نجات حاصل ہوگی۔

نجات کے مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ انہیں خوف اور رنج درپیش نہ ہوگا اس کا خوف ورنجِ دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بالمقابل جو کفر اختیار کریں گے ان کے ذکر میں آیندہ آیت میں آگ میں ہمیشہ رہنے کا ذکر ہے وہ یقیناً آخرت سے متعلق ہے اسی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ خوف اور رنج کی نفی جو اہل ایمان سے کی گئی ہے یہ بھی آخرت سے متعلق ہے ورنہ دنیا میں تو صاحبان ایمان اکثر و بیشتر خوف ورنج میں مبتلا رہتے ہیں۔

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۳۹﴾

”اور جو کفر اختیار کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے یہ دوزخ والے ہوں گے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔“

نار کے معنی تو مطلق آگ کے ہیں مگر اس پر ال عهد خارجی کا ہے جس سے اشارہ اس خاص آگ کی طرف ہوتا ہے جو آخرت کے

عذاب کے لئے الٰہی مخبروں نے بتائی ہے جسے اصطلاحاً جہنم کہا جاتا ہے اور اس کا ترجمہ دوزخ کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ مولوی عبدالماجد صاحب نے لکھا ہے اس آگ کا ذکر سابقہ کتب سماویہ میں بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے جیسے فرشتے نکلیں گے اور شریروں کو راست بازوں سے جدا کر دیں گے اور انہیں آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے وہاں رونا اور دانتوں کا پیسنا ہوگا۔ (متی ۱۳: ۹ ۴ و ۵۰)

اے ملعونو! میرے سامنے سے اس ہمیشہ کی آگ میں چلے جاؤ جو ابلیس اور اس کے تابعین کے لئے تیار کی گئی ہے اور یہ ہمیشہ کی سزا پائیں گے (متی ۲۵: ۱۴ و ۴۶)

”جہنم میں ڈالا جائے جہاں اس کا کیڑا نہیں مارتا اور آگ نہیں بجھتی (مرقس ۹: ۴۸)

یہی دونوں باتیں کہ اس آگ میں داخل ہونے والے کے لئے پھر موت نہیں جو اس عذاب کو ختم کر دے اور نہ وہ آگ خود بجھنے والی ہے کہ اس سے کبھی نجات حاصل ہو سکے قرآن کریم میں خالدون کے لفظ سے ادا کی گئی ہیں۔

یہ خلود جنت اور جہنم دونوں کا وصف ہے وہاں کی نعمت ختم ہونے والی نہیں اور یہاں کا عذاب ہاں جہنم سے کچھ اشخاص کو جن کی معصیت حد کفر تک نہیں پہنچتی ہے میعادی سزا بھی دی جائے گی اور بقدر گناہ اس سزا کے ختم ہونے کے بعد وہ بہشت میں جو ان کی اصلی جگہ سے ہمیشہ کے لئے داخل کر دیے جائیں گے یہ لوگ دراصل اصحاب النار کی لفظ کے مستحق ہیں ہی نہیں کیوں کہ یہ عذاب ان کے لئے ان کی دنیا کی بہت سی تکلیفوں کی طرح ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے انجام آخر کے اعتبار سے انہیں اصحاب الجنۃ ہی سمجھنا درست ہے اور اسی لئے کفر او رتکذیب کرنے والوں کے ذکر کے ساتھ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ کے لفظ کہے گئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یوں وقتی طور پر عذاب جہنم سے چاہے کچھ اور لوگوں کو بھی سزا یاب بنا دیا جائے مگر اصلی تعلق رکھنے والے دوزخ کے ساتھ یہی لوگ ہیں جنہوں نے جان بوجھ کر کفر اختیار کیا اور آیات الٰہیہ کی تکذیب کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِىْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّاىَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾

”اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جس سے میں نے تمہیں نوازا اور مجھ سے جو معاہدہ ہے اسے پورا کرو تو میں تم سے معاہدہ پورا کروں اور اس کے بعد مجھ سے ڈرتے رہو۔“

بنی اسرائیل اور ان کا کردار:

حضرت ابراہیم خلیلؑ کے فرزند اسحٰقؑ کے بعد ان کے فرزند یعقوبؑ ہوئے جو اسرائیل کہلائے عبرانی میں ایل کی لفظ اللہ کے لئے آتا ہے اور اسی وجہ سے ملائکہ کے ناموں میں یہ لفظ آیا کرتا ہے جیسے جبرائیلؑ، عزرائیلؑ، اسرافیلؑ وغیرہ۔ اس سے اس طرح کی اضافت نکلتی ہے جیسے عبداللہ قدرۃ اللہ وغیرہ اسراء کے معنی قوۃ کے تھے اور اس طرح اسرائیل کے معنی ہوئے ”اللہ کی قوت“۔

اس لقب کے ساتھ انکا تعارف صرف بطور نسبت اظہار شرف کے لئے ہوسکتا ہے جیسے آدمؑ کے لئے صفی اللہ، شیث علیہ السلام کے ہبتہ اللہ نوحؑ کے لئے نجی اللہ وغیرہ کے القاب لیکن اس لقب کے ساتھ ملقب ہونے کی تقریب کے طور پر مروجہ توریت میں ایک خرافتی حکایت درج کی گئی ہے جس میں یعقوبؑ کا خدا کے ساتھ کشتی لڑنا مذکور ہے۔ یہ حکایت بالکل بے بنیاد اور یہود کی اختراع کردہ ہے جو جلال الٰہی کے بالکل خلاف ہے۔

بنی اسرائیل صدیوں تک دنیا میں بڑے عروج کی منزل پر رہے انہیں اللہ نے اپنی جس نعمت سے نوازا اس کی ذرا تفصیل دوسری جگہ قرآن میں حضرت موسیٰؑ کی زبان درج ہوئی ہے:

وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ جَعَلَ فِيۡكُمۡ اَنۡۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمۡ مُّلُوۡكًا ‌ۖ وَّاٰتٰٮكُمۡ مَّا لَمۡ يُؤۡتِ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ‏ ﴿۲۰﴾ (مائدہ)

اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اے قوم والو یاد کرو اللہ کی اس نعمت کو جو تم پر ہے جب کہ اس نے تم میں پیغمبر بنائے اور تمہیں بادشاہ بنایا اور تم کو وہ دیا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا۔"

ان کے خالق نے اور جو خصوصی فضل واحسان کے مظاہرے فرمائے ہیں اوران کے ساتھ جو جو رعایتیں ہوئی ہیں ان کا ذکر اسی سورہ بقرہ میں بہت دور تک جستہ جستہ آتا رہے گا مگران تمام نعمتوں، ان تمام احسانوں اور رعایتوں کے باوجود اس قوم کی اکثریت برابر خالق کی نافرمانی کرتی رہی اور چند دفعہ ایسا ہوا کہ من حیث القوم سب کے سب مرتد ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ باوجودیکہ صدہا برس تک انبیاء اس قوم میں ہوتے رہے آخر میں نبوت کی نعمت اس سے سلب ہوگئی اور آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو مبعوث ہوئے وہ آل ابراہیم کی دوسری شاخ یعنی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہوئے۔ یہ چیز بنی اسرائیل کے لئے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔

زمانہ نزولِ قرآن میں یہ بنی اسرائیل دو مذہبوں میں تقسیم تھے۔ ایک یہود جو حضرت موسیٰؑ تک مانتے تھے اور عیسیٰؑ کے قائل نہ تھے دوسرے نصاریٰ جو حضرت عیسیٰؑ کو رسالت کی منزل سے گزار کر خدا یا خدا کے بیٹے کی حد تک مانتے تھے۔ اسلام سے ان دونوں قوموں کو علاوہ مذہبی اختلاف کے یہ جذباتی تعصب بھی تھا کہ یہ رسول ہماری قوم سے نہیں آیا ہے بلکہ بنی اسماعیل سے آیا ہے جو روایات قدیمہ کے بالکل خلاف ہے اس آیت میں قرآن مجید نے اسی کا جواب دیا ہے اور کہا ہے کہ ذرا میرے احسانات کو یاد کرو کہ تمہارے ساتھ میں نے کیا کیا حسن سلوک کیا اس کے ساتھ تم نے ہمیشہ کفران نعمت اختیار کیا پھر اب اگر ایک دوسری قوم کی نوازش نعمت وفضلِ نبوت کے ساتھ ہوگئی تو اس پر چراغ پا کیوں ہوتے ہو؟

پھر یہ کہ خود تمہارے انبیاء نے جنہیں تم اپنا رہنما جانتے ہو پہلے ہی میری طرف سے تم کو یہ خبر پہنچا دی تھی کہ آخر زمانہ میں اولاد اسمٰعیلؑ سے ایک نبی پیدا کروں گا۔ اب وہ نبی آیا ہے تو مجھ سے اپنے اس عہد کو پورا کرو کہ اس کی اطاعت کرو گے پھر مجھ سے اس کے بعد اپنے لئے بھی نوازش واکرام کے عہد کو پورا کرنے کے متوقع ہونا۔ اور جب ایسا نہیں ہے تم کفران نعمت کرتے رہے اب عہد شکنی کررہے ہو تو پھر مجھ سے تم کسی خوشگوار نتیجہ کا مطالبہ کیوں کرتے ہو تمہیں تو اب مجھ سے ڈرتے ہی رہنا چاہیے۔

اس سے ایک عام اصول مستفاد ہوتا ہے کہ اگر انسان خدا کے ساتھ اپنے فریضہ کی تکمیل نہیں کرتا تو اسے حق بھی نہیں کہ وہ اللہ سے اس کے کسی وعدے کی تکمیل کا مطالبہ کرے اسی لئے امام جعفر صادقؑ نے اس آیت کو پیش فرمایا اس شخص کے جواب میں جس نے پوچھا تھا کہ خدا نے

قبولیت دعا کا وعدہ کیا ہے پھر ہم دعائیں کرتے ہیں تو وہ کیوں نہیں قبول ہوتیں آپ نے فرمایا:

انکم لا تفون لله بعهده فانه تعالیٰ بقول اوفوا بعهدی اوف بعهدکم والله لو وفيتم لله سبحانه لوفی لکم (صافی)

(یعنی) تم اللہ سے وہ عہد جو اس نے تم سے لیا ہے پورا نہیں کرتے خود اس نے ارشاد کیا ہے کہ تم میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا۔ اگر تم اللہ سے وعدہ وفائی کرتے تو وہ بھی تم سے ایفائے وعدہ کرتا[1]۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

"اور اس پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کیا ہے تصدیق کرتا ہوا اس کی جو تمہارے پاس ہے اور اس کے اول نمبر کے منکر نہ بنو اور میری آیتوں کو ذراسی قیمت پر ہاتھ سے نہ دے دو ورنہ پھر مجھ سے بچاؤ کی فکر کرو"۔

"اس پر جواب نازل کیا ہے"۔ اس سے مراد قرآن ہے اور جو تمہارے پاس موجود ہے اس سے مراد توریت ہے مطلب یہ ہے کہ اس نبی اور اس کی زبان پر کلام الٰہی اتارے جانے کی اطلاع تو خود توریت میں موجود ہے۔ یہ کتاب تو اس کی سچائی کا عملی ثبوت ہے تو تمہیں تو اس پر اول درجہ کا مومن ہونا چاہیے نہ یہ کہ تم ہی اس کے اول درجہ کے کافر نظر آؤ۔

چوں کہ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت اور قریش کی شکستوں کے بعد اب سب سے بڑے منکر قرآنی صداقت کے یہود ہی نظر آرہے تھے اور واقعہ یہ تھا کہ وہ اس وقت اول درجہ کے کافر بنے ہوئے تھے اس لئے یہ کہا گیا کہ بجائے اول درجہ کے مومن ہونے کے تم اتنی شدت سے کافر کیوں ہو یہ کوئی قید احترازی نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے کافر نہ بنو دوسرے کافر ہوں تو کوئی ہرج نہیں[2]۔

اسی طرح یہ کہ "میری آیتوں کو ذراسی قیمت پر ہاتھ سے نہ دے دو"۔ اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ بہت قیمت ملے تو دے دو بلکہ واقعہ یہ تھا کہ علمائے اہل کتاب ذرا ذرا سے نفع کی خاطر احکام الٰہیہ میں تحریف کرتے تھے تو ان کے عمل کی جو حقیقی صورت تھی اس کی رکاکت اور پستی دکھانے کے لئے یہ الفاظ صرف کیے گئے ہیں پھر یہ کہ آیات الٰہیہ پر عمل میں جو بلند مفاد وابستہ ہے اس کے لحاظ سے اس کے مقابلہ میں جو بڑی سے

---

[1]۔ ويوحذ منالاية قاعدة كلية وهى ان من لم يف بعهد الله فيما اخذه من الدين والشريعة فهو بنفسه قد نقض عهد الله معه وخرج عن كونه اهلا لما وعدبه من اللطف والرحمة واستجابة الدعاء (البلاغى)

[2]۔ (اول كافر) اوّل من يعدّ من الكافرين وذلك لفاحش كفر كم بعد قيام الحجة عليكم من وجوه عديدة يقال لكثير الكذب وشديد الفسق اول كاذب واول فاسق اى اول من بعد من الكذبين ومن الفاسقين (البلاغى) ليس فى نهيه عن ان يكونوا اول كافر به دلالة على انه يجوز ان يكونوا آخر كافر به. كما قال الشاعر من انس ليس فى اخلاقهم عاجل الفحش ولا سوء الجزع وليس يريد ان فيهم فحشاً آجلا (مجمع البيان)

بڑی قیمت بھی وہ حاصل کریں گے "ثمن قلیل"[۱] ہی ہوگی۔

آخر میں وایای فاتقون کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے اس طرز عمل پر قائم رہو گے تو پھر تمہارے لئے میرے عذاب کا استحقاق یقینی ہے اب اگر کر سکتے ہو تو اس سے بچاؤ کی فکر کر لو۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾

"اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور نہ حق کو چھپاؤ حالانکہ تم جانتے بھی ہو"۔

امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالبؑ نے نہج البلاغہ میں مندرج ایک کلام کے ذیل میں فرمایا ہے:

فلو ان الباطل خلص من مزاح الحق لم يخف على المرتادين ولو ان الحق خلص من الباطل انقطعت عنه السنّ المعاندين ولكن يؤخذ من هٰذا ضغث ومن هٰذا ضغث فيمزجان ويخرجان معا فهنالك يستولى الشيطان علىٰ اوليائه.

اگر باطل حق کی آمیزش سے صاف ہو تو طلب گاروں پر پوشیدہ نہ رہے اور اگر حق باطل سے الگ ہو تو معاندین کی زبانیں اس پر نکتہ چینی سے بند ہو جائیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ ایک مٹھا اس کا لیا جاتا ہے اور ایک مٹھا اس کا اور دونوں کو ملا جلا دیا جاتا ہے اور اس طرح ایک ساتھ سامنے لایا جاتا ہے تو اب نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شیطان اپنے حوالی موالی پر قابو پا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ نرا کھرا جھوٹ ہو تو اتنا خطرناک نہیں ہے جتنا وہ جھوٹ جس میں سچائی کا شائبہ بھی شریک ہو۔ سیاست دان مخالف اکثر اسی طرح کا جھوٹ بولا کرتے ہیں چنانچہ اس وقت بھی رسولؐ کے مقابلہ میں ایسا ہی کرتے تھے مثلاً اہل کتاب کبھی یہ کہہ دیتے تھے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیغمبر بحق ہیں لیکن اولاد اسمٰعیلؑ اور قریش کے لئے ہیں۔ ہم سے کیا مطلب اس کی صدائے بازگشت آج کل بعض تعلیم یافتہ ارباب وطن کے دہن سے بلند ہوتی ہے ان الفاظ میں کہ محمدؐ صاحب ملک عرب کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور سچے رسول تھے یا کچھ نام نہاد مسلمان یہ کہتے ہیں کہ روزہ نماز وغیرہ کے احکام عرب کے ماحول اور اس زمانہ کی فضا کے لحاظ سے تھے۔ اب ہم سے ان کا تعلق نہیں ہے ایسی ہی باتوں پر قرآن مجید نے یہ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ حق کو باطل سے نہ ملاؤ[۲]۔

لبس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جن الفاظ میں حقیقت پنہاں ہے ان کے معانی بدل کر حقیقت کو مشتبہ بنایا جائے۔ اس میں علمائے اہل کتاب ید طولیٰ رکھتے تھے بشارتین بعثت محمد مصطفیٰؐ کی باوجود ہزاروں لفظی تحریفوں کے بھی آج تک توریت اور انجیل میں موجود ہیں مگر علمائے اہل کتاب نے الفاظ کے معنی بدل کر اپنی جماعت کو باطل کے شکنجہ سے ہمیشہ تک نہ دیا یہاں تک کہ وہ لفظ جس کے معنی احمد تھے اسے ترجموں میں تسلی دہندہ سے تبدیل کر کے حقیقت سے دور کر دیا یہی سلوک اس امت کے جمہور علماء نے خلافت علی مرتضیٰ کے نصوص کے ساتھ کیا اور اس طرح رسالت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کے ادعاء کے ساتھ آپ کی مسلسل تبلیغات وتعلیمات کو ٹھکرانے کا موقع پیدا کر لیا۔

---

[۱]۔ كل كثير اليه قليل وكل كبير اليه حقير (کشاف)

[۲]۔ وكان اعظمهم يقولون محمد نبى مبعوث الا انه مبعوث الىٰ غيرنا فذلك خلطهم الحق بالباطل ولبسهم اياه به (طبری)

پھر یہ جان بوجھ کر ہوتا ہے کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ ہر مذہب کے عوام تو سادہ لوح ہوتے ہیں اور خواص گرفتار اغراض ہوتے ہیں عوام اکثر باطل کو نادانستہ اختیار کیے ہوئے ہوتے ہیں مگر علماء زیادہ تر حقیقت سے واقف ہوتے ہوئے دھاندلیوں سے کام لے کر حق سے دور رہتے اور دوسروں کو دور رکھتے ہیں۔ اسی کا قرآن نے ان الفاظ میں اظہار کیا ہے کہ ''حق کو چھپاؤ نہیں جب کہ تم جانتے بھی ہو''۔ اسی لئے خالق کے یہاں مواخذہ ان علماء سے عوام کی نسبت بہت زیادہ ہوگا جو از روئے عدالت ان کے جان بوجھ کر اعراض کرنے کا صحیح نتیجہ ہے۔

وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ ﴿۴۳﴾

''اور نماز ادا کرو اور زکوۃ دیتے رہو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتے رہو۔''

چوں کہ ترتیب آیات کے لحاظ سے سیاق اس بات کا بتاتا ہے کہ یہ خطاب یہود سے ہے اس لئے اس آیت کے ذیل میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ کیا کافروں کے فروغ کا مخاطب بنانا درست ہے[1]۔

ہمارے نزدیک یہ بحث اس لئے دور از کار ہے کہ ترتیب آیات موافق تنزیل نہیں ہے لہٰذا ہر آیت کو مستقل طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس سے کیا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ سیاق آیت سے نتیجہ برآمد کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔

اس آیت میں شریعت اسلام کے تین احکام کا ذکر ہے پہلے اقامتِ صلوٰۃ جس کی تشریح یقیمون الصلوۃ میں ہو چکی ہے۔ اس کا مطلب ہے ادائے نماز، دوسرے ایتاء زکوۃ۔ یہ شریعتِ اسلام کا وہ حکم ہے جو اموال سے متعلق ہے یعنی کچھ خاص شرائط کے ساتھ ایک مال میں سے سال گزرنے پر کچھ مخصوص حصّہ فقراء و مستحقین اور دیگر امورِ خیر کے لئے الگ کرنا۔ پہلا عمل انفرادی عبادت کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا مفادِ اجتماعی سے متعلق ہے۔

تیسرا حکم ''رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو''۔ یہ نمازِ جماعت سے متعلق ہے۔ اس میں انفرادی عبادت میں اجتماعیت کو سمونے کی صورت ہے جو شریعتِ اسلام کی خاص خصوصیت ہے۔

اس میں رکوع کا ذکر بظاہر اس لئے ہے کہ نمازِ جماعت میں ادراکِ رکعت کا آخری موقع رکوع ہے جیسا کہ فقہ میں ثابت ہوا ہے اور اس صورت میں کہ جب خطاب یہود سے ہو رکوع کا خاص طور سے ذکر اس لئے بھی ہوسکتا ہے کہ یہود کے یہاں کی عبادت میں رکوع نہیں ہے۔ یہ ان کے بالمقابل اسلامی نماز کی خصوصیت امتیازی ہے[2]۔ مگر ہمیں اس میں تامل ہے' اس بناء پر کہ سورۂ آلِ عمران میں' جیسا کہ اس کے بعد آئے گا جناب مریمؑ سے خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے: وارکعی مع الراکعین اس سے پتہ چلتا ہے کہ شریعتِ موسوی کی نماز میں بھی رکوع جزء اہم تھا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بعد میں یہود نے شریعت موسوی کے اس حکم میں تنسیخ و ترمیم کر کے رکوع کو ساقط کر دیا ہو۔

---

[1]۔ فی هذا الخطاب مع الیهود دلالة علیٰ ان الکفار مخاطبون بفروع الشرائع (نیشا پوری)
دوسرے گروہ کی طرف سے معقول جواب یہ ہے کہ آیت کے یہ سارے احکام ایک آیت قبل کے حکم ایمان و اٰمنوا بما انزل کے ماتحت ہیں یعنی پہلے ایمان لاؤ اور پھر ان احکام پر عمل کرو (دریابادی)

[2]۔ عبر عن الصّلوٰۃ بالرکوع احترازا عن صلوۃ الیهود (ابوالسعود)

اَ تَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾

''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم تو دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب الٰہی پڑھتے رہتے ہو پھر بھی کیا عقل سے کام نہیں لوگے''؟

یہ خطاب اصلاً علمائے یہود سے ہے چوں کہ مشرکین کو ان کی علمی بلندی کا احساس تھا، اس لئے اکثر وہ ان کے پاس آ کر پیغمبر اسلامؐ کے متعلق دریافت کرتے تھے اور یہ ان کو اپنے علم کے مطابق یہ جواب دیتے تھے کہ بلاشبہ جو علامتیں ہماری کتابوں میں پائی جاتی ہیں وہ سب اس رسول میں پائی جاتی ہیں اس لئے اس پر ضرور ایمان لانا چاہیے۔ یہ ہدایت وہ دوسروں کو کرتے تھے مگر خود اپنی کتاب کی تعلیم کے مطابق ایمان قبول نہ کرتے۔ اس سے انہیں اپنے جاہ و منصب کے تحفظ کا خیال مانع تھا کیوں کہ موجودہ حالت میں تو اپنے مذہب میں وہ ایک پیشوا کی حیثیت رکھتے تھے لیکن اگر ایمان قبول کر لیتے تو ان کی حیثیت پیروی کی ہوجاتی بس اسی بے عملی پر قرآن کریم نے اس آیت میں متنبہ کیا ہے۔

وانتم تتلون الکتاب کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو تو تمہارے واسطے سے تمہاری کتاب کے مندرجات پہنچتے ہیں اور تم اس کتاب کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے اور زبان سے پڑھنے والے ہو۔ پھر کیا وہ تمہارے خلاف حجت نہ ہوگی اور یہی اتمام حجت کا پہلو وہ ہے جس پر عقل کا حوالہ دیا ہے کہ سوچو تو خود تمہاری عقل بتائے گی کہ اس صورتِ حال میں ایمان نہ لانے پر ان لوگوں سے زیادہ تم موردِ الزام ہو اور مواخذہ کے زیادہ مستحق ہو۔

اب یہ تنبیہ چوں کہ ایک عام اصول عقلی کے ماتحت ہے اس لئے وہ عمومی طور پر تمام عالمان بے عمل اور واعظان غیر متعظ کو شامل وحاوی ہے[1]۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

''اور سہارا لو صبر اور نماز کا اور یقیناً وہ گراں ہے مگر عظمت الٰہی سے متاثر دل رکھنے والوں کے لئے جنہیں خیال ہے کہ انہیں اپنے پروردگار کا سامنا کرنا ہے اور یہ کہ انہیں اس کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔''

صبر وصلوٰۃ:

''سہارا'' لینے کے حکم میں مشکلات کے پیش آنے کی خبر مضمر ہے اور کوئی شک نہیں کہ ماحول کے تقاضوں کے خلاف حق کے راستے پر آنا

---

[1]۔ نزلت فی الخطبآء والقصاص وھو قول امیر المؤمنین وھو کل منبر منھم خطیب مصقع کذب علی اللہ وعلی رسولہ وعلیٰ کتابہ اقول وھی جاریۃ فی کل من وصف عدلا وخالف الی غیرہ (صافی)

دشواریوں سے خالی نہیں ہیں اور دشواریاں بھی ایسی جن کے مقابلہ سے خود اپنی مادی قوت قاصر ہے کیوں کہ قوت قاصر نہ ہوتی تو سہارا لینے اور مدد حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی مگر یہ مدد کسی دوسری مادی طاقت کی نہیں ہے بلکہ راہ حق میں جو مشکلات درپیش ہوں ان کے مقابلہ میں مدد بھی لی جائے تو بس اپنی ایک اندرونی قوت سے اس کا نام ''صبر'' ہے اور ایک بیرونی قوت سے جو پردہ غیب میں ہے اور اس سے مدد مطلب کرنے کا طریقہ ''صلوۃ'' ہے۔

صبر کے اصل معنی برداشت کرنے کے ہیں اور انسان جتنی برداشت کی طاقت بڑھائے گا اتنی ہی مشکلیں آسان نظر آئیں گی۔

اسلام میں ایک عبادت یعنی صوم انسان کے لئے قوت برداشت کی مشق کے واسطے ایک بہترین ورزش کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے متعدد روایات میں صبر کی تفسیر صوم کے ساتھ ہوئی ہے[1]۔

صبر یعنی قوتِ برداشت کے ذریعہ سے انسان میں استقلال اور ثباتِ قدم کا ظہور ہوگا اور اب صلوٰۃ کے ذریعہ سے خالق کی جانب رجوع کرے گا تو توفیقِ ربانی اس میں پہلے تو مزید استقلال پیدا کرے گی اور استقلال کے کمال کے ساتھ ساتھ مشکلات کے دور ہونے کی صورتیں پیدا ہوں گی وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت ۶۹) اسی لئے دوسری آیت میں صبر اور صلوۃ دونوں کو مرکز استعانت قرار دینے کے ساتھ پھر آخر میں انحصار صبر پر کر دیا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (البقرہ:۱۵۳) اور اس سے ظاہر ہے کہ صبر و استقلال کے معیار پر پورے اترنے کا ثبوت دیئے بغیر مددِ غیبی کا آسرا لگانا بے کار اور بالکل غلط ہے۔

مگر یہ صبر و صلوٰۃ سے سہارا لینا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے مادی ذہنیت والا آدمی تو ہر مشکل میں کسی مادی قوت ہی کا سہارا ڈھونڈھے گا اور جب نہ مانے گا تو یقین شکست کے ساتھ ہمت ہار جائے گا۔ یہ کام انہیں افراد کا ہے جن کے دل عظمت الٰہی سے متاثر ہوں اور اسی لئے ارشاد ہوا کہ وانہا لکبیرۃ الا علی الخاشعین۔ اس احساس وعظمت کا نتیجہ اس خیال کا قائم ہونا ہے کہ انہیں اپنے پروردگار کا سامنا کرنا ہے اور یہ کہ آخر میں ان کے معاملہ کا انحصار خالق کی مرضی پر ہے۔

یہاں لفظ یظنون صرف کیا گیا ہے جو ادنیٰ درجہ اعتقاد کا پتہ دیتی ہے اور وہ اس لئے کہ انسان کے لئے خالق کی طرف رجوع کا ظن بمعنی گمانِ غالب بھی مطلق العنانی سے روکنے کے لئے کافی ہے لیکن جو صاحبانِ ایمان ہیں وہ اس سے بالاتر یعنی یقین کا درجہ رکھتے ہیں اور وہ بھی ان الفاظ میں داخل ہے۔

یوں سمجھنا چاہیے کہ لفظِ ظن اپنے سے کم درجوں کے مقابل میں ہے نہ کہ اپنے سے مافوق کے مقابل میں، اس لئے یہ ظن بڑھ کر یقین کے درجہ پر پہنچ جائے تو وہ اس آیت کے خلاف نہ ہوگا بلکہ اس کی فردِ اکمل ہوگا اور اسی لئے روایات میں یظنون کی تفسیر یوقنون کے ساتھ کی گئی ہے[2]۔

يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى

---

[1]۔ فی الکافی والفقیہ والعیاشی عن الصادق علیہ السلام فی ہذہ الایۃ ان الصبر الصیام (صافی)

[2]۔ فی التوحید والاحتجاج والعیاشی عن امیر المؤمنین علیہ السلام یوقنون انہم یبعثون والظن منہم یقین (صافی)

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

”اے بنی اسرائیل میری وہ نعمت یاد کرو جس وقت میں نے تمہیں نوازا اور یہ کہ میں نے تمہیں تمام خلائق سے زیادہ عطا کیا۔“

قرآن کریم میں متعدد جگہ فضل کا لفظ مال ودولت وغیرہ کی زیادتی کے مفہوم میں آیا ہے جیسے:

فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ (سورۂ نحل ۷۱)

تو جنہیں زیادہ دیا گیا ہے وہ ایسا نہیں کرتے کہ جو انہیں ملا ہے اسے پلٹا دیں انکی طرف جو انکی ملکیت میں ہیں (غلام وغیرہ)

دوسری جگہ فضلتکم علی العالمین کی تشریح یوں آئی ہے: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾ (مائدہ)

جس کا ذکر معہ ترجمہ پہلے آ چکا ہے۔

اسی لئے فضلتکم علی العالمین کا ترجمہ میں نے کثرتِ عطا سے کیا ہے۔فضیلت مرتبہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

پھر ”یاد کرو“ کا لفظ جو شروع میں ہے بتاتی ہے کہ یہ ماضی کا ذکر ہے، حال میں تو کفران کے سبب سے وہ نعمت وفضیلت سب سلب ہو چکی ہے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

”اور اس دن سے بچنے کا سامان کرو جب نہ کوئی دوسرے کو کوئی فائدہ پہنچا سکے گا، اور نہ کسی کی سفارش قبول ہوگی اور نہ کسی کا کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی“۔

جیسا کہ عبدالماجد صاحب دریابادی نے لکھا ہے ”اس دن سے مراد ظاہر ہے کہ یوم قیامت ہے۔قیامت کی یاد بڑے حکیمانہ موقع پر دلائی گئی حشر ونشر جزاء سزا کا عقیدہ جو انسان کے دل میں مسؤلیت اور ذمہ داری کی روح ہے اسرائیلیوں کے دلوں ہی سے نہیں کہنا چاہیے کہ ان کی مقدس کتابوں اور نوشتوں تک سے مٹ چکا تھا۔آگے روزِ قیامت کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں سب میں رد ہی ہے کسی نہ کسی اسرائیلی عقیدہ کی لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ، اس سے مقصود اس اسرائیلی عقیدہ کی رد ہے جو آج تک جیوش انسائیکلو پیڈیا میں ان الفاظ میں لکھا چلا آتا ہے ”بہت سے لوگ اپنے اسلاف کے اور بہت سے لوگ اپنے اخلاف کے اعمالِ حسنہ کی بناء پر بخش دیے جائیں گے (جلد ۶ ص ۶۱) وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ (جس صورت میں کہ موت حالت کفر پر اور عدم ایمان میں ہوئی ہے) یہاں بھی رد ہے اس اسرائیلی عقیدہ کی کہ عمل اور عقیدے کیسے ہی ہوں بہرحال اپنے اسلافِ کرام شفاعت کر کے بخشوا ہی لیں گے شفاعت اور ایک شفیع مستقل کا یہی وہ مبالغہ آمیز تخیل ہے جس نے مسیحیت میں آکر انتہائی شکل اختیار کر لی اور کفارہ ہی کی طرح شفاعت پر مسیحیت کی بنیاد ہے۔لا یو خذ منھا

عدل اس میں اصلی ضرب یہودی اور مسیحی عقیدہ کفارہ پر ہے۔مسیحیوں کے یہاں عقیدہ کفارہ کی اہمیت تو ظاہری ہے لیکن خود یہود بھی اس عقیدہ کفارہ سے متاثر ہوکر قائل ہو گئے تھے(جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۲ ص ۲۷۸)''

اسرائیلی عقیدۂ شفاعت اور اسلامی عقیدۂ شفاعت میں فرق:

بے شک اسلام میں بھی شفاعت کا عقیدہ ہے اور وہ قرآن سے ثابت ہے مگر اس میں اسرائیلی عقیدہ کی طرح نہ عمومیت ہے نہ اس طرح قطعیت بلکہ وہ خاص اہل ایمان کے لئے خدا تعالیٰ کے اذن ورضا کے ساتھ مشروط ہوتے ہوئے مایوسیوں کی گھنگھور گھٹا میں صرف ایک امید کی چمک دکھلا کر توجہ الی اللہ کو تازہ کرنے کا ذریعہ ہے۔اس طرح نہ اس میں نجات پر اعتماد کلی ہے جس کے بعد اصلاح اعمال کی ضرورت ہی نہ ہو جو اسرائیلی عقیدہ کا لازمہ ہے اور نہ یاسِ کامل ہی ہے جس کے بعد گنہ گار اپنے کو دوزخی سمجھ کر پھر اصلاح نفس کے بےکاری سمجھ لے بلکہ اسلام کی تعلیم ان دونوں نقطوں کو چھوڑ کر بین بین ہے اور یہی اس کا طرہ امتیاز ہے(**الایمان نصفان نصف خوف و نصف رجاء**) (یعنی) ایمان کے برابر سے دو حصے ہیں۔ایک حصہ خوف ہے اور ایک حصہ امید ہے۔

وَاِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَیَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ؕ وَفِیۡ ذٰلِکُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَظِیۡمٌ ﴿۴۹﴾

''اور اس وقت جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے چھٹکارا دیا جو تمہیں بری طرح تکلیفیں پہنچاتے تھے تمہارے لڑکوں کو حلال کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھ لیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔''

فرعون کے مظالم اور بنی اسرائیل کی نجات:

''تمہیں'' یہ نسبت اور اس کے بعد کی تمام نسبتیں جو اس آیت اور اس کے بعد کی آیتوں میں ہیں، موجودہ بنی اسرائیل کی طرف قومی حیثیت سے دی گئی ہیں ورنہ حقیقۃً تو جنہیں نجات دی گئی تھی اور جن پر یہ واقعات گزرے تھے وہ اس تخاطب سے بہت صدی پہلے کے ان کے آباؤ اجداد تھے۔

فرعون کسی خاص آدمی کا نام نہیں ہے بلکہ مصر کا ہر بادشاہ فرعون کہلاتا تھا جیسے ایران کا ہر بادشاہ کسریٰ اور روم کا قیصر اور حبشہ کا نجاشی۔

بنی اسرائیل پر جن مظالم کا حوالہ قرآن مجید نے دیا ہے ان کا ذکر توریت میں بھی موجود ہے۔مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب خدمت کھیت کی کرواکے ان کی زندگی تلخ کی۔ان کی ساری خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے۔مشقت کی تھیں(خروج ۱:۱۳ و ۱۴) لڑکوں کو قتل کرنے اور لڑکیوں کے زندہ رکھے جانے کا جو فرعون کی طرف سے حکم تھا اس کا بھی ذکر ان الفاظ میں ہے کہ ''فرعون نے اپنے سب لوگوں کو تاکید کر کے کہا کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو تم اسے دریا میں ڈال دو اور جو بیٹی ہو جیتی رہنے دو(خروج ۱:۱۵ و ۲۲)۔

عدال اس میں اصلی ضرب یہودی اور مسیحی عقیدہ کفارہ پر ہے۔مسیحیوں کے یہاں عقیدہ کفارہ کی اہمیت تو ظاہری ہے لیکن خود یہود بھی اس عقیدہ کفارہ سے متاثر ہوکر قائل ہو گئے تھے(جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۲ ص ۲۷۸)''

اسرائیلی عقیدۂ شفاعت اور اسلامی عقیدۂ شفاعت میں فرق:

بے شک اسلام میں بھی شفاعت کا عقیدہ ہے اور وہ قرآن سے ثابت ہے مگر اس میں اسرائیلی عقیدہ کی طرح نہ عمومیت ہے نہ اس طرح قطعیت بلکہ وہ خاص اہل ایمان کے لئے خدا تعالیٰ کے اذن ورضا کے ساتھ مشروط ہوتے ہوئے مایوسیوں کی گھنگھور گھٹا میں صرف ایک امید کی چمک دکھلا کر توجہ الی اللہ کوتازہ کرنے کا ذریعہ ہے۔اس طرح نہ اس میں نجات پر اعتماد کلی ہے جس کے بعد اصلاح اعمال کی ضرورت ہی نہ ہو جو اسرائیلی عقیدہ کا لازمہ ہے اور نہ یاسِ کامل ہی ہے جس کے بعد گنہ گار اپنے کو دوزخی سمجھ کر پھر اصلاح نفس کے بے کاری سمجھ لے بلکہ اسلام کی تعلیم ان دونوں نقطوں کو چھوڑ کر بین بین ہے اور یہی اس کا طرہ امتیاز ہے(**الایمان نصفان نصف خوف و نصف رجاء**) (یعنی) ایمان کے برابر سے دو حصے ہیں۔ایک حصہ خوف ہے اور ایک حصہ امید ہے۔

وَاِذۡ نَجَّيۡنٰكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ يُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَيَسۡتَحۡيُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ‌ؕ وَفِىۡ ذٰلِكُمۡ بَلَاۤءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَظِيۡمٌ ﴿۴۹﴾

''اور اس وقت جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے چھٹکارا دیا جو تمہیں بری طرح تکلیفیں پہنچاتے تھے تمہارے لڑکوں کو حلال کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھ لیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔''

فرعون کے مظالم اور بنی اسرائیل کی نجات:

''تمہیں'' یہ نسبت اور اس کے بعد کی تمام نسبتیں جو اس آیت اور اس کے بعد کی آیتوں میں ہیں،موجودہ بنی اسرائیل کی طرف قومی حیثیت سے دی گئی ہیں ورنہ حقیقۃً تو جنہیں نجات دی گئی تھی اور جن پر یہ واقعات گزرے تھے وہ اس تخاطب سے بہت صدی پہلے کے ان کے آباؤ اجداد تھے۔

فرعون کسی خاص آدمی کا نام نہیں ہے بلکہ مصر کا ہر بادشاہ فرعون کہلاتا تھا جیسے ایران کا ہر بادشاہ کسریٰ اور روم کا قیصر اور حبشہ کا نجاشی۔

بنی اسرائیل پر جن مظالم کا حوالہ قرآن مجید نے دیا ہے ان کا ذکر توریت میں بھی موجود ہے۔مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب خدمت کھیت کی کرواکے ان کی زندگی تلخ کی۔ان کی ساری خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے۔مشقت کی تھیں(خروج ۱:۱۳ و ۱۴) لڑکوں کو قتل کرنے اور لڑکیوں کے زندہ رکھے جانے کا جو فرعون کی طرف سے حکم تھا اس کا بھی ذکر ان الفاظ میں ہے کہ'' فرعون نے اپنے سب لوگوں کو تاکید کر کے کہا کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو تم اسے دریا میں ڈال دو اور جو بیٹی ہو جیتی رہنے دو(خروج ۱:۱۵ و ۲۲)۔

لڑکیوں کے زندہ رہنے دینے کی غرض نہ توریت میں صراحتاً مذکور ہے اور نہ قرآن میں مگر اسے مصائب کے ذیل میں درج کرنے ہی سے ظاہر ہے کہ یہ زندہ رکھنا لڑکیوں کا کچھ ایسے مقاصد کے لئے تھا جن کی بہ نسبت نفسیاتی طور سے مار ڈالنا زیادہ گوارا ہوسکتا ہے۔

ظلم کا مرتکب اگرچہ ظالم ہوتا ہے اور وہی اپنے ارادہ واختیار کی بناء پر اس کا ذمہ دار ہے مگر خداوند عالم کی طرف سے اس کا موقع دیا جانا کہ وہ ظلم کرسکے اور اس کا اپنی طاقت سے مزاحمت نہ کرنا کبھی بطورِ سزا ہوتا ہے جسے مذہبی روایات میں ان الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے کہ اللہ نے ظالمین کو مسلط کردیا اور کبھی بطورِ امتحان ہوتا ہے جس میں کامیابی کی صورت میں وہ مظلومین کو اپنے انعام واکرام کے ساتھ سرفراز کرتا ہے۔

آلِ فرعون کے ان مظالم کو جو بنی اسرائیل پر تھے قرآن نے دوسری قسم میں داخل کیا ہے۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝٥٠

”اور جب ہم نے تمہارے ذریعہ سے دریا میں شگاف دے دیا، اس طرح تمہیں چھٹکارا دلایا اور فرعون والوں کو ڈبو دیا، اس حالت میں کہ تم دیکھ رہے تھے۔“

فرعونی حکومت کے مظالم سے نجات دلانے کے لئے خالق کے حکم سے موسیٰؑ اسرائیلیوں کو لے کر مصر کی سرزمین سے نکلے کہ اپنے آبائی وطن شام وفلسطین کی طرف روانہ ہوجائیں فرعون نے اپنی فوج کو ساتھ لے کر ان کا تعاقب کیا۔ وہ لوگ اتفاق سے شب کی تاریکی میں راستہ بھول کر دریا کے قریب پہنچ گئے تھے کہ پس پشت سے فرعونی لشکر آ گیا۔ اب یہ لوگ پریشان ہوئے آگے دریا اور پیچھے دشمنوں کی فوج وحی خداوندی سے موسیٰؑ تمام قوم کو حکم دیا کہ وہ بلا تامل دریا کی طرف قدم آگے بڑھا دیں۔ ان کے بڑھنے کے ساتھ ہی دریا کا پانی بیچ سے پھٹ گیا۔ اس کی بڑی بڑی موجیں ادھر ادھر دیواروں کی طرف کھڑی ہوگئیں اور موسیٰؑ تمام بنی اسرائیل کے ساتھ اس طرف کے ساحل تک پہنچ گئے مگر جب فرعون اپنے لشکر سمیت دریا کے حدود میں پہنچ گیا تو دونوں طرف سے پانی کی موجیں پلٹ پڑیں اور انہوں نے اس تمام لشکر کو غرق کردیا۔

یہ واقعہ توریت میں بھی مذکور ہے ”پھر موسیٰؑ نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا اور خداوند بہ سبب بڑی پوربی آندھی کے تمام رات میں دریا کو چلایا اور دریا کو سکھا دیا اور پانی کو دو حصے کیا اور بنی اسرائیل دریا کے بیچ میں سے سوکھی زمین پر ہوکر گزر گئے اور پانی کی ان کے داہنے اور بائیں دیوار تھی“ (خروج ۱۴، ۲۱، ۲۳) بنی اسرائیل خشک زمین پر دریا کے بیچ میں چلے گئے اور پانی کی ان کے داہنے اور بائیں دیوار تھی۔ سوخداوند نے اس دن اسرائیلیوں کو مصریوں کے ہاتھ سے یوں بچایا“ (خروج ۱۳: ۲۹، ۳۰) اور مصریوں نے پیچھا کیا اور ان کا پیچھا کیے ہوئے وہ اور فرعون کے سب گھوڑے اور اس کی گاڑیاں اور اس کے سوار دریا کے بیچوں بیچ تک آئے۔ اور موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ دریا پر بڑھا دیا اور دریا صبح ہوتے ہی اپنی اصلی قوت پر لوٹا اور مصری اس کے آگے بھاگے اور خداوند نے مصریوں کو دریا میں ہلاک کیا اور پانی پھرا اور گاڑیوں اور سواروں اور فرعون کے سب لشکر کو جوان کے پیچھے دریا میں آئے تھے چھپا لیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا (خروج ۱۴: ۲۳، ۲۴) اسی واقعہ کا تذکرہ قرآن مجید کررہا ہے۔

فرق کا جو مفہوم عربی میں ہے اسے اس سے سمجھنا آسان ہوگا کہ مانگ نکالنے کو فرق کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ دریا میں راستہ پیدا ہونا جزرومد کا کوئی کرشمہ نہ تھا جیسا کہ بعض مادی نقطۂ نظر والے افراد نے جو کسی معجزہ کو ماننے پر تیار نہیں ہوتے تو ہم کہا ہے۔

بِکُم کے لفظ سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ تمہارے داخلہ کے ساتھ ہی پانی نے راستہ دیا[1]۔

رہ گئی عقلی حیثیت سے اس پر بحث تو وہ ایک مستقل کلی موضوع کا جز ئیہ ہے جو معجزات انبیاء سے متعلق ہے اور جس پر بحث کا یہ مقام نہیں ہے۔ روح مطلب یہ ہے کہ دریا کا اس طرح شگافتہ ہو جانا محالِ عقلی تو ہے نہیں صرف محال عادی سمجھا جا سکتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ عام طور پر ایسا ہوا نہیں کرتا لیکن خدا کو ماننے کے بعد پھر اس کی قدرت کو محدود سمجھنا معقول چیز نہیں ہے۔

اگر نظر حقیقت شناس سے دیکھئے تو دریا کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا خود سمندر کے وجود سے زیادہ حیرت خیز چیز نہیں ہے۔ پھر وہ جو اس کے پیدا کرنے پر قادر تھا وہ کسی وقت اسے دو حصوں میں تقسیم کرنے پر کیوں قادر نہیں ہے۔

عبدالماجد صاحب دریابادی نے اس پر طبیعی نقطہ نظر سے بھی بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "یہاں جس فرق البحر کا ذکر ہے تو یہ سمندر کا پھٹ جانا اور درمیان میں خشکی کی راہ بن جانا کچھ ایسا زیادہ خارق عادت ہے بھی نہیں کہ اس کی نظیر کہیں ملتی ہی نہ ہو۔ بحری زلزلہ کے وقت ایسی صورتیں پیش آتی ہی رہتی ہیں چنانچہ جنوری ۱۹۴۴ء رمضان ۱۳۵۴ھ میں جو عظیم الشان زلزلہ بہار اور اطراف بہار میں آیا اس موقع پر صوبہ کے صدر مقام پٹنہ شہر میں دن دہاڑے کوئی ڈھائی بجے کے وقت ایک مجمع کثیر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ گنگا جیسے وسیع و عریض دریا کا پانی چشم زدن میں غائب ہو گیا اور اتنے چوڑے پاٹ میں بجائے دریا کے خشک زمین نکل آئی اور یہ حیرت انگیز اور دہشت ناک منظر چند سیکنڈ نہیں چار پانچ منٹ تک قائم رہا یہاں تک کہ دریا اسی برق رفتاری کے ساتھ یک بیک زمین سے ابل کر پھر جاری ہو گیا۔ واقعہ کی مفصل روداد ایک وقائع نگار کے قلم سے انگریزی روزنامہ پانیر لکھنؤ کی ۲۰ جنوری ۱۹۴۴ کی اشاعت میں درج ہے۔"

"بحر سے مراد سے یہاں دریائے نیل نہیں جیسا کہ بعض ثقات کو دھوکا ہو گیا ہے بلکہ بحر قلزم یا بحر احمر مراد ہے دریائے نیل تو بنی اسرائیل کے مسکن سے مغرب کی طرف واقع تھا اور اسرائیلیوں کا راستہ شام کے لئے مشرق کی طرف تھا نیل سے اس راستے کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا مصر سے شام کی راہ کے قریب بحر قلزم تھا۔ اس کے تنگ شمالی راستے کی طرف یہاں اشارہ ہے۔ مصر کے مشرق میں جہاں اب نہر سویز کھدی گئی ہے۔ اس سے متصل مغرب میں سمندر دو مثلثوں کی شکل میں تقسیم نظر آئے گا۔ یہاں ان میں سے مغربی مثلث مراد ہے اسرائیلیوں نے اسی کو عبور کر کے جزیرہ نمائے سینا میں قدم رکھا تھا۔" علامہ بلاغی نے لکھا ہے:

البحر هو خليج السويس من البحر الاحمر و عرضه بحسب اختلاف مواقعه نحو عشرة اميال الىٰ نحو عشرين ميلا. (آلاء الرحمٰن)

بحر سے مراد نہر سویز ہے جو بحر احمر سے نکلی ہے اور اس کی چوڑان مختلف موقعوں کے اعتبار سے دس میل سے تقریباً بیس میل تک ہے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

"اور جب ہم نے موسیٰؑ کے لئے چالیس راتوں کی میعاد مقرر کی اور پھر تم نے ان کے بعد گوسالہ تیار کر لیا اور یہ تمہارا

---

[1]۔ معنی بکم انهم كانوا يسلكونه و تفرق الماء كما يفترق بين الشيئين بما يوسط بينهما (نیشاپوری)

بہت بے محل اقدام تھا۔"

بداءاوراس کا مطلب:

فرعونی حکومت سے نجات پانے کے بعد جب بنی اسرائیل کو آزادی کی کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع حاصل ہوگیا تو حکمت الٰہی کا اقتضاء ہوا کہ ان کے لئے ایک مکمل نظام شریعت مقرر کیا جائے۔اس کے لئے حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ وہ کوہ طور پر آکر تیس دن دعاؤ مناجات اور عبادت میں مصروف رہیں تو ان کو وہ آسمانی کتاب جو ان کے لئے ایک دستور حیات کی حیثیت رکھتی ہوگی عطا کردی جائے گی۔اس معیاد میں بعد کو دس دن اور بڑھا دیے گئے۔اس تبدیلی کا ذکر دوسری جگہ قرآن مجید میں موجود ہے: وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ (اعراف ۱۴۲) یہ اسی قسم کی تبدیلی تھی جس کو اصطلاح مذہب میں بدا کہا جاتا ہے۔

زیر تحریر آیت میں قرآن مجید نے دونوں میعادوں کا مجموعہ بیان کیا ہے جو علم الٰہی میں ابتداہی سے مقرر کیا تھا جیسے سورہ اعراف والی آیت میں پہلے وعدہ اوراس میں اضافہ کے بعد اس طرح ذکر کیا ہے:

فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً

اس طرح ان کے پروردگار کی طرف کی میعاد چالیس راتوں کی پوری ہوگئی۔

یہی بدا کی عموماً حقیقت ہوتی ہے کہ مصلحت کا مقتضا شروع میں مختتم نتیجہ کا اظہار نہیں ہوتا لہٰذا جس حد تک اس وقت مصلحت ہوتی ہے اتنا اس وقت بتا یا جاتا ہے۔پھر بعد میں اس میں تبدیلی نمایاں ہوتی ہے جو ظاہر میں تبدیلی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں وہی اصل تقدیر الٰہی ہوا کرتی ہے جو علم باری میں مختتم طور پر شروع ہی سے مقرر ہے سورہ اعراف میں تبدیلی کے ذکر کرنے کے ساتھ یہاں اسی اصلِ تقدیر کو بیان کرنے پر اکتفا کی گئی ہے [1]۔

یہی تبدیلی قوم موسیٰؑ کے لئے ذریعہ ابتلاء ہوگئی۔انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور باوجود یہ کہ ہارونؑ جنہیں حضرت موسیٰؑ اپنا جانشین بنا کر چھوڑ گئے تھے منع کرتے رہے قوم کی ایک بہت بڑی تعداد سامری کے کہنے میں آکر گوسالہ کو جسے اس نے سونے چاندی سے بنایا تھا خدا مان کر اس کی پرستش میں مصروف ہوگئی۔اس واقعہ کی بہت سی کڑیاں قرآن مجید میں متفق طور پر مذکور ہیں جن کی تشریح ان ہی آیات کے ذیل میں آئے گی۔

ظاہر ہے کہ یہ ان کا عمل صریحی طور پر ''شرک'' تھا اور شرک کو قرآن میں کہا گیا ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾ (لقمان) اس اعتبار سے بھی وانتم ظالمون کا فقرہ ان کے لئے بالکل درست ہے۔پھر خصوصی طور پر وہ جتنے قدرت ربانی کے مظاہرے دیکھ چکے تھے اور جو ان پر موسیٰؑ کے احسانات تھے ان کے باوجود ان کا خدا اور رسول کے وعدہ پر بھروسہ نہ کرنا اور ان کے نائب ہارون کے حکم سے سرتابی کرنا ایک شدید قسم کی زیادتی تھی جس کی ہرگز کسی حق شناس جماعت سے توقع نہ کی جانا چاہیے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

---

[1] ۔اربعین لیلۃ باعتبار مجموع العددین الوعد الاول وھو ثلاثون لیلۃ والثانی وھو اتمامھا بعشر کما فی سورۃ الاعراف (البلاغی)

"پھر اس کے بعد بھی ہم نے تمہیں معاف کر دیا کہ شاید اب تم شکر گزاری کرو۔"

گوسالہ کی عبادت کے جرم میں سوائے ہارونؑ کے جو منع کر رہے تھے تمام قوم ہی شریک تھی کچھ اصل اس عمل کے مرتکب ہونے کی صورت سے اور کچھ اس پر راضی رہ کر خاموشی اختیار کرنے کی صورت سے اس بناء پر اس جرم کی پاداش میں اگر پوری قوم پر عذاب نازل ہو جاتا تو کچھ بعید نہ تھا مگر اس کے بعد کی ایک آیت میں جیسا کہ ذکر آئے گا خداوند عالم نے ایک خاص صورت سے سزا دینے اور اس کے ذیل میں تھوڑی جماعت کے ہلاک کر دیے جانے کے بعد عذاب کو برطرف کر لیا۔یہی وہ معافی ہے جس کا یہاں ذکر ہے۔

وَاِذۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ وَالۡفُرۡقَانَ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۵۳﴾

"اور اس وقت جب ہم نے موسیٰؑ کو نوشتہ اور تفرقہ امتیاز کا سامان عطا کیا شاید کہ تم ہدایت حاصل کرو۔"

یہ نوشتہ اور حق و باطل کے تفرقہ کا سامان دو چیزیں نہیں ہیں بلکہ وہی توریت جو میعاد مقرر کے پورے ہونے پر الواح کی صورت میں موسیٰؑ کو عطا ہوئی کتاب بھی تھی اور وہی معارف کے لحاظ سے حق و باطل اور اعمال کے اعتبار سے صحیح و غلط اور جائز و ناجائز میں تفرقہ امتیاز کا سامان بھی تھی[1]۔

وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ اِنَّكُمۡ ظَلَمۡتُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ بِاتِّخَاذِكُمُ الۡعِجۡلَ فَتُوۡبُوۡۤا اِلٰى بَارِئِكُمۡ فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ ؕ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ عِنۡدَ بَارِئِكُمۡ ؕ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۵۴﴾

"اور اس وقت جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم بلاشبہ تم نے گوسالہ بنا کر اپنے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے لہٰذا اپنے خالق سے توبہ کرو اس طرح کہ اپنے آدمیوں کو خود قتل کرو۔اس میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے تو اس صورت سے اس نے تمہاری توبہ قبول کی بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہے۔"

بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی:

توریت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قتل کیا جانا شریعت موسوی میں شرک کی قانونی سزا تھی چنانچہ مشرک و مشرکہ کے لئے یہ حکم درج ہے کہ "اس مرد یا عورت پر یہاں تک پتھراؤ کرو کہ وہ مر جائیں" (استثناء ۱۷:۵) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گوسالہ پرستوں کے لئے یہ حکم خصوصی سزا کی حیثیت نہ رکھتا تھا بلکہ وہ حد شرعی تھی جو ان پر جاری ہونا ہی چاہیے تھی ہاں اس کے جاری کرنے کا حکم ان لوگوں کو جو اس جرم سے عملاً الگ رہے تھے

[1]۔یعنی الجامع بین کونہ کتابا منزلا و فرقانا یفرق بین الحق و الباطل یعنی التوراۃ نحو رأیت الغیث و اللیث یرید الرجل الجامع بین الجود و الجرأۃ (نیشاپوری)

مگر خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہنے کے مرتکب تھے اب ان کی استقامت و اطاعت کا ایک امتحان تھا جس کے بعد ان کی اس چشم پوشی کے گناہ کو معاف کردیا گیا۔ اس امتحان کے نقطہ نظر سے فاقتلوا انفسکم کی یہ تشریح بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ ہر شخص کے لئے اپنے عزیز کو جو اس جرم کا مرتکب ہوا اپنے ہاتھ سے قتل کرنے کا حکم تھا[۱]۔

یہ اپنے عزیزوں کو قتل کرنا وقتی طور پر طبیعتوں پر جتنی بار تھا وہ ظاہر ہے اسی لئے اس ناگواری کو یہ کہہ کر دور کیا گیا کہ اس میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے اس لئے بھی کہ اس طرح تم اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤ گے جو ان مشرکین کے عمل سے بے تعلقی کے فرض کے لحاظ سے تم پر عائد تھی اور اس لئے آیندہ کے لئے تمہاری وفاداری پایہ ثبوت کو پہنچ جائے گی اور نیز آخرت میں تمہیں اس کا اجر و ثواب بھی عطا ہوگا۔

وَاِذۡ قُلۡتُمۡ يٰمُوۡسٰى لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً فَاَخَذَتۡكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۵﴾

"اور وہ وقت جب تم نے کہا اے موسیٰؑ ہم ہرگز آپ کی بات نہیں مانیں گے جب تک کہ ہم ظاہر بظاہر دیکھ نہ لیں اس پر تمہیں بجلی نے گرفت میں لے لیا اس حالت میں کہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔"

مطالبۂ دیدار اور اس کا انجام:

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب قوم نے مطالبہ کیا کہ ہم آپ کے پیغمبر الٰہی ہونے اور شرف مکالمہ سے مشرف ہونے کو اس وقت تک تسلیم نہیں کر سکتے جب تک خود اپنے کانوں سے کلام الٰہی نہ سن لیں۔ اس پر موسیٰؑ نے ستر بزرگانِ قوم منتخب کیے جنہیں لے کر وہ کوہ طور پر گئے۔ اس کا ذکر قرآن کی دوسری آیت میں اس طرح ہے۔

وَاخۡتَارَ مُوۡسٰى قَوۡمَهٗ سَبۡعِيۡنَ رَجُلًا لِّمِيۡقَاتِنَا "موسیٰؑ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو منتخب کیا ہماری طرف کی وعدہ گاہ پر لے جانے کے لئے[۲]

آپ انہیں دامن کوہ میں چھوڑ کر خود آگے بڑھ گئے اور خالق سے مناجات و مکالمہ کے شرف سے مشرف ہوئے جس کی آواز ان سب لوگوں نے صاف صاف سنی مگر اب انہوں نے یہ کہا کہ ہم آپ کا یہ کہنا کہ آپ کی اللہ سے گفتگو ہوئی اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک اپنی آنکھوں سے اس کا دیدار بھی نہ کریں[۳]۔

---

[۱]۔ الظاهر انه ليس المراد ان يتحرّوا و يقتل كلا نسان نفسه بل قتل النفوس المضافة اليهم بالقرابة و الرحم الماسة (بلاغی)

[۲]۔ (اعراف۔ ۱۵۵)

[۳]۔ روی ابن بابویه فی العیون عن الرضا علیه السلام ما ملخصا ان بنی اسرائيل قالو الموسىٰ لن نؤمن لك بأن الله ارسلك و كلمك حتى نسمع كلام الله فاختار منهم سبعين رجلا فلما سمعوا كلام الله من الجهات الست قالوا لن نؤمن بانه كلام الله حتى نرى الله جهرة (بلاغی)

اس پر عتاب الٰہی نازل ہوا اور بجلی نے گر کر اُن سب کو ہلاک کر دیا۔

اس جلال وغضب کے مظاہرہ سے نمایاں ہے کہ یہ مطالبہ عظمت وشانِ الٰہی کے خلاف تھا جب ہی اس پر اتنا سخت عتاب ہوا[ا]۔ جب کہ یہ ایک محال امر ہے اور عظمت وقدوسیت خالق کے منافی ہے تو اس میں دنیا و آخرت کی تفریق کیسی؟ اس کا جلال وعظمت جس طرح یہاں ہے ویسے ہی وہاں جیسے آج ہے ویسے ہی کل۔

اگر جنت میں دیدار ہونے والا ہوتا تو بجائے اس غضب وعتاب کے یہ تسکین دہانی مناسب قرار پاتی کہ ابھی صبر کرو آخرت میں جب جنت میں داخل ہونا تب دیدار کر لینا مگر چوں کہ آنکھوں سے کسی چیز کا مشاہدہ جسمیت کا متقاضی ہے اور اللہ جسم نہیں رکھتا اس لئے اس کی رویت بلا فرقِ زمان ومکان محال وغیرہ معقول ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴿۵۶﴾

"پھر تمہارے مرنے کے بعد تمہیں ہم نے دوبارہ جلا دیا کہ شاید اب تم شکر گزار ثابت ہو۔"

"تمہیں" یعنی تمہاری قوم کے ان آدمیوں کو جو بجلی کی نذر ہو گئے تھے"۔

چوں کہ سوال رویت جلال وعظمت الٰہی سے کمی معرفت اور نادانی کی بناء پر تھا تو صاعقہ کے عذاب سے اس تصور وعقیدہ کے جرم کی اہمیت ثابت کر دی گئی جس سے بقیہ قوم کی تنبیہ کا مقصد بھی پورا ہو گیا مگر اس کے بعد انہیں دوبارہ زندگی عطا کر دی گئی تا کہ وہ اپنے گزشتہ عمل کی پاداش کا ذاتی تجربہ ہو چکنے کے بعد اب تنزہ وتجرد معبود کی کامل معرفت اور ایمان بالغیب کے ساتھ اپنے دور حیات میں عبادت واطاعت کی زندگی گزار سکیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عذاب استیصال نہیں بلکہ عذاب تنبیہ تھا جو امراض ومصائب اور تسلط جابرین وغیرہ کی شکل میں اکثر آتا رہتا ہے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴿۵۷﴾

"اور ہم نے تم پر ابر کو سایہ افگن کیا اور تم پر من وسلویٰ اتارا کہ کھاؤ ان پاک وحلال چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں اور انہوں نے اس سے کچھ ہمارا نقصان نہیں کیا بلکہ وہ برابر خود اپنے ہی اوپر ستم ڈھاتے رہے۔"

من وسلویٰ:

جزیرہ نمائے سینا میں جو غیر معمولی فضل وکرم خالق کا بنی اسرائیل پر ہوتا رہا اور پھر وہ اس پر ناشکرا پن کرتے رہے اس کا تذکرہ ہے۔

توریت میں اس سایہ کا ذکر "بدلی کے ستون" کی لفظوں میں کیا گیا ہے۔ من وسلویٰ کی اصل حقیقت تو اللہ جانے مگر اہل لغت کی تشریح

[ا] ۔لفرط العناد والتعنت وطلب المستحیل (بیضاوی)

کے مطابق من ایک میٹھی چیز تھی جو درختوں پر شبنم کی طرح گرتی تھی[1] ۔
سلویٰ ایک طرح کا طائر ہے[2] ۔
ان نعمتوں کے باوجود انہوں نے اپنے نبی کے احکام سے سرتابی کی یہی وہ ظلم ہے جسے کہا جا رہا ہے کہ درحقیقت اس طرح انہوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی مطلب یہ ہے کہ اس سے ہمارا کچھ بگاڑا نہیں ضرر اس کا جو بھی تھا وہ اُن کی ذات ہی کی طرف راجع تھا۔ اور یہ انتباہ ہے ہر کافر مشرک اور عاصی کے لئے کسی کی نافرمانی اور سرتابی سے اللہ کے عزت وجلال کبریائی اور جبروت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ ایمان و اطاعت کی صورت میں نفع بھی انہی کا خود ہوتا ہے اور کفر و عصیان سے نقصان بھی خود ان ہی کو۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

”اور جب ہم نے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو اور اس میں سے جہاں سے چاہو خوب مزے سے کھاؤ پیو اور دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے جانا اور کہنا ”گناہوں کی توبہ“ تو ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور حسن عمل سے کام لینے والوں کو ہم کچھ زیادہ ہی عطا کریں گے“۔

بابِ حطہ:

چوں کہ آیاتِ قرآن کی ترتیب شانِ نزول کے مطابق نہیں ہے اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ ہی کے دور کا ہے بلکہ ممکن ہے ان کے وصی یوشعؑ کے وقت میں پیش آیا ہو یا اس کے بھی بعد کا ہو اور اسی لئے اس بستی کو بھی تعین کے ساتھ نہیں بتایا جا سکتا جس میں داخلہ کے موقع پر یہ صورت پیش آئی تھی بہر حال تعلق اس کا بھی اسرائیل ہی کی تاریخ سے ہے۔
الباب سے مراد شہر پناہ کا پھاٹک ہے جس سے شہر کے اندر داخلہ ہونا تھا۔ سجدہ خشوع و خضوع کا انتہائی مظاہرہ ہے کوئی وجہ نہیں کہ اس کے ظاہری معنی کو چھوڑ کر یہاں بس فروتنی اور انکسار ہی کو مراد لیا جائے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

---

[1] ۔وقال بعض المفسرین انه الترنجبین ولیس له مستند یقول علیه (بلاغی)
[2] ۔اسم طائر یشبه السّمانی (طبرانی) ”اردو میں بعض نے اسے ”بٹیر“ کی قسم سے بتایا ہے اور لکھا ہے بٹیر جزیرہ نمائے سینا کا خاص جانور ہے، بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے، گرمی میں شمال کی طرف چلا جاتا ہے، جاڑے میں جنوب کی طرف پھر آ جاتا ہے اڑتا اونچا نہیں، بہت نیچا رہتا ہے، تھک بہت جلد جاتا ہے اور شکار بڑی آسانی ہو جاتا ہے۔ (دریابادی)

"مگر ان ظالموں نے اس قول کے بجائے جو انہیں بتایا گیا تھا ایک دوسری بات بدل کر کہہ دی تو ہم نے ان ظالموں پر آسمان سے ایک بڑا عذاب نازل کیا اور اس لئے کہ وہ برابر نافرمانی کرتے رہتے تھے۔"

انہوں نے بدل کر کہہ دیا، اس بارے میں قرآن تصریح نہیں کرتا، روایتیں ضرور ہیں مگر سند کے لحاظ سے بے اعتبار تاہم سب سے اتنا پتا چلتا ہے کہ انہوں نے حکم الٰہی کا استخفاف کرتے ہوئے بطور تمسخر لفظ کو بدل دیا مثلاً حِطَّةٌ (توبہ) کے لفظ کو حنطة (گیہوں) کر دیا، جس سے ان کی ذہنیت بھی ظاہر تھی کہ وہ گناہوں کی معافی کو کوئی چیز نہیں سمجھتے۔ اس کے بجائے "شکم پری" کو وہ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ ایک لفظ کی بات نہ تھی بلکہ عدول حکمی ہونے کے ساتھ اہانت حکم و حاکم حیثیت اُسے حاصل تھی۔ چنانچہ اس کی پاداش میں ان پر عذاب نازل ہو گیا[1]۔ پھر قرآن نے اس توہم کو دور کرنے کے لئے کہ اتنی سی بات پر آخر وہ عذاب کے مستحق کیوں کر ہو گئے عذاب کی وجہ بیان کی کہ بما کانوا یفسقون۔ یہ ماضی استمراری کا صیغہ ہے جس سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ ان کا فعل اگر اتفاقی طور پر ایک شرارت کی حیثیت رکھتا ہوتا تو اسے ایک وقتی شوخی قرار دے کر ٹالا بھی جا سکتا تھا مگر وہ تھے ہی ایسے کہ برابر عدول حکمی کرتے رہتے تھے جس کا ایک مظاہرہ اسکی رکاکت آمیز صورت سے ہوا اس لئے اب ان پر عذاب نازل ہی ہو گیا[2]۔

وَاِذِ اسۡتَسۡقٰى مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖ فَقُلۡنَا اضۡرِبْ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ ‌ؕ فَانۡفَجَرَتۡ مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَيۡنًا ‌ؕ قَدۡ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَهُمۡ‌ ؕ كُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ اللّٰهِ وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ ﴿۶۰﴾

"اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لئے پانی کی دعا مانگی تو ہم نے کہا کہ اپنا عصا چٹان پر مارو بس اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اس طرح کہ ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ الگ جان لیا۔ کھاؤ اور پیو اللہ کے دئے ہوئے رزق سے اور زمین پر خرابیاں پھیلاتے نہ پھرو۔"

بارہ (۱۲) چشمے:

مصر سے نکل کر فلسطین کے راستے میں ایک جگہ ایسی آئی جہاں دور تک پانی دستیاب نہ ہوا بنی اسرائیل پریشان ہوئے اور خود پریشان ہو کر جناب موسیٰؑ کو سخت پریشان کیا اور توریت کہتی ہے کہ:

"موسیٰؑ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ پئیں موسیٰؑ نے خداوند سے فریاد کر کے کہا کہ میں ان لوگوں کا کیا کروں وہ سب تو مجھے ابھی سنگسار کرنے کو تیار ہیں۔" (خروج ۱۷: ۱، ۴)

---

[1] ۔الرجز فی لغة العرب العذاب (طبری)

[2] ۔بسبب فسقهم المستمر حسبما یفیده الجمع بین صیغتی الماضی والمستقبل (ابو السعود)

اس کے بعد ہے کہ:

''خداوند نے موسیٰؑ کو فرمایا کہ لوگوں کے آگے جا اور بنی اسرائیل کے بزرگوں کو اپنے ساتھ لے اور اپنا عصا جو تو نے دریاء پر مارا تھا اپنے ہاتھ میں لے۔تو اس چٹان کو ماریو۔اس سے پانی نکلے گا تا کہ لوگ پیویں چنانچہ موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے لوگوں کے ساتھ یہی کیا'' (خروج ۱۷: ۵و۶)

قرآن کے مختصات میں سے یہ ہے کہ اس نے چشموں کی تعداد بتائی ہے کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کی تعداد کے مطابق بارہ چشمے ظاہر ہوئے۔عبدالماجد صاحب دریا بادی لکھتے ہیں:۔

''بعض نادان مسیحیوں نے اس تعداد پر اعتراض کر دیا کہ یہ تو بائبل میں موجود نہیں۔قرآن نے کہاں سے گھڑ کر کہہ دیا؟ قدرت نے سوال کا جواب بھی مسیحیوں کی زبان سے دلوایا۔جارج سیل انگریزی میں قرآنِ کریم کا قدیم مترجم ہے۔آیت کے حاشیہ پر لکھتا ہے:۔

''ایک مسیحی سیاح جو وہاں ہو آیا ہے بتصریح بیان ہے کہ چٹان سے پانی بارہ مقامات سے نکلتا تھا''

اور ایک دوسرے مسیحی سیاح کا مشاہدہ بیان کرتا ہے چٹان میں اس وقت ۲۴ سوراخ موجود ہیں جو بہ آسانی شمار کیے جا سکتے ہیں بارہ ایک طرف میں اور بارہ ان کے مقابل جانب پادری ڈین اسٹینلی Dean Stanley نے جو انیسوی صدی میں مسیحیت کے ایک ممتاز رکن ہوئے ہیں صدی کے وسط میں بائیل کے مقامات مقدسہ کی جغرافی تحقیق کے لئے بہ نفس نفیس فلسطین اور اس کے ملحقات کا سفر کیا اور اپنے مشاہدات وتحقیقات پر ایک مستقل تصنیف شائع کی۔

اس میں اس چٹان کا ذکر کر کے لکھتے ہیں: یہ چٹان دس اور پندرہ منٹ کے درمیان بلند ہے آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے اور راس سفسفہ کے قریب لے جا کے وسیع وادی میں واقع ہے۔شگاف اور دراز جا بجا پڑے ہوئے ہیں کچھ مٹے ہوئے ہیں کچھ بڑے ہیں کچھ چھوٹے گنتی میں اگر سب کو لیا جائے تو بیس ہوتے ہیں اگر بعض کو چھوڑ دیا جائے تو دس سب سے پہلے قرآن ہی نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کیلئے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے یہ اشارہ انہی شگافوں کی طرف ہے۔''

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ط قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ط اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ط وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ق وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾

''اور اس وقت جب تم نے کہا: اے موسیٰؑ ہم ہرگز ایک کھانے پر صبر نہیں کریں گے لہٰذا اپنے پروردگار سے ہمارے لئے دعا کیجئے کہ وہ ہمارے لئے وہ چیزیں نکالے جو زمین سے اگتی ہیں جیسے ساگ، ککڑی، گیہوں مسور اور پیاز، موسیٰؑ نے کہا ارے ایسی پست چیزیں تم بدل کر لینا چاہتے ہو اس کے بجائے جو بہتر ہے! اچھا تو پھر کسی شہر میں جا کر اتر و وہاں تمھیں جو مانگتے ہو سب مل جائے گا اور ان پر ذلت اور محتاجی عائد کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کا برابر انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کر ڈالتے تھے یہ اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ برابر ظلم و تعدی سے کام لیتے تھے۔''

اس کے قبل ایک آیت میں یہ ذکر آچکا ہے کہ بنی اسرائیل کو دشت سینا میں کھانے کی دو چیزیں ملتی تھیں ۔ایک من جسے بعض لوگوں نے ترنجبین بتایا ہے اور دوسرے سلویٰ جس کی بیٹر کے نام سے تشریح کی گئی ہے بنی اسرائیل کی بس ہر پھر کے وہاں یہی غذا تھی ایک مدت تک اسے کھانے کے بعد ان کی طبیعت بھر گئی اور اب انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے ان غذاؤں کی فرمایش کی جن کے وہ مصر میں عادی تھے۔اور توریت میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

''اور بنی اسرائیل بھی پھرے اور روتے ہوئے بولے کون ہے جو ہمیں گوشت کھانے کو دے گا۔ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مفت مصر میں کھاتے تھے اور وہ کھیرے اور وہ خربوزے اور وہ گندنا اور وہ پیاز اور وہ لہسن پر اب تو ہماری جان خشک ہو چلی یہاں ہماری آنکھوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے مگر یہ من (گنتی ۱۱: ۴ و ۶)

اس طرح کی فرمائش یا التجا عام حالات میں ہوتی تو کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی کیوں کہ وہ فطرت بشری کے ایک عام تقاضا پر مبنی تھی کہ انسان کا ایک غذا کھاتے کھاتے چاہے وہ کتنی ہی نفیس و لذیذ ہو، جی اکتا ہی جاتا ہے مگر یہاں صورت حال تو یہ تھی کہ مصر سے وہ نکالے گئے تھے مظالم فرعون سے نجات دلوانے کے لئے اور منزل مقصد یعنی فلسطین کے داخلہ سے وہ محروم ہو گئے اپنی اس عدول حکمی اور سرکشی کی بدولت جو وہاں کے قوم جبارین سے مقابلہ کی صورت درپیش ہونے کے بعد ان سے ظاہر ہوئی اور جس میں آخر میں انہوں نے انتہائی جسارت آمیز جملہ تک کہہ دیا تھا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ ۲۴) یعنی آپ جائیے اور آپ کا خدا دونوں جنگ کر لیجئے ہم یہیں بیٹھے ہوئے ہیں اسی کے نتیجہ میں حکم ربانی ہوا فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ (مائدہ ۲۶) یہاں کا داخلہ ان پر چالیس برس کے لئے حرام ہو گیا۔اتنی مدت میں یہ یونہی سرگرداں پھرتے رہیں گے اس سے ظاہر ہے کہ یہ دشت نوردی کی زندگی ان کے لئے بطور سزا تھی۔ اس صورت میں تقاضائے عقل یہ تھا کہ وہ اپنے گریبان میں خود منھ ڈالتے اور جو کچھ مل رہا تھا اسے غنیمت سمجھ کر صبر و شکر کے ساتھ اسی پر اکتفا کرتے نہ یہ کہ وہ اپنے پیغمبر کو طرح طرح کی فرمائشیں کر کے اور ناز نخرے دکھا کر پریشان کریں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ موسیٰؑ نے ان سے جھلا کر کہا کہ ''ایسا ہی ہے تو کسی شہر میں جا کر اتر پڑو یعنی تمہاری بد اعمالیوں سے مقدر میں تو یہ جنگل لکھ دیا گیا ہے۔پھر جنگل میں یہ چیزیں کہاں؟ ان چیزوں کی طلب ہے تو مصر میں یا کسی شہر میں جا کر بود و باش اختیار کرو جو تمہارے بس میں نہیں ہے [1]۔

---

[1] ۔والامر بالهبوط على كلا الو جهين انما هو للتعجيز لان مصر هى بلاد عبوديتهم وذلتهم و مجمع عدوهم المنكوب مضافا الى انهم كتب عليهم التيه فكيف يستطيعون الهبوط الى مصر (بلاغیؒ)

یہود کے لیے فیصلہ تقدیر:

یہ تو ایک جزئی واقعہ اس قوم کا تھا جو ذکر ہو گیا۔ اس مثال کو دینے کے بعد اب اس پوری قوم کے لئے قرآنِ کریم نے فیصلہ تقدیر سنایا ہے جو ان کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ اس کا تعلق خاص ان لوگوں کے ساتھ نہیں ہے جنہوں نے ایک غذا کو بدل کر دوسری غذا کی خواہش کی اس لئے کہ ان کے جرائم میں قتل انبیاء کا بھی ذکر ہے یہ جرم قوم کی طرف نسبت رکھتا ہے ان خاص لوگوں کی طرف نہیں جو کہ تیہ میں حیران و سرگردان پھر رہے تھے پھر جب کہ یہ جرائم ان سے متعلق نہیں ہیں تو ان کی پاداش کو بھی ان سے مخصوص نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ پوری قوم کے لئے کہا گیا ہے کہ ان پر ذلت اور فقیری عائد کر دی گئی ہے [۱]۔

اس ذیل میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن میں اس کا ذکر کہیں نہیں ہے کہ یہود کو حکومت کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس میں ذلت اور محتاجی کا ذکر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ایک سود خوار قوم کتنی ہی دولت مند یا پائے مردی ہمسایہ کسی حکومت کی بھی مالک ہو جائے پھر بھی وہ دناءت نفس اور محتاجی کے احساس سے بلند نہیں ہو سکتی۔

اس ذلت و مسکنت اور غضب میں گرفتاری کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ وہ آیات الٰہیہ کا انکار کرتے رہے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے ظاہر ہے کہ انبیاء کا قتل ناحق تو ہو گا مگر یہاں مطلب یہ ہے کہ خود ان کی نظر میں بھی وہ انبیاء قتل کے مستحق نہ تھے [۲]۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٔينَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾

”یقیناً جو مسلمان ہوں اور جو یہودی، عیسائی اور صابی ہوں جو کوئی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے اور ان کے لئے کوئی خوف نہیں ہے اور نہ ہی وہ رنج میں مبتلا ہوں گے۔“

معیارِ نجات:

زمانہ رسولؐ میں اسلام لانے والے کئی قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو پہلے کسی دوسرے دین کو اختیار کیے ہوئے نہ تھے خواہ شرک کی

---

[۱] ۔الظاھر ان الضمیر لا یختص بالذین طلبوا البصل وما ذکر فانھم لم یعھد منھم قتل النبییّن بل یعود الضمیر علی نوع بنی اسرائیل (بلاغؔ)

[۲] ۔فائدۃ التقئید مع ان قتل الانبیاء یستحیل ان یکون بحق الایذان علیٰ ذٰلك عندھم ایضاً بغیر الحق (ابو السعود)

زندگی بسر کرتے ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ لا دینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے جب دین قبول کیا تو وہ اسلام ہی تھا یا وہ پیدائشی مسلم ہوں دوسرے وہ جو پہلے کسی اور دین کو اختیار کیے ہوئے تھے جیسے یہودیت، نصرانیت، صائبیت وغیرہ ان سب کے لئے قرآن بتانا چاہتا ہے کہ معیار نجات ایک ہی ہے۔ یعنی ان کی سابقہ زندگی سے بحث نہیں کہ وہ کیا تھی۔ حال کے لئے سب کے واسطے نجات کی شرطین یکساں ہیں اور وہ یہ کہ اب اسلامی تعلیمات کے مطابق مبداء ومعاد کو مانیں اور صحیح طریقہ پر اعمال حسنہ کے پابند ہوں۔ ظاہر ہے کہ تعلیمات اسلامی کے مطابق عقائد و اعمال کو درست کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے محمد مصطفیؐ کی رہنمائی کو قبول کر لیا اس لئے ایمان بالرسالتہ کے ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب اس کے بعد آخرت میں ان کو نجات کا بمناسبت درجہ ایمان وعمل یکساں طور پر استحقاق حاصل ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

”اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور ہم نے تمہارے اوپر کوہ طور کو بلند کیا کہ جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے ہاتھ میں لو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو شاید اس طرح تم بچ سکو“

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب الواحِ توریت نازل ہوئی ہیں۔

کوہ طور کو ان پر کیوں کر بلند کیا گیا تھا اس کی تفصیل قرآن میں تو ہے نہیں اسرائیلیات کچھ بتاتے ہیں مگر وہ معتبر نہیں بہرحال اس آیت کے انداز بیان سے ظاہر ہے کہ یہ کوئی غیر معمولی مظاہرہ قدرت تھا۔ اس عملی تہدید کے ساتھ ان سے کہا گیا کہ اس کتاب کے ساتھ جو نازل ہوئی ہے مضبوطی کے ساتھ تمسک کرو اور اس کے مضامین کو ہمیشہ یاد رکھو کہ اسی میں تمہاری نجات ہے۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

”پھر تم اس کے بعد پلٹ گئے اب اگر اللہ کا خاص فضل و کرم تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تو تم سخت گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔“

سبت کا حکم اور اس کی مخالفت کا انجام:

یعنی عہد و پیمان ہو جانے کے بعد نبی اسرائیل نے کچھ عرصہ کے بعد کتاب الٰہی پر عمل بالکل ترک کر دیا۔ اب ان کے اعمال کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان پر عذاب نازل ہو جاتا اور وہ ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیے جاتے مگر خالق کے مخصوص فضل و کرم اور اس کی رحمت نے ان کو مہلت دی اور وہ مکمل تباہی سے محفوظ رہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿٦٥﴾

”اور تمہیں معلوم ہیں وہ جنھوں نے تم میں سبت کے بارے میں تعدی سے کام لیا تھا تو ہمارا ان کے لئے حکم ہوا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ۔“

سَبت شریعت یہود میں ایک خاص دن تھا جو عبادت و ذکر الٰہی کے لئے مخصوص تھا۔ توریت میں اس کے احکام اس طرح بیان ہوئے ہیں:

”پس سبت کو مانو اس لئے کہ وہ تمہارے لئے مقدس ہے جو کوئی اس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے۔ پس جو کوئی روزِ سبت کام کرے وہ ضرور مار ڈالا جائے“ (خروج ۳۱: ۱۴ و ۱۵)

قرآنِ مجید جس واقعہ کو یاد دلا رہا ہے اس کے انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تاریخ بنی اسرائیل کا کوئی ایسا واقعہ ہے جس کا زمانۂ نزول قرآن میں عام طور سے یہود میں چرچا تھا۔

کسی خاص جگہ کے لوگ جس کا نام قرآن نے نہیں لیا ہے توریت کے اس حکم کی خلاف ورزی کرتے تھے اس کی سزا میں ان پر یہ عذاب نازل ہوا کہ وہ بندروں کی صورت میں مسخ ہو گئے۔ روایت میں اس مقام کا نام ایلہ آیا ہے جو دریا کے کنارے تھا[1]۔

”ہم نے کہا“۔۔۔ یا۔۔۔ ”ہمارا ان کے لئے حکم ہونا اس کے لفظی قول یا حکم ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ ارادۂ الٰہی کی تعبیر ہے[2]۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ان کے اخلاق بندروں کے سے کر دیئے گئے مگر یہ ظاہر الفاظ قرآنی کے خلاف ہے۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾

”تو ہم نے اسے ذریعہ عبرت بنا دیا اس زمانہ اور اس کے بعد کے لئے اور نصیحت بنا دیا، فکر نجات رکھنے والوں کے لیے۔“

یہ تتمہ صاف بتا دیتا ہے کہ سزا محسوس شکل وصوت میں ایسی تھی جس کے عذاب الٰہی ہونے کا ہر شخص کو احساس ہو سکے۔ اخلاق کا مثل بندروں کے ہو جانا یہ اس قسم کی چیز نہیں ہے جسے ہر ایک شخص سمجھ سکے کہ یہ خالق کی طرف کا عذاب ہے جو نازل ہوا ہے آج بندر کیا بندروں سے بھی بدتر بہت سوں کے افعال ہیں مگر اس کے عذاب ہونے کا تصور بھی پیدا نہیں ہوتا۔

---

[1]۔ هم اهل ايلة قرية على شاطئ البحر وهو المروى عن ابن جعفر (طبریؒ) ”مقام ایلہ اگر وہی ہے جس کا ذکر توریت میں ایلات کے نام سے آتا ہے (استثناء ۲: ۸) تو یہ فلسطین کے جنوب میں عرب کی عین شمالی سرحد پر (قدیم علاقۂ روم میں) بحرِ قلزم کی مشرقی خلیج میں لبِ ساحل واقع ہے۔ موجودہ جغرافیہ اس کو عقبہ کے نام سے پہچانتا ہے اور عقبہ خلیج عقب کی مشہور بندرگاہ ہے (دریابادی)

[2]۔ المواد منه سرعة الايجاد واظهار القدرة وان لم يكن هناك قول انما امرنا اذا اردناه ان نقول له كن فيكون (نیشا پوری)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾

”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔ انہوں نے کہا: آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں کہا پناہ بخدا کہ میں جاہلوں میں سے ہوں۔“

بقرہ یعنی گائے کا قصّہ:

اس واقعہ کی تفصیل اہل بیت طاہرینؑ سے دو معتبر روایتوں میں وارد ہوئی ہے [۱]۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک نہایت نیک آدمی کو اس کے ایک ناہنجار عزیز نے قتل کر دیا اور خود آ کر اس کے خون کا دعویٰ کیا۔ اسی کے قاتل کا پتا چلانے کے سلسلے میں یہ گائے کے ذبح کرنے کا حکم ہوا طبرسیؒ یہ گائے بنی اسرائیل کے ایک جوان صالح کی تھی جس کا اپنے باپ کے ساتھ حسن سلوک اللہ کو پسند آیا اور اس کے صلہ میں اس گائے کے ذریعے سے اس کے فقر و فاقہ کو دور کرنا منظور ہوا اس لئے قاتل کا پتا لگانے کے لئے صفات کے ذریعہ سے اس گائے میں انحصار کر دیا تا کہ یہ لوگ اسے منہ مانگی قیمت پر خرید لیں اور وہی اس جوان کی فارغ البالی کا ذریعہ ہو۔ (صافی)

چوں کہ قاتل کی سراغ رسانی کا گائے کے ذبح کرنے سے بظاہر کوئی تعلق نہ تھا اس لئے قوم والے سمجھے کہ یہ مذاق ہے [۲]۔
ظاہر ہے کہ قتل کا ایسا مقدمہ پیش ہونے کے ہنگام پر مذاق کا کوئی محل نہیں ہو سکتا اور اس محل پر مذاق کرنا جہالت کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا اس لئے موسیٰؑ نے مذاق کی نفی ان الفاظ میں فرمائی پناہ بخدا کہ میں جاہلوں میں سے ہوں یعنی اس محل پر مذاق کا میری نسبت تمہیں تصور ہی نہیں ہونا چاہیے [۳]۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾

”انہوں نے کہا ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے التجا کیجئے کہ وہ ہمارے لئے ظاہر کر دے کہ وہ کیسی ہے؟ کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے ایسی ہے جو نہ بوڑھی ہے نہ بن بیاہی، دونوں عمروں کے بیچ میں، ایسی ہے جس کے بچے ہو رہے ہیں۔ بس اب جو حکم ہو رہا ہے اسے انجام دیدو۔“

پہلے حکم کے الفاظ مطلق تھے کہ ایک گائے ذبح کر دو۔ اگر بنی اسرائیل ان الفاظ کے اطلاق پر عمل کر کے کوئی گائے لے آتے اور ذبح کر

---

[۱]۔ رواہ القمی بسند معتبر عن الصادقؑ و ابن بابویہ فی العیون فی الصحیح عن الرضاؑ (بلاغی)

[۲]۔ لم یعرفوا بین ھذا الجواب و ذلك السؤال مناسبة فظنّوا انه یلاعبھم (رازی)

[۳]۔ اطلاق لاسم السّبب علی المسبّب فان الاشتغال بالاستھزاء لایکون الا بسبب الجھل و منصب النبوة یجل عن ذلك (نیشاپوری)

ڈالتے تو اصولاً حکم کی تعمیل میں کسی کمی کا الزام نہیں آسکتا تھا۔ مگر انہیں پہلے تو یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ قاتل کی سراغ رسانی کے لئے واقعی گائے ذبح کی جائے وہ اسے مذاق قرار دے رہے تھے۔ اب جب نبی کی تصریح کے بعد انہیں یہ یقین آیا کہ واقعی یہ حکم ہے تو ان کے ذہن میں آیا کہ بہرحال یہ کوئی عام گائے نہیں ہوسکتی، ضرور کوئی خاص گائے ہوگی۔ جس میں یہ خاصیت ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے کہا کہ وہ گائے کون سی ہے اور کیسی ہے۔ اب ان کی ذہنیت جب اس مشکل پسندی کی طرف مائل ہوگئی جوان کے رجحانِ طبعی کا تقاضا تھی اور وہ علم الٰہی میں پہلے ہی سے تھی تو خالق نے کشاں کشاں ان کو اس معیّن گائے تک پہنچا دینا چاہا جس کے ذریعہ سے اس ایک جوان صالح کی اقتصادی حالت کو درست کرانا مقصود تھا[1]۔

قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوۡنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفۡرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوۡنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيۡنَ ﴿۶۹﴾

”انہوں نے کہا ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے عرض کیجئے وہ ہمیں بتادے کہ اس کا رنگ کیا ہے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے چوکھے زرد رنگ کی جو دیکھنے والوں کو فرحناک بناتی ہو۔“

معلوم ہوتا ہے عموماً اس رنگ کی گائیں کم ہوا کرتی تھیں۔ اس لئے یہ وصف فردواحد تعیین سے بہ نسبت پہلے کے قریب تھا۔

حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کو فرحناک بنانا زرد رنگ کی طبعی صفت ہے[2]۔

قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِىَ ۙ اِنَّ الۡبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيۡنَا ؕ وَاِنَّآ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۷۰﴾

”انہوں نے کہا اپنے پروردگار سے ہماری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمارے لئے مزید توضیح کرے اس لئے کہ گائیں ہمیں ملتی جلتی نظر آتی ہیں اور اللہ نے چاہا تو ہم صحیح راستہ پاجائیں گے۔“

معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ صفات باوجود کمیابی کے اب بھی متعدد گایوں میں جمع نظر آرہے تھے اور ان کی سمجھ میں یہ آتا ہوتا کہ بس کوئی ایک گائے کافی ہے تو وہ پہلے ہی کیوں ”ہندی کی چندی“ کرتے۔ ان کے تو دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہو نہ ہو یہ کوئی خاص گائے ہے۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اوصاف ایسے آئیں جو بس ایک منحصر ہوجائیں۔ ہاں ضرور ہے کہ گذشتہ ہر صفت سے دائرہ تنگ ہوتا جاتا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ رنگ کے وصف کے بعد اب یہ دائرہ کافی تنگ ہوگیا تھا۔ اسی لئے انہیں امید بندھی کہ بس ذراسی تشریح اور ہوجائے تو ہم ایک فردواحد کو معیّن کرنے میں

---

[1]۔ امام رضاؑ کا ارشاد ہے: ولو انهم عمدوا الى بقرة اجزأتهم ولكن شددوا فشدّد الله عليهم (طبرسیؒ) ولا تنافى بين الروايتين لجواز ان يكون ذلك نتيجة علم الله بتشديدهم على انفسهم (بلاغی)

[2]۔ عن علیؑ من لبس نعلا صفراء قلّ همّه لقوله تسر الناظرين (نیشاپوری) روى عن الصّادق علیہ السلام انّه قال من لبس نعلا صفراء لم يزل مسرورا حتى يبليها كما قال الله تعالىٰ صفرآء فاقع لونها تسر الناظرين (طبرسیؒ)

کامیاب ہوجائیں [۱] ۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

”کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہے جو نہ محنت کرنے والی ہے کہ زمین کو جوتتی ہو اور نہ وہ کھیتی کو پانی دیتی ہے۔ وہ بے عیب ہے ایسی کہ اس میں کوئی داغ دھبہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا اب آپ نے ٹھیک ٹھیک پتادیا۔ اب جا کر انہوں نے اسے ذبح کیا اور معلوم تو ایسا ہوتا تھا کہ وہ یہ کریں گے نہیں۔“

معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان ممالک میں عام طور پر گایوں سے بھی کاشت کاری میں کام لیا جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ صفت بجائے خود مشترک بھی ہو لیکن دوسری صفتوں کے ساتھ اس صفت کے اجتماع نے گائے کی ایک مخصوص فرد میں انحصار کا فائدہ دے دیا جس کے بعد کوئی ابہام باقی نہ رہا۔ اور اسی لئے انہوں نے خوش ہو کر کہا کہ اب آپ نے ٹھیک ٹھیک پتہ دیا [۲] ۔

ابتدائی آیت کے الفاظ ان اللہ یا مرکم ان تذبحو ابقرۃ پھر درمیان میں ایک دفعہ کی توضیح کے بعد نبی کا کہنا فافعلو اما تو مرون ”جو حکم ہو رہا ہے بس کر ڈالو“ اور آخر میں یہ کہ وما کا دو ایقعلون ”معلوم تو ایسا ہوتا تھا کہ وہ اسے کریں گے نہیں“ اس سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں یہ تمام موشگافیاں کرنا نہ چاہیے تھیں۔ پہلے ہی جو حکم ہوا تھا اسے بجالے آنا چاہیے تھا۔ انہوں نے بلاوجہ اس معاملہ کو طول دیا اور سوالات کیے جس پر قدرت نے بھی وزن بڑھانا شروع کر دیا۔ اس کی موید حدیث کا حوالہ پہلے آچکا ہے [۳] ۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

”اور جب کہ تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا تھا، پھر تم اس کے بارے میں جھگڑ رہے تھے اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا اس کا جسے تم چھپا رہے تھے تو ہم نے کہا کہ اسی گائے کا ٹکڑا اس پر مارو۔

اس طرح اللہ مردوں کو جلاتا ہے اور تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے، شاید اب بھی تم میں عقل آجائے۔“

اس آیت کے ذریعہ اس گائے کے ذبح کرنے کا سبب اور اس کا نتیجہ سب ظاہر ہو گیا جو ان روایات کے بالکل مطابق ہے جو اس کی تشریح میں وارد ہوئی ہیں۔

توریت میں ایک جگہ قتل کے بعد قاتل کا سراغ نہ ملنے کے موقع پر گائے کے ذبح کرنے کا ذکر ہے اس طرح کہ:

---

[۱] ۔ و معنی اهتدائهم فی هذا الموضع معنی تبیّنهم ایّ ذٰلك الذی لزمهم ذبحه ممّا سواه من اجناس البقر (طبری)

[۲] ۔ الاٰن جئت بالحق ای بحقیقة وصف البقرة بحیث میّزتها عن جمیع ماعداها ولم یبق لنا فی شأنها اشتباه اصلا (ابوالسعود)

[۳] ۔ فی التصحیح عن الرضا علیه السلام لو انهم عمدوا الی بقرة اجزأتهم ولکن شدّدوا فشدّد الله علیهم (بلاغی)

''اگر اس سرزمین پر جس کا خداوند تیرا خدا تجھے ارشاد کرتا ہے، کسی مقتول کی لاش کھیت میں پڑی ہوئی ملے اور معلوم نہ ہو کہ اس کا قاتل کون ہے تب تیرے بزرگ اور تیرے قاضی باہر نکلیں اور ان بستیوں تک جو مقتول کے ارد گرد ہیں، درمیان کو ناپیں اور یوں ہوگا کہ جو شہر مقتول سے نزدیک ہو اس شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے ہنوز کچھ خدمت نہ لی گئی ہو اور جوئے تلے نہ آئی ہو۔ اور وہاں اس وادی میں اس بچھیا کی گردن کاٹیں'' (استثناء ۲۱:۱،۹)

مگر توریت میں اس ذبح کا ماحصل کوئی معلوم نہیں ہوتا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اہتمام صرف قسم کھانے کے لئے ہے کہ ہم نے یہ خونریزی نہیں کی۔ اسلامی روایت یہ ہے کہ گائے کا ٹکڑا مقتول پر مارنے کے بعد وہ زندہ ہو گیا اور اس نے خود اپنے قاتل کا پتہ دے دیا[1]۔

آیت قرآنی میں آخری کذلک یحی اللہ الموتی و یریکم ایاۃ اس روایت کے مناسب ہے۔

آیت کا لفظ قرآنِ مجید میں معجزہ اور غیر معمولی مظاہرہ قدرت کے لئے آتا ہے۔ یریکم ایایۃ سے ظاہر ہے کہ گائے کا ٹکڑا لاش پر مارنے کے بعد کوئی غیر معمولی کرشمہ قدرت نمودار ہوا اور مخرج ما کنتم تکتمون سے ظاہر ہے کہ اس کرشمہ کے ذریعہ سے قاتل کی تعیین ہوگئی۔ یہ صورت بالکل اسی روایت پر منطبق ہوتی ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

''پھر اس کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہی رہے چنانچہ وہ پتھر کے مثل یا اور بھی زیادہ سخت ہیں، اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ بعض سے ندیاں پھوٹ نکلتی ہیں اور بعض ان میں ایسے ہوتے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان میں سے پانی نکلتا ہے اور ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو جلال الٰہی کے اثر سے نیچے آپڑتے ہیں اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔''

''پتھر کے مثل یا اور بھی زیادہ سخت'' اس طرح کی تردید کلام الٰہی میں اور بھی جگہ ہے جیسے قاب قوسین اوادنی'' (دو کمان بھر یا اس سے بھی کم)''۔ ان مقامات پر اوجس کے معنی اردو میں یا کے ہوتے ہیں اظہار شک کے لئے نہیں ہوتا بلکہ وہ بل کے معنی میں ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پتھر کے مثل بلکہ زیادہ سخت ان میں اصل واقعہ وہی ہوتا ہے جو بعد میں آتا ہے مگر یہ ایک اندازِ کلام بمقتضائے بلاغت اختیار کیا جاتا ہے، اس لئے کہ وہی بات ایک دم سے کہہ دی جائے تو اتنی سننے والے کہ ذہن کو متوجہ نہیں کرتی جس قدر کہ اس وقت جب اسے تدریجی طور پر اس کے ذہن تک پہنچایا جائے۔

پتھروں کی جن کیفیات کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے وہ ان کے دلوں کے زیادہ سخت ہونے کا ایک ادبی انداز میں ثبوت ہے یعنی پتھروں

---

[1]۔ فی الکلام محذوف والتقدیر فقلنا اضربوہ ببعضہا فضربوہ ببعضہا فحیی (رازی)

میں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ اثر پذیری آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے اور وہ ان کے تکوینی تغیرات ہیں جو خالق کے نظامِ تخلیق کے ماتحت ہیں۔ وہ اس نظامِ تخلیق سے باہر کبھی نہیں ہوتے۔ مگر تم ایسے انسان ہو کہ تمہارا دل خالق کے مقاصد سے باغی ہی رہتا ہے۔ پھر پتھروں کے ارادہ وجلال الٰہی سے متاثر ہونے کے مناظر خود بنی اسرائیل اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ چکے تھے، اس لئے یہ مثال ان کو مخاطب کر کے مطلب کے واضح کرنے کے لئے انتہائی مناسب اور برمحل ہوسکتی تھی[1]۔

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡہُ وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾

”کیا تمہیں اس کی توقع ہے کہ یہ تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں ایسے لوگ رہے ہیں جو اللہ کا کلام سنتے ہیں اور پھر اسے سمجھنے کے بعد جان بوجھ کر اس میں تحریف کر دیتے ہیں۔“

یہ سوال اب مسلمانوں سے ہے۔ کیا کا لفظ جو سوالی حیثیت رکھتا ہے بغرض استفہام نہیں ہے بلکہ بطور انکار ہے یعنی ان سے یہ امید نہ کرنا چاہیے۔

”یومنو الکم “میں لام سبب کا ہے جس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ تمہاری تبلیغ وہدایت سے متاثر ہو کر ایمان قبول کریں[2]۔

تحریف جس کا ذکر ہو رہا ہے یہ لفظی بھی ہوسکتی ہے اور معنوی بھی۔ لفظی کا مطلب ہے الفاظ میں ترمیم کر دینا اور معنوی اس کی غلط تاویل کر کے کہیں سے کہیں لے جانا۔

من بعد ما عقلوہ کی لفظ تحریف معنوی کے لئے کچھ زیادہ مناسب ہے کیوں کہ سمجھنے کا تعلق معنی سے ہوتا ہے یعنی باوجود یہ کہ اس کا جو اصلی مطلب ہے وہ سمجھ جاتے ہیں پھر بھی جان بوجھ کر اسے غلط معنی پہناتے ہیں اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ جب مطلب سمجھ لیتے ہیں کہ یہ الفاظ ہمارے خلاف پڑتے ہیں تو فوراً لفظوں میں ترمیم کر دیتے ہیں۔ بحیثیت واقعہ حقیقت یہ ہے کہ یہود دونوں قسم کی تحریف کے مرتکب تھے۔ اس لئے دونوں مراد ہوسکتی ہیں۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ قَالُوۡۤا اَتُحَدِّثُوۡنَہُمۡ بِمَا فَتَحَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمۡ لِیُحَآجُّوۡکُمۡ بِہٖ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۷۶﴾

---

[1]۔ قد حدث ھٰذا کلہ لبنی اسرائیل وشاھدہ وھو برأی العین فی الحجر الّذی انفجرت منہ العیون والجبل الّذی تجلی لہ اللہ فجعلہ دکّا وامّا انتم یا بنی اسرائیل فلا تتاثر قلوبکم بالاٰیات ودلائل الحق (بلاغی)

[2]۔ ای یحدثوا الایمان لاجل دعوتکم ویستجیبوا الدعوتکم کقولہ فاٰمن لہ لوط (نیشاپوری)

”اور جب وہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم مومن ہیں اور جب آپس میں تخلیہ ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ جو تمہیں معلومات اللہ نے دی ہیں وہ تم انہیں کیوں بتا دیتے ہو کہ جس سے وہ خود تمہارے خلاف پیشِ پروردگار حجت قائم کریں۔ آخر تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے ہو؟“

منافقین یہود کا رویّہ:

یہ اب یہود میں سے جو منافق تھے ان کا ذکر ہے ان میں سے بہت سے مسلمانوں کے پاس آ کر اظہار ایمان تو کرتے ہی تھے بعض ان میں سے اپنے ایمان کے خلوص کو ظاہر اور مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے اپنی کتابوں سے جو پیغمبر اسلام ﷺ کے ظہور کی پیشین گوئیاں ان کے یہاں موجود تھیں وہ بھی بیان کرتے تھے کہ تم ان دلائل کی بناء پر مسلمان ہوئے ہو۔ یہ لوگ جب آپس کی صحبت میں بیٹھتے تھے تو دوسرے ان کو لعنت ملامت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ خیر ان کے پاس جاؤ اور اسلام کا اظہار کرو انہیں دھوکہ دینے کے لئے اس میں کوئی حرج نہیں مگر یہ کیا غضب کرتے ہو کہ انہیں اپنی کتابوں کی معلومات بھی پہنچا دیتے ہو[1]۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود تمہارے مذہب کی رو سے تمہاری پوری قوم کے مقابل میں دلائل پیش کر سکیں جن کا تمہارے پاس سچ مچ کوئی جواب نہیں ہے۔

”پیش پروردگار“ حجت قائم کرنے کا مطلب بظاہر یہی ہے جس کو ہمارے محاورہ میں یوں کہا جائیگا کہ ”بینی وبین اللہ“ تمہارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ نہ یہ کہ روزِ قیامت حجت پیش کریں کیوں کہ قیامت کے دن تو حقیقتیں خود ہی منکشف ہوں گی، حجت و استدلال کا کوئی موقع نہ ہوگا۔

أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٧٧﴾

”کیا انہیں یہ نہیں معلوم ہے کہ جو یہ چھپائیں اور جو ظاہر کریں اللہ کو اس سب کا علم ہے۔“؟

یعنی پیغمبرؐ کو ان دلائل کے معلوم ہونے میں جو ان کی کتابوں میں ہیں ان کے بتانے کی ضرورت نہیں ہے انہیں تو اللہ کی طرف سے اطلاع حاصل ہوتی ہے جس کا علم ظاہر اور پوشیدہ سب پر حاوی ہے اس لئے یہ بتائیں یا نہ بتائیں اللہ اپنے رسولؐ کو جب چاہے گا ان تمام باتوں کی اطلاع دیدے گا۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٧٨﴾

”اور ان میں کچھ ایسے ان پڑھ لوگ ہیں جو سوا بلند بالا توقعات کے اپنی کتاب کا کچھ بھی علم نہیں رکھتے اور وہ بس خام خیالیوں میں مبتلا ہیں۔“

یہ ان عوام کا ذکر ہے جو مذہب کی حقیقت بس اتنی جانتے ہیں کہ ہم اس کی وجہ سے آخرت میں بلند سے بلند تر درجہ کے مستحق ہیں مگر خود اس مذہب کی جس سے نجات کے متمنی ہیں الف ب بھی نہیں جانتے ایسے عوام آج مسلمانوں میں بھی ہیں اور وہ بھی اپنی خام خیالیوں پر کوئی قابل

---

[1] ۔بما فتح اللہ علیکم .بما بیّن لکم فی التّورٰة من نعته وصفته (نیشاپوری)

تعریف حیثیت نہیں رکھتے۔

یہود کے ان بلندوبالا توقعات کا ذکر قرآنِ مجید میں کئی جگہ تفصیل کے ساتھ بھی آیا ہے جیسے یہ کہ جنت میں بس ہم ہی ہم ہوں گے وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ کَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی (بقرہ۔۱۱۱) وہ کہتے ہیں کہ بہشت میں ہرگز کوئی داخل نہیں ہوگا سوا اس کے جو یہودی یا عیسائی ہو۔"

یا یہ کہ دوزخ میں ہم گئے بھی تو بس چند دن کے لئے پھر بہشت میں پہنچنا ضروری ہے لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً (بقرہ۔۸۰)(یعنی) ہمیں آگ چھوبھی نہیں جائے گی سوا گنتی کے چند دنوں کے یا یہ کہ ہم من حیث الجماعت اللہ کے بیٹے اور اس کے لاڈلے ہیں نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ۔۱۸)

اب جائزہ لے لیجئے کہ سو فیصدی وہی خیالات اسلامی جماعت کے بہت سے افراد میں سرایت کیے ہوئے ہیں یا نہیں؟ ان کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نجات کیلئے فرائض واعمال اخلاق حسنہ اور تکمیل نفس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے حالانکہ اسلام ایمان محبت اہل بیت اور ولایت علی بن ابی طالبؑ ہر چیز کا لازمی نتیجہ اطاعت واتباع ہے جو استحقاق نجات کے لئے ضروری ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۚ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

"وائے بحال ان لوگوں کے جو اپنے ہاتھوں سے جعلی نوشتہ لکھ کر تیار کرتے ہیں پھر فقط تھوڑا سا معاوضہ حاصل کرنے کے لئے کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ وائے بحال انکے اس کی وجہ سے جو وہ لکھتے ہیں اور وائے بحال ان کے اس کی وجہ سے جو وہ کمائی کرتے ہیں۔"

کتب سماویہ میں تحریف:

یہ اب علمائے یہود کا ذکر ہے جیسا کہ مولانا عبدالماجد صاحب نے لکھا ہے:

"توریت کی تحریف اب کوئی اختلافی یا نزاعی مسئلہ نہیں۔ دوست دشمن سب ہی کو اب تسلیم ہو چکا ہے کہ یہ کلام الٰہی نہیں اور اس کے دوست زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا رسیدہ انسانوں کی تصنیف ہے۔ کسی جامد سے جامد یہودی میں بھی اب یہ ہمت باقی نہیں کہ توریت کو قرآن مجید کی طرح تنزیل لفظی قرار دے اب زیادہ سے زیادہ جو کہا جاتا ہے وہ یہ کہ خاصانِ خدا نے الہام خداوندی سے مشرف ہو کر اپنے طور پر اور اپنی عبارت میں ترتیب وتالیف دیا اور خدائے تعالیٰ کی جانب اس کا انتساب صرف مجازاً یا بالواسطہ ہے حقیقی اور براہ راست کے مفہوم میں نہیں پھر وقتاً فوقتاً جو تصحیفات ہوتی رہی ہیں وہ بالفرض کسی مصلحت یا ضرورت ہی سے ہوئی ہوں بہرحال نفس ان کے وقوع کا اعتراف کھلے خزانے سب کو ہے اور بائبل کی تنقید ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ جرمن فرنچ انگریزی وغیرہ میں چھوٹی بڑی صدہا بلکہ ہزارہا کتابیں اس موضوع پر

تیار ہو چکی ہیں اور مقامات ومضامین کا تو شمار ہی نہیں پھر فن بھی مختلف شاخوں میں تقسیم ہو چکا ہے انتقادِ متن انتقادِ تاریخی وغیرہ اور ہر شاخ کے الگ الگ ماہرین پیدا ہو رہے ہیں۔عرب کے امی کے لائے ہوئے کلام کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے تیرہ صدی پیشتر ہی اہل کتاب کی کتاب کو (جو لفظی ترجمہ ہے بائبل کا) تمام تر محرف ونا قابل اعتماد قرار دے دیا تھا۔"

وَقَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدَةً ‌ؕ قُلۡ اَتَّخَذۡتُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ عَهۡدًا فَلَنۡ يُّخۡلِفَ اللّٰهُ عَهۡدَهٗۤ‌ اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۰﴾

"اور ان کا قول ہے کہ ہمیں دوزخ کی آگ تو چھو بھی نہیں سکتی سوا چند گنتی کے دنوں کے۔کہو کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد نامہ کرا لیا ہے کہ اللہ اپنے عہد نامہ کے خلاف کبھی نہ کرے گا یا تم بے جانے خود ہی اللہ پر ایک بات عائد کر رہے ہو"؟

کہا جاتا ہے کہ یہودی اس کے قائل تھے کہ ہمیں اتنے دن کہ جن میں موسیٰؑ کی غیبت کے موقع پر گوسالہ کی پرستش ہوئی تھی اور وہ چالیس دن تھے آتش دوزخ کی سزا دی جائے گی۔اس کے بعد چاہے کتنا ہی بداعمال یہودی ہو وہ دوزخ میں نہیں رہ سکتا۔اسی کی رد کی گئی ہے کہ یہ تم نے اللہ کے یہاں کے معاملات میں اپنے دل سے کیوں کر فیصلہ کر لیا ہے اور اللہ اس کا پابند کس بناء پر سمجھا جا سکتا ہے۔

بَلٰى مَنۡ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِيۡٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۱﴾

"کیوں نہیں"، جو بھی برا کام کرے گا اور اس کے قصور اس پر حاوی ہو جائیں گے، تو یہی لوگ دوزخ والے ہوں گے کہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔"

یہ بَلٰی جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے "کیوں نہیں"، اس نفی سے متعلق ہے کہ ہمیں دوزخ کی آگ چند گنتی کے دنوں کے سوا چھو نہیں سکتی۔ اس کی رد کی جا رہی ہے اور اس ذیل میں نجات اور عدم نجات کے استحقاق کا ایک عام اصول بتایا جا رہا ہے کہ یہ کیا کہ "ہمیں تو" آگ چھو بھی نہیں سکتی۔اللہ کے یہاں "ماوشما" کا سوال نہیں۔اس کے یہاں کی نجات اور عدم نجات کا تعلق تو انسان کی زندگی اور اس کے کردار سے ہے، اگر وہ بے گناہ ہے یا گناہگار ہے مگر گناہوں کے ساتھ حسنات بھی موجود ہیں جن میں ایک بہت بڑا حسنہ 'ایمان' ہے تو نجات کی امید کی جا سکتی ہے اور سزا ہو بھی تو اعمال کے تناسب سے عارضی ہو گی لیکن اگر جان بوجھ کر معصیت میں مبتلا رہا اور سب سے بڑی معصیت اس کے پیغام کو ٹھکرا دینا ہے جس کا نام کفر و شرک ہے اور جو سلطنت الٰہی سے بغاوت کرنا ہے اور اس کی پوری زندگی اس میں غرق رہی، حسنات کا اس کے نامہ اعمال میں نشان ہی نہیں ہے، تو اب وہ کسی قوم اور کسی جماعت سے بھی تعلق رکھتا ہو اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عذاب دوزخ کا استحقاق حاصل ہے اور اسے نجات حاصل ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ ۚ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

”اور جو ایمان لائیں اور اچھے اعمال کریں تو یہ لوگ بہشت والے ہیں کہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔“

جس طرح وہ وعید اپنے عقائد و اعمال سے وابستہ ہے اسی طرح یہ وعدہ بھی حسن اعتقاد اور حسن عمل دونوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر دونوں باتیں حاصل نہیں تو پھر حتمی وعدہ نہیں ہے۔ ہاں تفضّل و احسان و کرم خسروانہ سے مغفرت ہو جائے تو اس پر پابندی عائد کرنے کا کسی کو حق نہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

”اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور حسن سلوک سے پیش آنا اپنے ماں باپ عزیز و اقارب، یتیموں اور محتاجوں سے اور لوگوں کے ساتھ حسن گفتار سے کام لینا اور نماز ادا کرنا اور زکوۃ دیتے رہنا پھر تم سب پلٹ گئے بجز تم میں سے تھوڑے سے آدمیوں کے اور تم سب نے روگردانی اختیار کی۔“

عہد نامہ:

یہ عہد و پیمان ضروری نہیں کہ کسی خصوصی مظاہرہ کی شکل میں ہو بلکہ انبیاء و مرسلین پر ایمان لانے ہی میں یہ عہد مضمر ہے کہ ہم ان کے تعلیمات پر عمل کریں گے۔ پھر جب ان انبیاء کی تعلیمات میں ان باتوں کا حکم موجود ہے تو اسی کو کہا گیا ہے کہ اللہ نے اس کا عہد لیا ہے۔

اس لفظ کی اہمیت اس سے بڑھ جاتی ہے کہ خود اہل کتاب کی اصطلاح میں آج تک بائبل ”عہد نامہ“ ہی کہا جاتا ہے چنانچہ توریت اور اس کے ملحقات کو ”عہد قدیم“ اور انجیل اور اس کے ملحقات کو ”عہد جدید“ کہا جاتا ہے۔

اکثر یہ باتیں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے توریت میں اب بھی موجود ہیں۔ مثلاً پہلی بات ”اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو“۔ اس کیلئے ملاحظہ ہو توریت کا حکم: ”میرے حضور تیرے لئے دوسرا خدا نہ ہووے تو اپنے لئے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر پانی میں زمین کے نیچے ہے مت بنا۔ تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر“ (خروج ۲۰:۲۰۵ و استثناء ۵:۷ و ۸)

اور بھی مقامات پر اس کی ہدایت کی گئی ہے

والدین کے متعلق: ”تو اپنے ماں باپ کو عزت دے (خروج ۲:۱۱۲ استثناء ۵:۱۶)

اعزا کے متعلق: ”اور اپنے مفلس بھائی کی طرف سے اپنے ہاتھ مت بند کیجیو بلکہ تو اس پر اپنا ہاتھ کشادہ رکھیو اور کسی کام میں جو وہ چاہیے بقدر اس کی احتیاج کے ضرور اس کو قرض دیجیو (استثناء ۱۵:۸ و ۹)

یتیموں اور محتاجوں کے بارے میں اور مسافر اور یتیم اور بیوہ جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہیں آویں اور کھاویں اور سیر ہوویں۔" (استثناء ۲۹:۱۴)

بعض باتیں اگر توریت میں اب نہیں ملتیں تو یہ تحریفات کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔

لوگوں کے ساتھ حسن گفتار کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی دل آزادی نہ ہو تو ہین یعنی تمسخر و استہزاء نہ ہو۔

بہترین معیار یہ ہے کہ جس طرح تم خود اپنے سے گفتگو پسند کرتے ہو اسی عنوان پر دوسرے سے گفتگو کرو [1]۔

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ لَا تَسۡفِكُوۡنَ دِمَآءَكُمۡ وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ﴿۸۴﴾

"اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں خونریزی نہ کرنا اور اپنے آدمیوں کو گھر سے بے گھر نہ کرنا پھر تم نے اس کا اقرار کیا جس کے گواہ تم خود ہو۔"

اس اقرار کا ثبوت توریت میں اب بھی موجود ہے:

"وہ بولے کہ سب کچھ خداوند نے فرمایا ہے ہم کریں گے اور تابع رہیں گے" (خروج ۲۴:۷)

ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَتُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ؕ وَاِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ ؕ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾

---

[1] عن الباقر علیہ السلام قولو اللناس ما تحبون ان یقال لکم (نیشا پوری) کی الکافی والعیاشی عن الباقر علیہ السلام فی ھٰذہ الاٰیۃ قولو اللناس حسنا احسن ما تحبّون ان یقال لکم فان اللہ یبغض اللعان السباب الطعان علی المؤمنین المتفحش المسائل الملحف ویحب الحیّ الحلیم العفیف المتعفف (صافی)

"پھر اب تم یہ ہو رہے ہو کہ آپس میں خونریزی بھی کرتے ہو اور اپنوں میں سے کسی کسی گروہ کو گھر سے بے گھر بھی کر دیتے ہو اور ان کے خلاف گناہ وظلم کے ساتھ متفقہ سازش کرتے ہو اور اگر وہ قید ہوجائیں تو فدیہ ان کا تم ہی دیتے ہو حالانکہ ان کا گھروں سے نکالنا ہی تمہارے لئے ناروا ہے تو کیا تم کتاب کے کسی کسی جزء کو مانتے ہو اور کسی جزء سے انکار کرتے ہو؟ پھر کیا سزا ہے اس کی جو تم میں سے ایسا کرے سوا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے اور قیامت کے دن وہ سخت ترین عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اللہ بے خبر نہیں ہے۔"

مدینہ میں یہود کے تین بڑے قبیلے تھے: بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی قینقاع اور مشرکین کے دو قبیلے تھے، اوس اور خزرج جن میں جنگ رہتی تھی۔ یہودی قبائل میں سے بعض جنگ میں ایک طرف ہوجاتے تھے اور بعض دوسری طرف اس طرح مشرکین کی باہمی لڑائی میں یہ بھی ایک دوسرے کے فریق بن جاتے تھے اور پھر جب لڑائی ہوتی تھی تو ظاہر ہے کہ یہودیوں ہی کے ہاتھ سے یہودیوں کا خون بہتا تھا۔ گھر سے بے گھر ہونا پڑتا تھا اور وہ سب کچھ ہوتا تھا جو جنگ کے نتیجہ میں اس زمانہ میں ہوا کرتا تھا۔ اسی کو قرآن مجید نے لعنت ملامت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

یہ فقرہ کہ "اگر وہ قید ہوجائیں تو فدیہ ان کا تم ہی دیتے ہو" ان کے عمل کا تضاد دکھانے کے لئے ہے یعنی یوں تو تمہیں اتحاد قومی کا اتنا احساس ہے کہ اگر کسی غیر قوم کے ہاتھ میں کبھی تمہارے اس دوسرے قبیلہ کا آدمی گرفتار ہوجائے تو تم جس طرح بھی ممکن ہو اس کا معاوضہ دے کر اسے چھڑا لینا چاہتے ہو مگر بلاوجہ جنگ کے ہنگام میں خود ہی ان کو قتل کرتے ہو یا گھروں سے نکال کر بے وطن بناتے ہو[1]۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کے عوض مول لیا ہے لہٰذا نہ ان پر عذاب میں کوئی کمی ہوگی اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔"

وہ سمجھتے تھے کہ ہم انبیاء کی اولاد ہیں اس لئے ہمیں آخرت میں کوئی کھٹکا نہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد ہماری مدد کریں گے۔ قرآن نے اسی آسرے کا خاتمہ کیا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

---

[1] ـفکیف تستجیزون قتلهم ولا تستجیزون ترك فدائهم من عدوهم (طبری)

”اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی اور ان کے بعد لگا تار پیغمبروں کا سلسلہ قائم رکھا اور مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ کو ہم نے نمایاں معجزے عطا کیے اور روح القدس سے ان کو تقویت پہنچائی تو کیا جب بھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ان باتوں کو لے کر آئے جنہیں تمہارے نفوس پسند نہیں کرتے تو تم اکڑا ہی کرو گے بعض کو تو جھٹلاؤ گے اور بعض کو قتل ہی کر دو گے؟“

بیّنات کے لغوی معنی تو کھلے ہوئے دلائل یا واضح نشانیوں کے ہیں مگر اصطلاح قرآنی میں خوارقِ عادات 'یعنی غیر معمولی مظاہرات قدرت کو جو رسولوں کے دعوائے نبوت کی تصدیق میں نمودار ہوتے ہیں آیات اور بیّنات کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل ہم نے مقدمہ تفسیر میں شواہد و دلائل کے ساتھ درج کیا ہے۔

روح القدس قرآنی اصطلاح میں ایک فرشتہ کا نام ہے ممکن ہے وہ جبرائیلؑ ہی ہوں۔

اس مقام پر روح القدس کے ذریعہ سے تائید کو اپنی جانب منسوب کر کے عیسائی عقیدہ تثلیث کی جو روح القدس کو عیسیٰؑ کے ساتھ اللہ کا شریک قرار دیتا ہے رد کی ہے۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

”اور کہتے ہیں وہ کہ ہمارے دلوں پر قدرتی غلاف چڑھے ہوئے ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے انہیں اللہ نے رحمت سے دور کر دیا ہے۔ تو اب کم ایمان لائیں گے۔“

پیغمبر کی تبلیغ و تلقین کے مقابلہ میں وہ طنزیہ طور پر الفاظ استعمال کرتے تھے کہ آپ یہ کوشش ہماری ہدایت کی بے کار کرتے ہیں۔ ہمارے دلوں پر تو قدرتی غلاف ہیں لہٰذا ہم ایمان آپؐ پر لا ہی نہیں سکتے [1]۔

بل کے لفظ سے قرآن نے ان کی رد کی ہے کہ ان کے دلوں پر قدرتی خلاف نہ تھے مگر انکے کفر و عناد کے نتیجہ میں ان کی صلاحیت ایمان کم ہوگئی ہے۔ اس صلاحیت کے کم ہونے اور توفیقات کے سلب ہونے ہی کو یہاں ”لعنت“ کی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے [2]۔

”اب وہ بہت کم ایمان لائیں گے“۔ یہ کمی ایمان لانے والوں کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے یعنی زیادہ افراد ان میں کفر پر قائم رہیں گے بہت تھوڑے ایسے ہوں گے جو ایمان لائیں اور یہ باعتبار قلت صلاحیت کے بھی ہو سکتا ہے یعنی ایمان لانے کا ان کے بہت کم امکان ہے۔ بہر حال اس سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ کفر کے بعد بھی جو اثر مرتب ہوا ہے وہ بحد اضطرار نہیں ہے ورنہ اس کے خلاف ہونا کم افراد میں یا کم درجہ تک بھی غیر ممکن ہوتا۔

---

[1] ۔ان قلوبنا مغشاة باغطية مانعة من وصول اثر دعوتك اليها (رازی) ”اغلف“ کہتے ہی غیر مختون کو، اُس کو جس کے ختنہ نہ ہوا ہو۔ نامختون کہنے کا محاورہ یہود کی زبان پر عام طور سے چڑھا ہوا تھا۔ انجیل میں بھی آیا ہے ”اے گردن کشو اور دل اور کان کے نامختونو (اعمال ۷:۵۱) قرآن کا یہ اندازِ بیان بھی ایک اعجازی پہلو رکھتا ہے کہ جب یہود کا قول نقل کیا تو زبان بھی ان ہی کی اختیار کی (دریابادی)

[2] ۔بل لعنهم الله ردّ لقولهم وان تكون قلوبهم مخلوقة كذلك لانها خلقت الفطرة والتمكن من قبول الحق و لكنهم لعنوا اى طردوا عن رحمة الله وابعدوا عن الخيرات بسبب كفرهم الّذى احدثوه بعد نصب الادلة وازاحة الغلة (نیشاپوری)

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

”اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آئی جو ان کے پاس ولی کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے تو باوجود یہ کہ اس کے پہلے یہ لوگ خود کافروں کے سامنے اس کتاب کے ذریعہ سے فتح وظفر کا اعلان کرتے تھے اب جسے وہ پہلے سے جانتے تھے جب ان کے پاس آئی تو وہ خود اس کے منکر ہو گئے اللہ کی لعنت ہو کافروں پر۔“

یہود کا انتظار اور بعد میں انکار:

”تصدیق کرنے والی کتاب“ سے مراد یہی قرآن ہے۔ اس کا خاص جوہر یہ ہے کہ اس نے پہلے ولی کسی کتاب کی اصلاً صداقت سے انکار نہیں کیا ہے بلکہ سب کو من جانب اللہ مانا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں اس کے ماننے والوں کی تحریفوں کا پردہ فاش کیا ہے۔

اہل کتاب کے مقابلہ میں جو کافروں کا نام ہے اس سے مراد مشرکین ہے یعنی جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی نبوت کے بھی قائل نہ تھے تو اسلام کے آنے سے پہلے ان کے مقابلہ میں اہل کتاب مومن کی حیثیت رکھتے تھے اور وہ کافر کی۔ یہ اہل کتاب ان کافروں کے سامنے جب بات پڑتی تھی تو کہتے تھے کہ ابھی تم جو چاہو ہمارے ساتھ بدسلوکی کرلو۔ دیکھنا جب محمد مصطفی ﷺ مبعوث ہوں گے تو پھر مدینہ میں ہم ہی ہم ہوں گے۔ تمہارا یہاں پتہ بھی نہیں ہوگا۔ مگر جب حضرتؐ کی بعثت ہوئی تو وہ یعنی باشندگان مدینہ اوس وخزرج تو ایمان لائے اور یہ خود آپؐ کی رسالت کے منکر ہو کر کافر بن گئے [۱]۔

یہ ظاہر کرنے کے بعد کہ ان کا انکار کسی غلط فہمی یا نادانی کا نتیجہ نہیں بلکہ سراسر تعصب وعناد پر مبنی ہے خاتمہ آیات میں ان کو مورد لعنت قرار دیا گیا ہے۔

قرآنِ مجید میں کافروں، ظالموں اور کاذبوں پر لعنت بہت جگہ وارد ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مستحق لعنت پر لعنت دشنام نہیں ہے جو خلاف وشائستگی ہو بلکہ وہ کسی کے اعمال سے بیزاری کے اظہار کا بالکل سنجیدہ عنوان ہے [۲]۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ

---

[۱]۔ کانت الیہود تقول لھن امالو قد بعث فیکم محمد النخرجنکم من دیارنا وامو النا فلما بعث اللہ محمدا اٰمنت بہ الانصار وکفرت بہ الیہود (صافی) روی فی الکافی فی لموثق عن الصّادقؑ وعن تفسیر العیاشی عن الصّادقؑ مثلہ وفی صحیحۃ اسحٰق بن عمار عن الصّادقؑ ما یقرب من ھٰذا فیکون معنی یستفتحون یستنصرون بالتھدید دیطلبون فی کلا مھم ما یصلون من الفتح والنصر فی المستقبل (بلاغی)

[۲]۔ ان لعن من یستحق اللّعن من القول الحسن (رازی)

فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٩٠﴾

"انہوں نے اپنے نفوس کے بچانے کا کیا برا سامان کیا ہے کہ وہ انکار کرتے ہیں اس کا جسے اللہ نے نازل کیا ہے صرف اس بات کی ضد میں کہ کیوں اللہ اپنے فضل وکرم کی اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے بارش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے دہرے غضب کے مستحق ہیں اور کافروں کے لئے ذلت دینے والا عذاب ہے۔"

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اشتراء کے معنی بیع کے بھی ہوتے ہیں اور یہاں **اشتروا** کے معنی یہی ہیں کہ انہوں نے کسی بری قیمت پر اپنے نفوس کو بیچا ہے مگر کلام عرب میں عموماً بیع کے محل پر شراء ہوتا ہے نہ کہ اشتراء کے معنی خریدنے ہی کے ہوا کرتے ہیں [1]۔

دوسرا قول یہ ہے اور وہی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کہ اشتراء کے معنی خریدنے کے ہیں اور خریداری کا مطلب ہے عذاب آخرت سے اسے چھڑانے کا سامان کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو یہ سامان ایمان اور اطاعت سے مہیا کرنا چاہیے مگر علمائے یہود کی عقل مندی دیکھو کہ یہ خدا ترسی کا ادعاء رکھتے ہوئے بطور سامان نجات کے کفر وعناد کا ذخیرہ فراہم کررہے ہیں [2]۔

یہ کفر عناد کس لئے تھا، نسلی تعصب کی بناء پر کہ نبوت خاندان اسرائیل سے نکل کر اولاد اسمٰعیل میں کیوں چلی گئی ہے۔ گویا وہ اللہ کے فضل وکرم پر پہرے بٹھانا چاہتے تھے کہ وہ ان سے نکل کر کسی اور طرف نہ جاسکے۔ اب اس میں دو جرم ہوگئے ایک بلاوجہ حقیقت کا انکار جس کا نام کفر ہے اور دوسرے حسد جس کے معنی ہیں اللہ کی نعمت کو جس سے اس کسی کو سرفراز کیا ہے دیکھ کر جل جانا اور اس کے مٹانے کی فکر کرنا۔ اور ان میں سے ہر جرم مستحق غضب ہے اس لئے کہا گیا کہ وہ غضب بالائے غضب یا دہرے غضب کے مستوجب ہیں اور چوں کہ ان کا کفر بر بنائے غرور وتکبر تھا اسی لئے ان کی سزا کے لئے بھی دو لفظ صرف کئے ایک تو عذاب جو کفر ومعصیت کا نتیجہ ہے ہی اور دوسرے مہین یعنی ذلت دینے والا جو ان کے غرور کے بالمقابل ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩١﴾

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس پر جو اللہ نے نازل کیا ہے ایمان لاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ جو ہم پر نازل ہوا ہے اس پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور جو اس کے علاوہ ہے اس کے یہ منکر ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور ان کے پاس والی کتاب

[1]۔ کلام العرب فیما بلغنا ان یقولوا شریت بمعنی بعت واشتریت بمعنی ابتعت (طبری)

[2]۔ وھذا الوجہ اقرب الی المعنی واللفظ من الاول (رازی)

کی تصدیق کرنے والا ہے کہو کہ اچھا اگر تم ایمان رکھتے تھے تو اس کے پہلے انبیاء کو کیوں قتل کر ڈالتے تھے؟"

یہود کا گزشتہ انبیاء کے ساتھ سلوک:

مطالبہ ایمان کا جواب بنی اسرائیل یعنی یہودی یہ دیتے تھے کہ کوئی ہم کا فر تھوڑی ہی ہیں ایمان رکھتے ہیں قرآن نے اس کا جواب پہلے یہ دیا ہے کہ خود ان کے اس قول کے معنی یہ ہوئے کہ جو کچھ ان کے خاندان میں نہیں اترا ہے اس کے یہ منکر ہیں اور جب کہ وہ بھی حق ہے اور من جانب اللہ ہے اور پھر یہ کہ وہ خود ان کی کتاب کی تصدیق کرنے والا ہے کچھ اس کے خلاف نہیں ہے تو اس کا صرف عناد اور تعصب سے منکر ہونا یہی کفر ہے اس کے بعد پھر ان کے خود اپنے خاندان والی کتابوں پر ایمان کا ان کے قومی کردار کی رو سے جائزہ لیا ہے کہ تم نے من حیث القوم ان ہی کتابوں کو کب مانا تھا بلکہ تم تو ان پیغمبروں کو جو تمہارے پاس آتے رہے قتل ہی کرتے رہے۔ پھر تمہارا دعوائے ایمان خود ان ہی کتابوں پر کہاں تک درست اور حق بجانب ہے؟!

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ﴿۹۲﴾

"اور موسیٰؑ تمہاری جانب کھلے ہوئے معجزے لے کر آئے پھر تم نے اس کے بعد بھی حد سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے گوسالہ پرستی اختیار کی۔"

بنی اسرائیل کی آنکھوں کے سامنے جتنے معجزے آئے اتنے شاید ہی کسی دوسری قوم کے سامنے آئے ہوں۔ اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اوّل درجہ کے بالیقین ہوتے مگر واقعات سے یہ قوم جتنی ڈھلمل یقین ثابت ہوئی شاید ہی کوئی قوم ثابت ہوئی ہو۔

قرآن میں بنی اسرائیل کے واقعات پر زور اس امت کی تنبیہ کے لئے دیا گیا ہے چوں کہ خود حضرتؐ نے اس امت والوں کو مخاطب کر کے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ تم بنی اسرائیل کے طریقے اختیار کرنے والے ہو[1]۔ اس لئے اس قوم کے کرتوت پر بار بار روشنی ڈالی گئی کہ اس امت کے فرض شناس افراد ان راستوں پر نہ چلیں اور نہ چلنے والوں کا ساتھ دیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴿۹۳﴾

[1] ۔لتتبعن... سنن بنی اسرائیل حذو القذّۃ بالقذّۃ حتیٰ لو دخلوا جحر ضب لدخلتموہ (حدیث نبوی)

’’اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے اوپر کوہ طور کو بلند کیا کہ جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑو اور بات کی سماعت کرو، انہوں نے کہا کہ سن تو ہم نے لیا مگر ماننے پر تیار نہیں ہیں اور ان کے کفر کے سبب سے ان کے دلوں میں گوسالہ کی محبت سرایت کر گئی۔ کہو کہ اگر تم ایمان والے ہو تو تمہارا ایمان کیسے برے تقاضے تم سے کرتا ہے۔‘‘

’’سن تو لیا مگر ماننے پر تیار نہیں‘‘۔ یہ ہوسکتا ہے کہ جسارت آمیز تمسخر کے ساتھ انہوں نے زبان ہی سے کہہ دیا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے نہ کہا ہو بلکہ عمل ان کا اسی کا ترجمان ثابت ہو رہا تھا۔

یہاں تک بظاہر تمام جواب ان کے اس قول کا چلا آ رہا ہے کہ جو ہم پر نازل ہوا ہے اس پر تو ہم ایمان لائے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ سب کہا گیا کہ اگر تم ایمان لائے تھے تو انبیاء کو کیوں قتل کرتے رہے۔ کتنے معجزے پیش کیے گئے اور پھر اس کے بعد بھی تم نے گوسالہ پرستی اختیار کی۔ اس عہد و پیمان کے بعد کہ ہماری شریعت اور اس کے احکام کی اطاعت کرو گے پھر بھی تم نے قولاً یا عملاً اطاعت سے انکار کر دیا۔ اگر تم واقعی اپنی کتابوں پر ایمان رکھتے ہوتے تو اس کے تقاضے یہ نہ ہوتے جو تم سے ظاہر ہوئے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾

’’کہو کہ اگر عالم آخرت پیش خدا صرف تمہارے لئے ہے تمام دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر تو اگر تم سچے ہو تو تمہیں موت کا مشتاق و آرزومند ہونا چاہیے۔‘‘

تمنائے موت کا مطالبہ اور یہود کی نفسیاتی کیفیت:

یہود نسلی طور پر اپنے کو نجات کا حق دار سمجھتے تھے۔ یہ ان کا عقیدہ مختلف الفاظ میں قرآن مجید میں نقل کیا گیا ہے اور ہر جگہ ایک خاص طرز میں اس کی رد کی گئی ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (بقرہ ۱۱۱)

ان کا قول ہے کہ ہرگز بہشت میں داخل نہیں ہوگا کوئی سوا اسکے جو یہودی یا عیسائی ہو یہ ان کی آرزوئیں ہیں کہو کہ تم اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ (مائدہ ۱۸)

اور یہودی وعیسائی کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ کہو کہ پھر بھلا وہ تمہارے گناہوں کی سزا کیوں دیگا؟ بلکہ تم بھی اس کی مخلوق میں سے کچھ انسان ہو۔

یہاں ان کے جواب میں کہا گیا ہے کہ اگر تم بلا ایمان و عمل صالح صرف اسرائیلی قوم اور یہودی مذہب میں پیدا ہونے کی وجہ سے یقین نجات رکھتے ہو تو پھر موت سے خائف کیوں ہوتے ہو۔ جب جانیں کہ موت کے مشتاق اور آرزومند ہو۔

مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ نجات کسی قوم اور نسل میں پیدا ہونے سے وابستہ نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ایمان اور عمل صالح کی ضرورت ہے۔ اب اگر مسلمانوں میں سے کوئی فرد یا جماعت کسی وقت یہ سمجھنے لگے کہ ہم بلا لحاظ صفات شخصی صرف جماعتی انتساب کی وجہ سے نجات کے حق دار ہو جائیں گے تو یہی تمام جوابات و مطالبات جو قوم یہود کے سامنے پیش کیے گئے ہیں اس کے سامنے بھی پیش کیے جا نا درست ہوں گے۔

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

"اور وہ اس کے آرزومند کبھی نہیں ہو سکتے ان گناہوں کی وجہ سے وہ اپنے ہاتھوں سے کر چکے ہیں اور خدا اپنی حدود سے تجاوز کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔"

اس میں ان کے ضمیروں کی ترجمانی کی گئی ہے یعنی وہ زبان سے لاکھ کہیں کہ لقائے الٰہی کے ہم مشتاق ہیں مگر وہ جانتے ہیں کہ ان کی سیاہ کاریاں اس لائق نہیں ہیں کہ وہ اس حال میں اپنے خدا کو منہ دکھا سکیں۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

"اور ایک خاص طرح کی زندگی کا لالچ ان میں سب سے یہاں تک کہ مشرکین سے بھی زیادہ پاؤ گے۔ ان میں کا ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اسے ہزار برس کی عمر ملتی حالانکہ اس عمر کا ملنا بھی اسے عذاب سے نہیں بچا سکتا اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے اللہ خوب دیکھتا ہے۔"

مشرکین کا ذکر اس محل پر اس لئے کیا گیا کہ وہ تو آخرت کے قائل ہی نہیں اس لئے وہ اگر اس دنیاوی زندگی کو زیادہ سے زیادہ عزیز رکھیں تو کوئی تعجب نہیں مگر یہ یہود تو کتب سماویہ پر ایمان کا ادعا رکھنے والے ہیں۔ انہیں تو دنیا سے اتنا دل نہ لگانا چاہیے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾

"کہہ دیجئے کہ جو شخص جبرائیل کا دشمن ہے تو انہوں نے تو اس کو آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے تصدیق کرتا ہوا اس کی جو اس کے پہلے سے تھا اور ہدایت اور خوشخبری ایمان لانے والوں کے لیے۔"

انبیاء مرسلین سے سنی سنائی باتوں کے مٹے ہوئے آثار یہود میں اس حد تک تھے کہ وہ فرشتوں کو وجود تسلیم کرتے تھے کچھ بھولے بسرے نام جبرائیلؑ، میکائیلؑ وغیرہ بھی ان کے ذہن میں تھے مگر جبرائیلؑ کے ساتھ ان کے یہاں یہ روایت وابستہ ہوگئی تھی کہ یہ امتوں پر عذاب ہی لاتے ہیں۔ رسولؐ خدا نے اپنی وحی کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ یہ وحی جبرائیل لاتے ہیں تو وہ اس پر بڑے چراغ پا ہوئے اور انہوں نے کہا کہ

یہ جبرائیل تو ہمارے پرانے دشمن ہیں۔ اس لئے وہ ہمارے خلاف اس طرح کی آیتیں لاتے ہیں۔ اسی کا جواب قرآن نے دیا ہے۔

عقلاً یہ ہے کہ یا تو وہ سرے سے جبرائیل وغیرہ فرشتوں کے وجود کے منکر ہی ہوتے جیسا کہ مادی نقطہ نظر ہے یا اگر وہ تعلیمات مذہبی کی بنا پر ان کو مانتے تو پھر انہیں سمجھنا چاہیے تھا کہ وہ تو نور سے مخلوق ہوتے ہیں' ان میں ہوا وٗہوس کہاں۔ وہ تو حکم الٰہی کے طبعاً پابند ہوتے ہیں۔ قرآن نے ان کو ان کے خیال کی اس حماقت پر متنبہ کیا ہے۔

الفاظ آیت پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلام جس طرح شروع ہوا تھا اس طرح ختم نہیں ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بات شروع کی گئی ان الفاظ سے کہ کہہ دیجئے کہ جو شخص جبرائیل کا دشمن ہے اس کا تقاضا یہ تھا کہ اب مخاطب آخر تک مشرکین ہوتے اور متکلم رسول اللہؐ رہتے مگر اتنا کہہ کے جیسے متکلم نے اس جملہ کو نا تمام چھوڑ دیا اور وہ اس کی نا معقولیت پر الگ سے رسول کو مخاطب کر کے تبصرہ کرنے لگا۔ اس کا تتمہ پھر نئے سرے سے کلام شروع کر کے اس کے بعد والی آیت میں لایا گیا ہے۔

ایسے مواقع پر مفسرین ترکیب نحوی بنانے میں دقتیں محسوس کیا کرتے ہیں لیکن یہ انداز ادباء کے کلام میں فصاحت و بلاغت کی جان ہوتے ہیں اور وہ ہر زبان میں متعارف ہیں۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾

"جو دشمن ہو اللہ کا یا اس کے فرشتوں کا یا اس کے پیغمبروں کا یا جبرائیل یا میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے ایسے کافروں کا۔"

جبرائیلؑ سے دشمنی اور اس کا جواب:

جو بات اس کے قبل کی آیت میں "قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ" کہہ کر شروع کی گئی تھی اسے اب زیادہ وسعت اور عمومیت دے کر ختم کیا گیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اولیائے الٰہی سے دشمنی خواہ وہ فرشتوں میں ہوں اور خواہ انسانوں میں ان سے دشمنی نہیں ہے وہ حقیقتاً اللہ سے دشمنی ہے اور ایسا شخص ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ خود اپنا ہی بگاڑتا ہے اس لئے کہ ان سے دشمنی کے نتیجہ میں اللہ خود اس کا دشمن بن جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ خالق سے دشمنی مول لے کر کون مخلوق پر کوئی فلاح حاصل کر سکتا ہے [1]۔

جبرائیلؑ و میکائیلؑ فرشتوں کے لفظ میں آ گئے تھے مگر انہیں علیحدہ کر کے اظہار عزت و خصوصیت کے لئے بیان کیا [2]۔

---

[1] ۔ الذی سمّاھم اللہ فی ھذہ الآیۃ ھم اولیاء اللہ واھل طاعتہ ومن عادی اللہ فقد عادی اللہ وبارزہ بالمحاربۃ (طبری)

[2] ۔ انما اعاد ذکرھما لفضلھما ومنزلتھما کقولہ فیھما فاکھۃ ونخل ورمان (مجمع البیان)

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿٩٩﴾

''اور حقیقت امر یہ ہے کہ ہم نے آپ پر بہت صاف اور واضح آیتیں اتاری ہیں اور ان کا انکار بداعمال لوگوں کے سوا کوئی کر ہی نہیں سکتا۔''

آیات سے مراد قرآن کی آیتیں بھی ہیں اور حقانیت کی دوسری نشانیاں بھی۔

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٠﴾

''اور کیا یہ جب بھی کوئی عہد کریں گے تو ایک جماعت ان میں سے اسے پس پشت ضرور ڈال دے گی' بلکہ زیادہ ایسے ہی ہوں گے جو ایمان نہ لائیں؟''

یہ استفہام اقراری ہے یعنی واقعی ان کا مستقل کردار یہی بن گیا ہے۔

وَلَمَّا جَاۗءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ڎ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِھِمْ كَاَنَّھُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾

''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ پیغمبر آیا جو ان کے پاس والی کتاب کی تصدیق کرنے والا ہے تو ان اہلِ کتاب میں سے ایک جماعت نے اللہ کو اپنے پس پشت ڈال دیا جیسے کہ وہ اسے جانتے ہی نہ تھے۔''

یہاں ''اللہ کی کتاب'' سے مراد خود ان کے یہاں کی کتاب توریت ہے یعنی حضرت محمد مصطفی ﷺ کا انکار کرکے انہوں نے درحقیقت خود اپنی کتاب توریت سے روگردانی کرلی کیونکہ اس میں تو صاف صاف ان کے آنے کی بشارت تھی اور اسے وہ جانتے بھی تھے۔مگر اب وہ انکار ایسا کررہے ہیں جیسے کہ وہ بالکل اس سے ناواقف تھے[1]۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰي مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۤ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَي الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا ھُمْ

---

[1]۔ کانہم لا یعلمون ای ان القوم کانوا یعلمون ولکنہم افسدو علمہم وجحدوا و کفروا و کتموا (طبری)

بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ
وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۛ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ
اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

”اور ان لوگوں نے پیروی کی اس کی جو شیاطین حضرت سلیمان کی سلطنت میں پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور سلیمانؑ نے کفر اختیار نہیں کیا تھا بلکہ ان ہی شیطانوں نے کفر پھیلایا تھا کہ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور (پیروی کی) اس کو جو بابل میں ہاروت اور ماروت دو فرشتوں پر اتارا گیا تھا اور وہ دونوں کسی کو اس وقت کچھ نہیں بتاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیں کہ ہم بس ایک ذریعہ آزمائش ہیں تو تم کہیں کافر نہ ہو جانا مگر وہ لوگ ان سے وہ سیکھتے تھے جس سے کہ مرد اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال دیں حالانکہ وہ اس سے کسی کو بغیر مشیت الٰہی کے نقصان ہی پہنچا سکتے تھے اور وہ ایسی باتیں سیکھتے تھے جو ان کے لئے مضر ہیں اور مفید نہیں ہیں اور وہ خوب جانتے ہیں کہ جو ان چیزوں کو اختیار کرے گا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا اور کس بری قیمت پر انہوں نے اپنے نفسوں کا سودا کیا۔ کاش وہ اس سے باخبر ہوں۔“

جادو کی ابتداء اور اس کی ترقی :-

اس آیت میں یہود کی ایک اور بے راہ روی کا ذکر ہے اور وہ یہ کہ بجائے آسمانی کتاب اور حقائق مذہب کی واقفیت حاصل کرنے کے وہ جادو ٹونے میں پڑ گئے ہیں اور اسے اپنا کمال سمجھنے لگے۔

عبدالماجد صاحب دریابادی لکھتے ہیں کہ ”فنون سحر کہانت میں یہود کی مہارت تاریخ میں مسلم چلی آ رہی ہے ان کے اکابر و مشاہیر اس کا برابر اعتراف کرتے آ رہے ہیں بلکہ اکثر فخر کے ساتھ یہود کا یہ شوق ان کی قدیم تاریخ سے قطع نظر رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی قائم تھا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کا یہودی النسل و یہود خصلت پروفیسر مارگریس آنجہانی، جس کی اسلام دشمنی ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی ہے اپنی انگریزی سیرت رسول میں معاصر یہود عرب کے سلسلہ میں لکھتا ہے یہ لوگ فن سحر کے ماہر تھے اور بجائے میدان جنگ میں آنے کے سفلی عملیات کو ترجیح دیتے تھے“ (صفحہ ۱۸۹) نیز بنی اسرائیل کی ساحری و کہانت کا ذکر خود عہد عتیق کے صحیفوں میں بھی موجود ہے۔

”انہوں نے اپنے بیٹے، بیٹی کو آگ کے درمیان گزارا اور رفال گیری اور جادوگری کی۔ ان باعثوں سے خداوند بنی اسرائیل پر پٹ غصہ ہوا اور اپنی نظر سے انہیں گرا کر دور کر دیا (۲ سلاطین ۱۷:۱۷ و ۱۸)

اس فن سحر کی ابتدا کیا تھی اور مذہبی جماعت کی اس کے ساتھ گرویدگی کہاں تک اس کے شایان شان تھی اس پر قرآن مجید نے روشنی ڈالی ہے اور اس ذیل میں بعض ان غلطیوں کی اصلاح کی ہے جو عوام کے ذہن میں وراسخ ہوگئی تھیں۔

سحر کی اشاعت کی ابتداء دو ذریعوں سے بتائی گئی جن میں ایک از اصل غلط تھا اور ایک بنیادی طور پر صحیح تھا مگر عمل اس پر غلط طریقہ سے

کیا گیا۔

جناب سلیمانؑ کی طرف سے صفائی:

پہلا ذریعہ شیاطین جس کے تفصیل جیسا کہ حدیث سے ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ چوں کہ جناب سلیمانؑ پیغمبر کو خالق کی جانب سے اصناف مخلوقات پر غیر معمولی اقتدار عطا فرمایا گیا تھا شیاطین نے ان کے بعد گمراہی خلائق کا یہ سامان کیا کہ کچھ جادو کے قواعد اصول لکھ کر ان پر سرخی یہ قائم کر دی کہ یہ وہ علمی ذخیرہ ہے جو آصف بن برخیا نے سلیمانؑ بن داوٗدؑ کے لئے فراہم کیا تھا۔ اس کتاب کو انہوں نے تخت سلیمانؑ کے نیچے دفن کر دیا۔ وفات سلیمانؑ کے بعد لوگوں کو وہ کتاب ملی اور یہ بہت سے لوگوں کے لئے سبب کفر بن گیا۔ وہ کہنے لگے کہ بس معلوم ہو گیا کہ سلیمانؑ جو غیر معمولی قدرت وسلطنت کے مالک تھے وہ من جانب اللہ نہ تھی بلکہ اسی سحر کا نتیجہ تھی [1] ۔

اس نوشتہ کی ذمہ داری جناب سلیمانؑ کی طرف عائد کی جا رہی تھی۔ اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے مذکورہ آیت میں یہ دفع دخل ضروری سمجھا گیا کہ سلیمانؑ نے یہ کفر نہیں کیا تھا شیاطین نے اس کفر کا ارتکاب کیا تھا۔

بظاہر یہاں لفظ **کفر** کا سحر کے استعمال اور اس کے اعتقادی پر اطلاق ہوا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: **الساحر کالکافر والکافر فی النار**۔

سلیمانؑ کے لئے اس صفائی کے پیش کرنے کی ضرورت اس لئے بھی ہوئی کہ یہود و نصاریٰ میں رائج شدہ بائبل میں نے ان کی طرف بلا تکلف کفر اور شرک کی نسبت دے دی ہے مثلاً: ”جب سلیمانؑ بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں [2] نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا (سلاطین ۱۱: ۴، ۹، ۱۰) ”خداوند سلیمانؑ پر غضب ناک ہوا اور اس نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے اس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا“ (سلاطین ۱۱: ۹، ۱۰)

قرآنِ کریم جو کہ انبیاء مرسلین کی شانِ مقدس کو غلط الزامات سے بری کرنے اور ان کی اصل عظمت کو قائم کرنے کا کفیل ہے اس نے اہل کتاب کے عائد کردہ الزامات سے مثل دیگر انبیاء کے سلیمانؑ کو بھی بری کیا اور کہا کہ کفر کے مرتکب دوسرے تھے سلیمانؑ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہ تھی۔

جیسا کہ عبدالماجد صاحب نے لکھا ہے ”اب قدرت حق کا اعجاز دیکھیے کہ جو محققانہ و فاضلانہ کتب جوامع و حادیات بائبل ہی کے پرستاروں کے قلم سے نکل رہی اور شائع ہو رہی ہیں وہ تائید و تصدیق بائبل کی الزام دہی کی نہیں، قرآن کے جواب صفائی کر رہی ہیں! انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، برطانوی کاوش و تحقیق کا لب لباب ہوتا ہے۔ اس کے سب سے آخری ایڈیشن میں مقالہ زیر عنوان سلیمانؑ نکال کر دیکھئے صاف مضمون ملے

---

[1]۔ القمی والعیاشی عن الباقرؑ قال لما مات سلیمان وضع ابلیس السحر ثم کتبه فی کتاب فطواه و کتب علی ظهره هٰذا ماوضع اٰصف بن برخیا لملك سلیمان بن داؤد من ذخائر کنوز العلم من اراد کذا و کذا فلیفعل کذا و کذا ثم دفنه تحت السریر ثم استبان لهم فقرأوه فقال الکافرون ما کان یغلبنا سلیمان الا بهذا (صافی)

[2]۔ بائبل کے اردو نسخوں کی زبان یہی ہے۔

گا ''سلیمانؑ خدائے واحد کے مخلص پرستار تھے'' (جلد ۲ ص ۶۵۲ طبع چہاردہم) انسائیکلوپیڈیا ببلیکا، خاص مسیحی فضلا اور پرستاران بائبل کی تحقیق وتدقیق کا ثمرہ ہے۔اس میں یہاں تک ہے کہ بائبل کو جو آیتیں ابھی اوپر نقل ہو چکی ہیں ان کا حوالہ دے کر یہ لکھ دیا ہے کہ یہ عبادتیں بعد کو بڑھائی گئی ہیں اور الحاقی ہیں اور پھر لکھا ہے ''یہ تو غالباً صحیح ہے کہ سلیمانؑ کی بیویاں متعدد تھیں۔ اسرائیلی بھی اور غیر اسرائیلی بھی لیکن انہوں نے نہ تو سب کے لئے قربان گاہیں تیار کرائیں اور نہ ہی تو خدائے واحد کے پرستش کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش کا تجربہ ہونے دیا (کالم ۴۶۸۹)

دوسرا ذریعہ سحر کی اشاعت کا بتایا گیا ہے دو فرشتے جن کا نام ہاروت اور ماروت تھا اس اشاعت کا مرکز بائبل تھا جسے جغرافیہ میں اب عراق کہا جاتا ہے۔ یہ اپنی ساحری کے لحاظ سے زمانہ قدیم میں مشہور رہا ہے۔

عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں: ''اسی ملک کا ایک دوسرا قدیم نام کالڈیا (کلدانیہ) ہے اور انگریزی میں آج تک لفظ **کالڈین** (**کالدانی**) ساحر کا مرادف چلا آرہا ہے۔ یہود ونصاریٰ کے صحیفوں میں اس ملک کا ذکر کثرت سے آیا ہے ذکر اس ملک کی عظمت کا بھی اور اس کی بدعملیوں وتباہ کاریوں کا بھی۔لیکن اس فہرست جرائم کا عنوان اول سحر کاری تھا۔ بائبل کی شہادت ملاحظہ ہو: ''تیرے سوداگر زمین کے امیر تھے تیری جادوگری سے زمین کی ساری قومیں گمراہ ہوئیں۔اور نبیوں اور مقدسوں اور زمین کے اور سب مقتولوں کا خون اس میں بہایا گیا (مکاشفہ ۱۸: ۲۳و۲۴)

پرانے کتبے اور نوشتے آج جو کچھ دریافت ہوئے ہیں ان کی متفقہ شہادت ہے کہ دینِ بابلی کا جزو عظم سحر وکہانت، جنتر منتر، ٹونے ٹوٹکے تھے۔' بابلی مذہب کا جزو عظم سحر وکہانت کے انواع واقسام ہیں۔ بابلی مذہب کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے تو ہر طرف کہانت کے منتر ہی منتر نظر آئیں گے (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۲ ص ۱۱۶)

ایک اور فاضل کی تحقیق ہے ''مذہب بابل ونینوا کا جزو اعظم بھوت پریت کا اتارنا جھاڑنا تھا (راجرس کی ریلیجن آف بابلونیا اینڈ ایریا ص ۱۴۵)

یہ سحر پیشہ وکہانت دوست قوم جب ۵۳۸ ق میں تاجدارِ ایران کے ہاتھوں برباد ومنتشر ہوئی تو جہاں جہاں گئی اپنے ساتھ اپنے فنونِ سحر وکہانت کو بھی لیتی گئی تاریخ کا بیان ہے ''یہ لوگ جہاں جہاں گئے اپنے ان علوم کو اپنے ساتھ لیتے گے۔ان کی تعلیم دیتے رہے اور ضعیف العقیدہ خلقت انہیں ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیتی رہی (ریگوزین کی کالڈیا ص ۲۵۵)

یہود ان استادوں کے شاگرد رشید ثابت ہوئے''۔ بابل کے میل جول نے اسرائیلیوں کے عقائد متعلق ملائکہ وشیاطین کو متاثر کرنا شروع کیا (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۳ ص ۱۷۸، طبع یازدہم) خود یہود کے اکابر کا اعتراف ہے کہ ''بابل کا مذہبی احترام ہر خطہ کے یہود میں قائم رہا''۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۶ ص ۴۱۲، ''دریابادی)۔

قرآنِ کریم نے زیرِنظر آیت میں اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ یہود میں دونوں جگہ کا سحر رائج ہے فلسطین کا بھی اور بابل کا بھی اس ذیل میں جس فلسطینی سحر کے ذکر میں اپنے ایک معصوم پیغمبر سلیمانؑ کی پاک دامنی کا اظہار کیا اسی طرح بابلی سحر کے تذکرہ میں اپنے دو فرشتوں ہاروت ماروت کی شانِ عصمت کا تحفظ کیا چوں کہ ان کے متعلق ''اسرائیلیات'' میں ایک حکایت مشہور تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ان دونوں فرشتوں کو انسانی

جذبات دے کر بھیجا گیا تھا اورعراق کی ایک فاحشہ زہرہ سے ان کا تعلق ہو گیا اوراب وہ اسی فاحشہ کے ساتھ ساتھ عذاب الٰہی میں گرفتار ہیں۔

قرآن نے ان فرشتوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی عصمت اور انکے دامن کے بے داغ ہونیکا اثبات کر کے گویا ذہن انسانی کو ان کی نسبت عائد کردہ اورالزامات سے بھی بری سمجھنے کی طرف مائل کردیا ہے۔اسی لئے مفسرین نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اس حکایت کے بے سروپا ہونے کا بھی اظہار کیا ہے[1]۔

ایک روایت اس بارے میں بعض کتب شیعہ میں بھی درج ہوگئی ہے مگر وہ ضعیف السند ہے[2]۔

دوسری روایت جو الفاظِ قرآن سے بالکل مطابقت رکھتی ہے یہ ہے کہ ان دونوں فرشتوں کو اصل میں ساحروں کا زور توڑنے کے لئے بھیجا گیا تھا[3]۔

یہ فرشتے انسانوں کی صورت میں خالق کی طرف سے بھیجے گئے تاکہ ساحروں کے سحر کا مقابلہ کرنے کے لئے انہیں مسلح کرائیں اور اسی لئے جس کو وہ ان تدابیر کی تعلیم دیتے تھے انہیں متنبہ کردیتے تھے کہ دیکھو ہمارے ذریعہ سے تم ایک معرضِ امتحان میں ہو، وہ امتحان یہ ہے کہ اس کو بس دفعیہ سحر میں صرف کرنا، خود ساحر نہ بن جانا[4]۔مگر لوگوں نے ان کی اس تنبیہہ سے صحیح اثر نہ لیا اور کیا یہی کہ وہ خود سحر کرنے لگے اور زیادہ تر اس کا استعمال میاں بیوی کے افتراق کے باب میں کیا جاتا تھا۔

بقول عبدالماجد صاحب "اب دیکھئے کہ بیسویں صدی کے علمائے یہود اور محققینِ اسرائیلی اپنے اسلاف کے مشغلہ سحر وساحر کی نوعیت سے متعلق کیا شہادت دیتے ہیں 'سحر کی سب سے زیادہ عام متداول صورت میں اس نقش کی تھی جو عشق ومحبت کے لئے دیا جاتا تھا، خاص طور پر وہ نقش جو ناجائز آشنائیوں کے لئے لکھا جاتا تھا اس قسم کے سحر کی ماہر عورتیں ہی زیادہ تر ہوتی تھیں۔ چنانچہ ذکر بھی سحر اور حرام کاری کا عموماً ساتھ ہی ساتھ آیا ہے (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۸ ص ۲۵۵)

یہ فقرہ کہ وہ جس کو نقصان پہنچاتے تھے وہ مشیت الٰہی سے اس کا یہ مطلب نہیں کہ خالق ان کے عمل سے راضی تھا۔نہیں عمل تو وہ اس کے حکم کے خلاف تھا مگر اثر اس پر قانونِ تکوینی کے مطابق اسی طرح مرتب ہوتا تھا جیسے زہر پر اس کا اثر۔ یہ آثار ایک عام نظامِ قدرت کے تحت میں واقع ہوتے ہیں جن کی مخالفت اسی وقت ہوتی ہے کہ جب اظہارِ معجزہ وغیرہ کی ضرورت ہو۔اس میں فعل کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے جو ان اسباب کو مہیا کرے اور اسی لئے وہ مستحق ملامت وعقوبت بھی ہوتا ہے بے شک خالق اس کی مزاحمت بہ نظرِ حکمت نہیں کرتا جو اگروہ کردیتا ہے تو یہ فعل

---

[1]۔ھٰذہ القصة عند المحققین غیر مقبولة (نیشا پوری) ان القصة التی ذکروھا باطلة (رازی) مدارہ روایة الیھود مع مادفیه من المخالفة لادلة العقل والنقل (ابوالسعود)

[2]۔راویه عن الباقر علیه السلام محمد بن قیس وھو مشترك بین الضعیف وغیرہ (بلاغی)

[3]۔ قال الصادق علیه السلام وکان بعد نوح قد کثر السحرة والممو ھن فبعث الله تعالیٰ ملکین الیٰ نبیّ ذٰلك الزمان بذکر مایسحر به السحرة وذکر مایبطل به سحرھم ویرد به کیدھم فتلقاہ النبی عن الملکین واداہ الیٰ عباد الله بامر الله عزوجلّ (صافی) روی ابن بابویه فی العیون عن الرضا علیه السلام ان ھاروت وماروت علما الناس السحر لیحتزوا به عن سحر السحرة ویبطلوا کیدھم (بلاغی)

[4]۔ امرھم ان یقفوا به علیٰ السحر وان یبطلوہ ونھم ان یسحروا به الناس (صافی)

غیرممکن الوقوع ہوجاتا۔اس اعتبار سے اسے نتیجۂ مشیت کہا جاتا ہے اور یہی معنی باذن اللہ کے اس آیت میں ہیں۔

''یہ خوب جانتے ہیں''۔یہ یہود کا تذکرہ ہے جنہیں کہا گیا تھا کہ انہوں نے سلیمان کے زمانہ والے سحرِ فلسطین اور ہاروت وماروت کے بتائے ہوئے سحرِ بابل کا اتباع کیا۔انہیں خوب معلوم ہے کہ یہ ان کی آخرت کی بربادی کا سبب ہے کیوں کہ توریت میں بھی اس کی ممانعت صاف الفاظ میں موجود ہے''تو جادوگری کو جینے مت دے(خروج ۲۲: ۱۸)''اور جادو نہ کرو،اور ساعتوں کا لحاظ مت کرو۔''(احبار ۱۹: ۲۶)اور نہ مال و ساحر ہو کیوں کہ وہ سب جو ایسے کام کرتے ہیں خداوند کی نفرت کے باعث ہیں''(استثناء ۱۸: ۱۲)

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝١٠٣

''اور اگر وہ ایمان لاتے اور اپنے بچاؤ کا سامان کرتے تو اللہ کی طرف سے ذرا سا بھی ثواب جو انہیں ملتا وہ کہیں بہتر تھا کاش وہ اسے جانتے۔''

مادیت اور مذہب کے نقطہ نظر میں یہی فرق ہے۔مادی انسان دنیا کے منافع کو بہت کچھ سمجھتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہاں کا بڑے سے بڑا نفع جو حاصل ہو وہ فانی ہے اور آخرت کا ذرا سا بھی ثواب دنیا کی ہر شے سے بہتر ہے اس لئے کہ وہ باقی ہے۔مثوبة میں تنوین (ٌ) سے کچھ اور ذرا کے معنی پیدا ہوئے ہیں[1]۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝١٠٤

''اے ایمان والو'راعنا'' نہ کہا کرو''انظرنا'' کہا کرو اور بات کو سنا کرو اور کافروں کے لئے تو دردناک عذاب ہے۔''

رَاعِنَا اور اُنْظُرْنَا کا فرق:

جب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن سناتے ہوتے یا کوئی تبلیغ فرماتے ہوتے تو بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کوئی لفظ مجمع میں سے بعض افراد نہ سن سکیں اس موقع پر وہ شخص حضرتؐ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتے ہوئے پکار کر کہتا تھا راعنا یعنی ہمارا لحاظ کیجئے۔اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ براہِ کرم اس جملہ کو دوبارہ ارشاد فرمادیجئے۔عربی زبان کے لحاظ سے اس میں کوئی خرابی نہیں تھی مگر مجمع میں کچھ یہودی بھی منافقین کی صف میں داخل ہوکر موجود ہوتے تھے۔وہ اس لفظ کو شرارۃً حضرتؐ کی شان میں ایک دشنام کے طور پر استعمال کرتے تھے مسلمان عموماً اس شرارت کو نہیں سمجھتے تھے اور اپنی جگہ خوش و مطمئن تھے کہ ہماری شرارت کا کسی کو علم نہیں ہوسکتا مگر خالق کریم نے ان کی اس شرارت کے سدباب کے لئے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ تم لفظ بدل دو راعنا نہ کہا کرو بلکہ انظرنا کہا کرو۔

تفسیریں دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ اس حکم کے بعد بھی مفسرین اس راز کو نہیں سمجھ سکے ہیں کہ راعنا میں کونسی خرابی تھی جو سختی کے ساتھ اس

[1] ۔تنكير المثوبة للتقليل اى بشئى مامن المثوبة كائنة من عنده تعالىٰ خير (ابوالسعود)

ممانعت کی گئی مگر اہل بیت رسولؐ نے اس راز کا انکشاف کیا کہ یہ لفظ عبرانی زبان میں دشنام کے معنی پیدا کرتا ہے [1]۔

اللہ جزائے خیر دے علامہ شیخ محمد جواد بلاغی نجفی طاب ثراہ کو جنہوں نے عبرانی زبان سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد عبرانی زبان کی بائیل میں اس راعنا کے لفظ کے محل استعمال ڈھونڈھے اور حضرت امام محمد باقرؑ کے ارشاد کی حقانیت معلوم کی کہ راع کی لفظ ''شر'' اور ''قبیح'' کے معنی میں مستعمل ہے جیسا کہ توریت سفر فصل ۲ و ۳ میں آیا ہے اور کبھی شریر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ سفر ۵ فصل اول اور مزامیر فصل ۶۴ و ۶۵ میں ہے [2]۔

جب مسلمانوں نے حکم الٰہی سے لفظ بدل دی اور انظرنا کہنے لگے تو یہود کی اس شرارت کا سدباب ہو گیا۔

آخر کے فقرہ میں بتایا گیا ہے کہ راعنا کہہ کر دشنام طرازی کرتے ہیں وہ حقیقتاً کافر ہیں جن کو ان کے فعل کی سزا تو ملے ہی گی لیکن تم نادانستہ ان کے شریک کار یا معاون کیوں بنو اور انہیں تمہارے طرز گفتگو سے اس کا موقع کیوں ملے وہ رسولؐ کی شان میں گستاخی کر سکیں۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ وَلَا الۡمُشۡرِكِيۡنَ اَنۡ يُّنَزَّلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ يَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ‌ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ۝۱۰۵

''جو کافر ہیں اہل کتاب میں ہوں یا مشرکین میں وہ نہیں پسند کرتے کہ تمہارے لئے تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی کی صورت ہو، حالانکہ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے مخصوص کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل و کرم والا ہے۔''

منکرین رسالت کی ذہنیت اور ان کا جواب:

کافر یعنی رسالت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منکر دو قسم کے تھے ایک اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ اور دوسرے مشرک یعنی بت پرستی ان دونوں کو اصولاً نبوت و رسالت سے کوئی اختلاف نہ تھا مگر وہ کہتے تھے کہ آخر یہ رسالت ان کے لئے کیوں تسلیم کی جائے۔

اہل کتاب تو اس بناء پر اسے ناپسند کرتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی بیاہتا بیوی یعنی جناب سارہؑ کی نسل آل اسحقؑ سے تھے اور پیغمبر اسلامؐ دوسری بیوی جناب ہاجرہؑ کی نسل آل اسماعیلؑ سے۔ وہ کہتے تھے کہ نبوت اولاد اسحاقؑ کو چھوڑ کر اولاد اسماعیلؑ میں کیوں کر جا سکتی ہے اور مشرکین اس بناء پر اسے ناپسند کرتے تھے کہ ان میں بڑے بڑے صاحبان دولت و وجاہت موجود تھے وہ کہتے تھے کہ ان کو چھوڑ کر یہ رسالت ''یتیم عبداللہ'' کو کیوں کر مل گئی چنانچہ ایک جگہ ان کی زبانی قرآن میں آیا ہے: لَوۡلَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡيَتَيۡنِ عَظِيۡمٍ (زخرف۔۳۱) یعنی یہ قرآن مکہ اور مدینہ کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اتارا گیا؟

---

[1]۔ قال الباقر علیہ السلام ھذہ الکلمۃ سبّ بالعبرانیۃ الیہ کانوا ایذھبون (طبرسی)

[2]۔ فتکون راعنا فی العبرانیۃ بمعنی شریرنا (بلاغی)

مذکورہ آیت میں ان ہی دونوں گروہوں کے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ان کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت نہ خاندانی امتیاز کو دیکھتی ہے اور نہ دولت اور نہ ظاہری وجاہت کو۔ وہ کمال صفات کو دیکھتی ہے اور جس میں یہ خصوصیت ہوتی ہے اسے خدا رسالت کے لئے منتخب فرمالیتا ہے[1]۔

اسی کو دوسری جگہ قرآن نے ان لفظوں میں کہا ہے کہ: اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهٗ (انعام ۱۲۴) ''اللہ خوب جانتا ہے کہ اسے اپنی رسالت کسے دینا چاہیے کسی دوسرے کا اس میں کیا جارہ ہے!

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۰۶﴾

''جس آیت کو ہم منسوخ کردیتے ہیں یا وہ بھلادی جاتی ہے تو ہم اس سے بہتر یا اس کے مثل دوسری نازل کردیتے ہیں کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر بات پر قادر ہے۔''

نسخ اور بدا:

یہود و نصاریٰ کے رسالت خاتم النبیینؐ پر جو ایرادات تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ خالق خود اپنی سابق کتاب اور شریعت کو منسوخ کردے؟ کیا اس کے احکام میں غلطی کا امکان ہے؟ کیا اس کی رائے میں تبدیلی ہوتی ہے اور کیا وہ اپنے کیے پر پشیمان ہوتا ہے؟ ان توہمات کی بناء پر وہ نسخ احکام کو شان الٰہی کے خلاف سمجھتے تھے اور تعجب ہے کہ ان ہی دلائل سے مسلمانوں کا ایک گروہ تقدیرات الٰہیہ میں بدا کا انکار کرتا ہے۔ اس آیت میں انہی کے اس اعتراض کا جواب ہے اور بتایا گیا ہے کہ دوسری شریعت اور کتاب ضرورت دو وجہوں سے پڑا کرتی ہے۔ ایک تو یہ کہ حالات اور مصالح کی تبدیلی کی وجہ سے اب پہلے احکام اتنے مناسب نہیں رہے ہیں جتنے کہ یہ دوسرے احکام۔ اس لئے خالقِ حکیم ظرفِ زمان کی مطابقت سے اب زیادہ مناسبت احکام نافذ کرتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے قانون کو دنیا والوں سے تصرف وتحریف کرکے بالکل نسیاً منسیاً کردیا ہے اس لئے جدید شریعت اور کتاب میں اس کی تجدید کی گئی ہے جو بحیثیت اصلاحِ خلق ویسے ہی مضمون پر مشتمل ہے جو اس نسیان شدہ حکم کا تھا۔

یہ تصرف وتحریف کرکے بھلانا اصل میں تو فعل انسانوں کا ہے مگر چوں کہ کائنات کا ہر واقعہ تحتِ قدرت الٰہی ہے اور شرائط واسباب کی فراہمی اور موانع کے فقدان کی باگیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں، اس لئے ان نتائج کو جو انسانی افعال پر بھی مرتب ہوتے ہیں کبھی خالق کی طرف منسوب کردیا جاتا ہے۔ نسیاً منسیاً کردینے کی نسبت خالق کی طرف جو ننسہا کے تحت اللفظی ترجمہ سے سمجھ میں آسکتی ہے، اسی اعتبار سے ہے[2]۔

باوجود حالات کی تبدیلی کے پہلے حکم کو خالق جب ہی باقی رکھتا جب کہ وہ زیادہ مناسب قانون کے اجراء پر قادر نہ ہوتا اور دنیا کے کسی حکم

---

[1]۔ روی عن امیر المؤمنینؑ وعن ابی جعفر لباقرؑ ان المراد برحمته ھھنا النبوۃ (مجمع البیان)

[2]۔ نسب الانسآء الی اللہ مجازاً کما نسب الاضلال باعتبار تمود المنتسبین الی کتابه (بلاغی)

کو بالکل زینت طاق نسیان بنا دینے کے بعد وہ اس کا کچھ تدارک نہ کر سکتا اور پھر وہ اپنے نبیؐ کو معبوث کر کے ویسے ہی حکم کو دوبارہ نازل کرنے پر قادر نہ ہوتا۔ مگر یہ تو سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ ہر بات پر قادر ہے پھر وہ اپنی حکمت کے مقتضی پر عمل کو کس لئے ترک کرے؟

حکمت کی تبدیلی سے حکم میں تبدیلی نہ نتیجہ جہل ہے نہ پشیمانی بلکہ وہ عین مقتضائے علم وقدرت ہے۔

نسخ کی بحث میں علمائے جمہور نے اس کی خوب خوب تشریح وتوضیح کی ہے۔ یہاں عبدالماجد صاحب دریا بادی کا اقتباس ملاحظہ ہو وہ لکھتے ہیں:

''احکام کی مثال طبیب کے نسخہ کی ہے طبیب کی تشخیص اپنی جگہ پر بدستور رہتی ہے لیکن مریض کی حالت بدلتی رہتی ہے اور پھر موسم اور آب وہوا میں کسی فرق ہوتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں کوئی حاذق سے حاذق طبیب بھی اپنے نسخہ کے اجزاء میں ان بدلے ہوئے حالات کے مطابق ترمیم کرنے میں تامل نہ کرے گا۔''

آگے لکھتے ہیں:

''یہ بھی خوب واضح رہے کہ یہ نسخ جو کچھ بھی ہوگا علم بشری ناقص ومحدود کے اعتبار سے ہوگا، ورنہ علم الٰہی میں تو ہر حکم ازل سے وقت معیّنہ کے لئے مقرر وثابت ہی ہے۔''

یاد رکھنا چاہیے کہ بدا کی نوعیت بھی بالکل یہی ہے کہ وہاں بھی یہی ہے کہ تقدیرات کی تبدیلی جو کچھ بھی ہے وہ علم بشری کے لحاظ سے ہے ورنہ علم الٰہی میں تقدیر اول پہلے ہی سے مشروط ہوتی ہے۔ پشیمانی کا سوال نہ اس میں ہے اور نہ اس میں بلکہ نسخ وبداء دونوں ہی علم وقدرت دونوں کے ایک ساتھ کارفرما ہونے کا نتیجہ ہیں۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی یار ومددگار نہیں ہے۔''

اگر یہ آیت تنزیل میں گزشتہ آیت سے متصل ہے تو مخاطب وہی ہوں گے جو نسخ کے منکر تھے۔

اور اگر یہ الگ ہے تو پھر مخاطب ہر سننے والا اس کلام کا ہو سکتا ہے خواہ براہ راست اور خواہ بتوسط رسولؐ اسی لئے کلام میں تخاطب شروع ہوا ہے بصیغۂ مفرد (الم تعلم) اور بعد میں جمع کا انداز ہو گیا ہے (وما لکم) اور استفہام کہ کیا تمہیں نہیں معلوم یہ حقیقتاً استفہام نہیں ہے بلکہ مقصود اس سے اثبات واقرار کرانا ہے[1]۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ

[1]۔ ویؤل فی المعنی الی الایجاب کانه یقول قد علمت حقیقة (مجمع البیان)

الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

"یا کیا تم چاہتے ہو اپنے رسول سے ویسا سوال کرو جیسا اس کے پہلے موسیٰؑ سے کیا گیا تھا؟ اور جو ایمان کے عوض کفر اختیار کرے گا وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔"

الفاظِ قرآن سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ یہ خطاب مسلمانوں سے تنبیہہ کے طور پر ہے چوں کہ مسلمانوں کی عام ذہنیت بہت حد تک بنی اسرائیل سے ملتی جلتی تھی جس پر حضرت پیغمبر اسلامؐ نے بھی اپنی حدیث میں تنبیہہ کی تھی کہ لتتّبعنّ سنن بنی اسرائیل (الحدیث) (یعنی) تم بنی اسرائیل کے راستوں پر چلو گے۔" اس لئے خالقِ کریم نے اس انتباہ کی ضرورت محسوس فرمائی۔

اس انتباہ کے بعد بھی مسلمانوں بروزِ قیامت دیدار کا عقیدہ قائم ہونا جو محسوس حقیقت ہے اس انتباہ کی اہمیت کا زبردست ثبوت ہے۔

حالانکہ آخری الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ خالق کے دیدار کی ہوس ایمان کے عوض کفر کی جانب قدم زنی کے مترادف ہے۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾

"بہت سے اہل کتاب کی دلی خواہش یہ ہے کہ کسی طرح ایمان کے بعد پھر دوبارہ تم لوگوں کو کافر بنالیں صرف حسد کی وجہ سے جو ان کے نفوس میں ہے، باوجود یکہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے۔ تو تم انہیں معاف کرتے رہو اور درگزر سے کام لو اس وقت تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

اہل کتاب کی حاسدانہ ذہنیت:

یہود و نصاریٰ کی کوششیں مسلمانوں کو ایمان سے برگشتہ کرنے کی اس وقت بھی تھیں اور اب بھی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ قرآن اُن کوششوں کا نفسیاتی سبب بتاتا ہے کہ وہ نہ اپنے مذہب کی حقانیت کے احساس یا اس کی محبت سے ہیں اور نہ تمہاری ہمدردی میں بلکہ اصل اس کا سبب رشک و حسد ہے۔

جس میں دو ۲ عنصر کارفرما ہیں ایک دماغ سے متعلق اور ایک دل سے۔ اول یہ احساس کہ تم جس مذہب پر ہو حق ہے اور اس کے ذریعہ سے تم دنیا و آخرت میں بے شمار فوائد حاصل کرو گے۔ دوسری طرف تقلید آبائی، ماحول اور عادت کی بناء پر اپنے کیش سے ہٹنے کو اپنے لئے گوارا نہ کرنا اب اس کا نتیجہ عقلاً تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ تمہیں تمہاری حقیقت پروری کی بناء پر قابل عزت سمجھیں اور اپنی محرومی پر ظاہر بہ ظاہر نہ سہی تو دل ہی دل میں حسرت کریں بلکہ خود موانع سے مقابلہ کر کے تمہارے درجہ تک پہنچنے کی کوشش کریں مگر بد باطن کور نفس اور کم ظرف اشخاص کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود تو اپنے نقص کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا مگر تمہاری بلندی سے تکلیف محسوس کرتا ہے اس لئے چاہتا ہے کہ تمہیں کسی طرح کھینچ کر اپنے

راستے پر لے آئے۔

یہی حالت ہر زمانہ میں ان اشخاص کی ہے جو خود کسی کمال سے محروم ہیں یا اپنی بے بضاعتی، کوتاہ عملی یا پست ہمتی سے علمی یا عملی کارناموں سے قاصر ہیں مگر کسی دوسرے کو اس کے کمال کی منزل پر یا ان کارناموں کی راہ میں دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے، اس لئے انہیں بھی کھینچ کر اپنی سطح پر لانے میں کوشاں ہوتے ہیں۔ یہ حسد کی وہی قسم ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔

ان کے اس حاسدانہ رویہ پر مسلمانوں کو تکلیف محسوس ہونا بلکہ غصہ ہونا فطری امر ہے۔ یہ غصہ بہت سے افراد میں اشتعال کی حد تک تھا۔اس لئے قرآن کریم نے آخر میں ان کے ہیجان وغضب کو یہ کہہ کر روکا ہے کہ تم ان سے انتقام لینے کی کوئی فکر نہ کرو اس وقت تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے۔

اس حکم سے مراد امر تکوینی بھی ہوسکتا ہے۔اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تم کچھ فکر نہ کرو یہاں تک کہ تقدیر الٰہی اپنا فیصلہ کرے اور تمہیں وغلبہ عطا کرے اور امر تشریعی بھی ہوسکتا ہے کہ جہاد کا حکم آنے سے قبل تمہیں توقف کرنا چاہیے۔

مفسرین نے زیادہ تر دوسرا قول اختیار کیا ہے[1]۔مگر آیت کا سب سے آخری ٹکڑا 'ان اللہ علی کل شیء قدیر' پہلے معنی کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

"اور نماز ادا کرتے اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو کچھ تم اپنے لئے نیک کاموں کا ذخیرہ آگے بھیج دو گے اسے اللہ کے یہاں موجود پاؤ گے۔ یقیناً اللہ تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۔"

اگر یہ آیت تنزیل میں گزشتہ آیات سے متصل ہے تو مطلب یہ ہے کہ ان سے انتقام کے لئے تم اگر اس لئے بے چین ہو کہ جہاد کا ثواب حاصل کرو تو یاد رکھو کہ اللہ کے یہاں کا اجر وثواب کچھ جہاد پر موقوف نہیں ہے بلکہ بغیر اس کے زمانہ سکوت یا صلح میں اگر تم عام فرائض جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی حیثیت سے تم پر عائد ہیں ادا کرو تو وہی تمہاری آخرت کو کامیاب بنانے کے لئے کافی ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾

"اور وہ کہتے ہیں کہ ہرگز جنت میں داخل ہوگا مگر وہی جو یہودی یا عیسائی ہو یہ اُن ہی کی خود آرزوئیں ہیں۔ کہو کہ تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔"

---

[1]۔ الاکثرون علی انہ الامر بالقتل (نیشاپوری)

یہود ونصاریٰ کے مزعومات اور ان کا جواب:

یہودی کہتے تھے کہ نجات صرف یہودیت سے وابستہ ہے۔نصاریٰ کا قول تھا کہ نجات صرف عیسائیت میں منحصر ہے۔قرآن نے چوں کہ دونوں جماعتوں کے لئے ایک مشترک لقب ''اہل کتاب'' کا صرف کر کے ان کا تذکرہ کیا ہے لہٰذا ان دونوں کے مقولوں کو سمو کر مشترک طور سے ان کا نقل قول کیا کہ جنت میں وہ داخل ہوگا جو یہودی یا عیسائی ہو یہ دونوں قولوں کے اجتماع کا نتیجہ ہے۔اس سے کسی ایک کا قول مراد نہیں ہے[1] ۔

وہ ظاہر تو کرتے تھے اپنے اس ادعاء کو بطور خبر اور وہ بھی حتم و جزم کے ساتھ کہ سوا ہمارے کوئی بہشت میں جا ہی نہیں سکتا، مگر قرآن نے اس کے جواب میں ظاہر کیا ہے کہ واقعہ ان کو اس کے کہنے کا تو کوئی حق ہے نہیں۔ہاں ان کی دلی تمنائیں یہی ہیں کہ سوا ان کے کوئی دوسرا نہ جائے لیکن ان آرزوؤں کے پورے ہونے کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔اسی لئے امانی کا لفظ صرف کیا گیا جس کے معنی حسرتوں اور تمناؤں کے ہیں۔اور اگر ایسے توقعات ہوں جن کے پورے ہونے کا قرینہ پایا جاتا ہے تو ان کے لئے امانی کا نہیں امال کا لفظ صرف کیا جائے گا یعنی امیدیں۔حالانکہ امید کیلئے بھی امکان ہے پورے نہ ہونے کا مگر قرینہ اس کے وقوع کا کچھ نہ کچھ سامنے ہوتا ہے۔آرزو میں ایسا بالکل نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اپنے ذاتی جذبات کی ایک پیداوار ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔اب اگر وہ صرف اسے بطور ''آرزو'' ہی کے ظاہر بھی کرتے تو ان سے کسی مطالبہ کا محل نہ ہوتا مگر چوں کہ پیش کر رہے ہیں وہ اسے بطور بیان واقعہ لہٰذا ان کی طرف یہ مطالبہ متوجہ ہوگا یہ کہ اگر سچے ہو تو اس کی دلیل پیش کرو کہ آخر تم میں کیا خصوصیت ہے کہ نجات تمہارے لئے ہو اور کسی کے لئے نہ ہو۔یاد رکھنا چاہیے کہ اصول ایک ہوتا ہے۔اگر کوئی اور جماعت بھی اس کی مدعی ہو کہ نجات صرف اس کے واسطے ہے تو اسے بھی اپنے اوصاف ہی کے لحاظ سے سند پیش کرنا ہوگی کہ اسے تنہا نجات کا استحقاق کس بنیاد پر ہے؟

بَلٰی ۚ مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾

''کیوں نہیں جو اپنے کو اللہ کے سامنے جھکا دے اور وہ حسن عمل بھی رکھتا ہو تو ضرور اس کے پروردگار کے پاس اس کا اجر ہے اور نہ انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ کبھی افسوس ہوگا۔''

اس میں اُن کے قول کی رد کرتے ہوئے نجات کا اصول بیان کر دیا گیا ہے۔

بَلٰی کے لفظ کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ نفی کے بعد ثبوت کا فائدہ دیتی ہے چوں کہ ان کے کلام میں نفی تھی کہ سوا یہود ونصاریٰ کے کوئی بہشت میں داخل نہیں ہوسکتا۔اسی لئے اس کا جواب بَلٰی کے لفظ سے شروع ہوا یعنی سوا ان کے کیوں نہیں کوئی داخل ہوسکتا، اصل معیار نجات کا یہ ہے کہ بارگاہ الٰہی میں عبودیت کے ساتھ سر خم کرے اور حسن عمل سے کام لے۔یہ معیار جس پر منطبق ہو وہ نجات کا حق دار ہے۔

اس معیار کے بیان میں لفظ اَسۡلَمَ لا کر اُمت مسلمہ کے اصطلاحی نام کی طرف ذہن منتقل کیا ہے کہ یہ جماعت ضرور نجات کی حق دار

---

[1] ۔عنیٰ بہ وقالت الیہود لن یدخل الجنۃ الا من کان ہوداً او نصریٰ لن یدخل الجنۃ الا النصریٰ (طبری)
ادرج الخبر عنہما للا یجاز من غیر اخلال بشیءٍ من المعنیٰ فان شہرۃ الحال تغنی عن البیان (مجمع البیان)

ہے مگر اَسْلَمَ کے ساتھ اس کے متعلقات ذکر کر کے اس حقیقت کا اظہار کر دیا کہ یہ استحقاق نجات اسمی اور رسمی طور پر کسی جماعت میں محسوب ہو جانے سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان اوصاف کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو انسان کو اصلی معنی میں مسلم کے لفظ کا مصداق قرار دے سکیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

”اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کا مذہب کچھ نہیں' اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں کا مذہب کچھ نہیں' حالانکہ یہ سب ایک کتاب کے پڑھنے والے ہیں۔ یوں ہی وہ جو علم رکھتے ہی نہیں کہنے لگے ان ہی کی سی بات اب اللہ اُن کے درمیان قیامت کے دن اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں یہ اختلاف کرتے رہے ہوں گے۔“

مسلمانوں کے مقابلہ میں یہود و نصاریٰ سب ”اہل کتاب“ کے عنوان کے ماتحت ایک ہو گئے اور ان سب نے متفقہ فیصلہ یہ کر دیا کہ ہمارے سوا کوئی یعنی مسلمان تو بہشت میں جا ہی نہیں سکتے جس کا جواب اس کے قبل کے آیات میں قرآن نے دیا ہے۔ اس آیت میں ان کے باہمی اختلاف کا تذکرہ ہے کہ معیار نجات کے باب میں یہ لوگ خود کب متفق ہیں یہودی عیسائیوں کے مذہب کو بے بنیاد کہتے ہیں اور عیسائی یہودیوں کے مذہب کو، حالانکہ جب یہ سب ایک کتاب توریت کے ماننے والے ہیں تو کاش یہ سب تو ایک ہی ملت کے پیرو ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی دیکھا دیکھی مشرکین کو بھی حالانکہ وہ تو کسی کتاب آسمان اور علم الٰہی کے کسی عنوان سے بھی حامل نہیں، جسارت پیدا ہوگئی اور وہ ان دونوں ہی کے مذہب کو بے بنیاد کہنے لگے۔

کاش قرآن کی اس تنبیہ سے مسلمانوں نے سبق حاصل کیا ہوتا اور وہ مختلف فرقوں میں تقسیم نہ ہوئے ہوتے جن میں ہر فرقہ دوسرے کو لیست علی شیءٍ ہی سمجھتا ہے اور کہتا ہے حالانکہ قرآن نے یہ بھی آخر میں بتا ہی دیا ہے کہ یہ فرقوں کے اختلاف کا جھگڑا کبھی دنیا میں طے ہونے والا نہیں ہے تو آخرت میں بس پیش خدا ہی طے پا سکے گا۔ پھر اختلاف فرق کی بناء پر دنیا میں لڑائی جھگڑے سے کیا فائدہ!

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

”اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں نام خدا لئے جانے کو روکے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اس کا حق نہیں کہ وہ ان مسجدوں میں داخل ہوں مگر ڈرتے چوری چھپے۔ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔“

نظم وسیاق ترتیبی کو اہمیت دینے والوں نے بڑی کوشش سے اس آیت کو یہود یا نصاریٰ سے متعلق کیا ہے چوں کہ اس کے قبل ان ہی کا ذکر ہے مگر تفسیر اہل بیتؑ جو خود آیت کے مضمون سے مطابقت رکھتی ہے یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق مشرکین مکّہ سے ہے جو مکہ معظّمہ اور مسجد الحرام میں داخل ہونے سے مسلمانوں کے سدراہ ہوئے تھے[1]۔

پھر بھی محل نزول کی اس تخصیص کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا حکم بھی کسی جماعت کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ مساجد الٰہی میں ذکر وعبادت سے روکنے والا ہر شخص خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو قیامت تک اس میں داخل ہے[2]۔

آخر میں جو استثناء ہے اَلَّا خَآئِفِیْنَ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خوف زدہ شکل میں آنا مسجدوں کے اندر کفار کے لئے جائز ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ مسلمانوں کو جب اقتدار حاصل ہوگا اوران کا پتہ چل جائے گا تو ان پر لازم ہوگا کہ وہ ان کا فوراً اخراج کردیں۔

یہ جو کہا گیا کہ ”ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب“ تو دنیا کی رسوائی تاریخ میں نمایاں ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں رسولؐ کی زندگی ہی میں دشمنانِ اسلام کے پرخچے اڑ گئے اور ان میں سے بہت سوں کو بادل ناخواستہ تقاضائے وقت سے مجبور ہو کر اسلام کا حلقہ بگوش ہونا پڑا جس پر وہ خود بھی اگر نظر کرتے تو اپنے نفوس کے حقیر وذلیل ہونے کا انہیں احساس پیدا ہوتا اور آخرت کا عذاب وہ وقت آنے پر آنکھوں کے سامنے آئے گا۔

وَلِلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ ۚ فَاَيۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۱۵﴾

”اور اللہ کے مشرق اور مغرب دونوں ہی ہیں تو جدھر تم رخ کرو ادھر اللہ کی مرضی مل سکتی ہے یقیناً اللہ وسعت والا ہے بڑا علم رکھنے والا“۔

یہود ونصاریٰ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے عبادت کرتے تھے جو مدینہ سے ایک سمت میں واقع تھا۔ مسلمانوں کے لئے قبلہ کعبہ قرار دیا گیا جو دوسری سمت میں تھا تو انہوں نے اس پر نکتہ چینی کرنا شروع کی۔ اس کے جواب میں یہ آیت اور اس سورہ کے متعدد آیتیں جو بعد میں آئیں گی نازل ہوتی تھیں۔

خالقِ کریم نے اس آیت میں اصولی طور پر واضح کیا ہے کہ سمت بحیثیت سمت کسی تقدس کی حامل نہیں ہے۔ یہ تو اس وقت ہوسکتا ہے جب اللہ جسمیت رکھتا ہوتا اور کسی سمت میں محدود ہوتا لیکن جب کہ وہ جسم اور جسمانیات سے منزہ ومبرا ہے لہٰذا اس سے کسی مکان بحیثیت مکان کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ جو بھی تعلق ہے صرف مخلوق ومملوک ہونے کا ہے تو اس تعلق میں مشرق اور مغرب دونوں ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں اب اگر وہ صرف جماعت میں یک رنگی و یک جہتی پیدا کرنے کی خاطر کسی ایک جانب عبادت میں توجہ کا حکم دیتا ہے تو اس میں مشرق یا مغرب دیکھنے کے کوئی معنی نہیں بلکہ اصل نصب العین حکم الٰہی کی تعمیل کو قرار دینا چاہیے اور جدھر کے لئے اس کا حکم ہو جائے خواہ وہ مشرق ہو خواہ مغرب اسی طرف اس کی

---

[1]۔ فی المجمع عن الصادقؑ والقمی انہم قریش حین منعوا رسول اللہﷺ دخول مکۃ والمسجد الحرام (صافی)

[2]۔ الظاھر ان ماورد بیان امورد النزول الّذی لا یجعل العام خاصا (بلاغی)

رضا حاصل ہوسکتی ہے [1]۔

اسلام کی عالم گیر وسعت کو دیکھتے ہوئے شریعتِ اسلام کا حکم قبلہ خود اس حقیقت کا مظہر ہے اس لئے کہ اس نے اظہار کے لئے کعبہ کو قبلہ قرار دیا ہے اور ہر اقلیم کے لحاظ سے کعبہ کی سمت مختلف ہے۔ کہیں سے وہ مشرق میں ہوگا اور کہیں سے مغرب میں کہیں وہ جنوب میں ہوگا اور کہیں شمال میں لہٰذا سمت پرستی تو خود اسی سے ختم ہوجاتی ہے اور مکان خاص کی طرف توجہ کی پابندی بھی سب عمومی حالات میں نماز فریضہ کے لئے ہے مسلمانوں کے درمیان یک رنگی و یک جہتی پیدا کرنے کے لئے ورنہ حقیقت عبادت میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لئے دعاؤ مناجات اور سجدہ قرآن اور بہت سے حالات میں نماز نافلہ اور بعض اوقات نماز فریضہ میں بھی یہ پابندی اٹھ جاتی ہے اور جدھر بھی رخ کرے ادھر ہی عبادت درست ہوجاتی ہے اور وہاں اس آیت کا مضمون پوری شدت وقوت کے ساتھ نمایاں ہوجاتا ہے اور اسی اعتبار سے احادیث اہل بیتؑ میں آیت کے محل انطباق کے بیان میں ان مواقع کو پیش کیا گیا ہے جہاں بغیر پابندی قبلہ کے نماز صحیح ہوجاتی ہے مثلاً نماز نافلہ بحالت سفر [2] وغیرہ [3]۔

علمائے جمہور میں سے ایک طبقہ کے رجحان کے برخلاف جو اللہ کو عرش پر جسمانی طور پر متمکن مانتے ہیں عبدالماجد صاحب دریابادی کا یہ تبصرہ قابل قدر ہے کہ:

"المشرق المغرب دونوں سمتیں اور ان ہی دو پر کیا موقوف ہے ہر سمت اور ہر جہت اللہ تعالیٰ کے لئے یکساں ہے وہ سب کا یکساں خالق ہے حاکم ہے مالک ہے کسی خاص سمت میں کوئی بھی خاص تقدیس، کوئی شائبہ الوہیت کوئی شان حق نمائی موجود نہیں۔ مذاہب جاہلی کی تاریخ انسانی حماقتوں جہالتوں وہم پرستیوں کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ ایک مشترکہ گمراہی مشرک قوموں میں یہ رہی ہے کہ خدا چوں کہ متمکن ہے اور مجسم ہے اس لئے لازمی ہے کہ اس کی ہستی کسی نہ کسی متعین سمت یا جہت میں ہو اور اس تلبّس کی بناء پر خود وہ سمت یا جہت مقدس ہے مصری ہندی رومی تمام مشرک قوموں نے خدا کو کسی نہ کسی جہت میں فرض کرکے خود اس جہت کو مقدس مانا ہے اور چوں کہ سورج دیوتا کا مرتبہ مشرکین میں عموماً اہم ومقدم رہا ہے اس لئے شاہ خاور کے طفیل میں سمت مشرق ہی عموماً مقدس سمجھی گئی اور دنیا کے اکثر علاقوں میں پوجتی رہی مشرکوں ہی کے اثر سے یہ سمت پرستی کا شرک اہل کتاب میں بھی سرایت کرگیا اور مسیحی مذہب چوں کہ عقائد وعبادات دونوں میں اپنے وقت کے رائج وشائع رومی مذہب ہی کا مثنیٰ یا پرتو ہے اس لئے وہ تو کھلم کھلا مشرق پرستی میں مبتلا ہوگیا۔ یہود جنہیں اپنی توحید پر ناز تھا وہ تمام تر محفوظ نہ رہ سکے بلکہ ان کے بعض فرقے تو پوری طرح

---

[1]۔ المراد بالوجه القصد والنّية مثل وجهت وجهي للّذى فطر السمٰوٰت والارض او المراد فثم مرضاة الله مثل انما نطعمكم لوجه الله (نیشاپوری)

[2]۔ هٰذا هو المروى عن ائمتّنا (طبرسی)

[3]۔ فى صحيحة الفقيه عن اسحٰق بن عمار عن ابى عبد الله عليه السلام نزلت هٰذه الاية فى المتحير اى فى صلوٰة الفريضة وروى انه احتج الصادق عليه السلام هٰذه الاٰية لصحة سجود التلاوة لغير القبلة كما فى رواية الصّدوق فى العلل عن الحلبى عنه والعدم القضاء لصلوٰة الفريضة اذا صليت خطاء لغير القبلة كما فى رواية التهذيب عن محمد بن الحسين الجعقى عنه وفى رواية الصدوق المنفل مدانّ الصادق عليه السلام احتج بالاية لصحة صلوٰة النافلة على الدّابّة اينما توجهت. وانّ النظر الى مجموع هٰذا للمروى ودلالة الاٰية وجتها يرشد بان رواية نزولها فى مورد خاص انما هو باعتقار انطباقها قا عليه وارادته فى عموم تنزيلها (البلاغی)

اس صفت میں آگے بعض قوموں نے مشرق کے جوڑ پر مغرب کے تقدس کا کلمہ پڑھنا شروع کیا۔انہوں نے دیکھا کہ مشرق اگر خطۂ حیات ہونے کی بناء پر مقدس ہے تو مغرب بھی خطۂ موت و دیار ہلاکت ہے۔شاہ خاور اگر طلوع ادھر سے ہوتا ہے تو روزانہ غروب اور فنا تو ادھر ہی ہوتا ہے۔پھر اس کے تقدس کا کیوں نہ قائل ہوا جائے چنانچہ یہ دونوں سمتیں خوب پجتی رہیں مشرق زیادہ،مغرب اس سے کچھ کم دنیا کی اس سمت پرستی کے شرک مشرق پرستی اور مغرب پرستی کی ضلالت میں مبتلا تھی کہ توحید قرآنی نے ساری دنیا کے عقائد کو چیلنج کر کے اس مشرکانہ عقیدہ پر ضرب لگا کے ایک عالم کو چونکا دیا۔'

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبۡحٰنَهٗ ؕ بَلۡ لَّهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾

''اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے کوئی بیٹا قرار دیا ہے۔بری ہے اس کی ذات بلکہ اس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب سامنے جھکے ہوئے ہیں۔''

مسیح علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کا ابطال:

یہ عیسائیوں کی رد ہے جو مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔اس کے جواب میں دو فقرے کہے گئے ہیں:ایک سُبۡحَانَهٗ اور دوسرا بَلۡ لَّهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ .اس کا مطلب ''بیٹے'' کی نسبت کے خلاف ایک عقلی استدلال ہے اور وہ یہ کہ تم بیٹا کس لحاظ سے کہتے ہو!اگر اس معنی سے کہ وہ حقیقت اصلیہ میں خالق کے ساتھ متحد ہیں جس طرح بیٹا باپ سے متحد ہوتا ہے تو یہ ذات باری کی قدوسیت اور اس کی شان لا ہوتی کے خلاف ہے سبحانہ سے اس کی طرف اشارہ ہو گیا۔

اور اگر اس معنی سے کہ وہ اس کے مخلوق اور اس کے مطیع ہیں جس طرح بیٹا باپ کے لئے ہوتا ہے تو اس میں مسیح کی کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ آسمان و زمین کی ہر شے اس کی مخلوق و مملوک ہے اور اس کے سامنے خواہ اضطراری تکوینی اور خواہ اختیاری طور پر سر جھکائے ہوئے ہے۔

اس استدلال عقلی سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ یہ اسی عقیدہ کی ردّ ہے کہ مسیح واقعی خدا کے بیٹے ہیں لیکن اس کے برخلاف عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں کہ:

''اتخذ ولد ا کا صحیح ترجمہ ہے'' لے رکھا ہے ایک بیٹا بنا رکھا ہے ایک بیٹا۔یہاں مسیحیوں کا یہ قول نہیں نقل ہو رہا ہے کہ خدا کا ایک بیٹا ہے بلکہ یہ کہ خدا نے ایک بیٹا بنا لیا ہے اتخذ ولد ا کا صاف مفہوم یہ ہے کہ خدا نے گویا کسی کو متبنیٰ کر لیا ہے۔قرآن مجید کی تلمیحات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے قرآن کے صدہا مقامات کی طرح یہاں بھی اس کی ضرورت ہے کہ نظر اہل باطل عقائد و خیالات پر ذرا گہری ہو۔مسیحیوں کے ہاں ایک زبردست فرقہ Adoptionists کے نام سے گزرا ہے۔ان کے مرکزی عقیدہ کیلئے اصطلاحی لفظ تبنیت (Adoptionism) کا ہے۔عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیح خلقتِ خدا نہیں۔وہ خدا پیدا نہیں ہوئے۔وہ خدا شروع سے بنے بنائے اور خود بخود نہیں ہیں بلکہ اصلاً و خلقۃً وہ انسان ہی تھے۔البتہ اقنوم ثالثہ یعنی روح القدس کا فیضان ان پر شروع ہی سے ہونے لگا تھا۔اس لئے وہ قدوسیت کے ایسے اوج کمال پر پہنچ گئے اور روح الٰہی ان کے

اندر ایسی حلول کر گئی کہ اقنوم اول یعنی خدائے برتر و اعظم نے انہیں اپنا بیٹا قرار دے کر اپنا متبنّیٰ بنا کر شریک الوہیت کر لیا اور اب وہ ربوبیت مالکیت وغیرہ جملہ صفات الٰہی میں شریک و سہیم ہیں اس عقیدہ کے وجود کی شہادت تاریخ میں ۱۸۵ء میں ملتی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں پاپائے روم نے اسے الحادو زندقہ قرار دیا۔ بارھویں صدی عیسوی میں اس نے پھر زور پکڑا اور پھر یہ لوگ زندیق قرار پائے۔ آیت میں صاف اشارہ مسیحیت کی اس شاخ کی جانب ہے۔''

میرے خیال میں اگر اس عقیدہ کی رد ہوتی تو سبحانہ کے پہلے اتخاذ شریك کا ذکر آتا کیوں کہ صرف برائے نام 'ابن' قرار دے لینا اتنا شان الٰہی کے خلاف نہیں ہے جتنا اس عقیدہ کا یہ جز کہ ''اس نے ان کو شریک ربوبیت کر لیا۔ اب وہ ربوبیت و مالکیت وغیرہ جملہ اوصاف الٰہی میں شریک و سہیم ہیں''۔ لہٰذا تنزیہ و تسبیح کے لئے اس تصور کا ذکر کرنا زیادہ مناسب تھا مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ ولد قرار دیے جانے ہی کو مورد تنزیہ قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے واقعاً ابن خدا ہونے ہی کے تصور کا انکار ہے۔

رہ گیا اتخذ کا لفظ سے جو استدلال ہے وہ بھی ایک قرآنی نظیر دیکھنے کے بعد غلط معلوم ہوتا ہے ارشاد ہوا ہے:

''اَفَاَصۡفٰىكُمۡ رَبُّكُمۡ بِالۡبَنِيۡنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الۡمَلٰٓـئِكَةِ اِنَاثًا‌ ؕ اِنَّكُمۡ لَتَقُوۡلُوۡنَ قَوۡلًا عَظِيۡمًا ۞ (بنی اسرائیل) ظاہر ہے کہ مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ یہ نہیں کہ وہ انہیں متبنّیٰ خدا کا قرار دیتے تھے۔ معلوم ہوا کہ اتخاذ اصل تخلیق کے ساتھ بھی وابستہ ہوسکتا ہے۔

بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۞

''اور آسمانوں کا اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کسی بات کو طے کر دیتا ہے تو بس اس سے کہتا ہے کہ ہوجا وہ ہوجاتی ہے۔''

بدیع اور مبدع کے معنی ہیں کسی شے کو بنانے والا بغیر نمونہ و شکل کے۔ اسی لئے اس کا ترجمہ ''موجد'' کے لفظ سے کیا گیا ہے [1]۔

کسی بات کو طے کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے علم تام و شامل میں یہ ہوتا ہے کہ وہ حکمت و مصلحت کے مطابق ہے اس لفظ سے خالق کے فاعل مختار اور مرید ہونے کا اظہار ہے یعنی اس کے افعال بتقاضائے ذات قہری طور پر نہیں ہیں۔

''کہتا ہے کہ ہوجا'' اس سے یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ یہ لفظ اس کی طرف سے وجود میں آتا ہے۔ قول میں لفظ کی ضرورت تو اس وقت ہے جب قائل زبان و دہن رکھتا ہو لیکن خالق کی ذات جسم و جسمانیات سے منزہ و مبرا ہے۔ کن کا لفظ صرف ارادہ الٰہی کے تعلق کی تعبیر لفظی ہے مطلب یہ ہے کہ اس کے ارادہ کے ساتھ ہی بس یہ شے عالم وجود میں آجاتی ہے تاخیر و توقف کی کوئی گنجائش نہیں ہے [2]۔

وَقَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ لَوۡلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوۡ تَاۡتِيۡنَآ اٰيَةٌ‌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ

---

[1]۔ معنی المبدع المنشئی و المحدث مالم یسبقه الی انشاء مثله و احداثه احد (طبری) فی الکافی عن الباقر علیه السلام فی تفسیره ابتدع الاشیاء کلها بعلمه علےٰ غیر مثال کان قبله (صافی)

[2]۔ یقول له کن فیکون بلا لفظ و لا نطق بلسان و لا همة و لا تکفر (صافی)

مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ؕ تَشَابَهَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ قَدۡ بَيَّنَّا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾

''اور جو دانائی سے محروم ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا قدرت کی کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں آتی؟ یونہی وہ جو ان کے پہلے تھے انہی کی سی بات کہتے تھے ان سب کے دل ملتے جلتے ہوئے ہیں ہم نے اپنی نشانیاں تو صاف پیش کردی ہیں، ان لوگوں کے لئے جو یقین کرنے پر تیار ہوں۔''

کفار کے غلط مطالبے:

یہ جاہل مشرکین کا ذکر ہے جو نظام رسالت پر ہی معترض ہیں یہ کہہ کر کہ اللہ کو واسطہ اور نمائندہ کی ضرورت کیا ہے؟ وہ براہ راست خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا؟ یہ ان کا قول خود ان کی جہالت کا مظاہرہ ہے اس لئے کہ وہ خالق کو سمجھتے ہیں کہ مادی حیثیت سے وہ جسمانی طور پر کلام کرتا ہے لہٰذا ہم ہی سے کلام کرے حالانکہ اس کا کلام تو غیر مادی ہے جو کانوں پر نہیں بلکہ قلب روحانی اور فطرت ربانی ہی پر نازل ہوسکتا ہے اور وہ ہر بشر کے قالب میں نہیں ہوتی۔ اس کے لئے کچھ مخصوص ہی افراد ہو سکتے ہیں جو روح مجسم کی حیثیت رکھتے ہوں۔ وہی اس لائق ہوسکتے ہیں کہ اس فیض کے حامل ہوں۔ اسی کو دوسرے جگہ اس طرح کہا ہے کہ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ ''اللہ ہی اس محل کو جانتا ہے جہاں وہ اپنی رسالت قرار دے۔''

دوسرا جاہلانہ مطالبہ ان کا یہ تھا کہ کوئی نشانی ہمارے پاس آئے۔ یہ اگر واقعی حقیقت طلبی کے لئے ان کا مطالبہ ہوتا تو حق بجانب تھا اس لئے کہ رسولؐ کے پاس اس کی حقانیت کی دلیل بہرحال کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے۔ اور یہ دلیل اس کی سچائی کی نشانی ہوا کرتی ہے اسی لئے آیۃ یعنی نشانی کا لفظ قرآن میں بہت جگہ ''معجزہ'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے مگر ان کا یہ مطالبہ تو اس حالت میں تھا کہ رسولؐ کی طرف سے آیات یعنی حقانیت کی نشانیاں یا معجزات کثرت سے پیش ہو چکے تھے پھر بھی وہ یہی رٹ لگائے ہوئے تھے کہ کوئی معجزہ آئے، کوئی نشانی ظاہر ہو کوئی دلیل سامنے آئے یہ ان کا صرف عناد تھا اور اسی لئے ان کے جواب میں کہا گیا ہے کہ نشانیاں تو ہم بڑی واضح وظاہر پیش کر چکے ہیں مگر وہ ان ہی کو منوا سکتی ہیں جو ماننے کے لئے تیار ہوں اور جو یہ طے کر چکے ہیں کہ ہم چاہیے جو کچھ ہو جائے یقین ہرگز نہ کریں گے تو ان کے لئے کوئی بھی معجزہ آجائے وہ بے کار ہی ہوگا۔

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ بِالۡحَـقِّ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا ۙ وَّلَا تُسۡـئَلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِيۡمِ ﴿۱۱۹﴾

''ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا اور دوزخ میں جانے والوں کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔''

رسولؐ خدا کو اس کی بڑی فکر تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ایمان لائیں حالانکہ جتنی کامیابی اس بارے میں آپ نے اپنی زندگی میں حاصل فرمائی وہ کسی دوسرے نبی یا رسولؐ کی تاریخ زندگی میں نایاب ہے۔ پھر بھی جو ایمان نہیں لائے تھے اور کفر وشرک پر قائم تھے ان کے متعلق آپ کو بہت ملال ہوتا تھا۔ آپ کے اس رنج وملال کو دور کرنے کے لئے قرآن مجید میں متعدد مرتبہ اس طرح کی آیتیں آئی ہیں کہ اے رسول ﷺ

آپ کا جو فرض ہے وہ آپ پوری طرح ادا کر رہے ہیں۔ اب ایمان لانا نہ لانا ان لوگوں کا کام ہے۔ اس کی ذمہ داری آپ پر کوئی نہیں ہے لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (غاشیہ ۲۲) وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾ (نور ۵۴) اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ (قصص ۵۶) یہ سب آیتیں اسی باعث سے نازل ہوئی ہیں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (رعد ۴۰) آپ کا کام صرف پہنچا دینا ہے اور ان کے افعال کا محاسبہ ہمارے ہاتھ میں ہے ان میں سے ایک جگہ خود خلائق سے مخاطب ہو کر بھی کہا گیا ہے فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ (نور ۵۴) ''رسولؑ اس کے ذمہ دار ہیں جس پر وہ مامور ہیں اور تم اس کے ذمہ دار ہو جس پر تم مامور ہو۔''

اس کا مطلب بھی وہی ہے کہ تمہارے کفر و عصیان کی ذمہ داری پیغمبر پر نہیں ہے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

''اور آپ سے یہودی اور عیسائی تو اس وقت تک کبھی خوش نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ ہو جائیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے اور اگر آپ اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آچکا ہے ان کے من مانے خیالات کی پیروی کیجئے تو اللہ کے غضب سے بچانے کے لئے آپ کا نہ کوئی یاور ہوگا نہ مدد گار۔''

یہ خطاب رسولؐ سے ہے اور متنبہ کرنا مسلمانوں کو مقصود ہے چوں کہ یہود اور نصاریٰ بہ نسبت مشرکین کے اسلام سے قریب نظر آتے تھے، اس لئے کہ وہ (مشرکین) توحید کے لفظاً اور معناً ہر طرح کے منکر تھے اور نبوت و شریعت اور جزا و سزا اس پورے نظام ہی سے بے خبر بلکہ منکر تھے اور یہ توحید کے لفظاً مقر، نبوت و شریعت اور جزا و سزا کے معترف اور وحی و الہام سب ہی باتوں کے ماننے والے تھے۔ صرف اتنی بات تھی کہ انہوں نے کچھ رہنمایانِ دین کے بارے میں غلو سے کام لے کر ان کے بارے میں غلط عقیدے قائم کر لئے تھے اور پھر یہ کہ وہ بالخصوص حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آپ کے پہلے حضرت عیسیٰؑ کی بھی نبوت کے منکر تھے لہٰذا امید کی جا سکتی تھی کہ اگر ان کے ساتھ ذرا رعایت و مدارات سے کام لیا جائے تو یہ اسلام سے قریب ہوتے جائیں اور دین حق کو قبول کر لیں خالقِ حکیم نے ان کے متعلق اس امید کو قطع کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ کسی خاطر مدارات سے آپ کے نہیں ہو سکتے۔ یہ اس وقت تک آپ سے خوش نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ حق کے منکشف ہونے کے بعد یہ آپ کے لئے ممکن ہی نہیں ہے اور اگر آپ ایسا کیجئے تو خدا کے غضب سے آپ کو بچانے والا کوئی نہیں ہو سکتا یہ بطورِ مفروضہ صرف اس حقیقت کے اظہار کے لئے کہا ہے کہ تصورات میں حق سے قریب ہونے کی وجہ سے کوئی باطل مذہب حق نہیں ہو سکتا۔ نہ یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اسے مان لیا جائے تو اس پر بازپرس اتنی تو نہ ہوگی جتنی شرک پر ہو سکتی ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ حق پر مطلع ہونے کے بعد حق سے روگردانی جس شکل سے بھی ہو وہ باطل ہی ہے اور باطل ہونے کے لحاظ سے ہر باطل برابر ہے، اس میں کمی اور زیادتی یا قوت اور ضعف کوئی نہیں ہے

اور اگر وہ دین کے اجزاء ہیں تو ان سے انکار پر مواخذہ میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق ہوسکتا ہے تو علم اور لاعلمی یا مراتب عناد کے لحاظ سے ہوسکتا ہے نہ کہ انکار کی مقدار اور تعداد کے لحاظ سے کہ کون دس باتوں کا منکر ہے اور کون ایک بات کا۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓىِٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

”جنہیں ہم نے کتاب دی ہے اور وہ اسے پڑھنے کا حق ادا کرتے ہوئے پڑھتے ہیں وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور جو اس سے انکار کرتے ہیں تو یہ وہ ہیں جو خسارے میں ہیں۔“

کتاب سے مراد توریت ہے اور ”جنہیں کتاب دی گئی“ اس سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں۔ پڑھنے کا حق ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف الفاظ کو زبان پر جاری کرتے یا انہیں رٹتے ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے معانی پر غور کرتے اور ان پر عمل کی کوشش کرتے ہیں [1]۔

مقصود آیت یہ ہے کہ وہ یہود اور نصاریٰ جو خود اپنی کتابوں کے صرف لفظی حافظ نہ ہوں بلکہ ان کے معانی و مطالب پر بھی نظر کیے ہوئے ہوں اور ان کا اتباع بھی پیش نظر رکھتے ہوں ان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ پیغمبر اسلامؐ اور ان کے پیغام پر ایمان نہ لائیں اور جو ان میں سے منکر ہیں ان کے متعلق یقین سمجھنا چاہیے کہ وہ پہلے ہی سے خود اپنی کتاب کے فیض سے بھی محروم ہیں اور انہوں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ پھر ایک سرمایہ ہدایت پاس موجود ہوتے ہوئے جہالت و گمراہی میں پڑے رہنے سے بڑھ کر خسارہ اور کیا ہوسکتا ہے۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۲﴾

”اے بنی اسرائیل میری وہ نعمت یاد کرو جس سے میں نے تمہیں نوازا اور یہ کہ میں نے تمہیں تمام خلائق سے زیادہ عطا کیا۔“

یہ آیت بالکل ان ہی الفاظ میں پہلے آ چکی ہے اور اس کی تفسیر وہاں درج ہو چکی ہے۔

اگر ترتیب تنزیلی یہی ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے تو یوں سمجھنا چاہیے کہ ایک دفعہ واقعات کے بیان سے پہلے بنی اسرئیل کو متنبہ کیا گیا اور ایک دفعہ پھر واقعات کے بعد ان کے نتیجہ پر توجہ دلائی اور اس صورت میں گویا یوں کہا جا رہا ہے: ”پھر تم سے کہتا ہوں کہ اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جس سے میں نے تمہیں نوازا (الخ)“ اس سورت میں یہ تکرار ویسی ہی ہوگی جیسے سورہ رحمٰن میں فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ

---

[1] ۔ یتبعونہ حق اتباعہ (طبری) سب سے زیادہ جامع تشریح اس کی امام جعفر صادق کی حدیث میں ہے عن الدیلمی عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال یر تلون ایاتہ ویتفقھون بہ ویعلمون باحکامہ ویرجون وعدہ ویخافون وعیدہ ویعتبرون بقصصہ ویأتمرون باوامرہ وینتھون بنواھیہ (بلاغی)

کی بار بار تکرار کی گئی ہے جسے یوں سمجھنا چاہیے کہ تنبیہ کے لئے مسلسل تازیانے لگائے گئے ہیں [1]۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ یہ آیت تنزیل میں اس سلسلہ کی ہو ہی نہ اور کسی اور ایسے موقع پر ان ہی الفاظ میں جو ایک دفعہ کہے جا چکے تھے انہیں متنبہ کیا گیا ہو جس کا نظم کلام میں کوئی تعلق ہی پہلی دفعہ کی تنبیہ کے ساتھ نہ ہو۔ چوں کہ ترتیب قرآن کلیتہً مطابق تنزیل قطعی طور پر نہیں ہے اس لئے اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

”اور اس دن سے بچنے کا سامان کرو جب نہ کوئی دوسرے کو کچھ فائدہ پہنچا سکے گا اور نہ کسی کا کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ سفارش کسی کو کچھ فائدہ پہنچا سکے گی اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔“

گذشتہ آیت کے بعد پہلی جگہ بھی تقریباً ان ہی الفاظ میں یاد آخرت دلائی گئی تھی اور اس کے تمام فقروں کی تشریح وہاں ہو چکی ہے۔ الفاظ میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہاں پہلے شفاعت کے متعلق نفی تھی اور پھر معاوضہ کے متعلق اس طرح کہ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ اور یہاں اس کا عکس ہے مگر اس فرق سے مطلب پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے تفسیر میں کوئی امر محتاج تحریر نہیں ہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

”اور وہ وقت جب ابراہیمؑ کا ان کے پروردگار نے چند باتوں کے ساتھ امتحان لیا اور انہوں نے ان باتوں کو پورا کر دیا تو ارشاد ہوا کہ میں تمہیں خلق خدا کا امام بنا تا ہوں۔ انہوں نے کہا اور میری اولاد میں سے؟ ارشاد ہوا کہ میری طرف کا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔“

امتحان حضرت ابراہیمؑ اور اعلانِ امامت:

ابراہیمؑ کی شخصیت چوں کہ مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب ہی میں مسلم تھی اس لئے ان کے واقعات زندگی کا تذکرہ قرآن نے بڑی اہمیت سے کیا ہے۔ مشرکین کی وہ جماعت جس سے شروع میں رسولؐ کو سابقہ پڑا تھا حجاز کی باشندہ تھی اور زیادہ تر جناب ابراہیمؑ سے نسلی تعلق رکھتی تھی۔ اس لئے حج خانہ کعبہ کی پابند تھی اور کعبہ کو اپنا قومی گھر سمجھتی تھی اور یہود و نصاریٰ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل میں سے تھے اور یہ یعقوبؑ بن اسحٰق

---

[1]۔ تخصيصهم بتكرير التذكير واعادة التحذير بلمبالغة فى النصح وللايذان بان ذلك فذلكة القضية والمقصد من المقصد (ابو السعود)

بن ابراہیمؑ کی نسل کا نام ہے پھر مسلمانوں کے لئے خصوصیت سے ابراہیمؑ کو اس لئے اہمیت حاصل تھی کہ آپ مذہبی طور پر بھی ان کے مورث اعلیٰ ہیں یعنی ملت اسلامیہ کے پہلے مبلغ حضرت ابراہیمؑ تھے جنہوں نے اس کا نام ''اسلام'' رکھا اور آنے والی امت کا نام ''امت مسلمۃ'' تجویز کیا جس کا ذکر آیاتِ قرآن کے سلسلہ میں عنقریب آئے گا۔

''پروردگار نے ابراہیمؑ کا چند امور میں امتحان لیا'' ان امور کی تفصیل قرآن مجید میں مذکورہ نہیں بہر حال یہ ظاہر ہے کہ وہ تکالیف عمومی کے علاوہ کچھ خصوصی امورہ ہوسکتے ہیں جو انبیا ؤ مرسلین میں بھی سب سے متعلق نہیں ہوئے بلکہ حضرت ابراہیمؑ ہی کے ذمہ عائد ہوئے اور جنہیں انہوں نے پایہ تکمیل کو پہنچایا ان میں سے ایک نمایاں امر اا پنے فرزند اسماعیلؑ کی قربانی کو بھی سمجھا جا سکتا ہے جس کا روایت میں ذکر ہے [1]۔

''آزمایا'' اپنی واقفیت کے لئے نہیں کہ وہ تو خود عالم الغیوب ہے' بلکہ اس منصب کے لئے جو نہیں دیا جانے والا ہے ان کا استحقاق ثابت کرنے کے لیے۔

جب ابراہیمؑ ان امتحانوں میں پورے اترے تو خالق کا ارشاد ہوا کہ میں تمہیں لوگوں کا امام قرار دیتا ہوں۔ امام کے لغوی معنی ہیں جس کی پیروی کی جائے اور مذہبی اصطلاع میں وہ ایک منصب ہے جس کے لازمی نتیجہ میں مفترض الطاعۃ ہونا یعنی اس کی پیروی کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ جناب ابراہیمؑ کے لئے نبوت و رسالتؑ وخلت کے مراتب پر فائز ہونے کے باوجود امتحان کے معیار پر پورے اترنے کے بعد امامت کا اعلان کیا جانا، منصب کی رفعت کا نا قابل انکار ثبوت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امامت لغوی چاہے ہر نبی ورسول کے لئے ثابت ہوسکتی ہے لیکن بحیثیت منصب من جانب اللہ امام ایک وہ خصوصی عہدہ ہے جو نبوت اور رسالت کے لئے لازمی نہیں ہے [2]۔

نبی رسولؑ اور امام کے لغوی معنی پر بھی غور کیا جائے تو امامت کی منزل زیادہ بلند نظر آئے گی۔ نبی خبر دینے والا، رسول پیغام پہنچانے والا اور امام یعنی پیشوا، پہلی دونوں چیزوں میں وہ ہمہ گیری، مستقل حیثیت اور دوسروں کے لحاظ سے خود مفہوم لفظ میں وہ رفعت نہیں جو امام میں ہے اور اسی لئے جب کہ عقلی طور پر نبی اور رسول بھی معصوم ہوتے ہیں امام کے لئے خود اس لفظ سے اور زیادہ قوت کے ساتھ عصمت کے ضروری ہونے کا پتہ چلتا ہے [3]۔

امتحان میں تمام وکمال کامیابی کے بعد خالق کی طرف سے اعلان امامت ہوا تھا اس لئے ابراہیمؑ کا دل بڑھا ہوا تھا۔ خالق کی نگاہ کرم کی

---

[1]۔ عن الصادق علیہ السلام انہ ما ابتلاہ اللہ بہ فی نومہ من ذبح ولدہ اسمٰعیل (مجمع البیان)

[2]۔ اسی مضمون کی امام جعفر صادقؑ کی حدیث ہے کہ انّ اللہ تبارک وتعالیٰ اتخذ ابراھیم عبدا قبل ان یتخذ بیّنا وان اللہ اتخذہ نبیّنا قبل ان یتخذہ رسولا وان اللہ اتخذہ رسولا قبل ان یتخذہ خلیلا وان اللہ اتخذہ خلیلا قبل ان یجعلہ اماما فلما جمع لہ الاشیآء قال انی جاعلك للناس امام (اصول کافی) وفی العیون عن الرضاء فی حدیث طویل ان الامامۃ خص اللہ عزوجل بہا براھیم الخلیل بعد النبوۃ والخلۃ مرتبۃ ثالثۃ وفضیلۃ شرفۃ بہا (صافی)

[3]۔ فی الایۃ دلیل علیٰ انہ ﷺ کان معصوما عن جمیع الذنوب لانہ لو صدرت عنہ معصیۃ لوجب علینا الاقتدآء بہ وذٰلك یؤدّی الی کون الفعل الواحد ممنوعا منہ مندوبا الیہ وذٰلك محال (نیشاپوری)

توجہ خاص مبذول دیکھ کر اور منصب کی بلندی کو محسوس کر کے سوال کر لیا **و من ذریتی** اور میری اولاد میں سے بھی[1] ؟"

جواب ملا: "میرا عہدہ ظالموں تک نہیں پہنچتا" غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ از اول سوال ابراہیمؑ تمام ذریت سے متعلق ہی نہ تھا کیوں کہ انہوں نے کہا تھا "**و من ذریتی**" میری ذریت میں سے بھی۔ اگر کل کے لئے سوال ہوتا تو **من** یعنی "میں سے" نہ کہا ہوتا[2]۔

اس کے بعد خالق کریم کے جواب کو ابراہیمؑ کی رد یا اس میں کوئی کمی سمجھنا غلط ہوگا بلکہ وہ دعائے ابراہیمی کی قبولیت کا اظہار ہے اس کے ابہام کی تشریح کے ساتھ مطلب فقرہ کا یہ ہوتا ہے کہ ہاں ضرور تمہاری اولاد میں یہ منصب رہے گا البتہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔

ظالم کسے کہتے ہیں، اس کی تشریح خود قرآن نے دوسری جگہ کر دی ہے: "**وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ**" (بقرہ ۲۳۳) "جو اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں وہ ظالم ہیں۔" اس کے بعد ظالم کے لفظ کو کافر سے مخصوص کرنا بلاوجہ ہے "گناہ" جو بھی ہوگا' وہ حد الٰہی سے تجاوز ہی ہوگا لہٰذا مرتکب اس کا ظالم قرار پائے گا خواہ وہ کفر ہو یا فسق بلکہ ایسا گناہ بھی جو فسق کی حد تک نہ پہنچے۔

دعائے ابراہیم علیہ السلام اور اس کی قبولیت با شرط عصمت:

اس کے علاوہ جب ابراہیمؑ کے لئے امامت کا اعلان عصمت کی دلیل ہوتا امامت کے بقاء کا اعلان ان کی ذریت میں جیسا کہ اس وعدہ سے ظاہر ہے خود ہی صفت عصمت کے کچھ افراد ذریت میں تا قیامت وجود کی یقینی دلیل ہوں گے۔

اس کے ساتھ جب لفظ ظالم کے حدود کی وسعت دیکھنے کے لئے اس آیت پر نظر کی جائے کہ **وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ** حالانکہ فعل آدمؑ ص گناہ نہ تھا تو معلوم ہوگا کہ امامت کا درجہ وہ ہے جو اس حد تک کے ترک اولیٰ کو بھی برداشت نہیں کر سکتا جو کسی درجہ تک نبوت کے ساتھ ممکن الوقوع ہوتا ہے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

"اور وہ وقت کہ جب ہم نے خانہ کعبہ کو تمام لوگوں کا مرکز اور مقام امن قرار دیا اور تم لوگ مقام ابراہیمؑ کو اپنے نماز کی جگہ بناؤ۔ اور ہم نے ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو حکم دیا کہ میرے گھر کو پاک رکھنا طواف کرنے والوں اعتکاف کرنے

---

[1] ۔خبر صادقؑ میں ہے فمن عظمها فی عين ابرٰهيم قال ومن ذرّيّتي (اصول کافی) عیون اخبار الرضا کی روایت میں ہے فقال الخليل سرورا بها ومن ذرّيّتي (صافی)

[2] ۔"مِن ذرّيّتي" میں من تبعیضیہ ہے اور فقرہ کی ترکیب نے اسے صاف کر دیا کہ ابراہیمؑ کی دعا سوال کے رنگ میں اپنی ساری نسل سے متعلق نہیں۔ اس کے جزو سے متعلق تھی (دریابادی)

والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔"

خانۂ کعبہ کی مرکزیت:

بیت کے لفظی معنی تو عام گھر کے ہیں لیکن الف لام عہد کے ساتھ اصطلاح قرآنی میں یہ نام کعبہ کا ہو گیا ہے [1]۔

مثابہ اسم ظرف ہے ثَوب سے جس کے معنی پلٹنے کے ہیں کسی شے سے لو لگانا اور بغرض حصول ثواب اس کی طرف رخ کرنا اس کی جانب رجوع کرنا ہے۔ اسی لئے ہم نے ترجمہ "مرکز" کے لفظ سے کیا ہے۔

بعض مفسرین نے اس میں جا کر پلٹنے کے مفہوم کا لحاظ کرتے ہوئے یہ معنی پیدا کیے ہیں کہ لوگ اس کی زیارت سے سیر نہیں ہوتے بلکہ جا کر پھر آتے ہیں اور بار بار حج کرتے ہیں [2]۔

یہ ایک خصوصیت اس گھر کی بیان کی گئی۔ دوسری یہ کہ وہ محل امن قرار دیا گیا ہے اور وہ معیاری امن کا نمونہ جس میں انسان کیا بلکہ بہائم و طیور اور اس سے بڑھ کر نباتات تک امن میں ہیں یعنی حرم کے حدود میں کسی جانور کا شکار نا جائز اور وہاں کی گھانس تک کا اکھاڑنا ممنوع قرار دیا گیا ہے اور انسانوں کے لئے تو اس دنیوی امن کے علاوہ وہ آخرت میں بھی امن کا ذریعہ ہے [3]۔

جیسا کہ مولوی عبدالماجد صاحب نے لکھا ہے "فرنگی" قاموس علم و دانش ہیں۔ اتنا تو بہر حال ہے کہ حضرت محمدؐ کے دور سے قبل مکہ کی دو حیثیتیں ہم مسلم پاتے ہیں، ایک تجارتی مرکز کی ایک مقدس معبد کی جس کے ارد گرد کی زمین بھی حرج ہے" (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ج ۱۵ ص ۱۵ طبع چہادرہم)

خانہ کعبہ کا مرکز خلائق اور محل امن ہونا تو حادث نہیں بلکہ قدیم امر تھا اس لئے اسے ذکر ماضی کے طور پر یاد دلایا اور اس کے بعد اب حال کے متعلق حکم ہے جو مسلمانوں ہی کا شعار بننے والا تھا اور وہ مقام ابراہیمؑ کو محل نماز قرار دینا یعنی اس جگہ حج کے موقع پر نماز ادا کرنا [4]۔

مقام ابراہیمؑ سے مراد وہ محل ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے نماز ادا کی تھی اور وہیں وہ پتھر بھی نصب ہے جس پر ان کے قدم کا نشان ہے [5]۔

---

[1]۔ البیت اسم غالب للکعبة کالنجم للثریا وھذا من الاسماء التی کانت فی الارض للجنس ثم کثر استعماله فی واحد من ذلك الجنس (نیشاپوری)

[2]۔ یأتونه کل عام ویرجعون الیه فلا یقضون منه وطرا (طبرانی)

[3]۔ عن الصّادقؑ من دخل الحرم من الناس مستجیرا به فهو امن من سخط الله عزوجل ومن دخل من الوحش والطیر کان امنا من ان یهاج او یؤذی حتی یخرج من الحرم (کافی)

[4]۔ فی التهذیب عن الصّادقؑ یعنی بذلك رکعتی طواف الفریضة ومثله فی الکافی (سافی)

[5]۔ فی الکافی فی الحسن کالصحیح عن ابی عبدالله مقام ابراهیم حیث قام علی الحجر فاثرت فیه قدماه. والظاهر ان المراد من مقام ابراهیم فی الایة هو جهة موقفه ومحل قیامه لاخصوص موطئه فی قیامه اونفس الصّخرة (بلاغی)

نماز کا حکم دینے کے بعد اب مسلمانوں کو اس کی طہارت کے متعلق اہتمام کی طرف متوجہ کرتے ہوئے پھر ذکر ماضی کی طرف عود ہوا ہے کہ یہ آج ہی نہیں ہے بلکہ پہلے ہی تمہارے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند اسماعیلؑ کو ہمارا حکم ہو گیا تھا کہ میرے گھر کی تطہیر کو پیش نظر رکھنا۔تطہیر کے معنی متفقہ طور پر یہاں طاہر رکھنے کے ہیں طاہر کرنے کے نہیں کیوں کہ خانہ کعبہ طہارت ہی کے ساتھ وجود میں آیا تھا نجاست اس میں کبھی نہ تھی [۱] ۔

''میرے گھر'' میں اضافت اظہار شرف وعظمت کے لئے ہے اور اسی طرح آدمؑ کے لئے من روحی اور عیسیٰؑ کے لئے روح اللہ اور ایسے ہی عرش کی اضافت۔ان میں کہیں بھی جسمیت کا تصور کرنا باطل ہے [۲] ۔

آخر میں خانہ کعبہ کے ساتھ جس طرح کی عبادتوں کا تعلق ہے ان کا بیان کیا گیا ہے ایک طواف یعنی خانہ کعبہ کے ارد گرد چکر لگانا جو حج کا ایک ضروری جزء ہے۔ دوسرے اعتکاف یعنی نیت کر کے روزہ کی حالت میں ایک معینہ مدت تک مسجد میں مسلسل قیام۔ اس کے احکام فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں تیسرے نماز جس کی نمایاں حالتیں رکوع وسجود ہیں۔ چوں کہ رکوع وسجود دونوں ایک ہی عبات کے جزء ہیں اسی لئے ان کے درمیان واو عاطفہ جو مغایرت کا پتہ دیتا ہے نہیں لایا گیا۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

''اور وہ وقت جب ابراہیمؑ نے کہا اے میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا اور اس میں رہنے والوں کو پھلوں سے روزی عطا کر انہیں کہ جو ان میں سے اللہ اور آخرت پر بھی ایمان لائیں۔ ارشاد ہوا کہ اور جو کفر اختیار کرے گا میں اسے بھی کچھ دن تو مزے اٹھا لینے دوں گا۔ پھر سے بجبر دوزخ کے عذاب کی طرف لے جاؤں گا اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے۔''

حضرت ابراہیمؑ کی دعائیں اور اُن کی استجابت:

حضرت ابراہیمؑ نے جو دعائیں کی تھیں ان کی قبولیت کا سب سے زیادہ نمایاں رخ یہ ہے کہ وہ دعائیں اس وقت کے حالات کے تقاضے اور اسباب طبیعیہ کی رفتار کے خلاف تھیں۔ایک آبادیوں سے دور افتادہ مقام جہاں ابھی نئی نئی انسانوں کی بستی بسی ہے اور ہر وقت لیٹروں اور ڈاکوں کا خطرہ، وہاں امن وامان کہاں پھر وہ جگہ جہاں اب تک پانی کا نام ونشان نہ تھا اور پتھریلی زمین وہاں پھل پھلواری کہاں اور وسائل وذرائع کی

---

[۱]۔المراد اقرّاه علیٰ طهارته مثل ولهم فیها ازواج مطهرة فمعلوم انهن لم يطهّرن بل خلقن طاهرات (نیشاپوری)

[۲]۔ الاضافة للتشریف کناقة الله (روح المعانی)

نایابی کے سبب دوسری جگہوں سے درآمد کا کیا امکان مگر خلیل حق کی پر خلوص دعائیں تھیں۔ قادر مطلق کی بارگاہ میں ان سے ہر دعا قبول ہو کر رہی۔

الحب فی اللہ و البغض فی اللہ کے ماتحت جو ایمان و اخلاص عبودیت کا لازمی نتیجہ ہے حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا کو اہل ایمان کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ مگر خالق نے اس کی قبولیت کا اعلان کرتے ہوئے اپنی ربوبیت و رحمانیت کے ثبوت میں اس کی خبر دے دی کہ رزق دنیا میں تو کافر بھی مومنین کے ساتھ شریک رہیں گے۔ ہاں آخرت میں وہ رحمت جو بتقاضائے رحیمیت ہے مومنین کے ساتھ مخصوص ہوگی اور وہاں کافروں کا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا۔

ان دونوں قسم کی رحمتوں کا فرق بسم اللہ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔

وَاِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَاِسۡمٰعِیۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۲۷﴾

''اور وہ وقت جب ابراہیمؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ اسماعیلؑ۔ اے ہمارے پروردگار ہم سے قبول فرما یقیناً تو بڑا سننے والا ہے جاننے والا۔''

بنائے کعبہ اور ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی مناجات:

بنیادیں اونچی کرنے کے لفظ سے ظاہر ہے کہ وہ ابتدائی تعمیر نہ تھی بلکہ سابقہ عمارت جو امتداد زمانہ سے منہدم ہو گئی تھی اس کو از سر نو انہی بنیادوں پر قائم کرنا تھا[1]۔

اسلامی روایات بتاتے ہیں کہ کعبہ کی زمین تخلیق ارض میں مقدم ترین نقطہ اور اس کی عمارت دنیا کی بنا کردہ عمارتوں میں سب سے مقدم عمارت ہے جو ابو البشر کے ہاتھ سے قائم ہوئی تھی۔

غیر مذاہب کے محققین نے بھی اپنے حدود تحقیق کے اندر خانہ کعبہ کی غیر معمولی قدامت کا اقرار کیا ہے جن کی تصریحات کو مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نے نقل کیا ہے چنانچہ انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں انگریز مصنف باسورتھ اسمتھ نے لکھا ہے'' یہ وہ معبد ہے جس کی قدامت عہد تاریخ سے آگے ہے (محمد اینڈ محمڈ ازم ص ۱۶۶) سر ولیم میور نے لکھا ہے'' مکہ کے مذہب کی تاریخ بہت ہی قدیم ماننی پڑتی ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ ایک نامعلوم زمانہ سے ملک عرب کا مرکز چلا آتا ہے۔'' (لائف آف محمد مقدمہ ص ۱۰۲ و ۱۰۳)

یہ اس خانہ مقدس کے من جانب اللہ تقدس و احترام ہی کا نتیجہ تھا کہ خلیل حق کو اس کی معماری کے لئے منتخب کیا گیا اور وہ اپنے فرزند اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر بنفس نفیس اس کی بنیادوں کو اونچا کر رہے تھے۔

اس وقت ان کے قلبی تاثرات کیا تھے' انہیں خالق نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ''رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّاۤ الخ' یہ الفاظ اگر لفظی طور پر ان کی زبان پر جاری ہوئے ہوتے تو بیچ میں قول کا ذکر آتا کہ یقولان یا قائلین مگر درمیان میں بغیر ذکر قول کے مقولہ کا بیان کرنا پتہ دے رہا ہے کہ یہ

---

[1]۔ رفع القواعد صریح فی ماذھب الیہ الاکثرون من ان القواعد کانت موجودۃ وان ابراھیم عمرھا ورفعھا (نیشاپوری)

ان کے قلبی تاثرات تھے جنہیں عالم الضمائر خالق نے اپنے الفاظ کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔

تَقَبَّلْ مِنَّا "قبول فرما ہم سے" بصورت التجا اس تمنا میں خود بخود یہ احساس مضمر ہے کہ ہمارا عمل اپنی جگہ حقیر ہے اور وہ تیری بارگاہ کے لائق نہیں ہے مگر تو اپنے فضل و کرم سے اپنی بارگاہ میں قبولیت کا درجہ عطا فرمادے عمل کی درستی کے ساتھ یہی وہ باطنی احساس ہوتا ہے جو عمل کو معراج قبول تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۖ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٨﴾

"پروردگار! اور یہ عرض ہے کہ ہم دونوں کو اپنی بارگاہ میں مسلم قرار دے اور ہماری نسل میں سے بھی ایک امت قرار دے جو تیری بارگاہ میں مسلم ہو اور ہمیں ہماری طاعت وعبادت کے طریقے آنکھوں سے دکھا دے اور ہماری طرف اپنی خصوصی توجہ مبذول فرما یقیناً تو بڑا توجہ فرمانے والا مہربان ہے۔"

"مسلم" کے معنی ہیں "سر جھکانے والا" مگر یہ صفت بحیثیت صفت عباد مخلصین اور بالخصوص انبیا و مرسلین میں ہمیشہ ہی سے پائی جاتی تھی۔ ابراہیمؑ نے اس صفت رکھنے والے کو لفظ مسلم سے یاد کیا اور اس وقت سے یہ اصطلاح قائم ہوگئی۔ اس لئے ہم نے ترجمہ میں بجائے اس لفظ کے ترجمہ کے اصل لفظ مسلم ہی رکھ دیا ہے۔

"سر جھکانے والا قرار دے" کے معنی اس صفت کا پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم بھی تَقَبَّلْ مِنَّا کی طرح یہ ہے کہ ہمارا سر جھکانا درحقیقت تیری شان جلال و کمال کے لحاظ سے کوئی لیاقت نہیں رکھتا۔ تو اپنے کرم سے ہمارے سر جھکانے کو قابل لحاظ قرار دے کر ہمیں اپنے یہاں "مسلم" کے لقب کے حق داروں میں محسوب فرما۔

دوسری دعا یہ ہے کہ ہماری اولاد میں سے ایک قوم قرار دے جو "امت مسلمہ" کے لقب کی حق دار ہو "ہماری" کی اضافت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ دونوں کی طرف ہے لہٰذا "امت مسلمہ" کے ظہور کی پیش گوئی چاہے اولاد اسماعیلؑ کے ذریعہ سے پوری ہو لیکن اس امت میں شمولیت کا مطالبہ قدرت کی طرف سے تمام اولاد ابراہیمؑ کو شامل ہوگا چاہے وہ نسل اسماعیلؑ سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔

تیسری دعا "اَرِنَا مَنَاسِكَنَا"، یہ خالق کی طرف سے عبادت کے لئے ایک دستور العمل کے نفاذ کی درخواست ہے اور ارنا "ہمیں دکھا دے" اس دستور العمل کے اجزاء کے اپنی زندگی میں دیکھ لینے کی تمنا کا اظہار ہے جس کی تکمیل فریضہ حج کے لئے نداء کے حکم اور اس نداء کی عملی تاثیر کو وقوع میں لانے کی ضمانت کے ساتھ قرآن کی دوسری آیت سے ظاہر ہوتی ہے کہ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ (حج۔٢٧) مناسك کا لفظ اگرچہ لغۃً تمام طریق عبادت کو شامل ہے مگر اصطلاحی طور پر اس کا استعمال اعمال حج کے ساتھ زیادہ خصوصیت رکھتا ہے اور پھر بحد تمام و کمال اس کی انجام دہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ ہوئی جنہوں نے خود مسلمانوں کو اپنے

ساتھ حج کرا کے دکھلایا اور فرمایا "مجھ سے اپنے حج کے مناسک کو لے کر محفوظ کر لو۔[1]

آخری دعا التجائے عبودیت کا ایک عام مظاہرہ ہے کہ ہماری طرف اپنی خاص توجہ مبذول فرما۔

توبہ کے لفظ کا عام استعمال "گناہ" کے ساتھ ہوتا ہے مگر اس کے اصل معنی رجوع کے ہیں۔ گناہ سے توبہ اس معنی کا ایک مصداق ہے اور اس کا نتیجہ ہے خالق کی طرف سے گناہ کا بخش جانا۔ لیکن بے گناہ جب بارگاہ الٰہی میں توبہ کرتا ہے تو اس کے معنی اخلاص عبودیت کے مزید اظہار کے ہوتے ہیں اور اس کے مقابل میں خالق کی طرف سے جو نتیجہ ہوتا ہے وہ رحمتِ خصوصی اور توجہ امتیازی کی زیادتی۔ یہ اس کی نسبت سے توبہ کا مصداق ہوتا ہے اور وہی جناب ابراہیمؑ کی دعا کا مقصد ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

"پروردگار! اور یہ گزارش ہے کہ ان میں ایک پیغمبر ان ہی میں سے بھیجنا جو انہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کے اخلاق کو درست کرے یقیناً تو بڑا زبردست اقتدار کا مالک اور بڑا حکمت والا ہے۔"

دعائے ابراہیمؑ میں پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف:

یہ نسل اسمٰعیلؑ میں سے ایک نبی کے آنے کی دعا ہے۔ دعا کا وجود اور اس کی قبولیت دونوں توریت سے ثابت ہیں ایک جگہ ابراہیمؑ سے تخاطب کے طور پر آیا ہے: "میں نے اسماعیلؑ کے بارے میں تیری دعا سن لی" دوسری جگہ حضرت موسیٰؑ اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں "خداوند تیرا خدا تیرے لئے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میرے مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی طرف کان دھرو (استثناء ۱۸:۱۵)

ظاہر ہے کہ من حیث الجماعت بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسمٰعیلؑ ہی سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ایک نبی اولاد اسرائیل میں نہیں بلکہ اولاد اسمٰعیلؑ میں ہوگا جو مثل موسیٰؑ صاحب شریعت و کتاب ہوگا۔

قرآن مجید میں اسی لئے پیغمبر خداؐ کے بارے میں خالق کے یہ الفاظ آئے ہیں کہ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا (مزمل۔ ۱۵) ہم نے تمہاری طرف ایک پیغمبر بھیجا جو تم پر گواہ ہے اسی طرح جیسے فرعون کی طرف ایک پیغمبر بھیجا تھا"

توریت اور قرآن دونوں کی مطابقت سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ موسیٰؑ کے مانند مبعوث ہونے والے نبی حضرت ختمی مرتبتؐ ہی تھے۔

اس کے بعد رسول کے فرائض کا بیان ہے جس کی تشریح مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"رسول کا پہلا کام اپنی امت کے سامنے تلاوت آیات ہوتا ہے یعنی اللہ کا کلام پہنچانا گویا رسول کی پہلی حیثیت مبلغ اعظم کی ہوتی ہے۔

---

[1] ۔سمّی اعمال الحج مناسك قال علیه السلام خذوا عنّی مناسککم لعلّی لاالقاکم بعدعامی هذا (رازی)

یعلمھم الکتب رسول کا کام محض تبلیغ و پیام رسانی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کا کام کتاب الٰہی کی تبلیغ کے بعد اس کی تعلیم کا بھی ہے۔ اس تعلیم کے اندر شرح ترجمانی تعیم میں تخصیص، تخصیص میں تعیم سب کچھ آ گئی اور یہیں سے ان کج فہموں کی بھی تردید ہوگی جو رسول کا منصب (معاذ اللہ) صرف ڈاکیہ یا قاصد کا سمجھے ہوئے ہیں۔ گویا رسول کی دوسری حیثیت معلم اعظم کی ہوئی۔ **والحکمۃ** پھر رسول تعلیم محض کتاب ہی کی نہ دیں گے بلکہ حکمت ودانائی کی تلقین بھی امت کو کریں گے۔ احکام و مسائل دین کے قاعدے اور آداب، عوام وخواص سب کو سکھائیں گے اور خواص کو رہ نمائی اسرار ورموز میں بھی کریں گے۔ گویا رسول کی تیسری حیثیت مرشد اعظم کی ہوئی **یُزَکِّیْھِمْ** تزکیہ سے مراد دلوں کی صفائی ہے۔ رسول کا کام محض الفاظ اور احکام ظاہری کی تشریح تک محدود نہیں رہے گا بلکہ وہ اخلاق کی پاکیزگی اور نیتوں کے اخلاص کے بھی فرائض انجام دیں گے۔ رسول کی چوتھی حیثیت مصلح اعظم کی ہوئی''۔

اس سے ظاہر ہے کہ ہدایت و اصلاح خلائق کے لئے صرف کتاب الٰہی کافی نہیں ہے ورنہ رسولؐ کا فرض تلاوت آیات پر ختم ہو جاتا۔ اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہ ہوتی اور اسی بناء پر رسولؐ کی وفات کے بعد کتاب کے علاوہ ایک جانشین رسولؐ کی ضرورت ہے جو تعلیم وارشاد و اصلاح کے فرائض کو بہ نیابت رسول اسی عنوان پر انجام دے جس عنوان پر رسول انجام دیتے تھے اور یہ مقصد ماہرین سیاست اور ذمہ داران نظم و نسق ملکی سے پورا نہیں ہوسکتا اس لئے وہ رسولؐ کے جانشین کہے جانے کے مستحق قرار نہیں پاسکتے۔

دعائے ابراہیمی میں جن جن خصوصیات کو پیش نظر رکھا گیا تھا اور جن امتیازات کے حامل رسولؐ کی درخواست پیش کی گئی تھی اس کے حرف بہ حرف پورے ہونے کا بیان بعینہ انہی الفاظ میں قرآن کریم نے متعدد جگہ کیا ہے جیسے:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (بقرۃ۔۱۵۱)

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران ۱۶۴)

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (الجمعۃ۔۲)

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٣٠﴾

''اور کون ہوگا جو ابراہیمؑ کے مذہب سے روگردانی کرے سوا اس کے جس نے خود اپنے کو بے وقوف بنا رکھا ہو اور ہم نے انہیں دنیا میں بھی منتخب کیا اور یقیناً وہ آخرت میں بھی نیکوکاروں میں محسوب ہوں گے۔''

چوں کہ دین اسلام ہی کا دوسرا نام ''ملت ابراہیم'' تھا اس لئے یہود ونصاریٰ اور مشرکین سب کو اس کی جانب اس لفظ سے متوجہ کیا ہے کیوں کہ وہ سب ابراہیمؑ کو مورث اعلیٰ سمجھتے تھے اس کے علاوہ آیت قرآن نے یہ واضح کیا کہ ملت ابراہیمیؑ کے اصول وہ ہیں جو بالکل انسان کی عقل

عمومی اور فطرت کے مطابق ہیں اس لئے ان سے کوئی شخص اپنی آزادضمیر وعقل سے کام لیتے ہوئے رد گردانی کر ہی نہیں سکتا اور اگر کوئی اس سے منحرف ہوتا ہے تو وہ حقیقتاً دھوکے میں ہے، نہیں بلکہ اپنے کو عمداً دھوکے میں رکھتا ہے۔ اور اس لئے اس کی جہالت قصوری نہیں بلکہ تقصیری ہے جو بارگاہ الٰہی میں اسے مواخذہ سے بری نہیں کرسکتی۔ پھر آخر میں ملت ابراہیمؑ کی اس خصوصیت کی طرف بھی اشارہ کردیا کہ دوسرے مذاہب وہ ہوں گے جنہوں نے روحانیت کا معیار دنیاوی زندگی کے تج دینے میں مضمر رکھا ہے مگر اسلامی تعلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آخرت کے ساتھ دنیا کے بھی آباد اور پر رونق بنانے کا کفیل ہے اور اسی کا نمونہ کامل ابراہیمؑ کی ذات ہے جو دنیاوی نعمتوں سے بھی سرفراز ہے اور آخرت میں بھی بڑے درجہ پر فائز ہے۔

جیسا کہ عبدالماجد صاحب دریابادی لکھتے ہیں! ایک مسیحی مورخ ویورنڈ ولیم ڈین ایم اے نے ایک مستقل سیرت ابراہیمؑ انگریزی میں لکھی ہے جس سے آپ کی دنیوی عروج واقبال پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٣١﴾

”جب ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا: ”سر جھکا دو انہوں نے کہا جھکا دیا سر میں نے تمام جہانوں کے پروردگار کے سامنے۔“

یہ کہنا کوئی لفظی کہنا اور جواب لفظی جواب نہیں ہے بلکہ یہ کہنا وہ مطالبہ فطرت وضمیر ہے جو ہر انسان سے ہے مگر کوئی وہ ہوتا ہے جو اس مطالبہ پر لبیک سے انکار کرتا، کوئی توقف کرتا، کوئی قدرے تامّل کے بعد اسے قبول کرتا ہے، اور ابراہیمؑ کی تعریف یہ ہورہی ہے کہ انہوں نے اس مطالبہ کے پورا کرنے میں ایک لمحہ کا توقف بھی کبھی نہیں کیا۔ بس جس طرح حکم کن سے اشیاء کے وجود کا ذرہ بھر تخلف نہیں اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (سورۂ یٰسین۔ ۸۲) ویسے ہی سمجھنا چاہیے کہ اس مطالبہ اَسْلِمْ سے اسلام ابراہیمؑ کو ذرہ بھر تاخر نہ تھا۔ اور چوں کہ یہ مطالبہ ہر انسان سے ابتدائے تعقل وشعور سے ہے، اس لئے ماننا پڑے گا کہ ابراہیمؑ کے لئے دور تکلیف میں کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جس میں وہ ذرہ بھر بھی قانون الٰہی سے ہٹے ہوئے ہوں، بلکہ حکم کن کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حکم تکلیفی نہ تھا جو کسی خاص عمر کا پابند ہو بلکہ یہ حکم تکوینی تھا جو مبدأ سے تھا یہ اور بات ہے کہ دور تکلیف آنے کے بعد اُسی نے حکم تکلیفی کی حیثیت حاصل کرلی جس کی وجہ سے اب وہ موردِ مدح وثواب بھی ہوگیا۔ بہرصورت یہ وہ عصمت مطلقہ کی تصدیق ہے جو ابراہیمؑ کی جلالت شان کا بے نظیر ثبوت ہے۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٣٢﴾

”اور ابراہیمؑ نے اس کے متعلق وصیت کی اپنے بیٹوں کو اور یعقوبؑ نے بھی اے میرے فرزندو! یقیناً اللہ نے تمہارے لئے یہ مخصوص دین منتخب کرلیا ہے لہٰذا تم مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔“

اولاد ابراہیم علیہ السلام کا دین:

جب کہ ابراہیمؑ دین اسلامی کے پیرو تھے جیسا کہ اس کے پہلے گزر چکا تو ان کی اولا دخواہ وہ اسحٰق علیہ السلام کی نسل سے ہوا اور خواہ اسمٰعیلؑ کی اسی دین کی پیرو تھی بے شک نسل اسرائیل میں جب موسیٰؑ اولوالعزم اور صاحب شریعت رسول مبعوث ہو گئے تو ان کی طرف منسوب ہو کر دین موسوی اور دین یہود کا تصور الگ قائم ہو گیا اور جب عیسیٰؑ آئے تو ان کی طرف منسوب ہو کر مذہبِ عیسوی اور دین مسیحی کا تخیل جدا قائم ہو گیا مگر موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے پہلے اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور ان کی اولاد میں بھی جو دین حقیقی موجود تھا وہ دین اسلام ہی تھا۔ اسی لئے قرآن نے یہود نصاریٰ کے سامنے اس تذکرہ کو چھیڑا ہے کہ تم جو دین موسوی یا عیسوی کے پیرو ہونے کی بناء پر دین اسلام سے وحشت کرتے ہو تو یہ غور کرو کہ تمہارا دین موسوی اور عیسوی تو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ سے شروع ہوا ہے مگر وہ دین جو ان کے پہلے خود تمہارے آبا وَ اجداد اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کا تھا وہ بھی تو دین اسلام ہی تھا اور یہ آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰؐ اسی دین کے علمبردار ہیں تو تم کو ان سے انحراف و تنفر کا سبب کیا ہو سکتا ہے[1]۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰـهًا وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

”تم لوگ اُس وقت کہیں موجود تھے جب یعقوبؑ کی موت کا ہنگام آیا اور انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ کے خدا، معبود واحد کی اور ہم اس کی بارگاہ میں مسلم رہیں گے۔“

اسرائیل جناب یعقوبؑ کا لقب تھا اور ان ہی کی طرف نسبت سے یہود و نصاریٰ بنی اسرائیل کہلاتے ہیں اس لئے ان کا عقیدہ و عمل ان کے سامنے پیش کیا جانا نفسیاتی طور پر ان کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں براہ راست یعقوبؑ کی تعلیم کا بیان ہوا اور ضمناً ان کے پہلے ان کے اسلاف سب کا اعتقاد و عمل آ گیا۔

اباء کے اصلی معنی تو باپ دادا کے ہوتے ہیں مگر چوں کہ چچا بھی باپ کا ہم رتبہ ہوتا ہے اس لئے آیت میں اسمٰعیلؑ کو بھی آباء کے ذیل میں ذکر کر دیا گیا ہے کیوں کہ وہ یعقوبؑ کے والد بزرگوار اسحٰقؑ کے بھائی تھے۔

اس مسلم الثبوت نظیر کے بعد اگر کہا جائے کہ آزر جناب ابراہیمؑ کے باپ نہیں بلکہ چچا کا نام تھا تو اسے نص قرآنی کے مخالف نہیں سمجھا جا سکتا۔

---

[1]۔ وصّٰی بھٰذہ الکلمۃ اعنی بالکلمۃ قولہ اسلمت لرب العلمین وھی الاسلام الذی امر بہ نبیّہ وھو اخلاص العبادۃ التوحید للہ وخضوع القلب والجوارح لہ (طبری)

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٤﴾

"یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی۔ اس کے لئے وہ ہے جو اس نے کیا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم کروگے اور جو کچھ کرتے تھے اس کی جواب دہی تم سے نہیں ہوگی۔"

یہود اپنے آباؤ اجداد سے رشتے جوڑ جوڑ کر ہی اپنے کو مطمئن بنا لیتے تھے اور اسی وصف اضافی کو اپنے لئے سرمایہ نجات سمجھتے تھے قرآن نے ان کے بزرگوں کی خدا پرستی کو احوالہ دیتے ہوئے انہیں متنبہ کیا کہ اگر تم نظریہ مسلک اور عمل میں ان سے متحد نہ ہوئے اور تمہارا راستہ ان کے راستے سے مختلف رہا تو تمہارا انتساب ان کی طرف کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ ان کے لئے ان کے اعمال تھے اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔

اسی سے ان مسلمانوں کو بھی سبق لینے کی ضرورت ہے جو صرف بزرگان دین کی طرف انتساب کو ذریعہ نجات خیال کر لیتے ہیں اور ان کے اتباع اور عملی پیروی کی اہمیت کا احساس نہیں کرتے کیوں کہ اصول بہرحال اصول ہے۔ وہ "من وتو" کی تفریق کی گنجائش نہیں رکھتا۔ وہ اگر یہود کے لئے تھا تو مسلمانوں کے لئے بھی اسے ماننا لازم ہے۔

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہے کہ انسان اپنے اچھے اور برے دونوں افعال کا ذمہ دار ہے اور دونوں کا فاعل وہی ہوتا ہے، خدا نہیں۔ کسی کام کے عمل میں لانے ہی کو لفظ کسب سے ادا کیا گیا ہے۔ اس کا کسب کی اس اصطلاح سے کوئی تعلق نہیں جس کے بعض فرق اسلامیہ کے متکلمین نے عقیدہ جبر پر پردہ ڈالنے کے لئے وضع کیا ہے اور خالق کو افعال عباد کا فاعل ماننے کے بعد جس سے کوئی معنی ہی نہیں رہ جاتے وہ ان کی بنائی ہوئی اصطلاح ہے جسے قرآنی استعمال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٥﴾

"اور وہ کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ یا عیسائی تو راہ راست پر آ جاؤ گے۔ کہہ دو کہ نہیں بلکہ ہم سچا راستہ دین حق کے پرستار ابراہیمؑ کے مذہب کو سمجھتے ہیں اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔"

"وہ" کی ضمیر تمام اہل کتاب کی طرف پھرتی ہے اور وہ دو قسم پر تھے ایک یہود اور دوسرے نصاریٰ یہودی کہتے تھے کہ جو مذہب یہود اختیار کر لے وہ راہ راست پر آ جائے گا اور عیسائی کہتے تھے کہ جو عیسائی مذہب اختیار کر لے وہ ہدایت یافتہ ہے قرآن نے دونوں کے مقولہ کو ملا کر بطور اختصار نقل کیا ہے کہ یہ کہتے ہیں یہود یا نصرانی ہو جاؤ حقیقت میں ہر ایک طبقہ ان میں سے ایک ہی کو کہتا تھا یقینی طور پر دونوں کا نام لے کر دعوت کوئی نہیں دیتا تھا[1]۔

---

[1] ۔یعنی تعالیٰ ذکرہ وقالت الیھود لمحمد ﷺ واصحابه من المؤمنين كونوا هودا تھتدوا وقالت النصاریٰ لھم کونوا نصاریٰ تھتدوا (طبری)

قرآن نے ان کے جواب میں اسی لئے یہ کہا ہے کہ تم میں تو پھر بھی اختلاف ہے۔ایک نقطہ پر تم سب مجتمع نہیں ہو۔آؤ ہمارے ساتھ مل کر سب اس ملت پر اتفاق کرلو جس کی صحت میں تم سے کسی کو شک نہیں اور وہ ابراہیمؑ کا راستہ ہے جو توحید خالص کے علمبردار تھے۔ رہ گئے تم تو تم نے تو اس میں شرک کی آمیزش کر دی ہے۔اس وجہ سے اب تمہارا دین صحیح نہیں رہا ہے۔اس شرک کو چھوڑ کر اصلی توحید جس کے ابراہیمؑ علمبردار تھے وہ دین السلام ہے جس کے آج ہم حامل ہیں۔

آخری فقرہ سے ظاہر ہے کہ چاہیے مشرکین کا لفظ بطور اصطلاح اکثر جگہ قرآن نے اہل کتاب کے بالمقابل استعمال کیا ہو لیکن معنوی طور پر اہل کتاب بھی زمانہ نزول قرآن کے پہلے سے مشرکین کے زمرہ سے الگ نہیں رہے ہیں۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٦﴾

’’کہہ دو کہ ہم تو ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف بھیجا گیا ہے اور اس پر جو ابراہیمؑ، اسماعیل، اسحٰقؑ یعقوبؑ اور اسباط پر اتارا گیا وار جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا اور جو دوسرے انبیاء کو ان کے پرورد گار کی طرف سے دیا گیا ہم ان میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور ہم اس کی بارگاہ میں مسلم ہیں۔‘‘

اہل کتاب میں یہود موسیٰؑ کو مانتے تھے اور عیسیٰؑ کے منکر تھے نصاریٰ عیسیٰؑ کو مانتے تھے اور ہمارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ منکر تھے۔ پھر یہ دونوں ہی فریق متحدہ طور پر نسلی تعصب کی وجہ سے اسحٰقؑ کی تو عظمت کو بہت سراہتے رہتے تھے مگر اسماعیلؑ کو ان کے مقابلہ میں نظر انداز کرتے تھے۔اس طرح یہ سب انبیاء الٰہی میں تفریق کے جرم کے مرتکب تھے۔اسلام اگر اپنے پیروؤں کے جذبات کی پیداوار ہوتا تو وہ نفسیاتی طور پر رد عمل کے جذبہ کا شکار ہو کر اس کے برعکس تفریق کا قائل ہو جاتا مثلاً وہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی عظمت کا منکر ہوتا یا اسمٰعیلؑ کو آگے بڑھا کر اسحٰقؑ سے مغایرت برتتا مگر اسلام تو کسی مخلوق کے ذہن کی پیداوار نہیں۔

وہ خالق کا حقیقی پیام تھا۔اس لئے اس کی خصوصیت یہ ہوئی کہ وہ رہنمایانِ دین میں سب کی عظمت کا محافظ ہے۔وہ ان سب پر ایمان کی دعوت دیتا ہے۔وہ اسماعیلؑ و اسحٰقؑ دونوں ہی کو سچا نبی مانتا ہے اور یعقوبؑ اور اسباط یعنی اولاد یعقوبؑ میں جو انبیاء ہوئے [1]، ان سب پر ایمان کی دعوت دیتا ہے وہ نبی اسماعیلؑ کے ایک رسول کی زبان پر آنے کے ساتھ نبی اسرائیل پر نازل شدہ ہدایت ربانی سے منحرف نہیں ہے بلکہ ان سب پر ایمان رکھتا ہے اس طرح اس کے بالمقابل جو جماعتیں ہیں وہ جزئی حیثیت سے ایمان رکھتی ہیں یعنی بعض پر ایمان کے ساتھ بعض کے کفر کی مرتکب ہیں مگر مسلمان وہ ہیں جو ایمان کلی کے حامل ہیں اور وہ خدا کے کسی پیام اور کسی ہدایت کے منکر نہیں ہیں، چاہے وہ کسی خاندان میں نازل ہوئی ہو بلکہ دنیا کے کسی خطہ میں بھی جو الٰہی پیغام آیا ہو ایک مسلمان اجمالی طور سے اس پر ایمان رکھتا ہے۔یہ اور بات ہے کہ دلائل کی نارسائی سے وہ تفصیلی

---

[1]۔ هم الانبیآء من ولد یعقوب (طبری)

طور پر بالتعیین اس کی تصدیق سے قاصر ہوجائے۔بس یہی اسلامی جماعت کی وہ خصوصیت ہے جسے مذکورہ بالا آیات میں فی الجملہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جس میں بنیادی طور پر ایک حقیقت اور بھی محفوظ رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ اس نبی آخرالزماںؐ کی پیش گوئی خود سابقہ کتابوں میں موجود تھی لہٰذا ان کتابوں پر ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ اس پر بھی ایمان لایا جاتا لیکن اگر سابق کتاب میں یہ اعلان ہوگیا ہوتا کہ آئندہ کوئی نبی نہیں ہوگا تو پھر آئندہ مدعی نبوت پر ایمان پہلی کتاب پر ایمان کے منافی ہوتا۔لہٰذا دونوں پر بوقت واحد ایمان کا امکان ہی نہ ہوتا بلکہ تفریق ہوتا یعنی ایمان بالاول اور کفر بالآخر واجب ولازم ہوتا۔

فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوۡا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا هُمۡ فِىۡ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكۡفِيۡكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ؁۱۳۷

"اب اگر یہ لوگ اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو وہ بھی راہ راست پر ہوجائیں گے اور اگر انہوں نے روگردانی اختیار کی تو پھوٹ ڈالنے والے وہی ہیں۔اس صورت میں اللہ ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور وہ سننے والا اور بڑا جاننے والا ہے۔"

جب یہ بیان ہو چکا کہ تم تو ان سب پر ایمان رکھتے ہو جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔کسی کا انکار نہیں کرتے تو ثابت ہو گیا کہ بنائے مخاصمت تمہاری طرف سے کوئی نہیں ہے۔ نیز یہ کہ جو معیار ہدایت ہے یعنی ایمان اس کے ہر جزء میں تم ان کے ساتھ شریک ہو لہٰذا تمہارے ہدایت یافتہ ہونے میں تو کوئی کلام نہیں مگر وہ ہیں کہ جو اس رسولؐ کی رسالت کو نہیں مانتے تو بنائے مخاصمت جو ہے وہ ان کی طرف سے ہے اور وہ اس پیام ہدایت کا انکار کر کے کفر میں بھی مبتلا ہیں لہٰذا انہیں آپ کی رسالتؐ کو قبول کر کے ہدایت کا راستہ حاصل کرنا چاہیے اور وہ گمراہ بھی ہیں اور تفرقہ اندازی کے بانی بھی۔

آخر میں رسولؐ اور ان کے ساتھ والے مسلمانوں کے لئے تسلی اور بشارت ہے کہ یہ تمہاری جتنی ہی مخالفت کریں تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے کیونکہ تمہارا پشت پناہ اللہ ہے اور وہ تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے اور اس سے ان کی باتیں اور ان کے کام کوئی پوشیدہ رہنے والے نہیں وہ سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے لہٰذا اس کے مقابلہ میں ان کی کامیابی بہر حال غیر ممکن ہے۔

صِبۡغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً ۚ وَّنَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ ؁۱۳۸

"ہم اللہ کے رنگ پر ہیں اور اللہ سے اچھا کس کا رنگ ہوگا اور ہم اسی کے عبادت گزار ہیں۔"

چوں کہ یہود و نصاریٰ کے یہاں دین کے اختیار کرنے کے ثبوت میں ایک خاص قسم کے رنگ میں پانی کے ساتھ غسل کا رواج تھا جسے اصطباغ یا تعمید اور بپتسمہ کہا جاتا ہے اس لئے ان کے بالمقابل مسلمانوں کی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ تمہیں کسی مصنوعی رنگ کی جو تمہارا ساختہ ہے ضرورت ہوگی مگر ہم جو ہیں تو اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں یعنی اس کے دینِ فطرت کے پیرو ہیں۔ہمیں کسی ایسے مصنوعی رنگ کی ضرورت

نہیں ہے [1] ۔

دین فطرت کو رنگ اس اعتبار سے بھی کہا گیا ہے کہ اس کے آثار و مظاہر ایک مسلمان کی زندگی سے ہویدا ہوتے ہیں اگر وہ سچا مسلمان ہے [2] ۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿١٣٩﴾

''کہو کہ کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں بھی تکرار کرو گے؟ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے تمہارا بھی پروردگار ہے ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں بے شک ہم اس کی خاص عبادت کرنے والے ہیں۔''

اہل کتاب نے اللہ کو مخصوص اپنا بنا لیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم اس کے بیٹے اور لاڈلے ہیں اور وہ ہمارا باپ ہے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں کو یہ تلقین نہیں کی گئی ہے کہ وہ ان کے مقابلہ میں یہ کہیں کہ نہیں۔ اللہ ہمارا ہے اور کسی کا نہیں ہے۔ اس صورت میں اسلام کے پیام کی ہمہ گیری ختم ہو جاتی نیز احساس فرائض اور اصلاح نفس کے شعور کو نقصان پہنچتا مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ وہ غیر مسلموں کے جواب میں جو صحیح بات ہے وہ کہیں کہ وہ نہ تمہارا مخصوص ہے نہ ہمارا بلکہ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں۔

یہی خالق ہمہ گیری وہ ہے جسے ہر مسلمان کے دماغ میں راسخ کرنے کے لئے سورہ حمد جو ہر نماز میں کم از کم دو مرتبہ ہر مسلمان کو پڑھنا لازم ہے اور چوں کہ کم از کم پانچ نمازیں دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں اوقات مقررہ پر ادا کرنا لازم ہیں اس لئے کم از کم دس مرتبہ اس سورہ کا ہر مسلمان کی زبان پر جاری ہونا ضروری ہے اس میں خالق کو رب العالمین کہہ کر یاد کیا گیا ہے کہ وہ تمام جہانوں کا پرورگار ہے اور دوسری جگہ اس کی وسعت ربوبیت کو ان الفاظ میں کہا گیا ہے کہ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (صٰفٰت ۵) ''وہ آسمان و زمین کا اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا پروردگار ہے اور تمام مشرقوں کا پررورگار ہے'' اس طرح ان کو ان کی برادری کی وسعت کا بھی احساس پیدا کر دیا گیا ہے کہ جہاں جہاں مخلوق الٰہی ہو چاہیے وہ اس کرہ ارض کے علاوہ دوسرے کرات میں بھی ہو وہ اسی ایک برادری میں داخل ہے جس میں یہ ایک مسلمان مندرج ہے۔ یہ مشترکہ امن و تنظیم اور حقوق عمومی کے احساس کا بھی سنگ بنیاد ہے جس کی تمام عالم انسانی کو ضرورت ہے۔

یہ سبق ہمیشہ یاد رکھنے کا تھا اور آج جب کہ دنیا امن و سکون اور عالمی احساس تنظیم کے لئے تڑپ رہی ہے تو اسے یہی سبق یاد کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا جز ''ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال'' یہ ہر مسلمان بلکہ ہر فرد انسان کو اپنی جگہ یاد رکھنے کا ہے کیوں کہ ہر شخص کو دوسرے پر نکتہ چینی میں جو مزہ ملتا ہے وہ اپنے اوپر نظر ڈالنے سے مانع ہوتا ہے اور اسلام غیر کے اعمال پر نظر سے زیادہ محاسبہ نفس کو

---

[1] ۔ فسّرھا الصادق علیہ السلام بالاسلام کما فی الکافی ورواہ العیاشی (صافی)

[2] ۔ سمّیت صبغۃ باعتبار الاثر الکریم الظاھر من التوحید و مکارم الاخلاق و زینۃ الشریعۃ (بلاغی)

اہمیت دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ تم غیر کے پہلے خود اپنے کو دیکھو کہ تم کیا ہو اور تم میں کیا برائیاں موجود ہیں یہ بات ہو جائے تو ہر انسان کے لئے خود اپنی عملی اصلاح کا دروازہ کھل جائے اور باہمی تصادمات کا ممکن درجہ تک سد باب ہو جائے مگر افسوس یہ ہے کہ غیر تو کیا خود مسلمانوں نے بھی اس تعلیم کو بہت کم سمجھا ہے یا سمجھا بھی تھا تو بہت کم یاد رکھا ہے۔

اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطَ كَانُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى ؕ قُلۡ ءَاَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ كَتَمَ شَهَادَةً عِنۡدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۰﴾

"کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور اسباط یہودی یا عیسائی تھے؟ ان سے کہنا چاہیے کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ! اور اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا کہ جو کسی گواہی کو جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے ہے پوشیدہ کرے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔"

ابراہیمؑ، اسحاقؑ، اور یعقوبؑ کا دین کیا تھا؟ یہود نصاریٰ کے لئے لمحۂ فکریہ:

حقیقت امر سابق میں بیان کر دینے کے بعد کہ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ اور یعقوبؑ یہ سب افراد جو یہود و نصاریٰ سب کے مشترکہ حیثیت سے قابل احترام اور لائق تقلید اسلاف ہیں صرف ایک دین کے پیرو تھے۔ اور وہ دین اسلام ہے جسے حضرت محمد مصطفیٰؐ دنیا میں پیش فرما رہے ہیں۔ دینِ یہود اور دینِ نصاریٰ دونوں اس کے بالمقابل حادث حیثیت رکھتے تھے اور دین اسلام کے اصول ان دونوں مذہبوں کے اصلی اصول پر جامع وحاوی ہیں۔ لہٰذا یہود اور نصاریٰ کے کسی گروہ کو بھی اسلام سے منحرف یا اس پر معترض ہونا کسی صورت سے بھی جائز نہیں ہے۔ اس حقیقت کے پیش ہونے کے بعد اب ان جماعتوں سے براہ راست تخاطب کر کے انہیں ان کے رویہ پر نظر ثانی کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ اپنی جگہ خود غور کریں کہ ان کی یہودیت یا نصرانیت کیا ان کے اسلاف کا دین قرار پا سکتی ہے بلکہ اس کی ابتدا ہی ان کے بعد ہوئی ہے۔

اس ذیل میں خود ان کی سابقہ کتب کے آسمانی تصریحات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ تم آج اپنی زبان سے جو چاہو کہو مگر تمہیں خود معلوم ہوگا کہ تمہاری کتابوں سے جنہیں تم اللہ کی طرف نسبت دیتے ہو صاف ظاہر ہے کہ وہ بزرگ سب توحید حقیقی کے پرستار تھے ایسی صورت میں تم خود اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تمہاری یہ بات صحیح سمجھی جائے یا اللہ کی بات جو آسمانی صحیفوں میں مذکور ہے۔ یہ قرآن کریم کا وہ انداز احتجاج وہ استدلال ہے جو ہر منکر کو خود اس کے ضمیر سے شرمندہ بنا دینے کا سبب ہے یہ اور بات ہے کہ وہ عناد سے کام لے اور اس کے تسلیم کرنے سے انحراف کرے۔

آخری فقرہ اہل کتاب کی جماعت میں جو علماء تھے ان کے اس کرتوت کے راز کو فاش کرنے اور ان کے ضمیر پر تازیانہ لگانے کے

لئے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی کتابوں کے ان فقروں کو جن میں اس حقیقت کا اظہار ہے[1] اور پیغمبر آخرالزماںؐ کے آنے کی بشارت ہے[2] اپنے عوام سے مخفی رکھنا چاہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ انہیں اس کا پتہ نہ لگنے پائے۔

اس ذیل میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ ایک ظلم ہے اور بہت بڑا ظلم، اپنے اوپر بھی ظلم حقیقت وہ انصاف پر بھی ظلم، خود اپنے اسلاف پر بھی ظلم اور اپنی جماعت کے عوام پر بھی ظلم کہ ان کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر انہیں صراط مستقیم کے فیوض سے محروم رکھا جاتا ہے۔

سب کے بعد اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کا حوالہ دے کر انداز ہ کیا گیا ہے کہ آج جو چاہو کرلو۔ اللہ تمھارے اعمال سے واقف ہے اور اس کے یہاں کی جوابدہی کے لئے تمہیں منتظر اور تیار رہنا چاہیے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

"اور یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، اس کے لئے وہ ہے جو اس نے کیا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم کروگے اور وہ جو کچھ کرتے تھے اس کی جوابدہی تم سے نہیں ہوگی۔"

یہ آیت بعینہ ان ہی الفاظ میں تھوڑی دور پہلے گزر چکی ہے ایک دفعہ پھر اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تمہارا نسبی انتساب ان کی طرف تمہاری نجات کے لئے کافی نہیں ہے جب تک کہ تم عقائد و اعمال میں ان کے سات متحد نہ ہو۔

بعض نے کہا ہے کہ وہ خطاب بنی اسرائیل سے تھا اور یہ خطاب مسلمانوں سے ہے کہ تمہیں بھی صرف ان اسلاف کے مجاہدات او رتوحید کی راہ میں ان کے مساعی کو پیش کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ خود بھی ان کی پیروی کرنا لازم ہے[3]۔

(تمام شدہ پارہ اول تفسیر قرآن علی نقی النقوی ۱۳ صفر ۱۳۷۵ھ)

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

---

[1]۔ يقول وایّ امرئ اظلم منهم وقد کتموا شهادة عندهم من الله بأن ابراهيم علیه السلام واسمعيل علیه السلام واسحٰق علیه السلام ويعقوب علیه السلام والاسباط علیهم السلام کانوا مسلمین فکتموا ذٰلك ونحلوهم اليهودية والنصرانيّة (طبری)

[2]۔ فی اطلاق الشهادة مع ان للمراد بها ما ذکر من الشهادة المعيّنة تعريض بکتمانهم شهادة الله عزوجل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فی التورٰة والانجيل (ابوالسعید)

[3]۔ تکریم للمبالغة فالزّجر عمّا هم علیه من الافتخار بالآبآء والاتکال علی اعمالهم وقیل الخطاب السابق لهم وهٰذا لنا تحذیرا عن الاقتداء بهم (ابوالسعید)

''بہت جلد بے وقوف لوگ یہ کہیں گے کہ کس چیز نے ان لوگوں کو پھیر دیا ان کے اس قبلہ سے جس پر وہ تھے۔ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی کا ہے مشرق بھی اور مغرب بھی جسے وہ چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔''

تبدیلی قبلہ:

استقبال کے معنی عربی میں ہیں کسی شے کی طرف رخ کرنا اور قبلہ وہ شے جس کی طرف رخ کیا جائے اصطلاح شرع میں قبلہ اس کو کہتے ہیں جس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے۔

اس آیت سے آغاز ہوتا ہے تحویل قبلہ کے ذکر کا۔ اجمالی طور پر قرآن مجید سے اتنا تو پتہ چلتا ہی ہے کہ قبلہ پہلے کچھ اور تھا اور اس کے بعد کچھ اور ہو گیا حدیث تاریخ اور تفسیر سب سے اس کی تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتدائے اسلام میں قبلہ بیت المقدس تھا اور اس کے بعد کعبہ ہو گیا۔

اہل سنت کے صحاح ستہ اور شیعوں کے کتب اربعہ میں کثیر التعداد طرق سے اس کا ذکر موجود ہے اور یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ مسجد قباء میں لوگ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے، جب ایک شخص نے آ کر اطلاع دی کہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم آ گیا ہے۔ یہ سن کر حالت نماز ہی میں شام سے مکہ کی طرف منہ پھیر لیا گیا۔

علی بن ابراہیمؒ کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد بنی سالم میں نماز پڑھا رہے تھے دو رکعتیں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے ہوئی تھیں کہ تبدیل قبلہ کا حکم نازل ہوا اور حضرت نے باقی دو رکعتیں کعبہ کی طرف متوجہ ہو کر پڑھیں۔

مدینہ میں آنے کے بعد کتنے عرصے تک حضرتؐ نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی اس میں بے شک اختلاف ہے۔ شیخ الطائفہ کی کتاب تہذیب میں امام جعفر صادقؑ کی زبانی ہے کہ جنگ بدر سے واپسی تک حضرتؐ نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ہے۔ ایسا ہی رسالہ فضل بن شاذان میں ہے اور ابن عباس کی روایت بھی اس کے موافق ہے۔ نیز اس میں یہ ہے کہ آپ نے مدینہ میں آنے کے بعد سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی۔ براہ بن عازب نے سولہ یا سترہ مہینے کہے ہیں۔ قرب الاسناد میں امام محمد باقرؑ کی زبانی ۱۹ مہینے لکھے ہیں یہی صدوق کی من لا یحضرہ الفقیہ میں بھی ہے اور علی بن ابراہیم نے جو امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث نقل کی ہے، اس میں سات ۷ مہینے کا ذکر ہے شیخ مفیدؒ نے مسار الشیعہ میں معیّنطور پر بتایا ہے کہ تحویل قبلہ ۱۵ رجب سنہ ۲ ہجری میں ہوئی ہے۔ سیوطی نے درمنثور میں اس کی موافقت کی ہے۔

بہرحال اس مدت کے اختلاف سے تبدیلی قبلہ کے اصل واقعہ کی قطعیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مکہ بزمانۂ قیام سمت قبلہ:

رہ گیا یہ سوال کہ جب حضرت مکہ میں تھے تو کس طرف نماز پڑھتے تھے، اس کے متعلق احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت آپ کعبہ کے سامنے اس طرح نماز پڑھتے تھے کہ بیت المقدس کی طرف بھی رخ رہتا تھا۔ یہ صورت مدینہ میں آ کر پیش آئی کہ بیت المقدس اور کعبہ کی سمتیں

الگ الگ ہوگئیں [1]۔

قرآن مجید کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ کا عمل باوجود یہ کہ بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا تھا۔مگر آپ کا دل یہ چاہتا تھا کہ کعبہ قبلہ ہوتا پھر بھی آپ نے دل کی خواہش کے مطابق اس وقت تک عمل نہیں کیا جب تک وحی الٰہی صراحۃً اس کے مطابق نازل نہ ہوگی یوں بہ حیثیت بشر کسی خواہش کا ہونا شان رسالت کے خلاف نہیں ہے۔بے شک عصمت کا تقاضا یہ ہے کہ عمل حکم الٰہی کے بغیر خواہش کی بناء پر نہ ہو۔وہ اس واقعہ میں محفوظ ہے۔

مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ نے یہ بات ٹھیک کہی ہے کہ:

''معلوم ہوتا ہے کہ وحی الٰہی کا سرچشمہ نبی صلعم کا اپنا قلب نہ تھا ورنہ سولہ سترہ ماہ تک آپ کا دل تو یہ چاہے کہ خانہ کعبہ قبلہ ہو مگر وحی نازل نہ ہو یہ بے معنی بات ہے۔''

مگر اس کے ساتھ ان کو یہ بھی کہہ دینا چاہیے تھا کہ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ رسولؐ کے عمل کی بھی بنیاد آپ کی قلبی خواہش پر نہیں ہوتی تھی ورنہ آپ سولہ سترہ ماہ اپنی خواہش کے خلاف عمل جاری نہ رکھتے اور وحی کا انتظار نہ فرماتے۔

بے شک قبلہ کی اس طرح تبدیلی دوسروں کے لئے چہ مگوئیوں کا مرکز ضرور بن گئی ،اس لئے کہ احکام الٰہیہ میں تغیر وتبدل بہت سے لوگوں کے ذہن میں آج تک نہیں آیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ تبدیلی پشیمانی کا نتیجہ ہوتی ہے اور اللہ عالم الغیب ہے اس کے یہاں پشیمانی کا کوئی سوال نہیں۔ پھر اس کے احکام میں تبدیلی کیوں ہو۔اسی لئے یہود ونصاریٰ نسخ کے آج تک منکر ہیں [2] اور مسلمانوں کا ایک طبقہ بداء کا اسی لئے منکر ہے مگر احکام الٰہی خواہ تشریح سے متعلق ہوں جن کے بدلنے کا نام نسخ ہوتا ہے اور خواہ تقدیر سے جن کے بدلنے کا نام بداء ہوتا ہے پشیمانی کی بناء پر تبدیل نہیں ہوتے بلکہ حکمت ومصلحت کے بدلنے سے بدلتے ہیں [3] اور یہ تبدیلی علم وحکمت کے خلاف نہیں بلکہ عین اس کا مقتضا ہے۔

یہی چیز ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی جنہیں قرآن نے سفہاء کے نام سے یاد کیا ہے وہ کہتے تھے کہ مَا وَلّٰهُمۡ عَنۡ قِبۡلَتِهِمُ الَّتِىۡ كَانُوۡا عَلَيۡهَا ؕ آخر کس لئے یہ اس قبلہ سے جس پر تھے دوسری طرف پھر گئے؟

بعض لوگ كَانُوا عليها کی ضمیر کو سابق انبیاء کی طرف راجع کرتے ہیں ،یعنی جس قبلہ پر اور انبیاء تھے اس سے ہٹ کر یہ دوسری طرف کیوں رخ کرتے ہیں۔اس صورت میں یہ الفاظ حضرت پیغمبر خداؐ اور مسلمانوں کے عمل میں کسی تبدیلی کا ثبوت نہ ہوں گے مگر خود قرآن مجید کی

---

[1]۔ لما کان رسول الله ﷺ بمکة امر الله عزّ و جل ان یتوجه نحو بیت المقدس فی صلٰوته و یجعل الکعبة بینه و بینها اذا امکن و اذا لم یمکن استقبل بیت المقدس (صافی) فی الکافی فی الحسن کالصحیح عن الحلبی عن ابی عبدالله سالته هل کان رسول الله ﷺ یصلّی الی بیت المقدس قال نعم فقلت اکان یجعل الکعبة خلف ظهره قال امّا اذا کان بمکة فلا و امّا اذا هاجر الی المدینة فنعم حتّٰی تحوّل الی الکعبة.(البلاغی)

[2]۔ گوکہ اُن کی توراۃ اور انجیل میں نسخ موجود ہے جیسا کہ صولت علویہ وعماد الدین وغیرہ میں مفصل لکھا گیا ہے (تاج العلماء)

[3]۔ مثلاً جاڑے میں لحاف اوڑھنے کا حکم دیا گیا، پھر گرمی میں خود وہ حکم منسوخ کر دیا گیا اس لحاظ سے کہ مصلحت بدل گئی اور سردی نہ رہی (تاج العلماء)

اس کے بعد کی آیت میں صاف رسولؐ کو مخاطب بنا کر کہا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ.

"اور ہم نے وہ قبلہ جس پر آپ تھے صرف اس لئے رکھا تھا کہ پتہ چلے کہ کون پیغمبر کی پیروی کرتا ہے اور کون پچھلے پیروں پلٹتا ہے۔"

اس سے یہ حقیقت بالکل نمایاں ہے کہ خود پیغمبر خداؐ اس کے پہلے اور قبلہ کی طرف رخ کرتے تھے اور اب آپ کا عمل اس سے مختلف ہے۔ اس صورت میں وما لھم عن قبلتھم کی ضمیروں میں دورنگی پیدا کرنا کہ ولھم کی ضمیر مسلمانوں کی طرف راجع ہو اور اس کے بعد قبلتھم کی ضمیر سابق کے انبیاء کی طرف راجع کی جائے بالکل بے نتیجہ اور بے سبب ہے۔

سمت میں ذاتی تقدس نہیں:

ان کے مستعجبانہ سوال کا کہ آخر اس قبلہ کو چھوڑ کر دوسری طرف رخ کرنے کا انہیں کیا داعی ہوا؟ جواب یہ دیا جا رہا ہے کہ "مشرق اور مغرب دونوں اللہ کے ہیں" اس میں مشرق اور مغرب کا ذکر تو اس لحاظ سے ہے کہ یہ دونوں سمتیں بہت نمایاں طور پر باہم دگر مقابل ہیں[1]۔

اصل مطلب یہ ہے کہ اگر سمت میں کوئی ذاتی تقدس ہوتا تو بے شک جس طرف اتنی مدت تک رخ کر کے عبادت کرتے رہے اس سے روگردانی ناروا ہوتی مگر درحقیقت سمت میں کوئی ذاتی عظمت نہیں ہے[2]۔ اصل تو اللہ کا حکم ہے اور ایک سمت کا معیّن کر دینا نماز کے لئے صرف افراد میں ہم آہنگی اور یک جہتی کے مظاہرہ کی ایک صورت ہے، اس لئے جب تک اس نے چاہا ایک طرف رخ کرنے کو کہا اور جب چاہا دوسری طرف اور یہ قبلہ کے ایک دم بدل دینے کا ایک بڑا فائدہ اسی سمت پرستی کے تصور کو ختم کرنا ہے اور اسی بناء پر آخر میں کہا جا رہا ہے کہ "اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست کی ہدایت کرتا ہے۔" اس کا یہ مطلب نہیں اس قبلہ کی طرف رخ کرنا راہ راست نہ تھا۔ اگر وہ راہ راست نہ ہوتا تو اتنی مدت تک اس کے پہلے رسولؐ اور وہ بھی خداوند عالم کی ہدایت سے اس قبلہ کی طرف رخ کئے کیوں رہتے بلکہ مقصود یہ ہے کہ قبلہ کی طرف رخ کرنے میں سمت پرستی کی ذہنیت اگر شریک ہوگئی تو آدمی صراط مستقیم سے منحرف ہوگیا۔ خالق سمت قبلہ کی اس تبدیلی سے مسلمانوں کو سمت پرستی کے تصور سے الگ اور خداپرستی کے صحیح راستے پر قائم رہنے کا سامان کر رہا ہے[3]۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى

---

[1]۔ المشرق والمغرب ای الجھات کلھا (جلالین) ای جمیع الجھات فان تحویل القبلۃ کان من ناحیۃ الشمال الغربی الیٰ تقطۃ الجنوب تقریبا (البلاغی)

[2]۔ لا یختص بہ مکان دون مکان لخاصیۃ ذاتیۃ یمتنع اقامۃ غیرہ مقامہ وانّما العبرۃ بارتسام امرہ لا بخصوص المکان (بیضاوی)

[3]۔ صراط مستقیم وھو مایقتضیہ الحکمۃ والمصلحۃ من التوجہ الیٰ بیت المقدس تارۃ والی الکعبۃ اخریٰ (صافی)

الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچوں بیچ والا گروہ بنایا ہے تا کہ تم گواہ ہولوگوں پر اور پیغمبر گواہ ہوں تم پر اور نہیں قرار دیا تھا ہم نے اس قبلہ کوجس پر آپ تھے مگر اس لئے کہ ہم جان لیں کون پیغمبر کی پیروی کرنے والا ہے اور کون الٹے پاؤں واپس جاتا ہے۔ اگر چہ وہ سوا ان لوگوں کے جنہیں اللہ کی خاص ہدایت شامل حال ہے (اور سب پر) بہت گراں تھا اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ تمہارے ایمان کو اکارت کردے۔ بے شک اللہ لوگوں پر مہربان ہے بڑا رحمت والا۔''

اس آیت کے متعدد ٹکڑے ہیں اور ہر ٹکڑا ایک خاص مضمون کا حامل ہے۔

پہلا ٹکڑا امتِ وسط

اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچوں بیچ والا گروہ بنایا ہے۔''بیچوں بیچ کا مطلب ہے معتدل ومتوازن گروہ جس کے اعمال میں نہ افراط ہے نہ تفریط''[1] ''اوراسی طرح'' یعنی جس طرح ہم نے تمہیں سمت پرستی کے توہمات سے الگ کر کے دوسروں کی مماثلت سے آزاد مستقل قبلہ کی طرف رخ کرنے پر مامور کیا[2] اسی طرح ہم نے تمہیں سیرت میں ایک مثالی حیثیت عطا کی ہے۔'' تا کہ تم گواہ ہولوگوں پر'' گواہ یعنی وہ نمونہ کامل جو معیاری ہونے کی بنا پر دوسروں کے نقص وکمال کے درجہ کا اظہار کردے۔

چوں کہ پہلا قبلہ وہ تھا جس کی طرف یہود رخ کرتے تھے اور اب قبلہ کی تبدیلی سے انہیں نا گواری یہ تھی کہ ہماری پیروی چھوڑ کر انہوں نے اپنا قبلہ الگ کیوں بنالیا تو اس کا جواب میں یہ کہا جارہا ہے کہ یہ امت دنیا میں دوسروں کی پیروی کے لئے نہیں آئی ہے۔ اگر پیروی ہی کرانا ہوتی تو نئے رسول مستقل شریعت اور منفرد کتاب کی ضرورت ہی کیا تھی اور پھر رسول بھی وہ جو خاتم الانبیاءؑ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اسی سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس تعلیم کے سانچے میں ڈھلنے والا گروہ دوسروں کی پیروی کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ وہ تو اس لئے ہے کہ تمام خلائق کیلئے انسان رفعت کا مثالیہ قائم کر کے ان سے اپنی پیروی کرائے۔ اس کی پیروی کا مرکز اگر کوئی ہے تو بس یہ رسولؐ ہے جو اس کے لئے نمونہ بنا کر پیش کیا گیا ہے اور اعلان کردیا گیا ہے کہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران۔۳۱) اور اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ لفظی طور پر امت محمد مصطفیؐ میں اپنے کو محسوب کر لینا خلق خدا کے لئے مثال بننے کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ خلائق کے لئے مثال وہی افراد بن سکتے ہیں جو حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1]۔ الوسط خیارع لشئی لانّہ محمی عن الفساد وفی تفسیر القمی وسطا ای عدلا وھو المروّی فی روایات الجمھور کما فی الدّر المنثور (البلاغی) وسطا خیارا عدولا (جلالین)

[2]۔ کذٰلك اشارة الیٰ مفهوم الا یة المتقدمة ای كما جعلنا كم مهدیین الیٰ صراط المستقیم او جعلنا قبلتكم افضل القبل (بیضاوی)

کے اتباع کامل کا نمونہ ہوں اوران میں بھی فرد اکمل وہ ہستیاں ہوں گی جن میں صفات محمدیؐ کا انعکاس اس درجۂ اتم پر ہو کہ وہ ''انفسنا'' کا مصداق بن جائیں اور اسی بناء پر تفاسیر اہل بیتؑ میں وارد ہوا ہے کہ امة وسطا کی مکمل تعبیر ائمة وسطا ہے یعنی وہ معصوم ہستیاں جو بعد رسولؐ امامت خلائق کا منجانب اللہ استحقاق رکھتی تھیں[1]۔ اس سے جس طرح ائمہ کی بلندی عامہ افراد امت کے مقابلہ میں ظاہر ہوتی ہے اسی طرح تمام ائمہ میں پیغمبر خدا کی رفعت بھی نمایاں ہے جو ان افراد کے لئے سُرمہ چشم ہے جو رسولؐ اور ائمہ اہل بیت میں مساوات مطلق کے حامی ہیں۔

شہداء علی الخلق اوران کے مراتب:

اس کے ساتھ جب ایک دوسری آیت پر نظر ڈالی جاتی ہے کہ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا (نساء۔ ۴۱) وہ وقت بھی کیا ہوگا کہ جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کو سامنے لائینگے اور آپ (اے رسولؐ) ان گواہوں کے لئے گواہ ہوں گے' اس کی تشریح پر غور کیا جاتا ہے کہ ہر امت کا گواہ اس کا نبی اور رسول ہوگا اور ان گواہوں کے گواہ ہمارے رسولؐ ہوں گے تو ان دونوں آیتوں سے مل کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک سلسلہ شہداء کا موجودہ امت محمدیہ کے پہلے ہے اور وہ انبیا ومرسلین کا ہے اور ایک سلسلہ شہداء کا اس امت میں ہے اور وہ ائمہ معصومینؑ کا ہے اور ذات ختمی مرتبتؐ اس پہلے سلسلہ پر بھی رقیب وشہید کی حیثیت رکھتی ہے اور دوسرے سلسلہ پر بھی اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی ذات اقدس اولین پر حجت خدا ہے اور آخرین پر بھی اور یہ دوسرا سلسلہ موازی اس پہلے سلسلہ کا ہے لہٰذا اس سلسلہ کے افراد پر پہلے سلسلہ کی کڑیوں کو کوئی مزیت ورفعت ازروئے قرآن ثابت نہیں ہوتی اور جب کہ معیار کمال اس سلسلہ کے افراد کا وہی ہے جو انبیائے سلف کے لئے قرآن نے بیان کیا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے نمونہ ہیں اور پہلے انبیاء میں باعتبار مراتب ایک دوسرے پر فضیلت ناقابل انکار ہے تو اگر شخصی مراتب کے لحاظ سے اس دوسرے سلسلہ کے افراد پہلے سلسلہ کے اشخاص سے بلندی بھی رکھتے ہوں تو اس میں بربنائے قرآن گنجائش انکار واستبعاد نہیں ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو خود معیار شہادت ہی سے اس سلسہ کی رفعت بہ نسبت پہلے سلسلہ کے ثابت ہے کیوں کہ پہلے سلسلہ کا ہر فرد کسی ایک دور کی امت پر گواہ تھی جو من کل امة بشهيد کے الفاظ سے ظاہر ہے اور یہ سلسلہ جو ''امت وسط'' اور ''ائمہ وسط'' کا ہے تمام خلق پر بلا استثناء شہید ہے جو الناس کے اسم جمع ولام استغراق سے ظاہر ہے اس لئے کوئی تعجب نہ کرنا چاہیے کہ شہداء اولین میں کوئی فرد اگر اس ''امتہ وسط'' میں کی کسی شخصیت کے سامنے آجائے تو اس کو بحکم الٰہی ماموم بننا پڑے اور اس امتہ وسط کی نمائندہ ذات امام قرار پائے جس کی طرف صحیح بخاری اور مسلم کی حدیث میں اشارہ پایا جاتا ہے، کیف بکم اذانزل عیسیٰ بن مریم و اما مکم منکم ،۔ یہ امامت اسی خصوصی رفعت کا ایک مظاہرہ ہے جسے شهدآء علی الناس کی لفظوں میں آیت نے ثابت کیا ہے۔

دوسرا ٹکڑا پہلا قبلہ بھی خالق کا مقرر کردہ تھا

اتنے عرصے جو بیت المقدس کی طرف نماز ہوتی رہی وہ کیوں؟ ارشاد ہوتا ہے ''ہم نے اس قبلہ کو جس پر آپ تھے صرف اس لئے بنایا تھا

---

[1] ۔ امة القلمي يعني الائمة. اقول والخطاب للمعصو مين خاصة (صافی) ''وسط بمعنی عادل اس لیے کہ عدالت وسط کا درجہ ہے جیسا علم اخلاق میں ثابت ہوا ہے اور باتفاق عقلاٗ عدالت جامع جمیع سفات کمالیہ اور حاوی کل مکارم اخلاق ہے تو اس ایک صفت کا ثابت کرنا مستلزم ان سب کے ثبوت ہے اور جب کہ عالم الغیب سے صادر ہے تو ظاہر باطن دونوں کو شامل ہے پس یہ ممدوح معصوم ہوئے جو کبھی بدی کرتے ہی نہیں (تاج العلماء)

کہ پتا چلے کون رسول کی پیروی کرتے ہیں اور کون نہیں۔" قرآن صاف اس پہلے قبلہ کے لئے "ہم نے قرار دیا تھا" کہہ رہا ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ وہ پہلا قبلہ بھی خالق کا مقرر کردہ تھا اور وہ رسول کا عمل بطورِ خود نہیں بلکہ بوحی الٰہی تھا[1]۔

اس صورت میں یہ کہنا:۔

"اللہ نے بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم نہ دیا تھا، نہ ایسی کوئی وحی قرآن ہی میں موجود ہے' نہ کسی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی طرف آپ نے وحی الٰہی کے حکم سے منہ کیا ہو(بیان القرآن محمد علی صاحب لاہوری)

مضحکہ خیز ہے۔دیکھئے مشرکین کا اعتراض یہی تھا کہ اللہ کے احکام میں تبدیلی کے کیا معنی! اگر واقعہ یہ ہوتا کہ اس کے پہلے پیغمبر خداؐ بطورِ خود (معاذ اللہ) یہودی دیکھا دیکھی بیت المقدس کی طرف رخ کرنے لگے تھے' اور اب خالق نے آپ کو اس سے ہٹا کر کعبہ کی طرف رخ کرنے کی ہدایت کی تو مشرکین کے اعتراض کا صاف جواب یہ تھا کہ اب تک جو ہو رہا ہے وہ بغیر کسی ہدایت ربانی کے تھا اور اب خالق کی ہدایت مجھے یہ ہوئی ہے اس سے تمام اعتراض ختم ہو جاتا۔مگر خدا تعالیٰ تو یہ جواب دینا اپنے حبیب کی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔وہ رسولؐ کے اس عمل کی پوری ذمہ داری خود لیتا ہے اور اسی لئے اس کی توجیہ کرتا اور اس کے حکیمانہ مصالح کا پتہ دیتا ہے اور رسولؐ کے یہ "لائق امتی" ایسے ہیں کہ وہ اسے رسولؐ کا ذاتی عمل کہہ کر اللہ سے اس کی ذمہ داری ہٹانا چاہتے ہیں۔

رہ گیا یہ کہ قرآن میں وہ وحی درج نہیں ہے' تو یہ واقعہ ہے اور خود یہ آیت اور اس کے علاوہ متعدد دوسری آیتیں اس کا ثبوت ہیں کہ اکثر وحی ایسی ہے جو قرآن میں موجود نہیں ہے۔اس کا مظہر صرف پیغمبر خداؐ کا عمل ہوا ہے اور اسی لئے قانونِ الٰہی کے سرچشمہ کے طور پر کتاب کے ساتھ سنت کو ماننا لازم ہے اور حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ غلط ہے۔

اچھا تو پھر اللہ نے وہ قبلہ کیوں قرار دیا تھا؟ صرف اس لئے کہ معلوم ہو جائے کون رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اور کون روگردان ہوتا ہے۔

ہوا کے رخ پر اڑنے والے لیڈر تو ماحول کے رخ پر چلا کرتے ہیں مگر مصلح کو ماحول سازی کا فریضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔مکہ معظّمہ میں مشرکین عرب کعبہ کو تقدس کا مرکز مانتے تھے، وہاں قبلہ بیت المقدس رہا[2] اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ "اگر چہ وہ ان لوگوں کے سوا جنہیں اللہ کی مخصوص ہدایت شامل حال تھی (اور سب پر) بہت گراں تھا"[3] اور اب مدینہ کا با اقتدار گروہ یہود بیت المقدس کے تقدس کا قائل ہے تو یہاں کعبہ قبلہ بنایا جارہا ہے،صرف اس لئے کہ دیکھنا ہے کون ماحول کے بندے ہیں اور کون اللہ کے بندے۔اگر پیغمبرؐ کی تعلیم بھی وہی ہو جو زمانہ والوں کی

---

[1]۔وھو الظاھر ایضا من معتبرة التھذیب عن ابی بصیر عن احدھما علیھما السّلام قال قلت لہ امرہ ان یّصلی الیٰ بیت المقدس قال نعم الاتریٰ ان اللہ تعالیٰ یقول وما جعلنا القبلۃ وتلا جمیع الآیۃ (البلاغی)

[2]۔ عن النعمانی باسنادہ عن امیر المؤمنین علیہ السلام ان رسول اللہ ﷺ کان یصلی فی اول مبعثہ الیٰ بیت المقدس جمیع ایام قیامہ بمکۃ (الروایۃ) وفی الفقیہ وصلی رسول اللہ الیٰ بیت المقدس بعد النبوّۃ ثلث عشرۃ سنۃ وتسعۃ عشر شھرا بالمدینۃ وفی الدّر المنثور اخرج الطبرانی عن عثمان بن حنیف وفی الحدیث کان رسول اللہ ﷺ قبل ان یقدم من مکۃ والقبلۃ الیٰ بیت المقدس (البلاغی)

[3]۔ ظاھر السوق یقتضی ان الضمیر فی کانت یرجع الی القبلۃ الّتی کان علیھا وھی بیت المقدس (البلاغی)

خواہشوں کا مقتضا ہے تو اتباعِ رسولؐ کرنے والوں کا جوہر ہی کہاں نمایاں ہو!

اس میں خاص لفظ قابلِ تشریح یہ ہے کہ امتحان کا نتیجہ سامنے آنے کو یوں کہا گیا ہے کہ ''ہمیں معلوم ہو'، اور ایسی ہی تعبیر قرآنِ مجید میں دوسرے متعدد مقامات پر بھی آئی ہے جیسے:

وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ (آل عمران۔۱۶۶۔۱۶۷)

اور تا کہ اسے علم ہو ایمان والوں کا اور اسے علم ہو ان کا جنہوں نے نفاق اختیار کیا۔

لِيَعْلَمَ اللهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ (مائدہ۔۹۴)

تا کہ اللہ کو علم ہو اس شخص کا جو غائبانہ اس کا خوف محسوس کرتا ہے

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ (توبہ۔۱۶)

کیا تم سمجھتے ہو کہ چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی تک اللہ کو علم نہیں ہوا تم میں سے ان کا جنہوں نے جہاد کیا۔

قَدْ يَعْلَمُ اللهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا (نور۔۶۳)

اللہ جانتا ہے انہیں جو تم میں سے پناہ لینے کے لئے کھسکتے رہتے ہیں۔

لِيَعْلَمَ اللهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (حدید۔۲۵)

تا کہ اللہ کو معلوم ہو کہ کون اس کی مدد کرتا ہے۔

لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى (کہف۔۱۲)

تا کہ ہم جانیں کہ دونوں گروہوں میں سے کون زیادہ حاوی ہے۔

لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ (سباء۔۲۱)

تا کہ ہمیں معلوم ہو کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون اس بارے میں شک رکھتا ہے۔

لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ (محمد۔۳۱)

اور ضرور ضرور ہم تمہاری آزمائش کریں گے یہاں تک کہ جان لیں تم میں جہاد کرنے والوں اور صبر کا جوہر رکھنے والوں کو۔

حالانکہ اللہ کو علم پہلے سے ہوتا ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کا علم اگرچہ باعتبار وقت واقعہ کے وقوع پر مرتب نہیں ہوتا مگر ذاتاً ہوتا ہے بر بنائے واقعہ ہی کیوں کہ علم کے معنی ہی ہیں کسی واقعہ کو جاننا۔

اب اگر متبع اور غیر متبع کی تفریق کا کوئی سامان نہ ہوا تو یہ افتراق و امتیاز وقوع ہی میں نہ آئے گا لہٰذا اللہ کو اس کا علم بھی کیوں ہوگا۔ پھر یہ کہ یہ تعلق علم کا قبل میں بحیثیت وقوع آئندہ ہے کہ ایسا ہوگا اور اس کا تعلق باعتبار وقوع حالی و استقبالی اس کے وجود حالی و استقبالی سے وابستہ ہوگا ورنہ خلاف واقعہ قرار پائے گا لہٰذا علم نہیں بلکہ معاذ اللہ جہل ہوگا[۱]۔

اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ علم الٰہی حوادث کا سبب نہیں ہوتا بلکہ حقیقتاً ایک طرح سے ان کا نتیجہ ہوتا ہے، اور اسی لئے افعال انسانی کے

---

[۱]۔ فی الاحتجاج عنه یعنی الا لنعلم ذٰلك منه وجودا بعدان علمنا انه سیوجد (صافی)

متعلق اس کا علم جبر کا موجب نہیں ہوتا۔

تیسرا ٹکڑا:

''ایسا نہیں ہونے کا کہ اللہ تمہارے ایمان کو اکارت کردے۔'' ان الفاظ سے خود ظاہر ہے کہ یہ کسی غلط فہمی کا دفعیہ اور کسی تردد تشویش کا ازالہ ہے۔ اس لئے اس کے پس منظر میں یہ روایت درست معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو پریشانی پیدا ہوئی کہ اس کے پہلے جو نمازیں پڑھی ہیں کہیں وہ سب بے کار تو نہیں ہوگئیں۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس وقت تو نمازوں کا اس طرف منہ کرکے پڑھنا ہی تمہارا تقاضائے ایمان تھا لہٰذا وہ نمازیں بے کار کیوں کر ہو سکتی ہیں! اس طرح ایمان کے اکارت کردیئے جانے کا مطلب ہے نمازوں کا اکارت کردیا جانا[1]۔

اب اس سے یہ حقیقت پھر ایک دفعہ ذہن میں آجانی چاہیے کہ کسی خاص قبلہ کی طرف رخ کیا جانا اس سمت کے ذاتی تقدس کا کوئی خاصہ نہیں ہے بلکہ اصل تو حکم الٰہی کی تعمیل ہے۔ اس لئے جب تک حکم ادھر کے لئے تھا وہ نماز بالکل صحیح و درست تھی اور جب حکم ادھر کے لئے آگیا تو یہ نمازیں جو اس سمت رخ کرکے ہوں ویسی ہی صحیح و درست ہوں گی۔ ''اللہ لوگوں پر بڑا مہربان بڑی رحمت والا ہے''۔ یہ اسی کا تتمہ ہے یعنی وہ قبلہ بدل کر تمہاری گزشتہ نمازوں کو بے کار کردے، یہ اس کی رافت و رحمت کے خلاف ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

''بہت[2] دیکھ رہے ہیں ہم آپ کے چہرے کی گردش کو آسمان کی طرف تو اب ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف موڑ دیں گے جس سے آپ خوش ہو جائیں گے۔ بس اب مسجد حرام کی طرف اپنا رخ موڑا کیجئے اور تم لوگ جہاں کہیں ہوا پنے منہ اسی طرف کیا کرو، اور وہ جنہیں کتاب دی گئی ہے یقیناً بخوبی جانتے ہیں کہ یہ ان کے پروردگار کی طرف کا حقیقی فیصلہ ہے اور اللہ اس سے جو وہ کرتے ہیں بے خبر نہیں ہے۔''

سلسلہ آیات کو دیکھنے سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے تک تحویل قبلہ وقوع میں نہ آئی تھی[3]، بلکہ یہی آیت ہے

---

[1]۔ ایمانکم یعنی صلوٰتکم (صافی) فی الکافی عن ابن ابی عمر الزبیری عن ابی عبداللہ علیہ السلام فی الاٰیۃ ان اللہ سمّی الصّلوٰۃ ایمانا (البلاغی)

[2]۔ قدھنا للمکثّر (البلاغی) بعض لوگوں نے قَدْ کو تحقیق کے لیے قرار دے کر مضارع کو ماضی کے معنی میں لیا ہے اور یہ ترجمہ کیا ہے ''تحقیق کہ دیکھتے تھے ہم'' یہ بظاہر درست نہیں ہے۔

[3]۔ جعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یدیم التنظر الی السمآء رجآء ان یاتیہ جبرئیل بالذی سأل بریۃ فانزل ھٰذا الاٰیۃ (مجمع البیان)

جو پہلے پہل اس حکم کو لے کر آئی ہے [1] اور قبل کی دونوں آیتیں تحویل قبلہ ہو چکنے پر اس کے بعد اتری ہیں [2] یہ اور بات ہے کہ موجودہ ترتیب قرآن یہ بعد میں اور وہ پہلے ہیں مگر ترتیب قرآن تنزیل کے مطابق نہ ہونا تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار کیا ہی نہیں جا سکتا' جس کی تفصیل 'مقدمہ تفسیر' میں ہو چکی ہے۔ اس صورت میں خواہ مخواہ ترتیب کے تقاضے کو سنبھالنے کے لئے اس بے جوڑ بات کے کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ:

''یہاں مراد اس حکم کا انتظار نہیں کہ کعبہ کو قبلہ بنا دیا جائے کیوں کہ وہ حکم نازل ہو چکا اور اس پر اعتراضات کا جواب بھی ہو چکا بلکہ یہ انتظار اس لئے ہے کہ خانہ کعبہ جو مشرکین کے قبضہ میں ہے اور جسے اب قبلہ بنایا جاتا ہے کہ کب بت پرستی سے پاک ہوگا اور مسلمانوں کا اس پر کب قبضہ ہوگا ''فلنولّینّك ولیته کذا'' کے معنی ہوتے ہیں میں نے اسے فلاں چیز کا والی یا متصرف بنا دیا' یہی معنی یہاں مراد ہیں' نہ پھیرنے کے نہیں اس لئے کہ یہ آئندہ کے متعلق ہے اور منہ پھیرنے کا حکم پہلے ہو چکا (بیان القرآن) مگر یہ ''آئندہ'' اور ''پہلے'' سب ترتیب موجود پر مبنی ہے اور جب کہ اس کے مطابق تنزیل ہونا ثابت نہیں تو اس استدلال کی وقعت ہی کیا! لغت میں تولیہ کے معنی حاکم اور منتظم بنانے کے ڈھونڈ کر نکالنے سے فائدہ کیا جب کہ یہاں بیان بہر حال قبلہ کا ہے اور ادھر رخ کرنے کا چنانچہ اس کے بعد بھی بلا فاصلہ اس پر متفرع کر کے جو بات کہی گئی ہے وہ بھی قبلہ ہی کی ہے کہ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ‌ؕ وَحَيۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ یعنی ''اب سے آپ اپنا منہ اس قبلہ کی طرف کیا کیجئے''۔ یہ رسولؐ کو مخاطب بنا کر حکم دیا اور پھر روئے خطاب تمام مسلمانوں کی طرف کر کے ان سے بھی کہا کہ 'اب تم سب اپنے رخ اس طرف کیا کرنا [3]۔

اس انداز سے خود ظاہر ہے کہ اصل تحویل قبلہ کے حکم کو لے کر آنے والی یہی آیت ہے نہ یہ کہ حکم پہلے ہو چکا تھا اور اس کے بعد اس سے متعلق کچھ باتوں کے صاف کرنے کے لئے یہ آیت اتری ہے۔ بے شک اس کے قبل کی آیتوں کے مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ وہ قبل کے واقعہ سے متعلق ہیں اور تحویل قبلہ اس کے پہلے ہو چکی ہے جس کے لئے کہا جا رہا ہے کہ:

''اب احمق لوگ یہ اعتراض کریں گے' اور اس کا یہ جواب ہے۔

پھر ایک خاص بات یہ ہے کہ اگر اس آیت میں فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضٰٮهَا اور اس کے بعد کے اجزاء کو مان لیا جائے کہ وہ تحویل قبلہ ہو چکنے کے بعد اس ماضی کی بات سے متعلق اس خیال کو دور کر رہے ہیں کہ

خانہ کعبہ میں بت ہیں تو فرمایا کہ اس وجہ سے مضائقہ نہ کرو کیوں کہ ہم تم کو متولی بنا دیں گے اور یہ مرکز توحید موحدین کے ہاتھ میں ہی رہے گا۔ اس لئے بغیر کسی خیال کے دل میں لانے کا اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کرو۔'' (بیان القرآن)

اور اس کے قبل کی آیتیں یقیناً تحویل کے بعد اعتراضات کا جواب ہیں' تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس وحی کا جو خود تحویل قبلہ کے حکم کو لائی ہے قرآن مجید کے اندر وجود نہیں ہے۔ ایسی صورت میں جیسا بیت المقدس کے لئے کہا گیا ہے کہ:

---

[1]۔ هٰذا الاٰية ناسخة لفرض التوجه الیٰ بیت المقدس (مجمع)

[2]۔ القمی ان هٰذه الاٰية مقدمة علیٰ اٰية سیقول السفهآء (صافی)

[3]۔ خصّ الرّسول بالخطاب تعظیماً له و ایجا با بالرّغبة ثم عمه تصریحا بعموم الحکم لجمیع الامة وسائر الامکنة. وتاکید الامر القبلة و تحضیضاً لامّة علی المتابعة (صافی)

"نہ ایسی کوئی وحی قرآن میں موجود ہے نہ کسی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی طرف آپ نے وحی الٰہی کے حکم سے منہ کیا ہو۔"(بیان القرآن)

وہی بات کعبہ کے لئے بھی ہو جائے گی حالانکہ کعبہ کے لئے ان کو خود تسلیم ہے کہ "ہجرت کے سولہ یا سترہ ماہ بعد خانہ کعبہ صریح وحی الٰہی کے ماتحت قبلہ قرار پایا۔" یہ صریح وحی ظاہر ہے کہ سَيَقُوۡلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ الخ والی آیت نہیں ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا الخ والی آیت نہیں ہے۔ تو وہی یہی آیت ہے جس کا انداز بتا رہا ہے کہ وہ پہلے پہل اس حکم کو لے کر اتری ہے اور اس کے پہلے تک یہ حکم نہیں آیا تھا۔

المسجد الحرام سے عموماً وہ وسیع احاطہ مراد ہوتا ہے جس میں خانہ کعبہ ہے۔ یہ احاطہ کوئی دو سو پچاس قدم لمبا اور دو سو قدم چوڑا ہے اور خانہ کعبہ اس کے وسط میں واقع ہے جو اٹھارا قدم لمبا اور چودہ قدم چوڑا ہے۔ اس کے شمال مشرقی کونے پر حجر اسود ہے۔ ہاں کسی مسجد حرام کا اطلاق کُل حرم پر بھی کر دیا گیا ہے [1]۔ جس کے اندر تمام مکہ معظّمہ اور منیٰ اور عرفات وغیرہ واقع ہیں اور جس کے اندر جنگ کرنا ہتھیار اٹھانا، شکار کھیلنا بلکہ گھاس وغیرہ تک کا کاٹنا ممنوع ہے۔

مسجد حرام:

یہاں مسجد الحرام کو جو قبلہ قرار دیا گیا ہے تو یا تو اس سے مراد کعبہ ہی ہے [2] جیسا کہ اکثر فقہا کا قول ہے کہ اصل قبلہ تمام مسلمانوں کا کعبہ ہی ہے اور یا یہ کہ مسجد حرام کو بہ معنی حرم لے کر ان لوگوں کے لحاظ سے قبلہ قرار دیا گیا ہے جو مکہ معظّمہ سے باہر ہیں جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ کعبہ قبلہ ہے ان کے لئے جو مسجد کے اندر ہوں اور مسجد قبلہ ہے ان کے لئے جو حرم میں مسجد سے باہر ہوں اور حرم قبلہ ہے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے [3]۔

آخر میں کہا گیا ہے کہ اہل کتاب چاہے کتنے ہی اعتراضات کریں وہ بہرحال آپ کی سچائی اور اس پیغام کی سچائی سے جو آپ پر نازل ہوا ہے پوری طرح واقف ہیں ان پیشین گوئیوں کی بناء پر جو ان کے یہاں موجود ہیں یہ فقط ہٹ دھرمی ہے جو انکار کرتے ہیں اور اسی لئے اس پر تہدیدی انداز میں کہا گیا ہے کہ خداوند عالم ان کے ہر عمل سے خوب واقف ہے یعنی اس کے یہاں انہیں اس کی پاداش ملے گی۔

وَلَئِنۡ اَتَيۡتَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوۡا قِبۡلَتَكَ ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ بِتَابِعٍ قِبۡلَتَهُمۡ ۚ وَمَا بَعۡضُهُمۡ بِتَابِعٍ قِبۡلَةَ بَعۡضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ

---

[1] - جیسے لمن لم یکن اھلہ حاضری المسجد الحرام (بقرہ۔۱۹۶) اور لاتقتلوھم عند المسجد الحرام (بقرہ۔۱۹۱)

[2] - لا مانع من ان تسمی الکعبۃ مسجدا باعتبار انھا یسجد الیھا (البلاغی)

[3] - ھٰذا موافق لما قالہ اصحابنا ان الحرم قبلۃ من نأی عن الحرم من اھل الا فاق (مجمع البیان)

وانما ذکر المسجد دون الکعبۃ لانّہ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کان فی المدینۃ والبعید یکفیہ مراعاۃ الجھۃ (بیضاوی)

مِّنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ۘ﴿۱۴۵﴾

''اور اگر آپ ان اہل کتاب کے سامنے سارے معجزے پیش کردیں پھر بھی وہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہ کریں گے اور نہ آپ ہی ان کے قبلہ کے پیرو ہوں گے اور خود وہ بھی دوسرے کے قبلہ کے پیرو نہیں ہیں اور جو علم آپ کے پاس آچکا ہے اس کے بعد اگر آپ ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگیں تو بلا شبہ آپ حد سے تجاوز کرنے والوں میں ہوں گے۔''

بظاہر یہ کچھ اتحاد پسند مسلمانوں کے خیالات کی رد ہے۔ کسی بھی اصولی اختلاف کے موقع پر بعض لوگ اتفاق واتحاد اور تنظیم قومی کا درس دینے لگتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو یک جہتی بہتر ہے۔ مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ تھے جو بسا اوقات سوچتے تھے کہ یہود ونصاریٰ سے جہاں تک ممکن ہو ہم آہنگی اور اتفاق واتحاد پیدا کیا جائے اس لئے کہ وہ اپنا اصلی حریف مشرکین یعنی بت پرستوں کو جانتے تھے یہود ونصاریٰ بہ نسبت ان کے اپنے سے قریب تر محسوس ہوتے تھے لہٰذا انہیں سیاسی حیثیت سے مناسب معلوم ہوتا تھا کہ ہم انہیں اپنے ساتھ ملا کر مشرکین کے مقابلہ میں ہم دست ہو جائیں۔

قرآن میں اس قسم کے تخیلات کی رد بعض دوسری آیتوں میں بھی نظر آتی ہے جیسے: **ولن ترضى عنك اليهود ولا النصرى حتى تتبع ملتهم** یہود ونصاریٰ تو آپ سے اس وقت تک خوش نہ ہوں گے جب تک آپ ان کے مذہب کو قبول نہ کرلیں۔'' ایسے موقعوں پر بظاہر مخاطب رسولؐ کو بنایا ہے کہ اور رد کی گئی ہے دوسرے لوگوں کے خیالات کی چنانچہ یہاں بھی یہی انداز اختیار کیا گیا ہے[1] اور بتایا گیا ہے کہ اتفاق واتحاد کا تصور ان سے خیال خام ہے۔ مخالفت اگر غلط فہمی سے ہوتو اس کے دور ہونے کی توقع ہے لیکن اگر حق کو حق جانتے ہوئے عناد سے ہو یا باطل کو باطل سمجھ کر فرض شناسی کی بنا پر ہو تو پھر مفاہمت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اہل کتاب کی مخالفت آپ سے پہلی قسم کی ہے اس لئے ان سے امید نہ کرنا چاہیے کہ وہ اس سے باز آئیں گے[2] اور آپ کا اختلاف ان سے دوسری قسم کا ہے اس لئے یہ بھی ناممکن ہے کہ آپ اپنے طریقہ کو چھوڑ کر ان کے پیرو ہو جائیں۔ اور پھر ان میں آپس میں کب اتحاد ہے! یہود کا قبلہ اور ہے اور نصاریٰ کا قبلہ اور ہے[3] اور ان کے یہ دونوں قبلے کسی حکم الٰہی کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اپنے ذاتی جذبات سے ہیں اور آپ کا قبلہ قطعی طور سے حکم الٰہی پر مبنی ہے۔ پھر آپ کے لئے کہاں جائز ہو سکتا ہے کہ آپ حق کو چھوڑ کر اور فرمان الٰہی کی مخالفت کر کے صرف اتفاق واتحاد کی خاطر ان کے نفسانی جذبات کی پیروی کرنے لگیں! یہ تو بہت بڑا ظلم یعنی حدود سے تجاوز ہوگا جس کا تصور بھی آپ کی نسبت نہیں کیا جانا چاہیے۔

اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ؕ وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنۡهُمۡ

---

[1]۔ المراد به غيره ﷺ وذلك من قبيل ايّاك اعنى واسمعى ياجارة (صافی)

[2]۔ لان المعاند لا ينفعه الدلالة (صافی)

[3]۔ فان النصادی تتوجه الى المشرق واليهود الىٰ بيت المقدس (البلاغی) اليهود تستقبل المخرة والنصارىٰ مطلع الشمس (البیضاوی)

لَيَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۴۶﴾

”وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے، اس (رسولؐ) کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بلا شبہ ان میں سے ایک جماعت دانستہ حق کو چھپاتی ہے۔“

اہل کتاب کا جان بوجھ کر انکار:

اہل کتاب اپنی کتابوں میں صاف صاف پیغمبر اسلام ﷺ کے اوصاف یہاں تک کہ حلیہ کو بھی پڑھ چکے تھے [۱]۔ اس وجہ سے بحیرا راہب نے بچپن میں آپ کو دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ یہ صرف اغراض نفسانیہ جن کی وجہ سے اب وہ انکار کرتے تھے۔ ”جس طرح اپنے بیٹوں کو پہنچانتے ہیں“، اس کا یہ مطلب ہے کہ جس طرح اپنی اولاد کو پہنچاننے میں آدمی کو کوئی تکلف نہیں ہوتا اور نہ ہی ذرا سا بھی اشتباہ اسی طرح وہ بلا تکلف اور بغیر کسی اشتباہ کے آپ کو پہنچانتے ہیں۔

ایک دوسرے معنی اس کے یہ کہے گئے ہیں کہ اَبۡنَآءَهُمۡ سے مراد انبیائے بنی اسرائیل ہیں ”یعنی جن نشانات سے ان کی سچائی کو سمجھتے تھے اور وہ سب نشانات یہاں بھی موجود ہیں۔“ (بیان القرآن) مگر یہ معنی الفاظ کے مفہوم سے ایک حد تک بعید ہیں۔

پہنچاننے میں کل جماعت شریک ہے لیکن اس کے بعد کچھ تو وہ ہیں جنہوں نے ایمان قبول کیا اور بہت سے ایسے نکلے جو جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔ انہی کو کہا گیا ہے: وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنۡهُمۡ لَيَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ [۲] یہ علم جرم میں شدت کا باعث بنتا ہے لاعلمی سے انکار کرنے والا چاہے ”مقصر“ ہونے کی وجہ سے معذور نہ ہو پھر بھی اتنا قابل سرزنش نہیں ہوتا جتنا جان بوجھ کر انکار کرنے والا۔

اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ﴿۱۴۷﴾

”حق وہ ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہو لہٰذا ہرگز جھگڑنے والوں سے نہ ہو۔“ یہ تنبیہ ان لوگوں کے لئے بھی ہوسکتی ہے جو تحویل قبلہ کے بارے میں جھگڑا کر رہے تھے اس صورت میں یہ آیت پہلے کی آیت سے مرتبط ہوگی اور ان لوگوں کے لئے جو رسولؐ کی رسالت سے انحراف کر رہے ہیں۔ اس طرح اس کا تعلق اس کے قبل کی آیت سے بلا فاصلہ ہوگا مگر پہلا احتمال زیادہ قوی ہے اس میں واحد کا صیغہ ہے جس سے مخاطب رسولؐ کی ذات کو سمجھنا ضروری نہیں ہے بلکہ عام محاورہ کے مطابق اس کا مخاطب عام بھی ہوسکتا ہے جس کی نظیریں قرآن میں بہت ملتی ہیں [۳]۔

وَلِكُلٍّ وِّجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّيۡهَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ ؕ اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يَاۡتِ بِكُمُ اللّٰهُ

---

[۱]۔ الضمير لرسول الله ﷺ وان لم يستبق ذكره لدلالة الكلام عليه (بيضاوی)

[۲]۔ وهم المعاندون دون المؤمنين (صافی)

[۳]۔ الخطاب فی النهی يراد به غير النبی ﷺ كما فی قوله تعالیٰ. فلا تقل لهما اُفّ ولا تنهر هما وقل واخفض فقل لها جناح الزل من الرحمة وقل رب رحمهارتينی صغيرا (البلاغی)

جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

''اور ہر ایک کی ایک سمت ہے جدھر وہ رُخ کرتا ہے۔ لہٰذا بڑھ چڑھ کر نیکیاں حاصل کرو جہاں بھی ہو گے تم سب کو اللہ لے آئے گا اللہ ہر بات پر قادر ہے۔''

وجھۃ اور قبلہ کے لفظی معنی تقریباً ایک ہی ہیں۔ وجہۃ جدھر توجہ کیجئے اور قبلہ جس کا استقبال ہو توجہ کے معنی رُخ کرنا اور استقبال اپنے سامنے رکھنا۔

ھو مو لیھا کی ضمیر کو بعض مفسرین نے اللہ کی طرف راجع کیا ہے [۱]۔ اس صورت میں لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ہر ایک کے لئے ایک سمت رہی ہے جدھر وہ (یعنی اللہ) اس کا رخ کراتا ہے مگر ہمیں دوسرا قول زیادہ سلجھا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضمیر کل کی طرف ہی راجع ہے [۲] اور ہم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ احادیث اہل الذکر میں اس کی تفسیر کوئی وارد ملتی نہیں [۳]۔

مطلب بظاہر یہ ہے کہ یہ تو ہر جماعت کے نظم و تربیت کا ایک علامتی شعار ہوتا ہے جسے وہ اختیار کرتی ہے تو مسلمانوں کے لئے ہم نے بھی بطور شعار ایک قبلہ قرار دے دیا ہے مگر کبھی اپنی فضیلت و بزرگی کا معیار اسی کو سمجھ نہ لینا۔ فضیلت کا اصل معیار صرف اعمال خیر ہیں۔ اسی میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو اور دنیا کی قوموں پر اس بات میں سبقت حاصل کر کے دکھاؤ جو خالق کی نظر میں معیار بزرگی ہے (اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ) یہی وہ حقیقت ہے جس پر دوسری جگہ ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے کہ: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ...... الخ ''نیکی کا معیار یہ نہیں ہے کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرتے ہو بلکہ نیکی کا دارو مدار کچھ خاص اوصاف پر ہے (جو بعد میں درج ہیں)۔

قبلہ اور معیار فضیلت:

اسی سے معلوم ہوا کہ یہ قبلہ کی طرف رخ کرنا بت پرستی کے دور سے بھی تعلق نہیں رکھتا۔ اس مقام پر مولوی محمد علی نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اچھے الفاظ لکھے ہیں کہ:

''خانہ کعبہ کی جو کچھ عزت مسلمانوں کے دلوں میں ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ یہ توحید کا اصل مرکز ہے اور نسل انسانی کے اتحاد کا بھی اصل مرکز یہی ہے بعض کوتاہ اندیش مخالفین نے اس عزت کو پرستش کے قائم مقام قرار دے کر اعتراض کیا ہے حالانکہ کسی چیز کی عزت کرنا اور امر ہے اور اس کی پرستش امر دیگر ہے۔'' (بیان القرآن جلد اص ۱۳۳)

اگر یہ نکتہ پیش نظر رہے تو مسلمانوں کے ایک طبقہ کی طرف سے بہت سے موقعوں پر جو ''شرک، شرک'' کی بے محل آوازیں بلند ہوتی ہیں

---

[۱]۔ اللہ مولّیھا ایّاھم (صافی)

[۲]۔ ھو مولّیھا وجھۃ فی صلوتہ (جلالین) یجوز ان یکون الضمیر الّذی ھو فی قولہ ھو مولّیھا عائدا الیٰ کلّ والتقدیر لکلّ وجھۃ ھو مولّیھا وجھۃ (مجمع البیان)

[۳]۔ لم اجد عن النبی ﷺ واھل لبیت شیئا فی ذٰلک (البلاغی)

وہ موقوف ہوجائیں۔

"جہاں بھی ہو گے اللہ تم سب کو لے آئے گا۔" یعنی جب اسے جزا دنیا ہوگی تو تمہارا مشرق اور مغرب کا فاصلہ اس کے نزدیک یکساں ہوگا۔ اس کی قدرت ہر زمان ومکان اور ہر سمت وجہت پر حاوی اور سب کا شامل ہے [1]۔

وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۹﴾

"اور جب بھی کہیں نکلئے تو منہ اپنا مسجد الحرام ہی کی طرف موڑیئے۔ یہی بلاشبہ آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں ہے۔"

چوں کہ اس کے پہلے کی آیات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خود مسلمانوں کی جماعت میں بھی تحویل قبلہ کے معاملے میں بے چینی تھی اور اسکے بعد امکان تھا کہ کچھ لوگ جب تک مدینہ میں ہوں اور پیغمبر خداؐ کی اقتدا میں نماز پڑھیں اس وقت تک تو کعبہ کی طرف رخ کریں اور جب کہیں باہر جائیں تو اپنی پرانی پڑی ہوئی عادت کے مطابق بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو جائیں تو اس لئے اس انتباہ کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ حکم سفر وحضر میں یکساں ہے [2] اور اصل میں یہ خطرہ خود رسولؐ سے تو تھا نہیں کہ آپ سفر وحضر میں فرق کر دیں۔ یہ صرف ایک بلیغ انداز تھا دوسروں کو متنبہ کرنے کا۔ اس لئے آیت میں کلام کی ابتدا ہوئی رسولؐ کے ساتھ مخاطب کی صورت میں بلفظ واحد (خرجت اور وجهك اور من ربك) اور انتہائی عام مسلمانوں سے تخاطب پر بصیغہ جمع (وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ) یہ صرف اس لئے کہ اصل انتباہ یہ انہی کے لئے ہے جو جماعت میں شامل ہیں مگر یہ تبدیلی ان پر شاق ہے اور مدینہ سے باہر رسولؐ کی نگاہ سے اوجھل ہوتے ہی طرز عمل میں تبدیلی چوں کہ اس تصور کی غماز ہے کہ اب رسول تو یہاں ہیں نہیں اور دیکھ نہیں رہے ہیں لہٰذا اس خطور ذہنی کے مقابل میں یہ انتباہ کیا جا رہا ہے کہ "اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔" یعنی رسولؐ دیکھ رہے ہوں یا نہ اگر تم مسلمان ہو تو تمہیں اللہ کو ماننا ہے اور اس کے لئے تمہارا حضر وسفر یکساں ہے۔ وہ جس طرح تمہیں مدینہ میں دیکھ رہا تھا اسی طرح اب اس جگہ جہاں اس وقت تم ہو تمہیں دیکھ رہا ہے اور تمہارے کردار سے باخبر ہے۔

وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَحَيۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَيۡكُمۡ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ ۗ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِىۡ ۗ وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِىۡ عَلَيۡكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ

---

[1]۔ انّ اللہ علیٰ کلّ شیء قدیر ای ہو القادر علیٰ جمعکم وحشرکم وہو علیٰ کلّ شیء (مجمع البیان)

[2]۔ کرر لبیان تساوی حکم السفر وغیرہ (جلالین)

تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۰﴾

''اور جب بھی کہیں نکلئے تو منہ اپنا مسجد الحرام ہی کی طرف موڑ یئے اور تم بھی جہاں کہیں ہو اپنا منہ مسجد الحرام ہی کی طرف موڑو تا کہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ ملے سوا ان کے جو ظلم و تعدی سے کام لیں تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور اس لئے کہ [۱] میری طرف سے نعمت تم پر پوری ہو جائے اور شاید تم سیدھے راستے پر ہو۔''

اس آیت سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ کے عمل اور تمام مسلمانوں کے عمل میں جہاں بھی ہوں اختلاف نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کس طرف رخ کر کے نماز پڑھیں اور یہ کبھی کسی اور رخ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لیا کریں کیوں کہ اس صورت میں لوگ تمہارے خلاف ایک دلیل و حجت پیش کر سکتے ہیں کہ اس تبدیلی سے خود ان سب کا ضمیر مطمئن نہیں ہے اس لئے اب بھی ان میں کچھ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ لیتے ہیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے اور مخالفین کو یہ حجت پیش کرنے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔ اِلَّا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم انہیں کسی حجت کا موقع نہ دو۔ اب جو خواہ مخواہ دھاندلی سے کام لے کر کچھ نہ کچھ کٹھ حجتی سے کام لئے ہی جائیں ان کا کوئی علاج نہیں ہے [۲]۔

''ان سے نہ ڈرو'' یعنی ان کے اعتراضات کی کوئی پروانہ کرو [۳] ''مجھ سے ڈرو'' یعنی میرے حکم کی اہمیت کا لحاظ کرو [۴] جو تمہاری عبودیت کا عقلی تقاضا ہے۔ پھر یہ کہ میں نے تم پر یہ ایک احسان کیا ہے کہ جو کعبہ تمہارا دینی و قومی مرکز ہے اسی کو تمہارے لئے قبلہ بھی بنا دیا جو تمہارے دینی اور قومی رجحانات کے بالکل مطابق ہے اب تم ہی میں سے کچھ لوگ اس کی مخالفت کریں تو یہ کتنا بڑا کفران نعمت ہے۔ اور پھر جب کہ خالق کا فرمان اس کے لئے صادر ہو گیا تو رشد و ہدایت اس کی تعمیل ہی میں ہے اس کی عدول حکمی کر کے تمہیں گمراہی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔

كَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيۡكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۵۱﴾

''جیسا کہ ہم نے تم میں تم ہی کا ایک پیغمبر بھیجا جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا تمہیں سدھارتا تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا اور تمہیں وہ باتیں بتاتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔''

یعنی یہ تحویل قبلہ تم پر ایک احسان ہے جیسا کہ اس کے پہلے تم پر یہ احسان ہو چکا ہے کہ یہ رسولؐ تمہاری جانب مبعوث ہوا [۵]۔

اسی سورہ بقرہ میں پہلے پارے میں انہی الفاظ میں حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت اس پیغمبر کے بھیجے جانے کی دعا کی تھی:

---

[۱]۔ عطف علیٰ لئلا یکون (جلالین)

[۲]۔ فان ھٰؤلآء الظالمین لا یقطعون جدلھم واحتجاجھم بالاباطیل (البلاغی)

[۳]۔ فان مطاعنھم لا تضرّکم (بیضاوی)

[۴]۔ فلا تخالفوا ما امرتکم (بیضاوی)

[۵]۔ ای ولا تمّ نعمتی علیکم کما اتممتھا بارسال رسول منکم (صافی)

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (بقرہ۔ ۱۲۹)

اس دعا کی قبولیت کا اظہار کرتے ہوئے متعدد جگہ قرآن مجید میں اسی نبی کے اوصاف انہی الفاظ میں پیش کیے گئے ہیں جو دعائے ابراہیمی میں مذکور تھے ان الفاظ کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔ ''جیسا کہ ہم نے تم میں یہ پیغمبر بھیجا''۔ اس میں اشارہ اس طرف بھی ہوسکتا ہے کہ کعبہ کی مرکزیت بھی ابراہیمی تمناؤں کی تکمیل کا ایک تتمہ ہے اسی طرح جیسے اس رسولؐ کی بعثت بھی۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿١٥٢﴾

''مجھے تم یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرے شکر گزار رہو اور میری ناشکری نہ کرو۔''

بندہ کا اللہ کو یاد رکھنا احساس فرائض کا قائم رکھنا ہے اور خداوند عالم کا اسے یاد رکھنا نعمتوں سے نوازنا ہے [1] اس نوازش کو ذکر (یاد) سے تعبیر کرنا عمل اور جزا میں مناسبت ذکری کے قائم رکھنے کے لئے ہے [2]۔ جو بلاغت کا تقاضا ہے جیسے عرب کا مقولہ: كما تدين تدان

اگر یہ آیت بوقت تنزیل گزشتہ آیات کے ساتھ ہی نازل ہوئی ہو تو اس کا ربط ان نعمتوں کے ساتھ ہے جن کا ذکر ولا تم نعمتى عليكم اور پھر كما ارسلنا الخ میں ہو چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مدینہ کے اندر اور مدینہ کے باہر جہاں بھی ہو قانون الٰہی کا خیال رکھنا چاہیے اور کہیں بھی حکم خداوندی کے خلاف نہیں کرنا چاہیے۔ تب ہی خالق کی نظر رحمت بھی تمہاری طرف مبذول رہے گی اور یہ جو تم پر احسان کیا گیا ہے تبدیل قبلہ کر کے اور اس کے پہلے اس پیغمبرؐ کو بھیج کر [3] اس کی ناشکری نہ کرو [4] قبلہ والے احسان کی ناشکری کبھی کبھی گذشتہ قبلہ کی طرف رخ کر لینا ہے اور رسولؐ والی نعمت کی ناشکری اس رسولؐ کی مخالفت کرنا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٣﴾

''اے ایمان لانے والو! صبر اور نماز سے مدد لیا کرنا بلاشبہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

صبر اور صلوٰۃ:

مدد کے مفہوم میں داخل ہے خود اپنی مادی قوت کا ناکافی ہونا۔ اس طرح اس پیغام میں مسلمانوں کے لئے یہ انتباہ مضمر ہے کہ انہیں ایسی مشکلات درپیش ہوں گی جن کے دفعیہ سے ان کی مادی طاقت عہدہ برآ نہ ہو سکے گی۔

عموماً ایسے محل پر انسان کسی بیرونی طاقت کا سہارا ڈھونڈھتا ہے لیکن پوری جماعت خود اپنی حقانیت کے اصولوں کی بناء پر مبتلائے

---

[1]۔ فاذكروني بالطاعة اذكركم بالثواب (بیضاوی وصافی)

[2]۔ لاجل المقابله انفطيهة جرى العبر عن ذٰلك بقوله تعالىٰ اذكركم (البلاغی) قبل معنا داجازيكم (جلالین)

[3]۔ يعنى بالنعمة قوله كما ارسلنا فيكم رسولاً منكم الاٰية (مجمع البیان)

[4]۔ اراد بالكفر كفر النّعم (صافی)

مشکلات ہوتو اسے وہ بیرونی طاقت مل ہی کیوں سکتی ہے جو اسے سہارا دے اور جو کوئی دوسری جماعت مدد کرنا چاہے گی وہ ضرور اس کی ان سے کچھ قیمت وصول کرے گی اور وہ ان کی حقانیت کے اصول میں کمزوری کا باعث ہوگی اس لئے مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ کسی دوسری طرف کبھی مدد کے لئے نہ دیکھیں بلکہ ایک طرف خود اپنے میں صبر کا جوہر پیدا کریں صبر کیا ہے؟ تمام مشکلات کے باوجود پائے استقامت میں جنبش نہ ہونا۔ یہ داخلی قوت ہے اور اس کے ساتھ اللہ سے مدد طلب کریں صلوٰۃ کے ذریعہ سے یہ بیرونی قوت ہوگی۔ ان دونوں باتوں سے ان کے نفس میں ایک جوہر اعتدال بھی پیدا ہوگا جو انسانیت کا کمال خاص ہے پہلی صفت دنیا کی مادی طاقتوں کے مقابلہ میں استحکام کا پتہ دیتی اور دوسری صفت اپنے مالک و معبود کی بارگاہ میں تذلل کا ثبوت دیتی ہے پہلا امر خودداری کا مقتضی اور دوسرا خودسری سے مانع ہے۔

مگر آخر میں کہہ دیا ہے کہ اللہ مدد انہی کی کرتا ہے جو صبر کا جوہر رکھتے ہوں۔ اس طرح پورا دارو مدار صبر پر ہو گیا وہی اہل حق کی کامیابی کا واحد راز ہے۔

اس آیت کے ابتدائی الفاظ (اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ) بنی اسرائیل کے سلسلہ کی آیات میں پہلے پارے میں آچکے ہیں اس طرح کہ

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝٤٥ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝٤٦ (سورۂ بقرہ)

مگر وہاں مخاطب بنی اسرائیل تھے اور انہیں ان کے فرائض کا احساس پیدا کرانا تھا کہ وہ اس پیغام حق کو جو ان کے سامنے خاتم الانبیاءؑ کے ذریعہ سے پہنچا ہے قبول کریں۔ اس میں انہیں ایک طرح کی ''حمیت جاہلیت'' سدراہ تھی اور وہ یہ کہ خاندانی طور پر ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم ہی میں سے کوئی رسول مبعوث ہو۔ اولاد اسماعیلؑ کے سامنے سرخم کرنا ہماری شان کے خلاف ہے۔ یہ ایک طرح کی خودسری ہے جسے ختم کرنے کا ذریعہ صلوٰۃ یعنی رجوع الی اللہ ہے لہٰذا ''صبر وصلوٰۃ'' کا ذکر کرنے کے بعد وہاں زیادہ توجہ صلوٰۃ پر مبذول کی گئی، اس طرح کہ خصوصیت کے ساتھ اس کے ذکر کا سلسلہ بعد تک رہا (وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ) یعنی اللہ کی طرف توجہ عام لوگوں کی طبیعت پر بار ہے سوا ان کے جو عظمت الٰہی سے متاثر دل اور اللہ کو ایک دن منہ دکھانے کا تصور رکھتے ہیں۔ اور اس میں اشارہ تھا کہ تم ان دونوں صفتوں سے محروم ہو اس لئے اس پیغام کا قبول کرنا بھی تمہارے لئے دشوار ہے اور یہاں مخاطب مسلمان ہیں۔ انہیں اس طرح کی کوئی بات صراط مستقیم پر برقرار رہنے سے مانع نہ تھی صرف قوت ارادی کی کمی ہوسکتی تھی جو شدائد ومصائب کے مقابلہ میں سپر انداختہ بنا دے۔ اس لئے یہاں ''صبر وصلوٰۃ'' کا ذکر کرنے کے بعد زیادہ اہمیت صبر کو دی اور ختم کلام اس پر ہوا کہ ان اللہ مع الصٰبرین بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝١٥٤

''اور انہیں جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں یہ نہ کہو کہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمہیں شعور نہیں ہے۔''

حیاتِ شہداء:

زندگی طبعاً پسندیدہ شے ہے اور موت ناپسند ہے اور عقلاً بھی بلا شبہ حیات ایک کمال ہے۔ اسی لئے صفات خالق میں بھی حی کی صفت ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ موت نقص ہے اسی طبعی مقتضا اور عقل کے فیصلہ کے مطابق انسان خطروں سے قدم پیچھے ہٹاتا ہے جب جان کے جانے کا اندیشہ ہوتا مگر اسلام نے جس کا نصب العین بلند مقاصد کے لئے قربانی کا مطالبہ تھا اس ذہنیت کا خاتمہ کرنا چاہا اسی طرح کہ قرآن میں اعلان کیا گیا کہ جو اللہ کی راہ میں قتل ہوں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں یہ تمہارے شعور کا نقص ہے کہ تم انہیں مردہ خیال کرتے ہو۔

چوں کہ کائنات عالم کا نظام اسی پر قائم ہے کہ ہر پست بلند کے کام آئے اور یہ کام آنا اس کی بلندتر بقا کا ذریعہ ہوتا ہے تو پھر انسان اپنے مافوق کے کام آ کر میّت کیوں کہا جائے بلکہ وہ اس صورت میں شہید ہوگا اور ایک بلندتر حیات کا مالک ہوگا۔ بس شرط یہ ہے کہ مقصد قربانی بلند تر ہو۔ انہی بلند مقاصد کو جو جان سے زیادہ عزیز ہونا چاہئیں فی سبیل اللہ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔

دنیا پرست لوگ ایسے اشخاص کو جوان مقاصد کیلئے جان دیتے ہیں یہ کہہ کر ملامت کرتے ہیں کہ بے کار جانِ عزیز ضایع نہ کرو اور کبھی ہمدردی کے لباس میں اس پر اظہار افسوس کرتے ہیں جیسا کہ منافقین کی زبانی کچھ شہدائے راہ خدا کے متعلق ایک جگہ قرآن میں آیا ہے لَوۡ كَانُوۡا عِنۡدَنَا مَا مَاتُوۡا وَمَا قُتِلُوۡا (آل عمران ۱۵۶)

''اگر وہ ہمارے ساتھ ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے''۔ قرآن اس ذہنیت کو ختم کرتے ہوئے منع کرتا ہے کہ انہیں یہ نہ کہو کہ مردہ ہیں۔

اس میں اگر صرف پہلے الفاظ ہوتے کہ مردہ نہ کہو تو اس تصور کا امکان تھا کہ وہ مردہ ہیں مگر ''میّت'' کہنا ادب کے خلاف ہے لیکن آخری ٹکڑے سے یہ تصور ختم ہو جانا چاہیے: بَلۡ اَحۡيَآءٌ وَّلٰـكِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ یعنی یہ کوئی احترامی ممانعت نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ انہیں مردہ سمجھنا تمہاری بے شعوری ہے۔

انہیں الفاظ کے لب ولہجہ وَ لٰكِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ سے اس نظریہ کی بھی رد ہوجاتی ہے جسے راغب اصفہانی نے اختیار کیا ہے کہ:

''یہاں نفی موت سے مراد غم اور ناکامی کی موت ہے۔ موت کے اس معنی کی تائید میں انہوں نے یہ آیت پیش کی ہے وَيَاۡتِيۡهِ الۡمَوۡتُ مِنۡ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (ابراہیم ۱۷) مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ خدا کی راہ میں کام کرتے ہوئے مارے جائیں ان پر حزن و ناکامی کی موت نہیں ہوگی۔

اس لئے ان کو ناکام نہ کہو بلکہ وہ کامیاب ہوں گے'' (بیان القرآن)

اس کے معنی یہ ہیں کہ ''نفی موت'' یہاں مجازی طور پر ہے مگر اس تصور کی اس وقت گنجائش بھی تھی جب صرف یہ ہوتا کہ انہیں مردہ نہ کہو لیکن یہاں تو اتنا نہیں ہے بلکہ آخر میں ہے کہ ''وہ زندہ ہیں مگر تمہیں اس زندگی کی شعور نہیں ہے۔'' یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ وہ کسی ایسی حقیقت کا اظہار ہے جو شعورِ عام سے مخفی ہے۔ پھر دوسری جگہ تو احیاء کے بعد تفصیل سے مقتضیات حیات کو ثابت کیا گیا ہے کہ

عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيۡنَ بِمَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ۙ وَيَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِيۡنَ لَمۡ يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ مِّنۡ خَلۡفِهِمۡ ۙ اَلَّا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾ (سورۂ آل عمران)

''انہیں اللہ کے یہاں سے رزق ملتا ہے۔ وہ اپنے پسماندگان کے پرمسرت حالات کے علم سے خوش ہوتے ہیں'' اس سب کے بعد نفی موت کو رنج وملال یا تباہی وبربادی کا نفی پرمحمول کرنا تاویل نہیں ہے بلکہ ایک قرآنی حقیقت کے تسلیم کرنے سے انکار ہے۔

اور یوں تو اسلامی تعلیم کے مطابق عالم برزخ میں ہر فرد مکلّف کے لئے ایک طرح کی زندگی ثابت ہے۔ مگر قرآن کا اندازِ کلام بتارہا ہے کہ یہ شہداء کی حیات کوئی امتیاز خصوصی رکھتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس کی پوری نوعیت کو نہ سمجھ سکیں اور ہم حیات برزخی کی پوری نوعیت کو کب سمجھتے ہیں جو اس کی عمومی کیفیت اور حیات شہداء کی خصوصی حالت میں امتیاز کرسکیں اور اسے ہمیں سمجھ سکنا بھی نہ چاہیے اس لئے کہ منزل نقص میں کمال کا صحیح تصور غیر ممکن ہوتا ہے کہ بچپن میں یہ سمجھنا کہ شباب کیا ہوتا ہے خواب میں یہ سمجھنا کہ بیداری کسے کہتے ہیں ویسے ہی اس دور حیات مادی میں یہ سمجھنا کہ مابعدالموت کی زندگی اور پھر وہ بھی حیات شہداء کیا ہے۔

بہر حال وہ ہے سنت کائنات میں جو قربانی کا فطری اصول ہے وہ بھی اس کا متقاضی ہے اور قرآن بھی اس کی تصریح کررہا ہے لہٰذا ایک مسلمان کو اس کا ماننا بہر حال ضروری ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٥﴾

''اور ضرور بالضرور ہم تمہیں آزمائیں گے خوف، دہشت، بھوک اور مال وجان اور پھلوں کی کمی کسی نہ کسی چیز کے ساتھ اور خوش خبری دیجئے ان صبر کرنے والوں کو۔''

آزمائش کا عمومی طور پر [1] اعلان کردیا گیا ہے مگر یہ امر غور طلب ہے کہ خالق اپنے بندوں کا امتحان کیوں لیتا ہے؟ امتحان وہ لے جو حقیقت پر مطلع نہ ہو اور خالق تو ہمارے ظاہر و باطن پر حاوی ہے مگر حقیقتاً امتحان کا مقصد یہی نہیں ہوا کرتا کہ امتحان لینے والا خود اطلاع حاصل کرے بلکہ اس کے علاوہ کبھی ناقص کو اس کے نقص کا اندازہ کرانا اور کبھی کامل کے کمال سے دنیا کو متعارف کرانا بھی نصب العین ہوتا ہے اور خالق کا مقصود امتحان سے انہی دونوں امروں میں سے ایک ہوتا ہے۔ ناقص نفوس کو احساس نقص پیدا کرانا تاکہ تحصیل کمال کی طرف توجہ ہو اور کامل نفوس کے کمال کا خلائق کے سامنے ظاہر کرنا اس لئے جتنی زیادہ بلند ہستی ہوتی ہے اتنا ہی خالق کی طرف سے اس کا شدید امتحان ہوتا ہے۔

اللہ کے امتحان کی نوعیتیں تو بہت ہوتی ہیں مگر آیت میں ان میں سے کچھ بطور مثال بیان ہوئی ہیں اس میں اور تو کوئی خاص لفظ محتاج تشریح نہیں مگر ثمرات اس کے ظاہری معنی تو یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ باغوں میں پھل خراب ہوجائیں، کھیتیاں برباد ہوجائیں، مگر یہ نقصان اموال کی ایک قسم ہے اس لئے دوسری تفسیر زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ نقص ثمرات سے مراد اولاد کے داغ ہیں جو میوہ زندگی ہوتے ہیں [2] اور اسی لئے نقصان مال کے بعد اس سے شدید تر سے یعنی نقصان نفوس اور پھر اس کے بعد مفارقت اولاد کا ذکر کیا گیا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ جانی نقصان سے زیادہ شدید امتحان ہے۔

---

[1] ۔ یاایّہا الذین اٰمنو کما یقتضیہ سیاق الخطاب اویاایّہا النّاس (البلاغی)

[2] ۔ قبل ارادبہ الاولادلانّ الولد ثمرۃ القلب (مجمع البیان) عن الشافی النقص من الثمرات موت الاولاد (بیضاوی)

الَّذِيۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾

"کہ جب کوئی تکلیف دہ بات [1] ان کے سامنے آئے ان کا قول یہ ہو کہ بلا شبہ ہم اللہ کے ہیں اور بلا شبہ ہمیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔"

یہ صبر کی حقیقت کا بیان ہے۔ بعض لوگ صبر کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ احساس مصیبت ہی نہ ہو مگر احساس تو انسان کے شعور کا نتیجہ ہے۔ اس کا فقدان قابل تعریف کہاں ہوسکتا ہے! اس طرح یہ سمجھنا کہ صبر بس یہ ہے کہ آنکھ سے آنسو نہ نکلے یہ بھی غلط ہے کیوں کہ یہ آنسو نکلنا احساس غم کا وہ طبعی نتیجہ ہے جس کا ربط اس احساس کے ساتھ فطرت نے قائم کیا ہے۔

حقیقتاً صبر یہ ہے کہ انسان تقدیر الٰہی پر معترض نہ ہو اور جو کچھ اس کی جانب سے ہوا ہے اسے صحیح سمجھے یہی وہ ہے جسے کلمہ انا للہ وانا الیہ راجعون ظاہر کرتا ہے۔

یہ قول صرف لفظی نہیں ہے جسے بس زبان پر جاری ہونا چاہیے بلکہ اس کو دل و دماغ میں راسخ ہونا چاہیے کہ ہم اللہ کے ہیں اور اسے ہم پر اختیار کلی ہے جو وہ کرتا ہے وہ ہمارے حق میں مناسب ہی کرے گا اور ہمیں پلٹ کر اسی کی طرف جانا ہے۔ لہٰذا وہ ہم کو ہر نقصان کا معاوضہ بھی بمقتضائے عدل عطا کرے گا۔ اس کے یہاں ذرہ برابر ظلم نہیں ہے [2]۔

اگر مصائب حق کی راہ میں قیام کی وجہ سے اور ظلم ظالمین کے نتیجہ میں ہوں تو انہی دونوں فقروں میں یہ پہلو بھی مضمر ہے کہ "ہم اس کے ہیں لہٰذا ہمیں اسی کی راہ میں صرف ہونا چاہیے اور اس راہ میں جو شدائد ہوں ان کی پرواہ نہیں کرنا چاہیے اور ہمیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے اس لئے وہ ہم کو ہمارے ثبات قدم کی جزا اور ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا بھی ضرور دے گا لہٰذا ہم کو پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے یہ دونوں باتیں اگر سامنے رہیں تو کبھی کوئی سختی وصعوبت ہمیں جادہ حق سے متزلزل اور کوئی ظالم وجابر جہاد حق میں سپر انداختہ نہ بنا سکے۔

اُولٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

"یہ وہ ہیں کہ ان پر خاص عنایتیں ہیں ان کے پروردگار کی طرف سے اور مہربانی ہے اور یہی ہدایت پانے والے ہیں۔"

صلوٰات، صلوٰۃ کے جمع ہے۔ صلوٰۃ کی معنی توجہ خاص کے ہوتے ہیں اس کی نسبت جب خدا کی طرف ہو تو اس سے عنایت و افضال یا تعریفوں [3] اور قدردانیوں کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اور اس کی نسبت مخلوق کی طرف دی جائے تو وہ اللہ سے دعائے رحمت وعنایت کی شکل اختیار کرتی ہے۔

یہ صلوات ورحمت تو صابرین کے صبر کا خصوصی اجر ہے اور آخر میں جو کہا ہے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے

---

[1]۔ فی الحدیث کل شیء یوذی المومن فھو لہ مصیبۃ (صافی ونحوفی البیضاوی)

[2]۔ ھذا اقرار بالبعث والنشور اینحن الیٰ حکمتہ نصیر (مجمع البیان)

[3]۔ صلوات من ربہم ثناء جمیل (البلاغی)

ہیں کہ یہی راہ ہدایت پر ہیں یعنی مصیبت کے وقت یہ احساس قائم رکھنا کہ ہم اللہ کے ہیں اور اللہ کی طرف پلٹ کر جانا ہے یہی صحیح راستہ ہے [۱] مگر ہمارا ذوق یہ کہتا ہے کہ اس صورت میں اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ کا فقرہ پہلے ہونا چاہیے تھا اور صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ کا تذکرہ بعد کو، اس لئے کہ یہ ابتداً اُن کے عمل کی نوعیت ہے جو عمل کے ساتھ ساتھ ہے اور صلوٰت و رحمۃ ان کی جزا ہے جو اس پر مترتب ہے۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ کے دوسرے معنی جو زیادہ دل نشین ہیں وہ یہ ہیں کہ ایسے ہی لوگ جو مصیبت کے وقت یہ احساس رکھتے ہوں وہ ہیں جو پیغامِ حق کو قبول کر کے صراط مستقیم پر آتے ہیں اور شدائد کو جھیلتے ہوئے اس پر برقرار رہتے ہیں۔ کیوں کہ حق کا راستہ خطرناک ہے لہٰذا بے صبرے چاہیے حق کو سمجھ بھی گئے ہوں مگر خطرات کو دیکھ کر لرز جاتے ہیں اور حق کے اختیار کرنے کی ہمت نہیں کرتے اور اگر حق کو اختیار کر لیا ہو تب بھی ان کی بے صبری سے ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ کوئی مصیبت ان کے قدم کو راہِ ایمان سے منحرف کر دے جس سے وہ ہلاکت ابدی میں گرفتار ہو جائیں۔

اِنَّ الصَّفَا وَالۡمَرۡوَةَ مِنۡ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنۡ حَجَّ الۡبَيۡتَ اَوِ اعۡتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِ اَنۡ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنۡ تَطَوَّعَ خَيۡرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۵۸﴾

"بلا شبہ صفا و مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ بجا لائے اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا کہ وہ ان دونوں کا چکر لگا لے اور جو شوق و رغبت کے ساتھ کچھ نیکی کرے تو اللہ قدر دان ہے جاننے والا۔"

صفا و مروہ مکہ معظمہ کی مشہور دو پہاڑیاں ہیں اور شعائر شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں علامت و نشانی لہٰذا شعائر اللہ کا مطلب ہے عبادت الٰہی کی یاد دلانے والی نشانیاں [۲]۔

حج اور عمرہ دونوں خانہ کعبہ کی زیارت کو کہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ حج کے لئے زمانہ خاص ہے جس میں ذی الحج کی ۹ سے لے کر ۱۲ تک کی تاریخوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان دونوں کے علاوہ حج نہیں ہو سکتا اور جو دوسرے دنوں میں ہوتا ہے وہ عمرہ کہلاتا ہے۔

آیت کا مقصود یہ ہے کہ حج اور عمرہ میں صفا اور مروہ کے درمیان سعی [۳] بھی لازم ہے [۴] جس کے ذیل میں بڑے بڑے سلاطین با اقتدار کو بھی حکم الٰہی کی تعمیل میں ذرا اپنے تمکنت کے درجہ سے نیچے اترنا پڑتا ہے اور یہ اس سعی کے مناسک حج میں قرار دینے کا مستقل مقصد ہے [۵]۔

اسی سے یہ سمجھنا صحیح ہے کہ موجودہ دور میں سرمایہ داری اور اقتدار کا مظاہرہ جو صفا و مروہ کے درمیان موٹروں کے دوڑانے کی شکل میں شروع ہوا ہے یہ قانونِ اسلام کی روح سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتا۔

---

[۱]۔ المهتدون للحق والصواب حيث استرجعوا واسلموا القضاء الله (بیضاوی)

[۲]۔ من شعائر الله من اعلام مناسكه جمع شعيرة وهي العلامة (بیضاوی وصافی) شعائر الله اعلام دينه (جلالین)

[۳]۔ بان يسعى بينهما سعيا (جلالین)

[۴]۔ في الكافي والعياشي عن الصادق عليه السلام انه سئل عن السعي بين الصّفا والمروة فريضة فقال فريضه (صافی)

[۵]۔ عنه عليه السلام جعل السعي بين الصفا والمروة مذلة للجبّارين (صافی)

اس وجوب ولزوم کو آیت میں ان لفظوں میں کہا گیا ہے کہ ''اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا'' یہ انداز اس لئے اختیار کیا گیا کہ شعائر اللہ کہہ کر ان کے مرکز عبادت اور محلّ احترام ہونے کا مقتضی تو ثابت ہو ہی گیا۔ اس مقتضی کے مقابل میں آ سکتا ہے تو کوئی محذور عقلی یا شرعی جو ان کی تعظیم وتکریم سے مانع ہو۔ وہ عام اسلامی ذہنیت کے مطابق شرک کا تصور ہو سکتا ہے کہ چوں کہ پہاڑیاں بے جان ہیں اور پتھر میں انہی پتھروں کے اصنام کی مشرکین پرستش کرتے ہیں۔ تو اب ہم ان کا احترام کیوں کریں [1]۔ اس لئے بجائے حکم دینے کے صراحۃً یہ نفی ضروری سمجھی گئی کہ اس میں خرابی کوئی نہیں ہے۔ شرک کا تعلق تو نیت سے ہے اگر تم شعائر اللہ ہونے کی بناء پر سعی کرو گے تو وہ ہرگز شرک نہیں ہو سکتا کاش اس سے ان مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں جنہیں بات بات پر شرک کا ہو انظر آیا کرتا ہے اور وہ دوسروں کو بھی اس سے ڈرایا کرتے ہیں۔

تفسیر عیاشی کی روایات سے جو حضرت امام جعفر صادقؑ سے وارد ہے اس آیت کا پس منظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمرۃ القضاء میں مشرکین سے یہ شرط ہوئی تھی کہ چند دنوں کے لئے وہ بتوں کو ہٹا دیں چنانچہ اس پر عمل بھی ہوا تھا مگر ایک صحابی کو سعی میں اتنی تاخیر ہوئی کہ وہ بت دوبارہ لا کر رکھ دیے گئے۔ اس وجہ سے صحابہ کو یہ دغدغہ پیدا ہوا کہ اب بتوں کی موجودگی میں سعی ہونا چاہیے یا نہیں لہٰذا یہ کہا گیا کہ بتوں کے رکھ دیے جانے کے بعد بھی سعی میں کوئی حرج نہیں ہے اسی کے قریب قریب تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی ہے۔

بہر حال فقہائے جمہور کو اس تعبیر کا یہ پہلو محفوظ رکھنا چاہیے کہ لا جناح ''کوئی حرج نہیں ہے'' کہہ کر جس بات کو کہا جائے وہ ہمیشہ مباح و جائز ہی نہیں ہوتی بلکہ کبھی وہ کوئی واجب چیز بھی ہوتی ہے [2] اس لئے سفر میں جو قصر نماز کا حکم ہوا ہے یہ کہہ کر کہ

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ (نساء ۱۰۱)

''جب سفر میں ہو تو کوئی حرج نہیں ہے کہ نماز کو قصر کرو۔'' اسے صرف اجازت پر محمول کرنا لازم نہیں ہے بلکہ جس طرح لا جناح کہہ کر صفا و مروہ کے درمیان سعی کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ اکثر علمائے امت کے نزدیک واجب ہے [3] اسی طرح نماز کے قصر کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے مگر وہ واجب ہے۔ فقط جائز نہیں ہے اس کی مزید تشریح اسی آیت کے تحت میں ہوگی۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَآ أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ أُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُونَ ﴿۱۵۹﴾

''بلا شبہ وہ جو چھپاتے ہیں ہماری اتاری ہوئی واضح دلیلوں اور ہدایت کو جب کہ ہم اسے تمام لوگوں کے لئے کتاب

---

[1]۔ فی الکافی عن الصدقؑ المسلمین کانوا یظنّون انّ السعی ما بین الصفا والمروۃ شیئ صنعه المشرکون فانزل اللّٰہ ھٰذہ الاٰیة (صافی)

[2]۔ نفی الجناح یدلّ علی الجواز الداخل فی معنی الوجوب فلا یدفعه (بیضاوی)

[3]۔ علیه اجماع الامامیّة واکثر الجمہور (البلاغی) عن ابی حنیفة انّه واجب وعن مالك الشافعی انّه رکن (بیضاوی) قال الشافعی وغیرہ رکن وبیّن فرضیته بقوله ان اللّٰہ کتب علیکم السعی رواہ بیہقی وغیرہ (جلالین) اس کے یہ معنی نہیں کہ سعی بین الصفا والمروہ نہ کرے تو بھی حرج نہیں کیوں کہ اس کا ارکان حج میں سے ہونا احادیث صحیحہ اور تعامل اُمت سے ثابت ہے۔ (بیان القرآن)

میں صاف طور پر بیان کر چکے ہیں کہ وہ ہیں کہ ان پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں۔"

کتمان حق کرنے والے پر لعنت:

اس کتمان کے معنی ہیں ایک چیز کو جس کے اظہار کا موقع ہو جان بوجھ کر ظاہر نہ کرنا چنانچہ ایسے چھپانے والے علماء و اکابر یہود تھے [1] اور کتاب سے مراد یہاں توریت ہے جس میں آنے والے پیغمبر کے اوصاف اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے علامات صاف طور پر مذکور تھے [2] لیکن حکم آیت کا ہر اس جماعت کو شامل ہے جو آیت الٰہیہ اور دلائل ربانیہ کا اخفاء کرے اور لوگوں کو ان سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرے [3]۔

لعنت کیا لفظ صلوٰات کے مقابل ہے جس طرح وہ توجہ خاص کا نام ہے خدا کی طرف نسبت کی صورت میں اس کے معنی رحمت کے ہوتے ہیں اور دوسروں کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں دعائے رحمت کے۔ اسی طرح لعنت کے لفظ کے معنی خدا کی طرف نسبت کی صورت میں رحمت سے دور کرنے کے ہوں گے [4] اور دوسروں کی طرف منسوب ہونے کی شکل میں رحمت الٰہی سے دور کرنے کی دعا کے ہوں گے۔

آخری فقرہ یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ "ان پر لعنت کرنے والے لعنت کریں گے"، اس کی دلیل ہے کہ مستحقِ لعنت پر لعنت کرنا تقاضائے ایمان ہے جس میں ملائکہ اور احکام الٰہی کی پیروی کرنے والے انسان سب شریک ہیں [5]۔

اس آیت قرآن کی زد میں سب سے زیادہ علماء کا طبقہ آتا ہے جب کہ وہ روپہلی سنہری مصلحتوں کی خاطر یا اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے حقیقتوں کو عوام سے چھپانے کا مرتکب ہو۔ اس کیلئے تفسیر صافی میں متعدد حدیثیں درج کی گئی ہیں۔

ایک حدیث میں امیر المومنین حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ سے پوچھا گیا کہ آئمہ معصومینؑ کے بعد بہترین خلق کون ہے؟ فرمایا:

العلمآء اذا صلحوا

"علماء جب کہ وہ ٹھیک طور پر اپنے فرائض انجام دیں"

پوچھا گیا" اور شیطان وفرعون ونمرود کے بعد بدترین خلق کون ہے؟ فرمایا:

العلماء اذا فسدوا وھم المظھرون للا باطیل الکاتمون للحقائق و فیھم قال اللہ عزوجل اولئك یلعنھم اللہ و یلعنھم اللاعنون

---

[1]۔ کاحبار الیھود (بیضاوی)

[2]۔ فی الکتاب فی التوٰرۃ (البیضاوی) الکتاب التوٰرۃ (جلالین)

[3]۔ قیل انه متناول لکل من کتم ما انزل اللہ وھو اختیار البلغیٰ وھو اقویٰ لانه اعم فیدخل فیه اولئك وغیرھم (مجمع البیان)

[4]۔ یلعنھم اللہ ای یبعدھم من رحمة (جلالین)

[5]۔ اللاّعنون الملئکة والمؤ منون وکل شئی بالدعاء علیھم للعنة (جلالین) وھو التصحیح لقوله تعالیٰ علیھم لعنة اللہ والملئکة والناس اجمعین (مجمع)

یہ بھی علما ہی ہیں جب وہ خراب ہوں اور یہ وہ ہوں گے جو غلط باتوں کو ظاہر کریں اور حقیقتوں کو مخفی کریں۔ان کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے کہ ان پر اللہ اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے۔''

دوسری حدیث: ارشاد نبویؐ ہے جس سے کسی حقیقت کے متعلق سوال کیا جائے جو اس کے علم میں ہو اور وہ اسے مخفی کرے تو روز قیامت اس کے منہ میں آتشیں لجام دی جائے گی۔''

تیسری حدیث نبویؐ: ''جب میری امت میں بدعتیں رونما ہونے لگیں تو عالم پر لازم ہے کہ وہ اپنا علم ظاہر کرے اور ایسا نہ کرے گا تو وہ لعنت الٰہی کا مستحق ہے۔''

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

''مگر وہ جنہوں نے توبہ کی، اعمال درست کئے اور اظہار کر دیا تو یہ وہ ہیں جن کی میں توبہ قبول کروں گا، اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا ہوں رحم کھانے والا۔''

تَوب کے اصل معنی رجوع یعنی پلٹنے کے ہیں[۱]۔اسی لحاظ سے جب اس کی نسبت بندہ کی طرف ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے گناہوں سے پشیمان ہو کر بارگاہ الٰہی میں پیمان اطاعت کے ساتھ رجوع کرنا اور جب اس کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو مطلب نکلتا ہے اس بندہ کے گناہوں کو معاف کر کے اس کی جانب توجہ کو پلٹانا۔

بندہ کے تائب ہونے کا لازمی نتیجہ ہے کردار میں تبدیلی کا ہونا یہاں کام کیا تھا جس کا قبل کی آیت میں ذکر ہوا ہے؟ دلائل حقیقت اور خدا کی طرف کے حق راستے کو چھپانا، تو اس میں عملی تبدیلی کیا ہے؟ حقائق کا ظاہر کر دینا اور واقعیت سے پردہ ہٹا دینا چنانچہ یہ تینوں الفاظ: تابوا واصلحو او بینوا اس تبدیلی کا مکمل بیان ہے۔

توبہ کریں یعنی نادم ہوں۔اپنے عمل کی اصلاح کریں جو ماضی پر ندامت کا مستقبل میں لازمی نتیجہ ہے اور اس محل پر وہ اصلاح عمل کیا ہے یہی کہ جن چیزوں کو چھپاتے تھے انہیں اب بیان کر دیں[۲] یہ ہو جائے تو بلا شبہ اللہ ان کی توبہ کو قبول فرمائے گا۔

وہ دوسرے ہوں گے جن کا جذبہ انتقام مشتعل ہو گیا تو اب وہ کسی طرح فرو ہی نہیں ہوتا۔اللہ جذبات سے بری ہے بلکہ وہ تو رحمت کے لئے بہانہ چاہتا ہے۔اسی لئے تواب کے لفظ کے بعد پھر رحیم کہا گیا ہے تاکہ مجرم کو مایوسی نہ ہو اور وہ سمجھے کہ

رحمت حق بہانہ می جوید

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ

---

[۱]۔ تابوا رجعوا عن ذلك (جلالین)

[۲]۔بیّنوا مابیّنہ اللہ فی کتابہ لیتم توبتھم (بیضاوی)

وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

”بلا شبہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور مر گئے اس عالم میں کہ وہ کافر ہی تھے یہ وہ ہیں کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور انسانوں سب کی لعنت ہے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے نہ عذاب ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔“

کفر اگر غلط فہمی اور بے خبری سے ہو تو قابل اصلاح ہے اور اس صورت میں جب بھی دلائل حق سامنے آ جائیں گے وہ راہِ راست اختیار کر لے گا لیکن کفر جان بوجھ کر بر بنائے عناد ہے تو ایسے ہی لوگ وہ ہو سکتے ہیں جو آخر دم تک اس کفر پر قائم رہیں اور دنیا سے انہیں کافر ہونے ہی کی حالت میں موت آئے۔ اب ان کے لئے اصلاح کا دروازہ بند ہے اور چوں کہ انہوں نے جب تک دم میں دم تھا برابر کفر کو قائم رکھا اس لئے اس کی سزا یہ ہے کہ عذاب بھی اُن پر قائم ودائم رہے، رحمتِ خدا سے دور اور عذاب کا مستحق ہونا ہی لعنت ہے [۱] اور تمام کائنات اس لعنت میں ہم آواز اور متفق ہے یہاں تک کہ جو شعوری طور پر لعنت نہ کریں وہ بھی لاشعوری اور فطری طور پر ایسے اشخاص کو مورد لعن ہی بنا رہے ہیں [۲]۔ یہی وہ لعنت کی ہمہ گیری ہے جسے اجمعین کی لفظ نے ظاہر کیا ہے۔

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

”اور تمہارا خدا بس ایک خدا ہے سوا اس ہمہ گیر فیض والے بڑے مہربان کے کوئی خدا نہیں ہے۔“

توحید الٰہی کے معنی:

یہ آیت بظاہر تنزیل میں گزشتہ آیات سے مربوط نہیں ہے بلکہ کسی موقع پر نازل شدہ مستقل آیت ہے جس کا مضمون تقریباً سورہ قل ہو اللہ سے متحد ہے [۳] اسے بعض لوگوں نے جو بزحمت گزشتہ آیات سے متعلق قرار دیا ہے [۴] وہ خالی از تکلف نہیں ہے اور بلا ضرورت بھی ہے۔

اللہ کو ایک کہنا اس طرح نہیں ہے جسے ہر شے کو جب اکیلا دیکھا جائے تو وہ ایک چیز ہوتی ہے بلکہ اللہ ایک ہے اس معنی میں کہ اس کی ذات میں کسی قسم کی کثرت کا شائبہ نہیں ہے۔ نہ اجزاء ہیں، نہ اقسام ہیں اور نہ افراد پھر وہ اس معنی میں ایک ہے کہ کوئی اس کا مثل وشریک نہیں ہے جسے لا الہ الا ھو کا لفظ نمایاں کرتا ہے۔

---

[۱]۔ من طردہ اللہ من رحمتہ فھو معذّب (البلاغی)

[۲]۔ حتیٰ انفسھم فان الکافرین یقولون لعن اللہ (صافی)

[۳]۔ ان عباس قال ان کفار قریش قالوا یا محمد صف لنا وانسب لنا ربك فانزل اللہ ھٰذہ الاٰیۃ وسورۃ اخلاص (مجمع البیان)

[۴]۔ اس رکوع میں چونکہ صبر کی تعلیم تھی اور صبر کے معنی طاعات پر قائم رہنا ہے اور نیز ہدایت کے پھیلانے کی تعلیم تھی، اس لیے بتا دیا کہ ہدایت کا اصل الاصول توحید الٰہی ہے (بیان القرآن)

الرحمن الرحیم کی تفسیر بیان ہوچکی ہے۔یہاں اس کا تذکرہ اللہ کے مستحق عبادت ہونے کی وجہ بیان کرنے کے لئے کیا گیا ہے یعنی مستحق عبادت ہے اس لئے کہ اس کے فیوض عمومی وخصوصی سب کے شامل حال ہیں[1]۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

”یقیناً آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں، رات اور دن کی ادل بدل میں[2]۔کشتیوں میں جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے والی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی ہیں اس پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا تو اس سے زمین کو اس کے بے جان ہونے کے بعد جان دار بنادیا میں جنہیں آسمانوں و زمین کے درمیان قابو میں رکھا جاتا ہے[3]،نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیں۔“

قدرت کی نشانیاں:

یہ مصنوعات سے صانع پر استدلال ہے جو وجود خالق کے ثابت کرنے کا فطری اور آسان ترین طریقہ ہے اور یوں تو ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اس کے وجود کو بنانے کے لئے کافی ہے مگر ان کو سلسلہ وار تفصیل کے ساتھ بیان کرنا عوامی ذہنیت پر اثر انداز ہونے کا ایک نفسیاتی طریقہ ہے جس سے ان کے ذہن میں بیداری ہوتی ہے۔

ایک مجمل دلیل مثلاً یہ کہ عالم کا حدوث اپنے موجد کی نشانی ہے ایک فلسفی کو مواد دینے کے لئے کافی ہوسکتی ہے مگر سطحی دماغ اس سے اتنا متاثر نہیں ہوتا ہے جتنا کائنات کی بہت سی چیزوں کے یکے بعد دیگرے تابڑ توڑ تذکرہ اس کی توجہ کو اس حقیقت کی طرف مبذول کرتا ہے۔ پھر ان اشیاء میں جو تنوع پایا جاتا ہے وہ ایک فلسفی کے ذہن کو بھی خالق کے فاعل مختار ہونے کی طرف متوجہ کرتا ہے اور ان میں جو فوائد واغراض سے مناسبت پائی جاتی ہے وہ اس کی حکمت کاملہ کی طرف توجہ دلاتی ہے جس سے نہ صرف وجود باری بلکہ اس کے صفات کاملہ کی بھی بقدر ضرورت معرفت ہوجاتی ہے۔

---

[1]۔ انما قرن الرحمٰن الرحیم بقوله لا اله الّا هو لانه یبین به سبب استحقاق العبادة (مجمع) فانه لما کان مولی النعم کلها اصولها وفروعها وما سواها امانعمة او منعم علیه لم یستحق العبادة احد غیره (بیضاوی)

[2]۔ الٹ پھیر میں رات اور دن کے (تاج العلماء)

[3]۔ ابر کہ جو مارا مارا پھرتا ہے آسمان اور زمین کے بیچ میں (تاج العلماء)

ان چیزوں کے ذیل جو صنعت باری کا مظاہرہ ہیں کشتیوں کا تذکرہ باعتبار ان کی روانی کے ہے جو قدرتی ہواؤں کے بل بوتے پر ہوا کرتی تھی، جن میں انسانی کارگزاری کا کوئی دخل نہ تھا[1]۔ یا ان عجائب کے لحاظ سے ہے جو خود دریا کی خلقت میں ودیعت ہیں جن کا مشاہدہ انسان کو ان کشتیوں اور جہازوں کے ذریعہ سے ہوا جن سے انسان دریاؤں کو طے کرتا ہے[2]۔
ایک خیال یہ ہے کہ اس سے انسان کا اقتدار دکھانا ہے کہ اس نے کس طرح دریاؤں کو مطیع بنا لیا ہے[3]۔ مگر آیت کا محل ورود اس کے مطابق نہیں ہے۔
آخر میں جو کہا گیا ہے کہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیں۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے کتاب کو کہا ہے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ''یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے'' یعنی نشانیاں تو وہ بجائے خود ہیں اور ہر ایک کے لئے ہیں مگر چوں کہ فائدہ ان سے وہی اٹھائیں گے جو سمجھ سے کام لیں اس لئے ان کو اس جماعت سے مخصوص بتایا گیا ہے۔
اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان دلائل پر نظر کرنا اور عقل سے کام لینا ہر بشر کا فطری فریضہ ہے جس کے ترک کی صورت میں وہ کسی طرح بھی معذور اور قابل معافی نہیں ہے[4]۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾

''اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا اس کے بہت سے ہمسر قرار دیتے ہیں اور ان سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں مگر جو صاحب ایمان ہیں وہ اللہ کی محبت کہیں بڑھ کر رکھتے ہیں اور کاش[5] یہ ظالم اس موقع پر کہ جب عذاب کو دیکھ رہے ہوں گے پیش نظر رکھتے کہ تمام طاقت بس اللہ کے لئے ہے اور یہ کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔''
یہ آیت اگر تنزیل میں اس کے ماقبل سے مرتب ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سابقہ قدرت کی نشانیوں کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک متنفس

---

[1]۔ كيف سخرت لها الرياح المسماة بالتجارية (البلاغی)
[2]۔ القصد به الاستدلال بالبحر واحواله وتخصيص الفلك بالذكر لانه سبب الخوض فيه والاطلاع على عجائبه (بیضاوی)
[3]۔ بیان القرآن ص ۴۴۔
[4]۔ فی هٰذه الاٰية ايضا دليل على وجوب النظر والاستدلال وابطال التقليد (مجمع البیان)
[5]۔ لَوْ کا استعمال کلامِ عرب میں تمنا کے موقع پر بھی ہوتا ہے۔ اسی کے لحاظ سے ہم نے یہ ترجمہ کیا ہے مگر اکثر مفسرین اس کو یہاں شرطیہ کہتے ہیں۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوا کہ اگر یہ ظالم اُس موقع سے پہلے اسے پیش نظر رکھتے تو اس صورت میں کلام ناتمام رہتا ہے لہٰذا کہا جاتا ہے کہ لَوْ يَرى کا جواب محذوف ہے''۔ ''مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں وہ شرک اختیار کرنے کی جرأت نہ کرتے'' (بیان القرآن) تفسیر صافی میں ہے: قيل جواب لو محذوف اى لندموا اشد الندم میں پہلی صورت کو زیادہ مناسب خیال کرتا ہوں جیسا کہ اس کے بعد کی آیت وقال الذين اتبعوا لو انّ لنا كرّة میں تقریباً تمام ہی مفسرین نے لَوْ کو تمنی کے لیے مانا ہے۔

بھی اللہ کے سوا دوسرے کو ماننے والا نہ ہوتا۔ مگر ان تمام روشن دلائل کے باوجود ایسے آدمی موجود ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کو صفات الوہیت سے متصف سمجھتے اور ان کی عبادت کرتے یا ان کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ اس لئے اس میں صرف سونے چاندی پیتل اور پتھر وغیرہ کے بت داخل نہیں ہیں بلکہ وہ اقتدار باطل کے گوشت و پوست والے دیوتا بھی جو اللہ کے بجائے اپنے سامنے سر تسلیم خم کراتے ہوں اس کے تحت میں داخل ہیں [۱]۔

بہر حال یہ پرستاران باطل اپنے معبودوں کے کتنے گرویدہ ہوں پھر بھی چوں کہ اس کے پس پشت کوئی ضمیر کا احساس نہیں ہے اس لئے وہ اس گرویدگی و شیفتگی کے برابر نہیں ہو سکتی جو صاحبانِ ایمان کو اللہ کے ساتھ ہوتی ہے جس کا ثبوت ہر اس موقع پر ملتا رہا ہے جب سچے اللہ کے بندوں اور باطل پرستوں میں مقابلہ پڑ گیا ہے۔

اب اگر دعویداران اسلام میں قدموں کا تزلزل نظر آئے تو اس سے یہی سمجھنا چاہے کہ ان میں وہ ایمان کا جوہر مفقود یا انتہائی کمزور ہو گیا ہے۔

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾

”جب پیشوا لوگ ان سے جنھوں نے پیروی کی تھی اظہار بے تعلقی کرتے ہوں گے [۲] اور [۳] عذاب ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگا اور تمام رشتے ان سے قطع ہو چکے ہوں گے [۴]“۔

پرستارانِ باطل سے تبرا:

دنیا میں لوگ آنکھ بند کر کے کسی کے پیچھے چل کھڑے ہوتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ کوئی وقت پڑیگا تو یہ ہمارے لیڈر ہمارے کام آئیں گے مگر جب وقت پڑتا ہے اور سب سے بڑا وقت وہی ہوگا کہ جب عذاب الٰہی آنکھوں کے سامنے ہوگا تو پھر ان لیڈروں کو خود اپنی پڑی ہوگی یہ ان سے جنھوں سے ان کی پیروی کی تھی تبرا کر رہے ہوں گے کہ یہ ہمارے پیچھے بے کار آئے۔ ہم نے ان سے تھوڑی کہا تھا کہ یہ ہمیں پیشوا مانیں۔

یہاں جو تبّرا کا لفظ ہے یہ برات سے ہے جس کے معنی کسی شے یا شخص سے علیحدگی کے ہیں چنانچہ مرض سے چھٹکارے کو اسی لئے برء کہتے ہیں اور کسی شخص سے علیحدگی یا بیزاری کو بھی جو قرآن مجید میں کئی جگہ وارد ہے جیسے بَرَاءَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ (التوبة۔ ۱) أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ۙ وَرَسُولُهُ ۚ (التوبة ۳) إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ (ممتحنہ ۴) إِنَّنِي بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ (الزخرف ۲۶)

---

[۱]۔ وعلی ھٰذا المعنی ماروی عن جابر عن ابی جعفر علیہ السلام انہ قال ھم ائمۃ الظلمۃ واشیاعھم (مجمع البیان)

[۲]۔ پیچھا چھڑائیں گے (تاج العلماء)

[۳]۔ الواد للحال و قد مضمرۃ و قیل عطف علی تبرّآ (بیضاوی) ہم نے اسی دوسرے قول کو اختیار کیا ہے۔

[۴]۔ قطع اُمید ہو جائے گی سب علاقوں اور وسیلوں کی طرف سے (تاج العلماء)

چوں کہ دنیا میں کچھ عزیز داری کے رشتے ہیں کچھ دوستی اور محبت کے ہیں اور کچھ قول قرار اور عہد و پیمان کے ہیں کچھ مشترکہ مفادات کے ہیں [1] انہی کی بناء پر بہت سی پارٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ وہاں یہ سب رشتے قطع ہو چکے ہوں گے اور حقیقت آنکھوں کے سامنے ہوگی جس سے اب کوئی مفر نظر نہ آتا ہوگا۔

وَقَالَ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡا لَوۡ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنۡهُمۡ كَمَا تَبَرَّءُوۡا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيۡهِمُ اللّٰهُ اَعۡمَالَهُمۡ حَسَرٰتٍ عَلَيۡهِمۡ ؕ وَمَا هُمۡ بِخٰرِجِيۡنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

''اور وہ جنہوں نے پیروی کی تھی کہتے ہوں گے کہ کاش ایک دفعہ ہمیں واپسی کا موقع مل جاتا تو ہم ان سے یونہی الگ ہو جاتے جیسے یہ ہم سے الگ ہو گئے اس طرح اللہ ان کے کرتوتوں کو غم و غصہ کی صورت میں ان کے سامنے پیش کرتا ہوگا اور اب وہ آگ سے نکلنے نہ پائیں گے۔''

یعنی وہ دار دنیا کی طرف واپسی کی تمنا کرتے ہوں گے [2] جہاں وہ ان کے پیچھے چل کے آج عذاب کے مستحق ہوئے اور وہ ان کے کچھ کام نہ آئے اب وہ اپنی اس گزشتہ پیروی پر نادم و پشیمان ہوں گے مگر اس پشیمانی سے فائدہ کیا جب کہ اب حد تکلیف ختم اور توبہ کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔

کاش وہ آخرت سے پہلے دنیا ہی میں ان پیشواؤں کے متعلق نقد و بحث سے کام لیتے اور کم از کم ان لوگوں کی باتوں کا برا نہ مانتے جو ان کے افعال و اعمال کی قدح کرتے ہیں بلکہ انہیں غور سے سنتے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تو ممکن ہے اس دنیا ہی میں ان سے تبرا کر لیتے۔

بہرصورت ان آیات کی روشنی میں کم از کم اصل اصول تبرا کو تو مسلمانوں کے درمیان مسلم ہو ہی جانا چاہیے۔ شخصیتوں کی بحث بعد میں ہوتی رہے گی اور پھر جب کھلے دل سے اس پر نظر کی جائے گی تو کوئی وجہ نہیں کہ حق مشتبہ رہ جائے اور صراط مستقیم سے تعارف نہ ہو جائے۔

اس ارشاد سے کہ ''اس طرح اللہ ان کے کرتوتوں کو غم و غصہ کی صورت میں ان کے سامنے پیش کریگا'' بے شک یہ ظاہر ہے کہ کافر اور بد اعمال اشخاص کو روز قیامت پشیمانی ہوگی جیسا کہ دوسری آیتوں سے بھی ثابت ہے مثلاً لِيَجۡعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسۡرَةً فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ اور وَاِنَّهٗ لَحَسۡرَةٌ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ (الحاقۃ ۵۰) اور ممکن ہے اس دلوں کی حسرت ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہو:

نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ ۙ﴿۶﴾ الَّتِىۡ تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡـِٕدَةِ ؕ﴿۷﴾ (الھمزۃ) ''یعنی خدا کی جلائی ہوئی آگ جو دلوں پر بھڑکتی ہے۔'' مگر اس سے یہ سمجھنا غلط ہے کہ وہی حسرت ہی اس کے لئے موجب عذاب اور ایک آگ ہو جاتی ہے (بیان القرآن ص ۱۴۶) بایں معنی کہ اس کے علاوہ نار جہنم کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ غلط ہے اس لئے کہ بکثرت آیات میں اس آگ کے اوصاف شعلہ وری، آواز، چمک وغیرہ کا صاف صاف مفصل ذکر کیا گیا ہے۔ ایسی تفاصیل جن کے بعد مجاز کا کوئی احتمال باقی نہیں رہتا۔

اس کے علاوہ ایک جگہ کہا گیا ہے: كُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُهُمۡ بَدَّلۡنٰهُمۡ جُلُوۡدًا غَيۡرَهَا لِيَذُوۡقُوا (نساء ۵۶) اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آگ سے کافروں کے جسم جلتے ہیں صرف دل ہی نہیں جلتے۔

---

[1]۔ الاسباب الوصل التی کانت بینھم من الاتباع والاتفاق علی الدین والاغراض الداعیۃ الیٰ ذلک (بیضاوی) الوصل التی کانت بینھم فی الدنیا من الارحام والمودۃ (جلالین)

[2]۔ لو للتمنی ولذلک اجیب بالفاء (بیضاوی) یقولون لو کان لنا رجعۃ الی الدنیا (صافی)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٦٨﴾

"اے انسانو! اس زمین کی چیزوں میں سے کچھ حلال اور پاکیزہ ہے اسے کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔"

"کھاؤ" بظاہر حکم ہے مگر مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ "کھا سکتے ہو [1]"۔

غذا میں جائز اور ناجائز کی تفریق:

انسان اور حیوان میں ایک بڑا فرق ہی درحقیقت یہ ہے کہ حیوان کے افعال صرف ضرورت وطبیعت کے ماتحت ہوتے ہیں اس لئے جب اسے بھوک لگے گی تو پیٹ بھرنے سے مطلب ہوگا۔ جائز و ناجائز کی تفریق سے سروکار نہ ہوگا۔ اگر انسان بھی ایسا ہی ہو گیا تو اس میں اور حیوان میں فرق ہی کیا ہوا! اس کا امتیاز خالص یہ ہے کہ وہ ضرورت اور خواہش کی بناء پر فرائض کے احساس سے غافل نہ ہو جائے اور نہ صرف شخصی بلکہ اجتماعی مفادات اور خالق کے احکام پر بھی نظر رکھے چوں کہ یہ انسانی کردار کا ایک طرۂ امتیاز ہے اس لئے جب کہ احکام شرعیہ میں یا یہا الذین امنوا کہہ کر تخاطب کیا گیا ہے یہاں شکم پری میں جائز ناجائز کی تفریق کا حکم دینے میں یا ایہا الناس کہہ کر مخاطب بنایا ہے جس سے سمجھ میں آنا چاہیے کہ یہ تو تمہاری انسانیت کا ایک امتیازی تقاضا ہے لہٰذا تم کو صرف پیٹ بھرنے سے غرض نہیں رہنا چاہیے یہ تمہاری انسانیت کا ایک امتیازی تقاضا ہے، لہٰذا تم کو صرف پیٹ بھرنے سے غرض نہیں رہنا چاہیئے اور یہیں سے خط فاصل کھینچتا ہے اسلام اور سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے درمیان کہ ان دونوں میں غرض صرف تجوریاں بھرنے یا شکم پر کرنے سے ہوتی ہے اور اسلام ان دونوں باتوں کو حدود و قیود کا پابند بناتا ہے۔ تجوری بھرو مگر ناجائز اموال سے نہیں اور شکم بھی پر کرو مگر ایتام کا حق مار کر نہیں، غریبوں کا گلا کاٹ کر نہیں چوری کر کے اور ڈاکہ ڈال کر نہیں یہ آیت کا ایک رخ ہے۔

دوسرا رُخ اس کا ایک اور ہے۔ وہ یہ ہے کہ حلال وحرام مقرر کرنے کا حق اسی کو ہے جو تمام اشیاء کا خالق اور ان کے مصالح ومضرات پر حاوی ہے۔ انسان کو دل بخواہ کچھ چیزوں کو حرام قرار دے لینے کا حق نہیں ہے اور اپنے نفس کو بلاوجہ ایذا دینا خالق نفس کو پسند نہیں ہے جس طرح بعض مذاہب میں معیار روحانیت یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی بے مقصد اپنے کو تعب ومشقت میں مبتلا کرے اور جسمانی اذیتیں برداشت کرے۔ اسلام اس کا حامی نہیں ہے۔ مسلمانوں میں اکثر صوفیاء کی عبادتیں بھی اس کے تحت میں داخل ہوتی ہیں۔

قرآن نے ایک طرف حلال کی قید لگا دی ہے اور دوسری طرف وہ مجملات کے استعمال کی اجازت دیتے ہوئے متنبہ کرتا ہے کہ کچھ چیزوں کو بلاوجہ حرام سمجھ لینا بھی ایک طرح سے شیطان کی پیروی ہے [2]۔

---

[1]۔ الامر هنا للاباحة (البلاغی)

[2]۔ نزلت في قوم حرموا على انفسهم رفيع الاطعمة والملابس (بیضاوی)

بے شک اس آیت میں حلال کی قید نے اس اجازت کو مجمل بنا دیا ہے اور اب حلال و حرام کی معرفت سے کہ کونسی چیزیں جائز ہیں اور کونسی ناجائز ہیں دوسرے دلائل پر نظر کی ضرورت ہوگی۔ اس کا بیان کرنا اس آیت میں مقصود نہیں ہے مگر تلاش کے بعد جب کسی چیز کی حرمت ثابت نہ ہو تو یہ آیت ضرور بتلاتی ہے کہ پھر اس سے پرہیز کی ضرورت نہیں ہے [1]۔ اس طرح اخباری حضرات کا مسلک کہ وہ شک کی صورت میں حرمت کے پہلو کو ترجیح دیتے ہیں منشائے قرآن کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

”وہ تمہیں بس برائی اور بدکاری کا حکم دیتے ہیں اور یہ کہ تم اللہ پر ایسی باتیں منڈھو جن کا تمہیں علم نہیں ہے [2]۔“

شیطان اصطلاح قرآن میں نام اس کا ہے جو برائیوں کا متحرک ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی اصل فطرت کے مطابق نیکیوں کے خلاف راستہ اختیار نہیں کرتا۔ وہ اپنے ضمیر کے مقابلہ میں بیرونی محرکات سے مغلوب نہ ہو تو اس کا ضمیر اسے نیکی ہی کی طرف لے جائے مگر اپنے ضمیر کے فیصلہ کے خلاف وہ ایک خارجی محرک کے پیچھے ہو لیتا ہے جس سے اس کی شرافت انسانی برباد ہو جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن میں اسے انسان کا کھلا ہوا دشمن کہا گیا اور اب اس دشمن کی پہچان بتائی جا رہی ہے کہ جسے تم دیکھو کہ ان کاموں پر تمہیں آمادہ کرتا ہے [3] بس سمجھ لو کہ یہ وہی تمہارا دشمن ہے جو تمہیں گمراہ کرنا چاہ رہا ہے خواہ وہ کسی انسان کے روپ میں ہو۔

اس آیت کے اخیر میں وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ”اللہ کی طرف ان باتوں کی نسبت دینے کو کہتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں ہے“۔ یہ فقرہ اصول فقہ کی اس بحث میں دلیل بن سکتا ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ دلائل ظنّیہ میں اصل عدم حجیت ہے جب تک کہ حجیت پر دلیل خاص نہ قائم ہو۔ اس بحث کو جناب شیخ مرتضیٰ انصاریؒ نے رسائل میں تفصیل کے ساتھ درج فرمایا ہے۔ بے شک اگر کسی طریق ظنی کی حجیت پر دلیل قائم ہو جائے تو چوں کہ اس کا اعتبار منجانب اللہ معلوم ہو گیا لہٰذا اس پر عمل ما لا تعلمون میں داخل نہ ہوگا۔ اس کے بعد صاحب تفسیر صافی کا مدعا [4] جو اخباریت کی حمایت میں ہے ثابت نہیں ہو سکتا۔

ہو سکتا ہے کہ آیت کے دونوں ٹکڑے دو قسم کے لوگوں کا کردار پیش کرتے ہوں۔ ایک وہ جو خدا کی حرام کی ہوئی غذاؤں سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ ان کے لئے کہا گیا ہے کہ شیطان برائی اور بدکاری کا محرک ہوتا ہے اور اس طرح اس سے اشارہ ہوتا ہے کہ حرام غذاؤں کے استعمال سے سواء اور فحشآء پیدا ہوتے ہیں [5] یہ بھی شیطان کی کارستانیاں ہیں اور دوسرے وہ جو حلال غذا کو بھی حرام کیے دیتے ہیں انہیں کہا

---

[1]۔ هذه الاٰية دالة على اباحة الماكل الا مادل الدليل على حذره (مجمع البیان)

[2]۔ دل سے جوڑو تم اللہ پر بے جانے بوجھے بات کو (تاج العلماء)

[3]۔ معنی امره هو دعاه اليه (مجمع البیان)

[4]۔ فيه دلالة على المنع من اتباع الظن فی مسائل الدينية راسا (صافی)

[5]۔ جیسے مثلاً مردار اور خون کے کھانے سے صحت جسمانی پر بُرا اثر اور گندے اخلاق خنزیر کھانے سے بے حیائی۔ آج یہ امر مسلم ہے کہ ہر ایک اس قسم کی غذا اُس قسم کے صفات انسان کے اندر پیدا کرتی ہے مگر قرآن کریم نے آج تیرہ سو سال پیشتر اس حقیقت کی طرف توجہ دلا کر ایسی چیزوں سے روکا (بیان القرآن)

گیا ہے کہ یہ اللہ کے سر ایسی باتیں منڈھتے ہیں جن کا انہیں علم نہیں ہے یہ بھی شیطان کی وسیسہ کاری ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٧٠﴾

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے اتارا ہے اسی کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ داداؤں کو پایا، کیا چاہے ان کے باپ دادا ایسے ہوں جو کچھ سمجھتے نہ ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں۔''

آباؤاجداد کی غلط تقلید:

دین حق کے اصول عقلی ہیں اس لئے وہ تفکر و تدبر سے نہیں روکتا بلکہ ارباب عقل کو عقل سے کام لینے کی دعوت دیتا ہے مگر اس کے خلاف غلط راستوں کے پرستار اپنے لئے سب سے بڑی دلیل یہ رکھتے ہیں کہ ان کے آباؤاجداد ایک راستے پر چلے آرہے ہیں لہٰذا یہ بھی اسی راستے پر چلیں گے یہ اس کے خلاف کچھ سوچنے ہی کے روادار نہیں ہیں۔

قرآن مجید اس اندھی تقلید سے روک رہا ہے اور یہ کہتا ہے کہ انہیں آباؤاجداد کی شخصیتوں سے قطع نظر یہ دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ عقل کے مطابق تھا یا نہیں[1]۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اصول اصول ہے اس میں جماعتوں کی کوئی خصوصیت نہیں ہے اس لئے مسلمانوں کا بھی فریضہ اپنے دینی اصول میں یہی ہے کہ وہ ہر بات کو عقل و نقل کی کسوٹی پر لا کر پرکھیں اور پھر اس کے صحت و سقم کا اظہار کریں کسی بھی آواز پر بلا دلیل یہ شور مچانا کہ وہ دیرینہ مسلمات کے خلاف ہے قرآن تعلیمات کی روح کے مطابق نہیں ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٧١﴾

''اور جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو چیخ پکار مچاتا ہوا یسی جس سے وہ خود بھی سوا چیخ پکار کے اور کچھ سنتا سمجھتا نہ ہو۔ بہرے، گونگے، اندھے ہیں کہ کچھ عقل سے کام ہی نہیں لیتے۔''

مطلب یہ ہے کہ کفار جو بکواس کرتے ہیں اس کے خود بھی ان کے ذہن میں کوئی معنیٰ نہیں ہیں جیسے کوئی بے معنی چیخ پکار کر رہا ہو جس سے

---

[1]۔ الواجب اتباع الدلیل دون اتباع ھؤلآء (مجمع البیان)

خود بھی کچھ سمجھتا نہ ہو کہ کیا کہہ رہا ہے۔اس طرح ینعق اور لا یسمع دونوں کی ضمیریں الذی کی طرف پھرتی ہیں [1]۔

دوسرے مفسرین نے لا یسمع کی ضمیر اسم موصول کلمہ ما کی طرف راجع کی ہے۔اس طرح ترجمہ یہ ہوتا ہے "جنھوں نے کفر اختیار کیا ان کی دہائی ویسی ہے جیسے کوئی ایسے کو صدا دے جو سوا چیخ پکار کے کچھ محسوس نہ کرتا ہو"۔مگر اس صورت میں دشواری یہ محسوس ہوتی ہے کہ کفار تو بتوں کو صدا دیتے ہیں۔وہ ایسی چیز ہیں کہ چیخ پکار بھی محسوس نہیں کرتے لہٰذا اس دشواری کے دفعیہ کے لئے یہ سوچا جاتا ہے کہ یہ تشبیہ مفرد نہیں ہے۔تشبیہ مفرد میں ایک شے کی تشبیہ دوسرے شے سے ہوتی ہے لہٰذا اگر تشبیہ مفرد ہو تو کافروں کی تشبیہ قرار پائے گی اس پکارنے والے کے ساتھ۔اس صورت میں دشواری پیدا ہوگی لیکن اگر ہم کہیں کہ تشبیہہ مرکب ہے تو تشبیہ مرکب میں منظر کی تشبیہ کسی منظر کے ساتھ ہوتی ہے۔یہاں کافروں کو جو ہدایت کی غرض سے پکارا جارہا ہے اس کی تشبیہ ہے ان حیوانوں کے صدا دینے والے سے مطلب یہ ہے کہ کفار کو جو وعظ ونصیحت کیا جاتا ہے اور ان کی ہدایت کی کوشش کی جاتی ہے وہ ایسی ہی لا حاصل ثابت ہوتی ہے جیسے کوئی جانوروں کو صدا دے جو بس ایک پکار کی آواز تو محسوس کرتے ہیں مگر الفاظ کے معنی نہیں سمجھتے وہی حالت ان کفار کی ہے۔اس طرح مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مرکب قرار پاتے ہیں مگر اختصار کے لحاظ سے قرآن میں مشبہ کی طرف پکارنے کا ذکر نہیں ہے،اس لئے کہ وہ مشبہ بہ کے پکارنے کے ذکر سے خود سمجھ میں آجاتا ہے۔بعض لوگوں نے اس مطلب کو یوں بنایا ہے کہ داعی کے لفظ کو محذوف قرار دیا ہے [2]۔اس طرح کے اختصار کی نظیریں قرآن مجید میں اور بھی ہیں جیسے پہلے پارے میں:

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَاءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ۔

جس کی تفسیر پہلے پارے میں ہو چکی ہے۔

بے شک یہ صورت تکلف سے خالی نہیں ہے اور اسی لئے کہ اس کی توجیہ وتوضیح میں اقوال کی تعداد پانچ تک پہنچ گئی ہے [3]۔مجھے پہلی صورت زیادہ سلجھی ہوئی معلوم ہوتی ہے اس لئے میں نے اس کو اختیار کیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

"اے ایمان لانے والو! پاک ستھری چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں کھاؤ اور اللہ کا شکر کرو تم اسی کی پرستش کرتے ہو۔"

یہ "کھاؤ"،مثل صورۂ حکم اور معنیً اجازت ہے یعنی لذائذ دنیا کو جو حلال ہوں ترک کرنا تمہیں لازم نہیں ہے ان کو شوق سے استعمال کرو

---

[1]۔ مثل الذين كفروا فى اقوالهم هذه التى لا يتفكرون فى فساد معانيها كمثل الاصم الذى ينعق كنعاق الرّاعى فى غنمه بما لا يسمع ولا يميز من مد الليل نعاقه معنى معقولا (البلاغی)

[2]۔ على حذف المضاف تقديره مثل داعى الذين كفروا كمثل الذى ينعق (بیضاوی)

[3]۔ ملاحظہ ہو مجمع البیان علامہ طبرسیؒ۔

اور یہ اللہ کی ایک نعمت ہے جس کا تمہیں شکرگزار ہونا چاہیے۔

اِنۡ كُنۡتُمۡ اِيَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ میں بعض نے ان کو اذا کے معنی میں لیا ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا اللہ کا شکر کرو جب کہ تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔" یہی صورت اور دوسرے ایسے ہی مقامات پر بھی اختیار کی گئی ہے جیسے فَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ اس کا ترجمہ وہ یوں کرتے ہیں: اللہ سے ڈرو جب کہ تم ان پر ایمان رکھتے ہو'۔ حالانکہ ان کی شرطیہ لینے کی صورت میں معنی یہ ہوں گے: "اللہ سے ڈرو اگر تم اس پر ایمان رکھتے ہو۔"

میرے خیال میں اُن کا اِن کے معنی میں تصرف کرنا اس تصور پر مبنی ہے کہ خطاب تو مسلمانوں سے ہے لہٰذا یمان وہ لائے ہوئے ہیں اور اسی کی عبادت اختیار کر چکے ہیں تو "اگر" کہنے کے کیا معنی؟ مگر یہ تصور درست نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ خطاب تو تمام مسلمانوں کی جماعت سے ہے۔ یہ سمجھنا کہاں درست ہے کہ ان میں سب حقیقی طور پر ایمان کے جوہر کے حامل اور وا قع اس کی عبادت پر عامل ہو ہی گئے ہیں۔

آخر اسی قرآن میں یہ بھی تو موجود ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ (النساء ۱۳۶) اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر۔' اگر "ایمان والو" کہنے سے ان کے ایمان کا ثبوت لازم ہو تو پھر ایمان کے مطالبہ کا مفہوم ہی کیا ہو سکتا ہے؟ اسی طرح وہاں تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہا گیا ہے کہ تم زبان سے تو بہرحال ایمان کا اقرار کر چکے ہو لیکن اگر اس اقرار میں واقعیت ہے تو پھر تقویٰ بھی اختیار کرو اور اسی طرح یہاں کہا جا رہا ہے کہ اگر واقعی اس کی عبادت پر تم عامل ہو تو اس کا شکر بھی ضرور ادا کرو۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ وَالدَّمَ وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيۡرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضۡطُرَّ غَيۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۷۳﴾

"اس نے تم پر بس مردار، خون، سور کا گوشت اور وہ جسے اللہ کے سوا کسی اور کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو [۱]۔ حرام کیا ہے ہاں جو شخص ناچار ہو جائے، درآں حالانکہ نہ بغاوت کرنے والا ہو اور نہ آگے بڑھنے والا [۲]۔ تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان۔"

مردار، خون، سوٗر کے گوشت اور غیر ذبیحہ کی حرمت:

اس آیت کے شروع میں جو انما کی لفظ ہے وہ انحصار ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے جس کا ترجمہ ہم نے "بس" کے لفظ کے ساتھ کیا ہے مگر یہ حصر حقیقی نہیں ہے یعنی یہ مقصود نہیں ہے کہ جتنی چیزیں شرع میں حرام ہیں ان سب کی جامع فہرست مرتب کر دی جائے بلکہ یہ حصر اضافی ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ مشرکین نے دل بخواہ کچھ چیزوں کو حرام کر رکھا تھا جیسے بحیرہ، سائبہ وغیرہ جن کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ یہ حصر ان ہی چیزوں کے مقابلہ میں ہے یعنی یہ جو تم نے خواہ مخواہ چیزیں حرام کر رکھی ہیں یہ خدا کی جانب سے حرام نہیں ہیں خدا نے جن چیزوں کو حرام

---

[۱]۔ الاحلال فی الذبیحۃ رفع الصوت بالتسمیۃ (مجمع البیان)

[۲]۔ خواہانِ گناہ نہ ہو اور زیادتی کرنے والا نہ ہو (تاج العلماء)

کیا ہے وہ تو یہ ہیں جن کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

اب یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ انہوں نے جو پابندیاں عائد کر رکھی تھیں ان کا دائرہ حیوانات اور وہ بھی بہائم کے اندر محدود تھا اس لئے یہاں بھی جو محرمات بتائے گئے ہیں وہ اسی دائرہ سے متعلق ہیں [1] لہٰذا اس جنس کے غیر میں کوئی شے حرام ہو جیسے شراب، اس کا اس آیت کے حصر سے کوئی تعارض سمجھنا ہرگز درست نہیں ہے۔ اسی طرح مچھلی اس دائرہ سے خارج ہے لہٰذا جو ذبح کا طریقہ دوسرے حیوانات میں ہے وہ بھی اس میں جاری نہیں اور اگر کچھ اس کے اقسام کی حرمت احادیث سے ثابت ہو تو وہ بھی اس آیت کے منافی نہیں ہے۔

یہاں جو چیزیں بیان ہوئی ہیں ان میں پہلے میتة ہے۔ یہ وہ مردہ حیوان ہے جو بطریق شرعی ذبح یا نحر نہ کیا گیا ہو، خواہ خود سے مرگیا ہو یا کسی اور طریقہ پر اس کی جان لی گئی ہو جس کے چند اقسام کو قرآن مجید میں دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے: **وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۣ وَمَا ذُبِحَ عَلَي النُّصُبِ** (المائدہ ۳)

اگر بعد میں **مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ** صراحت کے ساتھ نہ کہا گیا ہوتا تب بھی المیتة کے تحت میں اس کی حرمت ثابت ہو جاتی اس لئے کہ ذبح کے شرعی طریقہ میں نام الٰہی کا لیا جانا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو خواہ اس کے گلے پر چھری ہی پھیری جائے وہ میتة قرار پائے گا مگر اس قسم کو پھر آخر میں اس کی اہمیت کے لحاظ سے صراحۃً بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

الخنزیر کے ساتھ لحم کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ عموماً کھایا وہی جاتا ہے ورنہ حرام اس کے تمام اجزاء ہیں گوشت کی خصوصیت نہیں ہے۔ جیسا کہ بیان القرآن میں ہے: ان چار چیزوں میں سے اول الذکر تین چیزوں کی حرمت کا ذکر یہود کی شریعت میں بھی ہے۔ چنانچہ مردار کی حرمت (احبار ۱۷:۱۵) میں، خون کی حرمت (احبار ۷:۲۶) میں سور کی حرمت (احبار ۱۱:۷) میں ہے اور گو عیسائیوں نے سور کو حلال کر کے اسے اپنی محبوب ترین غذا بنا لیا ہے مگر حضرت مسیحؑ کے کلام میں اس کو پلیدی ہی قرار دیا گیا ہے جیسے "اپنے موتیوں کو سوروں کے آگے مت پھینکو" (متی ۷:۶) سوروں کے چرانے کا بھی برے پیرایہ میں ذکر ہے (لوقا ۱۵:۱۵)

پلید روحیں انسان سے نکل کر سوروں کے گلے میں داخل کی جاتی ہیں (متی ۱۸:۲۲) خود پطرس بھی سور کے ساتھ ان لوگوں کو مشابہت دیتا ہے جو بار بار گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں یعنی اس کو ناپاک قرار دیتا ہے (۲ پطرس ۲:۲۲)"

نجاست کفار کے مسئلہ پر ضمنی روشنی:

ان محرمات پر نظر ڈالی جائے تو تین چیزیں ان میں سے کی وہ ہو سکتی ہیں جن میں طبی حیثیت سے مضرتیں یا جراثیم ہوں یعنی غیر ذبیحہ اور خون اور سور کا گوشت چنانچہ اب ڈاکٹر لوگ بھی ان چیزوں کی مضرتوں کا احساس و اعتراف کرنے لگے ہیں مگر چوتھی چیز یعنی ما اھل بہ لغیر اللہ وہ حیوان جسے بغیر اللہ کا نام لئے ہوئے ذبح کیا گیا ہو اس میں طبعی اور طبی مفاد نہیں ہو سکتا کیوں کہ یہ ظاہر ہے کہ زبان پر نام الٰہی جاری کرنے اور نہ کرنے سے گوشت کی تاثیر میں مادی طور پر فرق نہیں ہوتا۔ جب کہ رگیں اسی طرح قطع ہوں۔ خون اسی طرح بہا۔ ماننا پڑے گا کہ اسے حرام قرار دینا صرف ذہن انسانی میں توحید کی اہمیت اور شرک سے تنفر قائم کرنے کے لئے ہے کہ وہ حیوان بھی جو اللہ کا نام لئے بغیر ذبح ہو یا غیر اللہ کی نیت

---

[1] ۔الحصر فی الآیة اضافی بالنسبة الی الما کول من الحیوان (البلاغی)

سے ذبح ہو حرام ہو جاتا ہے۔

اس سے ان لوگوں کی تسکین ہونا چاہیے جو نجاست کفار و مشرکین کے مسئلہ میں جو فرقہ امامیہ میں متفق علیہ ہے یہ کہہ کر اظہار استعجاب کرتے ہیں کہ پاخانہ، پیشاب وغیرہ جو نجس ہیں تو ٹھیک ہے کہ ان میں جراثیم ہو سکتے ہیں جن میں تحفظ حکم نجاست کے ساتھ کیا گیا ہے مگر ایک غیر مسلم جب کہ سامنے وہ پورے اہتمام کے ساتھ نہا دھو کر آیا ہو کس لئے نجس سمجھا جائے۔ انہیں اب محسوس ہونا چاہیے کہ یہ نجاست ویسی ہی ہے جیسی ما اھل بہ لغیر اللہ کی حرمت ونجاست نہ یہ جراثیم کی بناء پر ہے اور نہ جسمانی گندگی وکثافت کی وجہ سے ہے بلکہ صرف ذہن مسلم کو کفر وشرک سے دور کرنے کے لئے ہے، وہ حیوان جو ذاتاً حلال ہے صرف اصنام کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے حرام ہو گیا حالانکہ اس میں اس حیوان کا ارادی عمل شریک نہیں ہے تو وہ انسان جو ارادۃً حق سے دور رہتا ہے اور کفر وشرک اختیار کرتا ہے اگر محکوم نجاست ہو جائے تو اس میں تعجب یا انکار کو کونسا محل ہے۔

جب کہ ہمیں اس شریعت میں یہ نظیر بھی ایک ملتی ہے کہ مسلمان ہو مگر بدبختی سے زنا کر مرتکب ہو تو اس فعل حرام سے جنابت کی حالت میں اس کا پسینہ بھی نجس ہے یہ کیا ہے؟ فقط اس فعل حرام سے تنفر پیدا کرنا حالانکہ وہ شخص اصل اصول دین سے منحرف نہیں ہے تو اگر ایک گناہ کی وجہ سے جو بحد کفر نہیں ہے شرع نے جسمانی نجاست کا حکم نافذ کر دیا تو کفر وشرک کی بناء پر جو نجاست کا حکم ہے اسے جسمانی کے بجائے صرف روحانی ماننے کی کیا ضرورت ہے۔

حرمت کے حکم کے بعد مضطر کا استثناء کیا گیا ہے۔ یہ مضطر ضرر سے مشتق ہے اور اسی سے ضرورت کا لفظ بھی ہے۔ لفظی معنی یہ ہوئے کہ جسے ضرورت ہو مگر ہماری عرف عام میں ضرورت کا لفظ اتنی وسیع ہو گئی ہے کہ انسان کو بھوک لگی ہونا اور کسی اور غذا کا سر دست موجود نہ ہونا "ضرورت" کے احساس کے لئے کافی ہے مگر قرآن مجید کا منشا یہ نہیں ہے۔ اسی لئے ترجمہ میں ہم نے یہ نہیں لکھا ہے کہ جسے ضرورت ہو بلکہ "ناچار ہو جائے" لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کا انحصار اسی غذا میں ہو جائے [1] اور پھر ارشاد ہوا غیر باغ ولا عاد۔ اگر احادیث میں کوئی تفسیر اس کی وارد نہ ہوا اور صرف یہی الفاظ ہمارے سامنے ہوں تو اس کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ کراہت نفس کے ساتھ بہ مجبوری یہ عمل ہو۔ یہ شخص باغی یعنی خواہش منداس کا نہ ہو اور نہ وہ حد سے آگے بڑھے یعنی بس جتنے میں زندگی کی حفاظت ہو سکے اس پر اکتفا کرے مگر بعض احادیث اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان دونوں صفتوں کا تعلق خود اس فعل کے ساتھ نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جو بحالت اضطرار اکل میتہ وغیرہ کر رہا ہے بجائے خود حکومت الٰہیہ کے باغیوں اور تعدی کرنے والوں میں نہ ہونا چاہیے چنانچہ کچھ احادیث میں ہے کہ باغی وہ ہے جو امام پر خروج کرے اور عادی وہ ہے جو رہزنی کرتا ہو اور بعض احادیث میں یہ ہے کہ باغی وہ ہے جو تفریحاً شکار کھیلتا ہو اور عادی وہ ہے جو چور ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ وہ ہیں جو مر جائیں مگر ان کے لئے اکل میتہ وغیرہ جائز نہیں ہوگا [2]۔

اہل سنت کی بعض تفاسیر بھی اس سے متفق ہیں [3]۔

---

[1]۔ خاف علی نفسه من الجوع ولا یجد ما کولا غیرہ لیسد به الرمق (مجمع البیان)

[2]۔ اذن فکل من صدق علیه انه باغ او عاد لم یجز له ان یتناول من المیتته وان اضطر الیها اخذا باطلاق الکتاب المجید (البلاغی)

[3]۔ غیر باغ خارج علی المسلمین ولا عاد متعدّ علیهم بقطع الطریق (جلالین)

یہ غالباً اس بنا پر ہے کہ یہ استثناء تو ایک لطف و کرم اور خصوصی وعنایت ہے لہٰذا اس کے مستحق وہی لوگ ہیں جو باغی اور طاغی نہ ہوں۔
اس لئے خاتمہ پر کہا گیا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ''اللہ بڑا بخشنے والا ہے مہربان''۔ یہ بخشش گناہ کی نہیں ہے کیوں کہ وہ تو پہلے ہی کہہ دیا گیا کہ اس صورت میں گناہ نہیں ہے، بلکہ اس ''مفسدہ ذاتی'' کو جو ان اشیاء میں ہے، بحالت ضرورت نظر انداز کر کے اس اجازت کا دینا اس کی بخشش ہے جو اس کے رحمت و افضال یعنی حیات بشری کے مفاد کو ملحوظ رکھنے کا تقاضا ہے۔ اس لئے موقع اضطرار میں اس اجازت خالق سے فائدہ نہ اٹھانا بھی کفران نعمت ہے [1]۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾

''بلاشبہ جو چھپاتے ہیں کتاب الٰہی میں سے اسے جو اللہ نے اتارا ہے اور اس کے بدلہ میں تھوڑے سے دام وصول کرتے ہیں یہ لوگ اپنے پیٹوں میں کچھ نہیں بھرتے سوا آگ کے اور قیامت کے دن اللہ ان سے بات تک نہیں کرے گا اور نہ انہیں کبھی سراہے گا اور ان کے لئے ہے دردناک عذاب۔''

''تھوڑے سے دام'' کے متعلق پہلے پارے کی تفسیر میں آچکا ہے کہ آیات الٰہی کے چھپانے کی قیمت میں جو بڑے سے بڑا نفع بھی حاصل کیا جا سکتا ہے وہ اس مفاد کے مقابلہ میں جو ہاتھ سے جاتا ہے تھوڑا ہی ہوگا [2]۔ اس لئے یہ قَلِيْلًا کا لفظ ان کے خسارے کو دکھلانے کے لئے ہے نہ یہ کہ اگر بہت سا نفع لے کر وہ ایسا کریں تو موردالزام نہیں ہوں گے۔

''اللہ ان سے بات نہیں کرے گا۔'' یہ کنایہ ہے اس سے کہ وہ رحمت الٰہی اور توجہ ربانی سے بالکل محروم ہوں گے [3]۔

اس رحمت خدا سے دوری میں روز قیامت کا حوالہ دینا اس کی دلیل ہے کہ اس حال کے بعد کوئی مستقبل ہے جس میں یہ عذاب ہوگا، اس لئے مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ سے نتیجہ نکالنا کہ بس یہ مال حرام کا کھانا ہی خود آگ ہے اس کے آگے اور کوئی جہنم نہیں ہے منشائے قرآن کے مطابق نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ اس مال حرام کو آگ اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ اس کا نتیجہ آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہے [4]۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ

---

[1]۔ فی الفقیہ عن الصادق علیہ السلام من اضطرّ الی المیتتہ والدّم ولحم الخنزیر فلم یاکل شیئا من ذلک حتّی یموت فھو کافر (صافی)

[2]۔ مھما بلغ ذلک الثمن کان قلیلا بالنسبة لمکتمانھم ما انزل اللہ (البلاغی)

[3]۔ قیل ھو کنایة عن غضبہ تعالیٰ علیھم (صافی)

[4]۔ مایاکلون فی بطونھم الا النّار لانھا مالہ (جلالین) کانھم لم یاکلون الّا النار لان ذلک یؤدّیھم الی النّار (مجمع البیان)

عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾

''یہ وہ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی اور بخشش کے بدلے عذاب کو مول لیا تو کتنے وہ آگ کے برداشت کی تاب رکھنے والے ہیں''

''مول لینے'' کا محاورہ پہلے پارے میں آچکا ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (بقرہ ۱۶) وہاں اس کی تشریح ہو چکی ہے۔

آخر کا فقرہ: فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ قرآن مجید کے ایک خاص قسم کے بلیغ طنزیہ فقرات میں سے ہے۔صبر کے معنی ہیں قوت برداشت سے کام لینا اور صبر آدمی کی ممدوح صفت ہے مگر وہ جو ممدوح ہے بلند مقاصد اور رضائے پروردگار کی خاطر شدائد و مشکلات دنیا پر صبر ہے جو اولیائے الٰہی کا شعار ہے۔

یہ مشرکین لذائذ دنیا کے حاصل کرنے کی خاطر گمراہی اختیار کرتے ہیں۔ان سے حق پرستی کی پابندیاں برداشت نہیں ہوتیں۔حقیقت میں تو یہ انتہائی بے صبری ہے مگر قرآن ایک لطیف پیرایہ میں اس کے انجام کا اظہار کرتا ہے کہ جو واقعی صابرین ہیں ان کا صبر کیا ہے؟ وہ تو تھوڑے دن مصائب جھیل کر ابدی نعمتیں حاصل کریں گے۔قابل حیرت تو ان لوگوں کا صبر ہے جو عذاب الٰہی اور ابدی لعنت و رسوائی کے برداشت کی طاقت رکھتے ہیں جو کسی انسان میں ہرگز نہ ہونا چاہیے۔

ما اصبرھم کلمہ تو تعجب کا ہے مگر تعجب وغیرہ ایسے صفات سے خداوند عالم بری ہے۔یہ تعجب اس حقیقت کے اظہار کی ایک صورت ہے کہ آدمی کی اس چیز کے برداشت پر ہرگز تیار نہیں ہونا چاہیے جو اس کے شرف انسانی اور بلندی منزل فطری کے خلاف ہے۔دوسری طرح یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ الفاظ خداوند عالم کی طرف سے تعجب نہیں ہیں بلکہ اس صورت حال کی فی نفسہٖ قابل تعجب ہونے کا اظہار ہیں[۱]۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾

''یہ اس بناء پر ہے کہ اللہ نے کتاب حق کے ساتھ اتاری اور جنھوں نے کتاب کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کیں[۲] وہ بلا شبہ بڑی سخت تفرقہ اندازی میں ہیں۔''

یعنی کتاب تو آئی تھی ان کی شیرازہ بندی کے لئے مگر وہ خود اس سے برسر مخالفت ہو کر سخت تفرقہ و انتشار کا باعث بن گئے ہیں۔

تفرقہ اندازی کے وصف میں بعید کی لفظ کے معنی سمجھنے میں مترجمین کو دشواری پیش آئی ہے۔چنانچہ عیسائی مترجم پادری عماد الدین نے

---

[۱]۔ھو تعجب لمؤمنین من ارتکابھم موجباتھا من غیر مبالاۃ (جلالین) المراد فیہ الانکار و التقریع علیٰ اکتساب سبب الھلاک وتعجیب الغیر منہ (مجمع البیان)

[۲]۔حیث قال بعضھم شعر و بعضھم کھانۃ (جلالین)

تو یہ ترجمہ کردیا ہے کہ ''وہ زمانہ بعید کی ضد میں ہیں۔'' میرے نزدیک ''بعید'' کا لفظ عربی محاورہ میں شدت کے اظہار کے لئے آتا ہے [1]۔ اس کے لئے بعد زمانی یہ مکانی کے لحاظ کی ضرورت نہیں ہے۔

لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ ۙ وَالسَّآٮِٕلِيۡنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا ۚ وَالصّٰبِرِيۡنَ فِى الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ١٧٧

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی کا نمونہ تو وہ ہے جو ایمان لائے اللہ اور روز آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر اور اس کی محبت میں [2] مال صرف کرے رشتہ داروں، یتیموں، محتاج، پردیسی اور مانگنے والوں پر اور گلوخلاصی میں [3] اور نماز بجا لائے اور زکوۃ ادا کرے اور جو اپنا عہد پورا کرنے والے ہوں جب کوئی قول قرار کریں اور فقر و فاقہ بیماری اور ہنگامِ جنگ میں [4] ثابت قدم رہیں۔ یہ وہ ہوتے ہیں جو سچے ہوں اور یہ ہوتے ہیں پرہیزگار لوگ۔''

اس آیت کا تعلق پھر اسی تبدیلی قبلہ والے مضمون کے ساتھ ہے جس کا بیان اس پارے کے شروع کی آیتوں میں تھا۔

معیار نجات ایمان وعمل:

مطلب یہ ہے کہ اس سمتِ خاص [5] کی طرف رخ کو کوئی بنیادی اہمیت نہیں ہے جس پر نجات کا انحصار ہو۔ یہ تو ایک جماعتی شعار ہے جو

---

[1]۔ فی اختلاف شدید (مجمع) بعید امدہ (البلاغی)

[2]۔ یعنی رضائے الٰہی کی خاطر۔ اس صورت میں ضمیر راجع اللہ کی طرف ہے اور بعض مفسرین نے ضمیر مال کی طرف راجع قرار دی ہے: علی حبة للمال (صافی) اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ''مال صرف کرے باوجود اس کی محبت کے''۔

[3]۔ گردنیں چھڑانے میں (عماد الدین)

[4]۔ الباسآء شدة الفقر و والضرآء المرض و حین الباس وقت شدّة القتال فی سبیل اللہ (جلالین)

[5]۔ المشرق والمغرب ای نحوھما علیٰ سبیل المثال (البلاغی)

شارع کی طرف سے علامت کے طور پر مقرر کر دیا گیا ہے، کسی مسلمان کو بس اس پر اکتفا کر کے نازاں نہ ہو جانا چاہیے کہ ہم کعبہ کی طرف رخ کرتے ہیں تو بس ہم میں کوئی بلندی آ گئی اصل بلندی کا تعلق ان باطنی وظاہری اوصاف کے ساتھ ہے جو اسے اللہ کا سچا بندہ ثابت کریں۔
ان میں سب سے پہلی چیزیں ایمان ہے جس سے دل ودماغ کی دنیا معمور ہوتی ہے اور پھر افعال واعمال ہیں جن میں حقوق اللہ بھی ہیں اور حقوق الناس بھی۔ انسے تمدن ومعاشرت اور کردار واخلاق کی آراستگی ہوتی ہے جب یہ سب باتیں ہوں اس وقت انسان واقعی ایک نیکوکار شخص سمجھا جا سکتا ہے اور ایک سچا مسلمان اور پرہیزگار قرار پا سکتا ہے [۱]۔
قرآن مجید کا انداز بیان بڑے نفسیاتی نکات پر مشتمل ہوتا ہے۔ وہ اگر چہ ایک ایسی ہستی کا کلام ہے جو خود مزاج وطبیعت سے بری ہے مگر وہ مزاج بشر اور طبیعت انسانی کا خالق ہے اس لئے اس نے اپنے کلام میں اس مزاج وطبیعت کے مقتضیات کو اعلیٰ پیمانہ پر ملحوظ رکھا ہے۔
بہت سی باتیں جب ایک ہی انداز اور لہجہ میں کہی جائیں تو ظاہر ہے کہ ترتیب کلام میں بہرحال ان میں سے کچھ پہلے بیان ہوں گی اور کچھ بعد میں مگر فطری طور پر اور لازماً سننے والے کی توجہ شروع کی باتوں کو سنتے سنتے سلسلہ کے طویل ہونے کی بناء پر کم ہوتی جائے گی اور اب آخری باتوں کو روا روی میں سنے گا اس لئے قرآن نے ایسے موقعوں پر بہت سے عرب فصحاء وبلغاء کے دستور کے مطابق [۲] درمیان میں دو ایک منزلوں پر اسلوب کلام بدلا ہے۔ جس سے ذہن سامع کو ایک دھچکا لگتا اور اس کی توجہ تازہ ہو جاتی ہے۔ یہاں بے چارے نحویوں کو اپنے قواعد نحویہ کے چسپاں کرنے میں بڑی سرمغزی سے کام لینا پڑتا ہے مگر فطری گفتگو کے بلیغ انداز ان کے ساختہ و پرداختہ قواعد سے بہت جگہ بے نیاز ہوتے ہیں۔ اب یہ ان کا کام ہے کہ وہ اپنے قواعد کے مطابق بھی اس کے لئے کوئی اصول تلاش کر کے منطبق کرنے کی کوشش کریں چنانچہ یہاں یہی ہوا کہ ابتدائے کلام ہوئی ولکن البر من امن باللہ یہ من اسم موصول اور امن فعل ماضی۔ اب حروف عاطفہ کے ساتھ متعلقات ایمان کی فہرست آگے بڑھی۔ والیوم الاخر -والملائکۃ۔ والکتاب۔ والنبیین یہاں ایمان کے متعلقات ختم ہوئے اور اب امن کے مقابل کا دوسرا فعل آیا حرف عطف کے ساتھ: واتی المال علی حبہ ذوی القربی۔ اب فہرست چلی ان لوگوں کی جنہیں مال دیا جائے: والیتامی۔ والمساکین۔ وابن السبیل۔ والسآئلین۔ وفی الرقاب لیجئے: یہ دوسری فہرست بھی ختم ہوئی۔ اب پھر امن اور اتی المال دونوں پر معطوف تیسرا فعل آیا: واقام الصلوۃ اور پھر چوتھا واتی الزکوۃ۔ اب اس سیاق کا تقاضا کیا ہے، یہ کہ اس کے بعد بھی جو وصف ذکر ہو وہ بصیغہ ماضی آئے اور پھر واحد کے صیغے چلے آرہے ہیں: من امن اور اتی اور اقام۔ تو اس کے بعد بھی واحد کا صیغہ آئے مگر متعلم قرآنی محسوس کرتا ہے سننے والا اب اس سلسلہ کو سنتے سنتے تھک چکا ہے اس کی توجہ میں فرسودگی آ گئی ہے اس لئے جو صفت اس سلسلہ میں بیان کی جائے گی وہ اس کی واجبی اہمیت محسوس نہیں

---

[۱]۔ الیہ اشار النبی ﷺ بقولہ من عمل بہذہ الآیۃ فقد استکمل الایمان (صافی)

[۲]-منھبہم فی الصّفات والنّعوت اذا طالت ان یعترضوا بینہا بالمدح اوالذّم ومن ذٰلك قول الشاعر انشدہ انقرّاہ:

الی الملك القرم وابن الھمام ... ولیت الکلیۃ فی المردحم
وذا الرّای حین تغمّ الامور ... بذات الصّلیل وذات اللّجم

(مجمع البیان)

کرے گا۔ لہٰذا وہ سب جیسے ایک سانس میں کہہ چکنے کے بعد اب چپ ہوتا ہے اور خود بھی دم لینے لگتا ہے۔ اس کے بعد اب شروع کرتا تو ایک نئے انداز سے: **والمو فون بعهدهم** اب یہ جیسے کوئی نئی بات کہی جا رہی ہو۔ فعل اسم سے بدل گیا اور واحد کا صیغہ جمع سے تبدیل ہو گیا۔ سننے والے کے ذہن پر ایک تازیانہ پڑتا ہے اور وہ چونک کر متوجہ ہوتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ یہ وفائے عہد کردار انسانی کا ایک خاص پہلو ہے جو ان تمام باتوں پر ایمان اور ان تمام نمازوں زکوٰۃ اور خیر و خیرات کے بعد مستقل طور پر انسانی زندگی کا ایک جوہر ہے اور ابھی وہ اس پر غور ہی کر رہا ہے کہ اسلوب قرآنی پلٹا کھا کر ذہن پر دوسرا تازیانہ لگاتا ہے: **والصابرين فى الباسآء والضرآء و حين الباس** ابھی تو تھا **والموفون** رفع کے ساتھ جیسے مبتداء یا فاعل ہوتا ہے، کیوں کہ عربی میں واؤ اور نون کے ساتھ جمع ایسے ہی محل پر آتا ہے۔ اس کے بعد عام توقع کے مطابق کہا جانا چاہیے تھا والصابرون مگر وہاں تو جیسے **الموفون بعهدهم اذا عاهدوا** کہہ کے متکلم پھر چپ ہو گیا تھا اور پھر کسی خاص بات کہنے کے لئے دوبارہ اس نے کلام شروع کیا اور اب تو والصابرین نصب کے ساتھ جیسے مفعول ہوتا ہے جس کی علامت عربی میں جمع کی صورت میں اور نون ہوتی ہے۔ اب سننے والے کو اس انداز کے بدلنے سے محسوس ہونا چاہیے کہ جیسے وفا بعہد ایمان اور نماز و زکوۃ کا تتمہ نہیں بلکہ مستقل طور پر کردار انسانی کا اہم رخ تھا ویسے ہی یہ فقر و فاقہ سختی و مرض اور میدان جنگ میں صبر و برداشت کا جوہر حسن عمل کا ایک مستقل رخ ہے جسے قرآن کو خاص طور پر نمایاں کرنا ہے۔

نحویین نے اسے اپنے قواعد کے مطابق اس طرح بنایا ہے کہ یہ الصابرین منسوب بمدح ہے[1]۔ یعنی کیا کہنا ان صبر کرنے والوں کا! یوں ہی سہی اس میں کوئی حرج نہیں ہے مگر اصل نکتہ اس تبدیل اسلوب کا وہ ہے جس پر اپنی کوتاہ فہمی اور کثر مژر بیانی کی حد بھر ہم نے روشنی ڈالی ہے اور اپنے کام کے سمجھنے کے لئے ذہن میں روشنی پیدا کرنا بھی اسی کا کام ہے۔ **ولله الحمد والشّكر**۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِصَاصُ فِى الۡقَتۡلٰى ؕ اَلۡحُرُّ بِالۡحُـرِّ وَالۡعَبۡدُ بِالۡعَبۡدِ وَالۡاُنۡثٰى بِالۡاُنۡثٰى ؕ فَمَنۡ عُفِىَ لَهٗ مِنۡ اَخِيۡهِ شَىۡءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَاَدَآءٌ اِلَيۡهِ بِاِحۡسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخۡفِيۡفٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَرَحۡمَةٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۷۸﴾

”اے ایمان والو تم پر ان کے بارے میں جو مار ڈالے گئے ہوں لکھ دیا گیا ہے جان کے میں جان لینا' آزاد کے بدلے میں آزاد، غلام کے بدلے میں غلام اور عورت کے بدلے میں عورت۔ ہاں جس کے لئے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ چھوٹ ہو جائے تو پیچھا کیا جائے اچھے عنوان سے اور ادائی بھی ہو خوش معاملگی کے ساتھ۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک سہولت اور مہربانی ہے۔ اب اس کے بعد جو زیادتی کرے تو اس کے لئے

---

[1]۔ نُصب علی المدح (جلالین)

تکلیف دہ عذاب ہوگا۔"

حکم قصاص:

اسلامی قانون کی خصوصیت عدل واعتدال ہے۔نہ یہاں انتقام پسندی ہے ایسی کہ عفووکرم کی گنجایش نہ ہو، نہ عفو پروری ہے ایسی کہ مجرم کو جرم کی پاداش کا اندیشہ ہی نہ ہو۔

جیسے اس نے خود اپنے براہ راست گناہوں میں اپنے لئے ایسا نظام حکمت قرار دیا ہے جس سے بندگان خدا امید وبیم دونوں کیفیتوں کے درمیان رہیں ویسے ہی اس نے انسانوں کے باہمی جرائم میں قانون قصاص کی شکل میں شرعی اصول یہ نافذ کیا ہے کہ مقتول کے وارث کو قاتل سے انتقام لینے کا حق ہے مگر معاف کر دینے کی بھی گنجائش ہے۔

اس قانون کے نفاذ کو اس نے کُتِبَ کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ چوں کہ لکھنے کے بعد ایک نقش قائم ہوجاتا ہے ویسے ہی حکم جو لزومی طور پر نافذ کر دیا گیا اس نے ثابت وقرار حاصل کر لیا چنانچہ دوسرے متعدد مواقع پر یہ لفظ کبھی ایجاب والزام اور کبھی حکم تاکیدی کے معنی میں آیا ہے [۱] اور کہیں تقدیر الٰہی کے معنی میں کہ وہ بھر مقررہ فیصلہ ہے [۲]۔

یہاں قصاص کا جو حکم بیان ہورہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کو قتل کر دے تو اس کے عوض میں اس شخص کو قتل کر دیا جائے یعنی جان کے بدلے میں جان لی جائے۔

قانون قصاص نیا نہیں تھا بلکہ اس کے پہلے شریعت موسوی میں بھی موجود تھا اور وہاں تصریح کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ: **والجروح قصاص**، یعنی اگر جان سے نہیں مارا ہے زخم لگایا ہے تو اس کے بدلے میں بس زخم لگایا جائے گا۔شریعت اسلام میں یہی حکم باقی رہا۔اس کے بعد مولوی محمد علی کا لکھنا بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں قصاص کا حکم صرف قتل کی صورت میں ہے۔زخموں میں قصاص کا حکم نہیں۔صحابہ نے ضرورت زمانہ کے لحاظ سے کر لیا ہو تو جزاء سنۃ مثلھا کے تحت ہے (بیان القرآن جلد اصفحہ ۱۵۵)

قصاص کے مجمل حکم پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے اس لئے کہ انتقام کے معنی میں قصاص عرب میں بھی رائج تھا مگر ان کی ذہنیت یہ تھی کہ قاتل اور مقتول کی حیثیتوں کا لحاظ کر کے اس حکم کا اجراء کرتے تھے اور اس میں انہوں نے اونچ نیچ کی تفریق قرار دے رکھی تھی۔اگر اونچی ذات کا آدمی نیچی ذات والے کے ہاتھ سے قتل ہوجائے تو وہ کہتے تھے کہ اس شریف آدمی کے بدلہ میں اس غلام کے قتل کرنے سے معاوضہ نہیں ہوگا بلکہ اس کے عوض کسی ویسے ہی شریف آدمی کو قتل ہونا چاہیے تاکہ برابری ہوجائے اور اگر کوئی عورت کسی مرد کو قتل کر دے تو سمجھتے تھے کہ اس عورت کے قتل ہونے سے برابری نہیں ہوسکتی بلکہ کسی مرد کو قتل ہونا چاہیے۔

اسلام نے اس ذہنیت کو ختم کرنے کے لئے قصاص کا حکم دینے کے بعد تفصیل ضروری سمجھی کہ حکم قصاص میں یہ عدم مساوات غلط ہے۔

---

[۱]۔ایجاب والزام کی مثال: کتب علیکم الصیام (بقرہ آیت۔۱۵۴) کتب علیکم القتال (بقرہ آیت۔۲۱۷) اور حکمِ تاکیدی کی مثال کتب علیکم. الوصیة (بقرہ۔۱۵۱)

[۲]۔جیسے: وابتغوا ما کتب اللہ لکم (بقرہ۔۱۸۸)

کسی بے گناہ کو گناہ کار کے بجائے قتل کرنا درست نہیں ہے بلکہ جو قاتل ہو چاہے آزاد ہو اور چاہے غلام چاہے مرد ہو اور چاہے عورت اسی کو قتل ہونا چاہیے۔اس کے بجائے دوسرے کو قتل کرنا درست نہ ہوگا۔اسی لئے بعد میں اعتدال کے دوسرے رخ کو نمایاں کرنے کے لئے ارشاد ہوا کہ اگر اس کا بھائی یعنی وارث مقتول [۱] خود معاف کر دے تو جن شرائط پر وہ معافی دے ان شرائط کی پابندی ضروری ہوگی۔

یہ معافی کی گنجائش کا تذکرہ اس کی دلیل ہے کہ ابتدائے آیت میں جو کُتِبَ کہا گیا تھا کہ یہ فرض ہے وہ فرض ولزوم مقابل میں اس قاتل کو قتل کرنا بہرحال ضروری ہے۔نہیں ایسا ضروری نہیں ہے بلکہ ایسی صورتیں ہیں کہ اس قاتل کو لازماً قتل نہ کیا جائے اور دِیَت وغیرہ پر اکتفا کیا جائے۔چنانچہ مسلمان اگر ذمّی کو یا آزاد غلام کو قتل کردے تو جان کے بجائے معاوضہ مالی معیّنہ۔ہاں کسی دوسرے شخص کو قتل کرنا کسی طرح درست نہ ہوگا۔الحر بالحر و العبد بالعبد کے یہی معنی ہیں یہ نہیں کہ آزاد کا قاتل کوئی غلام ہو تو اب ڈھونڈ کر اس کے بدلے کسی آزاد کو ہی مارا جائے چاہے بے گناہ ہو اور غلام کا قاتل کوئی آزاد ہو تو کسی غلام کو، چاہے وہ بے گناہ ہو، قتل کر دیا جائے یہ ہرگز مقصود کلام نہیں ہے۔

وارث مقتول کے معاف کرنے کا ذکر ان الفاظ میں کرنا کہ فمن عفي له من اخيه شي "اگر اس بھائی کی طرف سے اس کے لئے کچھ چھوٹ ہو جائے،" یہ در پردہ اس وارث کو معاف کرنے کی ترغیب ہے کہ آخر یہ قاتل بھی تو مسلمان ہے تمہارا بھائی ہی ہے۔اگر معاف کر دو تو یہ تمہاری اسلامی اخوت کا تقاضا ہی ہوگا۔

"کچھ چھوٹ ہو جائے" اس کا مطلب یہ ہے کہ جان کے بدلے میں جان سے درگزر کر دینے پر راضی ہو جائے [۲]۔کیوں کہ بالکل معاف کرنا تو یہ ہے کہ دیت سے بھی دست بردار ہو جائے۔اس صورت میں کہا جا رہا ہے کہ "پیچھا کیا جائے اچھے عنوان سے" یعنی وارث دیت کا تقاضا جو کرے تو اس میں زیادہ سخت گیری نہ کرے اور ادائیگی بھی ہو حسن سلوک کے ساتھ یعنی قاتل کو لازم ہے کہ دیت ادا کرنے میں بلاوجہ تعویق نہ کرے [۳]۔آخر میں جو کہا ہے فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ "جو اس کے بعد قدم آگے بڑھائے" یہ دونوں سے متعلق ہے یعنی خون بہا پر راضی ہونے اور معاف کرنے کے بعد پھر اگر جذبہ انتقام کی تحریک سے اس وارث نے اسے قتل کر دیا تو اب یہ مستحق عذاب ہوگا [۴] اور یہ بھی کہ اس قاتل نے اگر اس شرط کو پورا نہ کیا جس کی بنا پر معافی دی گئی تھی تو اب وہ اس کی پاداش کا مستحق ہوگا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

"اور تمہارے لئے اس جان کے بدلے جان والے قانون میں زندگی ہے اے عقل والو! شاید تم بچتے رہو"۔

فلسفۂ قصاص:

ان الفاظ میں فلسفۂ قصاص پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس میں قاتل کی ایک جان جاتی تو ضرور ہے مگر اس قانون کی وجہ سے بہت سی جانیں

---

[۱]۔الذی ھو ولیّ الدم (صافی)

[۲]۔ای بعض العفو و شیئ منہ بان رضی منہ بالدیۃ (البلاغ)

[۳]۔اتباع بالمعروف ھی وصیۃ لولیّ و اداء الیہ باحسان وصیّۃ للجانی (صافی)

[۴]۔ظلم القاتل بان قتلہ بعد ذلك ای العفو (جلالین)

جو بغیر اس کے جانیں، محفوظ ہو جاتی ہیں لہٰذا اس ضرر کثیر کے دفعیہ کے لئے یہ قلیل ضرر ضرر نہیں ہے بلکہ نفع ہے۔

عرب میں اس محل پر ایک مقولہ رائج تھا کہ القتل انفی للقتل "قتل قتل کو نابود کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔" قرآن نے اس کے بجائے وہ الفاظ صرف کیے ہیں۔ جن کی رفعت کے ثابت کرنے میں اس مقولہ کے مقابلہ میں علمائے بلاغت نے دریا بہا دیئے ہیں[1]۔

مگر نمایاں پہلو یہی کیا کم ہے کہ ان کے مقولہ لفظ القتل اصل مقصد کا اظہار نہیں کرتا بلکہ تصور ہوتا ہے کہ وہ ابتدائی قتل کو بھی شامل ہے قرآن نے قصاص کے لفظ سے بتا دیا کہ یہ ابتدائی قتل کی تعریف نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس قتل کی جو پاداش قتل میں بطور سزا ہوتا ہے۔ اس طرح کسی غلط فہمی کا امکان نہیں ہے۔ پھر عرب جس طرح بدلہ لیتے تھے کہ ایک کے بدلے بہت سوں کی جانیں لیتے تھے وہ بھی ان کے مقولہ میں داخل تھا۔ یہاں جو قانون قصاص نافذ کیا گیا کہ النفس بالنفس یعنی مقتول کے عوض میں فقط اس کے قاتل کی جان لی جائے، اس سے ان تمام بے گناہوں کی زندگی ہو گئی جن کی عرب کے غلط نظام مکافات کی بدولت بلا وجہ جان جاتی تھی۔

"شاید تم بچتے رہو"، یہ "شاید" کا لفظ اس لئے ہے[2] کہ بچنا انسان کا فعل اختیاری ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اس کے بعد بھی جوش غضب میں عواقب پر غور کیے بغیر اس جرم کا ارتکاب کریں لیکن عام نتیجہ اس قانون کا یہ ضرور ہے کہ اب اس سے لوگ قتل ہونے سے محفوظ رہیں

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾

"تم پر لکھ دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی ایک کے سامنے موت آ کھڑی ہو[3] اگر وہ کچھ بھی مال چھوڑے جا رہا ہو تو وصیت کر جائے ماں باپ اور زیادہ قریبی رشتہ داروں کے لئے مناسب طور پر جو پرہیز گاروں کے ذمہ لازمی حق ہے۔"

حکم وصیّت:

حَضَرَ کے لفظی معنی تو یہ ہوئے کہ موت بالکل سامنے آ جائے مگر مقصود اس سے ان آثار کا ظاہر ہونا ہے جو قرب موت کی خبر دیتے ہیں[4]۔ اس کے ساتھ یہ شرط ہے کہ اگر وہ کچھ خیر چھوڑے، خیر کے لفظ کے ایک معنی کلام عرب میں مال و دولت کے ہوتے ہیں یہاں وہی مقصود ہے[5]۔

---

[1]۔ مثلاً: ما فی القرآن اکثر فائدۃ واوجز فی العبارۃ وابعد من التکلّف بتکرار الجملۃ واحسن تألیفا بالحروف المتلائمۃ (مجمع البیان)

[2]۔ لاجل انّ الاتّقاء والتقویٰ امر اختیاری للانسان لا الجاء فیہ قبل فیہ لعلّکم تتقون (البلاغی)

[3]۔ جب آ کھڑی ہو تم میں سے کسی کے سر پر موت (تاج العلماء)

[4]۔ ای قرب منکم بان ظہرت اماراتہ بالمرض ونحوہ (البلاغی) الموت ای اسبابہ (جلالین)

[5]۔ خیرا ای مالا (مجمع البیان وغیرہ)

بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مفہوم میں کثرت بھی مضمر ہے یعنی تھوڑا سا مال ہو تو وہ ترک خیرا کا مصداق نہیں ہے [۱] ۔
اس حکم وصیت کے لئے جو کُتِبَ کا لفظ آیا ہے وہ وہی ہے جو اس کے پہلے قصاص کے بارے میں صرف ہو چکا ہے اور اس کے بعد صیام کے بارے میں صرف ہوگا۔ وہ بلا شبہ ان دونوں جگہ وجود ولزوم کا اظہار کرتا ہے مگر وصیت میں وہی لفظ صرف کیے جانے کے باوجود اسے بلا تفریق فرقہ مسلمان واجب نہیں سمجھتے [۲] ۔

ہم آج جب تقریبا چودہ سو برس کے بعد سوچنے بیٹھتے ہیں تو بہت سے آزاد منش افراد قرآن کی ہر آیت سے اس طرح معنی نکالنا چاہتے ہیں جیسے وہ آج ہی ہم پر نازل ہوئی ہے مگر ہم اسے غلط طریقہ سمجھتے ہیں ہمیں تو اپنی 'منزل شناسی'' کے لئے اس درمیان کے چودہ سو برس کے پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ڈیڑھ ہزار برس کے قریب کی مدت میں اور بالخصوص ابتدائی دور کے لوگوں میں عمل بالقرآن کے ذوق کی ہماری یہ نسبت کمی نہ تھی اور فہم قرآن کے ذرائع قرب عہد کی وجہ سے ان کے لئے ہم سے زیادہ تھے۔ پھر وہ سب اگر کسی مفہوم کے خلاف متفق ہیں جب کہ لغت کا تقاضا اس مفہوم کا تھا اور وہ لغت سے بھی زیادہ نہیں، تو کم از کم اتنے ہی تو واقف ضرور تھے۔ پھر بھی انہوں نے اس آیت قرآن کا مفہوم اس لغت کے موافق نہیں سمجھا تو اس سے ہمیں ضرور سمجھنا چاہیے کہ انہیں مرکز تخاطب قرآن یعنی رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے اس لفظ کی تشریح اس مقتضائے لغت کے خلاف معلوم ہو چکی تھی اور اسی بناء پر اب اس آیت کی رو سے وصیت کے وجوب کا تصور غلط ہے۔

ہاں کچھ مفسرین اس کے قائل ہیں کہ یہ آیت ابتدائے اسلام کے لئے تھی اور احکام میراث آنے کے بعد منسوخ ہو گئی لیکن مجھے یہ خیال بھی درست معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ اگر وہ منسوخ ہو گئی ہوتی تو پھر وصیت کا وجود ہی شریعت میں نہ رہتا حالانکہ مشروعیت وصیت کی بلا شبہ ثابت اور اس کا استحباب مسلّم ہے۔اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ کتب کے اصل معنی صرف قانون کے نفاد کے ہیں۔اب یہ قانون لزومی ہے یا استحبابی یہ دونوں باتیں مسلمانوں کو ہر ہر جگہ رسالت مآب ﷺ کی تشریح سے معلوم ہوئی ہیں۔ جہاں حضرتؐ نے وجود کے ساتھ تشریح فرمائی وہاں اجماع امت وجوب پر ہو گیا اور جہاں استحبابی کے ساتھ تشریح فرمائی وہاں اجماع استحباب پر ہو گیا اور یہ خود حسبنا کتاب اللہ کے مقولہ کے خلاف ایک واقعاتی ثبوت ہے۔ اگر صرف قرآن پر دار و مدار کبھی بھی رہا ہوتا تو قصاص، وصیت اور صیام سب کا حکم متحد ہوتا جب کہ قرآن میں سب کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوا ہے لیکن جب کہ ایسا نہیں ہے اور بالاتفاق نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ وہ وجوب از روئے قرآن ثابت ہوا ہے اور نہ یہ استحبابی۔ دونوں باتیں قرآن کے علاوہ اس ماخذ سے ثابت ہوئی ہیں جو قرآن کے ساتھ ساتھ اسی مقصد کے لئے بھیجا گیا تھا۔

وصیت کے ساتھ جو **بالمعروف** کی قید ہے یعنی مناسب طور پر اس کے لئے علیحدہ سے یہ معلوم ہونے کی ضرورت ہے کہ وہ مناسب حد کیا ہے؟ بعید نہیں ہے اس سے اشارہ اس حکم کی ضرورت کی طرف ہو جو احادیث سے ثابت ہے کہ ثابت مال میں وصیت ہو تو بلا رضائے ورثہ نافذ ہوگی لیکن اس سے زیادہ میں اجازت ورثہ پر انحصار رہے گا [۳] اور ہو سکتا ہے اسے ہم عرف عام پر چھوڑیں کہ عقل عمومی اس وصیت کو ظالمانہ قرار نہ

---

[۱] ۔خیرا ای مالا کثیرا (صافی)

[۲] ۔الاجماع علیٰ انّ الوصیۃ لیست بفرض (مجمع البیان)

[۳] ۔المعروف بالعدل بان لا یزید علی الثلث (جلالین)

دیتی ہو[1]۔

فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ؕ﴿۱۸۱﴾

”تو جو شخص اسے سننے کے بعد پھر بھی اس میں ادل بدل کر دے تو اس کا گناہ انہی ادل بدل کرنے والوں پر ہوگا۔ یقیناً اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔“

”اس کو سننے کے بعد“ یعنی اسے وصیت کا علم ہو گیا ہو خواہ ذاتی اطلاع کے ساتھ یا ثبوت شرعی کی بناء پر تو پھر اگر اس نے ان امور خیر میں اس مال کو صرف نہ کیا تو گنہگار یہ ہوگا یعنی موصی کو اس فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے بعد اس پر بھی عمل ہوگا یا نہیں کیوں کہ یہ تو اپنے عمل کا ذمہ دار ہے اور وہ اس وصیت کے ساتھ اپنے فرض سے سبک دوش ہو جائے گا۔ اب کوئی مخالفت کرے گا تو اس کا گنہگار وہ ہوگا جو مخالفت کرتا ہے یہ اس کا ذمہ دار نہیں قرار پائے گا[2]۔

”سننے والا اور جاننے والا ہے“ چوں کہ موصی کا وصیت کرنا سننے کی چیز ہے اور وصی یا وارث کا اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا دیکھنے کی چیز ہے، اس لئے یہ دو الفاظ صرف کئے گئے ہیں یعنی جو وصیت ہو وہ اسے سننے والا ہے اور جو اس وصیت کے ساتھ سلوک ہو اس کا دیکھنے والا ہے[3]۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ؕ﴿۱۸۲﴾

”اب جو خطرہ محسوس کر کے کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے کج روی یا گناہ کا اور اس بناء پر ان کی میں سمجھوتہ کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔“

یہ تبدیل وصیت کی ممانعت سے استثناء کی شکل ہے[4]۔ مطلب یہ ہے کہ وصیت کی مخالفت حرام ہے لیکن اگر وصیت خلاف شرع ہو یا ورثہ کے ساتھ اس سے بہت زیادہ ظلم و زیادتی ہوتا ہو خواہ نا سمجھی سے یا ارادہ[5] تو پھر ایسی شکل اختیار کرنا چاہیے کہ موصی کا مقصد بھی کسی حد تک پورا

---

[1]۔ بالمعروف ای بالشئی الذی یعرف اهل میزانه جور فیه ولا حیف (مجمع البیان)

[2]۔ فان الموصی اذا لم یکن مقصر ابتأ خیر ما اوصٰی به خرج بالوصیة عن عهدته واثمه دینا کان او عینا وبقی الاثم کلّه علی المبدل (البلاغی)

[3]۔ سمیع لمّا قاله الموصی من العدل او الحیف علیهم. بما یفعله الموصی من التغیر واتبدل (مجمع البیان)

[4]۔ لمّا تقدم الوعید لمن بدّل الوصیة بیّن فی هٰذه الاٰیة ان ذلك یلزم من غیّر حقًّا بباطل فامّا من غیّر باطلا بحقّ فهو محسن (مجمع البیان)

[5]۔ الاثم ان یکون المیل عن الحق علیٰ وجه العمد والجنف ان یکون علیٰ وجهة الخطأ. روی ذلك عن ابی جعفر علیه السلام (مجمع)

ہو اور جو ظلم و زیادتی ورثہ پر ہو رہی ہو وہ بھی بر طرف ہو جائے۔
"بخشنے والا مہربان" کہنا کسی وقوع میں آچکنے والے گناہ کے مقابلہ میں نہیں ہے بلکہ شرعی احکام میں یہ ہر ایک کے حقوق کا لحاظ خود خالق کی رافت و رحمت کا نتیجہ ہے جو تمام احکام شریعت میں کارفرما ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿١٨٣﴾

"اے ایمان لانے والو! تم پر لکھ دیا گیا ہے روزہ رکھنا جس طرح لکھا گیا تھا ان پر جو تم سے پہلے تھے شاید تم پرہیز گار ہو جاؤ۔"

روزہ کا وجوب:

صیام کے لغوی معنی تو باز رہنے اور چپ رہنے کے ہیں مگر شریعت میں وہ ایک خاص عبادت کا نام ہو گیا ہے جسے ہم اپنی زبان میں "روزہ" کہتے ہیں اور جس کے شروط و قیود فقہ اسلام میں معین و منضبط ہیں اور یہ بھی اس کا ثبوت ہے کہ قرآن کو صرف لغت کی مدد سے حل کیا جا سکتا جب تک کہ صاحب شریعت کے بتائے ہوئے تشریحات کو سامنے نہ رکھا جائے۔
"جس طرح تم سے پہلے لکھا گیا تھا" یہ اصل روزہ کے حکم کی تمثیل ہے یعنی اس طرح کی عبادت امم سابقہ میں بھی رہی ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ قیود و شرائط وغیرہ پہلے بالکل یہی تھے جو اب مقرر کیے گئے ہیں [1]۔
بعض روایات میں ہے کہ ادوار سابقہ میں روزہ صرف انبیاء پر واجب تھا۔ امتوں پر نہیں اور یہ اللہ کا اس امت پر فضل ہے کہ اسے گزشتہ انبیاء کی سطح پر قرار دے کر ذمہ داری عائد کی گئی ہے [2]۔
"شاید تم پرہیز گار ہو جاؤ" یہ روزہ کا روحانی نفسیاتی فائدہ ہے یعنی اس طرح انسان کو خواہشات نفس کے مقابلہ کی مزاولت ہوتی ہے تو اس کی مجموعی زندگی پر اثر پڑتا ہے [3] اور اس کے افعال و حرکات میں وہ ضبط و نظام پیدا ہو جاتا ہے جو تقویٰ کا نتیجہ ہوتا ہے جسے خوف الٰہی اور فرض شناسی وغیرہ کے الفاظ سے ادا کر سکتے ہیں۔
چوں کہ روزہ اس صفت کے لئے مقتضی کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ساتھ شرائط کے حصول اور موانع کے فقدان کی ضرورت ہے اور اکثر روزہ داروں میں ایسا نہیں ہوتا جس سے نتیجہ مطلوبہ یعنی بطور کلی جو ہر تقویٰ کا حصول نہیں ہوتا اس لئے اس نتیجہ کو "شاید" کے لفظ سے بیان کیا ہے پھر

---

[1]۔ قد دلّت الاٰثار علیٰ انّہ مختلف بحسب الشرائع فی الحدود والوقت (البلاغی)
[2]۔ من قبلکم من الانبیاء دون الامم (صافی)
[3]۔ لانہ یکسر الشھوۃ التی ھی مبدؤھا (جلالین)

یہ بھی کہ یہ تقویٰ امر غیر ارادی تو ہے نہیں جو لازم الوقوع ہو بلکہ فعل اختیاری ہے لہٰذا وقوع اس کا خود ان افراد کے ارادہ سے وابستہ ہے [1]۔

اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِيۡضًا اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيۡنَ يُطِيۡقُوۡنَهٗ فِدۡيَةٌ طَعَامُ مِسۡكِيۡنٍ ؕ فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَيۡرًا فَهُوَ خَيۡرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۴﴾

”گنتی کے کچھ دن اب جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے ہی دن کسی اور زمانہ میں [2]، اور جو اسے مشکل سے رکھ سکتے ہوں [3] وہ فدیہ ادا کریں ایک محتاج کو خوراک۔ اب جو اپنی خوشی سے کچھ بھلائی کرتے تو وہ اس کے لئے خوب ہے اور روزہ رکھو تو اور بھی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم واقف ہو۔“

صاحبانِ اعذار کا بیان:

پہلے روزہ کے مطلق حکم کا بیان ہوا تھا۔ اب مجملاً بتایا جا رہا ہے کہ وہ سال کے ایک مخصوص وقت میں کچھ دن ہوا کرتے ہیں وہ وقت کون سا ہے؟ یہ پھر بھی ابھی نہیں بیان ہوا۔

اب اس خاص وقت میں اگر عذر درپیش ہو جائے یہ عذر دو طرح کا ہوتا ہے جس کے دو الگ الگ حکم ہیں:۔

ایک عذر بیماری جس میں روزہ مضر ہو [4] اور سفر۔ اس قسم کے عذر کی صورت میں روزہ کا اس زمانہ میں ترک لازم ہے [5]۔ پھر دوسرے زمانہ میں اس کی قضا کرے یعنی جتنے دن کے روزہ ترک ہوئے ہیں ان روزوں کو پھر رکھے، دوسری قسم یہ ہے کہ نہ بیمار نہ سفر میں ہو مگر کسی وجہ سے باآسانی روزہ نہیں رکھ سکتا یعنی روزہ میں اسے غیر معمولی مشقت و زحمت ہوتی ہے۔ اس کی صورتیں احادیث میں یہ بیان ہوئی ہیں کہ کبیر السن ایسا ہے کہ روزہ بہت شاق بن گیا ہے یا حاملہ یا بچہ کو دودھ پلانے والی عورت یا کوئی ایسا شخص جسے پیاس کا عارضہ ہے تو اس صورتوں میں اختیار ہے کہ وہ اس مشقت کو برداشت کرے اور روزہ رکھے اس صورت میں اجر و ثواب زیادہ ہوگا یا روزہ نہ رکھے اور فدیہ دے دے جسے بتایا گیا ہے کہ وہ کم از کم

---

[1]۔ بمعنی لتتقوا ابلام الغایۃ و ابدلت بلعلّ لکون التقویٰ اختیاریۃ (البلاغی)

[2]۔ اس پر وہی مقدار ہے اور دنوں میں سے (تاج العلماء)

[3]۔ الوسع دون الطاقۃ. فالذین یطیقون الصوم یعنی یکون صوم بقدر طاقتھم و یکون نون معہ علیٰ مشقۃ (صافی) یعنی جو بیمار رکھ سکتے ہوں لیکن مشقتِ شاقہ ہو مثل مستسقی وغیرہ کے تو ان پر فدیہ ہے (تاج العلماء) قال فی النھایۃ الطّوق اسم لمقدار ما یمکن ان یفعل بمشقۃ منہ (البلاغی)

[4]۔ مرض یضرّ بہ الصّوم و یعسّر کما یدلّ قولہ تعالیٰ ولا یرید بکم العسر (صافی)

[5]۔ ھٰذا نص فی وجوب الافطار علی المریض و المسافر کما ورد عن أئمتنا فی اخبار کثیرۃ (صافی)

ایک مسکین کے کھانے کی مقدار ہے اور اس کی تعیین شیعہ اور سنی دونوں کے یہاں ایک مد گیہوں کے ساتھ ہوئی ہے[1] اور اس سے زیادہ دیدے تو بہت اچھا ہے[2] اس صورت میں پھر قضا نہ ہوگی۔

یہ سیاق قرآنی سے بالکل ظاہر ہے کہ یہ حکم بھی ایک قسم کے صاحبانِ اعذار ہی کا ہے لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ بلاعذر بھی انسان روزہ نہ رکھے اور فدیہ دیدے تو یہ کافی ہوگا۔ یہ تصور منشائے الٰہی کے قطعاً خلاف ہے جسے قرآن بھی نہیں بتاتا اور احادیث رسول آئمہؑ اور اجماع امت بھی اسے بالکل باطل قرار دیتے ہیں۔

شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰی وَالۡفُرۡقَانِ ۚ فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡیَصُمۡهُ ؕ وَمَنۡ كَانَ مَرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیۡدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ ۫ وَلِتُكۡمِلُوا الۡعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۱۸۵﴾

"ماہ رمضان جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے، سراسر ہدایت تمام لوگوں کے لئے اور صحیح رہنمائی اور امتیاز حق و باطل کی کھلی ہوئی نشانیوں کا حامل تو جو شخص تم میں سے اس مہینہ کو پائے تو وہ اس میں روزہ رکھے اور جو بیمار یا مسافر ہو تو اتنے ہی دن کسی اور زمانہ میں۔ اللہ تو تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور تمہیں مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا اور یہ بھی کہ تم تعداد پوری کرو اور اس بات پر کہ اس نے تمہیں سچا راستہ دکھایا۔ تم اللہ کی عظمت کے تقاضے کو پورا کرو[3] اور شاید تم اس کے شکر گزار رہو۔"

ماہ رمضان کی خصوصیت:

یہ ایاما معدودات والے اجمال کی تفصیل ہے کہ وہ معینہ دن جن میں روزہ واجب ہے کون سے ہیں۔ وہ ماہِ رمضان ہے[4] اب اگر فی شہر رمضان کہا جاتا تو یہ مطلب نکل سکتا تھا کہ پورے ماہِ رمضان کے روزے واجب نہیں ہیں بلکہ ماہِ رمضان میں چند دن کے واجب ہیں جیسا کہ

---

[1]۔ طعام مسکین ای قدر ما یاکل فی یوم و هو مدّ من غالب قوت البلد(جلالین) و قدّر فی الروایات بمدّ من حنطة (البلاغی)

[2]۔ قیل معناه من اطتم اکثر من مسکین واحد. و قیل اطعم المسکین الواحد اکثر من قدر الکفایة و یجمع بین القولین قول ابن عباس زیادة الطعام (مجمع البیان)

[3]۔ خدا کی بڑائی کرو (عماد الدین)

[4]۔ ای الایّام المعدودات هی شهر رمضان (صافی)

بعض خود رائے اشخاص یہ نظریہ ظاہر کرتے ہیں کہ تین دن ماہِ رمضان میں روزہ رکھ لینا کافی ہے۔ مگر یہاں شھر رمضان بطور ظرفیت نہیں ہے بلکہ شھر رمضان بطور رفع مبتدائے محذوف کی خبر کے ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ۔۔۔ وہ کون ہے؟ وہی زمانہ جسے ایاما معدودات کے لفظوں نے ظاہر کیا تھا، وہ رمضان کا مہینہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پورا مہینہ ہے جس کے روزے واجب ہیں۔

اس میں قرآن نازل ہوا، حالانکہ پورا قرآن مجید رسولؐ پر تھوڑا تھوڑا کر کے تیس برس میں نازل ہوا ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی عالم بالا کی تنزیل ہے جس کی پوری نوعیت کا بیان نہیں ہوا ہے۔ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پورا لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل ہوا۔ یہ وہ تنزیل ہے جو ماہِ رمضان میں ہوئی ہے اور وہ بھی اس کی ایک رات میں جو شب قدر ہے جیسا کہ قرآن مجید کی دوسرے آیات میں پتہ دیا گیا ہے[1]۔

"تو جو شخص تم میں سے اس مہینے کو پائے" یعنی بحالت بلوغ و عقل بغیر سفر و مرض وغیرہ کسی عذر شرعی کے وہ پورا مہینہ اس پر سے گزرے تو وہ پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو بیمار وغیرہ ہو وہ دوسرے زمانہ میں رکھ لے جس کا پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔

اب اس میں دو جز ہوئے۔ ایک اس مہینے میں ترک صوم اور دوسرے پھر کسی اور زمانہ میں اس کی قضا کا حکم۔ ان دونوں کا سبب بتایا گیا ہے کہ بات یہ ہے کہ اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے مشکل نہیں۔' یہ تو پہلے جزء کا سبب ہوا اور یہ بھی منظور ہے کہ تم تعداد پوری کر لو یہ دوسرے حکم یعنی قضا کا سبب ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ "مقصود یہ بھی ہے کہ تم اللہ کی عظمت کو محسوس کرو کہ اس نے کیسے اچھے اصول تمہیں بتائے اور تم شکر گزار رہو۔" گذشتہ دونوں باتیں شکر گزاری کی متقاضی ہیں۔ یہ بھی کہ وہ ہمیں مشکل میں ڈالنے کا روادار نہیں ورنہ حکم دیتا کہ چاہے بیمار ہو اور چاہے مسافر ہو، بہرحال روزے رکھنا ہوں گے مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور پھر یہ بھی کہ اس نے ہمیں اس فیض سے پھر محروم نہیں کیا بلکہ ایک دوسرا موقع روزہ کی برکات سے مستفید ہونے کا دے دیا۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾

"اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو بلاشبہ میں نزدیک ہوں پکارنے والے کی صدا پر لبیک کہتا ہوں جب وہ مجھے پکارے تو انہیں لازم ہے کہ وہ میری آواز پر لبیک کہیں اور مجھ پر یقین رکھیں شاید وہ نیک راہ پر آجائیں۔"

دُعا اور اس کی قبولیت:

"نزدیک" ہونا جسمانی نہیں ہے بلکہ وہ نزدیکی اسی اعتبار سے ہے جس کی شرح کر دی گئی ہے کہ مجھ تک عرض داشت بھیجنے کے لئے کسی

---

[1] ۔من اللّوح المحفوظ الی السّماء الدّنیا فی لیلۃ القدر منہ (جلالین) وھو المروی عن ابن ابی عبداللہ (مجمع البیان)

نامہ و پیام اور دور دراز ذریعہ کی ضرورت نہیں جہاں پکارو وہاں سننے کے لئے موجود ہوں [1] ۔
یہ وسعت خود ہی لامکان ہونے کا ثبوت ہے فلیستجیبوا لی ''لہٰذا وہ میری آواز پر لبیک کہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کی دُعا کے سننے میں بعد مکانی حائل نہیں ہوسکتا مگر خود ان کا کردار ضرور حائل ہوسکتا ہے لہٰذا انہیں چاہیے کہ وہ اپنے اعمال کا خیال رکھیں اور قبولیت دعا کے حق دار بنیں [2] ۔ یہ فلیستجیبوا لی ان تمام سوالات کا جواب ہے جو عدم قبولیت دعا پر وارد کیے جاتے ہیں جن میں کبھی دبی زبانی سے خداوند عالم پر معاذ اللہ وعدہ خلافی کا الزام بھی لگا دیا جاتا ہے۔
ارشاد ہوتا ہے کہ میں نے جو انہیں اپنے قانون کی اطاعت کی دعوت دی ہے اسے وہ بھی تو لبیک کہیں [3] ۔ بغیر اس کے انہیں مجھ سے کسی خاص عنایت کی امید کرنا بے سود ہے۔
دوسری چیز قبولیت دعا میں یہ سد راہ ہوسکتی ہے کہ وہ دعا نظام حکمت اور خود اس شخص کے حقیقی مفاد کے خلاف ہو اس لئے قبول نہیں ہوتی۔
اس کے لئے ارشاد ہوا ہے ولیؤ منوا بی یعنی مجھ پر یقین کریں کہ میں ان کا بہی خواہ اور شفیق ہوں اور دعا کی قبولیت پر قادر بھی ہوں [4] لہٰذا بلا وجہ ان کی بات کو رد نہیں کرونگا''۔ شاید نیک راستے پر آجائیں۔ اس کی طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ باتوں کو نظرانداز کرنے سے اکثر آدمی گمراہی میں پڑ جاتا ہے اور خداوند عالم کی حکمت اور فیاضی وغیرہ پر اعتراضات کرنے لگتا ہے جو ہلاکت ابدی کا باعث ہوتے ہیں۔

اُحِلَّ لَكُمۡ لَيۡلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآٮِٕكُمۡ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ تَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ وَعَفَا عَنۡكُمۡ ۚ فَالۡـٰٔنَ بَاشِرُوۡهُنَّ وَابۡتَغُوۡا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمۡ ۚ وَكُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الۡخَيۡطُ الۡاَبۡيَضُ مِنَ الۡخَيۡطِ الۡاَسۡوَدِ مِنَ الۡفَجۡرِ ۚ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيۡلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوۡهُنَّ وَاَنۡتُمۡ عٰكِفُوۡنَ ۙ فِى الۡمَسٰجِدِ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَقۡرَبُوۡهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۷﴾

---

[1] ۔ قریب منهم بعلمی (جلالین)
[2] ۔ فلیستجیبوا الی دعائی بالطاعة (جلالین)
[3] ۔ کانّ هٰذه الجملة فی مقام الشرط ای ان ارادوا ان اجیب دعوتهم فلیستجیبولی (البلاغی) القمّی عنه قیل له انا ندعوا فلا یستجاب لنا قال لانکم لا توفون بعهده وانّ الله یقول اوفوا بعهدی اوف بعهدکم (صافی)
[4] ۔ عن ابی عبدالله علیه السلام انه قال فلیؤ منوا بی ای ولیتحققوا انّی قادر علیٰ اعطائهم ما سألو (مجمع البیان)

"تمہارے لئے جائز کیا گیا، روزہ کی رات میں اپنی عورتوں سے مباشرت کرنا، وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنی ذات کے ساتھ غداری کرتے رہے ہو تو اب اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں معاف کر دیا ہے۔ لہٰذا اب تم ان سے مباشرت کرو اور جو کچھ اللہ نے تمہاری تقدیر میں لکھا ہے اس کے طلبگار رہو اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح ہو کر سفید ڈورا کالے ڈورے سے الگ ہو کر تمہارے لئے نمایاں ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ کو پورا کرو اور جس حالت میں کہ تم مسجدوں میں اعتکاف کیے ہوئے ہو ان سے مباشرت نہ کرنا۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں۔ ان کے نزدیک نہ جاؤ۔ اس طرح اللہ صاف صاف اپنے احکام لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے کہ شاید وہ پرہیزگاری اختیار کریں۔"

بعض سابق احکام صوم کی منسوخی:

ابتدائے اسلام میں یہ حکم تھا کہ ماہِ مبارک رمضان میں راتوں کو بھی عورتوں سے مقاربت جائز نہ تھی۔ اکثر مسلمان چوری چھپے اس حکم کی مخالفت کرتے تھے۔ اس آیت میں خالق نے اس حکم کو منسوخ فرمایا، اس طرح کہ ان کے گزشتہ کردار پر سرزنش بھی فرمائی اور پھر آئندہ کے لئے معافی کا اعلان بھی کر دیا۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا حکم اس آیت میں یہ بتلایا ہے کہ افطار کے بعد صبح صادق تک کھانا پینا جائز ہے۔ اس کی حد بتائی گئی ہے: الی الیل یعنی "رات تک" ظاہر ہے کہ صرف آفتاب کا نظر سے اوجھل ہو جانا اطلاق لیل کے لئے کافی نہیں ہے جب تک ذرا سیاہی بھی افق پر نہ آجائے۔ اس سے فقہ جعفری کے اس حکم کی تائید ہوتی ہے کہ غروب سے جو حد افطار ہے آفتاب کا غروب حسی یعنی نظر سے چھپ جانا مراد نہیں ہے بلکہ افق سے غروب کرنا مراد ہے جس کا لازمی نتیجہ مشرق کی طرف والی سرخی کا زائل ہو جانا ہے [1]۔ قرآن مجید کے الفاظ اسی کا پتہ دیتے ہیں۔

تیسرا حکم یہ بتایا گیا ہے کہ حالت اعتکاف میں رات دن کسی وقت عورتوں سے مباشرت جائز نہیں ہے۔ آخر میں بتا دیا گیا ہے کہ یہ حدود الٰہیہ ہیں جن کی پابندی لازم ہے۔

الفاظ قرآن میں پہلے حکم میں صاف صراحت قبل والے حکم کے منسوخ کرنے کی ہے مگر دوسرے اور تیسرے حکم میں الفاظ سے اس کی صراحت نہیں نکلتی۔ روایت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی ابتدائے اسلام میں ایک حکم تھا کہ ماہِ رمضان المبارک میں جب آدمی سو جائے تو پھر کچھ کھانا پینا جائز نہیں ہوتا تھا۔ اس حکم کو بھی اس آیت میں منسوخ کیا گیا اس طرح کہ سفید ڈورا یعنی صبح صادق کی پو جو پھوٹتی ہے وہ کالی دھاری یعنی رات کی تاریکی سے ممتاز ہو کر سامنے آجائے اس وقت تک کھانا پینا جائز ہے [2]۔ مگر اس منسوخی کے ساتھ کوئی سرزنش نہیں ہے اس لئے کہ کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی تھی بلکہ ایک صحابی رسولؐ نے جن کا نام بعض روایت میں خوات بن جبیر ہے اور بعض میں مطعم بن جبیر جنگ خندق میں اتفاق سے درمیان میں سو جانے کی وجہ سے روزہ پر روزہ رکھ لیا اور پھر خندق کھودنے میں مصروف ہو گئے یہاں تک کہ غش آ گیا تو آیت نازل ہوئی اور وہ حکم

---

[1]۔ لا یخفی انہ عند وجود الحمرۃ المشرقیۃ لم یقبل الّیل (البلاغی)

[2]۔ مروی علی ابن ابرھیم بن ھاشم عن ابیہ رفعہ الیٰ ابی عبد اللہ علیہ السلام قال کان الاکل محرّ ما فی شھر رمضان بالّیل بعد النّوم و کان النکاح حراما (بالّیل و النھار) (مجمع البیان)

برطرف کیا گیا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دونوں حکم پہلے بطور امتحان تھے۔ اس لئے نتیجہ امتحان کے بعد دونوں برطرف ہوگئے مگر پہلے کا نتیجہ ناکامیابی کی شکل میں جس کے بعد ترحماً آسانی کردی گئی۔

مرد اور عورت کو ایک دوسرے کی پوشاک کہا گیا ہے، اس لحاظ سے بھی کہ ایک کو بغیر دوسرے کے فطرۃً چین نہیں آتا [1]۔ اور اس لئے بھی کہ لباس جس طرح جسم کو چھپا لیتا ہے اسی طرح ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بہت حد تک جنسی بے راہ روی سے محافظ ہے اور اسی لئے شوہر دار عورت یا صاحب زوجہ مرد زنا کرے تو اسے ''زنائے محصنہ'' کہتے ہیں کہ ایک قلعہ کے موجود ہوتے ہوئے اس نے اپنے کو محفوظ نہ رکھا۔

اجازت دیتے ہوئے ان الفاظ کا صرف کرنا کہ وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک، ایک طرح اس اجازت کی وجہ بیان کرنا ہے کہ اس حکم میں واقعی ایک مشقت تھی جسے زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رہنا چاہیے [2]۔

مباشرت کی اجازت دینے میں یہ الفاظ: ''جو کچھ اللہ نے تمہاری تقدیر میں لکھا ہے اس کے طلب گار رہو۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امر سے مقصود صرف لذت نفس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اولاد جو نظام بشری کے قیام کے لئے ضروری چیز ہے اور جس کا قدرت نے اس عمل کو ذریعہ قرار دیا ہے۔

تیسرا حکم جو اعتکاف کا ہے اس مناسبت سے بیان کردیا گیا ہے کہ روزہ جو رات کے وقت مباشرت کی اجازت ہے یہ عام روزوں میں ہے لیکن ایک روزے وہ ہوتے ہیں جن کے ساتھ اعتکاف ہوتا ہے۔

اعتکاف:

اعتکاف کے معنی ہیں نیت کے ساتھ تین دن کچھ خاص مساجد میں [3] قیام کرنا اس طرح کی شب و روز کسی وقت مسجد سے باہر نہ نکلے۔ اس میں ہر روزہ غروب آفتاب کے ساتھ ختم ہوجائے گا اور تمام مفطرات صبح صادق تک حلال رہیں گے مگر مباشرت رات کے وقت بھی حرام رہے گی [4]۔

وَلَا تَأۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ وَتُدۡلُوۡا بِهَاۤ اِلَى الۡحُكَّامِ لِتَاۡكُلُوۡا فَرِيۡقًا مِّنۡ اَمۡوَالِ النَّاسِ بِالۡاِثۡمِ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۸﴾

---

[1]۔ ای هن سکن لکم و انتم سکن لهنّ کما قال و جعلنا الّیل لباسا ای سکنا (مجمع البیان)

[2]۔ استیناف بیّن سبب الاحلال و هو قلّة الصبر عنهنّ و صعوبة اجتنابهن (صافی)

[3]۔ الاعتکاف لا یصحّ عندنا الا فی احد المساجد الاربعة (مجمع البیان)

[4]۔ فی الآیة دلالة علی تحریم المباشرة فی الاعتکاف لیلا و نهارا (مجمع)

"اور اپنے آپس کے مال غلط طور پر نہ کھاؤ[1] اور نہ انہیں حکام تک پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے کچھ اموال کو بطور گناہ خورد برد کر جاؤ' درآں حالانکہ تم واقف ہو۔"

ناحق مال کھانے اور رشوت ستانی کی ممانعت:

یہاں فقہ کے باب معاملات سے متعلق دو اصول بیان ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک سے بہ کثرت احکام شرعیہ کا فقہاء استنباط کرتے ہیں۔

پہلے یہ کہ اپنے آپس کے مال غلط طور پر نہ کھاؤ یعنی ایک دوسرے کے اموال میں[2] بلا جواز شرعی تصرف نہ کرو۔اس اکل مال بالباطل میں ہر قسم کا سرقہ، ظلم، غصب، مکر، قمار اور سود خواری کے تمام اقسام سب داخل ہیں۔

کلیہ یہ ہے کہ دوسرے کے اموال جب تک کسی ایسے اصول کے تحت جسے شریعت نے معتبر قرار دیا ہے نہ لئے جائیں ان کا لینا حرام ہے۔لاٹری وغیرہ اسی میں داخل ہے۔

دوسرے حکام کو رشوتیں دے کر[3] لوگوں کے اموال خورد برد کرنے کی ممانعت۔اس سے ظاہر ہے کہ علم باری میں اس امت کے اندر غلط حکومتیں قائم ہونے والی تھیں جن کے یہاں حق باطل ہوجائے اور باطل حق ہوجائے ورنہ حکومت اگر حق ہوتو اس سے یہ اندیشہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کے ذریعہ سے ایک کا مال دوسرے کا ناحق پہنچے گا[4]۔

"درآں حالانکہ تم خود واقف ہو' یعنی تمہارا ضمیر خود تمہارے اس فعل کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا اور تم محسوس کرتے ہو کہ یہ برا ہے[5]۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

"آپ سے نئے چاندوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔کہہ دیجئے کہ یہ لوگوں کے لئے اور حج کے واسطے وقت مقرر کرنے کا ذریعہ ہیں اور یہ اچھی بات نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آؤ بلکہ نیکی کا

---

[1]۔اور نہ کھاجاؤ تم آپس میں مل بانٹ کے ناحق (تاج العلماء)

[2]۔ لا کل بعضکم مال بعض (صافی)

[3]۔ تدلوا بھا ای ترسلو ھا رشوۃ (البلاغی)

[4]۔ فی الکافی والعیاشی عن الصادقؑ فی ھذہ الآیۃ ان اللہ عزّوجل قد علم انّ فی الاُمۃ حکّاما یجورون والقمی قال العالم قد علم اللہ انہ یکون حکام یحکمون بغیر الحق (صافی)

[5]۔ وانتم تعلمون ان ذٰلک الفریق من المال لیس بحق لکم وانتم مبطلون (مجمع البیان)

نمونہ وہ شخص ہے جو غلط کاری سے بچے اور تم گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا ور اللہ کے غضب سے بچو شاید کہ تم ہر طرح کی بہترین حاصل کرلو۔"

جو شخص حقیقت سے واقف نہ ہو اسے حیرت تو ضرور ہونا چاہیے کہ آخر اتنا بڑا چاند جو چودھویں نظر آتا ہے کیا ہو جاتا ہے جو گھٹ کے اتنا باریک نظر آتا ہے جسے ہلال کہتے ہیں اور پھر یہ بڑھتا کیوں کر ہے جو ماہ کامل کی شکل میں دکھائی دیتا ہے چنانچہ لوگ اسے بار بار پوچھنے رسولؐ کی خدمت میں آئے مگر اس کا جو فلسفہ ہے وہ بتانے پر بھی ان کی سمجھ میں نہ آتا لہٰذا وحی الٰہی نے پیغمبرؐ کی زبانی ان کے ذہن کو اس کے فوائد کی طرف متوجہ کیا جو فرائض و اعمال سے متعلق ہیں۔ ارشاد ہوا کہ اس سے لوگوں کے لئے اوقات مقرر ہوتے ہیں۔

چاند کا حساب نہ کہ سورج کا:

"لوگوں کے لیے" عام ہے اس میں انکی دنیوی ضروریات بھی داخل ہیں جیسے قرضوں کی ادائیگی وغیرہ اور دینی ضرورتیں جیسے بیوہ کی عدت ماہ رمضان کے روزے اور عید الفطر وغیرہ۔ حج بھی اس میں داخل تھا مگر اس کی اہمیت کی بناء پر خصوصیت کے ساتھ ذکر کر دیا۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رجحان کہ روزہ وغیرہ کو شمسی حساب سے مقرر کیا جائے قرآنی نص کے خلاف ہے۔

گھروں میں دروازوں سے داخل ہو:

"گھروں میں پشت کی طرف سے داخل نہ ہو۔ دروازوں سے داخل ہو"۔ یہ حکم یوں تو مکان کے اندر دروازہ سے داخل ہونے کو صاف بتاتا ہی ہے مگر صرف یہ مفہوم ہو تو اس کا جوڑ قبل والی بات سے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بے شک یہ ارتباط اس تفسیر سے دل نشین طور پر سمجھ میں آ جاتا ہے کہ تمہیں کوئی دینی سوال کرنا ہو تو جو اس کا مرکز ہے وہاں ضرور آؤ۔ ادھر بھٹکتے نہ پھرو غلط راستے اختیار نہ کرو اور ہر کام کو اس راہ سے انجام دو جس طریقہ سے اللہ نے حکم دیا ہے[1]۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متواتر حدیث: انا مدينة العلم وعلی بابها فمن اراد العلم فليات الباب (یعنی "میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے تو جو علم حاصل کرنا چاہیے اسے دروازہ پر آنا چاہیے" اسی ارشاد خداوندی کی طرف ناظر ہے[2]۔

دوسرے ایمہ معصومین علیہم السلام کے لئے بھی اسی معنی سے ابواب اللہ کا لفظ وارد ہوئی ہے[3]۔

اتقاء کے معنی بچنے کے ہیں جب اس کی نسبت اللہ کی طرف دی جائے جیسے واتقوا الله میں ہے تو اس سے مقصود عمل میں اس کی مخالفت سے اور نتیجۃً اس کے غضب سے بچنا ہوتا ہے[4]۔

یہی اس سے بچنے کا احساس مستقل تقویٰ کہلاتا ہے جس کا "پرہیز گاری" سے بھی ترجمہ ہوتا ہے اور اسی کے مدارج و مراتب کے ساتھ

---

[1]۔ عن الباقر علیہ السلام فی قوله عزوجل واتوا البيوت من ابوابها قال ان يوتى الامر من وجهه ای الامور كان (البلاغی)

[2]۔ پس شہر علم میں بھی کہ جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں گزر ممکن نہیں بغیر اس کے دروازہ کے جو حضرت امیرؑ ہیں (تاج العلماء)

[3]۔ قال ابو جعفر علیہ السلام آل محمد ابواب الله ووسائله والدعاة الی الجنة (مجمع البیان)

[4]۔ معناه واتقوا ما نهاكم الله عنه وزهدكم فيه (مجمع)

اسلام میں انسانی فضیلت کے مراتب قائم ہوتے ہیں (اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ۔

وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ ﴿۱۹۰﴾

''اور اللہ کی رہ میں لڑو ان سے جو خود تم سے لڑتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو یقیناً اللہ تعالیٰ تجاوز کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا [1]''

جنگ اور اس کے حدود و قیود:

اس آیت میں صاف اسلام کا اصول جو تشدد اور عدم تشدد کے بارے میں ہے ظاہر ہوجا تا ہے وہ جارحانہ جنگ کا حامی نہیں ہے۔ اس لئے قید لگا دی ہے کہ ''جو خود تم سے جنگ کرتے ہیں''۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ابتدائے جنگ دوسروں کی طرف سے ہے مگر اس ابتدا ہو جانے کے بعد وہ مطلق ''عدم تشدد'' کا بھی قائل نہیں ہے۔ اس لئے اس صورت میں قاتلوا کہہ کر اجازت ہی نہیں بلکہ حکم دیتا ہے کہ اُن تم جنگ کرو اور واضح رہے کہ یہاں جہاد کا حکم قاتلوا کے لفظ سے ہے جو صاف اسلحہ جنگ سے مقابلہ کو ظاہر کرتا ہے جاھدوا نہیں ہے جسے جدو جہد سے لے کر بعض لوگ مقاومت مجہول وغیرہ پر بھی منطبق کر لیتے ہیں۔

بے شک جنگ کے بعد بھی وہ اس مادی ذہنیت سے روکتا ہے کہ جب لڑائی ہے تو اب دشمن کے ساتھ ہر سلوک جائز ہے بلکہ وہ پھر بھی کچھ اخلاقی اور انسانی حدود کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جنگ کے بعد بھی تمہیں حدود کا پابند رہنا ضروری ہے اور ان میں سب سے بڑی حد یہ ہے کہ جب اصول کے تحفظ کے ساتھ صلح کا امکان پیدا ہو جائے تو پھر جنگ قائم رکھنے کے کوئی معنی نہیں۔

حضرت امام حسنؑ کی صلح کو اس روشنی میں دیکھا جائے تو اس کی حقانیت صاف صاف نظر آجائے گی۔

قاتلوا کے ساتھ خاص قید فی سبیل اللہ کی ہے جس کی لفظی معنی تو ہوئے ''اللہ کی راہ میں'' مگر راہ کا مطلب کیا؟ اگر منزل مادی ہو تو اس تک پہنچانے والا کوئی مادی راستہ ہوگا مگر خالق تو کسی سمت وجہت میں نہیں ہے تو اس کی راہ کا مطلب ہے وہ دینی تقاضے جو اسے مقصود و مطلوب ہیں [2]۔

ہوا و ہوس میں گرفتار جاہ و حشم کے بھوکے اور اقتدار پسند خطا کار انسانوں سے اس کی شناخت میں یقیناً غلطی کا اندیشہ ہے اور معاملہ انسانی نفوس کا ہے۔ اس لئے اسلام کا حقیقی تعلیم میں جو فقہ جعفری کی صورت میں محفوظ ہے سوا تحفظ اختیاری کی صورت کے جسے دفاع کہتے ہیں جہاد کو اجازت معصومؑ کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے اور اسی بناء پر ہمارے یہاں یہ مقولہ عام ہے کہ غیبت امامؑ میں جہاد حرام ہے۔

---

[1]۔ اور زیادتی نہ کرو کہ بے شک خدا نہیں دوست رکھتا زیادتی کرنے والوں کو (تاج العلماء)

[2]۔ فی سبیل اللہ ای فی دین اللہ وھو الطریق الذی بیّنہ للعباد لیسلکوہ علیٰ ما امرھم بہ ودعاھم الیہ (مجمع البیان)

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾

”اور انہیں مارڈالو! جہاں انہیں پاؤ اور انہیں نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا اور فتنہ پردازی قتل سے بڑھ کر ہے۔ ہاں مسجد الحرام میں ان سے اس وقت تک نہ لڑو جب تک وہ اس میں تم سے نہ لڑیں لیکن اگر وہ تم سے لڑیں تو تم بھی انہیں قتل کرو اسی طرح ان کافروں کو سزا ملے گی۔“

اب یہ جنگ چھڑ چکنے کے بعد سے متعلق ہدایتیں ہیں کہ اس کے بعد ان کے جان ومال کا احترام باقی نہیں رہے گا اور اب کسی رعایت کی ضرورت نہیں کیوں کہ آغاز جنگ ادھر سے ہو چکا اور اب اگر تم انہیں قبضہ پا کر مکہ سے نکال بھی دو تو تمہاری زیادتی نہیں ہے اس لے کہ وہ تمہیں اس کے پہلے گھر سے بے گھر کر چکے ہیں[۱] مگر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے رسولؐ نے قبضہ پانے کے بعد اس اجازت ربانی سے فائدہ نہیں اٹھایا اور جائز انتقام بھی نہیں لیا بلکہ فتح مکہ میں سب کو عام معافی دیدی۔

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ”فتنہ پردازی قتل سے زیادہ بری چیز ہے“۔ یہ فقرہ خود ظاہر کررہا ہے کہ یہ آیت کسی خاص واقعہ کی طرف ناظر ہے اور یہی ایسے مقامات ہیں جن میں خود قرآن وحدیث اور تاریخ کے مطالعہ کی تشنگی پیدا کرتا ہے چنانچہ شان نزول کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ کسی مسلمان نے غلطی سے ان مہینوں میں سے کسی میں جن میں جدال حرام سمجھا جاتا تھا (محرم، رجب، ذیقعد، اور ذی الحجہ، کسی کافر کو قتل کر ڈالا تھا۔ اس پر مشرکین نے پوری اسلامی جماعت کے خلاف ایک طوفان اشتعال انگیزی کا اٹھا دیا تو قرآن مجید نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ بات اس مسلمان کی بری تو ضرور تھی مگر تم نے جو ایک شخص کے انفرادی فعل پر پوری جماعت کے خلاف شورش اٹھادی ہے یہ اس ایک آدمی کے قتل سے زیادہ بری چیز ہے۔

فتن کالفظ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر مسلمانوں کو جبر وتشدد کے ساتھ دین حق سے ہٹانے کی کوشش کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، ہوسکتا ہے اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ سے مشرکین کا یہ جبر وتشدد ہی مراد ہو جو وہ مسلمانوں پر کرتے رہے ہیں[۲]۔

اس کے بعد پھر مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ حالت جنگ میں بھی تم کو اپنی جانب سے مقدسات کے احترام کو بھی ادھر سے توڑا جائے تو تمہیں جواب دینا درست ہے۔

جس طرح ہم نے کہا کہ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ کے حق سے رسول اللہ ﷺ نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اسی طرح اس

---

[۱]۔ اخرجوھم من مکۃ کما اخرجوکم منھا (صافی)

[۲]۔ الفتنۃ وصرف المؤمنین عن دینھم واضلالھم کما قال جلّ اسمہ فی سورت لبروج ان الذین فتنوا المؤمنین والمؤمنات ثم لم یتوبوا فلھم عذاب جھنّم ولھم عذاب الحریق (البلاغی)

اذن خداوندی سے کہ اگر دوسرے بلد الحرام میں خونریزی کرنا ہی چاہیں تو تم پھر تلوار اٹھا سکتے ہو پیغمبر خداؐ کے وارث حضرت حسین علیہ السلام نے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ دوسروں کی طرف سے خونریزی کے اسباب فراہم ہوئے تو خود عین موقع حج پر حرم خدا سے باہر نکل کر حرمت خانہ کعبہ کو محفوظ رکھا۔

فَاِنِ انۡتَهَوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۹۲﴾

"اب اگر وہ باز آ جائیں تو بلا شبہ اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔"

یعنی اسلام لانے کے بعد [1] پھر سابق میں جو کچھ وہ کر چکے ہیں اس کا کوئی محاسبہ نہیں ہوگا۔ نہ مسلمانوں کو اب اس دنیا میں ان سے انتقام لینے کا حق ہوگا اور نہ آخرت میں خدا کے یہاں اب انہیں سزا کا استحقاق۔

وَقٰتِلُوۡهُمۡ حَتّٰى لَا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ وَّيَكُوۡنَ الدِّيۡنُ لِلّٰهِ‌ؕ فَاِنِ انۡتَهَوۡا فَلَا عُدۡوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۹۳﴾

"اور ان سے اس وقت تک لڑو کہ کوئی شورش نہ رہے اور پوری پوری اطاعت [2] اللہ کی ہو جائے۔ ہاں اگر وہ باز آ جائیں تو زیادتی نہیں کی جا سکتی مگر انہی پر جو خود زیادتی کرنے والے ہوں [3] "

واضح ہونا چاہیے کہ جو ظلم و زیادتی کرنے والے ہوں ان کے ساتھ جو سلوک ہو وہ درحقیقت خود زیادتی نہ ہوگا مگر اسے عدوان یعنی زیادتی عرب کے اس محاورہ کے مطابق کہا گیا ہے کہ جو کسی شے کی سزا ہے وہ اسی نام سے موسوم کر دی جاتی ہے جیسے شاعر نے کہا ہے: فدناھم کما دانوا اور عرب کا مقولہ ہے کما تدین تدان [4] ۔

اَلشَّهۡرُ الۡحَـرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَـرَامِ وَالۡحُـرُمٰتُ قِصَاصٌ‌ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ‌ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۹۴﴾

"حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے عوض میں ہے اور حرمتوں میں بھی ادلا بدلا ہے [5] تو جو شخص تم پر زیادتی

---

[1] ۔ ان انتھوا عن القتال والشرك (صافی)

[2] ۔ الدین ھٰھنا الاذعان بالطّاعة (مجمع البیان)

[3] ۔ زیادتی کا وبال ظالموں پر ہوگا (عماد الدین)

[4] ۔ سمّی الجزاء باسم الابتداء للمشاکلة وازدواج الکلام کما فی قوله سبحانه وجزآء سیئة سیئة مثلها و مثله فاعتدوا علیه (صافی)

[5] ۔ آبرودار مہینے بدلے میں آبرودار مہینے کے اور سب آبرودار مقام برابر ہیں (تاج العلماء)

کرے تو جیسی اس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے ویسی ہی زیادتی تم اس کے ساتھ کرو اور اللہ کے غضب سے بچو اور جانتے رہو کہ اللہ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔"

محترم مہینے یعنی وہ جن میں عرب غالباً سنت ابراہیمی کے اثر سے [1] جدال وقتال حرام جانتے تھے جیسا کہ پہلے بیان ہوا چار تھے۔ انہی میں ذیقعد کا مہینہ تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرہ کے ارادہ سے مکہ معظّمہ کی طرف روانہ ہوئے مگر مشرکین آمادہ جنگ ہو کر سدراہ ہوئے جس کے نتیجہ میں صلح حدیبیہ ہوئی۔ یہ ان کا آمادہ جنگ ہونا یقیناً شہر حرام کے احترام کے خلاف تھا مگر انہوں نے اس کی پروا نہ کی۔ اس کے بعد معاہدہ کے مطابق دوسرے سال رسول اللہؐ پھر اسی مہینے میں عمرہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اب مشرکین کو تین دن کے لئے مکہ سے باہر چلا جانا پڑا جس سے ان کو بڑی ناگواری محسوس ہوئی، اسی ناگواری کا قرآن مجید اس آیت میں جواب دے رہا ہے کہ اگر اس دفعہ اس ماہ محرم کی حرمت کا تم نے لحاظ کیا ہوتا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سکون و اطمینان کے ساتھ حج کر لینے دیا ہوتا تو اس دفعہ تمہیں اسی مہینے میں یہ مشقت وزحمت کیوں اٹھانا پڑتی۔

اب انہوں نے جو پیغمبرؐ کے سدراہ ہو کر جنگ کا اقدام کیا تھا اس میں ظرف زمان کے تقدس، ظرف مکان کے تقدس ارادہ مقدس یعنی احرام حج یا عمرہ کے تقدس سب کو نظر انداز کیا گیا تھا اس لئے ارشاد ہوا **والحرمات قصاص** حرمتوں کا سب کا معاوضہ [2] اور یہ ایک کلیہ ہے جس میں ہر ایسی چیز داخل ہے جس کا پاس ولحاظ انسان کے لئے ضروری ہے [3]۔

آخر میں پھر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ تم کبھی اپنی طرف سے پہل نہ کرو۔ ہاں جو زیادتی تمہارے ساتھ جس طرح ہو اس طرح تم اس کے بدلہ لے سکتے ہو۔

وَاَنۡفِقُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ ۛۚ وَاَحۡسِنُوۡا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝١٩٥

"اور خدا کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو اور حسن عمل اختیار کرو، بلاشبہ اللہ اچھے اعمال والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو:

یہ آیت قبل کے مضامین سے غیر مربوط معلوم ہوتی ہے اور چوں کہ ترتیب موجودہ کا تنزیل کے موافق نہ ہونا یقینی ہے اس لئے خواہ مخواہ قبل سے مرتبط بنانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔

---

[1] ۔لعل الاصل فی حرمتها شریعة ابراهیم کحرمت البیت فاستمر العرب علی ذلك وامضاه الاسلام (البلاغ)

[2] ۔انما جمع الحرمات لانه اراد حرمة الشعر وحرمة البلد وحرمة الاحرام (مجمع البیان)

[3] ۔ای کلّ حرمة وهی ما یجب ان یحافظ علیها یجری فیه القصاص (صافی)

اس آیت میں پہلا جز تو ظاہر بظاہر اموال سے متعلق ہے بے شک تاویل کے ساتھ اسے عام بنایا جا سکتا ہے کہ راہ خدا میں خرچ کرو مطلق ہے۔ اس میں جان و مال دونوں داخل ہیں اور اس طرح معرکہ جہاد میں جان نثاری بھی اس کے تحت میں داخل ہے مگر الفاظ کا ظاہری مفہوم اتنی وسعت یقیناً نہیں رکھتا۔

اس کے برخلاف دوسرا فقرہ ''اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو'' اپنی جگہ پر دیکھا جائے تو وہ جان سے متعلق معلوم ہوتا ہے اور اسی بناء پر خودکشی کے جرم ہونے پر اس سے استدلال عموماً کیا ہی جاتا ہے لیکن چوں کہ یہ فقرہ پہلے فقرہ کے ساتھ وارد ہوا ہے تو اب ذہن میں یہ مفہوم آتا ہے کہ یہ بھی انفاق سے متعلق حکم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں صرف کرو مگر اس طرح نہ لٹاؤ جس سے خود تباہ ہو جاؤ چنانچہ ایک حدیث میں جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے اس آیت سے اس حکم پر استشہاد کیا گیا ہے [1]۔

ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ پہلے ہی فقرہ کی تاکید ہے یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اس میں بخل سے کام لے کر اپنی ہلاکت کا باعث نہ بنو۔ اس صورت میں ہلاکت سے مراد ہلاکت اخروی ہے۔

علامہ طبرسیؒ کا خیال ہے کہ آیت کے مفہوم کو عام کیوں نہ لیا جائے جس میں یہ سب معنی داخل ہو جائیں [2]۔ مگر یہ اسی وقت مناسب ہے کہ جب پہلے فقرہ کو بھی جان و مال دونوں سے عام سمجھا جائے جو خالی از تکلف نہیں ہے۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ٚ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

''اور اللہ کے لئے حج اور عمرہ کو پورا کرو۔ اب اگر مجبور ہو جاؤ تو پھر جو کچھ قربانی میسر ہو اور اپنے سر اُس وقت تک نہ

---

[1]۔ عن ابی عبد اللہ علیہ السلام لو ان رجلا انفق ما فی یدیه فی سبیل الله ما کان احسن ولا ارفق لقوله سبحانه ولا تلقوا بأیدیکم الی التهلكة (مجمع البیان)

[2]۔ الاولیٰ حمل الآیة علیٰ جمیع هٰذه الوجوه ولا تنافی فیها (مجمع) الی التهلكة الاسراف و تضییع وجه المعاش وبكلّ ما یؤدّی الی الهلاك (صافی)

منڈاؤ اور جب تک کہ یہ قربانی اپنی جگہ تک نہ پہنچ جائے ۔اب شخص تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی دکھ ہو تو اس کا بدلہ ہوگا روزہ یا خیرات یا قربانی سے مگر جب تمہیں اطمینان حاصل ہوجائے تو جو شخص عمرہ کر کے حج کے موقع تک لذائد سے بہرہ مند ہو رہا ہو[1] اسے لازم ہے کہ جو کچھ میسر ہو قربانی کرے اور جسے قربانی نہ مل سکے اس کے ذمہ ہیں تین روزے زمانہ حج میں اور سات اس وقت جب تم لوگ واپس جاؤ۔یہ ہوجائیں گے پورے دس۔یہ اس کے لئے جس کے بال بچے مسجد حرام کے باشندہ نہ ہوں اور اللہ کے غضب سے بچو اور جانے رہو کہ اللہ کی سزا بڑی سخت ہوتی ہے۔"

حج تمتع کا حکم:

اس میں حج اور عمرہ[2] کے متعلق چند شرعی قوانین کا ذکر ہے پہلے حج تمتع جو باجماع امت اسلام میں موجود تھا مگر خلیفہ ثانی عمرؓ ابن الخطاب نے اپنے دور میں اس سے ممانعت کی اور اس لئے سواد اعظم میں واجب نہیں سمجھا جاتا مگر شیعہ علماء متفق ہیں کہ ایسے شخص کے لئے جو مکہ معظّمہ کا باشندہ نہ ہو حج قران اور افراد درست نہیں ہے۔اس کے لئے حج تمتع معیناً لازم ہے۔

اس آیت میں اول تو آیت کا آغاز اس ارشاد سے ہے کہ حج اور عمرہ کو رضائے الٰہی کے لئے مکمل کرو یہاں الحج اَوْ العمرة نہیں ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حج یا عمرہ جو تم بجالا رہے ہو اسے پورا کرو بلکہ الحج والعمرة کہا ہے جس کے معنی دونوں کے اجتماع کے ہیں چنانچہ حج تمتع کے لازمی جزء یہ دونوں ہیں کہ پہلے عمرہ کا احرام باندھے اور اس کے اعمال بجالائے۔دوسرے فرقہ کے بعض فقہاء عمرہ کو واجب نہیں سمجھتے جو حکم قرآنی کے خلاف ہے[3]۔

پھر آگے چل کر فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ إِلَى الۡحَجِّ کہہ دیا گیا ہے "عمرہ بجالا کر حج کے مواقع تک متمتع ہو رہا ہو"۔یعنی ان باتوں سے جو حالت احرام میں حرام تھیں اب عمرہ ختم ہونے کے بعد حج کا احرام باندھنے تک بہرہ اندوز ہو رہا ہو اور چوں کہ اس دوران انسان ان چیزوں سے متمتع ہونے لگتا ہے اسی لئے اس کو حج تمتع کہتے ہیں۔یہ بھی اس آیت میں بتلا دیا گیا ہے کہ یہ قسم حج ان کے لئے ہے جو مکہ معظّمہ کے باشندہ نہ ہوں۔(ذٰلِكَ لِمَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ اَهۡلُهٗ حَاضِرِى الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ)

محصور ومصدود:

اس کے بعد از روئے قرآن اس حج کے تعین میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے[4]۔محصور ومصدود کا حکم بتایا گیا ہے۔یہ وہ لوگ ہیں

---

[1]۔ جس نے حج کے ساتھ عمرہ ملا کے تمتع کی ہے (عماد الدین)

[2]۔عمرہ ایک مشہور عبادت ہے کہ میقات سے شروع ہوجاتی ہے اور مکّہ میں ختم ہوجاتی ہے۔اور حج ایک مشہور عبادت ہے کہ مکّہ سے شروع ہوتی ہے اور منیٰ کے مقام میں پہنچ کے تمام ہوجاتی ہے اور کچھ تتمہ اُس کا پھر مکّہ میں ہوتا ہے اور تفصیل اس کی حج کی بحث میں فقہ کی کتابوں میں ہے۔(تاج العلماء)

[4]۔ هو نصّ فى وجوب العمرة كوجوب الحج (صافی)

جواحرام باندھنے کے بعد بیماری یا دشمنوں کے سدراہ ہونے کی وجہ سے حج پورا نہ کرسکیں[1] ۔
احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے پہلے قسم یعنی بیماری سے معذور کو محصور کہتے ہیں اور دشمن سے دو چار ہونے والے کو مصدود اور ان کے احکام میں تھوڑا سا اختلاف ہے[2] ۔
اس آیت میں ان کا حکم یہ بتایا گیا ہے کہ ان کو احرام کے ختم کرنے کیلئے ضرورت ہے مااستیسر یعنی جو بآسانی ممکن ہو من الھدی یعنی جانور کی قربانی کی ۔اس کی تشریح احادیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر ممکن ہوتو اونٹ نہیں تو گائے اور آخر میں بدرجہ مجبوری بکری ۔
اس کے بعد کہا گیا ہے کہ جب تک قربانی اپنے محل پر نہ پہنچ جائے اپنے سر کو منڈوا کر احرام ختم نہیں کر سکتے[3] ۔
محل یعنی جہاں اسے نحر یا ذبح کرنا چاہئے اس کی تشریح احادیث سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ اگر دشمنوں کے سدراہ ہونے سے مجبوری پیدا ہوئی ہے تو جہاں دشمن سدراہ ہو بس وہی محل ھدی ہے۔ وہیں قربانی کر کے احرام کو ختم کرے جیسا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ میں عمل فرمایا اور اگر بیماری کی وجہ سے مجبوری پیدا ہوئی ہوتو خود وہیں ٹھہر جائے اور قربانی کے جانور کو مکہ معظّمہ بھیج دے۔ اب اگر حج کا احرام ہے تو محل قربانی منیٰ ہے جہاں دس ذی الحج کو اس کی قربانی ہوگی اور اگر عمرہ کا احرام ہے تو معظّمہ میں کسی جگہ بھی قربانی کردی جائے۔ جب قربانی اس محل تک پہنچ جائے تو اس وقت وہ شخص سر منڈوا کر احرام سے باہر نکل سکتا ہے اس کے پہلے نہیں۔
(۳) حلق یعنی سر منڈوانا احرام کے ختم کے لئے ہوتا ہے لیکن اگر بیماری یا سر میں کسی خاص تکلیف کی وجہ سے حالت احرام ہی میں سرمنڈوانے پر مجبور ہو گیا ہو تو کیا کرے؟ اس کے لئے بتایا گیا ہے کہ تین باتوں میں سے ایک میں اختیار ہے۔
ا ۔۔۔روزہ رکھے حدیث میں ہے کہ تین روزے رکھنا ضروری ہیں۔
۲ ۔۔۔صدقہ دے حدیث بتاتی ہے کہ کم از کم چھ مسکینوں کو۔
۳ ۔۔۔قربانی کرے حدیث میں ہے کہ بکری کی قربانی
(۴) فاذاامنتم الخ اب یہاں سے غیر مصدود محصور کا حکم ہے۔ جب حالت امن میں ہو یعنی نہ مرض کی مجبوری ہو، نہ دشمن کے سدراہ ہونے کی تو جو شخص حج تمتع بجالا رہا ہوا سے بھی ھدی یعنی قربانی ضروری ہے۔
(۵) فمن لم یجد الخ اسی حج تمتع کی صورت میں اگر ایسا شخص ہے کہ اس کے پاس قربانی کے لئے جانور نہیں ہے اور نہ اس کی قیمت ہے تو پھر دس روزے رکھے تین زمانہ حج میں ۷، ۸ اور ۹ ذی الحج کو[4] اور سات روزے اپنے شہر واپس ہونے کے بعد۔
یہاں خاص بات یہ ہے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ یہ شخص جب واپس جائے اس لئے کہ یہ ممکن ہے یہ شخص واپس جائے ہی نہیں بلکہ مکہ معظّمہ ہی میں قیام رکھے۔ اس لئے یہ کہا گیا کہ سات اس وقت رکھے جب تم لوگ واپس جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ نہیں جاتا تو یہ دیکھا جائے گا کہ

---

[1] ۔احصرتم منعکم خوف اوعدّو امرض عن المضیّ الیہ وانتم محرمون بالحج (صافی)
[2] ۔قدتکررفی روایاتنا الصحاح وغیرھا ان المحصور غیر المصدود وانھما مختلفان فی بعض الاحکام (البلاغی)
[3] ۔مکان الذی یجب ان ینحر فیہ (صافی)
[4] ۔یوم قبل یوم الترویۃ ویوم عرفۃ (مجمع البیان)

دوسرے حجاج جو واپس جارہے ہیں کتنے زمانہ کے بعد اپنے گھروں میں جو اس کے وطن کا سا فاصلہ رکھتے ہوں پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے بعد اسے مکہ میں رہ کر ہی ان روزوں کو ادا کر لینا چاہیے [۱]۔

(۶) یہ ان کے لئے ہے جن کے اہل وعیال مکہ معظّمہ کے باشندہ نہ ہوں۔" باشندہ کی تشریح احادیث سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ جو مکہ معظّمہ سے کسی سمت میں بارہ میل کے اندر ہو وہ حاضرین میں داخل ہے اس کیلئے حج قران یا حج افراد کا حکم ہے اور ان کے علاوہ جو دوسرے ہوں ان کے لئے حج تمتع ہے۔

اَلۡحَجُّ اَشۡهُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ ۚ فَمَنۡ فَرَضَ فِيۡهِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يَّعۡلَمۡهُ اللّٰهُ ؔؕ وَتَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَيۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰى ۚ وَاتَّقُوۡنِ يٰٓاُولِى الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۷﴾

"حج کے چند خاص مقررہ مہینے ہیں [۲] تو جو ان میں حج کی پابندی عائد کرلے تو پھر اس حج میں نہ ہمبستری ہو نہ نافرمانی اور نہ جھگڑا اور جو اچھائی تم کرو اسے اللہ جان لے گا اور توشہ مہیا کرو کہ بہترین توشہ پرہیز گاری ہے اور میرے غضب سے بچو اے عقل رکھنے والو۔"

محرّمات احرام:

یہ گزشتہ اجمال کی کچھ تفصیل ہے اور احرام حج کے بعض احکام مقررہ مہینے یہ شوال، ذی قعد اور ذی الحج ہیں کہ حج کے لئے بلکہ اس عمرہ کے لئے بھی جو تمتع کے سلسلہ میں ہو احرام انہیں مہینوں میں بندھ سکتا ہے [۳] دوسرے زمانہ میں جو ہوتا ہے وہ صرف عمرہ ہوتا ہے حج نہیں۔

حج کی پابندی عائد کرلے یعنی احرام باندھ لے [۴] تو پھر بہت سی چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جن میں سے چند کا یہاں ذکر ہوا ہے۔

پہلے عورتوں سے مقاربت یہاں تک کہ اپنی بیوی سے بھی تعلقات ازدواجی کا قائم کرنا بلکہ خواہش نفس کی تحریک کے ساتھ ہاتھ کا مس کرنا تک ناجائز ہے۔

دوسرے فسوق اسی کے لفظی معنی میں تو ہر گناہ داخل ہے مگر اس محل پر خصوصیت کے ساتھ اس کی تفسیر جھوٹ بولنے کے ساتھ ہوئی ہے [۵]۔

تیسرے جدال اس کے معنی یہاں قسم کھانے کے ہیں اور جھوٹی قسم تو بہر حال گناہ ہے مگر حالت احرام میں سچی قسم بھی نہیں کھانا

---

[۱] ۔من اقام بمكة يقدر له رجوع اصحابه الىٰ بلده كما عليه فتوى الامامية واحاديثهم (البلاغى)

[۲] ۔ معلومات اى اشهر موقة معيّنة لا يجوز فيها التغير والتبدل (مجمع البيان)

[۳] ۔ فلا يجوز ان يقدّم احرام الحج على الاشهر المذكورة باجماع الامامية وحديث اهل البيت (البلاغى)

[۴] ۔فى الكافى والعياشى قال الرضا عليه السلام الفرض التلبية والاشعار والتقليد (صافى)

[۵] ۔روىٰ اصحابنا انه الكذب (مجمع البيان)

چاہیے [۱] ۔

ان چیزوں سے توخصوصیت کے ساتھ حالت احرام میں پرہیز واجب ہے۔اس کے علاوہ آخر میں ارشاد ہوا کہ توشہ مہیا کرو بہترین توشہ پرہیز گاری ہے یعنی حالت احرام میں جہاں تک ہو سکے زیادہ سے زیادہ اعمال خیرانجام دو کہ یہ موقع ریاضت نفس کے لئے بہت موزوں و مناسب ہے۔

یہاں بعض اہل تفسیر نے یہ کہا ہے کہ توشہ مہیا کرو۔اس حکم کا باعث یہ ہے کہ اس زمانہ میں بہت سے حاجی زادراہ لے کر نہیں آتے تھے اور دوسروں پر بار بنتے تھے۔ یہ ان کو تنبیہ ہے۔ اسی لئے پادری عمادالدین نے بھی یہ ترجمہ کیا ہے کہ راہ کا خرچ لے کر آیا کرو اچھا راہ خرچ پرہیز گاری ہے مگر یہ تفسیر وترجمہ سیاق کلام الٰہی کی بناء پر درست نہیں ہے [۲] ۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾

”اس میں تمہارے لئے کوئی حرج نہیں ہے [۳] کہ تم کچھ اپنے پروردگار کی نعمت کے طلب گار رہو ہاں جب عرفات سے روانہ ہوتو مشعرالحرام کے حدود میں اللہ کو یاد کرو اور اس کے ذکر میں مشغول ہو جس طرح وہ تمہیں راہ پر لایا حالانکہ تم اس کے پہلے بہکے ہوؤں میں تھے۔“

زمانہ جاہلیت میں لوگ ایام حج میں تجارت کو گناہ سمجھتے تھے۔قرآن نے حالت احرام کی کچھ حرام باتوں کا ذکر کرنے کے بعد اس غلط تصور کی جو حلال خدا کو حرام کرتا تھا اصلاح کرنا چاہی ہے اور کہا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کی نعمت کے طلب گار ہو یعنی تجارت کر کے معاشی فائدہ حاصل کرو [۴] ۔

عرفات اور مشعرالحرام یعنی مزدلفہ:

اس کے بعد عرفات سے واپسی کے بعد مشعرالحرام میں قیام کا حکم بتایا گیا ہے کہ یہاں زیادہ سے زیادہ وقت ذکر الٰہی میں صرف کرو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دسویں شب کو مشعرالحرام میں قیام بھی واجب ہے جیسا کہ فقہائے امامیہ کا مسلک ہے [۵] اور بقرینہ سیاق یہ پتہ چلتا ہے کہ

---

[۱]۔الجدال قول الرجل لا واللہ بلی واللہ (صافی)

[۲]۔عرضھا علیٰ کتب اللہ فی تفریع الآیۃ بالفاء یعزّ فکّ وھنھا (البلاغی)

[۳]۔کسی طرح کا الزام نہیں (تاج العلماء)

[۴]۔کانوا یتأثمون بالتجارۃ فی الحج فرفع عنہ الجناح فی ذٰلک (صافی)

[۵]۔فی ھذا دلالۃ علیٰ ان الوقوف بالمشعر الحرام فریضۃ کما ذھبنا الیہ (مجمع البیان)

یہاں تجارت وغیرہ کا مشغلہ ناجائز نہیں تو خلاف فضیلت ضرور ہے۔

ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۹۹﴾

”پھر چل کھڑے ہو جس طرح اور لوگ چل کھڑے ہوئے ہیں اور اللہ سے بخشش کے طلب گار ہو یقیناً اللہ بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔“

یہ آیت اگر ترتیب نزول کے اعتبار سے اسی جگہ کی ہے جہاں وہ اب ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں دس ذی الحج کو طلوع آفتاب کے بعد مشعر الحرام سے منیٰ آنے کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ عرفات افاضہ یعنی واپسی کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے (فَاِذَاۤ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ) لہٰذا اب ثم یعنی پھر کہہ کر جو ذکر ہو رہا ہے تو یہ کسی دوسری جگہ سے واپسی کا ذکر ہوگا۔ اب یہ جو کہا گیا ہے کہ جیسے اور لوگ واپس ہوئے تو اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ اس نقل و حرکت میں ہم آہنگی ہونا چاہیے یہ نہیں کہ کچھ عرفات میں رہیں، کچھ مزدلفہ میں اور کچھ منیٰ جائیں۔ مگر بعض مفسرین کا خیال ہے اور ایک حدیث بھی اس کی تائید میں ہے کہ كَمَاۤ اَفَاضَ النَّاسُ کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح پہلے لوگ چلتے رہے ہیں اور پہلے لوگ سے مراد حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہیں اور ان کے بعد سے سنت ابراہیمی پر عمل کرنے والے ہیں [1]۔

لیکن دوسری روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت ترتیب نزول میں اس کے قبل کی آیت سے مقدم ہے اور افضتم سے مراد عرفات ہی سے واپسی ہے اور یہ کہ اس طرح واپس ہو جیسے اور لوگ قبیلہ قریش کو انتباہ ہے کہ وہ دوسرے قبائل عرب کے ساتھ عرفات میں قیام اور وہاں سے مراجعت نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے اور بس وہیں سے منیٰ چلے جاتے تھے۔ انہیں کہا گیا ہے کہ تمہیں اس امتیاز پسندی سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ تم دوسرے قبائل کا ساتھ دینا چاہیے۔ ہماری بعض روایات بھی اس کے موافق ہیں ۲۔

فَاِذَا قَضَيۡتُمۡ مَّنَاسِكَكُمۡ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَذِكۡرِكُمۡ اٰبَآءَكُمۡ اَوۡ اَشَدَّ ذِكۡرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا وَمَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾

”اب جب تم اپنے حج کے کام پورے کر لو تو اللہ کو یاد کرو ایسا جیسے تم اپنے باپ دادا کو یاد کرتے رہے ہو بلکہ اسے بھی بڑھ کر۔ اب انسانوں میں کوئی بھی تو ایسا ہے جو کہتا ہے پروردگار ہمیں جو دنیا ہے اس دنیا میں دیدے اور اس کا

---

[1]۔ قبل ان الناس ابرھیم و اسمعیل و اسحق و من بعدھم من الانبیاء عن ابی عبداللہ علیہ السلام (مجمع البیان)

آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور کوئی ان میں ایسا ہے جس کا قول یہ ہے کہ پروردگارا ہمیں عطا کر دنیا میں ایک بھلائی اور آخرت میں ایک بھلائی اور ہمیں آگ کی سزا سے بچا۔"

آیت کے ابتدائی مضمون میں بظاہر مقصود یہ ہے کہ جیسے عموماً رسمی عبادت کرنے والے ایک فریضہ کے اجزاء وشرائط ادا کر کے نازاں ہوجاتے ہیں اور پھر اس کے بعد وہ ایسے سرمست ہوتے ہیں کہ اب معاصی الٰہیہ میں بھی انہیں کوئی باک نہیں ہوتا جیسے کہ عید میں جو درحقیقت فریضہ صیام کی تکمیل پر اظہار تشکر کا موقع ہے بہت سے مسلمان رنگ رلیوں میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ یہ غلط چیز ہے۔ فریضہ حج کے تمام مناسک ادا کرنے کے بعد بھی یاد الٰہی سے غافل نہ ہو اور احساس فرائض قائم رکھو۔

یہاں پر یہ جزء کہ جیسے تم اپنے باپ دادا کو یاد کرتے ہو عربوں کے عام طرز عمل کی بناء پر ہے کہ وہ ایسے موقع پر ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر ومباہات کرتے تھے اور اس میں اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے تھے [1]۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ اس کے بجائے اتنا ہی بلکہ اس سے بڑھ کر اللہ کا ذکر کرو تو وہ تمہارے حال و مستقبل دونوں کے لئے زیادہ مفید ہے۔

دنیاداروں اور دیانتداروں کے نصب العین کا امتیاز:

اب چوں کہ خداوند عالم کی یاد اکثر بصورت دعاؤ مناجات ہوتی ہے اور دعا انسان کی تمناؤں کی آئینہ بردار لہٰذا یہاں قرآن مجید نے انسانوں کی تمناؤں کا تجزیہ کیا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو صرف دنیا کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں اور اس لئے وہ خدا سے دعا بھی مانگتے ہیں تو صرف اپنے دنیاوی مفادات کے لیے۔ یہ پست نظر ہیں اور ان کا صرف دنیا کو سامنے رکھنا اس بناء پر ہے کہ وہ آخرت کا تصور ہی نہیں رکھتے [2]۔ اس لئے آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے یعنی وہ نجات سے محروم ہیں۔

اور کچھ وہ ہیں جنہیں دنیا وآخرت دونوں کا مفاد مدنظر رہتا ہے۔ وہ دونوں کی کامیابی کے لئے اللہ سے دعا مانگتے ہیں یہ بے شک وہ دین دار ہیں جو دنیا کے آگے کسی آخرت کا تصور رکھتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾

"یہ وہ ہیں کہ جو کچھ انہوں نے حاصل کیا اس سے وہ بہرہ مند ہوں گے اور اللہ تیزی سے حساب لینے والا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ آخرت کی کامیابی صرف اس کہنے سے اور بارگاہ الٰہی میں دعا کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتی [3] بلکہ اس نصب العین کے مطابق جس قدر وہ اعمال بجالائیں گے ان کی جزاء انہیں ملے گی اور اسی تناسب سے آخرت کی کامیابی ہوگی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ثمرات

---

[1]۔ عرب اس مقام پر اپنے باپ دادا کا ذکر فخریہ کیا کرتے تھے کہ وہ ایسے سخّی تھے اور وہ ایسے سورما اور علیٰ ھذا القیاس (تاج العلماء)

۲۔ ھو المروی عن الباقرؑ (مجمع البیان)

[2]۔ لانه عبر مؤمن بالبعث والنشور (مجمع البیان)

[3]۔ فانّ ما سألوه لاینال بمحض الدعاء (البلاغی)

آخرت کے لئے صرف ایمان قلبی اور اقرار ذہنی ہی کافی نہیں ہے بلکہ جس حد تک اس کی مطابقت میں اعمال ہوں ان کے موافق جزائے اخروی کا استحقاق ہوگا۔

"اللہ تیزی سے حساب لینے والا ہے" یہ اس بناء پر کہا گیا ہے کہ اگر اللہ کے افعال مادی نوعیت رکھتے ہوتے اور وہ جب ہی ہوتے کہ جب وہ خود مادی قسم کی ہستی ہوتا تو اس کے حساب و کتاب کی مدت ان اعمال کی کثرت اور طویل مدت کے لحاظ سے طولانی ہوتی۔ مگر اس کا حساب کتاب تو مادی صورتوں پر مبنی نہیں ہے اس لئے صدیوں اور ہزاروں اور پوری پوری قوموں کی عمر بلکہ تمام کائنات کی عمر کی طوالت اس کے لئے حساب میں تاخیر کی باعث نہیں ہوسکتی۔

اس کا حساب یکساں طور پر ایک چشم زدن کی بات ہے بلکہ وقت کا محتاج ہی نہیں ہے [1]۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۲۰۳

"اور اللہ کو یاد کرتے رہو کچھ گنتی کے دنوں میں تو جو دو دن میں جلد ہی چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو دیر کرے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں یہ اس کے لئے ہے جو بچتا رہا ہو اور اللہ کے غضب سے بچنے کا خیال رکھو اور یقین رکھو کہ اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ۔"

منیٰ میں قیام:

۹ ذی الحج کو عرفات میں وقوف اور شب دہم مشعر الحرام میں قیام کے بعد دسویں کی صبح کو منیٰ میں پہنچے وہاں قربانی کا فرض انجام دیا اور سر منڈوا کر احرام سے باہر نکلے۔ اس طرح جو بنیادی اعمال حج ہیں ان سے فرصت ہوگی مگر اس کے بعد ایام تشریق یعنی گیارہ اور بارہ اور بعض صورتوں میں تیرہ کی شب کو بھی منیٰ میں قیام ہوتا ہے۔ اس آیت میں گنتی کے دنوں سے مراد یہی ایام تشریق ہیں [2]۔

یوں تو ہر صورت سے ان دنوں میں انسان مصروف عبادت رہے مگر خصوصی طور پر ان دنوں میں جو یاد الٰہی کا طریقہ وارد ہوا ہے وہ حسب ذیل تکبیرات ہیں جن کے نماز پنج گانہ کے بعد پڑھنے کا حکم یہ:

اللہ اکبر ، اللہ اکبر ، لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد اللہ اکبر علی ما ھدانا و الحمد للہ علی ما اولانا و رزقنا من بہیمۃ الانعام۔

---

[1]۔ ھٰذا احد ما یدل علی انہ لیس بجسم (مجمع البیان)

[2]۔ یعنی ایّام التشریق (صافی) کما فی صحیحتی الصافی عن محمد بن مسلم و منصور بن حازم و صحیحۃ التھذیب عن حماد بن موسیٰ عن الصّادق علیہ السلام (البلاغی)

یہ تکبیریں مستحب ہیں واجب نہیں ہیں[۱]۔

ان "اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ" میں بتایا جارہا ہے کہ گیارہویں اور بارہویں دو تاریخوں میں قیام بہرحال واجب ہے لیکن اس کے بعد اختیار ہے کہ بارہویں کو قبل غروب ہی روانہ ہوجائے اسے نفر اول کہتے ہیں جسے کہا گیا ہے: فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ جو دودن میں جلد ہی چلا جائے تو کوئی گناہ نہیں یا تیرہویں شب کو بھی قیام کرے اور تیرہویں تاریخ رمی جمرات کے بعد روانہ ہو تو اسے نفر ثانی کہتے ہیں جسے ارشاد کیا گیا ہے: وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اور جو دیر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔"

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ یہ اس کے لئے ہے جو بچتا رہا ہو یہ اس حکم فقہی کا بیان ہے کہ یہ اختیار جو دونوں صورتوں میں ہے اس شخص کے لئے جس نے احرام کی پابندیوں کو پورے طور پر بنایا ہو جس میں خاص اہم چیزیں عورت اور شکار ہیں[۲] لیکن اگر حالت احرام میں مقاربت کی ہو یا شکار کرلیا ہو تو پھر تیرہویں شب کا قیام واجب ہے[۳]۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾

"اور آدمیوں میں کوئی ایسا ہے جس کی گفتگو دنیا کی زندگی میں تمہیں بڑی پسند آئے گی، اور اللہ کو اپنی دلی حالت پر گواہ کرتا جائے گا حالانکہ وہ سخت کینہ ور ہے"[۴]۔

ریاکار اور مطلب پرست آدمی کا کردار:

یہ ریاکار اور ظاہردار مطلب پرست آدمیوں کا کردار ہے[۵] اور چاہیے بوقت نزول کسی خاص شخص کی جانب اشارہ مقصود ہو پھر بھی اس کی عمومیت میں فرق نہیں آتا[۶] ہر زمانہ میں ایسے اشخاص آنکھوں سے نظر آئیں گے جو مضمون آیت کی سچی تصویر ہیں۔

ان کے کردار کا خاص جزو بار بار اپنے خلوص اور سچائی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش اور قسموں پر قسمیں ہیں جس کی ضرورت وہ کبھی نہیں محسوس کرتا جو حقیقت میں سچا ہو اور جس کے ایمان و محبت میں کسی قسم کا کھوٹ نہ ہو۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا

---

[۱]۔لصحیحۃ علی بن جعفر عن اخیہ الکاظم علیہ السلام (البلاغی)

[۲]۔لمن اتقی النّساء والصّید کما ھو المشھور بین الامامیّۃ (البلاغی)

[۳]۔من لم تیّقھا فلا یجوز لہ النفر الاوّل (مجمع البیان)

[۴]۔الالدّ صفۃ مشبہۃ نحو اعمی العین واعور ھا ای شدید الخصومۃ (البلاغی) شدید العداوۃ (صافی)

[۵]۔قال ابن عباس نزلت الآیٰت الثلث فی المرائی لانّہ یظھر خلاف ما یبطن وھو المروی عن الصادق علیہ السلام (مجمع البیان)

[۶]۔یشمل عامۃ المنافقین وان نزلت خاصۃ (البلاغی)

يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿٢٠٥﴾

"اور جب وہ برسر اقتدار ہوگا تو دنیا بھر میں دوڑتا پھرے گا کہ اس میں فساد برپا کرے اور کھیتی اور نسل کو برباد کر دے [۱] اور اللہ فساد کو دوست نہیں رکھتا۔"

تولی کے معنی بعض مفسرین منہ پھرانے کے کہتے ہیں [۲] اور بعض مترجمین نے بھی اس کے مطابق ترجمہ کیا ہے [۳] مگر ہم دوسری تشریح کو زیادہ درست سمجھتے ہیں کہ یہ تولی ولایت سے مشتق ہے جس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں [۴] اسی لئے ہم نے ترجمہ یہ کیا ہے کہ جب وہ برسر اقتدار ہوگا۔"

جو نتائج اس شخص کے کردار کے بیان ہوئے ہیں کہ وہ فساد فی الارض اور زراعتوں کی بربادی اور نسل کشی کی صورتیں اختیار کرتا ہے یہ کسی بے اسم ورسم گمنام اور بے اثر شخصیت کے افعال نہیں بلکہ ایسوں ہی کے ہو سکتے ہیں جو وسیع ذرائع رکھتے ہوں اور زمانہ اقتدار کے مالک ہوں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٢٠٦﴾

"اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ کے غضب سے بچو [۵] تو غرور اس سے گناہ پر اصرار کراتا ہے [۶] ایسے کے لئے دوزخ ہی بس کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔"

یہ اس ریاکار اور منافق کے کردار کے ہی نقشہ کا ایک جزء ہے کہ وہ برسر اقتدار ہو کر جو فساد اور خونریزی میں مصروف ہے اور اگر کوئی داعی حق فرض شناسی سے کام لے کر اور ہمت کر کے اسے اس کے غلط اعمال اور خبیث افعال پر ٹوکتا اور غضب الٰہی سے ڈرانا چاہتا ہے تو اس سے متاثر ہونے کے بجائے اپنی خود پسندی کے غرور اور جہالت سے زیادہ اپنے غلط کردار میں اضافہ کر دیتا ہے اور بسا اوقات خود اس داعی حق کی جان لینے کے درپے ہو جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسے کے لئے دوزخ ہی بس کافی ہے یعنی دنیا میں اس کی اصلاح ممکن نہیں ہے اس کے لئے بس وہ ابدی عذاب درکار ہے جس کا کبھی اختتام نہیں ہے۔

---

[۱] تہس نہس کر دے کھیتی اور چوپائے (تاج العلماء)

[۲] اعرض عن الحسن (مجمع البیان)

[۳] اور جب چلا جاتا ہے (عماد الدین) اور جہاں (تمھاری محبت سے) منہ پھیرا (فرمان علی صاحب)

[۴] ملك الامر وصار واليا (صافی) بان تصير له ولاية وتسلط (البلاغی)

[۵] الاتقاء طلب السلامة بما يحجز عن المخافة واتقاء الله انما هو اتقاء عذابه (مجمع البیان)

[۶] حملة الانفة وحمية الجاهلية على الاثم الذی يؤمر باتقائه (صافی)

دوزخ کو کہا گیا ہے لبئس المھاد۔ مھاد کے معنی تو بچھونے کے ہیں[1] مگر چوں کے بچھونا ایک طرح انسان کی قرار گاہ ہوتا ہے اس لئے یہاں اس کا استعمال محل و مستقر کے معنی میں کیا گیا ہے[2] جیسا کہ دوسری آیت میں اس محل پر وبئس القرار کہا گیا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝٢٠٧

''اور آدمیوں ہی میں وہ بھی ہے جو اپنی جان بیچ ڈالتا ہے[3] اللہ کی مرضی کی طلب میں اور اللہ بندوں پر بڑا شفیق ہے۔''

شب ہجرت حضرت علی علیہ السلام کا کردار:

کثیر التعداد شیعہ اور سنی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہما السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے شب ہجرت کے بعد جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بستر پر آرام کی نیند سوئے تھے۔

بیچنے میں کیا ہوتا ہے؟ انسان اپنے پاس کی چیز دوسرے کو دیتا ہے اور اس کے بالمقابل قیمت حاصل کرتا ہے۔ یوں ہی راہ خدا میں جان کی قربانی پیش کرنے والا اپنی جان کو مرضی مولا کی خاطر خطرہ میں ڈال دیتا ہے اس لئے اسے بیچنے کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے[4]۔

آخری ٹکڑا کہ اللہ اپنے بندوں پر بڑا شفیق ہے ایک لطیف پیرایہ میں ان کی قربانی کی قبولیت اور اس پر اپنی بہترین خوشنودی کا اعلان ہے کہ جب وہ ہماری راہ میں اس طرح جان دیتا ہے تو ہم بھلا اس کو اپنی رحمتوں اور رضوان سرمدی کی بارشوں سے محروم کریں گے! اب جتنی قربانی زیادہ عظیم ہوگی اس کی شفقت و مہربانی کے تقاضے اس کے بالمقابل زیادہ نمودار ہوں گے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝٢٠٨

''اے ایمان والو سب کے سب امن و صلح کے احاطہ میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔''

مسلمانوں کو انتباہ اور دعوت اتحاد و اتقیاء:

آیت کے الفاظ سے خود ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کو باہمی اختلاف و نزاع سے بچانے اور باہم صلح و سلامتی اور یک جہتی قائم رکھنے کی

---

[1]۔ اور کیا برا بستر ہے (عمادالدین)

[2]۔ المھاد ای القرار کالوطاء فی الثبوت علیہ (مجمع البیان)

[3]۔ یشری یبیع (صافی) فی التبیان شری باغ (البلاغ)

[4]۔ انّما اطلق علیہ اسم البیع لانہ انّما فعل ما فعل لطلب رضاء اللہ (مجمع البیان)

دعوت ہے اس لیسلم کی تفسیر اسلام کے ساتھ قرین قیاس نہیں ہے بلکہ سلم سے مراد امن وصلح ہے۔ جو جنگ کے مقابل ہوتی ہے[۱] اور ظاہر ہے کہ سب سے اہم نزاع جو اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والی تھی وہ مسئلہ خلافت میں تھی۔ لہٰذا بہت قرین قیاس یہی ہے کہ اس بارے میں مسلمانوں کو انتباہ مقصود ہوا ور انہیں یک جہتی کے ساتھ خدا اور رسولؐ کے احکام کی پیروی کی دعوت دینا مقصود ہو[۲] اور سلم کے معنی اسلام کے بھی لئے جائیں تو چوں کہ اسلام کا عملی تقاضا خدا اور رسولؐ کے فیصلہ کے سامنے سر جھکانا ہے اس لئے خدا اور رسولؐ کی طرف سے اس اعلان کے بعد کہ پیغمبرؐ کے بعد ولی امر کون ہے مسلمانوں کو پھر خودرائی سے روکنا اور اس فیصلہ باری پر یک جہتی کے ساتھ عمل کرنا اس کے بعد بھی مقصود ہو سکتا ہے[۳]۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾

"اب اگر اس کے بعد کہ کھلے ہوئے احکام تمہارے پاس آچکے پھر بھی تم ڈگمگا گئے تو جانے رہو کہ اللہ بہت بڑا زبردست سمجھ بوجھ والا ہے"۔

سیاق قرآن سے ظاہر ہے کہ البینات یعنی کھلے ہوئے دلائل وہی ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں کے سامنے ان کے باہمی اختلافات کے بارے میں واضح طور پر آچکے ہوں اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان مسائل کو خالق نے مسلمانوں کی ذاتی مرضی اجماع یا شوریٰ پر نہیں چھوڑا تھا بلکہ خود اس سلسلہ میں واضح احکام دے دیئے تھے اور یہی وہ نصوص ہیں جو امامت حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے باب میں متفقہ طور پر کتب اسلامیہ میں موجود ہیں جیسے دعوت عشیرہ کا اعلان اور غدیر خم کا خطبہ۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

"انہیں کیا انتظار ہے سوا اس کے کہ خود اللہ ان کے پاس آئے سفید بادلوں کے سائے میں، اور فرشتے اور ہر بات کا پورا فیصلہ ہو گیا ہو آخر میں تو سب چیزوں کی رجوع اللہ ہی کی طرف ہونا ہے۔"

اگر یہ آیت ترتیب نزول میں اسی محل کی ہے تو مطلب یہ ہے کہ رسولؐ کی زبان سے تو ہر طرح اس پیغام کی تبلیغ ہوگئی مگر یہ نہیں مانتے تو کیا اب اس کا انتظار ہے کہ خالق خود ملائکہ کی صفوں کے ساتھ آئے اور پھر یہ تسلیم کریں؟ اس صورت میں ان کا ایمان ایک غیر ممکن امر یعنی اللہ کے بر نفس نفیس تشریف لانے کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اور چوں کہ اس کا بذات خود آنا ان کے سامنے غیر ممکن ہے اس لئے ان کا ایمان لانا بھی ان کے اس

---

[۱]۔ فیما تفحصنا من کتب اللغة السلم بکسر السین وسکون اللام الصّلح والمراد منه الملائمة وعدم الحرب (البلاغی)

[۲]۔ عن الباقر علیہ السلام فی تفسیر السّلم فی الاٰیة قال فی ولایتنا (البلاغی)

[۳]۔ حملها علی الطاعة اعمّ ویدخل فیه ما رواه اصحابنا من انّ المراد الدخول فی الولایة (مجمع البیان)

انتظار کی وجہ سے غیر ممکن ہے۔

دوسرے مفسرین نے سفید بادلوں کے سائے میں اللہ کے آنے کے معنی اس کے عذاب یا اس کی طرف کے بڑے ہولناک اثارِ قدرت کے ان کے سامنے آنے کے قرار دیئے ہیں جس کا ہنگام روز قیامت کہلاتا ہے اس طرح مطلب یہ ہوگا کہ اس دنیا میں ایمان نہ لائیں گے بلکہ وہ قیامت کا انتظار کررہے ہیں [۱] جب ایمان کا محل باقی نہ ہوگا اور دورِ تکلیف ختم ہو چکا ہوگا۔

سَلْ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

"بنی اسرائیل سے پوچھو کہ ہم نے ان کے سامنے کتنے کھلے ہوئے معجزے پیش کیے [۲] اور جو اللہ کی نعمت کو اس کے آنے کے بعد بدل ڈالے تو یقیناً اللہ سخت سزا والا ہے۔"

جمہور کا انحراف کوئی عجیب بات نہیں:

اس میں امم سابقہ کے انکار اور اس کے نتائج کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کاش مسلمان اس سے متاثر ہوں۔ پھر اس کے بعد والوں کا استعجاب بھی دور کرنا ہے جیسا کہ بعض سادہ لوح یا دوسروں کی سادلوحی سے فائدہ اٹھانے والے آج بھی کہتے ہیں کہ پیغمبرِ خدا کی زبانی واضح بیانات نصب خلافت کے متعلق ہو گئے ہوتے تو بھلا اس دور کے جمہور مسلمین اس سے منحرف کیوں کر ہو سکتے تھے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ دیکھو اور ان کی تاریخ کے واقف کاروں سے پوچھو کہ ان کے سامنے کتنے کھلے ہوئے آثار قدرت اور دلائل حقانیت [۳] آئے اور پھر انہوں نے اثر نہ لیا تو پھر اگر اس امت میں بھی ایسا ہو تو تعجب کی کون سی بات ہے؟

آخر میں یہ بھی تنبیہ ہے کہ جو اللہ کی نعمت کو پانے کے بعد بدل ڈالے یعنی اسے قبول نہ کرے اور اس کے بالمقابل خود اپنا دل بخواہ انتظام کرے تو اللہ کی سزا بہت سخت ہے۔

اب اسے اس آیت کے ساتھ دیکھئے جہاں غدیر خم کے اعلان ولایت کے بعد کہا گیا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (مائدہ۔ ۲"آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی" تو اس کے بعد بات صاف ہو جائے گی پھر سن لیجئے وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ "جو اللہ کی نعمت کو اس کے آنے کے بدل ڈالے تو اللہ کی طرف سے اس کی سخت سزا ہے۔"

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ

---

[۱]۔ای ہل ینظرون الّا یوم القیمۃ (مجمع البیان)

[۲]۔معجزۃ ظاھرۃ علی ایدی انبیاءہم (صافی)

[۳]۔مثل الید البیضآء وقلب العصا حیۃ وفلق البحر وتظلیل الغمام علیہم وانزال المنّ والسّلوی (مجمع البیان)

اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

”جنہوں نے کفراختیارکیاان کے لئے دنیا کی زندگی بڑی آراستہ بنی ہوئی ہےاور وہ ان سے کہ جنہوں نے ایمان اختیارکیاتمسخرکرتے ہیں حالانکہ جنہوں نے پرہیزگاری سے کام لیاوہ روزقیامت ان سے بڑھے چڑھے ہوں گے اوراللہ جسے چاہتا ہےبے اندازہ روزی عطا کرتا ہے۔“

”دنیا کی زندگی آراستہ بنی ہوئی ہے یہ آراستہ بنا کرنظروں کو لبھانے والے داخلی طور پرخواہشات نفس اور بیرونی طور پر شیطانی ترغیبات ہیں[۱]۔

بعض لوگوں نے اس کا فاعل اللہ کوقرار دیا ہےمگر جب قرآن نے صیغۂ مجہول کے ساتھ فاعل کومبہم قرار دیا ہےتوخواہ مخواہ اس کی نسبت اللہ کی طرف قرار دے کر تاویلات تلاش کرنے کی ضرورت کیا ہے؟اور ہوسکتا ہے کہ اس کے مفہوم میں فاعل پرنظرہی نہ ہوبلکہ معنی یہ ہوں کہ یہ زندگی ان کفارکی نظرمیں بڑی آراستہ معلوم ہوتی ہے وہ اس کی محبت میں گرفتار اوراسکی زیب وزینت کے والہ وشیدا ہیں[۲]۔

وہ مومنین کے ساتھ تمسخرکرتے ہیں ان کے عقائدایمانیہ کےساتھ بھی اوران کے فقروفاقہ اوردین حق کی راہ میں پیش آمدہ مشکلات و مصائب پربھی[۳] حالانکہ کفارکی یہ برتری اس دنیامیں ہےجوگزران ہےاورآخرت جہان کی زندگی کوقیام ودوام ہے وہاں یہ دیکھ لیں گے کہ کون بلند درجہ رکھتا ہے!وہاں بلندی مومنین اورمتقین ہی سےمخصوص ہوگی۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

”سب آدمی اصل میں ایک ہی دین والے تھے اسی لئے اللہ نے پیغمبروں کوبھیجا ثواب وعذاب کی خبریں پہنچانے والا بنا کر اوران کے ساتھ قانون بھیجا سچائی کے ساتھ تاکہ ان میں جواختلاف پیدا ہوا ہو وہی قانون ان کے

---

[۱]۔زيّنها الشيطٰن واهوء النفس الامّارة (البلاغی)

[۲]۔حسنت فی اعينهم واشربت محبّتها فی قلوبهم حتی تهالكوا عليها (صافی)

[۳]۔يمكن حمله علی الجميع (مجمع البيان)

درمیان فیصلہ کن ہو اور اس قانون کے بارے میں اس کے بعد کی کھلی ہوئی دلیلیں ان کے سامنے آ چکی تھیں انہوں نے ہی اختلاف کیا کہ جنہیں وہ دیا گیا تھا تو اللہ نے انہیں جو ایمان لائے تھے اپنے حکم سے ان باتوں میں کہ جن میں وہ اختلاف رکھتے تھے خصوصی رہ نمائی فرمائی اور اللہ جسے چاہتا ہے اس کی سیدھے راستے کی طرف خصوصی رہنمائی فرماتا ہے۔''

اختلاف خلق اور انبیاء کی بعثت:

یہ آیت قرآن مجید کی مشکل آیتوں میں سمجھی گئی ہے جس سے بعض لوگوں نے اس توہم کی گنجائش پیدا کی کہ لوگوں کے درمیان شروع میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ انبیاؑ و مرسلین کے آنے سے اختلافات پیدا ہوئے تو ان اختلافات کی ذمہ داری خالق پر ہوئی۔ اسی لئے بعض لوگوں نے ضرورت محسوس کی کہ درمیان میں ایک جزء کو مقدر و محذوف مانیں اس طرح کہ سب ایک ہی دین پر تھے، پھر ان میں اختلافات پیدا ہوئے اس وقت خدا نے انبیاء بھیجے[1] اب اختلافات کا پیدا ہونا انبیاء کے آنے سے قبل کی بات ہوگئی اور ذمہ داری خدا پر نہ رہی۔

ہمارے نزدیک امة واحدة کے فقرہ کا تعلق ان میں باہمی اختلاف ہونے نہ ہونے کے ساتھ ہے ہی نہیں بلکہ اس سے مقصود وہی ہے جسے دوسرے جگہ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِ سْلَامُ کے لفظوں میں کہا گیا ہے یعنی تمام خلاق کے لئے دین حقیقی اللہ کی طرف سے ایک ہی ہے یہ نہیں کہ وہ مختلف ادیان و مذاہب میں بٹ گئے ہیں تو یہ سب دین خدا کی طرف سے ہوں اور وہ ان کے اختلاف سے راضی ہو بلکہ اس کی طرف سے تو ان سب کا ایک ہی دین ہونا چاہیے۔ اب اگر ان میں اختلاف ہے تو اس میں جو اس دین حقیقی کے مطابق ہے وہ حق ہے اور جو اس سے الگ ہے وہ باطل ہے۔ وہ وہی ایک راستہ ہے جسے سورہ دہر میں تمام نوع انسانی کی طرف نسبت دے کر کہا گیا ہے کہ انا هدينه السبيل ہم نے اس کو ایک راستے کی طرف ہدایت کی اسی اتحاد دین کو اس آیت میں امۃ واحدہ کہہ کر ظاہر کیا گیا ہے[2] وانزل معهم الكتاب 'ان انبیاء کے ساتھ کتاب نازل کی اس میں عام طور سے کتاب کا مفہوم لکھے ہوئے مجموعہ کا لیا جاتا ہے اس لئے یہ دشواری محسوس ہوئی ہے کہ انبیاء میں سے ہر ایک کے ساتھ تو کتاب نازل نہیں ہوئی صاحب کتاب انبیاء تو معدودے یعنی چند ہی ہیں۔ زیادہ تر انبیاء سابق کی نازل شدہ کتاب کے پیرو اور اس کے مبلغ ہوتے تھے۔ اس لئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ هم کی ضمیر جو معهم میں ہے کل مجموعی کے طور پر ہے کہ اس سلسلۂ انبیاء کے ساتھ کتاب اتاری گئی نہ کل افرادی کے طور پر جس کے معنی یہ ہوں کہ ہر ایک کے ساتھ کتاب اتری[3]

ہمارا ذوق یہ کہتا ہے کہ اس صورت میں انزل معهم الكتب جمع کے صیغہ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا کیونکہ سب کے ساتھ ایک ہی کتاب تو نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ متعدد کتابیں متعدد انبیاء پر نازل ہوئیں۔

اس مفرد کتاب کے لفظ سے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ لکھا ہوا مجموعہ مراد ہی نہیں ہے جسے ہماری عرف عام میں کتاب کہتے ہیں بلکہ یہ کتاب

---

[1]۔ای اختلفوا فبعث اللہ (بیضاوی)

[2]۔ھی ھنا بمعنی الملّۃ والدّین (مجمع البیان)

[3]۔لا یرید بہ انّہ انزل مع کلّ واحد کتابا یخصّہ (بیضاوی)

کتب سے ہے جس کے معنی فرض کے ہیں جس کے اعتبار سے کہا گیا ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (نساء۔ ۱۰۳) اور اس طرح کتاب کے معنی اس آیت میں قانون الٰہی کے ہیں۔ بعض دوسری آیات قرآن میں بھی ایسے شواہد ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب کا استعمال متعدد جگہ قرآن مجید میں قانون کے معنی میں ہوا ہے اور اس آیت میں بھی یہی معنی مراد ہیں جیسا کہ میں نے ترجمہ کیا ہے کہ ان کے ساتھ قانون بھیجا اور قانون الٰہی درحقیقت سب انبیاء کے ساتھ والا ایک ہی تھا یہ اور بات ہے کہ اس کے بعض اور دفعات میں با اختلاف حالات ظرف زمان ومکان کچھ تبدیلیاں ہوتی رہی ہوں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

''کیا تم سمجھتے ہو[۱] کہ تم بہشت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کی سی صورتیں پیش نہیں آئیں کہ انہیں فقر و فاقہ اور سختیاں درپیش ہوئیں اور انہیں ہچکولے دیے گئے یہاں تک پیغمبر اور ان کے ساتھ کے ایمان لانے والے کہنے لگے کہ آخر اللہ کی مدد کب آئے گی خبردار رہو کہ بلاشبہ اللہ کی مدد نزدیک ہی ہے۔''

قرآن مجید میں متعدد آیات کے آغاز ام حسبتم ان تدخلوا الجنة سے ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی ایک جماعت تھی جو بہشت میں جانے کو بالکل آسان سمجھتی تھی اور آج بھی مسلمان عوام نے بہشت کو بس کچھ دعاؤں اور کچھ الٹی سیدھی نمازوں اور رسمی عبادتوں سے وابستہ سمجھ لیا ہے۔ قرآن مجید نے یہ کہہ کہہ کر کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم بہشت میں چلے جاؤ گے انہی خام خیالیوں کی رد کی ہے دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ (آل عمران۔ ۱۴۲) کیا تم سمجھتے ہو کہ بہشت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی یہ ثابت ہی نہیں ہوا کہ تم میں سچے جہاد کرنے والے اور ثابت قدم رہنے والے کون ہیں' اور یہاں کہا جا رہا ہے کہ آخر تمہارے پہلے انبیاء کی امتیں بھی تو ان انبیاء پر ایمان لا کے بہشت کی منتظر رہنے کا حق رکھتی تھیں مگر دیکھو تو ان کی کیسی کیسی آزمائشیں ہوئیں پھر تم لوگ بلا کسی آزمائش کے بسہولت جنت میں جانے کے کیوں متوقع ہو؟

گزشتہ امتوں پر ایسی ایسی سختیاں پڑی تھیں کہ ان کے رسول اور یمان لانے والے رفقائے رسول بھی گھبرا کر کہتے تھے کہ آخر خدا کی مدد کب آئے گی؟ یہ کب بطور اعتراض نہیں ہوتا تھا بلکہ بطور اظہار تمنا ہوا کرتا تھا[۲]۔

یہ اس صورت میں ہے کہ جب یہ متیٰ نصر اللہ بھی رسولؑ ہی کا کلام ہوا اور اگر بعض مفسرین کے خیال کے مطابق یہ سمجھا جائے کہ یہ

---

[۱]۔ ام منقطعة ومعنى الهمزة فيها الانكار (بیضاوی)

[۲]۔ قال له الرسول استبطاء للنّصر على جهة التمنّي (مجمع البیان)

رسولؐ اور مومنین کی باہمی گفتگو کا بیان ہے کہ مومنین گھبرا کر کہتے تھے کہ متیٰ نصر اللہ اور پیغمبرؐ جواب دیتے تھے الا ان نصر اللہ قریب گھبراؤ نہیں خدا کی مدد نزدیک ہے تو مطلب بالکل صاف ہے۔ اس صورت میں آیت کے الفاظ لف و نشر غیر مرتب کے قبیل سے ہوں گے کہ بات چیت کرنے والوں کے ذکر میں تو رسولؐ کا ذکر مقدم اور الذین امنوا کا موخر ہے اور ان کی گفتگو کا جب ذکر ہو تو الذی امنو کا قول پہلے بیان ہو گیا اور رسول کا بعد کو۔ اور بلاغت اس عکس ترتیب کی متقاضی اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ گفتگو کرنے والوں کے ذکر میں رسولؐ کو تقدم بلحاظ شرف تھا اور نیز اس لئے کہ امنوا کے ساتھ معه یعنی اس رسولؐ کے ساتھ ہونے کا ذکر کرنا تھا ضمیر کے ساتھ جس کے لئے مرجع کا تقدم لازم تھا اور گفتگو کے محل پر مومنین کا قول سوال ہے جس کا درجہ باعتبار رتبہ و بلحاظ وقت مقدم ہوتا ہی ہے اور رسولؐ کا قول اس کا جواب ہے جو طبعاً لازمی طور پر مؤخر ہی ہوا کرتا ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں؟ کہہ دیجئے کہ جو مال بھی تم صرف کرنا چاہو ماں، باپ، عزیزوں، یتیموں اور غریبوں اور مسافروں کا حق اور جو بھی نیک کام کرو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

مستحقینِ خیرات:

الفاظ آیت سے تو پتہ چلتا ہے کہ سوال یہ تھا کہ کیا خیرات کریں اور جواب میں یہ بتایا گیا کہ کس کس پر صرف کریں مگر شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال میں دونوں جزء تھے یہ بھی کیا خیرات کریں اور یہ بھی کہ کس کس کو دیں[1] بے شک جواب میں پہلے جز کو مبہم چھوڑ دیا گیا یہ کہہ کر کہ ما انفقتم من خیر جو مال[2] بھی تم صرف کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہاں لحاظ کی ضرورت اس کی ہے کہ جو دیا جائے، وہ کن لوگوں کو دیا جائے[3] کہ مصرف صحیح میں صرف ہو۔ اس کو تفصیل سے بیان کیا جا رہا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال اس مقدار مقرر کے علاوہ انفاق کے لئے تھا جو بطور زکوۃ ہر مسلمان پر واجب ہے[4] اس لئے اس میں مقدار خیرات کو دینے والے کی مرضی پر چھوڑا ہے اور مستحقین میں والدین کا ذکر کیا ہے حالانکہ زکوۃ واجب کا اپنے والدین کو دینا شرعاً جائز نہیں ہے۔

---

[1] ۔ نزلت فی عمرو بن الجموح و کان شیخا کبیرا اذا مال کثیر فقال یا رسول اللہ ﷺ ماذا اتصدق و علی من اتصدّق (مجمع البیان)

[2] ۔ من خیر من مال (صافی)

[3] ۔ سئل عن المنفق و اجیب ببیان المصرف لانہ اھم (صافی)

[4] ۔ لیس فی الاٰیۃ ماینافی فرض الزّکوٰۃ (صافی)

كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ وَهُوَ كُرۡهٌ لَّكُمۡ ۚ وَعَسٰٓى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـًٔا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ۚ وَعَسٰٓى اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾

”تم پر جنگ کرنا فرض کیا گیا ہے کہ حالانکہ وہ تمہیں شاق و ناگوار ہے [1] اور بہت ممکن ہے کسی چیز کو تم ناپسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے اچھی ہے اور بہت ممکن ہے کسی چیز کو تم پسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے بری ہے بات یہ ہے کہ اللہ علم رکھتا ہے اور تم علم نہیں رکھتے۔“

حکم جہاد بصورت قتال:

اس آیت میں صاف صاف شریعت اسلام میں جہاد کے فرض ہونے کا قتال کے لفظ کے ساتھ اعلان ہوا ہے جو قتل سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے جس سے غیر کے ساتھ مقابلہ کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ قتل کے معنی مار ڈالنے کے ہیں تو قتال کے معنی کیا ہوئے؟ دوسروں کے مقابلہ میں مرنا مارنا۔ اس سے ان لوگوں کے تصورات کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو اسلامی تعلیمات کو مطلق عدم تشدد کے ساتھ ساز گار بنانے کے لئے لفظ جہاد کے لغوی معنی سے جو جہد یعنی کوشش سے ماخوذ ہیں فائدہ، اٹھا کر اسے مقاومت مجہول وغیرہ پر منطبق کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ بہت ممکن ہے کسی چیز کو تم ناپسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے اچھی ہے اور بہت ممکن ہے تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے بری ہے اور اس کے بعد آخر میں یہ کہنا کہ واللہ یعلم وانتم لا تعلمون اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔“ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اچھائی اور برائی ایک واقعیت ہے جو اشیاء میں بذات خود مضمر ہے اور اسی کی بناء پر احکام الٰہیہ ہوتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ناقص العقل افراد انسان کو اس کی خبر نہ ہو [2] یہی عدلیہ کا مسلک ہے جو قرآن مجید کے بالکل مطابق ہے۔

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الشَّهۡرِ الۡحَرَامِ قِتَالٍ فِيۡهِ ؕ قُلۡ قِتَالٌ فِيۡهِ كَبِيۡرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَكُفۡرٌۢ بِهٖ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ۚ وَاِخۡرَاجُ اَهۡلِهٖ مِنۡهُ اَكۡبَرُ عِنۡدَ اللّٰهِ ۚ وَالۡفِتۡنَةُ اَكۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِ ؕ وَلَا يَزَالُوۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ حَتّٰى يَرُدُّوۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِكُمۡ اِنِ اسۡتَطَاعُوۡا ؕ وَمَنۡ يَّرۡتَدِدۡ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَيَمُتۡ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓـئِكَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ

---

[1]۔ شاق علیکم مکروہ طبعاً (صافی)

[2]۔ فیہ دلیل علیٰ ان الاحکام تتبع المصالح الراجحۃ وان لم تعرف عینھا (بیضاوی)

فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۱۷﴾

"آپ سے لوگ حرمت والے مہینے میں جنگ کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہہ دیجئے کہ اس میں جنگ بڑا جرم ہے [۱] اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کا انکار اور مسجد حرام کا اور اس کے باشندوں کا وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بڑا گناہ ہے اور فتنہ وفساد قتل سے بھی بری چیز اور وہ لوگ تم لوگوں سے برابر لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو وہ تمہیں تمہارے دین سے پلٹا دیں اور جو تم میں سے اپنے دین سے پھر کر کفر کی حالت میں دنیا سے جائے تو یہ وہ ہوں گے جن کے اعمال دنیا وآخرت میں اکارت ہو گئے اور یہ دوزخ والے ہیں جو اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔"

اس واقعہ کے متعلق ایک آیت میں پہلے **والفتنة اشدّ من القتل** کے الفاظ میں اشارہ ہو چکا ہے۔ کچھ مسلمانوں نے رجب کی پہلی تاریخ یہ سمجھ کر کہ ابھی چاند نہیں ہوا ہے مشرکین کے کسی گروہ پر جو لوٹ مار کے لئے مدینہ کی اطراف میں آیا تھا حملہ کر کے کسی ایک کو قتل کر دیا۔ اس پر مشرکین نے ایک طوفان برپا کر دیا کہ مسلمان محترم مہینوں کا احترام نہیں کرتے اور بظاہر خود مسلمانوں کے بھی ایک طبقہ میں بے چینی پیدا ہوئی اور وہ آ کر رسولؐ سے اس سے متعلق دریافت کرنے لگے۔ قرآن نے اس کے جواب میں مسلمانوں کو کہا ہے کہ تمہیں اس کا اقرار کر لینا چاہیے کہ ماہ حرام میں جنگ گناہ ہے مگر اس کے ساتھ مشرکین کو ان کے کردار پر بھی تو متنبہ کرو کہ وہ ایسے ایسے جرائم کے مرتکب ہیں جو اس سے بہت زیادہ بڑے گناہ ہیں لہٰذا ان کی زبان سے تو اس پر اعتراض کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا ان کے جرائم کیا کیا ہیں؟

پہلے **صد عن سبیل اللہ** خدا کی راہ یعنی قبول اسلام سے لوگوں کو روکنا جس کے شروع سے برابر وہ مرتکب رہے ہیں۔

دوسرے **کفر بہ** اس دین خدا سے انکار وانحراف رکھنا۔"

تیسرے **والمسجد الحرام** یہ لفظی حیثیت سے **کفر بہ** کے قریب ہے اس لئے صاف یہ معنی ہوتے ہیں کہ اور مسجد حرام کے ساتھ کفر، یعنی اس کی حرمت کا انکار مگر اس عام نحوی اصول نے کہ ضمیر جار پر بغیر اعادہ حرف جر عطف نہیں ہونا چاہیے [۲] بعض مفسرین کو مجبور کر دیا ہے کہ عطف **سبیل اللہ** پر لیا جائے یعنی مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکنا مگر اس عطف میں معطوف علیہ اور معطوف کے درمیان ایک اجنبی کا فصل جو پیدا ہوتا ہے یعنی **صد عن سبیل اللہ** کے بعد **و کفر بہ** آ گیا اور اس کے بعد اب جو **والمسجد الحرام** آیا تو اس کا عطف درمیان **کفر بہ** کے فقرہ کو چھوڑ کر اس کے قبل والے **سبیل اللہ** پر ہو جائے یہ خالی از تکلف نہیں ہے جس کی دوسری نظیر یعنی آیہ وضو میں **فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق** کے بعد **وامسحوا** آ گیا اور اس کے بعد جو **وارجلکم** کا لفظ آیا تو اسے **رءوسکم** پر عطف نہ لیا جائے جس سے پیروں کا مسح ثابت ہو بلکہ اس کے قبل **وجوھکم** پر عطف قرار دیا جائے جس سے پیروں کا وضو میں دھونا ثابت ہو جائے۔ یہ ہمارے لئے

---

[۱]۔ کبیر ای ذنب کبیر (بیضاوی)

[۲]۔ لا یجوز حملہ علی الباء فی قولہ وکفر بہ لانہ لا یعطف علی الضمیر المجرور الّا باعادۃ الجار الّا فی ضرورۃ شعر (مجمع البیان) ۲۔ (مائدہ۔۶)

بالاجماع قابل قبول نہیں مانا گیا اور بعض مصنف مزاج مفسرین اہل سنت نے بھی اس بارے میں ہم سے اتفاق کیا ہے اور ارجلکم کا عطف رءوسکم ہی پر لیا جو کہ قریب ہے اور جس کا مسح لازم ہے تو ویسا ہی بالکل یہاں ہے اس کو کیوں قبول کیا جائے بلکہ کفر بہ کے تحت میں اس کو لینا چاہے اور اگر ضمیر مجرور پر عطف بغیر اعادہ جار بالکل ہی غیر ممکن معلوم ہو تو اس معطوف میں جار کو مقدر مان لیا جائے [1] جس سے نحوی قاعدہ کی مخالفت دور ہو جائے گی میں اسے بہتر سمجھتا ہوں، اسی لئے میں نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔

چوتھے: مسجد حرام کے جو اہل و مستحق ہیں یعنی رسولؐ اور ان کے ساتھ مومنین ان کو مسجد حرام اور مکہ معظّمہ سے جلاوطن ہونے پر مجبور کرنا یہ سب باتیں بہت بڑا جرم ہیں۔

اور پھر **پانچویں** خاص اس معاملہ یہ شورش کا طوفان اٹھانا جو پوری قوم کے امن کو غارت کرنے کا سبب ہے۔ یہ ان دو ایک آدمیوں کے قتل سے زیادہ بڑا جرم ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو مخاطب بنا کر کہا گیا ہے کہ ان کفار سے جنگ کوئی وقتی چیز تھوڑی ہے۔ یہ تو ایک مستقل جنگ ہے جسے یہ جب تک ان کے دم میں دم ہے جاری رکھیں گئے یا اس وقت چین لیں گے جب تم اس دین سے منحرف ہو کر شرک و کفر میں ان کے ہم نوا بن جاؤ۔

ختم کلام پر مسلمانوں سے یہ تخاطب بتلاتا ہے کہ آ آ کر سوال کرنے والے مسلمان ہی تھے [2] اور اس لئے آخر میں تو شدید انتباہ کیا گیا ہے کہ اگر تم ایسے وساوس میں مبتلا ہو کر دین سے منحرف ہو گئے تو اپنی شدید ترین ہلاکت کا سامان کرو گے اور اب تک کے اپنے سب کئے کرائے اعمال خیر پر پانی پھیر دو گے اور پھر تم میں ان کفار و مشرکین میں انجام کے اعتبار سے کوئی بھی فرق نہیں رہے گا بلکہ تم انہی کی طرف مخلد فی النار ہو گے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۙ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢١٨﴾

"بلاشبہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

چوں کہ اسم موصول الذین دو دفعہ لایا گیا ہے، ایک دفعہ ایمان لانے کی صفت کے ساتھ الذین امنوا اور پھر ہجرت و جہاد کے وصفت کے ساتھ: والذین ھاجروا و جاھدوا اس لئے ہو سکتا ہے کہ جو ایمان لائے ان سے مراد وہ مکہ معظّمہ میں باقی ماندہ اہل ایمان ہوں جنہوں نے ابھی ہجرت نہیں کی ہے اور بعد کے اوصاف میں مہاجرین مراد ہوں اور ہو سکتا ہے کہ ایک ہی جماعت مراد ہو اور الذین کی تکرار ہر وصف کے مستقل طور پر باعث رحمت الٰہی ہونے کے اظہار کے لئے ہو [3]۔

---

[1] ۔ و بالمسجد الحرام علیٰ تقدیر الباء (صافی)

[2] ۔ فیہ مناسبۃ لان یکونوا ھم السائلین (البلاغی)

[3] ۔ کرر لفظ الذین للعنایۃ بہجرتہم و جہادھم (البلاغی)

اس ایمان اور ہجرت و جہاد کے بعد بھی یہ نہیں کہا جارہا ہے کہ انہیں رحمت الٰہی کا یقین ہے بلکہ امید کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو اندیشہ خلاف کا پتہ دیتا ہے اس لئے کہ ایمان وغیرہ کے بعد بھی انہیں اپنے اعمال کی کمزوری کا تصور اور اس لئے سزا کا دھڑکا لگا رہتا ہے جس پر تفضّل الٰہی سے مغفرت کے امیدوار رہتے ہیں [1] یہی امید وبیم ایمان کا خاص جوہر ہیں [2]۔

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَالۡمَيۡسِرِ‌ؕ قُلۡ فِيۡهِمَآ اِثۡمٌ كَبِيۡرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثۡمُهُمَآ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا ؕ وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ‌ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ ۝۲۱۹ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ‌ؕ وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡيَتٰمٰى‌ؕ قُلۡ اِصۡلَاحٌ لَّهُمۡ خَيۡرٌ‌ؕ وَاِنۡ تُخَالِطُوۡهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ الۡمُفۡسِدَ مِنَ الۡمُصۡلِحِ‌ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعۡنَتَكُمۡ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۝۲۲۰

”آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے کچھ فائدہ بھی ہیں مگر ان کا گناہ ان فائدوں سے بڑا ہے اور یہ پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات کریں؟ کہیے کہ جتنا فاضل ہو۔ اس طرح اللہ اپنی ہدایتیں تمہارے لئے بیان کرتا ہے شاید کہ تم دنیا اور آخرت کے بارے میں غور وفکر سے کام لو۔ اور آپ سے پوچھتے ہیں یتیموں کے متعلق کہہ دیجئے کہ ان کے لئے بندوبست کرنا بہتر ہے اور اگر ان سے مل کر رہو تو وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں اور اللہ خرابی کرنے والے اور درستی کرنے والے کے فرق کو خوب جانتا ہے اور اگر وہ چاہتا تو تمہیں مشکل میں ڈال دیتا یقیناً اللہ بڑا زبردست ہے بڑا سوجھ بوجھ والا۔“

قرآن مجید کے متداول نسخوں میں تتفکرون اور فی الدنیا والاخرۃ کے درمیان آیت کا گول نشان بنا ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ دو آیتیں ہوگئی ہیں جو قاریان کوفہ کے مسلک کے مطابق ہے مگر دوسرے تمام قاری اس سب کو ایک آیت مانتے ہیں [3] اور معنوی طور پر بھی بلاشبہ فی الدنیا والاخرۃ کا جزء تتفکرون سے متعلق ہے۔ اسی لئے ہم نے اس سب کی یکجا تفسیر لکھنا ضروری سمجھا۔ بہرحال یہ ایک آیت ہو یا دو آیتیں اس محل پر چند احکام شریعت کا بیان ہوا ہے۔

---

[1]۔ یرجون رحمۃ اللہ فی غفران معاصیہم (مجمع البیان)

[2]۔ من الواجب علی المؤمنین ان لاییأس من رحمۃ ولا یأمن من عقوبتہ (مجمع)

[3]۔ ایتان فی الکوفی وایۃ واحدۃ فیما عدا الکوفی (مجمع البیان)

(۱)خمر کے متعلق سوال ہوا خمر کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں اسی لئے سر پر ڈالی جانے والی اوڑھنی کو خمار کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے اس پینے کی نشہ والی چیز کو جو عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے خمر کہا جانے لگا[1]۔

زمانہ جاہلیت میں شراب کا عام رواج تھا۔اسلام کے شرعی احکام چوں کہ تدریجی طور پر آئے اس لئے شروع شروع اس بارے میں پیغمبر خداؐ خاموش رہے۔صرف وہ جو خدا کی طرف سے بصیرت ایمانی کے حامل بنائے گئے تھےاس سے الگ تھے۔غالباً خالق کریم کو انتظار تھا کہ افراد جمہور میں خود اپنا شعور پیدا ہو کہ ان کا ضمیر اس فعل سے خلش محسوس کرنے لگے چنانچہ وہی ہوا کہ بعض مسلمانوں کو خود اس کے متعلق ایک طرح کی ذہنی بے چینی پیدا ہوئی اور انہوں نے پیغمبر خدا ﷺ کے پاس آ کر کہا کہ یہ شراب جو انسان کو بے عقل بنا دیتی ہے کیا جائز ہے؟

(۲)میسر یہ کیا ہے؟ قمار یعنی جوا۔اس کی بھی یہی شکل ہے شراب کے ساتھ ساتھ آ کر قمار کے متعلق بھی دریافت کیا گیا کہ یہ بہت سوں کو مالی حیثیت سے تباہ کر دینے والی چیز ہے۔اس کا قانون الٰہی میں کیا حکم ہے؟انہی دونوں سوالوں کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی[2]۔

میسر چاہیے ابتدا میں کسی خاص قسم کے کھیل کا نام ہو لیکن حکم شرعی کے لحاظ سے ہر قسم کا جوا اس کے تحت میں ہے[3] چنانچہ لاٹری اور گھوڑ دوڑ میں شرکت کرنا بھی اسی میں داخل ہے۔

چوں کہ ابھی کچھ لوگوں کی نظر اس کے مضرات پر گئی تھی اور بہت سے ابھی اس کی خوش آیند لذتوں اور مفت کی دولت کے حصول کی تمناؤں کا تصور رکھتے تھے اس لئے قرآن مجید نے حکیمانہ انداز بیان اختیار کرتے ہوئے اس مجمع کے بھی تصورات کو سامنے رکھا جو اس کے خوش آیند پہلوؤں کا گرویدہ ہے اور دوا کی اس پہلی خوراک میں ہلکی تحریک انہیں پیدا کرنا چاہی کہ وہ ذرا چونک کر اس کے تاریک پہلوؤں پر بھی متوجہ ہوسکیں تو ارشاد کیا کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔ہاں عام لوگوں کے لحاظ سے کچھ فائدے بھی ہیں مگر گناہ کی اہمیت ان فائدوں سے زیادہ سے لہٰذا عقلی معیار پر وہ ناقابل ارتکاب عمل ہو گا کیوں کہ چھوٹا فائدہ جب بڑی مضرت کے ساتھ ہو تو وہ فائدہ نظر انداز کر دینے کے قابل ہوا کرتا ہے اور اس لئے سمجھنے والوں کے لئے یہی آیت حرمت شراب ثابت کر دینے کے لئے کافی تھی مگر اس کے بعد پھر اس بارے میں رفتہ رفتہ زیادہ واضح آیتیں نازل ہوئیں جن کا بیان اپنے اپنے محل پر آئے گا۔

خیرات کی مقدار:

(۳)وہی سوال جو پہلے ہو چکا تھا: ماذا ینفقون ’’کیا صرف کریں؟‘‘ وہاں ہم نے کہا تھا کہ دو سوال ہوئے تھے۔ایک یہ کہ کیا خیرات کریں؟ دوسرے کن کو دیں؟ چوں کہ پہلے جزء کے متعلق کوئی خاص بات کہنا نہ تھی اس لئے اس کا مبہم طور پر من خیر کی لفظ سے جواب دے دیا تھا کہ جو بھی مال خیرات میں دو یعنی اس میں اختیار ہے مگر وہ دو کسے؟ اسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مسائل پہلے جو جزء کے بارے میں اس ابہام کے مفاد کو نہیں سمجھے اور اب اس جزء کو خاص طور پر پھر پوچھا کہ یہ تو بتائیے کہ کیا خیرات کریں؟ تو اب اس کا جواب

---

[1]۔ھی کل شراب مُسکر مخالط للعقل مغط علیه (مجمع البیان)

[2]۔اتوا رسول اللہ ﷺ فقالوا افتنا فی الخمر والمیسر فانہا مذھبۃ للعقل مسلبۃ للمال فنزلت الاٰیۃ. (مجمع)

[3]۔ھو القمار کلّہ وھو المرویّ عن ائمّتنا علیھم السلام (مجمع البیان)

پھر ایک لفظ سے دیا گیا کہ العفو یعنی اس کا پوچھنا کیا ہے جتنا تمہارے روزمرہ کی ضروریات سے فاضل بچے [1] اور یہی وہ ہے جسے انسان بلا زحمت دے سکتا ہے جو العفو ے دوسرے معنی ہیں [2]۔

اب چوں کہ اس کا خود شارع کی طرف سے بہ طور حکم نہ آنا بلکہ لوگوں کے بار بار سوال پر بیان کیا جانا خود اس کا قرینہ ہے کہ وہ کوئی لازمی قانون نہیں بلکہ خوشنودی باری تعالیٰ کی خاطر بخوشی خیرات سے متعلق ہے جسے صدقہ مستحبّی کہتے ہیں اس لئے احکام زکوۃ سے اسے منسوخ سمجھنے کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ بے شک اس بارے میں ایک روایت بھی وارد ہوئی ہے [3] مگر اس کی سند ایسی نہیں ہے کہ اس کا ماننا لازم ہو۔

اب چوں کہ العفو کے مفہوم میں یہ تھا کہ جو روزمرہ کی ضروریات سے فاضل ہو وہ راہ خدا میں دو یہ روزمرہ کی ضروریات کا لحاظ شارع کی طرف سے مفاد دنیا کا تحفظ ہے اور فاضل کو راہ خدا میں دینے کا حکم اخروی مفاد کی خاطر ہے اس لئے اس کے بعد ارشاد ہوا ہے: ذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ○ یعنی اللہ نے ایسے احکام تمہارے لئے نافذ کیے ہیں جن پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ دنیا اور آخرت دونوں کا مفاد کس طرح محفوظ رکھا گیا ہے اور یہ درحقیقت شریعت اسلام کے حکیمانہ نظام کی وہ خصوصیت ہے جو اس کی ابدیت کی ذمہ دار ہے۔

یتیموں کی بہبودی:

(۴) ایتام کے بارے میں یہ سوال کب کیا گیا اس کا موجودہ ترتیب قرآن سے کہاں پتہ چل سکتا ہے؟ روایت بتاتی ہے کہ جب سورہ نساء کی یہ آیت اتری کہ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡيَتٰمٰى ظُلۡمًا اِنَّمَا يَاۡكُلُوۡنَ فِىۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا ‌ؕ وَسَيَصۡلَوۡنَ سَعِيۡرًا ’جو یتیموں کے اموال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے شکموں میں آگ بھرتے ہیں اور عنقریب اس کی گرمی کا مزہ چکھیں گے تو جن جن لوگوں نے کچھ ایتام کی سرپرستی اختیار کر رکھی تھی ان میں اس وعید الٰہی سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ انہوں نے سوچا اس خطرہ عذاب سے بچنے کیلئے بہتر تو یہ ہے کہ ایتام سے کوئی رابطہ ہی نہ رکھا جائے ان کو اپنے یہاں رکھنا ہی خطرناک ہے اور اسے آ کر پیغمبرؐ سے پوچھنا شروع کیا چنانچہ اس غیر معتدل رجحان کو متوازن بنانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی مطلب یہ ہے کہ ان کے اموال کو ناحق کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ نہ یہ کہ ان کے حالات کو سدھارنے اور ان کی پرورش کرنے کے لئے جو تم حسن سلوک کرتے ہو [4] اس سے باز آ جاؤ۔ یہ ہرگز کوئی اچھی بات نہیں ہوگی اور پھر ایتام کوئی اور نہیں تمہارے بھائی ہی تو ہیں۔ بھائی کے معاملات سے انسان کو وابستگی ہونا چاہیے [5] ہاں تمہاری نیت بخیر اور تمہارا عمل ایتام کی بہبودی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہونا چاہیے اور اس کا دیکھنے والا خالق عالم خود ہے وہ خود جانتا ہے کہ کون اس لئے ایتام کو اپنے ساتھ رکھتا ہے کہ ان کی کم سنی نادانی اور بے چارگی سے فائدہ اٹھا کر ان کے اموال کو خورد برد کرے اور کون انہیں اس لئے رکھتا ہے کہ ان کے اموال کی حفاظت اور ان کی پرورش کا سامان کرے۔ اور خالق حکیم جو رؤف و رحیم بھی

---

[1]۔ العفو ما خوذ من الزیادۃ (مجمع البیان)

[2]۔ العفو نقیض الجھد وھو ان ینفق ما تیسّر لہ بذلہ ولا یبلغ بہ الی الجھد (بیضاوی صافی)

[3]۔ العفو ما فضل عن قوت السنۃ عن ابی جعفر علیہ السلام الباقر علیہ السلام قال و نسخ ذلک بآیۃ الزکوٰۃ (مجمع)

[4]۔ بتولی امر ھم و حفظ اموالھم و الانفاق علیھم منھا و تربیتھم و تادیبھم و تعلیمھم (البلاغی)

[5]۔ ای انھم اخوانکم فی الدین و من حق الاخ ان یخالط (بیضاوی)

ہے اس کا تو طریق عمل یہی ہے کہ وہ بغیر زحمت و مشقت میں ڈالے ہوئے چاہتا ہے کہ جو بلند مقاصد ہیں ان کو صدمہ نہ پہنچے۔

ولو شاء اللہ لا عنتکم یعنی خالق اگر صرف اپنی شان حاکمیت سے کام لے کر تمہارے لئے ہی پابندیہ عائد کر دیتا کہ تمہیں ایتام کے اموال میں ہاتھ لگانا اور ان اموال کے ساتھ ان کی آمیزش کرنا حرام ہے [۱] مگر ایتام کی کفالت اور ان کے اموال کی حفاظت تم پر واجب ہے۔ اگر وہ یہ کر دیتا تو تمہیں اس کی پابندی لازم ہوتی مگر وہ تو خود تمہارے لئے سہولت پسندی سے کام لیا ہے اور تمہیں زحمت میں ڈالنا نہیں چاہتا اس لئے تمہیں ان کے ساتھ آمیزش سے منع نہیں کرتا ہاں یہ شرط ہے کہ ان کے نقصان کے درپے نہ ہو۔

آخری دو الفاظ عزیز اور حکیم ان دونوں مثبت اور منفی پہلوؤں سے متعلق ہیں اللہ عزیز یعنی غالب و قاہر ہے لہٰذا اگر وہ چاہتا تو مشقت میں ڈال سکتا تھا اور وہ حکیم ہے لہٰذا وہ اپنی مشیت کو حکمت و مصلحت کے خلاف کبھی جاری نہیں کرتا اور مشقت میں ڈالنا اس کی شان حکمت کے خلاف ہے [۲]۔

وَلَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ ۚ وَلَا تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَتّٰى يُؤۡمِنُوۡا ؕ وَلَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدۡعُوۡنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدۡعُوۡٓا اِلَى الۡجَنَّةِ وَالۡمَغۡفِرَةِ بِاِذۡنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ۝۲۲۱

"اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور یقیناً باایمان کنیز مشرک بیوی [۳] سے بہتر ہے چاہے وہ تمہیں پسند بھی ہو اور مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں یقیناً مسلمان غلام مشرک شوہر [۴] سے بہتر ہے چاہے وہ تمہیں پسند بھی ہو، یہ لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تمہیں بہشت اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے بلاتا ہے اور اپنے احکام لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان کرتا ہے شاید کہ وہ اثر لیں۔"

غیر مسلموں سے شادی بیاہ کی ممانعت:

یہ آیت اس حکم شرعی کا قطعی طور پر ثبوت ہے کہ غیر مسلمین کے ساتھ شادی بیاہ کرنا اسلام میں حرام ہے بے شک سورۂ مائدہ میں ایک جگہ

---

[۱]۔ لحملکم علی العنت وھی المشقۃ ولم یجوّز لکم مدا خلتم (صافی)

[۲]۔ عزیز غالب یقدر علی الاعنات حکیم یحکم ما یقتضیہ الحکمۃ ویتسع لہ الطاقتہ (بیضاوی)

[۳]۔ حرّۃ (صافی)

[۴]۔ حرّ (صافی)

اہل کتاب کی عورتوں سے تعلقات ازدواجی کا ذکر ہے اس طرح کہ: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ مگر اس میں یہ فقرہ موجود ہے کہ اِذَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ''جب تم ان کی اجرتیں دے دو''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نکاح متعہ سے متعلق ہے جو وقت ضرورت عارضی طور پر ہوا کرتا ہے۔ اس میں یہ وسعت دی گئی ہے کہ جب مسلمان عورتیں ایسی موجود نہ ہوں تو اس عارضی صورت میں بھی بت پرست عورتوں کی طرف رخ کرنا قطعاً جائز نہیں ہے پھر اگر توجہ کرو تو اہل کتاب عورتوں کی طرف مگر نکاح دائمی ان سے بھی جائز نہیں ہے جسے ایک اور آیت میں ان الفاظ میں منع کیا گیا ہے وَلَا تُمْسِکُوْا بِعِصَمِ الْکَوَافِرِ [1] اس آیت میں کوافر کا لفظ ہے یعنی کافرہ عورتیں۔ اس میں اتنی بھی گنجائش اہل کتاب کے اخراج کی نہیں ہے جتنی کہ مشرکین کے لفظ میں خیال کی جاسکتی ہے۔

آخر میں اس ممانعت کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ [2] آتش جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں [3] یعنی شوہر اور زوجہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس لئے اگرچہ یہ امکان ہے کہ مسلمان فریق ہی اپنے دوسرے ساتھی کو متاثر بنا دے مگر اس نفع مشکوک کے بجائے امکانی خطرہ سے تحفظ زیادہ ضروری ہے کہ کہیں وہ دوسرا فریق اثر انداز نہ ہو جائے جو ہلاکت ابدی کا سبب ہوگا۔

اب چوں کہ مرد نسبتہً زیادہ طاقتور ہے اور اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لئے فرقہ اسلامی میں عورت کے لئے مرد کے انتخاب میں زیادہ سختی برتی گئی ہے۔ عورت کے انتخاب میں اتنی اہمیت نہیں سمجھی گئی اس لئے متعہ کی بحالت ضرورت جو اجازت ہے وہ بھی مسلمان مرد کے لئے ہے وہ کتابی عورت سے متعہ کر سکتا ہے مگر مسلمان عورت کے لئے کسی نوع کے بھی تعلقات ازدواجی قائم کرنے کی کسی بھی طبقہ کے غیر مسلم مرد سے اجازت نہیں دی گئی ہے۔

وَیَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًی ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰی یَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ﴿۲۲۲﴾

''اور آپ سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دیجئے کہ یہ ایک گندگی ہے [4] لہٰذا تم حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے نزدیک نہ جاؤ ہاں جب وہ طہارت کر لیں تو ان کے پاس جاؤ جس صورت سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ یقیناً اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور طہارت کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

---

[1]۔ ممتحنة۔ ۱۰

[2]۔ اشارة الی المشرکین والمشرکات (صافی)

[3]۔ یعنی الی الکفر والمعاصی الّتی هی سبب دخول النّار (مجمع البیان)

[4]۔ بگو کہ وے نجاست است (شاہ ولی اللہ)

ایام میں مقاربت کی ممانعت:

چوں کہ حیض کے بارے میں شرائع سابقہ میں بھی احکام موجود تھے اس لئے لوگ اس کے متعلق پیغمبر اسلام ﷺ سے بھی دریافت کرتے تھے اس آیت میں اس حالت کے احکام میں اہمیت کے ساتھ اس حکم کا بیان ہوا ہے کہ مردوں کے لئے ہم بستری کرنا اس حالت میں ناجائز ہے۔

''جب تک پاک نہ ہو جائیں [۱] یعنی حیض موقوف نہ ہو جائے اگر چہ ابھی غسل نہ کیا ہو یہی یطھرن کے لفظ کا تقاضا ہے [۲] ہاں اگر یہاں پر یتطھرن ہوتا تو یہ معنی پیدا ہوتے کہ جب تک طہارت نہ کر لیں۔ اس کا مطلب ہوتا کہ جب تک غسل نہ کر لیں ان سے مقاربت ناجائز ہے [۳] مگر یہ قرأت شاذ ہے اور اس کا اعتبار نہیں ہے۔

جب پاک ہو جائیں تو کہا جا رہا ہے کہ اب اُن کے پاس جاؤ جس صورت سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ پابندی حیض والی برطرف ہو گئی۔ اب جو عام قانون شروع ہوا اس کے مطابق تعلقات ازدواجی سے کام لو۔

اب پہلی جگہ ممانعت کی حد توحیض موقوف ہونے کو قرار دیا گیا مگر اس کے بعد صراحةً جو اجازت دی گئی اُسے متفقہ قرأت میں طہارت نہیں، بلکہ تطھر سے وابستہ کیا گیا ہے جس کے معنی غسل کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ درمیانی وقت یعنی وہ موقع کہ جب حیض موقوف ہو چکا اور غسل ابھی نہ کیا ہو اس آیت میں مسکوت عنہ ہے یعنی وہ گزشتہ حرمت کے دائرہ سے بھی خارج ہے اور اس اجازت کی صراحت میں بھی داخل نہیں ہے اس سے ذہن میں کچھ آتا ہے کہ اس حالت میں مقاربت مکروہ ہے اسی لئے گزشتہ حرمت کے دائرہ سے تو خارج کر دیا مگر اجازت کی تصریح نہیں کی جیسا کہ بعض احادیث سے بھی استفادہ ہوتا ہے [۴]۔

نِسَآؤُكُمۡ حَرۡثٌ لَّكُمۡ فَأۡتُوا۟ حَرۡثَكُمۡ أَنَّىٰ شِئۡتُمۡ وَقَدِّمُوا۟ لِأَنفُسِكُمۡ وَاتَّقُوا۟ اللَّهَ وَاعۡلَمُوٓا۟ أَنَّكُم مُّلَٰقُوهُ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِينَ ﴿٢٢٣﴾

''تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں لہٰذا اپنی کھیتی میں جس طرف سے چاہو آؤ [۵] اور اپنے مستقبل کے لئے سامان کر

---

[۱] تا آں کہ پاک شوند (شاہ ولی اللہ) یہاں تک کہ پاک ہوں (شاہ رفیع الدین)

[۲]۔تخفیف الطاء کما هو المرسوم فی المصاحف المتداولة بین المسلمین یداعن یدو علیه قراء تهم ولا عبرة بما خرج عن ذلك من بعض القرأت (البلاغی)

[۳]۔من قرأ یطّهّرن فانما هو من یتطهّرن ای یغتسلن (صافی)

[۴]۔فی روایة اخریٰ والغسل احبّ الیّ (صافی)

[۵]۔من ای جهة شئتم (بیضاوی) ہر روش کہ خواہید (شاہ ولی اللہ)

رکھو اور اللہ کے غضب سے بچو اور جانتے رہو کہ تمہیں اس کے سامنے جانا ہے اور مبارک باد دیجئے [1] انہیں جو ایمان لائے ہیں۔

اس میں پہلا جزء عام حالات میں عورتوں سے مقاربت کے جواز کے لئے ہے کہ شریعت اسلام میں اس کی حامی کبھی نہیں ہو سکتی کہ عورتوں سے تعلقات ازدواجی تم ختم ہی کرو۔ اس لئے کہ یہ اس مقصد اجتماعی کو صدمہ پہنچانا ہے جس کے لئے خالق نے اس صنف کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے مگر ہاں اس دنیوی مفاد کے لئے آخرت کو بھول نہ جاؤ۔

دوسرا جزء کہ اپنے لئے سامان آخرت مہیا کرو اور اللہ کے غضب سے بچو، یہ ان صورتوں میں کہ جو ممنوع ہیں اس عمل سے روکنے کی تاکید ہے یعنی دنیا کا مفاد کیسا ہی سہی مگر تمہیں اپنے آخرت کے بنانے اور فرائض الٰہیہ کی پابندی کرنے کا خیال بہر حال ضروری ہے [2]۔

عمل کی پابندی کا مطالبہ کرتے ہوئے یہ کہہ کر کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہیں اللہ کو منہ دکھانا ہے، آخر میں یہ کہنا کہ **وبشر المومنین** ''یعنی مبارک باد کے قابل ہیں وہ جو ایمان لائے'' اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اس جماعت میں بھی جو اپنے کو مسلم و مومن کہتی ہو بہت سے واقعتاً اس کا یقین نہیں رکھتے کہ کوئی روز حشر و نشر ہے اور خدا کو منہ دکھانا ہے ورنہ ان کا کردار یہ ہوتا ہی نہ جو اس وقت ہے۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾

''اور اللہ کو اپنی قسموں کا تختہ مشق نہ بناؤ [3] تاکہ تم نیکوکار اور پرہیزگار بنو اور لوگوں میں صلح کرا سکو [4] اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

بات بات پر قسم کھانے کی ممانعت:

بعض لوگ بات بات پر قسمیں کھاتے ہیں اور زیادہ تر وقتی جذبات کی رو میں اور یہ اکثر نیک کاموں کے ترک سے بھی متعلق ہوتی ہیں مثلاً کسی سے بگڑ گئے تو کہہ دیا بخدا اب میں اس کے ساتھ کوئی نیک سلوک نہ کروں گا یا کسی سے رنجش ہوئی اور کہہ دیا خدا کی قسم اب میں اس سے کبھی بات نہ کروں گا۔ اس وقت انسان ایسا جذبات کی رو میں کہتا ہے اور پھر اس کام کو دل چاہتا ہے تو قسم کی پابندی سد راہ محسوس ہوتی ہے۔ خالق اس طرح کی قسموں سے منع کر رہا ہے اور ارشاد ہو رہا ہے کہ اس طرح کی قسمیں نہ کھایا کرو تاکہ نیک کاموں میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور خلق کے درمیان

---

[1]۔ بشّر یا رسول اللہ ﷺ (البلاغی)

[2]۔ ای واتّقوا اعقاب اللہ بترک مکاوزۃ الحدّ فیما بیّن لکم (مجمع البیان)

[3]۔ ای نصبا لھا (جلالین) العرضۃ ما تکثر ملاقتہ و مصادفۃ کما یقال الانسان عرضۃ للبلاء (البلاغی)
مت کرو اللہ کو نشانہ واسطے قسموں اپنی کے (شاہ رفیع الدین)

[4]۔ ان تبرّوا موضعۃ جرّ مجذف اللّام عن الخلیل (مجمع البیان)

رنجش ونزاع دیر پانہ ہو بلکہ صلح کی صورتیں پیدا ہوسکیں۔ چوں کہ قسمیں کلام سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے آخر میں کہا ہے کہ اللہ سننے والا ہے۔ یعنی تم جو قسمیں کھاؤ ان سے وہ بے خبر نہیں ہے اور جاننے والا ہے یعنی ان قسموں سے جو تم کو نقصان پہنچتا ہے اس سے بھی خوب واقف ہے اور اسی لئے وہ تم کو اس سے روکنا چاہتا ہے [1]۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغۡوِ فِيۡۤ اَيۡمَانِكُمۡ وَلٰكِنۡ يُّؤَاخِذُكُمۡ بِمَا كَسَبَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ﴿۲۲۵﴾

"اللہ تمہاری لایعنی قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا مگر جو تم دل سے کرو گے اس کا مواخذہ کرے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے برداشت کرنے والا ہے۔"

پہلے جو کہا گیا تھا کہ خالق کو تختۂ مشق اپنی قسموں کا نہ بناؤ اس سے ایسی قسموں کی ممانعت تو ہو ہی چکی مگر اب خیال ہوتا تھا کہ غصہ میں یا بطور تکیہ کلام ایسی قسمیں جو کھائی گئیں تو پابندی تو ان قسموں کی لازم ہو ہی گئی۔ اس آیت میں اسی خیال کی رد کی جارہی ہے اور کہا جارہا ہے کہ ایسی لایعنی [2] قسموں کی پابندی بھی ضروری نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی محاسبہ تم سے ہوگا اور نہ کفارہ لازم ہوگا [3]۔

آخری الفاظ کہ "اللہ بخشنے والا ہے برداشت کرنے والا" اس فعل کے مذموم اور لائق سزا ہونے کی طرف اشارہ ہے مطلب یہ ہے کہ یہ فعل تمہارا یقیناً برا ہے مگر یہ اللہ کی بخشش اور اس کا حلم ہے کہ وہ تم سے اس پر درگزر کرتا ہے اور سزا نہیں دیتا۔

لِلَّذِيۡنَ يُؤۡلُوۡنَ مِنۡ نِّسَآئِهِمۡ تَرَبُّصُ اَرۡبَعَةِ اَشۡهُرٍ ۚ فَاِنۡ فَآءُوۡ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۲۶﴾

"ان کے لئے جو اپنی عورتوں سے الگ رہنے کی قسم کھا لیتے ہیں چار مہینے کی مہلت ہے۔ اور اس کے بعد اگر وہ رجوع کریں [4] تو بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان"

ایلا کے احکام:

اس میں ایلاء کا حکم بیان کیا گیا ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں درج ہے۔ ایلاء یہ ہے کہ مرد قسم شرعی کھالے اور وہ بھی جوش غضب میں

---

[1]۔ سميع ايمانكم عليم باحوالكم وما يصلحكم (البلاغی)

[2]۔ اللغو ما لم يقصد به عقد اليمين بل يجرى على اللسان توكّأً في الكلام (البلاغی) هو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام و ابی عبدالله علیہ السلام (مجمع البیان)

[3]۔ لا يؤاخذكم الله بالعقوبة والكفّارة (صافی)

[4]۔ رجعوا فی اليمين بالحنث (بیضاوی)

تکیہ کلام کے طور پر نہیں بلکہ سمجھی بوجھی قسم[1] کہ وہ اپنی زوجہ سے مباشرت نہیں کرے گا[2] اسے بتایا گیا ہے کہ چار مہینے تک تو انہیں اس قسم پر قائم رہنے کا حق ہے کیوں کہ چار مہینے تک تو یوں بھی انسان کو ترک مباشرت کا حق ہے لیکن چار مہینے کے بعد زوجہ کو مطالبہ کا حق ہے اور اس صورت میں انہیں کفارہ دے کر[3] اس قسم کو توڑ دینا چاہیے یا طلاق دیدینا چاہیے جو اس کے بعد کی آیت میں مذکور ہے[4] اب قسم کے توڑنے کا جو گناہ ہے اسے کہا جا رہا ہے کہ خدا معاف کر دے گا[5] اور یہ اس کی رحمت ورافت کا تقاضا ہے جسے صرف تفضّل کہا جاسکتا ہے۔

وَاِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۲۷﴾

''اور اگر وہ طلاق دینا طے کر لیں[6] تو بلاشبہ اللہ سننے والا ہے جاننے والا ہے''

مطلب یہ ہے کہ چار مہینے کے بعد اگر عورت کا مطالبہ تعلقات ازدواجی کے متعلق ہے تو پھر (دوصورتوں میں انحصار ہے: یا تو قسم کو توڑ دیں اور اس کا کفارہ ادا کریں[7] اور یا پورے شعور اور ارادہ کے ساتھ طلاق دے دیں۔ بیچوں بیچ معلق چھوڑنا جائز نہیں ہے۔

طلاق کے ساتھ عزم کے لفظ کا استعمال جو شعور اور ارادہ کی قوت کا پتہ دیتا ہے اس کا ثبوت ہے کہ طلاق کے لئے صرف الفاظ جاری کر دینا خواہ بلا ارادہ ہو یا نمائشی طور پر ہو کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ قصد انشاء اور پورے پورے شعور کا ہونا ضروری ہے جو مطابق تعلیم اہل بیت علیہم السلام مسلک امامیہ ہے اور چوں کہ اس میں دو جزء میں ایک دل سے متعلق اور قصد انشاء اور دوسرا زبان سے متعلق اور وہ صیغۂ طلاق اس لئے تمۂ آیت میں دو لفظ صرف ہوئے سمیع اور علیم خدا سننے والا ہے یہ سننے والا الفاظ سے متعلق ہے اور جاننے والا دل کے اندرونی قصد سے متعلق ہے۔

وَالۡمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنۡ يَّكۡتُمۡنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِىۡٓ اَرۡحَامِهِنَّ اِنۡ كُنَّ يُؤۡمِنَّ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ وَبُعُوۡلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ اِنۡ اَرَادُوۡٓا اِصۡلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِىۡ عَلَيۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۖ وَلِلرِّجَالِ عَلَيۡهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۲۸﴾

---

[1]۔ علیٰ وجہ یقع موقع اللغو (مجمع البیان)

[2]۔ انہ الحلف علیٰ ترك الزوجة (البلاغی)

[3]۔ یجب علی الفائی عندنا الکفّارة ولا عقوبة علیه (مجمع)

[4]۔ لمعنی لیس لهم بعد

[5]۔ لا یتبع بعقوبة (صافی) یدل علیٰ عدم العقاب

[6]۔ وان حتموا اقصده (بیضاوی) واگر قصد کردند جدائی را (شاہ ولی اللہ) اور اگر قصد کریں طلاق کی (شاہ رفیع الدین) طلاق ہی کی ٹھان لیں (فرمان علی صاحب)

[7]۔ المذکورة فی سورة المائدة فی تسعة وثمانین (البلاغی)

''اور جن عورتوں کو طلاق دی جائے وہ اپنے کو روکیں گی، تین دفعہ ایام سے پاک ہونے تک اور انہیں جائز نہیں ہے کہ وہ چھپائیں اسے جو اللہ نے ان کے شکموں میں پیدا کیا ہے، اگر وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہیں اور ان کے شوہر اُس دوران اُن کے واپس بلا لینے کے زیادہ حق دار ہیں اگر وہ تعلقات درست رکھنا چاہیں اور ان عورتوں کا حق بھی ویسا ہی ہے جیسا اُن پر بھلائی کرنے کا فرض ہے۔ ہاں مردوں کو اُن پر ایک درجہ فوقیت ہے [۱] اور اللہ زبردست ہے بڑا سوجھ بوجھ رکھنے والا''۔

عدۂ طلاق:

اس میں عدۂ طلاق کا بیان ہے جب کسی عورت کو اس کا شوہر طلاق دے تو طلاق کے بعد ہی فوراً اسے کسی دوسرے مرد سے عقد جائز نہیں ہوگا۔ بلکہ عدّۃ کے گزرنے کا انتظار کرنا ہوگا۔ اسی عدّہ کو یہاں بیان کیا جارہا ہے اور ابتداء میں **المطلّقٰت** کی لفظ، اگرچہ عام ہے، مگر دوسرے دلائل سے ثابت ہوگیا ہے کہ یہ حکم انہی مطلّقات سے مخصوص ہے جنہیں بعدِ دخول طلاق دیا گیا ہو اور انہیں ایام ہوتے ہوں، یعنی یائسہ اور غیر مدخول بہا کا یہ حکم نہیں ہے [۲]۔

اس نظیر کو یاد رکھنا چاہیے اور اس کے بعد اگر احکام میراث میں آیت قرآن **ولھن الربع مما ترکتم** کی تشریح میں کچھ دلائل کی بناء پر کہا جائے کہ یہ حکم زوجہ کا ہے جائداد منقولہ کے متعلق اور غیر منقولہ میں سے بالکل یا کسی حد تک زوجہ محروم ہے تو یہ نہ کہا جائے کہ یہ نص قرآن کے خلاف ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ عموم کی تخصیص یا اطلاق کی تقئید کا نام مخالفت نہیں ہے جس کے ثبوت کے لئے یہی محل کافی ہے کہ آیت لفظ **المطلقا** ت کے ساتھ وارد ہوی ہے مگر حکم وہ کچھ خاص طرح کے مطلقات سے مخصوص مانا جاتا ہے سب کے لئے تسلیم نہیں کیا جاتا۔

اس مدت تک کہا گیا ہے کہ اپنے کو روکیں گی یہ الفاظ ظاہراً خبر ہیں مگر اس سے مقصود یہ کہنا ہے کہ انہیں اتنی مدت تک ضرور بالضرور اپنے کو روکنا چاہیے [۳]۔

اب یہ مدت کیا ہے تین قرو۔ قرو کے دونوں معنی ہیں ایام بھی اور ایام سے پاک ہونا بھی [۴] مگر ہمارے یہاں اس کی تفسیر تین طہر سے ہی ہوئی ہے جس کا مطلب تین دفعہ ایام سے پاک ہونے کی مدت [۵]۔

بعض ائمہ اہل سنت بھی اس متفق ہیں [۶]۔

یہ مطلقات اسے چھپائیں نہیں جو اللہ نے اللہ کے شکموں میں پیدا کیا ہے''۔ یعنی اگر انہیں حمل ہے جس کا شوہر کو بوقت طلاق علم نہیں تھا

---

[۱]۔ درجۃ زیادۃ فی الحق و فضیلۃ (نیشا پوری)

[۲]۔ المطلقات یرید بہا المدخول بہن من ذوات الاقراء (بیضاوی)

[۳]۔ خبر فی معنی الامر للتاکید (صافی)

[۴]۔ ھذا الحرف من الاضداد (مجمع البیان) جمع قرع بفتح القاف و ھو الطّھر قولان (جلالین)

[۵]۔ المراد بالقروء الاطھار عندنا (مجمع) علیہ اجماع الامامیۃ و حدیثھم (البلاغی)

[۶]۔ ذھب الشافعی الی انحصا الاطھار (نیشاپوری)

یا ممکن ہے خود اس عورت کو بھی علم نہ ہوا ور اب زمانہ عدہ میں معلوم ہو جائے تو انہیں لازم ہے کہ شوہر کو اس کی اطلاع دے دیں، چھپانے کی کوشش نہ کریں اور بعض روایات میں اس کے معنی یہ لئے گئے ہیں کہ جوان کی کیفیت ہو طہر ہو یا حیض ہو یا حمل اسے صاف صاف بتا دیں مخفی نہ کریں تاکہ ناواقفیت کی وجہ سے شوہر نہ غلط کاری میں مبتلا ہو سکے اور نہ جو خالق کی طرف سے اسے عدۂ میں رجوع کا حق ہے وہ ضائع ہو سکے [1]۔

اس عدہ کے دوران شوہر کو بغیر کسی عقد کے اسی سابق زوجیت کے حق سے دوبارہ تعلقات ازدواجی قائم کر لینا جائز ہیں جس میں زوجہ کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے [2]۔

ان ارادوا اصلاحا۔ اب یہ شوہروں کو ہدایت ہے کہ اس رجوع سے تمہارا مقصد صرف اس بیچاری عورت کو پریشان کرنا نہ ہونا چاہیے بلکہ واقعی اگر اب نباہ کرنا ہو تو ایسا کرو [3]۔

آخر میں عورتوں کو جو ایک بالکل بے جان مخلوق یا حیوان یا مثل اثاث البیت سمجھ کر ایسا تصور تھا اور اب بھی شاید بہت سے جاہل مردوں کو ہوتا ہے کہ حقوق سب شوہر کے ہیں اور بیوی کا کام تو بس اطاعت کرنا ہے اس کو ختم کرنے کے لئے ارشاد ہوا ہے کہ ایسا نہ سمجھنا مرد اور عورت کا رشتہ ایک طرح سے برابر کا رشتہ ہے لہٰذا جس طرح عورتوں پر فرائض ہیں جن کے مطالبہ کا حق مردوں کو ہے اسی طرح ان کے حقوق بھی ہیں جن کا ادا کرنا مردوں کے فرائض میں داخل [4] اس مطلب کو قرآن نے اس مختصر جملہ میں سمو دیا ہے کہ **لَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِىۡ عَلَيۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ** [5]

ہاں اسلام کا نقطۂ اعتدال چوں کہ مرد اور عورت کی بحیثیت صنف کلی مساوات کے نظریہ کے ساتھ بھی متفق نہیں ہے جو مغربی تصورات کی بناء پر آج کل تعلیم یافتہ دماغوں پر شدت سے مسلط ہے اس لئے قرآن نے تبادلہ حقوق وفرائض کے بیان کے بعد ایک جملہ میں ارشاد کیا کہ **وَلِلرِّجَالِ عَلَيۡهِنَّ دَرَجَةٌ**. ہاں مردوں کو ان پر ایک درجہ فوقیت ہے۔"

چوں کہ مرد فطری خصوصیات میں ان سے بالاتر ہیں اس لئے شارع نے جو خالق فطرت بھی ہے انہیں طبقہ خواتین کی عزت و ناموس کا محافظ اور نان ونفقہ کا کفیل بنایا ہے اس کا لحاظ عورتوں کو رکھنا لازم ہے جس کا اسلام کا حکیمانہ نظام تشریع اور تقسیم حقوق میں بھی لحاظ کیا گیا ہے۔

آخر میں **واللہ عزیز حکیم** کے الفاظ میں حاکمانہ اور حکیمانہ دونوں پہلوؤں کا امتزاج ہے۔

چوں کہ تقسیم حقوق وفرائض میں مرد اور عورت دونوں پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں وہ دونوں کو اکثر ناگوار ہوتی ہیں اور وہ ان کی مخالفت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور تعمیل سے گریز کرتے ہیں، تو عزیز کہہ کے انہیں عذاب الٰہی کا تصور پیدا کیا گیا ہے کہ اس کی مخالفت کر کے تم اس کے عذاب سے بچ نہیں سکتے کہ وہ زبردست ہے اس کے مقابلہ میں کوئی غالب نہیں آ سکتا اور پھر انہیں بطور ناصح سمجھایا ہے کہ اس نے جو پابندیاں عاید کی ہیں وہ تمہاری بھلائی ہی کے لئے ہیں کیوں کہ وہ "حکیم" ہے۔

---

[1]۔ وھٰذا القول اعم فالاخذ بہ اولیٰ (مجمع البیان)

[2]۔ لایحتاج فی ذلک الیٰ رضا المرأۃ ولا الیٰ عقد جدید واشھا د (مجمع)

[3]۔ اصلاحا لما بینھن ولم یریدوا مضارتھنّ (صافی)

[4]۔ ای ولھن حقوق علی الرّجال مثل حقوقھم علیھن فی الوجوب واستحقاق المطالبۃ علیھا (بیضاوی)

[5]۔ ھٰذا من الفوائد العجیبۃ الجامعۃ للفوائد الجمۃ (مجمع البیان)

اس کا کوئی حکم حلم اور مصالح سے خالی نہیں ہوتا[1] اور اس میں بھول چوک اور غلطی کا بھی کوئی امکان نہیں ہے[2]۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ‌ؕ وَلَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـــًٔا اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ‌ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ‌ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝۲۲۹

"ایسی طلاق[3] بس دو دفعہ ہوسکتی ہے اس کے بعد پھر یا ٹھیک طور پر رکھے یا مناسب طور پر روانہ کر دے اور تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم نے انہیں دیا ہے اس میں سے کچھ لے لو مگر یہ کہ ان دونوں کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ خدا کی مقرر کردہ حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ تو اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ وہ حدود الٰہیہ کو قائم نہیں رکھیں گے تو جو کچھ وہ عورت معاوضہ دینا چاہے اس میں ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں۔ ان سے قدم آگے نہ بڑھاؤ اور جو اللہ کی حدود سے قدم آگے بڑھائے تو یہی وہ ہوتے ہیں جو ظالم ہیں۔"

طلاق بائن کا حکم اور اس کا معیار:

اس میں پہلے طلاق بائن کا حکم بتایا گیا ہے اور پھر خلع کا حکم بیان کیا گیا ہے۔

طلاق بائن یعنی جس شوہر کو عدۃ میں رجوع کا حق حاصل نہیں ہے یہ کیوں کر ہوتی ہے ایک دفعہ طلاق دی پھر عدۃ کے اندر رجوع کر لیا۔ اس کے بعد پھر طلاق دیا اور پھر عدۃ کے اندر رجوع کر لیا اس کے بعد تیسری دفعہ پھر طلاق دیا تو یہ طلاق بائن ہوگی۔

سیاق اور الفاظ قرآن صاف اسی صورت کا پتہ دے رہے ہیں۔ چوں کہ اس کے پہلے کی آیت میں اس کا بیان ہوا تھا کہ عدۃ کے اندر اگر شوہر رجوع کر لے تو اس کے لئے جائز ہے اس آیت میں اسی کو کہا جا رہا ہے کہ اس طرح کی طلاق بس دو دفعہ ہوسکتی ہے اس کے بعد ایسا نہیں ہوسکتا لہٰذا اب مختتم طور پر طے کر کے طلاق نہیں دینا ہے تو بس یکسوئی اور حسن معاشرت کے ساتھ اب رشتۂ ازدواجی پر قائم رہے۔ یہی ھے امساك

---

[1]۔ عزیز یقدر علی الانتقام من خالف الاحکام حکیم شرعھا الحکم ومصالح (بیضاوی)

[2]۔ مصیب فی افعالہ واحکامہ لایتطرّق الیھا احتمال العبث والشفہ والغلط والباطل (نیشاپوری)

[3]۔ یعنی الطلاق الذی یملك الرجعة عقیبه مرّتان (معالم التنزیل بغوی) طلاق رجعی دو بار است (شاہ ولی اللہ) یہ طلاق دو بار ہے (شاہ رفیع الدین)

بمعروف[1]۔

اور یا بس اب مختتم طور پر سلسلہ ہی قطع کر لے یعنی ایسی طلاق دے جس کے بعد رجوع نہیں ہوگی ۳؎۔ یہ ہوگی طلاق بائن جس کے بعد یہ رشتہ بالکل منقطع ہوگیا اور عدۃ کے اندر رجوع کا حق نہیں رہا۔

اہل سنت عموماً ایک نشست میں تین دفعہ الفاظ طلاق جاری کر دینے کو بھی طلاق بائن سمجھتے ہیں مگر قرآن مجید کی دونوں آیتوں پر ایک ساتھ غور کرنے کے بعد اس تصور کی گنجائش نہیں رہتی۔

ہم نے **الطلاق** کا جو ترجمہ کیا ہے ''ایسی طلاق بس دو ہی دفعہ ہوسکتی ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ الطلاق میں الف لام عہد کا ہے اور اس سے اشارہ ہے گزشتہ آیت کے مضمون کی طرف کہ طلاق دے کر عدۃ کے اندر رجوع کر لی جائے۔ اگر یہ مفہوم نہ ہو اور الف لام جنس کا لیا جائے جس کے بعد یہ معنی ہوں گے کہ طلاق بس دو ہی دفعہ ہوتی ہے تو یہ مطلب بالکل درست نہیں ہے اس لئے کہ طلاق تو وہ بھی ہے جو تیسری دفعہ ہوتی ہے جس کے بعد رجوع نہیں ہے۔

پھر عقلاً بھی دیکھئے تو طلاق کی حقیقت اس کی متقاضی ہے کہ اس کے پہلے رشتہ زوجیت قائم تھا اور اسے اب قطع کیا جارہا ہے ایک نشست میں تین دفعہ کیا ہزار دفعہ الفاظ طلاق زبان پر جاری کر دیئے تو سوال یہ ہے کہ پہلی دفعہ کے صیغہ طلاق سے وہ عورت زوجیت سے خارج ہوئی یا نہیں۔ اگر خارج ہوگئی تو اب وہ زوجہ ہی نہیں ہے۔ پھر بعد کے یہ الفاظ طلاق کا مصداق کیوں کر قرار پاسکتے ہیں اور اگر پہلی دفعہ الفاظ سے خارج نہیں ہوئی بعد کے الفاظ سے خارج ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان تمام الفاظ کے مجموعہ سے طلاق حاصل ہوئی لہٰذا وہ تین طلاق کہاں ہوئے ایک ہی طلاق ہوئی۔

اسی لئے مذہب اہل بیت علیہم السلام یہ ہے کہ تین دفعہ الفاظ طلاق جاری کرنے کے بعد وہ ایک ہی طلاق سمجھی جاسکتی ہے تین طلاقوں کا حکم اس میں جاری نہیں ہوتا[2]۔

دوسرا حکم یہ بیان کیا گیا ہے کہ طلاق دینے پر جو کچھ تم نے دیا ہے یعنی مہر[3] اس کے کل یا کسی جزء کی واپسی کا حکم نہیں ہے یہ تمہید ہے حکم خلع کے بیان کی کہ مہر تو سابق زوجیت کی بناء پر ثابت ہو چکا۔ اب اس کے واپس لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہاں اگر زوجہ خود طلاق چاہتی ہو اور وہ طلاق کے معاوضہ میں اپنے مہر کو معاف کرے یا اگر لے چکی ہے تو واپس تو دینے پر تیار ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی طلاق کو جو معاوضہ کے ساتھ ہوتی ہے طلاق خلعی کہا جاتا ہے۔

اسے یوں کہا گیا ہے کہ جب ان دونوں کو اندیشہ ہو کہ حدود الٰہیہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے یعنی تعلقات اتنے ناخوش گوار ہوں کہ شوہر اور

---

[1]۔ بمعروف ای علی وجہ جمیل سائغ فی الشریعۃ لاعلی وجہ الاضرار (مجمع البیان) مایعرف فی الشرع من اداء حقوق النکاح وحسن الصحبۃ (بغوی) ۳۔ بان لایراجعھا حتی تبین منہ (صافی)

[2]۔ علیہ مذہب اہل بیت واجماع الامامیۃ ومذہب ابن عباس (البلاغی) ھٰذا ھو الّا قیس واختارہ کثیر من علماء اہل بیت (نیشاپوری)

[3]۔ ممّا اٰتیتموھنّ ای اعطیتموھنّ من المھر (مجمع البیان)

زوجہ دونوں ہی اب نباہ ہونے سے مایوس ہو گئے ہوں تو اس صورت میں گزشتہ حکم نہیں رہے گا۔ اب جب کہ ایسا ہو' ایسا ہو' کو قرآن میں اب یوں کہا گیا ہے کہ "لیکن اگر تم لوگوں کو یہ اندیشہ ہو" یہ تم لوگ کون؟ اس سے صنعت التفات کے طور پر شوہر اور زوجہ کے مراد ہونے کا امکان تو ہے مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے با اثر اور معقول اشخاصِ مومنین مراد ہوں جو صلح کی کوشش کر سکتے ہیں اور اس صورت میں اس تغیر اسلوب کے اندر یہ مفہوم مضمر ہے کہ اگر انہیں اندیشہ بھی پیدا ہوا ہو تو دوسرے لوگوں کو چاہیے کہ وہ بیچ میں پڑ کر اصلاح حال کی کوشش کریں۔ جب یہ بھی کوشش میں ناکام ہو کر مایوس ہو جائیں تو اب خلع کی معاملت ہو جائے تو بہتر ہے" یہاں کہا گیا کہ کوئی حرج نہیں' دونوں کے لئے اس کا مطلب یہ ہے کہ اب بھی کوئی پابندی نہیں ہے بلکہ اختیار ہے۔ زوجہ کو تو اختیار ہے کہ وہ کچھ معاوضہ کی پیش کش کر کے طلاق مانگے اور پھر شوہر کو یہ اختیار ہے کہ وہ اس پیش کش کو چاہے تو منظور کرے۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ أَنْ يَّتَرَاجَعَآ إِنْ ظَنَّآ أَنْ يُّقِيمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٠﴾

"اب اگر وہ طلاق دے تو اس کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی جب تک وہ اس کے علاوہ کسی شوہر سے شادی نہ کر لے۔ اب جب وہ اسے طلاق دے دے تو اگر ان دونوں کا خیال ہو کہ وہ اب اللہ کی حدود کو برقرار رکھیں گے تو ان کے لئے کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں پھر شادی کر لیں۔

"اور یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں جنہیں وہ بیان کرتا ہے ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں۔"

یہ گزشتہ آیت کے مضمون کا تتمہ ہے۔ یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ دو دفعہ کے بعد اب شوہر کو مختتم طور پر دو باتوں میں ایک کو طے کر لینا چاہے یا تو وہ ٹھیک طور پر رہے اور رشتہ ازدواجی کو برقرار رکھے یعنی، اب کبھی طلاق نہ دے اور یا اب وہ اس سے بالکل قطع تعلق کر لینا طے کر لے۔

اب اگر اس نے دوسری شق اختیار کر لی تو اس کا حکم اس آیت میں بیان ہو رہا ہے کہ اگر اس نے اب تیسری بار طلاق دی تو پھر اسے عدۃ کے اندر رجوع کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس طلاق کو طلاق بائن کہتے ہیں۔

اب وہ اس کے لئے اُس وقت تک حلال نہیں ہوسکتی جب تک ایک دوسرے شوہر سے اس کا عقد نہ ہو جائے اور وہ اس سے مباشرت نہ کر لے [١] اور یہ بھی ایک مثال ہے اس کی کہ الفاظ قرآن مطلق ہیں مگر حکم ایک قید کے ساتھ مقید ہے [٢]

ہاں! جب یہ شوہر اپنی مرضی سے طلاق دے دے تو اگر وہ دونوں یعنی سابق کے میاں بیوی سمجھیں کہ اب زوجیت کے فرائض ادا

---

[١]۔ حتی تزوج زوجا غیرہ و یجامعہا (مجمع البیان) اے فق الجمہور علی انہ لابدّ من الاصابۃ (بیضاوی)

[٢]۔ فالاٰیۃ مطلقۃ قیدتہا السنّۃ (بیضاوی) وتطأہا کما فی الحدیث رواہ الشیخا ن (جلالین)

کرتے رہیں گے، تو عدۃ گزرنے کے بعد پھر دوبارہ باہم عقد کر کے رشتۂ زوجیت میں منسلک ہو سکتے ہیں [1] ۔

یہ تمام پابندیاں اس لئے ہیں کہ وہ رشتۂ زوجیت کو ایک کھیل اور مذاق نہ سمجھیں اور اس کی اہمیت کو محسوس کریں۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٣١﴾

"اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی میعاد پوری کرنے لگیں [2] تو یا تو اب ٹھیک طور پر انہیں رکھو یا اچھے طور پر انہیں رخصت کر دو [3] اور نقصان رسانی کے طور پر انہیں نہ روکو کہ تعدی سے کام لو اور جو ایسا کرے گا اس نے خود اپنے او پر ستم ڈھایا اور اللہ کے احکام کو مذاق نہ بناؤ [4] اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے۔ اس کے ذریعہ سے تمہیں نصیحت کرتا ہے اور اللہ کے غضب سے بچو اور سمجھے رہو کہ بلاشبہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔"

یہ طلاق رجعی کے متعلق کہا جا رہا ہے جس میں عدۃ کے اندر رجوع کا حق ہوتا ہے کہ عدۃ پورا ہونے کے پہلے ایک دفعہ طے کر لو کہ تمہیں واقعۃً نباہ کرنا ہے یا نہیں۔ اگر صحیح طور پر یعنی ادائے حقوق کے ساتھ [5] نباہ کرنا ہے تو عدۃ کے اندر رجوع کر لو ورنہ عدۃ گزر جانے دو اور پھر انہیں رخصت کر دو کہ اب وہ جا کر چاہیں تو عقد ثانی کر لیں۔

بعض شوہر صرف پریشان کرنے کے لئے کہ وہ دوسرا نکاح نہ کر سکے عدۃ میں رجوع کر لیتے ہیں۔ ایسا اب بھی ہوتا ہے اور زمانہ جاہلیت میں تو ایسا بہت کیا جاتا تھا [6] اسے پہلے "بالمعروف" ٹھیک طریقہ پر کہہ کر اشارۃً روکا تھا۔ اور پھر صراحۃً بھی کہہ دیا کہ صرف ضرر رسانی کے لئے ایسا

---

[1] ۔ فذکر النکاح بلفظ التّراجع (مجمع البیان)

[2] ۔ البلوغ ھٰھنا بلوغ مقاربته ای قارب انقضاء العدّۃ (مجمع البیان)

[3] ۔ یا جانے دو انہیں اچھی طرح (تاج العلماء)

[4] ۔ نہ بناؤ تم ہماری آیتوں کو ہنسی ٹھٹھا (تاج العلماء)

[5] ۔ المراد بالمعروف ھٰھنا ان یمسکھا علی الوجه الذی اباحه الله من القیام بما یجب لھا من النفقة وحسن العشرۃ (مجمع البیان)

[6] ۔ کانوا یفعلون فی الجاھلیة اکثر ھٰذہ الافعال رجاء ان تختلع المرأۃ منه بمالھا (نیشاپوری)

نہ کرو ورنہ یہ تمہارا ایک ظلم ہوگا جس سے تم خدا کے یہاں نتیجۃً اپنا نقصان کروگے یعنی تم سے اس کا مواخذہ ہوگا[۱]۔
یہ طلاق اور رجوع وغیرہ کے احکام نظامِ معاشرتی کی اصلاح کے لئے حکیمانہ مصالح پر مبنی ہے ''انہیں مذاق نہ بناؤ''[۲]۔
یہ عملی مذاق احکام الٰہیہ کے ساتھ ان سب ہی افراد کے کردار میں ہے جو ایمان کے دعوے کے ساتھ پھر بھی اطاعت احکام سے گریز کرتے ہیں[۳]۔
آخر میں تہدیدی انداز میں کہا گیا ہے: ''اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے یعنی صرف اس کا خیال نہ رہنا چاہیے کہ ہمارے عمل کو لوگ برا نہ کہیں یا عام افراد خلائق کو اس کی برائی کا احساس نہ ہو۔ تمہیں تو اپنے عمل کو مابین خود خدا درست رکھنا چاہیے کیوں کہ لوگوں کو خبر ہو نہ ہوا سے تو ہر بات کا علم ہے[۴]۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

''اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی میعاد پوری کرلیں[۵] تو انہیں اپنے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب کہ وہ مناسب صورت پر[۶] آپس میں طے کرلیں۔ اس سے نصیحت لے گا تم میں وہ شخص جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو یہ تمہارے لئے زیادہ ستھرا اور پاک صاف رکھنے والا طریقہ ہے اور اللہ علم رکھتا ہے اور تم علم نہیں رکھتے۔''

اس میں یہ حکم شرعی بتایا گیا ہے کہ طلاق رجعی میں جہاں عدۃ کے اندر رجوع کی اجازت ہوتی ہے اگر عدۃ گزر جائے تو پھر رجوع کا حق نہیں رہتا۔ اس کے بعد وہ شادی کرنا چاہیں تو اس میں کسی کی مزاحمت کا حق نہیں ہے۔
''اپنے شوہروں سے'' یعنی اپنے پسند کے شوہروں سے[۷] یا اپنے مطلوب مناسب شوہروں سے[۸] اس صورت میں یہ مانع ہونے

---

[۱]۔ظلم نفسہ بتعریضھا للعقاب (بیضاوی)
[۲]۔لاتستخفوا بآوامرھونوا ھیہ (صافی)
[۳]۔من خالف امر الشرع فھو متخذ اٰیات اللہ ھزوا (بغوی)
[۴]۔تاکید و تھدید (بیضاوی وصافی)
[۵]۔بلوغ الاجل ھٰھنا علی الحقیقۃ (نیشاپوری)
[۶]۔بما یحسن فی الدّین والمروۃ من الشرائع۔
[۷]۔ای من رضین بھن ازواجالھن (مجمع البیان)
[۸]۔الذین یرغبن فیھم ویصلحون لھنّ (نیشاپوری)

والے پہلے شوہر بھی ہوسکتے ہیں کہ خود تو طلاق دے چکے، اب وہ جہاں نکاح کرنا چاہتی ہیں اس میں وہ مختلف صورتوں سے سدراہ ہوتے ہیں اور یہ عورت کے اہل خاندان سے سماج کے دوسرے افراد بھی ہوسکتے ہیں جو کسی غلط رسم ورواج وغیرہ کی بناء پر اس کو عقد ثانی سے مانع ہوں اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنے پہلے شوہروں سے [1] اگر از سر نو نکاح کرنا چاہیں تو دوسرے لوگوں کو اُس میں مزاحمت درست نہیں ہے۔

آخری الفاظ بھی اس کا پتہ دیتے ہیں کہ یہ دوسرے افراد خاندان اور افراد ملت کے طرز عمل پر انتباہ ہے کہ اکثر وہ کسی مفروضہ معیار شرافت کے تصور سے عورت کو اس کی مرضی کرنے سے روکتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ہوسکتا ہے کہ نفسانی خواہش اس سے کوئی ایسا عمل کرادے کے حقیقی معنی میں دامن شرافت داغدار ہی نہیں بلکہ تارتار ہوجائے تو کہا جارہا ہے کہ ان کو ان کی مرضی کے شوہروں سے عقد کرنے میں مانع نہ ہو"

ذٰلِکُمۡ اَزۡکٰی لَکُمۡ وَاَطۡهَرُ یعنی یہ اخلاقی پاکیزگی اور تمہارے دامان شرافت کے پاس صاف رکھنے کے لئے زیادہ بہتر طریقہ ہے اس سے عمومی طور پر ان بے زبان نا کتخدا لڑکیوں کے بزرگ بھی انتباہ حاصل کرسکتے ہیں جو ان پر ان کی مرضی کے خلاف اپنی مرضی کو مسلط کرنے میں ان کی رواجی خاموشی یا رسمی اظہار رضامندی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وَالۡوَالِدٰتُ یُرۡضِعۡنَ اَوۡلَادَهُنَّ حَوۡلَیۡنِ کَامِلَیۡنِ لِمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ
وَعَلَی الۡمَوۡلُوۡدِ لَهٗ رِزۡقُهُنَّ وَكِسۡوَتُهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفۡسٌ اِلَّا
وُسۡعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوۡلُوۡدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَی الۡوَارِثِ مِثۡلُ
ذٰلِكَ ۚ فَاِنۡ اَرَادَا فِصَالًا عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡهِمَا ؕ وَاِنۡ
اَرَدۡتُّمۡ اَنۡ تَسۡتَرۡضِعُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡكُمۡ اِذَا سَلَّمۡتُمۡ مَّاۤ اٰتَیۡتُمۡ
بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۲۳۳﴾

"اور مائیں اپنے بچوں کو کامل دو برس تک دودھ پلائیں گی اس کے لئے جو پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے اور بچہ کے باپ [2] پر ان کا کھانا، کپڑا مناسب طور پر لازم ہے [3] کسی بھی متنفس کو اس کی طاقت سے زیادہ حکم نہیں دیا جاتا۔ نہ ماں کو درپے آزاد ہونا چاہیے اپنے بچہ کے لئے اور باپ کو اپنے بچہ کے لئے [4] اور وارث پر بھی ایسا ہی

---

[1] ۔قیل الذین کانوا ازواجالھنّ من قبل (مجمع)

[2] ۔المولودله ای الاب (جلالین)

[3] ۔اس پر لازم ہے کہ کھانا کپڑا اس کا واجبی (تاج العلماء)

[4] ۔والدہ اپنے بیٹے کا اور والد اپنے بیٹے کا ضرر نہ چاہیں (عمادالدّین)

لازم ہے ہاں اگر وہ دونوں دودھ بڑھائی کرنا چاہیں آپ کی رضامندی اور باہمی رائے مشورہ سے تو ان پر کوئی گناہ نہیں اور اگر چاہتے ہو کہ اپنی اولاد کو خود دودھ پلوالو [1] تو تمہیں کوئی گناہ نہیں ہے جب کہ جو کچھ تمہیں دینا ہے [2] ٹھیک طور پر حوالے کر دو اور اللہ کے غضب سے بچو اور جانے رہو کہ بلا شبہ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کا دیکھنے والا ہے۔''

''مائیں اپنے بچوں کو کامل دو برس دودھ پلائیں گی'' یعنی ''انہیں ضرور پلانا چاہیے [3] مگر یہ ضرور پلانا چاہیے'' استحقاق کا اظہار ہے، نہ یہ کہ ان کا فریضہ ہے کہ وہ ضرور پلائیں [4] ایسا نہیں ہے۔ اسی لیے انہیں شوہروں سے اُجرت کے مطالبہ کا حق ہے [5] اور قرآن مجید کہہ رہا ہے وَاِنۡ تَعَاسَرۡتُمۡ فَسَتُرۡضِعُ لَهٗۤ اُخۡرٰى ''اگر تم نے اُجرت کے دینے میں تکلّف کیا تو پھر کوئی دوسری عورت دودھ پلائے گی۔''

اس رضاعت کی مدّت دو برس بتائی گئی ہے اور اسی لئے وہ مدت ہے جس میں رضاع ہو تو رضاعت کے شرعی احکام مرتب ہوتے ہیں۔ ورنہ نہیں اور اسی کے بیان کے لئے اس مدت کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ بعد میں کہا ہے لِمَنۡ اَرَادَ اَنۡ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ. اس کے لئے جو پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے''۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس مدت تک رضاعت واجب نہیں ہے۔ اگر کوئی نہیں چاہتا تو پہلے ہی دودھ بڑھایا جا سکتا ہے [6]۔

اب اگر وہ ماں جو دودھ پلا رہی ہے اپنے شوہر یعنی اس بچہ کے باپ کے حبالہ عقد میں ہے تو اس کا نان و نفقہ تو بہ تقاضائے زوجیت شوہر پر ہے ہی لیکن اگر یہ طلاق دے چکا ہے تو عام حالات میں تو عدہ کے بعد اب اس کے نان و نفقہ کہ ذمہ داری اس پر نہ تھی لیکن اگر یہ اس سے اپنے بچہ کو دودھ پلوا رہا ہے تو اب اس کا فرض ہے کہ وہ اس مدت رضاعت میں اس عورت کے طعام و لباس کا کفیل رہے [7]۔

احکام رضاعت:

اب اس میں ماں کا کام یہ ہوا کہ وہ بچہ کو دودھ پلائے اور باپ کا یہ کہ وہ اس کی ضروریات کا کفیل رہے۔ عام بشری کمزوریوں کی بناء پر طلاق کے بعد دونوں طرف جذبات کام کر سکتے ہیں۔ ایک طرف ہوسکتا ہے عورت شوہر کی ضد میں یہ کہے کہ اپنے بچہ کو دودھ پلوا لو، مجھے اب ضرورت نہیں ہے کہ میں اس زحمت میں مبتلا ہوں اور دوسری طرف ہوسکتا ہے کہ مرد اس غیظ و غضب سے کہ جو اسے عورت کے خلاف ہے یہ کہے کہ میں اس سے دودھ بھی پلوانا نہیں چاہتا۔ پیسہ دینا ہے تو کسی اور کو دوں گا۔ قرآن ان دونوں ہی معاندانہ جذبات کے خلاف انہیں بچہ کے مفاد کی طرف متوجہ

---

[1]۔ اگر تم (اے مردو!) یہ چاہو کہ اپنی اولاد کو (غیر عورت کا) دودھ پلواؤ (عماد الدّین)

[2]۔ ما اردتم ایتاءہ ایّاھنّ وشرطتم لھن (صافی)

[3]۔ خبر فی معنی الامر المؤکد (صافی)

[4]۔ امر استیجاب لا امر ایجاب (مجمع البیان)

[5]۔ لو وجب علیھا الرضاع لم تستحق الاجرۃ (نیشا پوری)

[6]۔ ای ھٰذا منتھی الرضاعۃ ولیس مادون ذٰلک حد محدود وانما ھو علی مقدار اصلاح الصبیّ وما یعیش بہ (معالم التنزیل)

[7]۔ ذٰلک فی المطلّقۃ (مجمع البیان)

کرتا ہے کہ تم دونوں آپس میں کیسی ہی ایک دوسرے سے نفرت رکھتے ہو مگر بچہ تو تم دونوں ہی کا ہے۔اس کا مفاد تم دونوں کے پیش نظر رہنا چاہیے نہ عورت ہی کو زیبا ہے کہ وہ اپنے بچے کے نقصان کے درپے ہو اور نہ مرد ہی کو کہ وہ اپنے بچہ کو نقصان پہنچانے کا باعث ہو۔اس سے ضمناً یہ ایک بات نکلتی ہے کہ بچہ کے لئے خود اس ماں کی رضاعت جتنی مناسب و اصلح ہے کسی دوسرے کی نہیں [1] اور اس سے ان لوگوں کی آنکھیں کھلنا چاہئیں جو بلا وجہ بھی صرف شان ریاست میں یا راحت طلبی میں اپنے بچوں کو اناؤں سے دودھ پلواتے ہیں۔

اس محل پر قرآن میں ولد کے لفظ کی تکرار (لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ) اسی لئے کی گئی ہے کہ پہلی جگہ اس کی اضافت ماں کی طرف دینا تھی اور دوسری جگہ باپ کی طرف اور اس اضافت ہی میں ان کے جذبہ ترحم کا بچہ کی نسبت پیدا کرنا مضمر ہے۔اور یہ انداز خود بتاتا ہے کہ یہ ارشاد حاکمانہ نہیں ہے بلکہ فرمائش حکیمانہ ہے اور اس لئے اگر وہ مخالفت کریں تو قانون انہیں کچھ سزا نہ دے گا مگر اس کے خراب نتائج کا انہیں منتظر رہنا چاہیے۔اب اگر اتفاق سے طلاق دینے کے بعد باپ کا انتقال ہو گیا تو قرآن کہہ رہا ہے کہ اس کے وارث [2] کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔

یہ کہ حکم گذشتہ کہ اس عورت کو دودھ پلانا اور باپ کو اسی ماں سے دودھ پلوانا چاہیے کوئی حکم وجوبی نہیں ہے بلکہ اولاد کی بہتری کے خیال سے ہے اسے پھر بعد میں نمایاں کیا جا رہا ہے اس طرح کہ اگر دونوں باہمی رضامندی اور باہمی مشورے سے مناسب یہی سمجھیں۔یعنی بچہ کے لئے اسی کو بہتر محسوس کریں [3] کہ بچہ کا دودھ دو برس سے پہلے ہی بڑھا دیں [4] مثلاً ماں کی صحت اچھی نہیں ہے اور اس کے دودھ سے بچہ کے بیمار ہو جانے کا اندیشہ ہے تو کوئی حرج نہیں ہے کہ پہلے ہی دودھ چھڑا دیں۔اب اگر کسی اور عورت سے دودھ پلوانا چاہو [5] تو اُن دوسری عورتوں سے جو مناسب اُجرت طے کرو۔اُس کے دینے کے بعد ان سے دودھ پلوا سکتے ہو آخر میں کہا گیا ہے کہ ''اللہ کے غضب سے بچو اور جانے رہو کہ اللہ تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے''مطلب یہ ہے کہ بالکل سچائی کے ساتھ جو کچھ کرو بچہ کے حق میں اچھا کرو اور اس میں جذبات سے کام لو اور نہ دوسرے کے ساتھ چال بازی کرنے کی کوشش کرو بلکہ معاملہ صاف ستھرا رکھو کہ بچہ کی صحیح پرورش بھی ہو جائے اور کسی کا حق بھی مارا جائے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ

---

[1] ۔فعن النّبیّ ﷺ لیس للصّبی لبن خیر من امّہ وفی الکافی والفقیہ عن امیر المؤمنین علیہ السلام ما من لبن رضع بہ الصّبی اعظم برکۃ علیہ من لبن امّہ (صافی)

[2] ۔المراد بالوارث الاب (بیضاوی)

[3] ۔انما شرط تراضیھما وتشاورھما مصلحۃ للولد (مجمع البیان)

[4] ۔فصالا ای فطاما قبل الحولین (جلالین) از شیر باز گردانند یعنی پیش از دو سال (شاہ ولی اللہ)

[5] ۔ای لاولادکم مراضع غیر امھاتھم لارضاعھم (معالم التنزیل)

بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۲۳۴

”اور جو تم میں مر جائیں اور بیویاں چھوڑ گئے ہوں تو یہ چار مہینے دس دن اپنے کو روکیں جب اتنی مدت پوری کر لیں تو وہ جو اپنے حق میں مناسب طور پر کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہ ہوگا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“

عدۂ وفات:

اس میں عدّۂ وفات کا بیان ہے اور اس عدّۂ وفات کے بعد عقد بیوگان کی اجازت ہے توفی کے اصل معنی تو پورا پورا لینے کے ہیں [۱] اور اس لئے حضرت عیسیٰؑ کے لئے زندہ ہونے کے باوجود اس دنیا میں قیام کی مدت پوری ہو جانے کے لئے قرآن میں توفی کی لفظ کا استعمال ہوا ہے مگر چوں کہ عمو ما یہ مدت کا پورا ہونا بصورت موت ہوتا ہے اس لئے اکثر موت کیلئے بھی توفی کے لفظ کا استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے کہ یہاں عدّۂ وفات کا بیان مقصود ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر شوہر کا انتقال ہو جائے اور زوجہ موجود ہو تو وہ چار مہینے دس دن عدۂ رکھے۔

یہاں بھی الفاظ قرآنی اگرچہ مطلق ہیں مگر حکم مقید ہے ان ہی عورتوں کے ساتھ جنہیں حمل نہ ہو۔ حاملہ کے لئے عدۂ کا تعلق متعلق علیہ طور پر وضع حمل کے ساتھ ہے اس مدت کے گزرنے کے ساتھ نہیں [۲]۔

جب یہ عدۂ گزر جائے تو قرآن کہہ رہا ہے کہ تمہارا کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ نیکی کے ساتھ یعنی شرعی طریقہ پر اپنے بارے میں جو چاہیں کریں یعنی جن سے چاہیں عقد کریں۔ انداز بیان بتا رہا ہے کہ اس میں مخاطب وہ لوگ ہیں جو عقد بیوگان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اگر عورت ایسا کرنا چاہیے تو اس پر رسم و رواج یا مزعومہ شرافت کا دباؤ ڈالتے ہیں۔ آخری الفاظ کہ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے انہی لوگوں کے لئے انتباہ ہے کہ تم کس کس عورت کو اس بارے میں متاثر کرتے ہو خدا خوب جانتا ہے۔ اس میں وہ برتاؤ بھی داخل ہے جو عقد ثانی کر لینے والی بیواؤں کے ساتھ کیا جاتا ہے جو پھر دوسری بیواؤں کو ایسے اقدام سے باز رکھنے کا ذریعہ ہے جس سے ان کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ قرآن صاف سمجھا رہا ہے کہ یہ تمہارا طرز عمل خدا کا ناپسند ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

---

[۱]۔ اصل التوفّی اخذ الشیئ کاملا وافیا (غرائب القرآن) معنی التوفّی ھذا الشیء وافیا (معالم التنزیل)

[۲]۔ ھذا فی غیر الحوامل فعدتھن ان یضعن حملھن (جلالین)

حَلِيۡمٌ ﴿٢٣٥﴾

''اور تم پر کچھ گناہ نہیں اس میں کہ تم اشارۃً کنایۃً ان عورتوں کی خواست گاری کرو یا اپنے دلوں میں چھپا رکھو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تمہیں وہ جلدی یاد آئیں گی مگر ان سے خفیہ طور پر قول و قرار نہ کرو سوا اس کے کہ اچھے عنوان سے کوئی بات اور عقد نکاح اس وقت تک نہ کرو جب تک مقررہ معیاد پوری نہ ہو جائے اور جانے رہو کہ اللہ تمہارے دلوں کے اندر کی بات جانتا ہے تو اس سے ڈرتے رہو اور سمجھ لو کہ اللہ بڑا بخشنے والا ہے برداشت کرنے والا [1]۔''

زمانۂ عدّہ کے بعض احکام:

یہ ان افراد کو نصیحت ہے جو بیوہ عورتوں سے عدۃ گزرنے کے بعد نکاح کرنا چاہتے ہیں کہ تمہیں عدۃ کے اندر اس بارے میں صراحۃً کوئی قول قرار کرنا نہیں چاہیے مگر اشارۃً کنایۃً اگر اس کا اظہار کردو کہ تم ان کے طلب گار ہو [2] تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کی نوعیت یہ ہے کہ مثلاً اس عورت کے سامنے اس کا تذکرہ کرے کہ میرا ارادہ عقد کرنے کا ہے اور اگر ایسی عورت مل جائے جس میں یہ اوصاف ہوں تو کیا کہنا اور اوصاف جو ذکر کیے ایسے ہوں جو اس عورت میں پائے جاتے ہیں [3]۔ یا یہ کہ اس سے باتوں باتوں میں کہے کہ تمہاری طبیعت میرے بہت موافق مزاج ہے اور تمہارے عادات و خصائل وغیرہ مجھے بہت پسند ہیں۔ اب تقدیر دیکھئے میرا ساتھ دیتی ہے یا نہیں [4]۔ بس اس کے علاوہ خود اس سے کوئی وعدہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے، ظاہر بظاہر اور نہ خفیہ طور پر جس کی بعد میں صراحۃً ممانعت کی گئی ہے۔ اس صورت میں پادری عماد الدین کا یہ ترجمہ کتنا غلط ہے کہ ''تم پر کچھ گناہ نہیں کہ عورت کو نکاح کا پیغام خفیہ دو یا اپنے دل میں چھپا رکھو''۔ خدا جانتا ہے کہ تم ان سے کہو گے مگر تم خفیہ وعدہ نہ کر بیٹھو، حسب دستور کوئی بات بول دو'' جب بعد میں یہ ہے کہ ''خفیہ وعدہ نہ کر بیٹھو تو شروع میں یہ کیسا کہ عورت کو نکاح کا خفیہ پیغام بھیجو' وہاں خفیہ اور ظاہر کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ وہاں تو یہ ہے کہ الفاظ پیغام کے نہ ہوں بلکہ ایسے ہوں جن سے خیال یہ پیدا ہوتا ہو کہ یہ اس کو پیغام دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایسے الفاظ چاہے مجمع میں بھی کہے جائیں تو قرآن نہیں روکتا اور پیغام خفیہ بھی بھیجا جائے تو قرآن اس کی ممانعت کر رہا ہے۔

اور عقد کرنا تو عدۃ کے پہلے حرام ہے ہی جسے کہا گیا ہے کہ وَلَا تَعۡزِمُوۡا عُقۡدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبۡلُغَ الۡكِتٰبُ اَجَلَهٗ عقد نکاح اس وقت تک استوار نہ کرو جب تک مقررہ معیاد پوری نہ ہو جائے یعنی عدۃ کی مدت گزر نہ جائے [5]۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ ''اللہ برداشت کرنے والا ہے'' اس برداشت کا مطلب یہ ہے کہ وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ

---

[1]۔ بخشنے والا تحمل والا ہے (شاہ رفیع الدین)

[2]۔ بان تعرضوا بالخطبۃ ولا تصرحوا بہا (صافی)

[3]۔ عن ابن عباس (مجمع البیان) عن القاسم بن محمد و الشعبی (مجمع)

[4]۔ عن القاسم بن محمد و الشعبی (مجمع)

[5]۔ حتی ینتہی ما کتب من العدۃ (بیضاوی)

پوری حجت تمام ہو لینے دیتا ہے اور اس کے لئے برابر مہلت پر مہلت دیئے چلا جاتا ہے[1] جو اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اِنۡ طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمۡ تَمَسُّوۡهُنَّ اَوۡ تَفۡرِضُوۡا لَهُنَّ فَرِيۡضَةً ۖۚ وَّمَتِّعُوۡهُنَّ ۚ عَلَى الۡمُوۡسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الۡمُقۡتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ حَقًّا عَلَى الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۲۳۶﴾

"تم پر کوئی بار نہیں ہے[2] اگر تم عورتوں کو طلاق دو جب تک کہ انہیں ہاتھ نہ لگا یا ہو یا ان کے لئے کوئی مہر مقرر نہ کیا ہو[3] ہاں انہیں خرچ کو دو، خوش حال اپنی حیثیت کے مطابق اور غریب اپنی حیثیت کے موافق کچھ مناسب خرچ جو نیک اعمال لوگوں کے ذمہ ایک حق ہے۔"

مہر وغیرہ جو ادا کرنا ہوگا:

یہ اس صورت کے حکم شرعی کا بیان ہے کہ جب بیوی کو کسی وجہ سے مباشرت کے پہلے ہی[4] طلاق دیدے یہاں اگر کوئی مہر مقرر تھا تو نصف مہر دینا ہوگا جس کا اس کے بعد ذکر ہوگا لیکن بوقت عقد کوئی مہر بھی مقرر نہ تھا تو اس صورت میں کہا جا رہا ہے کہ تم پر کوئی بار نہیں ہے یعنی اس صورت میں کسی خاص مقررہ رقم کی پابندی نہیں ہے بلکہ جو کچھ مناسب ہو حسب حیثیت اسے دیدو۔

یہ حسن عمل رکھنے والوں کے لئے ایک لازم الاداحق ہے، یعنی اس حق کا ادا کرنا حسن عمل کا لازمی تقاضا ہے۔

وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يَّعۡفُوۡنَ اَوۡ يَعۡفُوَا الَّذِىۡ بِيَدِهٖ عُقۡدَةُ النِّكَاحِ ‌ؕ وَاَنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى ‌ؕ وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡ ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۲۳۷﴾

"اور اگر تم ان عورتوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دو جب کہ تم ان کے لئے کچھ مہر مقرر کر چکے ہو، تو تم کو جو تم نے مقرر کیا ہو اس کا آدھا لازم ہوگا، مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں یا جس کے قبضہ میں نکاح کا معاہدہ ہے"[5]۔

---

[1]۔ حليم بتاخير العقوبة عن مستحقها (جلالين)

[2]۔ لا تبعة عليكم من مهر اووزد (صافی)

[3]۔ المراد بالفريضة الصداق بلا خلاف (مجمع البیان)

[4]۔ مالم تمسوهن ای تجامعوهن (بیضاوی)

[5]۔ یا وہ شخص کہ جس کے ہاتھ عقد باندھنا ہے (تاج العلماء)

وہ درگزر کرے اور اگر تم لوگ درگزر سے کام لو تو پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے اور آپس میں لطف و کرم کو نہ بھولو۔ بلاشبہ اللہ اس کا جو کچھ تم کرتے ہو دیکھنے والا ہے۔"

اب اگر طلاق قبل دخول [1] ہو مگر مہر مقرر ہو تو یہاں نصف مہر کا دینا شوہر کو لازم ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ زوجہ اگر وہ بالغ ہے اور اگر نابالغ ہو تو اس کا ولی جو باپ دادا ہوتا ہے [2] معاف کر دے۔

ایک دوسری تفسیر یہ ہے کہ جس کے قبضہ میں نکاح کا معاہدہ ہے اس سے مراد شوہر ہے مطلب یہ ہے کہ زوجہ معاف کر دے کہ وہ کچھ نہ لے یا شوہر درگزر سے کام لے، بایں معنی کہ اسے حق تو تھا آدھے مہر کے رُوک لینے کا مگر وہ پورا ہی دینے کے لئے آمادہ ہو جائے [3] مگر عفو سے زیادہ تر جو معنی سمجھ میں آتے ہیں وہ اپنے حق سے درگزر کرنے ہی کے ہوتے ہیں دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینے کے نہیں اس لئے پہلی تفسیر الفاظ قرآن سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔

بہرحال اس معافی یا درگزر کی قرآن نے یہ کہہ کر ترغیب بھی دی ہے کہ جہاں تک ہو سکے آپس میں تفضّل اور احسان سے کام لینا نہ بھولو" یہ پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے حق سے ذرا درگزار کرنے پر تیار ہو جائے اس کے لئے یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے ذمہ دوسرے کا حق کچھ بھی رہ جائے۔ لیکن اگر کوئی اپنے حق سے ایک پائی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں اس کے لئے بہت ممکن ہے کہ کچھ اپنے حق سے زائد بھی دانستہ یا نادانستہ وصول کرلے۔ اس لئے ایک احساس فرض رکھنے والے کے لئے پہلی ہی صورت اختیار کرنا بہت بہتر ہے۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾

"پابندی کرو [4] نمازوں کی اور بیچ والی نماز کی اور اللہ کے سامنے قنوت پڑھتے ہوئے کھڑے ہو۔"

نمازِ وُسطیٰ:

درمیانی نماز کی تعیین میں روایات و اقوال مختلف ہیں [5] مگر احادیث اہل بیت علیہم السلام کے رُو سے اس خیال کو قوت ہے کہ اس سے ظہر کی نماز مراد [6] ہے بلکہ ہمارے معصومین علیہم السلام کی صحیح و معتبر احادیث کی بناء پر اس کو یقینی سمجھنا چاہیے [7]۔

---

[1]۔ المراد بالمس المذکور فی الآیۃ الجماع (بغوی)

[2]۔ الذی بیدہ عقدۃ النکاح قیل ھو الولی. وھو المروی عن ابی جعفر و ابی عبد اللہ (مجمع البیان) عن ابن عباس ھو الولی اذ کانت محجورۃ (جلالین)

[3]۔ کسیکہ بدست او عقدِ نکاح است یعنی زوج حق خود گزاشتہ تمام دہد (شاہ ولی اللہ)

[4]۔ داوموا علیہا فی مواقیتہا باداء ارکانہا (صافی) تقیّد کنید بر ہمہ نمازہا (شاہ ولی اللہ)

[5]۔ فی الصّلوۃ الوسطی سبعۃ اقوال (نیشاپوری)

[6]۔ ھو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام و ابی عبد اللہ علیہ السلام و یدل علیہ سبب نزول ھذہ الآیۃ (مجمع البیان)

[7]۔ عن الخلاف ان علیہ اجماع الفرقہ و المروی فی احادیثنا (البلاغ)

چوں کہ صحابہ رسول اللہ کے ساتھ دوسری نمازوں کی جماعت میں کثرت کے ساتھ شریک ہوتے ہیں مگر ظہر کی نماز میں وقت گرم ہونے کی وجہ سے کم لوگ شریک ہوتے تھے، اس لئے اس آیت میں نمازوں کی عام پابندی کے ساتھ خصوصیت سے نماز ظہر کی پابندی کا حکم ہوا اور اسے وسطیٰ اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ دن کی نمازیں تین ہیں۔ ان میں پہلے صبح آخر میں عصر اور بیچ میں نماز ظہر واقع ہوتی ہے بعض روایات و اقوال اہل سنت بھی اسے متفق ہیں [1]۔

قانتین کا لفظ قنوت سے ہے جو نماز کا ایک خاص جزء ہے جو واجب نہ سہی مگر اس کا بڑا تاکیدی حکم ہے اسی لئے ہم نے ترجمہ میں اس لفظ کو بعینہٖ رکھ دیا ہے۔ یہ قنوت کیا ہوتا ہے؟ بارگاہ الٰہی میں دعا جس کا خصوصی طور پر نماز کی دوسری رکعت میں سوروں کی تلاوت کے بعد حکم ہے۔ روایات اہل سنت میں بھی اس کی تائید موجود ہے [2] مگر سواد اعظم کے عام فقہاء چوں کہ قنوت کی اہمیت نہیں سمجھتے اس لئے ان میں اس قنوت کے معنی اطاعت کے [3] اور کبھی چپ رہنے کے [4] کہے جاتے ہیں ظاہر ہے کہ ہمارا نقطۂ نظر اس بارے میں زیادہ واضح ہے اور ہمارے درمیان اس کے بارے میں کوئی انتشار وافتراق بھی نہیں ہے۔

ایک حدیث صحیح سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں قنوت کی تشریح اسی آیت سے ہوئی ہے [5]۔

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۖ فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٩﴾

"ہاں اگر تم خوف میں ہو تو پھر پیادے اور سواری کے عالم میں جیسا ہو [6] پھر جب تمہیں اطمینان ہو تو ذکر خدا کا کرو جیسا کہ اس نے تمہیں وہ باتیں سکھائی ہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔"

چوں کہ اس کے پہلے کہا گیا تھا کہ نماز میں کھڑے ہو تو اس آیت میں استثنائی صورت کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی خوف وخطر کی وجہ سے باطمینان کھڑے ہو کر عبادت ممکن نہ ہو تو پھر جس طرح ممکن ہو اسی طرح نماز پڑھو [7] یہاں تک کہ بعض صورتوں میں صرف ایماء واشارہ سے نماز

---

[1] ۔ یروی عن عمر و زید بن ابی بکر و ابی سعید الخدری و اسامة بن زید و هو قول ابی حنیفة و اصحابه (نیشاپوری)

[2] ۔ عن ابن عباس ان القنوت هو الدّعاء (نیشاپوری) دلیله ماروی عن ابی عباس قال قنت رسول اللهﷺ شهرا متنابعا یدعو علی احیاء من بنی سلیم علی، واذکر ان وعصیة (بغوی)

[3] ۔ بایستد برائے خدا فرمان بردار شدہ (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔ کھڑے ہو واسطے اللہ کے چپکے (شاہ رفیع الدین)

[5] ۔ فی صحیحة زرارة عن الباقر نزلت هذه الایة فی یوم الجمعة و رسول اللهﷺ فی سفره فقنت فیها (البلاغی)

[6] ۔ فصلّوا راجلین او راکبین (بیضاوی)

[7] ۔ عنی به صلوة الخوف (مجمع البیان)

ہوگی [1] لیکن ہر حال میں نماز کا بجالا نا ضروری ہے۔ جنگ کی حالت میں نماز کی خاص صورت شرع میں وارد ہوئی ہے جسے نماز خوف کہتے ہیں کتب فقہ میں اس کے احکام تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ آخر میں بتادیا گیا ہے کہ یہ اضطراری حکم ہے، لہٰذا جب عذر زائل ہو جائے، یعنی امن وسکون ہو جائے تو پھر جس طرح عام طور پر نماز کی تعلیم دی گئی ہے [2] اس طرح ادا کرنا لازم ہوگا۔ نماز کو ذکر اسی طرح کہا گیا ہے جیسے نماز جمعہ کے حکم میں ارشاد ہوا ہے اِذَا نُوۡدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنۡ یَّوۡمِ الۡجُمُعَۃِ فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ (یعنی) جب روز جمعہ کی منادی ہو جائے تو فوراً ذکر الٰہی کی طرف دوڑ پڑو یعنی نماز کے لئے روانہ ہو جاؤ۔

وَالَّذِیۡنَ یُتَوَفَّوۡنَ مِنۡکُمۡ وَیَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا ۚۖ وَّصِیَّۃً لِّاَزۡوَاجِہِمۡ مَّتَاعًا اِلَی الۡحَوۡلِ غَیۡرَ اِخۡرَاجٍ ۚ فَاِنۡ خَرَجۡنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡ مَا فَعَلۡنَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِنَّ مِنۡ مَّعۡرُوۡفٍ ؕ وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۴۰﴾

”اور جو تم میں سے دنیا سے جا رہے ہوں [3] اور بیویوں کو چھوڑ رہے ہوں تو انہیں اپنی بیویوں کے لئے وصیت کر جانا چاہیے [4] کہ سال بھر تک بغیر گھر سے نکالے ہوئے انہیں خرچ دیا جاتا ہے ہاں اگر وہ نکل جائیں تو جو کچھ اپنے بارے میں وہ مناسب طور پر کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں اور اللہ زبردست ہے بڑی سوجھ بوجھ رکھنے والا۔“

عدۂ وفات کا قدیم حکم جو منسوخ ہو گیا:

اس آیت سے تو بعض مفسرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عدۂ وفات ابتدائے اسلام میں ایک سال تھا اور اس صورت میں بعد میں جو یہ ہے کہ اگر وہ چلی جائیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک سال ہو جائے اور عدۂ پورا ہو جائے تو اب انہیں اختیار ہے کہ وہ اپنا عقد ثانی کر لیں [5] مگر ظاہر جو آیت سے سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ سال بھر تک انہیں شوہر کے گھر میں رہنے کا حق ہے اور ورثہ کو اس مدت کے اندر انہیں نکالنا جائز نہیں ہے اور شوہر کے مال سے اس دوران میں انہیں نان ونفقہ ملے گا جس کے لئے موقع ملے تو شوہر کو وصیت کر دینا چاہیے لیکن وہ اپنے اس حق سے فائدہ نہ اٹھانا چاہیں اور اس درمیان میں چلی جائیں [6] تو پھر ان کا نان ونفقہ ساقط ہو جائے گا اور اب وہ عقد ثانی کر لیں تو کسی مزاحمت کا حق نہیں ہے۔ اس سے عدۂ کے بارے میں مسلمہ عدۂ وفات یعنی چار مہینے دس دن کے خلاف کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ کہ اس میں عدۂ کی صراحت

---

[1]۔ فی الکافی عن الصّادق علیہ السلام سئل عن ھٰذہ الایۃ فقال اذا خاف من سبع او لصّ یکبّر و یومی ایماء (صافی)

[2]۔ من صلاۃ الامن (نیشاپوری)

[3]۔ ای الذین یقاربون منکم الوفاۃ لان المتوفی لا یأمر ولا ینھی (مجمع البیان)

[4]۔ فلیوصوا وصیۃ لھا (مجمع)

[5]۔ قبل ان المراد اذا خرجن بعد مضی الحول و قد مضت العدّۃ و ان بمعنی اذا (مجمع البیان)

[6]۔ خرجن بانفسھنّ قبل الحول من غیر ان یخرجھنّ الورثۃ (مجمع)

نہیں کی گئی کہ وہ نکلنے کے بعد پھر عقد کب کرسکتی ہے اس کی تشریح دوسری آیت سے ثابت ہوجائے گی۔

اب اس آیت میں اگر عدۂ وفات کا بیان ہے کہ اس کی مدت ایک سال ہے تو بھی اس پر مسلمانوں کا عمل نہیں ہے بلکہ گزشتہ آیت پر عمل ہے جس میں کہا گیا تھا: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک سال والی آیت منسوخ ہے اور وہ چار مہینے دس دن والی ناسخ ہے اور ظاہر ہے کہ اصل تنزیل میں حکم منسوخ مقدم ہوتا ہے اور حکم ناسخ موخر مگر موجودہ ترتیب قرآن میں چار مہینے دس دن والی آیت پہلے ہے جس کی تفسیر سابق میں لکھی گئی اور یہ ایک سال والی آیت بعد ہے جس کی تفسیر اب لکھی جارہی ہے۔اس سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترتیب قرآن مطابق تنزیل نہیں ہے جو ایک قطعی حقیقت ہے [۱]۔

اور اگر اس میں عدۃ کا بیان نہ سمجھا جائے تب بھی یہ حکم کہ سال بھر تک ورثہ کو لازم ہے کہ اسے گھر میں رہنے کا حق دیں اور اس ایک سال تک اس کا نان ونفقہ لازم ہے۔ یہ بھی فقہ اسلامی میں معمول بہ نہیں ہے لہٰذا اس صورت میں بھی اس آیت کو منسوخ ہی تسلیم کرنا پڑے گا [۲]۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾

”اور طلاق دی ہوئی عورتوں کو مناسب طور پر خرچ دینا لازم ہے یہ پرہیزگاروں کے ذمہ ایک حق ہے۔“

ترتیب نزول کو مفادات قرآنی سمجھنے میں خاص اہمیت تھی۔ اس سے انکار ممکن ہی نہیں چنانچہ یہ آیت کب کی اتری ہوئی ہے اس کے معلوم نہ ہونے سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں خرچ سے جو مطلقات کو دیا جائے کیا مراد ہے؟

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت اس وقت کی ہے جب مہر کا حکم نہیں آیا تھا یا اس صورت کی ہے جب ایک سال کا عدۃ تھا اور سال بھر تک ان کا نان ونفقہ لازم الادا تھا۔ بہرحال اب جو فقہ اسلامی میں مسلم ہے وہ یہ ہے کہ اگر عورت کا مہر بوقت نکاح کچھ مقرر کردیا گیا تھا اور تعلقات ازدواجی بھی قائم ہوئے اس کے بعد طلاق دی گئی تھی تو اس صورت میں اس کا پورمہر واجب الادا ہوگا۔اس کے علاوہ اور کچھ دینے دلانے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر مہر مقرر ہوچکا تھا اور بغیر تصرفات ازدواجی طلاق ہوگئی تو نصف مہر کا اسے استحقاق ہوگا۔اس کے علاوہ اور کچھ ضرورت نہیں اور اگر مہر کچھ مقرر نہیں ہوا تھا اور ازدواجی تعلقات بھی قائم نہیں ہوئے کہ طلاق ہوگئی تو اس صورت میں بس حسب حیثیت کچھ روپیہ پیسہ دے کر اسے رخصت کردے۔اس روپے کو جو اس صورت میں دیا جائے فقہ میں متاع اور متعہ کی لفظ ہی سے تعبیر کرتے ہیں ہوسکتا ہے کہ متاع بالمعروف کا اجمال اس پوری تفصیل پر حاوی ہو [۳]۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ متاع سے مراد علاوہ مہر کے کچھ دینا بھی ہو اور اسے عام بھی قرار دیں کہ جس میں تمام مطلقات داخل ہوجائیں مگر اس حکم کو وجوبی نہ سمجھا جائے بلکہ استحباب پر محمول کیا جائے اور یہ احادیث سے ثابت ہے کہ مال ومتاع دے کر رخصت کرنے کا استحباب طلاق کے

---

[۱]۔ کان ذٰلك فی الاول الا سلام ثم نسخت المدۃ بقوله اربعة اشهر وعشرا وهو وان كان مقدما فی التلاوۃ فهو متاخّر فی النزول (بیضاوی) تلك الاية متاخرۃ عن هٰذه باجماع المفسرین (نیشاپوری) نسخ عدۃ الحول باربعة اشهر وعشرا۔ (معالم التنزیل للبغوی)

[۲]۔ اتفق العلماء علیٰ ان هٰذه الاية منسوخة (مجمع البیان) الوصية المذكورۃ منسوخة باٰیته المیراث وتربّص الحول باٰیة اربعة اشهر وعشر السابقة المتاخرۃ فی النزول (جلالین)

[۳]۔ عندنا لا یجب المتعة الّا المطلقة التی لم یدخل بها ولم یفرض لها مهر (مجمع البیان)

بعد بہرصورت ہے [۱]۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾

"اس طرح اللہ تمہارے لئے اپنے احکام واضح طور پر بیان کرتا ہے شاید کہ تم سمجھو۔"

آیات کا لفظ قرآن مجید میں اکثر معجزات کے معنی میں آیا ہے اور کبھی مصنوعات قدرت کے معنی میں اور کبھی خود قرآن کی آیات کے معنی ہیں اور ان سب کے علاوہ کبھی احکام کے بارے میں اس لے کہ وہ بھی ایسے حکیمانہ ہیں جو مثل معجزات کے نبیؐ کی سچائی اور اس شریعت کی حقانیت کا ثبوت ہیں۔ چنانچہ یہاں اور اس کے قبل کا بھی بعض آیتوں میں جن کی تفسیر گزر چکی ہے۔ یہ لفظ احکام ہی کے لئے صرف ہوا ہے [۲]۔

لعلکم تعقلون میں عقل سے کام لینے کے ہیں [۳] اس لئے کہ اگر عقل کے مطابق عمل نہیں کرتا تو وہ نتیجۃً بے عقل کے مثل ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

"کیا نہیں دیکھا تم نے ان کو جو مرنے کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے ہزاروں کی تعداد میں تو کہا انہیں اللہ نے مرجاؤ پھر انہیں زندہ کیا بلاشبہ اللہ بڑا لطف وکرم والا ہے انسانوں پر لیکن اکثر آدمی شکرگزار نہیں ہیں۔"

وہ جماعت جو مر کر زندہ کی گئی:

"کیا نہیں دیکھا" یعنی کیا تمہیں خبر نہیں [۴] یا خبر ہے اور تم نے اس واقعہ پر غور نہیں کیا اور یہ تخاطب کوئی خاص رسولؐ سے نہیں ہے بلکہ مطلق طور پر سننے والے کو متوجہ کیا جارہا ہے [۵]۔

بعض لوگوں نے ہر ایسے صیغۂ مفرد کا تخاطب رسولؐ ہی کی جانب قرار دینا ضروری سمجھا ہے چنانچہ یہاں بھی یوں ہی ترجمہ کیا ہے [۶] مگر میں اس درست نہیں سمجھتا۔

---

[۱]۔ فی الاخبار ایضا مایدل علی التعمیم ______ وذٰلك محمول علی الاستحباب (صافی)

[۲]۔ یبین اللہ لکم اٰیتہ ھٰذہ احکام (مجمع البیان)

[۳]۔ المراد بہ استعمال العقل مع العمل بہ (مجمع)

[۴]۔ الرویۃ ھنا بمعنی العلم (مجمع البیان)

[۵]۔ آیا ندیدہ ای اے بیندہ (شاہ ولی اللہ)

[۶]۔ کیا تو نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ لوگ نہیں دیکھے (عماد الدین)

اب قرآن نے بالا جمال یہ تذکرہ کیا ہے کہ ایک قوم موت کے خوف سے نکلی مگر ایک دم اسے موت آ گئی اس ایک دم موت کی تعبیر ان الفاظ سے کی گئی ہے "اللہ نے کہا مر جاؤ وہ مر گئے"[۱]

یہ مر جاؤ کوئی خاص لفظی ارشاد نہیں ہے۔ یہ وہی کن فیکون ہے جس کی عمومی تعبیر کی گئی تو کہیں کہا گیا اور خصوصیت مقام کے لحاظ سے تعبیر کی گئی تو کہیں زمین اور آسمان کے لئے کہا: وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ[۲] کبھی طوفان نوح کے بعد کہا وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ[۳] کبھی جناب ابراہیمؑ پر آگ کے گلزار بنانے کے موقع پر ارشاد ہوا: قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ[۴] مراد سب سے تعلق ارادہ ہے اس شے کے ساتھ جو بلا توقف وقوع میں آنے والے ہے، یہاں چوں کہ ارادہ ان سب کے ایک دم مر جانے سے متعلق ہوا جو بغیر کچھ ظاہری اسباب کے تھا لہٰذا اس کی تعبیر لفظ موتوا کے ساتھ ہوئی[۵]۔

اب یہ جماعت تھی کون اور اس کا واقعہ کیا تھا؟ اسے جب قرآن نے یہ تفصیل بیان نہیں کیا تو ہم اس کے متعلق یقینی طور پر کیا کہہ سکتے ہیں:۔ روایتیں مختلف میں کوئی کہتا ہے یہ بنی اسرائیل کے کچھ لوگ تھے جو طاعون کے خوف سے نکلے تھے کوئی کہتا ہے جہاد کے خوف سے بھاگے تھے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ جناب موسیٰؑ کے تیسرے جانشین خرقیل کے وقت کی بات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں خرقیل کو ذوالکفلؑ بھی کہتے ہیں۔

بہر حال انسانی تدابیر کی ناکامی اور قدرت الٰہی کی کارفرمائی کی حقیقت جسے پیش کرنا قرآن کا نصب العین ہے اس میں ان خصوصیات کا کوئی دخل نہیں ہے اور قرآن کے ان واقعات کو اس اجمالی انداز پر ٹال دینے ہی سے یہ ظاہر ہے کہ مقصد قرآن تاریخ نگاری نہیں ہے بلکہ ان واقعات کے نتیجہ پر دنیا کو توجہ دلانا ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

"اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جانے رہو کہ اللہ سننے والا ہے جاننے والا۔"

اگر یہ آیت تنزیل میں گذشتہ آیت کے بعد ہی کی ہے تو یہ سیاق سابقہ آیت کے متعلق اس قول کو تقویت دیتا ہے کہ وہ لوگ موت کے ڈر سے جہاد کے فریضہ سے جان بچا کر نکلے تھے۔ جب ہی ان کا ذکر کیا گیا کہ وہ فرار کے بعد بھی بچ نہ سکے بلکہ ایک دم مار ڈالے گئے اور پھر زندہ کیے گئے تاکہ انہیں تنبیہ ہو کہ جان بچا کر بھاگنا تقدیر الٰہی کو ٹال نہیں سکتا اور اب اس کے نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کو دعوت جہاد دی گئی کہ اس فریضہ کے ادا کرنے میں موت کی پروہ نہ کرو[۶]۔

---

[۱]۔ ای اماتہم اللہ (صافی)

[۲]۔ سورۂ حٰم السجدہ۔ ۱۱

[۳]۔ سورۂ ھود۔ ۴۴

[۴]۔ سورۂ انبیاء۔ ۶۹

[۵]۔ المعنی انہم ماتوا میتة رجل واحد من غیر علة بأمر الله ومشیئة (بیضاوی) ولا امر ولا قول کما فی قوله سبحانه اذا قضی امرا فانما یقول له کن فیکون (نیشاپوری) فعبّر عن ارادته التکرینیّته بالامر بالموت (البلاغی)

[۶]۔ فان الفرار عن الموت غیر مخلص عنه (صافی) وان الموت اذا لم ینفع منه الفرار فاولی ان یکون فی سبیل اللہ (نیشاپوری)

لیکن چوں کہ ترتیب قرآن مطابق تنزیل نہیں ہے اس لئے اس آیت کا گذشتہ آیت سے متعلق ہونا ضروری نہیں ہے۔

آخری جملہ: اللہ سننے والا ہے جاننے والا بتاتا ہے کہ اس موقع پر کچھ باہمی چرچے تھے اور کچھ دلوں میں اندیشے تھے اس لئے کہا گیا کہ وہ سمیع یعنی سننے والا ہے ان باہمی چرچوں کا اور علیم یعنی جاننے والا ہے ان دلوں کے اندیشوں کا[1]۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

''کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض حسنہ دے[2] تاکہ وہ اسے بہت گنا زیادہ کرکے ادا کرے اور اللہ ہی تنگی کرتا اور کشادگی دیتا ہے[3] اور اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۔''

قرض حسنہ:

جہاد میں جان اور مال دونوں کا کام ہوتا ہے۔ موت کے ڈر کو بے بنیاد قرار دے کر تو جان کی قربانی کے لئے قدم آگے بڑھائے اور اب مال کی قربانی کے لئے آمادہ کیا جارہا ہے یہ کہہ کر کہ جو مال تم صرف کررہے ہو اسے یہ نہ سمجھو کہ وہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے جارہا ہے بلکہ وہ تو ایک قرضہ ہے جو تم اللہ کو دے رہے ہو اور وہ اس کے بعد بہت بڑھا کر تمہیں واپس کرے گا۔ اب یہ واپس کرنا دنیا میں بھی ہوسکتا ہے جس کے لئے کہا جارہا ہے کہ وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ یعنی تمہارے مال و دولت کی کمی یا زیادتی اللہ ہی کے تو ہاتھ میں ہے کسی اور کے اختیار میں تھوڑی ہے[4]۔

لہٰذا وہ چاہے تو اسی دنیا میں اس کے بعد اس سے بہت زیادہ تمہیں عطا کردے اور اگر دنیا سے چلے گئے تو آخرت میں بصورت ثواب اس سے بہت زیادہ عطا ہوگا۔ اس لئے کہا گیا والیہ ترجعون یعنی مرنے کے بعد بھی تو اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے تو وہیں تمہیں بدرجہ زیادہ مل جائے گا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا

---

[1]۔ سمیع بما یقول المنافق علیم بما یجنه (مجمع البیان)

[2]۔ اُدھار دے کر خود خدا کو اچھا اُدھار (تاج العلماء)

[3]۔ خدا ہی تنگ کرتا ہے روزی اور وہی کشادگی دیتا ہے (تاج العلماء)

[4]۔ یقتر علی بعض ویتوسع علی بعض حسبما اقتضت حکمۃ (بیضاوی)

وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾

"کیاتم نے نہیں دیکھا موسیٰ کے بعد اسرائیل کے معززین کو [۱] جب انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کردیجئے کہ ہم راہ خدا میں جنگ کریں۔ انہوں نے کہا کہیں ایسا تو نہ ہو کہ جب تم پر جنگ کا فرض عائد کیا جائے تو پھر تم جنگ نہ کرو۔ انہوں نے کہا بھلا ہمیں کیا ہوجائے گا [۲] کہ ہم خدا کی راہ میں جنگ نہ کریں جب کہ ہم اپنے گھروں اور بال بچوں سے چھڑائے جاچکے ہوں گے۔ مگر جب ان پر جنگ کا فریضہ عائد کیا گیا تو سوا ان کے تھوڑے سے آدمیوں کے سب نے پیٹھ پھیر لی اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔"

قصہ طالوت وجالوت:

یہ نبی کون تھے اور یہ جماعت کون سی تھی جس کا یہ واقعہ ہے؟ اس کی تفصیل بعض روایات میں وارد ہوئی ہے لیکن اگر وہ پایہ تکمیل کو نہ بھی پہنچے تو اس واقعہ کے بیان کرنے کا جو مقصد ہے اس پر کچھ اثر نہیں پڑتا [۳]۔ وہ مقصد ہے مسلمانوں کے لئے انتباہ کا سرمایہ بہم پہنچانا۔ یہ بصیرت کے بہت سے پہلو ہیں جو اس پورے واقعہ میں جس کا سلسلہ چند آیتوں تک برابر چلتا رہے گا رفتہ رفتہ نظروں کے سامنے آئیں گے چنانچہ اس پہلی آیت میں ایک خاص پہلو قابل توجہ یہ ہے کہ قوم دشمنان دین کے مقابلہ میں جہاد کے لئے بے چین ہے مگر نبی سے عرض داشت پیش کرتی ہے کہ ایک حاکم مقرر کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد شرعی بغیر اس حاکم کی اجازت کے جو منصوب من اللہ ہو نہیں ہوسکتا اس کے بغیر جو جنگ ہوگی وہ دنیوی جنگ ہوسکتی ہے دینی جہاد نہیں ہوسکتا۔

نبی نے بھی یہ نہیں کہا کہ تمہیں لڑنا ہے تو لڑو اور کسی کو اپنا سردار مقرر کرلو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا خیال دینی حیثیت سے بالکل درست تھا جس کا خدا اور رسول کی طرف سے امضا کیا گیا اور اسے جب قرآن میں مثالی طور پر پیش کیا گیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام میں بھی وہ اصول قائم ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امم سابقہ میں بھی ظاہری طور پر ایمان لانے والی جماعت میں جو مسلمان کہلاتی ہے ایک اقلیت ہی ہوا کرتی ہے جو تعلیم رسول پر قائم و برقرار رہے، ورنہ اکثریت زیادہ تر راہ راست سے منحرف ہوجایا کرتی ہے جس کا ایمان بس نمائشی رہا ہے اور آزمائشی موقع پر ہمیشہ وہ ناقص ثابت ہوئی ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ

---

[۱]۔ الملأ ای الاشراف والاعیان (البلاغی) ایک ذی رتبہ جتھے کو اسرائیل کے لڑکے بالوں میں سے (تاج العلماء)

[۲]۔ ای ای غرض لنا فی ترک القتال (بیضاوی)

[۳]۔ لم یحصل العلم بذلك النبی و باولئك الملا من الخبر التواتر و خبر الواحد لا یفید الا الظن لکن المقصود حاصل (نیشاپوری)

الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾

''اور ان سے ان کے پیغمبر نے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔انہوں نے کہا اس کے لئے ہم پر بادشاہت کا حق کہاں سے ہوسکتا ہے [۱] ہم اس سے زیادہ بادشاہت کے حق دار ہیں۔اسے مال و دولت میں کچھ وسعت تو ملی ہی نہیں ہے۔پیغمبر نے کہا کہ اللہ نے اسے تم پر ترجیح دی ہے اور اسے علم اور جسمانی طاقت میں زیادتی عطا کی ہے اور اللہ اپنی بادشاہت جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑا وسعت رکھنے والا ہے''علم والا۔''

باوجودیہ کہ خود التجا کی تھی کہ ہمارے لئے ایک بادشاہت مقرر کیا جائے مگر جب اللہ کی طرف سے بادشاہ کا تقرر ہوا تو اس کے انتخاب پر وہ اعتراض کرنے لگے اور اپنی اہلیت کو پیش کرنے لگے۔اب اگر انتخاب الٰہی کے مقابلہ میں حق جمہور کوئی چیز ہوتا تو اس فیصلہ کو واپس ہوجانا چاہیے تھا۔مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ نبی نے انتخاب الٰہی کو ان کے مقابلہ میں بطور حجت پیش کیا [۲] اس سے مسلمانوں کو انتباہ ہونا چاہیے کہ منصب حکومت کے بارے میں ان کا مسلک جمہوریت پر گامزن ہوان سنت الٰہیہ کی مخالفت ہے۔ان کا یہ کہنا کہ انہیں مال و دولت تو ملا ہی نہیں ہے ویسی ہی عوامی ذہنیت کا اظہار تھا جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں جمہور مشرکین کی آواز تھی لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ [۳] (یعنی) یہ قرآن آخر مکہ اور مدینہ کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اترا؟ اسی طرح پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے خلاف یہ آواز اٹھی کہ ان کی عمر زیادہ نہیں ہے مگر خالق کی نظر میں معیار بزرگی نہ مال و دولت ہے اور نہ سن و سال اصل چیز انتخاب ربانی ہے اور اس آیت میں اس کے لئے وجہ استحقاق بتایا گیا ہے علم و جسم میں وسعت کا ہونا معلوم ہوا کہ جو ہر علم اور قوت شجاعت میں جس کی فوقیت ثابت ہوجائے وہ خداوند عالم کی نظر میں سرداری کا مستحق ہوگا [۴] اس انتخاب کے مقابلہ میں پھر کسی کو چون و چرا کا حق نہیں ہے۔

آخر میں خالق کے مقابلہ میں جمہوریت کی پوری عمارت کو یہ کہہ کر مسمار کردیا گیا ہے کہ واللہ یو تی ملک من یشاء یعنی اصل مالک

---

[۱]۔من این یکون له الملک ویستاهل (صافی) کیف ومن این یصح ویصلح له الملک علینا (نیشاپوری)

[۲]۔رد علیهم اوّلا بان العمدة فیه اصطفاً الله وقد اختاره علیکم وهو اعلم بالصالح منکم (بیضاوی) امره علیکم ولا اعتراض لاحد علی حکم الله (نیشاپوری)

[۳]۔زخرف۔۳۱

[۴]۔انهی کان اعلم بنی اسرائیل فی وقته (بغوی) فیه دلالة علی ان من شرط الامام ان یکون اعلم من رعیته واکمل وافضل فی خصال الفضل والشجاعة (مجمع البیان)

ملک خدا ہے لہٰذا وہ اپنی طرف سے جسے چاہے مقرر کردے۔ کسی کو اس میں مداخلت کا حق نہیں ہے [1]۔
آخر میں جو کہا گیا ہے کہ خدا واسع ہے اور علیم اس میں وسعت سے مراد اقتدار ہے کہ وہ جو چاہے اس فیصلہ کے نافذ کرنے سے عاجز نہیں اور علیم ہے یعنی جانتا ہے کہ کون اس لائق ہے کہ اسے مقرر کیا جائے [2]۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾

"اور ان سے ان کے نبی نے کہا کہ اس کی بادشاہت کی پہچان یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق [3] آجائے گا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے سکون کا سرمایہ ہے [4]۔ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ کے گھرانے کے کچھ باقی ماندہ متروکات ہیں [5]۔ اسے فرشتے اٹھائے ہوئے ہونگے۔ ضرور اس میں تمہارے لئے نشانی ہے اگر تم ایمان لانے کے لئے تیار ہو۔"

غور کیا جائے تو اس سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے جو ہمارے یہاں مسلم ہے کہ معجزہ کا ضروری ہونا صرف نبی اور رسول ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ خداوند عالم کی طرف کا جو منصب بھی ہو اس کے ثبوت کے لئے معجزہ ہوتا ہے۔ چنانچہ طالوت نبی یا رسول نہ تھے۔ صرف جہاد کے لئے سردار مقرر ہوئے تھے مگر چونکہ ان کی سرداری خدا کی طرف سے تھی لہٰذا اس کے ثبوت میں معجزہ پیش ہوا اور وہ تابوت سکینہ تھا جو عرصہ نبی اسرائیل کی نگاہوں سے گم تھا۔ اب اس کا غیر معمولی طریقہ سے آنا [6] جسے نبی نے یوں کہا ہے کہ ملائکہ اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر لا رہے ہونگے ان کی حقانیت کا نشان تھا۔ اسی بناء پر ہمارے یہاں آئمہ معصومین علیہم السلام میں سے ہر ایک کے حالات میں ایک باب معجزات کا بھی ملتا ہے جن کا انکار وہی کر سکتے ہیں جو انبیاء و مرسلین کے معجزات کو بھی تسلیم نہیں کرتے اور ان معجزات کا انکار بغیر انکار قرآن کے نہیں ہو سکتا یا اور بات ہے کہ اس انکار کو تاویلات بعیدہ کے پردہ میں جیسا کہ نیاز صاحب فتح پوری کیا کرتے ہیں، پوشیدہ کرکے ظاہری اسلام کو سنبھالنے کی کوشش کی جائے مثلاً

[1]۔ انه تعالیٰ مالك الملك على الاطلاق فله ان يؤتيه من يشاء (بیضاوی)
[2]۔ عليم بمن هو اهل له (جلالین)
[3]۔ التابوت الصندوق (بیضاوی)
[4]۔ الضمير له بيان اى فیٔ اتيانه سكون لكم و طمانية او التابوت اى مودع فيه ما تسكنون اليه (بیضاوی) اس میں تمہاری ڈھارس ہوگی (تاج العلماء)
[5]۔ اور بچی کھچی کھرچن ہوگی اس کی جو کچھ چھوڑ گئے تھے موسیٰؑ اور ہارونؑ کے گھر والے (تاج العلماء)
[6]۔ ان مجیئ التابوت لا بدّ ان يقع على وجه يكون خارقاللعادة حتى يصح ان يكون معجزة و اٰية من عند الله دالة على صدق تلك الدعوىٰ (نیشاپوری)

ً ایک مسلمان کے اختیار میں سچائی کے ساتھ اگر زیادہ سے زیادہ ہوسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ سکینہ کی تفسیر میں جو روایات میں مثلاً یہ کہ وہ جنت کی ہوا کے جھونکے تھے جو اس تابوت کے ساتھ ساتھ چلتے تھے [1] ۔

یا وہ کوئی خاص حیوانی شکل کی مخلوق تھا، زمرد کا بنا ہوا، انہیں ضعف سند وغیرہ کی بناء پر قبول نہ کرے مگر قرآن جو اسے آیہ یعنی معجزہ کہہ کے یہ بتا رہا ہے کہ اس میں ایک سکون واطمینان [2] کا سرمایہ موجود تھا اسے اجمالی طور پر کیوں کر قبول نہ کرے گا؟

دوسری چیز یہ بتائی گئی ہے کہ اس تابوت میں موسیٰؑ اور ہارونؑ کے خاندانی متروکات تھے۔ روایات میں ہے کہ ان میں عصائے موسیٰؑ اور الواح توریت بھی تھے اور کیا شبہ کہ متروکات آل موسیٰؑ ہارونؑ میں یہ خاص اہمیت کے حامل اشیاء ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن نے کہا ہے کہ اسے فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ جب قرآن پر ایمان لانے والے کو اسے ماننا ضروری ہے تو اگر روایت یہ کہتی ہے کہ بنی اسرائیل نے آنکھوں سے دیکھا کہ زمین وآسمان کے درمیان فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں تو اس کے انکار کی معقول وجہ ہوسکتی ہے بلکہ غور کیا جائے تو جب نبی نے پہلے سے جس معجزہ کی خبر دی ہے اس کا جز یہ ہے کہ ملائکہ اٹھائے ہوئے ہوں گے تو اگر یہ چیز ان کے مشاہدہ میں نہ آجائے تو جہت اعجاز مکمل ہی نہیں ہوتی۔

آخر میں کہا گیا ہے کہ اس معجزہ کے بعد اگر تم نیک نیتی کے ساتھ ماننے کے لئے تیار ہو تو اب کوئی وجہ تامل باقی نہیں رہتی [3] ۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص طے کیے ہوئے ہو کہ نہ مانے گا تو اس کے لئے تمام معجزات لا حاصل ہیں جیسا کہ انبیاء ومرسلین کے سامنے ایک بڑی اکثریت ہمیشہ ایسی رہی جو معجزات کو دیکھتی تھی پھر بھی ایمان نہ لاتی تھی۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ ۙ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ ۚ فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ ۚ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۚ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ ۙ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللّٰهِ ۙ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٢٤٩﴾

"اب جو طالوت افواج کو لے کر روانہ ہوئے [4] تو کہا کہ اللہ تم لوگوں کی آزمائش کرنے والا ہے ایک نہر کے ساتھ

---

[1] ۔ ریح هفافة من الجنة لها وجه کوجه الانسان (مجمع البیان)

[2] ۔ طمانیة لقلوبکم (جلالین)

[3] ۔ اما من تمام کلام النبی او خطاب من الله (صافی)

[4] ۔ اصله فصل نفسه ولکن لما کثر حذف مفعوله صار کاللازم (بیضاوی) پس چوں جدا شد یعنی از وطن (شاہ ولی اللہ)

تو جو اس میں سے پانی پی لے گا وہ مجھ سے کچھ واسطہ نہیں رکھتا[1]۔ اور جو اسے چکھے گا بھی نہیں[2] وہ مجھ سے تعلق رکھتا ہوگا مگر وہ جو بس چلو میں پانی لے لے[3] تو سب نے اس سے پانی پی لیا سوا ان میں سے تھوڑے سے لوگوں کے۔ اب جب وہ اور ان کے ساتھ کے وہ ایمان لانے والے[4] وہاں سے آگے بڑھے تو وہ لوگ[5] کہنے لگے کہ ہم میں آج جالوت اور اس کے افواج کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے۔ ان لوگوں نے جنہیں پورا پورا خیال تھا[6] کہ وہ خدا کو منہ دکھائیں گے کہا کہ کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

گزشتہ اجمال کی کہ جب جہاد ہوا تو سوا ایک اقلیت کے باقی سب نے منہ پھیر لیا اب اس آیت میں تفصیل ہے۔

طالوت روانہ ہوئے اور ان کے ساتھ والی جمعیت جس کی کثرت کو جنود کی لفظ ظاہر کر رہی ہے یعنی ان کی حیثیت فوج نہیں بلکہ افواج کی تھی۔ روایتوں میں ان کی تعداد ستر اسی ہزار بتائی گئی ہے۔ اب ان کی ایک آزمائش ہو رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ پانی سامنے ہو اور لب تر نہ کیے جائیں جب کہ وَمَنۡ لَّمۡ يَطۡعَمۡهُ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ پانی کو چکھے بھی نہیں مگر اس کے بعد جو فقرہ ہے: اِلَّا مَنِ اغۡتَرَفَ غُرۡفَةً ۢ بِيَدِهٖ‌ۚ اس کے معنی سب مترجمین اور مفسرین نے یہ لئے ہیں کہ ایک چلّو پی لے تو کوئی حرج نہیں۔ مگر چوں کہ حدیث معصومؑ اس بارے میں کوئی نہیں ہے اس لئے ہمیں اس کے خلاف سوچنے کا حق ہے اور سمجھ میں یہ آتا ہے کہ اگر ایک آدھ چلّو کی اجازت دینا ہوتی تو یہ لفظ نہ کہا گیا ہوتا کہ جو چکھے بھی نہ وہ مجھ سے تعلق رکھتا ہے کیوں کہ ایک چلّو تو چکھنے سے بہت زیادہ ہوا پھر چکھنے کی نفی سے اس کے استثناء کا کیا مطلب؟

ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن میں چلّو ہاتھ میں لینے کا ذکر ہر پینے کا ذکر ہی نہیں۔ کیوں نہ سمجھا جائے کہ چلو ہاتھ میں لے کر پھینک دینا مراد ہے جس کی نظیر آخرین میں نہر فرات اور ابوالفضل العباسؑ بن علیؑ اور لب تر نہ کرنے اور چلو میں پانی پھینک دینے کی واقعیت کی شکل میں موجود ہے۔ چکھنے کی ممانعت کرتے ہوئے ایسے ہی عمل کی اجازت دی جا رہی ہے پینے کی بالکل نہیں نتیجہ یہ ہوا کہ سوا ایک اقلیت کے باقی سب نے عدول حکمی سے کام لیا۔ اس سے نتیجہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو ادائے فرض اتنی سختی برداشت نہ کر سکیں وہ تلوار کی آنچ کیا برداشت کریں گے! چنانچہ دشمن کے سامنے پہنچ کر بھی انہوں نے جی چھوڑ دیا اور نبی اور نبی نے پہلے ہی جو خطرہ ظاہر کیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب جہاد کا فرض عائد ہو جائے تو تم جہاد نہ کرو، وہ واقعیت کی شکل میں سامنے آگیا۔

ان تمام قرآنی الفاظ میں یہ انتباہ مضمر ہے کہ اکثریت سے کبھی مرعوب نہ ہونا اور اس کے رویہ کہ ہمیشہ حق ہی نہ سمجھنا۔ اکثر ایسا ہی ہوا ہے

---

[1]۔ فليس من تبعي واشياعي (صافی)

[2]۔ ومن لم يذقه من طعم الشئی اذا ذاقه (نیشاپوری)

[3]۔ جو بھرے ایک چلو اپنے ہاتھ سے (تاج العلما ۴)

[4]۔ يعني القليل (بغوی)

[5]۔ يعني الذين شربوا وخالفوا امر الله وكانوا اهل شك ونفاق (بغوی)

[6]۔ يظنون يوقنون (جلالین)

کہ حق اقلیت میں ہوا اور ایسی اقلیت میں جو نسبۃً بہت کم ہو اور اکثریت غلط راہ پر جا رہی ہو[1]۔

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٥٠﴾

"اور جب جالوت اور اس کے افواج کے سامنے باہر نکلے[2] تو کہا پروردگار! ہم پر صبر کی طاقت انڈیل دے[3] اور ہمارے قدموں کو جما دے اور کافر جماعت کے مقابلہ ہماری مدد فرما۔"

یہ اسی اقلیت کی آواز ہے[4] جو خدا کو منہ دکھانے کا تصور رکھتی تھی اور جس نے دوسرے لوگوں کو مایوسی سے منع کیا تھا۔

فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٢٥١﴾

"اب انہوں نے ان لوگوں کو اللہ کے حکم سے شکست دے دی اور داؤد نے جالوت کو مار ڈالا اور اللہ نے انہیں سلطنت اور حکمت عطا کی اور جس چیز کا چاہا علم دیا اور اگر اللہ بعض کا بعض کے ذریعہ سے دفعیہ نہ کراتا ہے تو زمین تباہ و برباد ہو جائے، لیکن اللہ تمام جہان والوں پر بڑا احسان والا ہے۔"

اجازت دفاع کا حکیمانہ پہلو:

آیت کے آخری حصہ میں مطلق عدم تشدد کے خلاف اسلام کے معتدل نقطہ نظر یعنی اجازت دفاع کے حکیمانہ پہلو پر تبصرہ ہے کہ اگر یہ دفاع کی صورت نہ ہوتی تو سرکشوں اور شرارت پسندوں کی ہمتیں بڑھتی جاتیں اور پھر عالم میں تباہی و بربادی پھیل جاتی مگر خدا نے ایسے طاقت وروں کی سرکوبی کے لئے قانونِ دفاع جاری فرمایا ہے جو اس کا خلق پر ایک بڑا احسان ہے۔

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٢٥٢﴾

---

[1]۔وان اهل الحق اعز من العنقآء واعوز من الكميآء (غرائب القرآن، نیشاپوری)

[2]۔آنگاہ کہ بمیدان آمدند (شاہ ولی اللہ)

[3]۔الافراغ اخلاء الاناء بما فيه وانما يخلو بصبّ كل ما فيه فيغيد المبالغة (نیشا پوری) لنڈھا دے ہم پر صبر (تاج العلماء) ہمیں پورا صبر دے (عماد الدین)

[4]۔ایں صالحان گفتند (شاہ ولی اللہ)

”یہ قدرت الٰہی کی نشانیاں ہیں جنہیں ہم آپ سے سچائی کے ساتھ بیان کرتے ہیں [1] اور بلاشبہ آپ پیغمبروں میں سے ہیں۔“

یعنی ان واقعات کی خبر آپ کو اللہ کی طرف سے اسی لئے دی جارہی ہے کہ آپ اس کے سچے رسول ہیں ضرورت ہے کہ آپ کے ذریعے سے خلق خدا تک یہ پیغام پہنچائے جائیں جو ان کے انتباہ کا ذریعہ ہوں اور ان واقعات کا آپ کی زبان سے بیان ہونا جب کہ آپ نے کبھی ان اطلاعات کو اکتسابی طور پر حاصل نہیں کیا خود آپ کے مرسل من اللہ ہونے کی دلیل ہے [2]۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۗ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝۲۵۳

”یہ پیغمبر ہے [3] ان میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضلیت دی [4] ان میں سے وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور ان میں کسی کو کئی درجے اونچا کیا اور دیئے ہم نے عیسیٰؑ فرزند مریمؑ کو کئی معجزے [5] اور انہیں روح القدس کے ساتھ [6] تقویت پہنچائی اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ جو ان کے بعد تھے اپنے پاس کھلی ہوئی نشانیاں آچکنے کے بعد آپس میں نہ لڑتے مگر ان میں آپس میں اختلاف ہو گیا تو ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ نے کفر اختیار کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔“

چوں کہ خالق کی طرف سے پاروں کی تقسیم نہیں تھی، بس سوروں کی تقسیم تھی۔ اس لئے اکثر ایک ہی مضمون دو پاروں میں بٹ گیا ہے کہ آدھا جز قبل کے پارے میں آیا اور آدھا بعد کے پارے میں جو پاروں کی تقسیم کرنے والے کے سلیقہ کا آئینہ بردار سے ہے چنانچہ اس پارے میں

---

[1]۔ نقصها (جلالین)

[2]۔ حیث تخبر بہا من غیر تعرّف واستماع (صافی)

[3]۔ تلك بمعنی اولٰئك (مجمع البیان)

[4]۔ تلك مبتدا الرّسل صفت والخبر فضلنا بعضهم علی بعض (جلالین)

[5]۔ معجزہا (شاہ ولی اللہ) ای الدلالات کابرآء الاکمه والابرض واحیاء الموتیٰ الخ (مجمع)

[6]۔ پاک روح سے (تاج العلماء)

بھی یہی صورت ہے کہ یہ پیغمبر جن کی طرف اشارہ ہے: تلك الرسل" یہ پیغمبر اس کے مشارٌ الیہ انبیاو مرسلین کا ذکر اس کے قبل والے پارے میں ہے ان کے متعلق جو مضمون ہے اس سے یہ پارہ شروع ہو رہا ہے [1]۔

پیغمبروں میں بعض کی بعض پر فضیلت:

پیغمبروں میں سے بعض کی بعض پر فضیلت کا پہلے مجمل طور پر اظہار کیا گیا ہے، یعنی یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سب پیغمبر ہم رتبہ ہیں اور یکساں حیثیت رکھتے ہیں بلکہ باوجود نفس نبوت یا رسالت میں اشتراک کے ان میں مختلف وجوہ سے کچھ کو امتیاز ہوتا ہے۔ اس کے ذیل میں بطور مثال کچھ خاص امتیازات کا تذکرہ کیا گیا ہے جس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امتیاز کے وجوہ انہی امور میں منحصر ہیں۔ چنانچہ ایک وہ امتیاز یہ بتائی گئی کہ ان میں سے بعض کو خالق نے شرف کلام سے سرفراز فرمایا۔

یوں تو اللہ کے کلام کی بہت سی صوتیں ہیں جن کا ذکر قرآن مجید (شوریٰ ۵۱) میں ہے کہ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ کسی آدمی کے لئے یہ بات حاصل نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے سوا اس کے کہ یا تو (بغیر توسط ملک) وحی (یعنی القاء) ہو یا پردہ کے پیچھے سے کلام ہو یا وہ ایک قاصد بھیجے جو اس کے حکم سے جو وہ چاہتا ہے اس وحی کو پہنچائے۔

اس میں پہلی قسم یعنی القاء کو بھی ایک نوع کلام قرار دینے سے اب کوئی پیغمبر ایسا نہیں سمجھا جا سکتا جس سے کسی نہ کسی طرح کلام نہ ہوتا ہو مگر نمایاں طور پر اللہ سے ہم کلامی کا امتیاز جناب موسیٰؑ کو عطا ہوا جس کی بناء پر ان کا لقب کلیم اللہ ہو گیا اور قرآن مجید میں ارشاد کیا گیا: و کلم اللہ موسیٰ تکلیما (یعنی) اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا اس طرح جو حق ہے کلام کرنے کا اس کی نوعیت خاص طور پر یہ تھی کہ منجانب اللہ آواز کر کے انہیں مخاطب بنایا تھا اور ہمارے رسولؐ سے معراج میں کلام کیا گیا، اس طرح کہ پردہ کے پیچھے سے آواز آئی اور آپ کو مخاطب کیا گیا [2]۔

ہمارے پیغمبر کی متعدد وجوہ سے دیگر انبیاء کے مقابلہ میں بلندی:

یہاں کلام سے یہی خصوصی صورت مراد ہے اس لئے اس کو کچھ خاص مرسلین کی خصوصی فضیلت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد پھر جو ارشاد کیا کہ "بعض کو کئی درجے اونچا کیا گیا۔" اس سے مراد ہمارے رسولؐ ہیں جن کو متعدد وجوہ سے گزشتہ انبیاء کے مقابلہ میں خصوصیت حاصل ہوئی۔ علامہ طبرسیؒ مجمع البیان میں لکھتے ہیں:

قال مجاهد اراد به محمداﷺ فانه تعالٰی فضله علی جمیع انبیائه بأن بعثه الی جمیع المکلفین من الجن والانس وبأن اعطاه جمیع الایات التی اعطاها من قبله من الانبیاء وبأن خصّه بالقران الّذی لم یعطه غیره و هو المعجزة القائمة الی یوم القیامة بخلاف سائر المعجزات فانها قد مضت و بأن جعله خاتم النبیین وحکمة تقتضی تاخیر اشرف الرّسل لاعظم الامور (مجمع البیان)

---

[1]۔ اشارۃ الی الجماعۃ المذکورۃ فی السورۃ (صافی)

[2]۔ کلّم اللہ من غیر سفیر کموسیٰ لیلۃ الحیرۃ فی الطور و محمّدﷺ فی المعراج (صافی)

مجاہد نے کہا ہے کہ اس سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مراد ہیں کہا اللہ سبحانہ نے آپ کو تمام انبیا پر فضیلت عطا کی اس حیثیت سے بھی کہ آپ کو انس وجن سب پر مبعوث کیا اور اس اعتبار سے بھی کہ آپ کو تمام وہ معجزے عطا کیے جو آپ کے قبل دوسرے انبیاء کو متفرق طور پر عطا ہوئے تھے اور پھر یہ کہ آپ کو قرآن کے ساتھ مخصوص کیا جس کے مثل کسی کو آپ کے پہلے معجزہ عطا نہیں ہوا تھا اور وہ ایسا معجزہ ہے جو روز قیامت تک قائم و برقرار ہے برخلاف دیگر معجزات کے جو وقت کے ساتھ گزر گئے اور یہ کہ آپ کو خاتم الانبیا قرار دیا اور حکمت متقاضی ہے کہ سب سے بڑی مہم کے لئے آخر میں وہی ذات بھیجی جائے جو شرف میں سب سے بالاتر ہو۔

اسی کو علامہ فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں اور پھر اس کی تلخیص کے طور پر نیشاپوری نے بھی غرائب القرآن میں زیادہ پھیلا کر بیان کیا ہے۔

خاص طور پر قابل غور آیت کا آخری جز ہے اس لئے کہ یہ اور اس سے ملتی جلتی چند اور آیتیں قرآن مجید کی ہیں جن کے معنی کے سمجھنے میں عقل اور معصوم رہنماؤں کا دامن چھوڑ دینے کی وجہ سے ایک طبقہ گمراہی میں مبتلا ہوا ہے اور ایسا سمجھا ہے کہ باہمی جنگ اللہ کی مشیت سے ہوئی ہے اور کچھ کا ایمان لانا اور کچھ کا کفر اختیار کرنا اسی کی مشیت کا نتیجہ ہے۔خصوصا جب کہ یہاں آخر میں یہ ہے کہ اللہ جو ارادہ اس کا ہوتا ہے وہ کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کے ارادہ کے خلاف کچھ ہو ہی نہیں سکتا تو پھر جب کہ ارادہ ہی یہ تھا کہ کچھ ایمان لائیں اور کچھ کافر ہوں تو اللہ کا ایمان بھی ضروری ولازم الوقوع تھا جس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا اور ان کا کفر بھی ضروری الحصول تھا جس کے خلاف ممکن نہیں [1]۔

توہم جبر کا دفعیہ:

مگر کیا واقعی قرآن مجید کا یہی مطلب ہے؟ کیا اسلام کی تعلیم یہی ہے؟ ہرگز نہیں اگر ایسا ہوتا تو پھر مومن کو اس کے ایمان کی جزاء اور کافر کو اس کے کفر کی سزا کیوں دی جاتی یا حشر ونشر کس لئے ہوتا اور روز حساب کی کیا ضرورت تھی؟

پھر قرآن یہ کیوں کہتا کہ: فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ ۚ

جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے۔ (کہف۔ ۲۹)

وہ کیوں کہتا کہ: مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ اَسَآءَ فَعَلَيۡهَا

جو نیک کام کرتا ہے وہ اپنے لئے کرتا ہے اور جو برا کام کرتا ہے اس سے نقصان اسی کو ہوتا ہے (جاثیہ۔ ۱۵)

جب کہ قرآن کی آیات میں اختلاف بیان ہونا بھی ناممکن ہے۔اختلاف کو تو قرآن نے غیر اللہ کی طرف سے ہونے کی نشانی بتائی ہے۔

وَلَوۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَيۡرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا

وہ اگر اللہ کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو یہ لوگ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔ (نساء۔ ۸۲)

مگر قرآن مجید تو حقیقتاً اللہ کا کلام ہے، پھر اس میں اختلاف کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سطحی نظر والے آیت قرآن کا مفہوم نہیں سمجھتے۔

---

[1]۔ فی الآیۃ دلالۃ علی صحۃ مسئلۃ خلق الاعمال ــــ وان الکل بقضاء اللہ وقدرہ لان الدواعی تستند لا محالۃ الیٰ داعیۃ یخلقھا اللہ عزوجل فی العبد (نیشاپوری)

یہ آیت اور اس کے مثل جو دوسری آیتیں ہیں جیسے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا

اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو روئے زمین پر جتنے ہیں سب کلیتہً ایمان لے آتے (یونس۔۹۹)

اس سب کا مطلب یہ ہے کہ خالق اگر اپنی جبری طاقت کو صرف کرتا تو کافر کا وجود نہ رہتا۔ اگر جبری طاقت صرف کرتا تو سب ایمان لے آتے۔ اگر جبر سے کام لیتا تو ان میں باہم اختلاف نہ ہوتا۔ اگر جبر کو صرف کرتا تو ان میں باہم جدال وقتال نہ ہوتا۔ مگر جبر کرنا تو اس کے نظام عدل کے خلاف ہے[1]۔

اگر نظام جبر کارفرما ہوتا تو ارسال رسل اور انزال کتب بے کار ہوتا اور پھر کارگاہ قیامت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے اس کا تو ارادہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اختیار سے کام لیں اور جب اپنے اختیار سے کام لیتے ہیں تو باختیار خود کوئی مومن ہوتا ہے اور کوئی کافر جو اللہ کے اس ارادہ کے بالکل مطابق ہے کہ ان پر جبر سے کام نہ لیا جائے اور یہ اپنے اختیار سے کام لے کر جدھر چاہیے جائیں تاکہ مستوجب ثواب یا مستحق عذاب ہوں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

”اے ایمان لانے والو جو کچھ ہم نے تم کو روزی دی ہے اس میں سے خیرات کرو اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ کوئی بکری ہوگی اور نہ دوستی اور نہ سعی سفارش اور کافر لوگ خود ہی ظلم کرنے والے ہیں۔“

اس دن سے مراد قیامت ہوسکتی ہے[2] اس دن ”کوئی بکری نہیں ہوگی“ یعنی دنیا میں خرید اور فروخت کے ذریعے سے انسان کچھ دولت کما لیتا ہے۔ وہاں کسی ایسی آسانی کی صورت نہیں ہوسکتی اور منفعت حاصل نہیں کی جاسکتی اور نہ یہ ممکن ہوگا کہ کوئی دولت صرف کر کے اپنے کو عذاب سے بچا لے، جسے دوسری جگہ قرآن میں یوں کہا گیا ہے کہ وہاں فدیہ کا کوئی امکان نہ ہوگا[3]۔

اور اس میں یہ پہلو بھی مضمر ہوسکتا ہے کہ اس دنیا میں جو کما کچا رہے ہو اسی میں سے خیرات کر کے ذخیرہ آخرت فراہم کر لو اگر موقع کو تم نے ہاتھ سے جانے دیا اور آخرت کی گھڑی سر پر آگئی تو اس دن کچھ کمانے کچانے کا امکان نہیں ہے۔

”اور نہ دوستی“ یعنی دوستیاں اس دن قطع ہوجائیں گی اور دنیا والے آپس کے دوست سب وہاں آپس میں دشمن ہوں گے جیسا کہ قرآن میں ہے۔

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ

---

[1]۔ لو شآء اللہ لم یقتتل الذین من بعد الانبیآء بان یلجئھم الی الایمان ویمنعھم من الکفر الا انہ لم یدعجئھم الی ذٰلک لان التکلیف لا یحسن مع الضرورۃ (مجمع البیان)

[2]۔ ای یوم القیامۃ (مجمع البیان)

[3]۔ لا بیع فیہ فیحضون ما تنفقونہ او تفتدون بہ من العذاب (صافی)

دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے (زخرف۔ ٦٧)

اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ دوستی اس دن کام نہ آئے گی اور اس لئے کہ ہر ایک کو خود اپنی پڑی ہوگی۔

دوسرے کے کام کون آئے گا [١]۔

اور اس دن سے مراد موت کا دن بھی ہوسکتا ہے کہ اسی وقت دنیاوی رشتے سب ختم ہوجاتے ہیں [٢]۔

سفارش کی نفی کے متعلق اس کے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا پر کسی کا دباؤ نہیں ہے جو کوئی سفارش کرے گا وہ بھی اس کی اجازت سے کرے گا جیسا کہ آیۃ الکرسی میں جو اس کے بعد ارشاد ہوا ہے:

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ

کون ہے جو اس کے یہاں سفارش کرے مگر اس کی اجازت سے۔

اس آیت کو سامنے رکھنے کے بعد یہاں جو سفارش کی نفی ہو رہی ہے تو اس سے وہی سفارش مراد ہوسکتی ہے جو بغیر اس کی اجازت کے ہو [٣]۔

اب اس تہدید کے ساتھ جو خیرات کا حکم ہوا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ جناب تاج العلما تحریر فرماتے ہیں:

"حکم یا خاص زکوۃ کا ہے اخیر میں وعید اور تہدید کے ذکر کی دلیل سے یا عام خیرات کا ہے۔" (حواشی ترجمہ قرآن)

بعید نہیں ہے کہ عام لیا جائے اور جب عمومی خیرات کا کلیۃ ترک ہوگا تو اس ترک کے دائرہ میں وہ حقوق الناس بھی آ جائیں گے جن کا ادا کرنا ضروری ہے اور اس طرح وعید اور تہدید کی زد میں آنا ظاہر ہے۔ آخر میں جو کہا گیا ہے کہ "کافر لوگ ہی تو ظالم ہیں۔" اس سے بعض نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس سے مراد وہی ہیں جو اصطلاحی طور پر کافر ہیں یعنی غیر مسلم اور اسی بناء پر ایک صاحب اس آیت کو پڑھ کر بڑے خوش ہو کر فرمانے لگے کہ شکر خدا کا کہ اس نے یہ کہا کہ کافر لوگ ہی ظالم نہیں یہ نہیں فرمایا کہ الظالمون ھم الکافرون جس کے یہ معنی ہوتے کہ ظالم لوگ ہی کافر ہیں [٤]۔

اس میں یہ تلخ احساس مضمر تھا کہ اپنی جماعت میں جو مسلمانوں کی ہے ظالم بہت سے ہیں۔ اگر کہیں آیت یوں ہوتی کہ ظالم ہی کافر ہیں تو یہ سب لوگ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ آیت کے آغاز میں ایمان لانے والوں کو مخاطب کر کے یہ حکم دینا کہ خیرات کر و اس دن سے پہلے جب نہ کوئی تجارت ہو سکے گی اور نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سعی سفارش۔ پھر مسلمانوں کو چھوڑ کر کسی دوسری جماعت کو کہنا کہ کافر لوگ ظالم ہیں مضمون آیت کو دولخت بنا دیا ہے جس میں دنیا کا اول سے کوئی ارتباط باقی نہیں رہتا اس لئے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جیسے حج کا حکم دیتے ہوئے جو ارشاد کیا:۔

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا ۔

---

[١]۔ وقیل لان شغلہ بنفسہ یمنعہ من صداقۃ غیرہ (مجمع البیان)

[٢]۔ یحتمل ان یکون المراد بہ یوم الموت ــــ وھو اظھر (صافی)

[٣]۔ ولا شفاعۃ بغیر اذنہ (جلالین)

[٤]۔ نقل عن عطاء بن یسار (نیشاپوری)

اللہ کے لئے لوگوں پر خانہ کعبہ کا حج ہے اس پر جو اس کی استطاعت رکھتا ہے۔ (آل عمران۔۹۷)

اور پھر کہا:

وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ اور جو کفر کرے تو اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ اس سے علماء یہی معنی سمجھتے ہیں کہ خود ترک حج کو خالق نے یہاں کفر سے تعبیر کیا ہے اسی طرح خیرات دینے کے حکم کے بعد یہ کہنا کہ ''کافر لوگ ہی تو ظالم ہیں'' اس مفہوم کا حامل ہے کہ یہ خیرات نہ دینا ہی ایک طرح کا ''کافر'' ہونا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسے ''کفر'' سے مشتق نہ لیا جائے ''کفران'' سے مشتق لیا جائے جس کے معنی ناشکرے پن کے ہیں اور اس میں کیا شبہ کہ واجب خیرات سے گریز کرنا اللہ کی نعمت کا عملی کفران ہے اور اس سے انسان بلاشبہ بمقابلہ ''شاکرین'' کافرین میں داخل ہوتا ہے۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡحَىُّ الۡقَيُّوۡمُ ۚ لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوۡمٌ ؕ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ۚ وَلَا يُحِيۡطُوۡنَ بِشَىۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرۡسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ وَلَا يَـُٔوۡدُهٗ حِفۡظُهُمَا ۚ وَهُوَ الۡعَلِىُّ الۡعَظِيۡمُ ﴿۲۵۵﴾

''اللہ! نہیں کوئی خدا سوا اُس کے جو زندہ ہے، بندوبست کرنے والا، اس پر نہ غنودگی غالب ہوتی ہے اور نہ نیند۔ اس کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے وہ جو بغیر اس کی اجازت کے اس کے یہاں سفارش کرے؟ وہ جانتا ہے اسے جو اُن کے سامنے ہے اور جو اُن کے پیچھے ہے اور وہ اُس کے علم میں سے ذرا بھر بھی حاوی نہیں ہیں مگر وہ جتنا چاہے۔ اسی کی کرسی آسمان اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے ان دونوں کی حفاظت اسے گراں نہیں گزرتی [۱] اور وہ اونچا ہے بہت بڑا [۲]۔

آیۃ الکرسی:

یہ پوری ایک آیت ہے جو ''آیۃ الکرسی'' کے نام سے مشہور و معروف ہے [۳] اور اس کی بڑی فضیلت ہے [۴] اور خاص خاص محل پر اس

---

[۱]۔ لا ثقیلہ (صافی)

[۲]۔ بلند مرتبہ و بزرگ ہے (تاج العلماء) ۵۔ الحی العلیم القدیر (صافی)

[۳]۔ اٰیۃ واحدۃ عندھم غیر عدّا البصری الحیّ القیّوم اٰیۃ (مجمع البیان)

[۴]۔ فی الخصال عن النبیّ ﷺ ان اعظم آیۃ فی القراٰن اٰیۃ الکرسی (صافی) وعن ابی عبداللہ علیہ السلام قال ان لکل شئی ذروۃ وذروۃ القراٰن اٰیۃ الکرسی (مجمع)

کے پڑھنے کا ثواب وارد ہوا ہے۔

حی و قیوم کے معنی:

خدا کو جو ”زندہ“ کہا گیا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ وہاں جسم و جان ہے بلکہ حیات کا جو تقاضائے ہے علم و ارادہ وہ اس کی ذات کے لئے ثابت ہے اس لئے اسے حی کہا جاتا ہے[1]۔ القیوم کے معنی میں اختلاف ہے۔ ایک احتمال یہ ہے کہ وہ قائم ہی کی لفظ میں مبالغہ ہے تو یہ معنی ہوئے کہ وہ زندہ ہے برقرار رہنے والا[2] اور دوسرے یہ کہ وہ کائنات کے نظام کو برقرار رکھنے والا ہے[3] بعض مفسرین نے دونوں باتوں کو جمع کر دیا ہے[4]۔

اس پر غنودگی اور نیند طاری ہونے کی نفی کسی غلط مزعومہ کی رد ہی کے لئے ہوسکتی ہے چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ یہود کا یہ تصور تھا کہ خالق آسمان و زمین کے پیدا کرنے کے بعد تھکن کی وجہ سے کرسی پر ایک خاص انداز میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آرام کرنے لگا۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ غالباً اسی مزعومہ کو پیش نظر رکھ کر تھکن کی نفی کی گئی ہے۔

وَمَا مَسَّنَا مِنۡ لُّغُوۡبٍ ۔اور ہمیں تھکن کچھ بھی نہیں ہوئی (ذاریات۔۳۸)

غنودگی کے بعد نیند کی نفی کا مطلب:

غنودگی نیند کا ادنیٰ درجہ ہے اور نوم پورے طور پر سو جانا۔ یہاں غنودگی کے بعد مقام نفی میں جو نیند کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس بناء پر ہے کہ یہ تو قوت ارادی کی کسی شخص میں بہت کمی ہے کہ وہ جاگنے میں بھی غنودگی میں مبتلا ہو کر کام سے غافل ہو جایا کرے مگر نیند وہ چیز ہے جو تقریباً ہر ایک ہی کو کسی نہ کسی وقت کام سے بے خبر بنا دیتی ہے۔ خالق کے لئے اونگھنا نہیں ہے اور اس سے بالاتر یہ ہے کہ وہ کبھی سوتا بھی نہیں، نیند بھی اس کے لئے نہیں ہے جو انتظام خلق سے غافل بنا دے۔

شفاعت کی نفی میں یہاں صرف ”اِلَّا بِاِذۡنِهٖ“ کا استثناء موجود ہے۔ پھر معلوم نہیں مسلمانوں میں سے بعض لوگ مطلق شفاعت کا انکار کس لئے کرتے ہیں؟

ثبوت شفاعت علم غیب بمشیت الٰہی:

اسی طرح خالق کے علم پر بشر کے حاوی نہ ہونے کے بیان میں ”اِلَّا بِمَا شَآءَ“ کا استثناء موجود ہے[5] جس کے بعد انبیاء اور اولیاء

---

[1]۔ وہ زندہ ہے ہمیشہ رہنے والا (شاہ رفیع الدین)

[2]۔ سدا برقرار ہے گا (تاج العلماء)

[3]۔ زندہ و تدبر کنندۂ عالم (شاہ ولی اللہ) لمبالغ فی القیام بتدبیر خلقه (جلالین)

[4]۔ الدائم القائم بتدبیر الخلق وحفظة من قام به اذا حفظه (صافی) النظر لجمیع هذه الوجوه محتمل (مجمع البیان)

[5]۔ یعنی ماشاء ان یعلمهم ویطلعهم علیه (مجمع البیان)

سے علم غیب کی مطلق نفی کا کوئی ثبوت باقی نہیں رہتا۔

جن ہستیوں کو ہم شفیع مانتے ہیں وہ وہی ہوں گے جو اللہ کے اِذن سے شفاعت فرمائیں اور انبیاء اور آئمہؑ نے علم غیب کی جو خبریں دی وہ وہی ہیں جن کا اللہ نے اپنی مشیت سے انہیں علم عطا فرمایا تھا۔

''وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔'' اس سے پیش پس باعتبار مکان بھی مراد ہوسکتا ہے۔ چوں کہ خود انہیں عموماً اپنے پیچھے کی چیز کا علم نہیں ہوا کرتا مگر اللہ کو اس سب کا علم ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پیش و پس سے مراد ماضی اور مستقبل ہو [۱]۔

کرسی کے معنی میں اختلاف ہے۔ کئی حدیثوں میں اس کے معنی علم کے قرار دیے گئے ہیں [۲] نیز عالم اعلیٰ میں سب سے بلند مرکز عرش سے موسوم ہے اور اس کے نیچے جو ہے اسے کرسی کہا جاتا ہے [۳] مگر واقعہ یہ ہے کہ پوری حقیقت سے نہ عرش ہی کی ہم واقف ہو سکتے ہیں اور نہ کرسی ہی کو ہم پورے طور پر سمجھ یا سمجھا سکتے ہیں۔ بہرحال اصل مقصود یہاں اللہ کے احاطہ علمی کا بیان ہے جسے معصومین علیہم السلام نے بتایا ہے [۴]۔

لَآ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَىِّ ۚ فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَيُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۵۶﴾

''دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے الگ ہو کر نمایاں ہو چکی ہے۔ اس کے بعد جو باطل کی طاقت [۵] کے ماننے سے انکار کرتے [۶] اور اللہ پر ایمان لائے اس نے مضبوط رسی [۷] تھام لی جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں [۸] اور اللہ سننے والا ہے خوب جاننے والا''۔

---

[۱]۔ ما مضی و ما ھو آت (البلاغی)

[۲]۔ علمہ کذا فی التوحید عن الصادق علیہ السلام (صافی) وھو المروی عن ابی جعفر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و ابی عبداللہ علیہ السلام (مجمع)

[۳]۔ سریر دون العرش وقد مروی عن ابی عبداللہ علیہ السلام (مجمع البیان)

[۴]۔ شاء ان یتبین احاطۃ علمہ و اسطۃ تدبیرہ بجمیع ما ھو لہ وملکہ فناسب التقریب لا را کنا القاصر بالتمثیل بالجسمانیات المألوفۃ لنا (البلاغی) وقیال لمقصود من کلام تصویر عظمۃ اللہ و کبریائہ ولا کرسی ثم ولا قعود ولا قاعدوا ختارہ جمع من المحققین کالقفال والزمخشری (نیشاپوری)

[۵]۔ الشیطان کما فی المجمع عن الصادق علیہ السلام اقول ویتم کل عبد من دون اللہ (صافی)

[۶]۔ کفر و انکار کیا سرکش کا (تاج العلماء)

[۷]۔ اس کا ہاتھ ایسے مضبوط بندھن پر پڑا (تاج)

[۸]۔ جس میں ٹوٹ جانے کی کبھی گنجائش ہی نہیں (تاج)

دین میں جبر نہیں:

روایات شان نزول میں اگر چہ مختلف ہیں کوئی کہتا ہے کہ کچھ انصار مسلمان ہو گئے تھے اور ان کی اولاد میں بعض مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ وہ ان پر جبر سے کام لے کر زبردستی مسلمان بنانا چاہتے تھے (جلالین) کوئی یہ کہ کسی انصاری کا حبشی غلام تھا جسے وہ اسلام پر مجبور کرنا چاہتا تھا (مجمع البیان) اور دوسری روایتیں بھی ہیں مگر سب کا مشترک نتیجہ یہ ہے کہ قرآن نے زبردستی مسلمان بنانے سے روکا ہے اس سے ان مخالفین اسلام کی زبان بندی ہو جانا چاہیے جو کہتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلایا گیا۔

حقیقت میں دین کا تعلق انسان کے دل و دماغ سے ہے۔ وہ چیزیں ہی کب ہوگی جو تلوار کے دباؤ سے اختیار کی گئی ہو۔ جب کہ قرآن نے صاف اعلان کر دیا اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فہمائش کر دی کہ دین کے معاملہ میں جبر سے کام نہ لو تو اس کے بعد اگر کبھی مسلمانوں نے ایسا کیا بھی ہو تو اس کی ذمہ داری اسلام پر عائد نہیں ہو سکتی۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ يُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ؕ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَوۡلِيٰٓــُٔهُمُ الطَّاغُوۡتُ ۙ يُخۡرِجُوۡنَهُمۡ مِّنَ النُّوۡرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓٮِٕكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝٢٥٧

”اللہ سرپرست ہے[1] ان کا جو ایمان لائے وہ انہیں اندھیرے سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کی سرپرست باطل کی طاقتیں ہیں[2] کہ وہ انہیں روشنی سے اندھیروں کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ ہیں آگ میں جانے والے، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔“

مفہوم و حالات:

وَلِيٌّ کا لفظ جس کا ترجمہ ہم نے ”سرپرست“ کر دیا ہے حقیقتاً اتنا جامع لفظ ہے جس کا پورا مفہوم اردو کے کسی لفظ سے ادا ہونا مشکل ہے۔

علامہ طبرسی رحمہ اللہ نے اس لفظ کی تحقیق بڑی بالغ نظری سے کی ہے جس کا آغاز اس طرح ہے:

الولیُّ مِن الولی وھو القرب من غیر فصل وھو الذی یکون اولیٰ من غیرہ واحق بتدبیرہ

وَلِيٌّ کا لفظ وَلاء سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں ایسی نزدیکی جس میں کوئی فاصلہ نہ ہو اور ولی وہ ہے جو اپنے غیر کے ساتھ اولی ہو اور اس کے انتظام کا زیادہ حقدار ہو۔

اس کے بعد انہوں نے ان تمام الفاظ کو جو ان حروف (و ل ی) سے مشتق ہیں پیش کر کے اس خصوصیت کا ثبوت دیا ہے جن میں سے بعض الفاظ ہماری اردو زبان میں بھی موجود ہیں جن کے خصوصیات پر ہر ایک غور کر سکتا ہے مثلاً ولی بمعنی حاکم۔ ولی جو نابالغ کے معاملات میں

---

[1]۔ متولی امورھم (صافی)

[2]۔ الطواغیت (صافی) واحداً یرید الجمع (مجمع البیان)

صاحب اختیار ہوتا ہے متولی جو اوقاف کے انصرام و انتظام کا ذمہ دار ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اللہ اہل ایمان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور طاغوت کافروں کی روشنی سے اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ نکالنا اور لے جانا دونوں کو مجبور کرنے کے معنی میں نہیں ہے، ورنہ ان مومنین کو جزا اور ان کافروں کو سزا کا استحقاق نہ ہوتا بلکہ محرکات مہیا کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد بھی اچھے یا بُرے راستے پر جانے کی ذمہ داری جانے والے ہی پر رہتی ہے۔ ایک اور بات قابل توجہ یہ ہے کہ مومنین کے لئے جو کہا گیا ہے کہ اللہ انہیں ظلمتوں سے نور کی طرف نکالتا ہے اور کافروں کے لئے یہ کہ ''طاغوت'' انہیں نور سے ظلمتوں کی طرف لے جاتے ہیں، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ مومنین لازماً پہلے ظلمتوں میں تھے اور کفار لازماً پہلے نور کے اندر تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے انہیں ظلمتوں میں گرفتار ہونے سے بچایا اور طاغوت نے انہیں نور حاصل نہ کرنے دیا۔ علامہ طبرسیؒ نے اس کی مثال محاورہ عرب سے یہ دی ہے کہ کہا جاتا ہے: اخرجه والده عن میراثه ''اسے اس کے باپ نے اپنی میراث سے نکال دیا'' یعنی محروم کر دیا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ میراث ملنے نہ دی اور قرآن سے مثال یہ ہے جو حضرت یوسفؑ کی زبانی ہے:

اِنِّیۡ تَرَکۡتُ مِلَّۃَ قَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ.

میں نے چھوڑ دی ملّت اس قوم کی جو ایمان نہیں رکھتی۔

اس کا مطلب نہیں کہ (معاذ اللہ) وہ اس ملّت پر تھے بس اسی طرح یہاں کہا گیا ہے۔

علامہ نیشاپوری نے اس پر کچھ زیادہ روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں:

والاخراج یشمل الکافر اذا من المومن الاصلی ولا یبعد ان یقال یخرجهم الی النور من الظلمات وان لم یکونوا فی الظلمة المیتة فان العبد لو خلا من توفیق الله تعالی لحظة لوقع فی ظلمات الجهالات والضلالات فصار توفیقه تعالیٰ سببا لدفع تلك الظلمات عنه و بین الدفع والرفع تشابه ومثله قوله و کنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم عنها و معلوم انهم ما کانوا فی النار و یروی انه سمع انسانا قال اشهدان لا اله الا الله فقال علی الفطرة فلما قال اشهدان محمدا رسول لله قال خرج من النار ومن المعلوم انه ما کان فیها (غرائب القرآن)

نکالنے کے لفظ میں داخل ہے کافر بھی جو بعد میں ایمان لے آئے اور اصلی مومن بھی اور یہ کہنا کہ انہیں ظلمتوں سے نور کی طرف نکالتا ہے کوئی بعید نہیں ہے چاہے وہ ظلمت میں اس کے پہلے قطعاً نہ ہوں اس لئے کہ بندہ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی توفیق ربانی سے محروم ہو جائے تو وہ جہالتوں اور گمراہیوں کی تاریکی میں پڑ جائے گا تو توفیق الٰہی بس وہ ہوتی ہے جو ان ظلمتوں کے دفعیہ کا سبب ہوتی ہے اور دفع (آتی ہوئی چیز کو روک دینا) اور رفع (آئی ہوئی چیز کو ہٹا دینا) دونوں ایک طرح ہی کی باتیں ہیں اور اس کی مثال قرآن سے یہ ہے کہ ''ارشاد ہوا ہے تم آتش دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تم کو اس سے چھٹکارا دیدیا''۔ اور ظاہر ہے کہ وہ اس آگ کے اندر تھے نہیں اور روایت میں ہے کہ پیغمبر خداؐ نے ایک آدمی کو سنا کر وہ کہتا ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی خدا نہیں سوا اللہ کے۔ فرمایا یہ فطرت کے تقاضے پر قائم ہے، پھر جب اس نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمدؐ اللہ کے پیغمبر ہیں، فرمایا بس یہ آگ سے نکل آیا اور یہ ظاہر ہے کہ وہ آگ کے اندر نہیں تھا۔

اب ان نظیروں سے آیہ تطہیر میں بھی جو کہا گیا ہے: لیذهب عنکم الرجس، اس کی نوعیت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ یعنی

اس سے یہ نتیجہ نکلتا کہ ان اہل بیتؑ میں (معاذ اللہ) کوئی نجاست پہلے موجود تھی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے نجاست کا گزر ان تک ہونے ہی نہ دیا اور وہ بدفطرت سے پاک وہ پاکیزہ رہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

”کیا نہیں دیکھا تم نے اسے جس نے ابراہیم سے ان کے پروردگار کے بارے میں تکرار کی اس بناء پر[۱] کہ اللہ نے اسے سلطنت دے رکھتی تھی جب کہا ابراہیم نے کہ میرا پروردگار وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے اس نے کہا میں جلاتا اور مارتا ہوں تو کہا ابراہیم نے کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال دے اس پر وہ کافر مبہوت ہو گیا[۲] اور اللہ ظالموں کو منزل مقصد تک نہیں پہنچایا کرتا۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو نمرود سے:

یہ نمرود وہ تھا جو اپنے اقتدار ملکی کے گھمنڈ میں اپنی خدائی کا علم بلند کیے ہوئے تھا اور جناب ابراہیمؑ سے بحث کرنے چلا تھا[۳] اور در حقیقت حضرت ابراہیمؑ کا پہلا ہی استدلال لاجواب تھا مگر اس نے حقیقت کو مجاز پر ڈھال کر حیا و موت کو اپنے ہاتھ کا کام اس طرح بتایا کہ ایک سزائے موت سنائے ہوئے مجرم کی جان بخشی کر دی۔ یہ گویا مردے کو جلا دیا اور ایک بے قصور کی جان لے لی۔ اس طرح زندہ کو مار دیا۔ ہوسکتا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی پہلی ہی دلیل پر زور دیتے کہ جلانا اور مارنا یہ نہیں ہے مگر یہ ایک دور کا راستہ ہوتا۔ اس لئے انہوں نے دوسری دلیل پیش کی جس میں اس طرح کی دھاندلی بھی نہ چل سکے[۴] جناب شیخ جواد بلاغیؒ فرماتے ہیں کہ اسے علی بن ابراہیمؒ نے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے مگر کسی معصومؑ سے منقول نہیں اور درمنثور میں اس کی نسبت جناب ابن عباس کی طرف رہی ہے مگر جہاں تک قرآن مجید کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ نمرود اللہ کا قائل ہوتے ہوئے اپنے کو اس کا شریک قرار نہیں دیتا تھا تاکہ وہ کہتا کہ میں بھی اسی صورت سے جلاتا اور مارتا ہوں اور اس طرح وہ اس مجاز سے کام

---

[۱]۔ لان اٰتاہُ اللہ الملک (جلالین) ابطرہ ایتاؤہ الملک وحملہ علی المحاجۃ (صافی) اس برتے پر کہ خدا نے اسے دنیا کا راج دیا تھا (تاج العلماء)

[۲]۔ بھوچکا ہو گیا وہ جو کافر تھا (شاہ رفیع الدین) وہ کافر ہکا بکا رہ گیا (فرمان علی صاحب) بالکل بھوچک ہو گیا (تاج العلماء)

[۳]۔ ھو نمرود بن کنعان وھو اوّل من تجبر وادعی الربوبیۃ (مجمع البیان)

[۴]۔ فنقلا الی حجۃ اوضح منھا (جلالین) دفعا للمشاغبۃ وھو فی الحقیقۃ عدول عن مثال خفیّ الی مثال جلی ـــــ لا عن حضۃ الی اخریٰ (صافی)

لیتا بلکہ وہ تو منکر خدا ہوتے ہوئے خود اپنے کو خدا کہتا تھا۔ لہٰذا اس کے کہنے کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہی زندگی اور موت جسے تم فعل الٰہی بتاتے ہو اس کا نہیں میرا ہی کام ہے۔ یہ اس کا ایک بلا وجہ کا بے بنیاد دعویٰ تھا مگر ایسا جس کے بطلان کا کوئی ثبوت عالم مشاہدہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا جناب ابراہیمؑ نے اس سے اس پر بحث بے کار سمجھتے ہوئے ایک ایسا مطالبہ کر لیا جس پر وہ کچھ دھاندلی سے کام لے ہی نہیں سکتا تھا اور اسی لئے اسے لاجواب ہونا پڑا[1]۔

آخری فقرہ میں جو ظالمین کی ہدایت کی نفی کی گئی ہے یہ وہ ہدایت بامعنی رہنمائی نہیں ہے جس کے ذریعہ سے اتمام حجت ہونا بلکہ یہ خصوصی رہنمائی ہے جو منزل تک پہنچانے کی ضامن ہے جس کے لئے خود انسان کا ذوق طلب اور اسکی جد وجہد درکار ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

جو ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستوں پر لگا دیتے ہیں (عنکبوت۔ ۶۹)

اس ہدایت خاص سے ظالمین اپنے ظلم وستم کی بدولت محروم رہتے ہیں اور وہ ظالم وستم یہی کیا کم ہے کہ داعی حق کی بات کو سنجیدگی کے ساتھ سنیں نہیں، مذاق اڑا دیں یا غلط قسم کی دھاندلیوں سے کام لیتے ہوئے اس کے تسلیم کرنے سے گریز کریں[2]۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ
مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا
اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ
يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ
نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

”یا جیسے وہ آدمی[3] جو گزرا ایک گاؤں کی طرف سے جس کے دیوار و در کا ملبہ گری ہوئی چھتوں پر آ چکا تھا[4] کہا

---

[1]۔ قوله انا احي وا ميت مصادرة جزافية يريد بها الأحياء والموف الذين قالها ابراهيم فاراد ابراهيم ان سيد بآب المصادران بالدّعاوى السحيفة (آلاء الرحمٰن)

[2]۔ لا يهدى اى لا يوفق ولا يوصل بلطفه (البلاغی)

[3]۔ اى هل رايت كالذى (مجمع البیان)

[4]۔ ڈھا گیا تھا اپنی چھتوں پر (تاج العلماء) ساقطة حيطا نها على سقوفها (صافی) كان حيطا نها كانت قائمة وقد تهدّمت سقوفها ثم تقعّرت الحيطان من قواعدها فتساقطت على السّقوف المتهد (نیشا پوری)

کیوں کر زندہ کرے گا[1] اسے اللہ اس موت کے بعد۔ تو سے اللہ نے سو برس تک کے لئے مردہ کر دیا پھر اسے اٹھایا کہا: کتنے عرصے تک تم اس طرح رہے؟ کہا: رہا میں اس طرح ایک دن یا دن کے کچھ حصہ میں۔ کہا بلکہ تم سو برس پڑے رہے ہو تو اب دیکھو اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو کہ وہ خراب نہیں ہوئی ہیں اور پھر اپنے گدھے کو دیکھو [2] اور یہ اس لئے [3] کہ تمہیں ہم نشانی قرار دیں لوگوں کے لئے اور تم دیکھو ہڈیوں کو کہ کس طرح ہم انہیں کھڑا کرتے ہیں [4]) پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ جب اس پر یہ ثابت ہو گیا تو کہا میں یقینی طور پر جانتا ہوں کہ اللہ ہر بات پر قادر ہے۔''

عزیر یا ارمیا کا واقعہ:

اس آدمی کے نام میں اختلاف ہے کہ یہ عزیز نبی تھے یا ارمیا نبی اور چوں کہ روایتیں دونوں طرح کی وارد ہیں اس لئے ان میں جمع کی یہ صورت پیدا کی گئی ہے کہ شاید اس طرح کہ واقعہ دو مرتبہ ہوا ہو[5] ۔

اس آیت کا تعلق سابقہ آیت سے علامہ بلاغی نے اس طرح قرار دیا ہے کہ پہلے ایسے شخص کا تذکرہ تھا جس نے اللہ سے سرکشی کی اور بطور عناد یہ باتیں کیں اور دوسرے اس کا ذکر ہے جس نے غلط فہمی اور غفلت نے ایک بے محل جملہ کہہ دیا۔ امت محمدی کو تنبیہ کیا جا رہا ہے کہ تم نہ ویسے ہونا اور نہ ایسے[6] ۔

مذکورہ بالا دونوں قولوں کی تائید میں احادیث موجود ہیں لیکن ان کے بالمقابل صاحب کشاف نے بلاوجہ یہ رائے اختیار کر لی ہے کہ یہ شخص جس کا قصہ بیان ہوا ہے کوئی کافر تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ قول خلاف نصوص ہونے کی بناء پر نا قابل قبول ہے[7] ۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىٕنَّ قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ

---

[1] ۔ کیف یحیی او متی یحیی (صافی)

[2] ۔ کیف تفرقت عظامہ و نخرت و تفتتت (صافی)

[3] ۔ ای و فعلنا ذالک لنجعلک اٰیۃ (صافی)

[4] ۔ نرفع بعضھا علی بعض للترکیب (صافی)

[5] ۔ ھو ارمیا النبی و قیل عزیر النبی و یمکن التوفیق بالقول بو قوع ھٰذہ القضیۃ مرتین (صافی)

[6] ۔ فان من الناس من یکون فی عنادہ و ضلالہ و مکابرتہ للحق الواضح کھٰذا او یکون فی غفلۃ عمّا یعتقدہ فی ایمانہ (آلاء الرحمٰن)

[7] ۔ لا مساغ لصاحب الکشاف فی اختیارہ ان صاحب الفقتہ کافر (البلاغیؒ)

حَكِيۡمٌ ﴿۲۶۰﴾

"اور جب کہا ابراہیمؑ نے اے پروردگار مجھے دکھلا کہ کیوں کر تو مردوں کو زندہ کرتا ہے؟ اس نے کہا کیا تمہیں ایمان نہیں ہے۔ کہا کیوں نہیں مگر اس لئے کہ میرے دل کو قرار آئے، کہا تو لے لو چار پرندے اور انہیں اکٹھا کر لو اپنے پاس پھر رکھ دو ہر پہاڑ پر اس کا ایک ٹکڑا۔ پھر پکارو انہیں تو وہ آئیں گے تمہاری طرف دوڑتے ہوئے اور جانے رہو کہ اللہ زبردست ہے حکمت والا۔"

حضرت ابراہیمؑ کی خالق سے التجا اور اس کا نتیجہ:

جناب ابراہیمؑ نے بارگاہ الٰہی میں قدرت کی ایک نشانی دیکھنے کی تمنا کی تھی۔ خود الفاظ حضرت ابراہیمؑ بتاتے ہیں اصل حقیقت کے وقوع میں کوئی شک نہیں ہے۔ صرف کیفیت کا مشاہدہ اپنی آنکھ سے مطلوب ہے [۱] خالق نے اس حقیقت کو سوال و جواب سے نمایاں کر دیا [۲]۔

یہ دل کا قرار پکڑنا سے جناب ابراہیمؑ نے کہ "لیطمئن قلبی" اشتیاق کی بے چینی دور ہونا ہے نہ کہ شک و شبہ کا دفع ہونا جو استحکام ایمانی کے منافی ہو۔ اس کے علاوہ "بلیٰ" "کیوں نہیں" کی لفظ کے ساتھ لیطمئن قلبی "تاکہ میرے دل میں سکون و طمانیت پیدا ہو صاف ظاہر کرتا ہے کہ اطمینان و یقین کا وہ مرتبہ جو ایمان کے لئے ضروری ہے حاصل تھا۔ مگر یقین و اطمینان کے بھی مراتب ہیں اور یقین میں اضافہ کی خواہش شان نبوت و رسالت کے ہرگز منافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب امام رضاؑ سے کسی نے پوچھا:

اکان فی قلبہ شك کیا ان کے دل میں کچھ شک تھا

تو حضرتؑ نے فرمایا:

لا کان علی یقین ولکنہ اراد من اللہ الزیادۃ فی یقینہ نہیں وہ یقین کے مرتبہ پر فائز تھے لیکن انہوں نے اللہ کی جانب سے اپنے یقین میں زیادتی کی خواہش کی تھی" (صافی)

یہ زیادتی کسی بھی رسولؑ کی شان کے خلاف نہیں ہے یہاں تک کہ خاتم النبین و افضل المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کی زبانی قرآن مجید میں ہے:

رب زدنی علما: پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما

جناب تاج العلماء لکھتے ہیں: "مطمئن ہو جائے میرا دل کہ تو نے مجھے اپنا دوست بنایا یا نہیں۔"

اس کے بعد سوال خلیلؑ کے پورا کرنے کے سلسلہ میں جو ارشاد ہوا چار پرندے لے کر انہیں اپنے پاس اکٹھا کر لو اس میں یہ مفہوم مضمر ہے کہ انہیں ذبح کر کے ان کے گوشت و استخوان اور پر و بال سب کو خلط ملط کر دو تاکہ پھر جب وہ زندہ ہو کر آئیں تو احیائے موتی کی صورت میں خالق کی صنعت آفرینی کا مشاہدہ ہو۔

دوسرا مفہوم اس کا یہ قرار دیا گیا ہے انہیں قریب سے خود دیکھ بھال کے پہچان رکھو (تاج العلماء) پھر یہ کہ یہ سوال مشاہدہ کس بناء پر تھا

---

[۱]۔ انہ احب ان یعلم ذلك علم عیان بعد ان کان عالما من جھۃ الاستدلال والبرھان وھذا اقوی الوجوہ (مجمع البیان)

[۲]۔ سالہ مع علمہ بایمانہ بذالك لیجیبہ بما سالہ فیعلم السامعون غرضہ (جلالین)

؟اس کے متعلق جناب تاج العلماء لکھتے ہیں:

مطلب استفہام تھا نہ انکار کہ جو خلاف ایمان تھا اور نہ جانچ کا حاصل کرنا کہ جو موجب تشخیص تھا کہ سب خلاف عصمت ہے بلکہ ضرور حضرت ابراہیمؑ مقرر تھے اس کے اور اسے باور بھی کر چکے تھے اجمالی تصور پر مگر انہوں نے چاہا کہ تفصیل وار اسے بہ چشم خود دیکھ کر تفصیلی علم اس کا حاصل کر لیں اور ایسا تفصیلی علم شرعاً از بسکہ کچھ ضرور نہ تھا اور علم اجمالی اذعان کے لئے کافی تھا تو از خود خدا نے انہیں یہ علم نہ دیا تھا یہاں تک کہ ان کی درخواست پر وہ راز فاش کیا گیا''(حواشی قرآن)

بعض لوگوں نے اسے قبل کے واقعہ سے مرتبط کیا ہے کہ چوں کہ انہوں نے نمرود سے بحث میں کہا تھا کہ میرا پروردگار زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اس نے یہ کہا میں ایسا کرتا ہوں تو انہوں نے چاہا کہ قدرت الٰہی سے مردہ زندہ کرنے کا نمونہ اس کی آنکھوں کے سامنے پیش کر دیں اور اس صورت میں اطمینان کے معنی یہ ہیں کہ دشمن کے مقابلہ میں بحث میں نمایاں کامیابی ہو جانے سے میرے دل کو سکون حاصل ہو [1]۔

مگر جب کہ یہ سوال و جواب نمرود کے دربار میں نہیں ہوا ہے جیسا کہ صورت واقعہ سے ظاہر ہے تو اس مشاہدہ سے نمرود پر کیا اثر پڑسکتا ہے؟اس لئے یہ توجیہ کوئی وزن رکھتی معلوم نہیں ہوتی۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

''مثال ان لوگوں کی جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں مثل اس ایک دانے کے ہے جس نے سات بالیاں اگائیں کہ ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے اور بڑھاتا ہے [2] اور اللہ بڑی سمائی والا ہے بڑا جاننے والا''

راہ خدا میں خیرات کی نتیجہ خیزی اور اس کی مثال:

''اللہ کی راہ میں'' یعنی کسی بھی کار خیر میں جس سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہو [3]

یہ ارشاد کہ ہر بالی میں سو دانے ہوں اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ عام طور پر گیہوں کی بالیوں میں سو دانے ہوتے بھی ہوں بلکہ اس برکت کے غیر معمولی ہونے کا اظہار اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کی تمثیل اس عام واقعاتی نشو و نما جو حدود مشاہدہ کے اندر ہے کسی چیز سے ہو ہی نہیں

[1]۔ لیکشف ھٰذہ المسئلۃ عند نمرود واتباعہ ویزول الافکار عن قلوبھم (نیشاپوری)

[2]۔ یضاعف اکثر من ذلک (جلالین)

[3]۔ الجھاد وغیرہ من ابواب البرّ کلھا وھو المروی عن ابی عبد اللہ علیہ السلام (مجمع البیان)

سکتی بلکہ اس کی تمثیل کے لئے مفروضات سے مدد لینے کی ضروری ہے [1]۔

پھر یہ کہ وہ بالکل فرضی چیز ہے بھی نہیں کیوں کہ قرآن مجید میں گیہوں کی تخصیص نہیں ہے بلکہ دوسری جنس کے غلے بھی داخل ہیں اور مختلف غلوں میں بالیوں اور بالیوں کے اندر کے دانوں کی تعداد مختلف ہوا کرتی ہے بعض اجناس میں سو کے لگ بھگ تعداد دانوں کی مشاہدہ میں آیا کرتی ہے [2]۔

''اللہ جس کے لئے چاہتا ہے اور بڑھا تا ہے۔'' یہ چاہنا بلاوجہ نہیں ہوتا بلکہ کچھ خلوص قلب کی نوعیت کچھ موقع محل کی نزاکت کچھ اس انفاق کے نتائج کا دور رس ہونا۔ اس اعتبار سے اس کی جزاء میں بیش از بیش اضافہ کا استحقاق ہوتا ہے [3]۔

اسی بناء پر آخری میں دو الفاظ کہے گئے واسع اور علیم واسع کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے خزانہ میں کمی نہیں ہے۔ وہ جتنا چاہے بڑھانے پر قادر ہے اور علیم کا مطلب یہ ہے کہ وہ درجہ استحقاق سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ کس کا انفاق کتنے اضافہ کا حق دار ہے [4]۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۲۶۲

''وہ جو اپنے مال کو راہ خدا میں صرف کرتے ہیں پھر اس صرف کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ ایذا پہنچاتے ہیں ان کیلئے ان کا اجر ہے ان کے پروردگار کے یہاں اور انہیں کوئی کھٹکا نہیں ہے اور نہ انہیں افسوس ہوگا۔''

خیرات کے باعث ثواب ہونے کی شرطیں:

اس میں انفاق کی ان خرابیوں کی طرف اشارہ ہے جن سے ثواب اس انفاق کا ختم ہو جاتا ہے اور یہ وہ بلائیں ہیں جن سے کم خیر خیرات کرنے والے محفوظ رہتے ہیں۔

پہلی چیز ہے احسان جتانا، یعنی اس وقت تو کسی کا کام نکال دیا اور پھر دوسرے وقت اس کے منہ پر کہہ دیا کہ تمہارے کیسے وقت پر ہم کام آئے [5] یہ وہ آگ ہوگی جو خرمن احسان کو جلا کر خاک کر دے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بعد میں اس کے دل دکھانے کا سامان کرنے لگے مثلاً ایسے لوگوں سے اس کا ذکر کر رہا ہے جن پر وہ اپنی حالت

---

[1]۔ متیٰ قیل ھل رأی فی سنبلہ مائۃ حبّۃ حتی یضرب المثل بہا فجرابہ ان ذلك متصور وان لم یر (مجمع)

[2]۔ لیس ذٰلك فرضا موھو ما کا ینات الاغوال بل ھو کثیر مشاھد مُریٔ وان کان قلیلا (البلاغی) قد یوجد فی الجادرس وللذرۃ وغیر ھا مثل ذٰلك (نیشا پوری)

[3]۔ علیٰ حسب حال المنفق من اخلاصہ وتعبہ وھال المصرف وغیر ذٰلك. (صافی)

[4]۔ واسع لا یضیق علیہ ما یتفضّل بہ من الزیادۃ علیھم بنیۃ المتفق وقدر انفاقہ (صافی) علیھم بما یستحق الزیادۃ (مجمع البیان)

[5]۔ المن ان یعتد باحسانہ علیٰ من احسن الیہ (صافی)

کا ظاہر ہونا پسند نہیں کرتا یا اپنا تفوق قائم کرتے ہوئے اس سے حقارت آمیز برتاؤ کر رہا ہے[1] اور ایسے ہی دل آزاد طرح کی باتیں[2]۔
یہ چیز بھی اس احسان کو رائیگاں کرنے کا سبب ہوسکتی ہے۔ اس لئے اجر و ثواب کے وعدہ میں شرط عاید کی گئی ہے کہ راہ خدا میں صرف کرے اور پھر اس قسم کی باتیں نہ کرے جو اس خیرات کو بے کار بنانے والی ہیں۔

قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّمَغۡفِرَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ صَدَقَةٍ يَّتۡبَعُهَآ اَذًى‌ؕ وَاللّٰهُ غَنِىٌّ حَلِيۡمٌ ۝۲۶۳

"اچھے عنوان سے بات کہہ دینا اور بخش دینا[3] بہتر ہے ایسی خیرات سے جس کے بعد ایذا پہچانا ہو اور اللہ بے نیاز ہے برداشت سے کام لینے والا۔"

مطلب یہ ہے کہ یہ اس کی ضرورت پوری نہ کرتا۔ مناسب الفاظ میں معذرت کر دیتا اور سوال کرنے میں وہ سختی و درشتی اور اصرار بے جا سے جو کام لے رہا تھا یا اسے برداشت کرکے درگزر کر دیتا[4] تو وہ اس حاجت برآری سے بہتر تھا جس کے بعد یہ اس کا دل دکھائے "بخشش" کے ایک معنی یہ بھی کہے گئے ہیں کہ یہ اچھے عنوان سے معذرت کرتا جو اللہ کی جانب سے خود اس شخص کی مغفرت کا باعث ہوتا وہ اس احسان سے بہتر تھا جو اس کی ایذا رسانی سے اکارت ہو جائے۔
اس صورت میں قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّ مَغۡفِرَةٌ خَيۡرٌ. کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "اچھے عنوان سے بات کہنا' اور بخشا جانا بہتر ہے ایسی خیرات سے[5] مگر یہ معنی بظاہر بعید ہیں۔ "اللہ بے نیاز ہے" یعنی اسے ایسی خیرات کی ضرورت نہیں ہے جس کے بعد سائل کا دل دکھایا جائے لہٰذا وہ ایسی خیرات کو قبول نہیں کرے گا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ حلیم برداشت سے کام لینے والا ہے اس لئے تمہیں فوراً سزا نہیں دیتا[6]۔
اس میں یہ ارشاد بھی مضمر ہے کہ خالق حلم سے کام لے کر تمہاری غلطیوں سے درگزر کرتا ہے تو تمہیں بھی ان سائلوں کی تلخ کلامی وغیرہ سے درگزر کرنا چاہیے[7]۔
بعض لوگوں نے سمجھا ہے کہ یہ بات مستحق خیرات ہی سے متعلق ہوسکتی ہے کہ اس کا نہ دینا بہتر ہے اس قسم کے دینے سے جس کے ساتھ یہ طرز عمل اختیار کیا جائے کیوں کہ اگر زکوۃ واجب ہے تو اس کا دینا بہرحال لازم ہے مگر اس کے جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ واجب زکوۃ میں بھی یہ ہوسکتا ہے کہ اس کو نہ دے، کسی دوسرے کو دیدے[8]۔

---

[1]۔ ان یتطاول علیہ بسبب ما انعم علیہ (صافی)
[2]۔ ان یقول ارا ضی اللہ منك ومن ابتلانی بك (مجمع البیان)
[3]۔ بھلی بات اور بخشش (تاج العلماء)
[4]۔ کلام حسن ورد علی المسائل جمیل و مغفرۃ للہ فی الخاصۃ (جلالین) مغفرۃ لما یصدر منہ من الحاف او ازعاج فی المسلۃ (البلاغی)
[5]۔ تجاوز عن السائل الحاحہ اونیل مغفرۃ من اللہ یسبب الرد الجمیل (صافی)
[6]۔ لا یعاجلکم بالعقوبۃ (مجمع البیان)
[7]۔ فعلکم بالعبادۃ بالحلم والغفران لما یندر من السائل (بلاغی)
[8]۔ رد بان الواجب قد یعدل بہ عن السائل الی مسائل وعن فقیر الی فقیر (بلاغی)

میں سمجھتا ہوں کہ از اول خیرات میں ثواب کے اس بڑھاوے کا اعلان اور اتنی ترغیب وتحریص یہ سب مستحق خیرات ہی سے تعلق کا پتہ دیتی ہے اس لئے کہ جو شے قانون شرع کے لحاظ سے ضروری ولازم ہے اس کے ترک کی صورت میں عذاب اور غضب الٰہی کا اعلان ہی کافی ہوتا ہے۔ اجر وثواب کی زیادتی بیان کر کے اس پر آمادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝٢٦٤

''اے ایمان لانے والو! اپنی خیرات کو اکارت نہ کرو[1] احسان جتانے اور ایذا پہنچانے سے اس شخص کی طرح جو اپنے مال کو خیرات کرتا ہے لوگوں کو دکھانے کے لئے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کی مثال اس چکنے پتھر[2] کی سی ہے جس پر کچھ خاک پڑی ہو اور پھر اس پر بڑی بڑی بوندوں کا مینہہ برس جائے اور اسے صاف چکنا کر ڈالے (ایسے ہی) وہ جو کچھ ان کے اعمال ہیں ان سے کچھ ان کے پلے نہ پڑے گا اور اللہ کافر لوگوں کو راہ پر نہیں لگاتا۔''

اس میں تاکیدی طور پر اس بات کے دہرانے کے ساتھ کہ احسان جتانے اور ایذا پہنچانے سے خیرات رائیگاں ہو جاتی ہے پھر خیرات کو باطل کرنے والی ایک تیسری چیز کا پتہ دیا گیا ہے اور وہ لوگوں کے دکھانے کی نیت ہے۔

دکھاوے کے قصد کے ساتھ یہ الفاظ کہ ''وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا'' اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ غیر مسلموں کی خیرات کا ذکر ہے بلکہ یہ اضافہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے ہے کہ ریاکاری خود ایمان کے تقاضے کے خلاف ہے[3] اس لئے کہ اگر یہ شخص خدا اور روز آخرت کا صحیح تصور رکھتا تو یہ مقصد اتنا اہم ہے کہ اس کے مقابلہ میں وہ کسی دوسرے مقصد کو سامنے رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

تشبیہ کے محل میں ''پتھر پر کا غبار'' وہ دکھاوے کا عمل ہے اور بارش سے اس کا صفاچٹ ہو جانا روز آخرت کی حقیقت پاش ساعت کا سامنے کا آجانا اور ریاکاری کے نمائشی کردار کا ایک دم غائب ہو جانا ہے۔

ریاکاری سے خیرات کے باطل ہونے کی مثال:

---

[1] ۔نہ مٹاؤ (تاج العلماء)

[2] ۔صفاچٹ چٹان (تاج العلماء)

[3] ۔فیہ تعریض بان الرّیاء والمن والاذی علی الانفاق من صفات الکفار (صافی) وکل مراء کافر او منافق (مجمع البیان)

اب وہ اعمال کا ذخیرہ جس پر یہ لوگ آسرا لگائے تھے ان کے ہاتھ نہیں آسکتا اور نہ کام آسکتا ہے اسے کہا گیا ہے کہ انہیں اپنے اعمال میں سے کچھ پلے نہیں پڑے گا[1]۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

''اور مثال ان کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال خوشنودی خدا کی خاطر اور اپنے کو ثابت قدم رکھتے ہوئے[2] مثل اس گھنے باغ کے ہے جو کسی اونچی جگہ ہو، جس پر بڑی بڑی بوندوں والا مینہ برسا تو وہ اپنے پھل دونا دوں لایا اور اگر بڑی بوندوں والا مینہ نہ بھی ہو تو پھوہار سہی اور جو تم لوگ کرتے ہو اللہ اس کا دیکھنے والا ہے۔''

قابل قبول خیرات کی مثال:

''اپنے کو ثابت قدم رکھتے ہوئے یعنی اپنی قوت ارادی کو مرتکز کرتے ہیں اس بات پر کہ وہ احسان کے ساتھ کوئی ایسی بات نہ کریں گے جس سے وہ رائگاں چلا جائے گا۔ مثلاً احسان جتانا یا اس شخص کے مقابلہ میں تفوق برت کر، یا اور کسی طرح کو آزار پہنچانا یا اسے دوسروں کے دکھانے کے واسطے عمل میں لانا[3]۔

اور یہ بھی مفہوم ہوسکتا ہے کہ ان کی محرک اس عمل پر ان کی دینی بصیرت اور ضمیر کو قوت ہے[4]۔

اور ایک مفہوم یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایسا اس لئے بھی کرتے ہیں کہ اہل ایمان کے سامنے اپنے ایمان کا ثبوت پیش کریں[5]۔

مگر میرے خیال میں پھر اس کی بھی نوعیت ایک طرح کی نمائش کی ہوجائے گی حالانکہ قرآن مجید سابق کی آیت میں جو ریا کاری والی خیرات کا ذکر ہے اس کے مقابلہ میں اس کردار کو پیش کر رہا ہے جو خالصۃً لوجہ اللہ ہے اور اس لئے اس سے بہتر مجھے ایک اور قول معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسا کرتے ہیں اپنے ضمیر کو مطمئن بنانے کے لئے[6]۔

---

[1]۔ لاینفقون بما فعل ولا یجدون ثوابہ (صافی)

[2]۔ لان ثبتوا انفسھم علی طاعۃ اللہ وطلب رضاہ (البلاغی)

[3]۔ یعنی یو طنون انفسھم علی حفظ ھٰذہ الطاعۃ وترک اتباعھا بما یفسدھا من المن والاذی والسمعۃ الرّیاء والعجب ونحوھا (صافی)

[4]۔ بقوۃ الیقین والبصیرۃ فی الدین (مجمع البیان) اپنی ثابت قدمی کی وجہ سے (تاج العلماء)

[5]۔ قیل تثبیتا من انفسھم عند المؤمنین انھا صادقۃ فی الایمان مخلصۃ فیہ (نیشا پوری)

[6]۔ وقیل انہ اذا انفق لاجل مودیۃ الحق ــــــ فھنا اطمأن قلبہ (نیشاپوری)

مثال میں باغ کے لئے اونچے پر ہونے کا ذکر اس لئے ہے کہ وہ باغ زیادہ لطیف اور شاداب ہوتا ہے [1]۔

''بڑے بوندوں والا مینہ اور اگر یہ نہ ہو تو ہلکی پھوار سہی'' اس سے خیرات کی زیادتی اور کمی مراد ہو سکتی ہے یعنی اگر انہوں نے خیرات زیادہ مقدار میں کی ہے تو وہ تو بڑی بوندوں والے مینہ کی طرح ہے جس سے پیداوار بہت ہونا لازم ہے اور اگر کم بھی دیا ہے تو بھی بے کار نہیں۔ صدق دل سے ہے تو نتیجہ اس کا بھی نفع اخروی کی صورت میں سامنے آئے گا [2]۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمۡ اَنۡ تَكُوۡنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۙ لَهٗ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الۡكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَاۤ اِعۡصَارٌ فِيۡهِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۶۶﴾

''کیا تم میں سے کوئی چاہے گا اس کا گھنا باغ ہو کھجور اور انگور کا جس کے نیچے سے نہریں جاری ہوں اور اس کے لئے اس میں سب طرح کے پھل موجود ہوں اور اسے بڑھاپا گھیر لے اس حال میں کہ اس کے بے تاب و توان اولاد ہو اور اس (باغ) کو اپنی لپیٹ میں لے لے ایک بگولا [3] جس میں آگ ہو جس سے وہ جل جائے۔ اس طرح اللہ تمہارے لئے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے۔ شاید کہ تم غور کرو۔''

مطلب یہ ہے کہ اعمال کے پودے زندگی کی سرزمین پر اس لئے لگائے جاتے ہیں کہ ضرورت کے وقت اور وہ ضرورت کا وقت آخرت کا ہنگام ہے انسان کے کام آئیں لیکن اگر وہ ریا کاری کی خیرات ہے یا وہ احسان ہے جس کے بعد اس نے احسان جتایا ہے یا دل آزاری کی ہے تو یہ بذل وسخا خوب اپنی بہار دکھاتا رہا کہ تعریفیں ہوں نام پھیلا شہرت ہوئی مگر جب اصل ضرورت کا ہنگام آیا تو اس وقت یہ پورا باغ جلا ہوا خاکستر نظر آئے گا اور ذرہ بھر بھی اس سے فائدہ حاصل نہ ہوگا [4]۔

---

[1]۔ لانہا تکون ازکی شجرا واحسن ثمرا وانقی ھواء (بلاغی)

[2]۔ یجوز ان یکون التمثیل لحالھم عند اللہ تعالیٰ بالجنۃ علی الربو ونفقاتھم الکثیرۃ والقلیلۃ بالوابل والطل (صافی)

[3]۔ ریح عاصفة تنعكس من الارض الى السماء مستديرة كعمود (صافی) غبار يلتف بين السماء والارض كالتفات الثوب فی العصر (مجمع البیان)

[4]۔ ھٰذا تمثیل لنقۃ المرائی المآنّ فی ذھابھا وعدم نفعھا احوج مایکون الیھا فی الاٰخرۃ (جلالین) عن الصّادق علیہ السلام من انفق ماله ابتغاء مرضات الله ثم امتن على من تصدق عليه كان كمن قال الله ايودّ احدكم الاٰية (صافی) اذا كان احدكم لا يود ذلك ___ فلماذا یسلط نار المن والاذی فی اعلیہ السلام صار جھلہ ویحرق بھا انفاقہ (بلاغی)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

”اے ایمان والو! خیرات کرو اپنی کمائی کی اچھی پاک وحلال چیزوں سے [1] اور اس سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے برآمد کیا ہے اور قصداً [2] خراب چیز خیرات میں نہ دو درانحالیکہ تم خود اسے لینے پر آمادہ نہیں ہوگے سوا اس صورت کے کہ جب اپنی آنکھیں اس کے بارے میں (کسی وجہ سے) بند کرلو [3] اور جانے رہو کہ اللہ بے نیاز ہے قابل تعریف اوصاف والا۔“

خیرات کے دو اہم اصول:

اس میں پہلا اصول یہ بتایا گیا ہے کہ مال حلال سے خیرات کرو حرام کمائی سے نہ ہو کافی کی حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے اس کی شان نزول منقول ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگوں نے ناجائز ذرائع سے اموال حاصل کیے تھے۔ اب اسلام کے بعد انہوں نے ان اموال کو خیرات میں دینا چاہا تو اس سے ممانعت آئی اور بتایا گیا کہ خیرات مال حلال سے ہونا چاہیے۔

طیبات کے ساتھ جو مَا كَسَبْتُمْ کا لفظ ہے جس سے کمائی کا مفہوم پیدا ہوا ہے اس سے ضمناً یہ بات مستفاد ہونا بعید نہیں ہے کہ مال حلال بھی اگر اپنی کمائی کا نہیں ہے تو اس سے خیرات کی اتنی فضیلت نہیں ہے جتنی خود اپنے قوت بازو سے حاصل کرو مال سے خیرات کرنے کی فضیلت ہے [4]۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ یہ غلط ہے کہ جو بری چیز ہو اور اپنے کو ناپسند ہو قصداً راہ خدا میں دے جب وہ چیز ایسی ہے کہ خود تمہیں کوئی دیتا تو تم خود اس کے لینے پر عام حالات میں آمادہ نہ ہوتے تو اسے زکوٰۃ خیرات دینا بھی صحیح نہ سمجھو۔

کافی اور تفسیر عیاشی میں متعدد حدیثیں ہیں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایسا کیا جاتا تھا کہ زکوٰۃ میں جو انتہائی خراب کھجوریں ہیں وہ حاضر کردی جاتی تھیں۔ یہی بات ہے جس سے اس آیت میں ممانعت ہوئی ہے۔

---

[1] ۔ المراد من الطيب هو غير الردى في ذاته او بحرمته (البلاغی)

[2] ۔ التيمّم التعمد (مجمع البیان)

[3] ۔ الّا ان تتساهموا فيه مجاز من اغمض بصره عن بعض حقه اذا غضّه (صافی) التغميض للعين اطباق الجفن (مجمع)

[4] ۔ فيه دلالة على ان ثواب الصدقة من الحلال المكتسب اعظم منه من الحلال الغير المكتسب وانا كان ذلك لانه يكون اشق عليه (مجمع البیان)

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦٨﴾

''شیطان ڈراتا ہے [١] تمہیں رنگ دستی سے اور تمہیں غلط کاری پر آمادہ کرتا ہے اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی طرف سے بخشش اور کرم کا اور اللہ سمائی والا ہے بڑا جاننے والا۔''

تنگ دستی سے ڈرانا خیرات سے مانع ہونا ہے۔ یہ خیال پیدا کر کے کہ ہم اسے کارہائے خیر میں صرف کر دیں تو خود تنگ دستی کا شکار ہو جائیں گے اور غلط کاری پر آمادہ کرنے سے بھی خود بخل پر آمادہ کرنا مراد ہوسکتا ہے [٢] اس صورت میں یہ پہلے ہی فقرہ کی دوسری تعبیر ہوگی اور یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ مال حرام یا خراب چیزوں کے دینے کی تحریک کرتا ہے [٣] یہ سب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور خدا کا اس خیرات پر وعدہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں بھی اس کی وجہ سے مال پر برکت عطا کرے گا اور آخرت میں بھی مغفرت سے نوازے گا [٤]۔

گویا انسان کو جو دل میں اس کے تصورات آتے ہیں ان کے بارے میں پہچان بتائی جارہی ہے کہ کون شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں، لہٰذا ان پر عمل کرنے سے پرہیز کرو اور کون خدا کی طرف سے ان پر عمل پیرا ہو [٥]۔

شیطان کو کہا کہ وہ برائی کی دعوت دیتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ برائی کو خود ضمیر انسانی بعض چیزوں میں محسوس کرتا ہے اور جب ان باتوں کو دل چاہے تو خود سمجھ سکتے ہو کہ یہ شیطان کی تحریک ہے اور یہ بھی کہ وہ تمہارا کتنا بڑا دشمن ہے تو پھر خیرات میں جو تصورات وہ پیدا کرے ان میں تم کیوں آؤ اور خیرات سے ہاتھ کیوں روکو [٦]۔

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾

''جسے ہو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا ہوئی اسے بہت بڑی دولت [٧] مل گئی اور نصیحت قبول نہیں

---

[١]۔ یخوفکم به (جلالین و بلاغی) واوعد مستعمل فی الخیر والشر (صافی) الوعد یصلح بالتقیید للخیر والبشر غیر انه اذا طلق اختص بالخیر (مجمع البیان)

[٢]۔ والعرب تسمّی النجیل فاحشا (صافی)

[٣]۔ بالفحشاء ای بالمعاصی ترك الطاعات (مجمع)

[٤]۔ فالمغفرة اشارة الی منافع الاخرة والفضل اشارة الی ما یحصل فی الدنیا (نیشاپوری)

[٥]۔ جب یہ خیال آئے کہ خیرات سے گناہ بخشے جاویں گے اور اللہ مجھے بہیں چاہے گا اور دے گا تو جان لے کہ اللہ کی طرف سے آیا (موضح القرآن)

[٦]۔ لا یخفی علیکم کونها فحشآء فاعرفوا بهٰذا عداوته لکم وخبثه وخداعه فیما یعدکم ویخوّفکم به (بلاغی)

[٧]۔ بڑی بھلائی (تاج العلماء)

کرتے مگر عقل والے“۔

فضیلتِ حکمت:

حکمت عقل نظری اور عقل علمی دونوں کے کمال پر حاوی ہے۔ اس لئے اس سے نظر اور عمل دونوں کی صحت حاصل ہوگی[1] اور ایک انسان کی رفعت انسانی انہی دونوں سے وابستہ ہے تو اس سے بڑھ کر دولت کیا ہوسکتی ہے؟

احادیث جو حکمت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں وہ ان دونوں شعبوں کا پتہ دیتی ہیں چنانچہ کافی اور عیاشی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے حکمت کی تفسیر وارد ہوئی ہے: طاعة الله و معرفة الامام ”اللہ کی اطاعت اور امام کی معرفت“۔

دوسری حدیث میں ہے:

معرفة الامام و اجتناب الکبائر التی اوجب الله علیها النار

امام کی معرفت اور ان کبیرہ گناہوں سے بچنا جن پر اللہ نے آتش دوزخ کا مستوجب گردانا ہے۔

تیسری حدیث میں ہے:

الحکمة المعرفة والفقه فی الدین فمن فقه منکم فهو حکیم:

حکمت معرفت ہے اور دینی سمجھ، تو جو شخص تم میں سے فہم دینی کا حامل ہوجائے وہ حکیم ہے ایسی ہی اور حدیثیں ہیں۔

”عقل والے“ یعنی جو عقل سے کام لیتے ہیں اور عقل کو ”لُب“ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ انسان کا اصل مغز ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ انسان ہے وہ بس چھلکا ہے[2]۔

وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

”اور جو کچھ تم خیرات کرو یا منت مانو یقیناً اللہ اسے جانتا ہے اور نہیں ہوں گے ظالمین کے لئے کوئی مددگار۔“

”اللہ اسے جانتا ہے“ یعنی اس کی جزا ضرور ملے گی[3] یہ تو عمل کا روشن رُخ ہے جو خیرات کرنے اور نذر کی وفا کرنے سے متعلق ہے۔

اب دوسرا تاریک پہلو یعنی جو زکوٰۃ واجب کو روکے یا غلط کاموں میں روپیہ صرف کرے یا غلط نذریں کرے یا صحیح نذروں کو پورا نہ

---

[1]۔ الحکمة تحقیق العلم و اتقان العمل (صافی)

[2]۔ لانه انفس ما فی الانسان کما ان لبّ الثمرة انفس ما فیها (مجمع البیان)

[3]۔ معناه یجازی علیه (مجمع البیان)

کرے ان سب لوگوں کو ظالمین کے لفظ سے یاد کیا ہے [1]۔

یہ اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتے اور سزا سے بچ نہیں سکتے، اس نہ بچ سکنے کو یوں کہا ہے کہ ان کے کوئی مددگار نہیں ہوں گے۔" یہ ان کی اس جتھے بندی پر چوٹ ہے جو وہ دنیا میں کیے ہوئے ہیں اور اس زعم میں مبتلا ہیں کہ کوئی بات ہوئی اور پارٹی مدد کے لئے دوڑ پڑی۔ وہاں یہ پارٹی والے سب اپنے اپنے حال میں گرفتار ہوں گے اور کسی اپنے رفیق کو بچانے کے لئے نہ آسکیں گے۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾

"اگر تم ظاہر کرو خیرات کو تو یہ بھی اچھا ہے اور اگر اسے پوشیدہ رکھو اور محتاجوں کو دید و تو وہ بہتر ہے تمہارے لئے اور تمہارے کچھ گناہوں کا کفارہ ہوجائے گا اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔"

خیرات کا خفیہ دینا بہتر اعلانیہ:

"ظاہر کرو" کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مقصد ہی خیرات کا لوگوں کو دکھانا ہو اسے تو پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ یہ خیرات کے ثواب ہی کو ختم کر دیتا ہے بلکہ "ظاہر کرو" سے مطلب یہ ہے کہ خیرات ہوئی تو خوشنودی خدا ہی کے لئے مگر خاص طور پر اسے چھپانے کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اس طرح دیا گیا کہ سب کو معلوم ہے یہ بھی اچھا ہے یعنی خیرات کا ثواب پھر بھی قائم رہے گا [2] لیکن دوسری صورت زیادہ بہتر ہے۔

شاہ عبدالقادر نے اپنے حاشیہ میں لکھا ہے کہ:

"اگر نیت دکھاوے کی نہ ہو تو خیرات کے لئے یہی بہتر ہے کہ اوروں کو شوق بڑھے اور چھپے بھی بہتر ہے کہ لینے والا نہ شرمادے۔"

اول تو بہتر جو زیادہ اچھے ہونے کا پتہ دیتا ہے اس میں عقلاً یہ ذہن میں آنے والی بات نہیں کہ دو باتیں ہوں اور ہر ایک بہتر ہو بلکہ یقیناً جب ایک چیز بہتر ہوگی تو دوسری اس کے مقابلے میں کمتر ہوگی۔ پھر یہ سیاق قرآنی کے بھی خلاف ہے قرآن کے ساق کلام سے ظاہر ہے یہی ہوتا ہے کہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہے [3] چنانچہ سنتی خیرات میں یہ حکم قطعی طور پر ثابت ہے لیکن واجب زکوۃ کے لئے اظہار افضل ہے تاکہ دوسرے لوگ بھی پیروی کریں اور اس شخص پر ترک واجب کی تہمت عائد نہ ہوسکے جیسا کہ نماز میں بھی سنتی اور واجب میں یہ تفریق ثابت ہے۔

---

[1] ۔ للظالمین بمنع الزکوۃ والنذور (جلالین) الذین ینفقون فی المعاصی وینذرون فیھا ویمنعون الصدقات ولا یوفون بالنذور (صافی) تو بری نذر نہ کرو ناجائز چیزوں کی یا ان کے لیے جیسے بت اور کفر و نفاق کے پیشوا اور بھلی نذر کرو جیسے خدا کی اور پیغمبروں اور اماموں اور دوستانِ خدا کی (تاج العلماء)

[2] ۔ ای فان الصدقۃ نعم شیئا ھی فی ذاتھا ولا یذھب الا بداء لھا بفضلھا اذالم یعرض علیھا بسببہ شئی من الریاء او اذی المتصدق علیہ (بلاغی)

[3] ۔ خیر لکم من ابدائھا (جلالین)

احادیث معصومینؑ میں بھی زکوۃ کے بارے میں یہ تفریق موجود ہے [۱] بلکہ ایک حدیث میں تو اس آیت کے دونوں جملوں کو ان دونوں زکوتوں کے فرق ہی پر محمول کیا گیا ہے کہ یہ جو ارشاد ہوا کہ :اِنۡ تُبۡدُ الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِیَ ''اگر ظاہر کرو تو بہت اچھا ہے'' یہ صدقہ واجبہ یعنی زکوۃ مفروضۃ سے متعلق ہے اور دوسرا جزء کہ اِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّکُمۡ ''اگر چھپاؤ اور فقیروں کو دیدو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے'' یہ زکوٰۃ سنتی سے متعلق ہے [۲]۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ بعض صورتوں میں صدقات کا ظاہر کرنا بہتر آتا ہے اور بعض صورتوں میں مخفی کرنا۔

لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰٮهُمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَلِاَنۡفُسِكُمۡ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يُّوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۲﴾

''آپ پر انہیں ٹھیک راستے پر لگا دینے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ وہ تو اللہ جسے چاہتا ہے ٹھیک راستے پر لگاتا ہے [۳]
اور جو تم لوگ مال و دولت خیرات میں دو گے وہ اپنے ہی لئے اور نہیں خیرات کرو گے مگر اللہ کی خوشنودی کے لئے [۴]
اور جو مال و دولت خیرات میں دو گے وہ پورا پورا تمہیں ادا کر دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا [۵]''۔

ایک ہدایت ہوتی ہے راستہ دکھانے کی صورت میں اور ایک ہاتھ پکڑ کے راستے پر لگانے کی صورت میں رسولؐ کے ذمہ بس پہلا کام ہے اور وہ سب کے لئے عام ہے [۶]۔ ہاں اس کے بعد خصوصی سہارا دینا توفیق کی شکل میں وہ خدا کرتا ہے۔ وہ بھی ان کے لئے جنہیں ان کے ذاتی

---

[۱]۔ علی بن ابراھیم باسنادہ عن الصادقؑ قال الزکوۃ المفروضۃ تخرج علانیۃ ______ و غیر الزکوٰۃ ان عہ سرّا فھو افضل (مجمع البیان)

[۲]۔ فی الکافی عن الصادقؑ فی قولہ تعالیٰ و ان تخفوھا قال ھی سوی الزکوٰۃ فان الزکوٰۃ علانیۃ غیر سر و عنہ قال کل ما فرض اللہ علیك فاعلانہ افضل من اسرارہ و ما کان تطوّعا اسرارہ افضل من اعلانہ (صافی)

[۳]۔ تیرے ذمہ پر نہیں ان کا منزل تک پہونچانا بلکہ خداوند پہونچاتا ہے منزل تک (تاج العلماء)

[۴]۔ مگر خدا کے منہ سے (تاج العلماء) یہ عام محاورہ ہے کہ مراد اس سے خاطر اور مرضی ہوتی ہے نہ یہ کہ سچ مچ کا مُنہ مراد ہو کہ یہ کفر ہے اس لیے کہ خدا جسم نہیں رکھتا (حواسی تاج العلماء)

[۵]۔ تمہارا حق نہ مارا جائے گا (فرمان علی صاحب)

[۶]۔ ما علیك الا البلاغ (صافی)

شوق وذوق کی بناء پر وہ اس کا حق دار پاتا ہے [1] جسے کیا گیا ہے:

وَالَّذِيۡنَ جَاهَدُوۡا فِيۡنَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَا: جو ہماری راہ میں کدوکاوش کرتے ہیں انہیں ہم اپنے راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں (روم۔٦٩)

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام جبری طور پر ہدایت کرنا نہیں:

اس استحقاق کو یہاں من یشآء جسے چاہتا ہے کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے یعنی جیسا کہ پہلے آچکا ہے یہ چاہنا بلا وجہ نہیں ہوتا بلکہ خود انسان کے اختیاری کردار کی بناء پر ہوتا ہے۔

رہ گیا اس کے آگے یعنی جبری طاقت سے منزل تک پہنچا دینا اس کا نام تو حقیقۃً ہے ہی نہیں وہ خدا کے نظام حکمت کے خلاف ہے اس لئے مشیت اس سے متعلق نہیں ہوسکتی وہ وہ ہے جس کے لئے کہا گیا ہے:

وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ كُلُّهُمۡ جَمِيۡعًا

اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو جتنے روئے زمین پر ہیں سب ہی ایمان لے آتے (یونس۔۹۹)

اور: وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً

اگر اللہ چاہتا تو انہیں ایک قوم بنا دیتا۔(شوریٰ۔۸)

وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ

اگر اللہ چاہتا تو جو ان کے بعد تھے وہ آپس میں جنگ نہ کرتے جس پر بہ قدر ضرورت وہاں بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔

باربار ان حقیقتوں پر واضح الفاظ میں تنبیہ کرنے کی اس لئے ضرورت ہے کہ لوگ ان مقامات پر ٹھوکریں بہت کھاتے ہیں مثلاً: شاہ ولی اللہ نے ترجمہ کیا ہے:

"لازم نیست برائے تو اے محمدؐ ہدایت ایشان ولیکن خدا ہدایت می کند ہر کہ امی خواہد۔"

اور شاہ رفیع الدین نے اسی کو اس زمانہ کی اردو میں کہہ دیا ہے کہ:

"نہیں اوپر تیرے ہدایت کرنا ان کا اور لیکن اللہ ہدایت کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔"

تو اس سے بھلا انسان کیا سمجھے جب کہ وہ جانتا ہے کہ رسول کا کام ہدایت کرنا ہے اور کام دوسرا ہے ہی کیا جس کے لئے رسول بھیجے گئے ہوں مگر دوسرے مقامات پر تو شاہ ولی اللہ یا ان کے فرزند شاہ عبدالقادر حاشیہ پر مختصر تشریح کرتے بھی ہیں اور اس محل پر باپ بیٹے صاف کترا جاتے ہیں صرف اس لئے کہ جب اپنا ہی ذہن اس معاملہ میں صاف نہیں ہے تو دوسروں کی تشفی کیا کی جائے؟

اس کے بعد خطاب قرآنی کا رخ خود ان کی طرف ہو گیا جنہیں خیرات دینے کی دعوت دی جاتی تھی کہ تم جیسے یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں جو اس کی دعوت دی جاتی ہے وہ کچھ اپنے فائدے کے لئے ہے۔ایسا نہیں ہے تم دوگے تو اپنا ہی بھلا کروگے اور کہیں جائے گا نہیں بلکہ خدا اسے پورا پورا تمہیں

---

[1] ۔بلطف ممن ان اللطف ينفع فيه-------فينتهى عما نهى عنه (صافی) ممن هو اهل للتوفيق (البلاغی)

بے باق کردے گا۔یعنی اس کا شایان شان ثواب تمہیں مل جائے گا اور یہ نہیں ہوگا کہ تمہارے ساتھ ذرّہ بھر ناانصافی ہو

اب ذہن میں بس یہ ایک جستجو باقی رہتی ہے کہ خیرات کے ذکر میں آخر یہ ہدایت کے بحث کیوں چھڑ گئی؟ س کا جواب شان نزول سے ملتاہے جو کافی اہمیت رکھتی ہے۔

یہ سوال آج بھی ہے اور ہمیشہ رہا ہے کہ غیر مذہب کا آدمی جو ہم سے سوال کرتا ہے اسے دینا ازروئے مذہب کیسا ہے؟ بعض لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر کسی غیر مومن یا غیر مسلم کو ہم نے دیا تو وہ کھاری کنویں میں گیا یہ سوال زمانہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پیدا ہوا اور اسی کے جواب میں یہ آیت اتری [1] اور خالق نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں خیرات دیتے وقت یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ وہ مسلمان ہے یا کافر تمہیں تو بس یہ دیکھنا چاہیے کہ ایک انسان ہے اور وہ تمہاری امداد کا محتاج ہے لہٰذا تم امداد کرو اور یہ حقیقت میں خود اپنی مدد ہے کہ تمہیں اس کا اجر ملے گا [2] اور وہ کہیں جائے گا نہیں بلکہ خدا اسے پورا پورا تمہیں بے باق کردے گا اور یہ نہ ہوگا کہ ذرّہ بھر بھی تمہارے ساتھ ناانصافی ہو۔

یہ ہے وہ وسعت نظر جو دین حق اپنے پرستاروں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔وہ دین کی روح سے بے بہرہ ہیں جو اس وسعت نظر کے حامل نہیں ہیں۔

لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِيۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِى الۡاَرۡضِ يَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ‌ۚ تَعۡرِفُهُمۡ بِسِيۡمٰهُمۡ‌ۚ لَا يَسۡـئَلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَـافًا ‌ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ ﴿۲۷۳﴾

”ان تنگ دست افراد کا حق ہے [3] جو اللہ کی راہ میں بے چارہ و تدبیر ہو گئے ہیں [4] اس طرح کہ روئے زمین پر سفر نہیں کر سکتے [5] ناواقف انہیں رکھ رکھاؤ کی وجہ سے [6] مال دار سمجھے گا تم انہیں ان کے قیافہ سے پہچان سکتے ہو [7] وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے [8] اور جو کچھ مال و دولت تم خرچ کرو تو بلاشبہ اللہ اس کا جاننے والا ہے۔“

---

[1]۔کان المسلمون یمتنعون عن الصدقة علیٰ غیر اهل دینهم فانزل الله تعالیٰ هٰذه الاٰیة (مجمع البیان)

[2]۔فلا یضرّکم کفرهم (نیشاپوری)

[3]۔تقدیره النفقة للفقراء (مجمع البیان) اعمدوا للفقراء او صدقاتکم للفقراء (صافی) و اما تعلیق الجار و لمجرور بکلمة و ما تنفقوا فی الاول فلا یصح لان الانفاق یعدی یعلی لا بالکرم (بلاغی)

[4]۔احصرهم الجهاد (صافی) رُکے پڑے ہیں راہ خدا میں (تاج العلماء)

[5]۔ای الزموا انفسهم الجهاد فی سبیل الله فلا یقع منهم للتصرف لغیره و لیس معناه انهم لا یقدرون علیه (مجمع)

[6]۔کم سختی کی وجہ سے (تاج العلماء) ای امتناع من السوال و التجمل فی اللباس و الستر لما هم فیه من الفقر و سوء الحال (مجمع)

[7]۔جنہیں تاڑتا ہے تو ان کی پیشانیوں سے (تاج العلماء)

[8]۔ معناه انهم لا یسئلون الناس اصلا و لیس معناه انهم یسئلون من غیر الحاف (مجمع)

فقراء میں ترجیح کا معیار:

مستحقین زکوٰۃ کی عام طور پر جو فہرست ہے وہ تو دوسری جگہ بیان کر دی گئی ہے۔ یہاں گذشتہ آیات کے نازل ہونے کے موقع پر جن لوگوں کی امداد کی طرف متوجہ کیا جا رہا تھا ان کے خصوصی اوصاف کا تذکرہ ہے[1]۔

بے شک جن اوصاف کو یہاں ان اشخاص کے لئے وجہ استحقاق کے طور پر بیان کیا گیا ہے ایسے اوصاف کسی اور زمانہ میں جن فقراء میں پائے جاتے ہوں ان کو عام فقراء پر ترجیح ہوگی جو ان اوصاف کے حامل نہیں ہیں مثلاً ایک شخص ہے جو سفر کر کے کسب معاش کر سکتا ہے اس پر اسے ترجیح ہوگی جو بے دست و پا ہے کہیں جا بھی نہیں سکتا۔

اسی طرح جو خودداری کی وجہ سے اظہار فقر و فاقہ کرنا عار سمجھتا ہے اسے ترجیح ہوگی اس پر جو ہر ایک سے اپنا حال کہہ کے اظہار استحقاق کر سکتا ہے۔

جہاں تک میں محسوس کرتا ہوں یہ آیت گذشتہ آیت کے مضمون کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتی۔ غالباً جمع قرآن کے وقت یہ دیکھ کر کہ اس میں بھی انفاق یعنی خیرات کا ذکر ہے اور اس میں بھی انفاق ہی کا ذکر ملتا ہے ان دونوں آیتوں کو اس طرح جوڑ دیا گیا ہے لیکن معنوی تسلسل ان دونوں آیتوں میں کوئی نہیں ہے۔

بہت ممکن ہے سلسلہ تنزیل کے اعتبار سے یہ آیت اس آیت کے قبل کی دونوں آیتوں سے متعلق ہو کہ

(۱) وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ‌ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ۝٢٧٠ (بقرۃ)

(۲) اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ‌ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ؕ وَيُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ۝٢٧١ (بقرۃ)

اور پھر (۳) للفقراء الذین احصر وا فی سبیل اللہ الخ اور بیچ میں جو غیر مسلم کی خیرات کے متعلق آیت ہے وہ کسی اور موقع کی ہو۔

اَلَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ‌ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ۝٢٧٤

"وہ جو اپنے اموال رات اور دن میں خفیہ اور اعلانیہ خیرات میں دیتے ہیں ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے پروردگار کے یہاں اور انہیں کوئی کھٹکا نہیں ہوگا اور نہ افسوس ہوگا۔"

جناب ابن عباسؓ اور دیگر محدثین نے بیان کیا ہے اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے ارشادات سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ آیت حضرت علی ابن طالبؑ کی شان میں نازل ہوئی کہ آپ نے ان چاروں طریقوں سے راہ خدا میں خیرات دی۔ اسی کی مدح قرآن مجید میں ان الفاظ سے ہوئی

---

[1]۔ قال ابو جعفر علیہ السلام نزلت الآیۃ فی اصحاب الصفّۃ (مجمع البیان)

ہے[1]۔

علامہ بلاغی نے اس سلسلہ میں شیعہ وسنی طرق سے کثیر التعداد روایات کی طرف تفصیلی اشارہ فرمایا ہے ان میں سے بعض روایات کو علامہ نیشا پوری نے بھی غرائب القرآن میں درج کیا ہے مگر اس کے مفہوم کی وسعت بقدر مرتبہ ہر اس شخص کو اپنے دامن میں لے سکتی ہے جو ان طریقوں سے راہ خدا میں خیرات کرے[2]۔

اَلَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا كَمَا يَقُوۡمُ الَّذِىۡ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ‌ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَيۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا‌ ۘ‌ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ‌ؕ فَمَنۡ جَآءَهٗ مَوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ فَانۡتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَؕ وَاَمۡرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ‌ؕ وَمَنۡ عَادَ فَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝٢٧٥

”وہ کہ جو سود[3] کھاتے ہیں نہیں اٹھیں گے مگر جس طرح اٹھے وہ کہ جسے شیطان نے اپنے آسیب سے بدحواس بنا دیا ہو[4] یہ اس لئے کہ وہ اس کے قائل ہیں کہ تجارت سود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے تو جس کے پاس اس کے پروردگار کی طرف سے فہمائش آئی اور وہ باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو پھر ایسا کرے تو یہ جہنم والے ہیں کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔“

سودخواروں کی مذمت:

یہ سودخواروں کے عذاب کا ذکر ہے اور سود کے ساتھ کھانے کا لفظ ہماری معلومہ تمام زبانوں میں بطور محاورہ ہوتی ہے جس کا مطلب ہوتا ہے ”سود لینا“ اب خواہ لے کر اسے کھایا جائے یا کوئی اور تصرف کیا جائے یا جمع کر دیا جائے[5]۔

سود کی حرمت:

---

[1]۔قال ابن عباس ؓ نزلت الآیۃ فی علی علیہ السلام وھو المروی عن ابی عبداللہ علیہ السلام وابی جعفر علیہ السلام (مجمع البیان)

[2]۔حکمہ سائر فی کل من فعل مثل فعلہ ولہ فضل السّبق الیٰ ذلک (مجمع البیان) والآیۃ اذا نزلت فی شیّ فھی منزلۃ فی کل ما یجری فیہ (صافی)

[3]۔ بیاز (تاج العلماء)

[4]۔جسے بولا دیا ہو شیطان نے اپنے چھو جانے کی وجہ سے (تاج العلماء)

[5]۔الوعید فی الآیۃ متوجہ الیٰ کل من اربیٰ وان لم یاکلہ (مجمع البیان) الا انہ غیّر عن الشئی بمعظم مقاصدہ (نیشا پوری)

''وہ نہیں اٹھیں گے مگر اس طرح'' یعنی قبروں سے جو اٹھیں گے وہ اس طرح اٹھیں گے [۱] قیامت میں اس طرح کھڑے ہوں گے [۲]۔

ان کا قول یہ تھا کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے یعنی نفع اس میں بھی لیا جاتا ہے لہٰذا دونوں کا حکم یکساں ہونا چاہے حالانکہ اصل میں انہیں کہنا یہ ہے کہ سود بھی بیع کی طرح ہے یعنی بے ضرر چیز ہے مگر اس بات میں زور پیدا کرنے کے لئے ادھر سے کہا گیا ہے کہ بیع بھی سود ہی کی طرح کی چیز ہے [۳]۔

یہ ان کی عقل ناقص کا فیصلہ تھا مگر خالق نے اس کی ردکی ہے وہ دونوں یکساں کیوں کر ہوسکتے ہیں۔ان میں فرق تو اسی سے ظاہر ہے کہ بیع کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے اور ربو کو حرام قرار دیا ہے۔یہ عقل کے فیصلہ کے مقابلہ میں شرع کو پیش کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی عقل کے نقصان کا اظہار ہے کہ وہ مزید غور کریں تو انہیں دونوں میں فرق خود سمجھ میں آجائے۔

''جو کچھ پہلے ہو چکا ہے'' اس کے یہ معنی تو ظاہری ہیں کہ اسلام میں حرمت رابو کا حکم آنے سے پہلے جو اس نے سود لیا ہے وہ اس کا ہے مگر اس کے ساتھ احادیث معصومین علیہم السلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکم شریعت وارد ہونے کے بعد بھی اگر کوئی لاعلمی کی وجہ سے سود لیتا ہے مگر حکم شرع معلوم ہونے کے بعد اس سے تائب ہوجاتا ہے تو وہ بھی اس میں داخل ہے [۴]۔

''وہ اس کے لئے ہے'' اس کا مطلب پہلی نظر میں تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نہ اس پر کوئی گناہ ہوگا اور نہ واپس لیا جائے گا [۵] مگر بعد کا فقرہ: **وامرہ الی اللہ** ''اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے'' یہ بتاتا ہے کہ پہلے کا تعلق صرف اس مال سے ہے وہ وصول کر چکا ہے مگر اس سے گزشتہ فعل کا مواخذہ ہونا نہ ہونا خالق کے اختیار سے وابستہ ہے چاہے گا وہ سزا دے گا اور چاہے گا معاف کر دے گا۔

اکثر علماء ہمارے اس خیال سے کہ **لہ ماسلف** کا تعلق اس مال کے ساتھ ہے جو پہلے لیا گیا ہے متفق ہیں مگر علامہ بلاغی کو اس سے شدید اختلاف ہے او وہ فرماتے ہیں کہ **لہ ماسلف** کا تعلق اس عمل سے ہے کہ وہ معاف ہوجائے گا نہ یہ کہ وہ مال جو وہ لے چکا ہے اس کے لئے حلال ہے۔اس پر ممدوح نے کافی بسیط بحث کی ہے جو ہمارے نزدیک الفاظ قرآنی کے خلاف ہے۔اور اگر **فلہ ماسلف** کے معنی یہ ہوگئے جیسا کہ ممدوح نے تحریر فرمایا ہے: **ای ان اللہ یتوب علیہ و یغفر لہ** (یعنی اس کی توبہ قبول کرے گا اور اسے معاف کردے گا'' تو پھر یہ فقرہ بعد کا بے جوڑ معلوم ہوتا ہے کہ **وامرہ الی اللہ** اور معاملہ اس کا اللہ کے ہاتھ میں ہے جب اعلان معافی کا ہو گیا تو پھر اس کہنے کا کیا مطلب؟

آخر میں جو سود کی سزا کا بیان ہے وہ اس بناء پر ہے کہ اگر سود کو حلال سمجھتا ہے یا وجود یہ کہ حکم الٰہی کا علم اسے ہو گیا تو وہ حقیقۃ دائرہ اسلام

---

[۱]۔لایقومون اذا بعثوا من قبورھم (صافی)

[۲]۔لایقومون یوم القیامة (مجمع البیان) وھو ظاھر للصّام (بلاغی)

[۳]۔ھٰذا من عکس التشبیہ مبالغة (جلالین) قاسوا احدھما بالاٰخر (صافی)

[۴]۔فی التھذیب عن الباقر علیہ السلام والعیاشی عنھما قال الموعظة التوبة وفی الکافی والفقیہ عن الصادق علیہ السلام کلّ ما اکلہ الناس بجھالة ثم تابوا فانہ یقبل منھم وفی معناہ اخبار کثیرة (صافی)

[۵]۔لایؤاخذ بما مطی منہ ولا یستردّ منہ (صافی)

سے خارج اور کفار کے زمرہ میں داخل ہے جیسا کہ تمام ضروریات دین کا حکم ہے منکران کا کافر ہے [۱]۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

"ملیامیٹ کر دیتا ہے اللہ سود کو اور بڑھاتا ہے خیرخیرات کو اور جتنے بہت ناشکرے ہیں [۲] گنہگار اللہ انہیں دوست نہیں رکھتا۔"

سود اسی لئے تو انسان لیتا ہے کہ اس کی دولت میں اضافہ ہو خالق کریم انسان کی اس توقع کو غلط قرار دیتے ہوئے اطلاع دیتا ہے کہ سود کے اموال میں برکت نہیں ہے [۳]۔

اور راہ خدا میں جو خرچ کرو گے تو ظاہر میں تو اس سے مال میں کمی ہوگی خداوند عالم اس کی وجہ سے مال میں ایسی برکت عطا فرمائے گا کہ اس میں اور فراوانی ہوگی۔

سودخوار کی انجام میں بربادی:

اور اگر دنیا میں ایسا نہ بھی ہو تو اس کا اثر قیامت میں تو یقیناً رونما ہوگا کہ اس سودخوار کو وہاں ایسی بربادی ہوگی کہ اس دنیا کے تمام منافع اس کے لئے وبال جان ہو جائیں گے اور خیرات کا ثواب اتنا زیادہ ملے گا جس کے مقابلہ میں یہ اتنی مالی قربانی کوئی ناگوار چیز نہیں رہ سکتی چنانچہ کافی اور من لا یحضر میں ہے کہ کسی نے امام جعفر صادقؑ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا اور کہا ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ بعض سودخوار دنیا میں بڑے دولت مند ہو جاتے ہیں اور ان کی دولت آخرت تک ضائع نہیں ہوتی۔ آپ نے فرمایا کہ کون مٹنا اس سے زیادہ ہو سکتا ہے کہ سود کی ایک معمولی رقم ملنے سے اس کا دین برباد ہو جاتا ہے اور آخرت تباہ ہو جاتی ہے [۴]۔

پھر دنیا میں بھی دولت کا زوال چاہے نہ ہو مگر سودخوار کے لئے اور برے نتائج ہیں جو ایک حدیث نبوی میں اس طرح بیان ہوئے ہیں:

الربوا و ان كثر الى قل و ذلك لدعا ء الناس عليه و بعضهم اياه ولسقوط عدالة و شهرته بالفسق و العدوان ور بما يطمع الظلمة فى ماله علما منهم ان المال فى الحقيقة ليس له (نیشاپوری)

سود چاہے بہت زیادہ ہو مگر نتیجتاً اس سے بڑی کمی پیدا ہوتی ہے وہ اس لئے کہ لوگ اس کے لئے بددعا کرتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں اور عدالت اس کی مجروح ہو جاتی ہے اور وہ بداعمالی کے ساتھ مشہور ہو جاتا ہے اور اکثر دوسرے ظالم افراد اس کے مال کو ہتھیانے کا

---

[۱]۔ ومن عادالی تحلیل الربوا والاستخفاف به بعد ان تبین له تحریمة فی الفقیه والعیون عن الرضاؑ هی کثیرة بعد البیان قال والاستخفاف بذلك دخول فی الکفر (صافی) ومن عادالی تعاطی الربوا متحلّلاله. اوالی الاعتراض علی الشریعة (البلاغی)

[۲]۔ الاظهران المراد هنا هو كفر النعمة وعدم الاكتفاء بما انعم الله عليه من الحلال حتى يقتهم ما حرم الله عليه من الربا (البلاغی)

[۳]۔ یمحق الله الربوا یذهب برکته و یهلك المال الذی یدخل فیه (صافی)

[۴]۔ قیل للصّادقؑ وقد یربی الرجل فیکثر ماله فقال یمحق الله دینه وان کثر ماله (مجمع البیان)

منصوبہ بناتے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ وہ مال حقیقت میں اس کا نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾

"بلا شبہ وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور اچھے اعمال کیے اور نماز ادا کی اور زکوۃ دی ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے پروردگار کے یہاں اور انہیں کوئی کھٹکا نہیں نہ انہیں کوئی افسوس ہوگا۔"

"اچھے اعمال" میں نماز اور زکوۃ دونوں داخل ہیں۔ مگر اس اجمال کے بعد یہ تفصیل ان دونوں شعبوں کی اہمیت کے لحاظ سے ہے [۱] (جیسے مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ جو شخص اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے پیغمبروں کا دشمن ہو" کہہ دینے کے بعد پھر" وہ جبرائیل ومیکائیل کہنا جو صرف ان دونوں فرشتوں کی اہمیت کے اظہار کے لئے ہے اور نہ ظاہر ہے کہ فرشتوں میں یہ بھی داخل ہیں۔

ترتب اجر و ثواب باعتبار اعمال:

اجر کا ذکر جہاں جہاں قرآن مجید میں ہے اکثر جگہ اسی طرح اضافت کے ساتھ ہے کہ لھم اجرھم "ان کے لئے ان کا اجر ہے" اس اضافت میں یہ حقیقت مضمر ہے کہ ثواب آخرت ایک منضبط و متعین شکل میں نہیں ہے کہ ہر صاحب ایمان بس دائرہ ایمان میں داخل ہوتے ہی اس کا مستحق ہوجائے بلکہ یہ ان اعمال خیر کے تناسب سے ہے جو ہر شخص انجام دے گا لہٰذا جس کا جیسا عمل ہوا اسی لحاظ سے اسے اجر ملے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایمان شرط ترتب اجر ہے مگر معیار میزان اجر کے اعمال صالحہ ہی ہیں۔

اس مقام پر ایک اور نکتہ ہے وہ یہ کہ اجر کے ساتھ عند ربھم کہا جاتا ہے کہ "ان کے پروردگار کے یہاں" ان کا اجر ہے۔ یہ نہیں کہ علی ربھم اجرھم یعنی "ان کے پروردگار کے ذمہ ان کا اجر ہے" کیوں کہ پہلے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اجر و ثواب موجود ہے خالق کے پاس یہ بطور امانت جس کے لئے بس تمہارے اس کے پاس پہنچنے کی دیر ہے۔ لیکن یہ الفاظ کہ اس کے ذمہ تمہارا اجر ہے اس مفہوم کا پتہ نہ دیتے کیوں کہ ذمہ پر تو اس کے پاس بھی ہوتا ہے جو قرض لے اور ابھی ادائی پر قادر نہ ہو۔ خالق کے یہاں کا ثواب یہ نوعیت نہیں رکھتا [۲]۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾

"اے ایمان لانے والو! اللہ کے غضب سے بچو اور جو کچھ سود رہ گیا ہوا سے چھوڑ دو [۳] اگر تم ایمان والے ہو۔"

"ایمان لانے والو!" کہہ کے تخاطب تو ان سب ہی سے ہوتا ہے جنہوں نے ایمان کا اقرار کیا یعنی مسلمان ہوئے۔ اب ان میں سے کون واقعی مومن ہے اور کون نہیں یہ اس کا عمل بتائے گا۔ اس لئے "ایمان لانے والو" کہہ کے مخاطب ہونے کے باوجود آخر میں کہا ہے اگر مومن ہو

---

[۱]۔ النصّ علیھما ابالذکر تعظیما لشانھما وان کانا من نوع الاعمال الصّالحة (البلاغی)

[۲]۔ الاول یجری مجری ما اذا باع بالنّقد (نیشاپوری)

[۳]۔ جانے ہی دو اس بیاز کو کہ جو باقی رہ گیا (تاج العلماء)

یعنی اگر تمہارا دعویٰ ایمان کا سچا ہے اور تم واقعی مومن ہو[1] تو تمہارا کردار بھی ویسا ہی ہونا چاہیے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو سود تمہارا لوگوں کے ذمہ رہ گیا ہے اس کا مطالبہ ترک کردو اس لئے کہ وہ جائز مطالبہ نہیں ہے[2]۔

بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت خالد بن الولید کے بارے میں نازل ہوئی تھی جب خالد نے اسلام لانے کے بعد اپنے باپ ولید بن مغیرہ کے سودی قرضوں کا مطالبہ شروع کیا[3] اس کے علاوہ بھی بعض دوسرے لوگوں کے نام لئے گئے ہیں کہ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی جس کے معنی آیت کے سمجھنے میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾

”اب اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہیں خبردار رہنا چاہے[4] اللہ اور رسولؐ کی جنگ سے اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہیں اپنے اصل مال کا استحقاق ہوگا۔ اس طرح نہ تم کسی پر ظلم کروگے اور نہ تم پر کوئی ظلم ہوگا۔“

العظمة للہ! یہ اعلان جنگ ان سے ہے جو اسلام قبول کرچکے ہیں[5] اور یہ ہے حقوق الناس کی اہمیت کہ ان کے نظرانداز کرنے سے اللہ بندہ کے مقابلہ میں برسرِجنگ ہوجاتا ہے۔

”نہ تم کسی پر ظلم کروگے اور نہ تم پر کوئی ظلم ہوگا یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ اب تمہارا اصل مال بھی نہ ملے تو یہ تم پر ظلم ہوتا اور اب چڑھے ہوئے سود کا تم مطالبہ کرو تو یہ تمہارا ظلم ہے۔ عادل شریعت نہ اس کی روادار ہے نہ اس کی[6]۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

---

[1]۔ ان کنتم مؤ منین صادقین فی ایمانکم (جلالین) ان کنتم مومنین بقلوبکم فان دلیله امثال ما امرتم به (صافی) مومنین علیٰ حقیقة الایمان (البلاغی)

[2]۔ اترکوا بقایا ماشرطتم علی الناس من الربوا (صافی) یعنی آگے جو سود لیا وہ لیا اب اگلا چڑھا ہوا نہ مانگو (حواشی تاج العلماء)

[3]۔ روی عن ابی جعفر الباقر علیہ السلام (مجمع البیان)

[4]۔ کان دھر کے سن لو (تاج العلماء) فاعلموا بہا من اذن بالشئی اذا علم به (صافی) کانه ماخوذ من العلم بواسطة السمع بالاذن (بلاغی)

[5]۔ لانه خطاب مع قوم تقدم ذکرهم وما هم الا المخاطبون بقوله یاایها الذین اٰمنوا (نیشاپوری)

[6]۔ لاتظلمون باخذ الزیادة علی راس المال ولا تظلمون بانقصان من راس المال (مجمع البیان)

"اور اگر تنگ دست آدمی ہو[1] تو مہلت دینا ہوگی[2] خوش حالی تک اور اگر خیرات کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔"

یعنی جو تمہارا مقروض ہے وہ اگر تنگ دست ہے سر دست نہیں دے سکتا تو اصل مال کے مطالبہ میں بھی سختی نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس مہلت دینا چاہیئے اس وقت تک کہ اسے کشائش ہو اور اگر خیرات کرو یعنی قرضہ معاف ہی کر دو تو بہتر ہے[3] کشائش میں یہ بھی ہے کہ خود اس کے پاس پیشہ ہو اور یہ بھی ہے کہ اس صورت میں کہ جب حکومت شرعیہ قائم ہو اس کی اطلاع حاکم شرع تک پہنچے اور وہ بیت المال سے زکوٰۃ کی جو مد قرض داروں کے لئے ہے اس سے اس قرضہ کو ادا کر دیں بشرطیکہ وہ قرضہ جائز مصرف کے سلسلہ میں ہو جس کی احادیث اہل بیتؑ میں تصریح ہے[4]۔

وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِيۡهِ اِلَى اللّٰهِ ۖ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۱﴾

"اور بچاؤ کی فکر کرو اس دن سے جس میں اللہ کی طرف پلٹائے جاؤ گے پھر ہر ایک نے جو کچھ کمایا ہے وہ اسے پورا پورا پہنچا دیا جائے گا اور ان کی حق تلفی نہیں ہوگی۔"

"اس دن سے بچاؤ کی فکر کرو" یعنی اس دن کے اُن خطرات سے جو بد اعمال لوگوں کو درپیش ہوں گے۔ اور وہ بچاؤ کی فکر یہی ہے کہ انسان حسنِ عمل کا پابند رہے[5]۔

"اس دن ہر ایک نے جو کمایا ہے وہ اسے پورا پورا پہنچا دیا جائے گا" براہ راست تو انسان جو کماتا ہے یعنی جو ذخیرہ فراہم کرتا ہے وہ اعمال کا ہے اس صورت میں "وہ پورا پہنچا دیا جائے گا" کے معنی یہ ہیں کہ اس کی جزا یا سزا اسے پہنچا دی جائے گی اور بالواسطہ اس جزا و سزا کو خود اپنے اعمال کے ذریعہ سے انسان اپنے لئے کماتا ہے تو وہ روز قیامت اسے پوری پہنچ جائے گی۔ اس میں ذرہ بھر کمی نہیں ہوگی[6]۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا تَدَايَنۡتُمۡ بِدَيۡنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكۡتُبُوۡهُ ؕ وَلۡيَكۡتُبۡ

---

[1] ۔ کان ھی التی تسمیٰ تامۃ بمعنی وجد الشئی (نیشاپوری) ان وقع فی غرمائکم ذو اعسار (صافی)

[2] ۔ ای فالذی تعاملون بہ نظرۃ الی میسرہ (مجمع) والتقدیر فالحکم او فالامر نظرۃ (نیشاپوری)

[3] ۔ تصدقوا علیہ بما لکم علیہ (صافی) اگر خیرات میں وہ قرض اسی کو دے ڈالو تو بہتر ہے (تاج العلماء)

[4] ۔ من المیسرۃ ان یصل خبرہ الی الامام فیقضی عنہ من سھم الغارمین اذا کان انفق الذین بالمعروف کما اسند فی الکافی عن الرضاؑ وارسلہ فی مجمع البیان عن الباقرؑ (بلاغی)

[5] ۔ المراد اتقاء ما یحدث فیہ من الشدائد والاھوال فاتقاء ذلك لایمکن الا بالاجتناب المعاصی (نیشاپوری)

[6] ۔ قیل فیہ وجھان احدھما توفی جزاء ما کسبت من الاعمال والثانی توفی ما کسبت من الثواب والعقاب (مجمع البیان) توفیتہ باعتبار توفیۃ جزائہ من ثواب او عقاب (البلاغی)

بَّيۡنَكُمۡ كَاتِبٌۢ بِالۡعَدۡلِ ۖ وَلَا يَاۡبَ كَاتِبٌ اَنۡ يَّكۡتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلۡيَكۡتُبۡ ۚ
وَلۡيُمۡلِلِ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَـقُّ وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبۡخَسۡ مِنۡهُ شَيۡـــًٔا ‌ؕ فَاِنۡ كَانَ
الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَـقُّ سَفِيۡهًا اَوۡ ضَعِيۡفًا اَوۡ لَا يَسۡتَطِيۡعُ اَنۡ يُّمِلَّ هُوَ فَلۡيُمۡلِلۡ وَلِيُّهٗ
بِالۡعَدۡلِ‌ ؕ وَاسۡتَشۡهِدُوۡا شَهِيۡدَيۡنِ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ‌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ
فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰٮهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰ
ٮهُمَا الۡاُخۡرٰى‌ ؕ وَلَا يَاۡبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوۡا ‌ؕ وَلَا تَسۡـــَٔمُوۡۤا اَنۡ تَكۡتُبُوۡهُ
صَغِيۡرًا اَوۡ كَبِيۡرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَاَقۡوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدۡنٰٓى اَ
لَّا تَرۡتَابُوۡٓا اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيۡرُوۡنَهَا بَيۡنَكُمۡ فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ
جُنَاحٌ اَ لَّا تَكۡتُبُوۡهَا ‌ؕ وَاَشۡهِدُوۡۤا اِذَا تَبَايَعۡتُمۡ ۖ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا
شَهِيۡدٌ ؕ وَاِنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاِنَّهٗ فُسُوۡقٌ ۢ بِكُمۡ‌ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ‌ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ‌ ؕ وَاللّٰهُ
بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۲۸۲﴾

"اے ایمان لانے والو! جب کسی مقررہ مدت کے لئے آپس میں قرض کا لین دین کرو[۱] تو اسے تحریر میں لے آیا کرو اور چاہیئے کہ کوئی لکھنے والا تمہارے درمیان منصفانہ شرائط کی تحریر لکھے اور کسی کاتب کو جیسے کہ اللہ نے علم کی دولت اسے عنایت کی ہے[۲] لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیے لہذا چاہیے کہ وہ لکھ دے اور جس کے اوپر قرضہ سے حق عائد ہورہا ہے اسے چاہیے کہ مضمون تحریر لکھوادے[۳] اور اپنے پروردگار کا خوف دل میں رکھے اور اس میں سے[۴] کچھ کم نہ کرے۔ اب اگر وہ شخص جس پر حق عائد ہورہا ہے کم عقل ہو یا کمزور یا یہ کہ وہ خود نہیں لکھوا سکتا تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ مضمون لکھوائے اور اپنی جماعت کے مردوں میں سے دو گواہوں کی گواہی کرا لو۔ اگر

---

[۱]۔ ای تعاملتم و داین بعضکم بعضا (مجمع البیان)

[۲]۔ مثل ما علمه الله من کتبه الوثائق (صافی) جیسا کہ خدا نے اسے سکھایا ہے (تاج العلماء) ولا یأب ان ینفع الناس بکتابه کما نفعه الله بتعلیمه (صافی)

[۳]۔ ٹھیک ٹھیک مطلب لکھا جائے (تاج العلماء)

[۴]۔ من الحق او مما املی علیه (صافی)

دو مرد ورنہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے جو تمہاری نظر میں درست ہوں [1] تا کہ ان دونوں میں سے ایک اگر بھولے تو ان میں سے ایک دوسرے کو یاد دلا دے اور گواہوں کو جب بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں اور چھوٹا یا بڑا کوئی بھی معاملہ ہو جس میں کوئی میعاد مقرر ہو اس کے لکھنے سے اکتاؤ نہیں یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی صورت ہے اور گواہی کے لئے زیادہ ٹھیک انتظام ہے اور اس کا زیادہ سامان ہے کہ شک وشبہ میں نہ پڑو [2] سوا اس صورت کے کہ کوئی نقدا نقد خرید وفروخت ہو [3] جسے تم اپنے درمیان وقتاً فوقتاً کرتے ہو تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں کہ اسے نہ لکھو اور جب کوئی خرید وفروخت کرو تو گواہ کرلو اور کاتب یا گواہ کو کوئی نقصان پہنچایا جانا نہ چاہیے اور اگر تم نے ایسا کیا تو وہ تمہارا نافرمانی کرنا ہوگا اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔"

معاملات باہمی کے متعلق احکام:

قرآن مجید خالق کا کلام ہے۔ خالق کی حیثیت فقط حاکم کی تو نہیں بلکہ حقیقی مُربی کی حیثیت ہے۔ اس لئے اس کی طرف کے احکام سب قانونی پابندیوں کی حیثیت سے نہیں ہوا کرتے بلکہ حکیمانہ فہمائشوں کے طریقہ پر بھی ہوتے ہیں یہ کبھی انداز کلام سے اور کبھی دوسرے دلائل سے پتہ چلتا ہے کہ ان احکام کی حیثیت کیا ہے۔ چنانچہ یہاں پر جو احکام ہیں وہ زیادہ تر ایسی ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان احکام کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کی مخالفت سے بس نقصان کا اندیشہ ہے لیکن گناہ کوئی بھی نہیں۔

حاکمانہ اور حکیمانہ دو قسم کے احکام:

مثلاً ان احکام میں پہلا ہی یہ حکم ہے کہ اگر کوئی قرضہ کی لین دین کرو تو اسے لکھ لو۔ اگر یہ حاکمانہ حکم ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر تحریری قرض کی معاملت باطل ہوتی اور ترک تحریر پر انسان گناہ گار ہوتا مگر یہاں ایسا نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا قرضہ آدمی آپس کے اعتبار پر دے دے یا لے لے کچھ لکھا پڑھی نہ کرے تو باوجود یکہ اس حکم قرآنی کی مخالفت ہے پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ معاملت باطل یا ناجائز ہے۔ بے شک نقصان کا اندیشہ ضرور ہے [4]۔ اگر بعد میں آپس میں جھگڑا ہوگیا اور محکمہ عدالت میں بات پہنچی تو بہت ممکن ہے وہاں ثبوت بہم نہ پہنچے اس طرح وہ قرضہ سوخت ہوجائے اور انسان کو اس حکم پر عمل نہ کرے سے اتنا بڑا نقصان اٹھانا پڑ جائے۔ یہ اس وقت نہ ہوتا جب تحریر ہوتی اور گواہیاں ہوتیں جس کا قرآن نے حکم دیا تھا۔

ان احکام میں بعض ایسے ہیں کہ موجودہ دور میں ایسا معلوم ہوگا کہ یہ تو کوئی خاص کہنے کی بات نہیں مگر یہ ہم اپنے اس وقت کے معیار تمدن

---

[1]۔ یعنی ممن ترضون دینه وامانته وصلاحه وعفّته وتیقظه فیما یشهد به (صافی)

[2]۔ اقرب ان لاتشکوا (صافی)

[3]۔ حالّةً یداً بید (مجمع البیان)

[4]۔ یہ پہلی شرط ہے، احتیاط کے لیے نہ کہ وجوب شرعی کے طور پر (حواشی تاج العلماء)

اور سطح ذہنی کے لحاظ سے کہتے ہیں۔اس وقت کے معاشرہ پر غور کیجئے جب عوام زیادہ تر لکھنے پڑھنے سے بے بہرہ تھے۔اب بھی دیہاتوں میں دیکھئے یا بے چاری ان پڑھ عورتوں کے یہاں دیکھئے ہوسکتا ہے کہ صاحب معاملہ لکھنے کو کچھ کہے اور کاتب اپنے مفاد سے اس میں کچھ گھٹا بڑھادے۔اس کے علاوہ دوسری صورت یہ ہے کہ کاتب صاحب نازنخرے کریں کہ میں تو نہیں لکھتا تو اس کے لئے کہا جارہا ہے کہ یہ کتابت کا علم حاصل ہونا بھی تو اللہ کی ایک نعمت ہے۔اس نعمت کی قدر یہی ہے کہ دوسروں کے کام میں صرف ہو لہٰذا اسے لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔بے شک یہ بھی ایک نصیحت ہی ہے کوئی حکم لزومی نہیں ہے کہ اس پر لکھنا واجب ہی ہوا اور انکار حرام ہو[1]۔

مگر یہ جو ہدایت ہے کہ وہ اسی طرح لکھے جس طرح اسے بتایا جارہا ہے یہ بس اخلاقی ہدایت ہی نہیں ہے بلکہ یہ دوسرے ادلّہ کے ماتحت حاکمانہ پابندی ہے کہ اسے ایسا جائز نہیں ہوگا کیوں کہ یہ تو خیانت اور کسی ایک کے ساتھ ظلم ہے لہٰذا اس سے پرہیز حکماً واجب ہے۔

دستاویز کے مضمون کو وہ بولے جس پر حق عائد ہورہا ہے یعنی جو قرض لے رہا ہے[2] اب یہ پھر حکیمانہ ہدایتیں شروع ہوگئیں۔وہ بولے اس لئے کہ دستاویز سے پابند تو وہی بنایا جارہا ہے۔پھر یہ کہ گواہ زبان سے اس کا اقرار سن لیں گے تو انہیں گواہی دینے میں آسانی ہوگی۔

اب وہ اگر اس سے قاصر ہے۔یہاں قرآن نے تین الفاظ صرف کی ہیں۔۱۔سفیہ،۔۲۔ضعیف اور۔۳۔وہ کہ جو خود مضمون بول کرنہ لکھوا سکے۔یہ اس لئے ہے کہ یا تو اس شخص میں فطری یا عارضی بہر حال قدرتی مجبوری کوئی نہیں ہے مگر اپنی حماقت سے وہ ایسا ہے کہ مال کے بارے میں اس کی سوجھ بوجھ کچھ نہیں ہے اور یا وہ قدرۃً مجبور ہے۔اب یہ مجبوری یا تو یہ ہے کہ اس میں عقل وہوش نہیں ہے جیسے صغیر یا سٹھیایا ہوا بوڑھا اور یا سمجھ بوجھ کی کمی نہیں، ہوش وحواس کا فقدان نہیں مگر لکھوا سے وہ معذور ہے جسمانی کمزوری سے کہ وہ بول نہیں سکتا یا اس لئے نہیں لکھوا سکتا کہ وہ زبان سے واقف نہیں ہے وغیرہ وغیرہ[3]۔

گواہوں میں پہلے تو "اپنی جماعت کے مردوں سے" کہہ کر اسلام کو معتبر قرار دیا ہے اور پھر آخر میں یہ کہا کہ "ان گواہوں میں سے جو تمہاری نظر میں درست ہوں" اس سے ان کے وصف وثاقت وعدالت کی طرف اشارہ ہے[4]۔

"ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتوں کا حکم دیتے ہوئے اس کی جو حکمت بتائی ہے کہ اگر ان میں کوئی ایک بھولے تو دوسری یاد دلادے" یہ کھلا ہوا اشارہ عورتوں کے نقصان عقل کی طرف ہے کہ ان کے دھوکا کھانے اور بھولنے کا زیادہ امکان ہے[5]۔

اب یہ عصر حاضر کے ترقی پسند افراد کو کتنا ہی ناپسند ہو مگر کیا کیا جائے کہ وہ حدیث نہیں ہے جسے ضعیف کہہ کر ٹال دیا جائے بلکہ قرآن کی

---

[1]۔النھی ھنا للکراھة (البلاغی)

[2]۔یعنی المدیون یقر علیٰ نفسه بلسانه لیعلم ما علیه (مجمع البیان)

[3]۔ سفیھا مبذّرا ــــــ او ضعیفا لصغرا و کبرا ولا یستطیع ــــــ لحباس او جھل باللغة ونحو ذلك (جلالین) فی التھذیب عن الصّادق علیہ السلام السفیه الذی یشرّ الدرھم باضعافه والضعیف الابله (صافی) مثلاً سٹھرا بہترا اور سٹھیایا ہوا ہو یا گونگا تو تلا یا قیدی ہو کہ لکھنے والے کے پاس نہ آسکے (تاج العلماء)

[4]۔ای ممّن یرضاھم النوع فی الشھادة ویرکن الیٰ شھادتھم لاجل اتصافھم بالصلاح والعدالة (البلاغی)

[5]۔لان نوع النساء ابعد عن ضبط ھذه الامور من نوع الرجال (البلاغی)

آیت ہے جس کا انکار بغیر انکار اسلام کے ممکن نہیں ہے۔

ایک صاحب عجیب دور کی کوڑی لائے ہیں کہ انہوں نے فتذکر کے لفظ کو ذکر بمعنی یاد سے نہیں بلکہ ذکر سے لیا ہے جو مرد کے معنی ہیں ہے۔ اس طرح فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰىهُمَا الۡاُخۡرٰى کے معنی یہ ہوں گے کہ ان دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ملنا انہیں مذکر یعنی مرد بنا دے مطلب وہی ہوگا کہ دونوں مل کر ایک مرد کی قائم مقام ہو جائیں مگر یہ معنی اس لفظ کے سننے سے اس مقام پر ذہن میں آتے نہیں ہیں[1] ۔

لکھنے کی تاکید کے ساتھ تین فقرے ارشاد ہوئے ہیں: یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی صورت ہے۔

''گواہی کے لئے زیادہ ٹھیک انتظام ہے'' اور ''اس کا زیادہ سامان ہے کہ شک وشبہ میں نہ پڑو'' اس میں کتابت کے تین فوائد کا ذکر ہے۔ پہلے دینی فائدہ کہ اس طرح اللہ کے یہاں تمہاری بری الذمہ ہونے کا زیادہ امکان ہے تو اس کے یہاں کی جواب دہی سے محفوظ رہو گے۔ دوسرے دینوی فائدہ اجتماعی اعتبار سے کہ جب باہمی نزاع ہو تو ثبوت موجود ہوگا اور رفع نزاع ہو جائے گی۔ تیسرے شخصی فائدہ بجائے خود اپنے ذہن کے لئے سکون کی صورت سے کہ بعض وقت بعد میں خود انسان بھول جاتا ہے کہ کتنا قرضہ تھا تو اگر کم دیتا ہے تو اس کے بعد میں فرض شناس ذہن میں یہ بے چینی رہتی ہے کہ ہم ابھی دیندار تو نہیں ہیں وار اگر زیادہ دے دیا تو یہ کوفت رہتی ہے کہ کہیں وہ زیادہ تو نہیں لے گیا۔ یہ بات اس وقت نہ ہوگی جب لکھا ہوا موجود ہو[2] ۔

چھوٹی چھوٹی چیزوں کی نقد خرید وفروخت جہاں ایک ہاتھ کا دینا اور ایک ہاتھ کا لینا ہوتا ہے وہاں لکھنے پڑھنے کی ضرورت نہیں مگر یہیں پھر کہا ہے کہ اگر کوئی بیع وشراء کرو تو گواہیاں کرالو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بڑی چیز جیسے مکان اور زمین وغیرہ کی معاملت ہو تو چاہے نقد ہو اس میں دستاویز ہو جانا مناسب ہے تاکہ بعد میں جھگڑا نہ ہو۔

آخر میں جو دو الفاظ ہیں: وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ۔ یہ ہمارے خیال میں دونوں قسم کے احکام کے لحاظ سے ہیں۔ ''اللہ سے ڈرو'' یہ ان احکام کے لحاظ سے ہے جو حاکمانہ ہیں جیسے یہ کہ کاتب لکھنے میں خیانت نہ کرے دوسرے لوگ کاتب اور گواہ پر دباؤ نہ ڈالیں اور ضرر رسانی کے لئے تیار نہ ہوں وغیرہ اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے یہ دوسرے احکام کے لحاظ سے ہے جو حکیمانہ ہیں[3] ۔

ہمارے مشہور قدیم مفسر علی بن ابراہیم قمیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ سورہ بقر میں پانچ سو احکام ہیں اور پندرہ حکم صرف اس ایک آیت میں ہیں (مجمع البیان)

یہ آیت قرآن مجید کی سب سے طولانی آیت ہے اور مختصر ترین سورہ رحمٰن میں مدھآمتان ہے جو صرف ایک لفظ کی ایک آیت ہے۔

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمۡ تَجِدُوۡا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقۡبُوۡضَةٌ ؕ فَاِنۡ اَمِنَ بَعۡضُكُمۡ بَعۡضًا فَلۡيُؤَدِّ الَّذِى اؤۡتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكۡتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ

---

[1] ۔لا یخفی ما فیہ من التعسّف (نیشاپوری)

[2] ۔فما احسن ھٰذہ الفوائد وما ادخلھا فی الضّبط والترتیب (نیشاپوری)

[3] ۔اتقوا اللہ فی مخالفۃ امرہ ونھیہ ویعلّمکم اللہ احکامہ المتصتمّنۃ لمصالحکم (صافی)

وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

''اور اگر تم سفر میں ہو اور تمہیں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو رہن با قبضہ رکھو[1] اگر تمہیں ایک دوسرے کا اعتبار ہو تو پھر جس کا اعتبار کیا گیا ہو اسے اپنی امانت داری کا فرض ادا کرنا چاہیے اور اپنے پروردگار کے غضب سے بچنا چاہیے اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو اسے چھپائے گا تو بلاشبہ اس کا دل گنہگار ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کا جاننے والا ہے۔''

رہن کا حکم:

واضح ہونا چاہیے کہ رہن بغیر سفر کے یوں اپنے شہر میں رہ کر بھی درست ہے۔ یہاں جو کہا جا رہا ہے کہ اگر تم سفر میں ہو اس کا مطلب رہن کے اصول کو کہ وہ سفر ہی میں ہوتا ہے بیان کرنا نہیں ہے بلکہ کتابت جو ایک باعث اطمینان شے تھی جس صورت میں دشوار ہے اس کا بیان کرتے ہوئے اب ایک دوسرے اطمینان کے ذریعہ کو بتایا جا رہا ہے لہٰذا یہ اطمینان کا ذریعہ اگر کوئی حالت حضر میں اختیار کرنا چاہیے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں[2]۔

اس کی نظیر قرآن مجید میں دوسری جگہ یہ ہے کہ:۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا.

اور جب سفر کرو تو تمہارا کوئی حرج تو نہیں ہے کہ تم نماز میں قصر کیا کرو اگر تمہیں خوف ہے کہ کافر لوگ تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔ (نساء۔۱۰۱)

یہاں قصر کا باعث پہلے سفر کو بتایا ہے۔ پھر خوف کا ذکر کیا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ سفر جس میں خوف نہ ہو باعث قصر نہیں ہے بلکہ ان دونوں چیزوں میں سے ہر ایک ہی قصر کا موجب ہے خواہ سفر ہو اور خواہ خوف[3]۔

اس کے بعد رہن میں جو قبضہ کی قید لگائی ہے اس سے بظاہر تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ رہن کی صحت میں قبضہ ضروری چیز ہے۔ ہمارے یہاں حدیث معصومؑ بھی اس کی تائید میں ہے اور علماء کے اجماع کا دعویٰ بھی ہوا ہے[4] مگر بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ یہاں قبضہ کا تذکرہ اس لئے ہے کہ حالت سفر میں جب تحریر ممکن نہیں ہے تو قبضہ ہی اطمینان کا ذریعہ ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ رہن بغیر قبضہ درست نہیں ہے۔ بہرحال یہ مسئلہ کسی حد تک اختلافی ہے جس کا علم فقہ سے تعلق ہے۔

اب اگر اعتبار رکھتا ہے ایک دوسرے پر جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی شے کہ رہن کی ضرورت محسوس نہیں کی اور یوں ہی اعتبار پر قرض دے دیا

---

[1]۔ بيّنت السنة جواز الرهن في الحضر ووجود الكاتب والتقييد بما ذكر لان التوثق فيه اشد (جلالین)

[2]۔ ليس الغرض تخصيص الارتهان بحال السّفر بل لما كانت مظنّة اعواز الكتب والاشهاد وامر المسافر بان يقيم الارتهان مقام الكاتب والاشهاد على سبيل الارشاد الى حفظ المال (صافی)

[3]۔ وليس الخوف من شرط جواز القصر (نیشاپوری)

[4]۔ في الكافي عن الصادق عليه السلام لا رهن الّا مقبوضا (صافی) فان لم يقبض لم ينعقد الرهن بالاجماع (مجمع البیان)

تو اب اس شخص کا جس پر اعتبار کیا گیا دینی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ اس اعتبار سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے اور بد دیانتی سے کام نہ لے۔
یہ ہے جو آخر میں کہا گیا ہے کہ جس کا اعتبار کیا گیا ہے اسے اپنی دیانت داری کا فرض ادا کرنا چاہیے۔ ورنہ وہ دنیا میں چاہے اپنے قرضہ کا ثبوت پیش نہ کر سکنے کی وجہ سے شکست کھا جائے اور یہ اسے چکمہ دے کر نکل جائے اور محفوظ رہے مگر اللہ کو تو اپنے علم میں کسی دستاویز کی ضرورت نہیں ہے وہ تو جانتا ہی ہے کہ کس نے کیا کیا لہٰذا اسے عذاب الٰہی سے ڈرتے رہنا لازم ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الۡاَرۡضِ ؕ وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِيۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡهُ يُحَاسِبۡكُمۡ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغۡفِرُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۲۸۴﴾

”اللہ سے مخصوص ہے [۱] جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور چاہے تم ظاہر کرو اسے جو تمہارے دلوں میں ہے اسے چھپاؤ اللہ اس کا تم سے حساب لے لے گا اور پھر جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

دل کی بات پر مواخذہ یہاں قصد و ارادہ عمل کے معاف ہونے نہ ہونے کی بحث ہے جس پر جناب شیخ مرتضیٰ انصاریؒ نے رسائل میں بسیط تبصرہ فرمایا ہے اور آخر میں نتیجہ یہ نکالا ہے کہ بعض صورتوں میں نیت پر عذاب ہے اور بعض میں نہیں ہے۔ بعض مفسرین بھی اس آیت کے ذیل ہیں اس پہلو کی طرف متوجہ ہوئے ہیں [۲]۔
ممکن ہے یہ ارشاد الٰہی کہ جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا اسی تفریق پر منطبق ہو اس لئے کہ یہ پہلے بھی ہم ایک جگہ واضح کر چکے ہیں کہ اللہ کا کوئی چاہنا بلا وجہ نہیں ہوتا۔ وہ جسے بخشا چاہتا ہے اس میں کوئی وجہ استحقاق مراعات کی ہوتی ہے اور جسے بخشا نہیں چاہتا وہ اس کی عدم اہلیت کی وجہ سے ہوتا ہے لہٰذا وہ تمہارے دل کی باتوں کا حساب لے گا یعنی ان کی نوعیت دیکھے گا کہ کون بخشنے کے لائق ہیں اور کون نہیں ہیں اور پھر جسے چاہے گا بخش دے گا۔ یہ وہی اقسام نیت کے ہیں جن کے متعلق دوسرے دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ معفو قرار دیے گئے ہیں اور جسے چاہیے گا سزا دے گا یہ وہ اقسام نیت کے ہیں جن میں مواخذہ اخروی ثابت ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫

[۱]۔ خلقاً وملکاً (صافی) اللام لام الملك (مجمع البیان)

[۲]۔ فی نہج البلاغہ وبما فی الصدور یجازی العباد اقول لا یدخل فیما یخفیہ الانسان الوساوس وحدیث النفس ــــــ ولکن ما اعتقدو عزم علیہ (صافی)

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ﴿٢٨٥﴾

"ایمان لائے ہیں پیغمبر اس پر کہ جو ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا اور مومنین سب، ہر ایک ایمان رکھتا ہے، اللہ اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر [۱] ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفرق نہیں کرتے اور ان کا قول ہے کہ سنا ہم نے اور مانا ہم نے تیری بخشش درکار ہے [۲] اے ہمارے پروردگار اور تیری ہی طرف رجوع ہونا ہے۔"

یہود حضرت موسیٰؑ تک مانتے ہیں حضرت عیسیٰؑ کو نہیں مانتے اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ تک مانا وار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ مانا مگر مسلمانوں کی شان یہ ہے کہ:

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

یہ اس رسول پر جو کچھ نازل ہوا سے بھی مانتے ہیں اور جو کچھ پہلے نازل ہوا اسے بھی مانتے ہیں۔

ان کے یہاں یہ نہیں ہے کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں اسی کو کہا جا رہا ہے کہ ہم مرسلین میں تفریق کے مرتکب نہیں ہوتے [۳]۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ۚ أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٨٦﴾

"اللہ کسی پر ذمہ داری عائد نہیں کرتا مگر اس کی وسعت کے اندر [۴] اسے نفع ہوگا اس کا جو وہ کرے اور اسے نقصان پہنچے گا اس کا جو وہ کرے، پروردگارا! ہماری گرفت نہ کرنا اگر بھول جائیں ہم یا چوک جائیں ہم، پروردگارا! اور ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا اُن پر ڈالا تھا جو ہم سے پہلے تھے اور پروردگارا! ہم پر ایسا بار نہ رکھنا جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اور ہمیں معاف کر اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر تو ہمارا مالک ہے تو کافروں کے مقابلہ ہماری مدد فرما۔"

---

[۱] ۔ای یقولون (مجمع البیان)

[۲] ۔ اغفر غفرانك اونطلب غفرانك (صافی) نسألك غفرانك (مجمع البیان)

[۳] ۔ فنؤمن ببعض ونكفر ببعض كما فعل اليهود والنصارىٰ (جلالین)

[۴] ۔ الوسع مادون الطاقة (مجمع البیان) مایسعه قدرتها (صافی) اس کے بوتے بھر (تاج العلماء)

شریعت اسلامی کی خصوصیت:

خالق نے اس امت پر یہ کرم فرمایا ہے کہ اسے شریعت سہلہ کے ساتھ مکلف فرمایا ہے جس میں بہت رعایتیں موجود ہیں۔ اس لئے بصورت دعا جن چیزوں کو پیش فرمایا ہے وہ خالق کے کیے ہوئے فیصلہ کو اپنے دل کی آواز بنانا ہے جو مقتضائے عبودیت ہے[۱]۔

نہ کہ یہ باتیں حاصل نہیں ہیں اور اب دعا کرکے ان کے حصول کی کوشش کی جارہی ہے[۲]۔

ہاں بعض احادیث میں جو معصومین علیہم السلام سے منقول ہیں یہ ہے کہ یہ سب التجائیں ہمارے پیغمبرؐ نے معراج میں بارگاہ الٰہی میں پیش کی تھیں اور یہ ان دعاؤں کی قبولیت ہے جو شریعت سہلہ کی صورت ہمارے سامنے ہے۔

اس آیت میں مولیٰ کے معنی صاف آقا و مالک کے ہیں مگر من کنت مولاکی بحث خلاف امیرالمومنینؑ کے نص کو مشکوک بنانے کے لئے مولی کے معنی دوست کے جو قرار دیے گئے تو وہ ذہن میں اتنا رس بس گئے کہ شاہ رفیع الدین صاحب نے یہاں بھی ترجمہ کردیا تو ہے دوست دار ہمارا حالانکہ خود ان کے والد شاہ ولی اللہ صاحب یہ ترجمہ کرچکے تھے کہ تو ئی خداوند ما اور جلالین میں ہے۔

مولانا سیدنا ومتولّی امورنا: تو ہمارا سردار اور ہمارے امور کا ذمہ ہے۔

اور یہی معنی بالکل درست و مناسب ہیں۔

---

[۱]۔ انہ علی سبیل التعبد وان کان تعالیٰ لا یکلف ولا یحمّل احدا ما لا یطلیقہ (مجمع البیان)

[۲]۔ فسئو الہ اعتراف بنعمۃ اللہ (جلالین)

سُوۡرَۃُ اٰلِ عِمۡرَانَ

مدنیہ-----۲۰۰ آیات

آغاز سورۂ آل عمران:

چوں کہ آل عمران کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس سورہ میں ہے جو یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعۡضُهَا مِنۡۢ بَعۡضٍ‌ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۚ‏ ﴿۳۴﴾ اِذۡ قَالَتِ امۡرَاَتُ عِمۡرٰنَ رَبِّ اِنِّىۡ نَذَرۡتُ لَـكَ مَا فِىۡ بَطۡنِىۡ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلۡ مِنِّىۡ ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۳۵﴾

پھر یہ سلسلہ کئی آیتوں تک چلا گیا ہے اس لئے اس سورۃ کا نام ''آل عمران'' ہوا۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں جو خاص مضامین ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

اس سورۂ کے خاص مضامین:

۱------آیات قرآن میں محکمات و متشابہات کی تفریق۔

۲------راسخین فی العلم کا امتیاز۔

۳------جنگ بدر کی روئداد۔

۴------عدالت کا اصول دین میں ہونا۔

۵------دین حقیقی اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔

۶------حکم تقیہ۔

۷------محبت الٰہی اور اتباع رسولؐ۔

۸------جناب مریمؑ کی ولادت وغیرہ کے حالات۔

۹------جناب زکریاؑ کی دعا اور اس کی قبولیت۔

۱۰------حضرت عیسیٰؑ کی ولادت اور ان کے معجزات۔

۱۱------حوارین عیسیٰ کا تذکرہ۔

۱۲------جناب عیسیٰؑ کا آسمان پر اٹھایا جانا اور ان کے متبعین کا غلبہ۔

۱۳------عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے کی رد

۱۴--------مباہلہ
۱۵--------اہل کتاب کومشترکہ اصول پر متحد ہونے کی دعوت
۱۶--------دین ابراہیمؑ کی تشریح
۱۷--------یہود ونصاریٰ کا کردار
۱۸--------پیغمبروں سے عہد ومیثاق
۱۹--------اسلام میں نجات کا انحصار
۲۰--------قبولیت خیرات کی شرط
۲۱--------خانہ کعبہ کا امتیاز
۲۲--------مقام ابراہیمؑ
۲۳--------فرضیت حج
۲۴--------مخالفت نص کرنے والوں کا انجام
۲۵--------خیرِ اُمت
۲۶--------یہود کے متعلق پیشین گوئی
۲۷--------بعد وفات رسولؐ ارتداد اختیار کرنے پر انتباہ
۲۸--------غزوۂ اُحد کا عبرت ناک مرقع
۲۹--------حیات شہداء اور اس کے تفصیلات
۳۰--------مانعین زکوٰۃ کا عذاب وغیرہ وغیرہ

ایک روایت یہ ہے کہ سورہ آل عمران کا ابتدائی حصہ آیہ مباہلہ تک پورا جو اسی آتیوں سے زیادہ پر مشتمل ہے، نصارائے نجران سے جو تحقیق مذہب اسلام اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بحث کے لئے آئے تھے بحث ومباحثہ کے سلسلہ میں اترا ہے [1]۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

"سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے"

الٓمّٓ ۝۱ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الۡحَىُّ الۡقَيُّوۡمُ ۝۲ نَزَّلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا

[1]۔ نقل المفسرون انه قدم علی رسول اللہ ﷺ وفد نجران فانزل اللہ فی ذلك اوّل سورة آل عمران الی بصنع وثمانین اٰیة منها اية المباهلة (نیشاپوری)

لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۳﴾ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴﴾

"الف لام۔ میم۔ اللہ نہیں کوئی خدا سوا اس کے جو زندہ ہے بندوبست کرنے والا[1]۔

اس نے آپ پر یہ کتاب اتاری[2] حق کے ساتھ تصدیق کرتی ہوئی اس کی جو اس کے پہلے سے موجود ہے اور اس نے اتاری توریت اور انجیل اس کے پہلے سراسر ہدایت بنا کر لوگوں کے لئے، اور اُتارا فیصلہ کن کلام[3] بلاشبہ جنہوں نے اللہ کی نشانیوں کے ساتھ کفر اختیار کیا ان کے لئے بڑا سخت عذاب ہے اور اللہ زبردست ہے بڑی سخت مکافات والا ہے[4]۔"

شروع میں جو حروف میں وہی سورہ بقرہ کی ابتداء والے جنہیں مقطعات قرآنیہ کہتے ہیں اور وہاں ان کے متعلق لکھا جاچکا ہے کہ یہ قدرت کے راز ہیں جنہیں سوا اللہ و راسخین فی العلم کے کوئی اور نہیں جانتا[5]۔

اس کے بعد کی آیت وہ ہے جس سے اسی پارے کے ابتدائی حصہ میں آیۃ الکرسی کا آغاز ہوا ہے۔ اس کی شرح وہاں ہو چکی ہے۔

"یہ کتاب اس کی جو اس کے پہلے تھا تصدیق کرنے والی ہے" اس معنی سے بھی کہ پہلے کی کتابوں میں اس رسولؐ اور اس شریعت کی خوش خبری دی گئی تھی لہٰذا اب اس رسولؐ اور اس شریعت کا آجانا ان سب کی مسیحائی کا ثبوت ہے اور اس معنی سے بھی کہ اصول دین تمام انبیاء کے تعلیمات میں مشترک ہیں لہٰذا یہ کتاب وہی بتارہی ہے جو آدمؑ سے لے کر اب تک تمام انبیاء بتاتے رہے اور اس لحاظ سے بھی کہ اس کی تعلیم یہ ہے کہ گزشتہ تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے اور جب ان انبیاء کی تصدیق لازم ہوئی تو ان کتب و شرائع کی بھی تصدیق ہوگئی جو ان انبیاء پر نازل ہوئے تھے۔

ما بین یدیہ یعنی جو اس سے پہلے تھا اس میں اصل توریت اور انجیل بھی داخل تھی مگر ان دو کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہو گیا اس لئے کہ مدینہ اور اس کے اطراف میں ان کے ماننے والوں کا دور دورہ تھا۔ پھر جیسا کہ پہلے بیان ہوا بعض روایات کے مطابق اس سورہ کے شروع والے بڑے حصہ کی تنزیل ہی جماعت تصدیق سے مذہبی بحث و مباحثہ کے سلسلہ میں ہوئی تھی تو ان کی مسلمہ کتابوں کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ مقتضائے حال کے عین مطابق تھا۔

---

[1]۔ سدا برقرار ہے (تاج العلماء)

[2]۔ یعنی القرآن (مجمع البیان)

[3]۔ ما یفرّق بہ بین الحق والباطل (صافی)

[4]۔ انتقام شدید لا یقدر علیٰ مثلہ منتقم (صافی)

[5]۔ اللہ اعلم بمرادہ بذلك (جلالین) علمہا عند اللہ و امناء وحیہ (البلاغی)

اس کتاب کے ساتھ نزل کا لفظ تشدید کے ساتھ اور توریت اور انجیل کے لئے انزل کا لفظ آیا ہے اس سے یہ معنی نکالے گے ہیں کہ قرآن تدریجی طور پر اتارا گیا ہے اور توریت اور انجیل ہر ایک یکجائی طور پر اتاری گئی تھیں[۱]۔ مگر مجھے ابھی تک تنزیل اور انزال کے مصدروں میں خاصیت کے اعتبار سے اس تفرقہ کے ہونے پر اطمینان نہیں ہے جب تک کہ علمائے صرف کی تصریح نہ ملے یا شواہد سے پورے طور پر یہ امتیاز نمایاں نہ ہو حالانکہ بعض جگہ قرآن مجید میں خود اس کتاب کے لئے انزل کا لفظ بھی موجود ہے۔

فرقان کے معنی:

اس کے بعد کہا ہے کہ اس نے فرقان اتارا۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ الفرقان کا لفظ خاص قرآن مجید کے لئے آیا ہے جیسے:

نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا

مگر وہ قرآن کا نام نہیں ہے بلکہ وصف ہے کہ وہ حق و باطل میں تفرقہ کا ذریعہ ہے اس لئے دوسرے پارے میں جس کی تفسیر ہو چکی ہے، حکم صوم کے ذیل میں ارشاد ہوا ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ۔

اب زیر تشریح آیت میں قرآن مجید کا ذکر اگر پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو ہم یہ سمجھتے کہ الفرقان سے قرآن ہی مراد ہے مگر چوں کہ الکتاب کے لفظ سے قرآن کا ذکر توریت وانجیل کے پہلے ہو چکا ہے، اس لئے اس الفرقان یعنی تفرقہ حق وباطل کی تشریح معجزہ کے ساتھ کی گئی ہے[۲] اور توریت وانجیل کے علاوہ پہلے تمام آسمانی کتابوں کے ساتھ بھی یعنی خصوصیت کے ساتھ قرآن اور توریت وانجیل کا ذکر کر کے خالق کا ارشاد ہے کہ کتابیں بھی ہم نے اتاریں جو امتیاز حق وباطل کا ذریعہ تھیں[۳]۔

مگر احادیث اہل بیت علیہم السلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ الفرقان اسی الکتاب یعنی قرآن کا وہ حصہ ہے جو محکمات کی حیثیت رکھتا ہے اور جسے اصول وقواعد دین کا ماخذ قرار دیا گیا ہے[۴]۔

اسی کو دوسری آیت میں جو عنقریب آئے گی ام الکتاب کہا گیا ہے۔ اس صورت میں الکتاب کے بعد اس کا ذکر ویسا ہی بلحاظ اہمیت و خصوصیت ہے جیسے مابین یدیہ اس کے پہلے والی چیزوں کے کہنے کے بعد پھر انزل التورۃ والانجیل کے الفاظ میں دو ۲ کتابوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝۵

---

[۱]۔ نزل عليك الكتب القرآن نجوما ــــــ وانزل التورته والانجيل جملة (صافی)

[۲]۔ فرود آورد معجزہ را (شاہ ولی اللہ)

[۳]۔ ذكر بعد ذكر الثلثه ليعلم ماعداها (جلالین)

[۴]۔ فى الكافى عن الصادق عليه السلام القرآن جملة الكتاب والفرقان المحكم الواجب العمل به وفى الجوامع عنه الفرقان كل اية محكمة فى الكتاب والقمى والعياشى عنه الفرقان هو كلّ امر محكم والكتاب هو جملة القرآن (صافی)

"بلا شبہ اللہ وہ ہے کہ نہیں پوشیدہ ہے اس پر کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں۔"

باعتبار واقعیت زمین اور آسمان کے کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ کائنات کی کوئی شے اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے مگر چوں کہ انسان مشاہدہ میں آسمان اور زمین ہی محیط کل ہیں اس لئے وسعت علم کو دکھانے کے لئے ان کا ذکر کیا گیا[۱]۔

هُوَالَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۶

"وہ وہ ہے جو ماں کے پیٹ میں[۲] تمہاری صورتیں بنا تا ہے جیسی چاہتا ہے، کوئی خدا نہیں سوا اس کے کہ جو زبردست ہے بڑی سوجھ بوجھ والا"۔

یہ صورت گری جو کئی کئی تاریک حجابوں کے اندر ہوتی ہے قدیم اور جدید دار باب تشریح کی تحقیقات کا مرکز رہی ہے اور اب تک اس کے تمام رموز واسرار منکشف نہیں ہوئے ہیں جس کا ایک بہت ہی سطحی مگر حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ ابتدائے خلقت انسان سے اب تک ہر دور کی مردم شماری دیکھئے اور سب کی میزان لگایئے تو وہ اتنا بڑا عدد ہو گا جس کا اظہار شاید ہم اپنے اعداد کے ناموں سے نہ کر سکیں۔

ان بے شمار انسانوں کے چہرے ہاتھ اور پاؤں سب محدود و متعین اعضاء ہیں مگر ان سب کی شکل وصورت اور پھر ہر ایک کے اندر جو نقوش ہیں ان میں کوئی نقش دوسرے سے بالکل متحد نہیں ہے اور چہرے اور تمام اعضاء کے باہمی امتیاز کا کیا ذکر صرف ایک چھوٹے سے جزء یعنی انگوٹھے کے نقوش ایک کے دوسرے سے نہیں ملتے کیا یہ صورت گری حد و دامکان سے باہر کسی قدرت کاملہ کا ثبوت نہیں دیتی؟

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ؔۚ وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۷

"وہ وہ ہے جس نے آپ پر یہ کتاب اتاری، اس میں سے کچھ محکم آیتیں ہیں جو کتاب میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں[۳] اور کچھ متشابہ ہیں جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کے پیچھے لگے رہتے ہیں جو اس میں متشابہ ہے گمراہ

---

[۱]۔عبر عن العالم بہما لان الحس لا یتجاوزھما (صافی)

[۲]۔گھیلیوں میں (تاج العلماء)

[۳]۔اصلہ المعتمد علیہ فی الاحکام (جلالین) اصلہ الذی یرد الیہ غیرھا (صافی)

کرنے کی خاطر [1] اوراس کے دل بخواہ معنی بنانے کی خاطر [2] حالانکہ اس کے اصل معنی کوئی نہیں جانتا سواللہ اور ان کے جوعلم میں جمع ہوئے ہیں [3] کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہرایک ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور نصیحت کا اثرنہیں لیتے مگرعقل والے۔''

آیات قرآن کی دوقسمیں: محکمات اور متشابہات

محکم ومتشابہ اورتفسیر وتاویل پر مبسوط تبصرہ تو ہم نے مقدمہ تفسیر میں کیا ہے۔اس محل پراختصار کے ساتھ اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔
یہاں صاف یہ بتایا جارہاہے کہ اس قرآن میں کچھ محکم آیتیں ہیں اورکچھ متشابہ ہیں مگر دوسری جگہ قرآن میں پورے قرآن کے لئے کہا گیاہے:۔

احکمت ایاتہ: اس کی آیتیں محکم ہیں (ھود۔۱)

اورایک جگہ پوری کتاب کو''متشابہ'' کہا گیاہے:۔

كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۔

متشابہ کتاب بطور مثانی جس سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں ان کے جسم پر جواپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔(زمر۔۲۳)

یہ الفاظ مختلف حیثیتوں سے صرف کیے گئے ہیں۔یہاں جو محکمات اور متشابہات کی تفریق کی گئی ہے وہ الفاظ اوران کے معنی کے لحاظ سے ہے کہ کچھ آیتیں وہ ہیں جن کے بس ایک ہی معنی ہوتے ہیں جنہیں ہرواقف زبان کے ذہن میں آجانا چاہیے اور کچھ آیتیں ہیں جن کے لغت وعرف کے لحاظ سے کئی کئی معنی ہوتے ہیں یا جومعنی اس لفظ کے عام طورپر ہوتے ہیں وہ کسی وجہ سے مرادنہیں لئے جاسکتے اوراس کے علاوہ دوسرے معنی متعدد جگہ ہوسکتے ہیں یا یہ کہ ان الفاظ کے کوئی معنی عام طورپر سمجھ ہی میں نہیں آتے جیسے مقطعات قرآنیہ۔

اور وہ جومحکم کہا گیاہے وہ دلائل حقانیت کے اعتبار سے ہے کہ اس میں کوئی کمزوری نہیں ہے جو اس کے الٰہی کلام ہونے کے اعتقاد میں رخنہ پیدا کرے [4] اور وہ جو متشابہ کہاہے وہ اس لحاظ سے کہ وہ پورا کلام اس مرتبہ پر ہے جو اس کے اعجاز کے شایان شان ہے اور اس اعتبار سے اس کے تمام اجزاء یکساں اورایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں ان میں فرق نہیں ہے [5]۔

الراسخون فی العلم اورعلم تاویل قرآن:

ہمارے یہاں کی زیادہ تر احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ الرسخون فی العلم سے مراد معصومینؑ ہیں اوراس کا عطف الا کے

---

[1]۔طلب ان یفتنوا النّاس عن دینھم لتشکیك والتلبیس (صافی)

[2]۔طلب ان یأولوہ علی ما یشتھونہ (صافی) اس خیال سے کہ انہیں اپنے مطلب پر ڈھال لے جائیں (تاج العلماء)

[3]۔الذین ثبّتوا وتمکنوا فیہ (صافی) ثابت قدمانِ علم (شاہ ولی اللہ) مضبوط لوگ بیچ علم کے (شاہ رفیع الدین) ثابت قدم لوگ ہیں (تاج العلماء)

[4]۔بمعنی انہ لیس فیہ عیب (جلالین)

[5]۔یشبہ بعضہ بعضا فی الحسن والصدق (جلالین)

تحت میں کلمہ اللہ پر ہے جس کے معنی ہوتے ہیں کہ اس کی تاویل بس اللہ جانتا ہے اور وہ جو علم میں جمے ہوئے ہیں۔ اس پر علامہ شیخ جواد بلاغی طاب ثراہ نے عقلی و نقلی حیثیت سے بڑی سیر حاصل بحث فرمائی ہے جس میں طرق اہل سنت سے بھی وہ اخبار آثار درج فرمائے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ تاویل قرآن کا علم اللہ کے خاص بندوں کو حاصل ہوتا ہے اور یہی بندگان خاص وہ ہو سکتے ہیں جو راسخین فی العلم ہیں[1]۔

علامہ نیشاپوری نے لکھا ہے:

هذا قول مجاهد والربيع بن انس واكثر المتكلمين وقد يروى عن ابن عباس ايضا[2]

یہ مجاہد اور ربیع بن انس اور زیادہ تر متکلمین کا قول ہے اور ایک روایت میں ابن عباسؓ کی طرف بھی اس کی نسبت دی گئی ہے۔

یہاں چند احادیث اہل بیت علیہم السلام کے جنہیں صاحب تفسیر صافی نے درج کیا ہے نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) فی الکافی والعیاشی عن الصادق نحن الراسخون فی العلم و نحن نعلم تاویله

کافی اور عیاشی میں امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے فرمایا کہ ہم ہیں راسخین فی العلم اور ہم اس کی تاویل جانتے ہیں۔

دوسری روایت میں اس کے ساتھ ہے:

(۲) فرسول الله افضل الراسخین فی العلم قد علم الله عزوجل جمیع ما انزل علیه من التنزیل و التاویل وما کان الله لینزل علیه شیالم یعلم تاویله واوصیاؤه من بعده یعلمونه کلّه۔

تو راسخین فی العلم میں سب سے افضل رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جنہیں اللہ نے خود علم عطا فرمایا تمام ان چیزوں کا جو آپ پر نازل کی ہیں تنزیل اور تاویل دونوں قسم میں سے اور واللہ ایسا نہیں کہ کوئی شے آپ پر اتارے اور آپ کو اس کی تاویل نہ بتائے اور آپ کے اوصیاء آپ کے بعد اس تمام علم کے حامل ہیں۔

اس حدیث کو علامہ طبرسیؒ نے بھی مجمع البیان میں درج کیا ہے۔

تیسری روایت:۔

(۳) فی الکافی عن الباقر علیہ السلام والراسخون فی العلم من لا یختلف فی علمه۔

کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ راسخین فی العلم وہ ہیں جن کے درمیان اس کے علم میں اختلاف نہیں ہوتا

(۴) احتجاج طبرسیؒ میں امیر المومنین علیہ السلام کی ایک حدیث میں کلام الٰہی کے تین اقسام قرار دیے ہیں ایک جسے عوام اور خواص سب ہی سمجھ لیتے ہیں اور دوسری قسم جسے بس ذہین افراد ذہانت سے سمجھ لیتے ہیں اور اس کے بعد:۔

قسما لا یعرفه الا الله وانبیاؤه والراسخون فی العلم

ایک قسم ہے جسے اللہ جانتا ہے اور اس کے پیغمبر اور وہ جو علم میں راسخ ہیں۔

بے شک نہج البلاغہ میں امیر المومنینؑ کے کلام میں چند فقرات ہیں جن سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لا یعلم تاویله الا الله یہ جملہ ختم

---

[1] ۔آلاء الرحمٰن ص ۲۵۷، ۲۵۸۔

[2] ۔غرائب القرآن ج ا۔

ہوگیا ہے اور **والراسخون فی العلم** کا تعلق بعد والے الفاظ سے ہے اور مدح اسی کی ہے کہ وہ متشابہات کے معنی سمجھنے کے درپے نہیں ہوتے اور کہتے ہیں کہ ہمارا کام بس ایمان لانا ہے۔ محکم اور متشابہ دونوں ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور خالق نے ان کے اس اعتراف عجز ہی کو رسوخ فی العلم سے تعبیر کیا ہے۔ یہ فقرات حسب ذیل ہیں:

اعلم ان الراسخين فی العلم هم الذين اغناهم عن اقتحام السدد المضروبته دون الغيوب الاقرار بجملة ماجهلوا تفسيره من الغيب المحجوب فمدح الله اعترافهم بالعجز عن تناول مالم يحيطوا به علما وسمی ترکهم التعمق فيمالم يکفهم البحث عن کنهه رسوخا.

معلوم ہونا چاہیے کہ علم میں راسخ وہی لوگ ہیں جنہیں غیب کے پردوں میں درّانہ گھسنے سے بے نیاز بنا دیا ہے ان کے اجمالی طور پر اقرار نے ان تمام باتوں کے ساتھ جن کے غیب کے پردہ میں چھپے ہوئے تفصیلات وہ نہیں جانتے تو اللہ نے ان کی مدح کی ہے اس بات پر کہ وہ جن چیزوں کے علم پر حاوی نہیں ہیں ان تک رسائی سے اپنی عاجزی کا اقرار کرتے ہیں اور جس چیز کی حقیقت کی کھوج پر انہیں ما مور نہیں کیا ہے اس میں گہرائی تک پہنچنے کی کوشش نہ کرنے ہی کا نام اللہ نے علم میں راسخ ہونا قرار دیا ہے۔

تعجب ہے کہ ملا محسن فیض نے تفسیر صافی میں اس کلام کو تفسیر عیاشی کے حوالہ سے نقل کرتے ہوئے اسے گزشتہ احادیث کے سلسلہ ہی میں درج کر دیا ہے جیسے کہ وہ مضمون میں ان احادیث سے بالکل متحد ہے اور اس پر کوئی بحث نہیں کی ہے۔

بہرصورت نہج البلاغہ کی درج شدہ عبارت کی حیثیت فنی حیثیت سے ایک خبر مرسل کی ہے جس کے مقابلہ میں مستند احادیث زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸

"اے ہمارے مالک! اس کے بعد کہ تو ہمیں سیدھی راہ پر لگا چکا اب ہمارے دلوں کو کج نہ ہونے دے اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت کے ساتھ مالا مال فرما! یقیناً تو بڑا عطا کرنے والا ہے۔"

دلوں کو کج نہ ہونے دے یعنی اپنے توفیقات خاصہ ہمارے شامل حال رکھ کہ ہمارے دل راہ راست سے کج نہ ہو جائیں[1]۔

"اس کے بعد کہ تو ہمیں سیدھی راہ پر لگا چکا یعنی توفیق شامل حال رکھی کہ ہم نے راہ راست پر چلنا اختیار کیا اور یہی وہ رحمت ہے جس کی آیندہ کے لئے بھی طلب ہے[2]۔

---

[1]۔ انما اضيف الزيغ الی الله لانه مسبّب عن امتحانه وخذلانه (صافی) وهذا دعاء للتثبت علی الهداية والامداد بالالطاف والتوفيقات ويجری مجریٰ قولهم اللهم لاتسلط علينا من لايرحمنا والمعنی لاتخل بيننا وبين نبينا من لايرحمنا ليتسلّط علينا (مجمع البيان)

[2]۔ رحمة بالتوفيق والمعونه (صافی) ای من عندك لطفا نتوصل به الیٰ الثبات علی الايمان (مجمع البيان)

دوسری جگہ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ یہ کج ہونے دینا یعنی توفیقات خاصہ کو سلب کرنا خود انسان کی کج روی کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ

جب وہ کج ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو کج ہو جانے دیا (الصّف۔۵)

اس کے بعد اس میں جبر کے تصور کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

"اے ہمارے پروردگار! بلا شبہ تو ہے سب لوگوں کا اکٹھا کرنے والا[1] اس دن[2] جس میں کہ کوئی شک نہیں ہے بلا شبہ اللہ وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔"

یہ آخری ٹکڑا بلا شبہ اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا اگر اس دعا کا جزء مانا جائے تو وہ صنعت التفات کے طور پر ہے التفات کے معنی یہ ہیں کہ کسی کے متعلق ایک انداز میں مثلاً بطور غائب کلام ہوتے دوسرے انداز میں بطور تخاطب کلام ہونے لگے جیسے سورہ حمد میں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ کے بعد تخاطب کا انداز ہو جاتا کہ: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ یہاں اس کا عکس ہے کہ بطور تخاطب کلام ہو رہا تھا ربنا ربنا کہہ کر اور اب آ گیا بصورت غائب کہ اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ ضمیر تو کے بجائے یہ کہنا کہ ان اللہ لا یخلف المیعاد اس میں اس کا اظہار مضمر ہے کہ وعدہ خلافی شان الوہیت کے خلاف ہے۔ بھلا اللہ اور وعدہ خلافی کرے؟ ناممکن[3]۔

اور ہو سکتا ہے کہ یہ دعا ختم کے بعد خالق کی طرف سے اس کا جواب ہو کہ یہ تو اللہ کا وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔ اللہ وعدہ خلاف تھوڑی ہے[4]۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝

"بلا شبہ جنھوں نے کفر اختیار کیا ہرگز انہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے ان کے مال اور اولاد اللہ کے مقابلہ میں اور یہی

---

[1]۔ بٹورنے والا (تاج العلماء)

[2]۔ اللّام فی قوله لیوم لاریب فیه معناه فی یوم (مجمع)

[3]۔ فکانه احتجاج علی عدم الخلف للمیعاد بمعنی ان الاله یجلّ عن ذٰلک فلنا الیقین (البلاغی) معناه ان الالٰهیة تنافی خلف المیعاد (نیشاپوری)

[4]۔ التفات عن الخطاب ویحتمل ان یکون من کلامه تعالٰی (جلالین)

لوگ آتش دوزخ کا ایندھن ہیں"

علامہ طبرسیؒ لکھتے ہیں کہ من اللہ میں جو من کا لفظ ہے اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ایک ممتاز ادیب ابوعبیدہ کا یہ قول ہے کہ وہ عند کے معنی میں ہے۔اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ان کے مال اور اولاد اللہ کے یہاں انہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچائیں گے۔مبرد کا قول ہے کہ اس کے معنی ابتداء کے ہیں یعنی اللہ کی طرف سے ان کا کوئی مددگار نہیں۔تیسرا قول یہ ہے کہ تغنی کے معنی میں بچانے کا مفہوم ہے اور اللہ سے یعنی اس کے عذاب سے ہمارے بعض مترجمین نے اس کے مطابق ترجمہ کیا ہے[1]۔

ایک چوتھا تصور یہ ہے کہ من بدلے کے معنی میں ہے یعنی اللہ کے بجائے ان کے اموال اور اولاد ان کے کام نہیں آئیں گے[2]۔

علامہ بلاغیؒ نے اس بحث میں بہت تفصیل سے کام لیا ہے کہ جس کا نتیجہ وہی ہے جو ہم نے ترجمہ میں مدنظر رکھا ہے اور بعض اکابر نے بھی ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے[3]۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿١١﴾

"جیسا فرعونی گروہ اور ان کے پہلوں کا حال ہوا کیا[4] کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو اللہ نے ان کے گناہوں کی بدولت ان کو گرفت میں لے لیا اور اللہ سخت سزا والا ہے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٢﴾

"کافروں سے کہہ دو کہ بہت جلد تم مغلوب ہوگے اور سمیٹ کے لے جائے جاؤ گے دوزخ کی طرف اور وہ کیا بری آرام گاہ ہے"

دوزخ کو آرام گاہ طنزیہ طور پر کہا گیا ہے[5]۔

اب یہ اعلان جو بہ طور اطلاع کافروں سے مخاطب ہو کر کیا گیا ہے اس میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ دو باتوں کی اطلاع ہو تم مغلوب ہو گے یعنی رسول سے جو تم مقابلہ کر رہے ہو اس میں شکست بھی تمہاری ہوگی[6] اور دوزخ کی طرف بھیجے جاؤ گے یعنی آخرت میں عذاب الٰہی میں بھی

---

[1]۔ان کو خدا کے عذاب سے نہ ان کے مال ہی کچھ بچائیں گے، نہ ان کی اولاد (فرمان علی صاحب)

[2]۔للبدل مثله فی قوله ان الظن لا یغنی من الحق شیئا ای بدله والمضاف محذوف تقدیره لن تغنی عنهم بدل رحمة الله او طاعة شیئا (نیشاپوری)

[3]۔اُن کے نہ آڑ آئیں گے ان کے مال اور نہ بال بچے (تاج العلماء)

[4]۔ کشأنهم (صافی) الذاب العادة (مجمع البیان)

[5]۔المهاد ما یمهده الانسان لاستراحته وعبّر عن جهنّم بالمهاد تهکما بهم (البلاغی)

[6]۔ستغلبون فی الدنیا بالقتل والاسر وضرب الجزیة وقد وقع ذلك (جلالین) وقد فعل الله ذلك وعده بقتل بنی قریظة واجلاء بنی النضر (صافی) وقد فعل الله ذلك فالیهود غلبوا بوضع الجزیة علیهم والمشرکون غلبوا بالسّیف (مجمع البیان)

گرفتار ہو گے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلا ٹکڑا دوسرے ہی کا اجمال ہو یعنی دنیا میں چاہے تم کتنی ہی کامیابیاں حاصل کر لو مگر آخر میں اللہ کے مقابلہ میں تم بے بس ہو جاؤ گے اور وہ تمہیں آتش جہنم میں پہنچا دے گا۔

اس طرح یہ حکم کسی جماعت کفار سے مخصوص نہیں ہے بلکہ عام ہے جس میں سب کافر داخل ہیں۔

تنہا اگر اس آیت کو دیکھا جائے تو یہ دوسرا مفہوم کچھ زیادہ قرآنی الفاظ سے قریب تر معلوم ہوتا ہے کیونکہ پہلے معنی کی صورت میں ستغلبون ثم تحشرون ہوتا یعنی مغلوب ہو گے۔ پھر تمہیں دوزخ کی طرف بھیجا جائے گا واو عاطفہ بتلاتا ہے کہ دونوں باتیں آخرت ہی سے متعلق ہیں لیکن آیات کا سلسلہ اگر ترتیب نزول کے مطابق مانا جائے تو پہلے ہی معنی کو قوت ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد قد کان لکم آیۃ ''تمہارے لئے اس واقعہ میں نشانی ہے'' کہہ کر انہیں ایک جنگ کے انجام کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دیکھو کس طرح رسول کو فتح حاصل ہوئی ھذا ستغلبون کا وہی مطلب ہوگا کہ تم رسولؐ کے مقابلہ میں مغلوب ہو کر رہو گے۔ فتح کے توقعات تمہارے ہرگز پورے نہیں ہو سکتے اور پھر آخرت میں عذاب میں بھی گرفتار ہو گے۔

قَدۡ كَانَ لَكُمۡ اٰيَةٌ فِىۡ فِئَتَيۡنِ الۡتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَاُخۡرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوۡنَهُمۡ مِّثۡلَيۡهِمۡ رَاۡىَ الۡعَيۡنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَعِبۡرَةً لِّاُولِى الۡاَبۡصَارِ ﴿۱۳﴾

''تم لوگوں کے لئے ایک معجزہ تھا[۱] ان دونوں گروہوں میں جن کی مڈبھیڑ ہوئی تھی[۲] ایک گروہ اللہ کی راہ میں جنگ کر رہا تھا اور دوسرا کافر تھا وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ ان سے دُونے ہیں اور اللہ اپنی مدد سے جسے چاہتا ہے تقویت دیتا ہے۔ اس میں عبرت ہے نگاہ والوں کے لئے[۳]''۔

جنگ بدر کی مختصر روداد:

یہ جنگ بدر کی مختصر روداد ہے کہ دیکھو کس طرح یہاں اہل ایمان اور کافروں کا مقابلہ ہوا اور کفار تعداد میں ان سے زیادہ تھے مگر انہیں شکست ہوئی اور اہل ایمان غالب ہوئے جو صرف نصرت الٰہی کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد کافروں کو کبھی اپنی کثرت تعداد پر نازاں نہ ہونا چاہیے کیوں کہ خدا جب چاہیے گا اپنی غیبی تائید سے اقلیت کو ان پر فتح دے دے گا جس کا مشاہدہ سب کو ہو چکا۔

''وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ ان سے دُونے ہیں'' اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ ''وہ مشرکین ان سے یعنی مسلمانوں سے دُونے ہیں'' یہ واقعیت کا اظہار ہے کہ مشرکین کی تعداد ایک ہزار تھی اور مسلمانوں کی تین سو تیرہ تو وہ ان سے دُونے کیا تگنے سے بھی زیادہ تھے مگر اللہ

---

[۱]۔ دلالۃ معجزۃ علی صدق محمد ﷺ (صافی) ای حجۃ و معجزۃ (مجمع البیان)

[۲]۔ آپس میں جٹ گئے (تاج العلماء)

[۳]۔ اُن لوگوں کے لیے جو منہ پر آنکھیں رکھتے ہوں (تاج العلماء)

اپنی مدد سے جسے چاہتا ہے تقویت دیتا ہے۔ اس صورت میں اعجاز کا تعلق باوجود قلت تعداد مسلمانوں کے اس فتح وغلبہ سے ہے۔

دوسرے یہ کہ مشرکین کی آنکھوں کو مسلمان ان سے دُونے نظر آرہے تھے حالانکہ وہ ان سے بہت کم تھے۔ اس صورت میں اعجاز کا تعلق خود اس تاثر سے ہوگا اور بعد کا فتح وغلبہ مسلمانوں کا اس معجزہ کا نتیجہ قرار پائے گا[1]۔

علامہ بلاغی رحمۃ اللہ علیہ کا خیال یہ ہے کہ مراد یہ ہے کہ، مسلمان انہیں بس اپنے سے دُونا دیکھ رہے تھے حالاں کہ حقیقت میں وہ ان سے تگنے تھے دُونے نہ تھے مگر یہ حکمت الٰہی تھی کہ یہ انہیں جوان کی اصل تعداد ہے اس کے مطابق محسوس نہ کریں تاکہ اہمیت ہار نہ جائیں اور پھر بھی اپنے سے کم یا برابر بھی نہ دیکھیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ ان کی ہمت محسوس نہ کریں اور جنگ میں تساہل سے کام لیں (آلا ء الرحمن)

علامہ نیشاپوری نے ''یَرَوۡنَہُمۡ مِّثۡلَیۡہِمۡ'' وہ ''انہیں ان سے دونا دیکھ رہے تھے'' اس میں یہ ''وٗ'' ہ اور ''انہیں'' اور ''ان'' کی جو ایک دم تین ضمیریں ہیں ان کے مرجع کے لحاظ سے چار احتمال قرار دیے ہیں۔

پہلے کہ وہ یعنی کافر انہیں یعنی مسلمانوں کو اپنے سے دُونا یعنی دو ہزار محسوس کر رہے تھے۔ اس طرح پہلی اور تیسری ضمیر مشرکین کی طرف اور بیچ کی ضمیر مسلمانوں کی طرف راجع ہے۔

دوسرے وہ یعنی مشرکین انہیں ان سے دُونا دیکھ رہے تھے یعنی مسلمان حقیقت میں تو تین سو تیرہ تھے مگر وہ انہیں چھ سو سے زیادہ نظر آرہے تھے تاکہ انہیں اپنی تعداد کی بہ نسبت بہت زیادہ کم محسوس نہ کریں۔ اس طرح پہلی ضمیر مشرکین کی طرف اور بعد کی دونوں ضمیریں مسلمانوں کی طرف عائد ہیں۔

تیسرے یہ کہ مسلمان انہیں اپنے سے دُونا دیکھ رہے تھے (حالانکہ وہ تگنے تھے) یہ وہی احتمال ہے جسے علامہ بلاغیؒ نے تقویت دی ہے نیشاپوری نے اس کو مزید تقویت یوں دی ہے کہ دُونے تک کے مقابلہ کے لئے تو وہ اس آیت سے کہ:

فَاِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ ۚ وَاِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ اَلۡفٌ یَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفَیۡنِ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۶۶﴾

اگر تم میں سو صبر کا جوہر رکھنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں اور اگر تم میں ہزار ہوں تو دو ہزار پر غالب ہوں اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، (انفال)

تیار ہو ہی چکے تھے لیکن وہ انہیں اپنے سے تگنا محسوس کر لیتے تو دہشت میں مبتلا ہو جاتے۔

ہمارے خیال میں اس توجیہ کے ساتھ یہ استشہاد اس لئے درست نہیں کہ اصل میں مطالبہ تو مسلمانوں سے دس گنے کے مقابلہ کا ہوا تھا چنانچہ علامہ نیشاپوری نے اگرچہ کہا یہ ہے کے مطالبہ ان سے دونے کا ہوا لیکن نادانستہ طور پر انہوں نے اس کے شاہد میں جو آیت پیش کی ہے وہ یہ کہ:-

الۡقِتَالِ ؕ اِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ عِشۡرُوۡنَ صٰبِرُوۡنَ یَغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ ۚ وَاِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ مِّائَۃٌ یَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفًا مِّنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاَنَّہُمۡ قَوۡمٌ لَّا یَفۡقَہُوۡنَ (انفال۔ ۶۵)

---

[1] یرا المشرکون المسلمین مثل عدد المشرکین (جلالین)

اگر تم میں بیس صبر کرنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں اور اگر تم سے سوا یسے ہوں تو ایک ہزار کا فروں پر غالب آئیں اس وجہ سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو دین کی سمجھ نہیں رکھتے۔

یہ تو ہم نے جناب نیشاپوری کی ترجمانی میں معقولیت پیدا کرنے کے لئے اس سے پہلے وہی آیت درج کی جس میں دو نے کے مقابلہ کی دعوت ہے۔

پھر یہ کہ وہاں سیاق قرآنی یہ بتاتا ہے کہ دس گنے کے مقابلہ کی دعوت کے بعد کوئی معرکہ پیش آیا جس میں مسلمان ناکام ہوئے تب دو گنے مقابلہ کی دعوت دی گئی یہ کہہ کر کہ:۔

اَلۡـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنۡكُمۡ وَعَلِمَ اَنَّ فِيۡكُمۡ ضَعۡفًا ۔

اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی اور معلوم ہو گیا کہ تم میں کمزوری ہے (انفال۔ ٦٦)

اور ظاہر ہے کہ معرکہ پہلا جو پیش آیا ہے وہ بدر ہی کا ہے تو اگر اس سے پہلے یہ دوسری آیت نازل ہو چکی ہوتی تو مسلمانوں کی کمزوری کا ظہور ہی کہاں ہوتا۔ لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ بدر کے پہلے جو مطالبہ تھا وہ تو دس گنے ہی سے مقابلہ کا تھا تو پھر وہ تگنا انہیں دیکھتے بھی تو انہیں ہمت نہیں ہارنا چاہے تھی۔

چوتھا احتمال جسے خود انہوں نے رد کر دیا ہے یہ ہے کہ وہ یعنی مسلمان انہیں یعنی مشرکین کو ان کی یعنی مشرکین ہی کی جو تعداد تھی اس سے بھی دونا دیکھ رہے تھے یعنی تھے تو وہ ایک ہزار مگر یہ انہیں دو ہزار محسوس کر رہے تھے۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہوسکتا اس لئے کہ یہ تو اور زیادہ خالق کی طرف سے مسلمانوں کو خوف زدہ کرنا ہوگا، کیوں کہ ایک ہزار ہوتے ہوئے واقعاً وہ مسلمانوں سے تگنے تھے ہی اب اللہ انہیں چھ گنا دکھلا کر اور دہشت زدہ کرے، آخر اس میں کیا معقولیت ہوسکتی ہے؟

میں کہتا ہوں کہ یہ تو اس وقت ہوگا جب اس دکھلانے کو اللہ کا عمل قرار دیا جائے مگر یہاں خالق نے یہ تو نہیں کہا ہے کہ ہم ان کی تعداد انہیں دونی دکھا رہے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ مسلمانوں کی نفسیاتی حالت کا اظہار ہو کہ وہ یوں تو تھے ہی ان سے زیادہ مگر یہ انتہائی خوف و دہشت کی وجہ سے جتنے وہ تھے اس سے بھی دونا انہیں محسوس کر رہے تھے۔ اس کے باوجود یہ خالق کی تائید غیبی اور کچھ نفوس مطمئنہ کا عزم و ثبات تھا کہ اس نے انہیں کی تعداد اور پھر اس نفسیاتی کیفیت کے باوجود فتح و نصرت عطا فرمائی۔

بہرحال ایسی آیتوں میں جو مفسرین کی بے بسی اور پریشانی نظر آتی ہے وہ بڑی شدت کے ساتھ حَسۡبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ کے نعرے کا کھوکھلا پن ظاہر کرتی ہے اور شارحین و معلمین کی ضرورت آفتاب نیم روز کے طور پر نمایاں ہو جاتی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ ذرائع کی کوتاہی یا تاریخی علل و اسباب سے حالات کی ناسازگاری کا نتیجہ ہو کہ حقیقی معلمین کی زبان سے اکثر آیات کی واضح تشریح ہم تک بھی نہ پہنچ سکی یا ہمارے راویوں کو ان کے دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا جس کی وجہ سے ہم بھی عملی طور پر اکثریت کے ساتھ صرف اپنی ذہنی کاوشوں ہی میں گرفتار ہیں اور معنیٰ طور پر ہم بھی نہیں کہہ سکتے کہ اصل مراد الٰہی اس محل پر کیا ہے؟

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالۡبَنِيۡنَ وَالۡقَنَاطِيۡرِ الۡمُقَنۡطَرَةِ مِنَ

الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

''لوگوں کے لئے دل آویز بنائی گئی ہے لذائذ نفس کی محبت جیسے عورتیں، بچے، سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے ذخیرے [۱] نشان لگائے ہوئے گھوڑے [۲] مویشی اور کھیتی باڑی یہ ہے اثاثہ اس دنیاوی زندگی کا اور انجام کی بہتری اللہ کے یہاں ہے۔''

محبت آل و مال بری چیز نہیں مگر فکر مآل مقدم:

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیوی ساز و سامان کی محبت بھی بجائے خود کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ وہ انسانی طبیعت کا ایک فطری تقاضا ہے [۳] مگر جب اس دنیوی مفاد اور آخرت کے مفاد میں تصادم ہو تو ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا بندہ آخرت کے مفاد کو دنیا پر ترجیح دے [۴]۔ اس صورت میں اس دل آویز بنانے کا فاعل اللہ کو بھی سمجھا جائے تو کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ فطرتِ انسانی میں ان چیزوں کی خواہش ودیعت کرنا اجتماعی کرنا اجتماعی اور تمدنی مفادات کے حصول کا ذریعہ ہے [۵]۔

ہاں اس دل آویزی سے اتنا مغلوب ہو جائے کہ آخرت کے مفاد کو نظر انداز کردے یہ شیطانی کام ہوگا۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ
بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾

''کہیے کہ کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتاؤں؟ جنہوں نے پرہیزگاری سے کام لیا، ان کے لئے ان کے پروردگار کے یہاں وہ بہشت ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور پاک و پاکیزہ بیویاں اور

---

[۱]۔ چنے ہوئے توڑے اور سونے چاندی کے گچھے (تاج العلماء) القنطار صلۂ مسك نو ر ذهبا (صافی) جمع قنطار وهو المال الكثير العظيم (مجمع البیان)

[۲]۔ المعلّمة او المرعبة (صافی) دغیلے فاصون (تاج العلماء)

[۳]۔ هی ضرورية فينا لا علينا دفعها عن نفوسنا (مجمع البیان)

[۴]۔ هو تحريص على استبدال ما عنده من اللذّات الحقيقة الابدية بالشهوات المخدجة الفانية (صافی)

[۵]۔ لم يذكر فی هٰذه ما هو محرم العنوان ـــــ فلا مانع من ان يكون الله تبارك اسمه هو المزين (البلاغی)

بہت بڑی اللہ کی خوشنودی [1] اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے بندوں کا"

وہ دنیا کی نعمتیں بھی اگر بطور جائز ہوں تو اللہ کی رحمت کا مظہر ہیں مگر نعم الٰہیہ کے مراتب ہوتے ہیں اور اسی لحاظ سے انسانی رجحانات کے مراتب پیدا ہوتے ہیں [2]۔

ادنیٰ درجہ دنیوی نعمتوں کا ہے اور اس سے بالاتر جنت ہے جو نعم اخروی کا مجموعہ ہے اور ان سب سے بالاتر ہے رضائے الٰہی جس کے لئے دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ: "اللہ کی ذرا سی بھی خوشنودی بڑی سے بڑی چیز ہے۔"

بلند ترین نفوس وہ ہیں جو جنت کو بھی مطمع نظر نہیں بناتے بلکہ اصل مقاصد رضائے خالق کو قرار دیتے ہیں پھر رضائے خالق کے نتیجہ میں جنت تو لازماً حاصل ہوئے گی اور بہت ممکن ہے وہ سب دنیوی نعمتیں بھی حاصل ہو جائیں لیکن چوں کہ اصل نصب العین رضائے خالق ہے لٰہذا جب بھی خدا کی خوشنودی ان دنیوی چیزوں کی قربانی سے وابستہ ہو جائے گی انسان اس کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کے لئے تیار رہے گا اور ذرا بھی قدم اس راہ سے پیچھے نہیں ہٹائے گا۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾

"جن کا قول یہ ہے کہ ہمارے پروردگار! بلا شبہ ہم ایمان لائے اب تو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور بچا ہمیں آتش دوزخ کے عذاب سے۔"

موجودہ ترتیب آیات کے لحاظ سے یہ وصف ہے ان "پرہیز گاروں" کا جن کا ذکر اس کے قبل کی آیت میں آچکا ہے کہ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ [3] اس طرح یہ تصور بے بنیاد ثابت ہوتا ہے کہ اس مقام پر صرف ایمان کو دعا میں پیش کرنا بتاتا ہے کہ فلاح آخرت کے لئے ایمان کافی ہے۔ اگر عمل صالح بھی جزء لازم ہوتا تو اس کا بھی ایمان کے ساتھ اس دعا میں ذکر ہوتا [4]۔

یہ تصور اس لئے غلط ہے کہ ان کے حسن عمل کا ثبوت تو خالق نے خود "المتقین" کے لفظ سے دے ہی دیا ہے مگر چوں کہ اعمال کی صحت وقبولیت کے لئے ایمان شرط لازم ہے اس لئے اعمال خیر کی پابندی کے ہوتے ہوئے وہ قبولیت کی دعا کیلئے اپنے ایمان کو پیش کر رہے ہیں اور اگر ایمان کے ساتھ بر بنائے اعمال استحقاق عذاب ہوتا ہی نہ تو وہ اپنے ایمان کو پیش کرنے کے ساتھ مغفرت ذنوب اور پھر عذاب النار سے بچائے جانے کی دعا ہی کیوں کرتے؟

ظاہر ہے کہ "ذنوب" سے عملی کوتاہیاں ہی مراد ہیں جن کی مغفرت کی ایمان کے ساتھ گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ بغیر ایمان نہیں۔

---

[1]۔ ای رضیً کبیر (جلالین)

[2]۔ قیل قد نبّہ بہذہ الاٰیۃ علیٰ مراتب نعمہ فادناہا متاع الدنیا واعلاہا رضوان اللہ ______ واوسطہا الجنۃ ونعیمہا (صافی)

[3]۔ وصف المتقین الذین سبق ذکرہم (مجمع البیان) بیان الصفات الذین اتقوا (البلاغ)

[4]۔ توسّلوا بمجرد الایمان الیٰ طلب المغفرۃ (نیشاپوری)

اَلصّٰبِرِیۡنَ وَ الصّٰدِقِیۡنَ وَ الۡقٰنِتِیۡنَ وَ الۡمُنۡفِقِیۡنَ وَ الۡمُسۡتَغۡفِرِیۡنَ بِالۡاَسۡحَارِ ﴿۱۷﴾

”جوصبر کرنے والے [۱] ہیں اور راست باز ہیں اور اطاعت گزار [۲] ہیں اور جو خیرات کرنے والے ہیں اور راتوں کو پچھلے پہر مغفرت کی دعائیں کرنے والے ہیں۔“

سحر خیزی کی تعریف:

”سحر خیزی“ بڑا ممدوح وصف ہے اور اس وقت نماز تہجد بڑی خاص عبادت ہے اور اس وقت کے استغفار میں توجہ قلبی بدرجۂ اتم حاصل ہونے کی وجہ سے قبولیت کا اور پھر مظاہرہ عبودیت کے خلوص کی وجہ سے بھی مراحم ربانی کے مورد ہونے کا زیادہ امکان ہے [۳]۔

شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ اُولُوا الۡعِلۡمِ قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿ؕ۱۸﴾

”گواہی دی ہے اللہ نے کہ سوا اُس کے کوئی خدا نہیں اور فرشتوں نے اور صاحبان علم نے اس صورت سے کہ وہ پوری پوری عدالت کے ساتھ برقرار ہے کوئی خدا نہیں سوا اس کے کہ جو زبردست ہے، ٹھیک ٹھیک کام کرنے والا“

اوصاف الٰہی میں وحدت کے ساتھ عدل کی اہمیت:

”اللہ نے اس کی گواہی دی ہے“ یعنی اپنے تجلیات قدرت سے خود اس نے اس کا ثبوت پیش کیا ہے [۴] اور آیات حکمت سے اس کے دلائل کو خلق کے ذہن نشین کیا [۵]۔

”اور فرشتوں نے گواہی دی“ یہ بھی ان کارگزاریوں کے ساتھ جنہیں بہ حکم الٰہی وہ نظم عالم میں انجام دیتے ہیں جن کا مظہر آثار قدرت ہیں اور ان کلام الٰہی کی آیتوں کے ساتھ بھی جو ان کے ذریعہ سے انبیاء پر نازل ہوئیں [۶]۔

اور اہل علم یہ انبیاء و اولیائے الٰہی اور راسخ الاعتقاد اہل ایمان ہیں جن کی گواہی اپنے اقوال سے بھی ہے اور اپنے اعمال اور

---

[۱] ۔ جھیل جانے والے (تاج العلماء)

[۲] ۔ قبل المطیعین اللہ قتادۃ و قیل الدائمین علی الطاعۃ و العبادۃ عن الزجاج و قیل القائمین بالواجبات عن القاضی (مجمع البیان)

[۳] ۔ قیل تخصیص الاسحار لان الدعاء فیھا اقرب الی الاجابۃ لان العبادۃ اشق و النفس امضیٰ و الروع اجمع (صافی) و بعدھا عن مداخلۃ الرّیاء (البلاغی)

[۴] ۔ گواہی داد یعنی آشکارا ساخت (شاہ ولی اللہ) بیّن لخلقہ بالدلائل و الاٰیات (جلالین)

[۵] ۔ بیّن وحدانیۃ لقوم بظھورہ فی کل شئی ــــــ و لقوم بنصب الدلائل ــــــ و لقوم بانزال الایات الناطقۃ بھا (صافی)

[۶] ۔ الملٰئکۃ بالاقرار ذاتاً لقوم و فعلاً لقوم و قولاً لقوم (صافی)

ثبات و استقلال کے مظاہرات اور اس کی راہ میں قربانیوں سے بھی [1]۔

لا الٰہ الا ھو توحید الٰہی کا اعلان ہے اور شھد اللہ کا جملہ اپنے شاہدین اللہ، ملائکہ اور اولوا العلم اور مشہور دریہ یعنی جس کی گواہی دی جارہی ہے اس کے ذکر کے ساتھ کہ لا الٰہ الا ھو بظاہر اولو العلم پر ختم ہو گیا جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ، ملائکہ اور صاحبان علم اس کے گواہ ہیں کہ سوا اس کے کوئی خدا نہیں مگر متکلم قرآنی نے اس جملہ کے ساتھ اضافہ ضروری سمجھا کہ قائما بالقسط اس صورت سے کہ وہ یعنی خدا پوری پوری عدالت کے ساتھ قائم ہے [2]۔

توحید کے ساتھ عدل اصول دین کا لازمی جزء:

اس سے ظاہر ہے کہ توحید کے ساتھ عدل اصول دین کا لازمی جزء ہے اور ان دونوں چیزوں کو پھر تتمۂ آیت میں دہرا دیا۔ توحید کو لا الہ الا ھو کے لفظوں کے ساتھ اور قائما بالقسط کو العزیز الحکیم کے لفظوں میں اس لئے کہ حکمت مطلقہ ربانی عدالت کے ساتھ دست و گریبان ہے۔ جو عدل کو اس کے لئے ضروری نہ سمجھے وہ پھر حکمت مطلقہ کا بھی عمومی طور پر قائل نہیں ہوسکتا۔

عام طور سے قسط کا ترجمہ عدالت ہی کے ساتھ کیا جاتا ہے [3] مگر علامۂ بلاغیؒ نے لفظی اور معنوی دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہے کہ قسط عدالت کے بالکل ہم معنی نہیں ہے بلکہ اس کا عالم سطح سے بالاتر مرتبہ ہے جیسے ظلم و جور بالکل مترادف نہیں ہیں بلکہ جور کا درجہ ظلم سے کچھ شدید تر ہے۔ حضرت امام مہدی علیہ السلام کے متعلق فریقین کے احادیث میں متواتر یہ جملہ آیا ہے کہ: یملأ الارض قسطا و عدلا کما ملئت ظلما و جورا اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ عدل جور کے مقابل میں ہے اور قسط ظلم کے مقابلہ میں ہے اور سورہ حجرات میں ہے: فَأَصۡلِحُوا۟ بَيۡنَهُمَا بِٱلۡعَدۡلِ وَأَقۡسِطُوٓا۟ ''صلح کرو عدالت کے ساتھ اور قسط سے کام لو''۔ یہاں عدالت کے بعد پھر قسط کا حکم ہے اسی بناء پر ہم نے اس کا ترجمہ ''پوری پوری عدالت'' کے ساتھ کیا ہے۔

علامہ نیشاپوری نے قائما کی ترکیب نحوی میں کئی احتمال درج کرتے ہوئے اسے اوجہ (زیادہ مناسب) قرار دیا ہے کہ وہ لا الہ الا ھو میں جو ضمیر ھُو کی ہے! اس کا حال ہے جو اس کے معنی میں زور پیدا کرنے کے لئے آیا ہے وہ کہتے ہیں:۔

لیکون الالھیۃ والتفرد بہا مقتضیا للعدالۃ۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی خدائی اور وحدانیت بذات خود عدالت کی متقاضی ہے۔

پھر اس پر حقیقت پسندانہ بحث کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

اعلم انّ وجوب الوجود یلزمہ الغنی المطلق والعلم التام والفیض العام والحکمۃ الکاملۃ ورحمۃ الشاملۃ وعدم الانقسام بجھۃ من الجھات وعدم الاقتصار بوجہ من الوجوہ الیٰ شئ من الاشیاء وعدم التقض والنقص فی شئ من الافعال والاحکام الیٰ غیر ذلك من الاسماء الحسنیٰ والتصفات العلیا ومرکوز فی العقل؛

---

[1] ۔فی العیاشی عن الباقر علیہ السلام انّ اولی العلم الانبیاء والاوصیاء (صافی)

[2] ۔انصاف کی بنیاد قائم کرنے والا ہے (تاج العلماء)

[3] ۔بالقسط ای بالعدل (جلالین) القسط العدل الذی قامت بہ السمٰوٰت والارض (مجمع البیان)

لسّليم من هٰذا شانه لا يصدر منه شئ الا علیٰ وفق العدالة وقضيّة السّوية ورعاية الاصلح عموما او خصوصا فكل ما يخيل الى المكلّف انه خارج عن قانون العدالة او يشبه الجور وا لقبيح وجب ان ينسب ذلك الیٰ قصور فهم وعدم احاطته التامة بسلسلة الاسباب والمُسبات والمبادی والغايات.

معلوم ہونا چاہیے کہ واجب الوجود ہونے کا لازمہ ہے مطلق استغناء اور کامل علم اور ہمہ گیر فیض اور پوری پوری سوجھ بوجھ اور عمومی رحمت اور کسی رخ سے بھی اس کی تقسیم کا ممکن نہ ہونا اور کسی حیثیت سے بھی اس کا محتاج نہ ہونا کسی بھی چیز کی طرف اور اس کے افعال اور احکام میں تضاد اور کسی کمی کا نہ ہونا اور اس کے علاوہ جتنے اس کے اسماء حسنیٰ اور بلند صفات ہیں سب (ذات سے الگ نہیں ہیں بلکہ خود اس کے واجب الوجود ہونے کے لازمی تقاضے ہیں) اور عقل سلیم میں یہ بات راسخ ہے کہ جو اس شان کی ذات ہو اس سے کوئی شے ایسی نہیں ہوسکتی جو عدالت اور مساوات اور زیادہ سے زیادہ مصلحت کے لحاظ سے نہ ہو خواہ وہ مصلحت عمومی ہو یا کسی موقع خاص سے تعلق رکھتی ہو تو اگر انسان کو وسوسہ بھی پیدا ہوا ور ایسا خیال ہو اس کے کسی کام میں کہ وہ عدالت کے خلاف ہے یا ظلم وستم یا برائی سے ملتا جلتا ہوا ہے تو اسے اپنی سمجھ کا پھیر قرار دے اور یہ کہ وہ اسباب اور ذرائع اور نتائج کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہے۔اس لئے اس کو ایسا غلط تصور ہو رہا ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ ایسے ہی غلط تصورات کو ختم کرنے کے لئے فرقہ شیعہ نے توحید کے ساتھ ساتھ عدل کو صراحۃً اصول دین میں درج کرنا ضروری سمجھا ہے۔

اِنَّ الدِّيۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ ۗ وَمَا اخۡتَلَفَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡيًاۢ بَيۡنَهُمۡ‌ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹﴾

”بلا شبہ حقیقی دین [۱] اللہ کے نزدیک اسلام ہے اور جنہیں کتاب ملی تھی انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اپنے پاس علم آجانے کے بعد صرف اپنے درمیان پھیلی ہوئی ناحق کوشی سے [۲] اور جس نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا تو بلا شبہ اللہ بڑی تیزی سے حساب لینے والا ہے۔“

اصل دین صرف اسلام:

یہ ”ناحق کوشی“ جان بوجھ کر صرف حسد وعداوت کی بناء پر تھی [۳] جیسے مشرکین کو یہ تعصب تھا کہ یہ قرآن کسی امیر اور صاحب دولت پر کیوں نہ اترا اور بنی اسرائیل کو یہ کہ یہ منصب اولاد اسماعیلؑ میں کیوں چلا گیا؟

---

[۱]۔الدین المرضی (جلالین) دین معتبر (شاہ ولی اللہ) لادین مرضی عند اللہ سوی الاسلام (صافی)

[۲]۔بغیا حاصلا بینھم علی الحق وتمردا علیٰ ما یعلمون (البلاغی)

[۳]۔حسدا او طلبا للریاسة (صافی) محض آپس کے بیر کی وجہ سے (تاج العلماء)

گزشتہ آیت کے ربط سے علامہ نیشاپوری نے اس آیت کے تحت میں جو مفہوم لکھا ہے وہ بھی مسلمانوں کی کثرت کے لئے سرمہ چشم ہونا چاہیے وہ لکھتے ہیں:۔

فیه ایذان بأن الدین هو العدل والتوحید اضار التوحید فان یعلم ان الله تعالیٰ لاشریك له ولا نظیر فی الذات ولا فی صفة من الصفات کما شهد هو به واما العدل فهو ان یعلم ان کل ما خلق وامر المکلف به ونهاه عنه فانه عدل وصواب وفیه حکم ومصالح۔

اس سے اس بات پر روشنی پڑی ہے کہ اصل دین عدل اور توحید ہی ہے۔ توحید یہ ہے کہ یہ یقین کر کے کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے اور نظیر نہیں نہ ذات میں اور نہ صفات میں جس کی گواہی اس نے خود دی ہے اور عدل یہ ہے کہ وہ یقین کرے کہ جو کچھ اللہ نے پیدا کیا اور جو اس نے اوامر اور نواہی جاری کیے سب عین مقتضائے عدالت اور درست ہیں اور ان میں حکمتیں اور مصلحتیں پائی جاتی ہیں۔

وہ فرماتے ہیں کہ پہلے جو کہا گیا کہ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ جس میں دو جزء پھیلا کر رکھے گئے تھے کہ اللہ کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں اور وہ عدالت کے ساتھ قائم ہے اب ان دونوں جزوں کو سمیٹ کر یوں کہہ دیا گیا کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی گواہی یہ ہے کہ اصل دین صحیح اسلام ہے یعنی وہی توحید و عدل کا اقرار جو پہلی گواہی میں صراحۃً بیان ہوا تھا[1]۔

اب اس کے بعد ہر شخص یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ عدل بھی مثل توحید کے ''اصول دین'' میں داخل ہوا یا نہیں:

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

''اب اگر وہ لوگ آپ سے کٹھ حجتی کریں تو آپ یہ کہہ دیجئے کہ میں نے تو سراسر اپنے کو سپرد کر دیا ہے اللہ کے[2] اور انہوں نے بھی جنہوں نے میری پیروی کی ہے اور کہیے ان سے جنہیں کتاب ملی اور جو کسی کتاب کے پڑھنے والے نہیں ہیں[3] کہ کیا تم نے بھی اسلام اختیار کیا تو اگر وہ بھی اسلام کا اقرار کرلیں تو ٹھیک راستہ پا گئے اور اگر انہوں نے منہ پھرا تو آپ کا فرض تو بس پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کا دیکھنے والا ہے۔''

حقیقت اسلام:

---

[1]۔غرائب القرآن

[2]۔معنی وجهی نفسی (مجمع البیان) انقدت له انا (جلالین)

[3]۔ای الذین لا کتاب لهم (مجمع البیان) اَن پڑھ کہتے تھے عرب کے لوگوں کو کہ ان کے پاس اگلے پیغمبروں کا علم نہ تھا (موضح القرآن)

اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰہِ کے لفظی معنی تو یہ ہوئے کہ اپنے منہ کو حوالے کر دیا ہے اللہ کے مگر یہ محاورہ کے طور پر ہے۔ مراد اس سے ہوتا ہے کہ اپنے کو بالکل حوالے کرنا۔ چوں کہ منہ کو خصوصیت حاصل ہے اس لئے عرب محاورہ میں اس کا نام لیا جاتا ہے [1] اور محاوروں کے ترجمہ میں لفظی ترجمہ کرنا غلط ہوتا ہے۔ اس لئے ہم نے ''سراسر اپنے کو'' حوالے کرنے سے ترجمہ کیا ہے۔

اس میں اسلام کے پیغام کی اصل حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ 'اسلام'' کوئی اعزازی لقب نہیں ہے۔ بلکہ ایک وصف ہے جو اس کے معنی لغوی کی مطابقت سے ہے یعنی اپنے کو بالکل اللہ کے سپرد کر دینا۔

اگر یہ چیز مسلمانوں کے پیش نظر رہے تو اقتدار واختیار الٰہی کے مقابلہ میں ''جمہوریت'' وغیرہ کا نام لینا بالکل غلط سمجھیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ ۙ وَّیَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۱﴾

''جو لوگ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے اور پیغمبروں کا ناحق قتل کرتے اور انہیں کہ جو انصاف کی ہدایت کریں قتل کرتے ہیں انہیں دردناک عذاب کا مژدہ سناؤ۔''

''مژدہ'' کیا لفظ طنزیہ انداز میں ہے چوں کہ دنیا میں وہ اپنے کو بڑا کامیاب سمجھتے تھے تو جو کامیابی انہیں حاصل ہورہی ہے وہ ان کے سامنے پیش کرو [2]۔

یہ ''مژدہ'' کن کے لئے ہے؟ ان کے لئے ہے جو پیغمبروں کو قتل کریں اور انہیں قتل کریں کہ جو انصاف کی ہدایت یعنی نیک کاموں کی تبلیغ کرتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ انبیاء کے قتل کا جیسا گناہ ہے ویسا ہی نیک راستوں پر چلنے کی تحریک کرنے والوں کے قاتل کا گناہ ہے [3] چاہے یہ قاتل اسلام کا نام اختیار کیے ہوئے اور مسلمانوں کے بھیس میں ہوں اور بالکل ایک ہی طرح کا عذاب ہے جس کی متحدہ الفاظ میں دونوں کو خبر دی گئی ہے۔

قرآن کے اس اعلان کو پیش نظر رکھا جائے تو یزید اور ابن زیاد وغیرہ کے لئے پر بنائے نام اسلام جو مغفرت کے پہلو تلاش کیے جاتے ہیں کی قرآن کے اس اعلان کے بعد کوئی گنجائش محسوس نہ ہو۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۲۲﴾

---

[1]۔ اضاف الاسلام الی لوجہ لان وجہ الشئی اشرف ما فیہ (مجمع البیان)

[2]۔ انما قال بشر ھم علی طریق الاتساع والا ستعارۃ والبشارۃ تکون فی الخیر دون الشر لان ذلک لھم مکان البشارۃ للمؤمنین (مجمع البیان)

[3]۔ عن الحسن ان فی الاٰیۃ دلالۃ علی ان الامر بالمعروف والناھی عن المنکر یعنی منزلۃ عند اللہ منزلۃ الانبیاء فلھٰذا ذکرھم عقبھم وروی ان رجلا قام الی رسول اللہ ﷺ فقال ای الجھاد افضل فقال افضل الجھاد کلمۃ حق عند سلطان جائر (نیشاپوری)

”یہ وہ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں اکارت ہو گئے اور ان کے مددگار کوئی نہیں ہیں [1]۔

”اکارت“ ہونے کا تعلق ایسے ہی افعال سے ہوسکتا ہے جو اگر صحیح طور پر وقوع میں آئیں تو ان سے دنیا میں مدح و ثناء اور آخرت میں جزاء و ثواب کا استحقاق ہوگا۔ وہ مورد آیت میں نمایاں طور پر یہ ہے کہ یہ لوگ اہل کتاب تھے جو کچھ سچے انبیاء کے ماننے والے تھے اور ظاہر ہے کہ ان انبیا پر ایمان اور ان کی تعلیمات پر عمل اگر صحیح طریقہ سے ہوتا تو وہ دنیا و آخرت میں سعادت کا باعث ہونا ہی چاہیے [2]۔

نیز خیرات ایثار اور رفاہ عام کے جو کام جو غیر مذاہب کے لوگ اکثر انجام دیتے ہیں [3]۔

مگر وہ اول تو ان انبیاء کے اصل تعلیمات سے دور ہو کر ایمان و عمل کے صحیح معیار پر قائم نہ رہے اور دوسرے بعد میں آنے والے سچے نبی حضرت خاتم الانبیاء کی رسالت کے منکر ہو کر کفار میں داخل ہو گئے اور ایمان صحیح کے جوہر سے جو صحت اعمال کی بھی شرط ہے محروم ہو گئے۔ اس لئے اب ان کا وہ ایمان بھی جو گزشتہ انبیاء اور کتب پر تھا نتیجہ خیز نہ رہا اور عبادات و اعمال کا بھی کوئی حاصل نہ رہا یہی ہے جسے قرآن مجید نے کہا ہے:

حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ یعنی ان کے اعمال اکارت ہو گئے [4]۔

دنیا میں اس طرح اکارت گئے کہ وہ کسی تعریف اور نیک نامی کے مستحق نہ ہوئے اور نہ ان دنیوی مفادات ہی برقرار رہے [5] اور آخرت میں اس لئے کہ ان پر کوئی ثواب نہ ملا بلکہ وہ مبتلائے عذاب ابدی ہوئے [6]۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يُدۡعَوۡنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ وَهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۲۳﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا انہیں جن کو کتاب کا کچھ علم ملا ہے [7] کہ انہیں دعوت دی جاتی ہے اللہ کی کتاب کی طرف کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے۔ اس پر ایک بڑا گروہ ان میں کا بے اعتنائی کرتے ہوئے روگردانی اختیار کر لیتا ہے۔“

یہ یہود کا ذکر ہے اور کتاب سے مراد یہاں توریت ہے اور یہ کہ انہیں کتاب کا کچھ علم ملا ہے اس لئے کہا گیا ہے کہ اب جو کتاب ان کے پاس موجود تھی اس میں بڑی آمیزش تھی لیکن کچھ حصہ پاشاں طریقہ پر اصل کتاب الٰہی کا بھی موجود ہے [8] وہ بھی بہت سے حقائق کا حامل ہے اور

---

[1]۔ نہیں ہیں ان کے لئے حمایتی (تاج العلماء)

[2]۔ یرید باعمالهم ماهم علیه من اذعائهم التمسك بالتورته واقامة شریعة موسیٰ (مجمع البیان)

[3]۔ اعمالهم التی فیها حسن كالاحسان الی الفقه والمعانی ونحو ذلك (البلاغی)

[4]۔ حبوط العمل عبارة عن وقوعه علیٰ خلاف الوجه الذی یستحق علیه الثواب (مجمع)

[5]۔ اذلم ینالوا بها المدح والنساء ولم تحقن وصائهم واموالهم (صافی)

[6]۔ اذلم یستحقوا بها مثوبه فصارت كان لم تكن (مجمع)

[7]۔ راده شده اندیک پارۂ از علم کتاب (شاہ ولی اللّٰہ) ایک جرگہ (تاج العلماء)

[8]۔ كانوا یعلمون بعض ما فیه (مجمع البیان) ان التورٰته والانجیل قد حرّ فاوبدلا فی اكثرهما (البلاغی)

حجت تمام ہونے کے لئے کافی ہے۔ لہٰذا انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی کتاب ہی کی رو سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور ان کے پیغام پرغور کر لیں مگر وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوتے اور روگردانی اختیار کرتے ہیں۔

بعض روایات میں شان نزول یہ وارد ہوئی ہے کہ دو یہود کا مقدمہ جو زنا کے مرتکب ہوئے تھے رسولؐ کے سامنے پیش ہوا اور آپ نے شریعت موسوی کے مطابق ان کو سزا دینا چاہی تو وہ بگڑ کر چلے گئے۔ اسی کا اس آیت میں ذکر ہے[۱]۔

بعض دوسری روایات میں ہے کہ حضرتؐ نے ایک جماعت کو یہود میں سے دین حق کی دعوت دی تو انہوں نے پوچھا آپ کس دین پر ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا ''ملت ابراہیمی پر'' انہوں نے کہا ابراہیمؑ تو خود یہودی تھے۔ آپ نے فرمایا کہ توریت لے آؤ، اس سے اس کا فیصلہ ہو جائے مگر انہوں نے اس سے انکار کیا[۲]۔

ان دونوں روایتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ''انہیں دعوت دی جاتی ہے اللہ کی کتاب کی طرف'' اس میں کتاب سے توریت مراد ہے مگر علامہ بلاغیؒ کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ ان روایتوں کو نا قابل قبول قرار دیتے ہیں، اس بناء پر کہ توریت جب کہ تحریف شدہ ہے تو پیغمبر خداؐ اس کی طرف کیوں کر دعوت دے سکتے تھے؟ پھر یہ کہ اس توریت میں وہ باتیں ہیں ہی نہیں جن کے لئے ان روایتوں میں بطور استشہاد اس کی طرف دعوت کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے ان کا خیال ہے کہ کتاب اللہ سے مراد اس جملہ میں قرآن ہے جس کی حقانیت خود ان کی کتابوں سے ثابت تھی[۳]۔

جناب ابن عباسؓ کی روایت سے علامہ بلاغیؒ کی تائید ہوتی ہے[۴]۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

''یہ اس وجہ سے ہے کہ ان کا قول یہ رہا ہے کہ ہمیں تو آتش جہنم چھوئے گی بھی نہیں سوا چند گنتی کے دنوں کے اور جو انہوں نے جھوٹ بنا رکھے تھے انہوں نے ان کو دین کے بارے میں مبتلائے غفلت کر رکھا ہے''[۵]۔

یہود کے اس مزعومہ کا ذکر پہلے پارے میں ہو چکا ہے۔

''جو انہوں نے جھوٹ بنا رکھے ہیں'' ان میں سے ایک تو یہی کہ ہمیں بس اتنے دن سزا ملے گی جتنے دن ہمارے بزرگوں نے گوسالہ پرستی کی۔ اس کے علاوہ یہ کہ ہمارے آباؤ اجداد جو تمام انبیاء مرسلین کی حیثیت رکھتے ہیں وہ ہمارے بچانے کے لئے کافی ہیں یا جیسے نصاریٰ نے یہ تصور کیا کہ مسیح سولی پر چڑھ گئے تو بس ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو گئے اور انہوں نے ہمیشہ کے واسطے عذاب سے چھٹکارا دے دیا غرض ایسی ہی

---

[۱]۔ جلالین و مجمع البیان بحوالۂ ابن عباسؓ

[۲]۔ صافی ملّا محسن فیض کاشانیؒ

[۳]۔ هو القرآن الذی قامت علیهم الحجّة بانه کتاب الله بدلائل اعجازه و بشری کتبهم (البلاغی)

[۴]۔ عن ابن عباس رضی الله عنه انه القرآن و لیس ببعید لانهم دعوا الیه بعد قیام الحجج علیٰ انه کتاب من عند الله (نیشاپوری)

[۵]۔ مغرور کر دیا تھا (تاج العلماء)

غلط اندیشیاں جو جزاؤ سزا کی اہمیت کو کم کریں [1]۔

اب اگر مسلمان سب یا ان میں سے کوئی طبقہ اس قسم کے تصورات قائم کرلے تو جو بات قرآن نے ان یہود و نصاریٰ کے بارے میں کہی ہے وہی ان کے بارے میں صادق آئے گی۔

اصل اصول یہ ہے کہ ہر شخص کو فرائض کا احساس اور سزائے اخروی کا اندیشہ قائم رکھنا چاہیے اور کسی ایسے غلط تصور کو ذہن میں جگہ نہیں دینا چاہتے جو انسان کا محاسبہ الٰہی سے غافل بنادے۔

فَكَيۡفَ إِذَا جَمَعۡنَٰهُمۡ لِيَوۡمٖ لَّا رَيۡبَ فِيهِ وَوُفِّيَتۡ كُلُّ نَفۡسٖ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُونَ ٢٥

"اس کے بعد کیا ہوگا [2] اس وقت جب ہم انہیں اکٹھا کریں گے اس دن کے لئے جس میں کوئی شبہ نہیں اور ہر ایک کو جو کچھ اس نے کمایا ہے پورا پورا ادا کردیا جائے گا اور ان پر کچھ بھی ظلم نہیں ہوگا۔"

یعنی یہاں یہ ان مزعومات سے دل بہلالیں مگر جب قیامت کا دن آجائے گا اور حساب کا وقت سامنے ہوگا تو اس دن یہ خیالات ان کے کچھ کام نہ آئیں گے۔

"جب ہم اکٹھا کریں گے اس دن کے لئے" بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں لام کے معنی فی کے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ "جب ہم اکٹھا کریں گے اس دن" [3]۔

مگر علامہ طبرسیؒ اس سے متفق نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دن جمع کریں گے اس سے یہ معنی پیدا نہیں ہوتے کہ اس دن کسی خاص ضرورت سے جمع کیا جارہا ہے مگر "اکٹھا کریں گے اس دن کے لئے" اس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ اس دن کوئی خاص اہم مقصد ہے جس کے لئے اکٹھا کرنا ضروری ہے اور وہ اس مقام پر جزاء وسزا جو بمقتضائے عدل لازم ہے [4]۔

قُلِ ٱللَّهُمَّ مَٰلِكَ ٱلۡمُلۡكِ تُؤۡتِي ٱلۡمُلۡكَ مَن تَشَآءُ وَتَنزِعُ ٱلۡمُلۡكَ مِمَّن تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَن تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَآءُ بِيَدِكَ ٱلۡخَيۡرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٞ ٢٦ تُولِجُ ٱلَّيۡلَ فِي ٱلنَّهَارِ وَتُولِجُ ٱلنَّهَارَ فِي ٱلَّيۡلِ وَتُخۡرِجُ ٱلۡحَيَّ مِنَ ٱلۡمَيِّتِ

[1]۔ عن ان النار لن تمسّھم الّا ایّا ما تلائل وان اٰبأھم الانبیاء یشفعون لھم او انہ تعالیٰ وعد یعقوب ان لا یعذب اولادہ (صافی) قولھم نحن ابناء ھو احباءُہ عن قتادۃ (مجمع البیان)

[2]۔ کیا حال ہوگا (تاج العلماء)

[3]۔ لیوم ای فی یوم (جلالین)

[4]۔ ای الجزاء لیوم ــــ ولو قال جمعناھم فی یوم لم یدل علی الجزاء واللام یدل علی ذلک (مجمع البیان)

وَ تُخۡرِجُ الۡمَیِّتَ مِنَ الۡحَیِّ ۫ وَ تَرۡزُقُ مَنۡ تَشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

"کہو اے خدا، سلطنت کے مالک! جسے تو چاہتا ہے سلطنت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت سلب کر لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تو عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت نصیب کرتا ہے تیرے قبضہ میں بھلائی ہے بلاشبہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو جاندار کو نکالتا ہے بے جان سے اور بے جان کو نکالتا ہے جان دار سے اور جسے چاہتا ہے بے سان و گمان کے روزی عطا کرتا ہے۔"

نیرنگ زمانہ سے اللہ کی قدرت کا ظہور:

دن رات میں داخل کرنا اور رات کا دن میں داخل کرنا محسوس طریقہ پر گرمی اور جاڑے میں رات اور دن کی زیادتی کمی کی شکل میں سامنے آتا ہے[1] مگر اس کا تذکرہ یہاں انقلابات روزگار کی طرف ذہن کو منتقل کرنے کے لئے ہے جیسے ہماری زبان میں بھی ایک محاورہ یہ ہے کہ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں وہی مفہوم یہاں بھی ان الفاظ سے برآمد ہوتا ہے۔

"جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے نکالنا ہے" اس کا ایک محسوس مشاہدہ ہے انڈے کا برآمد ہونا طائر سے اور طائر کے بچہ کا نکلنا انڈے سے اور جاندار کا پیدا ہونا نطفہ سے اور نطفہ کا باہر آنا جاندار سے اور اس کی تشریح احادیث میں ہوئی ہے کہ کافر کی اولاد میں سے مومن نکل آتا ہے اور کبھی مومن کی اولاد میں کافر پیدا ہو جاتا ہے[2]۔

نظم قرآنی کو مرضی الٰہی کے مطابق سمجھنے والے جو آیات میں ربط قائم کرتے ہیں انہوں نے ان آیات کا تعلق گزشتہ آیات سے قائم کرنے کے لئے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ:

"یہود جانتے ہیں کہ جو اول ہم میں بزرگی تھی وہی ہمیشہ رہے گی اللہ کی قدرت سے غافل ہیں۔ وہ جس کو چاہیے عزیز کرے اور سلطنت دیوے جس کو چاہیے چھین لیوے اور ذلیل کرے اور جاہلوں سے کامل پیدا کرے اور کاملوں سے جاہل اور جس کو دیا ہے رزق بے حساب دیوے" (موضح القرآن)

ہم ترتیب قرآن کے مطابق تنزیل نہ ہونے کی بناء پر یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیتیں یہود سے تعلق رکھتی ہیں بہر حال ان الفاظ کے عام مفہوم کے تحت میں بھی یہود کے لئے جو نتیجہ برآمد کیا گیا ہے وہ درست ہے۔

اللہ کی جانب سے سلطنت عطا ہونے کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ وہ کسی کو اہل جانتے ہوئے اپنی جانب سے سلطنت کا حق دار قرار دے اس طرح کا عطائے ملک اس کی جانب سے انبیاء و مرسلین اور ائمہ دین کے لئے ہوتا ہے اس معنی سے اس جملہ کا استعمال قرآن مجید میں طالوت کے واقعہ میں ہوا ہے جب قوم نے کہا:

---

[1] ۔ای تنقص من اللیل و تجعل ذٰلک النقصان زیادۃ فی النہار و تنقص من النہار و تجعل ذٰلک النقصان زیادۃ فی اللیل (صافی)

[2] ۔روی ذلک عن ابی جعفر علیہ السلام و ابی عبداللہ علیہ السلام (مجمع البیان) و فی المعانی عن الصادق علیہ السلام ان المؤمن اذا مات لم یکن میتا و ان المیت ھو الکافر ثم فسّر الایۃ بما ذکر (صافی)

اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ

اسے ہم پر سلطنت کا حق کہاں سے ہوسکتا ہے حالانکہ ہم اس سے زیادہ سلطنت کے حق دار ہیں اور اسے مال میں وسعت تو ملی ہی نہیں ہے (بقرہ:۲۴۷)

تو نبیؑ نے جواب دیا:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

بلاشبہ اللہ نے اسے تم پر برگزیدہ کیا ہے اور اسے علم اور جسمانی طاقت میں زیادتی دی ہے اور اللہ اپنی طرف کی سلطنت جسے چاہے دیتا ہے۔

اس عطائے ملک کا لازمہ ہے کہ حقانیت مگر اس کے ساتھ یہ ضروری نہیں کہ قوم سر تسلیم خم کردے جیسا کہ قصہ طالوت میں باوجود یہ کہ اللہ نے حاکم بنادیا تھا پھر بھی قوم نے تو پہلے اس کی تسلیم ہی کرنے میں چون و چرا کی اور پھر بادل ناخواستہ اس فوج میں شامل بھی ہوئے تو اطاعت نہیں کی بلکہ عدول حکمی سے کام لیا۔

دوسرے معنی عطائے سلطنت کے یہ ہیں کہ عالم اسباب کے نظام کے ماتحت اپنی تدابیر یا کچھ لوگوں کی منصوبہ سازی یا قوم کے انتخاب یا قہر وغلبہ سے کوئی بادشاہ بن جائے اور خالق اپنی قوت قاہرہ کو اس کے حصول میں سدراہ نہ کرے۔ اس طرح کے عطائے سلطنت سے حقانیت ثابت نہیں ہوتی چنانچہ اس طرح عطاء کی اضافت قرآن مجید میں فرعون کے لئے بھی آئی ہے جب حضرت موسیٰؑ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا:

رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

پروردگارا! تو نے فرعون اور اس کے ارکان وعمائد سلطنت کو اپنی طرف سے سامان آرائش اور بڑے اموال اس دنیوی زندگی میں عطا کیے ہیں (یونس۔۸۸)

اور اکثر مفسرین کی تفسیر کے مطابق نمرود کے لئے بھی:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ

کیا تم نے نہیں دیکھا اسے جس نے ابراہیمؑ سے ان کے پروردگار کے بارے میں بحث وتکرار کی اس بناء پر کہ اللہ نے اسے سلطنت دے رکھی تھی (بقرہ:۲۵۸)

یہاں عطاء کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ نے فرعون اور نمرود کو اس منصب پر مقرر کیا تھا بلکہ یہی ہیں کہ اس نے اپنی قدرت وطاقت کے باوجود ان کے حصول اقتدار میں رکاوٹ پیدا نہیں کی۔

یہاں بظاہر اس جملہ سے کہ جسے تو چاہتا ہے سلطنت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت سلب کرلیتا ہے اسی معنی کا عطائے سلطنت مراد ہے اور اس صورت میں عزت اور ذلت سے مراد بھی دنیوی اسباب عزت وذلت کا حاصل ہونا ہے۔ کیوں کہ حقیقی عزت حالات دنیا سے وابستہ نہیں بلکہ صفات شخصی سے وابستہ ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ.

عزت بس اللہ کے لئے ہے اور اس کے پیغمبر کے لئے اور صاحبان ایمان وعلم کے لئے (منافقون ۔ ۸)
انقلابات زمانہ کی آئینہ بردار جو عزت وذلت ہے پہلے ہی معنی کے اعتبار سے ہے [1] ۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾

"مسلمانوں کو نہ چاہیے کہ وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائیں اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتا [2] سوا اس صورت کے کہ جب ان سے کسی طرح تقیہ کرنا [3] ہو اور اللہ تمہیں اپنے سے ڈرانا چاہتا ہے اور اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔"

حکم تقیہ:

دوست بنائیں کا مطلب یہ ہے کہ کس امر باطل میں ان کے ساتھ عملی یا قولی کسی طرح کا تعاون کریں اور ان کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ اس سے استثناء صورت تقیہ کا ہے جہاں دل انسان کا حقانیت میں مطمئن ہوتا ہے اور زبان یا عمل سے کسی غلط بات کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس کی بنص قرآن اجازت ہے اس لئے کہ خود مسلمان کا جان ومال اور آبرو بھی اللہ کے نزدیک قابل حفاظت ہے لہٰذا جب اور جہاں ان چیزوں کو خطرہ ہو وہاں کا حکم عام حالات سے مختلف ہوگا۔

یہ دل اور زبان کا اختلاف جھوٹ نہیں ہے کہ جس پر اللہ کی لعنت کا استحقاق ہوتا ہے بلکہ وہ ایک فریضہ کا ادا کرنا ہے جو خوف کی بناء پر ہے۔ تفسیر جلالین میں ہے:

تقة مصدر تقى اى تخافوا مخافة فلكم موالاتهم باللسان دون القلب وهذا قبل عزة الاسلام و يجرى فى بلد ليس قويا.

تقاۃ یہ تقیہ کا مصدر ہے یعنی تم کسی طرح کا خوف محسوس کرتے ہو تو تمہیں زبان سے ان کے ساتھ اتحاد کا اظہار جائز ہے نہ کہ دل کے ساتھ یہ اسلام کے طاقت ور ہونے سے پہلے کی بات ہے اور اب بھی جس شہر میں اسلام طاقت ور نہ ہو وہاں یہ حکم جاری ہے۔

یہ کہ اس حکم کا تعلق آغاز اسلام سے تھا مجاہد کی طرف نسبت رکھتا ہے اور وہ اس اعتبار سے درست ہے کہ وہ حالات جن سے اس حکم کا

---

[1] ۔ بان تجعل كله من الفريقين بحسب سير التقدير الجارى بحكمتك فى نظام العالم بتسببك الاسباب وتصيره فى حالة تعد عزا واخرى تعد ذلا (البلاغى)

[2] ۔ يعنى انه منسلخ عن ولاية الله رأسا (نيشا پورى)

[3] ۔ مگر آن کہ دفع شر ایشان کند بنوعی از حذر کردن (شاہ ولی اللہ)

تعلق ہے آغاز اسلام میں زیادہ تھے۔ نہ یہ کہ اصل حکم جوان حالات سے تعلق رکھتا ہے وہ کسی خاص زمانہ سے مخصوص ہے چنانچہ خود اس عبادت میں بھی آخر میں موجود ہے کہ اس کے بعد بھی جہاں حالات ایسے ہوں کہ اظہار حق میں خطرہ ہے وہاں یہ حکم ہوگا علامہ نیشاپوری صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

روی عن الحسن انه قال التقية جائزة الى يوم القيامة وهذا ارجح عند الائمة .(غرائب القرآن)

عوف نے حسن بصری سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ تقیہ روز قیامت تک جائز ہے اور اکابر علماء کے نزدیک زیادہ ترجیح اسی کو ہے۔

آخر کا فقرہ کہ ''اللہ تمہیں اپنے سے ڈرانا چاہتا ہے'' یہ احساس پیدا کرنے کے لئے ہے کہ تقیہ سمجھ بوجھ کر کرو بے محل اس کا استعمال نہ کرو ورنہ غضب الٰہی کے مستوجب ہوگے [1]۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾

''کہہ دیجئے [2] کہ چاہے تم چھپاؤ اسے جو تمہارے سینوں میں ہے یا اسے ظاہر کرو، بہرحال اللہ اسے جان لے گا اور جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے وہ اس سب ہی کو جانتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًاۢ بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾

''اس دن [3] کہ جب ہر شخص جو کچھ اس نے بھلائی کی ہے اسے بھی اپنے سامنے موجود پائے گا اور جو کچھ برائی کی ہے اس نے اسے بھی وہ خواہش رکھے گا کہ کاش اس کے اور اس موقع کے درمیان [4] بڑا فاصلہ ہوتا اور اللہ تمہیں اپنے سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر بڑا مہربان ہے۔''

جو کچھ کیا ہے اسے موجود پائے گا یعنی اس کے ذکر کو نامہ اعمال میں اپنے سامنے پائے گا [5] یا اس کے نتیجہ کو جزاء وسزا کی صورت میں [6]۔

---

[1]۔لاتسترسلوا فی ذلك وتجاوزوا به مقدار الضرورة ____ فان امر الدين عظيم فاحذروا اذن من غضب الله وعقابه (البلاغی)

[2]۔قل یارسول الله ﷺ محذّرا (البلاغی)

[3]۔الاظهر ان العامل فيه يوم (نیشاپوری)

[4]۔بينها وبين ذلك اليوم وهو له (صافی)

[5]۔معنی كون العمل محضرا هو ان يكون ما كتب فيه العمل من الصحائف حاضرا (نیشاپوری)

[6]۔ای جزآء ما عملت (بلاغی)

بعد کا جملہ ''خواہش رکھے گا کہ کاش اس کے اور اس موقع کے درمیان بڑا فاصلہ ہوتا'' یعنی '' کاش یہ منزل اس کے سامنے نہ آتی۔'' یہ انہی سے متعلق ہے جن کا نتیجہ عمل حسرت ناک ہو، ایک دوسرا احتمال یہ ہے کہ بینہ کی ضمیر سُوْءِ یعنی برائی ہی کی طرف راجع ہو [1]۔

آخر میں جو ارشاد ہوا کہ ''اللہ بندوں پر بڑا مہربان ہے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا اپنے سے خوف دلانا اس کے لطف و مہربانی کا نتیجہ ہے کہ یہی خوف تمہاری تعمیر حال و استقبال کا ذمہ دار ہے [2]۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾

''کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے مہربان۔''

معیار محبتِ الٰہی اتباعِ رسول:

دنیائے محبت میں اس سے بڑھ کر بلندی کیا ہوگی کہ مرکز اس رشتہ کا وہ ذات ہو جائے جو مرکز ہر خیر و کمال ہے مگر محبت کا زبانی دعویٰ کافی نہیں ہے جب تک عمل اس کا گواہ نہ ہو اور سب سے بڑھ کر عملی تقاضا محبت کا یہ ہے کہ جس سے محبت ہو انسان اس کی پسند کی باتوں کو پسند کرے اور ناپسند باتوں سے پرہیز کرے۔ اب خدا بذات خود ہمارے مشاہدہ میں نہیں آ سکتا اور نہ ہم براہ راست اس کی پسند و ناپسند کو معلوم کر سکتے ہیں لہٰذا اس کی پسند و ناپسند کا آئینہ اس ذات کا عمل ہو سکتا ہے جو اسے محبوب ہے اور تمام کائنات میں محبوبیت الٰہی کے اعلیٰ نقطہ پر جو ذات تھی وہ حضرت ختم المرسلین محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی تھی اس لئے محبت الٰہی کے دعویداروں سے اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطالبہ ہوا [3]۔

مولانا فرمان علی صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔

''خداوند عالم نے اپنی محبت کی کسوٹی حضرت رسولؐ کی پیروی کو قرار دیا ہے پس محض دعویٰ محبت خدا اور رسولؐ کا کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا جب تک اپنی کارگزاریوں سے ثابت نہ کر دے کہ وہ رسولؐ کا سچا پیرو ہے۔ اسی طرح شیعہ علیؑ ہونے کا دعویٰ اس وقت زیبا ہے جب اپنے افعال، اعمال، رفتار و گفتار سے یہ کر دکھائے کہ جو کام جناب امیرؑ جس طرح کرتے تھے اسی طرح وہ بھی کر گزرے۔ فقط نام کا شیعہ مومن ہونا کافی نہیں ہے۔''

ملا محسن فیض کاشانی نے باوجودیکہ تفسیر میں عموماً کافی اختصار سے کام لیا ہے مگر اس آیت کی تفسیر میں محبت اور اتباع کے تعلق باہمی پر اچھا

---

[1]۔ بینہا ای معصیتہا (مجمع البیان) اس کے اور اس بدی کے درمیان میں (تاج العلماء)

[2]۔ اشارۃ الیٰ انہ تعالیٰ انما نہاھم و حذرھم رافۃ بہم و مراعاۃ اصلاحھم (صافی)

[3]۔ قال الحسن وابن جریج زعم اقوام علیٰ عہد رسول اللہ ﷺ انھم یحبون اللہ فقالوا یا محمد ﷺ انّا یحبّ ربنا فانزل اللہ ھذہ الایۃ (نیشاپوری)

خاصہ سیر حاصل تبصرہ فرما دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

فی الکافی والعیاشی عن الصادق علیہ السلام اھل الذین الّا الحب ثم تلا ھٰذہ الایۃ اقول المحبۃ من العبد میل النفس الیٰ شی الکمال ادرکتہ فیہ بحیث یحملھا علیٰ ما یقربھا الیہ ومن اللہ رجاہ من العبد و کشف الحجاب عن قلبہ والعبد اذا علم ان الکمال الحقیقی لیس الّا اللہ وان کل ما یراہ کمالا من نفسہ او غیرہ فھو من اللہ وباللہ والی اللہ لم یکن حبّہ الا اللہ وفی اللہ وذلك یقتضی ارادۃ طاعتہ والرغبۃ فیما یقرّبہ الیہ فعلا مۃ المحبۃ ارادۃ الطاعۃ والعبادۃ والا جتہاد البلیغ فی الاتباع من کان وسیلہ الیٰ معرفۃ اللہ تعالیٰ و محبۃ من کان عارفا باللہ محبا ایّاہ محبوبا لہ فانّ من ھٰذہ صفاتہ انّما قال ھٰذہ الصّفات بالطاعۃ علیٰ الوجہ المخصوص وھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومن بحذ وخذوہ فمن احبّ اللہ لا بدلہ من اتباع الرسول فی عبادتہ وسیرتہ واخلاقہ قاحوالہ حتی یحبّہ اللہ فان بذلك یحصل التقرب الی اللہ وبالتقرب یحصل محبۃ اللہ تعالیٰ ایاہ کما قال تعالیٰ وان العبد لیتقرّب الیٰ بالنوافل حتّٰی احبّہ وایضا لما کان الرّسول حبیب اللہ فکل من یدعی محبّۃ اللہ لزمہ محبّۃ الرسول لان محبوب المحبوب محبوب ومحبۃ الرسول اتما تکون بمتا بعتہ وسلوك سبیلہ قولا وعملا وخلقا وحالا وسیرۃ وعقیدۃ ولا یتمشی دعوی محبۃ اللہ الّا بہٰذا فانہ قطب المحبۃ ومظھرھا فمن لم یکن لہ من متابعۃ نصیب لم یکن لہ من المحبۃ نصیب ومن تابعہ حق المتابعۃ ناسب باطنہ وسرّہ وقلبہ ونفسہ باطن الرسو وسرّہ وقلبہ ونفسہ وھو مظھر محبۃ اللہ فلزم بہذہ المناسبۃ ان یکون محبۃ اللہ بقدر نصیبہ من المتابعۃ فیلقی اللہ محبۃ علیہ ویسری من باطن روح الرّسول صلی اللہ علیہ وسلم نور تلك المحبۃ الیہ فیکون محبوبا للہ محبّا لہ ومن لم یتابعہ خالف باطنہ بالاطاعۃ الرسول فبعد عن وصف المحبوبیۃ وزال المحبۃ عن قلبہ اسرع مایکون اذا لو یحبہ اللہ لم یکن محبالہ وفی حکم الرّسول من امر اللہ والرسول بحبّہ واتباعہ وھم الائمۃ والاوصیآء فی الکافی الصّادق علیہ السلام فی حدیث من سرّہ ان یعلم ان اللہ یحبہ فلیعمل بطاعۃ اللہ ولہ تبعنا لم تسمع قول اللہ عزّو جل لنبیہ قل ان کنتم تحبو ن اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم واللہ لا یطیع اللہ عبدا ابدا الّا ادخل اللہ علیہ فی طاعۃ اتباعنا ولا ولا واللہ لا یتبعنا عبدا ابدا الّا احبّہ اللہ ولا واللہ لا یدع احد اتباعنا ابدا الّا ابغضنا ولا واللہ لا یبغضنا احدا ابدا الّا عصی اللہ ومن مات عاصی اللہ اخزاہ اللہ واکب علیٰ وجھہ فی النار (صافی)

”کافی اور تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ دین کیا محبت کے سوا کچھ اور ہے؟ پھر حضرت نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ میں کہتا ہوں کہ محبت بندہ کی طرف سے نفس کا راغب ہونا ہے کسی چیز کی طرف اس کمال کی وجہ سے جسے اس نے شے میں محسوس کیا ہے اس طرح کہ وہ رغبت متقاضی ہوتی ہے اس کی کہ یہ وہ باتیں انجام دے جو اس سے نزدیک ہونے کا باعث ہوں اور اللہ کی طرف سے محبت کے معنی اس کا خوش ہونا ہے بندہ سے اور پردہ کا ہٹا دینا ہے اس کے دل سے اور بندہ نے جب یہ جان لیا کہ حقیقی کمال سوا اللہ کے کسی کے لئے نہیں ہے اور جو چیز از قبیل کمال نظر آتی ہے خواہ اپنے میں یا کسی دوسرے میں وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے اور اللہ کے سبب سے ہے اور اللہ کی

طرف راجع ہے تو اس کی محبت بس اللہ کے لئے ہوگی اور اللہ کے بارے میں ہوگی اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ اس کی اطاعت کو خواہش مند ہو اور ان چیزوں کی طرف راغب ہو جو اس سے قریب ہونے کی باعث ہیں تو محبت کی پہچان خواہش مند ہونا ہے اطاعت اور عبادت کا اور پوری پوری کوشش اس ذات کی پیروی میں جو اس کا وسیلہ ہے اللہ کی معرفت کی طرف اور اس کی محبت ہے جو اللہ کا عارف اور اس کا محب اور محبوب ہے اس لئے کہ جس کی یہ صفتیں ہیں اس نے یہ اوصاف خاص طور پر اطاعت الٰہی سے ہی پائے ہیں اور وہ رسول خداؐ اور ان کے نائب افراد ہیں تو جو اللہ کا دوست ہوگا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ رسولؐ کی پیروی کرے ان کی عبادت، سیرت، اخلاق اور حالات میں تاکہ اللہ بھی اسے دوست رکھے کیونکہ اس طرح اللہ سے تقرب حاصل ہوگا اور تقرب کے ساتھ اللہ کو اس سے محبت ہوگی جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے کہ بندہ نوافل کے ذریعہ سے مجھ سے قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اسے محبوب رکھنے لگتا ہوں اور نیز چوں کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محبوب خدا ہیں لہٰذا جو محبت خدا کا دعویٰ رکھتا ہو اسے رسولؐ کی محبت لازم ہے اس لئے کہ محبوب کا محبوب محبوب ہوتا ہے اور رسولؐ کی محبت کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان کی پیروی کرے اور ان کے راستے پر چلے گفتار، کردار، اخلاق، حالات، سیرت اور عقیدہ میں اور بغیر اس کے اللہ کی محبت کا دعویٰ صحیح نہیں ہوسکتا اس لئے کہ یہی محبت کا اصل محور اور اس کا مظہر ہے۔ تو جسے آپ کی متابعت کا کوئی حصہ نصیب نہیں، اس کا محبت میں کوئی حصہ نہیں ہوسکتا اور جو آپ کی پورے طور پر پیروی کرے گا اس کا باطن، ضمیر، دل اور نفس رسولؐ کے باطن، ضمیر، دل اور نفس سے ہم آہنگ ہو جائے گا اور آپ محبت الٰہی کا مرکز ہیں تو اس سے ہم آہنگی کی وجہ سے لازم ہوگا کہ اس پیرو کے لئے ایک حصہ محبت الٰہی میں ہو جائے اس مقدار کے لحاظ سے جتنی پیروی کی ہے تو اللہ اپنی محبت اس پر مبذول فرماتا ہے اور رسولؐ نے ضمیر کے اندر سے اس محبت کی روشنی اس کی طرف پہنچتی ہے تو یہ اللہ کا محبوب بھی ہو جاتا ہے اور محب بھی اور آپ کی پیروی نہیں کرتا اس کا ضمیر رسولؐ کے ضمیر سے مختلف ہوتا ہے تو وہ محبوب ہونے کے معیار سے ہٹ جاتا ہے اور محبت انتہائی تیزی کے ساتھ اس کے دل سے دور ہو جاتی ہے اس لئے کہ اگر اللہ کو اس سے محبت نہ ہو تو یہ اس کا محبّ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور رسولؐ ہی کے حکم میں وہ ہستیاں ہیں جن کی محبت اور پیروی کا اللہ اور رسولؐ نے حکم دیا ہے اور وہ آئمہ دینؑ اور اوصیائے رسولؐ ہیں۔ کافی میں امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث کے ذیل میں ہے کہ جو اس بات کے جاننے سے خوش ہو کہ اللہ اسے دوست رکھتا ہے تو اسے اللہ کی اطاعت پر عمل کرنا چاہیے اور ہماری پیروی کرنا چاہیے۔ کیا تم نے ارشاد الٰہی نہیں سنا جو اس نے اپنے رسولؐ سے فرمایا کہ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا، بخدا کبھی بندہ اللہ کی اطاعت نہیں کرے گا مگر یہ کہ اللہ اس کے لئے اپنی اطاعت میں ہماری پیروی بھی داخل کرتا ہے اور بہ خدا کوئی بندہ ہماری پیروی نہیں کرے گا مگر یہ کہ اللہ اسے دوست رکھے گا اور بہ خدا ہماری پیروی کوئی کبھی نہیں چھوڑے گا مگر یہ کہ وہ ہمارا دشمن ہوگا اور بخدا کوئی ہمارا کبھی دشمن نہیں ہوگا مگر یہ کہ وہ اللہ کا نافرمان ہوگا اور جو دنیا سے اٹھے اس عالم میں کہ وہ اللہ کا نافرمان ہو اسے اللہ رسوا کرے گا اور منہ کے بل اسے دوزخ میں ڈال دے گا۔

اس میں تمام اہم اور ضروری پہلو اتنی تفصیل کے ساتھ آگئے ہیں کہ اس پر نہ کسی تبصرہ کی ضرورت ہے۔ نہ اس کے آگے کچھ کہنے کی مزید حاجت ہے۔

قُلۡ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝۳۲

”کہہ دیجئے کہ فرماں برداری کرو اللہ اور پیغمبر کی، اب اگر تم روگردانی کرتے ہو تو بلاشبہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔“

بعید نہیں ہے کہ اس آیت کا تعلق اس کے پہلے ہی والی آیت سے ہو یعنی محبت خدا کے دعویداروں سے یہ کہلوایا گیا کہ وہ رسولؐ کا اتباع کریں اور انہی سے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اگر اللہ سے محبت رکھتے ہو تو پھر اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو یعنی ان کے احکام کی تعمیل کرو اس لئے کہ محبت کی سچائی اطاعت ہی سے وابستہ ہے [1] ۔

چوں کہ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ محبوب بھی اس سے دل بستگی محسوس کرے۔ اس لئے گزشتہ آیت میں حکم اتباع دینے کے بعد یہ کہا تھا کہ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ یعنی ایسا ہوا تو اللہ تم سے محبت رکھے گا جو کہ تمہاری سچی محبت کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ اس کے مقابلے میں ادھر یہ کہا جا رہا ہے کہ اِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡکٰفِرِیۡنَ ۔

تولوا کا لفظ ماضی بھی ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ اگر وہ رو گردانی کریں [2] اور مضارع بھی ہوسکتا ہے۔ اس طرح یہ معنی ہوں گے کہ اگر تم روگردانی کرو [3] ۔

پہلی صورت میں رسولؐ کا مقولہ جس کے کہنے کا حکم ہوا ہے: **اطیعوا اللہ و الرسول** پر ختم ہو جاتا ہے اور **فان تولوا** یہ خود خالق کا ارشاد ہے اور دوسری صورت میں **فان تولوا** بھی جز مقولہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے یعنی جو بات رسولؐ کے کہلوائی گئی ہے اس میں یہ ہے کہ اگر تم روگردانی کرو تو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

چوں کہ اس میں تسلسل کے ساتھ روانی زیادہ محسوس ہوتی ہے اس لئے میں اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

اب مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اطاعت سے انحراف عام کیا تو عملاً یہ کفر ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہرگز نہیں ہوسکتا اور اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا لہٰذا اب وہ محبت کا نتیجہ جو **یحببکم اللہ** کی صورت میں تھا تم سے متعلق نہیں ہوسکتا اور اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارا دعویٰ محبت بے حقیقت اور بے سود ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۙ۳۳﴾ ذُرِّیَّۃًۢ بَعۡضُہَا مِنۡۢ بَعۡضٍ ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿ۚ۳۴﴾

"بلاشبہ اللہ نے منتخب کیا آدمؑ، نوحؑ، خاندان ابراہیمؑ اور خاندان عمرانؑ کو تمام جہانوں پر ایک مسلسل نسل کی صورت میں جن کے بعض بعض سے ہیں [4] اور اللہ سننے والا ہے بڑا جاننے والا۔"

---

[1] ۔ یعنی بندے کی محبت یہی ہے کہ شوق سے اللہ کے حکم پر دوڑے (موضح القرآن) معناہ ان کنتم تحبون اللہ کما تدعون فاظھروا دلالۃ صدقاتکم بطاعۃ اللہ وطاعۃ رسولہ (مجمع البیان)

[2] ۔ پس اگر رد گردانیدند (شاہ ولی اللہ) اعرضوا عن الطاعۃ (جلالین) فان اعرضوا عن طاعۃ اللہ ورسولہ (مجمع البیان) اس پر بھی روگردانی کریں (تاج العلماء)

[3] ۔ پس اگر پھر جاؤ (شاہ رفیع الدین) یحتمل المعنی والمضارعۃ بمعنی فان تتولّوا (صافی)

[4] ۔ یعنی انہم ذرّیۃ واحدۃ متسلسلۃ بعضھا متشعب من بعض (صافی)

آل عمران کون ہیں؟:

خاندان عمران میں حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ بھی ہیں کہ جو ابن عمران تھے اور جناب عیسیٰؑ بھی ہیں کہ جو مریمؑ بنت عمران کے فرزند ہیں اور یہ عمران جس کی طرف موسیٰؑ اور ہارونؑ اور پھر جناب عیسیٰؑ کی نسبت ہے ایک ہی شخص کا نام نہیں ہے بلکہ وہ عمران جن کے فرزند موسیٰؑ وہارونؑ تھے بہت مقدم تھے ان عمران سے جن کی دختر جناب مریمؑ تھیں [۱]۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہاں لفظ عمران بطور علم مستعمل نہیں ہے جس کا مدلول جزئی حقیقی ہو، ورنہ ان میں سے ایک ہی شخص مراد ہوسکتا ہے دونوں ایک ساتھ مراد نہیں ہوسکتے بلکہ عمران کا لفظ بمعنی ''مسمّی بہ عمران'' مجازی تصرف کے ساتھ استعمال ہوا ہے لہٰذا اگر عالم انساب میں کوئی تیسری مسمّٰی بعمران ہے تو اس کی نسل بھی اس آل عمران کے عنوان میں داخل ہوسکتی ہے اور اب بعض روایات سے جو یہ ثابت ہوتا ہے کہ جناب ابو طالب علیہ السلام کا نام عمران ہے اور آل عمران میں حضرت علی ابن ابوطالبؑ کی فضیلت بھی مضمر ہے یہ اس پہلی تفسیر کے لحاظ سے بھی کوئی غلط چیز نہیں ہے اور اس کے بغیر بھی محمد وآل محمد علیہم السلام آل ابراہیم کی فرد اکمل ہونے کے اعتبار سے اس اصطفاء کا مرکز ہیں ہی اور وہ ''آل ابراہیم'' کے نام سے موسوم ہونے کے اس لئے زیادہ حق دار ہوئے کہ وہ ملت ابراہیم ہی کے مبلغ ہوکر دنیا میں تشریف لائے تھے [۲]۔

اسی لئے عیاشی کی روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام سے ہے کہ آپ نے اس آیت کی تلاوت کرکے ارشاد فرمایا کہ:

نحن منهم و نحن بقية تلك العترة.

ہم ان میں سے ہیں اور ہم اس نسل طاہر کے باقی رہنے والے افراد ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ روز عاشورہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اس آیت کی تلاوت فرمائی اور آل محمد کی فضیلت کے ثبوت میں اسے پیش فرمایا [۳]۔

تیسری حدیث میں ہے کہ امام رضاؑ نے مامون الرشید کے سوال پر عترت نبوی کی فضیلت میں اس آیت کو پیش فرمایا۔

جب کہ ایک لفظ اصطفاء ہے جس کے متعلقات ہی کی آخری کڑی ''آل ابراہیم'' ہیں جن میں افضل کائنات محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے آل طاہرین علیہم السلام بھی ہیں تو اب تمام عالمین میں پورے احاطہ واستغراق کے ساتھ اس برگزیدگی کا اعلان بالکل صحیح ہے اور اس کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی کہ اس اصطفاء کو کسی ایک دور کے عالمین سے مخصوص کیا جائے جس کی بعض لوگوں نے بلاضرورت احتیاط برتی ہے [۴]۔

اس کی ضرورت تو اس وقت ہوتی کہ جب اس کا تعلق صرف آدمؑ اور نوحؑ وغیرہ ہوتے جن سے افضل ہستیاں بعد میں پیدا ہوگئیں لیکن جب اس سلسلہ میں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی داخل ہوگئے تو اب وہ کون سا دور ہے جو اس افضلیت کے دائرہ سے باہر ہو جسے فی زمانہ کہہ کر

---

[۱]۔ بين العمرانين الف و ثمان مائة سنة كذا قيل (صافی)

[۲]۔ قد دخل فی آل ابراهيم نبيّنا و اهل بيته (صافی)

[۳]۔ فی المجالس عن الصادق عليه السلام قال قال محمد بن اشعث بن قيس الكندی للحسين عليه السلام يا حسين بن فاطمة اية حرمة لك من رسول الله ليست يغرك قتلا الحسين هذه الاية (صافی)

[۴]۔ ای علیٰ عالمی زمانه (مجمع البيان)

خارج کرنے کی ضرورت محسوس کی جائے؟

اس سلسلہ میں آخری فقرہ کہ ''اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔'' اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ اصطفاء بلا وجہ نہیں ہے بلکہ یہ ان افراد اوران جماعتوں کے امتیازی گفتار وکردار کی بناء پر ہے جس سے خدا خوب واقف ہے [۱]۔

پھر یہ بھی کہ ان بعض کے انتخاب سے کسی معروضہ اور دعا کا بھی تعلق تھا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز: **ومن ذریتی** اور میری اولاد میں سے بھی امام مقرر کیے جائیں۔'' مگر اس کی قبولیت کا انحصار ان افراد کی ذاتی اہلیت پر ہے جس کا اللہ جاننے والا ہے [۲]۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّکَفَّلَهَا زَکَرِیَّا ؕ کُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَکَرِیَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰی لَکِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

''جب کہا عمران کی بیوی نے کہا اے میرے پروردگار! میں منت مانتی ہوں کہ جو میرے پیٹ میں ہے وہ (تیری بارگاہ میں) نذر ہوگا [۳] تو مجھ سے قبول کر یقیناً تو بڑا سننے والا ہے، جاننے والا اب جب ان کے یہاں وہ پیدا ہوئی تو انہوں نے کہا اے میرے پروردگار! یہ تو میرے یہاں لڑکی پیدا ہوئی اور اللہ تو خود ہی خوب جانتا ہے کہ کیا ان کے یہاں پیدا ہوا؟ اور لڑکا لڑکی یکساں نہیں ہوتے اور میں نے اس کا نام مریم رکھا اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں تو اللہ نے اس لڑکی کو بحسن وخوبی قبول کرلیا اور اسے بڑی اچھی نشو ونما دی [۴] اور

---

[۱]۔ واللہ سمیع باقوال الناس علیھم باعمالھم فیصطفی من کان مستقیم القول والعمل (صافی)

[۲]۔ سمیع الدعاء الداعین علیم بما تقتضیہ المصلحۃ (البلاغی)

[۳]۔ معتقد الخدمۃ بیت المقدس لا اشغلہ بشئی (صافی)

[۴]۔ بہت اچھی باڑھ اور پھپھک دی اُسے (تاج العلماء)

اسے زکریاؑ کی کفالت میں دیا[1] جب اس کے پاس زکریا محراب عبادت[2] میں آتے تھے تو اس کے پاس کوئی کھانے کی چیز دیکھتے تھے۔ انہوں نے کہا اے مریمؑ! یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا کہ اس نے کہا وہ اللہ کی یہاں سے ہے۔ یقیناً اللہ جسے چاہتا ہے بے سان وگمان کے روزی عطا کرتا ہے۔"

جناب مریم سلام اللہ علیہا کی ولادت اور نشوونما:

مادر جناب مریمؑ کی دعا کے ذیل میں درمیان کا ایک فقرہ "اللہ تو خود ہی خوب جانتا ہے کہ ان کے یہاں کیا ہوا" یہ نقل قول کرتے ہوئے خود ناقل یعنی حضرت احدیت کی طرف سے اس پر ایک تبصرہ ہے جس کے بعد پھر ان خاتون معظمہ کی مناجات کا تتمہ درج ہوا ہے[3]۔

مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے یہاں بلا وجہ اپنے ترجمہ میں جملوں کی ترتیب کو بدل دیا ہے:۔

(۱)-----قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى

(۲)-----وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ

(۳)-----وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى

انہوں نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"کہنے لگیں اے میرے پروردگار! (اب میں کیا کروں) میں تو یہ لڑکی جنی ہوں" (یہ جملہ نمبر ۱ کا ترجمہ ہوا) اور لڑکا لڑکی کے ایسا گیا گزرا نہیں ہوتا" (یہ جملہ نمبر ۳ کا ترجمہ ہے)

حالانکہ (اس کے کہنے کی ضرورت کیا تھی) جو وہ جنی تھیں خدا اس کے (شان ومرتبہ) سے خوب وقف تھا (یہ جملہ نمبر ۲ کا ترجمہ ہے)

مذکورہ جملوں کے ترجموں میں علاوہ اختلاف ترتیب کے بریکٹ کے الفاظ (گیا گزرا) اور (شان ومرتبہ) مقصود متکلم کے مطابق معلوم نہیں ہوتے۔ مادر جناب مریمؑ کا مطلب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی خدمت مرد جس طرح کر سکتا ہے عورت نہیں کر سکتی۔ اس میں "شان ومرتبہ" "لڑکی کے گئے گزرے ہونے" کا کوئی تصور مضمر نہیں ہے۔

جناب زکریا علیہ السلام محراب عبادت میں جب مریمؑ کے پاس جاتے تھے تو ان کے پاس کچھ کھانے کی چیز پاتے تھے۔ روایات میں اس کی تفصیل یہ درج ہے کہ ان کے پاس پھل رکھے ہوئے ملتے تھے اور وہ بھی بے فصل کے میوے یعنی جاڑوں میں وہ پھل جو گرمی میں ہوا کرتے ہیں اور گرمی میں وہ کہ جو جاڑے میں ہوتے ہیں[4]۔

اور یہ ہونا بھی چاہیے تھا اس لئے کہ اگر عام پھل ہوتے تو یہ شبہ ہوتا کہ کوئی آدمی دے گیا ہے اور اس طرح پاک دامنی جناب مریمؑ پر

---

[1]۔ اور سونپ دی وہ زکریاؑ کو (شاہ رفیع الدین)

[2]۔ المحراب المسجد (البلاغ)

[3]۔ جملة اعتراض من کلامه تعالیٰ (جلالین)

[4]۔ فیجد عندها فاکهة الشتاء فی الصیف وفاکهة الصیف فی الشتاء (جلالین) العیاشی عن الباقر علیہ السلام (صافی)

دھبہ آتا لیکن جب کہ وہ غیر فصل کے پھل ہیں تو اس سے مریمؑ کے اس جواب کی تصدیق ہوتی تھی کہ **ھو من عند اللہ** "وہ اللہ کی طرف کے ہیں"

ہم نے "**بغیر حساب**" کا ترجمہ تقریباً ہر جگہ یہی کیا ہے کہ "بے سان و گمان کے" اس بنیاد پر کہ یہ حساب کا لفظ حسب یحسب والے حساب سے ماخوذ ہے جس کے معنی فارسی میں کہے جاتے ہیں "پنداشتین" اور اردو میں ہوئے سمجھنا اور خیال کرنا۔

اس صورت میں **کل شی عندہ بمقدار** سے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز اس کے یہاں ایک مقدار مقرر کے مطابق ہوتی ہے اس کے ٹکراؤ کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن اکثر مفسرین حساب کو مقدار معیّن اور پیمانے ہی والے حساب کے معنی میں لیتے ہیں اور اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس کی عطا عام اندازوں کی پابند نہیں ہے نہ اسے اپنے خزانہ کی کمی کا اندیشہ ہے کہ وہ ناپ جوک کر دے [1]۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝۳۸

"اسی موقع پر دعا کی زکریاؑ نے اپنے پروردگار سے کہا میرے پروردگار مجھے عطا کر اپنی طرف سے پاک و پاکیزہ [2] نسل یقیناً تو دعا کا سننے والا ہے۔"

جناب زکریا علیہ السلام کی ولادت فرزند کے لئے دعا:

بہت سی باتیں آدمی کو معلوم ہوتی ہیں لیکن کسی ایک مشاہدہ سے معلوم بات کا تصور اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ گویا وہ بات ابھی معلوم ہوئی یہاں یہ صورت حال ایسی ہی ہے۔

جناب زکریا علیہ السلام بہت کبیر السن ہو چکے تھے اور ان کے اولاد نہ تھی۔ قرآن کہ یہ الفاظ کہ اسی موقع پر اسی پس منظر کے مطابق ہیں جو احادیث میں ہے کہ مریمؑ کے پاس بے فصل کے میوے نظر آتے تھے۔ اس کو دیکھ کر زکریا کے دل میں ایک تمنا نے کروٹ لی اور ذہن میں یہ تصور قوت کے ساتھ پیدا ہوا کہ وہ خالق جو بے فصل کے میوے دے سکتا ہے اولاد کے عطا کرنے میں بھی عمر خاص کا پابند نہیں ہے۔ وہ بے فصل کے پھل دیتا ہے تو پیری میں مجھے اولاد بھی دے دے تو اس کی قدرت سے بعید نہیں [3]۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى

---

[1]۔ بغیر حساب لا فی الجریان علی العادۃ ولا علیٰ مقدار الضرورۃ (البلاغی)

[2]۔ صاف ستھری (تاج العلماء)

[3]۔ فی ذلک المکان او الوقت (صافی) ای عند ذلک الذی رأیٰ من فاکھۃ الصیف الشتآء و فاکھۃ الشتآء فی الصیف (مجمع البیان) علم ان القادر علی الاتیان بالشئی فی غیر حینہ قادر علی الاتیان بالولد علی الکبر (جلالین) زکریاؑ جو ساری عمر اولاد سے ناامید تھے اب امیدوار ہوئے کہ شاید وہ بے موسم مجھ کو بھی ملے (موضح القرآن)

مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾

''تو انہیں فرشتوں نے آواز دی اس حالت میں کہ وہ کھڑے ہوئے محراب میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اللہ آپ کو یحییٰ علیہ السلام کی خوشخبری دیتا ہے جو تصدیق کرنے والا ہوگا اللہ کے ایک کلمہ کی اور سردار ہوگا اور انتہائی ضبط نفس رکھنے والا اور نبی ہوگا نیکوکار جماعت میں سے۔''

ولادت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت:

''فرشتوں''، یعنی فرشتوں کی جنس، نہ یہ کہ وہ نداد ینے والے بہت سے فرشتے تھے، ایک نہ تھا[1]۔

بشارت میں بچہ کے نام کا درج ہوجانا، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ نام اس بچہ کا خالق نے رکھدیا ہے[2] یہ شرف اولین میں فقط جناب یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مختص معلوم ہوتا ہے اور آخرین میں خمسۂ نجباء بلکہ ہمارے معصومینؑ اس شرف کے حامل ہیں۔

اللہ کے کلمہ سے مراد جناب عیسیٰؑ ہیں جن کی بشارت دینے کے لئے جناب یحییٰ علیہ السلام بھیجے جا رہے تھے اور ان کا وصف جو حصور ہونے کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے عام معنی جو ضبط نفس کرنے والے کے ہیں وہ تو ہر رسول میں پائے جاتے ہیں کیوں کہ ہر رسول معصوم ہوتا ہے۔ لہٰذا بلا شبہ منہیات سے اپنے نفس کو روکنے والا ہوتا ہے اور دوسرے معنی اس کے وارد ہوئے ہیں عورتوں سے بے تعلق رہنے والا تو اس صورت میں وہ ایک خصوصی کردار کا اظہار ہے جو اس وقت کے حالات کی بناء پر ممدوح تھا لیکن اس میں ہمہ گیری اور عمومیت نہ تھی[3]۔ ورنہ ان کے علاوہ دوسرے انبیاء جن میں متعدد ایسے ہیں جو بلا شبہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے برتر تھے اس کردار کو اختیار کرنے اور ان کے لئے وہ ممدوح و مستحسن ہوتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ سوا جناب یحییٰ علیہ السلام اور جناب عیسیٰ علیہ السلام کے ان کے قبل اور بعد ان سے بالا تر ہستیوں نے تعلقات ازدواجی کا اختیار کرنا ضروری سمجھا اور حضرت خاتم الانبیاءؐ نے توصاف اعلان فرمایا کہ لا رهبانية فی الاسلام اور اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ کہ:۔

النكاح من سنتي فمن رغب عن سنتي فليس مني: نکاح میرے طریق کا جزء ہے تو جو میرے طریق سے منحرف ہو وہ مجھ سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔

اس کے بعد عفیف ہونا تو ممدوح رہا مگر حصور ہونا اس معنی میں کوئی قابل تعریف صفت نہیں رہا۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ

---

[1]۔ ای نوعهم كما يقال قتله الجن (البلاغی)

[2]۔ سماه الله بهذا الاسم قبل مولده (مجمع البیان)

[3]۔ حصورا مبالغا فی حصر النفس عن الشهوات والملاهی. وعن الصادق علیه السلام هو الذی لا یاتی النساء (صافی) فيه دليل على ان ترك النكاح كان افضل فی تلك الشريعة (نیشاپوری) شرعية ورجحانه ومدحه مختص به اذلم تعهد شرعية ورجحانه بنحو نوعی فی شريعة الهية (البلاغی)

اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝٤٠

"کہا اے پروردگار میرے! میرے یہاں لڑکا کہاں سے [1] ہوگا درانحالیکہ میری کبرسنی کا دور آ گیا ہے اور میری بیوی بھی بانجھ ہے۔ کہا اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔"

یہ انسان امید و بیم کا ایک مرقع ہے جو الفاظ سے نمایاں ہو رہا ہے کہ خود ہی تو اللہ کی قدرت کے اس کرشمہ کو دیکھ کر کہ گرمی میں جاڑے اور جاڑے میں گرمی کا میوہ آ رہا ہے اولاد کے امیدوار ہوئے تھے اور اب جو اللہ کی طرف سے قبولیت دعا کی فرشتے کی زبانی بشارت ملی تو نگاہ طبیعی موانع کی طرف جا رہی ہے [2] کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے اور یہ ایک مزید حصول اطمینان کی کوشش اور مضطرب دل کو سکون پیدا ہونے کی خواہش ہے کہ ان موانع کے ہوتے ہوئے پھر خداوند عالم کی جانب سے صراحت ہو جائے کہ ہم تمہارے لئے نظام عادت کو شکستہ کریں گے اور ممکن ہے کہ اس سے نوعیت بھی سمجھنا ہو کہ اسی حالت میں اولاد ہو گی یا ہم دونوں میں کوئی تبدیلی ہو گی کہ ہم جوان اور صحیح و توانا بنا دیے جائیں گے [3]۔

اس انداز سوال و جواب کو دیکھیں وہ جو معجزات انبیاء کے منکر ہیں اس خیال سے کہ نظام و دستور عادت شکستہ نہیں ہوتا۔ وہ محسوس کریں کہ اگر عادۃً یہ امر ناممکن نہ ہوتا تو جناب زکریاؑ نوید ملنے کے بعد بھی کیوں اسے اتنا امر بعید جیسے کہ اس کے باور کرنے کے لئے وہ تیار نہیں ہیں۔ یہ انداز بیان خود اس واقعہ کے خلافِ عادت ہونے کا قطعی ثبوت ہے۔

خالق نے بھی جواب میں یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ نہیں تم ابھی اتنے کبر السن نہیں ہوئے کہ اولاد نہ ہو سکے اور تمہاری بیوی بانجھ نہیں ہے بلکہ سب باتوں کے ہوتے ہوئے اس کے بارے میں بس اللہ کی قدرت کاملہ کا حوالہ دیا گیا کہ وہ اسی طرح جو چاہتا ہے کرتا ہے یعنی اس کی قدرت کے مقابلہ میں موانع عادی کوئی چیز نہیں ہیں [4]۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب حکمت الٰہی مقتضی ہو تو قدرت ربانی کا ظہور نظام اسباب کو توڑنے ہی کی شکل میں ہوا کرتا ہے۔ اسی کا نام "معجزہ" یا "کرامت" ہوتا ہے جو قرآن مجید سے بلا کسی گنجائش تاویل کے محقق و ثابت ہے۔

اور بھی توجیہیں جناب زکریا کے اس سوال کی بیان ہوئی ہیں جن میں سب سے زیادہ غلط یہ تو ہم ہے کہ جناب زکریاؑ کے دل میں معاذ اللہ یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ یہ فرشتے ہیں جو بشارت دے رہے ہیں یا شیطان ہے جو مجھے خواہ مخواہ پریشان کرنا چاہتا ہے۔ یہ تصور ہمارے نزدیک شان نبوت کے خلاف ہے اس لئے یقیناً باطل ہے [5]۔

---

[1]۔ من این یکون و قیل کیف یکون (مجمع البیان)

[2]۔ استبعاد عادیؔ و استفھام (صافی)

[3]۔ قیل انما ذلك علیٰ سبیل التعرف عن کیفیۃ حصول الولد ایعطھما اللہ ایاہ و ھما علی ما کانا علیہ من الشیب ام یصر فھما الی حال الشباب (مجمع البیان)

[4]۔ یفعل اللہ ما یشآء من العجائب الخارقۃ للعادۃ (صافی)

[5]۔ ان الا نبیاء لا قد ان یعرفوا الفرق بین کلام الملك و وسوسۃ الشیطان ولا یجوز ان تیلاعب الشیطان بہم تحیلط علیھم طریق الافھام (مجمع البیان)

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿٤١﴾

"کہا اے پروردگار میرے! میرے لئے کوئی نشانی قرار دے, کہا تمہاری نشانی یہ ہے کہ تین دن رات [1] سوا اشارہ کے لوگوں سے بات نہ کروگے اور اپنے پروردگار کو بہت یاد کرو اور شام وسحر اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہو۔"

جناب زکریاؑ کو یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ایسا بہر حال ہوگا اور یہ کہ ان کی کبرسنی کی حالت اور ان کی زوجہ کے بانجھ ہونے کی کیفیت بھی اس میں سدراہ نہ ہوگی، پھر بھی انتہائے شوق سے ایک بے قراری ہے اور وہ معروضہ پیش کرتے ہیں کہ تیرا وعدہ حق مگر جب اس وعدہ کی تکمیل ہونے لگے تو کوئی ایسی علامت مجھے بتلا دے کہ میں سمجھوں کہ اب مشیت ربانی اس اعجاز کو دکھا رہی ہے یعنی حمل قائم ہوگیا ہے تاکہ میرے قلب کو سکون حاصل ہو اور میں تیرے شکر کا فریضہ ادا کروں [2] ۔ تو ارشاد ربانی ہوا کہ اس کی علامت یہ ہوگی کہ ایسا ہونے پر تین دن خود بخود خلق خدا سے کلام کی طرف سے تمہاری زبان بند ہوجائے گی اور سوا یاد الٰہی کے تمہارا کوئی مشغلہ نہ رہے گا [3] اور یہ یاد الٰہی زبان سے ہوگی اس لئے کہ یہ اور زیادہ خدا کی قدرت کی نشانی ہے کہ زبان کوئی نقص نہیں کہ وہ تلفظ نہ کرسکے مگر اس زبان سے سوا ذکر الٰہی کے کوئی دوسرا کلام نہ ہوسکے [4] ۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٢﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿٤٣﴾

"اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! بلاشبہ اللہ نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہیں پاک و پاکیزہ بنایا ہے اور تمہیں تمام جہانوں کی عورتوں سے منتخب قرار دیا ہے۔ اے مریمؑ! اپنے پروردگار کی اطاعت کرو، سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہو۔

جناب مریم سلام اللہ علیہا کی فضیلت وعصمت:

جناب مریم سلام اللہ علیہا کے لئے اصطفاء یعنی انتخاب کا لفظ بتاتا ہے کہ حضرت مریمؑ خواتین کے طبقہ کے لئے کسی خاص منصب رہبری کی حامل قرار دی گئی تھیں اور تطہیر کا لفظ ان کے عصمت کردار کے جوہر کو ظاہر کرتا ہے جو منصب ہدایت کے لئے اصطفاء وانتخاب کی شرط لازم ہے اور

---

[1] ۔ ای بلیا لیہا ولھذا ذکر فی سورۃ المریم ثلث لیال (نیشاپوری)

[2] ۔ علامۃ یعرف بہا وقت حمل امرأتہ لیزید فی العبادۃ شکرا (مجمع البیان)

[3] ۔ لا تقدر علی تکلیم الناس ثلثا (صافی) نہ بول سکے گا تو اُن سے (تاج العلماء)

[4] ۔ القدرۃ علی التکلم بالتسبیح والذکر مع العجز عن التکلّم بکلام البشر (نیشاپوری)

آخرت میں جو نساء عالمین پر اصطفاء کا ذکر ہے وہ ان کی افضلیت کا آئینہ دار ہے کہ جب تک یہ افضلیت متحقق نہ ہو اس وقت تک منصب الٰہی کا استحقاق حاصل نہیں ہوتا۔

جب کہ طبقہ خواتین کے لئے جو رہ نمائی کے منصب پر فائز ہو اس کے لئے یہ دونوں باتیں لازم ہیں کہ معصوم ہو اور اپنے دور کے آدمیوں میں افضل ہو تو اس معیار کو ہر منصب ربانی کے لئے پیش نظر رکھنا چاہیے اور اس لئے امامت جو منصب ربانی کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے لئے بھی عصمت و افضلیت ضروری چیز قرار پاتی ہے۔

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی رفعت:

اس کے علاوہ جب اولین میں جہاں شریعت کا اختتام نہیں ہوتا تھا طبقہ خواتین کے لئے ایک صاحب منصب معصوم خاتون کا وجود نظر قدرت میں لازم ہوا تو اس امت مرحومہ میں جس کی ہدایت کلی پر دین کے کامل کرنے اور نعمت کے تمام کرنے کی مہر ثبت ہونے والی ہے کیوں کر طبقہ خواتین کی بغیر کسی ایسے رہ نمائے کامل کے جو عملی حیثیت سے اس طبقہ کے لئے مثال ہو خالی رکھا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے خالق نے اپنے رسولؐ کو وہ بیٹی کرامت فرمائی جسے **سیدۃ نساء العالمین** اور **سیدۃ نساء اھل الجنۃ** قرار دیا گیا اور جو آیہ تطہیر کا مورد ہوئی۔ اور چوں کہ اس امت کی ہدایت کا معیار اونچا ہے اس لئے جب اس امت کا رسول افضل المرسلین ہے تو یہ خاتون معظّمہ بھی اسی تناسب سے مریم بنت عمران اور دوسری ایسی مثالی خواتین سے افضل وارفع ہوں گی۔ اس لئے رسولؐ نے جب اپنی بیٹی کو سیدۃ نساء العالمین فرمایا تو اس کی تشریح فرمادی کہ جناب مریمؑ اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار تھیں لیکن فاطمہ زہراؑ اولین وآخرین سب کی سردار رہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب مریمؑ کو جو **اصطفٰك علی نساء العالمین** کہا گیا ہے اس میں العالمین کا لفظ شمول مکانی کا حامل ہے یعنی اس دور میں [1] تمام عالم کی عورتوں میں کوئی ان کے مثل نہیں تھی۔ شمول زمانی کی حامی نہیں ہے [2] اس لئے اس کے بعد کوئی خاتون ان سے افضل ہوسکتی ہے لیکن حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے لئے جو سیدۃ نساء العالمین کہا گیا اس کا دائرہ وہی ہے جو اس کے پہلے ان کے پدر بزرگوار کے لئے: **وما ارسلنٰك الا رحمۃ للعالمین** کا اور وہ وہی ہے جو وسعت ربوبیت کے مقام میں **الحمد للہ رب العالمین** کا ہے جس سے کوئی مخلوق باہر نہیں ہے۔

یہ اس وقت ہے جب اصطفاء کا لفظ ''سرداری'' کو بتاتا بھی ہو مگر علامہ بلاغی رحمۃ اللہ اس سے متفق نہیں ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اصطفاء کے معنی ہیں بس کسی بات میں اختصاص مضمر ہے۔ یہاں خصوصیت مقام کی بناء پر پہلی دفعہ جو اصطفاء کا لفظ ہے وہ اس کے اظہار کے لئے کہ لڑکی ہوتے ہوئے بھی اللہ نے ان کو خدمت بیت المقدس کے لئے قبول کرلیا اور دوسری دفعہ جو تمام دنیا جہاں کی عورتوں کے مقابلہ میں اصطفاء ہے وہ بغیر شوہر کے اولاد ہونے کی حیثیت سے ہے۔ اس سے سیادت ثابت نہیں ہوتی۔ بے شک اپنے اہل زمانہ پر ان کی سیادت حدیث سے ثابت ہوئی

---

[1] ۔ نساء العلمین ای اھل زمانك (جلالین) وھو قول ابی جعفر علیہ السلام (مجمع البیان)

[2] ۔ ترجیح دی اُن پر جو اُن کے زمانہ میں تھیں۔ حضرت فاطمہؑ کو ساری خدائی کی اگلی پچھلی عورتوں پر (حواشی تاج العلماء)

ہے مگر متفق علیہ احادیث ہی نے حضرت فاطمہ زہراؑ کو نہ صرف سیدۃ نساء العالمین بلکہ سیدۃ نساء اہل الجنۃ بتایا ہے [1] اور ظاہر ہے کہ اہل الجنۃ کے عموم میں جناب مریمؑ بھی داخل ہیں۔ اس لئے حضرت فاطمہ زہراؑ کی سرداری میں وہ بھی داخل ہیں (آلاء الرحمن)۔

علامہ بلاغی کی جلالت قدر مسلم مگر ان کے کسی ارشاد کے ساتھ لب کشائی کا حق تو سلب نہیں ہوسکتا۔ اصل یہ ہے کہ آیت میں اصطفاک کا لفظ دو دفعہ ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ دونوں جگہ ایک ہی مفہوم کا حامل ہو [2] اس لئے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ پہلی جگہ کا اصطفاء تو بجائے خاص انفرادی امتیاز کا مظہر ہے اور وہ وہی ہے جسے علامہ بلاغیؒ نے بیان فرمایا ہے۔ مگر دوسری دفعہ پھر جو اصطفاک کا لفظ ہے نساء عالمین کے مقابلہ میں "علی" کے ساتھ یہ فوقیت بحیثیت منصب کی حامل ہے جس کی دوسری "سیادت" ہے اور جب کہ ان کی سیادت کے حدیث سے ثابت ہونے کا تذکرہ ممدوح نے خود فرمایا ہے تو قرآن کے اس جملہ کو اس معنی کا حامل ماننے میں حرج کیا ہے جس کے بعد بھی جیسا کہ موصوف نے خود تحریر فرمایا ہے حضرت فاطمہ زہراؑ کی افضلیت بر بنائے حدیث پھر بھی محفوظ رہتی ہے۔

"رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہو۔" اس "ساتھ" کے معنی معیت عمل کے ہیں یعنی جیسے اور اللہ کے مخلص بندے رکوع کرتے ہیں، اسی طرح رکوع وسجود بجالاتی رہو، معیت زمانی ومکانی مراد نہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تم باہر نکل کر نمازیوں کی صف میں شامل ہوکر نماز ادا کرو [3]۔

اس مثال کو سامنے رکھا جائے تو سورہ بقرہ میں جو واركعوا مع الراكعين ہے، اس سے نماز جماعت کے حکم کا استفادہ مشکل ثابت ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں حدیث معصوم کے رو سے یہی تفسیر ثابت ہوجائے۔

ہاں ایک اور بات سنئے: کہ جناب مریمؑ کے بارے میں ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قبل اسلام دور موسوی میں جو نماز تھی اس میں بھی رکوع وسجود موجود تھا اور یہ صرف دعا والی نماز جو عیسائی پڑھتے ہیں بعد کی ایجاد ہے۔

یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہے کہ آیت میں سجدہ پہلے اور رکوع بعد کو ہے لہٰذا وہ کوئی نئی نماز تھی۔ ایسا نہیں ہے اس لئے کہ واؤ جو حرف عطف ہے اس میں ترتیب کے معنی پائے نہیں جاتے [4]۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ

---

[1]۔ رواه احمد والبخاری ومسلم والترمذی والنسائی وابن ماجة وابن حبان فی صحیح وابن ابی شیبة والحاکم وابو یعلے والرویانی والعقیلی والطبرانی وابن عساکر وصاحب الاستیعاب وغیرهم عن حذیفة وابی الخدری وابن عباس وعائشه وفاطمة عن رسول اللہ ﷺ (آلاء الرحمن)

[2]۔ لا یجوز ان یکون الاصطفاء بمعنی واحد للتکرار الصرف (نیشاپوری)

[3]۔ ای کن لی فی عدادهم امرت بالصلوة تذکرا کانها) (صافی) لا ان یکون ذلك امرالها بأن تعمل السجود رکوع معهم فی الجماعة (مجمع البیان) ای وکن لی فی زمرة المصلّین الکثیر الصلوة ولا ینحصر المعنی بصلوة الجماعة (البلاغی)

[4]۔ لا یوجب الترتیب ___ وانما یوجب الجمع والاشتراك (مجمع البیان)

اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

”یہ غیب کی خبروں سے ایک ہے جس کی آپ کی طرف ہم وحی بھیج رہے ہیں اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ لوگ اپنے قرعے ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریمؑ کی کفالت کا ذمہ دار ہو اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ آپس میں بحث کر رہے تھے۔“

جناب زکریاؑ کی دعا اور یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کا قصہ تو حضرت مریمؑ کے واقعہ کے ذیل میں بمناسبت آ گیا تھا کہ ان پھلوں کو دیکھ کر ہی حضرت زکریاؑ کو یہ احساس پیدا ہوا تھا اور انہوں نے یہ دعا کی تھی جسے اللہ نے یوں قبول کیا تھا اور نہ اصل بات تو حضرت مریمؑ ہی کی ہو رہی تھی اور اسی کو کہا جا رہا ہے کہ یہ غیب سے ہم آپ کو اطلاعیں دے رہے ہیں ورنہ آپ ان واقعات کو آنکھوں سے تھوڑے ہی دیکھ رہے تھے۔

قرآن کا اعجازی پہلو بحیثیت بیان واقعات:

اس طرح امم سابقہ کے ان حالات کے متعلق جو قرآن میں پیش کیے گئے ہیں اعجاز کے ایک پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے کہ رسولؐ کے لئے کوئی ظاہری ذریعہ ان حالات پر براہ راست مطلع ہونے کا نہیں ہے اور یہ اس بناء پر کہ اہل کتاب کے علماء اپنی مذہبی معلومات کو بطور راز اپنے سینوں میں رکھا کرتے تھے اور اپنی کتابوں کی اشاعت بھی انہوں نے چھوڑ رکھی تھی، اس لئے کہ دوسرے لوگ علم حاصل نہ کر لیں اور اس سے ان کی مرجعیت کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ اس کے علاوہ یہ معلومات خود انہیں مسخ شدہ شکل میں حاصل تھیں لہٰذا ان معلومات کو ان کی اصل شکل میں پیش کرنا یہ فیض ربانی اور وحی آسمانی کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے؟

بحیثیت واقعہ یہ جزء جو یہاں بیان ہوا ہے گزشتہ بہت سے واقعات سے مقدم ہے۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے کہ جناب مریمؑ پیدا ہوئی ہیں اور اسکے بعد بلا فاصلہ جو ذکر آتا ہے وہ جناب مریمؑ کے پورے طور پر کمال شباب کی منزل کا ہے کہ ملائکہ نے ان کو جناب عیسیٰؑ کی بشارت دی ممکن ہے یہاں ترتیب میں تنزیل کے لحاظ سے کچھ مقدم و موخر ہو گیا ہے اور اصل ترتیب آیات کے نازل ہونے کی کچھ اور ہو جسے پورے طور پر قائم کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

یلقون اقلا مھم کے معنی لفظی ہیں ”اپنے قلم پھینک رہے تھے۔“ یہ قرعہ ڈالنے کا اس وقت کا عام طریقہ تھا یا ممکن ہے خاص طور پر اختیار کیا گیا ہو۔ اس لئے ہم نے ترجمہ یہ کیا کہ وہ ”قرعے ڈال رہے تھے۔“ مگر تفصیل اس کی قرآن مجید میں مذکور نہیں اور بعض کتب تفسیر میں جو تفصیلات درج ہیں وہ مستند نہیں ہیں [1]

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾

---

[1] - قدروی فی الدر المنثور وغیرہ فی القاء الاقلام و کیفیتہ روایات لاتنھض حجۃ (البلاغی)

"جب کہا فرشتوں نے اے مریم! بلا شبہ اللہ آپ کو خوش خبری دیتا ہے اپنی طرف کے ایک کلمہ کی جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے جو دنیا و آخرت میں آبرودار [1] ہوگا اور بارگاہ الٰہی میں رسوخ رکھنے والوں میں۔"

ولادت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت:

جناب عیسیٰ علیہ السلام کے نام میں ماں کی نسبت کو شریک کر کے اسی وقت اس کا پتہ دے دیا تھا کہ یہ بے باپ کے پیدا ہوگا ورنہ باپ کی نسبت دی جاتی [2]۔

اس کے علاوہ ابن مریم کہنے سے ابن اللہ ہونے کی رد بھی تھی جو بعد میں نصاریٰ کا مزعومہ ہونے والا تھا [3]۔

انہیں کلمۃ اللہ کہا جانا اس اعتبار سے ہے کہ وہ اسباب فطری کے نظام کے صرف اشارہ قدرت سے جس کی تعبیر کلمہ کن سے ہوتی ہے عالم وجود میں آئیں گے [4]۔

جیسا کہ اس کے قبل بھی ایک آیت مجملا بیان ہوا۔ یہ بات کہنے والا ایک فرشتہ تھا [5] مگر ابہام کے موقع پر جب نام لینا منظور نہ ہو تو جیسے فارسی میں "گفتہ شد" کے بجائے "گفتند" کہہ دیتے ہیں جس کا لفظی مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے کہا' ویسے عربی محاورہ میں بھی ایک کی بات کی نسبت اس جماعت کی طرف دے دی جاتی ہے جس کا وہ فرد ہے۔ اس لئے قرآن نے کہا فرشتوں نے کہا اگر اس نظیر کو سامنے رکھا جائے تو آیہ ولایت میں بحث کے صیغے سب جمع کے ہیں:

الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (مائدہ..۵۵)

تو انہیں فرد واحد (جناب امیرؑ) سے متعلق کیوں سمجھا جاتا ہے؟ دور از کار ثابت ہوگی۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾

"وہ باتیں کرے گا آدمیوں سے گہوارے میں اور پوری عمر تک پہنچ کے [6] اور نیکوکاروں میں سے ہوگا۔"

"پوری عمر تک پہنچ کے" کلام کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ المهد کے جوڑ سے یہ مفہوم پیدا کیا ہے کہ گہوارہ میں

---

[1] ۔القمی ذو وجه وجاه (صافی) با آبرو (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔خاطبها بنسبته اليها تنبيها على انها تلده بلا اب (جلالین)

[3] ۔نسبه الى امه ردا على النصارى وقولهم انه ابن الله (مجمع البیان)

[4] ۔یعنی محض خدا کی ایک بات یعنی کن ۔۔۔ سے بنایا تھا (تاج العلماء)

[5] ۔یعنی جبرئیل (نیشاپوری)

[6] ۔الكهل فى اللغة الذى اجتمع قوته و كمل شبابه من قولهم اكهل البنات اى قوى روى ان عمره بلغ ثلثا وثلثين ثم رفع الى السماء (نیشاپوری)

اور پوری عمر پر پہنچ کے دونوں عالم میں یکساں کلام کرے گا۔ اب یہ دونوں باتیں مل کر ایک خاص چیز بن گئی [1]۔

اس کے علاوہ ہوسکتا ہے کہ کلام کی نوعیت کا اتحاد مراد ہو کہ جو بات وہ گہوارہ میں کہے گا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی قرار دیا ہے وہی بات اس کی آخر تک رہے گی۔ اس میں فرق نہ ہوگا [2]۔

اس طرح ذیل میں نصاریٰ کی رد بھی ہوجاتی ہے کہ وہ جو انہیں خدا اور خدا کا بیٹا کہتے ہیں یہ بالکل جناب عیسیٰؑ کی تعلیم کے خلاف ہے۔

قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ وَلَدٌ وَّلَمۡ يَمۡسَسۡنِىۡ بَشَرٌ‌ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ‌ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۝۴۷

"انہوں نے کہا اے میرے پروردگار! میرے یہاں کہاں سے ہوگا! حالانکہ مجھے کسی آدمی نے ہاتھ نہیں لگایا ہے [3] فرمایا کہ یونہی اللہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہوجا تو بس وہ ہوجاتی ہے۔"

جناب زکریاؑ کے سوال پر کہ میرے یہاں اولاد کہاں سے ہوگی جو جواب ملا تھا اس میں یہ جملہ تھا کہ "یونہی اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے" کیوں کہ وہاں جو اولاد عالم وجود میں آنے والی تھی وہ اپنی نوعیت میں کوئی عجوبہ حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ عام نظام طبیعت کے ماتحت ماں اور باپ سے پیدا ہونے والا بچہ تھا۔ صرف وہ حالات جن میں وہ پیدا ہوگا غیر معمولی ہیں۔ لہٰذا کہا کہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یعنی جن حالات میں چاہیے بچہ کو متولد کردے اور یہاں خود وہ بچہ جو پیدا ہونے والا تھا عجیب حیثیت رکھتا تھا کہ وہ کسی مرد کے نطفہ سے پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ چاہے ایسا بچہ خلق کرے جو نطفہ سے تدریجی طور پر جنین اور پھر طفل کی صورت میں آئے اور چاہیے ایسا بچہ جو بغیر کسی نطفہ کے ایک دم جنین کی شکل میں آ گیا ہو [4]۔

یہ الفاظ قرآنی ان تمام تصورات کا قلع قمع کردینے کے لئے کافی ہیں جو نیاز صاحب فتح پوری وغیرہ ایسے اشخاص کسی طرح ان تمام واقعات کو کھینچ تان کر عام نظام طبیعت اور اسباب فطرت پر منطبق کرنے کی کوشش میں قائم کرتے ہیں۔

وَيُعَلِّمُهُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَالتَّوۡرٰٮةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ‌ۚ ۝۴۸ وَرَسُوۡلًا اِلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرٰٓءِيۡلَ ۙ اَنِّىۡ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ۙۚ اَنِّىۡۤ اَخۡلُقُ لَكُمۡ مِّنَ الطِّيۡنِ

---

[1]۔ قال ابو مسلم معناہ انہ یتکلّم حال کونہ فی المھدو حال کونہ کھلا علیٰ حدّواحدوصفۃ واحدۃ (نیشاپوری)

[2]۔ یکلّم الناس کلام الانبیاء فی المھد حال کونہ طفلا و کھلا من غیر تفاوت (نیشاپوری)

[3]۔ چھو بھی نہیں گیا مجھے کوئی بشر (تاج العلماء)

[4]۔ عبر عن الفعل ھٰھنا الخلق لان القدرۃ ھٰھنا امم و ھو تخلیق مولود بغیر اب (نیشاپوری)

كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ
وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۴۹

”اور وہ اسے سکھائے گا کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل اور پیغمبر بنی اسرائیل کی طرف کہ میں تمہارے پروردگار کی طرف سے خاص معجزہ[1] لے کر آیا ہوں کہ میں تمہارے لئے مٹی سے پرند کی صورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ بحکم خدا پرند بن جاتا ہے اور پیدائشی اندھے[2] اور کوڑھی کو شفاء دیتا ہوں اور اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتا ہوں اور تمہیں بتاتا ہوں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں سینت کر رکھتے ہو بلاشبہ اس میں بہت بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان لانے کے لئے تیار ہو۔“

معجزات حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

یہاں ترتیب آیات میں معنوی حیثیت سے تسلسل نہیں ہے۔ اس کے پہلے کی آیت میں جناب مریمؑ کا اظہار تعجب اور اس فرشتہ کا جواب کہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں یہ ایک مستقل چیز ہے جو درمیان میں آ گئی ہے۔ اب اس کے پہلے جو بیان تھا کہ فرشتوں نے مریمؑ سے کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (آل عمران۔۔ ۴۵) اللہ تمہیں مژدہ دیتا ہے اپنے ایک کلمہ کا جس کا نام مسیح عیسیٰ الصالحین“ اور وہ لوگوں سے بات کرے گا گہوارہ میں اور کمال عمر کی منزل پر پہنچ کر اور وہ نیکوکاروں میں سے ہوگا“ اب اسی سلسلہ کی یہ کڑی آتی ہے کہ ”اور اللہ اسے کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل کی تعلیم دے گا“ اور پھر پہلے جو لفظ آیا تھا و جیھا فی الدنیا والاخرۃ دنیا اور آخرت میں آبرودار اس پر عطف کے ساتھ یہ لفظ کہ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اور پیغمبر بنی اسرائیل کی طرف جس کا پیغام یہ ہوگا جو بعد میں مذکور ہے[3]۔

”اسے کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل سکھائے گا۔“

اس میں توریت اور انجیل کا ذکر چوں کہ بعد کو ہے، اس لئے پہلے جو لفظ کتاب آیا اس سے بظاہر قوانین الٰہیہ کا علم مراد ہے۔ اس طرح کتاب کے معنی ہیں قانون ربانی جس کا حامل بن کر ہر نبی آیا ہے اور بعض لوگوں نے اسے عام کتب آسمانی کے معنی میں لیا ہے اور کہا ہے کہ توریت و انجیل کا ذکر بنظر اہمیت بعد میں خاص طور پر دیا گیا ہے[4] اور بعض نے فن کتابت یا توریت وانجیل کے علاوہ کوئی دوسری کتاب ہونے کا شبہ بھی ظاہر

---

[1] ۔المراد بالآیۃ الجنس لا الفرد لانہ عدد الوا عامن الایات (نیشاپوری)

[2] ۔سُور (تاج العلماء)

[3] ۔عطفا علی وجیھا و مابعدہ (نیشاپوری)

[4] ۔خدا اس کو (تمام) کتب آسمانی اور عقل کی باتیں اور (خاص کر) توریت وانجیل سکھائے گا (فرمان علی صاحب)

کیا ہے [۱] اور بعض نے اسی کو ظاہر کلام الٰہی کے مطابق قرار دیا ہے [۲]۔

رسولاً کے لفظ کے ساتھ آل و بنی اسرائیل کی قید اس کا ثبوت ہے کہ جناب عیسیٰؑ کی رسالت صرف خاندان اسرائیل سے مخصوص تھی جو بائبل سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور بعض احادیث معصومین علیہم السلام سے بھی اس کی تصریح کرتے ہیں [۳] مگر علامہ بلاغی اس سے متفق نہیں ہیں اس لئے انہوں نے رسولاً لی بنی اسرائیل کا مطلب یہ لیا ہے کہ ابتدائی مخاطب ان کے بنی اسرائیل تھے [۴]۔

الفاظ قرآنی کے لحاظ سے یہ مفہوم غلط تو نہیں ہے جیسا کہ ہمارے رسولؐ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: **وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا**: آپ ام القریٰ (مکہ) اور اس کے گرد و پیش والوں کو عذاب سے ڈرائیں (انعام۔۹۲)

مگر آپ کا دائرہ رسالت اتنے میں محدود نہیں تھا بلکہ تمام عالمین کے لئے تھا جو قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے ثابت ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ دائر رسالت عیسوی کا عام ہونا دوسرے دلائل سے ثابت ہو مگر ہمارے خیال میں ایسا نہیں ہے بلکہ دوسرے دلائل سے بھی ان کی رسالت کا بنی اسرائیل میں محدود ہونا ہی ثابت ہوتا ہے۔

اس کے بعد معجزات جناب عیسیٰؑ کا ذکر ہے اور وہ اتنے صاف الفاظ میں ہے کہ ان میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔

ان خاص امراض کو شفا دینا یا بنیائی پیدا کرنا، چاہے اس وقت کے اطباء کے دسترس سے باہر ہو لیکن ہے وہ اسی جنس کی شے جو اطباء کیا کرتے ہیں لہٰذا اس میں باذن اللہ کے لفظ کے لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی مگر پرند کے مجسمے میں روح پھونک کر جاندار بنانا اور مردہ کو زندہ کرنا خدا کی شان کے کام ہیں اس لئے ان دونوں میں باذن اللہ کی قید لگائی کہ یہ عیسیٰؑ کا بذات خود کام نہ تھا بلکہ اللہ کا کام تھا جو ان کے ہاتھ پر ظاہر کیا گیا تھا [۵]۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۞۵۰

”اور تصدیق کرتا ہوا اس توریت کی جو میرے آگے ہے [۶] اور اس لئے کہ حلال کروں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں جو تم پر حرام تھیں اور آیا ہوں تمہارے پروردگار کی طرف کے اعجاز کے ساتھ تو اللہ کے غضب سے بچو اور میرا کہنا مانو“

---

[۱]۔ ارادبه الکتابة عن ابن جریح۔ وقیل ارادبه بعض الکتب التی انزلها اللہ علیٰ انبیاء سوی التورٰة والانجیل (صافی)

[۲]۔ هو الیق بالظاهر (مجمع البیان)

[۳]۔ عن الباقر علیہ السلام انه ارسل الیٰ بنی اسرائیل خاصة وکانت بنوّته بیت المقدس (صافی)

[۴]۔ باعتبار ابتداء خطابهم فی الدعوة (آلاء الرحمٰن)

[۵]۔ کرّر باذن اللہ دفعا لوهم الالوهیة فان الاحیاء لیس من جنس افعال البشر (صافی)

[۶]۔ جو میرے سامنے موجود ہے یعنی توریت (تاج العلماء)

"جو چیزیں تم پر حرام کی گئی تھیں ان میں سے بعض کو میں حلال کر دوں" اس سے ظاہر ہے کہ شریعت عیسوی میں کچھ احکام شریعت موسوی کے منسوخ کیے گئے تھے[1] اور یہ پہلے فقرہ سے کہ میں توریت کی تصدیق کرتا ہوں، کوئی منافی چیز نہیں ہے۔ اس لئے کہ تصدیق کے معنی تو یہ ہیں کہ وہ شریعت من جانب اللہ نازل ہوئی تھی لیکن اللہ کی طرف سے خود مصالح کی تبدیلی کی وجہ سے اب کچھ اس کے احکام بدل دیے گئے جسے قرآن تمام سابق کتب کی تصدیق کرنے والا ہے مگر بہت سے احکام اس میں منسوخ کر دیے گئے ہیں[2]۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾

"یقیناً اللہ میرا پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے تو اس کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔"

اس میں جناب عیسیٰؑ کے جس پیغام کا ذکر ہوا ہے، اس کا مقصود یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا پیغام وہی اسلامی پیغام تھا جو تمام انبیاء الٰہی دیتے رہے تھے اور جو اب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے پیش ہو رہا ہے اور جو عقیدہ نصاریٰ نے ان کے متعلق قائم کر رکھا ہے کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہیں یہ خود حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کے خلاف ہے[3]۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾

"تو جب عیسیٰؑ نے ان کی طرف سے انکار محسوس کیا[4] تو کہا کہ اللہ کی سمت (جانے میں) کون ہیں جو میرے مددگار ہوں[5] حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور گواہ رہیے گا کہ ہم "مسلم" ہیں۔

حوارین عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ:

حواری کا لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخصوصین کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ملا محسن فیض فرماتے ہیں کہ حور کے لغوی معنی خالص سفیدی کے ہیں۔ اس مناسبت سے خالص و مخلص افراد کو اس لفظ سے بیان کیا جاتا ہے۔

عیون اخبار "الرضاؑ" کی روایت میں ہے کہ عوام کا تصور تو یہ ہے کہ چوں کہ یہ لوگ کپڑے دھوتے اور صاف کرتے تھے اس لئے حواری کہلائے مگر ہمارے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ وہ خود بھی خالص لوگ تھے اور دوسروں کو بھی گناہ کی آلائش سے وعظ و نصیحت کے ذریعہ سے صاف

---

[1]۔ ۲ے کالشحوم و الشمك ولحوم الابل و العمل بالسّبت کذا قیل (صافی)

[2]۔ ذلك لان النسخ فی الحقیقة بیان لانتهاء فا لنا سخ الحکم و تخصیص فی الازمان (صافی) مُدة فالناسخ والمنسوخ کلاهما حق فی وقته (نیشاپوری)

[3]۔ انما قال ذلك لیکون حجّة علی النصاریٰ فی قولهم المسیح ابن الله (مجمع البیان)

[4]۔ لما سمع ورای انهم یکفرون کذا روی القمی عن الصّادق علیه السلام (صافی) جانچ لیا عیسیٰؑ نے اُن کا کفر (تاج العلماء)

[5]۔ من اعوانی الی سبیله (صافی) ای فی الدعوة الیه (البلاغی)

کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔

کتاب التوحید کی روایت میں ہے کہ ان کی تعداد بارہ تھی (صافی)

ایک نبی کی زبان سے قرآن کے یہ الفاظ کہ کون میرے مددگار ہیں؟ اس تصور کے قلع قمع کرنے کے لئے کافی ہونا چاہیے کہ غیر اللہ سے امداد طلب کرنا یا اسے کسی بھی حیثیت سے مددگار سمجھنا ایک قسم کا شرک ہے۔ یہ تصور عقل و فطرت کے بھی خلاف ہے اور قرآن مجید کے بکثرت تصریحات کے بھی جن میں سے ایک مقام یہ ہے:

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٥٣﴾

"اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے اتارا اور ہم نے اس پیغمبر کی پیروی اختیار کی اب تو ہمیں گواہوں کی فہرست میں درج فرما۔"

گواہی دینا کیا ہے؟ ان اصول دین کا اقرار کرنا جن سے انسان ملت حقہ میں مندرج ہوتا ہے [1]۔ اس طرح یہ ارشاد کہ فاکتبنا مع الشاهدین ایسا ہے جیسے کہا جائے کہ فاکتبنا مع المسلمین "ہمیں اسلام لانے والوں میں محسوب فرمایا"، فاکتبنا مع المومنین ہمارا اہل ایمان میں شمار فرما۔"

اب مَعَ کے معنی یہ ہوں گے کہ اس صف میں ہمیں داخل قرار دینا [2] لیکن ہوسکتا ہے کہ مع کے معنی "ساتھ" ہی کے ہوں [3] اور الشاهدین سے کوئی وہ گروہ مراد ہو جس کا کام ہی گواہ ہونا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ

تم لوگ تمام لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔ (بقرہ۔ ۱۴۳)

یہ امت محمدیہ کے وہ بلند مرتبہ نفوس ہوں گے جن کے ساتھ ہونا امم سابقہ کے مومنین مخلصین کے لئے باعث سعادت ہوسکتا ہے [4]۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿٥٤﴾

"انھوں نے اپنی ترکیب کی اور اللہ نے اپنی ترکیب کی اور اللہ سب سے بہتر ترکیبیں کرنے والا ہے۔"

مکر کیا لفظ کا اطلاق جواب مکر پر کس طرح ہوا ہے، اس کی تشریح پہلے پارے میں اللہ یستھزی بہم کی تفسیر میں ہو چکا ہے۔ یوں بے ڈھرک مکر کی لفظ کا انتساب اللہ کی طرف بظاہر ضرور نا مناسب معلوم ہوتا ہے مگر جس صورت سے قرآن مجید نے اس کا استعمال کیا ہے یہاں سیاق

---

[1]۔ مع الشاهدین لك بالوحدانية ولرسولك بالصدق (جلالین)

[2]۔ ای فی جملة الشاهدین بجمیع ما انزلت (مجمع البیان)

[3]۔ لکھ لے ہمیں گواہوں کے ساتھ (تاج العلماء)

[4]۔ وهذا یقتضی ان یکون للشاهدین فضل یزید علی فضل الحوارین (نیشاپوری)

کلام خود مقابلہ مکر کا اظہار کر رہا ہے[1] اور آخر کا فقرہ اس کے مقابلہ میں دنیا والوں کی ترکیبوں کی ناکامی کا اعلان ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں کسی کا مکر چل نہیں سکتا ہے۔

خداوند عالم کی طرف مکر کی نسبت اور اس کا مفہوم:

صورت واقعہ بھی اس مفہوم کو تقویت پہنچاتی ہے۔ دشمنوں نے ترکیب کی تھی جناب عیسیٰؑ کو ہلاک کرنے کی اور اللہ نے اس کے مقابلہ میں ترکیب یہ کی کہ انہیں آسمان پر اٹھا لیا اور اس ترکیب کی لطافت اس قدر بڑھ گئی کہ وہ لوگ اسی گمان باطل میں رہے کہ انہوں نے عیسیٰؑ کو ہلاک کر دیا ہے۔

اکثر مفسرین کا تصور یہی ہے مگر علامہ بلاغی طاب ثراہ کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ لفظ مکر میں ذم کا پہلو ہمارے غلط استعمال کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اس کے اصل معنی فریق مخالف کے مقابلہ میں ایسی باریک صورت سے اقدام کئے ہیں جسے وہ سمجھ نہ سکے۔ اور اس لئے اس کے بے جھجک انتساب میں بھی خداوند عالم کی طرف کوئی خرابی نہیں ہے چنانچہ قرآن مجید میں اس کا استعمال اس طرح ہوا ہے جیسے:

اَفَاَمِنُوۡا مَکۡرَ اللّٰہِ ۚ فَلَا یَاۡمَنُ مَکۡرَ اللّٰہِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡخٰسِرُوۡنَ

کیا وہ اپنے خلاف اللہ کی کارروائی سے مطمئن ہیں تو اللہ کی اپنی خلاف کارروائی سے مطمئن نہیں ہوتے مگر وہی جو گھاٹا اٹھانے والے ہوں (اعراف ۹۹)

اور دعا میں اللہ سے خطاب کر کے یہ وارد ہوا ہے کہ:

لا تمکر بی حیلتك۔

اپنی تدابیر میں میرے خلاف کوئی کارروائی نہ کر۔

قرآن مجید اسی سورہ اور پھر سورہ انفال میں آیا ہے۔

وَاللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ۔

اللہ بہتر مکر کرنے والا ہے (آل عمران ۵۴) (انفال ۳۰)

جس میں اللہ اور دوسرے اشخاص پر یکساں طور سے الماکرین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ایک ہی استعمال میں مختلف افراد کے لحاظ سے مکر کے معنی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہو سکتا۔

علامہ موصوف کا خیال ہے کہ قرآن مجید کے ان شواہد کی موجودگی میں وہ روایت قبول نہیں جو امام رضاؑ کی زبانی وارد ہے کہ اللہ مکر نہیں کرتا بلکہ مکر کی سزا دیتا ہے یہ روایت ضعیف السند ہے اور برفرض صحت یہاں اس عوامی معنی والے مکر کی نفی ہے لیکن زیادہ رجحان اسی کو ہے کہ امام علیہ السلام کا ایسا ارشاد ہو ہی نہیں سکتا جو قرآن مجید کی تصریحات کے خلاف ہو۔

---

[1]۔ لا یسند الی اللہ تعالیٰ الا علی سبیل المقابلۃ والازدواج او بمعنی المجازاۃ وانما اضاف اللہ المکر الیٰ نفسہ علیٰ مزاوجۃ الکلام کما قال فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم والثانی لیس باعتداء (مجمع البیان)

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴿۵۵﴾

''جب اللہ نے کہا اے عیسیٰؑ! میں تمہاری مدت پوری کرتا ہوں [۱] اور تمہیں اپنی جانب اٹھاتا ہوں اور تمہیں ان کافروں سے پاک کرتا ہوں اور انہیں جو تمہاری پیروی کریں گے ان سے کہ جنہوں نے تمہارا انکار کیا روز قیامت تک اونچا رکھوں گا۔ پھر تم سب کا پلٹنا میری طرف ہوگا تو میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا اس کے بارے میں جس میں تمہارا اختلاف رہا کیا۔''

غیبت جناب عیسیٰ علیہ السلام اور غیبت امام مہدی علیہ السلام:

''ان کافروں سے پاک کرتا ہوں'' کا مطلب یہ ہے کہ یہ تمہارے ساتھ رہنے کے لائق نہیں ہیں ان کا ساتھ تمہارے لئے آلایش ہے [۲] تمہاری شان اس سے بالاتر ہے کہ تم ان میں رہو۔ اس لئے تمہیں زندہ اپنی طرف اٹھائے لیتا ہوں [۳]۔

یہ سلسلہ ہادیان سلف کی آخری فرد کی غیبت تھی جس پر جمہور مسلمین متفق ہیں۔ یہاں نہ طول عمر کی بحثیں پیدا ہوتی ہیں نہ وجود کی افادیت پر کوئی تکرار ہوتی ہے۔ اب اگر یہ سنت الہیہ اس امت میں بھی جاری ہو اور حکمت الٰہی اپنی طرف کے ہادی کو گویا مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کا پیغام پہنچائے کہ یہ کافرین امت اب اس لائق نہیں ہیں کہ تم ان کے اندر رہو۔ اس لئے غیبت کا پردہ ڈال کر اسے ان سے الگ کر دیا جائے تو اس میں قرآن کے ماننے والے عذر و تکرار کیوں کریں جب کہ یہ حدیث بھی صحاح ستہ میں موجود ہے کہ جو کچھ بنی اسرائیل میں ہوا ہے وہ اس امت میں بھی ضرور ہوگا۔

دائمی طور پر قوم یہود کی پستی کا اعلان:

جنہوں نے جناب عیسیٰؑ کا انکار کیا یہود ہیں۔ ان کے مقابلہ میں عیسیٰؑ کے ماننے والے اب مسلمان ہیں اور نصاریٰ، قرآن نے قیامت تک کے لئے یہ خبر دی ہے کہ یہود پست ہوں گے اور نصاریٰ اور مسلمانوں کو ہمیشہ ان کے مقابلہ میں فوقیت رہے گی [۴]۔

---

[۱]۔ مستوفی احلك او قابضك من الارض (صافی) من برگیرندۂ توام (شاہ ولی اللہ) میں لینے والا ہوں تجھ کو (شاہ رفیع الدین) ای اخذك من بین الناس من عالم الارض (البلاغی)

[۲]۔ جعل مقامه فيما بينهم كملاقاة النجاسة (مجمع البیان)

[۳]۔ رافعك الی من الدّنیا من غیر موت (جلالین)

[۴]۔ جاعل الذین اتبعوك من المسلمین والنصاریٰ فوق الذین کفروا من الیهود (صافی)

اب اگر خود نصاریٰ کے رحم و کرم سے ان کی کوئی حکومت بھی قائم ہو گئی تو ہو اس فوقیت کے منافی نہیں ہے۔
یہ کہ ان کی برائے نام بھی کوئی سلطنت قائم نہیں ہو گی قرآن مجید میں کہیں مذکور نہیں ہے بلکہ اسی لفظ فوق سے استفادہ کیا گیا ہے [1]۔
اور پھر دوسری جگہ قرآن کا یہ اعلان کہ ان پر ذلت لکھدی گئی ہے اس سے مشاہدہ کی بناء پر ذلت کا معیار یہی سمجھ لیا گیا کہ ان کی سلطنت قائم نہیں ہو گی [2]۔
لیکن برائے نام کوئی حکومت قائم ہو جائے اور وہ دوسروں کی زیر سیادت یا ان کی ہر طرح محتاج ہو تب بھی تو دوسروں کا تفوق یہود پر جو قرآن مجید میں ہے وہ تو صادق ہی رہے گا۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٥٦﴾

”تو جنھوں نے انکار کیا! انہیں میں دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا اور ان کے کوئی مددگار نہیں ہوں گے۔“

دنیا میں یہود جن سختیوں میں ہمیشہ مبتلا رہے وہ تو تاریخ میں آنکھوں کے سامنے ہیں [3] اور آخرت کی منزل وہ ابھی پردہ غیب میں ہے۔ وہ بھی کبھی مشاہدہ میں آ جائے گی۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥٧﴾

”اور جنھوں نے ایمان قبول کیا اور نیک اعمال کرتے رہے انہیں وہ پورے پورے ان کے صلے دے گا [4] اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔“

یہاں آخری فقرہ کہ ”اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا“ خود اللہ کے افعال میں ظلم و ستم کی نفی کے لئے آیا ہے یعنی جب وہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا تو خود اس کے افعال میں ظلم کا شائبہ کہاں ہو سکتا ہے۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿٥٨﴾

”یہ ہے جو ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں آیتوں اور حکیمانہ یادداشت کے قبیل سے۔“

---

[1]۔ قال الجبائی فیہ دلالۃ علیٰ انہ لا یکون للیہود مملکۃ الیٰ یوم القیامۃ (مجمع البیان)

[2]۔ لعمری انہ کذالک فلا یری ملک یہودی فی الدنیا ولا بلد لھم مستقل (نیشاپوری)

[3]۔ اذلالھم بالقتل والاسر والسبی والخنف والجزیۃ فکلّ ما فعل بھم علیٰ وجہ الاستخفاف والاھانۃ (مجمع البیان)

[4]۔ بھرپور دوں گا انہیں ان کی مزدوریاں (تاج العلماء)

حکیم کے لفظ عموماً حکمت سے مشتق ہوتی ہے۔اسی کے اعتبار سے ہم نے ترجمہ کیا ہے[1] اگر بعض مترجمین اور مفسرین نے اسے محکم یعنی مضبوط و مستحکم کے معنی میں لیا ہے[2]۔

بعض مفسرین نے دونوں احتمال برابر سے ذکر کیے ہیں[3] اور بعض نے دونوں کو سمودیا ہے[4] بعض نے ایک تیسرا احتمال یہ بیان کیا ہے کہ حکیم کے معنی حاکم کے ہوں یعنی وہ احکام الٰہی پر مشتمل ہے[5]۔

اِنَّ مَثَلَ عِيۡسٰى عِنۡدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ‌ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۵۹﴾

بلاشبہ عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے، انہیں تومٹی سے پیدا کیا پھر اس سے کہا کہ ہوجا اور بس وہ ہو جاتے ہیں"[6]۔

نصارائے نجران سے بحث کی آخری کڑی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے نہ ہونے کی بحث میں حضرت آدمؑ کی مثال:

یہ آیت اس موقع کی ہے بلکہ جیسا کہ پہلے آچکا ہے بعض کے نزدیک شروع سے یہ سورہ ہی اس موقع پر نازل ہوا ہے کہ جب نصارائے نجران رسولؐ کے پاس بحث کے لئے آئے تھے۔

انہوں نے الوہیت عیسیٰؑ اوران کے فرزند خدا ہونے پر یہ دلیل کی کہ وہ بغیر کسی باپ کے پیدا ہوئے تھے تو ان کے جواب میں یہ آیت اتری کہ اس کے پہلے آدمؑ تو بغیر ماں باپ کے وجود میں آئے تھے۔پھر اس سے وہ خدا یا خدا کے بیٹے نہ ہوئے تو عیسیٰؑ کیوں ہوجائیں گے؟

مولانا فرمان علی صاحب نے اپنے حاشیہ میں خوب بات لکھی ہے کہ:

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں یہود نصاریٰ دونوں شبہ میں پڑے ہوئے تھے۔یہود تو آپ کی نسبت بیہودہ بدگمانی کرتے تھے اور نصاریٰ خدا کا بیٹا کہتے تھے۔خداوند عالم نے حضرت آدمؑ کی مثال دے کر دونوں کی تشفی کر دی۔یہود کی اس طرح کہ جب خدا میں یہ قدرت ہے کہ آدمؑ کو

---

[1]۔نصیحت حکمت والی (شاہ رفیع الدین)

[2]۔الحکیم المحکم (جلالین) کتاب محکم (شاہ ولی اللہ) مضبوط یا دداشتوں میں سے (تاج العلماء)

[3]۔الحکیم المشتمل علی الحکم او المحکم الممنوع من تطرّق الخلل الیہ (صافی)

[4]۔القرآن المحکم و انما وصفہ بانہ حکیم لانہ بما فیہ من الحکمۃ کانہ ینطق بالحکمۃ (مجمع البیان)

[5]۔ھو بمعنی الحاکم کالعلیم بمعنی ان الاحکام تستفاد منہ (نیشاپوری)

[6]۔فیکون ای فکان فی الحال علی ما اراد (مجمع البیان) وانالم یقل فکان اما لانہ حکایۃ حال ماضیۃ واما تصویر لتلک الحالۃ العجیبۃ (نیشاپوری)

بے ماں باپ کے فقط مٹی سے بنا دیا تو عیسیٰؑ کو ماں سے پیدا کرنا کیا تعجب کی بات ہے اور نصاریٰ کی اس طرح کی اگر عیسیٰؑ کا بے باپ کے پیدا ہونا خدا یا خدا کا بیٹا ہونے کی دلیل ہے تو آدمؑ کے ماں باپ دونوں نہ تھے۔ پھر ان کو خدا یا خدا کا بیٹا بدرجہ اولیٰ ہونا چاہیے۔"

اس کو علامہ بلاغی رحمہ اللہ نے بھی اپنے انداز میں تحریر کیا ہے اس طرح کہ:

احتج علی الفریقین بما یعرفونه و یعترفون به من خلقة ادم فماذا یقول الیهود فی اٰدم و ما ذا یقول النصاری فیه (آلاء الرحمن)

دونوں فرقوں کے خلاف اس نے استدلال کیا ہے ایسی چیز سے کہ جس کو وہ جانتے تھے اور جس کو وہ اقرار رکھتے تھے یعنی آدمؑ کی تخلیق تو اب آدمؑ کے بارے میں یہود کیا کہیں گے اور ان کے بارے میں عیسائی کیا کہیں گے؟

اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ﴿۶۰﴾

"یہ حق بات ہے[1] تمہارے پروردگار کی طرف سے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔"

فَمَنۡ حَآجَّكَ فِيۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ فَقُلۡ تَعَالَوۡا نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَاَبۡنَآءَكُمۡ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمۡ وَاَنۡفُسَنَا وَاَنۡفُسَكُمۡ ۚ ثُمَّ نَبۡتَهِلۡ فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰذِبِيۡنَ ﴿۶۱﴾

"اب جو شخص اس بارے میں آپ نے کٹھ حجتی کرے اس کے بعد یہ علمی دلائل[2] آپ کے پاس آ گئے تو کہہ دیجئے کہ آؤ! ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے نفسوں کو اور تمہارے نفسوں کو پھر التجا کریں[3] اور اللہ کی لعنت قرار دیں جھوٹوں پر۔"

واقعہ مُباہلہ:

یہ مشہور و معروف آیہ مباہلہ ہے جس میں نصارائے نجران کو دلائل کے پیش ہونے اور ان کے برابر بحث کئے جانے کے بعد روحانی مقابلہ کی دعوت دی گئی اور اس کے لئے حضرتؐ تشریف لے گئے اس طرح کہ آپ کے ساتھ بیٹوں کی جگہ حسنؑ و حسینؑ تھے اور عورتوں میں خاتون جنت جناب فاطمہ زہراؑ اور انفس کی منزل پر حضرت علی بن ابی طالبؑ حضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب میں دعا کروں تو تم سب آمین کہنا نتیجہ یہ ہوا کہ نصاریٰ نے مباہلہ سے پہلوتہی کی اور جزیہ دینے پر تیار ہو گئے۔

---

[1] ۔خبر مبتداء محذوف (نیشاپوری) ای ھٰذا ھو الحق من ربك (مجمع البیان) ای الاخبار باحوال المسیح ھو الحق (البلاغی)
[2] ۔من البرھان الواضح (مجمع البیان) البیّنات الموجبة للعلم (صافی)
[3] ۔ای نتضرع فی الدعاء (مجمع)

"انفسنا" کے معنی:

یہ واقعہ فریقین کے درمیان متفق علیہ ہے[1] شیخ ابن تیمیہ ایسے متعصب نے بھی اپنی مشہور کتاب "منہاج السنہ" میں جو رد شیعہ کیلئے لکھی گئی ہے اس واقعہ کی صحت اور الفاظ قرآن کے مصداق میں کہ وہ یہی ہستیاں ہیں کسی شک وشبہ کا اظہار نہیں کیا ہے مگر انہوں نے حضرت علی بن ابی طالبؑ کی بلندی ورفعت کے اظہار میں انفسنا کا لفظ کی اہمیت کو گھٹانا چاہا ہے کہ اس سے عموماً اپنے ہم قوم افراد مراد ہوتے ہیں جس میں کسی بلندی اوصاف کا لحاظ نہیں ہوتا جیسا کہ قرآن میں ہے:

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ : اپنے نفوس کو قتل کرتے ہو اور وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ : تم اپنے نفوس کو اپنے گھروں سے نہ نکالو

مگر اس کا جواب علامہ بلاغیؒ نے آلاء الرحمن میں بالکل صحیح دیا ہے کہ نفس کا لفظ جو دوسرے اعزا وا قارب کا تذکرہ کے ساتھ الگ سے بولا جائے تو وہاں ہم قوم افراد تھوڑی مراد ہوں گے بلکہ اس وقت تو خود اپنی ذات مراد ہوں گی جیسے سورہ تحریم ہے۔

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا.

اپنے نفوس کو اور اپنے عزیز وا قارب کو آگ سے بچاؤ اور سورہ زمر اور شوریٰ میں ہے:

الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ

جنہوں نے نفوس اور عزیز اقارب کو خسارہ میں مبتلا کیا۔

یہاں ایسا ہی ہے کہ ابنآء اور نسآء نا کے بعد لگ سے انفسنا آیا ہے تو اب اسے عام ہم قوم کہاں مراد ہو سکتے ہیں؟ یہاں تو جسے انفسنا کہا جائے وہ اس خصوصیت خاص کا حامل ہوگا کہ وہ متکلم کی ذات کا درجہ رکھتا ہو۔

خود ابن تیمیہ کو اپنے بیان کردہ مفہوم میں ایک کمزوری محسوس ہورہی ہے کہ اگر ہم قوم مراد ہیں تو پھر چچا عباسؓ اور دوسرے نبی ہاشم کیوں اس منزل پر لائے نہیں گئے؟ اس کے جواب میں انہیں مجبوراً یہ کہنا پڑا ہے کہ عباسؓ کو اسلام میں وہ سبقت حاصل نہ تھی جو علیؑ کو تھی اور دوسرے بنی ہاشم ان میں بھی علیؑ کا ایسا کوئی دوسرا نہ تھا۔

دیکھا آپ نے؟ صیاد کس طرح اپنے دام میں آیا ہے؟! آخر میں نتیجہ کیا نکلا؟ یہی تو کہ انفسنا کہنا اوصاف کی کچھ خاص بلندی اور رسولؐ خدا سے خاص قرب کی بنا پر ہے یعنی ایسی منزلت جو دوسروں کو حاصل نہ تھی۔

اس آیت کی یہ دلالت بھی بلاشبہ مسلم ہے کہ اس میں حسنینؑ کو جو نواسے تھے فرزند رسولؐ کہا گیا ہے چنانچہ علامہ نیشاپوری لکھتے ہیں:

---

[1] ۔ فی العیون عن الکاظم علیہ السلام ـــــــ ان تاویل قوله عزو جل ابناء نا الحسن علیہ السلام والحسين علیہ السلام ونساء نا فاطمة علیہا السلام وانفسنا علی بن ابن طالب علیہ السلام (صافی) قدنجران لذلک وقد کرج ومعه الحسن علیہ السلام والحسين علیہ السلام وفاطمة علیہا السلام وعلی علیہ السلام وقال لهم اذا دعوت فامنوا فابوا ان بلا عنوه وصالحوه علی التجزية رواه ابو نعيم فی دلائل النبوة (جلالین) حضرت آپؐ حضرت فاطمہؑ اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ اور حضرت علیؑ کو لے کر گئے (موضح القرآن)

وفی الا یۃ دلالۃ علی ان الحسن علیہ السلام و الحسین علیہ السلام وھما ابنا بنت یصح ان یقال انھما ابنا رسول اللہ رضی اللہ عنہما لانہ وعدان یدعوابناء ثم جاء بھما (غرائب القرآن)

حسنینؑ کا فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونا:

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ حسنؑ و حسینؑ جو رسولؐ کی بیٹی کے فرزند تھے انہیں فرزند رسول خدا کہنا درست ہے اس لئے کہ آپ نے اعلان فرمایا کہ آپ اپنے بیٹوں کو لائیں گے پھر ان دونوں کو لے کر تشریف لائے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶۲ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝۶۳

"بلا شبہ یہی ہے سچا بیان اور کوئی خدا نہیں سوا اللہ کے اور بلا شبہ اللہ زبردست ہے ہر کام ٹھیک کرنے والا اب وہ منہ موڑیں تو بلا شبہ اللہ تباہ کاروں سے خوب واقف ہے۔"

نفی الوہیت غیر اور توحید باری کے اعلان کے ساتھ یہ الفاظ کہ "اللہ زبردست ہے ہر کام ٹھیک کرنے والا" اس استدلال پر مشتمل ہیں کہ شریک کی ضرورت یا قوت کی کمی سے ہوتی ہے یا علم کی کمی سے یعنی سہارا دوسرے کی جسمانی طاقت کا لیا جاتا ہے اور اس کے دماغی قوت کا اور اللہ کی نہ طاقت میں نقص ہے اور نہ علم میں پھر وہ اپنا شریک کس لئے بنائے گا[1]؟

آخر میں یہ کہ اللہ تباہ کاروں سے خوب واقف ہے اس سے یہ پتہ دیا گیا ہے کہ خود شرک بہت بڑی تباہ کاری ہے جس سے ارتقائے انسانی کو بڑا دھچکا لگتا ہے اور ذہنیت کی پستی کے ساتھ ہر طرح کی عملی پستی پیدا ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ نوح انسانی کی مکمل تباہی کی طرف منجر ہوتا ہے[2]۔

اسی لئے دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ

شرک بہت بڑا ظلم ہے (لقمان۔ ۱۳)

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَـيْـــًٔـا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا

---

[1]۔ لا احد سواہ یساویہ فی القدرۃ التامّۃ والحکمۃ البالغۃ لیشارکہ فی الالوھیّۃ (صافی)

[2]۔ الاعراض عن التوحید افساد للذین ویؤدی الی افساد النفس بل والی افساد العالم (صافی)

فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ۝٦٤

"کہیے کہ اے کتاب والو! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے [1] کہ ہم عبادت نہ کریں اللہ کے سوا کسی کی اور اسی کا کسی شے کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں کے کچھ لوگ کچھ کو اللہ کے سوا مالک ومختار نہ سمجھ لیں۔ اب اگر یہ لوگ منھ پھرائیں تو تم لوگ کہو کہ گواہ رہنا کہ ہم مسلم ہیں۔"

مخالفین کو روادانہ دعوت اتحاد:

اس میں یہود و نصاریٰ کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اصول اسلام خود ان کی کتابوں کے رو سے بھی قابل تسلیم ہیں اور مشرکین کے مقابلہ میں تو ان سب کو یک دست ہونا چاہیے مگر وہ صرف تعصب کی بناء پر مسلمانوں کے مقابلہ میں فریق بنتے ہیں اور اس طرح مسلم کا لفظ جو ان سب میں مشترک ہونا چاہیے ان کے تعصب وعناد کی وجہ سے صرف اس جماعت میں محدود ہو گیا جو کہ اپنے مسلم ہونے کا اعلان کر رہی ہے اور مسلم ہی کہے جانے پر فخر رکھتی ہے۔

نفی شرک کے بعد یہ کہ کچھ لوگ کچھ کو اللہ کے سوا اپنا مالک ومختار نہ مانیں۔" اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مالک ومختار سمجھنا بحیثیت عبادت نہیں کسی اور اعتبار سے ہے اور یہ وہ ہے جسے دوسری جگہ کہا گیا ہے:

اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ

انہوں نے اپنے پادریوں اور راہبوں کو اللہ کے سوا مالک ومختار سمجھ لیا ہے۔ (توبہ۔ ۳۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے شریعت میں حلال اور حرام مقرر کرنے کا انہیں ٹھیکہ دار سمجھ لیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم نے جو مسلمان ہو چکے تھے کہا: یارسول اللہ! ہم ان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے حضرتؐ نے فرمایا:

الیس کانوا یحلون لکم و یحرمون فتاخذون بقولھم

کیا ایسا نہ تھا کہ وہ تمہارے لئے حلال وحرام مقرر کرتے تھے تو تم ان کے قول پر عمل کرتے تھے؟

انہوں نے کہا ہاں ایسا تو تھا حضرتؐ نے فرمایا:

ھو ذاك "بس یہی وہ ہے جسے قرآن میں اس طرح کہا گیا ہے (صافی)

اسلام میں فقہا اور مجتہدین کو شریعت سازی کا اختیار نہیں:

اسلام میں حلال وحرام مقرر کرنے کا حق کسی کے لئے نہیں مانا جاتا۔ اسی لئے فقہائے امت کو مجتہد کہا جاتا ہے یعنی ان کا کام ہے حلال اور حرام معلوم کرنے کی کوشش کرنا اور دلائل سے پتہ لگانا کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام؟ نہ یہ کہ اپنے دل سے ان احکام کی تشکیل کرنا۔

---

[1]۔ بیائید بسوئے مسلم سخنی میان ما وشما (شاہ ولی اللہ) ای عادلة لا میل لها ـــــــ وقیل معناه كلمة مستربة بيننا وبينك (مجمع البیان)
برابر برابر ہے ہمارے اور تمہارے درمیان میں (تاج العلماء)

آخر میں یہ الفاظ کہ ''گواہ رہنا کہ ہم مسلم ہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہمارا مسلک وہ ہے جس کی حقانیت پر تمہاری بھی کتابیں متفق ہیں اور ہم تمہیں بھی عملاً اس پر قائم رہنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اب اگر تم اس پر عملاً قائم نہیں رہے تو خود تمہارے ضمیر کو اس کا گواہ ہونا چاہے کہ اس دین اسلام پر جو تمہارے اسلاف ابراہیمؑ اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کا راستہ تھا ہم قائم ہیں اس لئے ہم مسلم ہیں اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ تمہیں اعتراف کرنا چاہیے کہ تم کافر ہو جب کہ اس راہ سے جو اسلام کی ہے تم صاف صاف انحراف اختیار کر رہے ہو[1]۔

قرآنی تہذیب یا رواداری:

مگر قرآن نے پہلے جزء پر اکتفا کیا اور اس جزء کو جس کے اظہار میں تلخی زیادہ تھی بیان نہیں کیا جسے ایک قرآنی تہذیب سمجھنا چاہیے جس کے نمونے کلام الٰہی میں اور بھی موجود ہیں اور جسے 'رواداری' کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾

''اے کتاب والو! ابراہیم کے بارے میں کیوں خواہ مخواہ تکرار کرتے ہو؟[2] حالانکہ توریت اور انجیل دونوں نہیں اتریں مگر ان کے بعد تو کیا تم عقل سے کام نہیں لو گے[3]؟!

حضرت ابراہیم علیہ السلام کس دین پر تھے:

یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ ہمارے دین پر تھے اور نصاریٰ کہتے تھے کہ وہ ہمارے دین پر تھے بعض روایتوں میں یہ ہے کہ ان دونوں فرقوں کے آدمیوں نے حضرتؐ کو ثالث بنایا[4]۔

قرآن کہتا ہے کہ تم بلاوجہ بحثیں کیوں کرتے ہو؟ تمہارے خصوصیات امتیازی جو توریت اور انجیل سے وابستہ ہیں حضرت ابراہیمؑ میں کیوں کر ہو سکتے ہیں؟! یہ کتابیں تو ان کے بعد نازل ہوئی ہیں لہٰذا جناب ابراہیمؑ میں وہی مشترک جوہر توحید تھا جو اسلام کا طرہ امتیاز ہے لہٰذا انہیں بسم مسلم کہنا صحیح ہے۔ یہودی یا نصرانی کچھ بھی کہنا بے معنی ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے ایک بہت ضروری سوال اٹھا کر اس کا جواب دیا ہے۔ وہ یہ کہ جب توریت اور انجیل کا جناب ابراہیمؑ کے بعد نازل ہونا اس کی دلیل ہے کہ وہ یہودی اور نصرانی نہ تھے تو پھر قرآن تو اس کے بھی بعد نازل ہوا ہے۔ ایسی صورت میں انہیں مسلم کیوں کہا جاتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہودیت توریت اور نصرانیت انجیل سے وابستہ ہے لیکن اسلام کو خود قرآن نے بتایا ہے کہ وہ ازل سے دین الٰہی

---

[1]۔ معناه اعترفوا بانكم كافرون حيث اعرضتم عن الحق بعدما تبيّن (نیشا پوری)

[2]۔ کیوں جھائیں جھائیں کرتے ہو (تاج العلماء)

[3]۔ کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں (تاج)

[4]۔ قيل نزلت اليهود والنّصارىٰ فى ابراهيم ــــــ فترافعوا الىٰ رسول اللهؐ فنزلت (صافی)

ہے اور اس کی بنیاد توحید پر ہے لہٰذا وہ نزول قرآن سے وابستہ نہیں ہے۔
یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت ابراہیمؑ کو مسلم کہنا باعتبار اصل اصول دین ہے۔ اس سے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس شریعت پر کلیتہً عامل ہوں جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی[1]۔

هَاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٦٧﴾

"اچھا! اب تک تو تم ان سے ایسی باتوں میں حجت کر رہے تھے جن کا تمہیں کچھ علم ہے[2] اب کیوں تم ان باتوں میں حجت کرتے ہو جن سے تمہیں کوئی بھی واقفیت نہیں ہے اللہ علم رکھتا ہے اور تم علم نہیں رکھتے۔ ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ تو نرے کھرے مسلم تھے[3] اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے۔"

اس سے آگے بڑھ کر خود بخود نتیجہ ذہن میں آ جانا چاہیے کہ حضرت موسیٰؑ بھی موسائی یعنی یہودی نہ تھے، اور حضرت عیسیٰؑ یعنی نصرانی نہ تھے اس لئے کہ دین حقیقی جس کی تبلیغ کے لئے تمام سچے انبیاء آئے اسلام ہی ہے لہٰذا حضرت موسیٰؑ بھی اسلام ہی کے مبلغ تھے اور عیسیٰؑ بھی اسلام ہی کے معلم تھے جو دین ان کی طرف منسوب کر دیئے گئے ان سے خود ان کا کوئی تعلق نہ تھا[4]۔
آخر کے فقرہ میں کہ "وہ مشرکین میں سے نہ تھے" اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دین جو یہودیت اور نصرانیت سے موسوم ہیں ان میں تو شرک داخل ہو گیا ہے[5] اور انبیاء الٰہی سب توحید کے علم بردار رہے ہیں۔

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٨﴾

---

[1]۔ اذا لاسلام عبارۃ عن الدّین دون احکام الشریعۃ (مجمع البیان)
[2]۔ اے لو، تم وہی تو ہو جو جھگڑتے تھے اس میں جس کا یقین تھا (تاج العلماء)
[3]۔ فان الدین عند اللہ الاسلام والیھودیۃ ملّۃ محرّفۃ عن شرع موسیٰؑ والنصرانیۃ ملۃ محرفۃ عن شرع عیسیٰؑ (مجمع البیان)
[4]۔ قیل ان ھٰذا یتضمّن کون الیھودیۃ والنصرانیۃ شرکاء و قیل ان معناہ لم یکن مشرکا علیٰ ما یدعیہ مشرکوا العرب (مجمع)
[5]۔ فی الکافی عن الصادقؑ خالصا مخلصا لیس فیہ شی من عبادۃ الاوثان (صافی) حنیفا ی مائلا عن الادیان کلھا الی دین الاسلام وقیل معناہ مستقیما فی دینہ (مجمع البیان) موحّد ابحقیقۃ التوحید (البلاغی)

”بلا شبہ تمام لوگوں میں ابراہیم سے زیادہ تعلق رکھنے والے [۱] وہ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی ہے اور یہ پیغمبر اور وہ جو ایمان لائے ہیں اور اللہ اہل ایمان کا سرپرست ہے۔“

”جنہوں نے ان کی پیروی کی“ یعنی جنہوں نے ان کی تعلیم کو اپنایا اور اس پر عمل پیرا رہے۔ اس سے عامہ مفسرین نے ان کے زمانہ والوں کو مراد لیا ہے [۲] کہ وہ اس وقت کے سچے مسلمان تھے۔ مگر ہمارے نزدیک اس تخصیص کی ضرورت نہیں ہے بلکہ جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کے مبعوث ہونے تک جتنے ملت حنفیہ کے پرستار رہے [۳] جن میں فرد اکمل ہمارے رسولؐ کے آباؤ اجداد تھے وہ سب اس میں داخل ہیں، اور اب یہ رسولؐ اور اس رسولؐ پر ایمان لانے والے مسلمان، یہ حقیقی معنی میں جناب ابراہیمؑ کی تعلیمات کے ورثہ دار ہیں [۴]۔

اور یہ تعلق جو انہیں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ہے وہ حقیقت ان کی ذات کے ساتھ تھوڑی ہے۔ اسلام کی تو خصوصیت یہ ہے کہ یہاں بنیادی اہمیت کسی انسان کی نہیں ہے بلکہ یہ تعلق درحقیقت ذات خالق کے ساتھ ہے۔ اس لئے آخر میں کہا گیا: **وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ** ”اللہ اصلی مالک وسرپرست مومنین کا ہے“ اور ان سب کا جن میں خود حضرت ابراہیمؑ بھی داخل ہیں تعلق اس کی ذات سے ہے۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾

”اہل کتاب میں کے ایک بڑے گروہ کی خواہش ہے [۵] کہ کاش وہ تمہیں بہکا لیں حالانکہ وہ نہیں بہکاتے مگر خود اپنے ہی کو اور انہیں شعور نہیں۔“

چوں کہ اس بہکانے کی کوشش سے وہ دنیا میں ناکامی اور آخرت میں عذاب کے مستحق بنتے ہیں اور اس طرح مسلمانوں کا کچھ نہیں بگڑتا کیوں کہ یہ ان کے بہکانے میں آتے نہیں جو نقصان ہوتا ہے وہ خود انہی کا ہوتا ہے کہ اس لئے کہا گیا کہ ”وہ نہیں بہکاتے مگر خود اپنے ہی“ کو یعنی اس سے نقصان خود ہی اٹھاتے ہیں [۶]۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾

---

[۱]۔ احقهم بابراهيم (جلالین) نزدیک ترین مردم بابراہیم (شاہ ولی اللہ) اخصتهم واقربهم منه من الولی وهو القرب (صافی) ابراہیمؑ سے زیادہ خصوصیت انہی لوگوں کو ہے (تاج العلماء)

[۲]۔ الّذين اتبعوه فی زمانه (جلالین) پیروی او کردند یعنی دو زمان او (شاہ ولی اللہ)

[۳]۔ من الانبياء والموحّدين الصالحين من النّاس (البلاغی)

[۴]۔ ای هم الذين ينبغی لهم ان يقولوا انا علی دين ابرهيم علیہ السلام (مجمع البیان)

[۵]۔ بہت چاہا ایک جرگے نے کتاب والوں کے (تاج العلماء)

[۶]۔ لان اثم ضلالهم عليهم والمؤمنون لايطيعونهم (جلالین) ای لايرجع وبال اضلالهم الا علی انفسهم (مجمع البیان)

"اے اہل کتاب! کیوں آیات الٰہی کا انکار کرتے ہو؟ حالانکہ تم خود گواہ ہو[1]۔"

علمائے اہل کتاب کے لئے سرمایۂ انتباہات:

اہل کتاب سے علمائے یہود ونصاریٰ مراد ہیں۔ یہ لوگ خود جانتے تھے کہ ان کی کتابوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر اور ان کی علامات صاف طریقہ پر موجود ہیں۔ اس لئے انہیں ضمیر کی رہ نمائی سے خود اس کی گواہی دینا چاہیے مگر وہ بجائے اس کی شہادت دینے کے اپنے ذاتی اغراض کے بناء پر خود اس کا انکار کر رہے ہیں۔

اس صورت میں آیات الٰہی سے مراد خود ان کی کتابوں کے مندرجہ مضامین ہوں گے۔

اس کے علاوہ مفسرین نے دو معنی اور بھی لکھے ہیں:

ایک یہ کہ آیات اللہ سے آیات قرآن مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ تمہارا دل گواہی دیتا ہے کہ ان کا مضمون کتب سابقہ کے مطابق ہے پھر بھی انکار کرتے ہو[2]۔

دوسرے یہ کہ آیات سے مراد معجزات ہوں یعنی تم معجزات دیکھ رہے ہو اور جانتے ہو کہ یہ معجزے ہیں پھر بھی مانتے نہیں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿71﴾

"اے کتاب والو! کیوں حق کو باطل کے ساتھ غلط ملط کرتے ہو[3] اور (اصلی) حق کو چھپاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو۔"

جیسا کہ ایک جگہ حضرت علی بن ابی طالبؑ نے فرمایا کہ:

فلوان الباطل خلص من مزاج الحق لم يخف على المرتادين ولوان الحق خلص من لبس الباطل انقطعت عنه ألسُنُ المعاندين ولكن يوخذ من هذا ضغث و من هذا ضغث فيمزجان فهنالك يستولى الشيطان على اوليائه.

"اگر باطل حق کی آمیزش سے الگ ہو جاتا تو طلب گاروں پر پوشیدہ نہ ہوتا اور اگر حق باطل کی ملاوٹ سے خالی ہو جاتا تو معترضین کی زبانیں بالکل ہی بند ہو جاتیں مگر ہوتا یہ ہے کہ ایک مٹھی اس کی لی جاتی ہے اور ایک مٹھی اس کی اور پھر دونوں کو ملا دیا جاتا ہے اب شیطان کو موقع مل جاتا ہے اور وہ اپنے دوستوں پر غالب آجاتا ہے۔"

چابک دست حامیان باطل کا رویہ یہی رہتا ہے کہ باطل کے ساتھ کچھ حق کی آمیزش رکھتے ہیں تاکہ آدمی موٹی نگاہ سے اس کی غلطی پر متنبہ نہ ہو یہی صورت علمائے اہل کتاب کرتے تھے۔

اس طرح کی آیت پہلے آچکی ہے جس کی تفسیر میں تشریح کے ساتھ ہم نے اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔

---

[1]۔ تشھدون انھا آیات اللہ (صافی) کیوں تم منکر ہوتے ہو حالانکہ تم انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا کرتے ہو (تاج العلماء)

[2]۔ اٰیات اللہ یعنی القراٰن (مجمع البیان)

[3]۔ کیوں کھپے دیتے ہو تم حق کو باطل سے (تاج العلماء)

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ط قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ لا اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ط قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ج يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

''اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ کا قول یہ ہے کہ ایمان لے آؤ اس پر جو مسلمانوں پر نازل ہوا ہے دن کے ابتدائی حصہ میں اور اس کے آخر کے حصہ میں انکار کردو[1] ممکن ہے وہ بھی پلٹ آئیں اور مانو نہیں مگر اسی کی کہ جو تمہارے دین کی پیروی کرے۔ کہیے کہ اصل ہدایت اللہ کی ہدایت ہے کہ کسی کو مل جائے ویسی ہی چیز جیسی تمہارے پاس تھی یا وہ دلیل و حجت میں تمہارے پروردگار کے یہاں تم پر فوقیت لے جائیں کہہ دیجئے کہ بلاشبہ نعمت و احسان اللہ کے ہاتھ میں ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ گنجائش والا ہے بڑا جاننے والا۔ اپنی رحمت سے جسے چاہتا ہے مخصوص کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل و کرم والا ہے۔''

پرستارانِ باطل کا ایک منصوبہ:

اس آیت کے فقرات کی ساخت سمجھنے میں مترجمین کو بڑا دھوکا ہوا ہے اور مفسرین نے بھی دشواری محسوس کی ہے یہاں تک کہ ملا حسن فیض نے کہا ہے کہ:

هی من المتشابهات التی لم یصل الینا من اهل البیت علیہم السلام فیها شی (صافی)

یہ آیت متشابہات میں سے ہے جن کے بارے میں ہم تک اہل بیت رسولؐ سے کچھ نہیں پہنچا۔

اور علامہ نیشاپوری نے لکھا ہے:

عدت الایة من المواضع المشکلة (غرائب القرآن)

اس آیت کا مشکل مقامات میں شمار کیا گیا ہے۔ مگر ہم ہر جملہ کی مختصر تشریح جو بفضل الٰہی ہم سمجھے ہیں درج کرتے ہیں جس میں کوئی پیچیدگی معلوم نہیں ہوتی۔

اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے ایک گروہ نے کہا یہ کوئی قول لفظی نہیں ہے بلکہ ان کا طرز عمل زاویہ نظر اور ان کی ذہنیت جو ہے اس کا

---

[1]۔ مان لو ـــــــ سویرے اور مکر جاؤ جھٹپٹے وقت (تاج العلماء)

اظہار ہے اسی لئے ہم نے ''کہا'' یا ''کہتا'' ہے ترجمہ نہیں کیا بلکہ ترجمہ کیا ہے کہ ایک گروہ کا قول ہے۔

اور یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان جو شاطر سیاست داں لیڈر تھے وہ اپنے کچھ خاص افراد کو اس طرح کے طرز عمل اختیار کرنے کی فہمایش بھی کرتے ہوں گے [1]۔

وہ کیا قول ہے؟ ایک سیاسی منصوبہ کہ اگر بالکل دوٹوک مسلمانوں کی مخالفت کی جائے تب تو وہ تم سے بھڑک ہی جائیں گے۔ پھر تمہاری بات قبول کیا کریں گے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ انہیں مانوس بناؤ اور پھر اپنا مطلب حاصل کرو۔

اس کی شکل یہ ہے کہ پہلے جا کر ان کی جماعت میں شامل ہو ''ایمان لے آؤ یعنی بظاہر اقرار ایمان کرلو جس کی وجہ سے وہ اپنا آدمی سمجھ لیں پھر کچھ دن رہ کر اور ان کے ساتھ مانوس ہو کر حقائق ایمانی کے متعلق شکوک وشبہات ظاہر کرنا شروع کرو جس سے کچھ نہ کچھ وہ بھی اپنے استحکام ایمانی میں متزلزل ہوں اور پھر رجعت کر کے انکار کرنے لگو تو بہت سے ان سے تمہارے ساتھ کھینچ کر اس راستے سے منحرف ہو جائیں گے اور تمہارا مطلب حاصل ہو جائے گا [2]۔

یہ ہوا اس کا مطلب کہ دن کے ابتدائی حصہ میں ایمانی لاؤ اور آخری حصہ میں کافر ہو جاؤ شاید وہ بھی پلٹ آئیں۔

جیسا کہ علامہ طبرسیؒ نے لکھا ہے اس کی شان نزول بھی یہ بتائی گئی ہے کہ کچھ لوگوں نے ایسا ہی منصوبہ بنایا تھا کہ صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو پھر کافر ہو جاؤ یہ کہہ کر کہ ہم نے خوب دیکھ لیا۔ یہ وہ پیغمبر نہیں ہیں جن کی ہماری کتابوں میں پیشین گوئی ہے [3]۔

اب اس سیاست والوں کو یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ اس جماعت میں جا کر شامل ہونے والے واقعی ایمان لے ہی نہ آئیں۔ اس لئے کہ وہ ان کی حمیت قومی کو بیدار کرتے ہیں کہ تمہارا آبائی ایک دین ہے۔ یہ لوگ اس دین کو چھوڑ کر الگ ہوئے تو ان کے ساتھ واقعی تمہیں متحد نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں تو ان کی بات ماننا چاہیے جو تمہارے دین پر ہیں۔

ایک معنی اس کے جو میرے نزدیک بعید ہیں یہ کہے گئے ہیں کہ دیکھو خبردار! ایمان کا اظہار نہ کرو یعنی اپنی کتابوں سے ایسے اوصاف آخری رسولؐ کے جو اس پیغمبرؐ پر منطبق ہوتے ہیں بیان نہ کرو مگر اپنے ہی مذہب کے کسی قابل اعتماد آدمی سے جو اسے دوسروں سے نہ کہے [4]۔

یہاں تک ان باطل کیشوں کی سیاسی تلقین تھی [5]

اس کا جواب خالق دلوا رہا ہے اپنے رسولؐ کی زبانی:

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ

---

[1]۔ الظاھر انھم من الیھود قالوا البعض قومھم تعلیما لھم بمخاوعۃ المؤمنین (بلاغی)

[2]۔ لعلھم یرجعون یشکون فی دینھم ظنّا بانکم قد رجعتم لخلل ظھر لکم (صافی)

[3]۔ فاذا فعلتم ذٰلك شك اصحابه فی دینه وقالوا انھم اھل الکتاب وھم اعلم به منّا فیرجعون عن ما الیٰ دینکم (مجمع البیان)

[4]۔ ای ولا تبدوا ایمانکم ولا تعترفوا بذٰلك الا لمن تبع دینکم وکان منکم فانه یخفیه کما نخفیه (بلاغیؒ)

[5]۔ فیکون ھٰذا کلّه من کلام الیھود (مجمع البیان) اتفق المفسّرون علیٰ انه من بقیۃ کلام اھل الکتٰب (نیشاپوری)

کہہ دیجئے کہ اصل ہدایت اللہ کی ہدایت ہے [۱]۔

یعنی جو اہل ایمان خدا کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں تمہاری ان کارستانیوں سے متزلزل نہیں ہو سکتے اور اسی میں ان کے اس قومی احساس کا جواب ہے کہ دین حق اور ہدایت ربانی کسی قوم وملت کی ملکیت نہیں ہے۔ ہدایت اللہ کی طرف کی چیز ہے لہٰذا اس میں تمہارا کوئی اجارہ نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کو وہی نعمت دیدے جو تمہیں ملی تھی یعنی کتاب آسمانی تمہیں عطا ہوئی تھی۔ اسی پر تمہیں فخر تھا۔ اب اللہ کی کتاب کسی دوسرے خاندان اولاد اسماعیلؑ کو عطا ہوجائے تو تم اسے کہاں روک سکتے ہو۔ یہ ہے کہ اس جملہ کا مفہوم کہ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ [۲] اور اب تک خدا کے یہاں نجات کے حق دار اور کامیاب وکامران تم تھے یہ اب جب کہ دوسری کتاب اور شریعت آ گئی تو یہ دوسرے لوگ اب پیش خدا حجت ودلیل میں تم پر غالب آ جائیں یہ ہیں اس فقرہ کے معنی کہ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ اور اسی کا تتمہ ایک اصول اور ایک کلیہ کی صورت میں آخر میں کہلوایا کہ:

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ، يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

کہہ دیجئے کہ فضل وکرم اللہ کے ہاتھوں میں ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

اس طرح پوری سطح کلام کی ہموار معلوم ہوتی ہے مگر دوسرے لوگوں نے اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ کو ان اہل کتاب کا قول قرار دے کر بیچ میں صرف "قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ" کے جملہ کو اس کا جواب مانا ہے جو خالق کی طرف سے ہے۔

اس کے بعد پھر اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ کو مشرکین کے کلام کا تتمہ قرار دیا ہے اور پھر قل ان الفضل بیداللہ سے آخر تک اس کا جواب قرار دیا ہے اس طرح ترجمہ میں بڑی گڑبڑ ہوئی ہے مثلاً شاہ ولی اللہ نے قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ کے ترجمہ کے بعد

"کہ بگو یا محمدؐ ہر آئینہ ہدایت ہمانست کہ ہدایت خداست کا ہے وگفتند باور مکنید آنکہ دادہ شود بہیچ کس مانند آنچہ دادہ شدہ اید"

اس میں "گفتند" ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ "باور مکنید" بھی ایسا اضافہ ہے جس کے ہم معنی لفظ قرآن میں یہاں پر نہیں ہے۔

انہوں نے تتبع بظاہر تفسیر جلالین کا کیا جس کے الفاظ یہ ہیں:

المعنی لا تقروا بان احدا یؤتی ذلك الّا من تبع دینکم

معنی یہ ہیں کہ یہ تسلیم نہ کرو کہ کسی کو ایسی چیز مل سکتی ہے سوا اس کے جو تمہارے مذہب کی پیروی کرے۔

مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے بھی اس کی پیروی کی ہے۔

تعجب ہے کہ علامہ بلاغیؒ بھی اگرچہ بیچ میں قالوا وغیرہ کا اضافہ نہیں فرماتے مگر وہ بھی بیچ کے جملہ کو معترضہ قرار دیتے ہوئے اس کے بعد

---

[۱]۔ اتفقوا علیٰ ان قوله قل ان الهدٰی هدی الله وکذا قوله قل ان الفضل بید الله الیٰ اخرها کلام الله (نیشاپوری)

[۲]۔ یعنی من العلم والحکمة والکتاب والحجّة (صافی) فلا تجحدوا ایّها الیهود ان یؤتی احد مثل ما اوتیتم من النبوّة (مجمع)

کہ ان یوتی احدا الخ کومشرکین ہی کے قول کا تتمہ قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

ای ولا تومنوا لغیر من اتبع دینکم بان یؤتی احد من غیرکم مثل ما اوتیتم باعتبار انبیائکم و کتبکم من النبوۃ والرسالۃ والکتاب والشریعۃ او تؤمنوا لھم بانّھم یحاجّو کم عندربکم و ان لھم علیکم الحجۃ عند اللہ بما تعرفونہ من الحق.

یعنی اور سوا اس کے جو تمہارے دین کا پیرو ہو اور کسی کے لئے یہ تسلیم نہ کرو کہ کسی کو ویسی چیز ملے گی جیسی تمہارے انبیاء اور تمہاری کتابوں کے لحاظ سے نبوت اور رسالت اور کتاب اور شریعت کی نعمت تمہیں عطا ہوئی ہے اور نہ دوسروں کے لئے تم یہ مانو کہ وہ تمہارے پروردگار کے یہاں تم پر حجت میں غالب آئیں گے اور یہ کہ انکی تم پر اللہ کے یہاں اس حق کے لحاظ سے جو تم پہچانتے ہو حجت تمام ہوگی۔

اور زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کا ذہن اس مفہوم سے نزدیک پہنچتا ہے جو ہم نے قرار دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

او ان النبی قال ان لاھدی ھدی اللہ بان یوتی احدالی اخرہ تکون جملۃ ان یوتی متعلقۃ بما امر اللہ رسولہ ان یقولہ.

یا یہ کہ پیغمبرؐ نے ان سے یہ کہا کہ ہدایت اللہ کی ہدایت ہے کہ کسی کو ویسی ہی چیز جیسی تمہیں ملی تھی مل جائے تو یہ جملہ اسی مقولہ سے متعلق ہوگا جس کے کہنے کا ان سے اللہ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا تھا۔

مگر پھر لکھ دیتے ہیں:۔

والاظھر ھو الوجہ الاول.

پہلی صورت زیادہ واضح ہے

مجھے علامہ موصوف کے سلامت ذوق سے اگر کہیں پر شدید شکایت پیدا ہوئی ہے تو وہ یہ موقع ہے کہ ایک ہموار اور متوازن مفہوم کے مقابلہ میں جس میں قطعاً کوئی پیچیدگی نہیں وہ اس مفہوم کو اظہر فرماتے ہیں، جو الفاظ قرآنی سے ذہن میں بلا زحمت و تکلف ہرگز نہیں آسکتا۔

وَمِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ‌ ۚ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِدِيۡنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَيۡهِ قَآئِمًا‌ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ سَبِيۡلٌ‌ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰى مَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۷۶﴾

"اور اہل کتاب میں کوئی تو ایسا ہے کہ اگر اس کے پاس ڈھیر بھر بھی روپیہ تم امانت رکھواؤ[1] تو وہ اسے تمہیں ادا کر

---

[1]۔امین کرے تو ایک گچھے پر (تاج العلماء)

دے گا اور ان میں کوئی ایسا ہے کہ ایک سکہ بھی سونے کا[1] امانت رکھو تو وہ اسے بھی ادا نہ کرے گا مگر جب تک کہ تم اس کے سر پر کھڑے نہ رہو[2] یہ اس لئے ہے کہ ان کا قول یہ ہے کہ ہم پر غیر اہل کتاب کے بارے میں کوئی پابندی نہیں ہے اور وہ اللہ پر جھوٹ منڈھتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کیوں نہیں! جو اپنے عہد کو پورا کرے اور پرہیزگاری سے کام لے تو بلاشبہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔''

جماعت اہل کتاب کی بدمعاملگی:

اہل کتاب میں سے کچھ اچھے کردار کے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ انہیں امانت داری کا بالکل خیال نہیں ہے اور غیر مذاہب کے اموال کو تو وہ کافر کا مال سمجھ کر ہضم کر لینا جائز جانتے ہیں[3] اسی کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ہم پر غیر اہل کتاب کے بارے میں کوئی پابندی نہیں ہے۔

خالق نے اس کی رد فرمائی ہے اور اس رد کا ماحصل یہ ہے کہ جو بات اصول شرافت وانسانیت کے لحاظ سے غلط ہے وہ ہر جماعت کے ساتھ غلط ہے۔ اللہ اسے کسی کے ساتھ بھی پسند نہیں کرے گا۔

امانت ودیانت کالحاظ ہر جماعت کے ساتھ لازم:

چوں کہ اصول اصول ہی ہے لہٰذا اس سے مسلمانوں کو بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ بھی اگر یہ خیال کر لیں کہ کافروں کے مقابلہ میں ہم پر کوئی اخلاقی ذمہ داری نہیں ہے تو یہ خیال غلط ہے۔ امانت ودیانت کا لحاظ ہر جماعت کے ساتھ معاملت میں ضروری ہے خواہ وہ مسلمانوں کی جماعت ہو یا غیر مسلمین کی۔

حدیث میں ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ نے اس آیت کے پڑھنے کے بعد فرمایا:

ما من شئ کان فی الجاهلية الا هو تحت قدمی الا الامانة فانها مؤداة الی البرو الفاجر (صافی و مجمع البیان)

جو بات بھی زمانہ جاہلیت کی تھی وہ میرے قدموں کے نیچے پامال ہے سوا امانت داری کے کہ اس فریضہ کو نیک اور بد ہر آدمی کے مقابلہ میں انجام دینا ضروری ہے۔

اس حدیث کو علامہ نیشاپوری نے بھی درج کیا ہے اور پھر جناب ابن عباسؓ کے متعلق نقل کیا ہے کہ ان سے کسی نے کہا کہ ہمیں دوسرے اہل مذاہب کی بکریاں وغیرہ کبھی مل جاتی ہیں۔ انہوں نے پوچھا پھر تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں ہمارے لئے کوئی حرج نہیں ہے۔ انہوں نے کہا یہ تو ویسا ہی ہوا جیسے کافر کہتے تھے: لیس علینا فی الامیین سبیل: ہم پر ان لوگوں کا جو غیر اہل کتاب ہیں مال کھانے

---

[1] ۔ایک اشرفی (تاج العلماء) والمراد تجعله امینا علیٰ قلیل من المال (مجمع البیان)

[2] ۔الّا مذتقدوا مك علیٰ راسه تطالبه بالعنف (صافی) مگر تا وقتیکہ باش بر سراو ایستادہ (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔سبیل ای امر لا ستحلا لظلم من خالف دینهم (جلالین) ای لیس علینا فی شان من لیسوا من اهل الکتاب ولم یکونوا علیٰ دیننا عقاب وذم (صافی) اس لئے کہ غیر مذاہب کا مال کھا جانا درست ہے (حواشی تاج العلماء)

میں کوئی الزام نہیں ہے''(غرائب القرآن)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

''بلا شبہ وہ جو اللہ کے عہد و پیمان اور اپنی قسموں کے عوض میں تھوڑے سے دام وصول کرتے ہیں یہ وہ ہیں کہ ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اللہ روز قیامت ان سے بات بھی نہیں کرے گا اور ان پر نظر بھی نہیں ڈالے گا[۱] قیامت کے دن اور نہ انہیں بری قرار دے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

''اللہ کے عہد و پیمان'' کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے اس رسول پر ایمان اور اس کی نصرت و اطاعت وغیرہ کا جو عہد لیا تھا[۲] اور یہ بھی کہ یہ اللہ سے جو عہد کرتے ہیں[۳]۔ بعد میں قسموں کا ذکر اس مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اس عہد و پیمان اور قسموں کے عوض تھوڑے سے دام وصول کرنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ تھوڑی سی جاہ دنیا کی خاطر رشوت لے کر ان فرائض کو ترک کر دیتے ہیں۔ لَا يُزَكِّيْهِمْ کے معنی زیادہ تر یہ قرار دیے جاتے ہیں کہ انہیں پاک نہیں کرے گا[۴] مگر ہم نے ترجمہ کیا ہے ''بری نہیں قرار دے گا'' جس معنی میں ایک جگہ اور قرآن مجید میں یہ لفظ ہے اس طرح:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ (نساء ۴۹)

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے کو بری سمجھتے ہیں بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے بری قرار دیتا ہے۔

تفاسیر میں اس کے مطابق قول موجود ہے[۵]۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾

---

[۱]۔ انہیں نظر بھر کے نہیں دیکھے گا (تاج العلماء)

[۲]۔ یعھد اللہ الیھم بالایمان بالنبی ﷺ واداء الامانۃ (جلالین) ای بامر اللہ وما یلزمھم الوفاء بہ (مجمع البیان)

[۳]۔ بما عاھدوا علیہ اللہ (بلاغی) عوض پیمانی کہ بخدا بستند (شاہ ولی اللہ) ای بعھدھم مع اللہ (بلاغیؒ)

[۴]۔ لا یطھرکم (جلالین) پاک نسازد ایشاں را (شاہ ولی اللہ) نہ پاک کرے گا اُن کو (شاہ رفیع الدین)

[۵]۔ قیل لا یحکم بانھم ازکیاء ولا یسمیھم بذلك بل یحکم بانھم کفرۃ فجرۃ (مجمع البیان) قیل ولا شئی علیھم (صافی)

''اور بلاشبہ ان میں ایک گروہ ایسا ہے جو اپنی زبان کو کتاب کے پڑھنے میں مروڑ دیتا ہے [1] ۔ تاکہ تم اسے کتاب کا جزء سمجھو حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہوتا اور کہتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے اور وہ اللہ پر دیدہ و دانستہ جھوٹ باندھتا ہے۔''

توریت میں تحریف کا وقوع:

کتاب سے مراد توریت ہے اور ''زبان کو مروڑنے'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ اصل کتاب کے الفاظ سے اپنی زبان کو ہٹا کر اپنے ان مصنوعی فقرات کو پڑھنے لگتے ہیں [2] ۔ بہر صورت یہ آیت توریت اور کتب مقدسہ میں علمائے اہل کتاب کے لفظی طور پر تحریف کرنے کی دلیل ہے جو شک وشبہ سے بالاتر ایک حقیقت ہے۔ اس کے بعد قرآن کی ان آیات کو جن میں کتب سابقہ کی تصدیق ہے اسی اصل کتاب سے متعلق ماننا ضروری ہے نہ وہ جو اہل کتاب میں توریت وغیرہ کے نام سے چیز مروج ہوگئی ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٨٠﴾

''کسی انسان کے لئے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اللہ اسے کتاب، اپنی طرف کا اقتدار [3] اور نبوت عطا فرمائے اور پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم میرے بندے بن جاؤ، نہ اللہ کے بلکہ وہ یہی کہے گا کہ [4] تم اللہ والے ہو جاؤ۔ اس بناء پر کہ تم کتاب کی تعلیم دیا کیے ہو اور اسے پڑھتے رہے ہو اور نہ وہ تمہیں یہ حکم دے گا کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو پروردگار سمجھ لو، کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا اس کے بعد کہ تم مسلمان ہو۔''

یہ ان جماعتوں کو تنبیہ ہے جو کسی نبی کی پیروہونے کی مدعی ہیں جیسے یہود حضرت موسیٰؑ کے اور نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کے اور پھر کسی قسم کے شرک میں مبتلا ہیں خواہ خود اسی پیغمبر کو انہوں نے خدا یا خدا کا بیٹا قرار دے لیا ہو جیسے نصاریٰ یا کسی اور نبی کو جیسے یہود عزیرؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں یا فرشتوں کو جیسا

---

[1] ۔ لپیٹ سپیٹ سے زیادہ دبا کر لکھا ہوا پڑھتے ہیں (تاج العلماء)

[2] ۔ ای یعطفونہا بقرءتہ عن المنزل الیٰ ما حرّفوہ (جلالین) یقتلون السنتہم ویحرفونہا فی قراءتہم الیٰ مالیس فیہ (بلاغی)

[3] ۔ فی مجمع البیان ای العلم وفی الکشاف الحکمة ولکن کلّ منہا بعید عن اللفظ فالظاہر انہ سیطرة الرّسالة والدعوة والارشاد (بلاغی)

[4] ۔ فیہ حذف ای لاینبغی لھذا النّبیّ ان یقول للناس اعبدونی ولکنّہ ینبغی ان یقول لھم کونوا ربّانیّین (مجمع البیان)

کہ صائبین کا قول تھا[1] ۔انہیں سمجھا یا جارہا ہے کہ جب ایسی ہستیوں کے پیرو ہونے کے دعوے دار ہو جو اللہ کے سچے رسول ہیں تو خود غور کرو کہ ان رسولوں نے کیا یہی تعلیم دی تھی کہ تم انہیں خود خدا بنا لو یا کسی اور نبی یا فرشتے کو خدا سمجھ لو؟ وہ تو اللہ کے بھیجے ہوئے تھے اس لئے انہوں نے خدا ہی کی پرستش کی دعوت دی تھی۔ کسی اور کی تھوڑی لہٰذا اگر تم ان کے پیرو ہو تو ان شرک کی باتوں کو چھوڑ و اور جو ان کی اصل تعلیم تھی اور وہ اسلام ہے اس کو اختیار کرو۔

عصمت انبیاء:

ایک روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے ہمارے پیغمبرؐ کے پاس آ کر یہ عرض کیا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو ہم اپنا معبود بنا لیں؟ آپؐ نے فرمایا پناہ بخدا کہ ہم اپنی عبادت کے لئے کہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2] ۔

علامہ بلاغیؒ نے بشر کے ساتھ ان اوصاف کے انضمام سے جو آیت میں مذکور ہیں خوب نتیجہ نکالا ہے کہ اس آیت میں ایک ساتھ دو باتوں کا اظہار ہے۔ ایک یہ کہ بشر اور اس کے ساتھ باعتبار تخلیق جو نقائص وابستہ ہیں وہ الوہیت سے مانع ہیں اس لئے کسی بھی بشر کے لئے الوہیت کا دعویٰ درست نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ عام بشر چاہے غلط طور پر اپنے لئے دعویٰ کرے مگر وہ بشر جسے اللہ نے نبوت وغیرہ عطا کی ہے، اس قسم کا دعویٰ ہرگز نہ کرے گا کیوں کہ وہ معصوم ہوتا ہے اور یہ دعویٰ ہوگا جھوٹ اور معصوم جھوٹا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اس لئے انجیل وغیرہ میں اگر خود عیسیٰؑ یا کسی نبی کی طرف نسبت دے کر ایسے الفاظ مذکور ہیں جن سے خود اپنے متعلق الوہیت کا دعویٰ نکلتا ہو تو سمجھ لو کہ اس کی نسبت ان انبیاء کی طرف درست نہیں ہے۔

اس مقام پر علامہ نیشاپوری نے بڑی نکتہ رسی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی ممانعت یا عدم بھی جواز کا اظہار نہیں ہے کہ کسی کو جسے اللہ نے نبوت عطا کی تھی ایسا کہنا جائز نہیں یا درست نہیں تھا کیوں کہ یہ کہنا ناجائز اور نادرست تو سب ہی کے لئے بلکہ یہ عدم امکان کا اظہار ہے مطلب یہ ہے کہ جسے اللہ نے وحی اور کتاب کے لائق سمجھا وہ بندہ ایسے صفات کا حامل ہوتا ہے کہ اس سے اس قسم کے ادعاء کا تصور ہی نہیں ہوسکتا (ملاحظہ ہو غرائب القرآن) اسی کو علم کلام کی زبان میں ہم یوں کہتے ہیں کہ انبیاء اور آئمہ معصومؑ ہیں اور عصمت کی بناء پر ان سے صدور گناہ کا امکان ہی نہیں ہے۔ یہ عدم امکان عجز کی بناء پر نہیں ہے جو نقص ہو بلکہ یہ ان کے صفات کی برتری کا تقاضا ہے جو کہ کمال ہے۔ یہ اسی طرح یہ جیسے اس کے پہلے اللہ کے صفات میں ہم عادل ہونے کے قائل ہیں جس کے معنی ہیں قبائح وشرور اور ظلم وعبث سے بری ہونا۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ ان باتوں کے کرنے سے عاجز ہے بلکہ یہ کہ اس کا کمال ذات اور استغنائے مطلق ان باتوں سے صدور سے مانع ہے۔

علامہ نیشاپوری نے اس کی نظیر میں قرآن کی یہ آیت پیش کی ہے: مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ
اللہ کے لئے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اس کے کوئی اولاد ہو بس ویسا ہی یہاں ہے۔ (مریم۔۳۵)

ما کان لبشر (یعنی) اس طرح کے بشر کے لئے یہ بات ممکن ہی نہیں کہ وہ خود اپنی خدائی کے منوانے کے درپے ہو۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ

---

[1] ۔ کما اتخذت الصّائبة الملٰئکة والیهود عزیرا والنصارٰی عیسٰی (جلالین)

[2] ۔ قیل ان ابا رافع القرظی من الیهود ورئیس وفد نجران قالا یا محمّد اتریدان نعبدك ونتّخذك الٰها فقال معاذالله ان اعبد غیر الله اوامر بعبادة غیر الله ما بذلك بعثنی ولا بذلك امرنی فانزل الله الایة (مجمع البیان)

رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ ؕ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا ؕ قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنۡ تَوَلّٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۸۲﴾

"اور جب اللہ نے پیغمبروں سے اقرار لیا کہ میں نے جو تمہیں کتاب اور حکمت عطا کی ہے اس کے بعد ایک رسول تمہاری طرف آئے جو تمہاری پاس کی چیزوں کی تصدیق کر رہا ہو تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔ اس نے کہا کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور اس پر میرے عہد و پیمان کو تم نے قبول کیا[1]؟ انہوں نے کہا "ہاں ہم نے اقرار کیا" اس نے کہا کہ اچھا تو گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔ اب جو اس کے بعد منہ پھرائے گا تو یہ لوگ وہی ہوں گے جو بداعمال ہیں[2]۔

آیت کے الفاظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تمام انبیاء سے یہ عہد و پیمان لیا گیا اور یہ متعدد احادیث سے بھی جو اس کی تفسیر میں وارد ہوئے ہیں ظاہر ہوتا ہے[3]۔

تمام پیغمبروں سے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کا عہد:

اب جب انبیاء سے عہد و پیمان ہو گیا تو ان انبیاء کی بشارتوں کے ذریعہ سے یہ اطلاع ان کی امتوں میں بھی پہنچتی رہی بلکہ خود اس آیت میں ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ. کا ایک مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ تم نے میرے اس عہد کو دوسروں سے بھی لیا[4]۔ پاس لئے بعد میں جو تنبیہ ہے وہ امتوں کے لئے ہے کہ جو اس کے بعد منہ پھرائے گا تو یہ فاسق لوگ ہونگے۔ بلکہ دو ایک حدیثیں ایسی ہیں جن میں ہے کہ پیغمبروں سے اقرار کا مطلب ہی یہ ہے کہ ان کی امتوں سے اقرار لیا گیا[5]۔ مگر پہلے احادیث چوں کہ الفاظ قرآن سے زیادہ مطابقت رکھتی ہیں اس لئے وہی قابل ترجیح ہیں۔

اَفَغَيۡرَ دِيۡنِ اللّٰهِ يَبۡغُوۡنَ وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا

---

[1]۔ اصری ای عھدی (صافی) معناہ و قبلتم علی ذٰلک عھدی (مجمع البیان) اٹھالیا تم نے اس بات پر بوجھ میرے عہد کا (تاج العلماء)

[2]۔ ایسے ہی تو نافرمان و بدچلن ہوتے ہیں (تاج العلماء)

[3]۔ روی عن علی علیہ السلام انہ قال لم یبعث اللہ نبیا آدم و من بعدہ الا اخذ علیہ العھد لئن بعث اللہ محمدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و ھو حیّ لیؤمننّ بہ ولینصرنّہ (مجمع البیان)

[4]۔ عن امیر المؤمنین علیہ السلام قال اقررتم و اخذتم العھد بذٰلک علی امکم (صافی)

[5]۔ فی المجمع عن الصّادق علیہ السلام ان معناہ و اذا اخذ اللہ میثاق امم النّبیّین ـــــ و العیاشی عن الباقر علیہ السلام صافی معناہ مبسوطا (صافی)

وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

"تو کیا وہ اللہ کے دین کے سوا اور کسی دین کو تلاش کرتے ہیں حالانکہ اس کے لئے خوش، اور ناخوش، اسلام پر عمل پیرا ہیں [1] جتنے آسمان اور زمین میں ہیں اور اسی کی طرف انہیں رجوع ہونا ہے۔"

اسلام قانونِ فطرت ہے:

اسلام قانون الٰہی کے سامنے سر جھکانا ہے[2] اسی کو کہا گیا ہے: ان الدّین عند اللہ الاسلام اب اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا تمام کائنات کے دین سے انحراف ہے کیوں کہ تمام کائنات اس کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان کے علاوہ دوسری چیزوں کا سر جھکانا تسخیری طور پر ہے۔ تسخیری اسلام کا فرد ملحد پر بھی حاوی ہے مگر دین اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان اختیاری طور پر بھی اسی راستے پر گامزن ہوجائے جس پر ہو اضطراری طور پر بہرحال گامزن ہے تاکہ شرف انسانی نمودار رہو اور یہ اس کی بناء پر اجر کا حق دار رہو۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾

"کہہ دیجئے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر کہ جو اتارا گیا ہم پر اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اسباطؑ پر اتارا گیا تھا اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے عطا ہوا تھا ہم ان میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور ہم اس کے لئے اسلام اختیار کیے ہوئے ہیں۔"

بالکل اسی مضمون کی آیت پہلے پارے کے اواخر میں آچکی ہے۔ وہاں ابتداء قولوا سے ہے یعنی تمام مسلمانوں سے خطاب کیا گیا ہے کہ تم کہدو۔ یہاں قل سے ابتداء ہے یعنی اے رسولؐ! آپ کہہ دیجئے اور یہ کہنا سب کے نمایندہ کی حیثیت سے ہے[3] وہاں انزل الینا ہے ہماری طرف نازل ہوا اور یہاں انزل علینا ہے کہ ہم پر نازل ہوا۔ اس کے علاوہ بعد میں یہاں ایک لفظ اوتی عطا کیا گیا ساتھ موسیٰؑ عیسیٰؑ اور النبیون کو بطور نائب فاعل ذکر کر دیا ہے اور وہاں موسیٰؑ عیسیٰؑ کے بعد پھر وما اوتی کی تکرار کے ساتھ النبیون کو نائب فاعل قرار دیا ہے۔ بہرحال دونوں آیتوں کے مطلب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لئے اب اس کی تفسیر کے لئے اسی آیت کا حوالہ دے دینا کافی معلوم ہوتا ہے۔ مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

---

[1]۔ اس کے سامنے گردنیں ڈال دی ہیں ____ خوش خوش یا زبردستی (تاج العلماء)

[2]۔ فی التوحید والعیاشی عن الصّادق علیہ السلام ھو توحیدھم اللہ عزوجل (صافی)

[3]۔ امر الرّسول بان یخبر عن نفسہ ومتابعیہ بالایمان (صافی) کما یخاطب رئیس القوم بان یقول عن نفسہ وعن رعیۃ (مجمع البیان)

وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۸۵﴾

”اور جو اسلام کے علاوہ کوئی دین تلاش کرے وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا۔

اسلام کے بغیر نجات کا تصوّر غلط:

یہ آیت صاف وصریح طور پر اس کا اظہار کرتی ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں کسی دوسرے دین کے اختیار کرنے والے کے لئے نجات نہیں ہے۔ یہ تصور کہ دوسرے مذاہب کے افراد اگر اپنے معیار پر نیکوکار رہوں تو وہ نجات کے حق دار ہوں گے قرآن کی رو سے درست نہیں ہے۔

كَيۡفَ يَهۡدِى اللّٰهُ قَوۡمًا كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِيۡمَانِهِمۡ وَشَهِدُوۡۤا اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ ‌ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓـئِكَ جَزَآؤُهُمۡ اَنَّ عَلَيۡهِمۡ لَعۡنَةَ اللّٰهِ وَالۡمَلٰٓـئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ ۙ‏ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ ﴿۸۸﴾

”کیونکر اللہ منزل مقصود پر پہنچائے [۱] ان لوگوں کو جو ایمان اختیار کرنے کے بعد پھر کافر ہو جائیں حالانکہ [۲] وہ گواہی دے چکے کہ پیغمبر سچا ہے اور ان کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں آ چکیں اور اللہ انہیں کہ جو ظلم وتعدی سے کام لیں منزل مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا۔ ان کی سزا یہ ہے کہ عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔“

”کیوں کر اللہ منزل مقصد پر پہنچائے یہ قدرت کی کمی کی بناء پر مجبوری کا اظہار نہیں ہے بلکہ حکمت کے اقتضاء کی بناء پر ہے کہ اسے جبر کرنا نہیں ہے تو ہدایت کا تمام سامان ہو جانے اور حق کو خود جاننے پہچاننے اور اقرار کر لینے کے بعد بھی جو لوگ منحرف ہو جائیں ان کے ساتھ اللہ کیا کرے؟ بس وہ یہی کر سکتا ہے اسکے بعد کہ انہیں مورد لعنت قرار دے اور ان کے جرم کی سزا جو ان کے استحقاق کے لحاظ سے صحیح ومناسب ہے انہیں دے۔

اور ہدایت کے دوسرے معنی بھی ہو سکتے ہیں جس کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنی توفیق خاص راہ راست پر آنے کی ان کے شامل حال کیوں کر کرے جب کہ یہ اپنے غلط کردار سے اس کے مستحق ہی نہیں رہے ہیں [۳]۔

---

[۱]۔ راہ پر لائے گا (تاج العلماء)

[۲]۔ عطف علیٰ ما فی ایمانہم من معنی الفعل او حال باضمار قد (صافی)

[۳]۔ فانّ ھٰؤلاء قد اخرجوا انفسھم بتمرّدھم علی اللہ عن اھلیتھم للطفہ وایصالھم الی الھدٰی بتوفیقہ (البلاغ)

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٨٩﴾

"مگر وہ جنہوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور عمل کی اصلاح کر لی تو بلا شبہ اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان۔"

یعنی پھر تو ان کا معاف ہو جانا لازمی ہے۔ اس لئے کہ اللہ کی شان ہی یہی ہے کہ وہ ایسے مجرموں کو معاف فرما دے [1]۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿٩٠﴾

"یقیناً وہ لوگ جو ایمان لانے کے بعد کافر ہوئے پھر کفر میں اور زیادتی کر لی ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی اور یہ بالکل گمراہ ہیں۔

اگر سیاق سے الگ کر کے اس آیت کو دیکھا جائے تو وہ مرتد کے بارے میں بھی ہو سکتی ہے بلکہ پہلے جو ذہن میں معنی آتے ہیں وہ ہیں اس صورت میں وہ اس حکم کی دلیل ہوگی جو مسلم ہے کہ مرتد فطری کی توبہ قبول نہیں ہے مگر سیاق چوں کہ اہل کتاب سے متعلق ہے اس لئے مفسرین [2] اس کا مطلب یہ کہتے ہیں کہ جو ایمان لانے کے بعد کافر ہوئے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانا اس طرح مومن ہوئے اور پھر جب عیسیٰ علیہ السلام آئے تو ان کا انکار کر دیا اس طرح کافر ہوئے اور اب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کر کے مزید کفر اختیار کر رہے ہیں [3]۔ اس صورت میں "ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی" یہ کسی اصول شرعی کا اعلان نہیں ہے بلکہ علم الٰہی کا اظہار ہے کہ یہ لوگ صدق دل سے توبہ کریں گے ہی نہیں کہ ان کی توبہ قبول ہو بلکہ ان کا اصرار وانکار ایسا ہے کہ وہ توبہ کریں گے بھی تو بہ مجبوری ایسے حالات میں کہ جب اس توبہ کو قبول ہونا ہی نہ چاہیے [4]۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٩١﴾

"بلا شبہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے [5] ان میں سے کسی ایک سے پورے روئے زمین بھر کا سونا اگر وہ معاوضہ میں دینا چاہیے تو ہرگز قبول نہیں ہوگا۔ یہ وہ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہے اور ان کے کوئی مددگار نہیں ہوں گے۔"

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٩٢﴾

---

[1]۔ انّ ھذہ المغفرۃ لیست ممّا یرجی اتفاقہ بل ھی لازمۃ فی رحمۃ اللہ و لطفہ لانّہ غفور رحیم (بلاغؒ)

"ہرگز تم بھلائی کا درجہ حاصل نہیں کرو گے [1] جب تک خیرات نہ کرو اس میں سے جو تمہیں پسند ہے اور جو چیز تم خیرات میں دو گے یقیناً اس سے خوب واقف ہے"

یعنی سلف ما اجماع کردہ اند و آں بدون رضائے خدا منعقد نمی شود (فتح الرحمن)

خیرات کے متعلق ضروری ہدایت

بہت سے اشخاص ایسے ہیں کہ جو چیز انہیں خود نا پسند ہوئی، وہ انہوں نے خیرات میں دیدی، اسے کہا گیا ہے کہ یہ خیرات فضیلت نہیں رکھتی۔ خیرات تو وہی فضیلت رکھتی ہے کہ تم اپنے پسند کی چیز راہ خدا میں دو چنانچہ جناب امیر علیہ السلام کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ حضرتؑ نے ایک پیراہن خرید فرمایا جو آپ کو اچھا معلوم ہوا تو اسے آپ نے راہ خدا میں دیدیا (مجمع البیان)

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىةُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰىةِ فَاتۡلُوۡهَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝٩٣ فَمَنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝٩٤ وقف جبرائیل علیہ السلام

"سب کھانے بنی اسرائیل کے لئے حلال تھے سوا اُن کے جو اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کر لئے تھے [2] توریت اترنے سے پہلے کہیے کہ توریت لا کر اسے پڑھو، اگر تم سچے ہو، تو جو اس کے بعد اللہ پر جھوٹ باندھے تو یہ بڑے ظالم لوگ ہوں گے۔"

اگر شانِ نزول کی کسی روایت سے رہ نمائی نہ ہو تو اس آیت کے مضمون سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ توریت نازل ہونے کے پہلے غذاؤں میں حلال اور حرام کی تفریق من جانب اللہ نہ ہوئی تھی۔ ہاں جناب یعقوب علیہ السلام نے جن کا لقب اسرائیل ہے، کچھ چیزوں کے ترک کی اپنی مرضی سے پابندی کر لی تھی۔ بعض احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اونٹ کا گوشت تھا جو طبّی حیثیت سے جناب یعقوب علیہ السلام کو مضر تھا اس لئے انہوں نے ترک کر دیا تھا [3]۔ اب یہود جو بعض چیزوں کو دل بخواہ حرام کیے ہوئے ہیں، اس کا ماخذ کوئی بھی نہیں ہے، اسی کو کہا گیا ہے کہ اگر سچے ہو تو توریت لا کر پڑھو، دیکھو لو کہ ان کی حرمت کا پتہ کہاں لگتا ہے؟

---

[1]۔ لن تبلغوا حقیقۃ ولا تکونوا ابرار (صافی) ای لن تدرکوا برّ اللہ تعالیٰ باھل طاعتہ (مجمع البیان)

[2]۔ حرام کردہ بود یعقوبؑ بر خویشتن (شاہ ولی اللہ)

[3]۔ فی الکافی والعیاشی عن الصادقؑ ان اسرائیل کان اذا اکل من لحمہ الابل ھیّج علیہ وجع الخاصرۃ فحرّم علیٰ نفسہ لحم الابل (صافی)

مگر علامہ طبریؒ نے جو شان نزول لکھی ہے، وہ یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت پیغمبر خداؐ پر یہ اعتراض کیا کہ انہوں نے اونٹ کے گوشت کو حلال کر دیا ہے تو اس کا جواب دیا گیا ہے کہ شرعاً تو وہ کبھی بھی حرام نہیں تھا۔ اسے تو جناب یعقوب علیہ السلام نے شخصی طور پر اپنے لئے حرام قرار دیا تھا۔ اس پر کسی حکم شرعی کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔[1]

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾

''کہیے کہ اللہ نے سچ بتا دیا ہے لہٰذا تم بس ابراہیم کے دین کی، جو غلط راستے کو چھوڑ کر سیدھے راستے پر قائم تھے، پیروی کرو اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔''

حنیف کے معنی لغت میں ہٹنے اور مڑنے کے ہیں، اس لئے جناب ابراہیم علیہ السلام کو جو حنیف کہا گیا ہے، اس میں دوسری غلط راہوں سے ہٹنے کا مفہوم پیدا ہوا ہے۔[2] دوسری جگہ حنیفاً کے ساتھ مسلماً کی لفظ کہہ کر اثباتی پہلو نمایاں کیا گیا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ

بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ

مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾

''یقیناً سب سے پہلا گھر جو تمام لوگوں کے لئے مقرر ہوا، وہی ہے جو مکہ میں ہے، بابرکت اور سرمایہ ہدایت تمام جہانوں کے لئے۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، (خصوصیت سے) مقام ابراہیمؑ اور جو اس کے اندر پہنچ جائے وہ امن میں ہے اور اللہ کے لئے تمام لوگوں کے ذمہ خانہ کعبہ کا حج ہے، جو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو[3] اور جو کفر اختیار کرے اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔''

وجوب حج اور اس کی شرط لازم استطاعت، خانہ کعبہ سرزمین مکہ اور مقام ابراہیم علیہ السلام

''پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر ہوا'' یعنی جسے عبادت گاہ خلائق قرار دیا گیا ہے[4] اور دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلا گھر جو دنیا کے اندر وجود میں آیا، وہ یہی تھا اور یہیں سے خلقت زمین کا آغاز ہوا۔[5]

---

[1]۔ انکر الیہود تحلیل النبی لحوم الابل فقال کل ذلک کان حلالا لابراھیم (مجمع البیان)

[2]۔ مائلا عن کل دین الا الاسلام (جلالین) اصل الحنف الاستقامہ... حنیفا ای مستقیما علی الدین (مجمع)

[3]۔ ہر کہ توانائی دارد در فتن بسوئی آں از جہت اسباب راہ (شاہ ولی اللہ)

[4]۔ وضع للناس لیکون متعبّدا لھم (صافی)

[5]۔ ای بنی للناس ثم لم یبن قبلہ بیت مبنی و انما دحیت الارض من تحتہا (مجمع البیان)

بکہ اور مکہ صرف تلفظ کے فرق کے ساتھ ایک ہی جگہ کے نام ہیں[1] اور ایک روایت ہے کہ پورے شہر کا نام مکہ ہے اور بکہ خاص وہ جگہ ہے، جہاں پر کعبہ ہے[2] لیکن زیادہ حدیثیں اس کی تائید میں ہیں کہ مکہ اور بکہ ایک چیز ہے۔

''مقام ابراہیم'' وہ جگہ ہے جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی دیواریں اونچی کی تھیں اور پتھر میں آپ کے قدم کا نشان ہو گیا تھا۔[3]

مرکز عبادت کے تعارف میں اس کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کرنا اس کی دلیل ہے کہ اولیائے الٰہی کی یاد اور اس کی یاد کے مراسم کا قیام منافی توحید ربانی نہیں ہے۔

فریضہ حج ''استطاعت'' کے ساتھ مخصوص ہے جس کے حدود و قیود کتب فقہیہ سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

''کہیے کہ اے اہل کتاب! اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ اللہ تمہارے اعمال کا گواہ ہے۔ کہیے کہ اے اہل کتاب! اللہ کے راستے سے اس کو جو ایمان لانا چاہے کیوں روکتے ہو؟ تم اسے ٹیڑھا بنانے کے درپے ہو[4] حالانکہ تم خود گواہ ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔''

اہل کتاب کو تنبیہی تازیانے

''اسے ٹیڑھا بنانے کے درپے ہو'' یعنی اس کے بارے میں طرح طرح کے غلط اعتراضات اور نکتہ چینیاں کر کے چاہتے ہو کہ راہ راست کو سمجھنے والے دھوکے میں پڑ جائیں، وہ اسے کج سمجھنے لگیں اور اس طرح سے منحرف ہو جائیں۔[5]

ایک دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ تم اسے کج روی سے حاصل کرنا چاہتے ہو یعنی طلب حق کی کوشش کے جو صحیح راستے ہیں انہیں اختیار نہیں کرتے ہو۔[6]

---

[1]۔ بكة لغة في مكة (جلالین)

[2]۔ عنه موضع البيت بكة والقرية مكة (صافی)

[3]۔ مقام ابراهيم حيث قام على الحجر فاثرت فيه قدماه (صافی)

[4]۔ تطلبون السبيل عوجا (جلالین)

[5]۔ طالبين لها اعوجاجا بان تلبسوا على الناس و توهموا ان فيه عوجا عن الحق (صافی)

[6]۔ قيل معناه تطلبون ذلك السبيل لا على وجه الاستقامة او على غير الوجه الذى ينبغي ان يطلب (مجمع البيان)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾

''اے ایمان لانے والو! اگر اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانو گے تو یہ تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹا دیں گے۔''

مسلمانوں کے لئے سامان انتباہ

مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے بہت ایسے ہیں کہ اگر ان کا کہنا مانو گے تو یہ تمہیں گمراہ کر دیں گے۔ ورنہ کچھ اہل کتاب جو انصاف پسند تھے، انہوں نے سچے دل سے اسلام قبول ہی کر لیا۔ ممکن ہے کہ جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے ہیں، ان میں بھی کچھ اسلام کی حقیقتوں کو محسوس کر کے گومگو کے عالم میں ہوں اور ان کی قوت ارادی اظہار حق کے لئے ساتھ نہ دے رہی ہو مگر وہ اپنی اس کمزوری پر اپنی جگہ منفعل ہوں لیکن ان کے علاوہ ایک طبقہ ایسا ہے جو دیدہ دانستہ تعصب وعناد سے اسلام کی راہ سے الگ اور ہٹ دھرمی گویا اس پر مفتخر بھی ہے۔ وہ دوسروں کو بھی حق کی طرف آنے سے مانع ہوتا ہے اور وہ مسلمانوں کو بھی ناصح مشفق کے بھیس میں آ کر ورغلانے کی کوشش کرتا ہے، انہیں کہا جا رہا ہے کہ مسلمان اگر ان کے کہنے پر چلیں تو وہ انہیں بھی کفر یہ باتیں سکھا کر گمراہ کر دیں گے۔

اس انتباہ کی ضرورت قرآن کو کیوں محسوس ہوئی؟ صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ علمائے یہود کی بخیال خود علمیت سے مرعوب ہوتے ہوئے ان کا گرویدہ ہو رہا تھا ممکن ہے کہ اس طبقہ کے کچھ افراد قبول اسلام کا نقاب ڈال کر خود مسلمانوں میں شامل ہو گئے ہوں جیسے عبداللہ بن سلام اور کعب الاخبار وغیرہ اور افسوس ہے کہ مسلمانوں کے برسر اقتدار جماعت نے صرف اہل بیت رسولؐ کے معارف وعلوم سے بے نیاز ہونے کے لئے جنہیں وہ اپنا ''حزب مخالف'' سمجھتے تھے، ان نومسلم یہودیوں کو اپنا علمی مرکز بنا لیا جس کی وجہ سے ''اسرائیلیات'' کا بڑا ذخیرہ اسلامی لٹریچر میں شامل ہو گیا جس میں بہت سی باتیں اسلامی روح کے بالکل منافی ہیں۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

''اور کیوں کر اب تم کفر اختیار کرو گے درآں حالیکہ تم میں خداوندی آیتوں کی تلاوت ہوتی اور تم میں اس کا پیغمبر موجود ہے اور جو اللہ سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہوا[1] وہ بے شک سیدھے راستے پر لگا دیا گیا ہے۔''

''کیوں کر'' کے معنی نفی قدرت کے نہیں، بلکہ عدم استحسان کے ہیں، یعنی ہدایت کے تمام اسباب ہوتے ہوئے، پھر گمراہی کو اختیار کر لینا

---

[1]۔ چنگ استوار کرد بخدا (شاہ ولی اللہ)

ایسی بات ہے جو ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔[1]

اور یوں تو کفر ہر حالت میں غیر مستحسن ہے مگر ہدایت کے اس ماحول میں ہوتے ہوئے کفر اختیار کرنے کی برائی اور بھی زیادہ شدید ہے۔[2]

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

”اے ایمان والو! اللہ کے غضب سے بچو، جو حق ہے بچنے کا اور دنیا سے نہ اٹھو مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔“

”جو حق ہے بچنے کا......“ اس کی تشریح امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس طرح فرمائی کہ:

يطاع ولا يعصى ويذكر فلا ينسى ويشكر فلا يكفر (صافی)

اس کی اطاعت کی جائے، نافرمانی نہ کی جائے اور اسے یاد رکھا جائے، فراموش نہ کیا جائے اور اس کا شکریہ کیا جائے، ناشکرا پن نہ کیا جائے۔

دنیا سے اٹھنا، نہ اٹھنا تو ظاہر ہے، انسان کے اختیار میں نہیں ہے لیکن یہ ایک عام محاورہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم دین اسلام سے کسی وقت بھی منحرف نہ ہونا کہ جب بھی دنیا سے اٹھو، دین حق پر قائم و برقرار رہونے ہی کی حالت میں اٹھو۔[3]

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

”اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامو اور تتر بتر نہ ہو اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے جب کہ تم آپس میں دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی تو اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کی بالکل کگر پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے چھٹکارا دیا۔[4] اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے لئے ظاہر کرتا ہے، شاید کہ تم سیدھے راستے پر لگ جاؤ“

---

[1]۔ انکار و تعجب لکفرهم فی حال اجتمع لهم الاسباب الداعیة الی الایمان الصارفة عن الکفر (صافی)

[2]۔ والکفر وان کان قطعیا فی کل حال فهو فی مثل هذا الحالة اقطع (مجمع البیان)

[3]۔ انما النهی فی الحقیقة عن ترک الاسلام (مجمع البیان)

[4]۔ علیٰ طرف حفرة من جهنم لم یکن بینها و بینکم الا الموت (مجمع البیان)

اتحاد اور اتفاق باہمی کی تاکید

''اللہ کی رسی کو تھامنے'' کے معنی ہیں سب کا اس نظام پر قائم رہنا جو اللہ کا قائم کردہ ہے۔ اسی نظام کا نام ''دین'' ہے اسی نظام کا دستور العمل قرآن ہے اور اسی نظام کے رہبر اور عملی نمونہ رسولؐ اور امامؑ ہیں۔ اس طرح احادیث میں جو حبل اللہ کی تفسیر ''دین اسلام'' سے ہوئی ہے اور کتاب الٰہی سے ہوئی ہے اور آل محمد علیہم السلام یا خصوصیت کے ساتھ حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ساتھ ہوئی ہے، ان سب کا ماحصل ایک ہی قرار پاتا ہے۔[1]

حدیث ثقلین کے بعض طرق میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ:۔

ایہا الناس انی قد ترك فیکم حبلَین ان اخذتم بہما لن تضلوا بعدی.[2]

میں تم میں دو رسیاں چھوڑتا ہوں اگر تم انہیں تھامے رہو گے تو کبھی میرے بعد گمراہ نہیں ہو گے۔

اس حبل اللہ کے اس جامع مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ‌ؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۝١٠٤

''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا چاہیے جو بھلائی کی دعوت دیتی ہو، نیک کاموں کی ہدایت کرتی ہو اور بری باتوں سے منع کرتی ہو اور یہی وہ ہیں جو ہر طرح کی بھلائی حاصل کرنے والے ہیں۔''

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم

''تم میں سے ایک جماعت الٰہی ہونا چاہیے'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعوت و ہدایت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض عین نہیں ہے بلکہ واجب کفائی کی حیثیت رکھتا ہے کچھ لوگ جب اس کام کو انجام دیدیں تو باقی لوگوں پر فرض نہ رہے گا۔ پھر یہ کہ جامعہ اسلامی کا ہر فرد اس کا اہل بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ بہت سے وہ ہیں جو ضروری مسائل سے خود ہی ناواقف ہیں۔ وہ دوسروں کی ہدایت کیوں کر کریں گے؟ اس لئے ہمیشہ اس کے انجام دہی کرنے والے مجموع امت کے کچھ ہی افراد ہوں گے۔ سب نہیں[3] چنانچہ کافی میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا تمام امت پر واجب ہے؟

حضرتؑ نے فرمایا: نہیں۔

پوچھا کیوں؟ آپؑ نے فرمایا:

---

[1]۔ ما لا لکل واحد (صافی)

[2]۔ رواہ ابو سعید الخدری عن النبی ﷺ (مجمع)

[3]۔ من للتبعیض لان ماذکر فرض کفایۃ لا یلزم کل الامۃ ولا یلیق بکل احد کالجاھل (جلالین)

انما هو علی القوی المطاع العالم بالمعروف من المنکر لا علی الضعفة الذین لا یهدون سبیلا انی ای من ای یقول الی الحق من الباطل.

ارے! یہ فریضہ تو اس پر عائد ہوسکتا ہے جو اتنی قوت رکھتا ہو، جس کی بات کا وزن لوگ مانیں جو اچھائی اور برائی کے امتیاز سے واقف ہو، نہ وہ بے چارے جنہیں خود پتہ نہیں کہ وہ کدھر سے کدھر جارہے ہیں یعنی انہیں احساس نہ ہو کہ وہ خود حق سے باطل کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔

اس کے بعد آپؑ نے اسی آیت قرآن سے استشہاد فرمایا اور پھر دوسری آیت پیش فرمائی کہ:

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ.﴿الأعراف: ۱۵۹﴾

موسیٰؑ کی پوری قوم میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو حق کا راستہ دکھاتی ہے اور اسی کے ساتھ منصفانہ فیصلہ کرتی ہے۔

اس کے بعد ظاہر ہے کہ بدرجہ اتم ان کاموں کو جو دعوت الی الحق اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ہیں، انجام دینے والے وہی ہوسکتے ہیں جن کی نظر کبھی بھلائی اور برائی کے امتیاز میں چوکے نہیں اور معصومینؑ کے ذوات مقدسہ ہوتے ہیں۔ اس لئے بعض روایات میں ہے کہ امہ کی تفسیر تنزیلی ائمہ ہے یعنی تم میں ایسے اماموں کو ہمیشہ ہونا چاہیے اس صورت میں یہ ''چاہیے'' حکم تکلیفی نہ ہوگا بلکہ ضرورت عقلی کا اظہار ہوگا کہ تمہارے لئے مناسب و اصلح ہے کہ ایسے امام موجود ہوں لہٰذا خداوند عالم ان کے وجود کا ذمہ دار ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

''اور ان لوگوں کے ایسے نہ ہونا جو تفرقہ میں پڑ گئے اور کھلی ہوئی دلیلوں کے آنے کے بعد اختلافات میں مبتلا ہو گئے اور یہ وہ ہیں جن کے لئے بڑا عذاب ہے، اس دن کے جب کچھ چہرے نورانی ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ

ہوں گے تو جن کے چہرے سیاہ ہوں گے [1] ارے! تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے؟ اچھا تو اب عذاب کا مزہ چکھو، اس کی سزا میں کہ تم نے کفر اختیار کیا اور جن کے چہرے نورانی ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کی آیتیں ہیں جنہیں ہم آپ کے سامنے سچائی کے ساتھ پیش کر رہے ہیں اور اللہ جہان والوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا ہے۔"

مسلمانوں کو تنبیہی تازیانے

آیت جن الفاظ میں مسلمانوں کو انتباہ کر رہی ہے، وہ صاف پتہ دیتے ہیں کہ یہ خطرہ سامنے آنے والا ہے کہ جیسے یہود و نصاریٰ کھلے ہوئے دلائل کے بعد تفرقہ میں پڑ گئے اور اختلافات میں مبتلا ہو گئے اسی طرح یہ امت بھی اختلافات میں مبتلا ہو جائے۔

نیز یہ بھی اس آیت سے ظاہر ہے کہ جس چیز میں ان کا اختلاف ہو گا وہ ایسی نہیں ہے کہ اس میں خالق کی طرف سے کوئی ہدایت نہ ہوئی ہو بلکہ اس بارے میں "نص" موجود ہوتے ہوئے یہ لوگ اختلافات میں مبتلا ہوں گے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ:

مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنَةُ.﴿البینة:۴﴾

کھلی ہوئی دلیلوں کے آنے کے بعد

اب جب پیغمبر خدا ﷺ کے بعد ہم مسلمانوں کے اختلافات کا نقطہ مرکزی تلاش کرتے ہیں صاف پتہ ہے کہ وہ "زعامت کبریٰ" یعنی جانشینی رسول کا مسئلہ ہے جس میں مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ہوا اور آج تک قائم ہے۔

قرآن مجید صاف کہہ رہا ہے کہ یہ اختلاف "کھلے ہوئے دلائل" کے آنے کے بعد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو جماعت ان دلائل کا اقرار کرے اور نص کو منبع سمجھے وہ صراط مستقیم پر ہے اور جو ان نصوص کا انکار کرتے ہوں، وہ اس تفرقہ اور اختلاف کے ذمہ دار ہیں اور ان کے لئے قرآن میں خالق کی طرف سے سخت الفاظ میں وعید ہوا ہے کہ:

وَأُولَٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيمٌ.﴿آل عمران:۱۰۵﴾

ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

پھر عذاب کے تفصیلات بیان ہوئے ہیں اور اس میں انہیں کہ جو مبتلائے عذاب میں ہیں، صاف کہا گیا ہے کہ یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ ایمان لانیکے بعد کافر ہو گئے۔ اس سے صاف ہے کہ یہ نقطہ اختلاف کوئی فروعی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اصول دین کا جز ہے جو معیار ایمان و کفر قرار پاتا ہے۔

قرآن کے ان تصریحات کے باوجود یہ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ کچھ مسلمان مسئلہ خلافت کو "فروعی" چیز قرار دیتے ہیں یا اب "روشن خیالی" کے زمانہ میں صرف "تاریخی بحث" یا "سیاسی مسئلہ" قرار دے کر اس کی دینی اہمیت گھٹائی جاتی ہے۔

اب ایک طرف بلاغت قرآنی کی روشنی میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ صرف ایک "مفروضہ" خطرہ کے بارے میں جس کا وقوع نہ ہو، اتنا تفصیلی بیان نہیں کیا جا سکتا کہ جو تم میں سے مانیں گے، ان کے لئے یہ ہو گا اور جو نہ مانیں گے ان کے لئے یہ ہو گا اور جو چہرے روشن ہوں گے وہ

---

[1] علی ارادۃ القول ای فیقال لھم اکفرتم والھمزۃ للتوبیخ والعجب مرہ حالھم (صافی) بدیشاں گفتہ شود آیا کہ کافر شدید بعد از اسلام خویش (شاہ ولی اللہ) جو لوگ کہ کالے ہوئے منہ ان کے، کیا کافر ہوئے تم پیچھے ایمان اپنے کے (شاہ رفیع الدین)

ایسے ہوں گے اور جو چہرہ سیاہ ہونگے وہ ایسے ہوں گے۔ اس انداز بیان سے خود ظاہر ہوگا کہ کچھ واقعی ہوں گے، یہ سیاہ چہرہ والے اور وہ کھلے ہوئے کفار و مشرکین نہیں ہیں، وہ یہود و نصاریٰ نہیں ہیں۔ وہ اس امت کے افراد ہیں جس سے کہا گیا تھا کہ:

وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ ۔﴿آل عمران: ۱۰۴﴾

تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے اور امر بالمعروف کرے اور نہی عن المنکر کرے۔

اس کی مخاطب مسلمان کہلانے والی عام امت ہے اور اسی مسلمان میں سے یہ گروہ پیدا ہوا ہے جسے کہا جا رہا ہے کہ ''تم نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا، اب عذاب کا مزہ چکھو۔''

پھر آخر میں تو یہ آیت کہ ''یہ اللہ کی آیتیں ہیں جنہیں ہم آپ کے سامنے صاف بیان کرتے ہیں۔'' اس کا اعلان ہے کہ یہ بالکل مستقبل قریب میں ہونے والے واقعات میں جنہیں بطور اخبار بالغیب خالق ان انتباہات کے انداز میں پیش فرما رہا ہے۔

اس کے بعد بھی مسلمانوں کی آنکھیں نہ کھلیں اور وہ حق اور باطل کا امتیاز نہ کریں تو اس کا علاج کیا ہے؟ پھر جو کچھ ہو اس پر ''شکوہ'' نہ کریں کہ ''برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر......'' وہ اپنے افعال و اعمال کا نتیجہ ہے جسے خالق کہہ رہا ہے:

وَمَا اللّٰهُ يُرِيۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِيۡنَ

''اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کیا کرتا۔''

مفسرین جمہور کی بوکھلاہٹ ان آیات کی تفسیر میں بہت قابل رحم ہے۔ تفسیر جلالین میں ہے:۔

لاتکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جآء ھم البینت

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو تفرقہ اور اختلاف میں پڑ گئے کھلی ہوئی دلیلوں ہونے کی ممانعت ہوئی ہے؟ لکھا ہے:

وھم الیھود والنصاری

وہ لوگ یہود و نصاریٰ ہیں۔

تو اب یہ کون ہے جن سے کہا جا رہا ہے کہ ان کی طرح نہ ہو؟ یہ بلا شبہ مسلمان ہیں مگر جب نورانی چہروں اور سیاہ چہروں کی بات آئی تو وہاں اَمَّا الَّذِيۡنَ اسۡوَدَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ کو انہوں نے لکھ دیا۔

وھم الکافرون فیلقون فی النار

وہ سیاہ چہروں والے) کافر ہوں گے اور اس لئے آتش جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔

اس طرح انہوں نے مسلم جماعت کو اس وعید کی زد سے بچا لیا، اب جو آیا:

اَكَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ

ارے! تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے۔

تو انہیں اس کی تشریح کے لئے لکھنا پڑا: ''یوم اخذ المیثاق'' یعنی یہ ایمان اس دنیا کا نہ تھا۔ عالم ذر میں جو الست بربکم کہا گیا تھا اور اس کا جواب سب نے بلیٰ کہہ کر دیا تھا، یہ اس روز الست والے ایمان کا ذکر ہے کہ تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے۔ حالانکہ اصطلاح قرآنی

کے جاننے والے واقف ہیں کہ اس دن کے معاملہ کو قرآن اقرار سے تعبیر کرتا ہے، ایمان سے نہیں، ایمان اور کفر تو دار تکلیف کی چیزیں ہیں۔ اس لئے قرآن کفر بعد الایمان کا الزام ایک تو منافقین پر لگا تا ہے کہ وہ زبان سے ایمان ظاہر کرنے کے باوجود دل سے کافر رہے۔ یہاں ''بعد'' کی لفظ باعتبار زمانہ نہیں بلکہ باعتبار رتبہ ہوتی ہے کہ یہ کفر جو بعنوان نفاق ہے، مرتب ہوتا ہے اس اقرار اسلام پر جو زبان سے کہا گیا ہے اور دوسرے یہ الزام مرتدین پر ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے اسلام اختیار کیا اور پھر اس سے انحراف کیا۔ کفار اصلی سے کبھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تم ایمان کے بعد کافر ہوگئے چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب اس سے متفق نہیں ہیں۔ وہ نورانی اور سیاہ چہروں کے بیان والی آیتوں پر حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ منہ ان کے ہیں جو مسلمانی میں کفر کرتے ہیں، یعنی منہ سے کلمہ اسلام کہتے ہیں اور عقیدہ خلاف اسلام کے رکھتے ہیں، سب فرقے گمراہ یہی حکم رکھتے ہیں (موضح القرآن)

الحمدللہ کہ یہ کلمہ حق موصوف کے قلم سے نکل گیا ہے، بس اتنا اور رہ گیا کہ شاہ صاحب اس جز پر غور فرمالیتے کہ یہ ''مسلمانی میں کفر'' وَاخۡتَلَفُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ کی تصریح کے مطابق ''نص'' کا انکار کر کے تفرقہ اور اختلاف کی بنیاد قائم کرنے سے ہوا ہے لہٰذا روشن چہروں والے وہ ہوں گے جو ''نص'' کو مانیں، اور اس کے خلاف کسی اجماع وشوریٰ وغیرہ کو تسلیم نہ کریں اور جو انکار نص کا راستہ اختیار کر کے امور دین میں کوئی جمہوریت وغیرہ کا اصول اختیار کریں وہ کفر تم بعد ایمانکم کا مصداق ہوں گے اور ''فرق باطلہ'' میں داخل ہوں گے۔

انکار نص کے نتیجہ میں افتراق اور اس کا انجام

یہ آیتیں تمام فرق اسلامیہ کو صحیح نقطۂ حق کی تلاش میں مشعل راہ بننے کے لئے کافی ووافی ہیں۔

علامہ ثعلبی نے اس نکتہ کو کہ یہ اسی امت میں سے مرتد ہوجانے والوں کا تذکرہ ہے سمجھ لیا ہے جو اس آیت کے ذیل میں انہوں نے پیغمبرؐ کی متفق علیہ ''حدیث حوض'' کو جسے ہم ''حدیث ارتداد'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ [1] پیش کیا ہے۔

اور یہی مجمل پر حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے بھی اس آیت کی تشریح فرمائی ہے کہ:

هم اهل البدع والاهواء والارآء الباطلة من هذه الامة (مجمع البیان)

یہ اسی امت میں کی وہ جماعتیں ہیں جنہوں نے بدعتیں ایجاد کیں، دل بخواہ راستے اور غلط اعتقادات اختیار کیے۔

تفسیر علی بن ابراہیم قمی میں جناب ابوذر غفاری رضوان اللہ علیہ کی زبانی اس گمراہ اکثریت کی تشریح اور روز قیامت اس کے ورود کا منظر بڑی تفصیل سے وارد ہوا ہے جو جمہور کی حدیث ارتداد کے بالکل مطابق ہے اور اس کی تشریح وتفصیل کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے ملا محسن فیض نے تفسیر صافی میں درج کیا ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الۡاَرۡضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ۝۱۰۹

''اور اللہ کا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف تمام باتوں کی رجوع ہے۔''

یہ آیت بھی اگر مقام تنزیل میں اسی سلسلہ کی آیت ہے اور محسوس ایسا ہو رہا ہے کہ ایسا ہی ہے، اس میں بڑا صاف یہ رخ نظر آرہا ہے کہ یہ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ہمارا رسالہ ''حدیث حوض'' شائع کردہ امامیہ مشن لکھنو۔

سب اختیار الٰہی کے مقابلہ میں خود رائی، خود مختاری اور حق خود ارادی کے تصورات اور جمہوریت کے تخیلات کو ختم کرنے ہی کی باتیں ہو رہی ہیں۔
یعنی تمہارا جو کچھ حق خود ارادی ہو سکتا ہے وہ اپنے ایسے دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں ہو سکتا ہے، خالق کے مقابلہ میں تھوڑی جس کا آسمان و زمین میں سب کچھ ہے[1] اور تم خود اس کے مملوک ہو اور جتنی باتیں ہیں سب کا فیصلہ تکوینی طور پر اس کے ارادہ و اقتدار سے متعلق ہے لہٰذا اختیاری طور پر بھی تم اپنے معاملہ کو اسی کے نص و انتخاب سے وابستہ کرو تو یہی تمہارے ایمان باللہ کا ثبوت ہوگا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

''تم ایک بہترین جماعت ہو[2] جو تمام خلق کے فائدہ کے لئے سامنے لائی گئی ہے۔[3] نیک باتوں کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ ایمان لائے ہیں اور اکثر بداعمال ہیں۔

بہترین امت کون ہے

یہ پوری امت سے خطاب ہو نہیں سکتا، اس لئے کہ پہلے آچکا ہے: ولتکن منکم امة یدعون الی الخیرو یامرون بالمعروف و ینہون عن المنکر (یعنی) تم سے کچھ لوگ ایسے ہونا ہیں جو دعوت خیر دیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کریں'' اس سے ظاہر ہے کہ یہ دعوت پوری امت کو انتباہ کیا جاچکا ہے کہ تم اختلاف نہ کرنا اور تفرقہ میں پڑنا اور یہ کہ کچھ منہ نورانی ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے اور انہیں عذاب ہو رہا ہوگا لہٰذا یہ ماننا ناگزیر ہے کہ اب جو خطاب ہوا ہے: کنتم خیر امة اخرجت للناس تو یہ مجموع امت کے اس گروہ سے ہے جس کے وجود کی امت کے اندر گذشتہ آیت میں فلتکن منکم امة یدعون الی الخیر کہہ کے خبر دی گئی تھی اور اسی لئے بعض روایات میں خیر امتہ کو کہا گیا ہے کہ یہ خیر اُمّۃ کیوں کر ہو سکتی ہے جبکہ اسی امت نے امام برحق امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ اور حسنؑ و حسینؑ فرزندان رسولؐ کو قتل کیا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:
هم ال محمد خیر امت آل رسولؐ ہیں
تیسری حدیث میں ہے:

---

[1]۔ ملکا و خلقا (مجمع البیان و صافی)
[2]۔ الکون فیہا یعمہ الازمنة غیر متخصص بالماضی کقولہ تعالیٰ وکان اللہ غفورا رحیما (صافی)
[3]۔ اخرجت اظہرت (صافی)

انما نزلت ھذا الایة علی محمد فیہ و فی الاوصیاء خاصة۔
یہ آیت مخصوص طور پر حضرت پیغمبر خداؐ اور ان کے اوصیاء کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔
چوتھی روایت ہے:
یعنی الامة التی وجبت لھا دعوة ابراھیم ۔
اس سے مراد وہ گروہ جن کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا (و من ذریتی) مستجاب ہوئی۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ جنہیں منجانب اللہ امامت کا منصب عطا ہوا۔
یہ تمام احادیث ملا محسن فیض کاشانی نے تفسیر صافی میں درج کیے ہیں۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝١١١ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝١١٢

''ہرگز یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے سوا معمولی اذیت کے [1] اور اگر تم سے یہ جنگ کریں گے تو تمہارے سامنے سے پیٹھ پھرا کر بھاگیں گے، پھر انہیں کہیں سے مدد نہیں ملے گی۔ ان کے نصیب میں ذلت لکھ دی گئی ہے، جہاں بھی یہ پائے جائیں، سوا اللہ کی طرف کے کسی معاہدہ کے یا آدمیوں کے کسی سہارے کے [2] اور یہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہیں اور ان پر محتاجی لکھ دی گئی ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ آیات الٰہی کے ساتھ کفر کرتے رہے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے۔ یہ اس کی سزا ہے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور ہمیشہ ظلم و تعدی سے کام لیتے رہے۔''

یہود کے متعلق قرآنی پیش گوئی اور حالات حاضرہ

اس آیت میں یہود پر ذلت لکھے جانے کے اعلان کے ساتھ الا بحبل من اللہ و حبل من الناس کا استثناء تمام ان اعتراضات کا جواب ہے جو آج تقریباً چودہ سو برس کے بعد انگلستان اور امریکیوں کے دستیاری سے اسرائیلی سلطنت کے قیام کی وجہ سے زبانوں پر آنے لگے

[1]۔ضررا یسیرا کطعن و تھدید (صافی)
[2]۔مگر بدستاویزی از خدا و دستاویزی از مردمان (شاہ ولی اللہ) مگر ساتھ پناہ اللہ کے اور پناہ لوگوں کی (شاہ رفیع الدین)

ہیں کہ قرآن نے کہا تھا کہ ان پر ذلت لکھ دی گئی ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں میں مشہور تھا کہ یہودیوں کی کوئی سلطنت دنیا میں نہیں ہوسکتی۔ پھر یہ آج ان کی سلطنت کیوں کر قائم ہوگئی؟ مگر قرآن نے صاف خود استثناء کردیا ہے کہ وہ خود اپنی طاقت کے بل بوتے پر اس ذلت سے کبھی نہیں نکل سکتے، ہاں اللہ کی طرف سے کوئی معاہدہ ہو یعنی جزیہ دے کر وہ اسلام کی پناہ میں آجائیں یا کچھ اور لوگوں کے سہارے کبھی قوت حاصل کرلیں تو اور بات ہے۔ اب دنیا خود یہ فیصلہ کرے کہ یہ اسرائیل حکومت دوسروں کے سہارے سے قائم ہوئی ہے یا نہیں؟

اب بھی کیا دنیا اعجاز قرآن کا انکار کرے گی؟

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (انعام۔۱۱۵)

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

”وہ سب برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں ایک ثابت قدم جماعت بھی ہے[1] جو رات کے مختلف اوقات میں آیات الٰہی کی تلاوت کرتی ہے اور وہ سجدے بجالاتی ہے۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اچھی باتوں کی ہدایت کرتے اور بری باتوں سے ممانعت کرتے ہیں اور نیک کاموں میں تیزی کرتے ہیں اور یہ لوگ نیکوکاروں میں ہیں اور وہ جو نیک کام کریں گے اس کی ناقدری[2] ہرگز نہیں ہوگی اور اللہ پرہیزگاروں سے خوب واقف ہے۔“

جن کے اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں، اہل کتاب میں کے وہ افراد ہیں جنہوں نے صدق دل سے اسلام قبول کرلیا۔ ان کے کردار میں وہ جوہر تھے جن سے جماعت یہود عموماً محروم ہے۔[3]

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِىَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ ھٰذِهِ الْحَيٰوةِ

---

[1]۔ قائمته علی الحق (صافی)

[2]۔ فلن یضیع ولا ینقص ثوابه (صافی) وسمی منع الجزاء کفرا علی الاتساع لانه بمنزلة الجحد والسوا (جمع البیان)

[3]۔ وصفهم بصفات لیست فی الیهود (صافی)

الدُّنۡيَا كَمَثَلِ رِيۡحٍ فِيۡهَا صِرٌّ اَصَابَتۡ حَرۡثَ قَوۡمٍ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَاَهۡلَكَتۡهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰـكِنۡ اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۱۱۷﴾

''بلاشبہ وہ جو کافر ہیں، انہیں ان کے اموال اور اولاد اللہ (کے عذاب) سے کچھ بھی بچا نہیں سکتے اور یہ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، مثال کے اس کے جو وہ اس دنیوی زندگی میں صرف کرتے ہیں، اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا تھا[1] جو چلی ایک ایسی جماعت کی کھیتی پر جو اپنے اوپر ظلم کرتی رہی تھی[2] تو اسے برباد کردیا اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے تھے۔''

''مال اور اولاد'' وہ ہوتے ہیں جن پر ہر انسان بھروسا کرتا ہے کہ یہ آڑے وقت میں کام آئیں گے، اس لئے ان کو کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتے[3] ورنہ ان کی خصوصیت نہیں، اس سے تو کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔

آخر میں جو مثال دی گئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح وہ کھیتی برباد ہوجاتی ہے، اسی طرح ان کے یہ اللے تللے جو مصارف دنیا میں ہیں، اس وقت تو آنکھوں کو بہت بھلے لگتے ہیں مگر نتیجہ میں سب اکارت ہوں گے اور انہیں ان سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ لَا يَاۡلُوۡنَكُمۡ خَبَالًا ؕ وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ ۚ قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ ۖۚ وَمَا تُخۡفِىۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَكۡبَرُ ؕ قَدۡ بَيَّنَّا لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾

''اے ایمان لانے والو! اپنے علاوہ دوسرے ایسے لوگوں کو جو تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کریں گے، اپنا جگری دوست[4] نہ بناؤ، وہ تمہیں زحمت ہی پہونچنے کے متمنی ہیں۔ دشمنی ان کے دہنوں سے بھی ظاہر ہوہی جاتی ہے اور جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا رہتا ہے، وہ اور سبھی بڑھ کر ہے۔ ہم نے تمہارے لئے واضح نشانیاں[5] پیش کردی ہیں اگر تم عقل سے کام لو۔''

یہ مومنین کو نصیحت ہے کہ وہ مخالفین دین کو اپنا رازدار اور جگری دوست نہ بنائیں، اس لئے کہ وہ تمہارے حقیقی دوست کبھی نہیں ہوسکتے۔

---

[1] البرد الشديد (مجمع البيان)

[2] بالكفر والمعصية (صافی)

[3] انما خص الاموال والاولاد بالذكر لان هذا من معتمله الخلق (مجمع البيان)

[4] البطانة خاصة الرجل الذى يستنبطونه امرو ماخوذ من بطانة الذى يلى البدن لقربه منه (مجمع البيان)

[5] الدلالات على شانهم (البلاغى)

هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾

''اب تمہارا یہ عالم ہے کہ تم تو ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں کرتے اور تم ہر کتاب پر ایمان لائے ہوئے ہو اور وہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب تخلیہ ہوتا ہے تو تمہارے خلاف غیظ و غضب سے اپنی بوٹیاں کاٹتے ہیں [۱] کہو کہ مر جاؤ تم لوگ اپنے غم و غصہ سے'' یقیناً اللہ سینوں کے اندر والی باتوں کا جاننے والا ہے۔''

یہ ان ہی مسلمانوں سے تخاطب ہے جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی کے پینگ بڑھاتے تھے۔ [۲]

ہم نے تومنون بالکتاب کلہ کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ ''تم ہر کتاب پر ایمان لائے ہوئے ہو۔'' یعنی تم تو ان کی توریت کو بھی جو واقعی تھی، مانتے ہو اور ان کی انجیل کو بھی جو حقیقی تھی، مانتے ہو مگر یہ تمہارے قرآن کو نہیں مانتے۔ اس صورت میں الکتاب سے جنس کتاب مراد ہے اور کلہ اس کے اشخاص یعنی توریت و انجیل وغیرہ کے اعتبار سے ہے [۳] لیکن اس کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ الکتاب سے مراد قرآن ہی ہے اور مقصود یہ ہے کہ تم پورے قرآن پر ایمان لائے ہو تو اسی قرآن میں تو وہ آیتیں بھی ہیں جو ظالمین کا سہارا لینے اور کافروں کو دوست بنانے کی ممانعت میں ہیں، پھر تم انہیں اپنا دوست کیوں بناتے ہے [۴] مگر مجھے پہلے معنی الفاظ آیت کے سیاق و سباق کے لحاظ سے زیادہ درست معلوم ہوتے ہیں۔

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾

''اگر تمہیں کوئی بھلائی چھو بھی جائے تو انہیں باعث رنج ہوگی اور اگر تمہیں کوئی برائی پہنچے تو وہ اس سے خوش ہوں

---

[۱] ۔تم پر (غصہ کے مارے) انگلیاں کاٹتے ہیں''۔ (حاشیہ) اس (الانامل) کے اصلی معنی پوروں کے ہیں مگر چونکہ اردو کا محاورہ میں پوروں کا کاٹنا نہیں بولتے اور غصہ میں انگلیاں کاٹنا بولتے ہیں، اس وجہ سے یہ ترجمہ کیا گیا ہے (مولانا فرمان علی صاحب) مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو میں تو انگلیاں کاٹنے کا بھی محاورہ نہیں ہے، اس لئے ہم نے ترجمہ بوٹیاں کاٹنے کے ساتھ کیا ہے۔

[۲] ۔ھا انتم اولآ الخاطئون فی موالاۃ الکفار (صافی)

[۳] ۔تومئون بما انزل علیٰ ابراھیم و موسیٰ و عیسیٰ و محمد ﷺ وھم لا یصدقون بکتبکم (مجمع البیان) تومنون بجنس الکتاب کلہ کتابکم و کتابھم و غیرھما (صافی)

[۴] ۔ھل یسوغ و یحسن منکم ایھا المومنون بالکتاب کلہ لن تحبوا من لا یبہ اللہ لا جل شرہ (البلاغی)

گے اور اگر تم برداشت سے کام لو اور بچتے رہو [1] تو تمہیں ان کی ترکیبیں کچھ نقصان نہیں پہنچا ئیں گی۔ بلا شبہ اللہ ان کے تمام اعمال پر حاوی ہے۔"

یہ منافقین کی خباثت نفس کا حال اور اس کی پاداش کا ذکر ہے جس میں بھلائی کے ساتھ **تمسسکم** کی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں چھو جائے اور یہی ہم نے ترجمہ کیا ہے "کوئی بھلائی چھو بھی جائے" اور برائی کے ساتھ **تصبکم** کا لفظ جو اصابۃ سے ہے اور اصابۃ وہی مصدر ہے جس سے "مصیبت" کا لفظ ہے اس میں یہ مفہوم مضمر معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے لئے بھلائی کا کم سے کم حصہ بھی جسے چھونے کا مصداق سمجھا جائے۔ [2] وہ بھی انہیں گوارا نہیں اور برائی میں صرف امکانات یا خطرات سے بھی انہیں اطمینان نہیں ہوتا بلکہ وہ اس وقت تک خوش نہیں ہوتے، جب تک کہ وہ برائی پورے طور سے بطور ایک مصیبت کے تم پر اثر انداز نہ ہو جائے۔ [3]

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

"اور وہ موقع جب آپ سویرے اپنے گھر بار سے نکلے، اس طرح کے مسلمانوں کو جنگ کے لئے مناسب مورچوں پر جگہ دے رہے تھے [4] اور اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔ جب تم میں سے دو گروہوں نے (پہلے سے) ارادہ کر لیا تھا کہ وہ سستی دکھائیں گے، حالانکہ اللہ ان دونوں کا مالک و سرپرست ہے اور اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسا کرنا چاہیے۔"

غزوۂ احد کے لئے روانگی کے وقت کا تذکرہ

اکثر آیات قرآن مجید اذ سے شروع ہوئے ہیں یعنی جب یہ ہوا۔ ان میں کبھی تو اس 'جب' کا مرکز تعلق مذکور ہوتا ہے جب ایسا ہوتا تو اس وقت یہ ہوا اور بہت جگہ اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ ایسے موقعوں پر اس کا متعلق محذوف ماننا پڑتا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ موقع یاد رکھنے کے قابل ہے چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہے۔ [5]

یہ کس مہم پر نکلنے کا ذکر ہے؟ اس کی تصریح آیت میں مذکور نہیں ہے اور ایسے بھی محل وہ ہیں جو اس دعوے کو کہ قرآن فہمی کے لئے حدیث و

---

[1]۔ تصبروا علیٰ عداوتهم وتتقوا موالاتهم (صافی)
[2]۔ کناية عن قلة اعمالكم (البلاغی)
[3]۔ بمعنی تصبيكم فادحة اصابة لا بمجرد المسير (البلاغی)
[4]۔ تهيئى لهم مقاعد للقتال" مواقف وا ماكن له (صافی)
[5]۔ العامل فی "اذ" محذوف والتقدير "واذكر" (مجمع البيان)

تفسیر کی ضرورت نہیں ہے، غلط ثابت کرتے ہیں۔

تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزوہ احد میں روانگی کا تذکرہ ہے۔[1] اور اس کے بعد اس کا مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ آپ مومنین کو مناسب مورچوں پر جگہ دے رہے تھے جب ایک جگہ تو پوری فوج کا مستقر بنائی گئی اور ایک جماعت کو اس ہدایت کے ساتھ کہ ہمیں فتح ہو یا شکست، بہرصورت تم اس جگہ سے حرکت نہ کرنا، درہ کوہ کے اس تنگ راستے پر مقرر کردیا گیا، جدھر سے آنے پر مسلمانوں کو محاصرہ میں لیا جا سکتا تھا۔

اس کے تذکرہ کی اس موقع پر ضرورت اس لئے تھی کہ بعد میں رسولؐ کی مقرر کردہ جگہ سے ہٹنا ہی مسلمانوں کے لئے اس عظیم تباہی کے خطرہ سے دوچار ہونے کا باعث ہوا جس نے سوا اکا دکا مجاہدین کے باقی تمام جماعت کے قدموں میں تزلزل پیدا کر کے رو بہ فرار بنا دیا۔

قرآن مجید کا اس صورت حال کو اتنی اہمیت کے ساتھ بیان کرنا یہ کہہ کر کہ وہ یاد رکھنے کا موقع ہے، بعض علمائے جمہور کے اس رجحان کو غلط قرار دیتا ہے کہ دور رسولؐ کے مسلمان چونکہ صحابہ کے معزز گروہ سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا اس دور کے واقعات پر ایسا تبصرہ نہیں چاہیے جو کردار کے کسی پہلو کو نمایاں کرتا ہو، اگر افراد کا احترام اس حق پوشی کا متقاضی ہوتا اور خالق کا یہ منشا ہوتا تو قرآن مجید میں ان واقعات کی یاد ایسے چونکانے والے الفاظ کے ساتھ محفوظ نہ کی جاتی۔

صحابہ کے واقعات پر تبصرہ کو روکنا منشائے قرآنی کے خلاف ہے

چونکہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس حکم کی مخالفت ہوتی جس سے نقصان اٹھانا پڑا، اس لئے آخر میں تہدیدی انداز میں کہا گیا ہے کہ ”اللہ سننے والا ہے“ یعنی جو کچھ ان سے کہا سنا گیا تھا، اس سے بھی خوب واقف ہے اور ”جاننے والا ہے“ یعنی جو کچھ ان کا کردار پھر وقوع میں آیا، وہ بھی اس کے علم میں ہے۔

”جب تم سے دو گروہوں نے سستی دکھانا چاہی“ پھر روایت کی ضرورت۔ یہ ”دوگروہ“ کون ہیں؟ قرآن سے کیوں کر معلوم ہو؟ ہاں حدیث میں ہے جو طرق اہل سنت سے بھی ہے اور مسلم و بخاری دونوں نے اسے درج کیا ہے اور علامہ طبرسیؒ نے امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف نسبت کیساتھ بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ یہ دونوں گروہ بنو سلمہ اور بنو حارثہ انصار میں سے ہیں[2] اور یہی دونوں فوج کے دونوں بازوؤں کی حیثیت میں تھے۔[3]

دوسری روایت جو تفسیر قمی میں ہے یہ ہے کہ اس سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ہیں۔

علامہ بلاغی نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، اس بنا پر قرآن کہہ رہا ہے کہ ان دونوں گروہوں نے سستی دکھانا چاہی یعنی دکھائی نہیں اور پھر یہ ارشاد ہوا کہ ”اللہ ان کا مالک و سرپرست ہے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے انہیں اس کمزوری سے محفوظ رکھا اور عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی تو کھلے ہوئے منافق تھے اور وہ ہمیشہ ہی کمزوری دکھاتے تھے، پھر وہ کیوں کر مراد ہو سکتے ہیں؟

---

[1] عن ابن عباس وهو المروی عن ابی جعفر یعنی الباقر علیہ السلام (البلاغی)

[2]۔هما بنو سلمة و بنو الحارثه حيان من الانصار (مجمع البيان)

[3]۔وكانا جناحي العسكر (صافی)

ہم سمجھتے ہیں کہ جنگ احد کا جو انجام بعد میں سامنے آیا، اس کی بنا پر یہ کہنا کہ انہوں نے کمزوری دکھانا چاہی تھی مگر نہیں دکھائی، محتاج ثبوت ہے۔ اس لئے کہ بہت ممکن ہے کہ جب درہ کوہ سے خالد بن الولید نے حملہ کیا تو سب سے پہلے دونوں بازو ہی فوج کے پسپا ہوئے ہوں، جس کے بعد تمام فوج منتشر ہوگئی۔ اس لئے قرآن نے ان دو کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا اور اس حقیقت کا انکشاف کہ یہ ان دونوں گروہوں کی وقتی طور پر کوئی اضطراری حرکت نہ تھی بلکہ پہلے سے آپس میں طے کی ہوئی بات تھی کہ کوئی صورت گرگوں ہوئی تو سب سے پہلے ہم میدان سے ہٹیں گے۔

رہ گیا یہ کہنا کہ اللہ ان کا مالک و سرپرست ہے تو یہ اس ارادہ کی مذمت کا اظہار ہے کہ انہیں اپنے مالک کے مقصد کے خلاف ایسا منصوبہ بنانا نہیں چاہیے تھا، پھر دوسرے مسلمانوں کو یہ انتباہ ہے کہ یہ دونوں کمزوری دکھاتے کبھی تو دوسرے مسلمانوں کو ان کے سہارے تو نہیں رہنا چاہیے تھا، انہیں تو اللہ پر بھروسا رکھنا چاہیے تھا لہٰذا ان کے میدان سے ہٹنے کے بعد بھی دوسرے مسلمانوں کو ہمت نہیں ہار دینا چاہیے تھی اور خدا پر بھروسا رکھنا چاہیے تھا۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

''اور بلاشبہ اللہ نے تمہاری مدد کی بدر میں جب کہ تم کمزور تھے لہٰذا اللہ کی ناراضگی سے بچتے رہو، شاید کہ تم شکر گزار ثابت ہو۔''

جنگ بدر کا حال اور مدد الٰہی

مادی حیثیت سے جب فریق مخالف کو عددی بھی قوت ہو اور اسلحہ کے لحاظ سے بھی اس کی طاقت زیادہ ہو اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی بے سروسامانی اس حد پر کہ ''بے سروسامانی'' کی لفظ سے اتنی ''بے سامانی'' سمجھ میں نہ آسکتی ہو یعنی تین سو تیرہ آدمیوں میں [1] صرف ۱۳ عدد تلواریں اور صرف دو گھوڑے، یہی بے سروسامانی ہے جسے قرآن نے ایک لفظ: وَاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ سے ظاہر کیا ہے جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ ''تم کمزور تھے''۔ [2]

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

''جب آپ مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہ ہوگی کہ تمہارا پروردگار تمہاری مدد کرے تین ہزار فرشتوں سے جو اتارے گئے ہوں؟ کیوں نہیں، اگر صبر و برداشت اور پرہیزگاری سے کام لو اور

---

[1] فی غیر واحد من الاخبار الموسومة ان عدتهم کانت ثلثمائة وثلث عشر (صافی)

[2] لم یخرجوا باٰھبة حرب الاعزة محارب (البلاغی)

وہ تم پر اسی دم فوری طور پر [1] حملہ آور ہوجائیں تو تمہارا پروردگار تمہاری امداد پانچ ہزار فرشتوں سے کرے گا جو نشان زدہ ہوں گے۔ [2]

فرشتوں کا مدد کے لئے آنا

یہ اسی جنگ بدر کا تذکرہ اور امداد غیبی کے واقعہ کی تفصیل ہے۔

''کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں ہے؟'' یعنی اس عظیم نصرت و امداد ربانی کے بعد بھی پھر کیا تمہیں پریشان ہونا چاہیے اور دشمنوں کے مقابلہ میں کمزوری دکھانا چاہیے۔ [3]

وعدہ میں پہلے تین ہزار اور پھر پانچ ہزار کا جو تذکرہ ہے، اس میں مفسرین کو الجھن پیدا ہوئی ہے کہ اصل تعداد ملائکہ کی کیا تھی؟ بعض نے کہا ہے کہ تین ہزار کے بعد پانچ ہزار کے ذکر کا یہ مطلب ہے مزید دو ہزار بھیج کر پوری تعداد پانچ ہزار کردی جائے گی۔ [4]

دوسرا قول یہ ہے کہ ان تین ہزار کے علاوہ پانچ ہزار بھیجے جائیں گے تو مجموعاً آٹھ ہزار ہوجائیں گے۔ [5]

چونکہ الفاظ آیت دونوں صورتوں میں درست ہوتے ہیں، اس لئے اس بحث کا فیصلہ بغیر معصوم سے وارد شدہ تفسیر کے جواب تک نظر سے نہیں گزری مشکل ہے۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآىِٕبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

''اور نہیں قرار دیا ہے اسے اللہ نے مگر خوش خبری تمہارے لئے [6] اور اس لئے کہ تمہارے دلوں کو اس سے سکون و اطمینان ہوجائے اور نہیں ہے امداد مگر اللہ کی طرف سے جو بڑا زبردست ہے، سوجھ بوجھ والا، تاکہ کافروں کے ایک بڑے حصہ کا قلع قمع کردے یا انہیں شکست دیدے جس سے وہ ناکام ہو کر واپس جائیں۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ کو فتح و ظفر عطا کرنے کے لئے فرشتوں کے بھیجنے کی بھی ضرورت نہ تھی مگر چونکہ یہ پہلے پہل کی لڑائی تھی اور مسلمانوں میں بہت سے کمزور دل اور عقیدہ کے

---

[1] ۔من ساعتهم هذه (صافی) ای من وقتهم هذا القريب (البلاغی)
[2] ۔معلمين من السويم بمعنی اظهار سماء الشئی (صافی)
[3] ۔الن يكفيكم فی الثبات والاطمئنان بالنصر (البلاغی)
[4] ۔فمعناه يمدد كم ربكم بخمسة الاف (مجمع البيان)
[5] ۔فمعناه بخمسة الالاف اخر (مجمع)
[6] ۔بشارة لكم (صافی) لتستبشروا (مجمع البيان)

بھی لوگ تھے،اس لئے اللہ نے چاہا کہ نفسیاتی طور پر ان کے دل کو اس مشاہدے سے مضبوط بنا دے کہ جب ضرورت ہوگی تو خدا فرشتے بھی ہماری مدد کے لئے بھیج دے گا[1] اور یوں اصل فتح دینے والا اللہ ہے،خواہ وہ فرشتوں کے ذریعہ سے فتح دے یا ایسے کسی انسان کے ذریعہ سے جو اس کا پسندیدہ ہے چنانچہ احد میں پھر اسلامی جمعیت کے منتشر ہونے اور شکست کھانے کے بعد جو فتح عطا ہوئی وہ صرف ایک فرد بشر یعنی حضرت علی بن ابی طالبؑ کی تلوار سے جس کے سرخالق نے اس فتح کا سہرا باندھ دیا اور پھر خیبر میں قلع کی فتح کو انہی کے پائے نام رکھا جس کا حضرت پیغمبر خداؐ نے اپنی حدیث میں پہلے سے اعلان فرمادیا تھا ان الفاظ میں کہ یفتح اللہ علی یدیہٖ ”اسی کے ہاتھ پر اللہ اس قلعہ کو فتح کرے گا۔“

فرشتوں کے بھیجنے کی مصلحت

آخر میں امداد الٰہی کے نتیجہ میں دو صورتیں جو بتائی ہیں،ایک یہ کہ دشمنوں کا قلع قمع ہو جائے اور ایک یہ کہ وہ شکست کھا کر واپس چلے جائیں،اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نتیجہ مطلق امداد الٰہی سے تعلق رکھتا ہے،نہ یہ کہ خاص جنگ بدر والی امداد سے۔ورنہ تعیین کے ساتھ پہلی ہی صورت بیان کی جاتی۔دو شکلیں اسی لئے بیان ہوئی ہیں کہ بعض جگہ قلع قمع ہوا یعنی بہت سے دشمن قتل ہوئے جیسے بدر اور خیبر وغیرہ میں اور بعض جگہ وہ ایک ہی دو مقابلوں کے بعد شکست کھا کر واپس چلے گئے جیسے جنگ خندق میں۔[2]

اب اللہ کی طرف سے اس بشارت عملی اور اس سکون و اطمینان پیدا کرنے کے اہتمام کے بعد بھی اگر مسلمانوں نے کمزوری دکھائی جیسا کہ احد میں ہوا تو وہ اللہ کے غضب کا باعث ہوگی اور وہ ناشکرے ثابت ہوں گے کہ انہوں نے اللہ کے احسان خاص کے بعد خود تعمیل فرائض میں کوتاہی کی۔

لَيۡسَ لَكَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَىۡءٌ اَوۡ يَتُوۡبَ عَلَيۡهِمۡ اَوۡ يُعَذِّبَهُمۡ فَاِنَّهُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۲۸﴾

”آپ کو کوئی اختیار نہیں ہے، وہ چاہے ان کی توبہ قبول کرے اور چاہے انہیں سزا دے، بہرحال یہ ظالم لوگ ہیں۔“

عموماً ان ضمیروں کا مرجع انہی کفار کو لیا گیا یعنی اللہ چاہے تو ان کی توبہ قبول کرے جب کہ وہ کفر سے توبہ کرلیں اور اسلام لے آئیں اور چاہے تو وہ انہیں سزا دے جب کہ وہ کفر پر قائم رہیں[3] کیونکہ اس صورت میں وہ خود ظالم ہوں گے۔اللہ ان کے ظلم کی سزا دے گا۔علامہ طبرسیؒ نے جو متعدد اقوال آیت کے معنی میں تحریر کیے ہیں،ان سب کا مشترکہ نقطہ بھی یہی ہے کہ وہ مشرکین کے بارے میں ہے مگر چونکہ ان میں سے کوئی بھی

---

[1]۔فیہ تبییہ علی انہ لاحاجۃ الی مدد وانما امدھم ووعدہ لھم بشارۃ لھم ور بطاعلی قلوبھم من حیث ان نظر العامۃ الی الاسباب اکبر(صافی)

[2]

[3]۔یتوب علیھم ان اسلموا ویعذبھم ان اصروا (صافی)

قول معصومینؑ کی طرف استناد نہیں رکھتا اور اتنے اقوال کا ہونا خود بتا رہا ہے کہ کوئی ایسا بیان آیت کی تشریح کے متعلق ان لوگوں تک نہیں پہنچا ہے جس کے سامنے یہ سب سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں لہٰذا ہمیں حق معلوم ہوتا ہے کہ ان اقوال سے ہٹ کر خود سیاق آیت، اصول مسلمہ دین اور عقل سلیم کے ماتحت اس پر غور کریں چنانچہ میرا ذہن اس سے کہ وہ مشرکین کے متعلق ہو، بالکل مطمئن نہیں ہے۔

خالق ارشاد فرما رہا ہے کہ ان کا معاملہ آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے، ہمارے اختیار میں ہے۔ اللہ خواہ ان کی توبہ قبول کرے۔ اب چونکہ یہ ثابت ہے کہ مشرک کی بحالت شرک توبہ قبول ہونے کے کوئی معنی نہیں اس لئے ان لوگوں کو قید لگانا پڑی: ان اسلموا ''اگر وہ اسلام لائیں'' اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شق ایک گروہ سے متعلق ہے اور پھر ''خواہ ان کی توبہ قبول نہ کرے۔'' اب چونکہ اسلام قبل کے جرائم کے نظر انداز ہونے کا قطعی ضامن ہے تو انہیں یہاں یہ قید لگانا پڑی کہ ان صروا اگر وہ کفر قائم رہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شق دوسرے گروہ سے متعلق ہے مگر قرآن میں نہ تو دونوں گروہوں کا الگ الگ ذکر ہے اور نہ

ان دونوں قیدوں کا کوئی پتہ ہے اور ظاہر آیت یہ ہے کہ پوری جماعت میں یہ دونوں شقیں ہیں اور یہ دو شقیں ہمیشہ انہی جرائم میں ہوتی ہیں جو بحالت اسلام سرزد ہوں۔

پھر آخر میں یہ فقرہ فانہم ظالمون آخر یہ ضمیر کن کی طرف راجع ہے؟ اگر کہا جائے کہ دوسرے گروہ کی طرف تو اس دوسرے گروہ کا الگ تو کوئی ذکر ہے نہیں اور اگر پوری جماعت کی طرف ہو جس کا قبل میں ذکر ہے تو ان میں کا ایک گروہ جو اسلام لے آیا، ظالم کیوں کر ہے؟

لہٰذا میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کے پہلے مسلمانوں کو مخاطب کر کے جو تنبیہہ تھی کہ بدر میں اللہ نے اس طرح فرشتوں سے تمہاری مدد کی تو کیا یہ بھی تمہیں ہرگز ہرگز کافی نہیں ہوگی۔ اس ''لن یکفیکم'' کے زور کو جسے ہم ''ہرگز ہرگز'' سے ظاہر کر رہے ہیں، ایسے امکانی تصور پر محمول نہیں کیا جا سکتا جس کا وقوع ہونے والا نہ ہو۔ اس کے اندیشہ کو لفظ لن کے ساتھ جو تاکید کے لئے ہے، ظاہر کرنے کی ضرورت نہ تھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر چہ ماضی میں بطور سوال اسے پوچھا گیا تھا لیکن بعد کے حال میں وہ خطرہ واقعہ کی شکل میں سامنے آ گیا یعنی اللہ کی وہ امداد مسلمانوں میں سکون و اطمینان پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ہوئی اور احد کے میدان میں یہ حقیقت سامنے آ گئی تو اب یہ آیت جو بتصریح مفسرین احد میں نازل ہوئی ہے، انہی مسلمانوں کے اس جرم سے متعلق کیوں نہ سمجھی جائے و راس کا مضمون اس تصور سے بہت مطابقت رکھتا ہے، اس لئے کہ رسول خدا ﷺ جنہوں نے مشرکین تک کے لئے بددعا نہیں کی بلکہ یہ کہا کہ: رب اهد قومي فانهم لا يعلمون ''پروردگار! میری قوم کو ہدایت فرما کہ یہ جانتے نہیں ہیں تو بھلا مسلمانوں کے لئے وہ کیوں کر نہ چاہتے کہ ان کی سزائیں معاف ہو جائیں، خالق نے آپ کی اس رافت و رحمت کو نمایاں کرنے کے ساتھ ان جہاد میں کمزوری دکھانے والوں کے کردار پر سرزنش کا یہ انداز اختیار فرمایا کہ گویا خود حضرت پیغمبر خداؐ کو ایک طرح تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ آپ سے ان کے معاملہ کا کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کی معافی یا سزا آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ [1]

اس صورت میں آخر میں قرآن کا کلمہ تحقیق کے ساتھ انہم ظالمون کہنا، عدالت مطلق صحابہ کے عقیدہ کو بے بنیاد ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، اس لئے کہ یہ جن کا ذکر ہے دور پیغمبر خداؐ کے مسلمان ہیں جو صحابہ کے زمرہ میں داخل ہیں۔ اگر صحابی ہونا عدالت کی ضمانت ہوتا تو قرآن انہیں ''ظالمون'' کیوں کہتا؟''

---

[1]۔ فانك بشر مخلوق وانما الارض في ذالك الله (البلاغی)

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲۹

''اور اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے، مہربان''

''جسے چاہتا ہے بخشتا اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے۔'' یہ اس کے اقتدار کا اظہار ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا چاہنا بغیر کسی معیار اور اصول کے ہوتا ہے۔

درحقیقت یہ انسان کے مراتب استحقاق باعتبار نوعیت اعمال ہی میں ہیں کہ کوئی تفضلاً بخش دیا جائے، کسی کے لئے شفاعت وغیرہ کی ضرورت ہو اور کوئی بدنصیب کسی صورت سے بخشے جانے کا مستحق نہ ہو، بہر حال یہ بخشنا اور نہ بخشنا ہے فعل خالق ہی کا جس میں کسی دوسرے کا دخل نہیں ہے۔

اس سے بندہ میں خوف اور رجاء کی مخلوط کیفیت پیدا ہوتی ہے جو جوہر ایمان ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۳۰ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝۱۳۱ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۱۳۲

''اے ایمان لانے والو! یہ دونا، چوگنا سود نہ کھایا کرو اور اللہ کے غضب سے بچو، شاید کہ ہر طرح کی بہتری حاصل کرو اور بچو اس آگ سے جو کافروں کے لئے تیار ہے اور اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرو، شاید کہ تم رحمت کے مستحق ہو جاؤ۔''

سود کھانے کی ممانعت

''دونا چوگنا'' قید کی حیثیت سے نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہو کہ اگر دونا چوگنا نہ ہو تو سود جائز ہوگا بلکہ واقعہ یہی تھا کہ اس وقت دونا چوگنا سود کھایا جا رہا تھا[1] اس لئے اس فعل کی رکاکت کو ظاہر کرنے کے لئے ممانعت میں اسے نمایاں کیا گیا۔

اس قسم کے قید کی مثالیں جو حقیقت میں کوئی قید نہیں ہیں، قرآن مجید میں بہت ہیں جیسے ''لاتشتروا بآیت اللہ ثمناً قلیلاً'' آیت الٰہی کو تھوڑی سی قیمت پر فروخت نہ کرو۔'' اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ بہت سی قیمت ملے تو فروخت کرو۔ والذین یقتلون النبیین بغیر حق ''وہ جو پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں۔'' اس کا مقصد یہ نہیں ہے حق کے ساتھ قتل کریں تو ٹھیک ہے کیوں کہ انبیاء کا قتل حق کے ساتھ ہونا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ تو بہر حال ناحق ہوگا۔ یہی صورت یہاں ہے۔

---

[1] ۔قیل کان الرجل منهم یربی الی اجل ثم یزید فیه الی اخر حتی یستغرق بقلیله حال المدیون (صافی)

ساتھ ہونا تو ممکن ہی نہیں ہے۔وہ تو بہر حال ناحق ہی ہو گا۔یہی صورت یہاں ہے۔
پھر یہ کہ اضعافا مضاعفہ سے خود سود کے عدم جواز کی اصل حکمت کا بھی اظہار ہے کہ اس طرح ایک شخص نے دوسرے کو جتنا قرضہ دیا ہے اس سے دونا چوگنا وصول کر لیتا ہے [1] جو کسی طرح انصاف کے مطابق نہیں ہے اور اس سے معاشی عدم توازن پیدا ہوتا ہے، اس لئے یہ قانون حرمت ربوا کا قرار دیا گیا ہے لیکن جب کہ یہ قانون نافذ ہو گیا تو اب دونے چوگنے کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔اگر کوئی اس سے کم ہی سود لے تب بھی وہ اس قانون کی مخالفت کی بنا پر فعل حرام ہو گا۔
جن مصالح یا مفاسد عامہ کی بنا پر کلی قوانین نافذ ہوتے ہیں،ان میں یہ اصول عام ہے کہ اگر کسی خاص محل میں وہ مصلحت یا مفسد مرتب نہ بھی ہو،تب بھی قانون کے عموم کی بنا پر وہ حکم وجوب یا حرمت کا قائم رہے گا۔
''اس آگ سے بچو''یعنی ان افعال سے بچو جو اس آگ میں لے جانے والے ہیں۔[2]

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

''اور تیزی کرو اپنے پروردگار کی طرف سے بخشش اور اس بہشت کی طرف جس کی چوڑان تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہے وہ تیار ہے پرہیزگاروں کے لئے۔''

پرہیز گاروں کے اوصاف حمیدہ کا ایک سلسلہ

بخشش اللہ کا کام ہے،بندہ کا اس کی طرف تیزی کرنا ان اعمال کو جلد سے جلد انجام دینا ہے،جو انہیں مغفرت الٰہی کا مستحق بنائیں۔[3]
جنت کی وسعت کا تذکرہ انسان کو اس امر کی اطمینان دہانی کے لئے ہے کہ وہاں اس کے لئے کسی چیز کی کمی نہیں ہو سکتی۔[4]

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

''جو خیرات کرتے ہیں خوش حالی اور پریشانی (دونوں حالتوں) میں اور غصہ کو ضبط کرتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ بھلائی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

---

[1]۔هذا بيان لنحو من جهات المفسدة فيه وذالك انه يحسب طبعه وجوره يتهلك اموال المديون (البلاغی)
[2]۔ای اتقوا الا فعال الموجبة لدخول النار (مجمع البیان)
[3]۔الی اسباب المغفرة فی المجمع عن الامير المومنين الی اداء الفرائض (صافی)
[4]۔ذکرت مستعة الجنة يطمئن الانسان بان له فيها ماتشهيه نفسه من المحل الواسع (البلاغی)

یہ پرہیزگاروں کے اوصاف حمیدہ کا ایک سلسلہ ہے، جوفرض شناس افراد ہیں وہ غصہ سے کبھی کام لیتے ہیں مگر صرف غصہ کی زد میں نہیں بلکہ محل کو دیکھ کر یہاں مرضی الٰہی اسی اقدام سے وابستہ ہے، اس لئے وہ اقدام جذباتی طور پر غصہ کا نتیجہ نہیں ہوتا اور جب تک کسی بلند مقصد کی خاطر اور منشائے قدرت کی تکمیل کے لئے سزا دینا ضروری نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ مجرم سے عفوودرگزرہی سے کام لیتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر اس کے ساتھ بھلائی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

یوں تو آخر کا جملہ کہ ''اللہ بھلائی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے'' اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ سابق الذکر کردار ہی ''بھلائی'' ہے اور ممکن ہے کہ اس غصہ کے ضبط کرنے اور معاف کرنے کے علاوہ مزید بھلائی کی فضیلت کا اظہار ہو رہا ہو۔ [1]

اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں کنیز کے غلطی کرنے پر اس فقرہ کے پڑھنے سے کہ: ''والکاظمین الغیظ'' حضرتؑ نے فرمایا: **کظمت غیظی** ''میں نے اپنے غصہ کو ضبط کیا'' حضرتؑ نے فرمایا: ''**عفوت عنك**'' ''میں نے تجھے معاف کردیا'' اور اس جز کے پڑھنے پر کہ ''**واللہ یحث المحسنین**'' حضرتؑ نے فرمایا ''میں نے تجھے راہ خدا میں آزاد کیا۔''

وَالَّذِيۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَةً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِهِمۡ ۚ وَمَنۡ يَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَلَمۡ يُصِرُّوۡا عَلٰى مَا فَعَلُوۡا وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾

''اور وہ کہ جب وہ کوئی بڑا برا کام کر ڈالتے ہیں یا اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرکے اپنے گناہوں پر استغفار کرتے ہیں اور سوا اللہ کے ہے کون جو گناہوں کو معاف کرے اور وہ اپنے کیے ہوئے پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔''

آیات کے سیاق سے پہلا تصور یہ ہوتا ہے کہ یہ بھی متقین کا وصف ہے، حالانکہ جو متقین ہوں گے وہ ایسے بڑے برے کام کا ارتکاب ہی کیوں کریں گے۔ [2] اس لئے ممکن ہے کہ اس سیاق کو تسلیم کرتے ہوئے بھی متقین کا وصف بس پہلا ہی مانا جائے اور گزشتہ آیت کے آخر میں جو **واللہ یحب المحسنین** ہے اس میں ''**المحسنین**'' کے لفظ پر اس سلسلہ اوصاف کا عطف مانا جائے یعنی اللہ حسن عمل پر قائم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور (نہیں تو پھر) ایسے لوگوں جو پہلے اگر برے اعمال کرچکے ہیں تو بھی اب ان پر تائب ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کسی اور موقع کی نازل شدہ آیت ہو جسے ترتیب دیتے وقت یہاں چسپاں کردیا گیا ہو۔

فاحشہ یعنی ''بڑے برے کام [3] کے بعد جو کہا گیا ''یا اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں'' اس سے ہمارے خیال میں تو معمولی درجہ کے گناہ مراد

---

[1] ۔ای من فعل ذالك فھو محسن... ویحتمل ان یکون الاحسان شرطا مضموما الی ھذا الشرائط (مجمع البیان)

[2] ۔فیہ نوع اشکال واللہ العالم (البلاغی)

[3] ۔فی النھایۃ: الفاحشۃ کل ما اشتد قبحہ من الذنوب والمعاصی (البلاغی) سیئۃ بالغۃ فی القبح کانونا (صافی)

ہیں جو فاحشہ کے درجہ پر نہ ہوں۔ علامہ طبرسیؒ نے جو اقوال نقل کیے ہیں، وہ اس کے مطابق ہیں مگر بعض لوگوں نے ایسا سمجھا ہے کہ وہ فاحشہ سے بھی بدتر قسم کے گناہ ہیں۔[1]

اور اس ذیل میں ایک طویل روایت شان نزول کی حیثیت سے درج کی گئی ہے جس میں ایک جوان کا قصہ ہے کہ وہ قبروں سے مردوں کو نکال کر ان کے کفن اتارتا تھا اور اسی سلسلہ میں اس نے ایک خاتون کی لاش کی بے حرمتی کی اور اس سے زنا کا ارتکاب کیا۔ پھر اس کا ضمیر بیدار ہوا اور اس نے توبہ کی۔ کہا گیا ہے کہ اسی واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی مگر یہ شان نزول مسلم حیثیت نہیں رکھتی اور علامہ طبرسیؒ نے شان نزول میں جو دو روایتیں درج کی ہیں، وہ پہلے ہی تصور کے مطابق ہیں۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَجَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ وَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ ﴿۱۳۶﴾

''یہ وہ ہیں جن کی جزا ان کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہے اور وہ بہشت جن کے نیچے سے نہریں رواں ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور کتنا اچھا ہوتا ہے باعمل افراد کا صلہ۔''

یہ خالق کا تفضّل ہے کہ گناہ کے بعد توبہ وانابت سے وہ فقط اس سزا ہی کو ختم نہیں کرتا جو اس گناہ پر مترتب ہو۔ بلکہ اس توبہ واستغفار کو خود ایک قابل معاوضہ عمل قرار دے کر اس کا اجر وثواب بھی عطا فرماتا ہے۔

قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ ۙ فَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَیۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِیۡنَ ﴿۱۳۷﴾

''تمہارے پہلے بہت قسم کے نمونے گزر چکے ہیں[2] تو زمین میں سیر کر کے دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟''

عقل وہوش کا تقاضا یہ ہے کہ انسان سابقہ واقعات سے سبق لے اور عبرت حاصل کرے۔

افعال اور ان کے نتائج پر غور کے دو انداز ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ عقلی طور پر خود ان افعال کے حسن وقبح پر غور کرے اور پھر ان کے نتائج کا اندازہ کرے۔ دوسرے یہ کہ مختلف افعال کے جو نتائج وقوع میں آ چکے ہیں، انہیں دیکھے اور ان سے ان افعال کے حسن وقبح کے متعلق رائے قائم کرے۔ پہلا طریقہ بالغ نظر افراد کے لئے مناسب ہے اور دوسرا طریقہ عوام کے لئے چنانچہ یہاں عامہ ناس کو اس دوسرے طریقہ کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔

---

[1]۔ بان اذنبوا اعظم من الزنا (صافی)

[2]۔ وقایع سنہا اللہ تعالیٰ فی الامم المذبۃ (صافی) سنن من اللہ فی الامم السابقہ... وقیل سنن امثال (مجمع البیان)

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوۡعِظَةٌ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿١٣٨﴾

''یہ تمام لوگوں کے لیے واضح تذکرہ اور پرہیزگاروں کے لئے ہدایت اور نصیحت کا ذریعہ ہے۔''

چونکہ ترتیب معلوم نہیں ہے اس لئے ''یہ'' کا اشارہ معین طور پر بتایا نہیں جاسکتا کہ کاہے کی طرف ہے؟ ہوسکتا ہے کہ جنگ بدر کے جو حالات بیان ہوئے ہیں، ان کی طرف اشارہ ہو[1] اور ممکن ہے کہ پورے قرآنی کی طرف اشارہ ہو۔[2]

یہ ''بیان ہے لوگوں کے لئے'' یعنی حقیقت حال پر اطلاع اس سے ہر ایک کو ہوسکتی ہے، چاہے کوئی اثر لے یا نہ لے مگر ہدایت وموعظہ پرہیزگاروں کے لئے ہے[3] کیوں کہ اس سے اثر وہی لوگ لیتے ہیں جنہیں درستی اعمال اور نجات آخرکی فکر ہو۔[4]

وَلَا تَهِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿١٣٩﴾

''اور کمزوری نہ دکھاؤ اور رنجیدہ نہ ہو اور تم برتری رکھتے ہو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔''

جنگ احد کی عسکری شکست پر تنبیہیں اور تسلیاں

عام طور پر برتری ''کے معنی ''فتح وکامرانی'' کے سمجھے گئے ہیں یعنی اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اطمینان رکھو کہ اگر ظاہری طور پر دشمنوں کے خیال میں تمہارا بالکل قلع قمع ہوجائے اور تم تباہ وبرباد بھی ہوجاؤ، تب بھی نتیجہ میں فتح تمہاری ہوگی[5] شرط یہ ہے کہ ایمان کے تقاضوں پر قائم و برقرار رہو۔

چونکہ جنگ احد میں مسلمانوں کو بڑا جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی دھچکا بھی پہنچا تھا اس لئے اس طرح تسلی دی جارہی ہے۔[6]

اور آخری فقرہ میں ایک طرح کا انتباہ بھی ہے کہ جو شکست اور پسپائی تمہیں نصیب ہوئی وہ تمہارے ہی ایمان کی کمزوری سے تھی۔ اس کے بعد اگر ایمان مضبوط رکھو گے تو تمہاری فتح یقینی ہے۔

اور یہ بھی مفہوم ہوسکتا ہے کہ اگر تم ایمان کا جوہر رکھتے ہو تو بہر حال تمہیں بلندی حاصل ہے، چاہے جنگ میں تم بظاہر شکست بھی کھاؤ کیوں کہ تم حق پر ہو اور تمہارا مخالف باطل پر ہے تو اپنا دل کیوں تھوڑا کرتے ہو۔[7]

---

[1]۔الظاهر ان لایات من قوله تعالے ''واذغدوت'' الیٰ هنا سابقة علیٰ هذا الایة فی نسق التنزیل (البلاغی)

[2]۔هذا اشارة الی القرآن (مجمع البیان)

[3]۔بیان للناس عامة وهدیٰ وموعظة للمتقین خاصة (صافی)

[4]۔لان المتقین هم المنصورون به (مجمع)

[5]۔ای الظافرون المنصورون والغالبون علیهم فی العاقبة (مجمع البیان)

[6]۔تسیلته لهم عما اصابهم (صافی)

[7]۔انکم عالی منهم شانا علی الحق وقتلکم لله وقتلا کم فی الجنة (صافی)

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

''اگر تمہیں کچھ صدمہ پہونچ گیا تو ان لوگوں کو بھی تو ویسی ہی تکلیف پیش آئی ہے اور یہ دنیا کا غلبہ ہے جسے باری باری لوگوں میں ہم ادلتے بدلتے رہتے ہیں اور اس لئے کہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے کچھ کو مثالی حیثیت والا بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا اور اس لئے کہ اللہ ایمان والوں کو نکھار دے اور کافروں کو رفتہ رفتہ [۱] نیست و نابود کر دے۔''

یہ آیت بھی اسی احد کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے کہ تمہیں اگر اس جنگ میں نقصانات برداشت کرنا پڑے تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر مشرکین کو بھی تو پہلے جان و مال کا نقصان درپیش ہوا ہے اور اس جنگ میں بھی یہ نہیں کہ ان کا کوئی نقصان ہی نہ ہوا ہو، اس لئے ان نقصانات سے مراد جنگ بدر والے نقصانات بھی ہو سکتے ہیں [۲] اور خود اس جنگ میں احد میں جو ان کے نقصانات ہوئے وہ بھی ہو سکتے ہیں۔ علامہ بلاغیؒ نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے۔ [۳]

مگر ہمارے خیال میں اس کے بعد کا فقرہ کہ: تلك الایام نداولها بین الناس پہلے خیال سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو دنیا ہے۔ یہاں ہمیشہ ایک ہی صورت ہی نہیں رہتی۔ اس کو ہمارے اردو محاورہ میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ اس دنیا میں کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔

یہ تو عام اصول فطرت کا حوالہ تھا کہ دنیا میں ہوتا یہی ہے کہ کسی کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ فتح ہمیشہ وہی پائیگا۔

اس کے بعد خصوصی طور پر جو یہاں اس صورت حال میں ابتلاؤ آزمائش کی حکمت تھی اسے بیان کیا جا رہا ہے کہ حالات اگر سازگار ہی رہیں تو سب ہی مدعیان اسلام یکساں طور پر فتح کا سہرا اپنے سر باندھیں اور پتہ کیوں کر چلے کہ اصل جان نثار اور وفادار کون ہے؟

آزمائش کا نتیجہ اصل جاں نثار کا تعارف

اس نص قرآنی سے ظاہر ہے کہ جو آج ثابت قدم نہ رہے، وہ سچے معنی میں ایمان کے جوہر سے معمور نہیں ہیں۔ آج کی وفاداری وہ کسوٹی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سچے مومن کون ہیں اور ان وفاداری کرنے والوں میں جو کمال منزل ثبات میں ہوں، وہی ''شهداء علی الناس،، یعنی تمام خلق کے لئے مثالی افراد ہو سکتے ہیں، جن کو اس آیت میں جس کی تفسیر دوسرے پارے کے آغاز میں لکھی جا چکی ہے، ''امت

---

[۱]۔المحق نقص الشئی قلیلا قلیلا (صافی)
[۲]۔هو المروی عن الحسن البصری (البلاغی)
[۳]۔الاظهر والانسب للمقام واسلوبه وتسلیة وتشجیعه ان یراد ما اصاب المشرکین یوم احد (البلاغی)

وسطٗ' کہا گیا ہے اور ان کے لئے ارشاد ہوا ہے: ''لتکونوا شھدآء علی الناس :اور حقیقت امر یہ ہے کہ جنگ احد کے اختتام کی منزل تک جو مثالی ہستیاں نظر آتی ہیں، وہ بس خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام اور کوئی تیسرا نہیں ہے۔

پھر تیسری بات یہ ہے کہ جو مومنین ابھی خام کار ہیں، وہ اس زحمت وشدت کے بعد اگر اس وقت قدم کو لغزش ہو بھی گئی تو پھر اس غلطی کو محسوس ہونے سے اگر ندامت پیدا ہوئی تو وہ ذرا نکھر جائیں گے اور ان کی خامی دور ہو جائے گی اور جو واقعی دل سے کافر اور صرف نمائشی اسلام لائے ہیں، ان کی قلعی بالکل ہی کھل جائے گی اور طلسم باطل ہو جائے گا۔

پھر یہ بھی کہ تلک الایام نداولھا بین الناس میں جو دونوں رخ ہیں کہ دنیاوی غلبہ کبھی مسلمانوں کو ہوتا ہے اور کبھی کافروں کو، اس میں پہلے تو درمیان میں واللہ لا یحب الظلمین ''اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا'' کہہ کر یہ بتایا گیا کہ کافروں کو جو اقتدار حاصل ہوتا ہے وہ کوئی اللہ کی مہربانی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ وہ اتمام حجت کے طور پر ہوتا ہے جس سے وہ اور زیادہ مستحق عذاب بنتے ہیں اور اہل ایمان کے لئے باعث امتحان ہوتا ہے۔[۱]

پھر آخر میں شکست کے دونوں پہلوؤں کی حکمت الگ الگ بیان کی ہے۔ مسلمانوں کو جب شکست ہوتی ہے تو وہ اس لئے کہ ''لیمحص اللہ الذین امنوا'' اللہ ایمان والوں کو نکھار دے''[۲] اور کافروں کو شکست ہوتی ہے تو وہ اس لئے کہ ان کے زور کو توڑ دے اور رفتہ رفتہ ان کا قلع قمع کر دے۔[۳]

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

''کیا تم سمجھتے ہو کہ تم بہشت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے معلوم نہیں کیا تم میں واقعی مجاہد کون ہیں اور نہ یہ معلوم کیا کہ ثابت قدم کون ہیں''

اس طرح کی آیت کہ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے؟'' پہلے بھی آ چکی ہے۔ اس کے ساتھ کا مضمون مختلف آیتوں میں الگ الگ ہے مگر سب کا مشترک نتیجہ یہ ہے کہ صرف مسلمانوں کی فہرست میں داخل ہو جانا جنت میں لے جانے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ کردار سے ایسا ثبوت فراہم ہونا چاہیے جو استحقاق جنت کا ضامن ہو۔

یہاں جہاد کا ذکر ہے، اس لئے کردار کے اس پہلو کو بیان کیا ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ میدان جہاد میں نظر آنے والے سب مسلمان حقیقی مجاہد نہیں ہیں یہ تو وقت آنے پر حقیقت نمایاں ہوگی کہ کون واقعی مجاہد ہیں اور یہی وہ ہوں گے جن کے لئے اللہ کو معلوم ہوگا کہ یہ ہیں حقیقی مجاہد۔

---

[۱]۔اعتراض فیہ تنبیہ علی انہ لاینصر ھم فی الحقیقۃ وانما یدیل لھم احیاناً استدراجا لھم و ابتلاء للمؤمنین (صافی) انہ لایمکن الظالمین منھم لمحبۃ لھم (مجمع البیان)

[۲]۔لیطھر ھم ویصفیھم من الذنوب ان کانت الدولۃ علیھم (صافی)

[۳]۔یھلکھم ان کانت علیھم (صافی)

علم اللہ کو بربنائے واقعہ ہوتا ہے۔اس لئے اگر یہ واقعہ ظہور پذیر ہو ہی نہ تو اللہ کو اس کا علم بھی کیوں ہوگا۔
علم الٰہی میں مجاہدین وہی ہوں گے جن سے عمل جہاد وقوع میں بھی آئے [۱] لیکن زمانہ کے اعتبار سے وہ اس وقوع سے موخر نہیں بلکہ ازل سے حاصل ہے۔[۲]

وَلَقَدۡ كُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَلۡقَوۡهُ ۖ فَقَدۡ رَاَيۡتُمُوۡهُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۱۴۳﴾

''اورتم تو ان کا سامنا ہونے سے پہلے [۳] مرنے کے آرزومندر ہا کرتے تھے۔اب توتم نے اپنی آنکھوں سے اس کا سماں دیکھ لیا۔''

فرار ہونے والوں پر شدید طنز

یہ میدان جہاد سے فرار کرنے والوں پر بڑا شدید طنز ہے کہ مسلمانوں کا تو قول یہ ہے کہ کافروں سے جنگ کر کے مر گئے تو شہید اور بچ گئے تو غازی اس لئے وہ ہمیشہ شہادت ۴ کے آرزومندر ہتے ہیں مگر جب شہادت کا موقع سامنے آیا تو وہ فرار کے گوشے تلاش کرنے لگے۔
یہی علی بن ابراہیم قمیؒ نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں روایت درج کی ہے کہ مسلمانوں کے سامنے جب جنگ بدر کے شہداء کے مراتب بیان ہوئے تو انہوں نے کہا کہ کاش اب کوئی معرکہ پھر پیش آئے تو ہم اس مرتبہ کو حاصل کریں مگر جب احد کا معرکہ پیش ہوا تو سوا قلیل کے کوئی بھی ثابت قدم نہ رہا۔اسی کے متعلق یہ آیات نازل ہوئی ہے (صافی)

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰٓى اَعۡقَابِكُمۡ ؕ وَمَنۡ يَّنۡقَلِبۡ عَلٰى عَقِبَيۡهِ فَلَنۡ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيۡـــًٔا ؕ وَسَيَجۡزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيۡنَ ﴿۱۴۴﴾

''اور محمدؐ نہیں ہیں مگر ایک پیغمبر جن کے پہلے سب ہی پیغمبر گزر چکے ہیں تو کیا یہ مرجائیں یا مار ڈالے جائیں تو تم الٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے اور جو الٹے پاؤں پلٹ جائے تو وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچائے گا اور وہ وقت قریب ہے جب کہ اللہ شکر گزاروں کو صلہ عنایت کرے گا۔''

---

[۱] .ذکر علم اللہ لانہ لازم للوقوع (البلاغی) ای ولما یجاھدا المجاھدون منکم فیعلم جھادھم لانہ لو کان لعلمہ (مجمع البیان)
[۲] .الھاء فی تلقونہ ورأیتموہ راجعۃ الی الموت ای من قبل ان تلقوا اسباب الموت (مجمع البیان)
[۳] .المراد من الموت المتمنی ھی الشھادۃ (البلاغی)

مستقبل کے خطرہ پر توجہ دہانی

''نہیں ہیں مگر ایک پیغمبر'' یعنی خدا نہیں ہیں جسے موت نہیں ہے۔ یہ تو عقلی پہلو ہے اور ''جن کے پہلے سب پیغمبر گزر چکے ہیں۔'' یہ واقعاتی پہلو ہے، رسالت اگر دار دنیا میں بقاء کی ضامن ہوتی تو پہلے کے رسول دنیا سے کیوں اٹھتے؟!

ہم نے ''سب پیغمبر جو ترجمہ کیا ہے، یہ الرسل کے الف لام کی وجہ سے ہے جو استغراق کا فائدہ دیتا ہے اور اس طرح ان الفاظ سے ختم نبوت بھی ثابت ہوتا ہے یعنی سب پیغمبران کے پہلے گزر چکے ہیں، یہ آخری رسول ہیں اس لئے تمام انبیاء میں جو سنت الٰہیہ رہی ہے وہ مکمل طور پر آنکھوں کے سامنے آچکی ہے۔ بعض لوگوں نے جو یہ ترجمہ کیا ہے کہ ''ان کے پہلے بہت رسول گزر چکے ہیں۔'' اس وقت درست ہوتا جب رسل تنوین کے ساتھ ہوتا۔

قرآن مجید نے الرسل کے ساتھ خلت کی لفظ صرف کی ہے کہ ''گزر چکے ہیں'' ماتت کہا ہے کہ ''مر چکے ہیں۔'' لہٰذا حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر زندہ ہونے یا خضرؑ و الیاسؑ کی حیات پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس دار دنیا کی اس عام زندگی کے ایک لحاظ سے جو ان کے دور حضور میں تھی ہمارے رسول کی نسبت سے وہ سب گزرے ہوئے انبیاء میں داخل ہیں۔

اس آیت کا جنگ احد کے واقعہ سے تعلق یہ ہے کہ اس آواز ہی سے قتل محمدؐ ''رسول قتل ہو گئے'' مسلمانوں میں اور زیادہ بھگدڑ پڑ گئی تھی اور بالکل قدم اٹھ گئے تھے کہ جب رسولؐ ہی نہ رہے تو ہم جنگ کر کے کیا کریں؟

صاف ظاہر ہے کہ یہ خطرہ اسی جماعت سے ہے جس کے قدم میدان احد سے اٹھے تھے۔ اب اگر رسولؐ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد یہ خطرہ واقعیت کے لباس میں سامنے آجائیں تو بعد کے مسلمانوں کو راہ صواب کی تلاش میں کن افراد پر نظر کرنا چاہیے؟ انہی پر جو احد کی منزل میں ثابت قدم رہے ہوں۔

رسولؐ کی وفات کے بعد پیدا ہو جانے والے تفرقہ میں اگر ایک طالب حق حق کو معلوم کرنا چاہے تو یہ ایک آیت ہی اس کی مکمل رہنمائی کے لئے کافی ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اور کوئی ذی روح دنیا سے جا ہی نہیں سکتا مگر اللہ کے حکم سے نوشتہ کے طور پر مقررہ میعاد کی قید کے ساتھ اور جو دنیا میں صلہ چاہتا ہے، اسے اسی دنیا میں ہم دے دیتے ہیں اور جو آخرت کا صلہ چاہتا ہے اسے وہاں دیتے ہیں اور وہ دور قریب ہے جب ہم شکر گزاروں کو صلہ دیں گے۔''

موت کا وقت مقرر ہے

میدان جہاد سے فرار کیوں کیا جاتا ہے؟ موت کے ڈر سے اس لئے کہا جارہا ہے کہ موت کا تو دن مقررہ ہے [1] اس کے پہلے کوئی نہیں مرسکتا اور اگر وہ دن آ گیا ہے تو بھاگ کر بھی موت سے بچنا ممکن نہیں ہے۔

دنیا میں جو کام آدمی کرتا ہے، اس کا صلہ بہرحال ملتا ہے لیکن دنیا طلبوں کو دنیا ملتی ہے جیسا کہ احد میں مسلمانوں کی اکثریت مال غنیمت پر ٹوٹ پڑی تو انہیں پھر آخرت کی جزا سے سروکار نہیں رکھنا چاہیے [2] اور آخرت کے طلب گاروں کو اخروی ثواب ملتا ہے۔

اس کے بعد دنیا کے تخت و تاج اور قہر و غلبہ کو درگاہ الٰہی میں مقبولیت اور آخرت کی کامیابی کی ضمانت نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ خطر محسوس کرنا چاہیے کہ کہیں یہ کچھ اعمال کی دنیا میں بدلا دینا تو نہیں ہے جس کے بعد آخرت میں کوئی حصہ ہی نہ رہ گیا ہو۔

اس کے پہلے والی آیت میں خاتمہ کا فقرہ یہی تھا کہ: وَسَیَجۡزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیۡنَ ''بہت جلد اللہ شکر گزاروں کو صلہ عطا فرمائے گا'' اور اس آیت میں پھر اختتام اسی پر ہے کہ: سنجزی الشاکرین ''بہت جلد ہم شکر گزاروں کو صلہ عطا کریں گے۔''

شان نزول اور حضرت علیؑ کا کردار

یہ بار بار اس کا کہنا ضرور ذہن کو متوجہ کرتا ہے کہ اس کا کسی واقعہ سے تعلق ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے اس بارے میں امام محمد باقرؑ کی ایک حدیث نقل کی ہے جس میں ان دونوں آیتوں کی شان نزول کا ذکر ہے اور وہ یہ کہ حضرت علی علیہ السلام کے جسم پر میدان احد میں ساٹھ زخم لگے تھے۔ اس وقت تو وہ جوش ایمانی اور پھر رسولؐ کے زخموں کو دیکھ کر ان کے تاثر سے، جیسے ان زخموں سے ذرا بھی متاثر معلوم نہیں ہوتے تھے مگر بعد میں جب مہم ختم ہوگئی تو ان زخموں کے اثر سے آپ کی کیفیت ایسی تھی کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام مسلمان گروہ آپؑ کی عیادت کررہے تھے اور حضرت علی علیہ السلام اس موقع پر بار بار یہ کہتے تھے کہ یہ زخم تو کچھ نہیں ہیں میں تو شکر خدا اس پر جتنا ادا کروں کم ہے کہ میرے قدم میں تزلزل نہیں ہوا اور میں نے میدان نہیں چھوڑا۔ ان کے اس ادائے شکر کی ادا خالق کے نزدیک اتنی پسندیدہ تھی کہ دو دفعہ شاکرین کے لفظ کے ساتھ آپ کے کردار کا تذکرہ کیا گیا۔ [3]

وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ نَّبِىٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوۡنَ كَثِيۡرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوۡا لِمَاۤ اَصَابَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوۡا وَمَا اسۡتَكَانُوۡا ‌ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۴۶﴾

''اور بہت سے نبی ہوئے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے [4] جنگ کی تو جو انہیں اللہ کی راہ میں

---

[1]۔ فیہ تحریص وتشجیع علی القتال (صافی)

[2]۔ تعریض بهن شغلة الغنائم یوم احد (صافی)

[3]۔ فشکر اللہ لہ ذلك فی موضعین (مجمع البیان)

[4]۔ فی الکشاف ان الربی کالربانی هو المنسوب الی الرب (البلاغی)

مصائب پیش آئے، ان پر وہ سست نہ ہوئے اور نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ عاجزی سے کام لیا اور اللہ صبرو تحمل رکھنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

اس آیت کے متعلق ہم نے اپنے ان بیانات میں بسیط روشنی ڈالی ہے جو امامیہ مشن سے رسالہ کی صورت میں شائع ہوئے ہیں، جس کا نام ہے "شجاعت کے مثالی کارنامے"

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دور میں جن معرکوں کو تفصیل حدیث یا تاریخ ہی نہیں بلکہ قرآن مجید میں بھی آئی ہے، ان میں ہمیں وہ جماعت نظر نہیں آتی جن کا مثالی کردار قرآن مجید کی اس آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

انبیاء کے ساتھیوں کا کردار اور ساتھ ہونے کا معیار

لیکن اگر کسی دور تاریخ میں یہ مثالی کردار کسی جماعت میں جیتے جاگتے مرقع کی شکل میں سامنے آ گیا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس جماعت کو پیغمبروں کا حقیقی ساتھی نہ سمجھیں! چاہے جسمانی طور کوئی پیغمبر ان میں نظر نہ آتا ہو، اس لئے کہ معیت جسمانی کا کوئی اعتبار نہیں جب کہ صفات و کردار میں معیت کا جلوہ نہ ہو اور اگر صفت و کردار اتحاد و عمل کا پتہ دے رہا ہے تو وہ معیت کے جوہر کا حقیقی ثبوت ہے۔

اس پہلو کو اس معہ میں بھی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے اور محمد رسول اللہ والذین معہ اشدآء علی الکفار رحمآء بینھم میں بھی جس پر اس آیت کے ذیل میں جو ابھی بہت دور ہے انشاءاللہ تبصرہ کیا جائے گا۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٤٧﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٤٨﴾

"اور نہیں تھا ان کا کوئی قول سوا اس کے کہ وہ کہا کرتے تھے، اے ہمارے پروردگار! ہماری خاطر بخش دے ہمارے گناہوں کو اور خود ہمارے معاملہ میں ہماری فضول کاری کو اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافر گروہ کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما، تو اللہ نے دنیا میں بھی انہیں صلہ عطا کیا اور آخرت کے ثواب کی بہتری بھی اور اللہ نیک اعمال افراد کو دوست رکھتا ہے۔"

حسنِ کردار کے ساتھ شان عبودیت کا اظہار

یعنی باوجود راہ خدا میں اس استقامت کے وہ کبھی اپنے اعمال پر نازاں نہیں رہے بلکہ ہمیشہ اپنے کو خطاوار قرار دیتے ہوئے بارگاہ الٰہی میں عفو کے ملتجی رہے۔[1]

---

[1] .وما کان قولھم مع ثباتھم فی الدین و کونھم ربانیین الا ان قالوا (صافی)

یہ انداز عبودیت حسن عمل میں چار چاند لگا دینے والا ہوتا ہے جس کی معراج ''صحیفہ سجادیہ'' کی ایسی معصومینؑ کی دعاؤں میں نظر آتی ہے جہاں کامل معصوم ہستی بارگاہ الٰہی میں اس طرح تڑپ کے فریادیں کرتی اور اپنے عفو قصور کے لئے التجائیں کرتی ہے جنہیں پڑھ یا سن کر واقعی مجرموں کی روح میں بھی خوف الٰہی سے ارتعاش پیدا ہوجائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

''اے ایمان لانے والو! اگر کافروں کا کہنا مانو گے تو وہ تمہیں پچھلے پیروں پلٹا دیں گے تو تم بڑا خسارا اٹھا کے واپس ہو گے بلکہ تمہارا حامی وسرپرست اللہ ہے اور وہ تمام مددگاروں میں سب سے بہتر ہے۔''

آیت کے مضمون سے ظاہر ہے کہ اس کا کسی خاص شان نزول سے تعلق ہے۔ یوں تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کافروں کا کہنا ہر بات میں نہیں ماننا چاہیے، ورنہ وہ تو یہی چاہیں گے کہ یہ انہی کی طرح کفر کا راستہ اختیار کرلیں مگر آخر اس کہنے کی ضرورت کیا پیش آئی؟ روایتیں اس بارے میں مختلف ہیں اور وہ بھی مستند طریقہ پر وارد نہیں ہوئی ہیں۔ اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا واقعہ کیا ہے؟ مگر چونکہ اس کے پہلے جنگ احد ہی کا ذکر چلا آ رہا ہے، اس لئے یہ روایت قابل قبول معلوم ہوتی ہے جو معصوم ذات کی طرف نسبت کے ساتھ وارد ہوئی ہے [۱] کہ احد کی شکست کے بعد منافقین دوسرے مسلمانوں سے کہنے لگے کہ بس اب اس دین سے کنارہ کشی کرو اور مشرکین کا کیش اختیار کرلو۔ نجات کی یہی صورت ہے۔

نفسیاتی طریقہ پر بزدل اور پھر کمزور عقیدہ والے لوگ ایسی ہنگامی مصیبتوں میں ایسے ہی رخوں پر سوچا کرتے ہیں، اس لئے یہ روایت درایت کے بھی مطابق ہے۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

''عنقریب ہم رعب ڈال دیں گے ان کے دلوں میں کہ جنہوں نے کفر اختیار کیا، اس لئے کہ انہوں نے اللہ کا شریک کیا ہے ایسی چیزوں کو جس کے لئے کوئی دلیل [۲] اس نے نہیں اتاری ہے اور ان کا ٹھکانا دوزخ میں ہے اور ظالموں کا کیا برا ٹھکانا ہے۔''

چونکہ اسلام کے مقابلہ میں اس وقت زیادہ منکرین خدا نہ تھے بلکہ مشرکین تھے، مشرک کا خود مطلب یہ ہے کہ ایک خدائے بزرگ کی

---

[۱] ۔عن علی علیہ السلام (مجمع البیان)

[۲] ۔السلطان ھنا معناہ الحجۃ والبرھان (مجمع البیان)

ہستی تو مسلم ہے جس کا نام ''خدا'' ہے مگر دوسری شخصیتوں کو معبود مانا جارہا ہے، خواہ اس کا بیٹا قرار دے کر یا اس کا اوتار سمجھ کر[1] اس لئے قرآن مجید اس طرح سے ان کے مقابلہ میں استدلال پیش کررہا ہے اگر یہ اس کے کسی رخ سے بھی شریک ہوتے تو اللہ کی طرف سے ان کے اس منصب کا کوئی ثبوت اتارا جاتا جیسے ہم جنہیں انبیاء مرسلین کی حیثیت سے مانتے ہیں تو اللہ ان کی نبوت کے

ثبوت کے لئے معجزات ظاہر کرتا ہے لیکن جب ایسا نہیں ہے تو یہ اس سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ تمہارا عقیدہ ان کی نسبت غلط ہے اور چونکہ ان مشرکین کو خود بھی اپنے دعاوی کا کوئی ثبوت نظر نہیں آیا، اس لئے ان کے ضمیر میں کمزوری ہے اور یہی ضمیر کی کمزوری ہے جو انہیں اپنی فتح وظفر پر اعتماد نہیں پیدا کرسکتی اور وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مرعوب ہیں، یہ مرعوبیت صرف اس لئے ہے کہ وہ حقانیت کے جوہر سے محروم ہیں۔

جنگ احد میں مسلمان تو اپنے کردار سے شکست کھا چکے تھے، اب جو مشرکین پھر پسپا ہوئے تو یہ اللہ ہی کی طرف سے ان کے دلوں میں ڈالا ہوا رعب تھا، جس نے انہیں واپس جانے پر مجبور کیا۔[2]

یہ اور بات ہے کہ اس رعب کا ظاہری سبب خالق نے اپنے ایک بندہ کو بنادیا جس کی تلوار آخر تک مشرکین کے قلع قمع میں مصروف رہی اور وہ وہی تلوار ہے جس کا ملک کو کلمہ پڑھنا پڑا (لا سیف الا ذوالفقار)

وَلَقَدۡ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعۡدَهٗۤ اِذۡ تَحُسُّوۡنَهُمۡ بِاِذۡنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلۡتُمۡ وَتَنَازَعۡتُمۡ فِى الۡاَمۡرِ وَعَصَيۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَرٰٮكُمۡ مَّا تُحِبُّوۡنَ ؕ مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمۡ عَنۡهُمۡ لِيَبۡتَلِيَكُمۡ ۚ وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۵۲﴾

''اور بلاشبہ اللہ نے اپنا وعدہ سچ تو کر دکھایا اس وقت جب تم اس کے حکم سے ان کا قلع قمع کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے بے عملی سے کام لیا اور آپس میں طرز عمل کے بارے میں جھگڑنے لگے اور تم نے عدول حکمی کی، اس کے بعد کہ اس نے جو تم چاہتے تھے، وہ آنکھوں سے دکھا دیا۔ تم میں کوئی دنیا کا طالب تھا اور تم میں کوئی وہ تھا جو آخرت کا طلبگار رہے تو پھر اس نے تمہیں ان کے مقابلہ میں شکست دے دی[3] تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور اب تمہیں معاف کردیا ہے اور اللہ ایمان والوں پر بڑے فضل وکرم والا ہے۔''

---

[1]۔ یحسب ماصورۃ لھم ضلالھم من الدلالۃ من اللہ او تنزلات الالھیۃ (البلاغی)

[2]۔ ھو ماقذف فی قلوبھم من الخوف یوم احد حتی ترکوا القتال ورجعوا (صافی)

[3]۔ کفکم عنھم حین غلبوکم (صافی)

فتح، اس کے بعد شکست اور اس کے اسباب

یہ جنگ احد کا تذکرہ ہے۔ اس میں شروع میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اور دشمنوں نے فرار کیا مگر مسلمان مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور وہ لوگ جو درہ کوہ پر معین ہوئے تھے اس فرمان کے ساتھ کہ چاہے فتح ہو اور چاہے شکست، وہ اس جگہ سے نہ ہٹیں، انہیں بھی مال غنیمت کا شوق پیدا ہو گیا اور باوجودیکہ ان کے سردار بن جبیر نے بہت سمجھایا، انہوں نے کہنا نہ مانا اور وہاں سے ہٹ گئے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ بنی ہوئی لڑائی بگڑ گئی، اس درہ کوہ سے خالد بن ولید نے حملہ کر دیا اور ادھر مسلمان جھکے ہوئے غنیمت کا مال اٹھا رہے تھے اور ادھر سے ان کے سروں پر تلواریں پڑنے لگیں جس کی وہ تاب نہ لا سکے اور انہوں نے میدان جنگ سے فرار اختیار کیا، بس اسی واقعہ کو موثر ترین الفاظ میں اس موقع پر قرآن مجید نے پیش کیا ہے اور پھر یاد کر لینے کی یہ چیز ہے کہ اگر خالق کو صرف ''صحابہ'' رسولؐ کے نام کی لاج رکھنے کے لئے یہ مدنظر ہوتا کہ ان کے افعال پر کبھی کوئی نقد و تبصرہ نہ ہو تو وہ ابد تک باقی رکھے جانے والے قرآن میں ان کے ان افعال کا ذکر اور ان پر تبصرہ درج فرمانا ضروری نہ سمجھتا۔

شروع کے یہ الفاظ کہ ''اللہ نے اپنا وعدہ تو اس وقت پورا کر دیا جب تم ان کا قلع قمع [1] کر رہے تھے۔'' اس شروع والی فتح کا پتہ دے رہے ہیں جو مال غنیمت پر ٹوٹنے اور درہ کوہ سے ہٹنے کے پہلے ہوئی تھی [2] اور یہ فتح چونکہ مادی اسباب سے پیدا شدہ توقعات کے خلاف تھی، اس لئے کہ کفار کی تعداد اس جنگ میں بھی مسلمانوں کی چوگنی تو تھی ہی، اس لئے اسے حکم الٰہی سے وابستہ کیا ہے کہ ''تم اس کے حکم سے، ان کا قلع قمع کر رہے تھے۔'' یہ فتح تو خدا کے فضل و کرم کا نتیجہ تھی اور اس کے بعد جو شکست ہوئی وہ تمہارے کرتوت کا نتیجہ ہے۔

صحابہ کے ایک طبقہ کی نبض قرآن دنیا طلبی

اب یہی صحابہ کرام کی ''مقدس'' جماعت ہے جس میں قرآن مجید یہ تفریق کر رہا ہے کہ تم میں بعض دنیا طلب تھے، ظاہر ہے کہ یہ وہی ہو سکتے ہیں جو مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور پھر تلواروں کے سر پر آنے کے بعد میدان خالی کر کے چھوڑ گئے اور بعض وہیں جو آخرت کے طلب گار ہیں۔

اب قرآن کے لفظوں نے تو مجملاً دو حصے کر دیے ہیں مگر اسے میدان احد بتائے گا کہ اکثریت کس گروہ کی تھی اور اقلیت میں کون گروہ تھا اور اگر پھر انجام اسی آغاز کے تناسب سے کوئی ایسا کردار پیش کر دے جہاں کسی عارف کو کہنا پڑے ''چوں صحابہ حب دنیا داشتند'' یا ''اہل دنیا کار دنیا سے ساختند'' اور اس حب دنیا کا عملی نتیجہ کیا سامنے آیا؟ یہ کہ ''مصطفےٰ را بے کفن بگزا شتند'' تو پھر حق کو اسی اقلیت سے وابستہ ماننا پڑے گا جو دنیا کو ٹھکرا رہی ہو اور رسولؐ کے تجہیز و تکفین کو حصول اقتدار کی کوشش پر مقدم کرے اور زیادہ غور سے نظر ڈالئے تو یہ وفات کے بعد رسولؐ کی لاش کو نہ چھوڑنے والا وہی ہے جس نے رسولؐ کی زندگی کے نازک لمحہ میں احد کے میدان میں رسولؐ کو نہیں چھوڑا تھا۔

---

[1]۔ فی التبیان الحس ھو القتل علیٰ وجہ الاستئصال (البلاغی)

[2]۔ کان کذلک حتی خالف الرماۃ (صافی)

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

”جب تم بے تحاشا چلے جارہے تھے[1] اور کسی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے[2] اور پیغمبر تمہارے پیچھے سے تمہیں آواز دے رہے تھے[3] تو اللہ نے تمہیں ثواب کے بدلے میں[4] رنج پر رنج پہنچایا[5] تاکہ تمہیں صدمہ نہ ہو اس کا جو تمہارے ہاتھ سے نکل گیا ور نہ اس کا جو در پیش ہوا اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔“

جنگ احد سے فرار کا عبرت ناک منظر

آخری فقرہ کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو کوئی خسارہ بلا وجہ سامنے آئے اور کوئی مصیبت از خود در پیش ہو جائے تو اسے صدمہ ہونا چاہیے کہ ہم آخر کیوں اس مصیبت سے دوچار ہوئے مگر جب خود اپنے ہاتھوں ایسا ہوا ہے اور اپنے کیے کی سزا ہے تو اب اسے بس ندامت اور پشیمانی اپنے کردار پر ہونا چاہیے، اس منفعت کے ہاتھ سے جانے اور مصیبت کے در پیش ہونے کا کوئی صدمہ نہ ہونا چاہیے۔

دوسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ اب اس ابتلاء سے تم میں صبر کی عادت پیدا ہو اور آئندہ جو مصیبت آئے اسے برداشت کرسکو۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ معنی اس کے قبل کے مضمون سے کہ یہ بطور سزا تھا اور بعد کے فقرہ کے مضمون سے کہ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے، مناسبت نہیں رکھتے۔ اس لئے مجھے پہلی ہی تشریح مناسب معلوم ہوتی ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَاۗىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَاۗىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِھِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ

---

[1] ۔الاصعاد الذهاب فی الارض (صافی) الفرق بین الامعاد و الصعود دان الاصعاد فی مستمر من الارض و الصعود فی الاتفاع (مجمع البیان)

[2] ۔لایقف احد لاحد و لاینظره (صافی)

[3] ۔ای ینادیکم من ورائکم (مجمع)

[4] ۔جعل مکان ماترجونه من الثواب (مجمع)

[5] ۔غمّا متصلا بغم (مجمع البیان)

لَكَ ؕ يَقُوۡلُوۡنَ لَوۡ كَانَ لَنَا مِنَ الۡاَمۡرِ شَىۡءٌ مَّا قُتِلۡنَا هٰهُنَا ؕ قُلۡ لَّوۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ بُيُوۡتِكُمۡ لَبَرَزَ الَّذِيۡنَ كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقَتۡلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمۡ ۚ وَلِيَبۡتَلِىَ اللّٰهُ مَا فِىۡ صُدُوۡرِكُمۡ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ ۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۵۴﴾

''پھر اس نے رنج و غم کے بعد تم پر سکون و اطمینان اتارا نیند کی صورت سے جو تم میں سے ایک گروہ پر طاری ہو رہی تھی اور ایک گروہ ایسا تھا جسے اپنی جانوں کی فکر تھی۔ وہ اللہ کے ساتھ ناحق زمانہ جاہلیت کی سی بدگمانی کر رہے تھے، کہہ رہے تھے کہ کیا ہمیں بھی کچھ اختیار حاصل ہے؟ کہہ دیجیے کہ اختیار پورا اللہ کو ہے۔ یہ اپنے دل میں ایسی باتیں چھپائے ہیں جنہیں آپ سے ظاہر نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہمارے ہاتھ میں کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے کہہ دیجیے کہ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں بھی ہوتے، تب بھی جن کے لئے قتل ہونا لکھا جا چکا تھا، وہ اپنے مقتل کی طرف نکل کر جاتے اور اس لئے کہ اللہ آزمائے اسے جو تمہارے سینوں کے اندر ہے اور نکھار کر سامنے لائے اسے جو تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ سینوں کے اندر کی باتوں کا جاننے والا ہے۔''

بعد کی کیفیت اور چہ میگوئیاں

یہ فراری جماعت کے اندر دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے، کچھ ایسے تھے جو ایک دفعہ میدان چھوڑنے کے بعد دوبارہ واپس آ گئے اور اب وہ اپنے فرار پر احساس ندامت کی وجہ سے ایسے غوطہ میں ہو گئے تھے کہ اب انہیں میدان جنگ کے خطرے محسوس نہیں ہو رہے تھے جیسے کہ وہ نیند کے عالم میں ہوں۔[1]

بعض مفسرین لکھتے ہیں کو جو مومنین ثابت قدم رہے تھے ان پر واقعی اللہ کی جانب سے عین عالم جنگ میں نیند کا غلبہ ہو گیا تھا[2] مگر ہمارے نزدیک یہ درست نہیں ہے، اس لئے کہ لڑائی کے بگڑنے کے عالم میں ثابت قدم تھے ہی کے آدمی اور جو دو ایک تھے، وہ ہمہ تن جنگ میں مصروف تھے اور زخموں سے چور ان کے لئے یہ موقع کب تھا کہ ان پر نیند طاری ہو۔

تیسرا مفہوم جسے بعض مفسرین نے اختیار کیا ہے، یہ ہے کہ یہ عین موقع جنگ کا ذکر ہے ہی نہیں، بلکہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد جب شہر کی طرف واپسی ہوئی تو مشرکین نے چونکہ یہ دھمکی دی تھی کہ ہم ابھی پھر واپس آئیں گے تو مسلمان گویا ان کے دوبارہ حملہ کا دھڑکا لئے ہوئے تھے، اس وقت جو سچے مومن تھے، ان کے دل میں کوئی دغدغہ نہ تھا، اس لئے اللہ کی طرف سے انہیں ایسا اطمینان حاصل تھا کہ وہ چین سے سو رہے

---

[1]۔ عراهم فی جملة غموهم غم المعصية بالفرار (البلاغی)

[2]۔ هم المومنون حقار وی انهم غشيهم النعاس فی المصاف حتی كان السيف يسقط عن يدا احدهما أخذه ثم يسقط فيا خذ (صافی)

تھے اور جو کمزوردل اور ایمان والے تھے، انہیں اپنی جان کی فکر تھی، اس لئے انہیں نیند کہاں آسکتی تھی۔ وہ اس طرح چہ چہ کررہے تھے۔[۱] ان کے لئے قرآن یہ انکشاف کررہا ہے کہ ان کے عقائد بھی متزلزل ہوگئے تھے اور خدا رسولؐ کے بارے میں کفریہ خیالات ان کے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے۔

پھر ان کی اس وقت کی جو چہ می گوئیاں تھیں، وہ قرآن نے درج کی ہیں کہ وہ کہہ رہے تھے کہ ہر بات میں بس اللہ اور رسولؐ اپنا حکم چلاتے ہیں، ہمیں تو بس اپنی رائے سے کام لینے کا موقع دیا ہی نہیں جاتا۔ اگر ہمیں اپنی رائے کے مطابق عمل کرنے کا موقع ملتا تو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔[۲]

معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور رسولؐ کے مقابلہ میں حق خودارادی کا مطالبہ ایک جماعت کا شروع سے تھا۔ یہی بعد رسولؐ نص خدا و رسولؐ کے مقابلہ میں اجماع وشوریٰ وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوا۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٥٥﴾

''بلاشبہ تم میں سے وہ جنہوں نے دونوں جماعتوں کی مڈبھیڑ کے دن پیٹھ پھرائی، انہیں غلطی میں مبتلا کیا شیطان نے صرف ان کی کچھ بداعمالیوں کے نتیجہ میں اور بے شک اللہ نے انہیں معاف کردیا ہے۔ بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

شیطان انسانوں کو جو بہکانے میں کامیاب ہوجاتا ہے، وہ درحقیقت خود انسان کی قوت ارادی کی کمی اور فرائض میں اختیاری کوتاہی کے نتیجہ میں جس کی وجہ سے انسان کی جرأت بڑھتی جاتی ہے اور وہ بڑے سے بڑا گناہ بھی کرگزرتا ہے۔ اگر یہ پہلے ہی دن تحریک گناہ کے جذبہ کا مضبوطی سے مقابلہ کرلے تو اس کے نفس کی مقاومت خواہش سے زیادہ طاقت حاصل کرلیتی ہے اور وہ اب قوی محرک سے بھی متاثر نہیں ہوتا یہ ہے شیطان کی شکست۔

اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ''انہیں غلطی میں مبتلا کیا شیطان نے صرف ان کی کچھ بداعمالیوں کے نتیجہ میں''۔[۳] اس لئے گنہ گار کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ شیطان کو ذمہ دار قرار دے کر خود اپنے کو بے قصور ثابت کرے۔ یہاں پہلے یہ بداعمالی ہوئی کہ مجاہدین اسلام نے شروع شروع دشمن کو شکست دینے کے ساتھ ہی مال غنیمت پر ہلہ بول دیا اور دشمن کی نقل وحرکت سے بالکل بے پرواہ ہوگئے۔ پھر اس کے نتیجہ میں درہ کوہ پر متعین افراد کی اکثریت نے حکم رسولؐ کی مخالفت کی اور وہاں سے ہٹ گئے، جس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ دشمن کے پس پشت سے حملہ کردینے کے بعد جہاد سے فرار کے ایسے بڑے جرم میں مبتلا ہوگئے تو اس جرم عظیم میں ابتلاء اپنی ہی بداعمالی کا نتیجہ نہیں تھا تو

[۱]. ذکر سبحنه ان تلك الامة لم تكن عامة بل كانت لا هل الا خلاص و بقي لا هل النفاق الخوف والسهر (مجمع البيان)
[۲]. لم يزح من المدينة بل اقمنا فيها كما كان رأى ابن ابي وغيره (صافی)
[۳]. بما كسبوه من الذنوب التي سهلت له استنزالهم بمثل هذا الذنب الكبير (البلاغی)

کیا تھا۔[۱]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾

’’اے ایمان لانے والو! تم ان کی طرح نہ ہو جنہوں نے کفر اختیار کیا اور اپنے بھائی بندوں کے لئے[۲] جب انہوں نے سفر کیا یا جنگ پر گئے، یہ کہنے لگے کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے، تا کہ اللہ ان کے دل میں اس رنج وحسرت کو رکھ دے اور اللہ زندہ رکھتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو، اسے دیکھنے والا ہے۔‘‘

’’تا کہ اللہ اس رنج وحسرت کو ان کے دلوں میں رکھ دے‘‘ یہاں اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ یہ ’’تا کہ‘‘ مقصد کو نہیں بلکہ نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے جیسے زوجہ فرعون نے جو جناب موسیٰؑ کو تربیت کے لئے رکھ لیا تو قرآن نے کہا ہے: لیکون لھم عدوا وحزنا ’تا کہ یہ ان کے لئے دشمن جان اور سبب رنج وملال ثابت ہوں۔‘ حالاں کہ ان کا مقصد یہ نہ تھا مگر ہوا ایسا ہی، اس لئے یوں کہا گیا۔ اسی طرح یہاں ہے کہ ان کی اس گفتگو کے بعد اب صورت پیدا ہوئی کہ مومنین کو فتح حاصل ہوئی تو ان کے دل مبتلائے رنج وحسرت کہ ہم بھی کیوں نہ گئے تا کہ اس کامیابی میں شریک ہوتے اور مال غنیمت میں ہمیں بھی حصہ ملتا۔[۳]

اس صورت میں فی قلوبھم کی ضمیر ان کے کہنے والوں کی طرف راجع ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ کیوں نہ اس ضمیر کو اخوانہم کی طرف عائد سمجھا جائے یعنی وہ یہ سب اس لئے کہتے ہیں کہ مومنین کی جماعت کے دلوں میں ایک غم وغصہ پیدا ہو جائے کہ واقعی ہم کیوں جہاد کو گئے۔ اس صورت میں یہ لام مقصد ہی کے اظہار کے لئے ہوگا۔

بہر صورت یہ ان کا خیال غلط ہے۔ مرنا ہوتا تو وہ گھر پر بیٹھے ہوئے مرجاتے اور بچنا ہے تو سفر میں یا جہاد میں جا کر بھی بچ جائیں گے۔[۴]

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا

---

[۱] ۔استزلھم الشیطان جعلھم علی الذلة ببعض ما کسبوا من معصیتم النبی ﷺ بترك المرکز والحرص علی الغنیمة وغیر ذلك (صافی)

[۲] لاخوانھم ای فی شان اخوانھم (البلاغی)

[۳] ۔خرجوا ونالوا العز والغنیمة فصار حسرة فی قلوبھم (مجمع البیان) اللام للعاقبة مثلھا فی لیکون لھم عدوا وحزنا (صافی) انجام ان کی ایسی گفتگو کا یہ ہے (عمدۃ البیان)

[۴] ۔ھو المحی والمیت لا الاقامة والسفر فانه تعالیٰ قد یحی المسافر والغازی ویمیت المقیم والقاعد (صافی)

يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

''اور اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاتے یا مرتے [۱] تو اللہ کی طرف کی بخشش اور عنایت اس سے جو وہ لوگ جمع کرتے ہیں زیادہ بہتر تھی اور اگر تم مرو یا مارے جاؤ تو بلا شبہ اللہ ہی کی طرف محشور ہوگے۔''

شہادت میں خسارہ نہیں

اس دار دنیا کی زندگی میں انسان کی بڑی کامیابی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ کوئی بڑی دولت جمع کر جائے مگر یہ جمع کردہ اندوختہ تو بہر حال فانی ہے۔ان کے لئے آخرت کی نعمتیں جو اللہ کی راہ میں مارے جانے کی صورت میں ہیں، وہ بلا شبہ اس سے کہ جو یہ دنیا میں جمع کرتے ہیں بہتر ہیں۔

اگر چہ حقیقت میں اس اندوختہ دنیا میں بمقابلہ دنیا و آخرت کوئی خیر ہے ہی نہیں لیکن چونکہ دنیا والے اس میں بڑی بہتری کا تصور کرتے ہیں،اس لئے اس کے مقابلہ میں آخرت کی نعمتوں کو کہا گیا ہے کہ وہ ان سب سے جس میں تم خیر سمجھتے ہو بہتر ہیں۔[۲]

''اور اگر تم مرتے۔'' یہ ''تم'' کے مخاطب چونکہ مومنین ہیں تو چونکہ وہ واقعی مومن ہیں، اگر وہ فرش خواب پر بھی مریں تو اللہ کی رضامندی کی دولت لئے ہوئے دنیا سے جائیں گے اور اگر قتل ہوں تو یہ قتل بھی راہ خدا میں ہوں گے تو پھر اسی اللہ کی طرف محشور ہونا ہے جس کی راہ میں جان دی ہے تو بلا شبہ وہ اس کا بہتر سے بہتر صلہ عطا کرے گا۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

''تو یہ اللہ کی طرف کی بہت بڑی مہربانی ہے [۳] جس سے آپ ان کے لئے اتنے نرم ہیں اور اگر آپ سخت طبیعت، درشت مزاج ہوتے تو یہ سب آپ کے گرد پیش سے تتر بتر ہو جاتے تو انہیں معاف کر دیا کیجیے اور ان کے لئے دعائے مغفرت بھی کر دیجیے اور معاملات میں ان سے مشورہ بھی لے لیا کیجئے، مگر جب حتمی ارادہ کر لیجیے تو اللہ پر بھروسا کیجیے۔ یقیناً اللہ بھروسا کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

---

[۱] .اومتم فی سبیله(صافی)

[۲] .ان الناس یوثرون الدنیا علی الاخرة حتی انهم یترکون الجهاد فی سبیل الله محبة للاستکبار من الدنیا ز ایثار المقام فیها معلی هذا اجاز ذلك(مجمع البیان)

[۳] .مامعناها تفحتم قدر الرحمته التی لان بها لهم (البلاغی) مانریدة للتوکید(صافی) جاءت مأموکدة للکلام ودخولها باحسن النظم (مجمع البیان)

رسولؐ کی رواداری: عام مسلمانوں کے لئے دعائے مغفرت کا حکم

اصول جمہوریت وشوری کی حقانیت کے لئے بڑے زور وشور سے یہ آیت قرآن پیش کی جاتی ہے کہ خدا کا ارشاد ہے: **وشاورھم فی الامر** جیسے کہ یہ کوئی مستقل ومنفرد آیت ہے جو نظام امت کا اصول بتلانے کے لئے نازل ہوئی ہے۔

یہ استدلال پیش کرنے والے اگر اس سیاق کو بھی دیکھ لیتے ہیں جس کے ماتحت یہ فقرہ آیا ہے جو اب مذکورہ آیت اور اس کے ترجمہ میں سب ہی کے سامنے موجود ہے تو اسے پیش کرتے ہوئے یقیناً انہیں شرم آنا چاہیے۔

وہ تو ناقص الایمان اور عمل کے میدان سے پیچھے ہٹنے والے مسلمانوں کے لئے تازیانے ہیں جو گزشتہ آیات میں برابر لگائے گئے ہیں اور وہی سلسلہ اس آیت میں بھی جاری ہے۔

ارشاد ہو رہا ہے کہ ''یہ اللہ ہی کی طرف کی بڑی رحمت ہے جس سے آپ ان کے ساتھ اتنے نرم ہیں۔'' مطلب یہ ہے کہ ان کا جرم تو اتنا سخت تھا کہ عام آدمی، کوئی امیر فوج یا سردار قوم ان کے ساتھ نرمی برت ہی نہیں سکتا تھا مگر یہ غیر معمولی آپ کا عفو وکرم ہے اور یہ اللہ ہی کی طرف کی قوت برداشت ہے کہ آپ نے ان کے ساتھ ان کی اس عدول حکمی اور بے وفائی کے باوجود نرمی اختیار کی۔[1]

اور اسی ذیل میں ہے کہ یہ آپ کی اتنی خوش اخلاقی اور مروت داری ہی ہے جو یہ پھر بھی آپ کے گرد پیش نظر آتے ہیں اور جو رزم کی سختی نہ اٹھا سکے وہ بزم میں آپ کے پہلو میں بیٹھے رہا کرتے ہیں لیکن اگر کہیں آپ ان سے سختی سے پیش آئیں تو پھر بزم میں بھی سناٹا ہی سناٹا نظر آئے، لیکن چارہ کار کیا ہے، اس لئے کہ انہیں ناقص مسلمانوں کی جم غفیر کی پرورش کر کے ان کے اندر سے اس اقلیت کو پیدا کرنا ہے جو ایمان دار اور مخلص ہو لہٰذا یہ غلطیاں کریں، آپ انہیں معاف کیجئے اگر اس غلطی کا تعلق آپ کی ذات سے ہو اور خدا سے ان کے لئے طلب مغفرت بھی کیجیے اگر اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو[2] اور معاملات میں ان سے مشورہ بھی لے لیا کیجیے[3] مگر اپنے اقدامات کا انحصار ان کے مشورہ پر نہ رکھیے بلکہ جس طرح عمل کو صحیح سمجھ لیجئے، چاہے وہ ان کے مشورہ کے خلاف ہو تو کر گزریے، اللہ پر بھروسا کیجیے۔

یہ کیا کوئی جمہوریت کا اصول ہے؟

شوری بطور تالیف قلب واتمام حجت نہ بلحاظ حقانیت

گزشتہ آیات کے سلسلہ کو سامنے رکھ کر تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے گزشتہ فرار کے موقع پر جوان کے پے درپے دو فقرے نقل ہوئے تھے۔ ایک **یقولون ھل لنا من الامر من شئی** وہ کہتے ہیں آخر معاملات میں کچھ ہمارا بھی اختیار ہے؟'' پھر یہ فقرہ **لو کان لنا من الامر شئی ماقتلنا ھھنا** ''اگر ہمارے ہاتھ میں کچھ اختیار ہوتا تو ہم اس طرح قتل نہ ہوتے۔'' اس سے پتہ چلتا ہے کہ احد میں اسی کو اکثریت نے اپنے فرار کے حجت بنایا کہ ہم سے رائے تو لی ہی نہیں جاتی۔ اگر ہم سے رائے لی جاتی اور اس پر عمل ہوتا تو اس طرح شکست نہ ہوتی۔ اس کے

---

[1]۔ بعد ان کے واپس آنے کے تو نے ان کے ساتھ سختی نہ کی، باوجود ایسے گناہ سخت کرنے کے تجھ کو وہ دشمنوں میں اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ (عمدۃ البیان)

[2]۔ فاعف عنھم فیما یختص بك واستغفر لھم فیما للہ (صافی)

[3]۔ واستمل قلوبھم بالمشاورۃ لا نھم یضیدونہ سدادا وعلماء (البلاغی)

جواب میں پہلے تو خالق نے اصول کا اعلان فرما دیا جو اس غلط جمہوریت کے تصور کا خاتمہ کرنے والا ہے کہ: ان الامر کله لله ''اختیار جو کچھ ہے وہ اللہ کو ہے۔''تم کیا چیز ہو؟''...... پھر ان کی اس غلط اندیشی کو کہ اگر ہماری رائے پر عمل ہوتا تو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا'' دور کیا یہ کہہ کر: ''لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیھم القتل الی مضاجعھم ''اگر تم گھروں کے اندر بھی ہوتے تو جنہیں قتل ہونا تھا، وہ مقتل میں پہنچ جاتے۔''

اس کے بعد ان کی انہی باتوں کے مقابلہ میں کہ: ھل لنا من الامر من شئی اور لو کان لنا من الامر شئی ...... یہ کہا جا رہا ہے کہ وشاورھم فی الامر یعنی یہ باتیں تو خیر، ان کی غلط ہیں اور یہ کہ کردار ان کا بہر صورت ایک گناہ جس پر ان تاویلوں اور توجیہوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مگر اے رسولؐ! آپ آئندہ سے ''دروغ گو را تا درخانہ باید رسانید'' کے اصول پر اتمام حجت کے لئے ان سے رائے بھی لے لیا کیجیے اور جہاں تک کہ اس پر عمل کرنے میں کوئی بڑا نقصان نہ ہوتا ہو، اس پر عمل بھی کر لیا کیجیے تا کہ ان کی یہ حجت بھی ختم ہو جائے۔ پھر بھی یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیے کہ عمل کا انحصار ان کی رائے پر ہے بلکہ اصل دارومدار خدا کے حکم پر رہے گا اور اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ خواہ جماعت ساتھ دے یا نہ دے۔

اِنۡ يَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَـكُمۡ ۚ وَاِنۡ يَّخۡذُلۡكُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ‏ ﴿۱۶۰﴾

''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور اگر وہ تمہاری مدد نہ کرے تو پھر وہ کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرے اور صرف خدا پر بھروسا کرنا چاہیے ایمان لانے والوں کو۔''

یہ بھی ان کی اسی بات کی رد کا تتمہ ہے کہ اگر ہماری رائے پر عمل ہوتا تو شکست نہ ہوتی، ہماری بات پر عمل ہوتا تو ہمیں یوں قتل ہونا نہ پڑتا۔ اس کی رد میں اب یہ کہا جا رہا ہے کہ فتح وظفر اصل اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ بغیر اس کی مدد کے کون ہے جو فتح وظفر حاصل کر سکے۔

اس سے بھی ظاہر ہے کہ درمیان میں جو یہ تھا کہ ان کی رائے پر عمل کر لیا کیجیے۔ یہ صرف ان کی خاطرداری اور ان پر اتمام حجت کے لئے تھا۔ نہ یہ کہ ان کی اس بات کو تسلیم کر لیا گیا کہ انہیں معاملات میں مداخلت کا حق ہے اور یہ کہ ان کی رائے پر عمل کسی صحیح نتیجہ تک پہنچانے کا ضامن ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِىٍّ اَنۡ يَّغُلَّ ؕ وَمَنۡ يَّغۡلُلۡ يَاۡتِ بِمَا غَلَّ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ‏ ﴿۱۶۱﴾

''اور کسی پیغمبر سے یہ نہیں ہوسکتا[۱] کہ وہ مال غنیمت میں بد دیانتی کرے[۲] اور جو بد دیانتی کرے گا، اسے وہ چیز جس کے بارے میں بد دیانتی کی ہے، روز قیامت لانا ہوگی، پھر ہر ایک کو جو اس نے کیا ہے، اس کا پورا پورا بدلا دیا

---

[۱]۔ای لا یجتمع النبوۃ والخیانۃ (مجمع البیان)

[۲]۔فان النبوۃ تنافی الخیانۃ (صافی) الغلول ھو الخیانۃ فی الغنیمۃ (جلالین)

جائے گا اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔''

مسلمانوں کی رسولؐ سے بدگمانی اور اس پر تنبیہ

شان نزول کے بارے میں جو روایتیں سنی اور شیعہ طرق سے آئی ہیں کہ روز بدر کے مال غنیمت میں سے ایک سرخ رنگ کی چادر غائب ہوگئی تو بعض آدمیوں نے کہا کہ وہ خود رسول اللہؐ کے اپنے لئے الگ کرلی ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یا یہ کہ کسی نے اصحاب میں سے خواہش کی کہ مجھے مال غنیمت میں دوسروں سے زیادہ حصہ ملے، اس پر یہ آیت اتری۔

ان روایات کے روای ضعیف اور مجہول سہی مگر یہ خود الفاظ آیت سے ظاہر ہے کہ یہ کسی واقعہ سے متعلق ہے اور وہ واقعہ کچھ اسی قسم کا ہوسکتا ہے۔

الفاظ آیت شان نزول کے پہلے واقعہ سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ پیغمبر خداؐ کے متعلق اس قسم کا خیال ظاہر کرنے والے کفار ومشرکین نہیں ہوسکتے۔ یہ بجائے خود نوعیت الزام سے بھی ظاہر ہے اور قرآن مجید کے جواب سے بھی اس لئے کہ اس الزام کے لگانے والے جماعت کفار میں سے ہوتے ہیں تو اس جواب کا کوئی محل نہ ہوتا کہ بھلا جو نبی ہو، وہ اس طرح کا کام کیا کرے گا! اس جواب سے ظاہر ہے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو نبی ہونے کا اقرار کرچکے ہیں یعنی یہ الزام لگانے والے اس وقت کے معزز مسلمانوں ہی میں ہوں گے جو بلا استثناء صحابہ کی لفظ سے یاد کیے جاتے ہیں اور ان کا عالم یہ ہے کہ اس ذات پر جسے کفار ومشرکین تک امین کی لفظ سے یاد کیا گئے، وہ معاذ اللہ خیانت کا الزام لگا رہے ہیں جس کے جواب میں قرآن انہیں ان کے اقرار رسالت کو یاد دلا رہا ہے کہ تم نے جب انہیں نبی مان لیا ہے تو پھر اس طرح کا توہم کیوں کرتے ہو؟ جو نبی ہوگا، وہ تو کبھی اس طرح کی حرکت نہیں کرسکتا۔

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾

''تو کیا جو اللہ کی خوشنودی کا درپے رہے، وہ اس کے مثل ہے کہ جو اللہ کی ناراضگی میں گرفتار ہوا اور جس کا ٹھکانا دوزخ ہو وہ کیا بری منزل ہے۔''

ہر آیت میں شان نزول کی تشنگی محسوس ہوتی ہے کہ یہ آخر کہنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی تھی؟ مگر جب کہ زمانہ کی دست برد نے ہمیں اس علم سے محروم کردیا ہے تو بس جو آیت کے الفاظ اور جو ان سے نتیجہ برآمد ہوتا ہے، اسی کو سمجھنے اور کہنے کا ہمیں حق رہ گیا۔ اس کے آگے کچھ نہیں۔ یہ آیت اور ایسی ہی بہت سی آیتیں ہیں جو اسلاف کے ساتھ حسن ظن کے اس تصور کو کہ ان کے بارے میں نقد وبحث سے بالکل کام نہ لو، بس یہ سمجھ لو کہ وہ بڑے بزرگ لوگ تھے، اس کے آگے ان کے افعال واعمال پر نظر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، غلط قرار دیتی ہیں۔

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

''ان کے اللہ کے یہاں درجے ہیں[1] اور اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، اس کا دیکھنے والا ہے۔''

صحابہ کے درمیان اچھے اور برے میں امتیاز کی ضرورت

ان دونوں آیتوں کو ملایئے تو صاف منشایہ معلوم ہوتا ہے کہ اچھے برے کا فرق کرو اور اتنا ہی نہیں بلکہ اچھوں میں بھی بہت سے درجے ہیں، ان میں بھی سمجھنے کی کوشش کرو کہ کون بلندتر درجہ رکھتا اور اچھے کے مقابلہ میں برے اور افضل کے مقابلہ میں غیر افضل کو بھی یکساں درجہ پر نہ رکھو[2]۔ چہ جائیکہ دوسرے کو مقدم قرار دینا اور اسے اپنا سربراہ بنالینا اور جو افضل ہو، اسے نذر تغافل کر دینا، یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ اسی بنا پر کافی اور تفسیر عیاشی کی ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ہے کہ:

انّ الّذین اتبعوا رضوان اللہ ھم الائمۃ علیہم السلام

مکمل طور پر خوشنودی الٰہی کے درپے رہنے والے آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

''اللہ نے احسان کیا ہے ایمان لانے والوں پر جب کہ اس نے ان میں ایک پیغمبر بھیجا انہی میں سے جو ان کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت کرتا، ان کی اصلاح کرتا[3] اور انہیں کتاب وحکمت[4] کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ وہ اس کے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔''

جس طرح قرآن مجید کو ھدی للمتقین ''پرہیزگاروں کے لئے ہدایت اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ اس کی ہدایت سے فائدہ اٹھانے والے یہی ہیں۔ ورنہ وہ نازل ہوا ہے سب کی ہدایت کے لئے جیسا کہ دوسری جگہ اسے ''ھدی للناس'' کہا گیا ہے، اسی طرح یہاں اس احسان کے ذکر میں مومنین کا نام لیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اثر اس احسان کا انہی میں ظاہر ہوا ہے[5] ورنہ مقصود تو رسول کی بعثت سے سب ہی کو اس طرح پر لانا تھا مگر جنہوں نے فیض حاصل ہی نہیں کیا، انہیں اس احسان کا احساس ہی نہیں ہوسکتا تو ان کا ذکر ہی کیوں کیا جائے۔

اور بھیجنے کے ذکر میں انہیں مومن کہنا اس لحاظ سے ہے کہ وہ اب پیغمبر کی دعوت پر لبیک کہہ کے مومن ہوں گے جیسے:

---

[1]۔ای ھم ذودرجات (مجمع لبیان)

[2]۔ھم صلوات اللہ علیھم فی ھذا الایہ اظھر الافراد واعلاھم درجۃ (البلاغی)

[3]۔یطھرھم من سوء العقائد والاخلاق والاعمال (صافی)

[4]۔القران والسنۃ (صافی)

[5]۔لاھتدائھم بہ وانتفاعھم ببیانہ ونظیر ذلک ماتقدم من قولہ ھدی للمتقین (مجمع البیان)

من قتل قتيلا فله سلبه: جو کسی مقتول کو قتل کرے اس کا لباس وغیرہ اس کا حق ہے۔
ورنہ ظاہر ہے کہ جب رسول گو بھیجا گیا ہے، اس وقت تک اس معنی میں مومن اور کافر کی تفریق ہی موجود نہ تھی۔
چونکہ دوسری جگہ قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے کہ مسلمانوں میں کچھ ایسا تصور کرتے تھے کہ ہم نے جو ایمان اختیار کیا، یہ کوئی ہمارا احسان ہے، قرآن نے انہیں متنبہ کیا کہ:

لَا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ.

''تم اپنے اسلام اختیار کرنے کا مجھ پر احسان نہ رکھو، بلکہ اللہ کو تم پر احسان جتانے کا حق ہے کہ اس نے ایمان کی طرف تمہاری ہدایت کی'' اس لئے بھی یہاں پیغمبرؐ کی بعثت کو اللہ کی طرف کے احسان کی صورت میں مومنین کے مقابلہ میں پیش کیا جارہا ہے۔
بے شک یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم کلام کی کتابوں میں لکھا جاتا ہے کہ انبیاء کا بھیجنا خداوند عالم پر واجب ہے۔ پھر جب یہ واجب ہے اور خداوند عالم انبیاء کو بھیج کر اس امر واجب کی تکمیل فرماتا ہے تو احسان کیا ہوا؟
مگر یہ سوال لفظ واجب کے اصل معنی پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے، خدا پر وجوب کے معنی یہ تھوڑی ہی ہیں کہ کسی اور حاکم نے اس پر یہ فرض قرار دیا ہے یا معاذ اللہ کسی کا اس پر دباؤ ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ خالق عالم کے شایان شان ایسا ہی ہے لہٰذا بالکل درست ہے کہ کوئی فعل بندوں پر ایک لطف وکرم اور احسان ہو اور وہ لطف وکرم اور احسان ہی چونکہ اس کی ربوبیت کی شان کے لائق ہے، اس لئے اسے واجب بھی کہا جائے۔ ان دونوں باتوں میں باہم کوئی منافات نہیں ہے۔
مولانا عمار علی صاحب یہاں لکھتے ہیں:
''جیسے کہ آدمی پر زکوۃ واجب ہوتی ہے اور جب کسی دوسرے کو دیتا ہے تو اس پر اس کا احسان ہوتا ہے، ایسے خدائے تعالی پر پیغمبر کا بھیجنا واجب ہے اور جس وقت اس کو بھیجا اور مومنین نے اس سے فائدہ حاصل کیا تو خدائے تعالیٰ کا ان پر احسان ہو۔'' (عمدۃ البیان)
مگر یہ وجوب دوسری نوعیت کا ہے۔ اس لئے یہ مثال اس محل پر محل نظر ہے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٦٥﴾

''کیا جب بھی تم کو کوئی ایسا گزند پہونچ جائے جس سے دونا تم پہنچا چکے ہو، تو تم کہو گے کہ یہ کہاں سے ہوا؟ کہہ دیجیے کہ وہ خود تمہارے ہاتھوں ہوا۔ یقیناً اللہ ہر بات پر قادر ہے۔''

احد کی شکست اپنے ہاتھوں

مسلمان بدر میں دشمنوں کو شکست دے چکے اور احد میں بھی شروع میں انہوں نے شکست دی پھر جب رسولؐ کی عدول حکمی کی اور لڑائی بگڑی تو انہیں شکست ہوئی اور اب بہت سے مسلمان قتل ہوئے پھر بھی ان کے مقتولین کی تعداد ان مشرکین کی نصف تھی جو بدر و احد میں ان کے

ہاتھوں قتل یا اسیر ہو چکے تھے [1] مگر اپنے مقتولین دیکھ کر بہت سے مسلمان چیخ اٹھے اور گویا حقانیت اسلام میں شک کرنے لگے کہ جب ہم سچے دین پر ہیں تو ہمیں ہر معرکہ میں بس فتح ہی پانا چاہیے۔ [2]

شکوہ اور جواب شکوہ

اس جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ شکست تمہیں تمہارے ہاتھوں نصیب ہوئی ہے۔ نہ تم عدول حکمی کرتے اور نہ شکست اٹھاتے۔
اس کے بعد بھی اگر کوئی مسلمان کبھی "شکوہ" کرے کہ یہ کیا کہ ہم دین حق کی خدمت گزار اور پھر "برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر"

تو "جواب شکوہ" کے لئے قرآن کا یہ مختصر فقرہ کافی ہوگا کہ: هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ "یہ خود تمہارے ہی ہاتھوں ہے" تم خود اپنے گریبان میں منہ ڈالو اور دیکھو کہ تمہارے کیا کرتوت ہیں۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعْلَمَ
الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ
نَعْلَمُ قِتَالًا لَّااتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ
يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ اَلَّذِيْنَ
قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ
الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

"اور جو کچھ اس دن کہ جب دونوں جماعتوں کی مڈبھیڑ ہوئی [3] تمہیں مصیبت آئی، وہ اللہ کی مشیت کے مطابق تھی [4] اور اس لئے کہ وہ مومنین کو جانے اور انہیں بھی جان لے جنہوں نے نفاق سے کام لیا اور جن سے کہا گیا کہ آؤ! اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دفعیہ کرو تو انہوں نے کہا" ہم جنگ جانتے تو تمہارے پیچھے آتے؟ وہ اس دن

---

[1]. العیاشی عن الصادقؑ کان المسلمون قد اصابوا ببدر ماۃ واربعین رجلا قتلوا سبعین رجلا واسروا سبعین فلما کان یوم احد اصیب من المسلمین سبعون رجلا فاعتموا الذالك فنزلت (صافی)
[2]. من ای وجه اصابنا هذا ونحن مسلمون وفینا رسول اللّٰہ وینزل علیه الوحی (مجمع البیان)
[3]. یعنی یوم احد (صافی)
[4]. کائن بقضائه بتخلیه الکفار (صافی) یعنی ساتھ علم خدا کے تھا (عمدۃ البیان)

ایمان سے زیادہ کفر کے نزدیک ہیں۔ اپنے منہ سے کہتے ہیں وہ جوان کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ جو کچھ یہ چھپاتے ہیں، اسے خوب جانتا ہے وہ کہ جو خود تو بیٹھے رہے اور اپنے دوسرے بھائیوں کے لئے [۱] کہا کہ اگر یہ ہمارا کہنا مانتے تو مارے نہ جاتے۔ کہیے کہ اچھا، اب تم اپنے سے موت کو ہٹا نا اگر تم سچے ہو۔"

خیرالقرون کے مسلمان اور کفر کے نزدیک

"اس لئے کہ اللہ مومنین کو جان لے اور جنہوں نے نفاق سے کام لیا، انہیں بھی جان لے" اس طرح کی آیتیں پہلے بھی آ چکی ہیں اور لکھا جا چکا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ امتیاز وقوع میں آ جائے کیوں کہ علم تو نام ہی اس کا ہے کہ جو مطابق واقعہ ہو [۲] لہٰذا اگر کوئی شے وقوع میں آنے والی ہوہی نہیں تو وہ علم میں کیوں ہوگی؟

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باعتبار زمانہ اللہ کو علم اس وقت ہوگا جب کہ واقعہ عالم خارج میں ظاہر ہو جائے علم تو ازل سے ہے مگر ہے وہ اسی بنا پر کہ یہ شے اپنے وقت پر وقوع میں آئے گی۔

منافقین کا کردار اور ان کے حیلے حوالے

اس کے بعد منافقین کے کردار کی نشان دہی کی گئی ہے جس میں ذرا تفصیل سے کام لیا گیا۔ یہ فرائض کے ادا کرنے میں جھوٹ موٹ کے حلیوں سے کام لیتے ہیں، ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرو" "یا دشمنوں کو دفع کرو" یعنی اللہ کی راہ میں جہاد کا جذبہ نہیں بھی ہے تو دشمنوں نے جب حملہ کر ہی دیا ہے کہ تو اپنی قوم اپنی املاک اور اپنے وطن سے ان کی مدافعت ہی کی نیت سے آگے بڑھو [۳] تو وہ کہتے ہیں کہ ہم جنگ جانتے یعنی واقف ہوتے کہ جنگ ہونے والی ہے تو اس کے لئے تیار ہوتے اور تمہارے ساتھ چلتے مگر اب جب ہم پہلے سے اس سے واقف ہی نہ تھے تو اب ہم کیوں کر چل سکتے ہیں؟

دوسرے معنی اس جملہ کے یہ کہے گئے ہیں کہ:۔

"اگر جانتے ہم لڑنا اور لڑائی کے فن ہم کو معلوم ہوتے" (عمدۃ البیان)

مگر میرے خیال میں یہ معنی "لو نعرف قتالا" کے ہوتے ہیں۔ "لو نعلم قتالا" سے پہلا ہی مفہوم ذہن میں زیادہ آتا ہے۔

ایک اور مطلب اس فقرہ کا یہ کہا گیا ہے کہ انہوں نے کہا "ہم اگر اسے جنگ سمجھیں تو تمہارے پیچھے آئیں" مطلب یہ ہے کہ جو تم کر رہے ہو، اسے ہم جنگ سمجھتے ہی نہیں، کیوں کہ جنگ کے لئے طاقتوں کے درمیان تناسب کی ضرورت ہے بلکہ اسے ہم جان دینا سمجھتے ہیں لہٰذا ہم تمہارے ساتھ اس مہلکہ میں پڑنے سے مجبور ہیں۔ [۴]

---

[۱]۔ لا جلھم و فیھم یرید من قتل منھم یوم احد (صافی)

[۲]۔ اجری علی المعلوم لفظ العلم مجاز ای لیظھر المعلوم من المومن و المنافق (مجمع البیان) لیتمیز الفریقان بظھور ایمان ھولاء (صافی)

[۳]۔ ادفعوا عن قومکم و بلادکم و حفائظکم ان لم تکن لکم رغبۃ فی الجھاد فی سبیل اللہ (البلاغی)

[۴]۔ قالو ھذا غلاوا سھنوا ء لزعمھم ان ما یفعلونہ لیس بقتال بل القاء بالنفس الی التھلکۃ (صافی)

بعد کافقرہ کہ انہوں نے بعد میں اپنے دوسرے بھائیوں کے لئے جوشہید ہوئے کہا کہ اگر ہمارا یہ کہنا مانتے تو مارے نہ جاتے، اس مفہوم کے بعد خالق کا یہ قول کہ:۔

هُمۡ لِلۡكُفۡرِ يَوۡمَئِذٍ اَقۡرَبُ مِنۡهُمۡ لِلۡاِيۡمَانِ.

وہ اس دن ایمان سے زیادہ کفر کے نزدیک ہیں۔

یہ بھی اس مفہوم کے ساتھ زیادہ مرتبط معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ ان کا یہ کہنا کہ ''ہم پہلے سے واقف نہ تھے کہ جنگ ہوگی'' یا یہ کہ ''ہم فن جنگ سے واقف نہیں ہیں'' اس میں تو سچ اور جھوٹ کا سوال پیدا ہوتا ہے براہ راست کفر اور ایمان کا نہیں لیکن یہ کہ ''ہم اسے جنگ نہیں سمجھتے یہ تو صراحتہً جان دینا ہے ہم اس میں کیوں کر شریک ہوں۔'' اس میں ایک طرف اللہ کو بھولنا ہے کہ اس کی نصرت و تائید کوئی چیز ہی نہیں، جو کچھ ہیں، وہ بس مادی اسباب ہیں، پھر یہ کہ حکم جہاد جو اس کی طرف سے ہو رہا ہے، اسے غلط قرار دینا ہے۔اس لئے یہ بالکل ایمان اور کفر کا سوال بن جاتا ہے اور وہ اپنے اس قول سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایمان سے دور اور کفر سے قریب ہیں اور اس لئے ارشاد ہوا کہ ''یہ اپنے منہ سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں'' یعنی ایمان ان کا بس زبانی ہے، دل سے ایمان لائے ہوتے تو یہ اس طرح کی بات نہ کہتے۔یہی وہ مفہوم ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس حدیث سے بھی ظاہر ہوتا ہے جو مصباح الشریعۃ میں ہے کہ حضرت نے اپنے ایک کلام کے ذیل میں فرمایا:

من ضعف يقينه تعلّق بالاسباب ورخّس لنفسه بذٰلك واتّبع العادات واقاويل الناس بغير حقيقة والسّعي في امور الدّنيا و جمعها و امساكها يقرّ باللّسان انّه لامانع ولامعطي الّا الله وان العبد لا يصيب الّا ما رزق و قسّم له و الجهد لايزيد في الرزق وينكر ذٰلك بفعله وقبله قال الله تعالى: يقولون بأفواههم ماليس في قلوبهم.

جس کا یقین کمزور ہے، وہ اسباب ظاہری سے وابستہ ہوتا ہے اور اس کی بنا پر فرائض سے جی چراتا ہے اور عام طور پر جو ذریعہ ہوا کرتے ہیں انہی پر تمام دنیا کے کاموں میں دارومدار رکھتا ہے حالانکہ زبان سے یہ اقرار کرتا ہے کہ کوئی روکنے والا اور دینے والا سوا اللہ کے نہیں ہے اور یہ کہ بندہ کو بس وہی ملتا ہے جو اس کا رزق مقسوم ہے اور کوشش سے رزق میں اضافہ نہیں ہوتا مگر اپنے عمل اور دل سے اس کا منکر ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے کہ یہ اپنے منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہیں۔

امام علیہ السلام نے جس محل پر اس آیت سے استشہاد فرمایا ہے، وہ زیر بحث آیت کی صورت محال سے مطابق ہے کہ وہ لوگ اسباب دنیا پر پورا دارومدار قرار دے کر ہی یہ کہہ رہے تھے کہ یہ تو صراحتہً جان دینا ہے۔اگر وہ اللہ کی قدرت و قوت اور نیز علم و حکمت کے صرف زبانی نہیں بلکہ دل سے قائل ہوتے تو وہ اس کی طرف سے حکم جہاد ہونے کے بعد ایسا نہ کہتے۔

پھر وہ اپنے لئے عذر پیش کرنے کے موقع پر ہی یہ نہیں کہتے کہ اس فرض کے دور کرنے سے کوتاہی پر یہ منافق نازاں بھی رہتے ہیں اور ان لوگوں کو جنہوں نے خلوص کے ساتھ ادائے فرائض میں حصہ لیا، بیوقوف سمجھتے ہیں اور راہ خدا میں جان دینے والوں کو مورد الزام قرار دے کر کہتے ہیں کہ انہوں نے ایسا ہی کیا ہوتا جیسا ہم نے کیا تو ان کی جان کیوں جاتی ؟!

قرآن نے اس کے جواب میں یہ کہا ہے کہ تم جنگ سے جان بچا کر گھر میں بیٹھے رہے تو ہم جب جانیں کہ جب تم اب موت سے اپنے کو

محفوظ کرلو۔

مگر ایسا نہیں ہے، جب موت کو آنا ہوگا تو تم سات پردوں میں بھی بیٹھو گے تو موت آ کر رہے گی۔

پھر جب عارِفرار کے بعد بھی کبھی نہ کبھی مرنا ہی ہے تو اگر یہ موت ایک فرض کی ادائیگی کی راہ میں، ایک بلند مقصد کی خاطر اور اپنے ملک کی رضا کے لئے آئے، جہاں جان جائے تو اس کی خاطر جائے جو حقیقی اس جان کا مالک ہے۔ جہاں جان دینے والا یہ کہہ سکے کہ:۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تو یہ کون سا ایسا خسارہ ہے جس سے بچنے پر تمہیں خوشی ہو اور جس پر ان لوگوں کو جنہوں نے جانیں دی ہیں تم موردِ ملامت قرار دو۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾

''اور انہیں جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں ہرگز مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے یہاں رزق پاتے ہیں، خوش خوش اس پر جو اللہ نے اپنے فضل وکرم سے انہیں دیا اور اپنے پسماندگان کے حال سے جو ان کے پاس نہیں پہنچے ہیں، وہ خوش ہوتے ہیں کہ انہیں کوئی خوف نہیں ہے اور نہ کوئی انہیں افسوس ہونے والا ہے۔ اللہ کی بڑی عنایت اور کرم سے خوش ہوتے ہیں اور اس سے کہ اللہ ایمان والوں کے ثواب کو برباد نہیں کرتا۔''

حیاتِ شہدائے

بظاہر یہ گزشتہ آیات کے مضمون ہی کا تتمہ ہے کہ وہ منافقین راہ خدا میں جان دینے والوں کے حال پر گویا تاسف کرتے ہیں کہ افسوس انہوں نے ہمارا کہنا نہیں مانا ورنہ ان کی جان کیوں جاتی مگر یہ منافقین میدان جہاد سے فرار کرنے کے بعد کیا مرنے سے بچ جائیں گے، پھر انہیں جو موت آئے گی، وہ تو حقیقت میں موت ہی ہوگی اور یہ جان دینے والے جو راہ خدا میں دنیا سے گئے ہیں، انہیں حقیقت میں مردہ سمجھنا ہی غلط ہے بلکہ یہ تو زندہ ہیں۔

اب فقط ''زندہ'' کہہ کر قرآن خاموش ہوجاتا تو یہ سمجھا جاسکتا کہ یہ ''زندہ'' کہنا نتائج کے لحاظ سے مجازی طور پر ہے مثلاً اس اعتبار سے کہ ''نام نکو گزاشت'' یا اس لحاظ سے کہ ''دلش زندہ شد بعشق'' اور ''ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما'' مگر قرآن نے بات کو ''زندہ'' کہہ دینے پر ختم نہیں

کیا ہے بلکہ کیفیات زندگی کو تفصیل سے بیان کیا ہے، جس سے ثابت ہے کہ وہ حقیقت میں ایک خاص طرح کی زندگی ہے جو "بقائے روح" یا اس "حیات برزخی" کے علاوہ ہے جو قائلین معاد کے نزدیک سب ہی کے لئے ثابت ہے۔

یہ اور بات ہے کہ ہم اس زندگی کی پوری نوعیت سمجھ نہ سکیں جبکہ ہم خود اس زندگی سے محروم ہیں۔

سونے والے نے خواب کے عالم میں بیداری کو کب سمجھا ہے جو ہم اس خواب بیداری میں اس حیات کی نوعیت سمجھ سکیں جو راہ خدا میں آنکھ بند ہو کر حاصل ہوگی۔

اپنے پسماندگان کے حالات سے جو شہدائے راہ خدا کو مسرت ہوتی ہے، اس ذیل میں یہ فقرہ کہ **الا خوف علیھم ولاھم یحزنون** "ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ انہیں افسوس ہونے والا ہے"...... اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں ان کے دنیا کے حالات سے کوئی سروکار نہیں ہے کیوں کہ دنیا میں تو اہل ایمان کو خوف بھی ہوتا ہے اور اکثر رنج بھی اٹھانا پڑتے ہیں بلکہ انہیں ان کے حسن انجام کا جو علم ہوتا ہے کہ یہ پسماندگان ایمان اور عمل میں پختہ ہیں، جس کی وجہ سے ان کی آخرت پر امن ہے، اس پر انہیں مسرت حاصل ہوتی ہے۔[1]

ملا محسن فیض نے اس آیت کے ذیل میں ایک عجب توسعہ کیا ہے جس کے بعد اس کا تعلق صرف شہدائے جنگ سے رہتا ہی نہیں بلکہ ہر "مومن نیکوکار" کو وہ شامل ہوجاتی ہے، وہ یہ ہے کہ:

تشتمل کل من قتل فی سبیل من سبیل اللہ عزوجل سواء کان قتلہ بالجھاد الاصغر و بذل النفس طلبالرضا اللہ اوبالجھاد الاکبر و کسر النفس وقمع الھدی بالریاضۃ (صافی)

وہ حاوی ہے ہر اس شخص پر جو اللہ کے راستوں میں سے کسی میں بھی قتل ہو، خواہ وہ جہاد اصغر میں اور جان دینے کے ساتھ رضائے الٰہی کی خاطر قتل ہو یا جہاد اکبر اور نفس کشی اور ریاضت کے ساتھ اپنی خواہش نفس کو مارنے کی صورت سے قتل ہو۔

مگر میرے خیال میں ان کا یہ تصور ان کے متصوفانہ رجحان کا نتیجہ ہے جو ہم "اہل ظاہر" کے یہاں درخور اعتناء نہیں ہے۔

وہ اس پر خوش ہوتے ہیں کہ "اللہ ایمان والوں کے ثواب کو برباد نہیں کرتا"...... یہ جانتے تو وہ دنیا ہی میں تھے، اس لئے کہ عدل الٰہی ایمان رکھتے تھے مگر "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" اب اسے آنکھ سے بھی دیکھ لیا۔[2]

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿١٧٢﴾

"وہ جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی[3] اللہ اور رسولؐ کی آواز پر لبیک کہی، ان میں سے جنہوں نے حسن عمل سے کام لیا اور بچتے رہے، ان کے لئے بڑا ثواب ہے۔"

---

[1] ای یستبشر ان سعادتھم بصلاحھم (البلاغی)

[2] لانھم یعلمونہ بعد الموت ضرورۃ وانما یعلم ذلک فی دار التکلیف استدلالا (مجمع البیان)

[3] ای فالھم الجراح یوم احد (مجمع البیان) پیچھے اس سے کہ پہنچے تھے ان کے زخم (عمدۃ البیان)

غزوہ حمراء الاسد کے مجاہدین کی توصیف

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ''حمراء الاسد'' کے مجاہدین کے بارے میں ہے جس کا واقعہ یہ تھا کہ جب جنگ احد کے بعد رسالت مآبؐ واپس ہوئے تو مشرکین کو چونکہ اس شکست کی وجہ سے مسلمانوں کی کمزوری کا احساس اور اپنی قوت کا ذرا غرّہ ہو گیا تو مقام رجاء میں ٹھہر کر انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ وہ پھر پلٹ کر دوبارہ مدینہ پر ہلہ کر دیں۔ خالق کو معلوم تھا کہ یہ ان کا حملہ کا ارادہ تو صرف اس تصور میں ہے کہ مسلمانوں میں نفسیاتی طور پر اخلاقی کمزوری پیدا ہو گئی ہے لہٰذا اگر اس وقت یہ ثابت کر دیا جائے کہ مسلمان ہمت نہیں ہارے ہیں تو بس اتنے ہی سے کفار کے حوصلے پست ہو جائیں گے لہٰذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ جن میں سے اکثر زخمی تھے مقام حمراء الاسد میں ٹھہرے ہوئے تھے، انہی مسلمانوں کو جو زخمی حالت تھے حکم دیا کہ چلو، چل کر کفار کا تعاقب کریں۔[1]

حالانکہ بھاگنے والوں کا تعاقب کرنا یا خود سے حملہ کرنا آپ کے اصول میں داخل نہ تھا مگر یہ صرف ایک نفسیاتی مظاہرہ تھا ان کی ہمت کے پست نہ ہونے کا کہ ہم میں ابھی مدافعت کیا، پہل کرنے کی جرأت بھی موجود ہے اور یہ کہ زخمیوں کو حکم ہوا، جو صحیح وسالم تھے، انہیں نہیں اور جہاں تک میں محسوس کرتا ہوں، یہ صحیح وسالم افراد کے ضمیر پر تازیانہ تھا، اس لئے کہ احد کی نازک صورت حال کے پیش نظر میدان جنگ میں رہ گئے، یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی گزند سے محفوظ رہے لہٰذا یہ جو بال بال محفوظ تھے، یہ وہی ہوسکتے ہیں جنہوں نے میدان چھوڑنے کے بعد پھر مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ رسولؐ پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ تو بعد میں جب رسولؐ مظفر ومنصور واپس جا رہے تھے تو واپس آ کر مراجعت میں اس جمعیت کے ساتھ شریک ہو گئے تا کہ مدینہ جب واپس جائیں تو فاتحین کے ساتھ ہماری صورت بھی نظر آ رہی ہو، تو خالق کی طرف سے ان کے خلاف اس کا مظاہرہ ہوا کہ ان سے رسولؐ کی امید قطع ہو چکی ہے اور اب انہیں اس جہاد میں کوئی زحمت دینا منظور نہیں ہے لہٰذا جو زخمی تھے بس انہیں کو چلنے کا حکم ہوا اور یہ اب اس جماعت کی اطاعت گزاری تھی کہ باوجود زخمی ہونے کے پھر چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔

اسی کا اس آیت میں ذکر ہو رہا ہے، ان کی مدح ہو رہی ہے اور انہیں بشارت ثواب دی جا رہی ہے مگر اس میں ایک خاص پہلو دیکھنے کا ہے اور وہ یہ کہ جمہور اہل اسلام نے ایک حدیث بطور مسلمات قرار دے لی ہے کہ وہ صحابہ کرام جو بدر میں شریک ہوئے، ان سے کہہ دیا گیا ہے کہ اب تم چاہے جو بھی کرو، یہ بدر کی شرکت تمہارے حسن خاتمہ کی ضامن ہے۔ یہ حدیث ان کے آئندہ کے افعال پر نقد وجرح کی زبان بندی کے لئے دلیل قاطع سمجھ لی گئی ہے مگر قرآن کو دیکھیے، کیا کہہ رہا ہے؟

وہ ان کے مقابلہ میں جنہوں نے احد میں کوتاہی کی، ان مومنین کا تذکرہ کرتے ہوئے جنہوں نے اللہ اور رسولؐ کی آواز پر لبیک کہی، پھر بھی حسن انجام کی ضمانت نہیں کرتا[2] بلکہ کہتا ہے کہ آئندہ زندگی کو بھی دیکھنا ہے کہ حسن عمل اور منا ہی سے پرہیز قائم رہا یا نہیں۔ اگر آخر تک زندگی ٹھیک راستے پر رہی ہے، تب بے شک اجر عظیم کا استحقاق ہے۔ اس لئے افعال واعمال پر نقد وتبصرہ سے نہ اہل بدر کو مستثنیٰ سمجھا اور نہ اہل احد کو ہر ایک کی پوری زندگی کو سامنے رکھ کر نتیجہ پر حکم لگاؤ۔ یا پھر ایسی ہستیاں ہوں جن کی عصمت پر دلیل قطعی قائم ہو گئی ہے جس کے بعد خطا وگناہ کا سوال ہی پیدا

---

[1] ـ القمی ان النبیﷺ لما دخل المدینة من وقعة احد نزل علیه جبرئیل فقال یا محمد صلی الله علیه واله وسلم ان الله یامرك ان تخرج فی اثر القوم ولا یخرج معك الا من به جراحة (صافی)

[2] ـ لم یجر شکر الاستجابة والوعد بالاجر لجمیعهم (البلاغی)

نہیں ہوتا۔

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾

''وہ کہ جن سے لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے مقابلہ کے لئے بڑا لشکر جمع کیا ہے، ان سے ڈرو تو اس سے ان کے ایمان میں اور اضافہ ہوا اور انہوں نے کہا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور بڑا اچھا کارساز۔ تو وہ پھرے اللہ کی عنایت اور فضل (کیساتھ) اس طرح کہ انہیں کوئی برائی چھو بھی نہیں گئی اور وہ اللہ کی خوشنودی کے درپے رہے اور اللہ بڑے فضل وکرم والا ہے۔''

ایک روایت کے مطابق یہ تتمہ ہے اسی سابق یعنی حمراء الاسد جانے والے لوگوں کا کہ جب ابوسفیان کو رسولؐ کے بڑھنے کا اپنی طرف علم ہوا تو اس نے اس جماعت کی اخلاقی قوت کے آزمانے کو ایک شخص[1] بھیجا کہ وہ انہیں دشمنوں کی کثرت سے مرعوب بنا کر دیکھے کہ اثر ہوتا ہے یا نہیں چنانچہ اس نے آکر ان مسلمانوں سے کہا کہ ارے تم لوگ کہاں جا رہے ہو۔ وہاں تو تمہارے مقابلہ کے لئے تم سے بدرجہا زیادہ جمعیت تیار ہے اور بروایت درمنثور یہ کسی اور گروہ کا ذکر ہے کہ جو حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی سرکرگردگی میں بہت تھوڑی تعداد میں گیا تھا اور اسے راستے میں کسی نے ڈرایا کہ تم اتنے سے آدمی جارہے ہو اور وہاں تو بڑی فوج جمع ہے مگر انہوں نے کہا کہ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ اسی کی تعریف میں یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔

ہمارے ہاں امام محمد باقر علیہ السلام سے یہ روایت وارد ہوئی ہے کہ یہ غزوہ بدر صغری کی بات ہے۔ اسے ملا محسن فیض نے مجمع البیان کے حوالہ سے درج کیا ہے۔[2] مگر مجھے مجمع البیان میں یہ نہیں ملا۔ ہاں اس نے کہا تمہارے مقابلہ کے لئے لوگوں نے بڑا لشکر جمع کیا ہے، اس کہنے والے کے سلسلہ میں انہوں نے کہا ایک قول درج کیا ہے کہ یہ کہنے والا نعیم بن مسعود شجعی تھا اور اسے امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف منسوب کیا ہے۔[3]

خالق نے اس وحشت ناک خبر کو سن کر جو حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کہنے کی مدح فرمائی ہے، اس کے تحت میں آداب اسلامی میں یہ بھی ایک چیز ہے کہ جب کسی کو کوئی عظیم مہم درپیش ہو تو وہ یہ الفاظ زبان پر جاری کرے۔[4]

---

[1]۔ وہ نعیم بن مسعود یا عبدالقیس تھا (عمدۃ البیان)

[2]۔ في الجمع عن الباقر علیہ السلام نزلت في غزوة بدر الصغرى (صافی)

[3]۔ هو قول ابي جعفر و ابي عبدالله علیہما السلام (مجمع البيان)

[4]۔ صحت الرواية عن الصادق علیہ السلام (مجمع)

إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَٰنُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَآءَهُۥ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿۱۷۵﴾

”یہ تو شیطان ہے جو اپنے حوالی موالی کو ڈراتا ہے، تو تم ان سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو، اگر واقعی مومن ہو۔“

ہم نے جو ترجمہ کیا ہے، اس سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ کفار سے خوف دلانے کی کوشش والی شیطانی حرکت جو کسی نے کی تھی، اس سے ڈرتے تو وہ ڈرتے جو سچے مومن نہیں ہیں، چاہے وہ مسلمانوں کی جماعت کے اندر ہوں۔ وہ وہ ہیں جو خود شیطانی تصورات رکھتے ہیں، اس لئے شیطان کے حوالی موالی ہیں اور تم اگر واقعی مومن ہو تو تمہیں شیطان کے ڈرانے پر ان کافروں سے نہیں ڈرنا چاہیے۔

عام طور پر اکثر مفسرین و مترجمین نے اسی صورت سے تفسیر لکھی ہے اور ترجمہ کیا ہے [1] مگر ایک معنی اس آیت کے دوسرے قرار دیے گئے ہیں، جس کی بنا پر ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ یہ شیطان جو اپنے حوالی موالی سے ڈرایا کرتا ہے۔ [2]

اس صورت میں حوالی موالی سے مراد وہی کفار ہیں جن سے اس شخص نے آ کر ڈرایا تھا۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے، صرف پہلا فقرہ: ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَٰنُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَآءَهُۥ، اس سے بلا غور و فکر جلد جو مفہوم ذہن میں آتا ہے، وہ تو پہلا ہی ہے کہ جنہیں شیطان ڈراتا ہے یعنی اس کے ڈرانے کا اثر جن پر ہوتا ہے وہ اس کے حوالی موالی ہیں مگر اس صورت میں بعد میں: فَلَا تَخَافُوهُمْ ”تم ان سے نہ ڈرو“ کی ضمیر ”ان“ یہ اولیاء کی طرف سے عائد نہیں ہوگی بلکہ اس کا مرجع اس کلام سے خارج ہوگا اور وہ کفار ہیں جن سے کہ شیطان ڈرا رہا تھا۔ یہ ذرا الفاظ کے ظاہری معنی سے بعید معلوم ہوتا ہے، اس ضمیر کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ وہ اولیاء کی طرف سے راجع ہے یعنی تم شیطان کے حوالی موالی سے نہ ڈرو۔ اب جب اس کا یہ مفہوم قرار پا گیا تو پہلے جملہ میں لازماً وہ دوسرے معنی ماننا پڑیں گے کہ شیطان اپنے حوالی موالی سے ڈراتا ہے۔

بہر حال یہ وہ منزل ہے جہاں اب تک میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں۔ چونکہ ترجمہ کچھ نہ کچھ ہی تھا، اس لئے میں نے پہلے معنی کے مطابق ترجمہ کر دیا ہے لیکن دوسرا احتمال بھی بہت قریب ہے۔

وَلَا يَحْزُنكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ ۚ إِنَّهُمْ لَن يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْـًٔا ۗ يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۷۶﴾

”اور یہ لوگ جو کفر میں تیزی کرتے ہیں، آپ کے رنج کا باعث نہ ہوں۔ یہ اللہ کو ہرگز کچھ نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اللہ نے طے کر لیا ہے کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ وہ قرار نہیں دے گا اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب

---

[1]۔ یخوف اولیاءہ القاعدین من الخروج مع الرسول (صافی) ڈرتا ہے دوستوں اپنے کو کہ وہ منافقین ہیں (عمدۃ البیان)

[2]۔ قال الزجاج و ابو علی الفارسی و غیرھما ان تقدیرہ و یخوفکم اولیاءہ ای من اولیاء (مجمع البیان و قد یخوف المفعول الاول کما تقول خوف عمرو الکلب و کما فی الایۃ نہی کما اذا قیل یخوفکم اولیاءہ (البلاغی رحمۃ اللہ علیہ)

ہے۔"

یہ رسولؐ سے خطاب ہے۔ وہ پیغمبر جنہیں کفار و مشرکین کے ایمان نہ لانے سے اتنا صدمہ ہوتا تھا کہ خالق نے ارشاد کیا۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴿الکھف:۶﴾

معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آپ ان کے پیچھے جان دے دیں گے اس افسوس میں کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔

انہیں خود مسلمانوں میں سے ان اشخاص کے کفر یہ اقوال و افعال کا جو اسلامی تقاضوں کے خلاف ہیں جتنا صدمہ ہوتا کم تھا اور جیسا علامہ طبرسیؒ نے لکھا ہے کبھی کبھی بمقتضائے عبودیت اپنی جگہ یہ فکر پیدا ہوتی تھی کہ کہیں میری جانب سے تو کوئی کمی نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی طرح ایمان ان کے دل میں راسخ نہیں ہوتا[1] اسی کا اس آیت میں اظہار کیا گیا ہے۔

یہ کفر میں تیزی کرنے والے کافر تھوڑی ہیں۔ یہ وہ ہیں جو اپنے کو مومن کہہ رہے تھے[2] مگر تگ و تاز ان کی کفر کے میدان میں تھی جس کا قرآن ابدی گواہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾

"یقیناً وہ جنہوں نے ایمان کے بدلے کفر مول لیا، ہرگز اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا ئیں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

اس طرح کے الفاظ منافقین کے لئے سورہ بقرہ کے شروع میں آ چکے ہیں کہ:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (بقرہ۔۱۶ اور ۱۷۵)

وہ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی۔

وہاں اس مول لینے کی تشریح ہو چکی ہے کہ انکے لئے اسباب ہدایت سب فراہم ہو گئے تھے پیغمبر خداؐ کی خدمت میں پہنچ گئے، حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے تو اس طرح گویا ہدایت ان کے ہاتھ آ گئی مگر پھر بھی انہوں نے دل میں کفر کو چھپا کر اور منافقانہ چالیں اختیار کر کے گمراہی اختیار کر لی۔ بس اسی معنی سے یہاں کہا جا رہا ہے کہ انہوں نے ایمان کے بدلے کفر مول لے لیا۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِىْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِىْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْۤا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾

---

[1]. لا يبعد انه ربما كان يخطر بباله ان مسارعتهم الى الكفر و امتناعهم عن الايمان لتفريط حصل من قبله فأمنه الله من ذلك (مجمع البيان)

[2]. هم المنافقون من المتخلّفين (صافی)

''اور یہ کافر ایسا نہ سمجھیں کہ ہم جو ان کی رسی دراز رکھتے ہیں[1] یہ ان کے لئے کوئی اچھی بات ہے۔ہم تو صرف اس لئے ان کی رسی دراز رکھتے ہیں کہ وہ اور زیادہ گناہ کرلیں اور ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔''

کفار منافقین کو مہلت دیے جانے کی وجہ

ترتیب آیات کے لحاظ سے جو سیاق ہے،اگر تنزیل میں بھی یہ آیت اسی محل کی ہے،جیسا کہ مضمون آیات کے تسلسل اور روانی سے ظاہر ہے تو یہ کافر وہ نرے کھرے کافر نہیں ہیں جو مشرکین یا اہل کتاب ہیں بلکہ یہ کافر معز زطبقہ والے اقراری مسلمان ہیں جنہیں ان کے اعتقاد وعمل کے لحاظ سے قرآن کافر کہہ رہا ہے۔

ان کو ڈھیل دینا سب سے بڑا یہ تھا کہ نام بنام ان کے کفر کا اظہار کر کے ان کو اپنی محفل سے نکال نہیں دیا گیا۔یہ اس پر بڑے خوش ہیں، سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری سیاست کی کامیابی ہے مگر خالق کا ارشاد ہے کہ یہ ان کے لئے کوئی اچھی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو صرف اس لئے ہے کہ یہ اپنے منافقانہ دجرائم اور زیادہ کرلیں اور اس کے بعد جو عذاب انہیں ہونے والا ہے،وہ تو ہے ہی۔

بہر حال محل درود آیت چاہے منافقین ہوں مگر حکم تمام کافروں کو عام ہے۔کافروں کو سب ہی کو ڈھیل ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان پر نعمتوں کی فراوانی ہوتی ہے۔اموال و اولاد میں خوب کثرت ہوتی ہے۔سامان عیش وعشرت کی ریل پیل ہوتی ہے۔اسی طرح خوب کھل کھیلنے کا موقع دیا جاتا اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری قسمت زوروں پر ہے اور خدا یہ سب ہمارے لئے جو کر رہا ہے،یہ سب ہمارے بخت کی یاوری ہے مگر حقیقت ہے کہ میدان ان کے لئے کوئی اچھی بات نہیں ہے بلکہ اس سے ان پر زیادہ سے زیادہ خدا کی حجت تمام ہوتی ہے اور ان کے عذاب و وبال میں اضافہ ہوتا ہے،جس کے نتیجہ میں تباہی اور مکمل تباہی ہے۔خواہ اس دنیا ہی میں تاکہ دوسروں کے لئے سرمایہ عبرت ہو جائے اور خواہ صرف آخرت کی منزل میں جو اصل جزا وسزا کا محل ہے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ عَلٰى مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَيۡهِ حَتّٰى يَمِيۡزَ الۡخَبِيۡثَ مِنَ الطَّيِّبِ‌ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطۡلِعَكُمۡ عَلَى الۡغَيۡبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجۡتَبِىۡ مِنۡ رُّسُلِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ‌ ۖ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ‌ ۚ وَاِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَلَـكُمۡ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۷۹﴾

''اللہ مسلمانوں کی جماعت کو یوں جیسے تم ہو چھوڑنے والا نہیں ہے،جب تک کہ ناپاک کا پاک سے امتیاز نہ کرے اور اللہ تمہیں غیب کی خبر دینے کا بھی نہیں ہے لیکن اللہ اپنے پیغمبروں میں جسے چاہتا ہے،منتخب کرتا ہے تو اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان رکھو اور بچتے رہو تو تمہارے لئے بڑا ثواب ہے۔''

ثبوت علم غیب بعطائے الٰہی

---

[1] ۔الاملاء اطالۃ المدۃ (مجمع البیان)

لیجیے! اس آیت سے صاف فیصلہ ہوجاتا ہے کہ اس دور یعنی قرن اول، خیر القرون کے مسلمانوں میں پاک بھی تھے اور ناپاک بھی۔ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ایسی صورتیں پیدا ہوں گی کہ ان کے درمیان امتیاز ہوجائے۔[1]

اگر خالق کو یہ منظور ہوتا اور مقصد ربانی اس کا متقاضی ہوتا کہ اس دور کے معزز گروہ میں سب کو ایک لکڑی سے ہانکا جائے، سب ہی ''حضرت'' سب ہی ''رضی اللہ عنہ'' سب ہی عدول، سب ہی کی اقتدا رباعث نجات تو آخر خالق کو اس خبیث وطیب میں امتیاز پیدا کرنے کا درپے ہی کیوں ہونا چاہیے؟!

پھر بھی یہ اعلان ہوگیا کہ اس امتیاز کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صاف صاف ان آدمیوں کے ناموں کا عوام کے لئے اعلان ہوجائے: مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ، یعنی یہ امید نہ رکھو کہ خدا تم کو غیب پر مطلع کردیگا تو پھر یہ امتیاز کیوں کر ہوگا؟ اسی طرح جیسے جنگ احد میں سختی پیش آئی اور دو قسم کے کردار سامنے آ گئے، بس یوں ہی اس کے بعد بھی دور رسولؐ میں اور پھر رسولؐ کے بعد ایسے امتحانی مواقع پیش آتے رہیں گے جن میں کردار کے فرق سے یہ امتیاز ہوتا رہے گا کہ کون خبیث ہے اور کون طیب ہے؟ تو اب مقصد الٰہی جو اس امتیاز خبیث وطیب سے وابستہ ہے، کیا اس کی تکمیل یوں ہوگی کہ ہم یہ کہہ دیں کہ صدر اسلام کے واقعات پر اب تبصرہ نہ ہونا چاہیے تاکہ کہیں کچھ ''مقدس'' افراد سے سوءظن پیدا نہ ہوجائے یا یوں ہوگی کہ خوب قرآن وسنت اور عقل کی روشنی میں پھٹک پھٹک کر پوری فراخ حوصلگی اور اللہ کی دی ہوئی بصارت وبصیرت کے ساتھ دور اول کے واقعات پر بار بار نظر ڈالی جائے اور کردار کے جو مرقع سامنے آتے جائیں، انہی سے یہ امتیاز محسوس کرنے کی کوشش کی جائے کہ کون اتباع کے مستحق ہیں اور کون بچنے کے لائق اور یہی بچنا یعنی ان لوگوں کے اتباع کے خطرات کو پیش نظر رکھنا اس محل پر وہ ہے جسے کہا جارہا ہے کہ تم ایمان پر قائم رہو اور بچتے رہو، تب تمہیں اجر عظیم یعنی آخرت کی کامیابی حاصل ہوگی۔ بغیر اس کے نہیں۔

پھر کہا گیا ہے کہ خالق تمہیں براہ راست غیب پر اطلاع دینے والا نہیں ہے۔ ہاں پیغمبروں میں سے جسے وہ چاہتا ہے اس کے لئے منتخب کرتا ہے۔[2]

یہ انتخاب بحیثیت رسالت نہیں ہے تاکہ کہا جائے کہ پیغمبر سب ہی اس کے منتخب کردہ ہوتے ہیں بلکہ یہ انتخاب درانتخاب ہے جو مراتب رسالت کی رفعتوں کے لحاظ سے ہے، جس کی دوسری جگہ تصریح کی گئی ہے کہ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ یعنی پیغمبروں میں بعض، بعض سے افضل ہیں اور اسی لحاظ سے مراتب علم میں بھی اللہ کی طرف سے فرق ہوتا ہے۔ اب جو افضل المرسلین ہوگا، وہ یقیناً اس علم غیب کے بھی بلند سے بلند مرتبہ پر فائز ہونے کا حقدار ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس خبیث وطیب کے امتیاز میں رسولؐ کے ارشادات پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے جو آپ نے اپنے گرد وپیش کے مختلف افراد کے بارے میں وقتاً فوقتاً ارشاد فرمائے ہیں۔

اور یہ جو کہا جارہا ہے کہ ''اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھو''......اس ایمان کا یہ تقاضا ہے کہ جس کے بارے میں پیغمبرؐ جو ارشاد فرمائیں، اسے اللہ کے دیے ہوئے علم کا نتیجہ سمجھو۔ رشتہ کی محبت یا دلی رضا وغضب کا اسے نتیجہ قرار نہ دو۔

---

[1] حتی یتمیز المنافق من المخلص (صافی)

[2] فیوحی الیہ ویخبرہ ببعض المغیبات (صافی)

مذکورہ بالا ہدایت ربانی کا تقاضا عمل میں اسی وقت آسکتا ہے جب تاریخ بھی سامنے رہے اور حدیث بھی تب ہمیں اچھوں اور بروں میں امتیاز کرنے والی بصیرت کا سرمایہ فراہم ہوگا اور ہم غلط رہبروں سے بچ سکیں گے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾

''اور وہ کہ جو بخل کرتے ہیں اس کے ساتھ جو اللہ نے انہیں اپنے فضل وکرم سے دیا ہے، یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لئے کوئی اچھی بات ہے بلکہ یہ ان کے لئے بڑی خرابی ہے بہت قریب ہے وہ وقت کہ انہیں اسی کے جس کے ساتھ انھوں نے بخل کیا ہے، روز قیامت طوق پہنائے جائیں گے اور اللہ کے لئے آسمانوں اور زمین کا ترکہ ہے اور اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، اس سے خوب واقف ہے۔''

ادائے حقوق واجب نہ کرنے اور بخل سے کام لینے کی مذمت اور اس کا عذاب

بہت دیر کے بعد یہاں آکر سلسلہ کلام بدلا ہے، وہ ان کے فرار اور اس کے بعد کے واقعات، منافقین کے کیفیات، ان کے اقوال اور ان کے جوابات اور خالق کے تنبیہات کا سلسلہ تھا جواب ختم ہوا اور اب یقیناً دوسری بات شروع ہوئی ہے جس کا وقت نزول بھی یہ ضروری نہیں کہ بلا فاصلہ اس کے بعد ہی کا ہو بلکہ یہ ممکن ہے کہ ان واقعات کے پہلے ہو اور ممکن ہے کہ اس کے بعد ہو۔

یوں جناب مولوی حمید الدین فراہی ایسے ترتیبی نظم قرآن پر ایمان والے تو کھینچ تان کر اس کا کچھ نہ کچھ ربط سابق آیات سے ملائیں ہی گے مگر جب ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے اور متفق علیہ طور پر نہیں ہے تو نظم قرآن بحیثیت ترتیب کو اہمیت دینے اور اس کو معنوی حیثیتوں میں دلیل قرار دینے کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

یہ بخل کیا ہے جو ان کے حقوق واجبہ مثلاً زکوۃ وغیرہ کا روکنا جسے اللہ نے اموال میں فرض قرار دیا ہے[1] اور اس تعبیر میں کہ ''جو اللہ نے اپنے فضل وکرم سے انہیں دیا ہے'' عقلی طور پر ان کے عمل کی رکاکت کا اظہار ہے[2] کہ یہ اموال ذاتی طور پر خود ان کا حق ہوتے تو خیر، کوئی وجہ بھی ہوتی کہ وہ ان میں بخل سے کام لیں مگر خدا کے دیے ہوئے اموال اور خدا ہی کے عائد کردہ فرائض سے بخل!

یہ فقرہ کہ ''ان اموال کے طوق ان کی گردن میں ڈالے جائیں گے۔'' بلاشبہ کسی خاص نوعیت کے ہولناک عذاب کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] ۔فسّر ذٰلك بمنع الزكوة (ابلاغی) هو المروی عن ابی جعفر علیه السلام (مجمع البیان)

[2] ۔فی ذلك احتجاج علی البا خلین بما فرضه الله بأن ما یبخلون به انما هو من عطاء الله (البلاغی) فما لهولاء القوم یبخلون علیه بماله ولا ینفقونه (صافی)

اب خواہ ان اموال کے طوق بنا کر ڈالے جائیں [۱] یا ایک آتشیں [۲] اژدہا ان کے گلے کا احاطہ کیے ہوئے ہو جو برابر انہیں ایذا پہنچا تا رہے جیسا کہ بعض احادیث میں ہے۔

ہم اپنی اس دنیا کے مشاہدات میں گھری ہوئی عقل سے وہاں کی کسی چیز کی اصل نوعیت کب سمجھ سکے ہیں جو اس اژدہے کی پوری نوعیت محسوس کر سکیں۔بس اس کی شدت سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ وہ ابدی عذاب کا ایک طریقہ ہے جو غضب پرودگار کا نتیجہ اور اس کی نافرمانی کی سزا ہے نعوذ باللہ من ذلک۔

"اللہ کے لئے آسمان اور زمین کا ترکہ ہے" یعنی جس مال کے ساتھ یہ لوگ بخل کرتے ہیں، یہ ان کے پاس رہ بھی تو نہیں جائے گا۔ ایک وقت میں یہ رکھا رہ جائے گا اور یہ اسے چھوڑ کر چلے جائیں گے اور آخر یہ سب مالک جب اٹھ جائیں گے تو آخر میں تمام اموال پر جس کا قبضہ ہوگا وہ وہی ذات ہے جو سب کے بعد باقی رہنے والی ہے اور وہ بس خالق کی ذات ہے جس کو فنا نہیں......تو آخر میں یہ سب اموال اس کے ہو جائیں گے [۳] مگر اس وقت یہ اسے جبری طور پر پہنچیں گے، اس لئے انہیں ان کے کسی معاوضہ کا بھی حق نہ ہوگا لیکن اگر یہ اختیاری طور پر اس کے فرمان کی تعمیل میں ان اموال کا کچھ حصہ دے دیں تو صرف اتنا ہی نہیں کہ یہ عذاب اخروی سے محفوظ رہیں گے بلکہ وہ انہیں ان اموال فانی کا بہترین معاوضہ نعیم باقی کی شکل میں عطا فرمانے کا ذمہ دار ہے۔

لَقَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ قَوۡلَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيۡرٌ وَّنَحۡنُ اَغۡنِيَآءُ ‌ۘ سَنَكۡتُبُ مَا قَالُوۡا وَقَتۡلَهُمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوۡلُ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ﴿۱۸۲﴾

"اللہ نے سن لیا ہے ان کا کہا، جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم مالدار ہیں، جو انہوں نے کہا کہ وہ ہم قلم بند کر لیں گے اور ان پیغمبروں کا ناحق قتل کرنا بھی اور کہیں گے کہ چکھو آتش جہنم کا مزہ۔ یہ اس کی بدولت ہے جو تم اپنے ہاتھوں کر چکے ہو اور بلاشبہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔"

یہودیوں کی نکتہ چینیوں پر اللہ کا غضب

خود آیت کے مضمون سے بھی ظاہر ہے اور تفسیری روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ یہودیوں کا ذکر آ گیا لیکن یہ انہوں نے کب اور کیوں کہا؟ اس کا پتہ قرآن مجید سے نہیں چلتا۔ ہاں روایت میں ہے کہ جب وہ آیت اتری ہے کہ:

مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا : کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے

---

[۱]۔ وہ مال کہ جن کی زکوۃ وغیرہ تمام حقوق ادا نہیں کیے ہیں، وہ مال طوق کر کے ان کی گردن میں ڈالے جائیں گے (عمدۃ البیان)

[۲]۔ فی الکافی عن الباقر و الصادق علیہ السلام (صافی)

[۳]۔ یموت من فی السموت والارض ویبقی ھو جل جلالہ لم یزل ولا یزال فیبطل ملک کل مالک الا ملکہ (مجمع البیان)

اس وقت بطور نکتہ چینی یہودیوں نے یہ کہا کہ لیجیے! مسلمانوں کا اللہ (معاذ اللہ) مفلس ہے اور آدمی مالدار ہیں جب ہی تو وہ ان سے قرض کا خواستگار ہے [۱] حالانکہ وہ قرض کس مفہوم سے کہا گیا تھا اور اس کا مطلب کیا تھا؟ اس کا بیان اس آیت کے ذیل میں ہو چکا ہے اور علمائے یہود بھی اسے خوب سمجھتے تھے مگر معترض کو کوئی غرض اعتراض سے ہوتی ہے اور اپنے عوام کو بے وقوف بنا کر انہیں کیا جاتا ہے کہ کیا خوب نکتہ پیدا کیا۔ [۲]

اعتراض برائے اعتراض کا جواب نہیں دیا جاتا

اس طرح لفظوں کے معنی بدل کر گرفت کی جائے تو کلام الٰہی میں بھی اس کی گنجائش نکل آتی ہے اور ایسے ہی وہ اعتراض ہوتے ہیں جن کا جواب دینا بے کار ہوتا ہے چنانچہ بلاغت قرآنی نے بھی ان کے اعتراض کا جواب نہیں دیا ہے بلکہ اسے ان کی سرکشی اور عناد کا نتیجہ قرار دے کر اس پر اور اس کے پہلے کے ان کے طغیان وعناد پر جو قتل انبیا کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا ہے، اللہ کے عذاب کا اعلان کر دیا ہے۔

جواب تو اس وقت دیا جائے جب معترض واقعی سمجھے ہوئے نہ ہو اور جب وہ اصل مطلب سمجھے ہونے کے باوجود صرف بغرض اعتراض، اعتراض کر رہا ہے تو اس کا جواب دے کر اسے سمجھانا بے کار ہوتا ہے بلکہ اس کا جواب اپنی جگہ یہ کہہ لینا ہے کہ ''خدا سمجھے''...... اور اس کے بعد خاموشی اختیار کر لینا ہے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾

''اور وہ جن کا کہنا یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں ہدایت کی ہے [۳] کہ ہم کسی پیغمبر پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ ایک قربانی پیش نہ کرے جسے آگ آکر کھا لے کہیے کہ میرے پہلے بہت سے رسول تمہارے پاس معجزے اور جو تم کہتے ہو، یہی لے کر آئے تو انہیں تم نے کیوں قتل کر دیا، اگر تم سچے ہو۔''

معجزہ کی طلب جو اقعی حقیقت فہمی کے لئے ہو قابل احترام ہے اور ایسے موقعوں پر معجزات پیش کیے گئے ہیں مگر خواہ مخواہ عناد یا تمسخر کے طور پر جو معجزہ کی فرمائش ہو، اس کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے چنانچہ ایسے ہی موقعوں پر قرآن مجید میں انکار کر دیا گیا ہے کہ بس جتنے معجزے پیش ہو چکے ہیں، وہ کافی ہیں۔ یہ کوئی مذاق نہیں ہے جو بے کار ہوا کرے۔

---

[۱]۔ قالہ الیہود لما سمعوا من ذالذی یقرض اللہ قرضا حسنا (صافی)

[۲]۔ انما قالوہ تلبیا علیٰ اعوامھم (مجمع البیان)

[۳]۔ ای امرنا و قیل اوصانا فی کتبہ و علی السن رسلہ (مجمع البیان)

بلاوجہ دل بخواہ معجزہ کی فرمائش پر قرآن کا جواب

یہ یہودیوں کا قول بھی اس طرح کا تھا اور بالکل غلط تھا۔ یعنی ایسا کبھی کبھی ہوا تو ہے جیسا کہ خود قرآن نے اقرار کیا ہے کہ قبل کے مرسلین نے یہ معجزہ بھی پیش کیا ہے اور قصہ قابل وہابیل کے بیان میں بھی احادیث میں ہے کہ اس وقت قاعدہ تھا کہ جس کی قربانی قبول ہوتی تھی، ایک آگ آسمان سے آتی تھی جو اس قربانی کو جلا دیتی تھی مگر یہ کوئی عام اصول نہ تھا کہ ہر نبی کو یہ معجزہ ضرور پیش کرنا چاہیے اور یہ ان کا قول بھی غلط تھا کہ اس صورت میں وہ ایمان ضرور قبول کریں گے۔

قرآن کہہ رہا ہے کہ اگر ایمان اس کے بعد ضروری ہوا کرے تو ان انبیاء کو کیوں نہیں مانا گیا اور کیوں قتل کر دیا گیا جنہوں نے یہ معجزہ پیش کیا تھا۔

درحقیقت یہ نہ ماننے کے بہانے ہیں، اور کچھ بھی نہیں۔

فَاِنۡ كَذَّبُوۡكَ فَقَدۡ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِكَ جَآءُوۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالۡكِتٰبِ الۡمُنِيۡرِ ۝۱۸۴

''اب اگر انہوں نے آپ کو جھٹلایا تو آپ کے پہلے والے بہت پیغمبر جھٹلائے گئے جو معجزے، کتابیں اور روشن آئین حیات لے کر آئے تھے۔''

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو مشرکین کے انکار کی وجہ سے دکھ ہوتا تھا، اس کے لئے رسول کو قرآن مجید میں تسلی کے مختلف انداز اختیار کیے گئے ہیں جو اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد ان آیت کے ذیل میں آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے اور آئندہ گزریں گے، یہاں تسلی اس طرح سے دی گئی ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ آپ کو جھٹلایا جا رہا ہے یہی اس کے پہلے ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔

گزشتہ انبیاء جو آتے رہے وہ ''بینات'' لے کر آئے اور جیسا کہ ہم نے ''مقدمہ تفسیر'' میں لکھا ہے یہ اصطلاح قرآن ''آیات'' اور ''بینات'' 'معجزات' ہی کو کہا جاتا ہے، اسی لئے ہم نے یہاں ''بینات'' کا ترجمہ کیا ہے۔ ''معجزات''[۱]

اور ''زبر'' اس کا ترجمہ ہے ''کتابیں''۔[۲]

اور ''الکتاب المنیر'' اس سے مراد تحریری نوشتہ نہیں ہے، ورنہ وہ تو کسی نبی کو ملا تھا اور کسی کو نہیں ملا تھا اور جنہیں ملا ان میں سے ہر ایک کو الگ ملا تھا۔ اس لئے ''زبر'' کو بصیغہ جمع لایا گیا یعنی کتابیں مگر یہاں ''الکتاب المنیر'' کا لفظ مفرد لایا گیا۔

کتب کا لفظ قرآن مجید میں لازمی یا تاکیدی ہدایت عمل اور قانون کے لئے آتا ہے جیسے نماز کو کہا گیا: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتۡ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ كِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا۔ اور روزہ، قصاص اور وصیت کے لئے کتب کی لفظ استعمال کی گئی ہے۔ اس لئے یہاں ''الکتاب المنیر'' کا ترجمہ ہم

---

[۱] ۔بالبینات ای المعجزات الباھرات (مجمع البیان)

[۲] ۔الکتب التی فیھا الحکم والزواجر (مجمع)

نے ''آئین حیات'' کے ساتھ کیا ہے جو بلا استثناسب کے لئے مقرر تھا[1] خواہ وہ پہلے نبی کی شریعت ہو اور خواہ وہ شریعت جو خود ان پر نازل ہوئی ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

''ہر ذی روح موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور جو کچھ تمہارا بدلا ہے، وہ پورا پورا قیامت ہی کے دن ملے گا جسے دوزخ سے چھٹکارا دیدیا جائے اور بہشت میں بھیج دیا جائے وہ کامیاب ہے اور دنیوی زندگی تو سرمایہ فریب کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

یہ آیت گزشتہ مضمون سے مرتبط بتائی جاسکتی ہے مگر کہا نہیں جاسکتا کہ وہ اسی سلسلہ میں نازل ہوئی ہے یا نہیں۔

دنیا والے اس دنیا کی کامرانی کو کامرانی سمجھے۔ اس کے خلاف یہ ہے کہ یہ عبوری دور ہے۔ اصل زندگی اس کے بعد کی ہے اور جو وہاں کامیاب ہے وہ درحقیقت کامیاب ہے۔ اسی حقیقت کا اس آیت میں تذکرہ ہے۔

دنیاوی زندگی ''سرمایہ فریب'' کے سوا کچھ نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عیش وعشرت کو لوگ دھوکے سے اصل کامیابی سمجھ لیتے ہیں[2] جو حقیقت کے خلاف ہے۔ نہ کہ اس معنی سے جو غالب نے کہا کہ: ''دنیا تمام حلقہ دام خیال ہے''

یہ ''سوفسطائیت'' کا تصور ہے جسے واقعیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾

''یقیناً ضرور ضرور تمہاری آزمائش ہوگی تمہارے اموال اور نفوس کے بارے میں اور تمہیں سننا پڑیں گی ان سے کہ جنہیں تم سے پہلے کتاب ملی تھی اور ان سے جنہوں نے شرک کیا ہے بڑی دل آزار باتیں[3] اور اگر تم ضبط وتحمل سے کام لوگے اور خود پرہیزگار رہو گے تو یقیناً یہ مضبوطی کا کردار ہوگا۔''

---

[1]۔ المشتمل علی الشرائع والاحکام (صافی)

[2]۔ ای متاع زائل یفتربہ المفترون (البلاغی) الغرور مصدر او جمع غار (صافی) منعۃ متعکموھا الغرور والخداع المصحل لانکم المفترون ثم نہا تعود علیکم بالرزایا (مجمع البیان)

[3]۔ وہ باتیں کہ جو باعث آزار اور رنج کی ہیں بہ نسبت پیغمبر کے اور بہ نسبت تمہارے (عمدۃ البیان)

”ضرور ضرور تمہاری آزمائش ہوگی“ جہاد اور خیرات میں جان ومال کی قربانی کے احکام کی صورت میں بھی اور راہ خدا میں پیش آمدہ جانی اور مالی مصائب کی شکل میں بھی[1] ”پرہیزگار رہوگے۔“ ان کے طعن وتشنیع اور استہزاؤ تمسخر کی پروا کیے بغیر احکام الٰہیہ کی پابندی کے ساتھ بھی[2] اور یوں بھی کہ مخالفین کی پست کرداری، بداخلاقی اور بدزبانی کے مقابلہ میں تم ویسی ہی باتوں پر اتر نہ آؤ۔[3]

”یہ مضبوطی کا کردار ہوگا“ یعنی ایسا کردار جو مضبوط عزم وارادہ کے جوہر کا تقاضا ہے یا یہ کہ جس پر عزم وہمت کے پورے استحکام کے ساتھ قائم رہنا چاہیے۔[4]

وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكۡتُمُوۡنَهٗ فَنَبَذُوۡهُ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ وَاشۡتَرَوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ فَبِئۡسَ مَا يَشۡتَرُوۡنَ ﴿۱۸۷﴾

”اور جب کہ اللہ نے اُن سے جنہیں کتاب دی گئی تھی، عہد وپیمان لیا تھا کہ تم ضرور لوگوں کے لئے واضح طور پر پیش کرتے رہوگے اور اسے چھپاؤ گے نہیں تو انہوں نے اسے اپنے پس پشت ڈال دیا اور اس کے عوض میں ذراسی قیمت وصول کرلی تو کیا بری ہے وہ معاملت جو انہوں نے کی۔“

یہ عہد وپیمان ہر صاحب علم سے اس علم کے لئے ہے جو اسے عطا کیا گیا ہے[5] حق پوشی جرم ہے اور خصوصاً جب اس حق پوشی سے پوری دنیا کا خسارہ جیسے اہل کتاب جو اس رسول کی حقانیت کو جو ابدی صلاح وفلاح کا پیغام لے کر آیا تھا، چھپا رہے تھے اور اس طرح خلق خدا کی ابدی ہلاکت کا سبب بن رہے تھے اور وہ بھی وقتی ہنگامی ذرا سے نفع کی خاطر جو بحیثیت مقدار زیادہ سے زیادہ بھی ہو تو مفاد آخرت کے مقابلہ میں بہت کم ہی ہے۔ اس لئے اسے ”ثمن قلیل“ سے تعبیر کیا گیا ہے جو ان کے عمل کی عدم معقولیت کا اظہار ہے۔

لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ يَفۡرَحُوۡنَ بِمَاۤ اَتَوا وَّيُحِبُّوۡنَ اَنۡ يُّحۡمَدُوۡا بِمَا لَمۡ يَفۡعَلُوۡا فَلَا تَحۡسَبَنَّهُمۡ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الۡعَذَابِ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۸۸﴾

---

[1]۔ فی العلل من الرضاؑ فی اموالکم باخراج الزکوۃ وفی انفسکم بالتوطین علی الصبر (صافی)

[2]۔ تتقوا مخالفۃ امر اللہ (صافی)

[3]۔ پرہیز کرو تم ان کے بدلا لینے سے (عمدۃ البیان)

[4]۔ ای مما بان رشدہ وصوابہ ووجب علی العاقل العزم علیہ (مجمع البیان)

[5]۔ عن نجم الجزار قال سمعت علی بن ابی طالب علیہ السلام یقول ما اخذ اللہ علی اہل الجہل ان یتعلموا حتی اخذ علی اہل العلم یعلموا (مجمع البیان) حضرت علی بن ابی طالبؑ سے روایت کرتے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے جاہلوں سے عہد نہ لیا کہ علم دین کو سیکھو، یہاں تک کہ علماء سے عہد لیا کہ جاہلوں کو تم کردار سکھلاؤ (عمدۃ البیان)

''ہرگز نہ سمجھو انہیں جو اترائے جاتے ہیں اس پر جو انہوں نے کیا اور چاہتے ہیں کہ جو کچھ نہیں کیا، اس کے ساتھ بھی ان کی تعریف ہو تو ہاں۔ انہیں ہرگز یہ نہ سمجھو کہ وہ عذاب سے بچے ہوئے ہیں [1] ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

پندارِ خودی کیفیت اور مذمت

اگر اس کا سابق کے مضمون سے تعلق پیدا کرنا ضروری نہ سمجھا جائے تو یہ ایک خاص قسم کے آدمیوں کا کردار ہے جس کا نمونہ ہر دور میں دیکھا جا سکتا ہے۔

''پندارِ خودی'' اتنا کہ جو انہوں نے کیا ہو، وہ ان کے نزدیک ایک کارنامہ ہی ہے اور دوسروں سے اس کے طلب گار کہ ان کی تعریفیں کریں، چاہے ایسے کارناموں کے ساتھ جو انہوں نے نہ بھی کیے ہوں۔ یہ ان تعریفوں پر بڑے خوش ہوتے ہیں۔

اب چاہے وہ عذاب جس کا تذکرہ ہے، اس بنا پر ہو کہ وہ جماعت جس کے کردار کو بیان کرنے کے محل پر آیت نازل ہوئی ہے، کفار کی تھی اور مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں کتنی ہی غلط تعریفیں کرالیں اور کتنے اپنے کارناموں پر خوش ہوں لیں مگر آخرت میں یہ اس عذاب میں ہوں گے جو کہ ان کے کفر اور شرک کا نتیجہ ہے مگر یہ کردار خود اپنی جگہ بھی مذموم ضرور ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اگر اس کے ساتھ کوئی عملی گناہ شریک نہیں ہے تو صرف وہ ذہنیت باعث عذاب نہ ہو۔

اگر آیت کا تعلق سابق مضمون سے سمجھا جائے تو پھر یہ اسی جماعت یہود کا ذکر ہے جو پہلے سے چل رہا ہے [2] کہ یہ جو کچھ کیا اس پر خوش ہیں اور جو نہیں کیا، اس کے نہ کرنے کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں کہ اس پر ان کی تعریف ہو۔

کیا کیا؟ وہی جس کا اس کے قبل کی آیت میں ذکر ہے: فَنَبَذُوۡهُ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ وَاشۡتَرَوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا: یعنی کتمان حق کر کے منافع دنیوی حاصل کیے۔

اور جو نہیں کیا، وہ کیا؟ وہ جو عہد و میثاق لیا گیا تھا کہ لا تکتمونہ اس حقیقت کو چھپانا نہیں اس عہد و میثاق پر انہوں نے عمل نہیں کیا، اس پر وہ بہت خوش ہیں۔ [3]

مگر یہاں خوش ہو لیں، آخرت میں ان کے لئے اس پر سخت عذاب ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۸۹﴾

''اور اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

---

[1] ۔فسر المفازة... بالنجاة وذکر اللغویون فی معانی الفوز النجاة (البلاغی)

[2] ۔نزلت فی الیهود (مجمع البیان)

[3] ۔یعجبون بما فعلوا من الله لیس و کتمان الحق... یحمدوا بما لم یفعلوا من الوفاء المیثاق و اظهار الحق (صافی) یعنی پوشیدہ کیا ہے انہوں نے وصف تیرے..... نہیں کیا ہے یعنی عہد کو وفا نہیں کیا ہے (عمدۃ البیان)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی
الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ
خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ
النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ
اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖۗ
رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا
مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ○

”یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور رات اور دن کی ادل بدل میں نشانیاں ہیں صاحبان عقل کے لئے، جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور کروٹ میں یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔ اے ہمارے پالنے والے! تو نے اس سب کو بے کار نہیں پیدا کیا ہے۔ تیری ذات ہر برائی سے بری، اب تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے پالنے والے یقیناً جسے دوزخ کے اندر ڈالا، اسے تو نے رسوا کر دیا اور ظالموں کے کوئی بھی مددگار [1] نہ ہوں گے۔ اے ہمارے پالنے والے! اب تو ہمارے لئے ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری غلطیوں کی تلافی کرا دے [2] اور نیکوکاروں کی جماعت کے ساتھ ہمارا خاتمہ کر، اے ہمارے پالنے والے! اور ہمیں عطا کر وہ کہ جو تو نے ہم سے اپنے پیغمبروں کی زبانی وعدہ کیا ہے اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر۔ یقیناً تو وعدہ خلافی کبھی نہیں کرتا۔“

ان آیات کا پہلا جزا ورزیادہ تفصیل کے ساتھ پہلے آچکا ہے'۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ ﴿البقرة﴾

---

[1] ۔نصرت سے مراد یہ ہے کہ اپنے غلبہ سے عذاب کو دفع کریں اور شفاعت عاجزی اور خوشامد سے ہوتی ہے (عمدۃ البیان)

[2] ۔مٹادے ہم سے بدیاں ہماری کہ وہ گناہان صغیرہ ہیں اور یا یہ کہ بخش تو ہمارے گناہوں کو جن کی توبہ ہم نے نہیں کی اور مٹا دے تو بدیاں ہماری بعد ہونے کے جن کی ہم نے توبہ کی ہے (عمدہ)

وہاں ان کی پوری تفسیر درج ہو چکی ہے۔
یہاں جو اضافہ ہے وہ ان صاحبان عقل کے حالات اور ان کی واردات قلبی کی ترجمانی کا ہے جو ان آیات قدرت پر غور کرتے رہتے اور ان سے اپنی معرفت الٰہی کی قوت پہنچاتے رہتے ہیں۔
”کھڑے، بیٹھے، کروٹ میں“ یہ بظاہر ہر حال میں یادِ الٰہی کے قائم رکھنے کی تعبیر ہے۔[۱]
مگر اس کی ایک صورت وہ بھی ہے جس کا ذکر بعض احادیث میں اس آیت کی تفسیر وارد ہوا ہے کہ انسان اگر صحیح ہے تو کھڑے ہو کر نماز پڑھے گا، بیمار ہے تو بیٹھ کر، اس سے بھی زیادہ بیمار ہے تو لیٹ کر۔ غرض ہر حال میں نماز واجب ہے۔[۲]
جو کچھ بارگاہ الٰہی میں خطاب کر کے بعد میں بصورت مناجات ان بندوں کے معروضے ذکر ہوئے ہیں، ان کے پہلے کوئی لفظ یقولون کی طرح کی نہیں ہے کہ ”وہ یہ کہتے ہیں“ لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ الفاظ ان کی زبان پر آتے ہوں بلکہ ان کے تصورات وتفکرات اس طرح کے ہوتے ہیں، جن کے خالق نے ان کی طرف سے ترجمانی فرمائی ہے۔
بے شک چونکہ خالق کا ان الفاظ میں انہیں جز قرآن بنا کر پیش کرنا اس کا ثبوت ہے کہ یہ معیاری تصورات ہیں جو ایک بندہ کے اپنے خالق کی بارگاہ میں مناجات کی صورت سے ہونا چاہیے اور یہ الفاظ اکثر ان تصورات کے پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں، اس لئے احادیث میں بعض نمازوں کے قنوت یا اور حالات میں سورہ آل عمران کے ان آیات کے پڑھنے کی ہدایت ہوئی ہے اور اس کے ثواب وارد ہوئے ہیں مگر پڑھنا پورے طور پر کارآمد اسی وقت ہے کہ جب یہ تصورات ذہن میں بھی ہوں۔[۳]

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾

”تو قبول کی اُن کی دُعا ان کے پروردگار نے کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو، خواہ مرد ہو یا عورت، برباد نہ کروں گا، تم ایک دوسرے کی جنس ہی سے تو ہو تو جنہوں نے ہجرت کی ہو اور اپنے گھروں سے نکالے گئے ہوں اور میری راہ میں انہیں ایذائیں دی گئی ہوں اور جنگ کریں اور مارے جائیں تو ان کی غلطیوں کی میں تلافی

---

[۱]۔ المراد من ذلك بيان بعض المصاديق (البلاغي) اى فى سائر الاحوال (مجمع البيان)
[۲]۔ العياشى عن الباقر عليه السلام... قال الصحيح يصلى قائماً والمريض يصلى جالساً وعلىٰ جنوبهم الذى يكون اضعف من المريض الذى يصلى جالساً (صافى)
[۳]۔ قد اشتهرت الرواية عن النبى لما نزلت هذه الآيات قال: ويل لمن لاكها بين فكيه ولم يتامل ما فيها (مجمع البيان)

کروں گا اور انہیں بہشتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، اللہ کی طرف سے ثواب کے طور پر اور اللہ کے پاس ثواب کا اچھے سے اچھا سامان ہے۔"

ان تمام تصورات، تفکرات اور دعاؤ مناجات کے بعد بھی خالق کی طرف سے قبولیت کا جو اعلان ہے، اس میں اسے صاف کر دیا جاتا ہے کہ آخرت کا بہتر سے بہتر صلہ جو تم چاہو، وہ موجود ہے مگر یہ فقط دعاؤں سے نہ ہوگا بلکہ عمل سے حاصل ہوگا۔

بے شک عمل جتنا ہوگا، اس کا صلہ کبھی برباد نہیں ہو سکتا اور اس میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ مرد ہے یا عورت کیوں کہ مرد اور عورت کوئی الگ الگ جنس تھوڑی ہیں۔ یہ تو ایک دوسرے کا جز ہیں [1]۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ غلط فہمی مستقل طور پر سامنے ہے کہ عورت نوع انسانی کا کوئی جز نہیں ہے بلکہ یہ کوئی الگ مخلوق ہے جس کے ذمہ بس فرائض ہیں، اس کے حقوق کچھ نہیں ہیں۔ قرآن اس کا دفعیہ ہر ممکن و مناسب موقع پر کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿١٩٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۣ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾

"کافروں کا مختلف ممالک میں دندناتے پھرنا [2] تمہیں [3] ہرگز دھوکا نہ دے۔ یہ چند دن کی چاندنی ہے۔ [4] پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا بری منزل ہے۔"

غلبہ و اقتدار کو دلیل حقانیت سمجھنا غلط

غلبہ و اقتدار کو حقانیت کی دلیل سمجھنے والے اس آیت کو آنکھ کھول کر دیکھیں۔ یہ چیز تو کافروں کو بھی حاصل ہو جاتی ہے اگر کچھ بداعمال مسلمانوں کو بھی مل جائے تو وہ ان کے نیکوکار اور پسندیدہ پروردگار ہونے کی دلیل تھوڑی ہے۔

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿١٩٨﴾

---

[1]۔ روی ان ام سلمة رضی اللہ عنہ قالت یارسول اللہ رضی اللہ عنہما ما بال الرجال یذکرون فی الھجر ةدون النساء فانزل اللہ ھذہ الایة (مجمع البیان) ام سلمہؓ نے جاب رسول خداؐ سے عرض کی یا رسول خداؐ! حق تعالیٰ ہجرت اور جہاد کے ثواب میں مردوں کا ذکر کرتا ہے اور عورتوں کا ذکر نہیں ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی (عمدۃ البیان)

[2]۔ سالمین غائمین غیر مواخذین باجرامھم (مجمع البیان) تبسطھم فی مکاسبھم و متاجرھم و مزارعھم وسعتھم فی عیشھم (صافی) متمتعین بالصحة والامھال (البلاغی)

[3]۔ الخطاب لکل واحد او لنبی رضی اللہ عنہما (صافی)

[4]۔ ای یتمتعون بذلك قلیلا ثم یزول (مجمع)

مگر وہ جو اپنے پروردگار کی ناراضگی سے بچتے رہے، ان کے لئے بہشت ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں کہ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ کی طرف سے سامان ضیافت [۱] کے طور پر اور جو اللہ کے یہاں ہے، وہ نیکوکاروں کے لئے بہت اچھا ہے۔ [۲]

اتقاء کے اصل معنی بچنے ہی کے ہیں اور جب قرآن میں یہ لفظ آتی ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں عذاب سے بچنا یا غضب خدا سے بچنا مگر چونکہ یہ بچاؤ معاصی سے پرہیز کی شکل میں ہوتا ہے، اس لئے متقی کے معنی ''پرہیزگار'' کے قرار دیئے جاتے ہیں جو لازم معنی ہونے کے اعتبار سے درست ہیں مگر جب

اس اتقاء کے ساتھ مفعول آ جاتا ہے تو پھر بچنے ہی کے ساتھ ترجمہ کرنے سے مفہوم درست ہوسکتا ہے پرہیزگاری کو اب درمیان میں لاکر ترجمہ کرنے سے اردو عبارت بنا مشکل ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿١٩٩﴾

''اور یقیناً اہل کتاب میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ اور ان باتوں پر جو تمہاری طرف اتاری گئی ہیں اور جو ان پر اتاری گئی تھیں، ایمان رکھتے ہیں، اللہ کے سامنے دل سے جھکے ہوئے ہیں، آیت الٰہیہ کے عوض میں تھوڑے سی قیمت وصول نہیں کرتے، یہ وہ ہیں کہ ان کے لئے ان کے پروردگار کے یہاں ان کا اجر ہے۔ یقیناً اللہ بڑا تیزی سے حساب لینے والا ہے۔''

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو جماعت یہود و نصاریٰ میں سے سچے دل سے مسلمان ہو گئے۔

بعض روایات میں ہے نجاشی بادشاہ حبشہ کے لئے رسولؐ نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی اور اس پر کچھ لوگ معترض ہوئے ان کے جواب میں یہ آیت اتری ہے۔ [۳]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ

[۱]۔ النزل بضمتین ماعد للضیف و اکرامه من قری و منزل (البلاغی)

[۲]۔ انس سے روایت ہے کہ ایک روز جناب سید المرسلین خرما کے پتوں کے بوریے پر استراحت فرماتے تھے کہ اصحاب حاضر ہوئے اور جس وقت بیدار ہوئے تو نقش پتوں کا کمر پر اور پشت مبارک پر نمایاں تھا۔ ایک شخص اصحاب میں سے رویا اور کہا کہ یا رسول خدا! کسریٰ اور قیصر تو ریشمی بچھونوں پر آرام کریں اور آپ اس بوریئے پر۔ فرمایا کچھ ڈر نہیں، ان کے واسطے دنیا ہے اور ہمارے واسطے آخرت ہے (عمدۃ البیان)

[۳]۔ عن جابر بن عبداللہ و ابن عباس و انس و قتادۃ (مجمع البیان)

تُفۡلِحُوۡنَ﴿۲۰۰﴾

''اے ایمان والو! ضبط وتحمل سے کام لواور دوسروں کے مقابلہ میں پامردی کا ثبوت دو[۱] اور سرحدوں پر مورچے مضبوط رکھو اور اللہ کی ناراضگی سے بچنے کا خیال رکھو۔ شاید کہ تم دین ودنیا کی بہتری حاصل کرلو۔''

اصبروا وصابروا کے جو دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان کی تشریح میں عبارت وروایات مختلف ہیں[۲] اور اس لئے مجبوراً ہمیں خود ان دونوں لفظوں کی ساخت کے لحاظ سے مناسب انتخاب کرنے کا حق ہے۔

ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ صبر کا جو مفہوم ہے، اس میں اگرچہ میدان مقابلہ کی پامردی بھی داخل ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر اس معنی میں ارشاد ہوا ہے:

اِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ عِشۡرُوۡنَ صٰبِرُوۡنَ یَغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ وَاِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ مِّائَۃٌ یَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفًا مِّنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا۔﴿الأنفال: ۶۵﴾

''اگر تم میں بیس صبر رکھنے والے ہوں تو دوسو پر غالب آئیں اور سو صبر کا جوہر رکھنے والے ہوں تو ایک ہزار کافروں پر غالب آئیں۔''

پھر:

اَلۡـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنۡکُمۡ وَعَلِمَ اَنَّ فِیۡکُمۡ ضَعۡفًا فَاِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ۔(انفال:۶۶)

''اب اللہ نے تم سے بار ہلکا کر دیا اور جان لیا تم میں کمزوری ہے تو اب اگر تم میں سو صبر رکھنے والے ہوں تو دوسو پر غالب آئیں۔''

یہاں صبر سے میدان جہاد کا ثبات ہی مراد ہے مگر چونکہ مفہوم صبر عام ہے، اس سے زیادہ تر انفرادی طور سے اپنے اوپر جو مصائب پڑتے ہیں، انہی کے برداشت کرنے کی طرف ذہن جاتا ہے اس لئے میدان جہاد کے ثبات کو دوسرے لفظ صابروا کے ساتھ زیادہ واضح کر کے نمایاں کر دیا گیا ہے، جس کی ساخت میں دوسرے سے مقابلہ مضمر معلوم ہوتا ہے۔

کتب فقہیہ میں کتاب الجہاد میں مرابط اور رباط کا خاص عنوان قائم کیا گیا ہے اور اس کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ اسی لئے ہم نے یہ ترجمہ کیا کہ ''سرحدوں پر مورچے مضبوط رکھو'' جو اس کے قبل کے حکم سے کہ ''مقابلہ میں پامردی کا ثبوت دو'' تناسب بھی رکھتا ہے مگر ہوسکتا ہے کہ اس کا لغوی معنی کے اعتبار سے یہ مطلب ہو کہ اپنے فرائض کی ادائیگی پر ہمیشہ تلے رہو۔[۳]

مرابطہ کا حکم اور اسکے معنی

بلکہ جیسا کہ جہاد کے لفظ جہاد اصغر اور جہاد اکبر دونوں کو شامل ہے اور اس لئے باعتبار موقع ومحل جہاد کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں، اسی طرح

---

[۱]۔من باب المفاعلة مقابلة الصبر بالصبر ويفهم من المقام زيادة الصبر في مقام المقابلة (بلاغي)

[۲]۔اختلف في معناه على وجوه (مجمع البيان)

[۳]۔بمعنى اثبتوا و واطنوا ولازموا (البلاغی) تیار ہو تم دشمنان دین سے لڑنے کے واسطے اور یا یہ کہ منتظر ہو نماز وں کے ایک کے بعد دوسری کے اور یا یہ کہ ربط کرو تم ائمہ معصومین علیہم السلام کے ساتھ اور مشہور اس کے معنی میں یہ ہے کہ آمادہ اور طیار رہو تم دشمنان دین سے لڑنے پر اور گھوڑوں اور ہتھیاروں سے موجود رہو اور گھوڑے اپنے سرحدوں پر باندھ دو کہ کوئی کافر ادھر کا قصد نہ کرے (عمدۃ البیان)

یہ سمجھنا بالکل درست ہے کہ رباط کا مفہوم بھی وسعت رکھتا۔جس وقت فریضہ جہاد بالسیف کا ہو، اس وقت سرحدوں پر مورچہ مادی اور جسمانی حیثیت رکھتا ہے اور وہ کتب فقہ والا ارباط ہے......اور جہاں فریضہ خاموشی کا ہو تو باوجود انتہائی ناگواریوں کے اپنے کو اس موقف پر برقرار رکھنا بھی مرابطہ ہے۔ اس طرح بعد رسولؐ جو حالات پیدا ہوئے، ان میں بے پناہ اکثریت کے خلاف ائمہ حق کی معرفت اور ان کے اعتقاد پر باقی رہنا بہت بڑا مرابطہ قرار پاتا ہے۔اس کے بعد ان متعدد احادیث کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے جو ملا محسن فیض نے اس آیت کی تفسیر میں درج کیے ہیں:۔

القی عنه (الصادق علیه السلام) اصبرو اعلیٰ المصائب وصابروا علی الفرائض ورابطوا علی الائمة.

علی بن ابراہیم قمی کی روایت ہے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کہ (اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ) صبر کرو مصیبتوں پر اور فرائض کی انجام دہی میں بڑھ چڑھ کر ثابت قدم رہو اور ائمہ کی موالات پر مرابطہ کرو۔

فی المعانی عن الصادق علیه السلام اصبروا علی المصائب وصابروه علی الفتنة ورابطوا علیٰ من تقتدون.

معانی الاخبار کی روایت ہے امام جعفر صادق سے صبر کرو مصیبتوں پر اور فتنہ کی صورت میں دوسروں سے ثبات قدم میں مقابلہ کرو اور ان ہستیوں پر جن کی پیروی لازم سمجھتے ہو مرابطہ کرو۔

فی روایة: اصبرو اعلیٰ دینکم وصابروا عدو کم ممن یخالفکم ورابطو امامکم.

ایک روایت ہے کہ اپنے دین کے تقاضوں پر صبر کے ساتھ قائم رہو اور تمہارے خلاف جو جماعت ہے ان میں سے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں برداشت سے کام لو اور اپنے امام پر مرابطہ کرو۔

فی المجمع عن امیر المومنین رابطوا الصلوة قال انتظروها واحدة بعد واحدة

مجمع البیان میں روایت ہے جناب امیرؑ سے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے لئے مرابطہ کرو یعنی ایک کے بعد دوسری نماز کا انتظار کیا کرو

عن النبی صلی الله علیه وآله من الرباط انتظار الصلوة بعد الصلوة

پیغمبر خدا سے مروی ہے فرمایا کہ من جملہ رباط نماز کے بعد پھر دوسری نماز کا انتظار کرنا ہے۔

آخر میں ''فلاح''، یعنی دین و دنیا کی بہتری کے ساتھ ''شاید'' کی لفظ کہنا اس بنا پر ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی فلاح اس سے وابستہ ہے کہ آخری سانس تک ایمان و عمل میں صراط مستقیم پر برقرار رہے۔[1]

---

[1] .قیل لعلکم لان الفلا غیر لازم بل شرط الاستمرار علیها مع الایمان الصحیح الی الموت (البلاغی علیه الرحمه)

سُوْرَۃُ النِّسَآءِ

”عورتوں کا سورہ“

مدنیہ---۱۷۴آیات

چونکہ اس سورہ مبارکہ میں زیادہ تر طبقہ خواتین سے متعلق احکام بیان ہوئے ہیں، اس لئے اس سورہ کا نام اسی طبقہ کی نسبت سے معین ہوا اور یہ قرآنی حیثیت سے اس طبقہ کی اہمیت کا ثبوت ہے کہ کوئی سورہ بحیثیت صنف مردوں کے نام سے موسوم نہیں ہوا کہ سورۃ الرجال کہا جاتا لیکن یہ ایک سورہ مستقل طور پر عورتوں کی طرف نسبت دے کر اس نام سے موسوم کر دیا گیا۔ اسی لئے کہ اس طبقہ کے حقوق زیادہ تر نذر تغافل رہے اور خود اس کو بھی اور دوسروں کو بھی اس کے صحیح مقام و مرتبہ کا تصور بہت کم رہا۔

سورہ نساء کے خاص خاص مضامین

۱-----تعداد ازواج کا قانون
۲-----ترکہ کی تقسیم
۳-----زناکار مرد و عورت کی سزا
۴-----حرام عورتوں کا بیان
۵-----متعہ کا حکم
۶-----عورت اور مرد میں تبادلہ حقوق
۷-----مرد کی فضیلت اور ذمہ داری
۸-----غسل کا حکم
۹-----وضو کی ترکیب
۱۰-----اولی الامر کی اطاعت
۱۱-----جواب سلام کا قانون
۱۲-----ہجرت کا حکم
۱۳-----قصر نماز
۱۴-----حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ وغیرہ وغیرہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“۔

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنۡہَا زَوۡجَہَا وَبَثَّ مِنۡہُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِہٖ وَالۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیۡکُمۡ رَقِیۡبًا ﴿۱﴾

”اے انسانو! لحاظ کرو اپنے اس پروردگار کا جس نے تمہیں پیدا کیا ایک متنفس سے اور اسی سے اس کی رفیقہ حیات کو پیدا کیا اور انہی دونوں سے بہت سے مردوں اور بہت سی عورتوں کو پھیلا دیا اور پاس و لحاظ کرو اللہ کا جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو[۱] اور رشتوں کا[۲] یقیناً اللہ تم پر حاضر و ناظر ہے“[۳]

عالم گیر اخوت کا اعلان

اس آیت میں متعدد مقاصد مضمر ہیں:

1۔ علم گیر اخوت کہ تمام نوع انسانی ایک برادری میں منسلک ہے اس لئے بھی کہ ان سب کا پیدا کرنے والا ایک ہے اور اس لئے بھی کہ وہ ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ باپ جیسے نفس واحدہ سے تعبیر کیا گیا ہے، حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور ماں جناب ”حواؑ“ ہیں۔[۴]

2۔ عورتوں کا حقیقت نوعیہ میں مردوں سے متحد ہونا جس پر اس کے پہلے سورہ آل عمران کے آخر میں مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ بعض کی لفظوں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں بھی اس غلط فہمی کو کہ عورت نوع انسانی سے خارج ہے، یہ کہہ کر دور کیا گیا ہے کہ ”خَلَقَ مِنۡہَا زَوۡجَہَا“ اسی نفس واحدہ سے اس کی شریک حیات کو پیدا کیا۔

عورت کی مرد سے تخلیق کا مطلب

اس کی کیا صورت تھی؟ ہمارے احادیث میں یہ ہے کہ جناب حوا اسی مٹی سے پیدا کی گئیں جو جناب آدم علیہ السلام کی خلقت سے بچ

---

[۱] ۔ای یسأل بعضکم بعضا فیقول اسألك باللہ (صافی) یعنی اس کی قسم کھا کر بعض تم میں سے بعض کو کہتا ہے کہ میں سوال کرتا ہوں تجھ سے بحق خدا (عمدۃ البیان)

[۲] ۔واتقوا الارحام ان تقطعوھا (صافی)

[۳] ۔یکون الرقیب فعیلا بمعنی الفاعل وھو الحافظ الذی لا یغیب عنه شیء (مجمع البیان)

[۴] ۔نفس واحدۃ وھی ادم زوجھا ھئ حوا (صافی)

گئی تھی۔[1]

3۔ حقوق انسانی کے متعلق انتباہ کہ جب تم ایک برادری کے ہو تو تم سب کے آپس میں ایک دوسرے پر حقوق بھی ہیں جن کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

حقوق انسانی کی اہمیت

اور یہ رشتوں کے حقوق کی اہمیت ہے کہ جس طرح ایک جگہ قرآن میں احسان والدین کو عبادت الٰہی کے ساتھ بالکل ایک انداز میں پیش کیا ہے، اسی طرح یہاں حقوق قرابت کا لحاظ کرنے کے لئے کہا: ''وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ '' یعنی اللہ کی مخالفت سے بچو اور رشتوں کے تقاضوں کی مخالفت سے۔ یہ اس شعبہ کی اہمیت کے لئے کافی ہے۔[2]

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲

''اور یتیموں کو ان کے مال سپرد کرو اور پاک کے بدلے میں ناپاک حاصل نہ کرو[3] اور ان کے مال اپنے مال سے ملا کر نہ کھاؤ۔ یہ بلاشبہ بہت بڑا گناہ ہے۔''

''یتیموں کو ان کے مال سپرد کرو، یعنی جو یتیم تمہاری نگرانی میں تھے اور ان کے اموال بھی تمہارے پاس بطور امانت تھے، اب جب کہ وہ یتیم بالغ اور سمجھ دار ہو گئے[4] تو اب ان کے اموال ان کے سپرد کر دو۔

انہیں یتیم باعتبار اس حالت کے کہا گیا ہے، جو انکی اب تک تھی[5] ورنہ بلوغ کے بعد پھر انسان یتیم نہیں کہلاتا۔ ''پاک کے بدلے میں ناپاک حاصل نہ کرو۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا خود اپنا مال چاہے جنس کے اعتبار سے برا ہو مگر وہ تمہارے لئے پاک وحلال ہے لیکن اگر تم نے اسے مال یتیم میں شامل کر دیا اور یتیم کے اموال میں سے عمدہ قسم کا مال خود لے لیا تو وہ تمہارے لئے ناپاک وحرام ہے[6] اب کون سی حماقت ہے کہ اپنے پاک کو چھوڑ کر آدمی ناپاک حاصل کرے۔[7]

---

[1]۔روی عن ابی جعفر الباقرؑ ان اللہ تعالٰی خلق حواء من فضل الطینۃ التی خلق منہا آدم (مجمع البیان) العیاشی عن الباقرؑ: و فضل فضلہ من طین فخلق منہا حواء و فی العلل عنہ خلق اللہ عزوجل آدم من طین و من فضلتہ و بقیۃ فلقت حواء (صافی)

[2]۔واتقوا الارحام ان تقطعوھا... وھو المروی عن ابی جعفرؑ (مجمع البیان) فی الکافی و العیاشی عن الصادقؑ ھی ارحام الناس ان اللہ عزوجل امر بصلتہا و عظمہا الاتری انہ جعلہا معہ اقوال یعنی قونہا باسمہ فی الامر بالتقوی (صافی)

[3]۔نہ بدل کرلو تم ناپاک مال کو ساتھ پاک مال کے (عمدۃ البیان)

[4]۔یعنی اذا بلغوا و انتم منہم رشدا کما فی الآیۃ اخری (صافی)

[5]۔سماھم یتامی بعد البلوغ مجازا (مجمع البیان)

[6]۔قیل کانوا یاخذون الرفیع من اموالھم و یجعلون مکانہ الخسیس فھنوا عنہ (صافی)

[7]۔لاتستبدلوا ما حرمہ اللہ تعالٰی علیکم من اموال الیتامٰی بما احلہ اللہ لکم من اموالکم (مجمع)

یتیموں کے مال کا تحفظ

اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ تم اس وقت جلدی بازی سے کام لے کر یتیموں کے اموال سے اپنی ضرورت پوری کرتے ہو جو حرام ہے حالانکہ اگر تم صبر سے کام لیتے تو اللہ تمہیں بذریعہ حلال اتنا ہی مال عطا کردیتا۔ پھر تم اسے چھوڑ کر اس حرام مال کو کیوں اختیار کرتے ہو۔ [1]

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِى الۡيَتٰمٰى فَانْكِحُوۡا مَا طَابَ لَـكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰى
وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ‌ ۚ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً اَوۡ مَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ‌ ؕ ذٰلِكَ
اَدۡنٰٓى اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ؕ ﴿۳﴾ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً‌ ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَـكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ
مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِيۡٓــًٔا مَّرِیۡٓــًٔا ﴿۴﴾

”اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے بارے میں یوں انصاف نہ کرو گے تو نکاح کرلو، ان عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں، دو تین، چار سے اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کرو گے تو ایک سے یا جو تمہاری ملکیت میں ہوں، اس میں زیادہ امکان ہے اس کا کہ کج روی نہ کرو [2] اور عورتوں کو ان کا مہر فراخ حوصلگی سے ادا کرو [3] اب اگر وہ خوشی سے اس میں سے کچھ تمہیں بخش دیں [4] تو اسے مزے سے نوش جان کرو۔“

تعداد ازواج

اس میں یتیموں کے اموال کے ربط سے ضمناً تعداد ازواج کا ذکر آ گیا ہے۔ اسے بعض مفسرین اس طرح سمجھتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کی ایک صورت یہ ہے کہ اگر وہ صنف اناث سے ہیں تو تم ان کے ساتھ شادی کرلو لیکن اس کے بعد بھی اگر سمجھتے ہو کہ ان کے ادائے حق میں کمی ہوگی تو پھر یتیم لڑکیوں سے شادی نہ کرو بلکہ اور عورتوں سے جو پسند آئیں شادی کرو [5] مگر میرے خیال میں اس صورت میں جو کڑی محذوف ماننا پڑتی ہے یعنی یہ کہ ”حسن سلوک کی خاطر یتیم لڑکی سے شادی کرو۔“ یہ سلسلہ کلام سے کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ اس سے بہتر یہ مطلب ہے کہ تمہیں یتیموں کی خبر گیری یوں ہی کرنا چاہیے لیکن اگر یوں تمہیں اپنے میں کمزوری محسوس ہوتی ہے کہ منصفانہ صورت سے ان کی خبر گیری

---

[1] ۔بان تتعجلوا الحرام من اموالھم قبل ان یأتیکم الرزق الحلال الذی قدر لکم (صافی)

[2] ۔اقرب من ان لا تمیلوا (صافی)

[3] ۔نحلۃ القمی ای ھبۃ و قیل عطیۃ من اللہ و تفضلا منہ علیھن (صافی)

[4] ۔وھبن لکم عن طیب نفس (صافی)

[5] ۔یعنی اس صورت میں یتیم عورتوں سے نکاح مت کرو اور سوائے ان کے جس عورت سے چاہو نکاح کرو (عمدۃ البیان) اگر تم کو اندیشہ ہو کہ (نکاح کرکے تم یتیم لڑکیوں کی رکھ رکھاؤ) میں انصاف نہ کرسکو گے اور عورتوں سے اپنی مرضی کے مطابق دو دو اور تین تین اور چار چار نکاح کرو۔ (مولانا فرمان علی صاحب)

نہ کرسکو گے تو عورتوں سے یعنی ان یتیموں کی بیوہ ماؤں سے نکاح بھی کر سکتے ہو۔

اب یہ ذکر آیا تو خالق نے چاہا کہ یہاں تعدد ازواج کا اصول بتایا جائے کہ اس میں کہاں تک گنجائش ہے تو کہا کہ یہ بس چار کی تعداد تک ہوسکتا ہے۔

اب یہ ذکر اگر چہ یتیموں کے حسن سلوک کے ذیل میں آیا ہے لیکن اس کے احکام جو بیان ہو رہے ہیں، وہ یتیموں سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ جب بھی تعدد ازواج کی ضرورت پیدا ہو تو یہ اصول ہے کہ وہ چار تک ہوسکتا ہے۔ چار سے زیادہ نہیں اور وہ بھی جب ان چار میں عدالت کر سکے یعنی سب کے حقوق ازواجی ادا کر سکے اور اگر سب کے حقوق ادا نہ کر سکے تو پھر ایک ہی کرے یا زیادہ کی ضرورت محسوس ہو تو اپنی مملوکہ کنیزوں سے کام لے کر ان میں تعداد کی قید نہیں ہے۔

جب کہ اصل موضوع بیان اس آیت کا اقسام نکاح نہیں ہیں بلکہ ضمناً یہ تذکرہ آیا ہے تو یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ متعہ اگر شریعت اسلام میں جائز ہوتا تو اس کا بھی تذکرہ یہاں کیوں نہیں کیا گیا جب کہ اسی سورہ میں آگے چل کر اس کا حکم موجود ہے۔

مولانا عمار علی صاحب سونی پتی اعلی اللہ مقامہ نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ:

''یہاں ان عورتوں کا ذکر ہے کہ جن سے انتظام خانہ داری کا تعلق ہے اور وہ یا تو زوجہ دائمی ہوتی ہے اور یا لونڈی ہوتی ہے اور زن ممتوعہ ایسی نہیں ہوتی بلکہ وہ فقط رفع حاجت کے لئے ہوتی ہے۔ اس واسطے اس کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا۔''(عمدۃ البیان)

جب شادی کا ذکر آ گیا تو پھر ضمناً مہر کا بھی بیان کر دیا گیا کہ مہر کا دینا لازم ہے۔ ہاں عورت کل یا جز معاف کر دے تو اور بات ہے۔

یہ اس کا ثبوت ہے جس پر پہلے روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس آیت کا ہر مضمون یتیموں سے مخصوص نہیں ہے تو جیسے مہر کا حکم جو بیان ہوا ہے، وہ بلا شبہ ہر نکاح میں ہے، ویسے ہی تعداد ازواج کا جو قانون بیان ہوا ہے، وہ بھی یتیموں سے مخصوص نہیں ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵

''اور بدعقلوں کو اپنے پاس کے مال جنہیں اللہ نے تمہارے حالات کی درستی کا ذریعہ قرار دیا ہے [۱] نہ دو انہیں آزوقہ پہنچاؤ اور کپڑے بنوا دو اور ان سے اچھی گفتگو کرو۔''

اموالکم جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے 'اپنے پاس کے اموال' اس کے مطلب میں اختلاف ہے۔ ایک مطلب اس کا یہ کہا گیا ہے کہ ان خفیف العقل اشخاص کے جو مال تمہارے قبضہ میں ہیں [۲] مگر وہ خود ان کو صحیح طور پر صرف کرنے کا شعور نہیں رکھتے، انہیں ان کے سپرد نہ کرو۔ اس صورت میں یہ نابالغوں کی جائداد کو جو کورٹ ہوتی ہے، شرعی حکم ہے جو دینی اصول پر حکومت شرعیہ سے متعلق ہے۔

---

[۱] ۔سمی مابہ القیام قیاما للمبالغۃ (مافی)

[۲] ۔یعنی مال ان کے جو تمہارے تحت تصرف میں ہیں (عمدۃ البیان)

نابالغوں کی جائداد کی کورٹ ہونے کا حکم

دوسرا مطلب اس کا یہ کہا گیا ہے کہ:۔

''اپنے وہ مال جن پر خدا نے تمہاری گزران قرار دی ہے، بے وقوفوں (ناسمجھ یتیم) کو نہ دے بیٹھنا، ہاں اس میں سے انہیں کھلاؤ اوران کو پہناؤ (تومضائقہ نہیں) اوران سے (شوق سے) اچھی طرح بات کرو۔'' (مولانا فرمان علی صاحب مرحوم)

اس کی تشریح جناب ابن عباسؓ نے یہ کی ہے کہ اگرانسان جانتا ہو کہ اس کی بیوی احمق ہے، مال کا انتظام صحیح طریقہ پرنہیں کرسکتی ہے یا اس کا لڑکا لاأبالی ہے، مال کو تباہ کردے گا تو انہیں مال سپرد نہ کرے بلکہ خود ان کی ضروریات کا انتظام کردے۔

اس کی تائید میں معصومؑ کی حدیث بھی بیان کی گئی ہے [1] لیکن اگر آیات کی ترتیب جو اس وقت ہے مطابق تنزیل ہو جیسا کہ اس مقام پر مفہوم آیات کے لحاظ سے ذہن کے لئے قابل قبول ہے تو سیاق کلام سے پہلے ہی مفہوم کو تقویت پہنچتی ہے کیوں کہ اس کے بعد کی آیت میں مسلماً خود انکے مال ان کے حوالہ کرنے یعنی کورٹ ختم ہونے کا ذکر ہے تو اس آیت میں بھی ان کے اموال سے خود ان ہی کے اموال کا مراد لینا زیادہ مناسب ہوگا۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓي اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْھُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْھِمْ اَمْوَالَھُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْھَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْھِمْ اَمْوَالَھُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْھِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۶

''اوریتیموں کی جانچ کرو یہاں تک کہ جب وہ تعلقات ازدواجی کے قابل ہوجائیں [2] تو اگر ان میں سمجھداری بھی پاؤ تو انہیں ان کے مال سپرد کردو اور فضول خرچی سے کام لے کر اور اس جلدی میں کہ کہیں یہ بڑے نہ ہوجائیں، ان کے مال خورد برد نہ کرو اور جو مالدار ہو اسے تو پرہیز ہی کرنا چاہیے اور جو محتاج ہو، وہ مناسب حد تک اپنی خوراک حاصل کرلے تو جب ان کے مال کے سپرد کرو تو ان پر گواہی حاصل کرلو اور یوں تو اللہ ہی حساب کیلئے کافی ہے۔''

یہ اب یتیموں کے اموال کے کورٹ ختم ہونے کی حد ہے کہ جب وہ بالغ وراشد ہوجائیں تو بس اب انہیں ان کے اموال سپرد کردیے جائیں۔

---

[1] .رواہ ابو الجابرود عن ابی جعفرؑ (مجمع البیان)

[2] .لغو احداتیاںی منہم النکاح (صافی)

کورٹ ختم ہونے کی حد

بلوغ کا تعلق تو عمر کے ساتھ ہے جو لڑکے میں 15 برس اور لڑکی میں 9 برس ہے یا خاص کیفیات جو علامت بلوغ کی حیثیت سے معتبر ہیں اور رشد کا تعلق عقل وشعور یعنی اچھے برے کی تمیز سے ہے، غالباً جانچ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کا تعلق اس رشد کی صفت کے ساتھ ہے۔ [1]

مگر بعض مفسرین نے اسے بلوغ ہی سے متعلق کیا ہے یعنی قرآن اور حالات سے ان کے بلوغ کا اندازہ کرو۔ [2]

اب کورٹ کے زمانہ سے متعلق یہ ہدایت ہے کہ اس دوران میں تم ان کے اموال کی حفاظت کے ذمہ دار ہو۔ وہ تمہارے لئے حلال و جائز نہیں ہیں مگر چونکہ شریعت فطری طور پر سب ہی کے ضروریات کی کفیل ہے، اس لئے یہ نگراں اگر خود تنگ دست ہے تو پھر اسے اس نگرانی کا معاوضہ ملنا چاہیے اور وہ اتنا ہے کہ اس میں سے وہ اپنی خوراک حاصل کر لے مگر اس میں قید لگائی ہے۔ بالمعروف یعنی یہ حق نہیں ہے کہ اجازت مل گئی تو وہ اندھا دھند اس میں سے کھانا شروع کر دے۔ نہیں بلکہ بینہ وبین اللہ جتنی کہ واقعی اسے ضرورت ہے اتنا لے لیکن اگر یہ مالدار ہے تو اسے مفت نگرانی کرنا چاہیے۔ اس لئے کہا ہے: **فلیستعفف** یعنی اسے اپنے کو روکنا چاہیے۔ [3]

اب یہ حکیمانہ ہدایت ہے کہ جب ان کے اموال سپرد کرو تو گواہی حاصل کرلو تاکہ بعد میں جھگڑا نہ ہو۔ یہ حاکمانہ حکم نہیں ہے، اس کی طرف آخر کے فقرہ سے اشارہ ہوجاتا ہے کہ ''یوں تو اللہ حساب کے لئے کافی ہے۔'' یعنی اگر تم نے گواہی نہیں بھی حاصل کی اور اس کا مال اس کے سپرد کر دیا تو آخرت میں کوئی جواب دہی نہیں ہوگی اس لئے کہ خدا تو جانتا ہی ہے کہ تم نے امانت داری سے کام لیا ہے مگر دنیا میں ممکن ہے کہ وہ لے کر انکار کر دیں اور تم عام نگاہوں میں بے ایمان سمجھے جاؤ یا اگر وہ عدالت میں دعویٰ کریں تو چاہے وہ محکمہ عدالت شرعی ہو بلکہ خواہ معصوم حاکم کے یہاں دعویٰ ہو، تب بھی اصول قضاء کے ماتحت تم ہی سے ثبوت طلب کیا جائے گا کہ تم نے ان کے اموال ان کے سپرد کر دیئے اور اگر تم ثبوت نہ دے سکے تو تمہارے خلاف فیصلہ ہوگا اور تمہیں پھر دوبارہ ان اموال کا معاوضہ دینا پڑے گا لہٰذا مناسب یہی ہے کہ گواہی حاصل کرلو تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝٧

''مردوں کا بھی حصہ ہے اس میں سے جو ماں باپ اور دوسرے عزیز ترکہ چھوڑ جائیں اور عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں سے جو ماں باپ اور دوسرے عزیز ترکہ چھوڑ جائیں، چاہے وہ کم ہو یا زیادہ لازمی طور پر مقرر کیا ہوا [4] حصہ''۔

---

[1]۔ امرھم اللہ بان یختبروا عقول الیتامی (مجمع البیان)

[2]۔ اختبروھم قبل البلوغ یتتبع احوالھم (صافی)

[3]۔ لایأ خذ لنفسه منه قلیلا ولا کثیرا (مجمع البیان) فلیستعفف من اکلھار (صافی) بدن عوض اس کے مال کی نگھبانی کرے (عمدۃ البیان)

[4]۔ الفرق بین الفرض والوجوب ان الفرض یقتضی فارضا فرضه ولیس کذلك الوجوب لانه یجب الشئی فی نفسه (مجمع البیان)

لڑکیوں کو استحقاق میراث

اتنی تصریح کے ساتھ اس حکم کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی صرف یہ ہے کہ جاہلیت میں لڑکیوں کو حصہ نہیں دیا جاتا تھا، خواہ یہی کہہ کر لڑکیوں کا حصہ نہیں ہے [1] اور خواہ یہ اصول قرار دے کر کہ ترکہ ان کا ہے جو نیزہ و شمشیر سے دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہیں [2] بہر حال جس لباس میں بھی یہ تصور ہو قرآن مجید نے اسے رد کیا ہے۔

اس کے بعد یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں میں بھی بعض جگہ لڑکیوں کو حصہ نہ دینے کا رواج اب تک قائم ہے۔

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ⑧

''اور جب تقسیم کے موقع پر اعزاء اور یتیم اور غریب موجود ہوں تو انہیں بھی اس میں سے کچھ دے دو اور مناسب طریقہ پر ان سے بات کرو۔''

محجوب الارث عزیزوں کے ساتھ سلوک اور ہمدردی

پہلے تو ان حصوں کا ذکر تھا جو بطور فریضہ مقرر ہیں۔ اب ان وارثوں کو ایک استحبابی حکم ہے جو ان کی انسانیت کا تقاضا ہے [3] وہ یہ ہے کہ جائداد جو ورثہ کو ملی ہے، یہ کوئی ان کی محنت ومشقت کو مکسوبہ تو ہے نہیں۔ یہ تو ایک مفت کی دولت ہے جو نہیں مل رہی ہے تو اب اگر کچھ اور عزیز ایسے جو میراث میں حق نہیں رکھتے [4] مگر حاجت مند ہیں۔ یا عزیز نہیں، غیر ہیں اور یتیم یا مسکین کی حیثیت رکھتے ہیں تو یہ ورثہ اس موقع پر ان کے پیٹ بھرنے کا بھی کچھ سامان کر دیں تو بہت اچھا ہے مگر اس طرح نہیں کہ انکی دل آزاری ہو بلکہ مناسب بات چیت کے ساتھ جس سے ان کی دل شکستگی نہ ہو۔ [5]

بعض روایات بتاتے ہیں کہ یہ حکم صدر اسلام میں بطور وجوب تھا جو احکام میراث کے آنے کے بعد منسوخ ہو گیا اس کے بعد یہ معنی نہیں کہ حکم استحبابی بھی برطرف ہو گیا وہ اب بھی باقی ہے اور عمل کرنا اس پر بہتر ہے۔ [6]

---

[1]۔قیل کانت العرب فی الجاھلیة یورثون الذکور دون الاناث فرد اللہ سبحانہ علیھم (صافی)

[2]۔قیل کانوا لا یورثون الا من طاعن بالرماح وذاد عن الحریم والمال (مجمع البیان)

[3]۔المخاطب بذلك الورثة بن ابن عباس و ابن الزبیر و الحسن و سعید بن جبیر و اکثر المفسرین (مجمع البیان)

[4]۔اولو لقربی ممن لا یرث (صافی)

[5]۔تلطفوا لھم فی القول و اعتذروا الیھم و استقلوا ما تعطونھم ولا تمنوا بذلك علیھم (صافی) ان کو دیدیں تو احسان اپنا ان پر نہ رکھیں (عمدۃ البیان)

[6]۔عن الباقر علیہ السلام انہ سئل امنوختہ ھی قال لا اذا حضروك فاعطھم اقول نسخ لا جوب لا ینافی بقاالجواز والاستحباب (صافی)

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۹﴾

''اور ڈرنا چاہیے انہیں کہ جو اگر اپنے بعد بے ہاتھ پیر کے بچے چھوڑ جائیں تو انہیں ان کی فکر ہو گی لہٰذا وہ اللہ سے ڈریں اور صحیح طریقہ پر گفتگو کریں۔''

سیاق آیات سے جو سمجھ میں آتا ہے، یہ ہے کہ ان ایتام کی خبر گیری کے لئے جن کا میراث میں حصہ نہیں ہے، وارثوں کو متوجہ کرنے کے لئے انکے انسانی ضمیر کو بیدار کیا جا رہا ہے کہ آخر تمہیں بھی تو یہ صورت پیش آ سکتی ہے کہ تم چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جاؤ اور ان کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس کا خیال کرو اور اب جو دوسرے کے ایتام ہوں ان کی جہاں تک ہو سکے خبر گیری کرو اور کم از کم دل دکھانے والی باتیں نہ کرو۔

اب جب کہ یہ دوسرے غیر یتیموں کے لئے حکم ہے تو اگر اس ہیئت کی صلبی اولاد ہو اور اسی مرنے والے کے پوتے پوتیاں یا نواسے نواسیاں ہوں جو مجوب ہو گئی ہیں یعنی ان کے باپ یا ماں کا انتقال ان کے دادا یا نانا کے پہلے ہو گیا، اس لئے ترکہ میں ان کا حصہ نہیں رہا جیسا کہ شریعت اسلام کا حکم ہے تو ان چچاؤں یا ماموؤں یا پھوپھیوں یا خالاؤں کو جو وارث ہیں، ان پوتے پوتیوں وغیرہ کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو حسن سلوک تو ضروری ہی کرنا چاہیے اور یہ نہیں کہنا چاہیے کہ تمہارے ماں باپ کا تو پہلے ہی انتقال ہو گیا اب تمہارا اس ترکہ میں حق ہی کیا رہا۔

مگر تفسیروں میں مذکورہ بالا تشریح کے علاوہ دو قول ملتے ہیں:۔

ایک یہ کہ صدر اسلام میں جب کسی مومن کا وقت وفات قریب آتا تھا تو صحابہ آ کر گھیر لیتے تھے اور اس سے کہتے تھے کہ قیامت میں یہ اولاد تمہارے کام نہیں آئے گی لہٰذا اپنی زندگی میں آخرت کا سامان اپنے لئے کر لو تو وہ اپنی تمام املاک کی دوسرے مسلمانوں کے لئے وصیت کر دیتا تھا اور اس طرح وارث بالکل محروم ہو جاتے تھے۔ قرآن نے اس آیت میں اس طرز عمل کی مخالفت کی ہے اور مطلب یہ ہے کہ مرنے والے کو اپنی اولاد کا بھی خیال کرنا چاہیے اور دوسرے لوگوں کو اس کے خلاف وعظ و نصیحت نہیں کرنا چاہیے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کے لئے انتباہ ہے جن کی نگرانی میں یتیموں کے اموال ہیں کہ وہ ان میں خورد برد نہ کریں اور کہا ہے کہ تم دوسرے کے یتیم کے مال میں بے دردی سے کام لیتے ہوا اور یہ تصور نہیں کرتے کہ کہیں تمہاری اولاد تمارے بعد کسمپرسی کے عالم میں مبتلا نہ ہو۔ اس کے مطابق امام موسیٰؑ کاظمؑ کی حدیث ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ خالق نے ان لوگوں کو اس طرز عمل کی بنا پر قدرت کی جانب سے ایک طرح کے انتقام سے ڈرایا ہے کہ تمہارے اس طرز عمل کے نتیجہ میں ہو سکتا ہے کہ خالق تمہیں سزا دے کہ تمہارے یتیموں کا یہی انجام ہو۔[1]

اس کے بعد آیت کا مضمون اس تفسیر کو ذہن سے قریب لاتا ہے کیوں کہ اس میں جیسا کہ ابھی آئے گا، یتیموں کے اموال کھانے ہی کی اخروی سزا کا ذکر ہے۔

---

[1]۔ روی عن موسیٰ بن جعفر علیہ السلام قال ان اللہ اوعد فی مال الیتیم عقوبتین اثنتین اما احدھما فعقوبۃ الدنیا قولہ: ولیخش الذین لو ترکوا الایۃ یعنی بذلک لیخش فی ذریۃ کما صنع بھؤلاء الیتامیٰ (مجمع البیان)

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ
وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾

''یقیناً وہ جو یتیموں کے مال ناحق کھاتے ہیں، وہ اپنے شکموں میں صرف آگ ہے کہ جو بھرتے ہیں اور بہت جلد ایک بڑی آگ کی گرمی کا مزہ چکھیں گے۔''

یتیموں کے مال میں خورد برد کرنے والوں کی سزا

یہ ان افراد کی بدکرداری پر تنبیہ ہے جو اس جرم عظیم کے مرتکب ہیں کہ بجائے اپنے پاس سے ایتام کی اعانت کرنے کے خود یتیموں کے اموال بھی خورد برد کرتے ہیں۔ انہیں آخرت کے عذاب کی خبر دی گئی ہے جو ان کے اس گناہ کا نتیجہ ہے اور یہ لقمہ ہائے تر جو وہ نوش جان کرتے ہیں چونکہ سبب قطعی آگ میں جلنے کا ہیں اس لئے ان کے انجام پر نظر کرتے ہوئے یہ تعبیر کی گئی ہے کہ یہ لقمہ ہائے تر نہیں بلکہ سمجھو آگ ہے جسے وہ اپنے پیٹ میں بھرتے ہیں مگر یہ اس کا احساس ابھی نہیں کرتے۔ جب وہ آگ مستقبل قریب میں ان کے سامنے آئے گی، تب وہ اس کی گرمی کو محسوس کریں گے۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ فَإِن كُنَّ نِسَاءً
فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ
وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِن لَّمْ يَكُن
لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِن
بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ
لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١﴾

''ہدایت کرتا ہے تمہیں اللہ [1] تمہاری اولاد کے بارے میں کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا۔ اب اگر لڑکیاں ہی ہوں دو سے اوپر تو ان کے لئے دو تہائی ترکہ ہوگا اور اگر ایک ہو تو اس کے لئے آدھا ہوگا اور اس (میت) کے ماں باپ کے لئے ہر ایک کے لئے ان میں سے چھٹا حصہ ہوگا متروکہ کا اگر اس کے اولاد ہو۔ اب اگر

---

[1]۔ یوصیکم اللہ ای یامر کم و یفرض علیکم (مجمع البیان)

اس کے اولاد نہیں ہے اور ماں باپ اس کے وارث ہیں تو ماں کو تہائی ملے گا لیکن اگر اس کے بھائی ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، بعد اس وصیت کے جو اس نے کی ہو یا قرضہ کے تمہارے باپ ماں اور تمہاری اولاد، تم نہیں سمجھ سکتے کہ ان میں کون تمہارے لئے زیادہ فائدہ رساں ہے۔ یہ اللہ کی طرف کا مقررہ فریضہ ہے یقیناً اللہ بڑا جاننے والا ہے، بڑا سوجھ بوجھ والا۔"

ماں باپ اور اولاد کی میراث اور ان کے حصوں کی تعین

کوئی مرجائے تو شریعت اسلام نے اس کے متروکہ کو اس کے قرابت داروں کے لئے قرار دیا ہے اب قرابت داروں کے تین طبقے ہیں جن میں سب سے پہلے طبقہ میں ماں باپ اور اولاد ہیں۔ اس آیت میں انہی کے حصوں کا بیان ہے جس میں حسب ذیل مسائل الفاظ قرآنی سے مستفاد ہوتے ہیں:۔

(۱) اگر میت نے اولاد چھوڑی ہے جو صنف میں مختلف ہے مثلاً ایک لڑکا ہے اور ایک لڑکی تو لڑکے کو لڑکی کا دونا ملے گا لہٰذا مال کے تین حصہ ہوں گے۔ دو لڑکے کو دیدیے جائیں گے اور ایک لڑکی کو۔ اسی طرح اگر متعدد ہوں تو اصول یہی ہے کہ ہر لڑکے کے دو حصے مانے جائیں ی گے اور ہر لڑکی کا ایک حصہ اور اتنے حصے لگا کر دو دو حصے لڑکیوں کو دیدیے جائیں گے اور ایک ایک حصہ لڑکیوں کو مثلاً دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہوں تو چار حصے لڑکوں کے اور دو لڑکیوں کے۔ سب چھ حصے ہوں گے اور اگر دو لڑکے ہیں اور ایک لڑکی تو پانچ حصے اور اگر ایک لڑکا ہو اور دو لڑکیاں تو چار حصے۔ اسی طرح جتنی بھی تعداد ہو، اسی اصول پر حساب لگایا جاسکتا ہے۔

(۲) اگر میت نے صرف لڑکیاں چھوڑی ہیں، لڑکا کوئی نہیں ہے تو یہاں الفاظ قرآنی یہ ہیں کہ اگر وہ فوق اثنتین یعنی دو سے اوپر ہیں، اس سے سمجھ میں یہ آتا ہے کہ دو سے زیادہ ہوں مثلاً تین چار یا اور زیادہ ہوں تو ان کے لئے ثلثین یعنی متروکہ کے دو تہائی حصے ہوں گے لہٰذا اگر وہ صرف دو ہوں تو یہ حکم نہیں ہونا چاہیے مگر اجماع امت اس پر ہے کہ دو ہوں یا دو سے زیادہ ہوں، بہرصورت، جب ایک سے زائد ہوں تو یہ حکم ثابت ہے کہ ان کو دو تہائی ملے گا۔ [1]

اب ہم جو احکام کے ماخذ کو قرآن میں منحصر نہیں سمجھتے بلکہ سنت کو بھی قرآن کے ساتھ ماخذ مانتے ہیں [2] ہمارے لئے تو آسان ہے مگر کوئی پرویزی یا پرویزی جو ماخذ احکام کو قرآن میں منحصر سمجھتا ہے، وہ اسے الفاظ قرآن سے کس طرح سمجھے گا؟ یہ وہی بتا سکتا ہے۔

(۳) اگر میت نے صرف ایک لڑکی چھوڑی ہے تو اسے نصف ترکہ ملے گا۔

(۴) کسی نے اگر ماں باپ دونوں چھوڑے اور اولاد بھی موجود ہو تو ماں باپ کو سدسین یعنی ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

(۵) اگر ماں باپ دونوں ہیں، اولاد نہیں ہے، نہ میت کے بھائی موجود ہیں تو اس صورت میں ماں کو ثلث یعنی تہائی ترکہ ملے گا۔ اب

---

[1] ۔ظاھر ھذا الکلام مقتضی ان البنتین لاتستحقان الثلثین لکن الامۃ اجتمعت علی ان حکم البنتین حکم مازادا علیھا من البنات (مجمع البیان)

[2] ۔بین اھل البیت ذلک کلہ علی احسن وجہ...وھذا کما فی سائر الایات القرانیۃ المجملۃ فانھا انما یادلھا الراسخون فی العلم منھم ولایتفرق احد الثقلین عن الاخر (صافی)

باپ کو کیا ملے گا؟ اس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے مگر چونکہ یہ کہہ دیا گیا ہے کہ: ورثہ ابواہ 'اس کے ماں باپ دونوں وارث ہوئے ہیں'' اور پھر ماں کے لئے کہہ دیا گیا کہ اسے ثلث مل جائے گا تو اس سے عقل ایسا سمجھتی ہے کہ ثلث کے بعد جو باقی رہے وہ سب باپ کو مل جائے گا۔ اجماع علمائے بھی اسی کے مطابق ہے۔[1]

(۲) اگر اولا دنہیں ہے اور ماں باپ ہیں مگر میت کے بھائی موجود ہیں تو اگرچہ ماں باپ کی موجودگی میں بھائیوں کو ترکہ ملنا نہیں ہے مگر ماں کو ثلث یعنی تہائی کے ملنے سے وہ سدراہ ہو جائیں گے۔ اسے اس صورت میں بس چھٹا حصہ ملے گا۔

اب یہاں قرآن مجید میں تو لفظ اخوۃ آئی ہے جو جمع ہے اس لئے دو سے زیادہ پر اسے دلالت کرنا چاہیے مگر اکثر عربی میں بھی ایک سے زیادہ پر جمع کا اطلاق کیا جاتا ہے[2] چنانچہ اس موقع پر بھی حکم یہی ثابت ہے کہ اگر صرف دو بھائی ہوں تو بھی ماں کو ثلث نہیں ملے گا۔

اب یہاں نص قرآن جو حصے ثابت ہوئے، وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ثلثین یعنی دو تہائی جو متعدد لڑکیوں کا ہے، جب ان کے ساتھ لڑکا نہ ہو۔

(۲) سُدُس یعنی چھٹا حصہ، یہ اولاد کے ساتھ ماں باپ میں سے ہر ایک کا ہے۔ نیز تنہا ماں کا جب اولا د میت کی نہ ہو مگر بھائی موجود ہوں۔

(۳) ثلث یعنی تہائی۔ یہ اولا د اور بھائیوں کے نہ ہونے کی صورت میں ماں کا حصہ ہے۔

ان حصوں کو جو قرآن مجید سے بالنص ثابت ہیں **فُرُوض** کہا جاتا ہے اور ان اشخاص کو جن کے یہ حصے مقرر ہیں ''**اصحابُ الفروض**'' کہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ وہ ''بِالْقَرَابَة'' ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا تعین از روئے قرآن نہیں ہوتا۔ اس کے لئے پھر سنت ہی کا دامن تھامنے کی ضرورت ہے۔

وہ حسب ذیل صورتیں ہیں:۔

(۱) دو یا اس سے زیادہ لڑکیاں ہیں میت کی، بس تو دو تہائی از روئے قرآن ان کو مل گئے۔ اب باقی ایک تہائی کیا ہوگا؟ اس کا قرآن مجید میں کوئی ذکر نہیں ہے لہٰذا یہ انہیں از روئے قرابت مل جائے گا۔ اس لئے کہ دوسرے ورثہ ان کے مقابلہ میں دور کے ہوں گے۔ ان کے ہوتے ہوئے انہیں میراث کے کسی جز کا بھی حق نہیں ہے۔

(۲) لڑکی بس ایک ہے تو نصف یعنی آدھا از روئے قرآن ملے گا اور باقی آدھا از روئے قرابت۔

(۳) جب اولا د نہ ہو اور ماں باپ ہوں اور بھائی موجود نہ ہوں تو ماں کو ایک ثلث بصورت فرض مل گیا۔ باپ کو کیا ملے گا؟ اس کا ذکر قرآن میں نہیں مگر ہے وہ طبقہ اولی میں ماں کے برابر ہی کا وارث لہٰذا ماں کو ثلث دینے کے بعد باقی دو تہائی مال پورا باپ کو دے دیا جائے گا بر بنائے قرابت۔

---

[1]۔ ظاهره لهذا ايدل على ان الباقى لاب وفيه اجماع (مجمع البيان)

[2]۔ العرب تسمّى الاثنين بلفظ الجمع فى كثير من كلامهم (مجمع البيان)

(۴) جب ماں باپ ہیں، اولاد نہیں ہے مگر میت کے بھائی موجود ہیں تو اب ماں کو ایک سدس ملتا ہے سدس سے زیادہ جتنا ہے وہ باپ کو مل جائے گا۔

(۵) ماں باپ ہیں اور ان کے ساتھ اولاد لڑکے اور لڑکیاں ہیں تو ماں باپ کے لئے سدسین ہیں اور باقی لڑکوں اور لڑکیوں پر اس طرح تقسیم ہوجائے گا کہ لڑکے کو دوہرا اور لڑکی کو اکہرا دے دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر ماں کے ساتھ فقط لڑکے یا ایک لڑکا ہے تو وہاں بھی باقی سب اس لڑکے یا ان لڑکوں کو مل جاتا ہے۔ یہ بھی بربنائے قرابت ہے کیوں کہ لڑکے کا کوئی خاص حصہ قرآن نے مقرر نہیں کیا ہے۔

(۶) ماں باپ کے ساتھ دو لڑکیاں ہوں، تب تو بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں، اس لئے کہ ایک ایک سدس ماں باپ کو مل گیا جس کا مجموعہ ایک تہائی ہوا اور ثلثین یعنی دو تہائیاں لڑکیوں کو مل گئیں لیکن اگر ماں باپ کے ساتھ ایک لڑکی ہو تو چھ میں سے دو سدس یعنی ایک ایک تو ماں باپ کو مل گیا اور نصف یعنی تین لڑکی کو مل گئے۔ اب ایک بچ گیا یہ کیا ہو؟ یہ انہی لوگوں پر ان کے حصص کے اعتبار سے تقسیم ہونا چاہیے یعنی پانچ حصے کر کے ایک ایک والدین کو دے دیا جائے اور تین لڑکی کو یہ بربنائے قرابت ہے۔ فروض جواز روئے قرآن ثابت ہیں، ان میں شیعہ سنی کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے مگر یہ صورتیں جن میں فرض کے بعد کچھ مقدار بچتی ہے اور وہ بربنائے قرابت دی جاتی ہے، ان میں فقہی حیثیت سے فرقہ جعفریہ اور دوسرے فرق کے درمیان اختلاف ہے مگر چونکہ یہ اختلاف مندرجہ قرآن مضامین سے متعلق نہیں ہے، اس کا طے کرنا تفسیر قرآن کے موضوع سے خارج ہے۔ فقہ کی استدلالی کتابوں میں طے کرنے کا ہے۔ اس لئے اس بحث کو یہاں درج کرنا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

''تم نہیں سمجھ سکتے کہ ان میں کون تمہارے لئے زیادہ فائدہ رساہے'' اس سے میری تو سمجھ میں یہ آتا ہے کہ چونکہ اس کے پہلے اولاد اور پھر ماں باپ، ان دونوں کی میراث کا ذکر ہے۔ اس لئے یہ فقرہ خود ان کے وارث ہونے سے متعلق ہے اور اس سے ایک بات تو یہ ظاہر ہوتی ہے کہ والدین اور اولاد ایک طبقہ میں ہیں اور بہ حیثیت استحقاق مساوی الدرجہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ مقدار حصہ میں جو ان کے فرق قرار دیا گیا ہے کہ اولاد ایک لڑکی ہو تو وہ نصف ضرور پاجاتی ہے اور دو سے زیادہ ہوں تو دو تہائی اور لڑکے لڑکیاں دونوں ہوں تو ماں باپ کو دے کر جتنا ہے، سب انہیں مل جائے گا اور ماں باپ دو چھٹے حصوں ہی کے مستحق ہیں، اس کے فلسفہ کی طرف اشارہ ہے کہ دین اور دنیا کے فوائد اس شخص کے جتنے بعد کی نسل سے وابستہ ہیں، اتنے پیش رووں سے وابستہ نہیں ہیں، اس لئے ان میں خالق نے یہ فرق قرار دیا ہے۔

اللہ ان میں جو فرق ہے، اس سے واقف ہے کیوں کہ وہ علیم ہے اور اسی کے مطابق حکم شرعی میں فرق قرار دیتا ہے کیوں کہ وہ حکیم ہے۔

مولانا عمار علی صاحب مرحوم نے اسے تمام ورثہ سے متعلق قرار دے کر یوں تشریح کی ہے کہ ''تم نہیں جانتے کہ وارثوں میں سے وہ کون سا ہے کہ جس کا نفع دنیا اور آخرت میں تم کو زیادہ پہونچتا ہے اور ہم جانتے ہیں، اس واسطے ہم نے حصوں میں تفریق کی ہے کہ کسی کو زیادہ پہنچایا ہے اور کسی کو کم پہنچایا ہے۔''...... (عمدۃ البیان)

اس میں بھی کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا مگر ملا محسن فیض نے اس کے مضمون کو پھیلا کر عجیب پیچیدہ طریقہ سے وراثت اور وصیت دونوں پر حاوی قرار دیتے ہوئے یوں تشریح کی ہے کہ:

يعني لا تعلمون من انفع لكم من اصولكم و فروعكم و عاجلكم و اجلكم ممّن يورثكم و ير ثكم اممّن اوصىٰ منهم فعرّضكم للتواب بأمضاء وصية ام من لم يوص فوفر عليكم ماله او من اوصيتم له فوفر تم عليه

ام من لم توصوا له فحرمتموه (صافی)

مقصد یہ ہے کہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے اصول (ماں باپ وغیرہ) اور فروغ (اولاد) میں سے جن کی میراث تم پاتے ہو اور جو تمہاری پاتے ہیں یا ان میں جو وصیت کر جاتے ہیں اور تمہیں اس وصیت کو پورا کرنے سے ثواب آخرت فراہم کرتے ہیں یا جنہوں نے وصیت نہیں کی اور اس طرح تمہارے لئے مال آزادی سے استعمال کے لئے چھوڑ دیا یا جس کے لئے تم نے وصیت کی تو مال اس کے لئے فراہم کر دیا یا تم نے اس کے لئے وصیت نہیں کی تو وہ محروم ہوگیا۔

یہ طویل الذیل تفصیل الفاظ قرآنی سے میرے ذہن میں نہیں آتی۔ ہاں اگر کوئی حدیث بتادیتی کہ اس سے یہ مقصود ہے تو سر تسلیم خم ہوجاتا مگر یہاں صاحب تفسیر صافی نے حدیث کوئی پیش نہیں کی ہے۔

علامہ طبرسیؒ کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ یہ جملہ ہمیشہ آماجگاہ نظر بنا رہا ہے چنانچہ قدیم مفسرین کے پانچ قول انہوں نے اس کے متعلق بیان کیے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی کسی معصوم کی طرف نسبت نہیں رکھتا تا کہ اس کا وزن محسوس ہو۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِينَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّورَثُ كَلَٰلَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَّلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوٓا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصَىٰ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿١٢﴾

''اور تمہارے لئے آدھا ہوگا اس متروکہ کا جو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں اگر ان کے اولاد نہ ہو لیکن اگر ان کے اولاد ہو تو تمہارے لئے ان کے متروکہ کا چوتھائی ہوگا، بعد اس وصیت کے جو انہوں نے کی ہو یا قرضہ کے اور ان کے لئے چوتھائی ہوگا تمہارے متروکہ سے اگر تمہارے اولاد نہ ہو اور اگر تمہارے اولاد ہو تو ان کے لئے تمہارے متروکہ کا آٹھواں حصہ ہوگا، اس لئے وصیت کے بعد جو تم نے کی ہو یا قرضہ کے اور اگر کسی مرد یا عورت کے وارث مادری بھائی بہن ہوں تو ان میں جو کوئی ایک ہو، اسے چھٹا حصے ملے گا اور اگر ایک سے زیادہ ہوں تو وہ تہائی متروکہ میں برابر کے حصہ دار ہوں گے، بعد اس وصیت کے جو کی گئی ہو یا قرضہ کے درانحالیکہ نقصان پہنچانے کا درپے نہ

ہو۔ یہ اللہ کی طرف کی لازمی ہدایت ہے اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، برداشت سے کام لینے والا۔"

شوہر اور زوجہ کی میراث

سابقہ فرائض سے ماوراء اس آیت میں بھی فرائض کا بیان ہے جن میں ایک قسم سببی ہے یعنی ازدواجی تعلق سے جو رشتہ پیدا ہوتا ہے اور دوسری قسم نسبی ہے یعنی خون کا رشتہ۔

پہلی قسم میں چار مسئلے ہیں:۔

(۱) زوجہ مر جائے اور اس کے کوئی اولاد لڑکا یا لڑکی نہ ہو تو شوہر کو نصف متروکہ ملے گا۔

(۲) زوجہ کا انتقال ہو اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو، نہ لڑکا نہ لڑکی، نہ اس شوہر سے، نہ کسی پہلے شوہر سے تو اس صورت میں شوہر کو چوتھائی ملے گا۔

(۳) شوہر مر جائے اور اس کے کوئی اولاد، لڑکا یا لڑکی موجود نہ ہو۔ نہ اس بیوی سے، نہ کسی اور سے تو، بیوی کو چوتھائی ملے گا۔

(۴) شوہر کا انتقال ہو اور اس کے اولاد ہو، خواہ کسی اور بیوی سے تو اس صورت میں بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا۔

اب یہاں ایک چیز فقہ امامیہ کے منفردات میں سے ہے اور وہ یہ کہ زوجہ کو زمین میں سے بالکل حصہ نہ ملے گا اور زمین کے علاوہ جائداد غیر منقولہ جیسے عملہ مکانات اور اشجار وغیرہ، اس میں بھی اصل جائداد سے حصہ نہیں ملے گا مگر قیمت کا حساب لگا کر اس کا چوتھا یا آٹھواں حصہ دیا جائے گا۔ بے شک نقد یا جنس، اشیائے منقولہ جتنے ہوں، اس میں حصہ پائے گی۔

میراث ازواج میں بحث طلب مسئلہ

یہ تفصیل قرآن سے نہیں، سنت یعنی احادیث سے ثابت ہے۔ دوسرے حلقوں سے کہا جاتا ہے کہ یہ حکم قرآن کے خلاف ہے اور یہ مسلم اصول ہے کہ احادیث قرآن کے خلاف کسی بات کے بارے میں مستند نہیں سمجھے جا سکتے مگر ہم کہتے ہیں کہ بکثرت نظائر کو چھوڑتے ہوئے ذرا صرف گزشتہ آیت میں جو باتیں باجماع امت سنت کے رو سے ثابت ہیں، انہیں ملاحظہ فرمایئے، ان کی کیا نوعیت ہے؟

(۱) قرآن کہہ رہا ہے کہ اگر لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لئے دو تہائی ترکہ ہوگا، اجماع امت یہ ہے کہ اگر دو ہیں تو بھی یہی حکم ہے۔

(۲) قرآن کہہ رہا ہے کہ لڑکیوں کو اگر کئی ہوں تو ثلثین ملیں گے؟ باقی ثلث کیا ہوگا؟ قرآن اُسے نہیں بتاتا۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ ثلث بھی انہی لڑکیوں پر بطور قرابت رد ہو جائے گا۔ جمہور کہتے ہیں کہ میت کے عصبہ یعنی باپ کے رشتہ داروں کو جو صنف ذکور سے ہوں، وہ دے دیا جائے گا۔ قرآن میں صراحۃً نہ اس کا ذکر ہے، نہ اس کا۔

(۳) اسی طرح جب ایک لڑکی ہو تو قرآن کہہ رہا ہے کہ نصف ملے گا، نصف کیا ہوگا؟ اسے کچھ نہیں بتاتا ہم کہتے ہیں کہ اسی لڑکی کو بطور رد ملے گا۔ دوسرے کہتے ہیں کہ عصبہ کو مل جائے گا۔

(۴) اگر ماں باپ ہوں اور اولاد موجود نہ ہو تو قرآن بس اتنا کہہ رہا ہے کہ ماں کو تہائی ملے گا۔ باپ کا کوئی ذکر نہیں، اجماع امت کہتا

ہے کہ باقی جتنا ہے، وہ سب باپ کو ملے گا۔ اسی طرح اگر بھائی موجود ہوں تو قرآن میں ہے کہ ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور باپ کو کیا؟ کوئی ذکر نہیں، اجماعِ امت یہ ہے کہ باقی سب باپ کو مل جائے گا۔

تو یہ سب احکام کیا خلاف قرآن ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ مخالفت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کوئی حکم قرآن میں مذکور ہو اور حدیث اس کے خلاف بتلائے تو یہ حدیث قابل قبول نہیں ہے، رد کر دی جائے گی لیکن کسی چیز کا قرآن میں ذکر نہیں اور حدیث نے اس کا حکم بتا دیا یا قرآن میں اجمالی ذکر ہے اور حدیث نے اس کے قیود و شرائط تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے، اس کو مخالفت نہیں کہتے اور حدیثوں کو جو ہم قرآن کے ساتھ ماخذ احکام مانتے ہیں، وہ اسی صورت سے مذکورہ بالا تمام احکام کی نوعیت یہی ہے۔

مثلاً قرآن نے اگر یہ کہا ہوتا کہ لڑکیاں دو ہوں، اس سے زیادہ نہ ہوں تو انہیں ثلثین نہیں ملیں گے تب یہ حکم دو کو بھی ثلثین ملیں گے، قرآن کے خلاف ہوتا مگر قرآن نے کہا کہ ایک ہو تو نصف ملے گا اور دو سے اوپر ہوں تو ثلثین ملیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دو کا حکم مسکوت عنہ رہ گیا یعنی اس کے لئے قرآن کی لفظوں نے بظاہر کچھ نہیں کہا۔ حدیث نے اسے بتا دیا کہ دو کا بھی حکم وہی ہے جو دو سے زیادہ کا ہے۔ اسی طرح لڑکیوں کو ثلثین دینے کے بعد باقی ثلث اور ایک لڑکی کو نصف دینے کے بعد باقی نصف اور ماں کے ثلث یا سدس کے بعد باپ کا حصہ، قرآن میں مسکوت عنہ ہے لہٰذا حدیث سے اس کے حکم کا استفادہ ہوسکتا ہے اور ہونا چاہیے۔ اسے قرآن کی مخالفت نہیں سمجھ سکتے۔

اسی طرح یہ ہے کہ اگر قرآن نے کہہ دیا ہوتا کہ زوجہ کو ہر طرح کے مال سے چاہے وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ، یہ حصہ ملے گا تو اب کسی حدیث کے رو سے کسی مسلمان میں دم نہیں تھا کہ وہ اس حکم کے خلاف کوئی فتویٰ دے سکتا مگر قرآن مجید کو یہاں حصے بیان کرنا ہیں۔ اس کا بیان کرنا نہیں ہے کہ کس کس طرح کے مال میں زوجہ کا حصہ ہوگا۔

بے شک جہاں بھی اس کا حصہ ہے، وہ یہی ہوگا جسے قرآن نے بیان کیا ہے مگر یہ کہ کن صورتوں میں اس کا حصہ ہے؟ اس کو قرآن نے مجمل چھوڑ دیا ہے۔ احادیث نے اس کی تشریح کردی کہ یہ حصہ جائداد منقولہ میں ہوتا ہے۔ غیر منقولہ میں نہیں ہوتا۔ تو اسے اجمال قرآن کی تفصیل سمجھنا چاہیے۔ مخالف قرآن سمجھنا اس کو غلط ہے۔

دوسری قسم کا حکم جو نسبی رشتہ سے متعلق اس آیت میں بیان ہوا ہے، وہ کلالہ کا ہے کلالہ کی لفظ قرآن مجید میں دوسری جگہ حقیقی (جن کے ماں باپ دونوں ایک ہوں) ان دونوں قسم کے بھائیوں کے لئے آئی ہے مگر یہاں جو حکم مذکور ہے، وہ معصومینؑ کی تشریح کی بنا پر اخیافی بھائی بہنوں کا ہے یعنی وہ سوتیلے بھائی بہن جن کی ماں ایک ہو اور باپ الگ الگ ہوں۔ [1]

حقیقت یہ ہے کہ کہلاتے یہ سب کلالہ ہیں، صرف اضافت سے ان کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ ایک کو کہیں گے الکلالۃ للابوین، ایک کو کہتے ہیں للاب اور ایک کو کہتے ہیں للام۔

اب یہاں اضافتوں کی تعین کہ کس جگہ کون سے کلالہ مراد ہیں بیان حاملین قرآن سے ہوتی ہے، ورنہ صرف الفاظ قرآنی پر کوئی دار و مدار

---

[1]. فسرت فی الکافی عن الصادقؑ بمن لیس بولد ولا والد ای القریب من جھۃ العرض لا الطول والمراد بھا ھنا الاخوۃ والاخوات من الام خاصۃ وفی الآیۃ الاخری من الاب والام او الاب فقط کذا عن المعصومین (صافی)

رکھے تو دونوں جگہ کے بیان شدہ حکموں میں معاذ اللہ اختلاف نظر آئے۔

بہر صورت اس آیت میں حکم جو بیان ہوا ہے، وہ کلالۃ الام کا ہے کہ اگر ایک ہو تو سدس ملے گا اور ایک سے زیادہ ہوں تو ثلث ملے گا، اس طرح کہ مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہ ہوگی بلکہ ایک ثلث سب پر برابر سے تقسیم کر دیا جائے گا۔

وصیت وقرض میراث سے مقدم

گزشتہ آیات میں جو حصے بیان ہوئے اور اس آیات میں جو حصے، ان سب میں یہ قید لگائی ہے کہ یہ حصے وصیت یا قرضے کے بعد ہوں گے۔

اب یہاں بھی قرآن نے لفظ وصیۃ مجمل کہی ہے۔ احادیث سے اس کی تفصیل معلوم ہوئی ہے کہ وصیت ثلث تک اگر ہو تو اس میں ورثہ کو کوئی اختیار نہیں ہے لیکن اگر ثلث سے زیادہ ہو تو وہ رضائے ورثہ پر موقوف ہوگی۔

اس آیت میں وصیت اور قرضہ کے حکم کے ساتھ جو ایک قید ہے کہ ''وہ وصیت نقصان پہنچانے والی نہ ہو۔'' اس سے مجملاً یہ پتہ چلتا ہے کہ بعض وصیتیں نا قابل قبول ہوتی ہیں۔ اب اس اجمال کو اس تفصیل پر بھی منطبق کر سکتے ہیں کہ ثلث سے زیادہ جو وصیت ہو، وہ چونکہ حقوق ورثہ کو بہت نقصان پہنچاتی ہے لہٰذا نا قابل قبول ہے اور اس کے علاوہ خاص طور پر ورثہ کو ضرر پہنچانے والی کوئی دوسری وصیت ہو۔ وہ بھی مراد ہوسکتی ہے۔[1]

وصیۃ من اللہ اسے نحوی قواعد کے لحاظ سے ان تمام سابق احکام میراث کے بیان سے بھی متعلق کیا جا سکتا ہے اور خاص حکم وصیت سے بھی اور آخر میں اس کے اس جز سے بھی کہ نقصان پہنچانے کا سبب نہ ہو۔

یہ اللہ کی طرف کی وصیت یعنی ہدایت ہے۔[2]

اب یہ ہدایتیں خالق کی چونکہ الزامی حیثیت رکھتی ہیں یعنی ان کی مخالفت جائز نہیں ہے، اس لئے تتمۂ آیت میں ایک لفظ رکھ دی جو در صورت مخالفت ان کے غضب الٰہی کے مستوجب ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ سب جانتا ہے مگر وہ حلیم یعنی برداشت سے کام لینے والا ہے۔[3]

حلم یعنی برداشت کی لفظ اسی چیز کے مقابلہ میں صرف ہوتی ہے جس میں تقاضا ناراضگی اور سزا کا موجود ہو۔

تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ يُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا

الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ وَذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۝۱۳ وَمَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ

---

[1]. غیر مضار للورثۃ بالزیادۃ علی الثلث او ان یقصد الاضرار بہا (صافی)

[2]. وصیۃ نصب علی المصدر ای یوصیکم اللہ بذلک وصیۃ (مجمع البیان)

[3]. علیم بالمضار وغیرہ حلیم لا یعاجل بعقوبۃ (صافی)

وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۖ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

''یہ اللہ کی طرف کی حدیں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے تو وہ اسے ان بہشتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کردہ حدوں سے قدم آگے بڑھائے گا، اسے وہ بڑی ہولناک آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔''

ان دو آیتوں میں جو وعدہ وعید ہے، ان میں وعدہ ان مومنین کے لئے ہے جو اطاعت گزار ہیں۔ اب اس کے مقابلہ میں جو وعید ہے وہ کافروں کے لئے اگر ہو تو بالکل صاف ہے کہ کافر و مشرک بیشک مخلد فی النار ہیں لیکن الفاظ آیت یہ ہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی اور اس کے حدود سے تجاوز کرے، جو مطلق گناہ پر صادق ہیں، ایسے گناہوں پر جن کی سزا خلود جہنم نہیں ہے۔

اس بنا پر جیسا کہ دوسرے آیات و احادیث سے ثابت ہے، اس میں یہ قید سمجھنا ناگزیر ہے کہ ان حدود سے تجاوز کرے جن کی مخالفت کی سزا آتش جہنم اور خلود فی النار ہے تو اس کے لئے یہ سزا ہوگی ورنہ جس درجہ تک حد الٰہی سے تجاوز کرے گا اس درجہ کی سزا پائے گا یا پھر حد سے تجاوز کو عمل کے علاوہ اعتقاد پر حاوی قرار دیا جائے جو انکار ما نزل اللہ میں داخل ہو اور کفر قرار پائے۔[۱]

ایک تیسرا پہلو یہ پیدا کیا گیا ہے کہ من یتعد حدودہ ''جو اس کے حدود سے تجاوز کرے۔'' اس میں حدود کے لفظ جمع ہے اور اضافت کے ساتھ جمع استغراق کے معنی پیدا ہوتے ہیں یعنی اللہ کی تمام حدوں سے تجاوز کرے اور ایسا شخص کافر ہی ہوسکتا ہے۔ مومن نہیں ہوسکتا۔[۲]

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ
فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ
لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کریں[۳] تو ان پر اپنوں سے چار کی گواہی حاصل کرو، اگر وہ گواہی دے دیں تو انہیں گھروں میں روک رکھو اس وقت تک کہ موت ان کی عمر کو پورا کرے یا ان کے لئے اللہ کوئی صورت پیدا کرے۔''

ہر دعوے کا ثبوت دو گواہوں سے ہوتا ہے مگر یہ ناموس کا معاملہ اور بدچلنی کا الزام اتنا سخت ہے کہ بغیر چار گواہوں کے ثابت نہیں ہوتا۔

---

[۱]۔ اگر حلال کو حرام جانتا ہے اور حرام کو حلال جانتا ہے (عمدۃ البیان)

[۲]۔ المراد به من تعدّیٰ جمیع حدود اللہ و هذه صفة الكفار (مجمع البيان)

[۳]۔ اجمعوا علیٰ ان المراد بالفاحشة هنا الزنا (مجمع البيان)

جنسی جرم کے ثبوت کے لئے چار گواہوں کی ضرورت

ظاہر ہے کہ اس عورت کی بدچلنی اور بے باکی کی حد ہی نہیں اور وہ سماج کے لئے کیسی زہر قاتل ہے جو ایسے جرم کا ارتکاب اتنے آدمیوں کے سامنے کرے کہ چار چشم دید گواہ اور وہ بھی عادل، اس کے جرم کے ثبوت میں پیش ہوسکیں۔ پھر ایسی عورت کو بداخلاقی سے روکنے یا کم از کم سماج کو اس کے اثرات سے بچانے کے لئے اگر یہ سختی کی جائے تو کیا وہ بے محل سمجھی جاسکتی ہے؟

احادیث معصومین علیہم السلام سے ثابت ہوتا ہے کہ زانیہ کے لئے یہ قید عمری اور اس کے بعد کی آیت والی سزا ابتدائے اسلام میں رکھی گئی تھی مگر بعد میں جب وہ آیت نازل ہوگئی کہ:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيۡ فَاجۡلِدُوۡا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا مِائَةَ جَلۡدَةٍ

زناکار عورت اور زناکار مرد، ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

تو وہ پہلا حکم جو آیندہ کی آیت میں مذکور ہے، منسوخ قرار پا گیا اور اس کے بعد یہی سو سو کوڑے مارنے کا حکم ہو گیا بشرطیکہ زنائے محصنہ نہ ہو [1] اور زنائے محصنہ کی صورت میں سنگسار کرنے کا قانون جاری ہو گیا جس کا حکم قرآن میں ظاہر موجود نہیں مگر باجماع امت ثابت ہے۔

ایک دوسرا تصور یہ ہے کہ اس دوسرے قانون کے نفاذ کے بعد بھی پہلی آیتوں کو منسوخ سمجھنا ضروری نہیں ہے۔ اس لئے کہ پہلے یہ گھروں میں روکنے کا جو حکم دیا گیا ہے کہ وہ دائمی کب ہے؟ اس میں تو یہ حد بندی ہے کہ ان کی زندگی کا خاتمہ ہوجائے یا اللہ ان کے لئے کوئی دوسری صورت پیدا کرے۔ وہ دوسری صورت یہاں بیان نہیں کی گئی۔ وہ اس کے بعد معلوم ہوئی جب اس جرم کی حد شرعی کو بیان کردیا گیا۔

ظاہر ہے کہ اس حد شرعی کے بعد انکے بند رکھے جانے کا سوال ختم ہوجاتا ہے تو ناسخ اور منسوخ تو وہاں ہوتا ہے جہاں دونوں حکم ایک دوسرے کے خلاف ہوں اور یہاں ایسا نہیں ہے بلکہ ایک حکم کے اجمال کی تشریح دوسرے حکم سے ہوجاتی ہے تو اسے نسخ کے تحت میں کیوں داخل کیا جاتا ہے۔ [2]

وَالَّذٰنِ يَاۡتِيٰنِهَا مِنۡكُمۡ فَاٰذُوۡهُمَا‌ ۚ فَاِنۡ تَابَا وَاَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمَا‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۶﴾

''اور وہ دو شخص تم میں سے جو ایسا کریں تو انہیں تکلیف پہنچاؤ۔ اب اگر وہ توبہ کریں اور اپنے عمل کو ٹھیک کرلیں تو انہیں چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

یہ ان مرد اور عورت کا حکم ہے جو غیر شادی شدہ ہوں یعنی کوئی بھی ان میں کا زنائے محصنہ کا مرتکب نہ ہوا ہو جس کی شرعی سزا ہے سنگ سار کیا جانا لیکن اگر مرد ایسا ہے کہ اس کے کوئی بیوی نہیں ہے اور عورت بھی ایسی ہے کہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے تو اس کے سنگ سار کیے جانے کا حکم نہیں

---

[1]۔ هذا الاية والتي بعدها منسوختان باية الزانية والزاني (صافی)

[2]۔ قال بعضهم انه غير منسوخ لان الحبس لم يكن مويدا بل كان مستندا الی غاية فلا يكون بيان الغاية نسخا (مجمع البيان)

ہے۔انہیں بس تکلیف پہنچانا چاہیے۔تکلیف کا مطلب لیا گیا ہے لعنت ملامت کرنا کہ انہیں احساس جرم پیدا ہوا۔اس لئے اس آیت کو بھی منسوخ قرار دیا گیا ہے اس معین حد شرعی کی وجہ سے جو اس کے بعد سورہ نور میں وارد ہوئی جس میں زانی عورت اور مرد دونوں کو یکساں حکم یہ ہے کہ:۔

فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ:

ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

مگر یہاں بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن نے یہاں ایذاء کا حکم مجمل دیا ہے اور اس ایذاء کی تفصیل و تعیین سورہ نور میں ہوئی ہے تو یہ بھی نسخ میں داخل نہیں ہے۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

''توبہ کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ بس ان کے لئے ہے جو برائی کرتے ہیں نادانی سے [1] پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ یہ ہوتے ہیں جن کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، صحیح کام کرنے والا اور ان کے لئے توبہ نہیں ہے جو برائیاں کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی ایک کے سر پر موت آ کے کھڑی ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اس وقت میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان کے لئے جو مرتے ہیں اس حالت میں کہ وہ کافر ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے۔''

وہ جن کی توبہ قبول نہیں

یہ آیتیں بڑی ہمت شکن ہیں۔ وہ کہ جو کفر کی حالت میں دنیا سے جائیں، ان کی توبہ قبول نہیں، یہ تو بالکل مطابق توقع ہے، اس لئے کہ ایمان ہر عمل کی قبولیت کی لازمی شرط ہے اور توبہ بھی ایک عمل ہے لہٰذا کافر کفر سے توبہ کرے تو پھر وہ کافر ہی کہاں رہے گا اور قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ وہ حالت کفر میں دنیا سے جا رہے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کفر سے وہ توبہ کرتے نہیں۔ کچھ اور غلطیوں اور گناہوں سے توبہ کرتے ہیں تو اس توبہ سے کوئی فائدہ ہونا ہی نہ چاہیے مگر اسے تو قرآن مجید نے صراحۃً الگ سے ذکر

کیا تو اس کے پہلے جنہیں کہا گیا ہے کہ توبہ قبول نہیں، وہ وہ ہیں جو دائرہ اسلام و ایمان میں داخل ہیں، اس کے باوجود جب انہوں نے

[1] متبلسين بها سفها فان ارتكاب الذنب والمعصية سفه وتجاهل (صافی) هو المروی عن ابی عبدالله فانه قال كل ذنب عمله العبدوان كان عالما فهو جاهل حين خاطر بنفسه فی معصية ربه (مجمع البيان)

بالکل آخروقت توبہ کی تو قرآن کہہ رہا ہے کہ ان کی توبہ قبول نہیں۔[1] نعوذ باللہ من ذلك

بعض مفسرین نے بس ایک گنجائش نکالی ہے اور وہ جمع بین الا دلہ کے لحاظ سے شاید بعید نہ ہو کہ یہاں جس چیز کی نفی کی جارہی ہے وہ قبول توبہ کا وجوب ہے جو علی اللہ کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے یعنی ''توبہ کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ بس ان کے لئے''......''ذمہ'' کا مطلب ہے لازماً توبہ قبول کرنا۔اسے کہا گیا ہے کہ یہ بس ان کے لئے ہے جو جلدی توبہ کرلیں۔اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسری صورت میں تفضلا بھی توبہ قبول کرنا غیر ممکن ہو بلکہ اللہ کا فضل وکرم شامل حال ہو تو وہ آخر وقت بھی توبہ کرسکتا ہے۔اس کے رحم وکرم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔[2]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَـيْـــًٔـا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝۱۹

اے ایمان لانے والو! تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بنو اور نہ ان پر سختی کرو تاکہ تم کچھ حصہ اس کا جو تم نے اُنہیں دیا ہے، لے اڑو سوا اس صورت کے جب وہ کھلی ہوئی غلط کاری کریں اور ان کے ساتھ زندگی گزارو بھلائی کے ساتھ۔اگر تم انہیں ناپسند بھی کرتے ہو تو بہت ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور اللہ اس میں بہت بھلائی قرار دے۔''

زمانہ جاہلیت کے ایک رسم کی ممانعت

آیت کا مضمون صاف بول رہا ہے کہ اس کی کوئی خاص شان نزول ہے۔اس شان نزول سے یہ پتہ چل سکے گا کہ زبردستی وارث بننے سے مقصود کیا ہے؟ یہ سختی کرنا کیا ہے جس سے غرض یہ ہے کہ کچھ حصہ جو انہیں دیا ہے، اسے لے اڑے اور یہ ناپسندیدگی کون سی ہے جس میں ممکن ہے کہ اللہ نے بھلائی مضمر کی ہو؟

روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا کہ کسی شخص کے انتقال کے بعد اگر اس کی بیوہ ہے اور کوئی دوسرا وارث ہو خواہ وہ بیٹا ہو تو وارث اس عورت کی میراث کی طمع میں شوہر کے بعد خود اس کے سر پر کپڑا ڈال دیتا تھا کہ یہ اب میری زوجہ ہے اور اس طرح اسے اپنی بیوی کہہ کر اسے گھر میں بند کرکے رکھتا تھا اور خود اس کے لئے کوئی مہر بھی معین نہیں کرتا تھا بلکہ جو مہر اس مورث نے دیا تھا، اسی میں اس کے دیگر

---

[1]۔اس آخر وقت میں توبہ اس واسطے قبول نہیں ہوتی کہ جس وقت روح گلے میں پہونچتی ہے، اس وقت وہ تکلیف شرع سے باہر ہوجاتا ہے اور آخرت میں قدم رکھتا ہے۔ (عمدۃ البیان)

[2].وجوب القبول غیر التفضل به(صافی)

متروکہ کے مثل یہ اس عورت کا وارث بھی قرار پاجاتا تھا۔ اسی کو اس آیت میں روکا ہے۔[1]

ایک روایت میں یہ ہے کہ خود دورِ اسلام میں ایسا واقعہ پیش آیا۔ ابوقیس بن اسلت ایک صحابی کے انتقال کے بعد اور اس شان نزول کی روایت بھی معصومؑ سے وارد ہوئی ہے۔[2]

اب اس کے بعد جو ہے: **ولا تعضلوهن لتذهبوا ببعض ما اتيمتوهن**'' اور ان پر سختی کرو، تاکہ کچھ حصہ اس کا جو تم نے انہیں دیا ہے لے اڑو'، اسے بعض لوگوں نے اس حکم کا تتمہ قرار دیا ہے اور اس صورت میں سختی کرنے سے مراد ان کو عقد ثانی سے روکنا ہے مگر ذہن سے زیادہ قریب یہ چیز ہے اور وہ معصوم سے مروی بھی ہے کہ آیت کا پہلا جز تو اسی صورت سے متعلق ہے اور دوسرا جز، وہ شوہروں کو خود ان کی بیویوں کے متعلق ہدایت ہے اور اب **لا تعضلوهن** کا مطلب یہ ہے کہ ان پر سختی نہ کرو کہ وہ اس مہر کو جو تم نے انہیں دیا ہے، کل یا جز تمہارے سپرد کردیں۔[3]

اس کے بعد **الا ان یاتین بفاحشته مبینة** اس صورت کے کہ جب وہ کھلی ہوئی غلط کاری کریں' جو کہا گیا ہے، اس اک مہر سے تعلق نہیں ہے بلکہ سختی کرنے سے جو ممانعت ہوتی ہے، بظاہر یہ اس سے استثناء ہے کہ واپس لینے کے لئے تو سختی نہ کرو۔ ہاں اگر وہ غلط کاری کی مرتکب ہوں تو سختی کرو جس کا حق اس کے قبل کی ایک آیت میں بھی دیا جاچکا ہے۔

پھر عام شوہروں کے لئے ہدایت ہے کہ جب عورت میں کوئی بدچلنی والی صورت نہیں ہے تو ان سے اچھے عنوان اور حسن سلوک کے ساتھ[4] زندگی گزاروں۔ اگر تمہارا دل ان سے نہیں بھی ملتا ہے، تب بھی اس کا اثر بدسلوکی کی شکل میں نمودار نہیں ہونا چاہیے اور نہ طلاق دے کر چھٹکارا حاصل کرنا کوئی اچھی بات ہے اس لئے کہ ممکن ہے اللہ نے ان میں تمہارے لئے بڑی بھلائی رکھی ہو جس کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ اللہ نے انہی سے تمہارے لئے اولاد صالح مقدر فرمائی ہو۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا
تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ
اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

''اور اگر تم ایک بیوی بدل کر اس کی جگہ دوسری بیوی کرنا چاہو[5] اور تم نے ان میں سے ایک کو بڑی رقم بھی دے

---

[1]۔ القمی عن الباقر علیہ السلام کان فی الجاهلیة اذا مات حمیم الرجل وله امراة القی الرجال ثوبه علیها فورث نکاحها بصداق حمیمه الذی کان اصدقها یرث نکاحها کما یرث ماله (صافی)

[2]۔ عن مقاتل وهو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام (مجمع البیان)

[3]۔ العیاشی من الصادق قال الرجل تکون له امرأة فیضر بها حتی تفتدی منه فنهی الله عن ذلك (صافی)

[4]۔ بالانصاف فی الفعل والاجمال فی القول (صافی)

[5]۔ تطیق امراة وتزویج اخری (صافی)

دی ہو [۱] تو اُس میں سے کچھ لو نہیں کیا تم اُسے لو گے جھوٹا الزام لگا کر اور کھلے ہوئے گناہ کے طور پر؟ اور کیوں کر تم اسے لو گے جب کہ تم میں سے ایک دوسرے کی مقاربت سے لطف اندوز بھی ہو چکا ہے [۲] اور وہ تم سے پورا پورا عہد و پیمان لے چکی ہیں۔"

یہ بھی ایک دور جاہلیت کی حرکت تھی کہ کسی شوہر نے ایک خوبصورت عورت کو دیکھ لیا اور اس کا دل اس پر آ گیا تو اب وہ اپنی زوجہ پر بدکاری کا الزام لگا دیتا تھا اور اسے اتنا ستاتا تھا کہ وہ اپنا مہر چھوڑ دے اور یہ اسے طلاق دے دے۔ اس کو روکتے ہوئے ارشاد ہو رہا ہے کہ ایک عورت کو طلاق دیدینے کا تمہیں حق ہے مگر مہر اس کا چاہے، بہت زیادہ بھی ہو، وہ اسے دینا بہر حال لازم ہے۔ اس کے ہتھیانے کی کوشش غلط ہے اور بہت بڑا گناہ ہے۔ اگر مباشرت نہ ہو اور طلاق دیا جائے تو مہر اس صورت میں آدھا رہ جاتا ہے لیکن جب مباشرت ہو جائے، تب تو ایک ایک پائی مہر ادا ہونا ضروری ہے اور اب اس میں شوہر کی طرف سے کمی کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اسی کو قرآن مجید نے کہا ہے کہ معاہدہ پورا ہو چکا یعنی عقد ہوا اور اس کے بعد مباشرت بھی واقع ہو گئی [۳] تو اب تم مہر کا کوئی ایک جز بھی نہیں روک سکتے۔

وَلَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقۡتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيۡلًا ﴿۲۲﴾

"اور عورتوں میں سے ان سے شادی نہ کرو جن میں تمہارے باپ دادا تصرف ازدواجی کر چکے ہوں، سوا اس کے جو پہلے ہو چکا۔ یہ بڑا ہی سخت گناہ ہے اور ناراضگی کی بات اور بہت برا طریقہ ہے۔"

سوتیلی ماؤں کی حرمت

یہ سوتیلی ماؤں سے عقد کی ممانعت ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا۔

"سوا اس کے جو پہلے ہو چکا" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ عقد جو پہلے ہو چکا، اب بھی قائم رہے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ پہلے جو ہوا وہ ہوا۔ وہ تو اب خارج از بحث ہے لیکن اب ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ [۴]

اور اس کا بتانا بھی مقصود ہو سکتا ہے کہ جو پہلے یعنی زمانہ جاہلیت میں اسلام لانے کے پہلے ہو چکا ہے، اس کی سزا اب نہیں ہو گی [۵] کیوں کہ الاسلام یجیب ماقبله اسلام پہلے کے سب گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ از سر نو ایک زندگی ہے جو انسان کو ملتی ہے جس میں اب اپنے فرائض کا خیال رکھنا لازمی ہے۔

---

[۱]۔ ای مالا کثیرا (مجمع البیان)

[۲]۔ القمی الافضآء المباشرة (صافی)

[۳]۔ فی الکافی والعیاشی عنه المیثاق هی الکلمة التی عقد بها النکاح والغلیظ هو ماء الرجل یفیضه الیها (صافی)

[۴]۔ الا ما قد سلف استثنائے منقطع ہے، اس واسطے کہ استثناء ماضی کا مستقبل سے جائز نہیں ہے (عمدۃ البیان)

[۵]۔ استثنآء من لازم النهی فکانه قبل تستحقون العقاب بذلك الا ما قد سلف فی الجاهلیة فانکم معذورون فیه (صافی)

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۡ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۡ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾

”تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خلائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور وہ تمہاری مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری خوشدامنیں اور تمہاری پرورش میں آنے والی تمہاری ان بیویوں کی لڑکیاں جن سے تم نے مقاربت کی ہے لیکن اگر ان کے ساتھ تم نے مقاربت نہیں کی ہے تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اور بیویاں تمہاری صلبی اولاد کی اور یہ کہ تم دو بہنوں کو اکٹھا کرو مگر جو ہو چکا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

کن عورتوں سے شادی کرنا حرام ہے

اس میں محرم عورتوں کی فہرست ہے جن سے کبھی شادی نہیں ہوسکتی۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا حکم ”جمع بین الاختین“ کا بھی ضمناً بتا دیا گیا ہے یعنی ایک وقت میں دو بہنوں کے ساتھ تعلقات ازدواجی قائم نہیں کیے جاسکتے۔ ہاں جب ایک بہن کا انتقال ہوجائے یا اسے طلاق دیدے، تب عدہ کے بعد دوسری سے نکاح کرسکتا ہے اس لئے یہ سالی محرم نہیں ہے، کیوں کہ محرم تو وہ ہے جس کے ساتھ کبھی شادی نہ ہوسکے۔

جمع بین الاختین کی ممانعت کے ساتھ جو ہے:۔ الا ما قد سلف ”مگر جو ہو چکا“ اس کا مفہوم بھی وہی ہے جو سوتیلی ماؤں کے ساتھ نکاح کی ممانعت کے ذیل میں بیان ہوا یعنی قبل اسلام جو ہوا، اس کی سزا اب نہیں ملے گی۔ نہ یہ کہ وہ عقد اب بھی برقرار رہے گا۔[1]

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ

---

[1] فانه مغفور (صافی) وليس المراد به ان ما سلف حال النهي يجوز استدامة بلا خلاف (مجمع البيان)

فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِيۡضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا تَرٰضَيۡتُمۡ بِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡفَرِيۡضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ○

''اورعورتوں میں جوشوہر دار ہوں، سوااس کے جوتمہاری ملکیت میں آتی ہوں۔ یہ اللہ کی طرف کی تم پرلازمی پابندی ہے اور اس کے علاوہ تم پر حلال ہیں کہ تم اپنے اموال سے ان کے ساتھ شادی کرلو پاک دامنی قائم رکھتے اور بدکاری سے بچتے ہوئے تو ان میں سے جس کے ساتھ تم متعہ کرو توان کی اجرتیں جومقرر ہوں ادا کردو اور کوئی حرج نہیں کہ اسے مقررہ مقدار کے بعد پھر تم آپس میں کوئی سمجھوتہ کرو، یقیناً اللہ جاننے والا ہے صحیح کام کرنے والا۔''

جن عورتوں کے ساتھ نکاح حرام ہے، ان میں پہلی فہرست جوتھی وہ محرم عورتوں کی تھی، ان کے ساتھ ابدی طور پر شادی کا امکان نہیں۔ اب اس ذیل میں نامحرم عورتوں میں سے جن کے ساتھ اس وقت عقد نہیں ہوسکتا، ان کا ذکر شروع ہوا۔

اس میں ایک ''جمع بین الاختین'' کی صورت تھی اور اب یہ دوسری صورت ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے شخص کے حبالہ زوجیت میں داخل ہے تو اس حالت میں جب تک کہ وہ اس کی زوجیت سے خارج نہ ہوجائے، دوسرا آدمی اس سے عقد نہیں کرسکتا۔

اب اس میں استثناء جوکیا گیا ہے: اِلَّا مَا مَلَکَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اپنی کنیز کا کسی سے عقد کردے تو شوہر دار ہونے کے باوجود اس کے ساتھ خود بھی تعلقات ازدواجی قائم کرے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب ایک یہ ہے کہ بحالت کفر وہ کسی کی زوجیت میں تھیں [۱] اور اب وہ شوہر دار کنیزیں مال غنیمت میں آ کر کسی مسلمان کی ملکیت میں داخل ہوئیں تو ان کے ساتھ استبراء یعنی اس عدہ کے گزرنے کے ساتھ جوکنیز کے لئے مقرر ہے، تعلق ازدواجی قائم کرنا درست ہوگا۔ اسی لئے ہم نے یہ ترجمہ نہیں کیا کہ ''مگر جوتمہاری ملکیت میں ہوں'' بلکہ یہ ترجمہ کیا کہ ''جوتمہاری ملکیت میں آئی ہوں اور دوسری یہ بھی صورت ہوسکتی ہے کہ اپنی ہی کنیز کا عقد اس نے خود اپنے ہی غلام سے کیا ہو تو اسے یہ حق ہے کہ یہ ان دونوں میں تفریق کردے اور پھر استبراء یعنی مقررہ مدت جوعدہ کی نوعیت رکھتی ہے گزار کر اس میں خود تصرف کرے۔ [۲]

اب اس پورے سلسلہ کو سامنے رکھ کر جو چوتھے پارہ کی آخری آیت اور اس پارہ کی پہلی آیت دونوں کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوا، یہ ارشاد ہورہا ہے کہ ان کے علاوہ جو ہیں وہ تمہارے لئے حلال ہیں۔ ان کے ساتھ تم اپنے مال میں سے مہر ادا کرکے باقاعدہ عقد کے ساتھ، نہ کہ بے ضابطہ طور پر جو سفاح یعنی زناکاری میں داخل ہو تعلقات ازدواجی قائم کرسکتے ہو۔

باضابطہ ازدواجی تعلقات کی ایک صورت تو عقد دائمی کی ہے۔ وہ سب ہی کو معلوم ہے۔

دوسری صورت متعہ کی ہے یعنی ایک مقررہ مدت تک کے ازدواج کا معاہدہ جس کے مہر کو اصطلاحاً ''اجرت'' کہتے ہیں، اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے کہ:

فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِيۡضَةً.

---

[۱]۔ ما ملکت ایمانکم من سبی ما کان لھا زوج (بیتان) وان کان لھن ازواج فی دار الحرب (جلالین)

[۲]۔ یعنی امۃ الرجل اذا کان قد زوجھا عبدہ ثم اراد نکاحھا فرق بینھا وا استبراء (علی بن ابراھیم)

حکم متعہ

مترجمین اہل سنت جومتعہ کے قائل نہیں ہیں، وہ استمتاع کو لذت حاصل کرنے کے معنی میں لیتے ہیں، اور اسے نکاح دائمی ہی سے متعلق کرتے ہیں مگر یہ ظاہر قرآن نیز سنت کے خلاف ہے جس کی تفصیل سیر حاصل طور پر ہماری کتاب ''متعہ اور اسلام'' (شائع کردہ امامیہ مشن لکھنو امامیہ مشن پاکستان) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

جناب شیخ طوسیؒ نے اس امر پر کہ اس سے مراد متعہ ہی ہے، نہ کہ نکاح دائمی ایک نہایت لطیف استدلال کیا ہے اور وہ یہ کہ یہاں کہا گیا ہے کہ عقد کے بعد ہی ان کی اجرتیں انہیں دیدو، اس کے معنی یہ ہیں کہ ایجاب وقبول کے ساتھ ہی پورا مہر ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ یہ متعہ ہی میں ہوتا ہے۔ نکاح دائمی میں جب تک کہ مباشرت نہ ہو جائے پورا مہر واجب الادا نہیں ہوتا بلکہ اگر قبل مباشرت طلاق دے دیا جائے تو نصف مہر واجب الادا ہوتا ہے جس کی قرآن میں دوسری جگہ صراحت ہے۔ یہ عقد کے بعد پورے مہر کے ادا کرنے کا حکم بتاتا ہے کہ اس سے مراد عقد منقطع ہی ہے جسے ''متعہ'' کہتے ہیں۔ [۱]

وَمَنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنۡكُمۡ طَوۡلًا اَنۡ يَّنۡكِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ فَتَيٰتِكُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاِيۡمَانِكُمۡ ؕ بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَانۡكِحُوۡهُنَّ بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ وَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ مُحۡصَنٰتٍ غَيۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَيۡنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيۡهِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَى الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِىَ الۡعَنَتَ مِنۡكُمۡ ؕ وَاَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۵﴾

''اور جس کی حیثیت [۲] تم میں سے اس قابل نہ ہو کہ وہ مسلمان بیویوں [۳] سے نکاح کر سکے تو پھر اپنی مسلمان لونڈیاں سے [۴] جو تم لوگوں کی ملکیت میں ہوں اور اللہ ہی تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے تم میں سے ایک دوسرے کا جز ہے لہٰذا ان سے ان کے مالکوں کی اجازت سے شادی کرو اور انہیں بھلائی کے ساتھ ان کے مہر دیدو،

---

[۱]۔ انما یجب الاجر بکماله فی عقد المتعة (تبیان)

[۲]۔ الطول الغنی (مجمع البیان) وهو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام (تبیان)

[۳]۔ ای الحرائر المومنات (مجمع)

[۴]۔ الفتاة الامة وان کانت عجوزا (تبیان)

اس صورت سے کہ وہ پاک دامن رہیں، نہ بدکاری کرنے والی اور نہ اپنے لئے آشنا بنانے والی تو جب کہ وہ مسلمان ہو چکی ہیں [1] اب اگر وہ بدکاری کریں تو ان کے لئے آزاد عورتوں کی آدھی سزا ہوگی۔ یہ اس کے لئے ہے جو تم میں سے حرام کاری کا اندیشہ محسوس کرے اور اگر ضبط کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان۔"

کنیزوں کے ساتھ نکاح کا حکم

کنیز کے ساتھ عقد میں "**المومنات**" کی قید لگانا اس کا ثبوت ہے کہ غیر مسلم عورتوں کے ساتھ عقد درست نہیں ہے، چاہے وہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاری میں داخل ہوں۔ اس طرح بعض علمائے کے اس تصور کی کہ زن کتابیہ کے ساتھ عقد جائز ہے، رد ہو جاتی ہے۔ [2]

پھر اس سلسلہ میں یہ فقرہ کہ "اللہ ہی تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے۔" اس شبہ کا دفعیہ ہے کہ یہ کنیزیں پہلے تو کافر تھیں۔ اب مسلمانوں کی ملکیت میں آکر وہ اظہار اسلام بھی کرتی ہیں تو اس کا کیا اعتبار! بہت ممکن ہے کہ یہ مالکوں کے دباؤ سے یا انہیں خوش کرنے کے لئے ہو تو اس کا جواب دیا جا رہا ہے کہ تمہیں تو ظاہر پر عمل کرنا چاہیے۔ باطنی حقیقت سے تمہیں کیا سروکار۔ اس کا علم تو اللہ ہی کو ہو سکتا ہے۔ [3]

دوسرا امر جو اس میں مانع ہو سکتا ہے، وہ اپنی بلندی اور ان کی پستی کا احساس کہ کہاں ہم اور کہاں یہ کنیزیں! اس کی رد کے لئے یہ فقرہ ہے کہ **بعضکم من بعض** یعنی اصل حقیقت نوعیہ میں تو تمہارے اور ان کنیزوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے لہٰذا تمہیں اس میں کسر شان محسوس نہ کرنا چاہیے۔ [4]

اس کے بعد جو یہ فقرہ ہے کہ "اُن سے ان کے مالکوں کی اجازت سے عقد کرو۔" ...... یہ پتہ دیتا ہے کہ پہلے جو کنیزوں کو کہا گیا ہے: مما ملکت ایمانکم "جو تمہاری ملکیت میں ہیں" اس میں "تم" سے مراد خود یہ اشخاص نہیں ہیں۔ جو نکاح کرنا چاہتے ہیں بلکہ تمام مسلمان سے مراد ہیں یعنی ان کنیزوں سے نکاح کرو جو تم مسلمانوں کی ملکیت میں داخل ہیں [5] اور اس صورت میں انہیں مہر دینے کا مطلب ہے ان کے مالکوں کو اس مہر کا دینا جو ان سے طے ہوا ہو۔ [6]

یہ جو کہا گیا ہے کہ: **محصنت غیر مسفحت ولا متخذات اخدان** "اس صورت سے کہ وہ پاک دامن رہیں، نہ بدکاری کرنے والی اور نہ اپنے لئے آشنا بنانے والی" ...... اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے تعلقات جو قائم کرو وہ بطور نکاح جائز کے ہوں [7] جس میں نہ وہ زنا کاری کی مرتکب قرار پاتی ہوں اور نہ چوری چھپے ناجائز تعلقات قائم کرنے والی۔ [8]

---

[1]۔ معناہ اسلمن... وھو الاولیٰ لانہ لاخلاف انہ یجب علیھا نصف الحد اذا زنت وان لم تکن ذات زوج (تبیان)

[2]۔ لان الکتابیۃ لاتسمّٰی مومنۃ (تبیان)

[3]۔ فاکفتوا بظاھرہ وکلوا السرائر الیہ (جلالین)

[4]۔ فلاتستنکفوا من نکاح الاماء فانھا من جنسکم کالحرائر (مجمع البیان)

[5]۔ المراد بہ اماء الغیر لانہ لایجوز ان یتزوج الرجل بامۃ نفسہ بالاجماع (مجمع)

[6]۔ لان مھر الامۃ لسیدھا (تبیان)

[7]۔ یعنی بالعقد علیھن (تبیان)

[8]۔ مسفحت زانیات جھرا ولا متخذات اخدان اخلاء یزنون بھا سرا (جلالین)

پھر یہ بتایا ہے کہ بیویوں کے نہ مل سکنے کی صورت میں یہ کنیزوں سے عقد اس لئے ہے کہ تم حرام کاری میں مبتلا نہ ہو جاؤ اور اگر ایسا اندیشہ نہ ہو اور تم صبر و تحمل سے کام لو تو کوئی ضروری نہیں ہے کہ تم کنیزوں سے عقد کر ہی لو۔

پھر جب کہ آیت کے اس فقرہ سے ظاہر ہے کہ یہ حکم مجبوری کی صورت میں ہے یعنی بیوی کے نہ ہونے کی وجہ سے تو فقہ کا یہ مسئلہ کہ بیوی کی موجودگی میں کنیز سے عقد کرنا بغیر بیوی کی اجازت کے جائز نہیں، از روئے قرآن بھی بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ [۱]

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۲۶

"اللہ تو چاہتا ہے کہ تمہارے لئے صاف صاف بیان کر دے اور تمہیں تمہارے پہلے والے لوگوں کے طریقہ کار پر لگا دے اور تم پر نظر رحمت مبذول رکھے اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، صحیح کام کرنے والا"

اس آیت سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا احکام جوان عورتوں کے بارے میں ہیں جن سے تعلقات ازدواجی حرام ہیں، شریعت اسلام سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ اس کے پہلے بھی انبیاء کی شریعتوں میں یہ احکام آ چکے ہیں [۲] مگر وہ دور جاہلیت میں زینت طاق نسیان بن گئے تھے۔ قرآن مجید میں انہی کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا اور ان کی تجدید و توثیق کر دی گئی۔

بے شک وہ احکام جب اس شریعت میں داخل ہو گئے تو اب وہ شریعت اسلام کے احکام ہیں جس کی پیروی ہم پر واجب ہے۔ نہ کہ اس شریعت کے جو اب منسوخ ہو گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اثر اس منسوخی کا نمایاں وہیں ہو گا جہاں احکام میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ "پہلے والوں کے طریقہ پر" لگانا صرف حلال و حرام کے امتیاز کے عام پہلو کے لحاظ سے ہو جس میں یہ ضروری نہیں ہے کہ حلال و حرام کی حد بندی بالکل وہی ہو جو شرائع سابقہ میں تھی۔ [۳]

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۲۷ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۲۸

"اور اللہ یہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے [۴] اور جو نفسانی خواہشوں کے پیرو ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم بہت زیادہ کجی اختیار کر لو۔ اللہ چاہتا ہے کہ تمہارا بوجھ ہلکا کرے اور پیدا کیا گیا ہے آدمی کمزور"

بندہ توبہ کرتا ہے، بایں معنی کہ اس کے ضمیر میں بیداری پیدا ہوتی ہے، تب خدا اس کی توبہ قبول کرتا ہے یعنی سابق کی اس کی غلطیوں کو نظر

---

[۱]۔ من شرط صحة العقد على الامة عندنا كثر الفقهاء لايكون عنده حرة وهكذا عندنا الا ان ترضى الحرة (تبيان)

[۲]۔ طرائق الذين من قبلكم من الانبياء في التحليل والتحريم (جلالين)

[۳]۔ قال الرماني لايدل ذلك على انفاق التريعة وان كنا على طريقهم في الحلال والحرام (بيتان)

[۴]۔ يقبل توبتهم عما سلف من اثامهم (تبيان)

اندازکر دیتا ہےلیکن اگر انسان نافرمانی پر نازاں ہو گیا تو گناہ پر اسے شرمندگی پیدا نہ ہوگی اور اس لئے وہ اس سے باز آنے پر آمادہ نہ ہوگا تو اب خداوند عالم کی طرف سے توبہ قبول کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ "میلا عظیما"، بہت زیادہ کجی" سے یہی مراد ہے [1] اور نفسانی خواہشوں کے پیرو یعنی باطل پرست افراد یہی چاہتے ہیں کہ ضمیر میں کبھی زندگی پیدا نہ ہو اور انسان غلط راستوں پر بے محابا چلتے رہیں۔

دوسری آیت میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ شریعت اسلام کے احکام میں خود انسانی کمزوریوں کی بڑی مراعات کی گئی ہے۔ اس کے بعد بدنصیبی نہیں تو کیا ہے کہ پھر بھی انسان ان احکام کی پابندی نہ کرے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَـكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ‌ ۚ وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمۡ رَحِيۡمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰ لِكَ عُدۡوَانًا وَّظُلۡمًا فَسَوۡفَ نُصۡلِيۡهِ نَارًا‌ ؕ وَكَانَ ذٰ لِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا ﴿۳۰﴾

"اے ایمان لانے والو! اپنے آپس کے مال ناحق نہ کھاؤ، وہاں مگر [2] یہ کہ تم لوگوں کی باہمی رضامندی سے کوئی تجارتی معاملت ہو اور اپنی جانوں کو تلف نہ کرو، بلاشبہ اللہ تم پر مہربان ہے اور جو ظلم و تعدی سے ایسا کرے گا تو اسے ہم آتش جہنم کی گرمی کا مزہ چکھائیں گے اور یہ اللہ کے لئے بالکل آسان بات ہے"

مال غیر کو ناحق کھانے کی ممانعت

اس آیت کا پہلا جز پہلے آچکا ہے جس کی تفسیر پہلے لکھی جاچکی ہے مگر یہاں اس میں اضافہ کیا گیا ہے الاان تکون تجارۃ عن تراض منکم "سوا اس صورت کے جب باہمی رضامندی سے کوئی تجارتی معاملت ہو۔"......

یہ "الا" جس کا ترجمہ "سوا" ہوتا ہے، یہاں استثنائے متصل کی حیثیت سے نہیں ہوسکتا جس سے قبل والے عام حکم سے کسی ایسے فرد کو خارج کیا جاتا ہے جو بغیر اس استثناء کے اس میں داخل ہو جاتی۔ یہاں یہ صورت نہیں بلکہ "باہمی رضامندی سے تجارت" جو ہو، وہ "اکل مال بالباطل" میں داخل ہی نہیں ہے۔ یہ کلام عرب میں استثناء کی ایک دوسری قسم ہوتی ہے جسے "استثنائے منقطع" کہتے ہیں۔ یہ استثنائے حقیقت میں پہلے ہی حکم کی ایک قسم کی تشریح کی حیثیت رکھتا ہے یعنی "اکل بالباطل" تو کسی صورت میں بھی درست نہیں ہے۔ ہاں جو "اکل بالباطل" نہ ہو اور وہ باہمی رضامندی والا تجارتی معاملہ ہے، یہ جائز ہے۔ "اپنی جانوں کو تلف نہ کرو" اس سے خودکشی بھی مراد ہوسکتی ہے اور دوسروں کا قتل کرنا بھی [3] وارد ہوا ہے کہ غزوات میں بعض مسلمان جوش جہاد میں یا بخیال خود ایک کارنامہ انجام دینے اور اپنے سر سہرا باندھنے کے شوق میں بغیر اجازت رسول

---

[1] ۔ای تعتدلوا عن الاستقامة عدولا بينا بالاستكبار من المعصية (مجمع البيان)

[2] ۔الا لكن (جلالين)

[3] ۔ومثله قوله: اذا دخلتم بيوتا فسلموا على انفسكم (تبيان)

جا کر مشرکین سے بھڑ جاتے تھے، اس آیت میں روکا گیا ہے۔[1]

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝۳۱

''اگر تم ان چیزوں میں سے کہ جن سے تمہیں منع کیا جاتا ہے، کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرو تو تمہارے اور برے کاموں کی ہم تلافی کردیں گے اور تمہیں معزز مقام میں پہنچا دیں گے۔''

چونکہ ''سیئات'' کی لفظ جس کا ترجمہ ہم نے ''برے کام'' کیا ''الفاظ قرآنی میں ''کبائر'' کے مقابلہ میں صرف ہوئی ہے، اس لئے اس کی تعبیر گناہان صغیرہ کیساتھ درست معلوم ہوتی ہے۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم صاف یہ ہوتا ہے کہ اگر تم کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرو تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے صغیرہ گناہوں کو معاف کردیں گے۔

نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں امیر المومنینؑ کا کلام جس میں گناہوں کے اقسام میں ارشاد ہوا ہے:

مِنْ كَبِيْرٍ اَوْعَدَ عَلَيْهِ نِيْرَانَهُ اَوْ صَغِيْرٍ اَرْصَدَ لَهُ غُفْرَانَهُ.

کوئی بڑا ہے جس پر اس نے دوزخ کا اعلان کیا ہے اور کوئی چھوٹا ہے جس پر اس نے اپنی بخشش کی امید دلائی ہے۔

بالکل اسی آیت کی طرف ناظر معلوم ہوتا ہے۔

پھر اسی طرح کی آیت سورۂ النجم میں آئے گی: اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۗىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ.

گناہوں میں کبیرہ اور صغیرہ کی تفریق

اسی بنا پر اصطلاح اہل شریعت میں بھی گناہان کبیرہ اور صغیرہ کی دو لفظ شائع وذائع ہوگئے ہیں مگر قرآن مجید نے ''گناہ کبیرہ'' کی کوئی خاص تعریف یا تحدید نہیں بتائی ہے۔ نہ اس کی نوعیت ظاہر کرنے کے لئے کچھ گناہوں کے نام لئے ہیں۔ علمانے بلاتفریق فرقہ اس کا ایک معیار یہ بتایا ہے کہ گناہ کبیرہ وہ ہے جس پر قرآن مجید میں عذاب کی خبر دی گئی ہو[2] ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر جو حدیث پر مبنی ہے، اس کے مطابق ہے۔[3]

باقی جن منہیات پر قرآن میں وعید نہیں ہے، وہ صغیرہ میں داخل ہیں مگر گناہ صغیر بھی اصرار کی صورت میں کبیرہ بن جاتا ہے اس لئے فقہ میں عدالت کی تعریف میں آیا ہے کہ کبائر کا ارتکاب نہ ہو اور صغائر پر اصرار نہ ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گناہ صغیرہ جس کی تلافی کا اعلان ہے، وہی

---

[1]۔ فنہی اللہ ان یقتل نفسہ من غیر امر رسول اللہ (علی بن ابراھیم)

[2]۔ ھی ماورد علیہا وعید کالقتل والزنا والسرقة (جلالین)

[3]۔ قال ھی سبعة: الکفر وقتل النفس وعقوق الوالدین واکل مال الیتیم واکل الربوا والفرار من الزحف والتعرب بعد الھجرة وکلما وعد اللہ فی القرآن علیہ النار فھو من الکبائر (علی بن ابراھیم)

ہے جو اتفاقی طور پر ہوگیا ہے کچھ احادیث میں خاص خاص گناہوں کا نام لے کر کبائر کی فہرست بتائی گئی ہے مگر ان احادیث میں کافی حد تک اختلاف ہے۔

ایک خیال یہ ہے کہ کبیرہ اور صغیرہ کی کوئی محدود معین فہرست مرتب ہونا ہی نہیں چاہیے بلکہ یہ بالکل اضافی چیز ہے۔ ہر گناہ کسی دوسرے گناہ کے اعتبار سے کبیرہ ہوسکتا ہے اور کسی کے لحاظ سے صغیرہ اور خالق کو بھی یہ منظور نہ تھا کہ کبیرہ گناہوں کا نام معین کرے ورنہ دوسرے گناہوں کو آدمی سبک سمجھ لیتا۔ جناب شیخ الطائفہ کا نظریہ یہی ہے۔[1]

ہمارے بزرگوں میں جناب ''تاج العلمائے فرماتے ہیں کہ یہ احادیث جن میں کبائر کا بیان ہے آپس میں اتنا شدید اختلاف رکھتے ہیں کہ ان میں جمع انتہائی دشوار ہے اور گویا یہ اس کا قرینہ ہے کہ کبائر کے سلسلہ میں کوئی خاص شرعی اصطلاح نہیں ہے لہٰذا اسے لغوی معنیٰ ''بڑے گناہ'' پر محمول کرنا بہتر ہے اور جو بھی بڑا گناہ معلوم ہو خواہ اس بنا پر کہ قرآن وحدیث میں اس پر وعید اور تخویف وتہدید ہوئی ہے یا عقلاً وعرفاً وہ بہت بڑا گناہ محسوس ہوتا ہے جیسے کہ ایک درہم کی چوری ایسے شخص کے پاس سے جس کے پاس اس کے علاوہ کوئی پیسہ ہے ہی نہیں جس کے بعد وہ بھوک سے تلف ہوجائے یا شدید زحمت میں مبتلا ہوجائے یا جیسے مردہ لاشوں کے ساتھ بدفعلی کرنا۔ اس کو کبیرہ سمجھنا چاہیے اور باقی گناہوں کو صغیرہ میں داخل سمجھنا چاہیے۔

موصوف کے نزدیک اسی قول کو ترجیح بھی ہے اور فرماتے ہیں کہ کم از کم زیادہ موافق احتیاط تو وہ ضرور ہے۔[2]

چونکہ اصلاً یہ بحث فقہ کے مبحث عدالت اور کتاب القضاء والشہادات سے تعلق رکھتی ہے، اس لئے یہاں اتنے پر اکتفاء مناسب ہے۔ اس سے زیادہ بسیط وتفصیل اور تنقیح وتحقیق سے کام لینا تفسیری معیار کے خلاف ہے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

''اور جو اللہ نے تم میں کے ایک کو دوسرے پر زیادتی عطا کی ہے، اس کی آرزو نہ کرو۔ مردوں کو حصہ ملتا ہے اس کا جو وہ حاصل کریں اور عورتوں کو حصہ ملتا ہے اس کا جو وہ حاصل کریں اور اللہ سے سوال کرو اس کے فضل وکرم سے یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

''زیادتی'' عام ہے اس سے کہ مال ومتاع دنیا میں ہو یا فضائل ومراتب میں اور آرزو جس سے روکا گیا ہے وہ ہے جو بصورت حسد ہو

---

[1] لم يعين الكبائر التي اذا اجتنبها كفر ما عداها لانه او فعل ذالك لكان فيه اغراء بما عداها وذلك لا يجوز في حكمة تعالى (تبيان)

[2] هذا وان لم نقل بكونه اظهر فلا اقل من كرنه احوله (جويرة عزيزة)

یعنی انسان دوسرے سے اس زیادتی کی وجہ سے جلنے لگے اور چاہے کہ وہ اس مرتبہ پر نہ رہے۔ نیز یہ کہ آدمی بس تمنائیں کرتا رہے کہ ہائے میں اس مرتبہ پر نہ ہوا اور جب کہ وہ مرتبہ کسی عملی جدوجہد سے وابستہ ہو تو وہ اسباب فراہم نہ کرے جو اسے بھی اس مرتبہ تک پہنچا دیں۔

حسد کی ممانعت

بعد کا یہ ''فقرہ کہ ''مردوں کو حصہ ملتا ہے اس کا جو وہ حاصل کریں اور عورتوں کو حصہ ملتا ہے اس کا جو وہ حاصل کریں'' اس دوسرے پہلو سے تناسب رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس فضیلت و بزرگی کے آرزومند ہو تو اسے کام کرو اور پھر خدا سے سوال کرو کہ اس کا فضل وکرم شامل حاصل ہو۔

آخر میں جو ہے کہ ''اللہ ہر بات کا جاننے والا ہے۔'' اس میں یہ معنی مضمر ہیں کہ اللہ بلا وجہ کسی کو زیادتی تھوڑی عطا کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون اس کا مستحق ہے اور جو کچھ انسان جدوجہد کرے، اس سے بھی واقف ہے اور جو اس سے سوال کرے، اس پر بھی مطلع ہے۔[1]

یہ فقرہ اس کا ثبوت ہے کہ افعال الٰہی میں عدالت و حکمت کارفرما ہے۔ صرف قدرت و طاقت نہیں کہ بلا وجہ جسے جتنا چاہا دے دیا۔ بے شک جسے جتنا چاہے، وہ دیتا مگر یہ چاہنا اس کا کسی مصلحت و حکمت کی بنیاد پر ہوتا ہے، بلا وجہ نہیں ہوتا۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْھُمْ نَصِيْبَھُمْ ۭاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝ۧ

''اور ہر ایک کے ہم نے وارث قرار دیے ہیں اس میں جو چھوڑا ہے ماں باپ اور دوسرے قریب ترین اعزا نے اور جنہیں تمہاری قسموں نے وابستہ کیا ہے تو اس میں ان کا حصہ دے دو، یقیناً اللہ ہر بات پر حاضر و ناظر ہے۔''

لکل ''ہر ایک کے'' اس کی تشریح میں اختلاف ہے جس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:۔

''مقرر کردہ ایم وارثان برای ہر چیزے از انچہ گزاشتہ اند پدر و مادر ایشاں''

یعنی ''ہر ایک'' کا مطلب ہے ترکہ میں سے ہر چیز مگر ان کے بیٹے شاہ رفیع الدین صاحب تحریر کرتے ہیں:

''اور واسطے ہر شخص کے مقرر کیے ہیں ہم نے وارث اس چیز سے کہ چھوڑ گئے ماں باپ اور قرابتی''

ہمارے مفسرین اسی دوسرے ترجمہ سے متفق ہیں۔[2]

''جنہیں تمہاری قسموں نے وابستہ کیا ہے'' یعنی جاہلیت کے زمانہ میں جو یہ رسم جاری ہوئی تھی کہ مختلف قبائل اور افراد آپس میں حلیف ہوتے تھے، اس حلیف ہونے سے میراث کا استحقاق پیدا نہیں ہوتا بلکہ جو تمہارے حلیف ہیں، ان کے بھی وارث مقرر ہیں لہٰذا میراث تمہیں نہیں، انہی وارثوں کو ملے گی۔[3]

---

[1]. کان بکل شئی علیماً و منہ محل الفضل و سوال کم (جلالین)

[2]. لکلکم جعلنا ورثہ (تبیان) لکل واحد من الرجال و النساء جعلنا موالی وورثۃ (مجمع البیان)

[3]. لھم ورثۃ اولیٰ بمیراثھم (مجمع)

مگر اس کے برخلاف ایک خیال یہ ہے کہ اس آیت میں حلیفوں کو میراث میں حصہ دینے ہی کا حکم ہے جس کا زمانہ جاہلیت سے رواج چلا آرہا ہے مگر بعد میں اس آیت سے کہ:

وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِبَعْضٍ

''جس کا مطلب یہ ہے کہ میراث میں استحقاق بس قرابت ہی سے وابستہ ہے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

دوسرے بعض علماء کا یہ تصور ہے کہ: وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ ایک مستقل جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو تم نے اپنا حلیف بنالیا، انہیں ان کا حصہ ادا کرو یعنی اس معاہدہ حلفی کا جو تقاضا ہو مثلاً وقت ضرورت کا آنا دشمنوں کے مقابلہ میں مدد کرنا، اسے پورا کرو لیکن میراث کا استحقاق انہیں نہیں ہے۔[1]

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۚ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ ۚ وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ ۖ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا ﴿٣٤﴾

''مرد عورتوں کے انتظامات و اصلاحات کے ذمہ دار ہیں[2] اس بنا پر کہ ان میں سے ایک کو دوسرے پر اللہ نے فضیلت دی ہے اور اس کی وجہ سے جو یہ اپنے مال سے خرچ کرتے ہیں تو نیک عورتیں اطاعت گزار ہوتی ہیں[3] اور پیٹھ پیچھے بھی جس طرح خدا نے اُن کی حفاظت و کفالت کا انتظار کیا ہے[4] وہ حفاظت کرتی ہیں اور جن عورتوں سے سرکشی کے آثار تم کو محسوس ہوں[5] انہیں سمجھاؤ اور چھوڑ دو انہیں اُن کی خواب گاہوں میں اور مار و بھی اس کے بعد اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو پھر اُن کے خلاف کسی اقدام کے راستے نہ ڈھونڈھو[6] یقیناً اللہ برتر ہے، بہت بڑا۔''

مردوں کی سیادت وفوقیت کے ساتھ ذمہ داری اور عورتوں کی جنسی بے راہ روی کی صورت میں تادیب کا حق

---

[1]۔ فعلیٰ هذا الاٰية غير منسوخته (تبيان)

[2]۔ قوامون على النساء بالتاديب والتدبير (تبيان)

[3]۔ مطيعات لازواجهن (مجمع البيان)

[4]۔ اى بما حفظهن الله فى مهورهن والزام الزوج النفقة عليهن (تبيان)

[5]۔ تخافون نشوزهن بظهور اسبابه وامارا ته (مجمع)

[6]۔ فلا تطلبوا العلل فى خربهن وسوء معاشرتهن (تبيان)

آخری فقرہ شوہروں کو تنبیہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ خدا نے تمہیں جو یہ اختیارات دیئے ہیں، ان کے صرف میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا، اس لئے کہ تم عورتوں کے مقابلہ میں برتر سہی، مگر اللہ جو تمام کے حقوق کا نگہبان ہے، وہ سب سے برتر اور بزرگ تر ہے لہٰذا اُس سے ہمیشہ ڈرتے رہو اور حد سے قدم آگے نہ بڑھاؤ۔[1]

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَيۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ اِنۡ يُّرِيۡدَاۤ اِصۡلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيۡنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا خَبِيۡرًا ﴿۳۵﴾

''اور اگر تم لوگوں کو اُن دونوں میں پھوٹ کے آثار نظر آئیں تو ایک ثالث اُس کے والوں میں سے اور ایک ثالث اس کے والوں میں سے مقرر کرو۔ اگر وہ دونوں میل کرانا چاہیں گے تو اللہ اُن دونوں میں موافقت کی صورت پیدا کردے گا۔ یقیناً اللہ جاننے والا ہے، بڑا باخبر''۔

یہ خطاب چاہے سماج کے عام لوگوں سے ہو مگر نفاذ اس کا حاکم شرعی کی طرف سے ہوگا۔[2]

نزاع کی صورت میں دو ثالث مقرر کرنے کا حکم

اختلاف باہمی کی صورت میں ایک ثالث مرد والوں میں سے اور ایک عورت والوں میں سے مقرر ہوگا وہ دونوں معاملات کو سلجھانے کی کوشش کریں۔

اللہ دونوں میں موافقت کی صورت پیدا کرے گا یعنی شوہر اور زوجہ میں۔[3]

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُن دونوں آدمیوں میں جو ثالث مقرر ہوئے ہیں۔[4]

وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔـا وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡجَـارِ ذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡجَـارِ الۡجُـنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالۡجَـنۡۢبِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ۙ وَمَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنۡ كَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا ۙ ﴿۳۶﴾ اۨلَّذِيۡنَ يَبۡخَلُوۡنَ وَيَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ وَيَكۡتُمُوۡنَ مَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ مِنۡ

---

[1]۔ فاحذروہ ان یعاقبکم ان ظلمتوھن (جلالین)

[2]۔ ھو الظاھر فی الاخبار عن الصادقین وقیل الزوجان او اھل الزوجین (مجمع البیان)

[3]۔ بین الزوجین (جلالین)

[4]۔ الضمیر فی ''بینھما'' عائد الی الحکمین (تبیان)

فَضۡلِهٖ ؕ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا ۚ﴿۳۷﴾

''اور اللہ کی عبادت کرو، کسی چیز کو اس کا شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو[1] اور قرابت داروں، یتیموں، وہ پڑوسی جو عزیز ہو اور وہ پڑوسی بھی جو غیر ہو اور پہلو بہ پہلو رہنے والے ساتھی[2] اور مسافر اور اُن کے ساتھ جو تمہاری ملکیت میں ہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اُسے دوست نہیں رکھتا کہ جو گھمنڈ رکھنے والا، شیخی بگھارنے والا ہو۔ جو کنجوسی سے کام لیتے ہیں اور لوگوں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو اللہ نے انہیں اپنے فضل وکرم سے دیا ہے، اُسے چھپاتے ہیں اور ہم نے ناشکروں کے لئے ذلت دینے والا عذاب مہیا کر رکھا ہے۔''

چونکہ اُن لوگوں کے لئے عذاب آخرت کی خبر دی گئی ہے، اس لئے ماننا پڑے گا کہ کنجوسی سے مراد ''حقوق واجبہ'' کو روکنا ہے، اس لئے کہ واجبات کو ادا کرنے کے ساتھ کوئی کتنا ہی کنجوس ہو، وہ چاہے مورد مذمت قرار پاتا ہو لیکن مستوجب عذاب نہیں ہوسکتا۔[3]

یہاں انہیں مستحق عذاب ہی نہیں بتایا گیا ہے بلکہ کافرین کی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جو ''کُفران'' سے بھی ہوسکتا ہے جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے ''ناشکروں کے لئے'' ...... چونکہ مال اور جو نعمت الٰہی ہے، اُس کا شکر یہی ہے کہ اُسے اللہ کی مرضی کے مطابق خرچ کیا جائے اور ''کفر'' سے بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ حج کے حکم کے بعد کہا گیا ہے:۔

و من کفر فان اللہ غنی عن العالمین۔

اور جو کفر اختیار کرے تو اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ یہاں ترک حج کو کفر سے تعبیر کیا گیا جو گناہ کی اہمیت ثابت کرنے کا ایک انداز ہے تو منع زکوٰۃ کو بھی جو یہاں ''بخل'' کی لفظ کا مطلب ہے اگر کفر سے تعبیر کیا جائے تو کوئی عجیب بات نہیں ہے۔[4]

وَالَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ وَمَنۡ يَّكُنِ الشَّيۡطٰنُ لَهٗ قَرِيۡنًا فَسَآءَ قَرِيۡنًا ﴿۳۸﴾

''اور جو اپنے مال خیرات میں صرف کرتے ہیں لوگوں کے دکھانے کے لئے اور اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ روز آخرت پر اور جس کا ہمدم شیطان ہو، اس کا بہت بُرا ہمدم ہے''۔

پہلے اُن لوگوں کی مذمت ہوئی تھی جو بخل سے کام لیتے ہیں اور راہ خدا میں خرچ کرتے ہی نہیں اور اب اُن کی مذمت ہو رہی ہے جو خرچ کرتے تو ہیں مگر لوگوں کے دکھانے کی خاطر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خیرات کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہی ہیں۔ ایسی خیرات کا کوئی حاصل نہیں

---

[1] ۔نصب علی المصدر وتقدیرہ: واحسنوا الی الوالدین احسانا (تبیان)

[2] ۔الرفیق فی سفر او صناعۃ وقیل الزوجۃ (جلالین)

[3] ۔ذلک لایلیق الا بمنع الواجب (تبیان)

[4] ۔فسمی البخیل کافرا (علی بن ابراھیم)

ہے۔[1]

وَمَا ذَا عَلَيۡهِمۡ لَوۡ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمۡ عَلِيۡمًا ﴿۳۹﴾

''اوران کا کیا نقصان تھا اگر یہ ایمان لاتے اللہ اور روز آخرت پر اور جو اللہ نے انہیں روزی عطا کی، اُس میں سے خیرات کرتے اور اللہ ان سے خوب واقف ہے''۔

''ان کا کیا نقصان تھا؟'' استفہام انکاری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایسا کرتے کوئی ان کا نقصان نہ تھا بلکہ نقصان تو اس کے خلاف صورت اختیار کرنے سے ہے۔[2]

قرآن مجید میں یہاں اور بہت سے مقامات پر جو انسان کے کسی خاص رویہ پر اس طرح کی سرزنش کی گئی ہے، وہ ثبوت قطعی ہے اس امر کہ انسان اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے۔

اور خالق کی طرف سے اُس کے افعال میں کوئی جبر نہیں ہے ورنہ اس طرح کی سرزنش کے کوئی معنی ہی نہ ہوتے۔[3]

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنۡ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفۡهَا وَيُؤۡتِ مِنۡ لَّدُنۡهُ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۴۰﴾

''یقیناً اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر وہ نیکی ہو[4] تو اسے بدر جہا بڑھا دیتا ہے[5] اور اپنی جانب سے بہت بڑا اجر عطا فرماتا ہے''۔

خدا کی طرف سے ہر قسم کی ظلم کی نفی

انسانی افعال دو قسم کے ہوتے ہیں: حسنات اور سئیات یعنی نیکیاں اور برائیاں۔ ان کے مقابل میں اللہ کی طرف سے دو چیزیں ہیں ثواب اور عذاب۔

اب مقام تصور میں خدا کی طرف سے جو ثواب اور عذاب ملے، اُس کی ہر ایک میں تین صورتیں ہیں:

حسنات کے مقابلہ میں:

---

[1]۔ جمع اللہ سبحانہ فی الذم والوعید بین من ینفق مالہ بالرئاء والسمعۃ ومن لم ینفق اصلاح (مجمع البیان)

[2]۔ لاضرر فیہ وانما الضرر فیما ھم علیہ (جلالین)

[3]۔ لو کانوا غیر قادرین لکان فیہ اوضع العذر لھم ولما جاز ان یقال: وماذا علیھم (تبیان)

[4]۔ معناہ ان تلک زنۃ الذرۃ حسنۃ او وان تلک فعلۃ حسنۃ (تبیان)

[5]۔ یجعلھا اضعافا کثیرۃ وقیل یجعلھا ضعفین (مجمع البیان)

(۱) ثواب درجۂ استحقاق سے کم یا بالکل نہیں

(۲) درجۂ استحقاق بھر

(۳) درجۂ استحقاق سے زیادہ

سیّئات کے مقابلہ میں:

(۱) عذاب درجۂ استحقاق سے کم یا بالکل نہیں

(۲) درجۂ استحقاق بھر

(۳) درجۂ استحقاق سے زیادہ

عقلی طور پر حسنات میں پہلی قسم اور سیات میں تیسری قسم داخل ظلم ہے اس لئے آیت قرآن کے پہلے فقرہ سے (اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ) ان دونوں کی نفی ہوجاتی ہے لیکن دونوں میں وسطی قسم یعنی ثواب بمقدار درجۂ استحقاق اور عذاب بقدر استحقاق، یہ بمقتضائے عدل صحیح اور حسنات میں تیسری قسم یعنی ثواب درجہ استحقاق سے زیادہ اور سیات میں پہلی قسم یعنی عذاب درجہ استحقاق سے کم یا بالکل نہیں، یہ دونوں مقتضائے تفضّل ہیں جو لازم نہیں ہیں مگر مشیت الٰہی کی صورت میں مستحسن ہیں چنانچہ خالق کی طرف سے حسنات میں تو یہ عام اعلان ہوگیا ہے کہ وہ اُن کی جزا اصل عمل سے بہت زیادہ عطا کرتا ہے جس کا اس آیت کے بھی دوسرے فقرہ میں ذکر ہے اور دوسری آیتوں میں تو اور زیادہ اس جزا کے اضافہ کا اعلان ہے اور سیات میں بھی اُس حد تک کہ خلق خدا میں احساس سزا بالکل ختم نہ ہوجائے اور خوف کا عنصر باقی رہے، جابجا خاص شرائط وقیود کے ساتھ تفضّل کی کارفرمائی کا اعلان ہوا ہے جس کا دوسری آیتوں میں جابجا قرآن مجید میں تذکرہ موجود ہے۔

یہ کہنا کہ ''اللہ ظلم نہیں کرتا'' جیسا کہ اس آیت میں ہے اور قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی، اس کا ثبوت ہے کہ کچھ کام ایسے ہیں کہ اگر وہ اللہ سے (معاذ اللہ) صادر ہوں تو وہ ظلم قرار پائیں گے جو عدلیہ کا نقطہ نظر ہے۔

عدل کے جو منکر ہیں، اُن کا تصور یہ ہے کہ اللہ حاکم مطلق ہے۔ وہ جو بھی کرے، ٹھیک ہے۔ یہ قرآنی تصریحات کی بنا پر درست نہیں ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سے نفی ظلم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ظلم پر قادر نہیں ہے کیونکہ قادر نہ ہوتے ہوئے کسی چیز کا ترک کرنا کوئی تعریف نہیں ہے بلکہ ظلم پر قادر ہوتے ہوئے وہ اپنے کمال ذات، علم وحکمت اور استغنا کی بناء پر ظلم سے بری ہے۔[1]

فَكَيۡفَ إِذَا جِئۡنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍۭ بِشَهِيدٍ وَجِئۡنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾

''تو کیا ہوگا اس وقت جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں اور آپ کو اُن پر گواہ بنا کر لائیں گے۔''

ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے، اس لئے ''تو کیا ہوگا'' کا تعلق ماقبل سے کیا ہے؟ اسے وثوق کے ساتھ بتایا نہیں جاسکتا۔

ہم جو معنی اس کے سمجھتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ہر امت کا گواہ اُس کا پیغمبر ہوگا[2] اور ان لوگوں کے گواہ ہمارے رسولؐ۔ اس سے ہمارے پیغمبرؐ

---

[1]۔ فيه ايضاً دلالة على انه قادر على الظلم... غير انه كان قادراً عليه فانه لا يفعله لعلمه بقبحه دلانه غني عنه (تبيان)

[2]۔ شهيد يشهد عليها بعملها وهو نبيها (جلالين)

کی فضیلت تمام انبیاء کے مقابلہ میں نمایاں ہوتی ہے کہ آپ کے اُن انبیاء سے وہ نسبت ہے۔ جو اُن انبیاء کو اپنی امتوں سے ہے۔ اسی طرح بعد رسولؐ بھی ہر دور کا امام اپنے عہد کے افراد پر گواہ ہے اور ان گواہوں کے گواہ بھی رسولؐ ہیں [1] جیسا کہ اس کے پہلے دوسرے پارہ کے ابتدائی حصہ میں آ چکا ہے۔

لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

تم لوگ تمام انسانوں پر گواہ ہو اور پیغمبر تم لوگوں پر گواہ ہوں۔

جس سے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت ان ائمہ معصومین علیہم السلام کے مقابلہ میں بھی ظاہر ہے۔

مگر عام طور پر مفسرین اس کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ ہم ہر امت کا ایک گواہ لائیں گے اور آپ کو ان لوگوں (یعنی اس امت کے افراد) پر گواہ بنا کر لائیں گے۔ [2]

اس طرح حضرت کی کوئی خاص خصوصیت اس آیت سے ثابت نہ ہوگی۔

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾

"اُس دن اُن لوگوں کا جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا اور پیغمبر کی بات نہیں مانی تھی، دل چاہے گا کہ کاش وہ زمین کے برابر کر دیئے جاتے اور وہ (اب) اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔"

"تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ" کا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ وہ اُس دن آرزو کریں گے کہ وہ اپنی نوعیت وجود میں کاش انسان نہ ہوتے بلکہ زمین کے برابر ہوتے جیسا کہ دوسری جگہ کافروں کی تمنا مذکور ہے کہ

یالیتنی کنت ترابا۔

کاش میں خاک ہوتا [3]

دوسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ "کاش (وہ پیوند خاک ہوجاتے اور) اُن کے اوپر سے زمین برابر کر دی جاتی" (ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب مرحوم)

مجھے معتبر تفاسیر میں ابھی تک اس کی موافقت نہیں ملی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

---

[1]۔ فرسول اللہ یشھد علی الائمۃ وھم شھداء علی الناس (علی بن ابراھیم)

[2]۔ علی ھولاء یعنی علی امۃ (تبیان) علی قومہ (مجمع البیان) بیاوریم تر گواہ بر ایں امت (شاہ ولی اللہ)

[3]۔ بان یکونوا ترابا مثلھا (جلالین) یودون انھم لم یبعثوا وانھم کانوا والارض سواء (مجمع البیان)

وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ
اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا
صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَیْدِیْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

''اے ایمان لانے والو! نماز کے پاس نہ جاؤ اس حالت میں کہ تم نشہ میں ہو جب تک تمہیں اتنا ہوش نہ ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور نہ جنابت کی حالت میں جب تک غسل نہ کرلو، سوا اس صورت کے کہ تم سفر میں ہو اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا پائخانہ سے ہو کے آئے ہو یا عورتوں سے مقاربت کی ہے اور پانی دست یاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کرلو، اس طرح کہ اس سے اپنے منہ اور ہاتھوں کا مسح کرو۔ یقیناً اللہ انصاف کرنے والا ہے، بہت بخشنے والا''۔

غسل جنابت کا حکم اور تیمّم کی ترکیب

یہ آیت شراب کی صریحی ممانعت کے قبل نازل ہوئی تھی اور گویا تمہید تھی شراب کی مطلق ممانعت کے لئے۔ اس میں بس اتنا بتایا گیا تھا کہ نشہ کی حالت میں نماز درست نہیں ہوسکتی۔ جب دوا کی اتنی خوراک حلق سے اتر گئی تو پھر رفتہ رفتہ شراب کی مطلق ممانعت وارد ہوئی۔

حالت جنابت میں نماز کے قریب جانے سے یہ استثناء کہ: اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ ''مگر حالت سفر میں'' اس لئے ہے کہ سفر کی حالت کا حکم بیماری کے ساتھ ساتھ بعد میں ہوا ہے کہ اس صورت میں تیمم کیا جائے گا۔

ایک دوسری تفسیر اس کی یہ ہوئی ہے کہ ''نماز کے قریب نہ جاؤ'' اس سے مراد مساجد میں داخل ہونا ہے اور مساجد میں عموماً حالت جنابت میں جو داخلہ ممنوع ہے، وہ ٹھہرنے کی صورت میں لیکن اگر ایک دروازہ سے داخل ہو اور دوسرے دروازے سے نکل جائے تو اس کی ممانعت نہیں ہے۔ اس حکم کو بیان کیا جارہا ہے۔

جناب شیخ الطائفہ نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

مگر میرے نزدیک پہلے معنی زیادہ درست معلوم ہوتے ہیں، اس بنا پر کہ وہ عام مساجد کا حکم ہے کہ ان میں ٹھہرنا ناجائز ہے اور گزرنا جائز ہے لیکن مسجدین یعنی مسجد مکہ و مدینہ میں تو گزرنا بھی حرام ہے اور ظاہر ہے کہ وقت نزول آیت قریب محل نماز کا جو ذہن میں آسکتا تھا، وہ یہی مسجدین ہیں لہٰذا یہ کیونکر ممکن ہے کہ عام الفاظ صرف کرکے ایسا حکم بیان کیا جائے جو ان دونوں مسجدوں پر منطبق نہ ہو۔

یہاں بھی احکام فقہ پر نظر کی جائے تو ہر ہر جز میں پتہ چلے گا کہ ان احکام میں قرآن کے ساتھ احادیث کے تشریحات ہی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً بیمار ہو، اس کے ساتھ یہ قید ہے کہ ایسی بیماری جس میں نہانا نقصان کرتا ہو۔ مسافر ہو، اس کے ساتھ یہ قید لازمی ہے کہ مسافر ہونے کی وجہ سے پانی دستیاب نہ ہوتا ہو اور اب اصل سفر نہیں رہا بلکہ پانی کا دست یاب نہ ہونا اصل معیار بن گیا۔ اس لئے اگر حضر میں بھی پانی نہ ملے تو تیمم کا حکم ہوگا۔ اور اگر سفر ہے مگر پانی کا استعمال ممکن ہے تو غسل لازم ہے، تیمم درست نہیں ہے۔

پھر پانی نہ ملنے کے حدود کیا ہیں؟ کتنی دور تک تلاش کرنا لازم ہے؟ بغیر اس تلاش کے تیمم درست نہیں ہے اور جب اتنی تلاش کے بعد نہ

ملے تو تیمم صحیح ہوگا۔

پانی مل رہا ہے مگر غصبی ہے تو کیا حکم ہوگا؟

پانی ملتا ہے مگر اتنی قیمت پر جو اس کے لئے تباہی کا باعث ہے، تو کیا ہوگا؟

غرض ایسے ہی کتنے تفصیلات ہیں جو بغیر بیان معصومین کے معلوم نہیں ہوتے اور کبھی دوسرے قواعد شرعیہ پر نظر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کے اجتماع سے نتیجہ نکالا جاتا ہے جو حقیقتاً مجتہد کا کام ہے اور اس سب سے جو نتیجہ برآمد ہو، وہ علم فقہ کا جز بنتا ہے۔

اسی طرح تیمم میں منہ اور ہاتھوں کی کتنی مقدار پر مسح کیا جائے؟ اس کا بھی بیان احادیث ہی کے ذمے ہے۔ صرف قرآن مجید سے ان احکام قرآنی پر عمل ناممکن ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۫ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا اُن کو جنہیں کتاب کا کچھ حصہ ملا ہے کہ یہ گمراہی مول لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی سیدھے راستے سے بہک جاؤ اور اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کوئی سرپرست اور اللہ سے بڑھ کر کوئی مددگار نہیں ہوسکتا۔''[1]

آیت کے مضمون کا ظاہری نگاہ میں کوئی تناسب قبل والے مضمون سے معلوم نہیں ہوتا اور ہمارے نزدیک اس کی ضرورت بھی نہیں ہے جب کہ یہ معلوم ہے کہ ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ جہاں پر مطابق تنزیل ہو، وہاں بھی یہ ضروری نہیں ہے جب کہ آیات قرآن بحیثیت ایک تصنیف کے مسلسل اجزاء کے آئے ہی نہیں ہیں بلکہ مختلف واقعات کی مناسبت سے اترے ہیں تو اگر دو واقعے دو نوعیتوں کے ہوئے ہوں مثلاً کسی دن ایک صحابی کو غسل کی ضرورت ہوئی اور پانی موجود نہ تھا لہٰذا ضرورت تھی کہ تیمم کا حکم بتایا جائے اور اُسی دن اُس کے بعد ہی کسی یہودی نے تھوڑی سی رقم لے کر کسی حقیقت کا انکار کیا اور کچھ مسلمانوں کو بہکانے کی کوشش کی اور اس لئے یہ آیت اُتری۔ کوئی کاتب آیا، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں آیتیں یکے بعد دیگرے لکھوا دیں۔ اس طرح کتابت میں اُس وقت یہ دونوں آیتیں مسلسل درج ہوگئیں تو اَب بعد کے مفسرین کے لئے کیا معقولیت ہے کہ ان دونوں آیتوں کے مضمون میں تناسب کی تلاش کریں اور اگر آسانی سے تناسب پیدا نہ ہو تو کھینچ تان کر کچھ نہ کچھ ربط ضرور قائم کر دیا جائے جو ہمارے ہندوستان کے قریبی دور کے ایک صاحب قلم جناب حمید الدین فراہی صاحب کا پوری تفسیر کا مرکزی نقطہ نظر ہے جس کی وجہ سے نام ہی انہوں نے اپنی تفسیر کا ''نظام القرآن'' رکھ دیا ہے اور تعجب ہے کہ ہمارے اکابر مفسرین نے بھی بلا وجہ یہ کوشش

[1] خدا دوست بس است و خدا یاری دهنده بس است (شاہ ولی اللہ)

کرڈالی ہے[1] جس کی ہمارے نزدیک کوئی معقول بنیادنہیں ہے۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

یہودیوں میں ایسے ہیں جو جملوں کو اُن کے محل سے تحریف کر کے ہٹا دیتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور مانا نہیں اور سنو، تمہاری بات نہ سنی جائے[2] اور راعنا اپنی زبان میں دوسرے معنی لے کر[3] اور دین پر اعتراض کرتے ہوئے اور اگر وہ یوں کہتے کہ ہم نے سنا اور مانا اور سنیے اور ہماری طرف دیکھیے تو ان کے لئے بہتر اور زیادہ صحیح ہوتا مگر اللہ نے ان کے کفر کی بدولت ان پر لعنت کی ہے تو یہ ایمان لائیں گے نہیں مگر بہت کم"۔

ہر زبان کے محاورہ کے لحاظ سے جس کے شواہد قرآن مجید میں بھی موجود ہیں قول یعنی کہنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ زبان ہی سے ہو بلکہ بسا اوقات دل میں جو کہا جائے، اسے بھی کہنے کی لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

یہودیوں کی جس جماعت کا ذکر ہے، وہ اگر کھلم کھلا معاندانہ رویہ اختیار کرنا چاہتی تو اُسے رسولؐ کے پاس آ کر اس طرح کے الفاظ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟!

بظاہر تو یہ لوگ ایسے ہی تھے جو منافقانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ پھر زبان سے وہ پیغمبرؐ کی بارگاہ میں اس طرح کی بات کیوں کر کر سکتے تھے کہ **سمعنا واطعنا** کے بجائے **سمعنا وعصینا** کہیں اور آپ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے ایک طرح کی بددعا دیں کہ: واسمع غیر مسمع (سنیے، خدا کرے آپ کی بات نہ سنی جائے) وغیرہ وغیرہ...... بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں کچھ وہ دل میں کہتے تھے جن کا خالق نے انکشاف کیا ہے اور کچھ باتیں زبان سے کہتے تھے اور ان کا مطلب کچھ دوسرا لیتے تھے چنانچہ جب آپ کوئی حکم دیتے تھے تو ممکن ہے زبان سے کہ دیتے ہوں: **سمعنا** "جی ہم نے سن لیا" مگر اس کے ساتھ دل میں اُن کے یہ ہوتا تھا کہ: **وعصینا** یعنی "ہمیں ماننا اسے تھوڑی ہے" "ہم عدول حکمی کر کے رہیں گے" اسی طرح آپ کو متوجہ کرتے تھے کہ **واسمع** "سنیے ہماری بات" اور دل میں آپ کی شان میں یہ کہتے تھے کہ **غیر مسمع**

---

[1]. وجه اتصال هذه الاية بما قبلها التاكيد للاحكام التي يجب العمل بها بالتحذير عمن يدعوا الى خلافها (تبیان)

[2]. غير مسمع حال بمعنى الدعاء اى لا سمعت (جلالین)

[3]. راعنا پیچ دے کر اپنی زبان کو (شاہ رفیع الدین)

''خدا کرے آپ کی بات نہ سنی جائے''۔[1]

بے شک اس معنی میں کہ ہمارا خیال کیجئے ''راعنا'' ایک ایسی لفظ کہتے تھے جس کے معنی برے لیتے تھے۔ اس بنا پر اس کے پہلے سورہ بقرہ میں راعنا کہنے سے منع کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین ان تمام الفاظ کو کہتے ہیں کہ وہ زبان سے کہتے تھے اور وہ ذومعنیین ہوتے تھے حالانکہ سمعنا وعصینا اور اسمع غیر مسمع کے برے معنی اتنے نمایاں ہیں کہ اچھے معنی کسی طرح پیدا نہیں ہوتے بلکہ اچھے معنی کے پیدا کرنے کی کوشش مضحکہ خیز طور پر غلط معلوم ہوتی ہے لہٰذا انہیں ذومعنیین کسی طرح نہیں سمجھا جا سکتا جس کے بعد ان کا زبان سے ان الفاظ کو کہنا بالکل خلاف عقل قرار پاتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

''اے اہل کتاب! ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے اتارا ہے تصدیق کرتا ہوا اس کی جو تمہارے پاس ہے، اس سے پہلے کہ ہم بگاڑ دیں کچھ چہروں کو اور انہیں پیٹھ کی طرف پھیر دیں، یا ان پر اس طرح لعنت برسائیں جس طرح ہم نے ہفتہ کے دن والوں پر لعنت برسائی تھی اور اللہ کی بات ہو کر رہتی ہے۔''

فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ کا جو مفہوم ظاہری صورت سے سمجھ میں آتا ہے، وہ وہی ہے جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ: ''انہیں پیٹھ کی طرف پھیر دیں'' اور بعض مترجمین نے پہلے بھی ایسا ترجمہ کیا ہے[2] اور اس صورت میں قبل کے فقرہ سے اس کا تعلق یوں ہے کہ جب منہ پیٹھ کی طرف ہو جائے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا حسن وجمال محسوس نہیں ہو سکتا جو سامنے کی طرف ہونے میں ہے۔ اس لئے وہ اس کا مٹ جانا ہی ہے لیکن مٹانے کا دوسرا مفہوم جو اس لفظ سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے، یہ ہے کہ ان کے چہروں کے خط وخال اور آنکھ ناک کا امتیاز بالکل مٹ جائے۔ اس کی مطابقت سے دوسرے فقرہ کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے کہ ''ہم انہیں ان کی پیٹھ کی طرح کا بنا دیں'' یعنی چہرہ اور پیٹھ میں کوئی امتیاز نہ رہے[3] بعض تفاسیر بھی اسکے موافق ہیں۔[4]

لیکن یہ مفہوم فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ کے الفاظ کے جو لغوی معنی ہیں، ان سے بہت دور ہے۔ ان الفاظ کے تو معنی یہی ہوتے ہیں کہ انہیں ان کی پشت پر پھرا دیں یا پلٹا دیں۔

---

[1] یعنی الیھود یقرلون سمعنا قولك یا محمد ویقولون سرا عصینا (تبیان) یقولون بالسنتھم سمعنا وفی قلوبھم عصینا (مجمع البیان)

[2] پس پھیر دیں ان کی اوپر پیٹھاں کی کے (شاہ رفیع الدین)

[3] پس بگردانیمش بر شکل پشت رویہا (شاہ ولی اللہ)

[4] فنجعلھا کالاقفاء لوحا واحدا (جلالین)

''اصحاب سبت'' یعنی ہفتہ والے دن کے لوگوں کا تذکرہ دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے کہ وہ بندروں کی صورت میں مسخ ہو گئے تھے۔ یہ مسخ چونکہ رحمت خدا سے دور ہونے کا ایک مشاہدہ میں آنے والا ثبوت تھا، اس لئے اس کو لعنت کی لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ نہ یہ کہ لعنت کے معنی مسخ کے ہیں، جیسا کہ بعض تفاسیر سے شبہ ہوسکتا ہے۔ [1]

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿٤٨﴾

''یقیناً اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا ہر بات کو بخش دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرے، اس نے بہت بڑے گناہ کے ساتھ بہتان باندھا'' [2]

شرک نا قابل معافی، باقی ہر گناہ کی معافی کا امکان

اس آیت سے اہل ایمان کے لئے چاہے کتنے ہی گنہگار ہوں، مغفرت کی امید پیدا کی گئی ہے، پھر مشیت کے ساتھ وابستہ کر کے خوف کی آمیزش کردی گئی ہے تاکہ خوف و رجا کے دونوں پلے جو ایمان کے لئے ضروری ہیں، برابر ہو جائیں۔ یہ بخشش جس کا امکان شرک کے علاوہ ہر گناہ میں بتایا جارہا ہے صرف عفو و کرم کے نتیجہ میں ہے جب کہ بندہ نے اس گناہ سے آخر وقت تک توبہ بھی نہ کی ہو، کیونکہ توبہ کی صورت میں تو شرک بھی معاف ہو جاتا ہے۔ شرک میں جو قطعی اعلان عدم مغفرت کا ہے، وہ توبہ نہ کرنے کی صورت میں ہے [3] تو اس کے بالمقابل دوسرے گناہوں میں جو مغفرت کا تصور پیدا کیا گیا ہے وہ بھی اسی صورت سے متعلق ہوگا اور نہ اس استثنا کے کوئی معنی نہ ہوں گے۔ [4]

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿٤٩﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا انہیں جو خود اپنی تعریفیں کرتے ہیں [5] بلکہ اللہ جس کی چاہے تعریف کرے اور ان پر ایک سوت برابر بھی ظلم نہیں ہوگا'' [6]

مطلب یہ ہے کہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے کیا حاصل! تعریف تو وہ ہے جو اللہ کسی کی تعریف کرے۔ اب یہ تعریف قرآن اور حدیث

---

[1]. نلعنہم .بمسخھم قردۃ کما لعنا مسخنا (جلالین)

[2]. ہر آئینہ افترا کرد بہ گناہ بزرگ (شاہ ولی اللہ)

[3]. نفی ان یغفر من غیر توبہ لان الامۃ اجتمعت علی ان اللہ یغفرہ بالتوبہ (مجمع البیان)

[4]. ھذہ الایۃ من اکد مادل علی ان اللہ تعالیٰ یعفو عن المذنبین من غیر توبۃ (تبیان)

[5]. ای .بمدحونہا ویصفونہا بالزکو والطہارۃ (مجمع البیان)

[6]. ستم کردہ نخواہند شد بمقدار رشتہ (ولی اللہ) نہ ظلم کیے جائیں گے ایک تاگے برابر (رفیع الدین)

کی زبان سے بھی ہوسکتی ہے اور یوں بھی کہ انسان کے افعال واعمال ایسے ہوں کہ اللہ اس کی تعریف زبان خلق پر جاری کرادے۔ اور یہ تعریف خود اس کے حسن کردار سے ان کے افعال کا نتیجہ ہوتی ہے، اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ "ان پر ذرا بھی ظلم نہیں ہوگا"۔ یعنی جو تعریف کا مستحق ہوتا ہے خدا ضرور اس کی تعریف کرتا اور کراتا ہے۔

ہم با مناسب فقرہ اول یہی معنی سمجھتے ہیں لیکن بعض حضرات نے دوسرے فقرہ میں تزکیہ کے معنی پاک کرنے کے قرار دیئے ہیں یعنی کسی نفس کو پاک بنانا اللہ کا کام ہے۔[1]

اس میں تاویل کی بھی ضرورت ہے، جب کہ قرآن مجید میں خود دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

قد افلح من زکھّا: فلاح پائی اس نے جس نے خود اپنے نفس کو پاک کیا۔

اور پھر پہلے جملہ سے مناسبت بھی زحمت طلب ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۵۰

"دیکھو یہ کس طرح اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور اس سے بڑھ کر کھلا ہوا گناہ کیا ہوگا۔"

اس جھوٹی تہمت سے مراد کتاب اللہ کی تحریف بھی ہوسکتی ہے لیکن اگر یہ آیت مقام تنزیل میں بھی سابق آیت کے بعد ہی ہو تو اس کی مناسبت سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اپنی تعریفوں کا جو ذکر تھا اس میں جماعت یہود و نصاریٰ کے اس قسم کے دعاوی پیش نظر تھے کہ:

نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ.

ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں

اور:

لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى.

جنت میں نہیں داخل ہوگا کوئی سوا اس کے جو یہودی یا عیسائی ہو۔

ان تمام خودستائیوں میں اللہ کی جانب ایک غلط چیز کی نسبت مضمر ہے وہ ہمارا باپ ہے، وہ ہم سے محبت کرتا ہے یا وہ ہم ہی کو جنت میں بھیجے گا۔ اس لئے کہا جارہا ہے کہ یہ سب خالق پر غلط تہمتیں ہی یہ لوگ لگا رہے ہیں[2] اور کوئی بھی جھوٹ بولنا گناہ ہے اور کسی پر تہمت لگانا معصیت ہے۔ چہ جائیکہ وہ جھوٹ جس میں اللہ پر غلط تہمت لگائی جائے۔ اس سے بڑھ کر کھلا ہوا گناہ کیا ہوگا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ

وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝۵۱ اُولٰۗىِٕكَ

---

[1] ۔ای یطھر من الذنب من یشاء (مجمع البیان)

[2] ۔المراد بہ تزکیتہ انفسھم بانھا ابناء اللہ واحباوہ وانہ لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا او نصاری (تبیان)

الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ یَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِیْرًا ﴿۵۲﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا انہیں کہ جن کو کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا کہ وہ جبت اور طاغوت کے معتقد ہوتے ہیں اور کافروں کو کہتے ہیں کہ یہ اہل ایمان سے زیادہ ٹھیک راستے پر ہیں۔ یہ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کرے، اس پر ہرگز کوئی مددگار تم نہ پاؤ گے۔''

جبت اور طاغوت کی تشریح میں تعبیرات کا بہت اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:۔

''معتقد می شوند بت را د معبود باطل را'' (فتح الرحمن)

ان کے صاحبزادے لکھتے ہیں:۔

''یقین لاتے ہیں ساتھ سحر کے اور بتوں کے'' (شاہ رفیع الدین)

تیسرا قول یہ ہے کہ یہ دونوں دو بتوں کے نام ہیں:۔

صنمان لقریش (جلالین)

مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے ترجمہ تو یہ کیا ہے کہ

''شیطان اور بتوں کا کلمہ پڑھنے لگے''

مگر حاشیہ پر شان نزول جو لکھی ہے، اس سے جلالین کی تائید ہوتی ہے۔ لکھا ہے کہ:۔

''احد کی لڑائی کے بعد کعب بن اشرف ستر سواروں کے ساتھ رسول اللہؐ سے عہد شکنی کر کے کفار قریش کو آپ کے مقابلہ پر آمادہ کرنے کے واسطے مکہ میں آیا۔ ابوسفیان نے اس سے کہا کہ تم اور محمدؐ دونوں اہل کتاب ہو۔ جب تک تم ہمارے بتوں کو سجدہ نہ کرو گے ہم کو تم دونوں میں سے کسی کا اعتبار نہیں۔ آخر کعب نے جبت و طاغوت کو سجدہ کیا۔''

علامہ طبرسی بھی اس کے موید ہیں اس طرح کہ:۔

یعنی بہما الصنمین الذین کانا لقریش وسجدا لهما کعب بن الاشرف (مجمع البیان)

جناب شیخ الطائفہ نے جبت اور طاغوت کی تشریح میں پانچ قول نقل کیے ہیں جن کے تحت میں یہ تمام تشریحات آجاتے ہیں اور پھر ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ:

هما کل معبود من دون الله (تبیان)

اللہ کے سوا جس کی بھی عبادت کی جائے، وہ جبت و طاغوت ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں لفظوں کو الگ الگ نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ یہ دونوں ایک ساتھ استعمال ہو کر ایک ہی معنی کو بتاتی ہیں جسے کہیں تنہا لفظ طاغوت سے ظاہر کیا جاتا ہے اور کہیں دونوں لفظوں کو ملا کر ان کے مجموعہ سے جس کی نظریں ہر زبان کے محاوروں میں مثل ''جدو جہد'' کے کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

اب مجموعی حیثیت سے آیت کے مضمون پر نظر ڈالئے۔

اصولاً ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مشرکین یعنی وہ جو خدا کی وحدت اور نظام رسالت و شریعت ہی کے قائل ہی نہیں ہیں، جس طرح مسلمانوں کے حریف مقابل ہیں، اسی طرح یہود اور نصاریٰ کے بھی جو کسی نہ کسی حد تک ان باتوں کو مانتے ہیں لہٰذا یہود و نصاریٰ کو مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک محاذ بنالینا چاہئے تھا جو مشرکین سے برسر مقابلہ ہوتا مگر کتنے غضب کی بات ہے کہ اس جماعت نے بجائے مسلمانوں کا ساتھ دینے کے مشرکین کا ساتھ دیا اور مشرکین پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسی کو قرآن نے کہا ہے کہ ''کافروں کو کہتے ہیں کہ یہ اہل ایمان سے زیادہ ٹھیک راستے پر ہیں۔''

یوں تو ''اہل ایمان'' کے مقابلہ میں جس سے مراد یہاں مسلمان ہیں، یہود و نصاریٰ بھی کفار کے زمرہ میں داخل ہیں، مگر چونکہ وہ یعنی یہود و نصاریٰ جن باتوں پر اصول حق میں سے ایمان رکھتے ہیں جیسے وحدت خالق اور نبوت و شریعت، انہیں بھی مشرکین تسلیم نہیں کرتے تو اہل کتاب کے مقابلہ میں مشرکین ''کافر'' کے لقب سے نامزد ہیں۔ اس لئے کہ ''کافر'' گالی کے طور پر کوئی انتقامی لفظ نہیں ہے بلکہ وہ ایک واقعیت کا اظہار ہے کہ اس بات کو کون مانتا ہے کہ اور کون نہیں مانتا چنانچہ رسالت حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہود و نصاریٰ نہیں مانتے تو اس حقیقت کے اعتبار سے وہ کافر ہیں اور اصل نظام شریعت کو جسے یہ سب مانتے ہیں، مشرکین نہیں مانتے تو ان سب کے مقابلہ میں وہ کافر ہیں۔ اسی اعتبار سے یہاں اہل کتاب کا نام الگ لیا گیا ہے اور ''الذین کفروا'' یعنی کافروں کا الگ اور پھر: ''الذین امنوا'' کی لفظ کے ساتھ مسلمانوں کا الگ۔

اَمۡ لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّنَ الۡمُلۡكِ فَاِذًا لَّا يُؤۡتُوۡنَ النَّاسَ نَقِيۡرًا ۝۵۳

''کیا اقتدار سلطنت میں ان کا کوئی موروثی حصہ ہے؟ پھر تو یہ لوگوں کو ذرا سا بھی [1] منہ دیں گے۔''

یہ استفہام انکاری حیثیت رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سلطنت واقتدار کسی کا موروثی حصہ نہیں ہے کہ یہ دوسرے تک ذرا سا بھی اس کے پہونچنے کے روادار نہ ہوں۔ [2]

اَمۡ يَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ۚ فَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَاٰتَيۡنٰهُمۡ مُّلۡكًا عَظِيۡمًا ۝۵۴

''یا وہ لوگوں پر رشک وحسد کرتے ہیں اُس پر جو انہیں اللہ نے اپنے فضل وکرم سے دیا تھا (اچھا، پھر سن لیں کہ ہم نے نسل ابراہیمی کو کتاب اور حکمت عطا کی ہے۔ [3] اور انہیں بہت بڑا شاہانہ اقتدار عطا کیا ہے''۔

رسولؐ اور آل رسول علیہم السلام کا محسود خلق ہونا

پہلا استفہام انکاری تھا اور یہ استفہام اقراری ہے [4] یعنی ان کی مخالفت کا سبب یا تو یہ ہے کہ اقتدار سلطنت ان کا موروثی حق ہے لہٰذا

---

[1]۔ شیئا فیما قدر البقرۃ فی ظھر النواۃ (جلالین) کھجور کے شگاف کے برابر (شاہ رفیع الدین) بھوسی بھر بھی نہ دیں گے (مولانا فرمان علی صاحب)

[2]۔ ھذا استفھام و معناہ الانکار (مجمع البیان)

[3]۔ تحقیق دی ہم نے اولاد ابراہیمؑ کو کتاب اور حکمت (شاہ رفیع الدین)

[4]۔ معناہ بل یحسدون الناس (مجمع البیان)

یہ کسی دوسرے کو اس کے ملنے کے روادار نہیں ہو سکتے تو یہ بات تو غلط ہے۔حکومت و اقتدار کسی کی ملکیت نہیں ہے اور یا پھر یہ سبب ہے اور جب پہلا غلط ہے تو یقیناً بس یہی سبب ہے کہ یہ رشک وحسد کی وجہ سے کسی دوسرے پر اللہ کے فضل وکرم کی بارش نہیں دیکھ سکتے تو اگر یہ ہے اور واقعی یہی ہے تو پھر یہ جلتے رہیں۔ان کے جلنے سے اللہ کی نعمت کا دروازہ کسی پر بند نہیں ہو جائے گا اور اب یہ خوب جلیں کہ ہم قطعی اعلان کیے دیتے ہیں کہ ہم نے اولاد ابراہیمؑ کو جس کا اب مصداق نسل اسمٰعیلؑ میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور ان کی آل طاہرینؑ کی شکل میں نمودار ہوا ہے[1] اپنی طرف سے کتاب اور حکمت عطا کی ہے اور انہیں عالم گیر حکومت کے منصب پر بھی فائز کر دیا ہے[2] جو کسی کے جلنے سے سلب نہیں ہو سکتی اور یہ وہ حکومت ہے جو تاج وتخت سے وابستہ نہیں ہے۔ہاں تاج وتخت بھی اس کا حق ہے لہٰذا اگر کوئی تاج وتخت پر قبضہ کر کے حاکم بن جائے تو وہ غاصب ہو گا مگر یہ حکومت جس کے پائے نام ہے، اس کے لئے برقرار رہے گی۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۝٥٥

''تو ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور ان میں سے کوئی اس سے روگرداں ہو گیا اور دوزخ سے بڑھ کر کون آگ ہوگی۔''

''ان میں سے'' یہ ضمیر ان کی طرف ہے جنہیں کہا گیا تھا کہ ''کیا اقتدار سلطنت میں ان کا کوئی موروثی حصہ ہے یا وہ لوگوں پر رشک و حسد کرتے ہیں''......مطلب یہ ہے کہ خدا جسے اقتدار عطا کرتا ہے اس میں اس کا لحاظ نہیں ہوتا کہ کون مانتا ہے اور کون نہیں مانتا چنانچہ آل ابراہیمؑ کو خدا نے اپنی طرف سے اقتدار عطا کیا ہے۔اب یہ لوگوں پر ہے کہ کوئی مانتا ہے اور کوئی نہیں مانتا۔جس نے نہیں مانا، اس کے نہ ماننے سے ان کے اقتدار پر کوئی حرف نہیں آیا۔اسی کی آخرت میں بربادی ہوئی کہ آتش دوزخ کا مستحق ہو گیا، جسے آخر آیت میں ان لفظوں میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ''دوزخ سے بڑھ کر کون آگ ہو سکتی ہے۔''

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّ
لْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝٥٦ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۝٥٧

''بلاشبہ وہ جنہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کر دیا، انہیں ہم جلد ہی آگ کا مزہ چکھائیں گے جب ان کی پہلی کھالیں گل جائیں گی تو ان پر ہم دوسری کھالیں بدل کر چڑھا دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔ یقیناً اللہ

---

[1] انہ النبی ﷺ وھو قول ابی جعفر وزاد فیہ والہ (تبیان)

[2] قال مجاھد والحسن انہ النبوۃ وقال ابو جعفر انہ الخلافۃ من اطاعھم اطاع اللہ ومن عصاھم عصی اللہ (تبیان)

زبردست ہے، ٹھیک ٹھیک کام کرنے والا اور وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے، انہیں ہم بہت جلد ان بہشتوں میں پہنچا دیں گے جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ان کے لئے وہاں پاک و پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور انہیں ہم محفوظ سایہ میں جگہ دیں گے“۔ [۱]

بدلنا ھم جلودا غیرھا کا ظاہری مفہوم یہی ہے جس کے ساتھ ہم نے ترجمہ کیا ہے۔بعض لوگوں نے اس میں عقلی حیثیت سے خواہ مخواہ کی میخیں نکالی ہیں کہ گناہ تو پہلی کھال نے کیے تھے۔اس دوسری کھال کو سزا دینے کا کیا محل ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ گناہ اس آدمی نے کیے تھے۔اسی کو جلایا گیا اور اسی کو جلایا جا رہا ہے اور اسی کو اذیت پہنچانے کے لئے ایک کھال کے کہنہ ہو کر بے حس ہو جانے پر دوسری تازہ کھال کا لباس پہنایا جا رہا ہے تاکہ اس کی تکلیف قائم رہے۔کھال کو سزا نہیں مل رہی ہے۔وہ اس آدمی کو سزا کی تکلیف کا ذریعہ ہے۔[۲]

اسی کو قرآن میں کہا گیا ہے: لیذوقوا العذاب، جس کا ترجمہ میں نے کیا ہے ”تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں“ وہ، کون؟ کھالیں نہیں بلکہ وہ اشخاص جن پر پرانی کھالوں کے بدلے یہ نئی کھالیں چڑھائی گئی ہیں، وہی اصل مجرم ہیں۔نہ کہ وہ کھالیں جو ان پر چڑھی ہوئی تھیں بلکہ دوسری جگہ قرآن نے بتایا ہے کہ وہ کھالیں، ان کے خلاف اللہ کی طرف سے گواہی دیں گی اور وہ ان کھالوں سے شاکی ہوں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ.

اور وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ کہیں گی کہ ہمیں گویائی دی اس نے کہ جو ہر شے کو گویائی دیتا ہے اور وہ تو خود ہی جانتا ہے اسے جو تم کرتے تھے۔

اس سے بہت ہی نمایاں طور پر ظاہر ہے کہ جرائم کا ارتکاب کرنے والے اور ہیں، نہ کہ یہ کھالیں جو ان کے خلاف اللہ کی طرف کی گواہی ہوئی ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَھْلِھَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝۵۸

”بلاشبہ اللہ کا حکم تمہیں ہے کہ امانتیں ان کے حق کو ادا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔یقیناً اللہ تمہیں بہت اچھی ہدایتیں کرتا ہے۔یقیناً اللہ خوب سننے والا ہے، دیکھنے والا“۔

امانتوں میں اموال بھی ہیں جو مالک بنظر حفاظت دوسروں کے پاس رکھتا ہے اور وہ ذمہ داریاں بھی ہیں جو کسی معاہدہ یا ذاتی حق سے کسی دوسرے کے لئے اپنے اوپر عائد ہوں، جن میں سب سے اہم اللہ کی طرف کے احکام یعنی اوامر و نواہی کی تعمیل ہے۔اس سے عہدہ برآ ہونا امانت

---

[۱]۔الظلیل ھو الکنین لانہ لا شمس فیہ ولا سموم (تبیان)

[۲]۔انما ھو شی یصل بہ الالم الی المستحق لہ (تبیان)

داری کا بہت اہم جز ہے۔[۱]

اور پھر اسی کے عام دائرہ میں داخل ہے حکمرانوں کی ذمہ داری جو خلق خدا کی بہبودی کے پاس ولحاظ کی ان پر عائد ہوتی ہے۔[۲]

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝

''اے ایمان لانے والو! فرماں برداری کرو اللہ کی اور فرماں برداری کرو رسولؐ کی اور ان کی جو تم میں فرماں روائی کے حق دار ہیں لہٰذا اگر کسی بات میں تم جھگڑا ہو تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پلٹاؤ اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی اچھا ہے اور انجام کے لحاظ سے بہتر ہے''۔[۳]

آیہ اُولی الامر

اولی الامر کے معنی ''حکومت کا حق رکھنے والے'' ہی اس لفظ کا مقتضا ہے، اس لئے کہ غاصب صاحب مال نہیں کہلایا جاسکتا۔ اسی طرح حکومت پر ناجائز تصرف رکھنے والے کو اولی الامر میں سمجھنا بھی غلط ہے۔

اس سے جمہور کے اس خیال کا غلط ہونا ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اولی الامر کے تحت میں دنیوی بادشاہوں کی اطاعت کو فرض قرار دے لیا ہے، حالانکہ ان بادشاہوں کے احکام تو اکثر احکام خدا و رسولؐ سے متصادم بھی ہو جاتے ہیں تو پھر ان کا حکم اطاعت، خدا و رسولؐ کی اطاعت کے حکم سے ٹکرا جائے گا اور کلام الٰہی میں تضاد پیدا ہو جائے گا جو کسی صورت سے صحیح نہیں ہے اور اسی سے جمہور کی دوسری تفسیر بھی کہ اولی الامر سے مراد علماء ہیں غلط قرار پائے گی، اگر علماء سے عام علماء مراد ہوں اور اگر علمائے حقیقی یعنی معصومین علیہم السلام مراد ہوں تو ہمارے نزدیک وہ پہلے معنی یعنی حق حکومت کے اعتبار سے بھی اولی الامر ہوں گے۔

لا يجوز ان يوجب الله طاعته احد على الاطلاق الا من ثبت عصمته وعلم ان باطنه كظاهره وامن منه الغلط والامر بالقبيح وليس ذلك بحاصل فی الامرآء ولا العلماء سواهم جل الله ان يامر بطاعة من يعصيه او بالا نقياد للمخالفين فی القول والفعل لانه محال ان يطاع المختلفون كما انه محال ان يجتمع ما اختلفوا فيه. (مجمع البيان)

ممکن نہیں ہے کہ اللہ کسی کی بھی اطاعت بلاقید واجب کرے سوا اس کے کہ جس کا معصوم ہونا ثابت ہو اور معلوم ہو کہ اس کا باطن اسکے

---

[۱] . هو المروی عن ابی جعفر و ابی عبدالله (مجمع البيان)

[۲] . رواه اصحابنا عن ابی جعفر الباقر و ابی عبدالله الصادق (مجمع

[۳] . تاويلا مألا (جلالين) ای احمد عاقبة (مجمع البيان)

ظاہر سے بالکل متفق ہے اور جس سے غلطی اور کسی غلط کام کے حکم دینے کا خطرہ نہ ہو اور یہ بات نہ امراء کے لئے ہے اور نہ معصومین کے علاوہ دوسرے علماء کے لئے بالاتر ہے اللہ اس سے کہ وہ ایسے کی اطاعت کا حکم دے جو خود اس کا نافرمان ہو یا ان لوگوں کی پیروی کا حکم دے جن کے قول اور عمل میں اختلاف ہو۔ اس لئے کہ کئی کی اطاعت جو آپس میں اختلاف رکھتے ہوں ممکن نہیں ہے، جیسے کہ یہ ناممکن ہے کہ جن باتوں میں وہ اختلاف رکھتے ہیں، وہ ایک ساتھ سب صحیح ہوں۔

اس کو اس سے پہلے اس سے زیادہ مختصر لفظوں میں شیخ الطائفہ تحریر فرما چکے ہیں، اس طرح:۔

ولا يجوز ايجاب طاعته احد مطلقا الا من كان معصوما مامونا منه السهو والغلط وليس ذلك بحاصل فى الامرآء ولا العلماء وانما هو واجب فى الائمة الذين دلت الادلة على عصمتهم وطهاتهم (تبيان)

جائز نہیں ہے کسی کی بلا قید اطاعت سوا اس کے جو معصوم ہو اور جس سے بھولنے اور غلطی کرنے کا خطرہ نہ ہو اور یہ بات امراء اور عام علماء میں نہیں ہے اور یہ ضروری ہے بس ان ائمہ میں جن کی عصمت وطہارت ثابت ہوگئی ہے۔

اللہ اور رسولؐ کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کے حکم کے بعد جو کہا گیا ہے کہ تم میں اگر اختلاف ہو تو اللہ اور رسولؐ سے الگ نہیں لیا گیا ہے اس بنا پر کہ رسولؐ کی موجودگی میں اولی الامر کا مصداق بھی آپ ہی ہیں لہٰذا آپ ہی کی اطاعت رسولؐ و اولی الامر دونوں کی اطاعتوں کا مصداق ہے لیکن جب پیغمبرؐ دنیا سے اٹھ جائیں تو آپ کی نیابت میں جس دور میں جو اولی الامر کا مصداق ہو، وہ مرکز اطاعت ہوگا۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يَزۡعُمُوۡنَ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّتَحَاكَمُوۡۤا اِلَى الطَّاغُوۡتِ وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ يَّكۡفُرُوۡا بِهٖ ؕ وَيُرِيۡدُ الشَّيۡطٰنُ اَنۡ يُّضِلَّهُمۡ ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا ﴿۶۰﴾

"کیا آپ نے نہیں دیکھا انہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ ایمان لائے اور اس پر بھی جو آپ پر اتارا گیا ہے اور اس پر بھی جو آپ کے پہلے اتارا گیا تھا۔ پھر بھی وہ چاہتے ہیں کہ حکومت باطل [1] کے پاس وہ مقدمے لے جائیں۔ حالانکہ انہیں حکم یہ ہے کہ وہ اس کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں گمراہی میں مبتلا کرے"۔

عدالت غیر شرعی میں مقدمہ لے جانے کی ممانعت

اس آیت سے اس حکم فقہی کا ثبوت ملتا ہے کہ عدالت جور میں مقدمہ لے جانا ممنوع ہے۔

اس کے علاوہ ایک اصولی حکم جس کی اس آیت میں صراحت ہے، وہ یہ ہے کہ "حکومت باطل" کا انکار لازم ہے۔ انکار کے معنی ہیں اس کے باطل ہونے کا اعتقاد اور حسب مواقع اظہار۔

اصل اصول تبرا یہی ہے جسے عوام نے اپنے عمل سے بدنام بنادیا ہے۔

---

[1] روى عن ابى جعفر وابى عبدالله ان الاية فى كل من يتحاكم الى من يحكم بخلاف الحق (تبيان)

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰى مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوۡلِ رَاَيۡتَ الۡمُنٰفِقِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡكَ صُدُوۡدًا ۚ‏ ﴿۶۱﴾

’’اور جب ان سے کہا جائے کہ آؤ اس کی طرف جو اللہ نے اتارا ہے اور پیغمبر کی طرف تو منافقین کو دیکھے گا کہ وہ آپ سے شدت کے ساتھ [۱] روگردانی کریں گے‘‘۔

’’جو اللہ نے اتارا ہے‘‘ یعنی قرآن، اس کی طرف آؤ یعنی کتاب خدا پر عمل کرو اور رسولؐ کی طرف آؤ یعنی سنت پر عمل کرو تو منافقین کی علامت یہ ہے کہ وہ آپ سے روگردانی کریں گے۔ یعنی کتاب پر عمل کا چاہے اقرار کرلیں مگر ’’سنت‘‘ اور اقوال و اعمال پیغمبرؐ کے قبول کرنے میں انہیں عذر ہوگا جس کے ثبوت میں ایک آواز پہلے آئی تھی: حسبنا کتاب اللہ اور اب پرویز صاحب کا مستقل مشن یہ ہے کہ کتاب کو بہ حیثیت ماخذ قبول کیا جائے اور سنت کو نہیں۔ قرآن پہلے سے اس کردار کا مرقع محفوظ کیے ہوئے ہے۔

فَكَيۡفَ اِذَاۤ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ ثُمَّ جَآءُوۡكَ يَحۡلِفُوۡنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنۡ اَرَدۡنَاۤ اِلَّاۤ اِحۡسَانًا وَّتَوۡفِيۡقًا ﴿۶۲﴾

’’تو کیسا ہوگا [۲] اس وقت جب انہیں ان گزشتہ اعمال کی وجہ سے کوئی مصیبت درپیش ہوگی اور پھر وہ آپ کے پاس آئیں گے خدا کی قسمیں کھاتے ہوئے کہ ہمیں تو بھلائی و موافقت [۳] کے سوا کچھ مدنظر نہ تھا‘‘۔

توفیق جس کا ترجمہ ہم نے ’’موافقت‘‘ سے کیا ہے، اس کے دوسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ منافقین جو باطل حکام کے پاس مقدمے لے جاتے ہیں تو وہ بعد میں اس کی تاویلیں کریں گے کہ ہم چاہتے تھے کہ فریقین میں صلح کرادیں اور اتفاق باہمی پیدا کریں۔ [۴]

لفظ ’’توفیق‘‘ کے ساتھ دونوں ہی معنی سازگار ہیں اور دونوں توجیہیں عقلاً بھی درست ہیں، اور قدیم مفسرین نے بھی بس دونوں قولوں کے نقل کردینے ہی پر اکتفا کی ہے۔ [۵] اس لئے کسی ایک قول کو ترجیح دینا مشکل ہے۔

اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُ اللّٰهُ مَا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ وَعِظۡهُمۡ وَقُلْ لَّهُمۡ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَوۡلًاۢ بَلِيۡغًا ﴿۶۳﴾

---

[۱]۔ یصدون عنك صدودا عظیما۔ (تبیان)

[۲]۔ موضع کیف رفع بانه خبر مبتدا محذوف والتقدیر فکیف صنعیهم (مجمع البیان)

[۳]۔ نخواستہ بودیم مگر نیکوکاری و موافقت کردن (شاہ ولی اللہ) نہ چاہا ہم نے مگر احسان یعنی بھلائی اور موافقت کرنا (رفیع الدین)

[۴]۔ تالیفا بین الخصمین (جلالین) اراد بالتوفیق الجمع والتالیف (مجمع البیان)

[۵]۔ قیل فیه قولان احدهما ای ما اردنا... الا احسانا الینا وما وافق الحق فی امرنا... الثانی الّا توفیقا بین الخصوم (تبیان)

”یہ وہ ہیں کہ اللہ خوب جانتا ہے جوان کے دلوں میں ہے لہٰذا آپ ان کی باتوں کا خیال نہ کیجئے اور انہیں نصیحت کرتے رہیے اور ایسی باتیں ان سے کہتے رہیے جو زیادہ سے زیادہ ان کے دلوں میں اثر پیدا کرسکیں“۔ [۱]

فاعرض عنہم کے معنی اگر یہ ہوتے کہ اُن سے منہ پھیر لیجئے جیسا کہ بعض نے ترجمہ کیا ہے [۲] تو پھر بعد کے جملوں کا کہ ”انہیں نصیحت کرتے رہیے“ اور ”ایسی باتیں کہتے رہیے جو زیادہ سے زیادہ موثر ہوسکیں“ کوئی محل نہ ہوتا۔ اس لئے ہم نے یہ ترجمہ کیا کہ ”ان کی باتوں کا خیال نہ کیجئے“۔ [۳]

”یہ وہ ہیں کہ اللہ خوب جانتا ہے جوان کے دلوں میں ہے“...... اللہ تو سب ہی کے دل میں جو ہے، اسے جانتا ہے مگر جو نرے کھرے آدمی ہیں، ان کے دلوں میں سوا اس کے جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور کچھ ہوتا نہیں لیکن منافقین کے دلوں میں ان کی زبان کے اظہار کے علاوہ اور کچھ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ارشاد ہوا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ان کی منافقت سے خوب واقف ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِـيْمًا ﴿٦٤﴾

”اور کوئی پیغمبر ہم نے نہیں بھیجا مگر اس کے لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور اگر جب انہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی تھی تو آپ کے پاس آتے اور پھر اللہ سے بخشش کے طلب گار ہوتے اور پیغمبر ان کے لئے دعائے مغفرت کرتے تو اللہ کو پاتے بڑا توبہ قبول کرنے والا، بڑا مہربان“۔

”اپنے اوپر زیادتی“ کے معنی گناہوں کے ارتکاب کے ہیں جس سے وہ اپنے نفوس کو انجام کے لحاظ سے نقصان پہنچاتے ہیں۔ [۴]

توسل کی اہمیت

یہ آیت توسل کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔ استغفار ایک دعا ہی ہے، اس کے لئے براہ راست اللہ سے دعا کافی ہونا چاہئے مگر اس کا طریقہ کار یہ بتایا گیا ہے کہ وہ پیغمبرؐ کے پاس آ کے استغفار کریں اور پیغمبرؐ ان کے لئے خدا کی بارگاہ میں دعائے مغفرت کریں۔

بس یہی ہے ہر اس دعا کا مطلب جو کسی مقرب الٰہی کے روضہ پر جا کر کی جاتی ہے۔

دعا کا قبول کرنے والا اصل میں خدا ہی ہے مگر اس شخص کا جو کوئی دینی اہمیت رکھتا ہے، وسیلہ اختیار کرنا اس دعا کو قبولیت کی منزل سے قریب کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

---

[۱]۔ یبلغ من نفوسھم کل مبلغ (مجمع البیان)

[۲]۔ پس منہ پھیر لئے ان سے (شاہ رفیع الدین)

[۳]۔ ای لاتعاقبھم (مجمع البیان)

[۴]۔ فجسوھا حقھا بادخال الضرر علیھا بفعل المعصیة من استحقاق العقاب وتقویت الثواب بفعل الطاعة (تبیان)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴿۶۵﴾

''تو نہیں، قسم آپ کے پروردگار کی، وہ مومن نہیں ہوسکتے جب تک ان جھگڑوں میں جو ان کے درمیان ہوں، آپ کو حکم نہ مانیں، پھر جو کچھ آپ فیصلہ کریں، اس سے اپنے دل میں تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح تسلیم کریں۔''

اس میں صاف حکم رسولؐ کے مقابلہ میں مسلمان کو بالکلیہ ''سپردگی'' اختیار کرنے دعوت دی گئی ہے اور صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ یہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے جس کے بغیر یہ مومن سمجھے ہی نہیں جاسکتے۔[۱]

اس کے بعد فیصلہ خدا اور رسولؐ کو چھوڑ کر کسی اجماع یا شوریٰ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

جب آپ فیصلہ کردیں تو ''اپنے دل میں تنگی محسوس نہ کریں''......یعنی بے چینی اور اضطراب جو شک وشبہ کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔[۲]

اور یہی پوری طرح اس کا تسلیم کرنا ہے کہ اس کی صحت کے بارے میں انسان کسی شک اور اس کی تعمیل کے متعلق کسی تذبذب میں مبتلا نہ ہو۔[۳]

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا﴿۶۶﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴿۶۸﴾

''اور اگر کہیں ہم ان پر یہ فرض عائد کردیتے کہ خود اپنوں کو قتل کرو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو سوا کم لوگوں کے یہ سب اسے عمل میں نہ لاتے اور اگر یہ کرتے وہی جو انہیں ہدایت کی جاتی ہے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا اور ثابت قدمی کا زیادہ سبب ہوتا[۴] اس وقت میں ہم انہیں اپنے پاس سے بڑا اجر دیتے اور انہیں سیدھے راستے پر چلنے کی

---

[۱]۔ ایشان مسلمان نباشند تاآنکہ حاکم کنند ترا در اختلافی کہ واقع شود میان ایشان (شاہ ولی اللہ)

[۲]۔ حرجا ضیقا او شکا (جلالین)

[۳]۔ یسلمون من غیر شك یدخلهم فیه (تبیان)

[۴]۔ تثبیتا تحقیقا لایمانهم (جلالین) ای بصیرة فی امر الدین لان من کان علی بصیرة من امر دینه کان ذلك ادعی له الی الثبات علیه (مجمع البیان) محکم تر در استواری دین (شاہ ولی اللہ) اور زیادہ نہ ہوتا ثابت رکھنے میں (رفیع الدین)

خصوصی توفیق کرامت فرماتے۔"

مقصد یہ ہے کہ اس شریعت کے احکام تو آسان ہیں اور یہ عمل نہیں کرتے۔ بنی اسرائیل کو اتنے سخت احکام دیئے جاتے تھے۔ اگر کہیں انہیں ویسے سخت احکام دیئے جاتے [1] تو کیا سوا ایک بہت چھوٹی سی اقلیت کے کوئی بھی تعمیل کرتا؟!!

ایسے بیانات قرآنی کے بعد پھر اگر طبقہ صحابہ کو بلا استثناء آسمان پر چڑھا دیا جائے تو کیا ہنسی آنے کی بات نہیں ہے؟!

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓىِٕكَ رَفِيْقًا ۝۶۹ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝۷۰

"اور جو اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرے گا تو یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جنہیں اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے، انبیاء، صدیقین، شہیدان راہ خدا اور صالحین اور یہ بہت ہی اچھے رفیق ہیں۔ یہ ہے اللہ کی طرف کا فضل وکرم اور اللہ سے بڑھ کر کون باخبر ہوگا۔"

اطاعت کا اس سے بڑھ کر نتیجہ کیا ہوسکتا ہے کہ انسان کو ان بزرگ ترین طبقات کی معیت حاصل ہو جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اطاعت کرنے کے بعد نبی ہو جائے گا، یا ضرور ہی صدیق ہو جائے گا یا لازماً شہید ہو جائے گا کیوں کہ یہ تو خاص خاص مرتبے ہیں جو خاص خاص افراد کو حاصل ہوتے ہیں مگر اطاعت کرنے والا اسی منزل یعنی بہشت میں ہے جہاں ان سب اصناف کے افراد ہیں۔ یہی اس کے فخر کے لئے کیا کم ہے؟!

اس سے معلوم ہوا کہ قادیانی جماعت کا اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ نبوت کا دروازہ بند نہیں ہے، بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ اگر اطاعت کے ذریعہ سے آدمی خود انبیاء میں داخل ہوسکتا ہے تو بیچ میں مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ صاف صاف یہ کہہ دیا جاتا کہ: اُولٰٓىِٕكَ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ یا نعمت کا تذکرہ بھی ضروری سمجھا جاتا تو وہاں مع کے بجائے من آتا کہ فَاُولٰٓىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ "یہ ان میں سے ہوگا۔ جنہیں اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا ہے یعنی نبیین وغیرہ...... یہاں من کے بجائے مع کہنا اور پھر آخر میں رفیقا کا لفظ کہنا کہ "یہ لوگ بہتر رفیق ہیں" صاف اس کا پتہ دیتا ہے کہ یہ شخص خود ان اصناف میں داخل نہیں ہے۔

قادیانی جماعت کا غلط استدلال اور اس کی وجہ

اس صورت میں بس بات جو غور طلب رہ جاتی ہے، وہ انبیاء اور صدیقین اور شہداء کے بعد صالحین کا لفظ ہے، اس لئے کہ اطاعت خدا اور رسولؐ کے بعد آدمی نبی نہ ہو، صدیق نہ ہو، شہید نہ ہو مگر صالح تو ضرور ہوگا۔ پھر یہ کیوں کہا جا رہا ہے کہ وہ صالحین کی رفاقت میں ہوگا اور اگر صالحین کی رفاقت کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود صالحین میں سے ہے تو پھر نبیین اور صدیقین اور شہداء میں بھی یہ مفہوم درست ہونا چاہئے کہ یہ شخص ان طبقات میں

[1] - کما اوحینا علی قوم موسیٰ (تبیان)

داخل ہو جاتا ہے۔

اس پہلو کا تحفظ قادیانی جماعت کے وجود میں آنے سے پہلے شاہ عبدالقادر دہلوی نے کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''نبی وہ لوگ جن پر اللہ کی طرف سے وحی آئے اور صدیق وہ کہ جو وحی میں آوے، ان کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے اور شہید وہ جن کو پیغمبر کے حکم پر ایسا یقین آیا کہ جس پر وہ جان دیتے ہیں اور نیک بخت وہ جن کی طبیعت نیکی ہی پر پیدا ہوئی تھی تو جو لوگ ایسے نہیں لیکن حکم برداری میں لگے جاتے ہیں، اللہ ان کو بھی ان کے ساتھ گنے گا۔'' (موضح القرآن)

اسے ہم اپنے لفظوں میں کہیں تو یہ مطلب ہے کہ معیاری درجہ کے وہ افراد جنہیں خالق نے ''صالحین'' کے لفظ سے مرکز معیت قرار دیا ہے، وہ ''معصومین'' ہیں اور دوسرے لوگ جو غیر معصوم ہیں مگر ان کی پیروی میں لگے رہتے ہیں، ان کی اطاعت کا صلہ یہ ہے کہ یہ ان کی رفاقت کی نعمت سے بہرہ اندوز ہوں۔ اس کے بعد قادیانی استدلال ہباء منثور ہو کر نیست و نابود ہو جاتا ہے مگر شاہ عبدالقادر صاحب کو اس تشریح کی روشنی میں ایک اور حقیقت بھی تسلیم کرنا لازم ہے اور وہ یہ ہے کہ جب یہ تمام عناوین مختلف ہیں۔ اس طرح کہ بعض افراد میں چاہے ان کا اجتماع ہو جائے مگر یہ اوصاف علیحدہ علیحدہ بھی وجود رکھتے ہیں یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ جو صدیق ہو، وہ نبی بھی ہو یا شہید بھی ہو اور یہ ضروری نہیں کہ جو شہید ہو، وہ صدیق یا نبی بھی لازمی طور پر ہو تو آخر میں الصالحین کا لفظ لانے سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کے طبقہ کے علاوہ بھی معصومین کا کوئی گروہ ہے جن کی معیت مثل معیت انبیاء وغیرہ کے سرمایہ سعادت ہے، ورنہ شروع میں انبیاء کا ذکر ہونے کے بعد پھر آخر میں وہ الصالحین جو بقول شاہ صاحب ''نیکی ہی پر پیدا ہوئے تھے'' کون ہو سکتے ہیں؟

شان نزول میں بھی اس آیت کے جو دو روایتیں وارد ہیں، دونوں اس کی گواہ ہیں مع سے مراد ان جماعتوں میں داخل ہو جانا نہیں ہے چنانچہ علامہ طبرسی لکھتے ہیں:۔

قیل نزلت فی ثوبان مولی رسول اللہ وکان شدید الحب لرسول اللہ قلیل الصبر عنه واتاه ذات یوم وقد تغیر لونه ونحل جسمه فقال یاثوبان ماغیر لونك فقال یارسول اللہ مابی من مرض ولا وجع غیر انی اذالم ارك اشتقت الیك حتی القاك ثم ذکرت الاخرة فاخاف لغی لااراك هناك لانی عرفت انك ترفع من النبیین وانی ان ادخلت الجنة کنت فی منزل ادنی من منزلك ... فنزلت الایة ... وقیل ان اصحاب رسول اللہ قالوا ما ینبغی ان نفارقك فانا لانراك الا فی الدنیا فاما فی الاٰخرة فانك ترفع فوقنا بفخلك فلا نراك فنزلت الاٰیة (مجمع البیان)

ایک قول یہ ہے کہ وہ ثوبان غلام پیغمبر خدا کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہیں پیغمبرؐ خدا سے بڑی محبت تھی اور آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے تھے تو ایک دن وہ حضرتؐ کے پاس آئے اس عالم میں کہ رنگت متغیر تھی اور جسم زار و نزار، حضرتؐ نے دریافت فرمایا کہ اس کا کیا سبب ہے؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! مجھے کوئی بیماری یا تکلیف نہیں ہے مگر میں جب آپ کو نہیں دیکھتا تو جب تک آپ سے مل نہ لوں قرار نہیں آتا اس کے بعد مجھے آخرت کا تصور ہوا تو یہ ڈر محسوس ہوتا ہے کہ وہاں میں آپ کی زیارت نہ کر سکوں گا اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کا درجہ دوسرے انبیاء سے بھی بالاتر ہوگا میں اگر بہشت میں داخل بھی کیا گیا تو آپ کی منزل سے یقیناً بہت نیچے کی منزل میں ہوں گا...... اس پر یہ آیت نازل ہوئی...... اور ایک قول یہ ہے کہ اصحاب پیغمبر خداؐ نے کہا کہ ہمیں آپ سے جدا نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ ہم تو بس دنیا میں آپ کا دیدار کر رہے ہیں۔ رہ گئی

آخرت وہاں تو آپ اپنی فضیلت کی بنا پر ہم سب سے بہت بلند ہوں گے تو وہاں آپ کو ہم کہاں دیکھیں گے۔اس پر یہ آیت اتری۔
اس سے ظاہر ہے کہ معیت کے معنی ساتھ ہونے ہی کے ہیں۔نہ یہ کہ یہ شخص اس مرتبہ پر فائز ہو جائے گا۔
اس کے بعد ایک حدیث کو دیکھا جائے جو ہمارے یہاں وارد ہوئی ہے کہ معصوم نے شیعوں کے لئے فرمایا:
فی درجتنا یوم القیٰمۃ۔
وہ روز قیامت ہمارے درجہ میں ہوں گے۔
تو وہ بالکل اس آیت قرآنی کے مضمون سے مطابق معلوم ہوگی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿٧١﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿٧٢﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿٧٣﴾

''اے ایمان لانے والو! اپنی حفاظت کا سامان مکمل رکھو [1] اور پھر (جب وقت آئے تو) نکل کھڑے ہو خواہ دستہ دستہ ہو کر الگ الگ [2] اور خواہ نکلو اکٹھا۔اور بلاشبہ تم میں ایسے بھی ہیں جو ضرور بالضرور دیر کرتے ہیں [3] تو اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتے ہیں مجھ پر اللہ کا بڑا احسان تھا کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا اور اگر اللہ کا فضل و کرم تمہارے شامل حال ہو تو وہ ضرور یہ کہیں گے جیسے کہ تم میں اور ان میں کوئی محبت و الفت تھی ہی نہیں کہ کاش میں ان کے ساتھ ہوتا تو بہت بڑی کامیابی حاصل کرتا۔''

بالکل ظاہر ہے کہ یہ کافروں کا ذکر نہیں ہے ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ ''تم میں ایسے ہیں'' بلکہ یہ انہی کا ذکر ہے جو بظاہر مسلمان ہیں مگر ان کے جذبات کافرانہ ہیں۔اس لئے کہ کوئی مسلمان مسلمانوں کے مبتلائے مصیبت ہونے پر اور وہ بھی راہ حق میں، شکر خدا ادا نہیں کر سکتا کہ الحمدللہ میں ان میں شامل نہ تھا [4] ایسے ہی مسلمان نما کافروں کا نام منافقین ہوتا ہے۔

---

[1]۔حذوا حذرکم من عدوکم ای احترزوا منه وتیقنطوا له (جلالین) خذوا اسنحتکم وهو المروی عن ابی جعفرؑ (جمع البیان)
لو بچاؤ اپنا (شاہ رفیع الدین)

[2]۔الثبات جمع ثبة وهی جماعات فی تفرقة ای متفرقین (تبیان)

[3]۔بعضی از شمار آنست کہ درنگ می کنند (شاہ ولی اللہ) دیر کرتے ہیں نکلنے میں (رفیع الدین)

[4]۔قال ابوجعفر من یتمنی التاخر عن جماعة المسلمین لایکون الا کانوا (تبیان) قال الصادق علیه السلام والله لو قال هذه الکلمة اهل الشرق والغرب لکانوا بها خارجین عن الایمان ولکن الله قد سماهم مومنین باقرارهم (علی بن ابراهیم)

اس کے بعد یہ فقرہ کہ: كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ ’’جیسے کہ تم میں اور ان میں کوئی محبت و الفت تھی ہی نہیں۔‘‘ اس کے سمجھنے میں بعض مفسرین کو دشواری پیدا ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق پہلے جملہ سے ہے کہ جب کوئی مصیبت آئے تو وہ اس طرح کہ جیسے تم میں اور ان میں کوئی محبت کا رشتہ تھا ہی نہیں، یہ کہتے ہیں کہ خدا کا مجھ پر بڑا احسان تھا کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا۔ [1]

مگر ترتیب الفاظ کلام الٰہی اس تفسیر کے بالکل خلاف ہے۔ جب دوسرے جملہ کی شرط حرف عطف کے ساتھ آ گئی کہ ’’اگر تمہیں اللہ کا فضل شامل حال ہوا‘‘ تو اب یہاں کا کوئی جزو پہلے جملہ سے مربوط کرنا بالکل عجیب سی چیز ہے۔ ہمارے خیال میں تو یہ یہیں سے متعلق ہے [2] مطلب یہ ہے کہ اگر تم میں اور ان میں الفت ہوتی تو یہ تمہاری کامیابی کو اپنی کامیابی سمجھتے مگر یہ اپنے کو تم سے بیگانہ سمجھتے ہیں، اس لئے اب جو کامیابی تمہیں حاصل ہوئی، اس پر ہاتھ ملتے ہیں کہ ہم بھی کاش ان کے ساتھ ہوتے۔ [3]

حکم جہاد بصورت قتال

ہاں، یہاں ایک خاص پہلو سوچنے، سمجھنے اور یاد رکھنے کا ہے کہ جیسے پہلے جملہ میں انسان کا یہ قول کہ ’اللہ کا مجھ پر بڑا احسان تھا کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا‘ ذاتاً کسی برائی کا حامل نہیں ہے بلکہ محل کے لحاظ سے اس میں برائی پیدا ہوئی ہے کہ راہ خدا میں مصیبت کے درپیش ہونے پر یہ الفاظ کہے گئے...... اس طرح ان الفاظ میں کہ ’’میں بھی کاش ان کے ساتھ ہوتا تو بہت کامیابی حاصل کرتا، ذاتاً کوئی برائی کا پہلو نہیں ہے بلکہ اس پس منظر سے برائی پیدا ہوئی کہ راہ خدا میں مصیبت آنے پر تو وہ اپنی عدم موجودگی پر شکر خدا ادا کرتے ہیں اور جب اتفاق سے فتح ہوتی ہے اور مال غنیمت حاصل ہوتا ہے تو وہ مادی منفعت کے تصور سے کف افسوس ملتے ہیں کہ کاش ہم بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ یہ درحقیقت ان کی مادی ذہنیت، دین اور اہل دین سے بیگانگی کی مذمت ہے جو ان دونوں موقعوں پر ان کے قول سے نمایاں ہوتی ہے لہٰذا اگر محل مختلف ہو جائے تو انہی دونوں قولوں یا ان کے عمل مظاہروں میں بڑی بلندی پیدا ہو جائے اور وہ اس کی بالمقابل شکلیں یہ ہیں کہ راہ خدا میں کسی قربانی کا پیغام ملنے پر شکر خدا ادا کیا جائے اور کسی آماجگاہ مصیبت اور مرکز قربانی میں عدم موجودگی پر کف حسرت ملا جائے جیسے ہم کو ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام نے تعلیم دی ہے کہ جب مجاہدین کربلا کو یاد کرو تو کہو: يٰلَيْتَنَا كُنَّا مَعَكُمْ فَنَفُوْزُ فَوْزًا عَظِيْمًا۔ اب یہ الفاظ ایک بلند ذہنیت کے ترجمان ہوں گے اس طرح کہ وہ اگر صدق دل سے کہے جا رہے ہیں تو بلاشبہ بہت بڑے جذبہ ایمانی کا قوی ترین ثبوت ہیں۔

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٧٤﴾

’’تو جو لوگ دنیا کی اس پست زندگی کو آخرت کے عوض فروخت کرنے پر تیار ہوں، انہیں اللہ کی راہ میں جنگ کرنا چاہئے اور جو اللہ کی راہ میں جنگ کرکے مارا جائے یا فتح پائے، اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے‘‘

[1] ۔ھٰذا راجع الٰی قولہ: قد انعم اللہ علی اعترض بہ بین القول و مقولہ (جلالین)

[2] ۔قیل ان الکلام فی موضعہ من غیر تقدیم و لا تاخیر (جمع البیان)

[3] ۔اگر لوگوں کو فائدہ پہنچتا تو پچھتاتا ہے اور دشمنوں کی طرح حسد کرتا ہے (موضح القرآن)

اجر آخرت کا انحصار راہ خدا میں جنگ کے بعد دو چیزوں پر رکھا گیا ہے: ایک یہ کہ جہاد میں کام آ جائے جس کا مطلب ہے شہید ہونا اور دوسرے دشمن کو بھگا کر فتح حاصل کرے جس سے حق بجانب طور پر ''غازی'' کہا جا سکے۔
ان دونوں صورتوں میں اجر ہے لیکن تیسری صورت کہ میدان جہاد میں جائے اور پھر نہ مارا جائے اور نہ دشمن کو شکست دے بلکہ خود سلامتی کے ساتھ راہ فرار اختیار کرے یا چوتھی صورت کہ دشمنوں کے سامنے ہتھیار ڈال دے، ایسا میدان میں جانا، اور حق کو کمزور کرنے کا باعث ہے، اس لئے اس پر کسی اجر و ثواب کا استحقاق نہیں ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝٧٥

''اور تم آخر کیوں نہیں جنگ کرتے اللہ کی راہ میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جو کہتے ہیں کہ پروردگار! ہمیں اس بستی سے کہ جس کے باشندے ظالم ہیں، باہر نکال دے اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی سرپرست قرار دے اور اپنی جانب سے کسی کو مددگار بنا دے۔''

یہ کمزور مسلمان وہ ہیں جو کافروں کے شکنجۂ ظلم سے نکلنے کے لئے بے چین تھے اور دل ہی دل میں اللہ سے دعائیں کرتے تھے کہ وہ ان کی مخلصی کی کوئی صورت پیدا کرے اور ''مردے از غیب'' کو باہر لائے جو انہیں اس مصیبت سے نجات دلائے۔ خالق کریم نے ان کی ان دلی التجاؤں کی ترجمانی کرتے ہوئے مسلمانوں کو مشرکین سے مقابلہ کی ترغیب دی ہے۔
اگر ترتیب مطابق تنزیل ہوتی تو پورے طور پر پتہ چلتا کہ یہ آیت کب نازل ہوئی؟ کیوں کہ آغاز سلسلہ جہاد کے موقع پر تو متعدد آیتیں ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قتال کی اجازت مشرکین کی طرف سے آغاز حرب کے بعد ملی تھی۔ اس لئے وہاں یہ الفاظ آئے ہیں کہ

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (حج۔۳۹)

جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے، انہیں اب مقابلہ کی اجازت دی جاتی ہے۔
اور خود اسی سورہ میں اس کے بعد آیت آئے گی جس سے معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی طرف سے تقاضا تھا کہ اجازت جنگ دی جائے مگر انہیں روکا گیا تھا۔
علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اشارات سے پتہ چلتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد جب مشرکین کی عہد شکنی کے بعد دوبارہ حکم جہاد ملا ہے جس کے نتیجہ میں ''فتح مکہ'' واقع ہوئی، اس وقت کی آیت میں اول تو یہ کہ انہوں نے اُن 'کمزور مسلمانوں'' کے ذیل میں جو نام لئے ہیں، ان میں ایک ابوجندل ابن سہیل کا نام ہے جس کے متعلق یہ تاریخی حقیقت ہے کہ وہ حدیبیہ کے موقع پر ہتھکڑیاں، بیڑیاں پہنے ہوئے رسول خدا کے پاس آکر چاہتا تھا کہ آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں مگر اس کے باپ نے معاہدہ کے شرائط کا حوالہ دیتے ہوئے اسے آپ کے ساتھ جانے سے باز رکھا اور

پھر گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا۔ چونکہ اس معاہدہ میں ایک شرط یہ تھی کہ مشرکین میں سے جو مسلمان ہو کر رسولؐ کے پاس آئیں، رسولؐ کو انہیں واپس کرنا ہوگا، آپ نے اس شرط کی بنا پر ابوجندل کی مدد سے معذوری ظاہر فرمائی اور اس طرح جتنے مسلمان کافروں کے ہاتھ میں ظلم وتشدد کا شکار بنے ہوئے تھے، انہیں اب اپنی مخلصی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی لہٰذا وہ تڑپ تڑپ کر اللہ سے فریاد کرتے تھے۔

آخر میں ان کی اس دعا کے ذیل میں کہ ''ہمارے لئے اپنی جانب سے کسی کو سرپرست اور مددگار بنا دے'' علامہ طبرسی نے لکھا ہے:۔

فاستجاب الله دعاءهم فلما فتح رسول الله مكة جعل الله نبيّه لهم وليّا (مجمع البيان)

تو اللہ نے ان کی دعا کو قبول کیا اور جب پیغمبر خداؐ نے مکہ فتح کیا تو خداوند عالم نے اپنے پیغمبر کو ان کا مددگار بنایا۔

اس تشریح کو اس لئے پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس آیت کو جہاد اسلامی کا پس منظر دکھانے کے لئے کبھی پیش نہ کیا جائے کہ مسلمانوں کو حملہ کے لئے آمادہ کیا گیا ہے، ان مسلمانوں کو نجات دلانے کے واسطے جو بعد ہجرت مکہ معظمہ میں رہ گئے تھے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہجرت کے بعد آغاز جہاد سے اس آیت کا قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿٧٦﴾

''جنہوں نے ایمان قبول کیا، وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ اقتدار باطل کی راہ میں جنگ کرتے ہیں تو شیطان کے حوالی موالی سے جنگ کرو۔ یقیناً شیطان کا منصوبہ کمزور ہوا ہی کرتا ہے''۔ [1]

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿٧٧﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رہو اور نماز پڑھتے رہو، زکوٰۃ ادا کرتے

---

[1]۔ ہر آئینہ حیلہ شیطان سست است (شاہ ولی اللہ) دخلت كان ههنا موكدة لتدل على ان الضعف لكيد الشيطان لازم في جميع الاوقات فيما مضى والحال والمستقبل وليس هو عارضا في حال دون حال (تبيان)

رہو۔ پھر جب ان پر جنگ کرنے کا فرض عائد کیا گیا تو ایک دم ان کا یہ عالم سامنے آیا کہ ان میں کی ایک جماعت آدمیوں سے ڈرتی ہے ایسا جیسے اللہ کا ڈر ہو یا اس سے بھی زیادہ اور انہوں نے کہا پروردگارا! تو نے ہم پر جنگ کرنے کا فریضہ کیوں عائد کر دیا تو نے ہم کو کچھ تھوڑے زمانہ تک اور مہلت کیوں نہ دی؟ کہیے کہ دنیا کی پونجی بہت تھوڑی ہے، اور جو پرہیز گار ہو، اس کے لئے آخرت بہت بہتر ہے، اور تم پر ذرا بھی ظلم نہیں ہوگا۔"

ظاہر ہے کہ یہ کافروں کا تذکرہ نہیں ہے۔ کافروں سے کیوں یہ ہدایت ہوتی کہ ہاتھ روکے رہو، نماز پڑھتے رہو اور روزے رکھتے رہو۔ یہ مسلمان ہی ہیں اور مسلمانوں کا وہی معزز طبقہ جو پورے کا پورا بلا استثناء صحابیت رسولؐ کے شرف سے سرفراز ہے اور اس لئے امت کی اکثریت نے ان میں سے ہر ایک فرد کے کردار کو واجب الاتباع سمجھا ہے۔ ان کا عالم قرآن پیش کر رہا ہے۔[1]

اور پھر اسے سمجھ لینا چاہئے کہ اگر اس طبقہ کے افعال و اعمال کے متعلق کف لسان یعنی زبان کو روکنا اور غض بصر یعنی نظر اٹھا کر ان کے اعمال کی طرف نہ دیکھنا ضروری ہوتا تو خالق عالم قرآن ایسی ابدی کتاب میں اس پیغام کو کیوں محفوظ کر دیتا اور پھر اس سرنامہ کلام کے ساتھ کہ: الم تر "کیا تم نے نہیں دیکھا"...... اس کا مطلب یہ ہے کہ خالق کسی منزل پر ہماری آنکھوں کو بند رکھنا پسند نہیں کرتا وہ تو چاہتا ہے کہ آنکھ کھولو، دیکھو اور پرکھو اور ہر ایک کے اعمال و افعال کی پوری جانچ پڑتال کرو۔ خصوصاً ایسے طبقہ میں جن میں سے تمہیں اپنا پیشوا اور رہبر ڈھونڈھنا ہے۔ آنکھ بند کر کے ان میں سے ہر ایک کے پیچھے ہرگز نہ چلو بلکہ دیکھو کہ کس کا کردار مرضی الٰہی کے مطابق رہا ہے؟ کس کو حسن عمل کی سندیں ملتی رہی ہیں اور کن پر تنبیہ و عتاب کے تازیانے پڑتے رہے ہیں۔

تلوار اٹھانا اسلام کا بنیادی نصب العین نہ تھا

یہاں قرآن آغاز جہاد اور اس کے انجام کی ایک بڑی مبسوط تاریخ اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اور ایسی باتیں بتا رہا ہے جو شاید راویوں نے حدیثوں میں اور اہل قلم نے تاریخوں میں محفوظ نہ بھی کی ہوں۔

اس قرآنی بیان تاریخی سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا بنیادی نصب العین تلوار سے اشاعت اسلام نہ تھا۔ وہ تو کچھ مشرکین کے طرز عمل اور کچھ اپنے آدمیوں کی دانستہ یا نادانستہ بے راہ روی تھی جس سے جنگ کا فرض سر پر عائد ہو گیا۔

قرآن مجید کا انداز بیان اپنے بلاغت و ایجاز میں جو حد اعجاز تک ہے، یہ ہے کہ وہ کچھ کڑیاں واقعات کی بیان کرتا ہے اور کچھ کڑیوں کو سیاق کلام کے سمجھنے والے صاحبان عقل پر چھوڑ دیتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ اور سیاق سے پورا واقعہ یوں مرتب ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد جب رسولؐ مدینہ میں تشریف لائے تو کچھ مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہوئی اور تقاضے ہونے لگے کہ ان مشرکین نے ہم پر اتنے مظالم کیے ہیں، ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم جنگ کی تیاری کریں اور ان سے انتقام لیں، مگر خالق کا حکم یہ ہوا کہ جنگ کی باتیں نہ کرو۔ انہوں نے کچھ بھی کیا ہو مگر تمہیں ان سے لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ **كفوا ايديكم** "تم اپنے ہاتھوں کو روکے رہو" **واقيموا الصلوة واتوا الزكوة** "اور نمازیں پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو" یعنی جو تمہارے ذاتی فرائض ہیں، انہیں انجام دیتے رہو چنانچہ رسولؐ کی طرف سے تمام مسلمانوں کو

---

[1] ۔ هم جماعة من الصحابة (جلالين)

یہی ہدایت ہوگئی اور خود آپ کا یہ عمل رہا کہ مدینہ میں آنے کے بعد ایک سال کی مدت گذرنے کے باوجود آپ نے نہ اسلحہ جمع کیا اور نہ کوئی دوسرا سامان جنگ فراہم کیا۔ اس لئے جب جنگ بدر ہوئی تو کل فوج اسلام میں صرف تیرہ عدد تلواریں تھیں اور کل جمع دو گھوڑے تھے۔ یہ سامان خود اس حقیقت کا بدیہی ثبوت ہے کہ خدا اور رسولؐ کا نصب العین مدینہ میں آنے کے بعد جنگ کرنا نہ تھا۔ جنگ بادل ناخواستہ مجبوراً رسولؐ کے سر پر آ گئی۔ اب یہ جنگ سر پر کس طرح آئی؟ اس کی تفصیل کا تذکرہ قرآن مجید نے نظر انداز کر دیا ہے مگر سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے اس نظام عمل کے خلاف کہ:- کفوا ایدیکم واقیمو الصلوٰۃ واتو الزکوٰۃ 'اپنے ہاتھ روکے رہو، نماز پڑھتے رہو، اور زکوٰۃ دیتے رہو' اصرار واحتجاج کا سلسلہ جاری رکھا، وہ اس نظام عمل پر مطمئن ثابت نہیں ہوئے اور ان کا بے چینی کے ساتھ یہ مطالبہ رہا کہ ہمیں لڑنے کی اجازت دی جائے۔

اب جنگ بدر کے آغاز کے اسباب جن کی ذمہ داری اموی سیاست نے رسولؐ پر عائد کی ہے وہ اگر کسی حد تک درست مانی جائے تو اس کی نوعیت یہ ہو سکتی ہے کہ اسی جماعت نے جو جنگ پر مصر تھی، اپنی طرف سے مشرکین کے ساتھ چھوٹے پیمانہ پر شاید آویزش شروع کر دی۔

مگر جیسا کہ ہم نے تاریخ اسلام میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، وہ حکایت ہی از سر غلط معلوم ہوتی ہے اور اسی لئے قرآن میں دوسری جگہ ہے:-

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَٰتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا۟ .

انہیں جن سے جنگ کی جا رہی ہے، اجازت دی جاتی ہے اس بنا پر کہ ان پر ظلم ہوا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ ابتدائے جنگ مخالف اسلام جماعت کی طرف سے تھی اور ان کے آمادۂ جنگ ہوکر آنے کے بعد مسلمانوں کو مدافعت کی اجازت ملی ہے لیکن اگر قافلوں پر حملہ کی روایت کسی حد تک درست بھی ہو تو اس کی ذمہ داری پیغمبر اسلامؐ پر عائد کرنا، یہ زیر تحریر آیت کے مضمون کے بھی خلاف ہے۔

قرآن کہہ رہا ہے کہ خالق کا حکم تھا: كُفُّوٓا۟ أَيْدِيَكُمْ "اپنے ہاتھ روکے رہو"...... اب کیا ہاتھ روکنے کے فرمان کے بعد یہ گنجائش رہ جاتی ہے کہ رسولؐ چھوٹے چھوٹے دستے بھیج کر مشرکین کے قافلوں کا راستہ رکوائیں یا معاذ اللہ ان کے لوٹنے کا حکم دیں؟

صاف ظاہر ہے کہ اگر کچھ مسلمانوں نے اپنی ناعاقبت اندیشی سے ایسا کیا بھی ہو تو وہ خود اپنی مرضی سے خدا اور رسولؐ کے حکم کے خلاف کیا ہوگا۔

بہرصورت جب ان مسلمانوں کی ناعاقبت اندیشانہ روش سے یا مشرکین کے خود مدینہ پر حملہ کے منصوبہ سے کتب علیھم القتال کی منزل آ گئی یعنی جنگ کرنے کا فریضہ عائد ہو گیا تو اب وہی جماعت جو جنگ کے تقاضے کر رہی تھی، اسی کا عالم یہ ہو گیا کہ:-

يَخْشَوْنَ ٱلنَّاسَ كَخَشْيَةِ ٱللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً

وہ آدمیوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسے اللہ سے ڈریں یا اس سے بھی زیادہ۔

اب مسلمان یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو اللہ سے زیادہ آدمیوں سے ڈرتے ہوں، کیا واقعی جوہر ایمان کے حامل سمجھے جا سکتے ہیں؟!

اب اس کے بعد ایک تصور جو ایک پیش بندی کے لئے بہت سے مفسرین نے قائم کر رکھا ہے کہ منافقین کا وجود مدینہ میں آنے کے بعد اس وقت سے ہوا کہ جب سے فتوحات شروع ہوئیں، ورنہ اس کے پہلے تو دور ابتلاء تھا۔ اس دور کے جتنے مسلمان تھے، سب خالص مخلص مومن تھے، ان میں منافقت کا وجود نہ تھا، یہ تصور از روئے قرآن کہاں تک درست ہوتا ہے؟! کیوں کہ یہ موقع جس کا قرآن میں تذکرہ ہو رہا ہے، فتوحات سے بہت قبل، اس وقت کا ہے جب ابھی تازہ بتازہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں آئے ہیں۔ اس وقت مال غنیمت والے مسلمان تو نہیں

ہیں۔خالص مہاجرین اولین اور سابق الی الدین ہیں مگر قرآن ان کے باطن وظاہر کی پوری ترجمانی کر کے ثابت کیے دے رہا ہے کہ ان میں بھی راسخ الاعتقاد مومنین کم تھے اور اس طرح کے لوگ بہت زیادہ تھے جنہوں نے مرضی خدا اور رسولؐ کے خلاف اصرار بیجا یا کوئی اقدام بے محل کر کے پہلے تو مسلمانوں کے سر پر جنگ کے دیو کو مسلط کیا اور جب اس صورت حال سے نپٹنے کا ہنگام آیا تو خود میدان جنگ میں کوتاہی کی اور پھر انہی کو میدان جہاد میں مہموں کو سر کرنا پڑا جن کے ہاتھ اس کے پہلے كُفُّوٓا اَيۡدِيَكُمۡ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ کے حکم پر مکمل طور سے عمل کرتے ہوئے باوجود انتہائی سختیوں اور باعث اشتعال حالات کے تلوار کے قبضہ سے بالکل ناآشنا رہے تھے، انہوں نے ہی اسلام کو تباہ و برباد ہونے سے بچایا، ورنہ ان مسلمانوں پر اسلام کی قسمت کا انحصار اگر رہتا تو اس نازک صورت حال میں جب کہ جنگ ایسے ہنگام میں چھڑی تھی کہ ادھر جنگ کی کوئی تیاری ہی نہ تھی، مٹھی بھر ثابت قدم مسلمانوں کا تو خاتمہ ہی ہوجاتا اور اکثریت جو رہتی، وہ خیر سے پھر اپنے سابق کردار (کفروشرک) پر واپس چلی جاتی جسے چھوڑ کر وہ آئی تھی۔

بعض وقت تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ایسے مسلمانوں کا اپنے اسلام لانے میں یہی منصوبہ تو نہ تھا جسے خالق نے ملائکہ کے ذریعہ مدد دے کر اور پھر مٹھی بھر چند مسلمانوں بلکہ اس کے بعد کبھی تو ایک جان سپار فداکار کی ثابت قدمی نے شکست دے کر اسلام کو مکمل تباہی سے بچایا۔

اب ایسے نازک حالات میں اگر کسی ایک ضرب سے پورے اسلام وایمان کی قیامت تک کے لئے بقا کا سوال وابستہ ہوا ہو تو اس ایک ضرب کو عبادت ثقلین سے بڑھ کر کہہ دیا گیا تو اس میں حیرت واستعجاب کی کیا بات ہے؟!

اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يُدۡرِكْكُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ بُرُوۡجٍ مُّشَيَّدَةٍ‌ ؕ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ‌ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِكَ‌ ؕ قُلۡ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ‌ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَۤاءِ الۡقَوۡمِ لَا يَكَادُوۡنَ يَفۡقَهُوۡنَ حَدِيۡثًا ۝٧٨

’’جہاں بھی تم ہو،تم تک موت پہنچے گی، چاہے تم مضبوط قلعوں میں کیوں نہ ہو اور اگر ان کے لئے کچھ بھلائی ہوتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر ان کے لئے کچھ برائی پیش آئی تو کہتے ہیں یہ آپ کے ہاتھوں ہوا[1] کہئے کہ سب اللہ کی طرف سے ہے تو آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جیسے ان کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہی نہیں۔‘‘

یہ ماشاء اللہ اس وقت کے مسلمانان کرام کا رویہ ہے پیغمبر خداؐ کے ساتھ کہ اگر جنگ میں فتح ہوئی تو اب رسولؐ کی کوئی تعریف نہیں۔کہا یہ ہمیں اللہ نے فتح دی، ہماری قسمت زوروں پر تھی اور اگر کہیں شکست ہوئی تو رسولؐ پر نکتہ چینی شروع ہوگئی اور حضرتؐ پر ذمہ داری عائد کردی گئی کہ آپ نے یوں کیا، اس لئے یوں ہوا اور ہماری رائے پر عمل ہوتا تو یہ نہ ہوتا۔یہ شکست آپ کی وجہ سے ہوئی۔

اس کے تحت میں یہ تصور مضمر ہے جو آج تک علمائے اسلام کے ایک طبقہ میں چل رہا ہے کہ رسولؐ کے افعال بہت سے اپنی رائے سے

[1]۔گویند یامحمد این از نزدیک تست(شاہ ولی اللہ)

ہوتے تھے اور بحیثیت بشر ان میں غلطی کا امکان ہے مگر خالق اس تصور کو رد کرتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ رسولؐ کا تو ہر فعل اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لئے اگر تم اس شکست کا ذمہ دار رسولؐ کے عمل کو سمجھتے ہو، تو وہ رسولؐ کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری خدا پر ہے لہٰذا اس فتح کو اگر خدا کی طرف سے سمجھو تو اس شکست کو بھی اسی کی طرف سے سمجھنا چاہئے۔ پیغمبرؐ پر ذاتی ذمہ داری کوئی نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے امکانی حد تک صحابہ کرام کے ایمان کو سنبھالنے کے لئے اس آیت کو لے جا کر یہود سے متعلق کر دیا ہے اس لئے تصبہم کے بعد لکھ دیا ہے: ای الیہود "یعنی جماعت یہود" اور حسنۃ کے معنی میں لکھ دیا ہے: خصب وسعۃ "شادابی اور کشائش" اور سیئۃ کے تحت لکھ دیا ہے: جدب و بلاء "خشک سالی اور آفت" اور من عندک "آپ کی طرف سے ہے" اس کے تحت میں لکھ دیا ہے: لشومک "آپ کی نحوست سے" (جلالین)

مگر سیاق کلام الٰہی اس تفسیر کے خلاف ہے۔ خود اس آیت کے شروع کے الفاظ انہی مسلمانوں سے متعلق ہیں جو جنگ سے پہلو تہی کرتے ہیں اس خیال سے کہ کہیں مارے نہ جائیں۔ انہی کے اس تصور کے خلاف یہ کہا گیا ہے کہ اگر تمہیں موت آنا ہی ہے تو گھروں میں کیا، قلعوں کے اندر بھی بند ہو کر آ جائے گی۔ اس سے بھاگ کر جہاد سے پہلو تہی کرنا کیا معنی؟[1]

اس کے بعد بلا فاصلہ یہ ہے "اور اگر ان کے لئے کچھ بھلائی ہوئی" تو بالکل ظاہر ہے کہ جن کا پہلے ذکر ہو رہا تھا، انہی سے متعلق یہ بھی بات ہے کہ اس کو لے جا کر ایک دوسری قوم یہود سے متعلق کرنے میں کیا معقولیت ہو سکتی ہے؟

اسی لئے شاہ عبدالقادر صاحب کو لکھنا پڑا ہے:۔

"یہ منافقوں کا ذکر ہے اگر تدبیر جنگ راست آئی اور فتح اور غنیمت ملی تو کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہوئی یعنی اتفاقاً بن گئی۔ حضرتؐ کی تدبیر کے قائل نہ ہوتے تھے اور اگر بگڑ گئی تو الزام رکھتے حضرتؐ کی تدبیر کا۔ اللہ نے فرمایا کہ سب اللہ کی طرف سے ہے یعنی پیغمبرؐ کی تدبیر اللہ کا الہام ہے۔ غلط نہیں"۔ (موضح القرآن)

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ
وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾

"جو تمہارے لئے بھلائی ہو، وہ تو اللہ کی طرف سے ہے اور جو تمہیں برائی پیش آئے، وہ خود تمہارے ہاتھوں ہے اور ہم نے آپ کو لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون حاضر و ناظر ہوگا۔"

"تمہارے لئے میں جو "تم" کی ضمیر ہے، اس کے مخاطب رسولؐ نہیں ہیں بلکہ ان مسلمانوں میں سے جن کا ذکر پہلے تھا، ہر شخص مخاطب ہے۔

اس کے قبل کی آیت میں جو کہا گیا تھا کہ جو اچھائی ہو، وہ بھی اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی ہو وہ بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے، وہ ان کی اس تفریق کی رد تھی کہ "اچھائی اللہ کی طرف سے ہے اور برائی رسولؐ کے ہاتھوں"...... اس کے جواب میں یہ کہہ دیا گیا کہ رسولؐ کے فعل اور اللہ

---

[1]۔ ان الاجال لا تخطیهم ولا تنفعهم الخشیة من القتل (تبیان)

کے فعل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر برائی رسولؐ کی طرف سے ہے تو وہ رسولؐ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد ایک دوسری حقیقت کا اظہار ہے کہ تمہیں جب بھی فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ خدا اور رسولؐ کے احکام پر عمل کرنے سے ہوتی ہے اور جو شکست ہوتی ہے تو کچھ نہ کچھ اللہ کے احکام سے سرتابی کرتے ہو جیسے احد میں کہہ دیا گیا تھا کہ اس درّہ کے پاس سے نہ ہٹنا مگر تم ہٹ گئے یا تمہیں حکم ہے کہ میدان جنگ سے فرار کبھی اختیار نہ کرو مگر تم کمزوری دکھاتے ہو اور راہ فرار اختیار کرتے ہو تو اب جو نقصان پہنچے وہ خدا اور رسولؐ کے ہاتھوں نہیں ہے بلکہ خود تمہارے ہاتھوں ہے۔[۱]

اس کے بعد پھر کلام کی توجہ اس تفریق کی طرف ہوگئی جو وہ کہتے تھے کہ یہ برائی رسولؐ کے ہاتھوں ہوئی تو ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے آپ کو خلق خدا کے لئے رسولؐ بنا کر بھیجا ہے تو آپ کے افعال کی ذمہ داری ہم پر ہے۔[۲]

اس سے یہ نتیجہ صاف نکالا جا سکتا ہے کہ جو لوگ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال میں بشریت کا تصور کر کے خطا کا تصور کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت رسالت پر ایمان مکمل نہیں رکھتے۔

''اور اللہ سے بڑھ کر حاضر و ناظر کون ہے''...... یہ ان کی عدول حکمیوں پر تنبیہ ہے کہ تم جو احکام رسولؐ کی مخالفت کرتے ہو، اسے اللہ خوب دیکھتا ہے اور اسی کے لحاظ سے اس کا قلم تقدیر تمہارے حق میں جاری ہوتا ہے۔

ہم نے بھلائی اور برائی کا جو مفہوم قرار دے کر مطلب بیان کیا ہے، یہ گزشتہ آیات سے بھی مرتبط ہے یعنی اب جب جہاد کا حکم ہو گیا اور چارو ناچار اب یہ جہادوں میں شرکت بھی کر رہے ہیں تو ذہنیت ان کی یہ ہے کہ ذرا بھی کوئی خرابی پیدا ہوئی اور یہ اس کی ذمہ داری رسولؐ پر عائد کرنے لگے۔

ایک دوسرا مطلب ان آیتوں کا یہ کہا گیا ہے کہ یہ بھلائی اور برائی دنیاوی نعمت اور مصیبت ہے اس کا ذکر پہلے بھی اس ذیل میں آ چکا ہے کہ اس آیت کو بعض لوگوں نے جماعت یہود سے متعلق کیا ہے اور ہم اسے رد کر چکے ہیں۔ اس صورت میں ان کا یہ مقولہ اس طرح کا ہے جیسے بنی اسرائیل کے لئے دوسری جگہ وارد ہوا ہے:۔

فَإِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوا بِمُوسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ (اعراف ۱۳۱)

جب انہیں کوئی بھلائی ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں یہ تو ہمارا حق ہے اور اگر کوئی برائی ہوتی ہے تو وہ موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ وہ مصیبت کو پیغمبر کی معاذ اللہ نحوست قرار دیتے تھے۔ اس صورت میں قل کل من عند اللہ کا مطلب یہ ہوگا کہ نعمت اور مصیبت دونوں بقضائے الٰہی ہوتی ہیں۔ اس کو رسولؐ کی طرف منسوب کرنا غلط ہے اور پھر نعمت اور مصیبت دونوں کا فرق بیان کیا گیا ہے کہ نعمت تو اللہ کے فیض و عطا کا نتیجہ ہوتی ہے اور مصیبت آتی تو اسی طرف سے ہے مگر وہ تمہارے بداعمالیوں کی سزا میں ہوتی ہے[۳] جس کے لئے

---

[۱]۔ قال ابن عباس والحسن الحسنة ما اصابه يوم بدر من الظفر والغنيمة والسيئة ما اصابه يوم احد (تبیان)

[۲]۔ طاعتك طاعة الله ومعصيتك معصية الله (مجمع البیان)

[۳]۔ يعني بها افعال العباد التي يعاقبون عليها (علی بن ابراهیم)

تمہیں توبہ وانابت کی ضرورت ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے رسولؐ کی شان میں مخالفین نے جو جو گستاخیاں کی ہیں، ان کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے اور حدیث وتاریخ سے بھی ثابت ہے لیکن ہمیں کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ کی شان میں یہ کہا گیا ہو اور معاذ اللہ آپ کے قدم منحوس ثابت ہوئے ہیں بلکہ دوست و دشمن سب کو آپ کے مبارک ومیمون ہونے کا احساس تھا۔ ایسی صورت میں اس آیت میں یہ مفہوم قرار دینا جب کہ وہ سیاق کلام کے مطابق بھی نہیں ہے۔ کوئی صحیح بات معلوم نہیں ہوتی۔

مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ‌ ۚ وَمَنۡ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ عَلَيۡهِمۡ حَفِيۡظًا ؕ﴿۸۰﴾

"جس نے پیغمبر کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے منہ پھیرا یا تو ہم نے آپ کو ان پر پہریدار [1] بنا کر نہیں بھیجا ہے۔"

اطاعت رسولؐ عین اطاعت خدا ہے

بات وہی ابھی چل رہی ہے کہ یہ لوگ خدا اور رسولؐ میں جو تفریق کرتے ہیں، یہ غلط ہے، خدا کا حکم رسولؐ کے حکم سے کوئی الگ نہیں ہے اور رسولؐ کی بات کو ماننا خدا کی بات کو ماننا ہے۔ اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اب لوگ رسولؐ کا کہنا نہ مانیں تو اس میں رسولؐ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان کا کام تو بس احکام کا دینا ہے۔ وہ ہر ایک کے لئے پہریدار نہیں مقرر کیے گئے ہیں کہ انہیں جبر یہ مخالفت سے روکے رہیں۔

ان آیات کے مضمون کا تسلسل میرے ذہن میں اس خیال کو مزید تقویت دیتا ہے کہ اس بھلائی اور برائی سے مراد وہی جہاد کے خوشگوار اور ناخوشگوار نتائج ہیں اور "برائی آپ کی طرف سے ہے" اس کا مطلب وہی ہے کہ وہ اسے رسولؐ کی معاذ اللہ غلطی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور خالق جواب دے رہا ہے کہ نہیں یہ تمہاری عدول حکمی کا نتیجہ ہوتا ہے اور اسی لئے اطاعت رسولؐ پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس کا نحوست کے تصور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَيَقُوۡلُوۡنَ طَاعَةٌ ؗ فَاِذَا بَرَزُوۡا مِنۡ عِنۡدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ غَيۡرَ الَّذِىۡ تَقُوۡلُ‌ ؕ وَاللّٰهُ يَكۡتُبُ مَا يُبَيِّتُوۡنَ‌ ۚ فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ‌ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ﴿۸۱﴾

"اور وہ زبان سے "فرماں برداری" کا لفظ کہتے ہیں اور جب آپ کے پاس سے باہر نکلتے ہیں تو ایک گروہ ان میں کا دل میں اپنے کہے کے خلاف باتیں چھپائے ہوتا ہے اور اللہ لکھتا ہے اسے جو وہ چھپاتے ہیں لہٰذا آپ ان کی طرف توجہ نہ کیجئے اور اللہ پر بھروسا کیجئے اور اللہ سے بڑھ کر مددگار کون ہوگا"۔

---

[1] حافظا لاعمالھم بل نذیرا والینا امرھم فنجازیھم (جلالین)

بیات کے معنی شام کے ہیں لیکن چونکہ شام کو تاریکی ہوجاتی ہے، اس لئے خفیہ منصوبہ بنانے کے بطور کنایہ [1] بیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لئے ہم نے اس کا ترجمہ "دل میں اپنے کہے کے خلاف باتیں چھپائے ہوتا ہے" کے ساتھ کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو مفہوم اب اس لفظ کا ہے، اس میں رات کے وقت کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ لیکن بعض مفسرین ومترجمین اس کا یہ مفہوم قرار دیتے ہیں کہ وہ راتوں کو آپس میں اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جو ان کے اس اقرار کے خلاف ہیں۔ [2]

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾

"تو آخر یہ لوگ قرآن پر غور کیوں نہیں کرتے اور اگر وہ اللہ کے علاوہ کسی کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔"

اختلاف تضاد کے معنی میں بھی اور دورنگی کے معنی میں بھی [3] یعنی کسی شخص کا کلام پورا ایک ہی مرتبہ کمال فصاحت پر نہیں ہوسکتا مگر یہ خالق کا کلام ہے جو ہر طرح کے اختلاف سے بری ہے۔ [4]

قرآن پر غور کرنے کی دعوت دینا اس کا ثبوت ہے کہ قرآن کا ظاہری مفہوم ہر عربی دان کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ [5]

یہ اور بات ہے کہ اس کے تفصیلات یا متشابہات کی تاویل بغیر معصومین کے معلوم نہیں ہوسکتی۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

"اور جب ان کے سامنے کوئی بات امن وامان یا خوف واندیشہ کی آتی ہے تو اور اسے مشہور کر دیتے ہیں، حالانکہ اگر اس میں رجوع کریں پیغمبر کی طرف اور فرمان روائی کا حق رکھنے والوں کی طرف جو ان میں سے ہوں تو اسے جان لیں وہ لوگ جو ان میں سے اس کی تہہ تک پہونچ سکتے ہیں [6] اور اگر اللہ کا فضل وکرم تم پر نہ ہوتا اور اس کی

---

[1]۔ بیت اضروا صلہ احکام الامر لیلا (تبیان)

[2]۔ وقت شب رائے زنند (شاہ ولی اللہ) ای قدر جماعۃ منہم لیلا (مجمع البیان)

[3]۔ تناقضا فی معانیہ وتنا ینا فی نظمہ (جلالین)

[4]۔ کل ہذہ المعانی منفی عن کلام اللہ (مجمع البیان)

[5]۔ یدل علی فساد مذہب من زعم ان القرآن لا یفہم معناہ الا تفسیر الرسول (تبیان)

[6]۔ انانکہ از ایشاں می توانند برآوردن مصلحت آن (شاہ ولی اللہ)

رحمت تو سوا تھوڑے سے آدمیوں کے تم سب شیطان کی پیروی کرتے۔"

دشمن کی نقل وحرکت یا مسلمانوں کے انتظامات جنگ یا مخالف جماعتوں کی تیاریوں کے متعلق بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا عام طور پر مشہور ہونا مناسب نہیں ہوتا لیکن بعض لوگوں کا کردار یہ ہوتا ہے کہ ان کے پیٹ میں کوئی بات پچتی ہی نہیں۔ایسے ہی لوگوں کو یہ تنبیہ ہے اور ہدایت کی گئی ہے کہ جو خبر ہو، پہلے اسے ذمہ دار افراد کے کانوں تک پہنچانا چاہئے تاکہ وہ جو مناسب سمجھیں اس کے بارے میں طریق کار اختیار کریں۔ذمہ دار شخصیت اس وقت خود رسولؐ کی ہے اور آپ کے بعد اولوالامر یعنی معصومین ہر دور میں ہوتے رہیں گے۔[1]

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿٨٤﴾

"تو اللہ کی راہ میں جنگ کیجئے[2] آپ پر ذمہ داری نہیں ہے مگر آپ کی ذات کی اور ایمان لانے والوں کو بھی آمادہ کرتے رہیے،بہت ممکن ہے کہ اللہ کافروں کے زور کو توڑ دے اور اللہ کا زور وطاقت زیادہ اور اس کی طرف کی سزا سخت ہے۔"

آیت کا انداز بیان یہ بتاتا ہے کہ عام مسلمانوں کی بے وفائی سے رسولؐ کو سخت بددلی پیدا ہوئی تھی،اس پر دلجوئی کے لئے یہ آیت اتری ہے کہ آپ پر دوسروں کی ذمہ داری نہیں ہے آپ پر فقط اپنے عمل کی ذمہ داری ہے[3] چنانچہ بطرق اہل سنت یہ روایت ہے کہ اس کے بعد رسولؐ نے اعلان فرمادیا کہ کوئی ایک بھی میرا ساتھ نہ دے،تب بھی میں اکیلا جہاد کے لئے روانہ ہوجاؤں گا۔[4]

یہ ان مسلمانوں کے لئے سرمہ چشم ہے جو رسولؐ کو نظام جمہوری کے ماتحت دوسرے مسلمانوں سے رائے مشورہ کا پابند بنانا چاہتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رسولؐ کی ذات جب تمام امت کے لئے ایک مرکز کی حیثیت رکھتی ہے تو امت کو آپ کا تابع ہونا چاہئے، نہ کہ آپ کو امت کی رائے عامہ یا اکثریت کے فیصلہ یا اجماع کا۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿٨٥﴾

"جو اچھی سفارش کرے گا، اسے اس میں سے حصہ ملے گا اور جو بری سفارش کرے گا، اس کا اس میں حصہ ہوگا اور

---

[1]۔قال ابو جعفر هم الائمه المعصومين (تبیان)

[2]۔پس جنگ کن یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در راہ خدا (شاہ ولی اللہ)

[3]۔امره الله ان يقاتل فی سبيل الله وحده بنفسه (مجمع البيان)

[4]۔فقال صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیده لاخرجن ولو وحدی (جلالین)

اللہ ہر چیز پر قادر ہے“۔ [۱]

آیت کی شان نزول معلوم نہیں۔ بہرحال مقصود یہ ہے کہ کسی امر خیر کی سفارش کرنا بہت اچھا ہے کہ اس صورت میں اس امر خیر کے ثواب میں آدمی شریک ہوجاتا ہے اور کسی کو انسان کسی برے کام پر ابھارے تو یہ بہت بری بات ہے، انسان اس صورت میں اس برے کام کی سزا میں شریک ہوگا۔ [۲]

گزشتہ آیت سے ربط اس کا یہ قائم کیا گیا ہے کہ آپ مومنین کو راہ خدا میں جہاد پر آمادہ کیجئے اور یہ خیال نہ کیجئے کہ یہ عمل نہیں کرتے تو فائدہ کیا ہے؟ کیوں کہ وہ عمل کریں یا نہ کریں، ایک اچھے کام کی ترغیب وتحریص کا اجر تو آپ کا کہیں نہیں گیا ہے۔ [۳]

مگر چونکہ ترتیب قرآن مطابق تنزیل نہیں ہے، اس لئے نہیں سمجھا جاسکتا کہ یہ آیت گزشتہ آیت کے مضمون سے کوئی تعلق رکھتی ہے یا نہیں۔

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ﴿٨٦﴾

”اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس سے بہتر طریقہ پر تم سلام کرو یا اسی کو پلٹا دو، یقیناً اللہ ہر شے کا محاسبہ کرنے والا ہے“۔

اسلام میں خود سے سلام کرنا مستحب ہے مگر جواب سلام دینا واجب ہے اور سلام اسلامی کے کم الفاظ ”سلام علیکم“ یا ”السلام علیکم“ ہیں جن میں ہندوستانی عوام کے درمیان یہ تفریق ہوگئی ہے کہ پہلا طریقہ شیعوں سے مخصوص ہوگیا اور دوسرا سنیوں سے حالانکہ قدیم ماخذوں کے لحاظ سے یہ تفریق بالکل درست نہیں ہے۔

جواب سلام کے لئے اسلامی تعلیم

شیعوں کے یہاں زیارات میں عموماً السلام علیك اور السلام علیکم وغیرہ کے الفاظ ہیں اور یہی الفاظ نماز میں بھی ہیں اور شیعہ سنی سب کے لئے اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ قرآن مجید میں اہل جنت کا جو سلام ہے وہ سلام علیکم ہی کے الفاظ میں ہے۔ نیز قدیم مفسرین وعلماء بھی سلام کے تحت میں سلام علیکم ہی لکھتے ہیں۔ [۴]

---

[۱]۔ مقیتا ای مقتدرا (علی بن ابراھیم)

[۲]۔ کوئی محتاج کی سفارش کرکے دولت مند سے کچھ دلوادے، یہ بھی شریک ہوا ثواب خیرات میں اور جو کافر یا مفسد کو سفارش کرکے چھڑوادے کہ پھر وہ فساد کرے، یہ بھی شریک ہوا اس فساد میں (موضح القرآن)

[۳]۔ لما قیل لا تکلف الا نفسك عقب ذلك بان لك مع ھذا فی دعاء المومنین الی الحق مالالانسان فی شفاعة صاحبه بخیر یصل الیه (تبیان)

[۴]۔ بتحیة کان قیل لکم سلام علیکم (جلالین)

جواب بہتر دینا چاہئے، اس کی صورت یہ ہے کہ اس نے سلام علیکم کہا تو جواب میں کہے: علیکم السلام ورحمۃ اللہ اور وہ سلام علیکم ورحمۃ اللہ کہے تو جواب دے۔ علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

''کم سے کم انہی الفاظ کو واپس کردینا چاہئے''۔ اس سے ظاہر ہے کہ جواب سلام جوواجب ہے، وہ اتنے ہی الفاظ سے پورا ہوجائے گا اور اضافہ مستحب رہے گا۔

بعض نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ باختلاف مخاطب اس میں تبدیلی ہوگی۔ ''اس سے بہتر الفاظ میں جواب دو'' اگر سلام کرنے والا مسلمان ہو اور ''وہی الفاظ جواب میں دہرادو''۔ اگر وہ کافر ہو۔ [1]

مگر زیادہ قوت پہلی تشریح کو ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجۡمَعَنَّكُمۡ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ ؕ وَمَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيۡثًا ﴿۸۷﴾

''اللہ، کوئی خدا نہیں سوا اس کے۔ بلاشبہ ضرور وہ تم سب کو اکٹھا کر کے قیامت کے دن تک پہنچائے گا۔ [2] جس میں کوئی شک نہیں ہے اور اللہ سے زیادہ بات میں سچا کون ہوگا۔''

فَمَا لَـكُمۡ فِى الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِئَتَيۡنِ وَاللّٰهُ اَرۡكَسَهُمۡ بِمَا كَسَبُوۡا ؕ اَتُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَهۡدُوۡا مَنۡ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ سَبِيۡلًا ﴿۸۸﴾

''تو یہ کیا ہے کہ تم لوگ منافقوں کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے ہو حالانکہ اللہ نے انہیں ان کے کردار کی وجہ سے پلٹا دیا ہے [3] کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے گمراہ چھوڑ دیا ہے، تم اسے راہ راست پر قرار دو [4] اور جسے اللہ گمراہ چھوڑ دے، اس کے لئے تم ہرگز کوئی راستہ نہیں پاسکتے۔''

اس آیت کا تعلق واضح طور پر کسی خاص شان نزول کے ساتھ ہے، بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ احد سے واپسی کے بعد اتری ہے۔ جب جنگ سے فرار کرنے والوں کے باب میں اختلاف رائے تھا ایک رائے یہ تھی کہ ان سب کو قتل کردیا جائے، دوسری رائے یہ تھی کہ نہیں، ایسا نہیں کرنا

---

[1]۔ قال قتادۃ وابن عباس وابن وھب فحیوا باحسن منھا اھل الاسلام اوردوھا اھل الکفر (تبیان)

[2]۔ ای لیبعثنکم من بعد مماتکم ویحشرنکم جمیعا الی موقف الحساب (مجمع البیان)

[3]۔ ای ردھم الی حکم الکفار بما اظھروا من الکفر عن ابن عباس (مجمع البیان)

[4]۔ تحکموا بھدایۃ من اضل اللہ ای حکم اللہ بضلالہ (مجمع)

چاہئے۔اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی[1] یہ قول،مشہور جامع قرآن جناب زید بن ثابت کا ہے۔[2]
اس صورت میں یہ چیز یاد رکھنے کی ہے کہ اس پوری فراریوں کی جماعت کو قرآن نے ''المنافقین'' کا لقب دے دیا ہے کہ یہ کبھی راہ راست پر نہیں آئیں گے۔اس کے بعد امت مسلمہ کے لئے کتنے شرم کی بات ہوگی کہ وہ انہی میں سے اپنی دینی و دنیوی پیشوائی کے لئے رہبر اور سر براہ منتخب کرے تو ایسے رہبروں کی پیروی منزل نجات تک کیوں کر لے جاسکے گی۔
مگر مجھے یہ قول درست معلوم نہیں ہوتا۔اس لئے کہ مضمون آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ منافقین جن کے بارے میں آیت ہے،کوئی مختصر گروہ ہے جس کے بارے میں مسلمانوں کی اکثریت میں دو گروہ ہوگئے ہیں لیکن جنگ احد کی روئداد جو تاریخ وحدیث ہی نہیں،قرآن مجید سے بھی ثابت ہے،وہ تو یہ ہے کہ میدان سے فرار کے جرم میں سوا معدود ے چند کے جو قتل ہو گئے یا ایسے زخمی ہوئے ہوں کہ بالکل از کار افتادہ ہو گئے ہوں اور پھر آخر میں ایک فرد فرید کے جس نے جنگ کو سر کیا،باقی تمام ہی کے تمام اہلِ اسلام ملوّث تھے تو آخر یہ باغیرت مسلمان کون تھے جن میں سے ایک جماعت ان تمام فراریوں کے لئے حکم ''بزن'' کی حامی تھی اور ایک دم سے قتل عام کرا دینا چاہتی تھی۔اس لئے اس آیت کی شان نزول کا اس احد کے واقعہ سے قطعاً تعلق نہیں ہوسکتا۔
دوسرا قول جسے صاحب مجمع البیان نے درج کیا ہے اور غالباً اسی کو مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے حاشیہ میں جو''منافقوں'' کے لفظ پر ہے،ان الفاظ میں لکھا ہے کہ:۔
''کچھ لوگ مکہ سے مدینہ اپنے کو مسلمان ظاہر کر کے جا رہے تھے،راستے میں خدا جانے انہیں کیا سوجھی کہ پھر مکہ واپس آئے اپنے شرک وکفر کا اعلان کر کے یمامہ چلے گئے۔اب کچھ مسلمانوں کو ان سے جنگ کرنے میں تامل ہوا تو یہ آیت اتری۔''
مگر یہ قول بھی کچھ ایسا ہی سا معلوم ہوتا ہے۔اس لئے کہ جب انہوں نے اپنے شرک وکفر کا اعلان کر دیا تو وہ منافق کہاں ہوئے،وہ تو مرتد قرار پائے جو صریحی کفار کی قسم ہے۔
اب جب کہ شان نزول میں وارد شدہ دونوں قول رد ہوگئے تو آیت کی شان نزول کے سمجھنے میں اعتراف عجز کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

''ان کی تو خواہش ہے کہ کاش تم بھی کافر ہو جاؤ،اسی طرح جیسے انہوں نے کفر اختیار کیا[3] کہ تم سب برابر ہو جاؤ

[1] لما رجع ناس من احد اختلف الناس منهم فقال فریق اقتلهم وقال فریق لا فنزل (جلالین)
[2] ذکر ذٰلک زید بن ثابت (تبیان)
[3] دوست رکھتے ہیں کاش کہ کافر ہو جاؤ تم جب کافر ہوئے وہ (شاہ رفیع الدین)

لہٰذا ان سے اپنے حامی وسرپرست نہ بناؤ، جب تک کہ یہ اللہ کی راہ میں اپنے موجودہ مرکز سے جدائی اختیار نہ کریں، اب اگر وہ روگردانی کریں تو انہیں پکڑو اور جہاں انہیں پاؤ، انہیں مار ڈالو اور ان میں سے اپنا کوئی سرپرست نہ بناؤ اور نہ مددگار۔"

یہ نہ گزشتہ سلسلہ سے متصل آیت معلوم ہوتی ہے اور نہ یہ کفار کے متعلق کسی عام اعلان کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ یہ کسی خاص جماعت کفار کے بارے میں ہے جن کا کردار ایسا رہا ہے جس کی سزا یہ سنائی جارہی ہے کہ جہاں انہیں پاجاؤ قتل کرڈالو، اس صورت میں ان الفاظ کا کہ ان کو اپنا حامی وسرپرست نہ بناؤ، ظاہری مفہوم تو یہ نکلتا ہے کہ بحالت موجودہ جب کہ وہ کافر ہیں، انہیں اپنا حامی وسرپرست نہ بناؤ۔ لہٰذا اس کے بعد کا فقرہ کہ "حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" اس کے معنی یہ نہیں ہوسکتے کہ وہ راہ خدا میں ہجرت کریں یعنی ترک وطن۔ اس لئے کہ ہجرت کا درجہ ایمان کے بعد ہے۔ جب ابھی وہ ایمان نہیں لائے ہیں تو اس کے کہنے کا کیا محل ہے کہ وہ راہ خدا میں ہجرت کریں۔

اس لئے ہم نے یہ ترجمہ کیا کہ "اللہ کی راہ میں وہ اپنے موجودہ مرکز سے جدائی اختیار کریں"...... اس "مرکز سے جدائی" میں ایمان قبول کرنا اور پھر ہجرت کرنا دونوں داخل ہیں لیکن بعض مفسرین نے "لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا" کا یہ مطلب لیا ہے کہ وہ چاہے ایمان بھی اختیار کرلیں تب بھی تم ان کو اپنا دوست نہ بناؤ، جب تک کہ وہ راہ خدا میں ہجرت نہ کریں[1] مگر اس صورت میں اس کے بعد کا یہ فقرہ کہ: فان تولوا" تو کیا وہ مسلمان جو کسی وجہ سے ہجرت نہ کریں واجب القتل ہیں؟ ایسا نہیں ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہے تو یہ حکم یقیناً ان سے متعلق ہوگا جو ایمان اختیار نہ کریں تو پھر اس کے قبل کے فقرہ کو بھی مسلمانوں سے متعلق لینا درست نہیں ہونا چاہئے۔

اب روگردانی کرنے کے معنی جب یہ ہیں کہ وہ اپنے کفر کو ترک نہ کریں اور اسلام قبول نہ کریں یعنی اپنے موجودہ موقف پر جو کفر ہے، برقرار رہیں[2] تو اس کے پہلے یہاجروا کے معنی یہ لینا پڑیں گے کہ وہ اپنے اس موقف کو ترک نہ کریں جیسا کہ ہم نے ترجمہ کیا ہے ورنہ کلام دولخت ہوجائے گا اور اول وآخر ربط قائم نہ ہوگا۔

بعض مفسرین نے غالباً قبل کی آیتوں کے سلسلہ کو دیکھتے ہوئے اس آیت کو بھی منافقین سے متعلق قرار دیا ہے[3] مگر اس صورت میں یہ حکم کہ جہاں تم کو وہ ملیں، انہیں قتل کردو، منافقین سے متعلق قرار پائے گا حالانکہ منافقین کے لئے اسلامی مسلک یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی زبان سے لاالہ الا اللہ کہنے کا دنیاوی حقوق تک جو مسلمانوں کے لئے ثابت ہیں، احترام لازم ہے جس میں سب سے زیادہ جان و مال کا محفوظ ہونا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو مسلمانوں کی صفوں میں منافق آخر تک موجود کیوں کر رہتے، جن کا وجود آخر تک تاریخ ہی نہیں بلکہ قرآن وحدیث کی بھی مسلم حقیقت ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ

---

[1] فلاتتخذوا منهم اولياء توالونهم وان اظهروا الايمان حتى يهاجروا فى سبيل الله هجرة صحيحة (جلالين)

[2] فان تولوا اقاموا على ما هم عليه (جلالين)

[3] ودوا اى ودهؤلاء المنافقون (مجمع البيان)

صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ
عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ
السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾

''سوا اُن کے جو تعلق رکھتے ہیں ایک ایسی قوم سے کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہے یا تمہارے سامنے آتے ہیں اس حالت میں کہ ان کے دل الجھتے ہیں اس سے کہ وہ تم سے جنگ کریں یا اپنی قوم سے جنگ کریں اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں تم پر قابو دے دیتا اور وہ تم سے جنگ کرتے۔ اب جب وہ تم سے کنارہ کشی کرکے جنگ نہیں کرتے اور انہوں نے تمہاری طرف صلح کا ہاتھ بڑھا رکھا ہے [۱] تو اللہ نے تمہیں ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا جواز عطا نہیں کیا ہے۔''

ظاہراً یہ سب کفار ہی کی قسمیں ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ان میں کے ایک صلح پسند گروہ کا ذکر ہے جس میں ابھی اتنی بصیرت یا جرأت پیدا تو نہیں ہوئی ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں گے مگر وہ مسلمانوں سے لڑنا نہیں چاہتے۔ قرآن نے بربنائے امن پسندی یہ کہا ہے کہ ان لوگوں کے اس ''بین بین'' طرز عمل کا احترام ہونا چاہئے اور مسلمانوں کو ان سے کوئی تعرض نہ کرنا چاہئے۔ معصوم کی تفسیر بھی اس کے موافق ہے۔ [۲]

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى
الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا
اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ
عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

''کچھ اور لوگ ایسے پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی محفوظ رہیں اور اپنی جماعت سے بھی محفوظ رہیں [۳] اور جب بھی فتنہ پردازی کا دوبارہ موقع ملے تو وہ اس میں بالکل جٹ جائیں گے [۴] یہ لوگ اگر تم سے کنارہ کشی نہیں کرتے اور تمہاری طرف صلح کا ہاتھ نہیں بڑھاتے اور اپنے ہاتھ نہیں روکتے تو انہیں پکڑو اور جہاں بھی انہیں پاؤ قتل کرو۔ یہ

---

[۱] ۔بیگفتند بسوی شما پیغام صلح را (شاہ ولی اللہ)
[۲] ۔قال ابو جعفر علیہ السلام... هو هلال بن عويمر السلمي واثق عن قومه الا تخيف يا محمد من اتاك ولا نخيف من اتانا (تبیان)
[۳] ۔امن من رہیں تم سے اور امن میں رہیں قوم اپنی سے (شاہ رفیع الدین)
[۴] ۔اركسوا فيها يعني وقعوا فيها (تبیان)

وہ ہیں جن کے خلاف ہم نے تمہیں کھلی ہوئی دسترس عطا کیا ہے۔"

مذکورہ بالا تین آیتوں میں کھلے ہوئے کافروں ہی کی تین قسموں کا تذکرہ ہے۔

واضح ہونا چاہئے کہ ایک ہی عمل کے محرکات مختلف ہوتے ہیں جن کا پتہ طریق کار سے چلتا ہے۔

کافروں میں ایک گروہ تو وہ ہے جو شمشیر بکف مسلمانوں کے سامنے ہے۔ ان سے جنگ کرنا ہے اور ان سے کسی رعایت کی ضرورت نہیں۔

پہلے تو صلح جو کافر جو واقعی جنگ کو پسند نہیں کرتے مگر ان کے ضمیر میں اتنی روشنی پیدا نہیں ہوئی ہے کہ وہ ایمان اختیار کرلیں۔ وہ قلبی طور پر جنگ سے گھبراتے ہیں۔ نہ وہ مسلمانوں سے لڑنا چاہتے ہیں اور نہ اپنی قوم یعنی ان کفار سے جو برسر جنگ ہیں تصادم کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کے ساتھ صدق دل سے مصالحانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے لئے قرآن کہتا ہے کہ ان کی اس صلح پسندی کی مسلمانوں کو قدر کرنا چاہئے اور ان کے خلاف کوئی اقدام کرنے کا انہیں ہرگز حق نہیں ہے۔

دوسرے وہ جو اس وقت جنگ تو نہیں کر رہے ہیں مگر یہ جنگ نہ کرنا ان کا واقعی صلح پسندی کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ایک منافقانہ چال ہے۔ وہ جنگ کرنا پسند نہیں کرتے، اس لئے کہ وہ اپنے کو خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ ابھی جب تک کہ انہیں یہ اطمینان نہیں کہ فتح مسلمانوں کو ہوگی یا کافروں کو، وہ الگ تھلگ رہنے کا اظہار کرتے ہیں، صرف اس لئے کہ اگر مسلمانوں کو فتح ہو تو مسلمانوں کے ہاتھ سے وہ خطرہ میں مبتلا نہ ہوں اور اگر کفار کو فتح ہو تو ان کے ہاتھ سے بھی انہیں آزار نہ پہنچے، اسے قرآن مجید نے ان لفظوں میں کہا ہے کہ: يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ "وہ چاہتے ہیں تم سے بھی محفوظ رہیں اور اپنی جماعت سے بھی"...... مگر ذرا انہیں اطمینان ہو کہ مسلمان کمزور ہیں اور ان کے خلاف کوئی ہنگامہ خیزی ان کے لئے باعث نقصان نہیں ہے تو وہ ایک دم ہنگامہ کے اندر کود پڑیں گے۔ ایسے لوگ جن کا کردار یہ ظاہر ہو جائے، پھر کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں اور ان کی جان و مال محفوظ نہیں ہے۔

قرآن مجید کے ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ یہ تصور کہ اسلام میں ہر کافر کی جان و مال حلال ہے اور انسان کی بحیثیت انسان کوئی قدر و قیمت ہی نہیں، درست نہیں ہے اور یہ اقسام جو کافروں کی بیان ہوئی ہیں اور ان کے ساتھ رویہ میں جو فرق قرار دیا گیا ہے، وہ بالکل فتوائے عقل و اخلاق کے مطابق ہے۔ اس لئے وہ ہر دور میں قائم ہے اور منسوخ قرار دیئے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ بعد کے مطلق احکام جہاد سے یہ آیتیں منسوخ ہو گئیں[1] مگر میرے خیال میں یہ درست نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ

---

[1]. قال قوم الآية منسوخة (تبیان)

شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

''اور کسی مسلمان کا کام نہیں ہے [1] کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کرے سوا نادانستہ صورت کے اور جو نادانستہ کسی مسلمان کو قتل کرے تو ایک مسلمان بندہ کو آزاد کرنا ہوگا اور ایک خون بہا اس کے وارثوں کے حوالے کرنا ہوگا، سوا اس کے کہ وہ لوگ معاف کردیں۔ اب اگر وہ کسی ایسی جماعت میں سے ہے جو تمہاری دشمن ہے اور وہ خود مسلمان ہے تو بس ایک مسلمان بندہ کو آزاد کرنا ہے اور اگر ایسی جماعت میں سے ہے کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہے تو پھر وہی ایک خون بہا اس کے وارثوں کے سپرد کرنا ہے اور ایک بندہ کا آزاد کرنا۔ اب جس کے پاس یہ نہ ہو تو دو مہینے متواتر روزے رکھنا ہوں گے اللہ کی طرف سے عنایت کے طور پر [2] اور اللہ جاننے والا ہے، ٹھیک ٹھیک کام کرنے والا۔''

قتل خطا کی سزائیں

قتل خطاء کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کا قتل کرنے کا اس انسان کا بالکل ارادہ نہ تھا جیسے یہ تیر لگار ہا تھا کسی جانور کے شکار کے لئے اور اتفاقیہ اس کی زد میں آ گیا کوئی آدمی۔ اس میں چونکہ ایک حق اللہ ہے اور ایک حق الناس یعنی اللہ کا حکم ہے کہ کسی آدمی کو قتل نہ کیا جائے۔ یہاں اس کے ہاتھ سے ایک آدمی قتل ہو گیا۔ یہ اور بات ہے کہ جان کر اس کو قتل نہیں کیا مگر عموماً کوئی نہ کوئی کم توجہی اور رواروی ہوتی ہے جس سے ایسی اتفاقی صورت پیش آتی ہے۔ اس رواروی کے لئے کفارہ ہے ایک بندہ مسلم یعنی غلام یا کنیز کو آزاد کرنا اور حق الناس یعنی وارث کو جو صدمہ پہنچا ہے، اس کے لئے دیت یعنی خون بہا ہے۔ اور چونکہ یہ ان کا حق ہے تو جب وہ معاف کردیں، یہ ساقط ہو جائے گا لیکن وہ کفارہ یعنی بندہ کو آزاد کرنا، پھر بھی قائم رہے گا۔

اب اگر اس کے عزیز واقارب سب کافر ہیں اور وہ بھی ایسے کہ مسلمانوں سے ان سے کوئی ''ناجنگ'' معاہدہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں یہ حق الناس ساقط ہے لہٰذا دیت نہیں دینا ہوگی مگر کفارہ پھر بھی برقرار ہے۔

اور اگر وہ قوم کافر ہے مگر مسلمانوں کے ساتھ اس کا معاہدہ ہے تو اس کے وہی حقوق ہیں جو مسلمانوں کے ہیں لہٰذا پھر دونوں باتیں ہوں گی: کفارہ بھی اور دیت بھی اور کفارہ نہ دے سکے تو دو مہینے کے روزے رکھے۔ اس کفارہ کی وجہ سے اللہ کی طرف سے معافی ہوگی جسے توبۃ من اللہ کے لفظوں سے ظاہر کیا گیا ہے مگر دیت بہر حال دینا ہے یا وارثوں سے معاف کرانا ہے۔ اگر نہیں دے سکتا، تب بھی وہ ایک قرضہ ہے جو اس کے ذمے ہے۔ دیت ان روزوں کی وجہ سے ساقط نہ ہوگی۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

---

[1] ۔لیس من صفۃ المؤمن ان یقتل مؤمنا الا خطاء (مجمع البیان)

[2] ۔معناہ رجعۃ من اللہ لکم الی التیسیر علیکم (تبیان)

''اور جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ اس پر غضب ناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور اس کے لئے بہت بڑا عذاب مہیا کرے گا۔''

یہ سزا قتل نفس کی بالکل وہی بیان ہوئی ہے، جو کفر اور شرک کی سزا ہے یعنی عملی گناہوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جس میں **مخلّد فی النّار** ہونے کا اعلان ہوا ہو سوا قتل نفس کے کہ اس کی سزا یہ بتائی ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔

پھر بھی شرک اور اس میں ایک مابہ الامتیاز ہے اور وہ یہ کہ شرک میں مغفرت کی گنجائش ہی نہیں ہے اعلان ہو گیا ہے۔

إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ

یقیناً اللہ اس جرم کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔

قتل عمد کے گناہ کی اہمیت اور سزائے آخری میں شدت

مگر قتل نفس ایک گناہ ہے جس کی سزا اگر ملے تو یہی ہے لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ معاف ہوجانے کی بنا پر سزا ملے ہی نہ، اسی آیت کے تتمہ کی وجہ سے کہ:۔

يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ

اس سے کم کو جس کے لئے چاہتا ہے، اللہ بخش دیتا ہے۔

اس میں قتل نفس کا گناہ بھی داخل ہے اور اعلانِ **خلود فی النار** اس معافی کا سدباب نہیں کرتا [1] اس کے علاوہ آیت کی یہ تشریح بھی وارد ہوئی ہے کہ کسی مومن کو اس کے ایمان کی وجہ سے قتل کرے اور ظاہر ہے کہ ایمان کی بنا پر وہی قتل کرے گا جو خود ایمان سے خالی ہوگا۔ [2]

اور ہمارے یہاں یہ صراحت وارد ہوئی ہے کہ نبی کا جو قاتل ہو، اس کی توبہ کبھی قابل قبول نہیں ہے۔ [3]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿٩٤﴾

---

[1] ۔ھذا ماول بمن استحله او بان ھذا جزاؤہ ان جوزی ولا بدع فی خلف الوعید لقوله تعالیٰ ویغفر مادون ذٰلك لمن یشآء (جلالین) رواہ یضا العیاشی باسنادہ عن ابی عبداللہ علیہ السلام وقد روی ایضا مرفوعا الی النبی ﷺ انه قال ھو جزاؤہ ان جازاہ (مجمع البیان)

[2] ۔قد روی اصحابنا ان الاٰیة متوجهة الی من یقتل المؤمن لایمانه وذٰلك لا یکون الا کافرا (تبیان)

[3] ۔من قتل نبیا او وصی نبی فلا توبة له (علی بن ابراھیم)

''اے ایمان لانے والو! جب اللہ کی راہ میں (جہاد کے لئے) نکلو [1] تو جانچ پڑتال کرلیا کرو [2] اور اس سے جو تمہیں سلام کرے، یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں ہے تم دنیوی زندگی کی دولت چاہتے ہو! تو اللہ کے یہاں بڑے فائدے ہیں۔ ایسے ہی تو تم خود پہلے تھے، اس کے بعد اللہ نے تم پر احسان کیا لہٰذا جانچ پرتال کرلیا کرو۔ یقیناً اللہ اس سے جو تم کرتے ہو باخبر ہے۔''

اس آیت کی شان نزول شاہ عبدالقادر دہلوی ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

''حضرتؐ کے وقت میں مسلمانوں کی فوج پہنچی ایک بستی پر وہاں ایک مسلمان تھا، اپنے مویشی کنارے کرکے کھڑا ہوا تھا اور مسلمانوں سے سلام علیک کہا۔ لوگوں نے سمجھا کہ غرض کو مسلمان جتاتا ہے۔ اس پر یہ آیت اتری''۔ (موضح القرآن)

اس دستہ فوج کا سردار کون تھا؟ اس میں اختلاف ہے، بعض روایتیں بتاتی ہیں کہ وہ اسامہ بن زید تھے اور بعض میں دوسرے نام بتائے گئے ہیں۔

اظہار اسلام کا اعتبار

بہر صورت آیت کے آخری الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ یہ قتل کرنا مال غنیمت کی طمع میں تھا۔

آخر میں ارشاد ہوا کہ ایسے ہی تم پہلے تھے۔ اس کا مطلب پہلی ہی نگاہ میں جو سمجھ میں آتا ہے یہ ہے کہ اب اتنی غیرت ایمانی تم دکھاتے ہو۔ پہلے تم بھی اسلام سے خارج تھے اور بعد میں مسلمان ہوگئے۔ پھر کسی دوسرے کو یہ کیوں سمجھتے ہو کہ وہ اظہار اسلام میں سچا نہیں ہے۔ علامہ طبرسی کی تفسیر اس کے مطابق ہے۔ [3]

دوسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں بھی تو یہی تھا کہ تم مال ودولت کی خاطر آدمیوں کی جان لیتے تھے [4] پھر اگر اب بھی ایسا ہی ہوا تو تمہاری جاہلیت اور اسلام میں فرق ہی کیا ہوا؟

لَا يَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى

---

[1]۔ چوں سفر کنید در راہ خدا یعنی برائے جہاد (شاہ ولی اللہ)

[2]۔ ای میزوا بین الکافر والمؤمن (مجمع البیان)

[3]۔ کما کان فقدا المقتول کافرا فھداہ اللہ کذلك کنتم کفارا فھدا کم اللہ (مجمع البیان)

[4]۔ تم ایسے ہی تھے پہلے یعنی غرض دنیا پر خون ناحق کرنے والے (موضح القرآن)

الۡقٰعِدِیۡنَ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنۡہُ وَمَغۡفِرَۃً وَّرَحۡمَۃً ؕ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۹۶﴾

''برابر نہیں ہیں مسلمانوں میں سے بغیر معذوری کے گھر میں بیٹھنے والے اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے۔ اللہ نے اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر بہت فوقیت دی ہے، اور یوں تو ہر ایک سے اس نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور جہاد کرنے والوں کو پیچھے رہنے والوں پر بہت بڑے اجر کے ساتھ فضیلت عطا کی ہے۔ بڑے مرتبوں اور بخشش اور رحمت کے اعتبار سے اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

اس آیت کے مضمون سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے دور میں جہاد کے لئے فوج اسلامی میں جانا وجوب عینی کی حیثیت نہ رکھتا تھا یعنی بھرتی نہ تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو قاعدین کے لئے وعید عذاب ہونا چاہئے تھا حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ صاف کہا گیا ہے: کُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الۡحُسۡنٰی ''اللہ نے ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے'' یعنی قاعدین بھی جو گھر میں بیٹھ کر عبادت اور اپنے روزمرہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں، اُن کا ثواب نہیں ملے گا مگر مجاہدین کا ثواب ان سے بہت زیادہ ہے۔ اب اگر کوئی اس ثواب کو حاصل نہیں کرتا تو یہ اس کی کم نصیبی ہے مگر اس پر وہ کسی عذاب کا مستوجب نہ ہوگا۔[1]

ہاں جہاد میں کفار کے سامنے جا کر پھر میدان سے فرار اختیار کرنا گناہ کبیرہ ہے کہ وہ عزت و وقار اسلامی کے مجروح کرنے کا سبب ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَفّٰىہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ قَالُوۡا فِیۡمَ کُنۡتُمۡ ؕ قَالُوۡا کُنَّا مُسۡتَضۡعَفِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَکُنۡ اَرۡضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُہَاجِرُوۡا فِیۡہَا ؕ فَاُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ ؕ وَسَآءَتۡ مَصِیۡرًا ﴿۹۷﴾

''بلاشبہ وہ جنہیں فرشتوں نے دنیا سے اٹھایا اس عالم میں کہ وہ اپنے اوپر ظلم کے مرتکب تھے انہوں نے ان سے کہا:[2] کہ ارے! یہ تم کس عالم میں تھے؟ انہوں نے کہا ہم دنیا میں دبے پسے ہوئے تھے، انہوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے! یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بڑی بری منزل ہے۔''

---

[1] یدل علی ان القاعدین لم یکونوا عاصبین وان کانوا تارکین للفضل (تبیان) فی ھٰذہ دلالۃ علی ان الجھاد فرض علی الکفایۃ لانہ لو کان فرضا علی الاعیان لما استحق القاعدون بغیر عذر اجرا (تبیان)

[2] علی وجہ التقریر لھم او التوبیخ لفعلھم (مجمع البیان)

ہجرت کے بعد کچھ مسلمان ایسے تھے جو مکہ معظّمہ میں رہ گئے اور پھر جب جنگ بدر ہوئی تو وہ اپنی قوت ارادی کی کمی سے کفار کی فوج میں آ کر ادھر سے قتل ہوئے۔ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

باطل ماحول میں رہ کر اگر باطل کی حمایت سے اپنا تحفظ کر سکتا ہے تو وہاں رہے۔نہیں تو وہاں سے ہجرت واجب ہے، ورنہ وہ انجام کے لحاظ سے اس جماعت کے ساتھ محسوب رہے گا جس کا وہ شریک کار رہا ہے۔

صورت وجوب ہجرت

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت صرف ان حالات میں واجب ہے جب انسان کافروں کے ملک میں اپنے دینی فرائض کے انجام دینے سے قاصر ہو اور کفار و مشرکین کے ساتھ ان کی باطل پرستیوں میں شرکت پر مجبور کیا جاتا ہو۔نہ یہ کہ ایسے ملک سے جہاں غلبہ غیر مسلم جماعت کا ہو، بہر صورت ہجرت واجب ہو۔ایسا ہرگز نہیں ہے۔

اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ حِيۡلَةً وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ سَبِيۡلًا ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓـئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّعۡفُوَ عَنۡهُمۡ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوۡرًا ﴿۹۹﴾

”مگر مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے وہ بے بسے ہوئے جنہیں کوئی تدبیر ہی ممکن نہ ہو اور نہ کوئی راستہ انہیں ملتا ہو، یہ وہ ہوں گے جنہیں بہت ممکن ہے کہ اللہ معاف کر دے اور اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے، بخشنے والا۔“

یعنی تنگ دستی یا ناتوانی یا کافروں میں گھرے ہوئے ہونے، بہر صورت کسی بھی وجہ سے ہجرت کرنا جنہیں ممکن ہی نہ ہو[1] ان کی مجبوری ہے اور معاف کرنے سے مراد یہاں یہ ہے کہ وہ گنہگار نہیں ہیں۔نہ یہ کہ گناہ تو ان کا ثابت ہے مگر وہ معاف کر دیئے جائیں گے اور ”بہت ممکن ہے“ کے الفاظ اس لحاظ سے ہے کہ بسا اوقات انسان واقعی معذور نہیں ہوتا اور وہ تساہل کی وجہ سے اپنے کو دھوکا دیتا اور معذوری کی سپر لیتا ہے۔خدا ایسوں کو معاف نہیں کرے گا۔ورنہ جو واقعی معذور ہوں، یقیناً قابل معافی ہیں۔”بہت ممکن ہے“ ان سے بالخصوص متعلق نہیں ہے۔

بعض مفسرین کا خیال یہ ہے کہ خالق کے کلام میں جہاں بھی عسٰی ”بہت ممکن ہے“ آیا ہے، اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ لازماً ایسا ہوگا۔یہ عسٰی کا لفظ بس ایک محاورہ کے طور پر صرف ہوتا ہے، اس سے شک کا اظہار منظور نہیں ہوتا۔[2]

”مستضعفین“ کا ایک دوسرا مفہوم ذہنی اعتبار سے کمزوری کے اعتبار سے ہوتا ہے یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اتنا شعور نہیں رکھتے کہ حق و باطل کا امتیاز کر سکیں تو جب کہ مجنون اور بے ہوش سے بالکل ہی ذمہ داریاں ہٹا لی گئی ہیں تو کمی شعور میں بھی اس کے درجہ کے تناسب سے ذمہ داری کو ہلکا تو ماننا ہی پڑے گا۔

---

[1]۔ هم الذين يعجزون عن الهجرة لاعسارهم و قلة حيلتهم (تبيان)

[2]۔ عسٰى من الله معناه الوجوب (تبيان)

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ
مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى
اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾

''اور جو اللہ کی راہ میں ترک وطن کرے، وہ زمین خدا میں بہت گھومنے پھرنے کی جگہ اور بڑی کشائش[1] پائے گا اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسولؐ کی طرف ہجرت کر کے نکلے، پھر اسے موت آجائے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہو گیا اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

جیسا کہ شاہ عبدالقادر نے لکھا ہے:۔

''یعنی روزی کا ڈر نہ چاہئے کہ بہت جگہ روزی مل رہتی ہے کشائش سے اور یہ خطرہ نہ چاہئے کہ شاید راہ ہی میں مارے جاویں کہ اس میں ثواب پورا ہے'' (موضح القرآن)

امام محمد باقر علیہ السلام کی حدیث میں اس کی شان نزول وارد ہوئی ہے کہ ضمرۃ بن عیص یا عیص بن ضمرہ ایک بزرگوار بیمار تھے۔ انہوں نے حکم ہجرت سننے کے بعد اپنے گھر والوں سے کہا کہ وہ انہیں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے چلیں۔ چنانچہ وہ لوگ تخت پر انہیں ڈال کر لے چلے مگر منزل تنعیم تک کہ وہاں ان کی وفات ہوگئی۔

بعض دوسری روایتوں میں اس سلسلہ میں کچھ اور نام وارد ہوئے ہیں جن کا جناب شیخ طوسی نے تبیان میں تذکرہ فرمایا ہے۔

بہر حال شخصیت کے تعین کی اس سلسلہ میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے اور یہ اعلان بھی کوئی خلاف توقع اعلان نہیں ہے اس لئے کہ عام اصول یہ ہے کہ اجر و ثواب کا تعلق عزم اور سچے دل سے تمنائے عمل کے ساتھ ہوتا ہے۔

اگر انسان مقدرات کے ناگزیر موانع کی وجہ سے اس کام کو انجام نہ دے سکا تو یہ اس کے اختیار کے دائرہ سے باہر ہے۔ اس کا اجر و ثواب پر اثر نہیں پڑتا جو اللہ کے عام فضل و احسان کا ایک تقاضا ہے۔

بعض احادیث میں خاص طور سے امت محمدیہ پر جو اللہ کا فضل خاص ہے، اس کا تقاضا بتایا گیا ہے کہ گناہ اس وقت نامہ عمل میں لکھا جاتا ہے جب وقوع میں آجائے اور نیک کام سچے ارادہ کے ساتھ ہی لکھا جاتا ہے۔ چاہے بعد میں وہ کسی وجہ سے عمل میں نہ آسکے۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ
خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۱۰۱﴾

''اور جب تم سفر کرو تو تمہارا اس میں کوئی حرج نہیں کہ نماز میں قصر کر دو، جب کہ تمہیں ڈر ہے کہ کافر لوگ تمہیں کوئی

[1]۔ اقامت گاہ بسیار و فراخی معیشت (شاہ ولی اللہ)

گزند پہنچا دیں گے [1] یقیناً کافرلوگ تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔"

قصر کرنا نماز کا یہ ہوتا ہے کہ چورکعتی نمازوں میں سے آخر کی دو رکعتیں نہ پڑھی جائیں، بس نماز صبح کی طرح دو رکعت پر نماز کو ختم کر دیا جائے۔[2]

سفر میں انسان کو طرح طرح کے تفکرات اور ذہنی پریشانیاں ہوتی ہیں۔انہی کی وجہ سے قصر صلوٰۃ کا حکم ہوا ہے۔اس زمانہ میں جب آیت نازل ہوئی ہے، خاص پریشانی یہ تھی کہ کافروں کے حملہ کا ڈر لگا رہتا تھا، اس لئے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ حکم قصر اس ڈر کے ساتھ مشروط ہو۔اس سے مفسرین اہل سنت بھی متفق ہیں ا۔ورنہ جواز قصر بھی خوف کے ساتھ مشروط ہوتا حالانکہ جواز قصر سب کے نزدیک مطلق سفر میں ثابت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ آیت میں یوں کہنا درست نہ ہوگا کہ:

"جب تم روئے زمین پر سفر کرو اور تم کو اس امر کا خوف ہو کہ کفار (اثنائے نماز میں) تم سے فساد برپا کریں گے۔" (مولانا فرمان علی)

جواز قصر با جماع امت صرف سفر کے ساتھ وابستہ ہے۔اس خوف کے ساتھ نہیں، جو کچھ اختلاف ہے وہ وجوب قصر میں ہے۔

سفر میں نماز قصر کا حکم

چونکہ حکم قصر ان الفاظ میں دیا گیا ہے کہ: **لا جناح علیکم** "اس میں تمہارا کوئی حرج نہیں ہے"۔اس لئے اکثر علمائے اہل سنت اس کے قائل ہو گئے ہیں کہ یہ رخصت ہے، عزیمت نہیں ہے یعنی اجازت ہے کہ قصر کر سکتے ہیں۔اس کی پابندی عائد نہیں کی گی ہے لہٰذا اگر پوری نماز پڑھے تو بھی درست ہے لیکن جیسا کہ پہلے آچکا ہے حج میں صفا و مروہ کی سعی کا حکم بھی انہی الفاظ میں آیا ہے کہ: **فلا جناح علیہ ان یطوف بہما** "کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ان دونوں کا چکر لگائے" وہاں علمائے اہل سنت بھی سعی کو واجب سمجھتے ہیں تو ان الفاظ کی وجہ سے قصر صلوٰۃ کے وجوب کا انکار کیوں کیا جائے؟

یہ الفاظ تو اس کے اظہار کے لئے صرف ہوئے ہیں کہ اصل حکم قصر کا تخفیف اور سہولت بہم پہنچانے کے لئے نافذ کیا گیا ہے لیکن جب حکم ہو گیا تو اب پابندی اس کی لازم ہے اور اسی لئے ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی تعلیم یہی ہے کہ حالت سفر میں قصر واجب ہے اور نماز اگر پوری پڑھی جائے تو درست نہ ہوگی اور باوجود خالق کی طرف سے اس حکم کے پوری نماز پڑھنا خدا کے اس احسان کی ناقدری بھی ہے چنانچہ بعض علمائے اہل سنت بھی اس سے متفق ہیں۔[3]

شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے ترجمہ قرآن کے حاشیہ میں یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ یہ آیت حکم قصر کے بیان کے لئے آئی ہی نہیں ہے بلکہ نماز خوف کے بیان کے لئے ہے [4] خود انہوں نے اس مسلک کے اظہار میں ایسے الفاظ صرف کیے ہیں جن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان

---

[1]۔دربلا فگنند شمارا کافران (شاہ ولی اللہ)

[2]۔بان تردوھا من اربع الی اثنتین (جلالین)

[3]۔ پوری نہ پڑھے کہ اللہ کی بخشش سے بے پروائی ہوتی ہے اور سنت کا تقید سفر میں نہیں رہتا (موضح القرآن)

[4]۔مشہور آنست کہ این آیت در صلوٰۃ مسافر نازل شدہ است و خوف قید اتفاقی است و آنچہ نزدیک این بندہ رجحان یافتہ است آنست کہ این آیت در صلوٰۃ خوف نازل شدہ است و سفر قید اتفاقیست (فتح الرحمن)

کے منفرد تحقیقات میں سے ہے مگر تلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اس کے پہلے ایک جماعت علماء اختیار کر چکی ہے۔[1]

اس صورت میں سفر کا ذکر اس میں ضمناً ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بغیر جنگ سفر میں حکم قصر جو ہے، وہ سنت سے ثابت ہے، قرآن سے نہیں ہے۔ اس کے بعد اس "لا جناح" کے لفظ کا اس قصر سے تعلق ہی باقی نہیں رہتا۔ اب اگر سنت سے یہ ثابت ہے کہ سفر میں قصر ہی نماز پڑھنا چاہئے تو وہی معین ہے اور اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۣ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۠ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۰۲﴾

"اور جب آپ ان میں ہوں اور انہیں نماز پڑھانے لگیں تو ان میں سے ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو اور اپنے ہتھیار لئے رہیں، جب یہ نماز پڑھ چکیں[2] تو یہ آپ لوگوں کی پشت پناہی کے لئے چلے جائیں اور دوسرا گروہ ان کا جس نے نماز نہیں پڑھی ہے، آجائے اور آپ کے ساتھ نماز پڑھے اور یہ بھی اپنا سامان حفاظت اور ہتھیار لئے رہیں۔ کفار کی تو آرزو یہ ہے کہ تم لوگ اپنے ہتھیاروں اور سامانوں سے غافل ہو جاؤ تو وہ تم پر ایک دم ٹوٹ پڑیں اور اگر بارش سے اذیت ہو یا تم بیمار ہو تو تمہارا کوئی حرج نہیں ہے کہ تم اپنے ہتھیاروں کو رکھ دو۔ ہاں حفاظت کا خیال رکھو۔ یقیناً اللہ نے کافروں کے لئے ذلت آمیز عذاب مہیا کر رکھا ہے۔"

یہاں نماز خوف کی ترکیب بیان کی گئی ہے کہ فوج اسلام کے دو حصے ہو جائیں۔ ایک حصہ دشمن کے مقابلہ میں جنگ کرتا رہے اور ایک حصہ رسولؐ کے ساتھ نماز میں شریک ہو۔ اس طرح کہ ایک رکعت پیغمبر کے ساتھ بجماعت پڑھے۔ پھر رسولؐ بیٹھے رہیں اور یہ لوگ کھڑے ہو کر اپنی دوسری رکعت بطور خود جلدی جلدی پڑھ کر چلے جائیں دشمنوں کے مقابلہ میں۔ اب وہ لوگ آئیں اور رسولؐ اب کھڑے ہو کر ان کے ساتھ دوسری

---

[1]۔ قال قوم عنیٰ بہٰذہ الآیۃ قصر صلوٰۃ الخوف... و فیہا نزلت ذہب الیہ مجاہد و غیرہ (تبیان)

[2]۔ فرغوا عن سجودھم (مجمع البیان)

رکعت پڑھیں لیکن یہ ان لوگوں کی پہلی رکعت ہے لہٰذا رسولؐ دونوں سجدوں کے بعد پھر بیٹھ جائیں اور یہ لوگ سجدوں کے بعد کھڑے ہوکر اپنی دوسری رکعت جلدی سے پڑھ کر جب سجدوں سے فارغ ہوں تو اب رسولؐ ان کے ساتھ تشہد اور سلام پڑھ کر نماز تمام کریں۔

اس سے اسلام میں نماز جماعت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ صرف پوری فوج اسلام کو جماعت کی فضیلت سے بہرہ اندوز کرنے کے لئے امام جماعت کو جو اس وقت پیغمبر تھے کتنے طویل الذیل طریقہ پر نماز پڑھنے کی ہدایت ہوئی ہے۔

نماز خوف کے احکام کے بیان میں آخر کا فقرہ اس انداز میں ہے جیسے یہ سب احکام بیان کرتے کرتے ایک دفعہ یہ خیال آ گیا کہ یہ سب جھگڑے ان کم بخت کافروں کی وجہ سے ہیں تو یہ کہا گیا کہ ارے! جتنا چاہیں، یہ اس وقت تمہیں پریشان کرلیں۔ انجام میں تو ان کے لئے وہ عذاب سخت ہے کہ یہ بھی یاد ہی کریں گے۔

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿١٠٣﴾

''پھر جب نماز بجالے آؤ تو اللہ کو کھڑے بیٹھے اور کروٹ میں یاد کرتے رہو اور جب تمہیں اطمینان نصیب ہو تو نماز کو پورے طور پر ادا کرو۔ بلا شبہ نماز اہل ایمان پر ایک فریضہ ہے جو اوقات کے تعین کے ساتھ عائد کیا گیا ہے۔''

اب یہ نوافل وغیرہ کے حکم کا بیان ہے یعنی فریضہ تو اس طرح ادا ہوگیا۔ اب اس کے بعد نوافل ادا کرنا ہیں یا یوں ذکر الٰہی کرنا ہے تو وہ حالت جنگ میں اور رفتار کی حالت میں بلکہ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اور مطلق ذکر الٰہی اور دعا ہے تو یہ چیزیں لیٹنے کے عالم میں بھی ہوسکتی ہیں۔ ان سے کوئی وقت مستثنیٰ نہیں۔[1]

اب اس کے بعد ہے: فاذا اطماننتم ''اور جب تمہیں اطمینان نصیب ہو''۔ یہ اس پورے احکام خوف کے سلسلہ سے متعلق ہے جو اس کے پہلے دو آیتوں سے چل رہا تھا۔ یعنی وہ خوف کی حالت میں قصر کا حکم اور نماز خوف کی ترکیب وغیرہ سب ان اضطراری حالات سے متعلق ہے۔ اب جب تم مطمئن ہو تو پھر نماز کو اس کے پورے رکعات اور کیفیات کے ساتھ جن میں طمانیت اور سکون بھی داخل ہے ادا کرنا لازم ہے۔[2]

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١٠٤﴾

''اور اس جماعت سے مڈبھیڑ کے لئے نکلنے میں سستی نہ دکھاؤ۔ اگر تمہیں تکلیف پہونچتی ہو تو انہیں بھی ویسی ہی

---

[1]. اذا زال خوفكم من عدو كم وامنتم قائموا الصلوٰة بحدودها غير قاصر بها عن شئ من حدودها (تبیان)

[2]. ای فی طلب القوم (مجمع البیان)

تکلیفیں پہونچتی ہیں جیسی تمہیں ہوتی ہیں اور تمہیں اللہ کے یہاں امید وہ ہے جو انہیں نہیں ہے اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، ٹھیک ٹھیک کام کرنے والا۔‘‘

کفار سے مقابلہ میں مسلمانوں کو کبھی کبھی زحمتیں ضرور پیش ہوتی ہیں مگر ایسی زحمتیں تو کفار کو بھی بعض دفعہ پیش آتی ہیں اور اس کے ساتھ ان میں اور اس میں یہ فرق ہے کہ یہ جو صدمے اٹھائیں، ان پر انہیں اجر وثواب آخرت کی امید ہے جو ان تکالیف کو قابل برداشت ہی نہیں بلکہ خوشگوار بنانے کی ضامن ہے مگر کفار اس امید سے محروم ہیں تو مسلمانوں کو تو کبھی پست ہمت ہونا ہی نہ چاہئے۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰٮكَ اللّٰهُ‌ ؕ وَلَا تَكُنۡ لِّـلۡخَآئِنِيۡنَ خَصِيۡمًا ۙ‏ ﴿۱۰۵﴾ وَّاسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۚ‏ ﴿۱۰۶﴾

’’بلاشبہ ہم نے آپ پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری ہے تاکہ جو اللہ نے آپ پر نمایاں کر دیا ہے، اس کے مطابق آپ لوگوں میں فیصلہ کریں اور آپ بددیانتوں کی وکالت نہ کیجئے۔ [۱]

اور اللہ سے معافی کی سفارش کیجئے۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان‘‘۔

شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں:۔

’’یہ اول وآخر کئی آیت میں ذکر ہے ایک قصہ کا حضرت کے وقت۔ ایک انصاری کی زرہ آٹے میں دھری گم ہوئی۔ صبح کو تلاش ہوئی تو آٹے کا خط دیکھا ایک شخص کے گھر تک، اس کا نام طعمہ بن ابیر تھا [۲] وہاں جھاڑا لیا تو نہ پائی زرہ۔ خط آگے دیکھا ایک یہودی کے گھر تک، زید نام اور وہاں پائی۔ اس یہودی نے کہا کہ مجھ کو طعمہ نے سپرد کی۔ طعمہ نے کہا کہ میں بری ہوں، چور وہی ہے۔ طعمہ کی قوم نے مشورت کی کہ ہم حضرت کے پاس سب مل کر گواہی دیں گے کہ طعمہ بری ہے تو حضرت ہماری حمایت کریں گے اور یہودی چور ٹھہرے گا۔ صبح کو یہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں۔ حضرت کو خبردار کر دیا فی الحقیقت چور یہی تھا طعمہ۔‘‘ (موضح القرآن)

اب مذکورہ عبارت میں طعمہ کا نام اور اس کی قوم کا ذکر جس طرح ہے، شاید اس سے صحیح نوعیت واقعہ کی محسوس نہ ہو۔

آیت قرآن کے مضمون اور صورت واقعہ سے صاف ہے کہ یہ طعمہ یا ابوطعمہ اور اس کی قوم والے سب مسلم جماعت کے افراد تھے جو ایک یہودی کو پھانسنا چاہتے تھے اور اس ’’مسلم‘‘ کے لفظ سے بھی بات شاید پوری ظاہر نہ ہو تو سمجھ لیجئے کہ یہ دور رسولؐ کے مسلم تھے یعنی جمہوری اصطلاح میں سب صحابہ کرام کی معزز جماعت کے افراد اور کردار یہ کہ واہ ہی واہ۔

چوری بھی اور پھر ایک بے گناہ کو پھنسانے کی کوشش اور اب یہ پہلو خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے کہ وہ بے گناہ غیر مسلم تھا اور یہ صحابہ اپنے خیال میں شاید وقار اسلامی کا تحفظ کر رہے تھے کہ آئی گئی سب ایک نامسلم اور وہ بھی یہودی پر جائے جو بنص قرآن......

---

[۱]۔ مباش خصومت کنندہ برائے حمایت خیانت کنندگان (شاہ ولی اللہ) مت ہو خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑنے والا (شاہ رفیع الدین)

[۲]۔ تبیان شیخ طوسی سے ثابت ہوتا ہے کہ بشر، بشیر اور مشیر تینوں فرزندان اُبیرق تھے اور بشر کی کنیت ابوطعمہ تھی یہی تینوں اس چوری کے مرتکب تھے۔ اس طرح ’’طعمہ بن ابیر‘‘ کے بجائے ’’ابوطعمہ ابن ابیرق‘‘ کہنا صحیح ہوگا۔

خدا اور رسولؐ کے سب سے بڑے دشمن ہیں مگر یہ خالق کریم اور شارع اسلام کی طرف سے حقوق انسانی اور عدل و مساوات کے ہمہ گیر مفاد کا تحفظ تھا کہ باوجودیکہ ظاہری قرائن یہودی کو مجرم قرار دے رہے تھے اور مسلمان اور معزز صحابی بچ رہا تھا مگر خالق نے اس موقع پر اپنے خاص ذریعہ سے رسولؐ کو صورت حال پر مطلع کیا اور غیر مسلم کو صاف طور پر بری کر دیا۔

یہ جمہوری مسلمانوں کے سوچنے کی بات ہے کہ اگر خالق کو صحابہ کے ناموس کے تحفظ کے لئے کف لسان کرانا منظور ہوتا تو وہ ان کے بارے میں حسن ظن کے پردہ کو چاک کرنے کی ایک ایسے موقع پر کیوں ضرورت محسوس فرماتا۔ پھر اگر ایسے مخفی کردار کو ان کے نمایاں کرنا خالق نے ضروری سمجھا تو جو صفحہ تاریخ پر نمایاں نقوش کردار کے ثبت ہیں، ان کے تذکرہ کو وہ کیوں پسند نہ فرمائے گا اور ان سے چشم پوشی کیوں ضروری قرار دے گا؟

اس ارشاد کے بعد کہ آپ بد دیانتوں کی وکالت نہ کیجئے گا، یہ کہا گیا ہے کہ: **واستغفر الله** اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان کی طرف سے صفائی نہ پیش کیجئے۔ ہاں چونکہ مسلمان ہیں اور آپ کا کام ہی دعائے خیر کرنا ہے، اس لئے بارگاہ الٰہی میں ان کی معافی کی درخواست آپ کریں، یہ اور بات ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس استغفار کا تعلق خود رسول خداؐ کے اپنے کسی عمل سے نہیں ہے اور میں یہاں ان مفسرین سے متفق نہیں ہوں جو اس استغفار کا تعلق خود رسولؐ کے کسی عمل یا ارادہ سے قرار دیتے ہیں۔ [1]

نہ اس شان نزول سے متفق ہوں جسے مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے اپنے حاشیہ میں درج کر دیا ہے جس سے خود رسولؐ پر یہ الزام آتا ہے کہ آپ بلاوجہ دوسروں کے کہنے میں آکر ایک بے گناہ پر خفا ہوئے۔

ہمارے اکابرین میں جناب شیخ الطائفہ طاب ثراہ نے بھی اس شان نزول کو ناقابل تسلیم اور شان رسولؐ کے منافی قرار دیا ہے۔ [2]

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۝۱۰۷

''اور ان کی طرف سے جو خود اپنے ساتھ غداری کرتے ہیں، آپ بحث و مباحثہ نہ کیجئے، یقیناً اللہ اسے جو گنہگار، غدار ہے دوست نہیں رکھتا۔''

اصطلاح قرآنی میں ہر گناہ اپنے ساتھ غداری ہے، اس لئے کہ خود اپنے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا تو یہ ہے کہ اپنے کو نجات کا حق دار بنایا جائے۔ اب اگر یہ اپنے کو عذاب کا مستحق بناتا ہے تو یہ خود اپنی حق تلفی اور اپنے ساتھ ستم رانی نہیں تو اور کیا ہے۔ [3]

پھر یہ مسلمان جن نے سرقہ تو خود کیا اور تہمت لگاتا ہے ایک غیر مسلم پر اپنی جماعت کے ساتھ بھی غدار ہے، اس لحاظ سے کہ وہ دوسروں کی نگاہ میں اپنی پوری جماعت کے کردار کو داغدار بنا رہا ہے۔

---

[1]۔ امرہ بان یستغفر اللہ من مخاصمۃ عن الخائن (مجمع البیان) واستغفر اللہ عما ھمت بہ (جلالین)

[2]۔ المراد بذلك امۃ علی انا لا نعلم ان ماروی فی ھذا الباب وقع من النبی لان طریقۃ الاحاد (تبیان)

[3]۔ یخونونہا بالمعاصی (جلالین) لان ضرر خیانتہم راجع الیہم لاحق بہم (مجمع البیان)

بلکہ اس نے چونکہ یہ کوشش کی کہ پیغمبر اسلام سے ایک بے گناہ کو جو غیر مسلم ہے، سزا دلوا دے اور ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو اس غیر مسلم کی نگاہ میں رسولؐ معاذ اللہ ظالم ہی قرار پاتے تو یہ درحقیقت اس مجسم خلق عظیم اور رحمۃ للعالمین پر بھی ایک ظلم ناروا تھا کہ ان کے دامن کو اپنی خودغرضی کی بدولت داغدار بنانے کی کوشش کی گئی۔

يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾

''وہ آدمیوں سے تو چھپ لیں گے، اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ وہ تو ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ راتوں کو اس کی ناپسند گفتگو کرتے ہوتے ہیں اور اللہ اس پر کہ جو یہ کرتے رہتے ہیں حاوی ہے''۔

ابوطعمہ اور اس کی قوم والوں نے یہودی پر الزام لگانے کی سازش کے لئے جو رائے مشورہ کیا تھا، اس پر سرزنش ہو رہی ہے اور وہ ہر اس فرد اور جماعت کے یاد رکھنے کی چیز ہے جو کسی جرم کو پوشیدہ طور پر کرنے کی کوشش کرے۔ وہ پوشیدہ کرنے کی جتنی بھی کوشش کرے، لوگوں سے چھپنے کا امکان ہے مگر اصل حاکم جس کا وہ درحقیقت مجرم ہے، بہرحال اسے دیکھ رہا ہے اور حساب لینے والا اور سزا دینے والا وہی ہے۔

یہ خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا اسلامی عقیدہ ہے جو آدمیوں کے پیش نظر رہے تو ہر شعبہ حیات میں جرائم کا سدباب ہو جائے۔

یبیتون کا ترجمہ ہم نے جو کیا ہے کہ ''راتوں کو اس کی ناپسند گفتگوئیں کرتے ہوتے ہیں''۔ یہ اس لفظ کے حقیقی معنی سے کہ اس میں بیات یعنی شب بسر کرنا داخل ہے، مطابقت رکھتا ہے [۱] لیکن بعض مفسرین نے اسے مجاز پر محمول کیا ہے اور اس کے معنی ذہن میں پوشیدہ رکھنے کے لئے ہیں [۲] مگر شان نزول کے واقعہ کو دیکھتے ہوئے اس مجاز کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾

''اچھا! اس وقت تم لوگ ان کی طرف سے اس دنیاوی زندگی میں بحث و مباحثہ کر بھی لو تو قیامت کے دن اللہ سے ان کی جانب سے بحث کون کرے گا یا کون ان کا نمائندہ ہو سکے گا''۔

قبل کی آیتوں میں خطاب بصیغہ مفرد خاص رسولؐ سے ہونے کے بعد کہ ''ان کی طرف سے بحث مباحثہ نہ کیجئے'' ''ان کی وکالت نہ کیجئے'' فوراً اس کے بعد خطاب کو بصیغہ جمع وارد کرنا کہ ''تم لوگ یہاں ان کی طرف لڑ لو، قیامت میں ان کی طرف سے کون لڑے گا'' صاف اس کا قرینہ ہے کہ پہلا

---

[۱] ۔آں گاہ کہ بشب مشورت می کنند (شاہ ولی اللہ) جس وقت کرتے ہیں رات (رفیع الدین) ای یدبرون باللیل قولا لا یرضاہ اللہ (مجمع البیان)

[۲] ۔یبیتون یضمرون (جلالین)

خطاب بھی اگر چہ بظاہر خود رسولؐ سے تھا مگر اس سے مقصود دوسرے لوگوں ہی کی تنبیہ تھی جو ان مجرموں کی طرف سے صفائی پیش کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

خالق کا ارشاد ہے کہ یہ تو دنیا ہے۔ یہاں تو ہوسکتا ہے کہ گنہگار کی بلا بے گناہ کے سر چلی جائے مگر آخرت میں یہ نہیں ہوسکتا۔ وہاں انہیں عذاب سے تم کیوں کر بچا سکتے ہو؟!

بعض مفسرین نے جو شان نزول کچھ اس طرح درج کی ہے کہ خود حضرت رسولؐ کو بھی ان تنبیہات قرآنی کی لپیٹ میں لے لیا ہے، یہ ہمارے نزدیک شان رسولؐ کے خلاف بھی ہے اور خود قرآنی الفاظ کے مطابق بھی نہیں ہے جب کہ اس کے بعد قرآن مجید میں آیا چاہتا ہے کہ:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾۔ (النساء۔۱۱۳)

اور اگر اللہ کا فضل و کرم آپ کے شامل حال نہ ہوتا تو ان میں کا ایک گروہ یہ چاہتا تھا کہ آپ کو گمراہ کر دے حالانکہ (اب صورت یہ ہے کہ) بس وہ خود اپنے کو گمراہ کرتے ہیں اور آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اللہ نے آپ پر اپنا قانون اور حکیمانہ راز، یہ سب اتار دیا ہے اور آپ کو وہ علم دیا ہے جو آپ کو از خود حاصل نہ تھا اور اللہ کا فضل و کرم آپ پر بہت بڑا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ رسولؐ کو اپنی باتوں میں لانا چاہتے تھے مگر نہیں لا سکے اور قرآن کہہ رہا ہے کہ نہیں لا سکتے تھے۔ آپ کی شان اس سے بلند و ارفع ہے کہ آپ ان کی باتوں میں آتے۔ پھر یہ کہنا کتنا غلط ہے کہ انہوں نے حضرت سے بھی معاذ اللہ کچھ نہ کچھ اپنے موافق کہلوا ہی لیا۔[1] استغفر اللہ

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾

''اور جو برائی کرے یا خود اپنے اوپر ظلم کرے، پھر اللہ سے بخشش کا طالب ہو تو وہ اللہ کو بڑا بخشنے والا پائے گا، مہربان۔''

یہاں جو دو الفاظ صرف کئے گئے ہیں، ان میں بظاہر پہلے کا تعلق دوسرے افراد کے ساتھ ہے یعنی دوسرے پر برائی کرے اور دوسرا لفظ (اپنے اوپر ظلم کرے) یہ انفرادی گناہ ہے۔

ہمارے نزدیک رجحان اسی کو ہے۔ ورنہ مفسرین کے بیان میں ان دونوں لفظوں کے فرق میں کافی اضطراب ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں:۔

''گناہ فرمایا کبیرہ کو اور اپنا برا فرمایا صغیرہ کو''۔

یہ خود الفاظ کے تحت اللفظی معنی سے تو ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں اگر حدیث سے ثابت ہو جائے کہ اس کی تفسیر یہ ہے تو درست سمجھی جا سکتی

---

[1] ۔اسید بن عروہ، بنو یرق کی طرف سے وکیل بن کر قتادہ کے خلاف آپ کے پاس بحث کرنے کو آیا تھا اور آخر اس نے حضرت سے قتادہ پر کچھ خفگی کرا ہی دی (فرمان علی صاحب)

ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے ان دونوں لفظوں کا فرق ظاہر کرنے کے لئے کئی قول نقل کیے ہیں[1] مگر کسی کا بھی ثبوت حدیث سے نہیں ملتا۔

اس کے بجائے اللغۃ کے تحت میں سوء کے معنی جو لکھے ہیں:۔

القبیح الذی یواجہ بہ صاحبہ... ورجل سوء من شانہ ان یواجہ الناس بالمکارہ :۔

وہ برائی جو کسی کے منہ درمنہ کی جائے......اور مردسوء وہ شخص ہے جس کا شیوہ یہ ہے کہ لوگوں کے منہ پر انہیں تکلیفیں پہنچاتا ہے۔

یہ ہمارے خیال کی تائید کرتے ہیں۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١١١﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْۗـــــَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْۗـــــًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿١١٢﴾

''اور جو کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ بس اپنے ہی نقصان کا باعث ہوتا ہے اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، ٹھیک ٹھیک کام کرنے والا اور جو کوئی غلطی یا گناہ کرے، پھر اسے کسی بے قصور کے سرمنڈھ دے، اس نے افتراء اور کھلے ہوئے گناہ کا بوجھ اٹھایا''[2]

یہ سب تہدیدی وتنبیہی تازیانے اسی جماعت کے کردار پر ہیں جس نے ایک مسلمان کی طرف سے صفائی پیش کرنے کے لئے ایک یہودی پر تہمت لگائی تھی جس کا واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

خطیئۃ جس کا ترجمہ ہم نے ''غلطی'' کے ساتھ کیا ہے، یہ غیرارادی طور پر ہوسکتی ہے اور اثم جس کا ترجمہ کیا گیا ہے ''گناہ'' یہ جان بوجھ کر غلط کام کا ارتکاب ہے۔[3]

اب وہ غلطی بھی جو غیرارادی طور پر ہو، جب اسے کسی بے گناہ کے سرمنڈھنے کی کوشش کی تو وہ بجائے خود تو صرف غلطی تھی لیکن اب وہ بھی ایک جانا بوجھا غلط کام ہوگیا لہٰذا اب دونوں کا حکم یکساں ہوگیا کہ وہ بہتان بھی ہے اور اثم مبین یعنی کھلا ہوا گناہ بھی ہے۔

یہ دو الفاظ غالباً حق الناس اور حق اللہ کے لحاظ سے ہیں یعنی باعتبار اس بے گناہ آدمی کے وہ بہتان ہے اور خالق کی معصیت ہونے کے لحاظ سے ''کھلا ہوا گناہ'' ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا

---

[1] ۔سوء ای معصیۃ وامراً قبیحاً اویظلم نفسہ بارتکاب جریمۃ وقیل یعمل سوءاً بأن یسرق الدرع اویظلم نفسہ بأن یرمی بہا بریئاً وقیل المراد بالسوء الشرک وبالظلم مادون الشرک (مجمع البیان)

[2] ۔بر خود برداشت افتراء و گناہ ظاہر را (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔الخطیئۃ قد یکون عمداً وغیر عمد والاثم لا یکون الا عن عمد (تبیان)

يُضِلُّوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَضُرُّوۡنَكَ مِنۡ شَىۡءٍ ‌ؕ وَاَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡـكِتٰبَ
وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ‌ ؕ وَكَانَ فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ عَظِيۡمًا ﴿۱۱۳﴾

''اور اگر اللہ کا فضل وکرم آپ کے شامل حال نہ ہوتا اور اس کی مہربانی تو ان میں کا ایک گروہ یہ چاہتا کہ وہ آپ کو گمراہ کردے۔ حالانکہ (اب صورت یہ ہے کہ) وہ خود اپنے ہی کو گمراہ کرتے ہیں اور آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اللہ نے آپ پر اپنے قانون کے احکام اور حکیمانہ راز اتار دیئے ہیں اور آپ کو وہ علم دیا ہے جو آپ کو خود حاصل نہ ہوتا اور اللہ کا فضل وکرم آپ پر بہت بڑا ہے۔''

اس مسلمان کی صفائی پیش کرنے میں قسمیں کھا کھا کر اور غلط گواہیاں دے دے کر چاہتے تھے کہ رسولؐ اس یہودی کو مجرم سمجھ لیں اور اسی کو مستوجب سزا قرار دیں۔ اس طرح ایک غیر قوم کی نظر میں مسلمانوں کے کردار کے ساتھ خود رسولؐ کے عدل و انصاف کا دامن بھی داغدار ہوجائے۔

اللہ نے غیر معمولی طریقہ پر رسولؐ کو حقیقت حال سے اطلاع دے کر آپ کے دامن کو اس دھبے سے صاف رکھا اور ان دوست نما دشمنوں کا منصوبہ پورا نہ ہوسکا۔

لَا خَيۡرَ فِىۡ كَثِيۡرٍ مِّنۡ نَّجۡوٰٮهُمۡ اِلَّا مَنۡ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوۡ مَعۡرُوۡفٍ اَوۡ اِصۡلَاحٍۢ بَيۡنَ
النَّاسِ‌ ؕ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰ لِكَ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ فَسَوۡفَ نُـؤۡتِيۡهِ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۱۱۴﴾

''زیادہ تر ان کی سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ سوا اس کے جو کسی خیرات یا نیکی یا لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانے کی بات چیت کرے اور جو ایسا کرے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اسے ہم بڑا ثواب عطا کریں گے۔''

سازشیں اور منصوبے زیادہ تر خفیہ سرگوشیوں سے ہی بنتے ہیں چنانچہ یہ ایک مسلمان کو بچا کر یہودی کے پھنسانے کی سازش بھی اسی طرح ہوئی تھی، اس لئے سرگوشی کی مذمت کی گئی اور اس سے استثناء کردیا گیا ان صورتوں کا جب کسی نیک کام کے لئے منصوبہ بنایا جائے اور مصلحت اسی میں ہو کہ تکمیل کے پہلے اس کی خبر پھوٹنے نہ پائے۔ اس صورت میں اتنا ہی نہیں کہ کوئی ممانعت نہیں ہے بلکہ یہ اجر وثواب کا باعث ہوگا۔

وَمَنۡ يُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَـهُ الۡهُدٰى وَ يَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيۡلِ
الۡمُؤۡمِنِيۡنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ‌ ؕ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا ﴿۱۱۵﴾

''اور جو صحیح راستہ نمایاں ہو جانے کے بعد پیغمبرؐ سے اختلاف کرے[1] اور ایمان والوں کے راستے کے خلاف رستہ چلے، اسے جدھر وہ گیا ہے، اسی طرف ہم جانے دیں گے اور اسے دوزخ کی آگ کا مزہ چکھائیں گے اور وہ بہت بری بازگشت ہے۔''

شروع کے پہلے اور دوسرے دونوں فقروں کا حرف عطف کے ساتھ وصل دیکھئے تو صاف سمجھ میں آئے گا کہ پیغمبرؐ سے اختلاف کرنا خود ایمان والوں کے راستے کے خلاف راستہ چلنا ہے اب اگر کسی دور کے بعض یا کل مسلمان پیغمبرؐ کی راہ سے الگ اپنی راہ بنائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ نمائشی مسلمان حقیقی ایمان کے جوہر سے خالی ہیں اور ایسا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں جو ایمان والوں کا راستہ نہیں ہے۔ نہ یہ کہ ان مسلمانوں کا اس راستے پر چلنا اس کی ضمانت ہے کہ یہی راہ ایمان ہے۔

اتباع رسولؐ راہ اہل ایمان ہے نہ کہ اجماع امت

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ رسولؐ کا اتباع معیار راہ ایمان ہے۔ کچھ مسلمانوں کا کسی راستے پر چلنا معیار نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایمان کا تقاضا خدا و رسولؐ کی پیروی اور دین کی پابندی ہے[2] جب ایسا نہ ہو تو چلنے والے جو ہر دین سے معرا ہو سکتے ہیں۔ دین کا راستہ مشکوک و مشتبہ نہیں ہوسکتا۔

مگر تعجب ہے کہ اہل سنت کے اکثر مفسرین و متکلمین اس آیت پر پہونچ کر پہلے جز کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور دوسرے جز کو سامنے رکھ کر اسے جمہور امت کے اجماع یا شوریٰ کی حقانیت پر مقام استدلال میں پیش کرتے ہیں چنانچہ شاہ عبد القادر صاحب نے بھی اس طرح استدلال کر ڈالا ہے کہ:-

''پس جس بات پر امت کا اجماع ہو، وہی اللہ کی مرضی ہے اور منکر ہو، سو وہ دوزخی ہے۔'' (موضح القرآن)

یہ استدلال آیت کے پہلے جز کو سامنے رکھتے ہوئے بالکل پادر ہوا ثابت ہوتا ہے۔ پھر یہ تو اس وقت ہے جب اس آیت کو تنہا دیکھا جائے اور اگر یہ اسی واقعہ کے سلسلے کی ہے جس کے متعلقہ آیات اس کے پہلے برابر آتے رہے ہیں جیسا کہ مفسرین کا خیال ہے اور امام باقر علیہ السلام کی روایت بھی اس کے مطابق ہے[3] تو حقیقت اور زیادہ نمایاں محسوس ہوگی، اس لئے کہ یہاں تو ہوا یہی تھا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت نے خلاف حق اتفاق کرلیا کہ اس مسلمان کو جو واقعی مجرم ہے چھڑوا دیا جائے اور اس یہودی کو جو بے قصور ہے پھنسا دیا جائے۔

اگر مسلمانوں کے ہر اجتماعی فیصلہ پر خالق کی مہر تصدیق ثبت ہوتی تو چاہئے یہ تھا کہ یہی راستہ حق ہوتا مگر خالق نے سخت الفاظ میں اس منصوبہ پر سرزنش کی اور اسی کو کہا جا رہا ہے یہ مومنین کا راستہ نہیں ہے۔ ایسا راستہ اختیار کرنا دوزخ کی طرف لے جانے والا ہے۔ اب تو حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس آیت کو کسی ایسے اجماع یا شوریٰ کے لئے جو نص رسولؐ کے خلاف ہو، بطلان کی دلیل سمجھا جائے۔ نہ یہ کہ اس کی حقانیت پر اس آیت سے استدلال کیا جائے۔

---

[1] یشاقق یخالف (جلالین) مخالف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کند (شاہ ولی اللہ) جو کوئی برخلاف کرے رسولؐ کے (رفیع الدین)

[2] سبیل المومنین ای طریقھم الذی ھم علیہ من الذین (جلالین) ای طریقھم الذی ھو دینھم (مجمع البیان)

[3] نزلت ھٰذہ الآیۃ فی الخائبین الذین ذکرھم اللہ وھو قول مجاھد و قتادۃ و اکثر المفسرین و ھو المروی عن ابی جعفرؑ (تبیان)

نولہ ماتولی کے لفظی معنی ایک یہ ہیں کہ ''ہم اسے موڑ دیں گے جدھر وہ مڑے''، مگر جب ادھر وہ خود مڑ ہی رہا ہے تو پھر موڑنا تحصیل حاصل ہوگا۔ اس لئے یہ معنی جس کے نتیجہ میں جبر کا تصور ذہن میں آتا ہے، درست نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ہم نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ ''جدھر وہ گیا ہے، اس طرف ہم جانے دیں گے''[1] یعنی ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ ہم اسے روک دیں اور زبردستی ٹھیک راستے پر قائم رکھیں۔

اس سے ید اللہ علی الجماعۃ اور لا یجمع اللہ امتی علی الضلالۃ کے اس مفہوم کی نفی ہوجاتی ہے کہ اس امت کے لئے یہ اللہ کی خاص ضمانت ہے کہ وہ اس کی اکثریت کو گمراہی پر مجتمع نہیں ہونے دے گا۔

پھر اس کے تحت میں یہ بھی ہے کہ مخالفت رسولؐ کے اس منصوبہ اور اتباع غیر سبیل المومنین کے ذریعہ سے اگر وہ کوئی سازشی اقتدار یا ملک حاصل کر رہے ہیں تو اللہ کے ذمہ یہ بھی نہیں ہے کہ وہ اس منصوبہ کو ناکام بنائے۔

نولہ ماتولی یعنی دنیا میں تو وہ جو کرنا چاہیں کرلیں گے ہم اس میں سدراہ نہ ہوں گے بے شک آخرت میں انہیں عذاب کا مزہ چکھائیں گے اور وہ انجام بہت برا ہوگا۔

نولہ ماتولی کے ایک دوسرے معنی یہ قرار دیئے گئے ہیں کہ ہم اسے اس والی و مددگار پر چھوڑ دیں گے جس سے اس نے تولا کی ہے یعنی جسے اس نے اپنا مددگار سمجھا ہے۔[2]

مطلب یہ ہے کہ ہم اس کی حمایت و تائید سے ہاتھ اٹھالیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ جسے اس نے اپنا والی قرار دیا ہوگا، وہ خود عاجز و قاصر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کا کوئی والی و مددگار نہیں ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَن يَشَآءُ ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيدًا ﴿١١٦﴾

''بے شک اللہ اسے نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کم جو بھی ہو، اسے جس کے لئے چاہتا ہے، بخش دیتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ شرک اختیار کرے، وہ راہ راست سے بہت دور جا پڑا۔[3]

اس آیت کی رو سے شرک وہ گناہ قرار پاتا ہے جو نا قابل مغفرت ہے۔ باقی ہر گناہ کے لئے امکان ہے مگر حتمی وعدہ نہیں ہے بلکہ لمن یشآء کی قید کے ساتھ محدود ہے۔ اس طرح ''امید و بیم'' دونوں کی آمیزش ہوجاتی ہے جو ایمان کا خاص جوہر ہے۔

متفق علیہ اسلامی تصور یہ ہے کہ غیر مسلم کے لئے امکان مغفرت نہیں ہے مگر غیر مسلم کا لفظ بظاہر عام ہے۔ قرآن مجید میں ''شرک کا ذکر ہے''۔ یہ خاص ہے۔

---

[1] نجعلہ والیا لما تولاہ من الضلال بان نخلی بینہ و بینہ (جلالین)

[2] معناہ نجعل ناصرہ ما استنصر ھو استعان بہ (تبیان)

[3] زال عن قصد السبیل ذھابا بعید (تبیان) ضلالا بعیدا عن الحق (جلالین)

دین الٰہی سے انحراف بطور انکار قابل بخشش نہیں

جناب شیخ الطائفہ نے اس پر کافی میں بحث فرمائی ہے اور ثابت کیا ہے کہ جو بھی اسلام کے علاوہ کسی مذہب کا پیرو ہے، وہ ضرور کسی نہ کسی قسم کے شرک میں مبتلا ہے لہٰذا یہ حکم ان کے لئے ثابت ہوگا (تبیان)

شاہ عبدالقادر نے لکھا ہے:۔

''اوپر سے ذکر تھا منافقوں کا جو پیغمبرؐ کے حکم پر راضی نہ ہوئے اور جدا راہ چلے۔ پھر یہ آیت فرمائی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوا دین اسلام کے اور دین رکھے اور اس پر چلے پس جو دین ہے سوا اسلام کے شرک ہے اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں'' (موضح القرآن)

اس سے اول تو یہ سمجھ لیجئے کہ شاہ صاحب اس کے قبل والے بہت سی آیات سے لے کر یہاں تک سب آیتوں کو اسی دفعہ سے متعلق سمجھتے ہیں جس کا ذکر ہو چکا تو اب جو ہم نے گزشتہ آیت کے ذیل میں کہا تھا، اسے مزید قوت ہوگئی کہ سبیل المومنین یعنی اہل ایمان کا راستہ جس پر چلنے کی اللہ دعوت دے رہا ہے، مسلمانوں کا اختیار کردہ راستہ نہیں ہے بلکہ رسولؐ کا جو فیصلہ ہو، اسے تسلیم کرنا، یہی اہل ایمان کا راستہ ہے جس کی خداوند عالم نے دعوت دی تھی اور اب اسی سے انحراف کو وہ شرک کے ایسے شدید لفظ سے یاد فرمار ہا ہے۔

پھر جب کہ شرک سے مراد رسولؐ کا فیصلہ ہوگیا اور اس لئے کفر کی ہر قسم شرک بن گئی اور مغفرت سے ناامیدی کیلئے کافی ہوگئی تو اب اگر ہم کہتے ہیں کہ مغفرت ''فروع'' گناہوں میں ہوتی ہے یعنی جہاں کسی حکم خدا ورسولؐ کا انکار نہ ہو، بس صرف عملی کوتاہی ہو لیکن اگر انحراف اعتقادی قسم کا ہے یعنی کسی حکم خدا اور رسولؐ سے انکار ہوگیا تو مغفرت وشفاعت وغیرہ کسی چیز کی گنجائش نہیں ہے اور اس لئے اگر کسی طبقہ نے اس نظام حکمرانی کو قبول نہ کیا جسے خدا ورسولؐ نے مقرر کیا تھا اور اس ولی کی ولایت کو تسلیم نہ کیا جسے ادھر سے مولا بنایا گیا تھا تو ایمان اور اس کے ساتھ ساتھ نجات کا امکان ختم ہوگیا تو اسے قرآنی آیت کے مضمون کے خلاف نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ وہ سیاق کلام کے لحاظ سے مضمون آیت کے بالکل مطابق ہے۔

اِنۡ يَّدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰـثًا‌ ۚ وَاِنۡ يَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَيۡـطٰنًا مَّرِيۡدًا ۙ‏ ﴿117﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ‌ ۘ
وَقَالَ لَاَ تَّخِذَنَّ مِنۡ عِبَادِكَ نَصِيۡبًا مَّفۡرُوۡضًا ۙ‏ ﴿118﴾ وَّلَاُضِلَّـنَّهُمۡ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمۡ
وَلَاٰمُرَنَّهُمۡ فَلَيُبَـتِّكُنَّ اٰذَانَ الۡاَنۡعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمۡ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰهِ‌ ؕ وَمَنۡ
يَّتَّخِذِ الشَّيۡـطٰنَ وَلِيًّا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَقَدۡ خَسِرَ خُسۡرَانًا مُّبِيۡنًا ؕ‏ ﴿119﴾ يَعِدُهُمۡ
وَيُمَنِّيۡهِمۡ‌ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيۡـطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا‏ ﴿120﴾ اُولٰۤـئِكَ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَـنَّمُ وَلَا
يَجِدُوۡنَ عَنۡهَا مَحِيۡصًا‏ ﴿121﴾

''وہ اسے چھوڑ کر نہیں پکارتے مگر کچھ زنانے قسم کے نام اور نہیں پکارتے مگر اس سرکش شیطان کو جس پر اللہ نے لعنت کی تھی اور جس نے کہا تھا کہ میں تیرے بندوں میں اپنا مقررہ حصہ ضرور رکھوں گا اور ضرور انہیں گمراہ کروں گا اور انہیں سبز باغ دکھاؤں گا اور ضرور انہیں مامور کروں گا تو وہ چوپایوں کے کانوں کو شگافتہ کریں گے اور انہیں کہوں گا تو وہ اللہ کی طرف کی پیدائشی صورت کو بدلیں گے اور جو شیطان کو اپنا سرپرست بنائے گا اللہ کو چھوڑ کے، وہ کھلا ہوا گھاٹا اٹھائے گا۔ وہ انہیں طرح طرح کی امیدیں دلاتا ہے اور سبز باغ دکھاتا ہے اور نہیں انہیں امیدیں دلاتا ہے شیطان مگر دھوکے کے فریب کے طور پر۔ یہ وہ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ اس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہ پائیں گے۔''

مشرکین نے اپنے بتوں کے نام لڑکیوں کے سے رکھ چھوڑے تھے جیسے لات اور عزیٰ اور مناۃ وغیرہ اسی کو کہا گیا ہے کہ وہ خدا کو چھوڑ کر کچھ لڑکیوں کو پکارتے ہیں۔ [1]

''پکارتے ہیں'' کا مطلب ہے، معبود قرار دے کر ان کی دہائی دینا۔ [2]

معصوم ہستیوں کی موجودگی کا ثبوت

اور پھر وہ فرشتوں کو بھی اللہ کی لڑکیاں ہی کہتے تھے [3] اس کے بعد جو کہا گیا ہے کہ ''اور نہیں پکارتے مگر اس سرکش شیطان کو''۔ یہ پکارنا شعوری طور پر نہیں ہے کہ وہ قصداً اس کا کرتے ہیں بلکہ یہ ان کے پہلے عمل کا لازمہ ہے یعنی وہ بتوں کی پوجا جو کرتے ہیں تو اس سے درحقیقت اس شیطان کی پوجا ہوتی ہے [4] جس نے خلق خدا کے گمراہ کرنے کا پہلے ہی بیڑا اٹھالیا تھا اور کہا تھا کہ ''میں تیرے بندوں میں ایک مقررہ حصہ ضرور رکھوں گا''...... اس کا تو نصب العین یہی ہوسکتا تھا، کہ وہ سب کو گمراہ کردے مگر یہ پہلے سے معلوم تھا کہ اللہ کے کچھ ایسے پختہ، راسخ عزم والے بندے ہیں جن پر اس کی کوشش اثرانداز نہیں ہوسکتی۔ اس لئے پہلے ہی دن اس طبقہ کا استثناء ہوگیا تھا۔ اس نے کہا تھا: اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ اور خالق نے ارشاد کیا تھا:-

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ﴿الإسراء: ٦٥﴾

میرے خاص بندوں پر تیرا کچھ دسترس نہیں ہوگا۔

اور چونکہ اصطلاح قرآنی سے جیسا کہ بکثرت آیات سے ثابت ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر قسم کی غلطی، یہاں تک کہ سہو ونسیان بھی کار شیطان ہے، اس لئے اس نفی مطلق سے کہ کچھ بندے ایسے ہونگے جن پر شیطان کا کچھ دسترس نہ ہوگا، یہ ثابت ہوتا ہے کہ کچھ ہستیاں ایسی معصوم ضرور ہیں کہ جن میں سہو ونسیان کا بھی گزر نہیں ہے۔

---

[1] ۔اصناماً مؤنثة کاتلات والعزّیٰ ومناۃ (جلالین) بتان را کہ بنام دختران مسمیٰ کردہ اند (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔یدعون یعبد المشرکون (جلالین)

[3] ۔قالت قریش ان الملئکة هم بنات اللہ (تفسیر علی بن ابراهیم)

[4] ۔یعبدون بعبادتها (جلالین)

یہ جماعت چونکہ پہلے سے علم باری میں تو الگ تھی ہی۔ شیطان کو بھی معلوم تھا کہ وہ اس حلقہ سے لازماً الگ رہے گی، اس لئے یہاں شیطان کے منصوبہ کا جو خلاصہ بتایا گیا ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ میں اپنا کچھ مقررہ حصہ رکھوں گا۔

یہ مقررہ حصہ کن لوگوں کا ہے؟ جنہیں خالق نے فرما دیا تھا کہ:۔ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ (حجر ۔ ۴۲) یعنی جو گمراہ لوگ تیری پیروی کریں گے، وہ بس تیرے قبضہ میں آئیں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ شیطان کے قبضہ میں جانا ان کا فعل ارادی ہے، کوئی مجبوری کی بات نہیں ہے تاکہ شیطان پر ذمہ داری ڈال کر یہ اس کی سزا سے الگ ہونے کا تصور کر سکیں۔

اب شیطان نے جس قسم کی گمراہیاں دنیا میں پھیلائیں، ان کا ذکر شیطان ہی کی زبانی کیا گیا ہے۔ ان میں پہلی بات یہ ہے کہ لاضلنهم یعنی میں اعتقادی طور پر گمراہ کروں گا۔ اس کا مظہر تمام فرق باطلہ ہیں جو خیالات و اعتقادات کی گونا گونی سے مختلف راستوں پر لگ گئے ہیں۔

دوسرے: لامنينهم ''انہیں سبز باغ دکھاؤں گا'' یہ طرح طرح کے غلط توقعات ہیں جن کے ماتحت انسان فرائض الٰہیہ سے غافل رہتا ہے اور قسم قسم کی غلط کاریوں میں مبتلا رہتا ہے۔ اسی کے تحت میں وہ طولِ اَمَل ہے جس کی مذمت احادیث میں بکثرت وارد ہے۔

انسان دوسروں کا گلا کاٹتا ہے ایسے ہی غلط توقعات سے۔ حقوق غصب کرتا ہے انہی بے جا آرزوؤں سے۔ چوری، ڈاکا، دنیا کے جتنے جرائم ہیں، وہ سب کرتا ہے اسی سے۔ ورنہ اگر یہ تصور قائم رہے کہ یہ چندروزہ زندگی ہے اور پھر خدا کو منہ دکھانا ہے اور آخرت کی دوامی زندگی حاصل کرنا ہے تو انسان کسی غلط کاری کے راستے پر کیوں جائے؟!

تیسرے: ولامرنهم فليبتكن اذان الانعام ''میں انہیں کہوں گا تو وہ چوپایوں کے کانوں میں سوراخ کریں گے''۔ یہ مثال کے طور پر ذکر ہے ان بدعتوں کا جو دین کے نام سے رائج کی جاتی ہیں۔

عربوں نے حلال حیوانات میں کچھ کو دل بخواہ حرام سمجھ لیا تھا۔ اور ان حیوانات کو مقدس سمجھنے لگے تھے اور علامت کے طور پر ان کے کانوں میں شگاف دے دیئے تھے۔ اب وہ حیوانات ذبح نہیں ہوسکتے تھے۔ [1]

اسی طرح اور جماعتیں ایسی ہیں جو کچھ حیوانات کو مقدس سمجھ کر چھوڑ دیتی ہیں۔ اب وہ ایک ایک کا نقصان کرتے پھریں، کھیتوں کو چرتے پھریں، سبزی اور پھلوں کی دوکانیں لوٹتے پھریں مگر کوئی ان جانوروں سے کچھ نہ بولے۔ اس لئے کہ وہ مقدس و محترم ہیں۔ یہ سب شیطانوں کی کارستانی ہے۔

چوتھے: اللہ کی طرف کی پیدائشی صورت کو بدلنا۔ اس میں دین فطرت کے خلاف ہر قسم کی تحریف داخل ہے۔ [2]

بعض علما نے اس آیت سے ڈاڑھی منڈوانے کی حرمت پر استدلال کیا ہے کہ یہ بھی اللہ کی پیدا کردہ صورت کو بدلنا ہے۔ بہرحال جب کہ دینی نصوص سے اس فعل کی حرمت ثابت ہے تو یہ بھی اس کے تحت میں داخل تو ہے ہی۔ چاہے خصوصی طور پر مقصود نہ ہو۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

---

[1] ۔ یہ کافروں کا دستور تھا، گائے یا بکری کا ایک بچہ بت کے نام کا کر دیا، اس کے کان میں نشان ڈالتے (موضح القرآن)

[2] ۔ فليغيرن دين الله وبه قال ابرهيم و مجاهد وروى ذلك عن ابي جعفر و ابي عبد الله عليهما السلام (تبیان)

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾

''اور وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے، انہیں ہم ان بہشتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون بات میں زیادہ سچا ہوگا''؟

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾

''نہ تمہارے خیالات خام سے کچھ ہوتا ہے [1] اور نہ اہل کتاب کے خیالات خام سے۔ جو کوئی برائی کرے گا، اس کی اسے سزا دی جائے گی اور وہ اپنے لئے اللہ کو چھوڑ کر کوئی سرپرست نہیں پائے گا اور نہ کوئی مددگار۔''

تنہا اس آیت کو دیکھا جائے تو صاف مخاطب مسلمان ہی معلوم ہوتے ہیں اور ایک روایت شان نزول کی اس کے مطابق ہے مگر چونکہ اس کے پہلے شیطان کے منصوبوں کے ذکر میں آچکا ہے کہ لامنینھم ''میں انہیں طرح طرح کے خیالات خام میں مبتلا کروں گا'' اور وہ باتیں مشرکین سے متعلق تھیں، اس لئے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کے مخاطب مشرکین ہیں۔ یعنی ''اے مشرکو! نہ تمہارے غلط تصورات سے کچھ ہوتا ہے اور نہ اہل کتاب کے غلط تصورات سے۔

جناب شیخ الطائفہ نے اسی قول کو تقویت دی ہے اور فرمایا ہے:۔

ويقوى ذلك ان الله تعالىٰ قد وعد المومنين بقوله: والذين امنوا وعملوا الصلحت بادخال الجنة والخلود فيها وتلك غاية امانى المسلمين فكيف ينبغى بعد ذلك امانيهم۔

اس قول کو تقویت ملتی ہے اس لئے بھی کہ ابھی اللہ نے مومنین سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں بہشت میں داخل کرے گا اور وہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی مسلمانوں کی انتہائی آرزو ہے تو اس کے بعد اس کی آرزوؤں کو کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ان سے کچھ نہیں ہوتا۔

مگر میں سمجھتا ہوں بغیر یاایھا الذین کفروا: یاایھا المشرکون وغیرہ کے مطلق تخاطب سے ذہن میں مشرکین کا تصور پیدا ہونا مشکل ہے جب کہ بلا فاصلہ ذکر اہل ایمان کا ہے۔ مشرکوں کا کوئی تذکرہ بھی نہیں ہے۔

رہ گیا شیطان کے منصوبوں کا جو تذکرہ پہلے ہے، اس کے تمام اجزا کو بالخصوص مشرکین سے متعلق قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے، جب کہ سوا معصومین کے کسی نہ کسی حد تک شیطان کا داؤں سب ہی پر چلتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زیادہ شکار اس کے مشرکین ہیں مگر غلط خیالات اور تصورات اگر مسلمانوں میں آجائیں تو وہ شیطان کے لامنینھم کے حدود میں کیوں داخل نہ ہوں؟!

---

[1] ۔ليس الامر منوطا بامانيكم ولا امانى اهل الكتب بل بالعمل الصالح (جلالين)

پھر جب کہ یہاں ہمارے سامنے شیخ الطائفہ اعلی اللہ مقامہ ہیں جن کا نظریہ نجات کے بارے میں معلوم ہے کہ ولایت ائمہ معصومین علیہم السلام اس کے لئے شرط لازم ہے تو اگر مسلمان بھی اس خیال خاص میں مبتلا ہیں کہ بس لا الہ الا اللہ کہہ دینا کافی ہے اور اس کے بعد نجات دم قدم کو لگی ہوئی ہے تو یہ بھی شیطان کے منصوبہ: لامنینھم کا کرشمہ نہ ہوگا تو کیا ہوگا؟!

رہ گیا یہ کہ اللہ نے مومنین سے اس کے پہلے وعدہ کیا ہے تو وہاں تو ایمان کے ساتھ وعملو الصلحت کی قید ہے۔

اور یہاں لیس باما نیھم کے ساتھ کہا جا رہا ہے کہ: من عمل سوء ایجزبه "جو برائی کرے گا اس کی سزا پائے گا" تو یہ اس وعدہ کے مقابل میں کب ہے؟ بلکہ اسی کا تتمہ سمجھنا چاہئے اور اگر "امانی" ایسے تصورات ہو سکتے ہیں کہ اب ایمان کے ساتھ ہم جیسے بھی اعمال کریں، ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا جیسے کہ مسلمان عوام نے اپنی بداعمالیوں کا جواز پیدا کرنے کے لئے طرح طرح کے ایسے خیالات قائم ہی کر لئے ہیں۔ تو یہ سب وہ 'امانی' ہی ہیں جنہیں خالق ارشاد فرما رہا ہے:

لَيۡسَ بِاَمَانِيِّكُمۡ وَلَاۤ اَمَانِيِّ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ

نہ تمہارے خیالات خام سے کچھ ہوتا ہے اور نہ اہل کتاب کے۔[1]

غور کیا جائے تو خیالات خام کا تعلق ایسی ہی جماعت کے ساتھ ہوسکتا ہے جو آخرت کا کچھ تصور رکھتی ہے مگر کسی طرح "اندیشہ عذاب آخرت" سے اس نے اپنے کو بے نیاز کر لیا ہے۔ رہ گئے بدنصیب مشرکین، وہ تو آخرت کے قائل ہی نہیں ہیں تو ان کے کچھ 'امانی' ہو بھی کہاں سکتے ہیں؟

"امانی" تو ما شاء اللہ انہی افراد کے ہو سکتے ہیں جو اپنے "امت مرحومہ" یا "فرقہ ناجیہ" ہونے کے زعم میں ہو یا اہل کتاب جو اپنے کو اولاد انبیاء قرار دے کر یا مسیح کے کفارہ ہو جانے کے تصور میں مگن ہو کر آخرت کے متعلق "خواب شیریں" میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓـئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَـنَّةَ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ نَقِيۡرًا ﴿۱۲۴﴾

"اور جو کوئی نیک کام انجام دے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، درانحالیکہ وہ باایمان ہو تو یہ لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی[2] ظلم نہ ہوگا۔"

"خواہ مرد ہو یا عورت" اس تعمیم کے اظہار کی ضرورت اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ کوئی تصور اس کے خلاف موجود نہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب اسلام آیا ہے تو عورت ایک غیر ذمہ دارسی شے سمجھی جاتی تھی کہ یہ چاہے جو کچھ کرے، اسے بہشت کے درجوں سے کیا تعلق اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ تصور ان جماعتوں میں کارفرما ہوگا جو بہشت کی قائل ہیں، ورنہ جو بہشت کو مانتے ہی نہیں، ان سے اس خیال کا کیا تعلق ہوسکتا ہے؟

---

[1] یعنی لیس ماتتمنون انتم ولا اھل الکتب الاتعذبوا بأفعالکم (تفسیر علی بن ابراھیم)

[2] نقیرا قدونقرۃ النواۃ (جلالین) ھی النقطۃ التی فی النواۃ (علی بن ابراھیم) ھی النقطۃ التی فی ظھر النواۃ (تبیان)

ظاہر ہے کہ اس تصور کے بعد خود عورت کو بھی اپنے کردار کی بلندی اور اصلاح و ترقی نفس کا کوئی احساس قائم نہیں ہوسکتا۔

اسلام نے اس تصور کی نفی کی اور یہ بتایا کہ ایمان اور عمل صالح کی ذمہ داری بھی مرد اور عورت میں مشترک ہے اور اس کا صلہ جو بہشت کی صورت میں ہے، وہ بھی دونوں میں مشترک ہے۔ اس لئے اگر مرد پیش خدا بلند مرتبہ حاصل کرنا چاہے تو اسے اپنے نفس کو اس قابل بنانا ہے اور عورت اگر مرتبہ حاصل کرنا چاہئے تو اپنے نفس کو اس کا مستحق بنانا ہے۔

یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اصل بات کچھ اور کہی جارہی تھی کہ مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں ہے، پھر بھی قرآن نے صرف ایمان یا صرف حسن عمل کا ذکر نہیں کیا بلکہ اعمال صالحہ کو سرنامہ حکم قرار دے کر ایمان کا بطور شرط ذکر کر دیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک چیز بغیر دوسرے کے کافی نہیں ہے بلکہ قرآن کی اس آیت اور بعض دوسری آیتوں کا انداز بتاتا ہے کہ آخرت کی جزا اصل میں مراتب عمل ہی کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ ایمان اس عمل کی صحت اور اس پر استحقاق جزا کی شرط لازم ہوا کرتی ہے یعنی ایمان نہ ہو تو اعمال پر نظر ہی نہ ڈالی جائیگی کہ وہ کیسے ہیں۔ جب ایمان ہو تو پھر اعمال دیکھے جائیں گے، اور جیسے اعمال ہوں گے، ویسی جزاء ملے گی۔

سابقہ آیت میں برائیوں پر عام سزا کا اعلان اور اس آیت میں ایمان کی شرط کے ساتھ نیک اعمال پر داخلہ جنت کی بشارت، ایک مومن کے لئے ''امید و بیم'' کی سموئی ہوئی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جو جوہر ایمان ہے اور جو تحریک اصلاح عمل اور احساس فرائض کے لئے لازمی شرط ہے۔[1]

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾

''اور اس سے بڑھ کر کس کا دین اچھا ہوگا کہ جو اپنے کو اللہ کے سپرد کر دے[2] درانحالیکہ وہ اعمال اچھے کرتا رہے اور ابراہیم حنیف کی ملت کا پیرو ہو اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تھا۔''

''حنیف'' کے لفظی معنی مڑنے والا اور مطلب اس کا یہ ہے کہ غلط راستوں سے ہٹ کر صراط مستقیم پر قائم رہے۔[3]

لیکن اصطلاحی طور پر ''ملت ابراہیمی'' کا لقب سا ہوگیا ''ملت حنیفیہ'' اسی لئے ترجمہ میں ہم نے اسی لفظ کو دہرا دیا۔ ''اللہ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تھا'' یعنی خاص دوست۔[4]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لقب خلیل کے ساتھ سرفرازی

ظاہر ہے کہ ہر مومن کو اللہ کا دوست ہونا چاہئے، چہ جائیکہ انبیاء و مرسلین، یہ سب اللہ کے دوست خالص تھے مگر ''اللہ نے انہیں خالص

---

[1] ۔لیقف المؤمن بین الخوف والرجاء (مجمع البیان)

[2] ۔انقادوا خلص عملہ (جلالین)

[3] ۔حنیفا حال ای مال عن الادیان کلھا الی الدین القیم (جلالین)

[4] ۔صفیا خالص المحبۃ لہ (جلالین)

دوست بنایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں لقب عطا کر دیا، "خلیل" کا جو یقیناً عبودیت کی ایک بہت بڑی رفعت ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾

"اور اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر حاوی ہے۔"

اس کا علم وقدرت، کمال ذات کے دونوں پہلو، اس حاوی ہونے میں مضمر ہیں۔[1]

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

"اور آپ سے عورتوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ اللہ ان کے بارے میں تمہیں احکام بتلاتا ہے اور جو تم لوگوں کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے قانون الٰہی میں ان یتیم عورتوں کے بارے میں ہے جنہیں تم جو ان کا حق مقرر ہے، وہ تو دیتے نہیں اور یہ چاہتے ہو کہ ان سے نکاح کر لو اور بے بس و بے کس لڑکوں کے بارے میں اور یہ کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف برقرار رکھو اور جو بھلائی تم کرو گے تو اللہ اس سے یقیناً واقف ہوگا۔"

وما يتلٰى عليكم فى الكتاب فى يتامى النسآء کے نحوی ترکیب کے لحاظ سے کئی پہلو ہو سکتے ہیں:-

پہلی صورت یہ ہے کہ "ما يتلٰى عليكم" مبتدا ہے اور اس کی خبر "فى الكتاب" ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ "جو تم کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے، یہ قانون الٰہی میں ہے، ان یتیم عورتوں کے بارے میں"۔[2]

دوسرے یہ کہ ما يتلٰى عليكم فى الكتاب پورا مبتدا ہے اور اس کی خبر ہے "فى يتامى النسآء" اس صورت میں وہ مفہوم ہوگا جسے ہم نے کچھ زیادہ مناسب سمجھ کر ترجمہ اس کے مطابق کیا ہے "جو تمہیں پڑھ کر سنایا جاتا ہے قانون الٰہی میں ان یتیم عورتوں کے بارے میں ہے" اور بعض پہلے کے مترجمین نے بھی اس کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔[3]

ان دونوں صورتوں میں واؤ کے بعد ما يتلٰى عليكم جملہ مستانفہ ہے یعنی اس کا عطف ماقبل پر نہیں ہے بلکہ دونوں جز مستقل مبتدا و خبر ہیں۔

---

[1]۔ محيطا علما وقدرة (جلالين)

[2]۔ آں چہ خواندہ می شود بر شما در کتاب نازل شدہ است (شاہ ولی اللہ)

[3]۔ جو حکم (مناہی کا) قرآن میں (پہلے) سنایا جا چکا ہے، وہ حقیقتاً ان یتیم لڑکوں کے واسطے تھا (فرمان علی صاحب)

تیسری صورت یہ ہے کہ یہ سابق میں جو اللہ یفتیکم فیہن کا فقرہ آیا ہے، اس میں "اللہ" کا لفظ پر عطف ہے یعنی ان کے بارے میں اللہ تمہیں حکم بتاتا ہے اور وہ آیات کتاب حکم بتاتے ہیں، جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں ان یتیم عورتوں کے بارے میں۔[1]

چوتھے یہ کہ فیہن میں جو ضمیر ہے، اس پر عطف لیا جائے یعنی اللہ تمہیں حکم بتاتا ہے عورتوں کے بارے میں اور اس بارے میں جو کتاب میں سے تمہارے سامنے پیش ہوتا ہے۔[2]

اس کے بعد یہ جو آیا ہے کہ: ترغبون ان تنکحوھن، اس میں ترغبون کی لفظ کے معنی میں بھی اختلاف ہوگیا ہے۔

چونکہ رغبت عربی میں لغات اضداد میں سے ہے رغب فیہ کے معنی ہیں "اس کی طرف راغب ہوا" اور رَغِبَ عَنْهُ کے معنی یہ ہیں کہ "اس سے متنفر ہوا"...... یہاں ترغبون کے ساتھ نہ فی کا لفظ ہے، نہ عن کا۔ اس لئے ایک صورت میں معنی یہ ہیں کہ "تم ان سے نکاح کی طرف راغب ہو[3] ہم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

دوسری صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ "تم ان کا نکاح نہیں کرنا چاہتے"[4] ایک شان نزول جو بیان کی گئی ہے، وہ اس کے موافق ہے۔[5]

اس کے بعد جو ہے "اور بے بس لڑکوں کے بارے میں" اس کا محل عطف قریب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ "یتامی النسآء" عطف ہو یعنی کتاب میں جو احکام تمہارے سامنے پیش ہوئے، یہ ان یتیم لڑکیوں کے بارے میں ہیں کہ ان سے یوں نکاح نہ کرو کہ ان کے مہر نہ دو اور کمزور لڑکوں کے بارے میں ہیں، اور وہ یہ کہ ان کے ساتھ انصاف سے کام لو۔

دوسرا مفہوم اس طرح کہا گیا ہے کہ یہ اس کے قبل جو یفتیکم فیہن آیا تھا کہ "اللہ عورتوں کے بارے میں تمہیں فیصلہ سناتا ہے تو ان عورتوں کی ضمیر "ہن" پر عطف ہوئی ہے[6] یعنی ان عورتوں کے بارے میں فیصلہ سناتا ہے اور ان لڑکوں کے بارے میں۔

یہ اور اسی طرح اس کے پہلے: "وما یتلی علیکم کا عطف اگر فیہن کی ضمیر پر لیا جائے، یہ مثالیں ہونگی اس کی ضمیر مجرور پر جو فیھن میں ہے بغیر اعادۂ حرف جر عطف کیا گیا۔ اس بحث پر سورۃ البقرہ کی آیت ۲۱۷: (وکفربہ والمسجد الحرام) کے ذیل میں مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔

اس طرح "صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" کے جملہ پر جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ "علیہ" کی ضمیر پر جو مجرور ہے بغیر اعادۂ حرف جو عطف نہ ہونا چاہئے لہٰذا اگر آل کا ذکر ہو بھی تو "صلی اللہ علیہ وعلی آلہ" کہنا درست ہوگا اور یہ بحث بھی ایک ایسی ہے جو بدنصیبی سے بہت سی غیر اہم

---

[1] ۔مایتلی علیکم فی الکتاب القرآن من أیة المیراث یفتیکم ایضا (جلالین) یعنی ومایتلی علیکم فی الکتاب ایضا یفتیکم فیھن (مجمع البیان)

[2] ۔قال قوم معناہ یفتیکم فیھن ومایتلی علیکم (تبیان)

[3] ۔رغبت دارید کہ نکاح کنید با ایشان (شاہ ولی اللہ) رغبت کرتے ہو کہ نکاح کروان کو (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔ترغبون ایہا الاولیاء عن ان تنکحوھن (جلالین)

[5] ۔فکان جابر یرغب عن نکاحھا ولاینکحھا (تبیان)

[6] ۔قال لفوا ء یجوز ان یکون موضعہ جرا عطفا علی المضمر المجرور فی فیھن (مجمع البیان)

بحثوں کی طرح شیعہ سنی فرق کا ذریعہ بن گئی ہے، اس اعتراض کا ان قرآنی آیتوں سے جواب ہوتا ہے، پھر اگر اس اختلاف کی بنیاد اس نحوی دشواری پر ہوتی تو صریحی صلوات میں یہ فرق کیوں ہوگیا کہ شیعہ کہتے ہیں:۔اللّٰھم علی محمد وعلیٰ اٰل محمد، اور سنی کہیں گے: اللّٰھم علی محمد وعلیٰ اٰل محمد...... یہاں تو ضمیر کا معاملہ نہیں تھا۔ رسولؐ کا صریحی نام موجود تھا، پھر لفظ علٰی کے اعادہ کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ معلوم ہوا کہ وہاں بھی قاعدہ نحوی کا سہارا صرف بہانہ تھا جذبہ اختلاف کے اظہار کا اور اس کے علاوہ کوئی بنیاد نہ تھی۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿١٢٨﴾

''اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی طرف سے حق تلفی یا بے رخی محسوس کرے[1] تو ان دونوں کے لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ آپس میں کسی صورت سے صلح کر لیں اور صلح تو بڑی اچھی چیز ہے اور نفوس عموماً تنگ دلی پر آمادہ رہتے ہیں، اور اگر بھلائی کرو اور پرہیز گاری سے کام لو تو یقیناً اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔''

عام طور سے ''ناشزہ'' کا لفظ عورت کے لئے استعمال ہوتا ہے، جب وہ شوہر کی، جن باتوں میں اطاعت ضروری ہے، ان میں اطاعت نہ کرے مگر قرآن مجید نے یہاں یہ لفظ مرد کے لئے استعمال فرمایا ہے یعنی شوہر بھی ان حقوق کو ادا نہ کر کے جو شریعت نے اس پر عائد کیے ہیں مثلاً اگر نان ونفقہ ادا نہ کرے یا ازدواجی تقاضوں کے ماتحت جو عورت کے ساتھ اسے ربط رکھنا چاہئے، وہ ربط قائم نہ رکھے، تو ''ناشزہ'' ہوتا ہے۔[2]

وہ دونوں صلح کر لیں، اس میں ''کوئی مضائقہ نہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ حتی الامکان انہیں صلح کر لینا چاہئے اور حکم کے موقع پر یہ الفاظ کہ کوئی مضائقہ نہیں، ویسے ہی ہیں جیسے صفاو مروہ کے درمیان سعی کے لئے ارشاد ہوا: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (البقرۃ۔۱۵۸) اور قصر نماز کے بارے میں لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ (النساء۔۱۰۱) ''شح'' کو عموماً ''بخل'' کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے[3] جس کی بنا پر ہم نے اس کا ترجمہ ''تنگ دلی'' کا لفظ کے ساتھ کیا ہے مگر جناب شیخ طوسی نے ''شح'' کے معنی بیان کیے ہیں ''زیادتی ہوس''[4] اور پھر تشریح جو کی ہے وہ ایک طرح کی فیاضی کے مقابل ہونے کا پتہ دیتی ہے کہ عورت تعلقات زوجیت قائم رکھنے کی خاطر اپنا کوئی حق مثلاً نان ونفقہ یا شب باشی کا حق چھوڑ دیتی ہے یا مرد ایسی عورت پر جسے وہ پسند نہیں کرتا، نان ونفقہ جاری رکھتا ہے۔ پھر ''شح'' اور ''بخل'' میں فرق یہ بیان کیا ہے کہ ''بخل'' مال کے ساتھ مخصوص ہے اور ''شح'' کسی اعزازو غیرہ کے باقی رکھنے کی خواہش کو بھی کہتے ہیں۔

یہ تشریح الفاظ قرآنی کے لحاظ سے بعید معلوم نہیں ہوتی اور شاید ''تنگ دلی'' کا لفظ جو میں نے ترجمہ میں صرف کیا ہے، جناب شیخ علیہ

---

[1]۔ای علمت وقیل ظنت (مجمع البیان)

[2]۔نشوزا ترفعا علیھا بترك مضاجعتها والتقصیر فی نفقتها (جلالین)

[3]۔حاضر کردہ شدہ اند نفوس نزدیك بخل (شاہ ولی اللہ) اور حاضر کی گئیں جانیں بخیلی پر (شاہ رفیع الدین)

[4]۔الشح افراط فی الحرص علی الشئ (تبیان)

الرحمہ کے تصریحات کے لحاظ سے بھی غلط نہیں ہے۔

وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِيۡلُوۡا كُلَّ الۡمَيۡلِ فَتَذَرُوۡهَا كَالۡمُعَلَّقَةِ‌ ؕ وَاِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنۡ يَّتَفَرَّقَا يُغۡنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنۡ سَعَتِهٖ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيۡمًا ﴿۱۳۰﴾

''اورتم ہرگز عورتوں کے درمیان پوری برابری قائم نہیں رکھ سکو گے، چاہے اس کے خواہش مند بھی ہو مگر پورا پورا انحراف تو نہ کرو کہ اسے گویا بیچوں بیچ میں لٹکا ہوا چھوڑ دو اور اگر صلح پسندی اور پرہیز گاری سے کام لو تو بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔ اور اگر دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنے خزانہ سے عطا کرے گا اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا ہے، ہر کام بالکل درست کرنے والا۔''

ایک عدل تو وہ ہے جو تعدد ازواج کی صورت میں لازمی شرط ہے جسے اس سورہ کی ابتدا میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ عدل ہے کچھ لازمی حقوق ازدواجی میں مثلاً راتوں کی تقسیم اور نان ونفقہ کی ادائیگی وغیرہ۔ یہ عدل واجب ہے جس کے بغیر کہا گیا ہے کہ تم کئی شادیاں کرو ہی نہیں بلکہ اگر ایسا عدل نہ کرنا ہو تو بس ایک شادی کرو، لیکن یہاں جو عدل ہے، وہ محبت میں یکسانی ہے۔ [۱]

بعض مخالفین اسلام نے جو ان دونوں آیتوں میں تضاد ہونے کا اعتراض کیا تھا، اس کے جواب میں امام نے یہی تشریح فرمائی ہے جس کا ذکر ابھی آئے گا۔

بے شک محبت میں یکسانی ناممکن چیز ہے، اس لئے کہ انسان کا دل کسی ایک طرف زیادہ راغب ہوگا اور ایک طرف کم اور اس دل کے تقاضے کا اثر افعال سے ضرور نمودار ہوگا۔ اس لئے اسے کہا گیا ہے کہ تم ایسا ہرگز نہ کر سکو گے اور خالق کا یہ کہہ دینا کہ تم ایسا نہ کر سکو گے، خود اس کی دلیل ہے کہ یہ عدل واجب نہیں ہے۔ [۲]

پھر اس کے بعد یہ کہ ''مگر بالکل تو انحراف نہ کرو اور اسے بیچوں بیچ میں لٹکاؤ تو نہیں''...... اس سے ظاہر ہے کہ اس عدل نہ ہو سکنے کے بعد بھی تعدد ازواج سے ممانعت نہیں کی گئی بلکہ یہ ہے کہ کلیۃً مساوات نہیں برت سکتے تو ایسا نہ ہونے پائے کہ ایک کو تکلیفیں پہنچاؤ اور اسے بیچ ادھڑ میں لٹکاؤ کہ وہ نہ تو اپنی نوعیت حیات کے لحاظ سے اپنے کو شوہر دار محسوس کرے اور نہ وہ غیر شوہر دار ہو کہ دوسرا عقد کر سکے۔ [۳]

یہ اس امر کی دلیل واضح ہے کہ یہ وہ عدل نہیں ہے جو تعدد ازواج کی شرط لازمی ہے، اس لئے بعض لوگوں کا وہاں والی آیت کی عدل والی شرط کو اس آیت کے ساتھ ملانا کہ اللہ نے کہہ دیا ہے کہ تم عدل نہ کر سکو گے اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ تعدد ازواج اسلام میں جائز نہیں ہے، بالکل

---

[۱]۔ تسووا بین النسآء فی المحبة (جلالین)

[۲]۔ فان ذٰلك ليس اليكم ولا تملكونه فلا تكلفونه ولا تواخذون به (مجمع البيان)

[۳]۔ كالمعلقة التى لا هى ايم ولا ذات بعل (جلالين) يعنى كالتى هى لا ذات زوج ولا ايم ... وهو المروى عن ابى جعفر و ابى عبدالله عليهما السلام (تبيان)

غلط ہے۔

دونوں آیتوں میں خلط ملط سے غلط اندیشی صدر اسلام ہی میں پیدا ہوگئی تھی جسے ہمارے ائمہ علیہم السلام نے صاف کیا جس کا ذکر ہمارے مشہور قدیم ترین مفسر علی بن ابراہیم قمی کی تفسیر میں موجود ہے اور اسی سے علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ ایک دہریہ نے ابوجعفر احوال (مومن الطاق) کے سامنے ان دونوں آیتوں کو پیش کر کے اعتراض کیا اور انہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کیا۔

حضرت علیہ السلام نے فرمایا:

اماقوله: فان خفتم الاتعدلوا فانه عنى فى النفقة واماقوله: ولن تستطيعوا ان تعدلوا فانه عنى فى المودة فانه لايقدراحد ان يعدل بين المرأتين فى المؤدة۔

پہلے جو ارشاد ہوا ہے کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کرو گے، تو وہاں مراد عدالت برتنا ہے نان ونفقہ میں اور یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ تم ہرگز عدالت نہ کرسکو گے، اس سے مراد یکسانی ہے محبت میں کہ کوئی شخص اس پر قدرت نہیں رکھتا کہ دو بیویوں میں محبت کے اعتبار سے مساوات قائم رکھے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾

''اور اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور ہم نے ہدایت کی ہے انہیں کہ جن کو تمہارے پہلے کتاب دی گئی تھی اور تمہیں کہ اللہ کے غضب سے بچو اور اگر تم کفر اختیار کرو گے تو اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ بے نیاز ہے، تعریفوں کا حق دار۔ اور اللہ کا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون کارساز ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ خدا تمہارے اسلام و ایمان کا محتاج نہیں ہے۔ یہ خود تمہاری شرافت انسانی کا تقاضا ہے کہ تم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو اور اس کے احکام کی تعمیل کرو۔ ورنہ تم اگر کفر اختیار کرو تو اس سے خدا کا کچھ نہ بگڑے گا[1] وہ تو بے نیاز مطلق ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾

''اگر وہ چاہے تو تمہیں اے آدمیو! ختم کردے اور دوسروں کو لے آئے اور اللہ اس پر بالکل قادر ہے۔''

---

[1] لایضرہ کفرانکم وعصیانکم (مجمع البیان)

مطلب یہ ہے کہ سرتابی کرکے یہ آدمی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے بلکہ یہ اس کی حکیمانہ وحلیمانہ درگزر ہے کہ وہ ان کے ان معاصی کے باوجود انہیں باقی رکھتا ہے۔ ورنہ وہ چاہے تو ان کو ایک دم نیست ونابود کردے۔[1]

ایک دوسری خلق کو وجود میں لے آئے جو اس کی اطاعت کریں اور اس کے احکام سے سرتابی نہ کریں۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾

''جو دنیاوی صلہ کا طلب گار ہو تو اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں ہی کا صلہ ہے اور اللہ سننے والا ہے، دیکھنے والا۔''

اس سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ آخر بہت سے کافروں اور اللہ کے نافرمان بندوں کو اس دنیا کی نعمتیں کیوں بہت زیادہ ملی ہوئی ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ آخرت کا تصور ہی نہیں رکھتے لہٰذا ان کو جو کچھ ملنا تھا، اس دنیا میں مل گیا ہے، اب آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے لیکن اہل ایمان کا نصب العین ہی دنیا سے زیادہ آخرت ہے لہٰذا دنیاوی زندگی ان کی اگر تکالیف میں بسر ہو تو انہیں اس کا غم نہیں ہونا چاہئے، جب کہ آخرت کی منزل میں جو ان کا اصل نصب العین ہے، انہیں کامیابی نصیب ہو۔

اس کے لئے جو دنیاوی صلہ کا طلب گار ہو یعنی آخرت کا اعتقاد نہیں رکھتا، یہ جو کہا گیا کہ اللہ کے پاس دنیا وآخرت دونوں کا صلہ ہے۔ اس میں دنیا کا صلہ تو اس کی مراد کے مطابق یہ دولت یا شہرت یا سلطنت ہے جو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور آخرت کے صلہ سے مراد وہاں کا عذاب ہے جسے لفظ ثواب سے طنز کے طور پر تعبیر کیا گیا ہے۔[2]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

''اے ایمان والو! تمہیں انصاف پر استقلال کے ساتھ قائم رہنا چاہئے[3] اللہ کا گواہ ہوتے ہوئے، خواہ خود اپنے خلاف ہو یا ماں باپ اور عزیز اقارب کے۔ وہ چاہے مالدار ہو اور چاہے تنگدست، بہر حال اللہ ان دونوں کا زیادہ

---

[1]۔ یہلککم (مجمع البیان)

[2]۔ اما ثوابہ فی الآخرۃ فنار جہنم

[3]۔ ای دائمین علی القیام بالعدل (مجمع البیان) متعہد انصاف باشید (شاہ ولی اللہ) قائم رہنے والے ساتھ انصاف کے (شاہ رفیع الدین)

بھی خواہ ہے [1] لہٰذا انصاف کے موقع پر نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو اور اگر تم نے حقیقت کو بدلا یا چشم پوشی کی [2] تو یقیناً اللہ جو کچھ تم کرو گے، اس سے باخبر ہے۔"

اپنے اور پرائے ہر ایک کے معاملہ میں عدل وانصاف قائم رکھنے کا مطالبہ

"اللہ کا گواہ"یعنی حقیقت کا ترجمان اور اظہار حق کرنے والا [3] مطلب یہ ہے کہ انصاف اور اظہار حق میں اپنے اور بے گانہ کی تفریق نہ ہونا چاہئے۔

معصوم نے فرمایا کہ یہ ایک مومن کا دوسرے مومن پر ایک واجب الادا حق ہے۔ [4]

اس کے علاوہ امیر اور غریب کا امتیاز بھی نہ ہونا چاہئے اور خود اپنے خلاف گواہی یعنی ایسے حق کا اقرار جو اپنے اوپر عائد ہوتا ہو۔ [5]

"اللہ ان دونوں کا زیادہ بھی خواہ ہے" یعنی تم اسے بھی خواہ سمجھتے ہو کہ تم غلط طور پر اس کی طرف داری کرو، حالانکہ حقیقت میں یہ بھی خواہی نہیں ہے۔ خدا تم سے زیادہ ان کا بھی خواہ ہے مگر وہ اسے پسند نہیں کرتا کہ تم جھوٹی گواہی دے کر انہیں فائدہ پہنچانے کی کوشش کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۳۶

"اے ایمان لانے والو! ایمان لاؤ اللہ اور اس کے پیغمبر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے پیغمبر پر اتاری ہے اور اس کتاب پر جو پہلے اس نے اتاری تھی اور جو انکار کرے اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کی پیغمبروں اور روز آخرت کا وہ سخت گمراہی میں مبتلا ہوا"

ایمان لانے والوں کو دعوت ایمان

پہلے تخاطب فرمایا ہے "اے ایمان لانے والو!" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایمان لا چکے ہیں، پھر ارشاد ہوتا ہے کہ "ایمان لاؤ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی ایمان نہیں لائے ہیں تو اس کا ایک مطلب تو یہ ہوسکتا ہے کہ شروع میں تو "ایمان اجمالی" تھا۔ حقانیت اسلام کا احساس

---

[1] ۔انظر لهما من سائر الناس (مجمع) اولیٰ بهما منكم واعلم بمصالحهما (جلالین) خدا مهربان تر است بر ایشان (ولی اللہ)

[2] ۔قال مجاهد معنی "تلووا" تبدلوا الشهادة وتعرضوا ای تكتموها وهو قول ابی جعفر علیه السلام (تبیان)

[3] ۔اظهار حق كنندگان برائے خدا (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔قال ابو عبدالله علیه السلام ان للمؤمن علی المومن سبع حقوق فاوجبها ان يقول الرجل حقا وان كان علی نفسه او علی والديه فلا يميل لهم عن الحق (علی بن ابراهيم)

[5] ۔بان يكون عليه حق لغيره فيقر له ولا يجحده (تبیان)

ہوا، خواہ معجزہ کو دیکھ کر، خواہ رسولؐ کی سیرت کا مطالعہ کر کے، خواہ گزشتہ انبیاء کی بشارتوں کی بنا پر۔ اس لئے رسولؐ کی خدمت میں آ کر کہا: اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد انّك رسول اللہ، یہ تو بالا جمال ایمان ہوا جس سے احکام اسلام اس شخص پر مرتب ہو گئے۔ اس کے بعد ان کو "ایمان" مفصل کی تعلیم دی جا رہی ہے کہ تمہیں ان باتوں کو ماننا پڑے گا۔[1]

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اور یہ زیادہ واضح ہے کہ تخاطب سے کہ "ایمان لانے والو!" ظاہری مسلمان مراد ہیں اور انہیں دعوت جو دی جا رہی ہے، وہ اس کی ہے کہ وہ دل سے ان باتوں کو مان لیں تا کہ حقیقی معنی میں مومن ہو جائیں۔[2]

اب بعد میں جو ہے کہ: من یکفر باللہ تو اس سے مراد وہ ہوں گے جو باوجود اقرار اسلام کے ان باتوں کو دل سے نہ مانیں۔ انہیں کا نام "منافق" ہوتا ہے۔

جس طرح پہلی صورت میں بھی اگر انہوں نے "ایمان مجمل" اختیار کیا تھا مگر اس "ایمان مفصل" کو قبول نہیں کیا تو وہ منافق ہی رہیں گے۔

شاہ عبدالقادر دہلوی لکھتے ہیں:

"ایمان والے" فرمایا ہے ان کو جو ظاہر میں مسلمان ہیں، سو ان کو تقید ہے کہ جب تک دل سے یقین نہ لائیں گے ان سب چیزوں کا تو خدا کے یہاں مسلمان نہیں۔"

اور بعد والے فقرہ کی تشریح میں لکھا ہے:

"یعنی ظاہر مسلمان ہے اور دل سے بہکے تو اگر آخر کو بے یقین مرے تو کافر کے برابر ہیں، ان کی بخشش نہیں اور ظاہر کی مسلمانی سے وہاں راہ نہ ملے گی" (موضح القرآن)

آخری فقرہ کے حاشیہ میں ان کے والد شاہ ولی اللہ نے بھی لکھا ہے:۔

"از ایں جا وعید منافقان بیان می فرماید"۔

کاش علمائے جمہور اس کو سامنے رکھتے تو "صحابیت رسولؐ" کو "رفعت درجات" کی ضمانت نہ سمجھتے، اور بایھم اقتدایتم اھتدیتم "ان میں سے جس کی پیروی کرلو، راہ راست حاصل ہو جائے" کی روایت کو یا تو وضعی و اختراعی سمجھتے یا اسے مخصوص سمجھتے ان افراد کے ساتھ جن کی خوبی انجام پر حضرت پیغمبر خدا ﷺ کے نصوص نے مہر تصدیق ثبت کر دی تھی اور ان کے حسن کردار کی آیہ تطہیر نے ضمانت کر لی تھی۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ

---

[1]۔ مراد آنست کہ ھر کہ در ملت اسلام میدا خل شد ادرا بہ تفصیل تصدیق این چیز ھا باید کر (شاہ ولی اللہ)

[2]۔ المعتمد علیہ عندنا و اللائق بمذھبنا ان المعنی یا ایھا الذین آمنو فی الظاھر بالاقرار باللہ و رسولہ صدقوھما آمنو باللہ و رسولہ فی الباطن لیطابق باطنکم ظاھر کم (تبیان) یعنی یا ایھا الذین اقروا صدقوا (علی بن ابراھیم)

اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾

''بلاشبہ وہ جو ایمان لائے، پھر کفر اختیار کیا، پھر کفر میں اپنے اور اضافہ کر دیا، اللہ ان کو بخشنے کا نہیں ہے اور نہ انہیں منزل تک پہنچانے کا ہے۔''

یہ لوگ جو ہمیشہ ایمان اور کفر کے دوعملے میں رہے، پھر انجام کار کفر میں شدت ہی اختیار کرتے گئے، بظاہر منافقین ہی ہیں جن کا ذکر پہلے ہی شروع ہو چکا ہے اور اس کے بعد بھی پارہ کے آخر تک انہی کا ذکر رہے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ایمان لائے یعنی زبان سے اقرار ایمان کیا۔ پھر کفر اختیار کیا یعنی دل سے کافر رہے۔ پھر درمیان میں کبھی رسولؐ کے اخلاص اور حقانیت کا دل پر اثر پڑا تو ایمان کی طرف جھکے اور پھر کیش دیرینہ سے محبت یا پہلے زمانہ کے دوست احباب نے ورغلایا تو پھر کافر کے کافر ہی رہ گئے بلکہ اور شدت اختیار کر لی۔

یہ حضرات منافقین ہیں جو رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ انہیں کہہ دیا گیا ہے کہ ''اللہ کبھی انہیں بخشنے نہیں۔''

یہ بھی اس بحث کا ایک شاہد ہے جو پہلے اس آیت کے ذیل میں ہو چکی ہے کہ: ان اللہ لا یغفر ان یشرك بہ یعنی اللہ شرک کو نہیں بخشتا۔ یہ حکم ایمان حقیقی کے مقابلہ میں ہر قسم کے کفر کو شامل ہے جس میں نفاق بھی داخل ہے۔ اس کی بھی مغفرت نہیں ہے۔

لیکن بعض مفسرین نے اس آیت کو لے جا کر یہود سے متعلق قرار دیا ہے اور اس طرح کہ 'ایمان لائے'' یعنی موسیٰؑ پر ''پھر کفر اختیار کیا'' گوسالہ پرستی کر کے ''پھر ایمان لائے''، یعنی گوسالہ پرستی سے توبہ کی ''پھر کفر کیا''، یعنی عیسیٰؑ پر ایمان نہ لائے ''پھر کفر میں اضافہ کیا'' حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ پر ایمان نہ لا کر، انہیں کہا جا رہا ہے کہ ان کی مغفرت نہیں ہے (جلالین)

مگر یہ تفسیر سیاق وسباق کے خلاف ہونے کے علاوہ الفاظ آیت سے ذہن میں بالکل نہیں آتی، بلکہ یہ اس طرح کی تشریح ہے جیسے کسی پہیلی کو بوجھا جاتا ہے۔

اس کے برخلاف پہلی تفسیر ذہن سے قریب تر ہے لہٰذا اسی کو صحیح سمجھنا زیادہ مناسب ہے۔[1]

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ

---

[1]۔ قال مجاھد وابن زید یعنی بذلك اھل النفاق... واقوی الاقوال عندنا قول مجاھد (تبیان)

كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝١٤١

”مژدہ سنایئے منافقوں کو کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے، وہ جو اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا حوالی موالی بناتے ہیں، کیا یہ ان کے پاس عزت کے طلب گار ہیں؟ عزت تو تمام وکمال اللہ کے اختیار میں ہے اور اس نے تم پر قرآن میں یہ اتار دیا ہے کہ جب سنو آیات الٰہی کو کہ ان کا انکار ہو رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جارہا ہے تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو، جب تک کہ وہ کسی اور گفتگو میں مصروف نہ ہو جائیں۔ ورنہ تم انہی کے ایسے قرار پاؤ گے۔ بلاشبہ اللہ تمام منافقوں اور کافروں کو دوزخ میں اکھٹا کردے گا۔ وہ جو تمہارے ساتھ موقع پر نظر رکھتے ہیں [1] تو اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح ہوگئی تو کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کچھ کامیابی ہوگئی تو کہتے ہیں کہ کیا ہم تم پر قابو نہ رکھتے تھے اور (پھر بھی) ہم نے مسلمانوں سے تمہاری حفاظت نہیں کی۔ اب اللہ ہی تمہارے درمیان روز قیامت فیصلہ کرے گا اور اللہ ہرگز کافروں کو مسلمان پر دسترس قرار نہیں دے گا۔“

منافقین کے کردار کی رنگارنگی اوران کے عذاب کی شدت

”بشارت“ یعنی مژدہ اور خوش خبری خوش آئند اطلاع کو کہتے ہیں۔ خوفناک خبر کو ”انذار“ کہتے ہیں۔ یہ قرآن کی ایک طنزیہ تعبیر ہے کہ اس نے ”عذاب دردناک“ کی اطلاع کو انذار کے بجائے بشارت کے لفظ سے یاد کیا ہے اور یہاں اس ”طنزیہ“ میں نکتہ بلاغت یہ ہے کہ منافقین بظاہر ”مومنین“ کی حمایت میں داخل تھے جنہیں رسولؐ کا کام بشارت ہی دینا ہے لہٰذا انہیں اپنے مظاہرۂ ایمان کے زعم کی بنا پر کسی بشارت ہی کا متوقع ہونا چاہئے تو اب اس کے بجائے انہیں نفاق کی پاداش میں جو بشارت کے بجائے انذار کیا جارہا ہے تو اسے لطافت اسلوب کلام اور حکیمانہ ظرافت سے بشارت ہی کے نام سے یاد کیا جارہا ہے۔

نزل علیکم فی الکتاب ”تم پر قرآن میں یہ اتار دیا ہے“ کیا؟ یہ کہ ”جب آیات الٰہی کے ساتھ کفر اور تمسخر ہو رہا ہے تو اس محفل میں نہ بیٹھو“...... یہ تلاش کرنے پر قرآن میں سورۂ انعام میں ملتا ہے [2] جو اس کے بعد ہے۔

یہ منجملہ اور شواہد کے ایک نمایاں شاہد ہے اس کا کہ ترتیب قرآن موافق تنزیل نہیں ہے۔

آخر میں جو بیان کیا گیا ہے، وہ دورخے آدمیوں کا وہ کردار ہے جو ہمیشہ ہی نظر آتا رہتا ہے، ادھر جائیں گے، ادھر کی سی کہیں گے اور

---

[1] ۔ای ینتظرون بہم (تبیان)

[2] ۔فی الکتاب القراٰن فی سورۃ انعام (جلالین) التنزل فی کتابہ تعالےٰ: واذارأیت الذین یخرضون فی اٰیتنا فاعرض حتّٰی یخوضوا فی حدیث غیرہ (تبیان)

ادھر آئیں گے، ادھر کی سہی۔

''اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ'' کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ ''کیا ہم تم پر قابو نہ رکھتے تھے اور (پھر بھی) ہم نے مسلمانوں سے تمہاری حفاظت کی' یہ ایک تفسیر کے مطابق ہے [۱] جو ہمارے نزدیک ترجیح رکھتی ہے۔

دوسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ ''کیا ہم تم پر غالب نہیں آئے'' یعنی تمہارا ساتھ دے کر تمہاری رائے کو نہیں بدلا اور مسلمانوں کی طرف جانے سے روکا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارا ساتھ نہ دیتے تو تم مسلمانوں کے دباؤ میں آ کر مسلمان ہو گئے ہوتے۔ [۲]

''اللہ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا'' یہاں ''تمہارے'' سے مراد ہے ''تمہارے اور ان کے درمیان''...... چونکہ وہ بھی مسلمانوں کی جماعت میں بظاہر شامل تھے۔ اس لئے ''تمہارے'' کے لفظ کو دونوں پر حاوی کر دیا گیا۔ ہاں روز قیامت جب فیصلہ ہوگا تو پھر وہ الگ ہوں گے اور یہ الگ۔ [۳]

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَإِذَا قَامُوْٓا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾

''بلاشبہ منافق لوگ اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ خود انہیں دھوکے میں رکھ رہا ہے اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو اکساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر تھوڑا سا۔ وہ بیچوں بیچ میں ڈانواڈول ہیں [۴] نہ ان کی طرف اور نہ ان کی طرف جسے اللہ بھٹکنے دے، اس کے لئے تم کوئی راستہ نکال نہیں سکتے۔''

خدا کی طرف دھوکا دینے کی نسبت جوابی طور پر ویسی ہی ہے جیسے پہلے پارے میں مذاق اڑانے کی نسبت یا دوسری جگہ ''مکر'' کی نسبت۔ چونکہ اپنے طرز عمل کی بدولت دھوکا یہ خود کھاتے ہیں، اس طرح کی دنیا میں تو ان پر احکام اسلام جاری ہو جاتے ہیں جس سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے خدا و رسولؐ کو (معاذ اللہ) بے وقوف بنا لیا، مگر جب آخرت میں وہ کافروں کے زمرہ میں محشور ہوں گے بلکہ کافروں سے زیادہ عذاب انہیں ہوگا، جیسا کہ اس کے بعد کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے، تب معلوم ہوگا کہ حقیقت میں دھوکا کس نے کھایا اور بے وقوف کون بنا؟!

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ

---

[۱]۔ الم نستحوذ علیکم و نقدر علی اخذ کم و قتلکم فابقینا علیکم (جلالین)

[۲]۔ الم نغلبکم رأیکم بالموالاة لکم و نمنعکم من الدخول فی زمرة المؤمنین (مجمع البیان)

[۳]۔ یحکم بینکم و بینہم یوم القیمة بان یدخلکم الجنة و یدخلهم النار (جلالین)

[۴]۔ مترددین بین ذٰلک الکفر و الایمان (جلالین) و اصل التذبذب التحرک و الاضطراب (تبیان)

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾

''اے ایمان لانے والو! اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو حوالی موالی نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کی طرف سے تم اپنے خلاف کھلا ہوا الزام عائد کرلو۔''

یعنی تم نے اگر کافروں سے تعلقات قائم رکھے تو یہ تمہارے نفاق کا ثبوت ہوگا جس کے بعد یہ نمایاں ہوجائے گا کہ تم ان سزاؤں کا جو منافقین کی بتائی جارہی ہیں، پورے طور پر استحقاق رکھتے ہو۔ [۱]

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾

''بلاشبہ منافق لوگ آتش جہنم کے سب سے نیچے والے طبقہ میں ہوں گے اور ہرگز تم ان کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ سوا ان کے جنہوں نے توبہ کرلی اور اعمال درست کرلئے اور اللہ سے وابستہ ہوگئے اور اللہ کی اطاعت خلوص کے ساتھ کرنے لگے تو یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ ہوں گے اور اہل ایمان کو اللہ بہت بڑا اجر وثواب عطا فرمائے گا۔''

نفاق سے توبہ کی صورت میں انجام بخیر

یعنی نفاق کا جو انجام بد بیان ہوا ہے، وہ اس وقت ہے کہ جب آخر تک قائم وبرقرار رہے لیکن جس طرح کافر اگر مسلمان ہوجائے تو اس کا پہلے والا کفر نظر انداز ہوجائے گا، اسی طرح منافق اگر سچا مومن ہوجائے اب مومنین کے زمرہ میں داخل ہوجائے گا اور یہ نہ دیکھا جائے گا کہ وہ پہلے کیسا تھا۔ [۲]

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

''اللہ تمہیں عذاب کرکے کیا کرے گا! اگر تم شکر گزار رہو اور ایمان اختیار کرو اور اللہ قدردان ہے، بڑا جاننے والا۔''

یعنی تم اپنے عقائد و اعمال کی بدولت عذاب کے مستحق ہوتے ہو، ورنہ خدا کا عذاب کرنے سے کوئی فائدہ تھوڑی ہی ہے۔ وہ بے نیاز

---

[۱]۔ سلطنا مبینا برھانا بینا علی نفاقکم (جلالین) ثابت کنید برائے خدا بر خویشتن الزام ظاھر (ولی اللہ) کر دو واسطے اللہ کے اوپر اپنے غلبہ ظاہر (شاہ رفیع الدین)

[۲]۔ فاستثنیٰ منھم التائبین عن نفاقھم (تبیان)

مطلق ہے[۱] اور جذبات سے بھی بری ہے اسے معاذ اللہ کوئی دل کی بھڑاس نکالنا نہیں ہے۔

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا ﴿۱۴۸﴾

''اللہ برملا بدگوئی کو پسند نہیں کرتا، سوا اس کے جس پر ظلم ہوا ہو۔ اور اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔''

مظلوم کے لئے ظلم کو برا کہنے کا حق

''برملا بدگوئی'' یعنی بددعا یا غیبت جس کے معنی ہیں کسی کے عیوب کو ظاہر کرنا، یہ ناجائز ہے اور اللہ کو ناپسند ہے لیکن اس سے استثناء یہ ہے کہ جس پر ظلم ہوا ہو وہ مظلوم اپنا دردِ دل سنائے تو اس پر پابندی نہیں ہے، کیوں کہ اس کی زبان بندی اس کی فطرت کے ساتھ ناانصافی ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ بس اس ظلم کا اظہار کرے۔ یہ نہیں ہے کہ اب جذبہ مخالفت میں اس کی دوسری برائیاں بھی طشت از بام کرنے لگے۔

ہاں ظلم میں کوئی قید نہیں کہ کس درجہ کا ہو۔ یہاں تک کہ ایک روایت میں یہ ہے کہ اگر میزبان نے کسی مہمان کی خاطر داری میں، جتنی ہونا چاہئے، کمی کی ہے تو یہ اس مہمان پر ظلم ہے لہٰذا اس کو اس بدسلوکی کا تذکرہ کرنا درست ہے۔[۲]

اور ایک حدیث میں ظلم کی ایک ایسی قسم کا بیان ہے جسے ظلم محسوس کرنا بڑی بلند نظری کی بات ہے اور وہ یہ کہ کوئی تمہاری تعریفیں ایسی کرے جو غلط ہیں تو یہ بھی تم پر ظلم ہے لہٰذا تم کو اس کی رد کرنا چاہئے اور کہنا چاہئے کہ تم غلط بیان کر رہے ہو اور دوسروں کو بتانا چاہیے کہ یہ ان کا بیان بالکل غلط ہے۔[۳]

اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْہُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا ﴿۱۴۹﴾

''اگر کسی نیکی کو ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ یا کسی برائی سے درگزر کرو تو بلاشبہ اللہ معاف کرنے والا ہے، بڑا قدرت رکھنے والا۔''

''نیکی کو ظاہر کرو یا نہ کرو'' یعنی جس نے تمہارے ساتھ نیکی کی، اس کا چاہے تم اعلان کرو یا نہ کرو۔ یہ ایک تفسیر ہے[۴] اور دوسرے معنی یہ قرار دیئے گئے ہیں کہ تم جو نیکی کرو۔[۵]

میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ کیوں نہ ہم ان دونوں پہلوؤں کو سمولیں۔ ''اگر تم نیکی کو ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ یا برائی کو معاف کرو'' ...... یہ سب ہی کے کردار کے روشن پہلو معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے ''ظاہر کرو نیکی کو'' یعنی جو دوسرے نے تمہارے ساتھ کیا ہے یا چھپاؤ یعنی جو تم نے

---

[۱]۔ لا یجتلب بعذابکم نفعا ولا یدفع عن نفسه ضررا لانهما مستحیلان علیه (تبیان)

[۲]۔ روی عن ابی عبد اللہ انه قال هو الضیف ینزل بالتوجل فلا یحسن ضیافة جاز ان یقول ذٰلك فیه (تبیان)

[۳]۔ فی حدیث اٰخر فی تفسیر هٰذا قال: ان جآءك رجل فقال فیك مالیس فیك من الخیر والثناء والعمل الصالح فلا تقبله منه وکذبه فقد ظلمك (علی بن ابراهیم)

[۴]۔ لمن احسن الیکم شکرا له علی انعامه (مجمع البیان)

[۵]۔ اگر کھلم کھلا نیکی کرتے ہو یا چھپا کر (مولانا فرمان علی صاحب)

دوسرے کے ساتھ نیکی کی ہو، یا دوسرے کی برائی کو معاف کرو، تو یہ سب بہت اچھا ہے، کیوں کہ اللہ قدرت کے باوجود معاف کرتا ہے تو تم بھی دوسرے کی برائی کے اظہار کا حق رکھتے ہوئے جو پہلی آیت میں دیا گیا ہے، اگر برائی کا اظہار نہ کرو اور معاف کردو تو بہت اچھا ہے۔[1]

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡفُرُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يُّفَرِّقُوۡا بَيۡنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّنَكۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ وَّيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّتَّخِذُوۡا بَيۡنَ ذٰلِكَ سَبِيۡلًا ۙ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ حَقًّا‌ ۚ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا ﴿۱۵۱﴾

''بلاشبہ وہ جو اللہ اور اس کے پیغمبر کا انکار کرتے ہیں اور ''اللہ اور اس کے پیغمبروں میں تفریق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کچھ پر ایمان لاتے ہیں اور کچھ کا انکار کرتے ہیں اور اس کے بیچ میں ایک راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، یہ ہیں حقیقت میں کافر لوگ، اور ہم نے کافروں کے لئے توہین آمیز سزا مہیا کر رکھی ہے۔''

یہ یہود کا تذکرہ ہے کیوں کہ یہود اپنے کو خدا پرست کہتے تھے مگر انبیاء میں حضرت موسیٰؑ کو مانتے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ قرآن مجید نے ان کے بارے میں ارشاد کیا ہے کہ یہ ان کا اللہ کو ماننا انہیں مومنین کی صف میں کھڑا نہیں کر سکتا جب کہ یہ پیغمبروں کو نہیں مانتے تو ان کا خدا پرستی کا اظہار بھی بے کار ہے اور یہ حقیقی معنی میں خاص الخاص کافرین کے لقب سے ملقب ہونے کے لائق و سزاوار ہیں۔

انکار رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مثل انکار خدا کے موجب کفر

اب نصاریٰ بھی اس حکم میں ہیں، اس لئے کہ وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں مگر آخری رسول حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے لہٰذا تفریق بین اللہ والرسل کے جرم کے وہ بھی مرتب ہیں۔

اس سے اس دور کے ان اشخاص کے خیال کا قطعی جواب ہوجاتا ہے جو بعض جماعتوں یا بعض اشخاص کے یہاں خدا کے وجود یا اس کی وحدت کے اقرار کو دکھلا کر کہتے ہیں کہ وہ کافر کہاں رہے؟ وہ تو خدا کو مانتے ہیں۔

اس کے جواب میں قرآن کی صاف آواز ہے کہ بغیر رسالت کی تصدیق کے صرف وحدانیت کا اقرار کسی کو بھی کفر کے دائرہ سے نکال کر ایمان کے حلقہ میں داخل نہیں کر سکتا۔

ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول ضروری چیز ہے اور منکر رسولؐ اسی طرح کافر ہے جس طرح منکر خدا کافر ہوتا ہے۔

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمۡ يُفَرِّقُوۡا بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ اُولٰٓـئِكَ سَوۡفَ يُؤۡتِيۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۵۲﴾

---

[1]. فلا تجهروا له بالسوء من القول الذی اذنت لکم ان تجهروا به (مجمع البیان)

''اور وہ جو اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کی، یہ وہ ہوں گے جنہیں وہ ان کے اجر وثواب عطا کرے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے، بہت مہربان۔''

یہ سب پر ایمان لانے والے مسلمان ہیں، جن کی شان یہ ہے کہ: یومنون بما انزل الیك وما انزل من قبلك ''جو آپ پر اترا ہے، اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور جو آپ کے پہلے اترا تھا، اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔''

''انہیں ان کا اجر عطا ہوگا''۔ یعنی اب جیسے جس کے اعمال ہوں، ان کے اعمال کے اعتبار سے آخرت میں جزاء عطا ہوگی۔

اس سے پہلی حقیقت یہ نمایاں ہے کہ نجات کے لئے اسلام لازم ہے۔ یعنی انبیاء الٰہی میں کسی ایک کو بھی جو نہ مانتا ہو، وہ نجات کا مستحق نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ اعمال کا اجر اسلام کے ساتھ مشروط ہے لہٰذا جب تک عقائد درست نہ ہوں، حسن عمل کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ اسلام وایمان کے بعد جزاء جو ملتی ہے، وہ بمناسبت اعمال ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ مسلمان بلالحاظ اعمال بلند درجات کا حق دار ہوجائے۔

یَسۡـَٔلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَيۡهِمۡ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدۡ سَاَلُوۡا مُوۡسٰٓى اَكۡبَرَ مِنۡ ذٰ لِكَ فَقَالُوۡۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهۡرَةً فَاَخَذَتۡهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلۡمِهِمۡ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ فَعَفَوۡنَا عَنۡ ذٰ لِكَ‌ ۚ وَاٰتَيۡنَا مُوۡسٰى سُلۡطٰنًا مُّبِيۡنًا ﴿۱۵۳﴾

''آپ سے اہل کتاب یہ فرمائش کرتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے لکھی لکھائی کتاب اتاریں۔ انہوں نے موسیٰؑ سے تو اس سے بھی بڑی چیز کی فرمائش کی تھی اور کہا تھا کہ ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھلا دیجئے تو ان پر ان کی اس زیادتی کی وجہ سے بجلی گری، پھر انہوں نے بعد اس کے کہ کھلی ہوئی نشانیاں ان کے پاس آئیں، گوسالہ تیار کیا تو ہم نے اس سے درگزر کیا اور موسیٰؑ کو ہم نے نمایاں غلبہ عطا کیا۔''

توریت مکتوبی صورت سے نازل ہوئی تھی مگر قرآن لوح محفوظ میں لکھا ہوا موجود ہوتے ہوئے رسولؐ پر رفتہ رفتہ اترا غیر مکتوبی شکل میں۔ کتاب اس کے بعد ہوئی۔ اسے یہود نے ایمان سے انحراف کا ایک بہانہ بنایا کہ اللہ کی کتاب ہے تو وہ لکھی ہوئی شکل میں کیوں نہ اتری۔ [1]

قرآن نے ان کے ماضی کی تاریخ یاد دلاتے ہوئے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ توریت تو لکھی ہوئی شکل میں اتری تھی، اس پر یہ سب کب ایمان لائے اور کب عقیدہ حق پر ثابت قدم رہے جو اب یقین کیا جائے کہ ان کی فرمائش پوری ہوجائے تو یہ ایمان اختیار کریں گے۔

[1] جملة واحدة كما انزل على موسىٰ (جلالین) کتابی از آسمان یعنی ایك دفعه (شاہ ولی اللہ)

رہ گیا فرمائش کرنا تو ان کی فرمائشیں تو اتنی غیر معقول ہوا کرتی ہیں کہ اس کے پہلے اللہ کے دیدار کی فرمائش کر چکے ہیں۔ پھر ان کی اس فرمائش کا کیا وزن سمجھا جائے۔

بعض نے کہا ہے، ان کی فرمائش یہ تھی کہ اس قرآن کے علاوہ کوئی کتاب خاص ان کے لئے اترے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ وہ چاہتے تھے، ان کے اکابر کے پاس پیغمبر پر ایمان لانے کے لئے خطوط اللہ کی طرف سے آئیں۔[1]

آخر میں جو ہے کہ 'موسیٰ کہ ہم نے نمایاں غلبہ عطا کیا' اس غلبہ سے قہر وغلبہ والا دنیاوی اقتدار مراد نہیں ہے بلکہ یہ حقانیت اور دلائل کے لحاظ سے غلبہ ہے جو ہمیشہ باطل کے مقابلہ میں حق کے لئے ہوتا ہے۔[2]

وَرَفَعۡنَا فَوۡقَهُمُ الطُّوۡرَ بِمِيۡثَاقِهِمۡ وَقُلۡنَا لَهُمُ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُلۡنَا لَهُمۡ لَا تَعۡدُوۡا فِى السَّبۡتِ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ﴿۱۵۴﴾

''اور ہم نے کوہ طور کو اونچا کیا ان سے عہد لینے کے لئے اور ہم نے ان سے کہا کہ دروازہ میں سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور ان سے ہم نے کہا کہ ہفتہ کے دن کے بارے میں قانون الٰہی سے تجاوز نہ کرو اور ان سے ہم نے مضبوط عہد لیا۔''

اس میں حسب ذیل امور کا تذکرہ ہے جو پہلے بیان ہو چکے ہیں: ایک طور کا ان پر بلند ہونا۔ اس کے متعلق ہم وہاں لکھ چکے ہیں کہ اس کی پوری نوعیت تو قرآن مجید سے ظاہر نہیں ہوتی کہ طور کس طرح بلند ہوا تھا مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی عظیم مظاہرہ قدرت تھا۔

دوسرے دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کا حکم۔ اس کا ذکر پہلے دو جگہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے کہ ان سے اس موقع پر کہا گیا تھا کہ حطۃ کہو اور انہوں نے بدل کر دوسرا لفظ کہہ دیا۔ اس کی تشریح وہاں بقدر امکان کی گئی ہے۔

تیسرے سبت یعنی ہفتہ کے دن کے متعلق پابندی، اس کا بیان بھی پہلے ہو چکا ہے۔

فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ وَكُفۡرِهِمۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ وَّقَوۡلِهِمۡ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيۡهَا بِكُفۡرِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۱۵۵﴾

''تو ان کے اپنے عہد کو توڑنے اور آیات الٰہی کے ساتھ ان کے کفر اختیار کرنے اور پیغمبروں کو ناحق ان کے قتل کرنے اور ان کے اس قول کی وجہ سے کہ ہمارے دلوں پر تو غلاف چڑھے ہوئے ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے

[1] ذكر ذالك ابن حزم واختاره الطبرى (تبيان)

[2] اى حجة ظاهرة تبين عن صدقه (مجمع البيان)

سبب سے مہر کر دی ہے تو وہ ایمان نہیں رکھتے مگر بہت کم۔"

یہاں سے یہود کے خلاف "فرد قرار داد جرم" شروع ہوا ہے۔ اس سبب سے اور اس سبب سے۔ یہ ابھی تشنۂ تکمیل جملہ ہے کہ اس سب کے سبب سے کیا ہوا؟ مگر اس کے لئے جلدی نہیں کرنا چاہئے۔ یہ اس کے بعد کی آیت میں بھی نہیں ہے اور پھر اس کے بعد کی آیت میں بھی بلکہ کافی دیر کے بعد آئے گا کہ اس سب کے سبب سے ان کے لئے کیا ہوا؟

اب اس آیت میں ان امور میں سے جو انہوں نے کیے ہیں جن باتوں کا ذکر ہے، وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) عہد شکنی۔ یہ وہ عہد بھی ہے جو بمقتضائے عبودیت الٰہی ہر انسان کے ذمہ واجب الادا ہے اور وہ بھی جو انہوں نے اپنے دور کے پیغمبر پر ایمان لا کر اطاعت کا معاہدہ کیا ہے۔

(۲) آیات الٰہی کے ساتھ کفر۔ ان آیات سے مراد قدرت الٰہی کی نشانیاں اور حقانیت پیغمبر کے دلائل ہیں [۱] کیوں کہ یہ واقعہ ہے کہ بنی اسرائیل کے سامنے بکثرت مظاہر قدرت پیش ہوئے جو معجزات کی حیثیت رکھتے تھے مگر ان میں کے بہت سے پھر بھی راہ راست سے منحرف ہو جاتے تھے اور تسلیم نہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ آیات سے کتاب الٰہی یعنی توریت کے مندرجات بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

(۳) پیغمبروں کا ناحق قتل کرنا۔ ظاہر ہے کہ پیغمبروں کو جو قتل کیا جائے گا، وہ ناحق ہی ہو گا لہٰذا یہ قید کسی خصوصیت کے اظہار کے لئے نہیں ہے بلکہ اس قتل کے جرم ہونے کا سبب ظاہر کرنے کے لئے ہے یہ قتل ہمیشہ خون ناحق ہی ہوتا ہے۔

ہاں یہ ظاہر ہے کہ اس گروہ نے جو اس وقت محل تخاطب ہے، انبیاء کو قتل نہیں کیا تھا مگر چونکہ یہ نقطہ خیال میں ان قاتلوں سے متحد ہیں، اس لئے ان کی طرف سے اس جرم کے ارتکاب کی نسبت دی جا رہی ہے۔ [۲]

(۴) ان کا یہ کہنا کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں یعنی وہ ایمان سے انحراف کا اس طنزیہ انداز میں اعلان کرتے ہیں کہ پیغمبر کی ہدایتیں ہم پر اثر کر ہی نہیں سکتیں، اس لئے کہ ہمارے دلوں پر تو غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ ہم ایمان قبول کر نہیں سکتے۔ اس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔ یہاں قرآن نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ کہتے تو ٹھیک ہیں۔ ان کے دلوں پر تو غلاف کیسے، مہریں لگ چکی ہیں کہ ان میں صدائے حق کا اثر پہونچ

ہی نہیں سکتا مگر یہ خود ان کے کردار کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے ضمیر کی آواز سے اتنی بے اعتنائی برتی کہ ضمیر مردہ ہو گیا۔ اسی بنا پر وہ اس کی وجہ سے قابل معافی نہیں قرار پاتے۔

آخر میں جو ہے کہ "وہ ایمان نہیں رکھتے مگر بہت کم" یہ کمی ایمان سے بھی متعلق ہو سکتی ہے کہ یہ جو بعض چیزوں کی تصدیق کرتے ہیں جیسے یہود کہ موسیٰؑ کی رسالت کو مانتے ہیں، وہ مقدار میں کم ہے اور اس سے زیادہ حقیقتوں کے وہ منکر ہیں تو ان کے ایمان کا پلہ کفر کے مقابلہ میں سبک ہے۔ [۳]

---

[۱] ای جحودھم باعلام اللہ وحججہ وادلتہ التی احتج بہا علیہم فی صدق انبیائہ ورسلہ (تبیان)

[۲] ھولاء یقتلوا الانبیاء وانما قتلھم اجدادھم واجداد اجداھم فرضی ھؤلاء بذلك فألزمھم اللہ القتل بفعل اجدادھم فكذلك من رضی بفعل قوم فقد نومہ وان لم یفعلہ (علی بن ابراھیم)

[۳] صدقوا ببعض الانبیاء وبعض الکتب وکذبوا بالبعض (تبیان)

اور دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ کمی ایمان لانے والوں کی تعداد کے لحاظ سے ہے یعنی بہت کم ان میں وہ افراد ہو سکتے ہیں جو حق کو قبول کرلیں۔ زیادہ تو ایسے ہی ہیں جن سے ان کے دانستہ انکار اور مسلسل عناد کی وجہ سے قبول حق کی صلاحیت سلب ہی ہو گئی ہے۔

وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾

''اوران کے کفر کی وجہ سے اور مریم پر بڑا اتہام لگانے کی وجہ سے۔''

بسلسلہ سابق یہود کے جرائم میں سے پانچویں بات ہے جس کا دو الفاظ میں ذکر ہوا ہے: پہلے کفر مگر چونکہ آیات الٰہیہ کے ساتھ کفر کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، اس لئے بظاہر یہ کفر کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ یہ مریمؑ پر بہتان لگانا ہی ہے جسے پہلے اجمالی طور پر کفر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور پھر اس کی تشریح یہ کی ہے کہ انہوں نے مریمؑ پر بہت بڑا اتہام لگایا۔

یوں اتہام کسی پر تو صرف ایک گناہ ہوتا ہے لیکن یہ اتہام چونکہ ایک مرسل کی ماں پر ہے ایسا جس سے اس مرسل کی حقانیت اور عظمت پر اثر پڑتا ہے، اس لئے وہ کفر قرار پاتا ہے۔

اور ایک خیال یہ ہے کہ یہ کفر حقانیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ہے [1] اور پھر بہتان کا جرم جناب مریمؑ سے متعلق ہے۔

اس صورت میں یہ دونوں الفاظ دو جرائم کا پتہ دیں گی اور ان کے لحاظ سے اب جرائم کی تعداد چھ تک پہنچے گی۔

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾

''اور ان کے اس طرح کہنے سے ہم نے خدا کے پیغمبر مسیح عیسیٰ فرزند مریم کو قتل کر دیا حالانکہ انہوں نے ان کو نہ قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ انہیں شباہت محسوس کرائی گئی [2] اور جنہوں نے اس بارے میں اختلاف کیا، یقیناً وہ اس کے متعلق شک میں ہیں۔ انہیں سوا گمان کی پیروی کے کوئی علم نہیں ہے اور وہ انہیں یقیناً قتل نہیں کر پائے بلکہ انہیں اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ زبردست ہے، بالکل صحیح کام کرنے والا۔''

ان کا اصل قول تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کرنے کے بارے میں ان کے صرف نام کے ساتھ ہوگا، اس لئے کہ وہ ان کے مسیح اور رسول خدا ہونے کے قائل نہ تھے لہٰذا قرآن میں جو ان کا قول درج کیا گیا ہے، وہ نقل بالمعنی کے قبیل سے ہوگا۔ یعنی خالق نے ان کی بات کو بالکل ان

---

[1] ۔یکفرھم ای یجحدھولاء لعیسیٰ علیہ السلام (مجمع البیان)

[2] ۔مشتبہ شد برایشان (شاہ ولی اللہ) شبہ ڈالا گیا واسطے ان کے (رفیع الدین)

کیے لفظوں میں درج نہیں کیا ہے بلکہ اس مضمون کو اپنے لفظوں میں جناب عیسیٰ علیہ السلام کے نام کے ساتھ شایان شان القاب کے اضافہ کے ساتھ درج کیا ہے۔ [1]

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ الفاظ انہی کی زبان کے ہوں لیکن بطور طنز یعنی وہ جو کہتے تھے اس کا مطلب یہ تھا کہ دیکھو جو مسیح اور اللہ کے پیغمبر کہے جاتے تھے یا اپنے کو کہتے تھے انہیں کس طرح ہم نے قتل کر دیا۔

پہلی صورت میں جناب عیسیٰ علیہ السلام کے نام کے ساتھ ''مسیح'' اور ''رسول اللہ'' کے الفاظ کا خالق کی طرف سے اضافہ ان کے اس فعل کے ''جرم شدید'' ہونے کے سبب کا اظہار ہے کہ ایسی ہستی کے متعلق جو واقعاً مسیح اور رسول خدا ہے، وہ فخر یہ اس کا اظہار کرتے ہیں کہ انہوں نے انہیں قتل کر دیا اور سولی پر چڑھا دیا اور اپنے حدود اختیار میں انہوں نے ایسا کرنے میں کوئی کمی بھی نہیں کی۔ یہ اور بات ہے کہ خالق نے ان کے منصوبہ کو شکست دے دی اور وہ اس طرح کہ انہی کی طرف کے اس آدمی کو جسے انہوں نے مکان کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باہر نکال کر لانے کے لئے بھیجا تھا، عیسیٰؑ کی شبیہ بنا دیا اور انہوں نے اسے عیسیٰؑ سمجھتے ہوئے قتل کر دیا۔ [2]

قرآن مجید کے بعد کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود یہودیوں کو بھی اس کا اطمینان نہیں تھا کہ انہوں نے جناب عیسیٰ علیہ السلام ہی کو قتل کیا بلکہ انہیں اس بارے میں ایک تذبذب سا تھا۔ غالباً اس لئے کہ اگر یہ عیسیٰؑ تھے تو وہ آدمی کہاں ہے جسے ہم نے گرفتار کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ شباہت بھی چہرہ کی تھی مگر قد وقامت عیسیٰؑ کا نہ تھا۔ اس لئے شک ہو رہا تھا کہ یہ کوئی دوسرا شخص تو نہیں ہے۔ [3]

اب حقیقت میں کیا واقعہ ہوا تھا؟ اسے قرآن مجید نے ان الفاظ میں کہا ہے کہ: بل رفعہ اللہ'' بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف بلند کر لیا۔''

اگر تنہا یہ الفاظ ہوتے یہ تصور ہوسکتا تھا کہ یہ رفعت صرف روحانی بلندی ہے اور یہ رفعت، رفعت مرتبہ جو ہر مقرب باری کے لئے بعد وفات لازم ہے لیکن چونکہ یہ رفعہ اللہ کا لفظ قتل اور صلب کی نفی کے مقابلہ میں ہے کہ انہوں نے انہیں قتل نہیں کیا اور سولی نہیں دی اور یقیناً نہیں دی۔ اس کے بعد سے ''بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف بلند کر لیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ بحالت حیات جسمانی طور پر بلند کرنا ہے جو قتل اور صلب دونوں کے مقابلہ میں ہے۔ پھر اگر یہ اٹھانا وہ ہوتا جو اموات کے لئے مستعمل ہوتا ہے تو لاش تو اس عالم ارضی ہی میں، اسی مکان میں موجود ملتی جہاں وہ تھے تو وہ لوگ شبہ میں جہاں مبتلا ہوتے؟!

قرآن مجید کے اتنے اہتمام اور اتنی تاکید کے بعد کہ وہ بار بار قتل کی نفی کر رہا ہے اور پہلی دفعہ دہری دہری نفی سے کہ وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ اور پھر يَقِيۡنًا کے لفظ کے ساتھ تیسری مرتبہ وَمَا قَتَلُوۡهُ کہہ رہا ہے، پھر یہ انتہائی حیرت انگیز سانحہ نہیں تو اور کیا ہے کہ قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا اقرار کرنے والوں میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی جو حیات مسیح کی منکر ہے اور یہود کے اس دعوے سے کہ انہوں نے مسیح ہی کو سولی پر چڑھایا تھا، متفق ہے۔

بلا شبہ یہ لوگ خالق کے یہاں اسی عتاب و عذاب کے مستحق ہوسکتے ہیں جس کا خالق نے یہود کے لئے ذکر فرمایا ہے ان کے اس قول کی

---

[1] قیل انہ من قول اللہ سبحانہ لا علی وجہ الحکایۃ عنہم وتقدیرہ الذی ھو رسولی (مجمع البیان)

[2] القی اللہ علیہ شبہہ فظنوہ ایاہ (جلالین)

[3] حیث قال بعضہم لما رأوا المقتول: الوجہ وجہ عیسیٰ علیہ السلام والجسد لیس بجسدہ (جلالین)

بنا پر کہ انہوں نے عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھایا اور قتل کیا ہے۔ اس لئے کہ جب جرم ایک ہے تو حکم اور پاداش میں تفریق کے کوئی معنی نہیں۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿١٥٩﴾

''اور اہل کتاب میں کوئی نہیں ہے مگر یہ کہ وہ ضرور ان پر ان کے مرنے سے پہلے ایمان لے آئیگا۔ [1]
اور روز قیامت وہ ان کے خلاف گواہ ہوں گے۔''

حیات مسیح علیہ السلام

اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت ابھی واقع نہیں ہوئی ہے، کبھی بعد میں واقع ہوگی اور اس کے پہلے جتنے اہل کتاب اس وقت موجود ہوں گے، وہ ان پر ایمان لے آئیں گے۔ [2]

یہ کب ہوگا؟ اسی وقت جب دین حقیقی کا غلبہ ہوگا اور لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کا مصداق پورا ہوگا تو چونکہ اس دین کا لازمی جز ہے یہ کہ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (البقرة۔۴) ''وہ اس پر بھی ایمان لاتے ہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اترا اور اس پر بھی کہ جو پہلے اتر چکا ہے'' اس لئے جو اس دین کو اختیار کرتے ہیں، انہیں گزشتہ انبیاء کو ماننا ضروری ہے اور ان گزشتہ انبیاء کے نمایاں افراد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں لہٰذا ان کی نبوت پر بھی ایمان لانا سب کو ضروری ہوگا۔

شاہ عبد القادر لکھتے ہیں کہ:۔

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں۔ جب یہود میں دجال پیدا ہوگا، تب اس جہان میں آکر اس کو ماریںگے اور یہود و نصاریٰ سب ان پر ایمان لاویں گے کہ یہ نہ مرے تھے'' (موضح القرآن)

مسند احادیث سے ثابت ہے کہ یہ موقع ہوگا جب پیغمبر اسلامؐ کے بارہویں جانشین حضرت مہدی دین عجل اللہ فرجہ ظہور فرمائیں گے۔ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے اور نائب خاتم الانبیاء کے معین و مددگار رہوں گے۔

اب لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ کی ضمیر میں دو احتمال ہوئے:

ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع اور دوسرا جو شاہ عبد القادر کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، یہ ہے کہ ضمیر اس واقعہ یعنی وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ کی طرف عائد ہو کر یہود ابھی انکار کر رہے ہیں یا شک میں ہیں مگر یہ حقیقت ان پر ایک وقت میں آشکار ہو جائے گی اور اس وقت وہ بھی اس کے ماننے کے لئے مجبور ہوں گے۔

---

[1]۔ ایمان آورد بعیسیٰ علیہ السلام از موت عیسیٰ علیہ السلام (شاہ ولی اللہ)

[2]۔ یعنی روزی کہ حاضر شوند نزول عیسیٰ علیہ السلام را البتہ ایمان آورد (شاہ ولی اللہ)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ''ان کے خلاف گواہ ہوں گے''۔ بایں معنی کہ انہوں نے ان کی نسبت جو غلط تصورات قائم کر رکھے ہیں، ان کی نفی کردیں گے۔ یہود جو ان کی حقانیت اور زندگی کے منکر ہیں، ان کا قول بھی ان کے زندہ دنیا میں آجانے سے باطل ہوجائے گا اور نصاریٰ جو انہیں خدا کا بیٹا کہہ رہا ہے، ان کا قول بھی غلط ہوجائے گا [1] اس طرح کہ وہ خود اپنے بندۂ خدا بلکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیرو ہونے کا مظاہرہ کردیں گے نائب رسول حضرت مہدی آخرالزماں عجل اللہ فرجہ کے پیچھے نماز پڑھ کر جو صحاح اہل سنت سے بھی ثابت ہے۔

شروع میں اکثر مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ اِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ کی دوسری ضمیر جو ''موتہ'' میں ہے خود اس کتابی کی طرف عائد ہوتی ہے جس سے معنی ہوتے تھے کہ کوئی اہل کتاب میں سے ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائے۔ اس کی وجہ سے قرآن کی حقانیت کے خلاف یہ شبہ پیدا کیا جاتا تھا کہ ہمارے سامنے یہودی دنیا سے اٹھتا ہے اور وہ قطعاً ایمان اختیار نہیں کرتا تو قرآن نے یہ کیونکر کہہ دیا کہ جو بھی یہودی ہے وہ اپنی موت سے پہلے ایمان ضرور لے آئے گا۔ اس غلط فہمی کا پردہ امام محمد باقر علیہ السلام نے چاک کیا اور فرمایا کہ یہ ضمیر اس کتابی کی طرف نہیں بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے کوئی ایسا نہیں ہے جو ایمان قبول نہ کرے اور یہ اسی وقت ہوگا جب وہ زمین پر اتریں گے اور حضرت مہدی آخرالزمان علیہ السلام کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔

امام کے اس ارشاد کو سن کر مشہور دشمن اہل بیت ظالم حجاج بن یوسف نے اعتراف کیا کہ اس کی اس جواب سے تشفی ہوگئی اور اس آیت کے مضمون کی بنا پر جو ایک الجھن تھی، وہ دور ہوگئی۔ [2]

فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ وَبِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَثِيۡرًا ۝١٦٠ وَّاَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ؕ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۝١٦١

''تو یہودیوں کے بڑے ظالمانہ رویہ کے سبب سے ہم نے ان پر وہ اچھی اچھی نعمتیں جو ان کے لئے حلال تھیں، حرام کردیں اور ان کے روکنے کی وجہ سے بہت سوں کو اللہ کے راستے سے اور ان کے سود لینے کی وجہ سے حالانکہ انہیں اس کی ممانعت تھی اور لوگوں کے مال کو ان کے ناحق کھانے کی وجہ سے اور ہم نے ان میں سے جو کفر پر قائم

---

[1]۔ اقر علی نفسه بالعبودية (تبيان)

[2]۔ عن شهر بن حوشب قال قال لی الحجاج یا شهر اية فی كتاب الله قد اعيتنی فقلت ايها الامير اية اية هی؟ فقال قوله: وان من اهل كتاب الا ليومنن به قبل موته والله انی لامر باليهودی والنصرانی فاضرب عنقه ثم ارمعة يعينی فما اراه يحرك شفتيه حتی يخمد فقلت اصلح الله الامير ليس علی ما تاولت قال كيف هو؟ قلت ان عيسیٰ علیہ السلام ينزل قبل يوم القيمة الی الدنيا فلا يبقی اهل ملة يهودی ولا غيره الا امن به قبل موته وليصلی خلف لمهدی قال ويحك انی لك هذا فقلت حدثنی به محمد بن علی بن الحسين بن علی بن ابی طالب فقال جئت به من عين صافية (تفسير علی بن ابراهيم)

رہیں[1] ان کے لئے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے۔"

گزشتہ جرائم پر اب جا کر حکم سنا یا گیا اور چونکہ وہ سلسلہ طویل ہو گیا تھا، اس وجہ سے اور اس وجہ سے، تو پھر انہی باتوں کو گویا سمیٹ کر ایک جامع لفظ جو سب گناہوں پر حاوی ہے یعنی "ظلم" کا لفظ[2] جس پر تنوین یہاں کثرت وعظمت کا اظہار کرتی ہے کہ ان کا ظلم بہت بڑا اور سخت تھا، سزا یہ بتائی گئی کہ آخرت میں جو عذاب ہے، وہ تو ہے ہی، دنیا میں یہ کیا کم وبال ہے کہ کتنی اللہ کی نعمتوں سے وہ محروم ہو گئے ہیں اور پھر اس سزا کے بعد اب ان کے مزید جرائم کا ذکر ہو گیا جو معاملات مالی سے متعلق ہیں اور پھر اس سب کے بعد عذاب آخرت کا اعلان ہو گیا ان کے لئے جو اپنے کفر اور معاصی پر آخر تک برقرار رہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان ہو جائیں اور حسن عمل اختیار کریں، انہیں ان کے گزشتہ اعمال کی سزا نہ دی جائے گی۔

یہ نعمتیں جن سے وہ محروم ہو گئے، ظاہر الفاظ قرآنی سے تو ذہن میں یہی آتا ہے کہ اس سے مراد وہ سخت شرعی احکام وقوانین ہیں جو یہودیوں کی شریعت میں خصوصی طور پر موجود ہیں، جن کا ایک اور جگہ قرآن مجید میں ذکر ہے[3] کہ:

حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ شُحُوۡمَهُمَاۤ اِلَّا مَا حَمَلَتۡ ظُهُوۡرُهُمَاۤ اَوِ الۡحَـوَايَاۤ اَوۡ مَا اخۡتَلَطَ بِعَظۡمٍ. (انعام۔۱۴۶)

ہم نے ان پر ناخن والے سب جانور حرام کر دیئے اور گائے بیل، بھیڑ بکری کی چربی حرام کر دی یا پیٹ کے اندر کی چیزیں یا جس میں ہڈی کی شرکت ہو۔

وہاں بھی ان محرکات کے ذکر کے بعد یہ جملہ ارشاد ہوا ہے کہ:۔

ذٰلِكَ جَزَيۡنٰهُمۡ بِبَغۡيِهِمۡ

یہ ہم نے سزا دی ان کے ظلم کی[4]

لہٰذا ذہن میں آنے والی قریبی چیز یہی ہے کہ یہاں:۔

حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ

ہم نے حرام کر دیں ان پر وہ نعمتیں جو ان پر حلال تھیں۔

اس اجمال سے وہی تفصیل مراد ہو جو وہاں درج ہے مگر بعض اہل نظر کو اس میں یہ دشواری محسوس ہوئی ہے کہ یہ احکام تو شریعت توریت میں پہلے سے موجود تھے اور جرائم جن کا ذکر ہوا ہے یعنی جناب مریمؑ پر بہتان لگانا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرنا اور ان کے قتل کا دعویٰ کرنا، یہ سب بعد کی باتیں ہیں تو انہیں ان کی سزا کیوں کر سمجھا جا سکتا ہے؟ اس لئے "ہم نے وہ نعمتیں ان پر حرام کر دیں" اس کے معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ ان بداعمالیوں کی سزا میں یہ ہوا کہ جو نعمتیں مثلاً نبوت اور سلطنت وغیرہ انہیں عطا کی گئی تھیں، انہیں ان پر حرام کر دیا یعنی ہمیشہ کے لئے سلب کر دیا۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:۔

---

[1]۔ مهیا کردیم برای کافران ایشان یعنی مصران بر کفر (شاہ ولی اللہ)

[2]۔ لما طال الكلام اجمل تعالیٰ ماذکره هٰهُنا فی قوله "فبظلم" (تبیان)

[3]۔ هی التی فی قوله: حرمنا کل ذی ظفر الاٰیة (جلالین)

[4]۔ فهٰذا البغی هو الظلم الذی ذکره هٰهنا (تبیان)

''ایں بمثابۂ این است که ضربت علیھم الذلة والمسکنة الایة: وایں آیت: وحرام علٰی قریة اھلکناھا (فتح الرحمن)

مگر یہ معنی ان الفاظ کے ظاہری مفہوم سے بعید ضرور ہیں اور اس لئے ان کے فرزند شاہ عبدالقادر صاحب نے مفہوم وہی پہلا قرار دیا ہے اور یہ کہا کہ مذکورہ بالا جرائم کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ان سخت احکام سے پہلے ہی ہوئے ہوں بلکہ یہ جرائم ان اشخاص کی اس خبیث طبیعت کی نشاندہی کرنے والے ہیں جو پہلے ہی سے تھی، چاہے اس کے نتائج ان جرائم کی شکل میں سامنے بعد میں آئے ہوں، اس لئے خدا نے جو ان کی طبیعتوں کی برائی سے واقف تھا، ان کے لئے پہلے ہی سے اپنے احکام میں سختی برتی۔[1]

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾

''اور ان میں سے وہ جو علم میں مضبوط ہیں اور مسلمان کہ ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپ پر اتارا گیا اور جو آپ کے پہلے اتارا گیا تھا اور نماز کے پابندی سے ادا کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور روز آخرت پر یقین رکھنے والے، یہ وہ ہیں کہ ان کو ہم عطا کریں گے بہت بڑا اجر وثواب۔''

وہ اہل کتاب جو علم میں مضبوط ہیں، وہ اسلام قبول ہی کر لیتے ہیں، اس لئے اس کے بعد وہ بھی مومنین کی جماعت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ جو کہا گیا ''اور مسلمان'' اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے عیسائیت کے بعد اسلام قبول نہیں کیا بلکہ شروع شروع مذہب جو انہوں نے اختیار کیا، وہ اسلام ہی ہے[2] اب خود وہ پیدائشی ہی مسلم ہوں یا بت پرستی اور لا مذہبیت کے دور سے گذر کر اسلام لائے ہوں۔

اس کی نظیر پہلے دو جگہ آچکی ہے۔ جہاں ارشاد ہوا تھا: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٔيْنَ وَالنَّصٰرٰى (حج۔۱۷) اور دوسری جگہ: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى (مائدۃ۔۶۹)۔

ان تمام آیتوں میں یہود ونصاریٰ کے ساتھ جو الذین اٰمنوا آیا ہے، اس کا یہی مطلب ہے کہ یہ وہ ہیں جنہوں نے شروع ہی سے مذہب جو اختیار کیا وہ اسلام ہی ہے، یہودیت یا نصرانیت نہیں اور الذین ھادو وغیرہ سے مراد وہ ہیں جو پہلے ان مذاہب کو اختیار کیے ہوئے تھے اور اب مسلمان ہوئے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ان آیات میں سے کسی سے بھی یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ نجات اور ثواب آخرت کے لئے اسلام کی شرط نہیں ہے

---

[1]۔ یعنی اوپر سے شرارتیں ان کی جو ذکر کیں، بعض پہلے ہوئیں اور بعض پیچھے لیکن مجمل یہ کہ گناہ پر دلیر تھے۔ اس واسطے ان کی شریعت سخت رکھی کہ سرکشی ٹوٹے (موضح القرآن)

[2]۔ یعنی اصحاب النبی من غیر اھل الکتاب (مجمع البیان)

بلکہ ہر جماعت میں جو خوش عقیدہ اور نیکوکار ہوں، وہ نجات اور ثواب کے حق دار ہیں۔
یہ ہرگز درست نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر جماعت میں واقعاً نیک عقیدہ اور نیک عمل وہی ہونگے جو تعصّبات کے پردوں کو چاک کر کے حقیقت کا جلوہ دیکھیں اور صدق دل سے حقیقتوں کو مان کر اسلام قبول کریں اور اس صالح حیات کے پابند ہوں جس کا نام ''شریعت محمدیﷺ'' ہے۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ﴿١٦٣﴾

''بلاشبہ ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح وحی بھیجی تھی نوح اور ان کے بعد والے پیغمبروں کی طرف اور وحی بھیجی تھی ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب [1] اور عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر اور ہم نے داؤدؑ کو زبور عطا کی تھی۔''

اسباط یعنی اولاد یعقوبؑ کی طرف وحی کا ذکر ان انبیاء کے اعتبار سے ہے جو ان کی نسل میں بعد کو ہوئے۔ اس لئے کہ حضرت یعقوبؑ کی خود صلبی اولاد جو برادران یوسفؑ تھے، نبوت کے مرتبہ پر فائز نہ تھے [2] جو خود ان کے کردار سے ظاہر ہے۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَٰهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴿١٦٤﴾

''اور کچھ پیغمبر وہ جن کے واقعات ہم نے آپ سے اس کے پہلے بیان کر دیئے ہیں اور کچھ وہ پیغمبر جن کے حالات ہم نے آپ سے بیان نہیں کیے ہیں اور اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا جیسا کلام کرنے کا حق تھا۔''

اس کے قبل کی آیت کے الفاظ اس طرح تھے کہ ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی بھیجی جیسے نوحؑ اور ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ وغیرہ کی طرف بھیجی تھی۔ اگر اس پر لفظی حیثیت سے عطف ہوتا تو کہا جاتا کہ: وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ الخ یعنی اور جس طرح ان پیغمبروں کی طرف وحی بھیجی جن کے حالات بیان ہوئے ہیں اور ان پیغمبروں کی طرف جن کے حالات بیان نہیں ہوئے ہیں مگر چونکہ وحی کے مفہوم میں رسول بنا کر بھیجنا مضمر ہے، اس لئے اس آیت میں عطف اس کے معنی کے اعتبار سے ہوا: وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ، اس طرح مطلب یہ ہوا کہ ''اور جس طرح ان پیغمبروں کو ہم نے بھیجا جن کے واقعات بیان ہوئے ہیں اور ان پیغمبروں کو جن کے واقعات

---

[1]۔ یعقوب والاسباط اولادہ (جلالین)
[2]۔ لیس یصح عندنا ان الاسباط الذین هم اخوة یوسف کانوا انبیاء (تبیان)

بیان نہیں ہوئے ہیں [1] اسی طرح ہم نے آپ کو بھیجا ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ رسلا کو نصب اسی فعل کی بنا پر ہوا ہو اس کے بعد ہے یعنی کچھ پیغمبروں کے ہم نے آپ سے واقعات بیان کیے ہیں اور کچھ پیغمبروں کے نہیں بیان کیے [2] اس صورت میں کسی دوسرے فعل کے مقدر ماننے کی ضرورت نہ ہوگی اور اس صورت میں اس آیت کا کوئی ترکیبی تعلق بھی اس آیت کے قبل کی آیت سے نہ ہوگا، اس لئے ممکن ہے کہ یہ تنزیل میں اس آیت کے تسلسل سے آئی ہی نہ ہو بلکہ کسی اور موقع پر مستقل یا کسی اور آیت کے ساتھ اتری ہو۔

بہت سے پیغمبر وہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے

بہر صورت اس اجمال کی تصریح نے کہ بہت سے پیغمبر ایسے ہیں جن کا ذکر پیغمبر خدا سے یعنی آپ پر نازل ہونے والے آیات کی کتاب میں [3] اور آپ کی زبانی دنیا تک پہونچنے والے احادیث میں نہیں ہوا ہے، ان پیشوایان مذاہب کے لئے جن کے متعلق دوسرے اقوام وحی آسمانی کے دعویدار ہیں جیسے ایران میں زردشت اور ہندوستان کے وہ اشخاص جن کے نام سننے میں آتے ہیں یا جن پر کتابوں کا اترنا بیان کیا جاتا ہے، یہ احتمال پیدا کردیا ہے کہ ممکن ہے وہ واقعی اللہ کی طرف سے نبوت ورسالت کے منصب پر فائز ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی تعلیم کو بعد میں مسخ کردیا گیا ہو جیسے اہل کتاب نے توریت وانجیل وغیرہ کے ساتھ سلوک کیا یا انہیں اوتار وغیرہ فرض کر کے ان کے اصل منصب کو فراموش کردیا گیا ہو جیسے نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٦٥﴾

''اس شان کے پیغمبر [4] جو مژدہ سنانے والے اور ڈرانے والے تھے تاکہ ان پیغمبروں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی دلیل نہ رہے اور اللہ زبردست ہے صحیح صحیح کام کرنے والا۔''

رسول کے بھیجنے کا مقصد اتمام حجت

''بشارت'' اور ''انذار'' کی دو الفاظ قرآنی اصطلاح میں ایک پورا خاکہ ہوتی ہیں انبیاء کی ہدایتوں کا جن میں ایک مثبت پہلو ہوتا ہے اور

---

[1]۔ وارسلنا رسلا قد قصصنٰہم علیك (جلالین) چنانکہ فرستادیم پیغمبرانی کہ قصہ ایشاں گفتہ ایم (شاہ ولی اللہ) اور بھیجے ہم نے پیغمبر کہ تحقیق بیان کیا ہم نے ان کو (رفیع الدین)

[2]۔ الوجہ الثانی ان یکون نصبا بفعل یفسرہ ما بعدہ... وتقدیرہ وقصصنا علیك رسلا الخ (تبیان)

[3]۔ ان اللہ سبحانہ ارسل رسلا کثیرۃ لم یذکرھم فی القرآن (مجمع البیان)

[4]۔ رسلا نصب علی الحال (تبیان)

ایک منفی۔ اوامر اور نواہی اور انہی دونوں کے اعتبار سے نتیجہ میں ثواب ہوتا ہے اور عذاب اور انہی سے متعلق انبیاء جو خلق خدا کو انتباہات کا سرمایہ فراہم کرتے ہیں، ان میں وعدہ ہوتا ہے اور وعید۔ وعد یعنی ثواب کا اعلان اور وعید یعنی عذاب سے تخویف۔ اسی وعدہ کا نام ہے ''بشارت'' اور اس کے وعید کا نام ہے ''انذار''۔

ان کے ذریعہ سے خلق خدا پر حجت تمام ہوتی ہے یعنی ان کی ناواقفیت اور غفلت کا عذر ختم ہو جاتا ہے وہ عذر جس کی ترجمانی زبان قدرت نے دوسری جگہ اس طرح کی ہے کہ وہ کہتے :۔

لَوۡ لَاۤ اَرۡسَلۡتَ اِلَيۡنَا رَسُوۡلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ (طه۔۱۳۴، قصص۔۴۷)

تو نے ہماری طرف کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ ہم تیری تعلیمات کی پیروی کرتے۔

اس عذر پیش ہونے کی صورت میں ان سے حساب، کتاب اور جزاء و مکافات درست نہ ہوتی۔ یہ ان کے لئے عذر کی گنجائش ہی ان کی طرف کی حجت ہے جسے ختم کرنا مقصد رسالت قرار دیا جا رہا ہے، ان الفاظ میں کہ :۔

لَوۡ لَاۤ اَرۡسَلۡتَ اِلَيۡنَا رَسُوۡلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ

ان پیغمبروں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی دلیل نہ رہے۔ [۱]

اس دلیل اور بندگان خدا کے عذر ہی کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی طرف سے ذات الٰہی پر الزام لایا جاتا جیسا کہ اہل سنت کے بعض مستند مترجمین نے ترجمہ کیا ہے۔ [۲]

اس سے علم کلام کے مبحث عدل کے دو اہم مسائل ثابت ہوتے ہیں: پہلے حسن و قبح عقلی یعنی قطع نظر اس سے کہ خالق کا عمل یا حکم کیا ہے؟ خود اپنی جگہ کچھ باتیں ہیں جو عقلاً اچھی یا بری ہیں چنانچہ کچھ باتوں کو عقل یعنی انسانی ضمیر ظلم میں داخل سمجھتی ہے لہٰذا خالق کا ان سے بری ہونا ازروئے عقل ضروری ہے۔ اس ضروری ہونے کو یوں کہا جاتا ہے کہ اللہ پر یہ واجب ہے۔

اس واجب ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کسی اور بالادست طاقت نے معاذ اللہ خالق کو اس کا پابند بنا دیا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی شان کمال کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ایسا ہی کرے۔ اس کا نہ کرنا ہی وہ ہوگا جو خلق کے لئے اس کے مقابلہ میں حجت بن سکے اور چونکہ بنص قرآن ارسال رسل نہ ہونے کی صورت میں خلق کے پاس خالق کے مقابلہ میں حجت ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرسلین کا بھیجنا اس پر واجب تھا۔

دوسرے: افعال الٰہی کا بربنائے غرض و غایت ہونا۔ یہ غرض وہ ''خودغرضی'' والی غرض نہیں ہوتی جس سے خدا کا غنی مطلق ہونا سدراہ ہے بلکہ اس کے علم و حکمت کی رو سے کسی چیز کا حسن ذاتی اور عدل کے لحاظ سے ضروری ہونا، اس کے فعل کی غرض و غایت ہونے کے لئے کافی ہے۔ اسی بنا پر ارسال رسل جو فعل باری ہے، اس کی غرض و غایت بتائی جا رہی ہے کہ خلق کے پاس اللہ کے سامنے پیش کرنے کے لئے حجت نہ رہے۔

یہی غرض و غایت وہ ہوتی ہے جو اس کے افعال کو عبث اور بے مقصد ہونے سے بری قرار دیتی ہے جسے قرآن کریم میں بہت سی جگہ شان خالق کے خلاف قرار دیا ہے اور اس کی ذات کو اس سے برتر بتایا ہے کہ اس کے افعال معاذ اللہ عبث اور بے مقصد ہوں۔ چونکہ جو امر کسی ذات کی

---

[۱] یعنی تانگویند تقصیر ما نیست، هیچ پیغمبر نزدیک ما نیامد (شاہ ولی اللہ)

[۲] تانباشد مردمان را بر خدا الزام (شاہ ولی اللہ) نہ ہو واسطے لوگوں کے اوپر اللہ کے الزام (شاہ رفیع الدین)

رفعت کے لئے ضروری اوراس کی شان کے مطابق ہو، اس کا ترک دوصورتوں سے ہوتا ہے۔ایک مجبوری سے اور دوسرے ناداَنستگی سے، اس لئے خاتمہ آیت میں دوالفاظ لائے گئے: وکان اللہ عزیزاً ''وہ زبردست ہے''یعنی اس کی قدرت محدودنہیں تاکہ بربنائے مجبوری وہ کسی امرواجب کو ترک کرے۔حکیماً یعنی اس کی سوجھ بوجھ بھی ایسی ہے کہ وہ صحیح ہی کام کرتا ہے، غلط کام بربنائے ناواقفیت بھی اس سے نہیں ہوسکتا۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿١٦٦﴾

''مگراللہ گواہی دے رہاہے کہ اس کی جو اس نے آپ اتارا ہے۔اس نے اسے اتارا ہے اپنے خاص علم کے ساتھ اورفرشتے گواہی دیتے ہیں اوراللہ سے بڑھ کرکون گواہ ہوگا۔''

چونکہ ترتیب قرآن مطابق تنزیل نہیں ہے،اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ آیت گزشتہ سیاق آیات ہی کے ذیل میں نازل ہوئی ہے۔اس لئے اس ''مگر'' کا ربط گزشتہ کلام کے ساتھ ہونا یقینی نہیں ہے۔موجودہ صورت حال میں ہم جتنا سمجھ سکتے ہیں اس آیت کا مطلب، وہ یہ ہے کہ وحی تو سب انبیاء پراتری ہے اوراسی طرح آپ پربھی وحی اتری مگرسابق انبیاء پرنازل شدہ کتابیں اورصحیفے، ان پربحیثیت معجزہ رسالت نہیں اترے تھے۔ ان کے دلائل نبوت دوسری قسم کے معجزات کی صورت میں ہوتے تھے لہٰذا اس کلام میں جوان پراترتا تھا کوئی ایسی خاص بات نہ ہوتی تھی کہ وہ اثبات نبوت میں پیش کیا جائے مگرآپ یعنی حضرت ختمی مرتبت ﷺ پرجووحی بصورت قرآن اتری ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب بحیثیت اعجاز نازل ہوئی ہے یعنی خوداس کلام میں ایسے خصوصیات ہیں جواس کے کلام الٰہی اورآپ کے رسول الٰہی ہونے کی دلیل ہیں اوران خصوصیات کلام کا حامل بناکراس کتاب کوبھیجنا ہی اللہ کا گواہی دیناہے [1] اورچونکہ وہ کلام بھیجا گیا جبریل امینؑ وغیرہ فرشتوں کے ذریعہ سے یعنی وہ فرشتے ان خصوصیات کے حامل کلام کو لے کراترے تو اس لئے وہ گواہ قرار پائے کہ انہوں نے آپ کی رسالت کا ثبوت فراہم کیا مگروہ کیا؟ وہ توذریعہ وحی تھے اس لئے اصل گواہی خالق ہی کی ہے لہٰذا آخر میں پھراس کا تنہانام لے کرکہا گیا کہ۔وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۔اللہ سے بڑھ کرکون گواہ ہوگا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿١٦٧﴾

''یقیناً جنہوں نے کفراختیار کیا اوراللہ کی راہ سے روکا، وہ سخت گمراہی میں مبتلا ہوئے۔''

چونکہ اہل کتاب نے اپنی مقدس کتاب کوعام نہیں کیا تھا بلکہ وہ ان کے علماء کے پاس محفوظ رہتی تھیں اورعوام ان کے دست نگر تھے، اس لئے یہ علماء کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس رسولؐ پرخودبھی ایمان اختیار کرتے اوراپنے عوام کوبھی بتلاتے کہ ہماری کتابیں اس رسولؐ کے آنے کی پیش گوئی کرتی رہی ہیں مگرانہوں نے خودبھی کفراختیار کیا اورحق پوشی سے کام لے کردوسروں کوبھی سدراہ ہوئے کہ وہ ایمان نہ لائیں۔[2] اس کے علاوہ ایسی

---

[1] .واللہ سبحانہ تبیین ما انزل علی رسولہ بنصب المعجزات(مجمع البیان) یعنی وحی ہرپیغمبرکوآتی رہی، کچھ نیا کام نہیں ہے، پراس کلام میں اللہ نے اپنا خاص علم اتارا ہے اوراللہ اس حق کوظاہرکردے گا چنانچہ ظاہر ہوا کہ جس قدرہدایت اس نبی سے ہوئی اورکسی سے نہ ہوئی (موضح القرآن)

[2] .صدوا الناس عن سبیل اللہ یکتمھم نعت محمدﷺ وھم الیھود(جلالین)

ایسی باتیں بھی کیں جن سے ان کی گمراہی مستحکم ہوجائے مثلاًیہ کہ رسالت اولاد ہارونؑ سے مخصوص ہے، باہر جاہی نہیں سکتی۔ [1]
اس طرح ان کی گمراہی بہ نسبت ان عوام کے زیادہ شدید اور دوررس ہے۔ [2]

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿١٦٨﴾
اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿١٦٩﴾

''یقیناً جنہوں نے کفر اختیار کیا اور ظلم کیا، اللہ انہیں بخشنے کا نہیں ہے اور نہ انہیں کوئی راستہ دکھانے کا ہے، سوا دوزخ کے راستے کے جس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ اللہ کے لئے بہت آسان ہے۔''

کفر کے ساتھ ساتھ ظلم حقیقت پر بھی ہے کہ جان بوجھ کر اس کا انکار کرتے ہیں اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی کہ انہیں سچا جانتے ہوئے سچا مانتے نہیں اور ظلم ان لوگوں پر بھی جنہیں گمراہ کرتے ہیں [3] اور ظلم اپنے نفس پر بھی کہ انہوں نے اس کے لئے ہلاکت ابدی کے سامان کیے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ وَاِنْ
تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١٧٠﴾

''اے انسانو! وہ پیغمبر تمہارے پروردگار کی طرف سے پیغام حق کو لئے ہوئے آ گیا ہے تو ایمان لے آؤ، تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر انکار کرو گے تو بلاشبہ اللہ کے قبضہ میں وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ جاننے والا ہے، بالکل صحیح کام کرنے والا۔''

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلان رسالت اور دعوت ایمان میں کسی ایک دفعہ بھی قوم عرب کو مخاطب نہیں بنایا گیا ہے۔ یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ آپ کی ذات شروع ہی سے کسی ایک قوم اور نسل کی اصلاح کو مطمح نظر بنا کر نہیں آئی تھی۔

پھر آپ کے اعلان رسالت کو "الرسول" کے لفظ کے ساتھ ''معرفہ'' بنا کر پیش کیا گیا ہے، اس لئے کہ دنیا کی قوموں میں پہلے سے آپ کا انتظار تھا اور آپ کے اوصاف وعلامات مشہور ومعروف تھے۔ اس لئے آپ کی ذات نادیدہ ہونے کے باوجود ''نکرہ'' یعنی غیر معلوم شے نہ تھی اور اسی لئے توریت میں بھی آپ کا اعلان ''وہ نبی'' کے الفاظ سے تھا اور انجیل میں بھی آپ کا تذکرہ ''وہ نبی'' کے لفظوں میں ہے اور یہی ''وہ'' کا اشارہ ہے جو "النبی" اور "الرسول" کے لفظوں الف لام عہد کے ساتھ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں ہے۔

---

[1] ۔ادعائوھم انہ عھد الیھم ان النبوۃ لاتکون الّا فی ولد ھرون و من ذریتہ داؤد وما اشبہ ذٰلك (تبیان)
[2] ۔جادوا عن قصد الطریق جوارا شدیدا (تبیان)
[3] ۔ظلموا انبیۃ بتکذیبھم ایاھو مقامھم علی الکفر علی علم منھم ظلمھم عباداللہ (تبیان)

”وہ رسول“ اور ”نبی“ آپ کی آمد کا ہمہ گیر اعلان

پھر اس واقعیت کا اعلان ہے کہ جس طرح اللہ کو ماننے سے اللہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے جیسا کہ پیغمبر اعلان فرماتے تھے کہ: **قولوا لا اله الّا الله تفلحوا** ”مانو کہ سوا اللہ کے کوئی خدا نہیں تمہارا ہی فائدہ ہوگا“ اسی طرح رسولؐ کی تصدیق سے رسولؐ کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ خلق خدا کا فائدہ ہے۔“ اس کا اللہ نے اعلان کیا کہ: **فامنوا خيرا لكم** ”ان پر ایمان لے آؤ، اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔

اس کے بعد ظاہر ہے کہ جب خدا کے ماننے سے خلق کا فائدہ ہے اور رسولؐ کی تصدیق سے بھی خلق خدا ہی کا فائدہ ہے تو نہ ماننے اور تصدیق نہ کرنے سے نقصان بھی خدا و رسولؐ کا نہیں بلکہ انہی کا ہے جو انکار کر کے اپنے کو ہلاکت ابدی میں گرفتار کرتے ہیں اور چونکہ رسولؐ کی حیثیت اپنی ذاتی نہیں ہے بلکہ نمائندہ خدا ہونے کے لحاظ سے ان کا انکار، خدا کے پیغام کا انکار ہے، اس لئے انکار کی صورت میں یہ بتانے کے لئے کہ ان کا کوئی نقصان نہیں ہے، جلال و جبروت الٰہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی تمہارے کفر سے ان کا کچھ بگڑ نہیں سکتا، اس لئے کہ اس کے قبضہ میں تو تمام کائنات ہے۔ تم ایک نہ مانو گے تو کیا ہوگا۔ [1] اور یہ بھی اس کا نظام حکیمانہ ہے کہ اس نے تم کو اتنا عارضی اختیار دے رکھا ہے کہ تم اس اختیار سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کے احکام کی مخالفت بھی کر لیتے ہو جو اس کے لئے کوئی خلاف توقع امر نہیں ہے جس پر اسے کوئی افسوس یا پشیمانی ہو کیوں کہ وہ تو ”علیم“ ہے۔ پہلے سے نتائج سے واقف ہے [2] اور ”حکیم“ ہے۔ اس نے جان بوجھ کر بربنائے اصلاح عالم یہ نظام مقرر کیا ہے۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾

”اے اہل کتاب! اپنے مذہب میں غلو سے کام نہ لو اور اللہ کی طرف سوا سچ بات کے کچھ منسوب نہ کرو۔ مریم کے بیٹے عیسیٰؑ مسیح تو بس اللہ کے پیغمبر اور اس کا کلمہ ہیں جسے اس نے مریم کی طرف بھیجا اور اس کی طرف کی ایک روح ہیں لہٰذا اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور تثلیث کے قائل نہ ہو۔ باز آجاؤ، تمہارے لئے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک اکیلا خدا ہے۔ پاک ہے اس کی ذات اس سے کہ اس کے کوئی اولاد ہو۔ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں، سب اسی کا ہے اور اللہ کارسازی کے لئے کافی ہے۔“

[1] ۔ فان ضرر ذٰلك يعود عليكم دون الله تعالى الذى له ملك السموٰات (تبیان)

[2] ۔ عليهما بانهم صائرون اليه من طاعة او معصية (تبیان)

غلو کے معنی ہیں کسی کے بارے میں جوش عقیدت کی بنا پر حد سے بڑھ جانا۔[۱]

غلو کی ممانعت، عیسیٰ علیہ السلام کا صحیح تعارف رد تثلیث اور اثبات توحید

نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو میں مبتلا ہوئے یعنی انہیں اللہ کا پیغمبر کہنے کے بجائے اللہ کا بیٹا اور تثلیث کے ذیل میں اللہ کے ساتھ ایک خدا کہنے لگے۔ اسی بنا پر انہیں انتباہ کیا جا رہا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جو صحیح صحیح مرتبہ ہے، اسے بیان کیا جا رہا ہے کہ عیسیٰؑ کے بارے میں اتنی باتیں ٹھیک ہیں:۔

(۱) وہ حضرت مریمؑ کے بیٹے ہیں۔ اس ماں کی طرف انتساب میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ ان کا کوئی باپ نہیں ہے۔[۲]

(۲) وہ مسیح ہیں، یہ لقب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے خاص ہے۔

(۳) وہ اللہ کے رسول ہیں لہٰذا جیسے سب پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی۔

(۴) وہ کلمۃ اللہ ہیں یعنی خالق کے حکم کن سے ان کی تخلیق ہوئی ہے۔

(۵) وہ روح اللہ ہیں۔ اس میں رُوْحٌ مِّنْهُ ''اس کی طرف کی ایک روح'' کہہ کے اس کا اظہار کیا گیا ہے کہ یہ ''روح'' کہنا اس تعلق کے اظہار کے لئے نہیں ہے جو روح کا ذی روح کے جسم سے ہوتا ہے بلکہ یہ روح اللہ کہنا اس انتساب کے اعتبار سے ہے جو باعتبار شرف خالق کے ساتھ ہے[۳] جس کی بنا پر حضرت آدم علیہ السلام ہی کی خلقت کے موقع پر ارشاد فرمایا گیا تھا کہ:۔

فَإِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ

جب میں پتلا بنا دوں اور اس میں اپنی طرف کی روح پھونک دوں۔ (ص۔ ۷۲)

یہی روح ہے جس کا مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔ بحیثیت وصف یہ بات تمام نفوس کاملہ میں عام ہے ہاں خصوصی لقب عطا ہونا شرف خاص ہے۔ جیسا کہ تمام انبیاء کے القاب میں صفت عام ہے اور لفظ بحیثیت لقب اعزاز امتیازی کے طور پر ان کے لئے خاص ہے۔

اتنا مانا جائے تو یہ صحیح ایمان ہے جس کے بالمقابل ایک طرف یہود ہیں جو اس کو بھی نہیں مانتے اور اس طرح کفر کے مرتکب ہیں اور دوسری طرف اس کے آگے جو ہے، وہ غلو ہے جس کے نصاریٰ مرتکب ہیں کہ عیسیٰؑ کو تین میں کا ایک مان لیا اور اس طرح اللہ کا ساتھ سمجھ لیا۔ اس کے مقابلہ میں توحید کا اعلان کیا گیا ان الفاظ میں کہ إِنَّمَا اللّٰهُ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ (یعنی) اس کی وحدت خالص ہے جس میں کثرت کا شائبہ نہیں ہے۔ دوسری اس طرح غلو کہ عیسیٰؑ کو اس کا بیٹا کہہ دیا۔ اس کے مقابلہ میں صحیح تصور کا اعلان کیا گیا کہ سُبْحٰنَهٗٓ أَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ یعنی یہ اللہ کا تصور بھی اللہ سبحانہ کی شان جلال کے خلاف ہے۔ اب اگر ولد کے لفظ میں تاویل سے کام لیا جائے کہ جس طرح باپ اولاد کا سبب وجود اور مربی ہوتا ہے۔ اسی طرح عیسیٰؑ اس کے دامن تربیت کے پرورش یافتہ ہیں، تو اس کا جواب قرآن نے اس طرح دیا ہے کہ یہ پھر عیسیٰؑ سے مخصوص بات نہیں ہے۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ یعنی کائنات میں جو کچھ ہے، وہ سب ہی اس کا مخلوق اور اس کے زیر تربیت ہے اور وہ سب ہی کا مدبر و کارساز ہے

---

[۱]۔ اصل الغلو فی کل شئ تجاوز حدہ (تبیان)

[۲]۔ انہ ابن مریم لا ابن اللہ کما یزعمہ النصاریٰ ولا ابن اب کما زعمہ الیھود (مجمع البیان)

[۳]۔ اضیف الیہ تشریفا لہ (جلالین)

لہٰذا اس کے معنی سے بھی عیسیٰؑ کو خصوصیت سے اللہ کا بیٹا کہنے کے کوئی معنی نہیں۔
آخری فقرہ: وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا "اللہ کارسازی کے لئے کافی ہے" اس کا یہ مقصد ہوسکتا ہے کہ اگر یہ سمجھو کہ اس نے انتظام عالم کے لئے عیسیٰؑ کو اپنا ساتھی یا بیٹا قرار دے کر اپنا شریک کرلیا ہے تو یہ بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ یہ اس وقت ہوتا جب اس کی قدرت ناقص ہوتی اور اسے کسی اور شریک کار کی ضرورت ہوتی مگر ایسا نہیں ہے۔ وہ تنہا کارسازی کے لئے کافی ہے۔ پھر اسے کسی کو اپنا ساتھی یا بیٹا بنانے کی کیا ضرورت ہے۔[1]

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

"مسیح ہرگز اس کو اپنے لئے عار نہ سمجھیں گے کہ وہ اللہ کے بندے ہوں اور نہ مقرب فرشتے اور جو اس کی بندگی سے ننگ محسوس کرے گا اور غرور کرے گا تو اللہ ان سب کو جلدی ہی اپنی جانب محشور فرمائے گا تو جس نے ایمان اختیار کیا ہوگا اور نیک اعمال کیے ہوں گے، انہیں ان کا پورا پورا صلہ دے گا اور انہیں اپنے فضل وکرم سے اور زیادہ عطا کرے گا اور جنہوں نے ننگ محسوس کیا اور غرور کیا ہوگا، انہیں وہ دردناک عذاب کی سزا دے گا اور وہ اپنے لئے اللہ کو چھوڑ کر کوئی سرپرست نہ پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔"

مسیح کو نصاریٰ خدا کا بیٹا سمجھتے تھے، اصل میں تو انہی کی ردہو رہی ہے مگر چونکہ مشرکین فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، اس لئے ضمناً ان کی بھی رد کردی گئی[2] کہ تم ان سب کو چاہے جو کہہ دو مگر یہ سب تو اپنا فخر اسی میں محسوس کرتے ہیں کہ انہیں اللہ کی بندگی کا رتبہ حاصل ہو اور یہی آخرت میں ان کی رفعت مراتب کا ذریعہ ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾

"اے انسانو! تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی طرف کا کھلا ہوا ثبوت آگیا ہے[3] اور ہم نے تمہاری طرف ایک نمایاں روشنی بھیجی ہے۔"

---

[1] ۔اس کو پیش کار کی حاجت نہیں۔ وہ بس ہے کام بنانے والا (موضح القرآن)

[2] ۔هذا من احسن الاستطراد اذ كر الرد على من زعم انها الهة اوبنات الله(جلالين)

[3] ۔اى اتاكم حجة من الله تبرهن لكم على صحة ما امركم به وهو محمد ﷺ (تبيان)

یہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے کی موثر انداز میں دعوت ہے کہ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو تو کہ تجلیاں حق کی کتنی روشن اور دلائل حقانیت کتنے آشکارا ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَاعۡتَصَمُوۡا بِهٖ فَسَيُدۡخِلُهُمۡ فِىۡ رَحۡمَةٍ مِّنۡهُ وَفَضۡلٍ ۙ وَّيَهۡدِيۡهِمۡ اِلَيۡهِ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ؕ﴿۱۷۵﴾

''تو جنہوں نے ایمان اختیار کیا اللہ کے ساتھ اور مضبوطی سے اس کا دامن تھام لیا تو وہ انہیں اپنی رحمت اور فضل و کرم میں داخل کرے گا اور اپنی طرف پہنچانے والے سیدھے راستے پر لگا دے گا۔''

''اس کا دامن'' یہ ضمیر قرب کی بنا پر خود ''اللہ'' کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے، اگر چہ تمسک کا انتساب اللہ کی طرف صراحتاً کہیں نظر سے نہیں گزرا ہے۔ اس بنا پر یہ تعبیر غیر مانوس معلوم ہوتی ہے لہٰذا مفسرین اس ضمیر کی سابق کی آیت میں درج شدہ ''نُوۡرًا مُّبِيۡنًا'' کی طرف راجع کرتے ہیں۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ پر ایمان لایا اور مضبوطی سے اس کا یعنی ''نور مبین'' کا جو قرآن ہے دامن تھام لیا تو وہ رحمت الٰہی کا حقدار ہوگا۔[۱] ''راستے پر لگا دے گا'' یعنی توفیقات خاصہ شامل حال کرے گا[۲] جو ان کی راہ طلب میں صحیح جدوجہد کا نتیجہ ہوں گے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے: وَالَّذِيۡنَ جَاهَدُوۡا فِيۡنَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَا (العنکبوت۔۶۹)

يَسۡتَفۡتُوۡنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفۡتِيۡكُمۡ فِى الۡـكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امۡرُؤٌا هَلَكَ لَـيۡسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخۡتٌ فَلَهَا نِصۡفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنۡ كَانَتَا اثۡنَتَيۡنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنۡ كَانُوۡۤا اِخۡوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمۡ اَنۡ تَضِلُّوۡا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۱۷۶﴾

''آپ سے حکم شرعی دریافت کرتے ہیں[۳] کہئے کہ اللہ تمہیں ''کلالہ'' کے بارے میں حکم شرع بتاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا مر جائے جس کے اولاد موجود نہ ہو اور اس کے ایک بہن ہو تو اس کا آدھا متروکہ ہوگا اور وہ اس کی پوری وارث ہوگی اگر اس کے اولاد نہ ہو۔ اب اگر دو بہنیں ہوں تو انہیں دو تہائی متروکہ ملے گا اور اگر بھائیوں (کی صنف) میں مرد و عورت دونوں ہوں تو مرد کو دو عورتوں کے برابر ملے گا۔ اللہ تمہارے لئے صاف صاف بیان کرتا ہے کہ تم گمراہ نہ ہو اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

---

[۱]۔ تمسك بالنور الذی انزله الی نبیه... قال ابن جریج الهاء فی به کنایة عن القرآن (تبیان)

[۲]۔ یوفقهم لاصابة فضله الذی تفضل به علی اولیائه (تبیان)

[۳]۔ الاستفتاء السوال عن الحکم (مجمع البیان)

کلالہ یعنی بھائی بہن کی میراث

اس کے پہلے نصاریٰ کی رد تھی اور ان کے الوہیت مسیح اور مسیح علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کے تصورات کا ابطال ہورہا تھا اور اب یہ ایک دم میراث کا مسئلہ آ گیا جس سے ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ اس سلسلہ کی آیت نہیں ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ جامعین قرآن کو پورا سورۂ نساء مرتب ہوجانے کے بعد یہ آیت بھی اس سورہ کی دستیاب ہوگئی تو انہوں نے آخر میں درج کردی جس میں کوئی ترتیب یا ربطہ کا لحاظ نہ تھا۔

بے شک حمیدالدین فراہی صاحب ایسے افراد جو نظم قرآنی پر بڑا زور دیتے ہیں یعنی موجودہ ترتیب قرآن میں ہر آیت کا قبل کی آیت سے کچھ نہ کچھ ربط قائم کردیتے ہیں اور اس سے معانی پیدا کرتے ہیں ،انہوں نے یہاں بھی کچھ نہ کچھ کہا ہی ہوگا مگر بے لوث ذہن جسے خاص اس پہلو کے صحیح ثابت کرنے کی دھن نہ ہو یا تفسیر میں فن کاری کا کمال نہ دکھلانا ہو، وہ فطری طور پر اس آیت کو الگ ہی سمجھے گا اور حقیقت میں وہ الگ ہے بھی ۔اس کا کوئی تعلق ماقبل سے نہیں ہے۔اس آیت میں میراث ''کلالہ'' کا بیان ہورہا ہے یعنی بھائی بہن کی میراث [۱] اہل سنت کے یہاں اس کی تعبیر بڑے الجھے ہوئے انداز میں ملتی ہے ۔[۲] اس ذیل میں چند مسئلے ہیں :-

(۱) کسی شخص کا انتقال ہوا اور اس کے اولا د نہیں ہے ۔اب یہاں قرآن کے اطلاق میں علیٰحدہ سے قید لگانے کی ضرورت ہے کہ والدین بھی نہیں ہیں اور اس کی وارث بس ایک بہن ہے تو بہن کو نصف ملے گا۔

(۲) بہن کا انتقال ہوا اور وارث بس بھائی ہے تو یہ بھائی اس کے پورے متروکہ کا وارث ہوجائے گا۔

(۳) دو یعنی ایک سے زیادہ بہنیں ہیں تو انہیں ثُلثین ملیں گے یعنی دو تہائی ترکہ۔

(۴) اگر ورثہ میں بھائی بہن دونوں صنفیں ہیں تو میراث اس طرح ملے گی کہ بھائی کو دہرا حصہ اور بہن کو اکہرا حصہ۔

یہ احکام یہاں بیان ہوئے ''کلالہ'' کے لیکن اگر نظر پہلے کی طرف دوڑ ائیے تو معلوم ہوگا کہ اسی سورہ میں اس کے پہلے (چوتھے پارہ میں) جہاں والدین اور اولا د اور شوہر اور زوجہ کے حصے بیان ہوئے ہیں، وہاں بھی میراث کلالہ کا بیان ہوا تھا کہ:- وَاِنۡ كَانَ رَجُلٌ يُّوۡرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امۡرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوۡ اُخۡتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ فَاِنۡ كَانُوۡۤا اَكۡثَرَ مِنۡ ذٰلِكَ فَهُمۡ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ ،خلاصہ اس کا یہ بیان تھا کہ کلالہ اگر ایک ہے تو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر ایک سے زیادہ ہو تو انہیں تہائی حصہ دیا جائے گا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ وہاں جو حکم چھٹے حصہ اور تہائی والا بیان ہوا تھا، وہ کلالۃ الام کا ہے یعنی میت کے وہ بھائی بہن جن کی ماں ایک ہے اور باپ مختلف ہیں، ان کا یہ حکم ہے کہ اگر ایک ہو تو سدس اور ایک سے زیادہ ہوں تو ثلث ۔ اور اب یہاں جو حکم بیان ہورہا ہے، وہ **کلالۃ الابوین** اور **کلالۃ الاب** کا ہے یعنی سگے بھائی بہن جو ایک ماں باپ کے ہیں یا علاتی یعنی جن کا باپ ایک ہی ہے مگر مائیں مختلف ہیں کہ سگے بھائی بہن کی موجودگی میں تو ان کی میراث ملتی ہی نہیں لیکن اگر سگے نہ ہوں تو یہ ان کے قائم مقام ہوتے ہیں یعنی جو حق ان کا ہوتا، وہ اب ان کا ہوگا۔ ان کا یہ حکم ہے کہ اگر ایک بہن ہو تو نصف اور اگر ایک سے زیادہ بہنیں ہوں تو ثلثین اور اگر ایک یا کئی بھائی ہی بھائی ہوں تو کل متروکہ اور اگر بھائی بہن مخلوط ہوں تو بھائی کو دہرا اور بہن کو اکہرا۔ یہ ان بھائی بہنوں کا حکم ہے ۔ یہ تفصیل فقہ اسلامی میں متفق علیہ ہے مگر سوال یہ ہے کہ یہ تفصیل معلوم کہاں سے

---

[۱] ۔ھو اسم للاخوۃ والاخوات عن الحسن وھو المروی عن ائمتنا (مجمع البیان)

[۲] ۔لیس لہ ولد ای ولا والد (جلالین) فرزندش نیست یعنی ونہ والد (شاہ ولی اللہ)

ہوئی ؟ قرآن مجید میں تو دونوں جگہ کلالۃ کی لفظ ہے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ ماخذ احکام بننے کے لئے قرآن اکیلا اتارا ہی نہیں گیا تھا۔ بلکہ قرآن کے ساتھ تفصیلات کے بیان کرنے کے لئے ایک دوسرے ترجمان کو مقرر کیا گیا تھا۔ پھر اس ترجمان کو چھوڑ کر تنہا قرآن کو کبھی کافی سمجھ لیا جائے تو صحیح تعلیمات اسلام کہاں حاصل ہو سکتے ہیں؟!

سُوۡرَةُ الۡمَآئِدَةِ

مدینہ......۱۲۰ آیات

اس سورہ کا یہ نام حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر مائدہ آسمانی اترنے والے واقعہ کی بنا پر ہوا ہے جو اس سورہ میں مذکور ہے۔ اور کسی دوسرے سورہ میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں حسب ذیل اہم مضامین ہیں۔

سورۂ مائدہ کے خاص خاص مضامین

۱-----معاہدات کی پابندی کا عموماً ضروری ہونا

۲-----احکام شکار

۳-----حالت احرام میں شکار کا شرعی حکم

۴-----نیک باتوں میں تعاون کا حکم اور برے کاموں میں تعاون باہمی سے ممانعت۔

۵-----میتہ، خون، سور کے گوشت اور جھٹکے وغیرہ کی حرمت۔

۶-----روز غدیر تبلیغ ولایت کا حکم محکم اور اکمال دین واتمام نعمت کا اعلان۔

۷-----کلب معلم (شکاری کتے) سے شکار کا حکم۔

۸-----نکاح دائمی میں اسلام کی شرط اور زن کتابیہ سے عقد منقطع (متعہ) کی اجازت۔

۹-----ترکیب وضو

۱۰-----تیمم کا حکم اور اس کی ترکیب

۱۱-----دشمن قوموں کے ساتھ بھی انصاف کی تاکید

۱۲-----بارہ سردار

۱۳-----یہود ونصاریٰ کا دعویٰ کہ خدا ہمارا ہے اور اس کی رد

۱۴-----داخلہ فلسطین کی مہم میں قوم کا مامور کیا جانا اور اس کا انجام

۱۵-----واقعہ ہابیل وقابیل۔

۱۶-----قتل ناحق اور اس کا انجام

۱۷-----وسیلہ کا حکم

۱۸-----چور کی سزا

۱۹-----توریت میں قصاص کا حکم

۲۰-----ارتداد امت کا اندیشہ

۲۱-----آیت ولایت

۲۲-----یہود کا تصور کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور اس کی رد۔

۲۳-----ردنصاریٰ اور ابطال تثلیث

۲۴-----یہود اور مشرکین کے بالمقابل عیسائیوں کی تعریف

۲۵-----قسم توڑنے کا کفارہ

۲۶-----شراب اور جوئے کی حرمت

۲۷-----گواہی میں دو عادلوں کی ضرورت

۲۸-----حضرت عیسٰی علیہ السلام کی نصاریٰ کے غلط عقائد سے برأت وغیرہ وغیرہ۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ؕ

''اے ایمان لانے والو! معاہدوں کو پورا کرو''

باعتبار مضمون یہ مستقل آیت ہے چنانچہ اس پر پان کی شکل کا آیت کا نشان بھی اور ''ط'' وقف مطلق کی علامت بھی ہے اور ہمارے نقطہ نظر سے چونکہ بسم اللہ والی آیت ہر سورہ کا جز ہے لہٰذا حقیقتاً وہ آیت نمبر ۱ ہے اور پھر یہ آیت نمبر ۲ اور اس کے بعد والی آیت نمبر ۳ مگر چونکہ قرآن مجید کی تحریر میں شروع کے روایتی رواج کی پابندی اصطلاحی طور پر ایک تعبدی شکل اختیار کر گئی ہے اور عام طور سے قرآنوں میں اس پان والی شکل پر نمبر آیت کا نہیں لگاتے چنانچہ یہاں بھی نمبر ایک اس کے بعد والی آیت پر درج ہوتا ہے لہٰذا ہم نے بھی اسی کا تتبع کیا ہے۔ حالانکہ اس کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

''عقد کے معنی تو گرہ لگانے کے ہیں لیکن چونکہ معاہدہ دو آدمیوں کو ایک بات کا پابند بنا دیتا ہے اس لئے اسے عقد کہتے ہیں۔ نکاح وغیرہ کو بھی عقد اسی اعتبار سے کہتے ہیں کہ وہ دو نفوس کے درمیان کا ایک خاص معاہدہ ہے۔

یہاں جو ''عقود'' کا لفظ ہے، وہ سب معاہدوں پر حاوی ہے[1] وہ معاہدہ بھی جو بندوں کا اللہ کے ساتھ بتقاضائے عبودیت ہے کہ وہ اس

---

[1]۔عن ابی عبداللہ قولہ: اوفوا بالعقود ہ قال: بالعھود (علی بن ابراھیم)

کے احکام کی تعمیل کریں اور وہ بھی کہ جو دوسرے بنی نوع کے ساتھ معاہدہ ہو۔ [1]
اس عموم کی بنا پر آیت قرآن، فقہ کے بہت سے احکام کا سرچشمہ ہوگئی اور وہ ایک اصول ہے جس سے بہت سے فروع فقہیہ کا استنباط ہوتا ہے۔
اس سے یہ قاعدہ بن گیا ہے کہ ہر معاہدہ میں جب تک خاص طور پر اس کے قابل ردوبدل ہونے کا ثبوت نہ ہو، اصل لزوم ہے یعنی اختیار فسخ کے لئے خصوصی دلیل کی ضرورت ہوگی جو اس عموم سے استثناء کا سبب ہوسکے ورنہ فطری طور پر یہ معاہدہ کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اس کی پابندی ضروری ہے اور انسان کو اس کی مخالفت جائز نہیں ہے۔

اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ①

''تمہارے لئے چوپایہ کی قسم کے مویشی عموماً حلال ہیں سوا ان کے جن کا بیان تمہارے سامنے آئے گا [2] لیکن حالت احرام میں شکار کو حلال نہ سمجھنا۔ یقیناً اللہ جو چاہتا ہے، وہ احکام جاری کرتا ہے۔''

گوشت خوری کا جواز اور چوپایوں میں اصالت حلیت

اس میں پہلے تو گوشت خوری کا جواز بطور ایک عام قاعدہ کے اصول کی شکل میں بتایا ہے کہ سوا ان خاص چیزوں کے جن کی حرمت کا بیان آئندہ آئے گا، باقی مویشی جانوروں کا گوشت حلال ہے۔ دوسرے یہ حکم بتایا گیا ہے کہ حالت احرام میں شکار نا جائز ہے اور کسی دوسرے نے شکار کیا ہو تو اس کا گوشت کھانا بھی نا جائز ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَاۤ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ②

''اے ایمان لانے والو! شعائر اللہ کی حرمت کو برباد نہ کرو اور نہ محترم مہینہ کی اور نہ قربانی کے جانور کی اور نہ گلے

---

[1] العهود المؤكدة التي بينكم وبين الله والناس (جلالين)
[2] وهو قوله: حرمت عليكم الميتة والدم الآية (مجمع البيان)

میں پٹے ڈالے ہوئے جانوروں کی اور نہ ان لوگوں کی حرمت کو جو مقدس گھر کی طرف رُخ کیے ہوئے اپنے پروردگار کے فضل و کرم اور خوشنودی کی طلب میں آرہے ہیں اور جب حرم سے باہر نکل جاؤ تو پھر شکار کرو اور کسی قوم سے مخالفت کہ انہوں نے تم کو مسجد حرام سے روکا تھا تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم بھی زیادتی سے کام لو اور ایک دوسرے کی نیکی اور پرہیز گاری میں مدد کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ کے غضب سے بچو۔ یقیناً اللہ سخت سزا والا ہے۔‘‘

’’شعائر اللہ‘‘ یعنی اللہ کی نشانیاں[۱] اس میں ہر وہ چیز داخل ہے جو اللہ کی طرف نسبت رکھتی ہے، چنانچہ دوسری جگہ صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ:۔

البدن من شعائر اللہ یعنی قربانی کے جانور شعائر الٰہیہ میں داخل ہیں لہٰذا یہاں جو شعائر اللہ کے لفظ کے بعد الهدی اور القلائد کا ذکر کیا گیا ہے، اسے عام لفظ کے بعد خصوصیت کے ساتھ اس میں کی بعض خاص فردوں کا نام لے کر بیان کرنے کے قبیل سے سمجھنا چاہئے کیوں کہ ھدی اور قلائد دونوں اسی قسم کے جانور ہیں جنہیں قربانی کے لئے لایا گیا ہے۔ جن کی قربانی ہوگئی وہ الهدی ہیں اور جنہیں گردن میں پٹا ڈال کر ساتھ رکھا گیا ہے کہ وقت آنے پر ان کی قربانی کی جائے گی وہ القلائد ہیں۔[۲]

شعائر الٰہیہ کی حرمت کے ساتھ ان انسانوں کی بھی عزت و حرمت جو رضائے الٰہی کے جادہ کے سالک ہوں

ان سب کی حرمت ہے اور ان کی حرمت کو برباد کرنے سے ممانعت کی جارہی ہے اور جب کہ وہ جانور جو بغرض قربانی لے جائے جارہے ہیں، شعائر الٰہیّہ ہیں تو وہ انسان کیوں کر قابل حرمت نہ ہوں گے جو رضائے الٰہی کے جادہ پر سالک ہیں چنانچہ صراحت کے ساتھ ان جانوروں کے تذکرہ کے بعد ان انسانوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اب اگر اُن جانوروں کا احترام مطلوب باری ہے تو ان انسانوں کی تعظیم و تکریم جو اپنی پوری زندگی راہِ خدا میں صرف کردیں اور آخر میں اس کی راہ میں نثار ہوجائیں، داخل شرک کیوں کر ہوسکتی ہے؟

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۚ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ۚ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ ۗ الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۚ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ

---

[۱]۔ جمع شعیرۃ ای معالم دینہ (جلالین) نشانیہائے خدا (شاہ ولی اللہ)

[۲]۔ التقلید فی البدن ان یعلّق فی عنقھا شئی لیعلم انّھا ھدی (مجمع البیان) جن کے گلے میں پٹہ ڈال کر لے جاویں کعبہ کو (شاہ رفیع الدین)

دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ③

''تم لوگوں پر حرام کیا گیا ہے مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور جسے اللہ کے سوا کسی کا نام لیکر ذبح کیا جائے اور گلا گھوٹا ہوا اور لکڑی وغیرہ سے مارا ہوا[1] اور بلندی پر سے گر کر مرا ہوا اور کسی جانور کے سینگ مارنے سے ہلاک شدہ اور جسے درندہ نے کھا یا ہو مگر وہ جسے تم نے ذبح کر لیا ہو اور جو بتوں پر قربانی کی جائے اور یہ کہ تم جوئے والے تیروں سے حصّے نکالو[2] یہ ایک بڑی بدکرداری ہے۔ آج کافر لوگ تمہارے دین کی طرف سے ناامید ہوگئے ہیں تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کر لیا[3] تو جو شخص بھوک میں لاچار ہوگیا جب کہ گناہ کا مرتکب نہ ہو تو یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

حیوانی قسم کی حرام غذاؤں کے بیان میں آیت اکمال دین جو یقیناً اس سے الگ خاص موقع پر اتری ہے

آیت کا مضمون پڑھ جائیے، شروع میں محرمات کا بیان ہے اور آخر میں یہ ہے کہ:۔

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ

مگر جو شخص بھوک میں لاچار ہو جائے جبکہ گناہ کا مرتکب نہ ہو۔ یہ ٹکڑا پہلے کے بیان کردہ احکام تحریم سے بالکل چسپاں ہے جیسا کہ اس کے پہلے پارۂ دوم میں آچکا ہے۔ حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿البقرة:۱۷۳﴾

بالکل ویسا ہی یہاں ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۣ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ

بس وہاں الْمَيْتَةَ کا ایک لفظ کہا گیا جس میں مُنْخَنِقَةٌ وغیرہ سب درج ہیں اور یہاں میتة کے بعد ان اقسام کا صراحتاً ذکر کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد جیسے وہاں اس کے بعد تھا: فَمَنِ اضْطُرَّ ویسے ہی یہاں ہے: فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ وہاں اس کے بعد تھا: غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ویسے یہاں ہے غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ وہاں آخر میں تھا: فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ یہاں آخری الفاظ ہیں فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ------ بالکل شروع سے آخر تک وہی مضمون ہے یا نہیں اور اوّل سے آخر بالکل چسپاں ہے یا نہیں؟ مگر یہاں نہ معلوم کیوں کر اس اوّل اور اس آخر کے درمیاں الگ کا ایک مضمون اس آیت کا جز بن کر درج ہوگیا ہے کہ:۔

---

[1]۔ المقول ضربا (جلالین) آنچہ سنگ یا عصا مردہ باشد (شاہ ولی اللہ)

[2]۔ دس پانسے تھے، کسی پر لکھا آدھا کسی پر پاؤ، کم یا زیادہ کوئی خالی۔ پھر بانٹنے لگتے تھے تو ہر ایک کے نام پر جو پانسا آیا، وہی حصّہ اس کو ملا یا خالی نکل گیا (موضح القرآن)

[3]۔ اختیار کردم اسلام را دین برائے شما (شاہ ولی اللہ) پسند کیا واسطے تمہارے اسلام دین (شاہ رفیع الدین)

اَلۡيَوۡمَ يَئِسَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ دِيۡنِكُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِ‌ؕ اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَـكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَـكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا‌ ؕ

آج کافر تمہارے دین کی طرف سے ناامید ہو گئے ہیں۔آج میں نے تمہارے دین کو کامل کیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کی اور تمہارے لئے بحیثیت دین اسلام کو پسند کرلیا۔

اسکا اوّل وآخر سے کچھ بھی تعلق محسوس ہوتا ہے؟

اور پھر جس طرح وہ بیچوں بیچ میں کھپی ہوئی ہے،کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مستقل آیت ہے جو کسی اور موقع پر نازل ہوئی تھی مگر اس کو کیا کیا جائے کہ خود اس کا مضمون اُس کے مستقل ہونے اعلان کررہا ہے، اس لئے اُسے مستقل سب ہی کو ماننا پڑتا ہے چنانچہ شاہ عبدالقادر دہلوی فرماتے ہیں:۔

”فائدہ یہ جو فرمایا کہ آج پورا دین تمہارا ہو چکا، یہ آیت آخر کو اُتری ہے کہ سب احکام اللہ کے نازل ہو چکے تھے، اس کے بعد تین مہینے حضرت زندہ رہے ہیں“(موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں محرّمات والے جز کے بعد”ذلکم فسق “پر ختم ہوتا ہے، بعد والے جز سے بیچ میں لکھا ہے:

”ونزل بعدفة حجّة الوداع .اليوم يئس الذين كفروا من دينكم “

”اور عرفہ کے دن حجۃ الوداع میں یہ آیت اُتری کہ” آج کافر تمہارے دین سے نااُمید ہو گئے، آج میں نے تمہارا دین کامل کیا‘ الخ

لیجیے انہوں نے تو زمانہ نزول بھی بتادیا کہ وہ حجۃ الوداع میں اتری ہے مگر تاریخ عرفہ یعنی ۹ ذی الحجہ بتارہے ہیں۔

اس کے بعد جب کچھ مستند احادیث اس آیت کی تاریخ نزول یہ بتلارہے ہیں کہ وہ ۱۸ ذی الحج کو مقام غدیرخم میں رسولؐ نے حضرت علی بن ابی طالبؑ کو منبر پر بلند کرکے فرمایا تھا کہ :مَنۡ كُنۡتُ مَوۡلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوۡلَاهُ”جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے“ تو ان احادیث کے ماننے میں کسی کو عذر نہ ہونا چاہیے۔چناچہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے ہمارے طرق سے تو یہ وارد ہے ہی۔[1] بعض علمائے اہل سنت بھی اس سے متفق ہیں۔

شکاری کتے کے شکار کی حلیت

اس کے لحاظ سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دین پورے ہونے کا اعلان اس بنا پر نہیں ہے کہ سب احکام اللہ کے نازل ہو چکے تھے۔احکام کا تعلق تو شریعت سے ہے، نہ کہ اصول دین سے بلکہ یہ اعلان اس لئے ہے کہ آج تحفظ دین کے اس نظام کا اعلان ہو گیا ہے جو رسولؐ کے بعد قائم و دائم رہے گا۔

موصوف کا یہ ارشاد کہ ”اس کے بعد تین مہینے حضرت زندہ رہے ہیں“ یہ غالباً اُسی ۹ ذی الحج کی تاریخ کے لحاظ سے ہے۔ورنہ صحیح حساب تو یہ ہے کہ اس کے بعد ڈھائی مہینے حضرت زندہ رہے اور بس۔

[1] .روی عن ابی جعفر و ابی عبداللہ علیہ السلام(تبیان)عن محمدبن مسلم عن ابی جعفر قال:اٰخر فریضة انزلها اللہ الولایة ثم لم یزل بعدها فریضة (علی بن ابراھیم)

مگر یہ حیرت ہر ایک متجسس ذہن کو بہرحال ہونا چاہیئے کہ اس صورت میں یہ آیت حرام جانوروں کی حرمت اور عالم اضطرار میں اُن کی حلیت، دونوں کے درمیان حدِ فاصل بن کر آخر کیوں کروارد ہوگئی؟

اور اس نظیر کے ہوتے ہوئے جب بائیسویں پارے کے شروع حصہ میں سورۂ احزاب کی آیۂ تطہیر کو ہم کہتے ہیں کہ وہ مستقل آیت ہے جس کے لئے بین الفریقین شان نزول کے روایات اور احادیث موجود ہیں تو سیاق و سباق کو پیش کر کے اس کا قطعی انکار کرنا کہاں درست ہوسکتا ہے؟!

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴

''آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کیا چیزیں اُن کے لئے حلال قرار دی گئی ہیں؟ کہیے کہ سب اچھی پاک صاف چیزیں تمہارے لئے حلال ہیں اور جو تم نے شکاری کتے [1] سدھا کے انہیں اُس ہنر سے جو اللہ نے تمہیں دیا ہے سکھایا ہو تو جسے وہ تمہارے لئے پکڑ لیں، اُس میں سے کھا سکتے ہو اور اُس پر (شکار پر چھوڑنے سے پہلے) اللہ کا نام لے لو اور اللہ کے غضب سے بچو، یقیناً اللہ تیزی کے ساتھ حساب لینے والا ہے''۔

محرمات کا بیان نام لے لے کر کرنا اور حلال چیزوں کے سوال پر اجمالی طور پر یہ کہہ دینا کہ:۔احل لکم الطیبٰت ''جتنی اچھی پاک صاف چیزیں ہیں، سب ہی حلال ہیں'' یہ اشیا میں اصالت حلّیت کی دلیل ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ حرمت کے لئے ثبوت کی ضرورت ہے، خواہ وہ طبعی طور سے نفرت کی چیز ہو جو خبائث میں سے ہونے کا معیار ہے اور خواہ دلیل خاص سے از روئے شرع اُس کی حُرمت ثابت ہو اور جب تک ان دونوں میں سے کوئی ایک بات نہ ہو، ہر شے کو حلال ہی سمجھنا چاہیے۔

اس ذیل میں جانوروں کے بارے میں ایک طریقۂ حلّیت تو ابھی تک عام طور سے معلوم تھا کہ انہیں ذبح کیا جائے تو ذبیحہ ہو کر اُن کا کھانا جائز ہوگا۔ یہاں ان کے حلال ہونے کا ایک اور طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ کہ شکاری کتوں کے ذریعے سے تم نے اُن کا شکار کیا ہے تو بھی وہ حلال ہوں گے۔۔بے شک جیسے وہاں چھری چلاتے وقت اللہ کا نام لیتے ہو، ویسے ہی یہاں ان کتوں کو شکار پر چھوڑتے وقت اللہ کا نام لے لو۔

اگر ایسا نہ ہوگا تو نہ وہ چھری کا مارا ہوا حلال ہوگا اور نہ جانور کا پکڑا ہوا۔

اسی تنبیہ کے لئے آخر میں اللہ کے غضب سے بچنے کی تاکید اور حساب آخرت کی یاددہانی کی گئی ہے۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪

[1] ۔واذکروا اسم اللہ علیہ قبل الارسال ۔۔۔وقیل معناہ اذکروا اسم اللہ علی ذبح ما تذبحونہ ۔۔۔والقول الاول اصح (مجمع البیان)

وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۖ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ أَخْدَانٍ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْإِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۖ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٥﴾

''آج تمہارے لئے سب اچھی پاک صاف چیزیں حلال کی جاچکی ہیں اور اہل کتاب کا اناج [1] تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا اناج اُن کے لئے حلال ہے اور پاک دامن مسلمان عورتیں اور پاک دامن عورتیں اُن میں سے جنہیں تمہارے پہلے کتاب ملی ہے، جب اُن کی اجرتیں دے دو پاک دامنی کا تحفّظ کرتے ہوئے، نہ کہ بے محابا شہوت رانی کرتے ہوئے اور نہ خفیہ طور پر ناجائز تعلقات قائم کرتے ہوئے اور جو ایمان کے بجائے کفر اختیار کرے، اُس کے سب اعمال اکارت گئے اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا''۔

اہل کتاب کے ساتھ غلہ کی خرید وفروخت اور ان کی عورتوں کے ساتھ عارضی طور پر تعلق ازدواجی یعنی متعہ کی اجازت ہے

پہلے جوحلّیت کا بیان تھا، وہ صرف کھانے کی چیزوں سے متعلق تھا، اب اس حکم کی تکرار کے ساتھ کہ آج تمہارے لئے اب اچھی پاک صاف چیزیں حلال ہیں اور ''آج'' کا مطلب ہے ''اس شریعت میں'' کیونکہ شرائع سابقہ میں بعض سخت احکام نافذ تھے۔اس شریعت میں آسانی عطا کرتے ہوئے وہ سخت احکام برطرف کردیے گئے۔

اس کے بعد حلّیت کے دائرہ کو وسیع کرتے ہوئے اب اس کے دامن کو' کھانے پینے سے بڑھا کر دوسری قسم کے افعال تک وسیع کردیا گیا ہے جس میں پہلی چیز یہ ہے کہ اناج کی تجارت اس وقت یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔مسلمانوں کو غلّہ ان سے خریدنا بھی ہوتا تھا اور بعض وقت باہر سے لاکر اُن کے ہاتھ بیچنا بھی ہوتا تھا تو کچھ لوگوں کو اس میں تردّد ہوتا تھا کہ جب کفار سے ترک موالات کا حکم ہے تو یہ خرید وفروخت اُن کے ساتھ کہاں تک جائز ہے؟اس کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ اُن کا اناج تمہارے لئے اور تمہارا اناج اُن کے لئے،دونوں باتیں حلال ہیں یعنی تم اُن سے خرید بھی سکتے ہو اور اُن کے ہاتھ فروخت بھی کرسکتے ہو۔

اس کا نجاست اہل کتاب کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس فقرہ سے یہ بتانا نہیں ہے کہ ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا تمہارے لئے جائز ہے۔اگر یہ ہوتا تو پہلا فقرہ تو ٹھیک ہوگا کہ ان کا کھانا تمہارے لئے جائز ہے مگر دوسرا کہ تمہارا کھانا ان کے واسطے جائز ہے، اس کا کوئی محل نہ

---

[1] یختصّ عند اصحابنا بالحبوب۔(تبیان)

ہوگا۔

چنانچہ احادیث میں لفظ طعام کی تفسیر اس آیت میں ''حبوب''یعنی اناج کے ساتھ ہوئی۔[1]

اور کہ حکم اہل کتاب سے مخصوص نہیں ہے مگر چونکہ مدینہ میں سابقہ تجارت میں انہی کے ساتھ تھا،اس لئے ان کا نام لیا گیا۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے اس آیت کے ایک اور معنی قرار دیے ہیں۔وہ کہتے ہیں:۔

''یعنی آنچہ بر اہل کتاب حلال بود شما حلال است مثل گو سفند و گاد و آنچہ بر شما حلال کردہ شد بر کسی کہ از ایشاں مسلمان شود حلال است مثل شتر وذی ظفر و قبیلۂ یہود ونصاریٰ را درین باب اعتبار نیست''۔(فتح الرحمٰن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ''اہل کتاب کا کھانا''اس کے معنی ہی''اہل کتاب کے یہاں جو کھانا حلال ہے''اور''تمہارا کھانا''یعنی''جو کھانا تمہارے لئے حلال ہے''------اس مفہوم کو الفاظ آیت سے ہم بعید سمجھتے ہیں لیکن اس صورت میں بھی پاک اور نجس کے مسئلہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں قرار پاتا۔

اب جب حلّیت کا ذکر ماکولات سے آگے بڑھ کر معاملات تک پہنچ ہی گیا تو اس کے بعد معاملۂ ازدواج کا بھی تذکرہ کر دیا گیا کہ نکاح مسلمان ہی عورتوں سے کرنا چاہیے یعنی غیر مسلم عورتوں سے نکاح جائز نہیں ہے۔اس کے بعد مسلمان خواتین کے علاوہ اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ تعلق ازدواجی قائم کرنے کی اجازت دی گئی مگر اس شرط کے ساتھ کہ اُن کی اجرتیں اُنہیں دے دو اور اجرت چونکہ عقد منقطع یعنی متعہ میں ہوتی ہے،اس لئے فقہ اہل بیت علیہم السلام میں یہ حکم ہوا کہ نکاح سوا مسلمان عورت کے کسی کے ساتھ نہیں ہوسکتا ہے کیوں کہ وہ تو محدود ضرورت کی بنا پر ہوا کرتا ہے اور اسی لئے یہ کہا گیا کہ تم اُن کے ساتھ زنا کاری اور ناجائز آشنائی سے بچنے کی خاطر متعہ کرلو،نہ کہ جنسی ہوس کی رو میں۔

یہ زنا کاری وغیرہ سے بچنا اتنا اہم مقصد ہے کہ اس کے لئے عارضی ازدواج میں اہل کتاب کی حد تک اسلام کی شرط ختم ہوگئی لیکن کتنی افسوس ناک بات ہے کہ جمہور اہل اسلام نے مطلق طور پر مسلم خواتین کے ساتھ بھی عارضی ازدواج کا سد باب کر کے جنسی بے راہ روی کے سد باب کا حکیمانہ ذریعہ جو شریعت میں قرار دیا گیا تھا،اسے ہمیشہ کے واسطے بند کر کے سیہ کاریوں کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھول دیا۔ممانعت متعہ کی خرابی پر یہی تبصرہ تھا حکیم الاسلام حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کا کہ:

لو لا نہی عمر عن المتعۃ ما زنی الّا شقی

''اگر (خلیفہ دوم) عمر نے متعہ سے ممانعت نہ کی ہوتی تو سوا انتہائی بدبخت شخص کے کوئی زنا نہ کرتا۔

دوسری روایت میں ہے:

ما زنی الّا شقی

یعنی سوا اقل قلیل کے کوئی اس جرم کا مرتکب نہ ہوتا۔

بہت ممکن ہے کہ آخر میں جو تہدید ہے کہ:

---

[1] ۔عنی بطعامھم الحبوب والفاکھۃ (علی ابن ابراھیم) ھو المروی عن ابی عبداللہ علیہ السلام (مجمع البیان)

ومن یکفر بالا یمان فقد حبط عمله

جو ایمان کے بجائے کفر اختیار کرے، اس کے سب اعمال اکارت گئے۔

یہ اپنے عموم کے ساتھ حکم شرعی کے اس قسم کے انکار کو بھی شامل ہو۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡهَکُمۡ وَاَیۡدِیَکُمۡ اِلَی الۡمَرَافِقِ وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِکُمۡ وَاَرۡجُلَکُمۡ اِلَی الۡکَعۡبَیۡنِ ؕ وَاِنۡ کُنۡتُمۡ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوۡا ؕ وَاِنۡ کُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤی اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡکُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَیَمَّمُوۡا صَعِیۡدًا طَیِّبًا فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡهِکُمۡ وَاَیۡدِیۡکُمۡ مِّنۡهُ ؕ مَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ لِیَجۡعَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ وَّلٰکِنۡ یُّرِیۡدُ لِیُطَهِّرَکُمۡ وَلِیُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَیۡکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۶﴾

’’اے ایمان لانے والو! جب تم نماز کے لئے کھڑے ہونے لگو! [1] تو اپنے منہ اور کہنیوں تک کے ہاتھوں کو دھوؤ اور اپنے سر میں مسح کرو اور پیروں کا گٹوں تک! اور اگر حالت جنابت میں ہو تو غسل کر و اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی پیشاب پاخانہ کر کے آیا ہے، یا عورتوں سے تم نے مقاربت کی ہے اور پانی دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کر لو، اس طرح کہ اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کو مل لو۔ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر سختی کرے مگر یہ ضرور چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرنے کا سامان کر دے اور اپنی نعمت تم پر پوری کرے، شاید کہ تم شکر گزار رہو‘‘۔

وضو کی ترکیب اور بوقت ضرورت تیمم کا حکم

اس آیت میں وضو کی ترکیب ہے اور تیمم کی، خواہ بدل وضو ہو یا بدل غسل ہو،------ چنانچہ سب سے پہلے وضو کی ترکیب کا بیان ہے جس کے حسب ذیل اجزاء جو واجب ہیں بیان ہوئے ہیں:

پہلے چہرے کا دھونا۔ یہاں احادیث سے جو استفادہ ہوتا ہے وہ چہرے کے حدود کا تعین ہے، نہ کہ چہرہ میں کسی قید کا کہ وہ کہاں تک دھویا جائے۔

دوسرے ہاتھ کا دھونا۔ اس میں جو الی المرافق ’’کہنیوں تک‘‘ کا لفظ ہے، اس سے اہل سنّت کی فقہ میں دھونے کا یہ طریقہ سمجھ لیا گیا

---

[1]۔ مسح کرو سروں اپنوں کو اور پاؤں اپنوں کو گٹوں تک (شاہ رفیع الدین)

کہ انگلیوں سے کہنی کی طرف ہاتھ لے جا کر الٹا دھویا جائے، مگر تفسیر اہل بیتؑ کی بنا پر مذہب شیعہ یہ ہے [۱] اور بعض تفاسیر اہل سنت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے [۲] کہ یہ "الی المرافق" ہاتھ کے اُس حصّہ کی مقدار کا پتہ دینے کے لئے ہے جسے دھویا جائے مگر دھویا کس طرح جائے؟ اُسے اس لفظ میں نہیں بتایا جا رہا ہے۔

''کہنی تک کے ہاتھ دھوؤ'' مگر دھوؤ کس طرح ؟

اس کا فطری طریقہ یہی ہے کہ ہاتھ کہنیوں سے انگلیوں کی طرف لے جاؤ، اُلٹا نہیں۔ [۳]

تیسرے سر کا مسح۔ اس میں فقہ اہل بیت علیہم السلام کی تعلیم یہ ہے کہ سر کے آگے کے حصّے کا بقدر مسمّٰی مسح کیا جائے اور اس کی استحبابی حد تین انگلیوں بھر ہے۔ اس کے لئے زرارہ نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ قرآن کے الفاظ سے کیوں کر نکلتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: لمکان الباء، یعنی بِرُؤُسِكُمْ میں جوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر پورے سر کا مسح ہوتا تو اَمْسِحُوْا رُؤُسَكُمْ کہا جاتا۔ ''ب'' کی ضرورت نہ تھی ------''ب'' کے آنے سے یہ مفہوم پیدا ہو گیا کہ سر کے اندر کسی جز کا مسح کرنا ہے۔ پورے کا نہیں۔

چوتھے پیروں کا مسح۔ مگر یہاں فقہائے امت میں یہ عجیب اختلاف پیدا ہو گیا کہ اکثریت پیرونکے دھونے کی قائل ہو گئی۔ یعنی انہوں نے اَرْجُلَكُمْ کا عطف بِرُؤُسِكُمْ پر لینے کے بجائے جس کے قبل مسح کا حکم ہے، لے جا کر وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ پر عطف قرار دے دیا جس سے دھونے کا حکم پیدا ہو جائے گا۔ مگر یہ اس فطری مفہوم کے بالکل خلاف ہے جو ان الفاظ قرآنی سے ہر ذہن میں آ سکتا ہے۔

وضو کی ترکیب ختم ہونے کے بعد اجمالی طور پر غسل کا حکم بیان ہوا کہ اگر جنابت کی حالت ہے تو اُس سے طہارت کا جو طریقہ ہے، وہ اختیار کرو۔

ظاہر ہے کہ یہاں بھی اگر معلّم شریعت کی زبان سے غسل کی ترکیب معلوم نہ ہوتی تو الفاظ قرآن سے کوئی سمجھ نہیں سکتا تھا کہ جنابت سے پاک ہونے کا کیا طریقہ ہے؟

اس کے بعد تیمم کا حکم بیان ہوا کہ اگر تم میں کا کوئی پائخانہ جا چکا ہے یعنی حدثِ اصغر ہے جس کے دور کرنے کے لئے وضو کی ضرورت ہے۔

یہاں بھی حدث اصغر کی ایک فرد پائخانہ کا نام قرآن نے لیا اور کیا کیا چیزیں موجباتِ وضو ہیں؟ وہ سب سنّت سے ثابت ہوئی ہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ''یا عورت سے مقاربت کی ہے'' یہ حدث اکبر ہے جس کے دور کرنے کے لئے غسل کی ضرورت ہے۔ یہاں بھی بس ایک قسم کے حدث اکبر یعنی جنابت اور اس کی بھی ایک صورت یعنی مقاربت کا ذکر ہوا ہے۔

یہ ہمیں دوسرے ذرائع کی بنا پر معلوم ہوا ہے کہ حدث اکبر کے جنابت کے علاوہ بھی اقسام ہیں اور جنابت بغیر فعلِ مقاربت بھی ہوتی ہے۔

---

[۱]۔ یجب عندنا غسل الایدی من المرافق------والی فی الاٰیته بمعنی مع کقوله: ولا تأکلوا الی اموالهم الی اموالکم (تیبان)

[۲]۔ الی المرافق ای معها کما بینته السنّة (جلالین)

[۳]۔ یعنی من المرافق (علی بن ابراهیم)

بہر حال ان دونوں صورتوں میں یعنی خواہ حدث اصغر کی حالت ہے جس کے دفعیّہ کے لئے وضو کی ضرورت ہے اور خواہ حدث اکبر ہے کس کے دور کرنے کے لئے غسل کی ضرورت ہوتی ہے، اگر پانی موجود نہیں ہے یا بیمار ہے یا حالت سفر ہے اور سواری سے اتر کر پانی تک نہیں جا سکتا تو ان سب صورتوں میں تیمم کرے۔

تیمم کیا ہے؟ یعنی پاک مٹی کے پاس جاؤ اور اس سے چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کرلو۔

چہرہ اور ہاتھ کتنے؟ یہ بھی یہاں تو مذکور ہے نہیں۔ ہاں معلوم ہے کہ چہرہ میں پیشانی کا مسح ہونا چاہیے ناک کے اوپر کے حصّہ تک اور ہاتھوں کی پشت پر مسح ہونا چاہیے۔

ایک ہی ضرب سے یا دو ضربوں سے؟ اس کا قرآن مجید میں تو ذکر ہے نہیں اور حدیثیں مختلف ہیں۔ اس لئے علماء میں بھی اختلاف ہو گیا ہے۔ قولِ قوی یہ ہے کہ بدلِ وضو میں ایک ہی دفعہ ہاتھوں کو خاک پر مار کے چہرے اور ہاتھوں کو مسح کرے اور بدل غسل میں دو ضربی تیمم کرے یعنی ایک دفعہ خاک پر ہاتھ مار کے چہرہ کا اور دوسری دفعہ ہاتھ مار کے ہاتھوں کا مسح کرے۔

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝۷

''اور یاد کرو اللہ کی بڑی نوازش کو[1] جو تمہارے لئے ہے اور اس کے اُس عہد و پیمان کو جو اس نے تم سے لیا ہے، جب تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور مانا اور اللہ کے غضب سے بچو، یقیناً اللہ سینوں کے اندر کی باتوں کا جاننے والا ہے''۔

یہ عہد و پیمان ایک مسلمان اللہ اور رسولؐ کے ساتھ اسی وقت کر لیتا ہے جب وہ اسلام قبول کرتا ہے کیوں کہ اطاعت و متابعت، اسلام کے معنی کا لازمی جزء ہے اور پیغمبر خداؐ اس مضمر تقاضے کو عالم ظہور میں بھی لے آتے تھے اس بیعت کے ساتھ جو ہر نومسلم سے لی جاتی تھی اور جو مسلم گھرانے میں پیدا ہوا ہے، وہ پیدائش کے ساتھ ہی اس عہد و پیمان میں گرفتار ہے، چاہے شعوراً سے اسی وقت ہو کہ جب وہ سن شعور کو پہنچے اور پھر وہ شعوری طور پر اسلام کی راہ کو اختیار کر کے اُسی پر قائم و برقرار رہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ ۡ وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ اِعۡدِلُوۡا ۛ هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۝۸

---

[1] لم يقل نعم الله لا شعار بعظم النعمة (مجمع البيان)

''اے ایمان لانے والو! تم اللہ کے عائد کردہ فرائض کی تکمیل کے ذمہ دار [1] اور عدل وانصاف کے ساتھ گواہ رہو اور کسی قوم کی مخالفت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے [2] کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرتے رہو، یہی پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے اور اللہ کے غضب سے بچو، یقیناً جو تم کرو، اللہ اس سے باخبر ہے''۔

عدل وانصاف میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں

اس آیت سے ایک باقتدار مسلم حکومت کی ذمہ داری غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ بھی نمایاں ہوتی ہے کہ اُسے حقوق وحدود کے معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم رعایا میں امتیاز برتنا درست نہ ہوگا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۹

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝۱۰

''اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن سے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے کہ اُن کے لئے بخشش ہے اور بہت بڑا اجروثواب اور جنہوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا، یہ دوزخ والے ہیں''۔

یہاں دو قسم کے اشخاص کا ذکر ہے:۔

ایک وہ جن سے قطعی وعدہ نجات اور اجروثواب کا ہے۔ یہ وہ جن میں ایمان اور عمل صالح دونوں شرائط موجود ہوں۔

دوسرے وہ کافر ہیں یعنی ایمان ہی کی صفت سے معرّا ہیں۔ ان کے لئے قطعی طور پر دوزخ کا اعلان ہے۔

مگر ایک درمیانی قسم رہ جاتی ہے، وہ وہ ہیں جنہوں نے کفر وتکذیب سے کام تو نہیں لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے ایمان کے دائرہ میں تو رہے مگر جو ایمان کے عملی تقاضے ہیں، انہیں پورا نہ کر کے عمل صالح کے جوہر سے محروم رہے۔ یہ نہ اس پہلے والے قطعی وعدہ میں داخل ہیں، نہ دوسرے قطعی وعید میں بلکہ یہ وہ ہیں کہ ان کی مغفرت کا بھی امکان ہے اور یہ بھی کہ اُن کی بداعمالیوں کی سزا دی جائے جس کے بعد ان کو نجات حاصل ہو۔

ہاں تصوری طور پر ذہن میں ایک چوتھی قسم بھی آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ عمل صالح ہو بغیر ایمان کے، بادی النّظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ قسم بھی اُس وعدہ اور وعید دونوں سے خارج ہے مگر چونکہ اعمال کی صحت میں ایمان کی شرط ہے اور بغیر ایمان کوئی عمل قبول ہی نہیں، اس لئے حقیقت کے لحاظ سے بغیر ایمان اعمال صالحہ کا وجود ہی نہیں ہوسکتا اور مشاہدہ جس کا گواہ قرار پاسکتا ہے وہ خود عمل ہے، نہ کہ اس کی وہ صفت جو کہ اُسے ''عمل صالح'' کا مصداق قرار دے۔

پھر یہ کہ ایمان کے ساتھ تو پہلی قسم میں حرف عطف کے ساتھ عملوا الصّالحات کی قید تقریباً ہر جگہ لگی ہے اور وہ یہاں بھی موجود ہے

---

[1]۔ متعهّد حق اللہ باشید (شاہ ولی اللہ)، ہو جاؤ تم قائم رہنے والے واسطے اللہ کے (شاہ رفیع الدین)

[2]۔ لا یحملنّکم (تبیان)

مگر دوسری قسم میں کفروا و کذّبوا بآیٰتنا کہا گیا ہے، یہاں حرف عطف کے ساتھ جو اضافہ ہوا ہے، وہ تتمۂ کفر ہی ہے،کوئی اور چیز نہیں ہے۔اس کے آگے جیسے وہاں عملوا الصّالحات ہے، ویسے یہاں بلکہ غالباً کہیں: وعملوا السیّئٰت نہیں کہا گیا ہے تاکہ وعید میں بھی کفر کے علاوہ بداعمالیوں کی شرط ہو لہٰذا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ عمل صالح ہو بغیر ایمان کے تو وعد اور وعید دونوں سے خارج ہے بلکہ پہلی شق یعنی وعد میں چونکہ ایمان کے ساتھ وعملوا الصّحٰت ہے تو وہاں یہ قسم کہ ایمان ہو اور عمل صالح نہ ہو، وعد سے خارج ضرور ہے لیکن دوسری جگہ یہ قسم کہ کفر ہو اور اعضاو جوارح کے افعال میں بداعمالی نہ ہو، وعید کے دائرہ سے لفظاً بھی خارج نہیں ہے۔الفاظ سے ظاہر ہے کہ کفر کی صورت میں اعمال پر نظر ہی نہیں ڈالی جاتی کہ ہو وہ کیسے ہیں؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ هَمَّ قَوۡمٌ اَنۡ يَّبۡسُطُوۡۤا اِلَيۡكُمۡ اَيۡدِيَهُمۡ فَكَفَّ اَيۡدِيَهُمۡ عَنۡكُمۡ‌ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ‌ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۝١١

’’اے ایمان لانے والو! اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے یاد کرو جب کہ ایک جماعت نے ارادہ کیا کہ وہ تمہاری جانب دست درازی کریں تو اللہ نے اُن کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا، اور اللہ کے غضب سے بچو اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے اہل ایمان کو‘‘۔

مفسرین نے اس کو کسی خاص واقعہ سے متعلق قرار دیا ہے جو اُس کے شان نزول کی حیثیت رکھتا ہے مگر اس میں اتنا اختلاف ہے کہ گویا جتنے منُہ اتنی باتیں۔کوئی کہتا ہے کہ یہود کا قبیلہ نضیر تھا جس کے قلعہ میں پیغمبر خداؐ کچھ اصحاب کے ساتھ تشریف لے گئے تو اُس نے اس موقع پر آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا مگر خداوندعالم نے اس کی اطلاع رسولؐ کو دے دی اور حضرتؐ واپس تشریف لائے اور اس طرح بال بال بچ گئے۔

کوئی کہتا ہے: قریش نے ایک آدمی کو حضرتؐ کے قتل کرنے کے لئے بھیجا۔وہ جب آیا تو حضرتؐ کے ہاتھ میں ایک کھنچی ہوئی تلوار تھی۔اُس نے کہا ذرا مجھے تو دکھایئے، آپ نے وہ تلوار اُسے دے دی۔جب وہ تلوار اس کے ہاتھ میں آ گئی تو کہنے لگا اب مجھے آپ کے قتل سے کون روک سکتا ہے؟ حضرت نے بے ساختہ فرمایا ’’اللہ‘‘ ------بس یہ سننا تھا کہ اُس پر اثر ہوا، تلوار پھینک دی اور مسلمان ہوگیا۔

کوئی کہتا ہے کہ مشرکین نے ایک دفعہ مسلمانوں پر حملہ کا ارادہ کیا تھا کہ وہ طرح طرح کے مصائب میں گرفتار ہوگئے اور حملہ نہ کرسکے۔اسے قرآن کہہ رہا ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ حضرتؐ جب ایک قبیلہ سے جنگ کے لئے تشریف لے گئے ہیں اور اُس موقع پر اپنی جماعت سے جُدا ہو کر تنہا جنگل میں ایک جگہ لیٹے ہوئے تھے کہ اُن کا سردار تلوار لے کر آ گیا اور کہا آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا ’’اللہ‘‘ جس کے بعد وہ مُسلمان ہوگیا۔

اتنے شدید اختلاف اقوال [1] کے بعد یہ فیصلہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اصل شان نزول آیت کیا ہے؟

ایک اور قدیم تفسیر یہ ہے کہ یہ مشرکین کے عام رویّہ کا ذکر ہے جو ہجرت مدینہ کے بعد رہا کہ وہ مسلمانوں کا قلع قمع کر دینا چاہتے تھے اور پھر صلح حدیبیہ کے ذریعے سے اللہ نے اُن کے ہاتھوں کو مسلمانوں کی ایذا رسانی سے روک دیا۔ [2]

وَلَقَدۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ‌ ۚ وَبَعَثۡنَا مِنۡهُمُ اثۡنَىۡ عَشَرَ نَقِيۡبًا‌ ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىۡ مَعَكُمۡ‌ ؕ لَـئِنۡ اَقَمۡتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيۡتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنۡتُمۡ بِرُسُلِىۡ وَعَزَّرۡتُمُوۡهُمۡ وَاَقۡرَضۡتُمُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَلَاُدۡخِلَـنَّكُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ‌ ۚ فَمَنۡ كَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ﴿۱۲﴾

''اور بلاشبہ اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد و پیمان لیا اور ہم نے اُن میں بارہ سردار مقرّر کیے اور اللہ نے کہا کہ یقیناً میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم رکھو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ گے اور ان کو تقویت پہنچاؤ گے اور اللہ کو قرضۂ حسنہ دو گے تو میں تمہاری غلطیوں کی تلافی کروں گا اور تمہیں داخل کروں گا اُن بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی مگر جو تم میں سے اس کے بعد کفر اختیار کرے گا تو وہ بلاشبہ سیدھے راستے سے بھٹکا ہوا ہوگا''۔

ایک حدیث پیغمبر خداؐ کی جمہور اُمت میں مسلّم ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا جو کچھ بنی اسرائیل میں ہوا ہے، وہ اس امت میں بھی ہوگا۔ اس لئے بنی اسرائیل کے واقعات بڑی کثرت سے قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں چنانچہ بنی اسرائیل میں بارہ نقیب یعنی سردار ہوئے تو رسول خداؐ نے فرمایا کہ میری امت میں بھی میرے بعد بارہ سردار ہوں گے۔ وہی میرے جانشین ہوں گے۔

یہ دو ازدہ امام کا اعلان ہے جو تمام مسلمانوں میں متفق علیہ ہے۔ اس صورت میں حیرت ہوتی ہے کہ پوری اُمّت نے ''اثنا عشری'' ہونے سے کیوں گریز کیا؟

اس موقع پر شاہ عبدالقادر برادر شاہ عبدالعزیز دہلوی صاحب تحفہ کا نوٹ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

'' یہ بیان فرمایا بنی اسرائیل سے عہد لیا، حضرت موسیٰؑ کی آخر عمر میں یہ اقرار لیتے ہیں، یہ سورت آنحضرتؐ کی آخر عمر میں نازل ہوئی۔ شاید ہم کو سنایا اسی واسطے کہ ہم کو بھی یہی تقیّد ہے۔ ایک عہد اس امت سے تھا کہ رسولؐ جو بعد میں پیدا ہوں اُن کی مدد کرو۔ اس کے بدل ہم

---

[1]۔ اختلفوا فی الباسطین ایدیہم علی خمسۃ اقوال (تبیان)

[2]۔ یعنی اھل مکۃ من قبل ان فتحھا فکفّ ایدیہم بالصلح یوم الحدیبیہ (علی بن ابراھیم)

سے یہ عہد ہے کہ خلفاء کی اطاعت کرو۔ یہ مذکور بارہ سرداروں کا بیان فرمایا اسی اشارہ کو کہ حضرتؐ نے بتایا ہے میری اُمت میں بارہ خلیفہ ہوں گے قوم قریش سے"۔ (موضح القرآن)

بس اس میں اتنا اور اضافہ درکار ہے کہ ان بارہ سرداروں کے لئے خالق کا اعلان ہے کہ انہیں ہم نے مقرر کیا تھا یعنی جمہور اُمّت کے مقرر کردہ نہ تھے لہٰذا یہ بارہ خلفاء بھی جو رسولؐ کے بعد اس اُمت میں ہیں، اُمت کے اجماع یا شوریٰ سے منتخب کردہ خلفاء نہیں ہیں بلکہ یہ وہی بارہ جانشین رسولؐ کے ہیں جو اللہ کے منتخب کردہ ہیں اور ان کی اطاعت اس اُمّت پر اُسی طرح فرض قرار پاتی ہے جس طرح بنی اسرائیل پر اُن رسولوں کی اطاعت فرض تھی جو ان کی طرف من جانب اللہ مبعوث ہوئے تھے۔ اس کے لئے شاہ صاحب کا آخری فقرہ سن لیجئے کہ:۔

"فرمایا ہے کہ جو خرابی ہوئی پہلی اُمّت میں، سو ہو گی تم میں بھی -----جیسے وہ خراب ہوئے پیغمبروں کی مخالفت سے، یہ اُمّت خراب ہوئی خلیفہ پر خروج کرکے"۔ (موضح القرآن)

اب "خلیفہ پر خروج کرکے" کہا جائے یا حقیقی خلفاء کو نہ مان کر اپنے دل بخواہ اشخاص کو خلیفہ قرار دیکر اور جو حقیقی بارہ سردار تھے، اُن کی اطاعت سے انحراف کرکے۔

"اللہ کو قرضہ حسنہ' دینے کا جو ذکر کیا گیا ہے، یہ پہلے بھی آچکا ہے ان الفاظ میں کہ: وَاَقۡرَضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا (الحدید۔۱۸) "اللہ کو قرضہ حسنہ دو" اور: مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا (البقرۃ۔۲۴۵) "کون ہے جو اللہ کو قرضہ حسنہ دے" ------ہر جگہ اس سے مراد یہ ہے کہ اُن کاموں میں صرف کرو جو اللہ کو پسند ہیں، جس کا صلہ وہ تمہیں بعد میں عطا کرے گا۔[۱]

اس میں یہی ضرورت نہیں ہے کہ دوسروں کو "قرضہ حسنہ" ہی دیا جائے۔ ہاں یہ قرضہ حسنہ دینا بھی کبھی اعانت مومن ہونے کے لحاظ سے اُس کے تحت میں داخل ہو جائے گا۔

اس کا صاف طور پر مطلب یہ ہے کہ یہ 'انفاق فی سبیل اللہ کی تعبیر "اللہ کو قرضہ حسنہ' دینے سے بطور استعارہ ہے جس کی بنیاد تشبیہ پر ہوتی ہے یعنی راہ خدا میں صرف کرنا، وہ کسی صورت سے بھی ہو، مشبّہ ہے اور قرض مشبہ بہ ہے "وجہ مشبہ" جس کو استعارہ میں 'وجہ جامع" کہتے ہیں بعد میں اُس کا لازماً ملنا ہے۔ یعنی جیسے قرضہ بعد میں ایک فرض شناس لازماً ادا کرتا ہے اسی طرح جو کچھ راہ خدا میں صرف کیا جائے، اس کا معاوضہ بصورت ثواب اللہ ضرور عنایت فرمائے گا۔

اب جب کہ قرضہ "مشبہ بہٖ" کی حیثیت رکھتا ہے تو مشبّہ یعنی انفاق کو قرض دینے سے مخصوص کرنا جیسا کہ بعض تراجم سے ظاہر ہوتا ہے[۲] ہرگز درست نہیں ہے۔

فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ لَعَنّٰهُمۡ وَجَعَلۡنَا قُلُوۡبَهُمۡ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوۡا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنۡهُمۡ اِلَّا

---

[۱]۔ ای انفقتم فی سبیل اللہ واعمال البرّ نفقۃ حسنۃ یجازیکم بہا فکانہ قرض من ھذا الوجہ (مجمع البیان)

[۲]۔ خدا (کی خوشنودی کے واسطے لوگوں) کو قرض حسنہ دیتے رہو (مولوی فرمان علی صاحب)

قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

''تو ان کے اپنے عہد و پیمان کو توڑ دینے کی وجہ سے ہم نے ان کو مورد لعنت قرار دیا اور اُن کے دلوں کو سخت کر دیا۔ وہ خداوندی کلام کو اس کے اصلی مقامات سے ہٹا دیا کرتے ہیں، اور جن چیزوں کی یاددہانی انہیں بار بار کی گئی تھی، اُن میں کا بڑا حصّہ بھول گئے اور برابر آپ اُن کی ایک نہ ایک بددیانتی سے واقف ہوتے رہیے گا سوا اُن میں کے کم آدمیوں کے لہٰذا ان کو معاف کیجیے اور درگزر سے کام لیجئے۔ یقیناً اللہ اچھا سلوک کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

یہ ہے انجام اُس عہد کا جو بارہ سردار مقرر کرنے کے ساتھ بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا اور اب کیا کہا جائے انجام اس عہد کا جو اس وقت بارہ اماموں کے مقرر کرنے کے ساتھ ہوا اور اُن کی اطاعت سے منحرف ہونے کے بعد اُمت کا جو کردار قرآن نے بتایا ہے، اُن کی ہر ہر بات اس اُمّت میں بھی نظر آرہی ہے تو کیا یہ قرآن کی مکمل تصدیق نہیں ہے؟

شاہ عبدالقادر صاحب کو کیا اپنے گزشتہ نوٹ کے تتمہ کے طور پر اس آیت کے مضمون پر کوئی نوٹ لکھنا نہیں چاہیے تھا مگر اب معاملہ بہت ٹیڑھا تھا، اس لئے انہوں نے خاموشی ہی اختیار فرمانا مناسب سمجھی۔

اور اب بہت زیادہ کچھ طبائع میں ناگواری پیدا نہ ہو تو یہ سوال بھی پیدا تو ہوتا ہی ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے اس عہد اطاعت کے توڑنے کی وجہ سے خالق نے کہہ دیا: **لعنّاھم** ''ہم نے ان کو مورد لعنت قرار دیا تو اب اس امّت میں جو سردار مقرر کیے گئے، ان کی اطاعت کے عہد کو توڑنے والے کیا ہونگے لعنت کے مورد یا رحمت کے؟

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾

''اور اُن سے جو کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں، ہم نے عہد و پیمان لیا تو انہوں نے بھی اُن چیزوں میں سے جن کی انہیں یاددہانی کی گئی تھی، بڑے حصّہ کو بھلا دیا تو ہم نے اُن کے درمیان قیامت تک کینہ و بغض کا سامان کر دیا اور جلد آئے گا وہ وقت جب اللہ انہیں بتائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے''۔

اب ایک امّت میں فرقوں کے پیدا ہونے کا جن میں باہمی عداوت اور اختلاف ایسا ہے کہ:۔ **کل فرقة تکفّر الاخرٰی** (جلالین) ہر ایک فرقہ اُس دوسرے فرقہ کو کافر کہتا ہے۔

سب معلوم ہو گیا کہ یہ اللہ کی طرف کے عہد و پیمان کو توڑنے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی مسلمانوں کی آنکھیں نہ کھلیں تو اس سے بڑھ کر افسوس ناک سانحہ کیا ہو سکتا ہے؟

مولانا فرمان علی صاحب موصوم نے اسے مسیحی ممالک کے باہمی تصادمات پر منطبق کرتے ہوئے یوں کہا ہے کہ:۔
’’یہ بھی قرآن کی ایک اعلیٰ درجہ کی پیشن گوئی ہے کہ جس کو تیرہ سو برس گزرنے پر بھی ہم اپنے زمانہ میں پاتے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ اہل یورپ کل عیسائی اور دنیا کی تمام اقوام پر غالب ہیں مگر انگلستان، فرانس، اٹلی، امریکا اور آسٹریلیا میں ہر ایک دوسرے کا جانی دشمن اور خون کا پیاسا ہے فاعتبروا یااولی الابصار‘‘۔
مگر یہ بھی عیسائیوں سے مخصوص چیز تو نہیں ہے، مسلم ممالک آپس کے تصادم سے کب بری ہیں اور ان میں ایک دوسرے کے مقابلہ میں خونریزیوں، سفاکیوں اور ہر قسم کے غیر انسانی حرکات کی کیا کمی ہے؟!
حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں جو باتیں کہی ہیں خواہ وہ یہود کے لئے: وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ(البقرة۔٦١) کا اعلان ہوا ورخواہ یہ عیسائیوں کے لئے :وَاَلۡقَيۡنَا بَيۡنَهُمُ الۡعَدَاوَةَ وَالۡبَغۡضَآءَ کا فرمان، وہ سب باتیں مسلمانوں کو ہوشیار رکھنے ہی کے لئے تھیں کہ تم بھی اگر ان خراب کاریوں میں مبتلا ہو گئے اور انہی جرائم کے مرتکب ہوئے جو ان قوموں نے کیے تھے تو یہی انجام سب تمہارے بھی ہونا ہیں اور اب ایک ایک کر کے وہ ہر ایک انجام مسلمانوں کے سامنے ہے۔اس پر حضرت اقبال ’’شکوہ‘‘ کرتے ہیں تو کیا کریں۔

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَـكُمۡ كَثِيۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡكِتٰبِ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ؕ قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ ۙ﴿۱۵﴾ يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَيَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۱۶﴾

’’اے اہل کتاب تمہارے پاس آ گیا ہے ہمارا پیغمبر جو تمہارے لئے صاف بیان کر رہا ہے بہت سی ان چیزوں کو کہ جو تم اس کتاب میں سے چھپاتے رہے ہو اور بہت سی باتوں کو وہ نظرانداز کر دیتا ہے [1] تمہارے پاس آئی ہے ایک بڑی روشنی اور واضح کتاب جس سے اللہ ان لوگوں کو جو اس کی خوشنودی کے درپے ہوتے ہیں چلاتا ہے نجات کی راہوں پر اور انہیں اپنے حکم سے نکالتا ہے تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور انہیں لگاتا ہے سیدھے راستے پر‘‘۔
کسی تفسیر میں صراحت تو غالباً نہیں دیکھی مگر میرا ذہن ایسا محسوس کرتا ہے کہ ’’تمہارے لئے صاف بیان کرتا ہے‘‘ میں ’’تم‘‘ کے مخاطب اہل کتاب کے عوام ہیں اور ’’تم جو کتاب میں سے چھپاتے ہو‘‘ اس کے مخاطب ان کے علماء ہیں۔ اس لئے کہ جو لوگ جانتے ہوں اور ارادةً چھپاتے ہوں، اُن کے واسطے بیان کرنے کے کوئی معنی نہیں نکلتے۔ چونکہ عنوان خطاب یعنی ’اہل کتاب‘ میں دونوں طبقے داخل ہیں، اس لئے دونوں جگہ ’’تم‘‘، ’’تم‘‘ آیا ہے لیکن دونوں جگہ کے ’’تم‘‘ کا مقصد الگ الگ ہے۔

---

[1] ۔یعفوا عن کثیر من ذٰلك فلا یبیّنه (جلالین)

''بہت سی باتوں کو نظر انداز کرتا ہے''، یعنی وہ باتیں جن کی کوئی دینی اہمیت نہیں ہے[۱] مثلاً قصص وغیرہ میں اگر کچھ خرافات تم نے بھر دی ہے ایسی جس کا اثر دین پر نہیں پڑتا تو اُن سے رسولؐ نے تعرض نہیں کیا مگر اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہئے تھا کہ بعد میں مسلمان اُن اسرائیلیات کو جزء بنا کر تفسیر قرآن اور احادیث اور تاریخ اسلام درج کر دیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔـا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑰

''بلاشبہ کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ، مریم کے بیٹے مسیح ہی ہیں۔ کہہ دیجیے کہ اللہ کی طرف سے کون ہے جسے کوئی اختیار حاصل ہو اگر وہ چاہے کہ مریم کے بیٹے مسیح اور اُن کی ماں اور زمین میں جتنے ہیں، سب کو فنا کر دے اور اللہ کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کی۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''

الوہیت مسیح علیہ السلام کا ابطال

مطلب یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام اور ان کی ماں جب اُسی طرح بے بس ہیں جیسے کہ دنیا کے اور سب لوگ تو پھر انہیں اللہ کے ساتھ متحد سمجھنا کہاں درست ہو سکتا ہے۔[۲]

معلوم ہوا کہ یہ پہلا حصّہ کہ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔـا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ نصاریٰ کے عقیدۂ تثلیث کی رد میں ہے جس کی رو سے مسیح علیہ السلام، اللہ کے ساتھ متحد قرار دیئے جاتے ہیں۔

اس کے بعد کا جزء کہ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ یہ عقیدہ ابنیّت مسیح کی رد ہے۔

یعنی یہ سمجھنا کہ وہ بے باپ کے پیدا ہوئے لہٰذا اللہ کے بیٹے ہیں، غلط ہے۔ کیوں کہ یہ تو اللہ کے ملک وقدرت کی وسعت ہے۔ آسمان اور زمین کی ہر چیز اللہ کی ہے۔ اس معنی سے مسیح علیہ السلام بھی اللہ کے ہیں اور وہ جسے جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جیسے آدمؑ کو بغیر باپ کے پیدا کیا

---

[۱] یترك كثيرا الا يأخذ كم به ولا يذكره لانّه لم يؤمر به (تبیان) مما ليس فيه فائدة (مجمع البيان)

[۲] فكيف يجوز اعتقاد الرّبوبيّة فيه مع انّه مسخّر مربوب مقهور (مجمع البيان) و وجه الاحتجاج بذلك انه لو كان المسيح الٰهاً لقدر على دفع امر الله اذا اتى باهلاكه و اهلاك غيره (تبیان)

،اس نے مسیح کو بغیر باپ کے خلق کر دیا۔ اس سے کوئی اللہ کا بیٹا قرار نہیں پا سکتا۔[1]

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؗ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

''اور یہودیوں اور عیسائیوں کا قول ہے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ کہو کہ پھر وہ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے بلکہ تم بھی اس کی مخلوقات میں سے کچھ انسان ہو۔ وہ جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے، سزا دیتا ہے اور اللہ کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے، سب کی اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے''۔

یہود و نصاریٰ کے دعاوی باطلہ اور ان کی رد

کسی جماعت کو بحیثیت جماعت یہ زعم نہ ہونا چاہیے کہ اُسے اللہ کے ساتھ کوئی خاص رشتہ ہے جس کی بنا پر اُس کے اعمال کا محاسبہ نہ ہوگا۔ یہود اور نصاریٰ اسی زعم میں مبتلا ہو گئے تھے جس کی رد ہو رہی ہے مگر رد کا انداز دیکھنا چاہیے کتنا ملائم ہے۔

ان کے جواب میں ایک ایک کر کے اُن کی سیاہ کاریوں کی فہرست پیش کی جا سکتی تھی کہ تم ایسے، تم ایسے۔ اس کے بعد بھلا تمہارا منہ ہے کہ تم کہو کہ ہم اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں؟! پھر اس کے بعد کی منزل تھی ''تم نہیں، ہم'' کہ کہاں تم اور کہاں ہم! ہم ایسے ہیں۔ اگر کوئی اس کا بیٹا اپنے کردار کی بنا پر ہو سکتا ہے تو وہ ہم ہو سکتے ہیں اور ہم ہی اُس کے محبوب بھی قرار پا سکتے ہیں۔

عام بحثم بحثا اور جس کا عرف عام میں نام مناظرہ ہے، اُس کے لحاظ سے یہ سب ہونا چاہیے مگر اُن کے ایسے غلط دعوے کے جواب میں قرآن مجید نے میدان گفتگو میں کیسی سبک خرامی اختیار کی ہے۔ پہلے خود ان کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے ایک سوال کیا ہے جس کے عام طور پر مفسرین نے جو معنی قرار دیے ہیں، ہم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے کہ وہ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے؟[2] مگر ''اسلام کی حکیمانہ زندگی'' میں ہم نے اُس کا جو مفہوم قرار دیا ہے اور جواب بھی ہمارے ذہن میں زیادہ موزوں ہے، وہ یہ ہے کہ ''پھر بھلا وہ تمہارے گناہوں کی سزا کا ہے کو دے گا!''

اس صورت میں اس جملہ کے اندر اس ادّعاء کے اثر کا اظہار مضمر ہے کہ جس جماعت کو یہ تصوّر پیدا ہوگا، وہ پھر مواخذہ اعمال سے بالکل نڈر ہو جائے گی لہٰذا مسلمانوں کو بھی یہ تصوّر کبھی قائم نہ کرنا چاہیے۔

---

[1] ۔فدل بہا علیٰ انّہ لیس فی کون المسیح من اُنثیٰ بغیر ذکر دلالۃ علیٰ کونہ ا نہا (مجمع البیان

[2] ۔وھم یقرون بانّھم یعذّبون ---- والیھود تقرّ بانّھم یعذبون اربعین یوما وھی عدد الایام التی عبدوا فیھا العجل (تبیان) وقیل انّ معناہ الماضی ---- ای فلم عذبکم (مجمع البیان)

اس کے بعد اُن اہل کتاب سے مخاطب ہو کر بس یہ کہا گیا ہے جیسے کسی کو سبق سمجھایا جائے کہ کسی فرد یا جماعت کو اپنے منہ سے اللہ سے اپنے لئے کسی خاص رشتہ کا تصوّر نہیں کرنا چاہیے۔ سب آدمی اس کی مخلوق ہیں، تم بھی اُنہی میں سے ہو۔ پھر بجائے اس کے کہ اُن کے قطعی مستحق عذاب ہونے کا اعلان کیا جائے، ایک عام بات کہہ دی گئی کہ ''جسے وہ چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور یہ چاہنا بلا وجہ تھوڑی ہوتا ہے؟! یہ بھی خود انسان کے اعمال کی کیفیت اور گناہوں کو مقدار اور نوعیت سے وابستہ ہے اور پھر آخر میں اس کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ کی کائنات کی وسعت کے مقابلہ میں، یہ انسان ضعیف البیان ہے، ہی کیا جو یہ ''خودی'' کے زعم میں مبتلا ہو کر ''میں'' اور ''ہم'' کی ڈینگیں مارے۔

اور جتنی باتیں اُن سے مخاطب ہو کر کہی گئی ہیں، سب عام ہیں جن میں ان سے مخاطب افراد کی خصوصیت نہیں بلکہ یہ سب باتیں خود مسلمانوں کو بھی ان تصوّرات کے قائم کرنے سے سدّ راہ ہیں۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۹﴾

''اے اہل کتاب! آیا ہے تمہارے پاس ہمارا پیغمبر تمہارے لئے واضح بیانات لے کر اُس وقت کہ جب عرصہ سے پیغمبروں کا سلسلہ بند تھا[1] کہ تم یہ نہ کہو کہ تمہارے پاس کوئی خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا تو لو یہ ایک خوش خبری دینے والا، ڈرانے والا آیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

یعنی پیغمبروں کا بھیجنا ہمیشہ خلق پر اتمام حجت کے لئے ہوا کیا ہے چنانچہ اب یہ پیغمبر اس لئے بھیجا گیا ہے کہ تم پیش خدا حجت پیش نہ کر سکو کہ ہماری ہدایت کا کوئی انتظام نہیں ہوا۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾

''اور جب کہا موسیٰؑ نے اپنی قوم سے اے میری قوم والو! یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے جب کہ اس نے تم میں پیغمبر بنائے اور تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ چیزیں دیں جو دنیا میں کسی کو نہیں دی تھیں''۔

یہ اختلاف تعبیر قابل لحاظ ہے کہ پیغمبروں میں کہا گیا ''تم میں پیغمبر بنائے'' اور بادشاہوں میں کہا ''تم میں پیغمبر بنائے'' اور بادشاہوں میں کہا ''تم کو بادشاہ بنایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبری کے لائق جو ہر کچھ خاص افراد ہی میں ہوتا ہے، سب نہیں ہوتا اور بادشاہت میں کوئی ذاتی جوہر درکار نہیں۔ وہ اسباب وظروف پر مبنی ہے۔ ہاں وہ بادشاہت بھی جو منصب خاص کے طور پر اللہ کی جانب سے ملے جیسے طالوت کو ملی تھی، اس میں پھر

---

[1] یعنی علی انقطاع من الرّسل و فیہ دلالۃ علی انّ زمان الفترۃ لم یکن فیہ نبیّ (تبیان)

صلاحیت فرد کی شرط ہوتی ہے۔جس کا انتخاب خلق خدا کے ہاتھ میں نہیں ہوسکتا۔
پیغمبر یا امام بغیر خدا کے بنائے نہیں بنتا اور پھر اس میں خلق کے ماننے، نہ ماننے کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن دنیوی بادشاہت امراعتباری ہے۔ وہ دنیا والوں کے مان لینے سے وابستہ ہے اور اسی لئے جب وہ ماننا چھوڑ دیں تو وہ معزول ہوجاتا ہے مگر نبی کا معزول کرنا افراد امّت کے بس سے باہر ہے۔
اور یہ جو کہا گیا ہے کہ ''تم کو وہ چیزیں دیں جو کسی کو نہ دی تھیں'' یہ ان واقعات سے ظاہر ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے رونما ہوئے جیسے دریا کا شگافتہ ہونا اور من وسلوی کا نازل ہونا۔ یہ اور بات ہے کہ ان سب چیزوں کے ملنے پر بھی اس جماعت نے ناقدری ہی سے کام لیا اور کفران نعمت کرتی رہی لہٰذا انہیں سزا بھی پھر بہت سخت ملی یعنی خدا کی وہ غیر معمولی عطائیں ان کے رفعت مراتب کا سبب نہ تھیں کہ وہ افضل الامم قرار پاتے بلکہ نتیجہ میں کفران نعمت کی وجہ سے شاید انہیں شرّ الامم کا درجہ حاصل ہوگیا ہو جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لئے غضب الٰہی میں گرفتار ہوگئے۔

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿٢١﴾

''اے میری قوم والو! ان پاک سرزمین میں داخل ہوجاؤ جو اللہ نے تمہارے نصیب میں لکھ دی ہے اور پیٹھ دکھا کر بھاگنا نہیں کہ انجام میں گھاٹا اٹھاؤ گے''۔

سرزمین مقدس کی فتح پر ماموری، بنی اسرائیل کی عدول حکمی اور اس کا انجام

حضرت ابراہیمؑ جب نمرود اور وہاں کے دوسرے مشرکین کے عناد اور مخالفت سے مایوس ہو کر نکلے تو پھر شام کے ملک میں کنعان کے علاقے میں جا کر قیام کیا۔ یہی کنعان کا علاقہ اب فلسطین کہلاتا ہے۔حضرت یعقوبؑ کے زمانہ تک اس خاندان کا یہاں قیام رہا۔ پھر جب جناب یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے کنعان سے نکالا اور کنوئیں میں پھینکا، پھر وہ بحیثیت غلام مصر کے بازار میں فروخت کیے گئے اور پھر حالات کے انقلاب سے مصر کی مسند اقتدار پر پہنچے تو انہوں نے اپنے والد حضرت یعقوبؑ کو مع تمام افراد خاندان کے مصر میں بلوالیا اور اب کنعان یعنی فلسطین پر ایک سرکش قوم کا قبضہ ہوگیا جو عمالقہ کہلاتے ہیں۔ ادھر حضرت یوسفؑ کے بعد مصر میں رفتہ رفتہ ملکی اور غیر ملکی کا سوال ابھرا اور آخر وہاں کی مقامی قوم قبط نے اقتدار حاصل کر کے بنی اسرئیل کو اپنی غلامی میں لے لیا اور اس قوم کے ارباب اقتدار نے جو فرعون کہلاتے تھے، بنی اسرائیل کو غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا اور ان پر انتہائی مظالم کے پہاڑ توڑے تو خالق نے حضرت موسیٰؑ کو مبعوث کیا۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں بشارت دی کہ تم اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین یعنی ملک کنعان میں پھر واپس جاؤ گے اور وہاں تمہیں از سر نو اقتدار حاصل ہوگا چنانچہ اس آیت میں 'ارض مقدّسہ'' (پاک سرزمین) سے وہی ابراہیمؑ واسحاقؑ کا شہر کنعان مراد ہے۔
یہ بشارت جب تک فقط بشارت کی شکل میں تھی، قوم والے بڑے خوش تھے مگر جب بظاہر اس کی منزل قریب آ گئی یعنی فرعون اور اس کے ساتھ والے غرق ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو ان کے مظالم سے نجات دلا کر سرزمین فلسطین کی طرف روانہ ہوئے تو اب ان پر فرض عائد

کیا گیا کہ تم اپنی امکانی قوت عمل کا استعمال تو کرو یعنی ان عمالقہ سے جو اس سرزمین پر قابض ہیں جا کر مقابلہ کرو اور اس میں کمزوری نہ دکھاؤ میدان جنگ سے پیٹھ نہ پھیراؤ ورنہ گھاٹا اٹھاؤ گے یعنی اس بشارت کی تکمیل تم سے بہت دور ہو جائے گی تو اب کیا ہوا؟ اسے قرآن کی زبان سے سنیے اور ان سے درس لیجیے یعنی سمجھیے کہ مسلمانوں کو بھی اس غلبہ واقتدار عالمی کی بشارت دی گئی ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کے ساتھ اپنی عملی ذمہ داری کوئی نہیں ہے۔

اب اگر اس بشارت کی تکمیل ہمیں دور نظر آ رہی ہے تو اس میں نہ جانیں کس حد تک اپنی عملی کمزوری کا دخل ہے جو سنّت الٰہیہ کے بالکل مطابق ہے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِىْ وَاَخِىْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾

''انہوں نے کہا اے موسیٰؑ! اس میں بڑے زبردست لوگ ہیں اور ہم ہرگز وہاں داخل نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ اس میں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ نکل جائیں اس میں سے تو ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔ دو اشخاص نے ان میں سے جو ڈرتے تھے، جنہیں اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا، کہا کہ ان کا مقابلہ کر کے دروازہ کے اندر داخل ہو۔ جب داخل ہو جاؤ گے تو پھر یقیناً تم غالب آؤ گے اور اللہ ہی پر بھروسا کرو، اگر ایمان رکھتے ہو۔ انہوں نے کہا اے موسیٰؑ! ہم ہرگز وہاں داخل نہیں ہوں گے، کبھی جب تک کہ وہ اس میں ہیں لہٰذا بس آپ جایئے اور آپ کا پروردگار اور دونوں لڑ لیجیے ہم یہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ موسیٰؑ نے کہا پروردگار! میں قابو نہیں رکھتا مگر اپنے اوپر اور اپنے بھائی پر لہٰذا تو ہی فیصلہ کر دے ہمارے درمیان اور اس بداعمال جماعت کے درمیان''۔

یہ ''بداعمالی'' اگر صرف عدول حکمی کی حد تک ہوتی تو فقط ''فسق'' یعنی بداعمالی قرار پاتی لیکن یہاں اس کے ساتھ احکام الٰہی سے تمسخر بھی شریک تھا جو ان کے آخری فقرہ (آپ جایئے اور آپ کا پروردگار اور دونوں مل کر جنگ کر لیجئے) سے ظاہر ہے، اس لئے وہ کفر کے دائرہ میں داخل ہے

لیکن کفر پر ''فسق'' کا اطلاق قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی موجود ہے۔ گویا وہ فسق ہی کی ایک شدید صورت ہے۔[1]

ان کے اس دل شکن انداز سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے سے انکار کر دینے پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارونؑ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا[2] کہ پروردگارا! مجھے سوا اپنے بھائی کے کسی پر اختیار نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سوا جناب ہارونؑ کے تقریباً پوری جماعت کو آپ نے فاسقین کا لقب دے دیا ہے۔ جو کہ ہم نے کہا ''کافرین'' کی ایک تعبیر ہے۔

اس کے بعد کبھی اس پر حیرت نہ ہونا چاہیے کہ صرف ایک اقل قلیل جماعت حق کے جادہ پر قائم رہے اور باقی سب ہی اغراض دنیا کا شکار ہو کر اس سے منحرف ہو جائیں۔

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيۡهِمۡ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً ۚ يَتِيۡهُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ‌ ؕ فَلَا تَاۡسَ عَلَى الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۲۶﴾

''ارشاد ہوا کہ پھر اب وہ[3] ان پر چالیس برس کے لئے حرام ہے، وہ جنگل میں سرگردان پھرتے رہیں گے تو تمہیں ان بداعمال لوگوں پر افسوس نہ ہونا چاہیے''۔

یہ ''حرام'' وہ حرام شرعی نہیں ہے جس کی مخالفت انسان کے لئے ممکن ہو بلکہ یہ وہ فیصلہ تقدیر ہے جو ان کی بداعمالی کی سزا کے طور پر ان کے بارے میں نافذ ہوا ہے[4] کہ اب ایک مدّت دراز تک وہ اس ملک میں داخل ہونے سے محروم ہو گئے۔

تیّہ کے معنی ہیں حیرانی و سرگردانی کے ہیں[5] چنانچہ اس صحرا کا نام ہی زمین تیّہ ہو گیا۔ اس طولانی مدّت کے دوران میں حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ، دونوں کی وفات ہو گئی اور وہ وہیں صحرا میں دفن ہوئے۔

پھر بعد میں جناب یوشع بن نونؑ جانشین حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرکردگی میں بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہو سکے اور انہوں نے جہاد کر کے وہاں اپنا تسلط قائم کیا۔

وَاتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ ابۡنَىۡ اٰدَمَ بِالۡحَـقِّ‌ ۘ اِذۡ قَرَّبَا قُرۡبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنۡ اَحَدِهِمَا وَلَمۡ يُتَقَبَّلۡ مِنَ الۡاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقۡتُلَـنَّكَ‌ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الۡمُتَّقِيۡنَ‏ ﴿۲۷﴾ لَـئِنۡۢ بَسَطْتَّ اِلَىَّ يَدَكَ لِتَقۡتُلَنِىۡ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِىَ اِلَيۡكَ لِاَقۡتُلَكَ‌ ۚ اِنِّىۡۤ

---

[1] ۔ قال اللہ تعالیٰ الا ابلیس کان من الجن ففسق عن امر ربہ و کان بذٰلک کافرا بلا خلاف (تبیان)

[2] ۔ فاخذ موسیٰ بید ھٰرون و قال (علی بن ابراھیم)

[3] ۔ انہا ای الارض المقدسۃ (جلالین)

[4] ۔ قول اکثر المفسرین انہ تحریم منع ---- و قال ابو علی یجوز ان یکون المراد بہ تحریم تعبد و الاول ھو الاظھر (تبیان)

[5] ۔ اصل التیہ التحیر الذی لا یھتدی لا جلہ للخروج عن الطریق الی الارض المقصودۃ (مجمع البیان)

اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّىۡۤ اُرِيۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِىۡ وَاِثۡمِكَ فَتَكُوۡنَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ‌ ۚ وَذٰ لِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيۡنَ‌ۚ ﴿۲۹﴾

''اور سنایئے انہیں آدم کے دونوں بیٹوں کا واقعہ صحیح صحیح جب کہ ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قبول ہوئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی۔ اس نے کہا میں ضرور تمہیں مار ڈالوں گا۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تو بس پرہیز گاروں سے قبول کرتا ہے۔ اگر تم نے میری طرف ہاتھ بڑھایا کہ مجھے قتل کرو تو میں اپنا ہاتھ تمہاری طرف تمہیں قتل کرنے کے لئے نہیں بڑھاؤں گا۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اٹھاؤ میرا بھی گناہ اور اپنا بھی گناہ تو ہو جاؤ گے اہل دوزخ میں سے اور یہ سزا ہے ظلم ڈھانے والوں کی''۔

قصہ ہابیل و قابیل

آدمؑ کے دونوں بیٹے یعنی ہابیلؑ اور قابیل۔

قرآن مجید کے انداز بیان سے ظاہر ہے کہ یہ بہت قدیم واقعہ ہے اور ایسا قدیم جو ''قبل التاریخ'' کے دائرہ میں داخل ہے۔ بے شک اس کا تذکرہ بائبل میں ہے مگر قرآن مجید سے اس کی جتنی کڑیوں کا پتہ لگتا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) آدمؑ کے دونوں فرزندوں نے قربانی پیش کی۔

(۲) ایک کی قربانی قبول ہوئی، دوسرے کی رد۔

(۳) اس پر وہ جس کی قربانی رد ہوئی تھی، اپنے اس بھائی کے قتل پر آمادہ ہو گیا۔

اس کے آگے مزید تشریحات کے لئے عقل سے مدد لینا ہوگی اور اس کے آگے ان سے جنہیں تشریح قرآن کا حق تھا اور وہ اصل تو معصومین علیہم السلام ہو سکتے ہیں، ورنہ مجبوراً دوسرے علماء کا سہارا لینا پڑے گا، جس سے صرف گمان ہو سکتا ہے، یقین نہیں ہو سکتا۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آدمؑ کے دو فرزندوں سے کیا مراد ہے؟ یوں تو بنی آدم کا لفظ قرآن میں سب انسانوں کے لئے آیا ہے مگر بنی آدم ''آدم کے دو فرزندوں'' کے لفظ سے پہلی مرتبہ جو ذہن میں آتا ہے، وہ یہی کہ وہ بلا واسطہ آدمؑ کے بیٹے تھے۔ ہمارے بعض مفسرین نے اسے متفق علیہ کہا ہے [۱] اور ان دونوں کا نام جو ہمارے یہاں شہرت عام رکھتا ہے، ہابیل اور قابیل ہے مگر ایک قول کا اس کے خلاف یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں بنی اسرائیل میں کے دو بھائی تھے جن کا یہاں ذکر ہے اور انہیں آدمؑ کا فرزند اس طرح کہا گیا ہے جیسے سب آدمی بنی آدم کہے جاتے ہیں [۲] مگر بظاہر یہ قول شاذ ہے اور قوت پہلے ہی قول کو حاصل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ قربانی پیش کرنے کا آخر سبب کیا تھا اور اسی سے یہ مسئلہ حل ہوگا کہ آخر قابیل کیوں اتنا مشتعل ہو گیا کہ وہ سگے

---

[۱]۔ اجمعوا علیٰ انہا ابن ادم لصلبہ (مجمع البیان)

[۲]۔ قال الحسن وابو مسلم محمد بن بحر والزجاج هما من بنی اسرائیل (تبیان)

بھائی کے قتل پر آمادہ ہوگیا؟ بظاہر صرف اتنی بات کہ ایک کی قربانی قبول ہوئی اور ایک کی قبول نہیں ہوئی، یہ انسان کے رنجیدہ ہونے کا باعث ہوسکتی ہے یا کچھ غصہ بھی ممکن ہے پیدا کرے مگر نہ اتنا کہ وہ بعض آدمی جان لینے کے لئے آمادہ ہو جائے۔

یہ خلا تفسیر کی اس روایت سے پر ہوجاتا ہے جس کی تائید معصومؑ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ یہ دراصل ''زن'' کا مسئلہ تھا یعنی ایک لڑکی کی شادی کے لئے جناب آدمؑ نے یہ معیار مقرر کیا تھا کہ کس کی قربانی قبول ہوگی، اس کے ساتھ شادی، یہ بنا تھی کہ قربانی کے قبول نہ ہونے سے قابیل ہابیل کے قتل پر آمادہ ہوگیا۔[1]

تیسری بات یہ ہے کہ قربانی کا پیشِ خدا قبول ہونا، نہ ہونا، عموماً غیب سے متعلق چیز ہوتی ہے مگر قرآن نے یہ جو صورت واقعہ پیش کی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی صورت سے اسی وقت ظاہر ہوگیا کہ کس کی قربانی قبول ہوئی اور کس کی رد۔ اب یہ ذریعہ کیا تھا؟ اس تشنگی کو پھر روایات ہی دور کرسکتے ہیں۔ ان میں یہ جز تو متفق علیہ ہے کہ اس وقت ایک آگ اس امر کو ظاہر کیا کرتی تھی مگر اس میں اختلاف ہے کہ وہ اس قربانی کو جلا دیتی تھی جو رد ہونے والی ہے یا اس قربانی کو جلاتی تھی جو قابل قبول ہے؟ زیادہ شہرت اسی قول کو ہے۔[2]

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ ؕ قَالَ یٰوَیْلَتٰۤی اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ ﴿۳۱﴾ۚۛ

''تو اس کے نفس نے اسے اپنے بھائی کی جان لینے پر رغبت دلائی[3] چنانچہ اس نے انہیں قتل کر دیا اور اس طرح گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوا[4]۔ اب اللہ نے ایک کوّے کو بھیجا جو زمین کرید رہا تھا کہ اسے دکھائے کہ وہ کیوں کر اپنے بھائی کی لاش چھپائے۔ اس نے کہا ہائے افسوس! کیا میں اس کوّے کی طرح بھی نہیں ہوسکتا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپاؤں اور اب وہ پشیمان ہونے والوں میں سے تھا''۔

قرآن مجید کے اس بیان سے درس ملتا ہے کہ فطری اور مناسب صورت انسانی میت کے لئے یہی ہے کہ اسے دفن کیا جائے جس پر اس مخلوق کا عمل ہوا جسے فطرت کی درس گاہ سے براہ راست اس وقت انسان کی تعلیم کے لئے ہی یہ علم دیا گیا تھا۔ جلا دینا یا دریا میں بہا دینا ------- یہ سب انسان کی طبع زاد چیزیں ہیں۔

---

[1]۔ قال اکثر المفسدین وروا ہ ابو جعفر علیہ السلام (تبیان)

[2]۔ قال مجاھد کانت النار تاکل المردودۃ وقال غیرہ بل کانت العلامۃ نارا تاتی فتاکل المتقبل ولا تاکل المودودۃ (تبیان)

[3]۔ نفس او سھل ساخت در نظر وا کشتن برادر ش را (شاہ ولی اللہ) رغبت دلائی نفس اس کے نے (شاہ رفیع الدین)

[4]۔ لا یدل علی انہ قتلہ لیلا لانّ معناہ صار من الخاسرین (تبیان)

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا ۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾

''اس وجہ سے بنی اسرئیل پر ہم نے لکھ دیا ہے کہ جو کسی ایک کو قتل کرے بغیر کسی جان کے بدلے یا روئے زمین پر فساد کرے، وہ ایسا ہے جیسے کہ اس نے تمام آدمیوں کو قتل کیا، اور جو اس کی زندگی کا سامان کرے، وہ ایسا ہے کہ جیسے تمام آدمیوں کی زندگی کا سامان کیا، اور ان کے پاس آ چکے ہیں ہمارے پیغمبر کھلے ہوئے ثبوت لے کر، پھر بھی ان میں کے بہت سے اس کے بعد بھی روئے زمین پر ظلم وتعدّی سے کام لینے والے ہیں''۔

یہ عام اصول ہے کہ:۔

من سنّ سنة حسنة كان له اجر من عمل بها الى يوم القيمة ومن سن سنّة سيئة كان عليه وزر من عمل بها الى يوم القيٰمة.

جو کوئی نیک طریقہ قائم کرے، اسے ثواب ہے، ان سب کا جو قیامت تک اس پر عمل کریں اور جو کوئی برا طریقہ قائم کرے، اس پر وبال ہے ان سب کا جو قیامت تک اس پر عمل کریں۔

لہٰذا بے گناہ انسان کی جان لینے کی بنا سب سے پہلے جس نے قائم کی اس پر قیامت تک کے قتل ناحق کی ذمہ داری ہے۔

اب اگر اس شاذ قول کو اختیار کیا جائے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے کہ یہ قتل کا واقعہ تاریخ بن اسرائیل سے متعلق ہے، تب تو اس آیت کا مطلب زیادہ واضح طریقہ پر سمجھ میں آ جائے گا لیکن قول مشہور کی بنا پر کہ یہ آدم ابوالبشر کے دور کا واقعہ ہے تو ہم اس کی توجیہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب کہ یہ عام اصول ہے تو اس کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ بنی اسرائیل کو متنبہ کیا گیا کہ تم میں سے جو ایسی غلط کاری کرے گا، اس پر ہمیشہ کے وقوع میں آنے والے جرائم کی ذمہ داری ہوگی۔

اس طرح "من اجل ذلك" کے لفظی معنی تو ہوئے کہ ''اسی وجہ سے'' مگر مطلب یہ ہوا کہ اس اصول پر جو اس قتل کے متعلق تھا، ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نافذ کیا۔ [1]

---

[1] ۔چوں از قابیل رسم قتل پیدا شد، هر قتلی که در جهاں واقع شد اور ابدان مواخذه می کنند دهم چنیں در هر زمانه کسی که رسم کشتن نو می کند بحکم من سنّ سنّته سیئته کان له کفل منها در قتل که بعد ازوی آید شرکتی پیدا می کند، پس اینجا من اجل ذٰلك بجائے: علی قیاس ذلك واقع شده است (شاه ولی الله)

اور بعد میں بھی یہ بنی اسرائیل سے کوئی مخصوص بات نہیں ہے بلکہ ہر ایک کے لئے ہے جو کسی غلط بات کی بنا رکھے۔[1]
یہ سب اس صورت میں ہے جب مقام تنزیل میں یہ آیت اسی محل پر کی ہو مگر قرآن مجید کی ترتیب کے جو دوسرے نمونے ہمارے سامنے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے ہم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ یہ آیت اصل میں ہے کہاں کی اور کس سلسلہ سے اس کا تعلق ہے؟ ممکن ہے کہ جس ذیل میں آیت اتری ہے، وہاں یہ "من ذالك" (یعنی) 'اسی وجہ سے' کا فقرہ کسی اور واضح صورت سے مرتبط ہوتا ہے۔

إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۟ أَوْ يُصَلَّبُوٓا۟ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَٰفٍ أَوْ يُنفَوْا۟ مِنَ ٱلْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى ٱلدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٣٣﴾ إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُوا۟ مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا۟ عَلَيْهِمْ ۖ فَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣٤﴾

''بلاشبہ ان لوگوں کی جو اللہ اور اس کے پیغمبر سے جنگ کرتے ہیں اور دنیا میں دوڑتے پھرتے ہیں فساد کرنے کے لئے، بس یہ سزا ہے کہ انہیں مار ڈالا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا الگ الگ طرفوں سے[2] ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے جائیں۔ یہ ان کے لئے رسوائی ہے دنیا میں اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ سوا ان کے کہ جو توبہ کر لیں اس سے پہلے کہ تم لوگ ان پر قابو پاؤ تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ سخت سزائیں جن کا اعلان ہو رہا ہے، اپنی مخالف قوم کے افراد کے لئے ہیں جن سے جنگ ہو رہی ہے اور اس لئے اسے پیش کر کے اسلام کی رواداری کو مجروح کرے۔

جی نہیں۔ یہ ''اللہ اور رسولؐ سے جنگ کرنے والے جو کہے گئے ہیں کوئی غیر قوم نہیں ہیں۔ یہ اپنی قوم کے وہ بدنصیب اشخاص ہیں جنہوں نے ملک کے امن و امان کو غارت کیا ہے اور بے کس و بے بس افراد کو پریشان کیا ہے اور ان کے جان و مال پر چھاپے مارے ہیں۔ یہ افراد وہ ہیں جنہیں ''ڈاکو'' کہا جاتا ہے[3] یہ ان کی سزا کا اعلان ہے اور اس کے بعد کوئی حیرت نہ ہونا چاہیے کہ اس میں ہاتھ اور پیر کاٹنے تک کی شدید سزا کیوں درج ہے۔

ڈاکوؤں اور فسادیوں کے لئے سخت سے سخت سزاؤں کا اعلان

جب ایک معمولی چور جو ایک آدمی کا کچھ نقد و جنس، سامان چراتا ہے، اس کی سزا یہ ہے کہ اس کا ہاتھ قطع کر دیا جائے تو وہ شخص جو ڈاکو بن

---

[1]۔ فلفظ الآیة خاص فی بنی اسرائیل و معناه جار فی الناس کلهم (علی بن ابراهیم)
[2]۔ از جانب مخالف (شاہ ولی اللہ) ہاتھ ان کے اور پاؤں ان کے مخالف طرف سے (رفیع الدین)
[3]۔ نزلت فی قطاع الطریق عن اکثر المفسرین و علیه جل الفقهاء (مجمع البیان)

چکا ہو، کیا اس سے کم سزا کا مستحق ہوگا؟

ان سزاؤں پر ناک بھوں وہی چڑھاتے ہیں جنہیں مجرموں کے ساتھ ہمدردی ہے مگر یاد رکھا جائے کہ اسلامی سخت سزائیں ایک فرد یا چند افراد کو اس سخت سزا میں گرفتار کر کے پھر ان بے شمار انسانوں کے لئے باعث عافیت بنتی ہیں جو ان جرائم میں گرفتار ہوتے یا ایسے مجرموں کے مظالم کا پھر شکار ہوتے۔ اس کا جیتا جاگتا نمونہ حجاز کی سرزمین پر موجود ہے جہاں شرعی سزاؤں کے نفاذ نے اس قسم کے جرائم کو تقریباً نایاب بنا دیا ہے۔

یہاں قرآن مجید نے جو کئی سزائیں یا، یا کہہ کے بیان کی ہیں تو ان میں درجوں کا فرق نمودار ہے آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے ارشاد سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ یہ کئی سزائیں جن کا بیان ہے ایک ہی سطح پر نہیں ہیں بلکہ یہ مجرم کے کردار کے مختلف درجوں کے لحاظ سے ہیں۔ جناب شیخ الطائفہ فرماتے ہیں:۔

جزاءوهم على قدر الاستحقاق فان قتل قتل وان اخذ المال وقتل قتل وصلب وان اخذ المال ولم يقتل قطعت يده ورجله من خلاف وان اخاف السبيل فقط فانما عليه النفي لا غيرهٰذا مذهبنا و هوالمروىّ عن ابي جعفر عليه السلام وابي عبد الله عليه السلام (تبيان)

ان کی سزا ان کے استحقاق کے لحاظ سے ہوگی تو اگر وہ شخص قتل کو مرتکب ہوا ہو تو قتل کیا جائے گا اور اگر مال بھی لیا ہو اور قتل بھی کیا ہو تو قتل کیا جائے اور سولی دی جائے گی اور اگر صرف مال لیا ہو اور کسی کو قتل نہ کیا ہو تو ہاتھ پیر مختلف سمتوں سے کاٹے جائیں گے اور اگر بس راستے کو پرخطر بنایا ہو تو صرف اس علاقہ سے نکال دیا جائے گا یہی ہمارا مسلک ہے اور امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس کی روایت وارد ہوئی ہے۔

''ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے جائیں الگ الگ اطراف سے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی طرف کے مثلاً داہنا ہاتھ اور پاؤں قطع نہ کیے جائیں بلکہ ہاتھ داہنا کاٹا جائے اور پیر بایاں۔[1]

اگر توبہ کرلیں تو ارشاد ہو رہا ہے کہ ''اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان'' اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ توبہ کے بعد حق اللہ معاف ہو جائے گا لہٰذا حد شرعی جاری نہ ہوگی لیکن جو حقوق الناس ہیں جیسے وہ مال جو لوٹا تھا یا کسی کی جان لی تھی، وہ معاف نہیں ہو جائے گا، جب تک صاحبان حقوق معاف نہ کریں۔

اس پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے صاحب تفسیر جلالین نے اپنی انفرادیت کا اظہار کیا ہے۔[2] اس کی بنا پر اگر وہ شخص مرتکب قتل ہوا ہے تو حد شرعی کے طور پر حاکم شرع کے یہاں سے جو قتل کی سزا دی جاتی وہ توبہ کے بعد ختم ہو جائے گی لیکن ورثہ خون کا دعوے کر کے بطور قصاص اسے قتل کرا سکتے ہیں۔

يَآيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابۡتَغُوۡۤا اِلَيۡهِ الۡوَسِيۡلَةَ وَجَاهِدُوۡا فِيۡ سَبِيۡلِهٖ

---

[1] ای ايديهم اليمنى وارجلهم اليسرى (جلالين) يعنى دست راست و پاى چپ (شاه ولى الله)

[2] انّ الله غفوررحيم عبربذٰلك دون "فلا تحدّوهم" ليفيدانه لايسقط عنه بتوبة الا حدودالله دون حقوق الآدميين. كذا ظهرلى ولم ار من تعرّض له (جلالين)

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝٣٥

''اے ایمان لانے والوں! اللہ کے غضب سے بچواوراس کے یہاں کے لئے ذریعہ ڈھونڈواوراس کی راہ میں جہادکروشایدتم دین ودنیا کی بہتری حاصل کرلو''۔

ضرورت وسیلہ

خالق تک پہونچنے کاذریعہ داخلی طورپرقائم رہناہے اس ذہنیت اورکردارپرجواس کی رضا کا باعث ہولیکن خارجی طورپرذریعہ وہ ذات ہوسکتی ہے جواس معیار سے پورے طورپرواقف ہو۔ یہ اپنے عہدمیں پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوران کے بعدہردورکی وہ معصوم ہستی ہے جسے امامؑ کہتے ہیں اس لئے ہمارے یہاں وسیلہ کی تفسیرروایت میں امامؑ کے ساتھ ہوئی ہے۔[۱]

وہابی تصورکہ مطلق توسل شرک ہے،ازروئے قرآن درخوراعتنانہیں ہے۔ جب کہ خالق نے دعائے مغفرت کے لئے رسولؐ کے پاس آنے اورپھررسولؐ کے اس کے واسطے استغفارکرنے کا طریقہ تعلیم کیا: وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝٦٤ (النساء) تویہ توسل کاحکم نہیں ہے تواورکیاہے اوراس کے بعداگراس آیت میں بھی ''وسیلہ'' سے مراداپنے دورمیں رسولؐ اوران کے بعدان کے نائب یعنی امام معصومؑ کی ذات ہوجیساکہ حدیث معصوم میں ہے تواس میں کیاخرابی ہے؟!

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝٣٦ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝٣٧

''بلاشبہ وہ جن لوگوں نے کفراختیارکیا،اگران کے پاس وہ سب ہوجوزمین میں ہے اوراسی کے برابراس کے ساتھ اورہوتاکہ اس کے ذریعہ سے وہ روزقیامت کی سزا سے بچنے کاسامان کریں[۲] تووہ بھی ان سے قبول نہ ہوگااوران کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس آگ سے نکل جائیں حالانکہ وہ اس سے نکلنے والے نہیں ہیں اوران کے لئے برقرار رہنے والاعذاب ہے''۔[۳]

عرب میں فدیہ یعنی کچھ تاوان دے کرقیدوغیرہ سے رہائی حاصل کی جاتی تھی مگرآخرت کاعذاب وہ ہے کہ اگردنیامیں جوکچھ مال ودولت

---

[۱]۔تقربوا الیہ بالامام (علی بن ابراھیم)

[۲]۔عوض خوددھندہ آں رااز عذاب (شاہ ولی اللہ)

[۳]۔مقیم دائم (جلالین)

اورسامان روئے زمین کا ہے،سب کافروں کے قبضہ میں ہو اور اتنا ہی اور ہو اور یہ سب وہ اپنی جان بخشی کے لئے دینا چاہیں تو بھی بچنا ممکن نہیں ہے۔

شاہ رفیع الدین صاحب نے عجیب ترجمہ کیا ہے کہ:۔

''تا کہ بدلا پاویں ساتھ اس کے عذاب دن قیامت کے سے''۔

اس سے کسی طرح وہ مفہوم ادا نہیں ہوتا۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيۡدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۳۸﴾ فَمَنۡ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِ ظُلۡمِهٖ وَاَصۡلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوۡبُ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳۹﴾

''اور چور مرد اور چور عورت ہو تو ان کے ہاتھ کاٹ دو،سزا میں اس کی جو انہوں نے کیا ہے۔یہ اللہ کی طرف سے ایک عبرت ناک سزا ہے[۱] اور اللہ زبردست ہے بالکل صحیح کام کرنے والا تو جو توبہ کر لے اپنے ظلم کرنے کے بعد اور کردار درست کر لے تو یقیناً اللہ اس کی توبہ قبول کرے گا۔بلا شبہ اللہ بخشنے والا ہے،بڑا مہربان''۔

چوری کی حد یعنی شرعی سزا

یہاں بھی الفاظ قرآن مجمل تھے۔احادیث نے چوری کی بھی حد مقرر کی ہے اور ہاتھ کی بھی تعیین کی ہے کہ کون سا ہاتھ اور حد بھی بتائی ہے کہ کہاں سے قطع کیا جائے۔

اسی بنا پر فقہائے امت میں اختلاف بھی ہو گیا۔

فقہ اہل بیتؑ کے مطابق یہ ہے کہ ایک چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ کی جو چوری ہو،اس میں یہ حد شرعی جاری ہوتی ہے[۲] کچھ اہل سنت بھی اس سے اتفاق رکھتے ہیں۔[۳]

پھر یہ کہ داہنے ہاتھ کی بس چار انگلیاں قطع کی جائیں گی اور انگوٹھا اور ہاتھ کی ہتھیلی چھوڑ دی جائیگی[۴] اور دوسری مرتبہ کو چوری میں بایاں پیر گٹے سے قطع کیا جائے گا اور ایڑی چھوڑ دی جائے گی۔یہ اس لئے کہ نماز کے ارکان ادا کرنے سے وہ قاصر نہ ہو۔

علمائے شیعہ کے درمیان اس بارے میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے۔[۵]

---

[۱]۔نکالا عقوبۃ لھا (جلالین) عبرتی از طرف خدا (شاہ ولی اللہ) عبرت خدا کی طرف سے (رفیع الدین)

[۲]۔النصاب الذی متعلق القطع بہ قیل فیہ ستۃ اقوال اولہ مذھبنا و ھو ربع دینار (تبیان)

[۳]۔بیّنت السنۃ ان الذی یقطع فیہ ربع دینار فصاعدا (جلالین)

[۴]۔ھو المشھور عن علی علیہ السلام (تبیان)

[۵]۔اجمعت الطائفۃ علیہ (مجمع البیان)

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾

''کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کے لئے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی۔ جسے چاہتا ہے وہ سزا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

''کیا تم نہیں جانتے'' اس میں رسولؐ کا مخاطب ہونا اوّل تو ضروری نہیں بلکہ عام محاورہ کے مطابق ہر آدمی جو اس کلام کو سنے مخاطب ہوسکتا ہے اور اگر لفظی طور پر رسولؐ مخاطب ہوں بھی تو مقصود اس سے دوسرے لوگوں کو ہی متنبہ کرنا ہے[1] جس کی نظیریں قرآن مجید میں بکثرت موجود ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛۚ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـئًا ؕ اُولٰۤـئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ ۖۚ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾

''اے پیغمبرؐ! آپ کو رنج نہ ہونا چاہیے ان کا جو تیزی سے کفر کا راستہ اختیار کرتے ہیں، ان میں سے بھی کہ جو اپنے منہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کے دل ایمان نہیں لائے ہیں اور ان میں سے بھی کہ جو یہودی ہیں، جو سننے والے ہیں جھوٹ کے، سننے والے ہیں دوسرے لوگوں کی جو آپ کے پاس آئے نہیں ہیں، جو الفاظ کو ہٹا دیتے ہیں بعد اس کے کہ وہ اپنی جگہوں پر تھے[2] اور کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہی حکم دیا جائے تو قبول کرو[3] اور اگر یہ نہ دیا جائے تو بچو اور جسے اللہ نے گمراہی میں چھوڑ دینا چاہا ہو، اس کے لئے ہرگز آپ کا کوئی بس نہیں ہے۔ یہ

---

[1]۔ فی من یتوجه هذا الخطاب الیه قولان احدهما انه متوجه الی النبی صلی الله علیه واله والمراد به امة ----- والثانی انه متوجه الی کل مکلف من الناس وتقدیره الم تعلم یا انسان (تبیان)

[2]۔ من بعد استقراره فی مواضعه (تبیان) ای من بعد ان وضعه الله مواضعه (مجمع البیان)

[3]۔ اگر داده شود ایں حکم محرف قبول کیند (ولی الله)

وہ ہیں کہ اللہ نے چاہانہیں کہ ان کے دلوں کو پاک کرے۔ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اوران کے لئے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے“۔

”سننے والے ہیں دوسرے لوگوں کی جوآپ کے پاس آئے نہیں ہیں“ یعنی احبار یہود جنہیں اپنے اغراض کی وجہ سے یا اپنی شان کے گھمنڈ میں اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ خودرسولؐ کی خدمت میں حاضرہوں مگر دوسروں کو بہکاتے ہیں اور وہ عام یہودی یا منافقین ان کی سنتے ہیں یعنی ان کا کہنا مانتے ہیں [1] اور وہ ان کوتحریف شدہ احکام بتا کرکہتے ہیں کہ دیکھو رسول بھی اگر ایسا ہی حکم بتائیں تو قبول کرنا اور اگر کچھ اور بتائیں تو قبول نہ کرنا۔

بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ آپ کے پاس آکرآپ کے ارشادات سنتے ہیں ،دوسروں کی خاطر جوآپ کے پاس نہیں آتے ہیں [2] مگر سماعون للکذب ”سننے والے ہیں جھوٹ کے“ اس کے ساتھ بلا فاصلہ سماعون لقوم آخرین ”سننے والے ہیں دوسری قوم کی خاطر“ اسے رسولؐ کی باتوں کے سننے پر محمول کرنا کچھ ذوق کے مطابق معلوم نہیں ہوتا۔

لیکن بعض لوگوں نے پہلے جملہ کوبھی رسولؐ کی باتوں کے سننے ہی سے متعلق قرار دیا ہے اور معنی یوں کہے ہیں کہ وہ آپ کی باتیں سنتے ہیں جھوٹ کے لئے یعنی اس غرض سے کہ آپ پر جھوٹی تہمتیں لگائیں اور آپ کی باتیں سنتے ہیں دوسرے لوگوں کی خاطر جوآپ کے پاس نہیں آئے ہیں یعنی ان نہ آنے والوں کے جاسوس ہیں یہ آنے والے اشخاص [3] ہمیں یہ معنی بھی تکلف سے خالی معلوم نہیں ہوتے۔

سَمّٰعُوۡنَ لِلۡکَذِبِ اَکّٰلُوۡنَ لِلسُّحۡتِ ؕ فَاِنۡ جَآءُوۡکَ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ اَوۡ اَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ ۚ وَ اِنۡ تُعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ فَلَنۡ یَّضُرُّوۡکَ شَیۡئًا ؕ وَ اِنۡ حَکَمۡتَ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِالۡقِسۡطِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ﴿۴۲﴾

”جھوٹ کے بڑے ہی سننے والے ہیں ،بڑے کھانے والے مال حرم کے [4] تو اگر وہ آپ کے پاس آئیں توخواہ ان کے درمیان فیصلہ کیجیے اور خواہ ان سے روگردانی کیجیے اور اگر آپ ان سے روگردانی کریں تو وہ آپ کوکوئی نقصان نہیں پہونچاسکیں گے اور اگر فیصلہ کیجیے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ کیجیے۔یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کودوست رکھتا ہے“۔

ہوسکتا ہے کہ یہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مخصوص ہدایات ہوں مگر بعض مفسرین انہیں عام قرار دیتے ہیں یعنی یہ اصول بتایا

---

[1]۔شنوندگان اند برای گروهی دیگران که هنوز پیش تو نیامده اند(ولی اللہ) سننے والے واسطے قوم دوسری کے کہ نہ آئی تیرے پاس (شاہ رفیع الدین) وہ سردار یہود آپ نہ آئے، بیچ والوں کے ہاتھ بھیجتے اور کہہ دیتے کہ ہمارے معمول کے مطابق حکم کریں تو قبول رکھو نہیں تو نہ رکھو (موضح القرآن)

[2]۔سماعون منك لقوم لاجل قوم اٰخرين من اليهود(جلالين)

[3]۔سماعون کلامك للكذب عليك سماعون کلامك لقوم اٰخرين لم ياتوك اى هم عيون عليك(تبيان)

[4]۔روى عن علی علیہ السلام قال السحت الرشوة فى الحكم (تبيان)

جارہا ہے کہ اگر یہود ونصاریٰ اسلامی عدالت میں اپنا مقدمہ لائیں تو انہیں اختیار ہے کہ یہ خود اس کا فیصلہ اپنی شریعت کے مطابق کریں یا انہیں خود ان کے مذہبی پیشواؤں کے پاس جانے کی ہدایت کریں۔[1]

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ اختیار شروع اسلام میں تھا۔ بعد میں وہ منسوخ ہوگیا دوسری آیت سے جو اس کے بعد اسی سورہ میں آئے گی: وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ--- اس کے بعد یہ لازم ہوگیا کہ ان کے مقدمات کا فیصلہ شریعت حقّہ ہی کے مطابق ہوا کرے۔[2]

مگر ارشاد اہل بیت، یہ ہے کہ وہ حکم قائم ہے، منسوخ نہیں ہوا ہے۔[3]

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾

''اور وہ آپ کو ثالث کیوں کر بنا رہے ہیں، حالانکہ ان کے پاس تو توریت بھی موجود ہے جس میں اللہ کا حکم درج ہے اور پھر وہ اس کے بعد بھی روگردانی اختیار کرتے ہیں اور نہیں ہیں یہ لوگ ایمان لانے والے''۔

شان نزول ان آیتوں کی جسے علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں بیان کیا ہے، بطور خلاصہ یہ ہے کہ یہودیوں میں سے دو اشخاص نے زنائے محصنہ کا ارتکاب کیا جس کی سزا توریت میں سنگسار کرنا تھا۔ مگر چونکہ وہ دونوں مالدار تھے، علمائے یہود نے خود توریت کے اس حکم کو ان کے لئے سخت سمجھتے ہوئے اسے دبا دیا اور انہیں پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس بھیج دیا کہ آپ شاید ان کے لئے کچھ ہلکی تجویز فرمادیں، مگر جب آپ کے پاس آئے تو آپ نے انہیں سنگ ساری کا حکم سنایا اور جب انہوں نے چون چرا کی تو آپ نے انہی کے ایک بڑے عالم سے اقرار کرایا کہ توریت میں اس جرم عظیم کی یہی سزا ہے۔

توریت میں درج شدہ حکم کو حکم اللہ کہنا، اس کی دلیل نہیں ہے کہ وہ کتاب بحیثیت مجموعی تحریف شدہ نہیں۔ اس لئے کہ ممکن ہے یہ حکم جو اس میں اب تک تھا، اس تحریف سے بچ گیا ہوا ور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے حکم الٰہی ان کے خیال کے مطابق کہا ہو کہ انہیں تو اسے حکم الٰہی سمجھنا ہی چاہیے۔[4]

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا

---

[1] یعنی اهل ذمه اگر قضیه خویش بامام رفع کنند اگر خواهد حکم کند اگر خواهد بزعمائے ایشاں نقوض نماید (شاه ولی الله)

[2] هٰذا التخئیر منسوخ بقوله: ان احکم بینهم الایة فیجب الحکم بینهم اذا ترافعوا الینا وهو اصحّ قولی الشافعی (جلالین)

[3] الظاهر فی روایات اصحابنا ان هٰذا التخییر ثابت فی الشرع للائمة والحکام (مجمع البیان)

[4] لایمنع ان یکون فیها هٰذا ن الحکمان غیر متبدلین وهو رجم المحصن ووجوب القود ویحتمل ان یکون المراد بذٰلك فیها حکم الله عندهم (تبیان)

لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا
عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾

’’بلا شبہ ہم نے توریت کو اتارا تھا جس میں صحیح رہ نمائی اور روشنی تھی، اس کے ساتھ یہودیوں کے لئے فیصلے کرتے تھے وہ پیغمبر جو احکام الٰہی کے سامنے سر جھکائے تھے اور خدا والے اور یہودی علماء بھی اللہ کی اس کتاب کے ساتھ جس کی حفاظت کے وہ ذمہ دار بنائے گئے تھے[۱] اور جس کے وہ گواہ تھے تو لوگوں سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو اور میری آیتوں کے عوض میں تھوڑی سی قیمت حاصل نہ کرو اور جو اللہ کے اتارے ہوئے کے مطابق فیصلہ نہ کرے، تو یہی لوگ کافر ہیں‘‘۔

یہ خطاب کہ ’’لوگوں سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو‘‘ بظاہر علمائے یہود سے ہے جو بہت سی حقیقتوں کو اپنے عوام کے ڈر سے چھپاتے تھے۔[۲]

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ
وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ
فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

’’اور ہم نے ان پر قانون جاری کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان ہوگی اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں بھی برابر کا بدلا ہوگا۔ اب جو اس میں فیاضی سے کام لے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہوگا اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہ لوگ وہ ہیں جو ظلم وتعدی کے مرتکب ہیں‘‘۔

توریت میں حکم قصاص کا تفصیلی بیان

یہود کے لئے توریت میں حکم قصاص بالکل اسی طرح تھا جیسے اسلام میں ہے۔[۳]

---

[۱]۔ معناہ بما استودعوا (تبیان) ای استحفظھم اللہ ایاہ (جلالین) حکم می کردند بآنچہ حافظ آں گردانیدہ شدہ انداز کتاب خدا (شاہ ولی اللہ)

[۲]۔ ای لا تخشوا یا علماء الیہود الناس فی اظہار صفتہ النبی محمد ﷺ وامر الرّجم (مجمع البیان)

[۳]۔ لا خلاف فی ان ذلک ثابت فی ھذا الشرع (تبیان)

فیاضی سے کام لینے کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ قصاص کو معاف کر دے [۱] اس طرح اس فیاضی کا تعلق اس شخص سے ہوتا ہے جسے نقصان پہنچایا گیا ہے یا مقتول کے ورثا سے اور کفارہ کا تعلق اس کی زندگی کے گناہوں کے ساتھ ہے کہ یہ اس فیاضی اس کے گناہوں میں تخفیف یا معافی کا سبب ہوگی۔ [۲]

مگر دوسرے معنی اس کے یہ کہے گئے ہیں کہ فیاضی سے کام لینے کا مطلب یہ ہے کہ قصاص کے لئے تیار ہوجائے اور اپنے کو محکمۂ عدالت میں پیش کر دے۔ [۳]

اس صورت میں اس کا تعلق قاتل یا جارح سے ہوتا ہے، اور اب کفارہ کا تعلق اس کے اسی جرم سے ہوگا یعنی اگر وہ بہ خوشی قصاص کے لئے آمادہ ہوگیا تو اب آخرت میں اس سے بازپرس نہ ہوگی مگر پہلی تفسیر زیادہ واضح ہے۔ [۴]

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠

وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ

وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾

''اور ان کے نقش قدم پر ہم نے بعد میں بھیجا عیسیٰؑ فرزند مریم کو تصدیق کرتا ہوا اس توریت کی جو ان کے پہلے موجود تھی اور ہم نے انہیں انجیل عطا کی جس میں صحیح رہ نمائی تھی، اور روشنی اور تصدیق کرتی ہوئی تھی اس توریت کی جو اس کے پہلے تھی اور صحیح رہ نمائی اور نصیحت پرہیزگاروں کے لئے''۔

''ان کے نقش قدم پر'' -------یہ ضمیر بظاہر النّبیّون کی طرف راجع ہے جو اس سلسلہ کی پہلی آیت میں تھا: يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا ''اس توریت کے ساتھ فیصلہ کرتے تھے وہ پیغمبر جو بارگاہ الٰہی میں سر نیاز جھکائے تھے [۵] اور ''نقش قدم پر ہم نے بعد میں بھیجا'' یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام شریعت توریت کو منسوخ کرنے نہیں آئے تھے بلکہ اس شریعت کے پیرو تھے جس کا ذکر انجیل میں اب بھی ہے۔ انجیل اسی توریت پر عمل کی دعوت اور مواعظ ونصائح پر مشتمل بنا کر بھیجی گئی تھی۔ یہ تو بعد میں پال نے عقائد میں مسیح کے ابن اللہ ہونے اور صلیب پر چڑھ کر تمام عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ ہوجانے کا مسئلہ ایجاد کر کے حلال وحرام کی پابندیاں ختم کر دیں، اور شریعت کا بالکل خاتمہ کر دیا۔

تصدیق کا ذکر جو دو دفعہ ہے، اس میں ایک ہی بات کی تکرار نہیں ہے بلکہ پہلی دفعہ جو مصدّق کا لفظ ہے، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے

---

[۱]۔ فمن تصدق به ای عفا (علی بن ابراهیم) به ای بالقصاص الذی وجب له تصدق به علی صاحبه بالعفو واسقطه (مجمع البیان)

[۲]۔ کفارة له ای للمتصدق الذی هو المجروح اوولی الدم هٰذا قول اکثر المفسرین (مجمع البیان)

[۳]۔ فمن تصدق به ای بالقصاص بان مکن من نفسه (جلالین)

[۴]۔ هو الاقوی (تبیان)

[۵]۔ اٰثار النبییّن الّذین اسلموا (مجمع البیان)

ہے کہ وہ توریت کی تصدیق کرنے والے بنا کر بھیجے گئے تھے اور پھر دوبارہ جو یہ لفظ ہے، وہ انجیل کے متعلق ہے کہ اس کے اندر خود توریت کی تصدیق موجود ہے۔[1]

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾

''اور انجیل والوں کو لازم ہے کہ وہ اس کے موافق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں اتارا ہے اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے گا تو وہ بداعمال لوگ ہوں گے''۔

انجیل کے مندرجات کے متعلق بھی ماانزل اللہ ہونے کی تصدیق ان کی اصل کے لحاظ سے ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شان نزول کے اعتبار سے جس حکم کا اس وقت سوال درپیش ہو، وہ اپنی اصلی صورت میں اب تک انجیل میں موجود تھا۔

یہ امر بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ بوقت نزول قرآن جن باتوں کا قرآن نے ان کتابوں سے حوالہ دیا ہے یا جن کے درست ہونے کی تصدیق کی ہے، وہ بھی ضروری نہیں کہ اب موجودہ زمانہ میں توریت وانجیل میں اسی صورت سے باقی ہوں کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ ان کتابوں میں شروع ہی میں تبدیلیاں نہیں ہوئیں بلکہ اس کے بعد بھی مختلف ادوار میں ان میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾ۙ

''اور ہم نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تصدیق کرتی ہوئی اس کتاب کی جو اس کے پہلے ہے اور اس کا تحفظ کرتی ہوئی[2] لہٰذا آپ ان کے درمیان وہی فیصلہ کیجیے جو اللہ نے اتارا ہے اور جو کچھ آپ کے پاس حق آ گیا ہے، اس سے ہٹ کر ان کے خیالات کی پیروی نہ کیجیے ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک راہ مقرر کی ہے اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک بنا دیتا مگر اس کا تو مقصد یہ ہے کہ جو اس نے تمہیں بتایا ہے، اس میں

---

[1]۔ليس ذلك بالتكوير (تبیان)

[2]۔مقرر ساختہ ایم شریعتی وراھی (شاہ ولی اللہ) واسطے ہر ایک کے کیا ہم نے تم میں گھاٹ اور راہ (رفیع الدین)

تمہاری آزمائش کرے لہٰذا نیکیوں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرو، تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے تو وہ تمہیں اصلیت بتائے گا اس کی جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے''۔

اس آیت کے الفاظ کا ظاہری مفہوم کافی پیچیدہ ہے جس کے لئے اصول عقلیہ، نیز دوسری آیات پر نظر ڈالنا لازم ہے۔
بہر حال یہاں جو مفہوم بلا دغدغہ درست معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ اس کے پہلے توریت کا ذکر ہوا پھر انجیل کا ہوا اور اس کے بعد رسولؐ سے خطاب ہوا کہ ''آپ پر یہ کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ'' تو اس کے بعد خالق نے اہل توریت، اہل انجیل اور اہل اسلام سب کو سمو کر یہ مشترک خطاب فرمایا ہے کہ: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ ''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے، ایک ایک دور میں ایک شریعت اور ایک راستہ مقرر کیا تھا، یعنی وہ توریت والی شریعت بھی ہماری بھیجی ہوئی تھی، وہ انجیل والی تعلیم بھی ہماری ہی تھی اور اب یہ قرآنی شریعت بھی ہم ہی نے بھیجی ہے لہٰذا توریت کے وقت تک اس شریعت پر عمل لازم تھا اور انجیل آئی تو اس پر عمل لازم ہوا اور اب سب کو قرآن پر عمل لازم ہے کیوں کہ یہ کتاب سب سے آخر میں آئی ہے۔ [1]

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

''اور یہ کہ فیصلہ کیجیے آپ ان کے درمیان اس کے ساتھ جو اللہ نے اتارا ہے اور ان کے خود ساختہ خیالات کی پیروی نہ کیجیے اور ان سے ڈریئے کہ کہیں وہ آپ کو کسی اس حکم سے جو اللہ نے آپ پر اتارا ہے، ہٹانے کی کوشش نہ کریں۔ اس کے بعد اگر انہوں نے روگردانی کی تو جان لیجیے کہ اللہ بس یہ چاہتا ہے کہ انہیں ان کے کچھ گناہوں کی سزا دے اور بلاشبہ لوگوں میں زیادہ تر بداعمال ہیں''۔

پیغمبر خداؐ کو ان کے خود ساختہ خیالات کی پیروی سے روکنا اس کی دلیل ہے کہ اب یہودیت یا عیسائیت جو بھی ہو دین باطل ہے۔ اس سے گزشتہ آیت میں جو ہم نے تشریح کی ہے، اس کی تائید ہوتی ہے کہ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ ''تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک شریعت اور ایک راہ مقرر کی'' وہ بلحاظ وقت نفاذ شریعت تھا یعنی موسیٰؑ کے دور میں شریعت موسوی ہی حق تھی اور عیسیٰؑ کے دور میں شریعت عیسوی ہی درست تھی مگر اب سب کے لئے جو حق ہے، وہ شریعت محمدیؐ ہے اور اس کے مخالف جتنے تصورات ہوں، وہ اھواء یعنی باطل خیالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

---

[1] الخطاب للامم الثلثة امّة موسٰی وامة عیسیٰؑ وامة محمد صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم وفی ھٰذا دلالة علی جواز النسخ علی وان نبیّنا کان متعبّد بشریعة فقط (مجمع البیان)

’’تو کیا یہ جاہلیت کے فیصلہ کے طلب گار ہیں؟ حالانکہ اللہ سے بڑھ کر اچھا کس کا فیصلہ ہوگا ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہوں‘‘۔[۱]

’’جاہلیت‘‘ یعنی کسی قانون الٰہی پر عمل درآمد نہ ہونے والا دور۔ اس وقت تو ظاہر ہے کہ من مانے فیصلے ہی ہو سکتے ہیں مگر اب جب خدا کا رسولؐ موجود ہے اور اس کے ذریعہ سے قانون الٰہی کا عملی طور پر نفاذ ہو رہا ہے تو اب ایسا کیوں کر ممکن ہے؟!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾

’’اے ایمان لانے والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست نہ بناؤ، یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جس نے تم میں سے ان سے دوستی کی تو وہ ان ہی میں سے ہے۔ یقیناً اللہ ظالموں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا‘‘[۲]

دوستی کا مطلب غلط مقاصد اور باطل منصوبوں میں ان کے ساتھ شرکت اور اس طرح ان کی پارٹی کا ممبر ہونا ہے۔ ورنہ اپنے مذہبی قوانین کی پابندی کے ساتھ معاشرتی تعلقات قائم کرنا اور جائز مقاصد میں تعاون کرنا ہر ایک کے ساتھ درست ہے۔ اس میں قوم و ملت کا کوئی سوال نہیں ہے۔

قرآن مجید میں مشرکین تک کے اس طبقہ کے ساتھ جس نے مسلمانوں کے خلاف معاندانہ اقدامات نہیں کئے ہیں اور جارحیت کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں، حسن سلوک اور منصفانہ برتاؤ کی اجازت دی ہے اور وقت ضرورت ان کے کام آنے کی تحریک کی ہے اور خود حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل موجود ہے کہ شب ہجرت تک آپ کے پاس مشرکین کی امانتیں تھیں۔ معاشرتی تعلقات کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟!

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

---

[۱] ۔معناہ عند قوم یوقنون باللہ وبحکمہ (تبیان)

[۲] ۔معناہ لا یہدیہم الی طریق الجنۃ لکفرہم واستحقاقہم العذاب الدائم (تبیان)

''تو دیکھو گے انہیں جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ وہ ان کے حلقوں میں تیزی سے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں ہمیں ڈر ہے کہ ہم پر کوئی آفت نہ آئے۔اب بہت ممکن ہے کہ اللہ فتح دکھادے یا اپنی طرف سے کوئی اور صورت سامنے لے آئے [۱] تو پھر یہ اس پر جو انہوں نے اپنے دل میں چھپا رکھا تھا، پشیمان ہوں''۔

موالات یعنی یہود ونصاریٰ کے ساتھ گٹھ جوڑ سے ممانعت ہوئی تھی، اس کا پس منظر یہی ہے کہ منافقین جماعت یہود کے یہاں دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں اور ان کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے جب مسلمان ان پر اعتراض کرتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ یہ ہم احتیاطاً کرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں غلبہ حاصل ہو جائے تو ہمارے لئے خرابی نہ پیدا ہو۔

یہی دورُخے آدمیوں کا کردار ہر دور میں رہتا ہے مگر وہ دوسرے پہلو پر غور نہیں کرتے کہ اگر حالات نے پلٹا کھایا اور ادھر والی جماعت کے لئے خیر وبہتری حاصل ہوئی یا ان منافقین کا راز فاش ہو گیا [۲] تو پھر کیا ہوگا؟!

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

''اور وہ جو ایمان لائے ہیں کہیں گے، ارے کیا یہی وہ ہیں جنہوں نے اپنے مقدور بھر انتہائی سخت قسمیں کھائی تھیں کہ وہ بلاشبہ تمہارے ساتھ ہیں۔ان کی تمام محنتیں اکارت گئیں اب وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں ہیں''۔

ممکن ہے منافقین کے انجام آخرت کا عبرتناک ذکر ہو کہ وہاں جب وہ کفار کے زمرہ میں محشور ہوں گے تو اہل ایمان آپس میں یوں کہیں گے۔ [۳]

اور ہوسکتا ہے کہ یہ گزشتہ آیت کے تعلق سے اسی دنیا میں اس وقت کا ذکر ہو جب ان منافقین کا راز فاش ہو جائے جسے اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ سے تعبیر کیا گیا تھا تو اس وقت مسلمان آپس میں حیرت واستعجاب کے طور پر یہ گفتگو کریں گے۔ [۴]

اب یہ گھاٹا دنیا کا بھی ہے کہ جو ان کا منصوبہ تھا منافقت کا وہ شکستہ ہو گیا اور آخرت کا بھی کہ وہاں صریحی کفار سے بھی بدتر سزا کے مستحق ہوں گے۔ [۵]

---

[۱]۔امر من عندہ یرید فیہ هلاکهم (مجمع البیان)

[۲]۔بالفتح بالنصر لنبیہ باظهار دینہ او امر من عندہ بهتك ستر المنافقین وافتضاحهم (جلالین)

[۳]۔بگویند مومنان یعنی روز قیامت (شاہ ولی اللہ)

[۴]۔یقول الذین اٰمنوا اذا هتك سترهم (جلالین) تعجبا من نفاق المنافقین (تبیان)

[۵]۔خاسرین الدنیا بالفضیحتہ والاخرۃ بالعقاب (جلالین) اما الدنیا فلیسوا من الانصار واما الاخرۃ فقربهم اللہ مع الکفار (مجمع البیان) انما وصفهم الخسران لانهم فوتوا انفوسهم الثواب واستحقوا اعرضا منہ العقاب فای خسر ان اعظم من ذلك (تبیان)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝٥٤

اے ایمان لانے والو! جوتم میں سے اپنے دین سے پلٹ جائے تو (کوئی بات نہیں) بہت جلد اللہ ایک جماعت کو لائے گا جنہیں وہ دوست رکھتا ہوگا اور وہ اسے دوست رکھتے ہوں گے، وہ ایمان والوں کے سامنے نرم ہوں گے اور کافروں کے مقابلہ میں سخت، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کرینگے یہ اللہ کا فضل وکرم ہے جسے چاہتا ہے، وہ عطا کرتا ہے اور اللہ بڑی سمائی والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

جمہور اہل سنت کا خیال ہے کہ یہ جماعت جس کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں، ان کے شروع والے خلفاء اور اس دور کے مسلمانوں کی ہے جنہوں نے روم اور فارس کے ممالک فتح کیے مگر کیا کیا جائے کہ جو اوصاف قرآن نے اس جماعت کے ذکر کئے ہیں، وہ اس جماعت کے افراد پر منطبق نظر نہیں آتے۔

اس کے برخلاف جمہور علمائے شیعہ اس کو امیر المومنینؑ اور ان کے ساتھ کے افراد پر منطبق کرتے ہیں جنہوں نے ناکثین وقاسطین و مارقین سے جہاد کیا کہ بلکہ جناب شیخ طوسیؒ نے تبیان میں کافی بسط اور تفصیل کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی ہے کہ یہ اوصاف جو آیت میں مذکور ہیں خاص امیر المومنینؑ کی ذات پر منطبق ہیں جس کا شاہد یہ ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روز خیبر یہی وصف ایحب اللہ و رسولہ ویحبہ اللہ و رسولہ، اپنی حدیث میں حضرت علیؑ کے تعارف میں خصوصی طور اس انداز میں ارشاد فرمایا جس سے یہ ظاہر ہے کہ علم لے کر جو پہلے جاچکے ہیں، وہ اس صفت سے متصف نہ تھے۔ اس کے بعد یہ تصور کہ آیت کے مذکورہ اوصاف کا مصداق افراد میں سے کوئی ہے، کسی طرح صحیح نہیں قرار پاسکتا۔

ایک دوسری شیعی تفسیر یہ ہے کہ وہ حضرت امام مہدی آخر الزماں عجل اللہ فرجہ کے دور سے متعلق ہے۔[1]

اسے قرآنی الفاظ کی تائید یوں حاصل ہے کہ الفاظ قرآن ایسا ظاہر کررہے ہیں کہ وہ جماعت ابھی موجود نہیں ہے۔ بعد کو آئے گی۔[2] رہ گیا یہ کہ پھر یہ کیوں کر ارشاد ہوا کہ ''بہت جلد اللہ ایک جماعت کو لائے گا؟'' تو یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کے پیمانہ میں تو قیامت کا بھی آنا بہت جلد ہے پھر اگر ظہور امام کو جو بہر صورت قیامت کے تو پہلے ہے، بہت جلد کہہ دیا جائے تو اس کے انکار کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ

---

[1]۔ نزلت فی القائم واصحابہ (علی بن ابراھیم)

[2]۔ قولہ تعالیٰ فسوف یاتی اللہ بقوم یوجب ان یکون القوم غیر موجودین فی وقت نزول الخطاب (مجمع البیان)

الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ﴿۵۵﴾

''تمہارا حاکم وسرپرست بس اللہ ہے اور اس کا پیغمبر اور وہ ایمان رکھنے والے جو نماز ادا کرتے ہیں اور خیرات دیتے ہیں اس حالت میں کہ وہ رکوع میں ہیں۔''

آیہ ولایت

یہ مشہور معروف آیہ ولایت ہے جو امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی جب کہ آپ نے مسجد میں حالت رکوع میں سائل کو انگوٹھی عطا فرمائی۔ چنانچہ جملہ فعلیہ: يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ کے بعد جو واؤ کے ساتھ جملہ اسمیہ: وَهُمْ رٰكِعُوْنَ آیا ہے، اس میں صاف واو حالیہ جس سے وہی مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ ''وہ خیرات دیتے ہیں اس حالت میں وہ رکوع میں ہیں، اور اسی مفہوم سے یہ آیت شان نزول کے مطابق ہوتی ہے مگر اکثر مفسرین اہل سنت نے اس واقعہ سے آیت کو غیر متعلق بنانے کے لئے داؤ کو عطف کا لے لیا ہے۔اس طرح یہ معنی ہوں گے کہ نماز ادا کرتے ہیں اور خیرات دیتے ہیں اور وہ رکوع کیا کرتے ہیں، حالانکہ اس صورت میں يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ کے بعد آخر میں وَهُمْ رٰكِعُوْنَ کے جملہ کی کوئی افادیت ہی باقی نہیں رہتی۔ [1]

پھر یہ کہ اس آیت کا شان امیر المومنین علیہ السلام میں ہونا، تفاسیر اہل بیت علیہم السلام اور اجماع فرقہ شیعہ کے لحاظ سے تو یقینی ہے ہی، اہل سنت کے کچھ روایات بھی اس سے متفق ہیں جب کہ اس کے خلاف اقوال جو اہل سنت کے یہاں ہیں شاذ کی حیثیت رکھتے ہیں اور غالباً اس شان نزول کو مشتبہ بنانے کی خاص کوشش کچھ فرقہ وارانہ ذہنیت کے افراد کی طرف سے اس لئے عمل میں آئی ہے کہ اس آیت سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بلا فاصلہ حضرت علی بن ابی طالبؑ کی خلافت پر استدلال قوت کے ساتھ ہوتا ہے [2] جس کے انکار کے لئے دھاندلی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴿۵۶﴾

''اور جو تولاّ رکھے اللہ اور اس کے پیغمبر اور ان ایمان رکھنے والوں سے تو بلا شبہ اللہ کا لشکر ہی غالب آنے والا ہے۔''

سابق کی آیت میں جن کی ولایت کا اعلان ہوا تھا، انہی کے ساتھ تولاّ کی دعوت دی جارہی ہے۔

وہاں مولا نہیں قرار دیا گیا تھا؟ اللہ و رسولؐ اور وہ ایمان والے جنھوں نے حالت رکوع میں زکوۃ دی ہے۔ یہ تولاّ کی دعوت انہی کے لئے ہے اور ان سے تولا رکھنے والے ہی اللہ کا لشکر ہیں جو بالآخر دنیا پر غالب آکر رہیں گے کب؟ اسی وقت کہ جب لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ اور لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ کے وعدے پورے ہوں گے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ

---

[1]. قوله: ''يقيمون الصلوة'' يدخل فيه الركوع فلو لم يحمل قوله: ''وهم راكعون'' على انه حال من ''يؤتون الزكوة'' و حملنا على من صنعتهم الركوع كان ذلك كالتكرار غير مفيد (مجمع البيان)

[2]. اعلم ان هذا الاٰية من الادلة الواضحة على امامة امير المومنين علیہ السلام بعد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ بلا فصل (تبيان)

أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

''اے ایمان لانے والوں! اس جماعت میں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب عطا ہوئی ہے، ان لوگوں کو جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل سمجھ رکھا ہے اور کافروں کو دوست اپنا نہ بناؤ اور اللہ کے غضب سے بچوں اگر تم ایمان رکھتے ہو اور جب تم نماز کے لئے اذان دیتے ہو تو وہ اسے مذاق اور کھیل کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔''

پہلے آ چکا ہے کہ بت پرست گروہ کو اہل کتاب کے مقابلہ میں کفار کہا جاتا ہے، اس لئے کہ اہل کتاب موسیٰؑ اور عیسیٰؑ یا صرف جناب موسیٰؑ ہی کو مانتے تھے اور ان میں سے کسی کو بھی نہیں مانتے تھے تو وہ ان کے مقابل میں کافر تھے لیکن اس وقت کے جو مومن تھے، ان میں سے بھی بہت سے بعد میں خاتم الانبیاء کو نہ مان کر کفار کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔ [۱]

بہر حال خواہ وہ ہوں جو پہلے ہی سے کفار میں تھے اور خواہ یہ ہوں جو اب کافر ہو گئے ہیں اور اس کفر کا ثبوت یہ ہے کہ وہ دین حق کو مذاق اور کھیل سمجھتے ہیں یعنی اس کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں، ان میں سے کسی کے ساتھ بھی ایک مومن کو اتحاد عمل نہ کرنا چاہئے ورنہ غضب الٰہی کا اندیشہ ہے جس سے بچنے کی آخر آیت میں تاکید ہوئی ہے۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾

''کہیے کہ اے اہل کتاب! ہماری کس بات سے تم ناراض ہو سوا اس کے کہ ہم ایمان لائے اللہ اور اس پر جو ہماری طرف نازل ہوا اور جو پہلے اترا تھا اور یہ کہ تم میں سے زیادہ تر بداعمال ہیں۔''

حقیقت امر کے لحاظ سے تو وہ سب ہی بداعمال تھے [۲] اس لئے کہ کافر تھے اور کون کافر ہے جو فاسق نہیں ہے لیکن کسی جماعت کو من حیث المجموع کہا جائے کہ تم ایسے ہو تو اس میں تلخی زیادہ ہوتی ہے لیکن اگر یوں کہا جائے کہ تم میں بہت ایسے ہیں تو ہر ایک کے لئے ناگواری کم ہو جاتی ہے کیوں کہ امکان ہوتا ہے کہ یہ شخص ان بہت سے خارج ہو اور اگر ذہن میں فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہو تو ہر ایک کے لئے لمحہ فکریہ تو پیدا ہو ہی جاتا ہے کہ کہیں ان بہت میں وہ ایک بھی تو نہیں ہے؟!

---

[۱]۔ والکفار وان وقع علی جمیع الاصناف فهو ظن لیس من اهل الکتاب الیق وعلیه اغلب فذلك افرد بالذکر (تبیان)

[۲]۔ فاسقون خارجون عن امر الله طلبا للریاسة وحسدا منزلة النبوة (مجمع البیان)

یہ حکیمانہ انداز گفتگو ہے جسے ''رواداری'' ہی کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ورنہ اصل میں کہنا یہی ہے کہ تم لوگ ہمارے صرف اس لئے دشمن ہو کہ ہم ایمان اختیار کیے ہیں اور تم کافر و بداعمال اور بے ایمان ہو۔[۱]

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۶۰﴾

''کہیے کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اس سے زیادہ انجام میں اللہ کے یہاں بدتر کون ہے؟ وہ جس پر اللہ نے لعنت کی اور جس پر وہ غضب ناک ہوا اور جن میں اس نے کچھ کو بندروں اور سوروں کی شکل میں کر دیا اور جس نے معبود باطل کی پرستش کی ہو۔ یہ لوگ جگہ کے لحاظ سے بدتر اور سیدھے راستے سے زیادہ ہٹے ہوئے ہیں۔''

اگر یہ آیت تنزیل میں گزشتہ آیت کے بعد ہی کی ہے تو حقیقت یہ ہے کہ جن چیزوں سے اہل کتاب ناراض تھے، وہ تو کوئی بری چیزیں تھیں نہیں لیکن اب یہ ایک خاص طنز یہ انداز میں انہیں ان کے کردار اور اس کے نتائج کا جائزہ لینے کی دعوت ہے اگر بالخصوص تمہاری ناراضگی کی بنا پر یہ سمجھ بھی لیا جائے کہ یہ باتیں بری ہیں تو اس سے زیادہ بری[۲] تو یہ باتیں ہیں اور یہ باتیں وہ ہیں جو خود اسی جماعت میں پائی جاتی ہیں جس سے بات ہو رہی ہے مگر کھل کر یہ نہیں کہا جاتا کہ تم تو ایسے ایسے ہو یہ رواداری نہیں تو اور کیا ہے؟

یہ وہ بلیغ انداز گفتگو ہے جسے کسی کے اختیار کرنے پر سطحی نگاہ رکھنے والوں کا اسے ''عقائد و مسلمات'' پر ضرب کاری قرار دینا لازمی ہے۔

وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اور جب وہ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، حالانکہ وہ کفر ہی لئے ہوئے ہیں اور اسی کو لئے ہوئے باہر نکلے ہیں اور اللہ سے جو وہ چھپاتے ہیں، خوب جانتا ہے۔''

یہ آیت گزشتہ سلسلہ سے قطعاً غیر مرتبط ہے۔ یہ منافقین کا ذکر ہے یعنی رسولؐ کے پاس آنے اور آپ کی صحبت میں بیٹھنے کا ان پر ذرا بھی تو اثر نہیں ہوتا، وہ جیسے آئے تھے، ویسے ہی یہاں سے نکل کر چلے جاتے ہیں کچھ بھی ان میں فرق پیدا نہیں ہوتا۔ صحابیت کو اکسیر سمجھنے والے اس

---

[۱] ۔علی التلطف للاستدعاء و معنی الاٰیة هل تکرهون الا ایماننا و (مجمع البیان)

[۲] ۔بشر من ذلك الذی تنقمونه (جلالین) انما قال بشر من ذٰلك وان لم یکن من المؤمن شر و کذلك قوله: اولٓئك شر مکانا. علی الانصاف فی الخطاب والمظاهرة فی الحجاج لانه الکفار یعتقدون ان هٰؤلاء اشرار وان ما فیهم شر فخرج علی ما یعتقدونه (تبیان) المعنی ان کان ذلك عند کم شرّا انسانا اخبر کم بشرّ منه (مجمع البیان)

تصریح قرآنی کو غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾

''اوران میں سے بہتوں کو دیکھو گے کہ وہ گناہ اور ظلم وتعدی[1] اور حرام خوری میں بڑی تیزی دکھاتے ہیں۔ کتنا برا ہے وہ جو وہ کرتے ہیں۔''

یہ بہت جمہور عوام ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد رؤساء وعلماء ہیں۔[2]

مگر چوں کے علماء کا ذکر اس کے بعد کی آیت میں ہے کہ وہ انہیں منع کیوں نہیں کرتے، اس لئے یہاں یہ تفسیر درست معلوم نہیں ہوتی۔

لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾

''آخر کیوں نہیں منع کرتے ان کو خدا پرست لوگ اور پادری ان کے جھوٹ بولنے اور حرام کھانے سے؟ یہ یقیناً کتنا برا ہے جو وہ کرتے رہیں ہیں۔''

اس کے قبل کی آیت میں جو کہا تھا ''کتنا برا ہے وہ جو وہ کرتے ہیں۔'' وہ خود ان عوام کے عمل سے متعلق تھا اور یہ جو کہا جا رہا ہے، ان علماء کے کردار سے متعلق ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کوتاہی کرتے ہیں۔[3]

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ؕ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾

---

[1]۔الاثم الجرم کانیا ما کان و عالعدوان الظلم (تبیان)

[2]۔قیل المراد بالکثیر رؤساؤھم و علماؤھم (مجمع البیان)

[3]۔لبئس ما کانوا یصنعون ترک نہیھم (جلالین)

”اور یہودیوں کا قول ہے کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ان کے ہاتھ بندھیں اور ان پر لعنت ہو، اس کی وجہ سے جو انھوں نے کہا بلکہ اس کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور جو آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ کی جانب اتارا گیا ہے، وہ ان میں سے بہتوں کے لئے سرکشی اور کفر میں اضافہ ہی کرے گا اور ہم نے ان کے درمیان دشمنی اور کینہ قیامت تک کے لئے ڈال دیا ہے۔جب بھی یہ جنگ کی آگ سلگائیں گے، اللہ اسے بجھا دے گا اور یہ زمین میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔“

یہود کے اس قول کا کہ ”اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، یہ مطلب بتایا گیا ہے کہ جب اسلام کے غلبہ کی وجہ سے اور ہم سمجھتے ہیں شریعت اسلام میں سود کے حرام کیے جانے سے چونکہ یہود کے معاشیات کا انحصار سود پہ تھا، وہ مالی پریشانی میں مبتلا ہوئے تو جھنجھلا کر انہوں نے یہ کہا کہ خدا کے ہاتھ بندھ گئے ہیں۔یعنی وہ تنگ دست ہو گیا ہے کہ اب ہمیں اس نے دینا کم کر دیا ہے[1] اسی محل پر یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ دو رخ ان کے اس قول کے اور بتائے گئے ہیں اور وہ بھی قرین قیاس ہیں۔

ایک یہ کہ جب یہ آیت اتری کہ: اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا (حدید۔۱۸) ”اللہ کو قرضہ حسنہ دو“ تو اس پر تمسخر کا پہلو پیدا کرتے ہوئے انہوں نے یہ کہا کہ لو! مسلمانوں کا خدا تنگ دست ہے، اس کے پاس پیسہ نہیں ہے کہ وہ قرض مانگ رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی پریشان حالی کو دیکھ کر انہوں نے بطور طعن و تشنیع یہ کہا کہ اللہ تو ان پر بہت مہربان ہے، پھر یہ اس حال میں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود مجبور ہے کہ اپنی جماعت والوں کو اس حال میں دیکھتا ہے اور پھر کچھ نہیں کرتا[2] اس پر یہ آیت اتری۔

اہل سنت کے تفاسیر میں جہاں تک میری نظر سے گزرا ہے سوا ان اقوال کے جو مالیات سے متعلق ہیں اور کوئی آیت کا پس منظر نہیں ملا اور ہمارے بھی بہت سے مفسرین نے اسی کا تتبع کیا مگر ہمارے یہاں کی ایک قدیم تفسیر یہ ملتی ہے کہ اس کا تعلق قضاء و قدر سے ہے۔یعنی یہود کا یہ قول کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے جو کچھ فیصلے کرنا تھے وہ کر چکا، اب اس کے ہاتھ خود بندھ چکے ہیں۔کچھ بھی تبدیلی وہ نہیں کر سکتا۔اس کی قرآن نے ردکی ہے اور کہا ہے کہ اس کے فیصلے ایسے نہیں ہیں کہ وہ خود ان کے بدلنے پر قدرت نہ رکھتا ہو[3] اس لئے دعا استغفار اور شفاعت وغیرہ کو بے اثر سمجھنا غلط ہے۔

شیعہ اور سنی کا مشہور اختلافی بدآ کا مسئلہ انہی دونوں تصوروں پر مبنی ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ

---

[1]۔مغلولة مقبوضة عن ادرار الارزاق علينا كنوا به عن البخل (جلالين) مقبوضة عن العطآء ممسكة عن الرزق فنسبوه الى البخل عن ابن عباس (مجمع البيان)

[2]۔يجوز ان يكونوا قالوا ذلك على وجه الهزء حيث لم يوسع على النبی ﷺ و على اصحابه (تبيان)

[3]۔قالوا قد فرغ الله من لامر لا يحدث الله غير ما قد قدره فی التقدير الاوّل فرد الله عليهم فقال: بل يداه مبسوطتان ای تقدم ويؤخر ويزيد وينقص له البدا والمشيئة (علی بن ابراهيم)

جَنّٰتِ النَّعِيۡمِ ﴿۶۵﴾

''اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو ان کی غلطیوں کو ہم نظر انداز کر دیتے [۱] اور انہیں راحت و آرام والے بہشتوں میں جگہ دیتے'' [۲]

''ایمان لاتے'' یعنی پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو تسلیم کرتے اور اب سے اپنے اعمال ٹھیک رکھتے تو پہلے کی غلطیاں کالعدم ہو جاتیں یعنی ان کا کوئی مواخذہ نہ ہوتا۔ اس لئے کہ یہ عام اصول ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ہی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ قبل والی زندگی کا کوئی حساب نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ الاسلام یجب ماقبلہ کے اصول کے ماتحت اگر پہلے خون بھی کیا ہو تو اب اس کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔

وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اَقَامُوا التَّوۡرٰىةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ لَاَكَلُوۡا مِنۡ فَوۡقِهِمۡ وَمِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِهِمۡ ؕ مِنۡهُمۡ اُمَّةٌ مُّقۡتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ سَآءَ مَا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۶﴾

''اور اگر وہ توریت اور انجیل اور اس کو جو ان کے پاس ان کے پرودگار کی طرف سے اترا تھا [۳] ٹھیک طرح قائم رکھتے تو وہ کھاتے پیتے اپنے اوپر سے اور اپنے پیروں کے نیچے سے [۴] ان میں سے بس ایک گروہ تو اعتدال پر ہے اور زیادہ ان میں سے بڑا برا کردار رکھتے ہیں۔''

پہلے تو ان کی یہ شکایت کی گئی تھی کہ وہ اس آخری رسولؐ پر ایمان نہیں لاتے اور اگر ایسا ہوتا تو ان کی سب غلطیاں نظر انداز ہو جاتیں اور وہ نجات اور نعمات آخرت کے حقدار ہو جاتے اور اب ان کی یہ شکایت ہے کہ ارے اس رسولؐ پر ایمان لانا کیسا، انہوں نے خود اپنی کتابوں کے تعلیمات پر بھی عمل نہ کیا جس کی وجہ سے وہ معاشی تباہی میں مبتلا ہیں کم از کم وہ اپنے ہی یہاں کے تعلیمات پر من وعن عمل کرتے [۵] تو معاشیات کی تو ان کے لئے فراخی رہتی اور دنیا تو ان کی آرام سے کٹتی ہے''۔

یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہاں نجات آخرت کا ذکر نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ تو بہر حال آخری پیغمبرؐ پر ایمان اور پھر اس کی تعلیم پر عمل سے وابستہ ہے۔

---

[۱]۔ ای غطّاھا علیھم و ازال عقابھا عنھم (تبیان)

[۲]۔ اٰمنوا بمحمد (جلالین)

[۳]۔ یعنی سائر کتب سابقہ (شاہ ولی اللہ)

[۴]۔ بان یوسع علیھم الرزق ویفیض من کلّ جانب (جلالین)

[۵]۔ ای عملوا بما فیھا علی ما فیھا دون ان یحرّفوا شیئاً منھا او یغیّروا (مجمع البیان)

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَـتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝۶۷

''اے پیغمبر! جو اللہ کی طرف سے آپ پر اتارا گیا ہے، اسے پہنچا دیجیے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو اس کا کچھ پیغام پہنچایا ہی نہیں اور اللہ لوگوں سے آپ کی حفاظت کرے گا، بلا شبہ اللہ کافروں کو منزل تک نہیں پہنچایا کرتا۔''

حکم تاکیدی اعلان ولایت جناب امیر علیہ السلام بروز غدیر

الفاظ آیت سے ظاہر ہے کہ یہ کسی خاص اتارے ہوئے اہم حکم کی تبلیغ کے لئے تاکید ہے اور اس لئے خود آیت کے الفاظ جستجو پیدا کرتے ہیں کہ وہ کون سا اہم حکم تھا اور جب نہ شیعہ مفسرین کے یہاں بلکہ بہت سے سنی تفاسیر اور احادیث میں بھی یہ مل جاتا ہے اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کا ارشاد بھی اس کے مطابق موجود ہے [۱] کہ یہ آیت حجۃ الوداع میں ولایت حضرت علی بن ابی طالبؑ کے حکم کی تبلیغ کے متعلق آئی ہے جس کے بعد حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم میں وہ تاریخی اعلان فرمایا ہے کہ مَنۡ كُنۡتُ مَوۡلَاہُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوۡلَاہُ ''جس کا میں مولا ہوں، اس کا یہ علی مولا ہے'' تو آسودگی محسوس ہونے لگتی ہے اور جستجو کا سفینہ ساحل مراد تک پہنچ جاتا ہے۔

مگر کچھ مفسرین اہل سنت نے اس ''جستجو کا دروازہ بند کرنے کے لئے آیت کا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ جو بھی اللہ کا حکم اترے، اس کی تبلیغ کردیجیے یعنی ایک بھی حکم ایسا نہ ہو جو جس کی تبلیغ آپ لوگوں کے خوف سے چھوڑ دیں، ورنہ پھر آپ نے رسالت کا فرض ہی انجام نہ دیا ہو گا یعنی کسی ایک کی تبلیغ نہ کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ نے بالکل ہی تبلیغ نہیں کی۔ [۲]

مگر عربی سلیقہ بیان رکھنے والے احساس کر سکتے ہیں کہ اس صورت میں بلغ كل ما انزل اليك ہونا چاہیے یا پھر بلغ ما ينزل اليك (بصیغہ تجدید و استمرار خ، نہ کہ ما انزل اليك فقط جو آپ پر اتارا گیا ہے)۔

قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَسۡتُمۡ عَلٰى شَىۡءٍ حَتّٰى تُقِيۡمُوا التَّوۡرٰٮةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ؕ وَلَيَزِيۡدَنَّ كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ مَّاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ طُغۡيَانًا وَّكُفۡرًا ۚ فَلَا تَاۡسَ عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝۶۸

---

[۱]۔ قال ابو جعفر و ابو عبداللہ علیہما السلام ان اللہ تعالیٰ لما اوحی الی النبی علیه السلام ان یستخلف علیا کان یخاف ان یشق ذلك علی جماعة من اصحابه فانزل اللہ تعالیٰ ھذہ الآیة (تبیان)

[۲]۔ بلغ جميع ما انزل اليك من ربك ولا تكتم شيئا منه لخوف ان تنال بمكروه وان لم يفعل اى لم تبلغ جميع ما انزل اليك فما بلغت كا سالته بالا فراد وا الجمع لان كتمان بعضها كتمان كلها (جلالين)

''کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب تمہاری کوئی مذہبی بنیاد ہی نہیں [1] جب تک کہ توریت اور انجیل اور جو کچھ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے، اس کو قائم نہ رکھو اور یقیناً ان میں سے بہتوں کو یہ جو آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے، سرکشی اور کفر میں اضافہ کا باعث ہو جائے گا تو آپ ان کافر لوگوں پر کوئی افسوس نہ کیجیے گا'' [2]

اہل کتاب کا مشرین سے امتیاز بس برائے نام ایک انتساب کی حد تک ہے ورنہ جب انہوں نے آسمانی کتابوں میں تحریف کر دی اور عقائد و اعمال کسی بھی ان انبیاء کے تعلیمات پر قائم ہی نہیں رہے تو پھر ان کا دین و مذہب ہی کیا رہا؟ اور ان میں اور غیر اہل کتاب میں جو صریحی کافر ہیں، فرق ہی کیا باقی رہا؟

معلوم ہونا چاہیے کہ توریت اور انجیل کو ٹھیک طور پر قائم رکھنے کا لازمی نتیجہ آخر میں یہ ہے کہ وہ اب اس کتاب پر جو اتاری گئی ہے یعنی قرآن ایمان اختیار کریں اور اس طرح مسلمان ہو جائیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود اپنی کتابوں پر بھی ایمان سے محروم ہیں اور اس لئے آخر میں ان پر صاف صاف ''کافرین'' کے لفظ کا اطلاق کر دیا گیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٩﴾

''یقیناً جو مسلمان ہیں ہی اور جو یہودی تھے اور صابئ اور عیسائی، جو بھی اور خدا اور روز آخرت پر ایمان اختیار کرے اور نیک اعمال کرے، ان کے لئے کوئی خوف نہیں ہے اور نہ انہیں رنج ہوگا۔''

اس طرح کی ایک آیت پہلے پارہ میں آ چکی ہے۔صرف ذرا سا فرق ہے کہ وہاں نصاریٰ کا ذکر پہلے اور صائبین کا بعد کو تھا اور یہاں صائبین کا نام پہلے ہے اور نصاریٰ کا بعد کو ہے۔ بہرحال مطلب یہ ہے کہ پہلے کوئی کچھ ہو، خواہ شروع سے مسلمان ہو یا یہودی، عیسائی یا ستارہ پرست ہو، اب معیار نجات سب کے لئے ایک ہے کہ جو ان اصول وعقائد کو تسلیم کرے، جن میں اصل اصول مبداء و معاد ہے اور اس شریعت پر عامل ہو کہ اس کا نام ''عمل صالح'' ہے وہ آخرت کے خوف و رنج سے محفوظ ہے۔ [3]

لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَأَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رُسُلًا ۖ كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ﴿٧٠﴾

''ہم نے بنی اسرائیل سے عہد و پیمان لیا اور ان کی طرف بہت سے پیغمبر بھیجے، جب بھی کوئی پیغمبر ایسی باتیں لے کر

---

[1] لستم علیٰ شیء من الدّین یعتدّ بہ (جلالین) علی شیء من الدّین الصحیح (مجمع البیان)

[2] قیل معناہ لا تحزن علی ھلاکھم و عذا بھم فذٰلك جزاؤھم بقعالھم (مجمع البیان)

[3] یعنی دار صل از ھر فرقۂ کہ باشد چوں ایمان ارداز اھل نجات است و خصوصیت فرق را اعتبار نیست (شاہ ولی اللہ)

آیا جوان کی غلط خواہشوں کے موافق نہ تھیں[1] تو کچھ کو انہوں نے جھٹلایا ہی اور کچھ کو وہ قتل کر دیا کرتے تھے۔''

وَحَسِبُوۡۤا اَلَّا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ فَعَمُوۡا وَصَمُّوۡا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ ثُمَّ عَمُوۡا وَصَمُّوۡا كَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۷۱﴾

''اور انہوں نے سمجھا کہ کوئی سزا نہ ملے گی[2] تو وہ اندھے اور بہرے ہو گئے، پھر اللہ نے انہیں معاف کیا تو اس کے بعد ان میں سے بہت سے پھر اندھے اور بہرے ہو گئے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس کا خوب دیکھنے والا ہے۔''

نہیں سمجھا جا سکتا کہ یہ آیت گزشتہ آیت سے کوئی تعلق رکھتی ہے بلکہ مضمون آیت سے قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت منافقین کے متعلق کسی سلسلہ آیات کا جزء ہے۔

''اندھے اور بہرے ہو گئے'' یعنی آیات حقیقت سے آنکھیں بند کر لیں اور صدائے حق کے سننے سے گریز کیا۔ پھر اللہ نے انہیں معاف کیا یعنی انہوں نے توبہ تلّا کی اور اللہ نے توبہ قبول کی مگر پھر وہ اپنی پرانی روش پر واپس ہو گئے اور وہی اندھے بہرے پن کا رویہ اختیار کر لیا۔[3]

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ‌ ؕ وَقَالَ الۡمَسِيۡحُ يٰبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اعۡبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىۡ وَرَبَّكُمۡ‌ ؕ اِنَّهٗ مَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ الۡجَـنَّةَ وَمَاۡوٰٮهُ النَّارُ‌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۷۲﴾

''کافر ہو گئے وہ جنہوں نے کہا کہ مریمؑ کے فرزند عیسیٰؑ ہی اللہ ہیں اور خود مسیحؑ نے یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل! اللہ کی پرستش کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے بلاشبہ جو اللہ کے ساتھ شرک کرے اللہ نے اس پر بہشت حرام کر دی ہے اور ان کا ٹھکانا آتش دوزخ میں ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔''

نصاریٰ کے مختلف فرقوں کے کافر ہونے کا صریحی حکم

عموماً عیسائی لوگ ظاہر بظاہر مسیحؑ کے علاوہ ذات الٰہی کے منکر نہیں ہیں بلکہ انہیں ایک تو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں پھر تثلیث کے قائل ہیں کہ باپ بیٹا اور روح القدس یہ تینوں خدا ہوتے ہوئے ایک ہیں قرآن نے بھی اس قول کو کہ عیسیٰ علیہ السلام ہی بس اللہ ہیں، صاف صاف جماعت نصاریٰ کی

[1]۔ الهدیٰ هو لطف محلّ الشئی من النفس مع المیل الیه مما لا ینبغی فلذلك غلب علی الهویٰ صفة الذم (تبیان)
[2]۔ الفتنة ههنا العقوبة (تبیان)
[3]۔ یرید ان فریقا منهم تابوا فتاب الله علیهم ثم عموا وصموا ای عادوا الما کانو علیه (مجمع البیان)

طرف منسوب نہیں کیا ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ جنہوں نے یہ کہا، وہ کافر ہو گئے۔ اب تو یہ سمجھا جائے یہ نصاریٰ کا کوئی خاص فرقہ ہے جو مسیح سے علیحدہ کسی ذات کا جس کا نام اللہ ہے تصور ہی نہیں رکھتا جیسا کہ بعض مفسرین کا بیان ہے [1] اور اس آیت کے بعد والی آیت کو اگر تنزیل میں اس سے متصل ہی مانا جائے تو اس خیال کو اس سے تقویت ہوتی ہے اس لئے کہ اس کے بعد والی آیت میں صراحۃً تثلیث کے کفر ہونے کو ظاہر کیا گیا ہے تو دونوں آیتوں کو ملا کر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ نصاریٰ کے ایک فرقہ کی رد میں یہ آیت ہے اور دوسرے فرقوں کی رد میں جو تثلیث کے قائل نہیں، اس کے بعد والی ہے۔

مگر ایک امکان یہ ہے کہ وہ اس آیت کے بعد والی آیت کے ساتھ مقام تنزیل میں نہ آئی ہو بلکہ کہیں اور کی ہو جسے جمع قرآن کے وقت یکسانی مضمون کی بنا پر ساتھ ساتھ درج کر دیا گیا اور یہ کہ ''وہ کہتے ہیں کہ اللہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ہی ہیں، عقیدہ تثلیث ہی کی ایک دوسری تعبیر ہو اس کے لازمہ کو نمایاں کرنے کے ساتھ جب تثلیث کی رو سے اللہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ متحد ہے تو پھر وہی اللہ ہیں...... ان سے الگ کوئی نہیں جو اللہ ہو۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَھُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾

''بلا شبہ کافر ہو گئے وہ جنہوں نے کہا اللہ تین میں کا ایک ہے حالانکہ کوئی خدا نہیں مگر ایک اکیلا خدا اور اگر یہ اس سے جو کہہ رہے ہیں باز نہیں آئیں گے تو جو اس کفر پر ان میں سے برقرار رہیں گے [2] انہیں دردناک عذاب پہنچے گا''

یہ جو عام نصاریٰ کا عقیدہ تثلیث ہے [3] صاف صاف اسی کی رد ہے یعنی اللہ اور مسیح اور روح القدس یا اقانیم ثلثہ تین ہوتے ہوئے ایک ہیں یہ صریحی کفر و شرک ہے۔

بعض مفسرین نے اقانیم ثلثہ کی تشریح کی ہے: اللہ، عیسیٰ علیہ السلام اور مادر عیسیٰ علیہما السلام [4] مگر یہ غالباً عیسائیوں کے عقائد سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:

''نصاریٰ میں دو قول ہیں: بعض کہتے ہیں اللہ یہی تھا جو صورت مسیح میں آیا اور بعض کہتے ہیں تین حصہ ہو گیا۔ ایک اللہ رہا، ایک روح القدس اور ایک مسیح، یہ دونوں صریحی کفر ہیں۔'' (موضح القرآن)

بظاہر مطلب اس کا وہی ہے جسے ہم نے موجودہ ترتیب کو مطابق تنزیل ماننے کی صورت میں اس کے قبل کی آیت میں ترجیح دی ہے کہ وہ آیت پہلی قسم کے نصاریٰ کی رد میں تھی اور یہ آیت دوسری قسم کے نصاریٰ کی رد میں ہے۔

---

[1] الذین یقولون من النصاریٰ ان اللہ ھو المسیح ابن مریم ھم الیعقوبیہ... و غیرھم یقولون ان المسیح ابن اللہ (تبیان) ھذا مذاھب الیعقوبیہ منھم لانھم قالوا ان اللہ اتحد بالمسیح اتحاد الذات (مجمع البیان)

[2] الذین یستمرّون علی کفرھم (تبیان)

[3] القائلون بہذا المقالۃ جمھور النصاریٰ...... لانھم یقولون اب و ابن و روح القدس الٰہ واحد (تبیان)

[4] ثالث الٰھۃ ثلثۃ ھو احدھا و الاٰخران عیسیٰ و امّہ (جلالین)

اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾

''تو کیوں نہیں یہ توبہ کرتے اللہ کی بارگاہ میں اور اس سے معافی مانگتے اور اللہ تو بخشنے والا ہے بڑا مہربان''

کفر یا شرک سے توبہ صحیح عقیدہ کو اختیار کرنا اور ایمان لے آنا ہے اور ایمان اختیار کرنے کے بعد گزشتہ زندگی کے متعلق کوئی سوال باقی نہیں رہتا کہ وہ کس طرح گزری۔ اس طرح جو کچھ پہلے تھا، وہ سب معاف ہو جاتا ہے جو اللہ کے رحم و کرم کا تقاضا ہے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۷۵﴾

''نہیں ہیں مریم کے بیٹے مسیح ؑ مگر ایک پیغمبر جن کے پہلے اور پیغمبر گزر چکے ہیں اور ان کی ماں صدیقہ (بڑی راست باز) تھیں۔ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم ان کے سامنے کس طرح واضح بیانات پیش کرتے ہیں، پھر یہ دیکھو کس طرح منحرف ہوتے ہیں۔''[1]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی صحیح حیثیت

مسیح ابن مریم علیہ السلام کے متعلق جو صحیح تصور ہے، وہ صاف صاف پیش کر دیا گیا ہے کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے نہیں تھے۔ ہاں خدا کے رسول تھے اور ان کی ماں بڑی راست باز خاتون تھیں۔ اس طرح یہود کے جو خیالات جناب مریم سلام اللہ علیہا کی پاک دامنی اور جناب عیسیٰ علیہ السلام کی طیب ولادت کے خلاف ہیں، وہ بھی غلط ہیں اور عیسائیوں کے جو خیالات ان کے بارے میں الوہیت کے ہیں، وہ بھی خلاف واقع ہیں۔''

''کھانا کھاتے تھے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ بشر تھے، خدا نہ تھے، اس لئے کہ دوسرے انبیاء کے بارے میں کفار و مشرکین کا یہی قول قرآن میں درج ہے کہ یہ تو بشر ہے یاکل الطعام کھانا کھاتے ہے۔ بس جیسے اور انبیاء و مرسلین تھے، وہی صورت جناب عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کی بھی کہ وہ بشر کے ماورا کوئی چیز نہ تھے۔

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۶﴾

''کہیے کہ کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی پرستش کرتے ہو جو تمہارے لئے نہ کسی نقصان پہنچانے پر قابو رکھتی ہے اور

---

[1] انّٰی کیف یؤفکون یصرفون عن الحق مع قیام البرھان (جلالین)

نہ فائدہ پہنچانے پر اور اللہ وہی سننے والا ہے، خوب جاننے والا ہے۔"

انسان کا علم بھی محدود ہے اور قدرت بھی۔ یہ نقص اس کی نفی الوہیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے چنانچہ پہلے ماسوی اللہ کی عاجزی دکھلا کر ان نفی قدرت کا صراحتاً اظہار کیا گیا اور پھر اللہ کے لئے یہ کہہ کر کہ "وہی سننے والا ہے، خوب جاننے والا" ان کے نفی علم کو ضمناً ظاہر کیا گیا۔

پھر اس کے ساتھ اس میں تہدید۔ بھی مضمر ہے کہ تم ان معبودوں کو شریک خدا جس جس طرح کہتے اور جس جس طرح مشرکانہ افعال کرتے ہو، سب کا اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اس لئے اس کے عذاب سے پرحذر رہو۔

قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡـنِكُمۡ غَيۡرَ الۡحَـقِّ وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَهۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَاَضَلُّوۡا كَثِيۡرًا وَّضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ ﴿۷۷﴾

"کہیے کہ اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو سے کام نہ لو......اور ان لوگوں کے دل بخواہ خیالات کی پیروی نہ کرو جو پہلے گمراہ ہو چکے اور انہوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔"

غلو کسی کو اس کے مرتبہ سے بڑھا دینا ہے۔ نصاریٰ نے جناب عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا کہہ دیا۔ بظاہر اس محل پر مخاطب وہی ہیں یا یہود بھی اس کے تحت میں ہوں، اس لئے کہ دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے کہ وہ عزیر کو خدا کا بیٹا کہنے لگے تھے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دین غلو یعنی حد سے قدم آگے بڑھانا، اس غلو سے جو کسی شخص کو اس کے مرتبہ سے بڑھانے کے ساتھ ہوتا ہے مخصوص نہ ہو بلکہ کسی کو اس کے مرتبہ سے گھٹانا بھی اس شخص کے بارے میں غلو نہ ہو مگر دینی حدود سے تجاوز کی بنا پر دین میں غلو تو ہے لہٰذا یہود اور نصاریٰ دونوں اس معنی میں غلو فی الدین کے مرتکب ہیں کہ وہ اللہ کے سچے انبیاء کی تکذیب کر رہے ہیں۔ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں اور نصاریٰ کم از کم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت سے انکار کے مرتکب تو ہیں ہی لہٰذا دین کی حدود سے قدم آگے بڑھانے میں دونوں شریک ہیں۔[1]

ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے جو اس وقت مخاطب ہیں یہ راستے کسی ذاتی تحقیق سے اختیار نہیں کیے ہیں بلکہ اپنے اسلاف کی پیروی کر رہے ہیں، اس لئے انہیں انتباہ کیا گیا کہ ایسے اسلاف کی پیروی نہ کرو جو خود گمراہ ہو گئے تھے۔[2]

تمہاری خود ذمہ داری ہے کہ تم اس گمراہی سے بچو جس میں وہ گرفتار ہو گئے تھے۔ یہ نہیں کہ ان کے نقش قدم پر چل کر خود بھی گمراہ ہو۔

لُعِنَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡۢ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ‌ ؕ ذٰ لِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوۡا يَعۡتَدُوۡنَ ﴿۷۸﴾

[1]۔ قال قوم المراد به اليهود والنصارى لانّ اليهود ايضا غلوا في تكذيب عيسىٰ و محمّد ﷺ (تبيان)

[2]۔ قوم قد ضلوا من قبل بغلّوهم وهم اسلافهم (جلالين) خطاب للّذين كانوا في عصر النبي ﷺ نهوا ان يتبعوا اسلافهم (مجمع البيان)

”بنی اسرائیل میں جنھوں نے کفر اختیار کیا ان پر لعنت ہوئی داؤد اور عیسٰی فرزند مریم کی زبان سے۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی سے کام لیا اور وہ حد سے گزر جایا کرتے تھے۔“

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾

”وہ کسی برائی سے جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے کو روکتے نہ تھے کیا برا تھا وہ طرز عمل جو وہ اختیار کیے ہوئے تھے۔“

چاہے جرم کے مرتکب کچھ خاص لوگ ہوں لیکن دوسرے لوگوں نے اگر سکوت اختیار کیا اور ان اعمال سے چشم پوشی کی تو وہ سب ہی غضب ولعنت کے مستحق بن جاتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو زیارت امام حسینؑ ہے:

لَعَنَ اللهُ اُمَّةً سَمِعَتْ بِذٰلِكَ فَرَضِيَتْ بِهٖ.

لعنت ہو ان لوگوں پر بھی جنہوں نے اس کو سنا اور اس پر راضی رہے۔

یہ بالکل قرآن مجید کی اس آیت کے مطابق ہے، یہاں بھی اسباب لعنت میں ظلم و تعدی کے ارتکاب کو الگ بیان کیا گیا ہے اور اسے الگ کہ وہ برائی سے مانع نہ ہوتے تھے[۱] یہ ان لوگوں کے مورد غضب ہونے کا سبب ہے جو خود جرم کے مرتکب نہ بھی ہوئے ہوں۔

دوسرے معنی لا يتناهون کے یہ کہے گئے ہیں کہ وہ باز نہ آتے تھے یعنی اس برائی پر قائم و برقرار رہتے تھے[۲] اور بعض مترجمین نے ترجمہ اس کے مطابق کیا ہے۔[۳]

مگر بظاہر یہ درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ باز رہنے کے لئے انتہاء کا لفظ آتا ہے جو باب افتعال سے ہے نہ کہ تناہی جو باب تفاعل سے ہے اور جس کے معنی میں غیر کے ساتھ شرکت مضمر ہوتی ہے۔[۴]

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾

”دیکھو گے تم ان میں سے بہتوں کو کہ وہ کافروں سے موالات رکھتے ہیں، بہت برا ہے وہ سامان جو ان کے نفسانیتوں نے ان کے لئے رکھا ہے[۵] کہ اللہ ان پر غضب ناک ہو گیا ہے اور وہ عذاب میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں

---

[۱]۔ لا يتناهون ای لا ينهى بعضهم بعضا (جلالین) يك ديگر را منع نمی كردند از ان عملی زشت كه مرتكب آن می شدند (شاہ ولی اللہ) ایک دوسرے کو منع نہ کرتے تھے اس برے کام سے کہ وہ کرتے تھے اس کو (شاہ رفیع الدین)

[۲]۔ للتناهی ههنا معتيان احدهما انّه تفاعل من النهی الثانی انّه بمعنی الانتها ايقال تناهی عنه اذا كف عنه (مجمع البیان)

[۳]۔ کسی برے کام سے جسے ان لوگوں نے کیا باز نہ آتے تھے (مولانا فرمان علی صاحب)

[۴]۔ مثل قولك لا يتضاربون ولا يترامون ولا ينتهون معناه لا يكفّون (تبيان)

[۵] قدمت لهم انفسهم من العمل لمعادهم (جلالين)

گے۔“

یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اہل کتاب کے مقابلہ میں جب کافروں کا لفظ آتا ہے تو اس سے مراد مشرکین ہوتے ہیں [۱] اس لئے کہ اہل کتاب تو پھر بھی کچھ انبیاء اور آسمانی کتابوں کو مانتے تھے اور مشرکین اس میں سے کچھ بھی نہ مانتے تھے۔ اسلام نے قرآن کی زبانی بار بار ان کو دعوت دی کہ تمہیں ہمارے ساتھ مل کر ان کافروں کا مقابلہ میں ایک محاذ بنانا چاہیے مگر یہ اہل کتاب بجائے مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کرنے کے اسلام کے خلاف کافروں کے ساتھ سازشوں میں شریک ہوتے تھے یہی ان کے کرتوت کا تاریک پہلو ہے جسے قرآن یہاں نمایاں کر رہا ہے۔

وَلَوۡ كَانُوۡا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِىِّ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مَا اتَّخَذُوۡهُمۡ اَوۡلِيَآءَ وَلٰـكِنَّ كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۸۱﴾

”اور اگر وہ ایمان رکھتے اللہ اور رسول اور اس پر کہ جو اس پر اترا ہے تو ان لوگوں کو اپنا حوالی موالی نہ بناتے مگر ان میں سے زیادہ تر افراد بداعمال ہیں۔“

عموماً لفظ ”النبی“ یا ”الرسول“ مطلق طور پر قرآن میں آئے تو اس سے مراد یہ پیغمبر یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہوتے ہیں اور جو ان پر اترا ہے، اس سے مراد قرآن اور شریعت اسلام مگر مفسرین نے اس خیال سے کہ ذکر یہودیوں کا ہے تو ان کے متعلق یہ فرض کرنے کے کیا معنی کہ وہ اس رسول اور قرآن پر ایمان لاتے، یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یا تو یہ عام یہودیوں کا ذکر ہے ہی نہیں بلکہ ان کا ہے جو منافقین میں داخل ہو گئے ہیں اور ”النَّبِیِّ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡهِ“ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توریت مراد ہیں کہ اگر یہ واقعی ان پر ایمان رکھتے ہوتے تو مشرکین سے گٹھ جوڑ نہ کرتے۔ [۲]

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا الۡيَهُوۡدَ وَالَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقۡرَبَهُمۡ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنۡهُمۡ قِسِّيۡسِيۡنَ وَرُهۡبَانًا وَّاَنَّهُمۡ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۸۲﴾

”یقیناً تم سخت ترین دشمن مسلمانوں کا پاؤ گے یہودیوں کو اور مشرکین کو اور سب سے زیادہ مسلمانوں سے محبت میں قریب پاؤ گے انہیں جو کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ان میں پادری ہوتے ہیں اور دنیا سے الگ تھلگ رہ کر عبادت کرنے والے [۳] اور یہ کہ وہ غرور وتکبر سے کام نہیں لیتے۔“

---

[۱] الذین کفروا یرید کفار مکۃ (مجمع البیان)

[۲]۔ قولان احدھما انہ فی المنافقین من الیھود والثانی المراد بالنبی موسیٰ علیہ السلام (تبیان)

[۳]۔ قسیسین علماء ورھبانا عبادا (جلالین)

بت پرستوں اور یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کی تعریف

جیسا کہ قدیم تفسیر میں وارد ہے، یہ آیت اس واقعہ کے پس منظر اتری ہے کہ مکہ معظّمہ میں بہت مسلمان مشرکین کی ایذا رسانیوں کی بنا پر جب حکم رسولؐ سے ہجرت کر کے ملک حبش گئے جسے ''ہجرت اولیٰ'' کہتے ہیں تو نجاشی بادشاہ حبشہ نے حقیقت پسندی سے کام لے کر انہیں اپنے یہاں پناہ دی اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے کام لیا۔ اسی لئے بمقابلہ مشرکین عیسائیوں کی تعریف کی گئی ہے۔[1]

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قیامت تک ہر ملک اور ہر دور کے عیسائیوں پر یہ صادق آئے کہ وہ دوسروں سے زیادہ مسلمانوں کے خیر خواہ ہوں بلکہ دنیا کی سیاسی کروٹوں میں وہ وقت آسکتا ہے جب مسلمانوں کے دشمن نمبر ایک یہی عیسائی لوگ ہوں۔

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨٣﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَن يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ﴿٨٤﴾

''اور جب وہ سنتے ہیں اسے جو پیغمبر پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے ان کی آنکھوں کو کہ لبریز ہو جاتی ہیں آنسوؤں سے، اس سے کہ جو انہوں نے حق پہچانا ہے، کہتے ہیں پروردگارا ہم ایمان لائے تو تو ہمیں گواہوں میں درج فرما اور ہمیں کیا ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں اللہ پر اور اس حق بات پر جو ہمارے پاس آئی ہے اور پھر توقع رکھیں کہ ہمارا پروردگار ہم کو نیک لوگوں میں شامل کرے''۔

آیت کے آخری جزء وَنَطْمَعُ أَن يُدْخِلَنَا رَبُّنَا کو جلالین نے اور ان کے تتبع میں شاہ ولی اللہ نے لا نؤمن والے لا کے تحت میں لیا ہے۔ اس لئے شاہ صاحب نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ:

''وچیست مارا کہ طمع نکنیم''۔

مگر انہی کے فرزند شاہ رفیع الدین نے اس نطمع کو فعل ثبوتی قرار دیا ہے اور یوں ترجمہ کیا ہے ''اور طمع رکھتے ہیں ہم یہ''۔

مجھے یہی صحیح معلوم ہوتا ہے اور میں نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٨٥﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ

---

[1]۔ کان سبب نزولها انه لمّا اشتدّت قريش فی اذی رسول الله ﷺ واصحابه الذين آمنوا به بمكة قبل الهجرة امرهم رسول الله ﷺ ان يخرجوا الی حبشه (علی بن ابراهيم)

الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾

''تو اللہ نے صلہ دیا انہیں اس کا جو انہوں نے کہا ان بہشتوں کی صورت میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ صلہ ہے ان کا جو اچھے کام کریں۔ اور جنہوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا، یہ دوزخ والے لوگ ہیں''۔

''صلہ ہے اس کا جو انہوں نے کہا، چوں کہ یہ کہنا حقیقت واقعہ کے مطابق اور دل و دماغ کی ہم آہنگی کے ساتھ تھا۔ ورنہ صرف قول کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ اس نکتہ کی تشریح علامہ طبرسیؒ نے فرمائی ہے، اس طرح کہ:

علق الثواب بمجرد القول لانه قد تبين من وصفهم ما يدل علىٰ اخلاصهم فيما قالوه وهو المعرفة فى قوله مما عرفوا من الحق والبكاء الموذن بحقيقة الاخلاص واستكانة القلب ومعرفة والقول اذا اقترن به المعرفة والاخلاص فهى الايمان الحقيقى الموعود عليه الثواب (مجمع البيان)

ثواب کو صرف ان الفاظ کے کہنے پر مرتب کیا گیا، اس لئے کہ ان کی صورت حال سے ایسے آثار نمایاں ہوئے جو ان کے خلوص کا ان کے کہنے میں پتہ دیتے ہیں اور یہی معرفت ہے جس کا اظہار اس ارشاد الٰہی سے ہوا ہے کہ ''اس سے جو انہوں نے حق پہچانا ہے'' اور رونا جو حقیقی خلوص اور دلی تاثر اور معرفت کو ظاہر کرتا ہے اور الفاظ کا زبان سے کہنا جب معرفت اور خلوص کے ساتھ ہو گیا تو یہی حقیقی ایمان ہے جس پر ثواب کا وعدہ ہے۔

ایک خاص پہلو قابل لحاظ یہ ہے کہ عموماً چھٹے پارہ کی آخری آیت کو جو اس کے قبل والی تفسیر کی جلد میں ہے، مستقل طور پر دیکھ کے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس میں بمقابلہ مشرکین و یہود و انصاریٰ کی مدح ہے چنانچہ ہم نے بھی اس آیت کے ذیل میں اس خیال کی ترجمانی کی ہے لیکن اگر یہ تمام آیات مقام تنزیل میں ایک سلسلہ کے ہیں، جو کوئی عجیب نہیں ہے، اس لئے کہ پاروں کی تقسیم فقط صفحات یا سطور یا حروف کی تعداد کو دیکھ کر تقریباً برابر برابر حصوں میں کر دی گئی ہے۔ مضمون کا لحاظ ہی نہیں کیا گیا ہے چنانچہ اس کی نظیریں بہت ہیں کہ آدھی بات گزشتہ پارہ کے آخر میں ہے اور آدھی بعد والے پارہ کے شروع میں۔ اس صورت میں یہ بعد والے اوصاف اسی جماعت کے ہیں جس کا ذکر سابق آیت میں ان الفاظ پر ختم ہوا تھا: بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ''ان میں پادری ہوتے ہیں اور تارک الدنیا لوگ اور یہ تکبر سے کام نہیں لیتے''۔ اس کے بعد بلا فاصلہ یہ ہے کہ: وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ ''جب وہ سنتے ہیں آیات الٰہیہ تو ان کا عالم یہ ہوتا ہے: تو ایسے لوگ جن کی یہ تعریف ہے، اب نصاریٰ کہاں ہوئے؟ وہ تو مسلمان ہو گئے جو سابق میں عیسائی تھے، جیسے جناب سلمان فارسی رضوان اللہ علیہ جب کہ اس سلسلہ میں بہشت کے ثواب کا بھی اعلان ہے تو یہ پوری تعریف اور اوصاف اس جماعت سے متعلق ہو ہی نہیں سکتے جو آخر تک عیسائیت کا دم بھرتی رہے اور کسی وقت بھی اسلام قبول نہ کرے۔

یہ تصور میں نے کافی قوت کے ساتھ پیش تو کر دیا ہے مگر ابھی پورے طور سے میں مطمئن نہیں ہوں اور یہ بات کلیۃً درست معلوم نہیں ہوتی دو وجھوں سے: ایک یہ کہ اگر گزشتہ آیت والی مدح کو ہم عیسائیوں کی اسی جماعت سے متعلق کریں جو مسلمان ہو گئی تو پھر اس کے بالمقابل مذمت ہے، اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہود اور مشرکین ایسے ہیں کہ مسلمان ہونے کے بعد بھی مسلمانوں کے شدید دشمن رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اس

عمومیت کے ساتھ درست نہیں ہے۔

پھر یہ مدح اگر ان عیسائیوں سے متعلق ہے جو مسلمان ہو گئے تو اس مدح کا وہ جزء کہ 'ان میں پادری اور تارک الدنیا لوگ ہوتے ہیں' چسپاں معلوم نہیں ہوتا۔

اس لئے دونوں آیتوں کو مقام تنزیل میں یا تو مرتبط مانا نہ جائے اور یہ سمجھا جائے کہ پہلی آیت تو اس وقت کی عیسائی قوم ہی کی مدح میں ہے بمقابل یہود و مشرکین، اور دوسری آیت کسی اور موقع پر اتری ہے ان عیسائیوں کی مدح میں جو دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور یا ایک ہی ساتھ نازل شدہ مان کر بھی یہ سمجھا جائے کہ گزشتہ مدح کے ذیل میں عیسائیوں کی طبیعت کی نیکی ہی کا ایک نتیجہ قرآن یہ بتا رہا ہے کہ ان میں قبولِ حق اور آیاتِ الٰہیہ سے اثر پذیری کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے اور وہ اکثر ایمان بسہولت اختیار کر لیتے ہیں اور اب ایمان لانے کے بعد ان کے اچھے انجام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اس طرح دونوں باتیں ٹھیک ہیں یعنی پہلی آیت کے ذیل میں جو لکھا گیا تھا کہ وہ بمقابلۂ یہود و نصاریٰ من حیث القوم عیسائیوں کی مدح ہے وہ بھی درست ہے اور یہ کہ موجودہ آیت میں جو حسنِ انجام اور نعیم جنت کا ذکر ہے، وہ ان عیسائیوں سے متعلق ہے جو صدق دل سے مسلمان ہو گئے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۸۷﴾ وَ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

"اے ایمان لانے والو! جو اچھی دل پسند چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں، انہیں حرام قرار نہ دو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ یقیناً اللہ تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو اللہ نے تمہیں اچھی حلال چیزیں عطا کی ہیں، ان میں سے کھاؤ پیو اور اللہ کی ناراضگی سے بچو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔"

پہلے یہ مضمون آچکا ہے مگر وہ یہود کے متعلق تھا جنہوں نے بہت سی پابندیاں بلاوجہ عائد کر رکھی تھیں یہاں مخاطب مسلمانوں کو بنایا گیا ہے۔[1] معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اسلام لانے والوں میں بھی یہ رجحان پیدا ہو چلا تھا[2] کہ انہوں نے لذائذ دنیا[3] کو اپنے اوپر حرام کرنا چاہا تھا، خواہ قسم کھا کر یا اپنے دل میں ٹھان کر، لیکن چونکہ اس سے رہبانیت کو تقویت پہنچتی ہے جسے اسلام نے ختم کرنا چاہا تھا لہٰذا مسلمانوں کو اس غیر معتدل رجحان سے روکا گیا۔

---

[1]۔ هذا خطاب للمؤمنين خاصة (تبيان)

[2]۔ نزل لما هم قوم من الصاحبة ان يلازموا الصوم والقيام ولا يقربوا النساء والطيب ولا ياكلوا اللحم ولا ينا موا على الفراش (جلالين)

[3]۔ الطيبات اللذات التي تشتهيها النفوس وتميل اليها القلوب (مجمع البيان)

صوفیا کی اکثر چلہ کشی وغیرہ کی ریاضتیں اور ترک حیوانات وغیرہ کی پابندیاں اس رجحان کی حامل ہیں جسے اسلام رو کتا ہے۔

تعجب ہے کہ علامہ طبرسیؒ ہی نے نہیں بلکہ شیخ طوسیؒ نے بھی مفسرین اہل سنت کے تتبع میں اس منزل پر منجملہ اور حضرات کے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آیت نازل ہوئی، حضرت علی بن ابی طالبؑ کا نام درج کردی ہے بلکہ اس سلسلہ میں ایک مرسل حدیث بھی وارد ہوگئی ہے[1] اور پھر آپ کے بارے میں یہ بات بہت مشہور ہے کہ آپ نے مدۃ العمر گیہوں نوش نہیں فرمایا جسے جناب مفتی میر عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ نے خاص لطف کے ساتھ نظم بھی فرمادیا ہے۔

بظاہر حضرت علی علیہ السلام کی نسبت یہ تصور صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ آپ صاحب علم لدنیؑ ہونے اور آغوش وحی میں پرورش پانے کے باوجود اس طرح کی قسم کھائیں۔ پھر یہ تو قطعاً درست نہیں ہوسکتا کہ قرآن مجید کے ایسے سخت الفاظ میں تنبیہہ کے باوجود آپ معاذ اللہ آخر حیات تک اس اپنے رو یہ پر قائم رہیں اور پھر اسے آپ کے فضائل و مناقب میں درج کیا جاتا رہے۔

نہج البلاغہ میں درج شدہ آپ کے ارشاد کی روشنی میں جو سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ آپ کی زندگی کی غیر معمولی سادگی اور لذائذ سے کنارہ کشی اس وقت نمایاں طور پر اختیار کی گئی ہے جب آپ شہنشاہ عالم اسلام مانے گئے اور دنیا کے تمام اسباب اقتدار کے ساتھ معاشی تکلیف میں شرکت کے لئے رضا کارانہ طور پر اپنے اوپر وہ سختی برداشت کی اور یہی دنیا کو 'طلاق' دینے کا وہ مفہوم ہے جو بحیثیت حقیقی رہنمائے اسلام کے آپ کے شایانِ شان ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغۡوِ فِیۡۤ اَيۡمَانِكُمۡ وَلٰـكِنۡ يُّؤَاخِذُكُمۡ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الۡاَيۡمَانَ‌ۚ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطۡعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيۡنَ مِنۡ اَوۡسَطِ مَا تُطۡعِمُوۡنَ اَهۡلِيۡكُمۡ اَوۡ كِسۡوَتُهُمۡ اَوۡ تَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ‌ؕ فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ‌ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيۡمَانِكُمۡ اِذَا حَلَفۡتُمۡ‌ؕ وَاحۡفَظُوۡۤا اَيۡمَانَكُمۡ‌ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۸۹﴾

''اللہ تمہاری لایعنی قسموں پر تم سے باز پرس نہیں کرے گا مگر وہ تم سے باز پرس کرے گا اس کی جو تم قصداً قسمیں کھاؤ[2] تو اس کا کفارہ دس غریبوں کو کھانا کھلانا ہے اوسط حیثیت کا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان کا لباس یا ایک بندہ آزاد کرنا۔ اب جس کے پاس اتنا نہ ہو[3] تو تین دن کے روزے رکھنا۔ یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب

---

[1]۔ ابی عن ابن ابی عمیر عن بعض رجالہ عن ابی عبداللہ (علی بن ابراھیم علیہ السلام)

[2]۔ باز خواست می کند از شما بسبب محکم کردن سوگند با قصد (شاہ ولی اللہ) بان حلفتم عن قصد (جلالین)

[3]۔ فمن لم یجدوا حدمما ذکر (جلالین)

تم قسم کھالو اور اپنی قسموں کا خیال رکھو۔ اس طرح اللہ تمہارے لئے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے، شاید کہ تم شکر گزار رہو“۔

قسم توڑنے کا کفارہ

پہلا جزء یعنی لا یعنی قسموں کا اعتبار نہیں، پہلے آچکا ہے۔ ان قسموں کا کوئی گناہ بھی نہیں اور ان کی مخالفت کا کوئی کفارہ بھی نہیں مگر جو قسمیں سمجھ بوجھ کی ہوں، ان کی مخالفت کا [۱] کفارہ یہاں بیان ہو رہا ہے۔

دوسرا جزء یعنی ارادی قسموں کے خلاف عمل کرنے کا کفارہ، اس کا مجمل بیان الفاظ قرآن میں صاف موجود ہے۔ تفصیلات کتب فقہیہ میں مذکور ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾

”اے ایمان لانے والو! شراب، جوا، بت [۲] اور جوئے میں استعمال ہونے والے تیر [۳] ایک گندگی ہیں شیطان کے کاموں میں سے [۴] تو اس سے [۵] پرہیز کرو، شاید کہ تم ہر طرح کی بہتری حاصل کرو۔“

شراب اور جوئے سے بت پرستی کی طرح ممانعت

جیسا کہ جناب شیخ الطائفہ اور ان کے تتبع میں علامہ طبرسیؒ نے تحریر فرمایا ہے، اس آیت سے شراب وغیرہ کی حرمت چار پہلوؤں سے ثابت ہوتی ہے: ایک یہ کہ اسے نجاست و گندگی کہا گیا اور نجاست سے پرہیز لازم ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے شیطانی کام قرار دیا گیا۔ تیسرے صاف صاف اس سے پرہیز کا حکم دیا۔ چوتھے یہ کہ فلاح و نجاتِ آخرت کو اس سے پرہیز کا نتیجہ بتایا، جس کے معنی یہ ہیں کہ ان چیزوں کا ارتکاب فلاح آخرت میں سد راہ ہے۔

کیرم وغیرہ کی حرمت

میسر جس کا ترجمہ ہم نے ”جوئے“ کے ساتھ کیا ہے، اس زمانہ میں ظاہر ہے کہ ایک شکل خاص سے ہوتا تھا لیکن اس کی حقیقت صرف

---

[۱]۔ فکفارتہ ای الیمین اذا قستم (جلالین) ان الکفارۃ لا تجب بنفس الیمین و انما تجب بالیمین و الحنث (مجمع البیان)

[۲]۔ الانصاب الاصنام (جلالین) نشانہائے معبودان باطل (شاہ ولی اللہ) قیل لھا انصاب لانھا کانت تنصب للعبادۃ و اصل الانتصاب القیام (تبیان)

[۳]۔ ھی سھام کانوا یجبلونھا للقمار (مجمع البیان)

[۴]۔ از کردار شیطان (شاہ ولی اللہ)

[۵]۔ ای الرجس المعتبر بہ عن ھذہ الاشیاء (جلالین)

اس شکل سے وابستہ نہیں ہے چنانچہ قدیم تفسیر میں جوعموماً حدیث پر مبنی ہے، اس کے تحت میں نرد اور شطرنج کا نام خصوصیت سے لیا ہے اور پھر عام قانون یہ بتایا ہے کہ ہر قمار میسر میں داخل ہے[1] چنانچہ اسی بنا پر پچیسی اور گنجفے اور تاش وغیرہ کو ہمارے علماء نے حرام سمجھا حالانکہ یہ نام ہندوستانی ہیں اور ممکن ہے ان کی خاص ترکیب بھی ہندوستانی ہی ہو تو اگر تہذیبِ نو میں اس کی کچھ نئی صورتیں سامنے آئیں جن کا ماخذ یورپ کا کوئی ملک ہو جیسے کیرم وغیرہ تو ان کے حرام ہونے میں بھی تامل کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿٩١﴾

”شیطان تو بس یہ چاہتا کہ شراب اور جوئے میں مبتلا کر کے[2] تمہارے درمیان کینہ و عداوت ڈالتا رہے اور تمہیں یاد خدا اور نماز سے باز رکھے تو کیا اب تم باز آ ؤ گے“۔[3]

اس آیت میں شراب اور جوئے کی کچھ عقلی مضرتیں جو عموماً ان پر مرتب ہوتی ہیں، بیان کی گئی ہیں کہ ان چیزوں کی وجہ سے خواہ مخواہ جھگڑے اور عداوتیں پیدا ہوتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ انسان ان چیزوں میں پڑ کر یادالٰہی سے جس کا نتیجہ احساس فرائض ہے اور جس کی بدولت نظامِ حیات میں بہتری پیدا ہوتی ہے[4] اور عبادت الٰہی سے جس کا اہم مظہر نماز ہے، بے پرواہ ہو جاتا ہے۔

یہ وہ حکمتیں ہیں جو عمومی طور پر اس قانون کے نفاذ کا باعث ہوتی ہیں اور قانون بن جانے کے بعد اب اگر کسی خصوصی صورت میں یا خاص مقدار میں استعمال سے یہ نتائج نہ بھی مرتب ہوں، تب بھی قانون کی مخالفت حرام ہوگی۔

مثلاً شراب حرام چاہے اسی وجہ سے ہوئی ہو کہ اسے پی کر لوگ لڑنے جھگڑنے لگتے ہیں لیکن جب کہ اس حکمت کی بنا پر حرمت شراب کا قانون نافذ ہو گیا تو اب اگر کوئی شخص کسی صورت سے اس کا اہتمام کرے کہ شراب پی کر وہ لڑے گا نہیں تو بھی شراب نوشی کے قانون کی خلاف ورزی لازماً ہوگی اور اس پر مواخذہ کا استحقاق ہوگا۔ اس طرح کوئی شخص خاص طور پر اس کا اہتمام کرے کہ وہ ان ناجائز تفریحات کے ساتھ نماز کی پابندی قائم رکھے گا تو بھی وہ حرمت قائم رہے گی جو عمومی طور پر نافذ ہوئی ہے ان چیزوں کے نوعاً یادالٰہی اور عبادت سے غافل کرنے کی بنا پر جس کی وجہ سے ایسی چیزوں کا نام لہو ہوا ہے، اب اگر شخصی طور پر ان کے اس تقاضے کو وقوع میں نہ آنے دیا جائے، تب بھی قانون کے خلاف ہونے کی بنا پر جو مواخذہ اس معصیت کا ہے، اس کا استحقاق ثابت رہے گا۔

یہ اصول تمام ان مصالح و حکم میں جاری ہے جن کی بنا پر احکام کلیہ جاری کئے گئے ہیں۔ یعنی حکم ہو جانے کے بعد اب ہمیں اپنی عقل سے

---

[1]۔ فاما المیسر ولنرد والشطرنج وکل قمار میسر (علی بن ابراھیم)

[2]۔ بسبب خمر و قمار (شاہ ولی اللہ)

[3]۔ ای انتھوا (جلالین)

[4]۔ لما فی ذلک من الدعاء الی الصلاح واستقامۃ الحال فی الدین الدنیا (تبیان)

یہ نہیں دیکھنا ہے کہ وہ وجہ یہاں پائی جاتی ہے یا نہیں بلکہ اب تو قانون کو دیکھنا ہے کہ ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے لہٰذا ہمیں اس کی تعمیل واجب ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾

''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو پیغمبر کی اور ڈرتے رہو[1] اس کے بعد اگر تم نے روگردانی کی تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے پیغمبر کے ذمہ بس واضح طور پر پہنچا دینا ہے۔''

یعنی تمہاری روگردانی کی وجہ سے رسول خدا ﷺ سے کوئی جواب طلب نہ ہوگا۔ آخرت میں باز پرس تم ہی سے ہوگی جس باز پرس کے ذمہ دار ہم ہیں[2] جیسا کہ رسول ﷺ کو مخاطب کر کے دوسری جگہ ارشاد کیا ہے کہ: فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ''آپ پر تو صرف تبلیغ کرنے کی ذمہ داری ہے اور محاسبہ صرف ہمارے ذمے ہے''۔ (رعد: ۴۰)

پھر اس میں اس طرح کی تہدید بھی مضمر ہے جیسے کوئی کہے کہ ہمارا کام بتا دینا تھا ہم نے تم سے کہہ دیا اب تم جانو یعنی انجام سے اس کے تم کو ہوشیار رہنا چاہیے جس کے ذمہ دار تم خود ہوگے۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

''جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں، ان پر کوئی گناہ نہیں اس میں کہ جو وہ کھائیں جب کہ وہ پرہیز کریں اور ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں، پھر پرہیز گار رہیں اور ایمان پر قائم رہیں اور پھر پرہیز جاری رکھیں اور حسنِ عمل پر برقرار رہیں اور اللہ اچھے اعمال والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

مطلب آیت کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ترک لذّات کا طلب گار اور رہبانیت کا حامی نہیں ہے جیسے دوسرے مقامات پر بھی متعدد طریقوں سے طعام اور لباس دونوں میں بے ضرورت پابندیوں کی نفی کی گئی ہے مثلاً: مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ اور یہ جو بار بار کہا گیا ہے مگر جب وہ پرہیز قائم رکھیں یعنی جو منہیات شرع بالنص ثابت ہیں، ان سے علیحدہ رہیں تو پھر کسی بھی لذیذ چیز

---

[1]. واحذروا المعاصی (جلالین) وجزاؤ کم علینا
[2]. معناه الوعيد والتهديد كانه قال فاعلموا انكم قد استحققتم العقاب لتوليكم عما ادى رسولنا من البلاغ المبين (تبيان)

کے کھانے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔[1]

اس سے اشیاء میں اصالت حلیت ثابت ہوتی ہے یعنی حرام ہونے کا علم نہ ہو، اس وقت تک کسی شے کے استعمال پر مواخذہ نہیں ہوگا۔

دوسرا مطلب آیت کا یہ قرار دیا گیا ہے کہ جو مومنین ہیں اور نیکوکار ہیں، وہ پہلے یعنی حکم حرمت آنے کے قبل[2] کچھ کھا پی چکے ہوں تو اس کا اب مواخذہ نہیں ہوگا جبکہ وہ اس کے بعد احکام کی پابندی کریں اور پھر یعنی برابر اس پابندی کو قائم رکھیں۔[3]

تیسرا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ مسلمان ہونے کے پہلے اگر یہ ممنوع چیزیں کھائی ہوں تو اس کا اب گناہ نہ ہوگا۔[4]

جناب شیخ طوسیؒ نے شان نزول بھی اس طرح درج کی ہے جو اسے اس حکم کے اترنے کے پہلے سے متعلق قرار دیتی ہے مگر اس شان نزول کے لئے مجاہد وغیرہ متعدد ایسے مفسرین کا حوالہ دیا ہے جن کے تفسیری اقوال کو اہل سنت کے یہاں تو اہمیت حاصل ہو سکتی ہے، شیعی نقطۂ نظر سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے جب کہ کوئی تفسیر معصومؑ اس کی تائید میں موجود نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک اگر آیت میں "من قبل" کی طرح کی کوئی لفظ ہوتی تو ان دونوں مفہوموں میں سے ایک[5] قرار دیا جاتا لیکن جب آیت میں اس طرح کا کوئی لفظ نہیں ہے تو یہ مطلب سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔

رہ گیا طَعِمُوْٓا کی لفظ کا بصیغۂ ماضی ہونا، جس کے معنی ہیں "کھایا" تو یہ کوئی بات نہیں، اس لئے کہ یہاں تو جتنے الفاظ آیت میں آخر تک ہیں: امنوا، اور اتقوا، اور احسنوا سب ہی صیغۂ ماضی ہیں لیکن ان سب کا تعلق سب کے نزدیک حال اور مستقبل سے ہے تو طعموا کو ماضی سے وابستہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾

"اے ایمان لانے والو! اللہ کو تمہاری آزمائش کرنا ہے ایک طرح کے شکار کے ساتھ[6] جسے تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پا جائیں تا کہ اللہ پتہ چلائے کہ کون بے دیکھے اس سے ڈرتا ہے تو جس نے اس کے بعد حد سے

---

[1] ۔فی تفسیر اهل البیت علیه السلام فیما طعموا من الحلال (مجمع البیان)

[2] ۔ا کلوا من الخمر والمیسر قبل التحریم (جلالین)

[3] ۔یعنی آنچه قبل از تحریم خوردند عفوا ست چوں در تقوی رسوخ پیدا کنند وایں سخن بدان ماند که کسی گوید با تو احسان کنم و باز بتو احسان کنم یعنی آکه پیوسته بتو احسن کنم (شاه ولی الله)

[4] ۔یعنی کفر کی حالت میں اگر حرام چیز کھائی تھی (موضح القرآن)

[5] ۔ جو کچھ کھا (پی) چکے، اس میں کچھ گناہ نہیں (مولوی فرمان علی صاحب)

[6] ۔ای بتحریم شئ من الصید وانما بعض لانه عنی صید البر خاصة (مجمع البیان)

تجاوز کیا، اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

”پتہ چلائے“ یعنی اس امتیاز کو واقعہ کی صورت میں نمایاں کردے[1] اس طرح کی تعبیر پہلے آچکی ہے اور وہاں اس کی تشریح ہو چکی ہے۔

یہ تمہید ہے آئندہ آیت کے مضمون کی۔ یہاں مجمل اعلان کیا جارہا ہے کہ شکار کے بارے میں تمہاری آزمائش ہوگی۔ یہ آزمائش کیا ہے اور کس موقع پر ہوتی ہے؟؟ وہ حالت احرام میں خشکی کے شکار کا حرام ہونا ہے۔ جو اس کے بعد کی آیت میں مذکور ہے۔

”نیزے“ کا لفظ جو کہا گیا ہے، اس میں خصوصیت مضمر نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ خود تم ہاتھ سے پکڑ کر ذبح کر دیا نیزہ وغیرہ کسی چیز سے گرالو اور پھر ذبح کرو۔[2]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡتُلُوا الصَّيۡدَ وَاَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ وَمَنۡ قَتَلَهٗ مِنۡكُمۡ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثۡلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحۡكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ هَدۡيًاۢ بٰلِغَ الۡكَعۡبَةِ اَوۡ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيۡنَ اَوۡ عَدۡلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوۡقَ وَبَالَ اَمۡرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنۡ عَادَ فَيَنۡتَقِمُ اللّٰهُ مِنۡهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ ﴿۹۵﴾

”اے ایمان لانے والو! شکار کو نہ مارو اس حالت میں کہ تم احرام باندھے ہوئے ہو اور جو تم میں سے اسے جان بوجھ کر مارے گا تو سزا اس کی جو چوپایوں میں سے[3] ہوگی اس کے مثل جسے اس نے مارا ہے، جس کا فیصلہ کریں گے تم میں سے دو عادل شخص جو قربانی کی صورت سے کعبہ پہنچے گی یا کفارہ ہوگا کچھ مسکینوں کا کھانا یا اس کے عوض میں روزے تاکہ وہ اپنے کئے کی پاداش کا مزہ چکھ لے۔ جو ہو چکا اسے اللہ نے معاف کیا اور جو پھر ایسا کرے گا تو اللہ اس سے بدلا لے گا اور اللہ زبردست ہے، سخت بدلا لینے والا“

حالت احرام میں شکار کی ممانعت

حج یا عمرہ کے احرام میں جو پابندیاں عائد ہوتی ہیں، ان میں سے اکثر تو سنت سے ثابت ہیں لیکن ان میں سے وہ اہم پابندی جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے، شکار کی پابندی ہے اور اگر عمداً انسان نے اس پابندی کو توڑا تو اس کی سزا کا بیان ہے جو تین چیزیں ہیں:۔

پہلے جس طرح کے جانور کا اس نے شکار کیا ہے، ویسا ہی جانور کعبہ میں لے جا کر ذبح کرے۔

---

[1] تا متمیز کنند خدا (شاہ ولی اللہ)

[2]۔ نیزہ کا نام لیا، اس میں سب ہتھیار داخل ہوئے (موضح القرآن)

[3]۔ قوله من النعيم يكون صفة للجزء (تبيان)

اب یہاں ''اسی طرح'' کے جانور میں صرف جنس میں مماثلت بھی مراد ہوسکتی ہے جیسا کہ اکثر فقہائے اسلام قائل ہیں [1] اور قیمت کے لحاظ سے بھی مماثلت مقصود ہوسکتی ہے یعنی وہ جانور اسی قیمت کا ہو جیسا کہ دوسرا قول ہے۔[2]

ظاہر نظر میں قرآن کا اس کے بعد یہ کہنا کہ اس کا فیصلہ [3] دو عادل شخص کریں گے دوسرے قول کو تقویت دیتا ہے، اس لئے کہ صرف جنس میں یکساں ہونا کوئی ایسی مشتبہ یا قابل اختلاف چیز نہیں ہے، جس کے لئے کسی خاص شخص کے فیصلہ کی ضرورت ہو، بے شک قیمت میں یکساں ہے یا نہیں؟ اس میں غلطی یا دھاندلی ہوسکتی ہے جس کے لئے دو عادلوں کے فیصلہ کو قرآن نے معتبر قرار دیا ہے مگر چونکہ روایت اہل بیت علیہم السلام بھی پہلے قول کے مطابق ہے [4] اس لئے ترجیح اسی کو ہے۔ اس صورت میں عادلوں کا فیصلہ اس کے متعلق ہوگا کہ جس جانور کا شکار کیا ہے، اس سے جنس کے لحاظ سے قریب تر کون جانور ہے؟ [5] اس لئے کہ جسے قتل کیا ہے، وہ ممکن ہے چوپایہ نہ ہو لیکن جس کی قربانی ہوگی، اس میں چوپایہ ہونے کی شرط ہے مگر ایسا جو اس قتل کئے ہوئے جانور سے تناسب رکھتا ہو جیسے شتر مرغ ہے تو اس کی سزا میں اونٹ کی قربانی ہوگی۔ اب یہ ایسی چیز نہیں ہے جسے ہر آدمی سمجھ سکے۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ ''جو ہو چکا اسے اللہ نے معاف کیا، یہ قانون میں کوئی استثنا نہیں ہے۔ یہ ویسا ہے جیسے اس کے پہلے جمع الاختین اور باپ کی منکوحہ عورتوں کی حرمت کے ساتھ آیا تھا: اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ''مگر جو ہو چکا''...... یعنی اس حکم کے آنے سے پہلے یا زمانہ جاہلیت میں جو ہوا وہ ہوا۔ اب سے ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ وہی مطلب یہاں بھی ہے۔[6]

اُحِلَّ لَكُمۡ صَيۡدُ الۡبَحۡرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمۡ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيۡكُمۡ صَيۡدُ الۡبَرِّ مَا دُمۡتُمۡ حُرُمًا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡۤ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۹۶﴾

''تمہارے لئے دریا کا شکار اور اس کا کھانا جائز قرار دیا گیا ہے تاکہ تمہارے لئے اور قافلہ والوں کے لئے فائدہ کا ذریعہ ہو اور خشکی کا شکار تم پر حرام کیا گیا ہے جب تک کہ تم احرام میں رہو اور اللہ کے غضب سے بچو جس کی طرف تم سب کو سمٹ کر جانا ہے''۔

دریائی جانور یعنی مچھلی کے شکار کی اجازت

اس کے قبل کی آیت میں جو کہا گیا تھا کہ ایک طرح کے شکار سے تمہاری آزمائش کی جائے گی، اس آیت میں اس کی تفصیل بیان ہوگئی

---

[1]۔ مماثلت نزدیک شافعی بحقیقت وهیئت است (شاہ ولی اللہ)

[2]۔ نزدیک ابی حنیفه بقیمت (شاہ ولی اللہ)

[3]۔ یحکم برای بالمثل (جلالین)

[4]۔ ھذا ھو الذی یدل علیه روایات اصحابنا (تبیان)۔

[5]۔ فظر ان اشبه الاشیاء من النعم فیحکمان به (مجمع البیان)

[6]۔ تا منفعت باشد برائے شما برائے قافله (شاہ ولی اللہ)

کہ وہ خشکی کا شکار ہے جو حرام ہے لیکن دریائی شکار جیسے مچھلی حرام نہیں ہے اور بحر کے اصل معنی اگرچہ سمندر کے ہیں مگر جب برّ یعنی خشکی کے مقابلہ میں اس کا استعمال ہو تو اس کے معنی تری کے ہوتے ہیں لہٰذا تالاب اور جھیل وغیرہ کی مچھلیاں بھی اس میں داخل ہیں۔[1]

اس کے علاوہ ایک مزید اضافہ یہاں یہ ہو گیا کہ گزشتہ آیت سے فقط شکار کے مارنے کی حرمت ظاہر ہوتی تھی اور یہاں تری کے شکار کے ساتھ اس لفظ کے کہنے سے کہ ''اور اس کا کھانا بھی حلال ہے۔'' یہ معلوم ہو گیا کہ خشکی کے شکار کا خود کرنا ہی حرام نہیں ہے بلکہ کسی اور نے شکار کیا ہو تو اس کا کھانا بھی حرام ہے بلکہ ایک مفہوم کے لحاظ سے اس کا استفادہ خود سابق آیت سے بھی ہوتا ہے کہ صیدؔ کے ایک معنی مصدر قرار دے کر شکار کرنے کے ہیں اور دوسرے صیدؔ بمعنی شکار، خود اس شے کو کہتے ہیں جس کا شکار کیا گیا ہے اور اب معنی یہ ہوئے کہ تم پر شکار یعنی وہ جانور جو شکار کیا گیا ہو، حرام ہے تو اس سے کھانے کی حرمت بھی ثابت ہو جاتی ہے۔[2]

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾

''اللہ نے کعبہ کو جو محترم گھر ہے، سب لوگوں کی فلاح و بہبودی کا سبب قرار دیا ہے اور محترم مہینہ اور قربانی کے جانوروں اور ان جانوروں کو جن کے گلے میں پٹا ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ تمہیں معلوم ہو کہ اللہ جانتا ہے اسے جو آسمانوں میں ہے اور اسے جو زمین میں ہے اور یہ کہ اللہ ہر بات کا جاننے والا ہے۔''

کعبہ کے پاس کا اجتماع عرب کے تجارتی منافع کا بھی باعث تھا[3] پھر یہ کہ تمام قبائل عرب باوجود اپنے اختلافات اور مسلسل جنگ و جدل کے ان چیزوں کی حرمت کو مانتے تھے۔ اس لئے حدود حرم میں آ کر کھینچی ہوئی تلواریں نیام میں چلی جاتی تھیں اور جب اَشہر حُرم یعنی ذیقعد، ذی الحجہ، محرم اور رجب کے مہینے آ جاتے تھے تو لڑائیاں رک جاتی تھیں یا جب کسی قافلہ کے ساتھ قربانی کے جانور دیکھ لیتے تھے تو وہ قافلہ خطرہ سے محفوظ ہو جاتا تھا۔[4] اسی کو ارشاد کیا ہے کہ خالق نے اس محترم گھر اور ان چیزوں کو تمام لوگوں کے لئے حالات کی درستی اور تنظیم کا مرکز بنایا ہے۔[5]

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ؕ ﴿۹۸﴾

---

[1]۔ اذا اطلق دخل فیه الانهار بلا خلاف (تبیان)

[2]۔ الصید یعتبر به عن الاصطیاد فیکون مصدر اور یعتبر به عن الصید فیکون اسما و یجب ان یحمل الآیة علی تحریم الجمیع (تبیان)

[3]۔ قیاما لمعایش الناس و مصالحهم (تبیان) سبب انتظام امور مهر و مان (شاہ ولی اللہ)

[4]۔ فاستبقت معایشهم بذلك و استقامت احوالهم به ولذا قال سعید بن جبیر من اتی هذا البیت یرید شیئا للدنیا والاخرة اصاب به وهو المروی عن ابی عبدالله (مجمع البیان)

[5]۔ قال ابن عباس معناه جعل الله الکعبة امنا للناس بها یقومون ای یؤمنون ولولا ها لغنوا او هلکوا او ما قاموا (مجمع)

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے اور یہ کہ اللہ بڑا بخشنے والا بھی ہے مہربان۔''
آیت کے دونوں ٹکڑے بیم ورجاء دونوں پہلوؤں کی پرورش کا ذریعہ ہیں جو ایمان کے دو حصے ہیں (الایمان نصفان نصف خوف ونصف رجآء)۔

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾

''پیغمبر کے ذمہ نہیں ہے مگر پہنچا دینا اور اللہ جانتا ہے اسے جو تم ظاہر کرتے ہو اور اسے بھی جو تم چھپاتے ہو۔''

قُلْ لَّا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

''کہہ دیجئے[۱] کہ گندی اور پاک چیز برابر نہیں ہے، چاہے گندی چیز کی زیادتی تمہارے دل کو لبھائے[۲] تو اللہ کے غضب سے بچو اے عقل والو! شاید کہ تم ہر طرح کی بہتری حاصل کرلو۔'' اگر یہ آیت تنزیل میں اسی سلسلہ کی ہے تو مطلب یہ ہے کہ شکار کے ممنوع قرار پا جانے پر حالت احرام میں تمہارا دل نہ دکھے کہ افسوس، اتنی اللہ کی نعمتوں سے ہم محروم ہو گئے اور جو حلال غذا ہے یعنی مچھلی، وہ تو ان غذاؤں سے بہت کم ہے۔ نہیں، یہ تو افسوس تمہیں نہیں ہونا چاہیے، اس لئے کہ وہ حرام غذا چاہے بہت زیادہ ہو، کس کام کی جب کہ اللہ کو اس کا کھانا پسند نہیں ہے۔ اس سے وہ کم مقدار میں غذا اچھی جو اس کی طرف سے پاک وحلال قرار دی گئی ہے۔ دوسری تفسیر یہ کہ خبیث اور طیب سے برے اور اچھے، کافر اور مومن لوگ مراد ہیں[۳] اس صورت میں مفاد اس کا وہی ہے جو اکثر آیاتِ قرآن سے ثابت ہے کہ کثرت اور جمہور کی طاقت کوئی قیمت نہیں رکھتی جبکہ حق کے خلاف ہو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

''اے ایمان لانے والو! ایسی چیزوں کے متعلق دریافت نہ کرو کہ اگر وہ تمہارے لئے ظاہر کردی جائیں تو تمہیں صدمہ ہو اور اگر تم پوچھو گے ان کے متعلق (اس دور میں) جبکہ قرآن اتر رہا ہے تو وہ تمہارے لئے ظاہر کردی جائیں گی۔ اللہ نے انہیں نظر انداز کردیا ہے اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا بردا شت کرنے والا۔''

---

[۱]۔ قل یا محمد (مجمع البیان)
[۲]۔ کثرۃ الخبیث ای کثرۃ ماتراہ من الحرام (مجمع البیان)
[۳]۔ قال السدی الکافر والمؤمن (تبیان)

اخباریین کے نظریہ ''اصالت حرمت'' کی رد

میرے خیال میں اخباریین کے اس خیال کی رد میں کہ اصل اشیاء میں حرمت ہے یعنی جس چیز کا حکم شرع میں وارد نہ ہوا ہو، اسے ممنوع سمجھنا چاہیے، یہ آیت بہت بڑی قوی دلیل ہے۔ خالق کا ارشاد ہے کہ خواہ مخواہ خود سے کھوج کرکر کے نہ پوچھ کہ اس چیز کا کیا حکم ہے؟ اس چیز کا کیا حکم ہے؟ اس پوچھنے پر بہت ممکن ہے کہ تم پر کوئی ایسی پابندی عائد ہو جائے جس پر تمہیں صدمہ ہو اور جب تک شریعت میں اس کا حکم بیان نہیں ہوا ہے، اس وقت تک تمہارے لئے آسودگی ہے۔ ''اللہ نے اسے نظرانداز کر دیا'' یعنی اس کے متعلق کوئی پابندی عائد نہیں کی تو تم جو کرو، اس پر سزا نہیں ملے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اصل اشیاء میں حلّت اور برائت ہے اور بغیر ثبوت ممانعت مواخذہ کا تصور صحیح نہیں ہے۔ اس کے قبل اور بعد گندی اور پاک، حرام اور حلال چیزوں کا ذکر ہے، وہ بھی اس تصور کا جو ہم نے قائم کیا ہے، مؤید ہے اور حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام سے یہی وارد ہوا ہے کہ یہ آیت احکام شرعیہ سے تعلق رکھتی ہے۔ [1]

لیکن بعض لوگوں نے اس کی شان نزول ایسی بیان کی ہے جس سے اس کا تعلق احکام شرعیہ سے باقی نہیں رہا ہے۔ اس شان نزول کو مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے اپنے حاشیہ میں حسب ذیل الفاظ میں تحریر کیا ہے:

عرب کے کندہ ناتراش جاہل لوگ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے طرح طرح کے سوالات کیا کرتے۔ کسی نے پوچھا میری بی بی اس وقت گھر میں کس طرح ہے؟ کسی نے کچھ، کسی نے کچھ۔ یہاں تک کہ کثرت سوال سے آپ گھبرا کر منبر پر تشریف لے گئے اور غصہ سے فرمایا جسے جو پوچھنا ہو، پوچھے، میں جواب دیتا ہوں، اس پر بھی ان گنواروں کی سمجھ میں نہ آیا اور ایک بول اٹھا میرا باپ کون ہے؟ فرمایا فراقہ بن قیس۔ دوسرے نے پوچھا میرا باپ کہاں ہے؟ فرمایا دوزخ میں۔'' اس کے بعد فرمایا خدا کی قسم اس وقت بہشت و دوزخ میرے سامنے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ کون بہشت میں ہے اور کون دوزخ میں ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم میں سے کون بہشتی ہوگا اور کون جہنمی اگر میں بیان کروں تو سوال کرنے سے پچھتاؤ گے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔'' علامہ طبرسیؒ نے اسے درج کرنے کے بعد لکھا: عن الزهري عن قتادة عن انس (مجمع البیان) اس سے ظاہر ہے کہ کسی معصوم کی طرف منسوب نہیں ہے اور اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ یہ آیت قبل اور بعد کی آیتوں سے کوئی ارتباط نہیں رکھتی۔ یہ امر کوئی عجیب تو نہیں ہے اور اس کی نظیریں قرآن مجید میں بکثرت ہیں مگر خود مضمون آیت کے لحاظ سے پہلا قول مجھے زیادہ دلنشین معلوم ہوتا ہے۔

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿١٠٢﴾

''تمہارے پہلے کچھ لوگوں نے ایسی باتوں کا سوال کیا؟ پھر ان کے ساتھ کفر اختیار کیا۔''

یعنی خواہ مخواہ پوچھ پوچھ کر تو احکام دریافت کئے اور جب پابندیاں عائد ہوئیں تو ان کی مخالفت کی [2] درصورتیکہ اس سوال کو احکام سے

---

[1]۔ خطب رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال ان الله كتب عليكم الحج فقام عكاشة بن محصن ويروى سواقة بن مالك فقال افی كل عام يارسول الله الخ آخر میں ھے: عن بن ابی طالب علیہ السلام وابی امامة الباهلی (مجمع البیان)

[2]۔ صاروا بها كافرين بتركهم العمل بها (جلالين)

متعلق نہ سمجھا جائے جیسا کہ دوسری شانِ نزول سے ظاہر ہوتا ہے تو کفر اختیار کرنے کے معنی انکار کرنے کے ہوں گے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

''اللہ نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی کچھ قرار نہیں دیا تھا لیکن جو کافر ہیں، وہ اللہ پر جھوٹ تہمت لگاتے ہیں اور ان میں کے زیادہ اشخاص عقل وشعور نہیں رکھتے۔''

یہ چند قسم کے جانور مشرکین نے حرام سمجھ رکھے تھے، کسی آسمانی شریعت کی طرف سے حرام نہ ہوئے تھے۔ بلکہ انہوں نے رواجی طریقہ پران پابندیوں کو عائد کر لیا تھا۔ اسلام نے انہیں حلال قرار دیا اور بتایا کہ یہ پابندیاں کوئی اصلیت نہیں رکھتیں۔

بحيرة وہ اونٹنی جس یہاں کے پانچ دفعہ بچے ہو چکے ہوں اور پانچویں مرتبہ نر پیدا ہوا ہو تو اس کے کان کو پھاڑ دیا جاتا تھا اور اس کی بڑی عزت ہونے لگتی تھی۔ [۱]

سائبة وہ جانور جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیئے جائیں کہ وہ ہر طرف پھرتے رہیں، جیسے گائے، بیل ہمارے ہندوستان میں کافی نظر آتے ہیں۔ ان جانوروں کو باربرداری وغیرہ کے کام میں نہیں لایا جاتا تھا۔ [۲]

وصيلة یہ بکریوں میں ایسی بکری ہوتی تھی جس کے پہلے بھی بکری پیدا ہوئی تھی، بیچ میں کوئی نر نہیں ہوا۔ اسے بھی بتوں کے نام کا قرار دیا جاتا تھا۔ [۳]

دوسرے معنی یہ بیان کئے گئے ہیں کہ وصيلة وہ بکری ہے جو بکرے کے ساتھ پیدا ہوئی ہو۔ اس کو ذبح کرنا ممنوع تھا۔ [۴]

اور حامي وہ اونٹ ہوتا تھا جس کے صلب سے دس بچے پیدا ہو چکے ہوں تو اس کے بعد اسے بھی سواری وغیرہ کے کام میں نہیں لایا جاتا تھا۔ [۵]

یہ تمام پابندیاں چونکہ از خود عائد کی گئی تھیں اور خالق کی طرف سے کسی پیغمبر کے ذریعہ یہ حکم نہیں آیا تھا تو قرآن نے اسے افترا سے تعبیر کیا ہے اس کے بعد یہ امر قابل غور ہو جاتا ہے کہ ہمارے ملک میں مسلمانوں کے مختلف حلقوں میں بھی نذر و نیاز کے ذیل میں رواج عام کے ماتحت جو بعض ایسی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں جن کی اصلیت شرع میں کوئی نہیں ہے تو یہ اس افتراء کے تحت میں تو داخل نہیں ہوتا جس کی قرآن مجید نے اتنے سخت الفاظ میں مذمت فرمائی ہے؟!

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا

---

[۱]۔ای الناقة التی تشق اذنها (بتیان) الناقة كانت اذا انتجت خمسة ابطن وكان اخرها ذكرا بحروا اذنها (مجمع البیان)

[۲]۔السائبة كانوا یسیبونها لالهتهم فلا یحمل علیها شئی (جلالین) یقال سبت الدابة ای تركتها تسیب حیث شاءت (مجمع)

[۳]۔وصلت احدٰهما بالاخرى لیس بینهما ذكر (جلالین)

[۴]۔الانثى من الغنم اذا ولدت مع الذكر قالوا وصلت اخاها لم یذبحوها (بتیان)

[۵]۔اذا انتجت من صلب الفحل عشرة ابطن قالوا حمی ظهره فلا یحمل علیه شئی ولا یدفع من ماء ولا مرعی (تبیان)

عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝۱۰۴

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کی طرف جو اللہ نے اتارا ہے اور پیغمبر کی طرف تو وہ کہتے ہیں کہ ہمیں کافی ہے وہ جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔کیا چاہے ان کے باپ دادا نہ کچھ علم رکھتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں“۔

یہ مشرکین کی وہی دلیل ہے جو ایک ہی مفہوم کے مختلف الفاظ کے ساتھ قرآن مجید میں جابجا مذکور ہے اور ہر جگہ اس کا جواب بھی قرآن نے تھوڑے سے انداز کے فرق کے ساتھ ایک ہی دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ خود حقیقتوں پر غور کرے، آبا وٴاجداد کا قول یا عمل دلیل صحت نہیں ہوسکتا۔اولاد کا فرض ہے کہ اپنے باپ دادا کے عمل پر خود اپنی عقل کی روشنی میں غور کرے کہ وہ درست تھا یا نہیں۔ یہی جواب یہاں بھی دیا گیا ہے۔

ایسی ہی آیتوں سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ عقائد اور اصولِ دین میں تقلید حرام ہے۔ان میں ہر انسان خود اپنے آزاد ضمیر سے کام لینے پر مکلف ہے۔[1]

صدر آیت میں یہ الفاظ کہ ”ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف آؤ جسے اللہ نے اتارا ہے اور پیغمبر کی طرف“ اس سے ظاہر ہے کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بجائے خود نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کے ساتھ وہ پیغام بھی ہوتا ہے جو اللہ کی طرف کا اتارا ہوا ہے۔اس طرح یہ دونوں ماخذ احکام ربانی ہوتے ہیں۔خدا کا پیغام جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی ہوتا ہے اور خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت جس کا عمل کاشف رضائے خالق ہوتا ہے۔

یہی بنیاد ہے جس کی بنا پر جمہور امت ماخذ احکام، کتاب اور سنت دونوں کو مانتی ہے اور اس کے خلاف اس آواز کو کہ کتاب کافی ہے، سنت کی ضرورت نہیں، خود کتاب الٰہی کے خلاف جانتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۰۵

”اے ایمان لانے والو! تم پر ذمہ داری خود اپنے نفوس کی ہے، جب تم صحیح راستے پر ہو تو جو گمراہ ہو، وہ تمہارا کوئی نقصان نہیں کرے گا۔اللہ ہی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہوگا تو وہ تم کو بتائے گا کہ تم کیا کرتے تھے۔“

یہ تنبیہ بطور تسلی بھی ہوسکتی ہے، جیسے کچھ ایمان والے اس فکر میں گھلے جاتے ہیں کہ یہ اتنے آدمی گمراہ کیوں ہیں تو جواب میں کہا جارہا ہے کہ تم ان کی فکر نہ کرو، تم تو الحمدللہ راہ راست پر قائم ہو۔اب یہ نہیں آتے تو یہ خود اپنا نقصان کریں گے۔یہ ایسا ہے جیسے خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرکے بہت جگہ کہا گیا ہے کہ آپ ان کی اتنی فکر کیوں کرتے ہیں؟! آپ کا جو فرض ہے، وہ آپ انجام دے رہے ہیں۔اب یہ اس سے اثر قبول

---

[1] فی الایۃ دلیل علی فساد التقلید۔لا یجوز لاحد ان یعمل علی شئی من امر الدین الا بحجۃ (بتبیان)

نہیں کرتے تو یہ بھگتیں گے مگر یہاں دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ تنبیہ واقعی سرزنش کا انداز رکھتی ہو کیوں کہ بہت لوگ دوسروں کے افعال پر نکتہ چینی سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں لیکن خود اپنی خبر نہیں لیتے کہ خود ہم میں کیا کیا نقائص ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان ہی لوگوں کے کردار پر اس آیت میں تازیانہ لگایا گیا ہو کہ تم دوسروں پر ہر وقت نکتہ چینی کیا کرتے ہو، وہ جیسے ہوں، ہوا کریں، تمہیں تو اپنے نفوس کی خبر لینا چاہیے کہ تم تو اپنے فرائض سے غفلت برت نہیں رہے ہو۔

چونکہ عموماً یاایہا الذین امنوا کہہ کے فقط خاص الخاص سچے صاحبانِ ایمان مراد نہیں لئے گئے ہیں بلکہ پوری جماعت جو ادعائے ایمان رکھتی ہے، سب کو مخاطب بنایا گیا ہے اور ان میں اکثریت ایسے ہی کردار والوں کی ہوا کرتی ہے، اس لئے میرے خیال میں یہ دوسرا مفہوم مقصدِ قرآن سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے اور ہماری قدیم تفسیر بھی جو بظاہر کسی حدیث پر مبنی ہے، اس کے مطابق ہے۔ [1]

بعض مفسرین نے سابق آیت سے اس کے لگاؤ کا خیال مدنظر رکھتے ہوئے یہ مطلب قرار دیا ہے کہ کفار تو باپ دادا کی تقلید کا عذر پیش کرتے ہیں۔تم اے ایمان والو! اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے خود اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے جادہ پر قائم رہو اور اگر آباؤ اجداد تمہارے غلط راستے پر تھے تو ہوا کریں۔ان کی غلط کاری یا گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ [2]

اب جنھوں نے اس کو اموات نہیں بلکہ احیاء سے متعلق قرار دیا ہے جس پر اس کے پہلے والی تفسیریں جو ہم درج کر چکے مبنی تھیں، ان میں سے بعض کا ذہن یہاں تک آگے بڑھ گیا کہ تم دوسروں سے کوئی سروکار ہی نہ رکھو کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔تم کو بس اعمال درست رکھنا چاہئیں اور اب ذہن نے یہ سوال اٹھا دیا کہ پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بھی ضرورت نہیں ہے۔کوئی گمراہ ہے تو ہو، ہم سے کیا مطلب اور کوئی معصیت کر رہا ہے تو ہم سے کیا غرض؟! اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہدایت وارشاد کی بھی ضرورت نہیں مگر ظاہر ہے کہ یہ انتہا پسندانہ نقطۂ نظر بھی غلط ہے۔ [3]

اس کے دفعیہ کے لئے کچھ حضرات نے بہت باریک نظری صرف کی ہے۔آیت کے لفظ انفسکم کی ایسی تاویل کر ڈالی کہ وہ خود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دلیل قوی بن جائے اور وہ یوں کہ انفسکم کے معنی اپنی ذات کے ہیں ہی نہیں بلکہ یہ لفظ اپنے آدمیوں کے معنی میں ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:۔

وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ　　اپنے آدمیوں کو اپنے گھروں سے نہ نکالو۔(بقرہ۔۸۴)

دوسری جگہ ہے:۔فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ　　اپنے آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرو۔

ویسے ہی یہاں کہا جا رہا ہے کہ تم پر بس اپنی جماعت کے آدمیوں کی اصلاح ہے۔دوسرے لوگ یعنی غیر مذاہب کے افراد کی بداعمالیوں سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا [4]

اس توجیہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی عمارت تو برپا ہوگئی مگر کفار کو دعوت وارشاد کی بنیاد اب بھی منہدم ہے۔ ہمارے نزدیک صاف سیدھا مطلب وہی ہے جو پہلے لکھا جا چکا ہے۔

---

[1]۔ اصلحوا انفسکم ولا تتبعوا عورات الناس فلا تذکروھم فانہ لایضرکم ضلالتھم اذا کنتم انتم صالحین (علی بن ابراھیم)

[2]۔ لایلزمھم من ضلال ابائھم شئ من الذم والعذاب (بتیان)

[3]۔ لیس فی الآیۃ مایدل علی سقوط انکار المنکر (بتیان)

[4]۔ لایضرکم من ضل من الکفار...وھذا قول ابن عباس فی روایۃ عطا عنہ (بتیان)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ
اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ
فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ
اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ
اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۝١٠٦ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ
مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ
اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝١٠٧ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ
يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝١٠٨

’’اے ایمان لانے والو! تمہارے درمیان کے گواہ [۱] جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے دو عادل ہونا چاہئیں تم میں سے۔ ہاں اگر تم سفر میں ہو اور اس حالت میں تمہیں موت آرہی ہو تو دوسرے دو تمہارے علاوہ اوروں میں سے [۲] اور اگر تمہیں شک ہو تو ان دونوں کو نماز کے بعد کھڑا کرو [۳] کہ وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم اس سے کوئی قیمت حاصل نہیں کر رہے ہیں چاہے وہ عزیز ہی ہو [۴] اور اللہ کی طرف کی گواہی کو چھپائیں گے نہیں کہ اس صورت میں یقیناً ہم گناہ گاروں میں ہوں گے۔ اس کے بعد اگر پتہ چلے کہ وہ گناہ کے مستوجب ہوئے تو ان کی جگہ دوسرے دو آدمی میت کے عزیزوں میں سے جن کا حق ان سے چھینا گیا ہے، کھڑے ہوں [۵] اور اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ صحیح ہے اور ہم نے کچھ بھی تجاوز نہیں کیا ہے کہ اس صورت میں ہم یقیناً ظالموں

---

[۱]. المعنی عدد الشھود منکم اثنان کقولہ: الحج اشھر معلومات ای وقت الحج (مجمع البیان)
[۲]. من غیرکم ای من غیر ملتکم (جلالین)
[۳]. معنی تحبسونھما تقفونھما (مجمع)
[۴]. اگرچہ کسی کہ برای نفع او گواھی می دھند صاحب قرابت باشد (شاہ ولی اللہ)
[۵]. دو کس از ورثۂ مظلومین بایستند بجای ایشاں (شاہ ولی اللہ)

میں سے ہوں گے یہ زیادہ امکانی صورت ہے اس کی کہ وہ گواہی صحیح صحیح دے دیں یا انہیں ڈر ہو کہ ان کی قسموں کے بعد دوسرے گواہوں سے قسمیں لی جائیں گی [1] اور اللہ کے غضب سے بچو اور بات کی سماعت کرو اور اللہ بدکار لوگوں کو منزل تک نہیں پہنچایا کرتا''۔

مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے ان آیات کی شانِ نزول حسب ذیل تحریر کی ہے:

''تمیم دارمی صحابی نے ابن بیدی اور ابی ماریہ نصرانی کے ساتھ بغرض تجارت سفر کیا اور اس کے پاس علاوہ اور اسباب کے سونے چاندی کے منقش ظروف اور ہار بھی تھے۔ اتفاقاً راہ میں بیمار ہوا اور مر گیا اور تمام مال و اسباب ان دونوں کے حوالے کر گیا کہ میرے وارثوں کو دیدیجیو۔ ان دونوں نے مدینہ آ کر سونے چاندی کے ظروف اور ہار نکال کر باقی اسباب ان کے وارثوں کو دے دیا اور چونکہ ان وارثوں کو تمام اسباب کی فہرست معلوم تھی، ان دونوں نصرانیوں سے یوں جرح شروع کی کیا ہمارا مورث بہت دنوں تک بیمار رہا کہ اس کی بیماری میں بہت کچھ خرچ ہو گیا؟ وہ بولے نہیں، تب پوچھا کیا تجارت کی تھی جس میں گھاٹا ہوا؟ کہا نہیں، پوچھا کہ پھر یہ قیمتی چیزیں سونے کے ظروف وغیرہ کیا ہوئے؟ وہ بولے ہم یہ نہیں جانتے، جو ہمیں دیا تھا وہ ہم نے پہنچا دیا آخر یہ مقدمہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اجلاس میں پیش ہوا اور چونکہ ان دعویداروں کا کوئی گواہ نہ تھا، اس وجہ سے آپ نے نصرانیوں کو رہائی دے دی۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر وارثوں نے ایک کٹورا مضارب کے پاس پایا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ ان ہی دونوں نصرانیوں نے بیچا ہے۔ تب ان نصرانیوں نے کہا کہ یہ چیزیں ہم لوگوں نے اس کی زندگی میں خریدی تھیں مگر چونکہ کوئی گواہ نہ تھا، اس لئے ظاہر نہ کیا۔ وارثوں میں سے دو شخصوں نے جو میت کے زیادہ قریب تھے قسم کھائی کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ ہم لوگوں کو بیچنا معلوم نہیں اور میت کے ہاتھ کی لکھی ہوئی فہرست بھی نکلی۔ تب حضرت نے نصرانیوں سے کل مال واپس لے کر وارثوں کے حوالہ کیا''

مگر جناب شیخ الطائفہ نے تبیان میں اور ان کے تتبع میں علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں النزول کے زیر عنوان جو تحریر فرمایا ہے اور اس کی نسبت امام محمد باقر علیہ السلام کی طرف بھی دی ہے، اس میں ہے کہ تمیم بن اوس دارمی اور اس کا بھائی عدیؔ دونوں نصرانی تھے اور ابن ابی ماریہ غلام عمرو بن العاص مسلمان یہ تینوں تجارت کے لئے شام کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ابن ابی ماریہ بیمار ہوئے اور انہوں نے وصیت نامہ لکھ کر اپنے ساتھ کے اسباب و اموال کے ساتھ ان دونوں نصرانیوں کے سپرد کیا کہ وہ ان کے عزیزوں کے پاس پہنچا دیں۔ اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ دونوں نصرانیوں نے سامان میں سے جو جو چیزیں پسند تھیں، وہ نکال لیں اور باقی مال وارثوں کے سپرد کیا۔ وارثوں نے مال کا جائزہ لیا تو بہت سی چیزیں جو متوفی اپنے ساتھ لے گیا تھا، نہ پائیں۔ اس کے بعد وصیت نامہ دیکھا تو اس میں فہرست تمام سامان کی پوری تھی۔ اس پر دونوں عیسائیوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا ہمیں یہ نہیں معلوم۔ ہمیں تو یہی سامان سپرد کیا تھا جو ہم نے پہنچا دیا۔ یہ مقدمہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش ہوا اور اس پر یہ آیتیں اتریں چنانچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں سے اسی طرح قسم لی کہ ہمارے سپرد اتنا ہی کیا گیا تھا اور جب انہوں نے قسم کھالی تو انہیں چھوڑ دیا۔ پھر ایک گنگا جمنی برتن ان کے پاس نکلا اور ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا، ہم نے خریدا تھا اور ہم تمہیں بتانا بھول گئے۔ پھر معاملہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گیا، تب دوسری آیت اتری جس کے بعد میت کے دو عزیز عمرو بن عاص اور مطلب بن رفاعہ سہمی کھڑے ہوئے اور انہوں نے قسم کھائی کہ ان دونوں عیسائیوں نے خیانت کی ہے چنانچہ وہ برتن میت کے ورثہ کے سپرد کیا گیا۔ بعد میں تمیم دارمی مسلمان ہو گیا تو وہ

---

[1]۔ تردایمان الی اولیاء السیت بعد ایمانهم فیحلفوا علی خیانتهم و کذبهم فیقتخوا (مجمع البیان)

کہتا تھا کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ برتن میں نے ناجائز طور پر لیا تھا اور جو فیصلہ میرے خلاف ہوا، وہ بالکل درست تھا۔
وہ نماز جس کے بعد گواہوں کو کھڑا کیا جائے، اس سے مراد نماز عصر تھی کیونکہ قسم کا لینا اسی وقت مروج تھا اور لوگوں کا اجتماع بھی اس وقت زیادہ ہوتا تھا۔[۱]
''وہ گواہ قسم کھائیں کہ ہم نے اس سے کوئی قیمت حاصل نہیں کی ہے' یعنی گواہی میں کسی ذاتی مفاد کی خاطر کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔[۲]
''چاہے وہ عزیز ہوں'' یعنی جس کے وہ گواہ ہیں، وہ ان گواہوں میں سے کسی کا عزیز ہو۔[۳]
جب بھی (قسم کھا رہے ہیں کہ) ہم نے گواہی دینے میں قرابت داری کے لحاظ سے کام نہیں لیا ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾

''جس دن اللہ سب پیغمبروں کو یکجا کرے گا تو کہے گا کہ تمہاری آواز پر کیا لبیک کہی گئی[۴]؟ وہ کہیں گے کہ ہمیں خبر نہیں۔ یقیناً تو ہے تمام غیب کی باتوں کا جاننے والا''۔

اس سے غالباً صرف یہ اظہار مقصود ہے کہ قوم کے لبیک کہنے یا نہ کہنے کی ذمہ داری پیغمبروں پر کچھ نہیں ہے۔ اگر قوم گمراہ رہی یا بعد میں گمراہ ہوگئی تو یہ اس قوم کی بدنصیبی ہے۔ پیغمبروں کو اس سے کچھ مطلب نہیں اور ان کا اپنے سے علم کی نفی کرنا اس بنا پر ہے کہ انہیں ذاتاً صرف اپنے سامنے کا علم ہوسکتا ہے لیکن آواز پر لبیک کہنے والے بعد میں ہوسکتے ہیں جن کا علم غیب سے تعلق رکھتا ہے بلکہ حال میں بھی حقیقی لبیک یعنی قلبی ایمان جس پر جزائے اخروی کا انحصار ہے، وہ بھی غیبی ہی چیز ہے اور انبیاء کو اللہ کے دیئے ہوئے علم سے چاہے اس کا علم ہو بھی لیکن مقتضائے عبودتی یہی ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں اپنے سے علم کی نفی کی جائے کہ وہ علم جو ہے، وہ بھی بذات خود تو نہیں ہے، اس کا عطا کردہ ہے۔[۵]
ایک قدیم تفسیر آیت کی جو ہمارے یہاں حدیث میں وارد ہوئی ہے، آیت کے مضمون سے زیادہ چسپاں معلوم ہوتی ہے۔
چونکہ اس کے بعد جناب عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر آئے گا کہ ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے ان سے کہا تھا کہ تمہیں خدا بنالیں اور یہ بھی بعد کے واقعہ سے متعلق ہے اور اسی لئے جناب عیسیٰ علیہ السلام کا جواب یہی درج ہے کہ میں اپنے سامنے تک نگراں تھا۔ بعد میں کیا ہوا؟ اس کا علم تجھ ہی کو ہے۔ تو اسی طرح یہاں مرسلین سے بلاکر ان امتوں پر ظاہر کرنے کے لئے تمہارے رویہ سے انبیاء بے تعلق ہیں، ان سے ان انتظامات کے بارے میں پوچھا جائے گا جو انہوں نے اپنے بعد کے واسطے ہدایت خلق کے لئے کئے تھے کہ کچھ خبر بھی ہے تمہیں کہ قوم نے تمہاری ہدایتوں پر کیسا عمل کیا؟

---

[۱]۔ھو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام و قتادۃ و سعید بن جبیر و غیرھم (مجمع البیان)
[۲]۔ای لا نشتری بتحریف الشھادۃ ثمنا (مجمع)
[۳]۔تقدیرہ: ولو کان المشھود لہ ذا قربیٰ (تبیان)
[۴]۔چہ جواب دادہ شد شمارا (شاہ ولی اللہ) کیا جواب دیئے گئے تھے تم (شاہ رفیع الدین)
[۵]۔قال بعضھم لا علم لنا مع علمک (تبیان)

اس پر وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ خبر نہیں۔غیب کا تو جاننے والا تو ہی ہے۔[1]

اس بارے میں سب سے زیادہ شدید اس امت کا کردار ہے جو اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کی وصیتوں کے خلاف اور ان کے اہل بیت کے ساتھ روا رکھا اور اس لئے کوئی بعید نہیں کہ تنزیل آیت میں مقصود اصلی اس امت کی تنبیہ ہو کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تو ان کی ہدایتوں پر جس حد تک عمل کر رہے ہو، وہ خیر مگر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دیکھنا ہے تم کیا کرتے ہو؟

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ إِذْ أَيَّدْتُكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۖ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۖ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰةَ وَالْإِنْجِيلَ ۖ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي ۖ وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَآءِيلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿۱۱۰﴾

"جب کہے گا[2] اللہ اے عیسیٰ فرزند مریم! یاد کرو میری نعمت کو جو تم پر تھی اور تمہاری ماں پر، جب میں نے تمہیں تقویت پہنچائی روح القدس کے ساتھ کہ تم، لوگوں سے باتیں کرتے تھے گہوارہ میں اور ادھیڑ عمر میں اور جب میں نے تمہیں قانونِ شریعت اور حکمت اور توریت اور انجیل کا علم دیا اور جب تم مٹی سے پرندے کی سی شکل بناتے تھے۔اس کے بعد اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی اور تم پیدائشی اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتے تھے میرے حکم سے اور جب تم مردوں کو جلا دیتے تھے میرے حکم سے اور جب میں نے بنی اسرائیل کو روکا تمہاری طرف سے[3] جب تم ان کے پاس معجزے لائے تو ان میں سے جو کافر تھے، انہوں نے کہا کہ یہ نہیں ہے مگر کھلا ہوا جادو۔"

معجزات حضرت عیسیٰ علیہ السلام

"روح القدس" ایک خاص فرشتہ کا نام ہے جسے بعض نے کہا ہے کہ جبریلؑ امین ہی ہیں[4] اور بعض نے کہا ہے کہ کوئی اور فرشتہ ہے۔

---

[1]۔عن ابی جعفر علیه السلام قال: ماذا اجبتم فی اوصیائکم فیقولون لا علم لنا بما فعلوا بعدنا بهم (علی بن ابراهیم)

[2]۔معناه اذ یقول الله فی الآخرة (مجمع البیان)

[3]یعنی قتل کرنے نہ دیا (موضح القرآن)

[4]۔وهو جبرئیل (مجمع البیان)

مگر شاہ ولی اللہ نے اپنے ترجمہ میں روح القدس کے بعد عجیب تشریح کی ہے کہ: ۔''یعنی برکات حظیرۃ القدس'' ...... مجھے نہیں معلوم اس کا ماخذ کیا ہے؟

''تم لوگوں سے باتیں کرتے تھے گھوارہ میں اور ادھیڑ عمر میں'' اس کا مفہوم سمجھنے میں ذرا ذہنی پریشانی محسوس ہوتی ہے۔اس لئے کہ گھوارہ میں بات کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔پھر اس کا ذکر کیوں ہوا؟ یا تو اس فقرہ کو پہلے جز کا تتمہ سمجھا جائے کہ تم نے گھوارہ میں اور ادھیڑ پن میں یکساں گفتگو کی یعنی جو بات ادھیڑ پن میں کہنے والے تھے، وہی گھوارہ میں بھی کہی کہ ''قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۣ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾ (سورۂ مریم) میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے اس نے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے''۔

دوسرا مطلب اس کا بعض مفسرین نے یہ قرار دیا ہے کہ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں ادھیڑ پن کی عمر تک پہنچے ہی نہیں۔وہ تو صرف چالیس برس کی عمر کے تھے جب آسمان کی طرف اٹھا لئے گئے، اس لئے خالق کا یہ کہنا کہ تم نے ادھیڑ پن میں بھی لوگوں سے باتیں کیں، اس کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر اس دنیا میں آئیں گے اور خلق خدا کو دعوت حق دیں گے۔

اسلامی روایات کے مطابق یہ اس وقت ہوگا، جب حضرت مہدی آخر الزماں علیہ السلام ظہور فرمائیں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے انصار میں سے ہوں گے۔

چونکہ یہ ادھیڑ پن میں پھر تبلیغ کا موقع فراہم ہونا، غیر معمولی مظاہرۂ قدرت ہے، اس لئے اس کا گھوارہ کی گفتگو کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔[۱]

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''اور جب میں نے پیغام بھیجا حوارئین کی طرف کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ، انہوں نے کہا ہم ایمان لائے اور گواہ رہنا کہ ہم اسلام لائے ہیں۔''

وحی کا لفظ قرآن میں اکثر جگہ خالق کے پیغام کے معنی میں آیا ہے، چاہے وہ قلبی القاء کے طور پر ہو جس کا نام الہام ہوتا ہے جیسا کہ مادر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے یا ہدایت فطری کے طور پر ہو جیسا کہ شہد کی مکھی کے لئے اس کا استعمال ہوا ہے۔یہاں بھی اس لفظ کا استعمال اسی طرح کے معنی میں ہوا ہے۔[۲]

اور ممکن ہے کہ جہاں وحی کے لفظ کا استعمال بالواسطہ ہوا ہو یعنی پیغمبر کے ذریعہ سے جو حکم ربّانی انہیں پہنچایا گیا ہے، وہی مراد ہو جیسا کہ بعض جگہ قرآن مجید میں انزال کتب کی نسبت خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دی گئی ہے جیسے: يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ اور کہیں اس کی نسبت افراد خلق کی طرف دے دی گئی ہے جیسے: ۔وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا ''کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور

---

[۱]۔ کھلا یفید نزولہ قبل الساعۃ لانہ رفع قبل الکھولۃ (جلالین)

[۲]۔ ای الھتم و قیل القیت الیھم بالایات التی اریتھم ایاھا (مجمع البیان)

اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا ہے‘‘......ظاہر ہے کہ احکام ربّانی افراد امت پر نہیں اترا کرتے بلکہ پیغمبر پر اترتے ہیں مگر چونکہ پیغمبر کے ذریعہ سے وہ احکام ان تک پہنچتے ہیں، اس لئے بالواسطہ وہ ان کی طرف نازل ہوتے ہیں۔ ویسے ہی یہاں یہ کہنا کہ حوارین کی طرف وحی بھیجی اس لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کے ذریعہ سے ان کی طرف یہ پیغام بھیجا گیا ہے۔[ا]

اس نظیر کو سامنے رکھا جائے تو ایک جگہ اَوحینا کے تحت میں انبیا و مرسلین کے ذکر کے ساتھ جو اسباط کا نام ہے، اس سے اس امر پر استدلال نہ کیا جائے کہ فرزندانِ یعقوب سب انبیاء کا درجہ رکھتے تھے۔ جب کہ ان کا کردار جو خود قرآن سے ثابت ہے، منزل نبوت کیا، مرتبہ ایمان کے بھی شایانِ شان نہیں ہے۔ اس کا ذکر اجمالی طور پر سابق میں آ چکا ہے۔

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

’’جب کہا حوارین نے کہ اے عیسیٰ بن مریم! کیا آپ کا پروردگار یہ قدرت رکھتا ہے کہ وہ ہم پر آسمان سے ایک خوان کھانے کا اتارے؟! انہوں نے کہا اللہ کے غضب سے بچو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ انہوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ اس میں سے ہم کھائیں اور ہمارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو اور ہمیں معلوم ہو کہ آپ نے ہم سے سچ کہا تھا اور ہم اس پر گواہ ہوں۔‘‘

بنی اسرائیل کتنے ہی معجزے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں دیکھ چکے تھے اور ہر مرتبہ ان کا کردار یہی تھا کہ وہ ٹیڑھے ہی رہتے تھے مگر وہ تو عوام بنی اسرائیل تھے۔ اب یہ ان میں کے خواص کا ذکر ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوارین کہلاتے ہیں مگر ذہنیت ان کی بھی وہی نظر آتی ہے جو ان عوام کی تھی۔

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗ

[ا]۔اوحیت الی الحواریین امرتھم علی لسانك(جلالین)

اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴿۱۱۵﴾

''کہا عیسیٰ بن مریم نے کہ ہمارے پروردگار! اتار ہم پر ایک خوان آسمان سے جو عید ہو[1] ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے اور تیری طرف کی قدرتی نشانی ہو اور ہمیں روزی عطا فرما اور تو تو تمام روزی عطا کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔ اللہ نے ارشاد کیا کہ بے شک میں اسے تم پر اتاروں گا۔ اب اس کے بعد جو تم میں سے کفر اختیار کرے گا تو پھر یقیناً میں اسے ایسی سزا دوں گا جیسی دنیا میں کسی کو بھی نہیں دی ہو گی۔''

بالکل اسی طرح جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کے جاہلانہ سوال رویت پر پہلے انہیں سمجھایا اور جب وہ نہ مانے تو ان کی طرف سے بارگاہ الٰہی میں درخواست پیش کر دی جس پر برق تجلّی چمکی اور کوہ طور سرمہ ہو گیا اسی طرح یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو حوارین کو سمجھایا مگر جب انہوں نے نہیں مانا تو بارگاہ الٰہی میں آپ نے ان کی درخواست پیش کر دی مگر یہ سوال اتنا سنگین نہ تھا جتنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے پیش کردہ سوال تھا۔ اس لئے یہاں اتنا سخت مظاہرہ جلال الٰہی کا نہیں ہوا کہ پیغمبر کو غش آ جائے اور پہاڑ سرمہ ہو جائے۔ پھر بھی چونکہ معجزوں کے آ چکنے کے بعد پھر خاص خاص معجزوں کی فرمائش کرنا ہی ایمان کمزوری کا ثبوت ہے جو خالق کو ناپسند ہے۔ اس کے بعد پھر فرمائش کی تکمیل کے باوجود اگر انحراف کیا جائے تو یہ بڑی ہی سخت غضب الٰہی کی مستوجب بات ہے، اس لئے دعائے مسیحؑ کی قبولیت کے اعلان کے ساتھ یہ سخت تہدیدی انداز اختیار کیا گیا ہے کہ اگر اس کے بعد ان لوگوں نے نہ مانا تو وہ عذاب ہو گا جو تمام کائنات میں کسی کو نہ ہوا ہو گا۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے ایک عملی نتیجہ اور اچھا نکالا ہے کہ: ''اس میں مسلمانوں کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا خرق عادت کی راہ سے نہ چاہیں، پھر اس کی شکر گزاری بہت مشکل ہے۔ اسباب ظاہری پر قناعت کریں تو بہتر ہے'' (موضح القرآن)۔

ہاں، ایک نتیجہ شاہ صاحب نے الٹا بھی نکالا ہے جس میں ''وہابیانہ'' مسلک کی سخن پروری مضمر ہے۔ وہ یہ ہے کہ: ''اس قصہ میں یہ ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت کی پیش نہیں جاتی''۔

حالانکہ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ پیغمبر کے واسطے سے جو دعا کی جاتی ہے، وہ مقبول ہوتی ہے۔ رہ گیا اس دعا کی قبولت کے بعد کفر پر قیام، اس سے ظاہر ہے کہ پیغمبر بھی انتہائی ناراض ہوں گے اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے کسی حمایت کا ہونا قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ پھر اس واقعہ سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے وہ حقیقت کے مطابق کہاں سمجھا جا سکتا ہے؟!

اس کے برخلاف جناب شیخ الطائفہ اور ان کی پیروی میں علامہ طبرسیؒ نے اسی آیت کے ایک لفظ سے ایسا نتیجہ برآمد کیا ہے جو وہابی تصورات کے قلعہ کو مسمار کر دیتا ہے یعنی وہابی تصور یہ ہے کہ اگر کسی نے پیغمبر یا امام یا کسی ولی خدا سے طلب رزق کر لیا تو مشرک ہو جائے گا کیونکہ رازق ہونا اللہ کی مخصوص صفت ہے مگر اس آیت میں خالق کو خیر الرازقین کہا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ رزق کا انتساب اللہ کے سوا بھی دوسرے کی طرف ہو سکتا ہے۔

جناب شیخ الطائفہؒ فرماتے ہیں:-

فی الأیة دلالة علی ان العباد یرزق بعضهم بعضا بدلالة قوله وانت خیر الرازقین لانه لو لم یصح ذلك

---

[1] ۔نتخذ الیوم الذی ینزل فیه عیدا نعظمه نحن و من یاتی بعدنا (تبیان)

لم یجز خیر الرازقین کما انه لما لم یجزان یکون الٰهة لم یصح ان یقال انت خیر الاٰلهة وصح ارحم الراحمین واحکم الحاکمین واسرع الحاسبین واحسن الخالقین.(تبیان)

یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ بندے بھی ایک دوسرے کے رازق ہوتے ہیں۔اس کی دلیل یہ جملہ ہے کہ تو تمام رزق دینے والوں میں سب سے بہتر ہے۔اس لئے کہ اگر یہ درست نہ ہوتا تو خیر الرازقین کہنا درست نہ ہوتا جیسے چونکہ خدا بہت نہیں ہو سکتے اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ تو ”خیرالالہتہ“(خداؤں میں سب سے بہتر) ہے ہاں ارحم الراحمین، احکم الحاکمین، اسرع الحاسبین اور احسن الخالقین کہنا درست ہے۔

مائدہ (کھانے کے خوان) کا واقعہ

انہیں جو تنبیہہ کی گئی تھی کہ اگر تم نے کفر کیا تو پھر سخت سزا دوں گا، بلاضرورت تو نہیں ہونا چاہیے چنانچہ ہماری قدیم تفسیر بتاتی ہے کہ کچھ دن تو یہ سلسلہ جاری رہا۔دسترخوان پکے ہوئے کھانے کا آتا تھا اور سب مل جل کر ان غذاؤں کو کھاتے تھے اور شکر خدا ادا کرتے تھے مگر کچھ دن کے بعد مال دار افراد نے کہا کہ غریبوں کو ہمارے پاس نہیں بیٹھنا چاہیے۔ان کے لئے انتظام الگ ہونا چاہیے۔اس پر قہر خدا جوش میں آگیا اور وہ دسترخوان آنا موقوف ہو گیا اور ایسا کہنے والے بندروں کی شکل میں مسخ ہو گئے۔[1]

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ
كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ
اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝١١٦ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ
وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ
الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝١١٧ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ
عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝١١٨

”اور جب اللہ کہے گا[2] اے عیسیٰؑ پسر مریمؑ! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے علاوہ مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لو تو وہ کہیں گے کہ پاک ہے تیری ذات، مجھے یہ حق نہیں ہو سکتا کہ میں وہ بات کہوں جو میرے لئے صحیح نہیں ہے۔

---

[1] ۔فرفع اللہ المآئدۃ و مسخوا قردۃ و خنازیر (علی بن ابراھیم)

[2] ۔المعنی: اذیقول اللہ یوم القیامۃ(مجمع البیان) فاما لفظ من قال فی معنی یقول فمستعمل کثیرو ان کان مجازا(تبیان)

اگر میں نے اسے کہا ہو تو تجھے خود معلوم ہوگا۔ تو میرے دل کی بات جانتا ہے اور میں تیرے علم پر حاوی نہیں ہوں [1] یقیناً تو تمام غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔ میں نے ان سے نہیں کہا تھا مگر وہی جس پر تو نے مجھے مامور کیا تھا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے اور میں ان پر گواہ تھا، جب تک میں ان میں تھا۔ پھر جب تو نے میری مدت پوری کر دی تو تو ہی بس ان پر نگراں تھا اور تو ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔ اگر تو انہیں سزا دے تو وہ بے شک تیرے ہی تو بندے ہیں۔ اور اگر انہیں بخش دے تو بلاشبہ تو زبردست ہے، صحیح ہی کام کرنے والا"۔

یہ سوال و جواب مدعیان عیسائیت کو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ سنوا دینے کیلئے ہے کہ جو کچھ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں باتیں بنا رکھی ہیں اور عقیدے قائم کر رکھے ہیں، ان سے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیزار ہیں اور خود ان کی تعلیم ان عقائد کے موافق نہ تھی۔ [2]
اس آیت کے اس جملہ سے کہ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ط قادیانی، وفات حضرت مسیح علیہ السلام پر استدلال کرتے ہیں حالانکہ عربی میں توفی کے اصل معنی موت دینے کے نہیں ہیں بلکہ مدت پوری کرنے کے ہیں۔ یہ مدت کا پورا کرنا چونکہ اکثر موت کی صورت سے ہوتا ہے تو اس لئے عرف عام میں موت کو وفات کہا جانے لگا لیکن اگر مدت پوری ہونے کی کوئی دوسری شکل ہو تو وہ بھی اس لفظ کا مصداق ہوگی جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ہوا کہ وہ زمین سے آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ ان کے لئے مدت پوری ہونے کا یہ عنوان ہوا۔ اس لئے متوفيك کا لفظ اس پر بھی منطبق ہوگا [3] اس کے لئے ویسے قبض روح کی ضرورت نہیں ہے جو موت کی صورت میں ہوتا ہے۔

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ط لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ط رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿119﴾

"ارشاد الٰہی ہوگا کہ یہ وہ دن ہے کہ سچوں کے کام آئے گی ان کی سچائی۔ ان کے لئے بہشت ہوں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے خوش اور وہ ان سے خوش ہوں گے، یہی ہے بڑی کامیابی۔"

"یہ وہ دن ہے"............ یعنی دنیا میں جو انہوں نے عمر بھر قول و عمل میں سچائی کو قائم رکھا، اس کا ثمرہ انہیں آج ملے گا۔ [4]
اس سے ظاہر ہے کہ دنیا میں تو اکثر سچوں کو ان کے سچ سے نقصان بھی پہنچتا ہے اور ان کی زندگی اکثر عسرت و ناکامی کا مرکز نظر آتی ہے۔

---

[1]۔ النفس الغیب (مجمع)
[2]۔ ھٰذا وان خرج مخرج الاستفھام فھو تقریع و تھدید لمن ادعیٰ ذٰلک من النصاریٰ (مجمع البیان)
[3]۔ لا یدل علیٰ انہ اماتہ لان التوفی ھو القبض الیہ (تبیان)
[4]۔ ھو ما صدقوا فیہ فی دار التکلیف لان یوم القیامۃ لا تکلیف فیہ علیٰ احد (تبیان)

وہ اکثر مظالم کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں۔

اس سے ان کی آنکھیں کھلنا چاہئیں جو دنیاوی کامیابی وکامرانی یا وقتی قہر وغلبہ کی ترازو پر حقانیت کو تولنے کے منادی ہیں مگر قرآن سے صاف ظاہر ہے کہ صادقین کی حقانیت کو اس دنیا کی کامرانی کے معیار پر نہیں جانچا جا سکتا۔ اس کے بعد وہ افراد جنہیں کونوا مع الصادقین کہہ کر مرکز اتباع قرار دیا گیا ہے، انہیں دنیا کی بااقتدار صفوں میں ڈھونڈھنا درست نہ ہوگا۔ بلکہ گوشہ نشینوں، کسمپرسی میں زندگی گزارنے والوں اور ظلم وستم کے قید خانوں میں اسیر افراد میں یہ "الصادقین" ملیں گے جن کی اصل کامرانی اسی دن سامنے آئے گی، جب خالق کی ندا ہوگی:۔ هٰذَا يَوۡمُ يَنۡفَعُ الصّٰدِقِيۡنَ صِدۡقُهُمۡ .

لِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا فِيۡهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۲۰﴾

"اللہ کے لئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اور ان کے درمیان کی چیزوں کی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

* * * * * * *
* * * * *
* * *
*